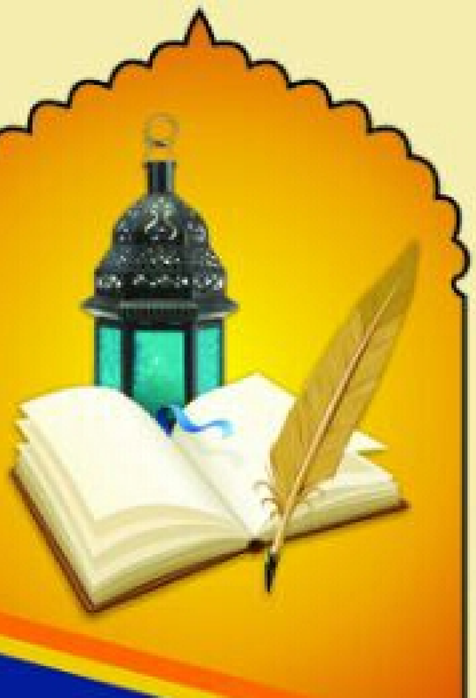


علوم و نکات

(مجموعۂ مضامین)

جلد اوّل



مؤلف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

(م: ۲۸ر ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

ترتیب

محمد عرفات اعظمی

مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

علوم و نکات

(مجموعۂ مضامین)

مؤلف حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

ترتیب محمد عرفات اعظمی

FBD

فہرست

(۱) مرتب کی جانب سے.......۶
(۲) مقدمہ.......۲۰

فقہی مضامین:

(۳) تمہید.......۲۷
(۴) مسئلہ عنین.......۲۸
(۵) مقدمہ ’’لفظ اللہ میں مد کی تحقیق‘‘.......۶۳
(۶) لفظ اللہ میں مد کی تحقیق.......۷۲
(۷) نوٹوں کی شرعی حیثیت اوران سے قرض کی ادائیگی کا مسئلہ.......۸۲
(۸) دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت.......۹۶
(۹) گاؤں میں جمعہ.......۱۲۰
(۱۰) شرعی پنچایت یا قاضی.......۱۳۵
(۱۱) زکوٰۃ.......۱۴۳
(۱۲) فی سبیل اللہ.......۱۶۵
(۱۳) مصارف زکوٰۃ۔ایک اہم استفتاء کا جواب.......۱۸۴
(۱۴) مسئلۂ رفع یدین.......۲۰۲

تعارفِ کتبِ حدیث:

(۱۵) مسند حمیدی۔حضرت محدث اعظمی کا ایک عظیم کارنامہ.........................۲۱۱
(۱۶) کتاب الزہد والرقائق۔حضرت محدث اعظمی کی ایک عظیم خدمت حدیث.....۲۳۱
(۱۷) المطالب العالیہ فی زوائد المسانید الثمانیہ...۲۴۵
(۱۸) کشف الاستار عن زوائد البزّ ار...۲۶۷
(۱۹) مؤطاامام محمد۔تعارف واہمیت...۲۸۸

متعلقاتِ حدیث:

(۲۰) شرح مسند احمد اور محدث اعظمی کے علمی استدراکات..........................۳۲۰
(۲۱) استدراکات علمیہ..۳۵۰
(۲۲) استدراکات علمیہ..۳۷۰
(۲۳) ضعیف اور موضوع احادیث اور حضرات محدثین کی اصطلاح..............۳۸۵
(۲۴) کتابت حدیث کے اصول وقواعد...۳۹۴
(۲۵) محدث کبیر کی اسناد حدیث..۴۱۵
(۲۶) محدث کبیر کی اسناد حدیث..۴۳۵
(۲۷) محدث کبیر کی اسناد حدیث..۴۴۹

متفرقات:

(۲۸) نقد برحقیقت رجم...۴۶۱
(۲۹) امام محمد اور اہل الرائے ہونے کی حقیقت وحیثیت...........................۴۹۳
(۳۰) البانی شذوذہ واخطاؤہ..۵۰۷
(۳۱) البانی شذوذہ واخطاؤہ..۵۴۱
(۳۲) سنن مؤکدہ..۵۵۸
(۲۴) شیخو پور سے چھپرا تک...۵۷۰

فہرست

(۱) مرتب کی جانب سے ۸
(۲) مقدمہ ۱۳

مقالات ومضامین

(۳) قاضی اطہر صاحب۔ معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں ۲۲
(۴) دیار پورب میں علم اور علما۔ قاضی اطہر مبارک پوری کی ایک قابل قدر تصنیف ... ۴۵
(۵) حضرت مولانا نازو ار حسین صاحب بحیثیت مترجم ۶۰
(۶) کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضرات شیخین شریک نہ تھے؟ ۷۹
(۷) کتب شیعہ کی شہادت ۱۰۲
(۸) تصوف اور علماء دیوبند ۱۰۸
(۹) بہار کا ایک مرد عظیم۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ۱۱۵
(۱۰) نصیحت نامۂ پیرومرشد ۱۲۹
(۱۱) قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام۔ معارف وحقائق ۱۳۶
(۱۲) سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا ارادۂ حج ۱۴۵
(۱۳) ترجمہ مقدمہ ’’الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن‘‘ ۱۷۱
(۱۴) فقہی اختلاف رحمت ہیں ۱۸۷
(۱۵) سبیل المومنین سے انحراف ۱۹۱
(۱۶) تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کی شرعی حیثیت ۲۰۵
(۱۷) جماعت تبلیغ۔ مشورے اور گزارشیں ۲۲۰

(۱۸) تبلیغی جماعت اور اس کے اجتماعات..۲۲۷
(۱۹) بے احتیاطیوں کا طوفان..۲۳۱
(۲۰) صبر..۲۳۵
(۲۱) اخلاص..۲۴۰
(۲۲) اہل بیت کون ہیں؟..۲۴۳
(۲۳) قوم انصار کی حقیقت وقطب وابدال اور مجذوب کی شرعی حیثیت..............۲۴۷

اداریئے

(۲۴) رسالۃ الاوائل اور ناشر دیو بند..۲۵۸
(۲۵) کتب خانہ محدث کبیر..۲۶۱
(۲۶) محدث کبیر کی سوانح حیات کی ضرورت..۲۶۴
(۲۷) دارالعلوم دیو بند کا نمائندہ اجلاس بسلسلۂ نصاب تعلیم..........................۲۶۷
(۲۸) حکومت کی پالیسیاں اور مسلمانوں کے کالائحہ عمل..............................۲۷۰
(۲۹) سیمناروں کے سوال نامے؟..۲۷۴
(۳۰) بیمہ اور فقہ اکیڈمی کا فیصلہ؟..۲۸۳
(۳۱) تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟..۲۸۸
(۳۲) ایک مجلس کی تین طلاق اور غیر مقلدین کا رویہ..۲۹۲
(۳۳) مملکت سعودیہ عربیہ میں غیر مقلدین کی بدعنوانیاں..........................۲۹۵
(۳۴) فرق ضالہ اور علمائے حق..۳۰۱
(۳۵) منافق علیم اللسان..۳۰۶
(۳۶) تحریف وتبدل کی ابتدا اور قرآن وحدیث کی وضاحت..........................۳۱۰

سفرنامے

(۳۷) سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ..۳۱۷
(۳۸) تحفۂ مدینہ..۳۳۰

(۳۹) تحفۂ بہار......۳۳۷
(۴۰) سفر بنگلہ دیش......۳۶۹
(۴۱) سفر بنگلہ دیش......۳۷۴

تبصرہ وتعارف

(۴۲) وقفۃ مع اللا مذہبیۃ......۳۹۶
(۴۳) مسائل غیر مقلدین......۴۱۷
(۴۴) فیضان محبت......۴۲۱
(۴۵) تقریر دلپذیر......۴۲۵
(۴۶) الفوز الکبیر......۴۳۱
(۴۷) صدیق اکبر۔ایک انسان کامل......۴۳۴
(۴۸) مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں......۴۴۲
(۴۹) افادات صدیق......۴۴۵
(۵۰) حیات ابوالمآثر......۴۴۷
(۵۱) مقالات ابوالمآثر......۴۵۱
(۵۲) نصرۃ الحدیث (عربی)......۴۵۳
(۵۳) تعدیل رجال بخاری......۴۵۵
(۵۴) دارالاسلام اور دارالحرب......۴۵۷
(۵۵) بیمہ اوراس کا شرعی حکم......۴۵۹
(۵۶) عظمت صحابہ......۴۶۱
(۵۷) ابطال عزاداری......۴۶۳
(۵۸) رحمۃ اللہ الواسعۃ......۴۶۴
(۵۹) رحمۃ اللہ الواسعۃ......۴۷۴
(۶۰) رحمۃ اللہ الواسعۃ......۴۷۶

(۶۱) اللؤلؤ والمرجان فی لطائف القرآن..۴۸۲
(۶۲) مسئلہ امام مہدی..۴۸۴
(۶۳) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں..۴۸۷
(۶۴) زندگی سے لطف اٹھایئے..۴۸۹

مقدمات وتقریظات

(۶۵) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ بحیثیت فقیہ ومجدد..............۴۹۲
(۶۶) غیر مقلد۔ جماعت یا فرقہ؟...۵۰۹
(۶۷) تأثر بر حیات ابوالمآثر...۵۲۲
(۶۸) جہاد اور شہادت...۵۲۶
(۶۹) سیرت نبوی کی جامعیت کا ایک درخشاں پہلو..............................۵۳۶
(۷۰) مقدمہ ''اخلاق نبوی غزوات کے آئینے میں''..................................۵۴۵
(۷۱) اندلس اور ہندوستان...۵۵۰
(۷۲) مقدمہ ''قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے''................................۵۵۸
(۷۳) تقریب بر ''تذکرہ مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری''......................۵۶۱
(۷۴) تقریظ بر ''مسجد نبوی میں تراویح عہد بعہد''.................................۵۶۶
(۷۵) چراغ سے چراغ جلا..۵۷۰
(۷۶) تقریب بر ''چند بسیشور''...۵۷۴
(۷۷) علماء ومشائخ کے تذکرے کا دینی پہلو..۵۷۶
(۷۸) تأثر بر ''اپنی باتیں''...۵۸۰
(۷۹) فیضانِ حکیم الامت..۵۸۳
(۸۰) تقریظ بر ''عمدۃ الاقاویل فی تحقیق الاباطیل''.................................۵۸۷
(۸۱) مقدمہ ''تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت''..۵۹۱.

☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرتب کی جانب سے

والدمحترم (حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نوراللہ مرقدہ) عبقریت کے حامل جامع الجہات انسان تھے، دینی وشرعی علوم کے تقریباً ہر بحر کی انہوں نے شناوری کی اور آبدار موتی چنے، ساتھ ہی میدان طریقت کے شہسوار اور مرد میدان بھی رہے ہیں، ان کی پوری زندگی شریعت وطریقت کے دشت بے کراں کی آبلہ پائی میں گزری ہے۔ کیا علم اور کیا عمل؟ ہر میدان میں ان کی زندگی قابل رشک رہی ہے، ان کی عملی زندگی کی کافی شہادت ہندو بیرون ہند بصورت تلمیذ ومتعلق ومنتسب موجود ہے، اور ان کی علمی زندگی کا کچھ حصہ سفینہ میں منتقل ہوکر بصورت کتاب لوح عالم پرثبت ہے۔

والد صاحب کو قلم وقرطاس سے بہت زیادہ مناسبت نہیں تھی، وہ اصلاً تدریس کے آدمی تھے، لکھنے لکھانے سے ان کو ایک طرح کا گریز تھا، ہاں تدریس کے لئے ہمہ وقت مستعد رہا کرتے تھے۔ مدرسی کے ابتدائی زمانہ میں انہوں نے پڑھایا اور صرف پڑھایا ہے، لکھنے کے نام پر صرف خطوط اور اس کے جوابات تھے۔ والد صاحب نے قاضی اطہر صاحب مبارک پوری علیہ الرحمہ کے تذکرہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''ایک بار مجھ سے انھوں نے اپنے ذوق ومزاج کے مطابق، لیکن ذرا زور دے کر پوچھا کہ آج کل کچھ لکھ رہے ہو؟ میں قاضی صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے کچھ گستاخ سا ہو گیا تھا، اس کے جواب میں، میں نے ایسی بات کہہ دی، جو مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی، اب بھی سوچتا ہوں، تو ضمیر ملامت کرتا ہے، میں نے بے تکلفی میں کہہ دیا کہ جی لکھ رہا ہوں، پوچھا کہ کیا؟

میں نے عرض کیا کہ خطوط !اس وقت میں طلبہ کی تعلیم وتربیت سے متعلق بکثرت خطوط لکھا کرتا تھا،بعض طلبہ کچھ اشکالات لکھ لکھ کر بھیجتے تھے،ان کے جواب خاصے مفصل دیا کرتا تھا،وہی بات پیش نظر تھی اور میں نے کہہ دی،ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا،فرمایا یہ کیا چیز ہے؟ میں یہی پوچھتا ہوں؟ کوئی علمی وتصنیفی کام کرو،محنت سے بچنے کے لئے یہ سب حیلے بہانے ہیں، پھر دیر تک سمجھاتے رہے، میں بہت شرمندہ ہوا،اس کے بعد پھر کبھی میں نے ایسی بے تکلفی کی گفتگو قاضی صاحب سے نہیں کی''۔

خط لکھنے کے معاملہ میں والد صاحب بہت فراخ اور کشادہ دل تھے،اہتمام کے ساتھ بزرگوں،شاگردوں اور خردوں کو خطوط لکھتے تھے،اوران کے مکتوب کا جواب دیتے تھے۔بہرحال مکتوب سے آگے قلم کا سفر بدرجۂ مجبوری اور اشد ضرورت کے وقت ہوتا، پھر رفتہ رفتہ انہیں ضرورتوں اور مجبوریوں نے اپنے بال وپر نکالنے شروع کئے اور محفل قرطاس وقلم ان کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی،اور دنیائے تصنیف وتالیف میں ان کا نام معتبر اور معزز مصنفین کے زمرہ میں شمار ہوکر مرتبۂ سند پر فائز ہوا۔

والد صاحب کی قلمی زندگی میں تیز رفتاری مجلّہ ''المآثر''مئو کی ادارت کے بعد آئی،اس سے پہلے بھی انہوں نے چند کتابیں، کتابچے اور مضامین لکھے تھے مگر لکھنے کا بہت زیادہ اہتمام نہیں تھا،سخت ضرورت پر قلم اٹھاتے تھے۔المآثر کی ادارت کے بعد پرچہ کی ترتیب،اداریہ کی تیاری اور دیگر مضامین کی فراہمی نے ان کے اشہب قلم کو برق رفتار بنادیا،اس کے بعد ماہنامہ ''انوار العلوم''جہانا گنج اور''ضیاءالاسلام'' کی ذمہ داریوں نے ان کے قلم کو اور زیادہ متحرک کردیا۔

والد صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے بیشتر علمی واصلاحی شہ پارے کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں،اور جو کسی کتاب کی زینت نہ بن سکے ان کی بھی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔زیرنظر کتاب میں انہیں مقالات ومضامین کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے،کتاب میں شامل تمام تحریریں چند ایک کے استثنا کے ساتھ کسی نہ کسی علمی مجلّہ یا رسالہ کی زینت رہی ہیں،ہم نے انہیں رسالوں اور مجلوں سے چن کر اکٹھا کیا ہے۔

اب آیئے کتاب کے مشمولات پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔

کتاب کا پہلا جلی عنوان ''فقہی مضامین'' ہے،اس عنوان کے تحت کل ۱۰ ؍مضامین ہیں،جس کا پہلا مضمون ہے۔

(۱) مسئلۂ عنین

یہ مضمون ۱۳۹۹ھ میں لکھا گیا ہے،اوراسی وقت کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا تھا، یہ کتابچہ والدصاحب کے اصل نام سے نہیں بلکہ تاریخی نام یعنی (مولانا) نعیم اختر (اعظمی) کے نام سے شائع ہوا تھا،اس وقت والد صاحب مدرسہ وصیۃ العلوم الہ باد میں کارتدریس انجام دے رہے تھے۔اس مضمون کا محرک محکمۂ شرعیہ مئو ناتھ بھنجن کی جانب شائع کیا گیا ''ایک اہم فیصلہ'' نامی رسالہ ہے،جس میں ایک قصیرالذکر شخص کے تفریق نکاح کا قضیہ زیر بحث ہے،جواصولی اور شرعی اعتبار سے غلط تھا،اورمزیداس رسالہ میں قاضی مجاہدالاسلام صاحب کا ایک تائیدی مقالہ بھی تھا،جس میں قاضی صاحب نے اس شخص کوملحق بالمجبوب قراردے کرمحکمہ شرعیہ کے اس غلط فیصلہ کی تائید کی تھی۔یہ مقالہ اسی رسالہ کے تعاقب میں لکھا گیا ہے،اوراصول فقہ اورفقہا کے اقوال کی روشنی میں اس رسالہ کا احتساب کیا گیا ہے۔

اصلاً تو یہ رسالہ رد میں ہے مگر چونکہ یہ تردید فقہ ہی سے متعلق ہے اوراس کے غالب مشمولات فقہ ہی کے سلسلے کے ہیں،اس لئے اس کوفقہی مضامین کے تحت رکھا گیا ہے۔

(۲) لفظ اللہ میں مد کی تحقیق

اس مضمون میں اذان کے اندرلفظ اللہ میں مد کی تحقیق فقہ اورتجوید کی روشنی میں کی گئی ہے، کہ آیا مد جائز ہے یانہیں؟اوراگر جائز ہےتو ''اللہ اکبر'' کے کس لفظ میں جائز ہے؟اوراگر ناجائز ہےتو وہ کون سے الفاظ ہیں؟۔

زمانۂ قریب کے مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب نوراللہ مرقدہ اذان میں مدصوت (آواز کو دراز کرنا) کو ناجائز کہتے تھے،اوراس پر شدت سے نکیر فرماتے تھے۔یہ مضمون اسی نظریے کا احتساب ہے،اس مضمون کا اسلوب وانداز تردیدی نہیں خالص معروضی ہے۔یہ مضمون پہلی مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمودالحسن صاحب گنگوہیؒ کی توجہ وعنایت سے ۱۳۹۹ھ میں مکتبہ نعمانیہ دیوبند سے کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا تھا،پھر دوبارہ شائع کرنے کا والد

صاحب نے ارادہ کیا اور دوسری اشاعت کے لئے ایک مقدمہ بھی لکھا، ہم نے اسی دوسری اشاعت سے مقدمہ سمیت مضمون کو اس کتاب میں شامل کرلیا ہے۔

(۳) نوٹوں کی شرعی حیثیت اوران سے قرض کی ادائیگی کا مسئلہ

اس مضمون میں نوٹ کی شرعی حیثیت اوران سے قرض کی ادائیگی کے مسئلہ سے مدلل بحث کی گئی ہے۔ شریعت نے ثمن کے طور پر سونے اور چاندی کو متعین کیا ہے، کاغذی نوٹ اور گلٹ کے سکوں کی شریعت کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے، مگر فی زماننا سارے معاملات انہیں نوٹوں اور سکوں سے کئے جاتے ہیں، اسی لئے ایک زمانہ میں بعض مفتیان کرام نے یہ فتوی دیا تھا کہ قرض میں دیئے گئے نوٹ کی تعداد اور گنتی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کیوں کہ وہ بے حیثیت ہیں، بلکہ اس مالیت کا اعتبار ہے جو ان نوٹوں کے عوض سونے یا چاندی کی صورت میں ملے گی، لہٰذا قرض کے واپسی کے وقت نوٹ کی تعداد قابل اعتنا نہیں ہوگی بلکہ وہ مالیت دیکھی جائے گی جو قرض دیتے وقت ان نوٹوں کی تھی۔

اس مضمون میں اسی رجحان اور نظریے کے عکس سے بحث کی گئی ہے اور بدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ نوٹ کی حیثیت ثمن ہی کی ہے، اور بوقتِ واپسیٔ قرض اس کی تعداد معتبر ہوگی، مالیت نہیں۔

(۴) دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت

یہ مضمون اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے منعقد دوسرے فقہی سیمینار میں پیش کیا گیا تھا، اس مضمون میں دارالحرب میں ربوی معاملات کی نوعیت اوران کی شرعی حیثیت کو فقہاء کرام خصوصاً فقہاء احناف کی آرا کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، نیز ضمناً ہندوستان جیسے ملک کے سلسلے میں بھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی عبارات کی روشنی میں بحث کی گئی کہ آیا ہندوستان دارالاسلام ہے یا دارالحرب، یا ان کے علاوہ کچھ اور؟

(۵) گاؤں میں جمعہ

جمعہ کے جواز کی شرطوں میں سے ایک شرط مصر جامع ہے، اسی شرط کی وجہ سے گاؤں

میں جمعہ کے عدم جواز کا فتوی ہے، مصر جامع کی جو تعریف فقہا نے لکھی ہے اس کے اعتبار سے ہندوستان کا کوئی شہر یا قصبہ مصر جامع کا مصداق نہیں بن سکتا (مصر جامع کی تعریف مضمون میں ملاحظہ فرمائیں) لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں چھوٹے گاؤں اور چند دیہات کو چھوڑ ہر جگہ جمعہ کے جواز کا فتوی ہے۔

زیر نظر مضمون میں متقدمین ومتأخرین فقہا کی تصریحات کی روشنی میں مصر جامع کی تعریف اور اس کے مصداق سے بحث کی گئی ہے، نیز ہندوستان میں اس شرط پر عمل ہے یا نہیں؟ اس کو دکھایا گیا ہے، اور معروضی انداز میں حضرت نانوتوی کے ایک مکتوب (جس سے اس سلسلے میں ان کے رجحان کا پتہ چلتا ہے) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی تصریحات سے گاؤں میں جمعہ کے جواز کو پیش کیا گیا ہے، اور اخیر میں گاؤں میں جمعہ کی ضرورت، فوائد اور اس کے مضمرات کو سامنے رکھ کر حضرات اہل فتاوی کو دعوت فکر دی گئی ہے۔

(۶) شرعی پنچایت یا قاضی

عامۃ المسلمین یا ارباب حل وعقد کی متفقہ رائے سے تقرر قاضی کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ کچھ سالوں قبل ارباب فتاوی اور اہل علم کے درمیان زیر بحث تھا، اسی تعلق سے مولانا عبدالحلیم صاحب گورینی نے اپنے پرچے ''ریاض الجنۃ'' میں ایک کالم اس موضوع کے لئے خاص کر دیا تھا، جس میں مولانا کی جانب اس سلسلے میں کئے گئے سوال کا جواب شائع کیا جاتا تھا، سوال یہ تھا۔ ''کیا ہندوستان جیسے ملک میں فقہ حنفی میں عامۃ المسلمین کی طرف سے تقرر قاضی کا دعوی درست ہے''؟۔

یہ مضمون مولانا کے اسی استفتا کا جواب ہے، اس مضمون میں مدعیان جواز کے دلائل و استدلالات کی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ عدم جواز کے ثبوت اور دلائل کے لئے دوسری قسط کی ضرورت تھی، مضمون کے اخیر میں باقی آئندہ بھی لکھا ہوا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسری قسط لکھی ہی نہیں گئی۔

(۷) زکوۃ

پانچواں فقہی سیمینار جو مسائل زکوۃ سے متعلق تھا اس میں یہ مقالہ پیش کیا گیا تھا، اس

مقالہ میں شرائط زکوٰۃ اور اس کے ضمن میں متعدد جزئیات سے بحث کی گئی ہے، مثلاً ایسا مال تجارت جس کی رقم پیشگی ادا کر دی گئی ہو تو زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ بائع پر یا مشتری پر؟ ڈپوزٹ کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ حلال وحرام مال مخلوط غیر ممتاز ہو تو زکوۃ دینے کی کیا صورت ہوگی؟ مشترک تجارت میں زکوۃ اجتماعی طور پر نکالنی ہوگی یا انفراداً؟ ہیرے جواہرات پر زکوۃ کس صورت میں ہوگی؟ اور کس صورت میں نہیں ہوگی؟ شیرز کی زکوۃ اور ان کی مالیت کا تعین کیسے ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ، دور حاضر کے پیدا شدہ ان مسائل پر اصول شرع کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

(۸) فی سبیل اللہ

یہ مقالہ بھی پانچویں فقہی سیمینار جو کہ مصرف زکوۃ فی سبیل اللہ سے متعلق تھا، پیش کیا گیا تھا۔ قرآن کی رو سے مصارف زکوۃ آٹھ ہیں، ان میں سے ایک مصرف فی سبیل اللہ ہے۔ فی سبیل اللہ کا مصداق کیا؟ اور اس سے صرف مجاہد فی سبیل اللہ مراد ہیں یا ان کے علاوہ دیگر کار خیر میں مشغول افراد بھی مراد ہیں؟ اس سلسلہ میں احادیث اور دور صحابہ کا عرف کیا کہتا ہے؟ فقہا کی آراء اور اجماع امت سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ وغیرہ جیسے امور میں تحقیق پیش کی گئی ہے۔

(۹) مصرف زکوۃ۔ ایک اہم استفتا کا جواب

ماہنامہ جامعۃ الرشاد ۱۹۹۲ء میں مولانا شہاب الدین ندوی صاحب نے مصرف زکوۃ بالخصوص فی سبیل اللہ کے مصداق کے سلسلے میں ایک لمبا چوڑا استفتا شائع کیا تھا، استفتا کیا تھا گویا ایک طرح کا فتوی تھا، جس میں یہ عندیہ پیش کیا گیا تھا کہ فی سبیل اللہ کے مصداق صرف مجاہد اور منقطع الحاج نہیں ہیں، بلکہ یہ عام ہے، اور تمام کار خیر اس میں شامل ہیں، حتی کہ وہ امور خیر بھی جن میں زکوۃ کی رقم کسی فرد خاص کی ملکیت میں نہیں جاتی، بلکہ کسی ادارہ یا تنظیم کے حوالے ہوتی ہے، وہ بھی اس میں شامل ہیں، جیسے دینی پروگرام، اور وہ تنظیمیں جو امور خیر میں لگی ہوئی ہیں ان کے پروگرام یا اشاعت کے لئے زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، گویا کہ انہوں نے ملکیت کی شرط کو کالعدم قرار دے دیا۔

یہ مضمون اسی استفتا کے تعاقب میں لکھا گیا ہے، مستفتی کی دی ہوئی دلائل کا محاکمہ اور ان کے اس نظریہ کی بدلائل تردید کی گئی ہے، اور ان کو اجماع امت سے عدول پر تنبیہ کی گئی ہے۔

یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے، والد صاحب کے مسودات سے ہم کو یہ حاصل ہوا ہے۔

(۱۰) مسئلہ رفع یدین

رفع یدین کا مسئلہ کوئی جواز یا عدم جواز کا مسئلہ نہیں، اس میں صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ کا اختلاف ہے، مگر غیر مقلدیت نے اس فرعی مسئلہ کو اصولی اور نماز کے لئے مدار صحت بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ مضمون ایک غیر مقلد ہی کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے معرض وجود میں آیا، اس میں احادیث وآثار، صحابہ وتابعین اور فقہاء امت کی آرا کی روشنی میں عدم رفع یدین کو ثابت کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا جلی عنوان ''تعارف کتب حدیث'' ہے، اس کے تحت کل پانچ مضامین ہیں، یہ مضامین محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نوراللہ مرقدہ کی تحقیق و تحشیہ اور تعلیق سے مزین کتب احادیث کا تعارف ہیں، یہ سارے مضامین المآثر کے ابتدائی شماروں میں شائع ہوئے تھے۔

(۱) مسند حمیدی۔ حضرت محدث اعظمی کا ایک عظیم کارنامہ

امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر قرشی اسدی حمیدی مکی حدیث کے بلند پایہ اور عظیم المرتبت حفاظ میں سے ایک ہیں، سفیان بن عیینہ اور امام شافعی کے شاگرد ہیں، مسند حمیدی ان کی مشہور تصنیف ہے، یہ کتاب نایاب تھی، محدث کبیر کی علمی لگن اور حدیث کے ساتھ ان کے غیر معمولی شغف نے اس کے مخطوطات کو تلاش کیا اور حواشی وتعلیقات سے مزین کرکے شائع کیا۔

اس مضمون میں امام حمیدی کا تعارف، ان کے متعلق کبار علما کی رائے، مسند کے مخطوطات کی تعداد، محدث کبیر کے کام کی نوعیت، بصیرت کے لئے کچھ مثالیں اور ان پر رسالہ ''محدث'' بنارس کی جانب لگائی گئی تہمت بے جا اور اس کا جواب بہترین اسلوب اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲) کتاب الزہد والرقائق۔ حضرت محدث اعظمی ایک عظیم خدمت حدیث

امام الزہاد والمتقین حضرت عبداللہ بن مبارک کی بابرکت تصنیف ''کتاب الزہد والرقائق'' زہد وتقوی کے موضوع پر اپنے رنگ کی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ والی قطر

سے محدث کبیر کو ہدیۃً ملا تھا، جس کی بنیاد پر آپ نے اس کتاب کی تحقیق وتحشیہ اور اشاعت کا ارادہ کیا۔

اس مضمون حضرت عبداللہ بن مبارک کا تفصیلی تعارف، قلمی نسخوں کی تعداد اور ان کا تعارف مع اسماء رواۃ کے، محدث کبیر کی تحقیق کا منہج اور اس کے مراحل مع مثال کے درج ہیں۔

(۳) المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ نے ''المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیۃ'' کے نام سے مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عمرو، مسند مسدد، مسند احمد بن منیع، مسند ابی بکر ابن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید اور مسند حارث بن اسامہ کے زوائد کو یعنی ان روایتوں کو جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تتبع وتلاش کر کے جمع کیا، نیز ان کے ساتھ مسند ابویعلی کی ان روایتوں کو بھی شامل کرلیا جو ''مجمع الزوائد'' میں علامہ ہیثمی سے چھوٹ گئی تھیں، اور مسند اسحاق بن راہویہ کا ناتمام مجموعہ ان کے پاس تھا اس کے زوائد کو بھی شامل کرلیا۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر محدث کبیر علیہ الرحمہ کو اس کے مخطوطہ کی تلاش بہت شدت سے تھی، ہندوستان وحجاز کے متعدد کتب خانوں میں بارہا تلاش کیا، بالآخر کامیابی مل ہی گئی۔

اس مضمون میں کتاب اور صاحب کتاب کا مفصل اور دلچسپ تعارف، محدث کبیر کی تلاش وجستجو کی داستان، قلمی نسخوں کا تعارف، محدث کبیر کی تحقیق وتعلیق کا نہج اور مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

(۴) کشف الاستار عن زوائد البزّار

امام ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار البصری کی کتاب ''مسند کبیر معلل''، جس کا نام ''البحر الذخار'' ہے، کے زوائد کو حافظ نورالدین ہیثمی نے ''کشف الاستار'' کے نام سے جمع کیا ہے، اس کتاب کا ایک عمدہ قلمی نسخہ محدث کبیر علیہ الرحمہ کو کہیں سے دستیاب ہوگیا، اس کو بنیاد بنا کر تحقیقات وتعلیقات کے بعد شائع کیا۔

اس مضمون میں امام بزار کا مختصر تعارف ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد علامہ نورالدین ہیثمی قاہری کا مفصل ذکر خیر ہے، جس میں ان کے استاذ حافظ زین الدین عراقی سے

ان کے تعلق خاطر کو خاص طور سے بیان کیا گیا ہے۔مخطوطہ کا تعارف، تحقیق وتعلیق کا انداز اوراس کے نمونے، مخطوطہ میں کتابت کی غلطی اوراس کے علاوہ دیگر اغلاط اور محدث کبیر کے مواخذات کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔

(۵)موَطاامام محمد۔تعارف واہمیت

موَطاامام محمد کی اہمیت وحیثیت اہل علم پر مخفی نہیں ہے، یہ کتاب درحقیقت امام مالک علیہ الرحمہ کی مرتب کردہ موَطاہے، جس کی روایت امام محمد نے کی ہے، یہ کتاب ہر زمانہ میں اہل علم کے مابین متداول رہی ہے، مگر قدیم طرز طباعت کے ساتھ۔مولانا تقی الدین ندوی صاحب نے موَطاامام محمد مع ''التعلیق الممجد'' کو جدید طرز طباعت کے ساتھ شائع کیا، اوراس پر ایک مبسوط مقدمہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے لکھوایا، یہ مضمون اسی مقدمہ کا ترجمہ قدرے تلخیص کے ساتھ ہے۔

اس مضمون میں موَطا کا تعارف، اس کی اہمیت، اس کا زمانۂ تالیف، امام محمد کا تفقہ اور ان کی محدثانہ حیثیت، نیز امام محمد اوراصحاب رائے خصوصاً احناف کے سلسلے میں محض رائے کی وجہ سے محدثین کرام کی کرم فرمائیاں، بالفاظ دیگر محدثین کی زیادتی، اوراس کے اسباب وعلل اوراس کے نقصانات جیسی اہم چیزوں سے بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔

کتاب کا تیسرا جلی عنوان ''متعلقات حدیث'' ہے، اس کے تحت کل چار مضامین ہیں۔

(۱)استدراکات علمیہ

مسند امام احمد بن حنبل کو شیخ احمد محمد شاکر محدث مصر نے جب اپنی تحقیق وتعلیق اور بیش قیمت حواشی سے مزین کر کے شائع کرنا شروع کیا تو کئی جلدوں کی اشاعت کے بعد انہوں نے خوب سے خوب تر کی جستجو میں پوری دنیا کے علما کو دعوت نقد دی، محدث کبیر علیہ الرحمہ کو جب یہ جلدیں ملیں تو انہوں نے نہایت عرق ریزی سے اس کا مطالعہ کیا اور استدراک لکھ کر شیخ کے پاس بھیجا، جس کو انہوں نے بہت پسند کیا، اور محدث اعظمی کے شکریے کے ساتھ کتاب کی پندرہویں جلد میں شائع کیا۔

اس مضمون میں انہیں استدراکات کو اردو کا جامہ پہنا کر درج کیا گیا ہے،ان استدراکات سے محدث کبیر کا علمی رسوخ اور تبحر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔یہ مضمون تین قسطوں میں شائع تھا،اور ہر قسط میں الگ الگ تمہید ذکر کی گئی تھی اس لئے ہم اسی ترتیب پر باقی رکھا،اس کی پہلی قسط''ترجمان الاسلام'' بنارس کے محدث کبیر نمبر کے صفحات پر شائع ہوئی تھی،اور بقیہ دو قسطیں المآثر میں اشاعت پذیر ہوئیں۔

(۲)ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق حضرات محدثین کی اصطلاحات

احادیث کے مرتبہ ومقام کی وضاحت کے لئے محدثین کرام خاص خاص الفاظ استعمال کرتے ہیں،جس سے حدیث کی حیثیت واضح ہوتی ہے،جیسے لا اعرفہ،لا اصل لہ،لیس لہ اصل، موضوع وغیرہ وغیرہ۔محدثین جب ان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو ان کا لغوی معنی نہیں بلکہ اصطلاحی مفہوم جو ان کے عرف میں مشہور ہے،مراد ہوتا ہے،بسا اوقات ایک ہی لفظ کئی احادیث کے مرتبہ کو بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں،مگر سب کی مراد حدیث کے موقع ومحل کے لحاظ سے جدا ہوتی ہے،یہ ایک نازک اور دقیق علم ہے۔

یہ مضمون شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی اس تحریر کی روشنی میں لکھا گیا ہے جو انہوں نے حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمہ کتاب''المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع''پر تعلیقات کے لئے بطور مقدمہ کے لکھی ہے،اس میں صرف ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق محدثین کی اصطلاحات سے بحث کی گئی ہے،کہ کس موقع اور کس مناسبت سے محدثین کے کون سے لفظ سے کیا مراد ہوتا ہے؟۔

(۳) کتابت حدیث کے اصول وقواعد

حدیث کی حفاظت وصیانت کے لئے محدثین نے جو اصول وقواعد وضع کئے ہیں اور ان کو بروئے کار لانے کا جو اہتمام کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاید ہی کوئی ذی ہوش حدیث کی حفاظت میں مین میخ نکالنے کی جسارت کرے،حدیث اور حدیث سے متعلق کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے قواعد وضوابط نہ ہوں،اور قواعد وضوابط بھی ایسے سخت مگر معقول ہیں کہ ردی چیزیں خود

بخو داصل سے جدا ہو جائیں۔

اس مضمون میں کتابت حدیث کے سولہ قواعد بیان کئے گئے ہیں، جو کہ حافظ ابن صلاح کی کتاب ''مقدمہ ابن صلاح'' سے ماخوذ ہیں۔اس مضمون میں متعدد جگہ آپ کو اشارے اور نشانات ملیں گے، کمپیوٹر کی کتابت کی وجہ سے بعض اشارے بنانے میں دقت کا سامنا کرنا پڑا اور بعینہ اس جیسا اشارہ نہیں بن سکا، مگر پھر بھی ہم نے کوشش کر کے اس جیسا تو نہیں مگر اس کے قریب قریب بنانے کی کوشش کی ہے۔

(۴)محدث کبیر کی اسناد حدیث

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نوراللہ مرقدہ کی اسناد حدیث اس مضمون میں ذکر کی گئی ہے، ابتداء مضمون میں اسناد کی ضرورت ،اس کے مقام ومرتبہ، اس کی فضیلت اور اس کے فوائد کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد محدث کبیر کی سند بخاری ان کے استاذ مولانا کریم بخش سنبھلی سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک ذکر کی گئی ہے، اور تمام واسطوں کا کچھ کا اجمالی اور کچھ کا تفصیلی تعارف بھی مذکور ہے۔

یہ مضمون المآثر میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا، اور ہر قسط میں تمہید بھی مذکور تھی، اس لئے ہم نے سب کو باہم نہ ملا کر اسی ترتیب پر باقی رکھا ہے، پہلی قسط کا اوپر ذکر ہوا۔ دوسری قسط میں حضرت شاہ ولی اللہ کے استاذ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے لے کر شیخ محمد بن یوسف فربری امام بخاری کے شاگرد تک ہے۔

یہ تو بخاری کی سند کا ذکر ہوا، اس کے علاوہ محدث کبیر علیہ الرحمہ کو اپنے استاذ مولانا عبدالغفار صاحب علیہ الرحمہ سے بھی کتب احادیث اور ادعیہ ماثورہ کی سند واجازت حاصل تھی، تیسری قسط میں اسی سند کا تذکرہ ہے، مگر ناتمام ہے، اس قسط میں صرف مولانا عبدالغفار صاحب اور ان کے شیخ فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا تفصیلی ذکر خیر ہے، المآثر کی جلد میں اس قسط کے اخیر میں ''بقیہ آئندہ'' لکھا ہے مگر آئندہ کی جلدوں میں بعد کی قسطیں نہیں ہیں، نہ معلوم کن وجوہات کی بنیاد پر نہیں لکھی جاسکیں۔

تیسرا جلی عنوان ''متفرقات'' ہے، اس کے تحت کل چار مضامین ہیں۔

(۱)نقد برحقیقت رجم

زانی محصن کا رجم کچھ حدود قیود کے ساتھ شرع کا اجماعی مسئلہ ہے،متقدمین ومتاخرین میں سے کوئی قابل ذکرشخص رجم کا منکرنہیں ہے، کچھ سالوں پہلے جناب عنایت اللہ سبحانی صاحب سابق استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ نے ''حقیقت رجم'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے بزعم خود رجم کی تردید کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شرع میں زانی خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ کے لئے رجم نامی سزا کا کوئی ثبوت نہیں ہے،انہوں نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے تحریف،تبدیل اور تفسیر بالرائے حتی کہ من چاہے ترجمہ سے بھی گریز نہیں کیا،اور ایڑی سے چوٹی کا زور لگا دیا،ثابت تو کچھ نہیں ہوا مگر ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ان کی کتاب لطیفے کی کتاب بن گئی۔

اس مضمون میں اسی کتاب کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی اعجوبہ کاریوں کو دکھلایا گیا ہے۔

(۲)امام محمد اور اہل الرائے ہونے کی وحقیقت حیثیت

یہ مقالہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے ''التعلیق الممجد علی المؤطا الامام محمدؒ'' کے جدید ایڈیشن پر لکھے گئے مقدمہ سے مستفاد ہے،اس مضمون میں محدثین کی جانب سے امام محمد پر اہل الرائے کے الزام کا جائزہ لیا گیا ہے،اور محدثین کی اس رائے پر نقد اور فقیہ کے لئے حدود شرعیہ کے اندر رہ کر رائے اور قیاس کی ناگریزیت کو بیان کیا گیا۔

(۳)البانی شذوذہ واخطاءہ

شیخ ناصرالدین البانی دنیائے عرب کے مشہور عالم ہیں،حدیث کی متعدد کتابیں ان کی تحقیق وتعلیق اور حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں،عالم عرب میں ان کے علمی رعب کا یہ عالم تھا کہ ایک زمانہ میں ان کا ہر فرمایا ہوا مستند سمجھا جاتا تھا،ان کی تحقیق میں کسی کو قیل وقال کی مجال نہیں ہوتی تھی،مگر تا کجے؟ تحقیق تو تحقیق ہے،کسی کی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوسکتی،غلطی کا امکان بہر صورت رہتا ہے،اور البانی صاحب کی تحقیقات کا تو کیا کہنا؟۔

محدث کبیر علیہ الرحمہ نے جب ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان کی علمی غیرت نے یہ

گوارانہیں کیا کہ وہ ان کی فاش غلطیوں پر پردہ ڈال کرعلمی دنیا کو مغالطہ میں رکھیں، چنانچہ انہوں نے ''البانی شذوذہ واخطاءہ'' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا،جس میں البانی صاحب کی غلطیوں اورمغالطہ انگیزیوں کوظاہرکیا۔

یہ رسالہ عربی میں ہے،زیرنظرمضمون اسی کی قدرے تلخیص اورترجمانی ہے۔یہ مضمون المآثر میں متعددقسطوں میں شائع ہوا تھا،طوالت کی وجہ سے ہم نے اس کو دوحصوں میں تقسیم کردیا۔یہ مضمون خالص علمی مواد سے پرہےاورمحدث کبیرکی علمی گہرائی وگیرائی کا آئینہ دار ہے۔

(۴)سنن مؤکدہ کی اہمیت

یہ مضمون محدث کبیرعلیہ الرحمہ کے غیرمطبوعہ عربی رسالہ جوکہ سنت مؤکدہ کی اہمیت وفضیلت کے بیان پرمشتمل ہے،کی اردوترجمانی ہے،عالم عرب کےکوئی عالم شیخ محمدنورکلی نےکسی رسالہ میں سنت مؤکدہ کے سلسلے میں زہرافشانی کی اوراس کے مرتبہ کواس رسالہ میں گھٹا کر دکھانے کی کوشش کی،محدث کبیر نے اس رسالہ کو پڑھنے کے بعداپنی انصاف پسندطبیعت کے تقاضے کےمطابق یہ رسالہ لکھا،جوسنن کےسلسلے میں چشم کشااوربصیرت افروز ہے۔

کتاب کے اخیرمیں ''شیخو پور سے چھپرا تک'' کےعنوان سے ایک مضمون ہے،یہ حضرت مولانا کی بالکل آخری تحریر ہے،وفات سے کچھ دنوں پہلے ''سراج الاسلام خصوصی اشاعت حضرت مولانا زین العابدین صاحب نوراللہ مرقدہ'' کے لئے بطوراداریہ تحریرفرمایا تھا، بغیرکسی خاص تقریب کےمحض تبرکاً ہم نےاس کوبھی کتاب کا حصہ بنادیاہے۔

کتاب کےمشمولات کا تعارف مکمل ہوااب کچھ کتاب کےسلسلے میں بھی سن لیجئے۔

والدصاحب کےانتقال کے بعدمیرے دل میں داعیہ پیداہواکہ ان کےتعلق سے کچھ کام کرنا چاہئے،ان پرخصوصی نمبرکی اشاعت کی بات چل رہی تھی،مگروہ نمبرمسلسل التوا کا شکار ہوتا گیا،میراخیال یہ تھا کہ خاص نمبرکی اشاعت کے بعدکوئی کام کیاجائےتوبہترہے،مگرنمبرکے التوا کی وجہ سے میں گومگوکی کیفیت میں مبتلارہا،ذہن میں کچھ کرنے کا سوداسمایاہوا تھامگرکیا؟اس کی نوعیت واضح نہیں تھی۔استاذمحترم مولانا ضیاءالحق صاحب خیرآبادی اورمیرے بڑے بھائی اوراستاذمولانامحمد عابداعظمی صاحب کی راہنمائی نے یہ راستہ واضح کیا کہ مختلف رسالوں میں والد

صاحب کے منتشر پڑے مقالات ومضامین کے جمع وترتیب کا کام کیا جائے،سو میں نے جمع و ترتیب کا کام شروع کیا،اور انہیں دونوں حضرات کی نگرانی اور مشوروں کی روشنی میں یہ کام کیا۔ کتاب میں اگر کوئی حسن ہےتو صاحب مضامین کی برکت اوران دونوں حضرات کا فیض ہے،اور اگر کوئی عیب ہےاور یقیناً عیب نہیں عیوب ہوں گےتو یہ بلاشبہ میری نارسائیوں کی وجہ سے ہے

اس کتاب کی تیاری میں وسائل کی کمی کی وجہ سے کتابت سے لے کر پروف خوانی اور سیٹنگ تک سب کام میں نے خود انجام دیئے ہیں،اس لئے بہت زیادہ کمیوں اور کوتاہیوں کا رہ جانا مستبعد نہیں ہے۔کتاب میں جہاں کہیں کسی لفظ یا حرف کے چھوٹ جانے کا امکان یا کسی عبارت کے غلط ہونے شبہہ گزرا تو اہتمام کے ساتھ اصل سے مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کردی گئی ہے،نیز جس جگہ بھی زمانۂ قریب کے کسی ہندوستانی یا پاکستانی عالم کا ذکر آیا ہےتو حاشیہ میں ان کا مختصر سا تعارف بھی لکھ دیا گیا ہے تاکہ بالکل ناواقفیت نہ رہے۔

اخیر میں قارئین خصوصاً صاحبان علم سے گزارش ہے کہ یہ کتاب ایک ناتجربہ کاراور اس میدان میں نوآموز شخص کی کوششوں کا نتیجہ ہے،اس لئے بہت زیادہ غلطیاں اور فروگزاشت کے رہ جانے کا قوی امکان ہے،استدعا ہے کہ اس کتاب کے جمع وترتیب کے کام بنظر اصلاح اور حوصلہ افزائی دیکھا جائے تو بہتر ہے،اور کمیوں کوتاہیوں پر تنبیہ کردی جائے تو مزید بہتر ہو۔

بارگاہ ذوالجلال میں دعا ہے کہ اس کتاب کو صاحب مضامین کے حق میں صدقۂ جاریہ بنائے،اوران کی روح کو اعلی علیین میں جگہ مرحمت فرمائیں،اوران کی برکت سے ان صفحات کے مرتب اوراس کے معاونین پر بھی اپنے فضل وکرم اور رحمت ومہربانی کے دروازے کھول دے۔ آمین

محمد عرفات اعظمی

۲۰۱۵/۴/۱۴

مرتب کی جانب سے

والدمحترم (حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نوراللہ مرقدہ) کے حیات مستعار کی کل مدت ۶۳ر سال ہے، ان کی فرصت حیات اور ان کی علمی، عملی اور قلمی خدمات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عرصۂ حیات کے اتنے کم لمحات میں انہوں نے اتنی گونا گوں اور متنوع خدمات کیسے انجام دیں؟ خدا کی ذات مسبب الاسباب ہے، وہ جس سے چاہے، جتنا چاہے کام لے سکتی ہے، سہولت وآسانی اور صعوبت وپریشانی اس کے کارخانۂ اسباب سے متعلق ہیں، مگر پھر بھی انسانی دماغ تھوڑی دیر ٹھہر کر سوچنے پر ضرور مجبور ہوگا کہ یہ کیوں اور کیسے ممکن ہوا؟ ۶۳ر سال کی زندگی میں ۴۲ر سال بلا انقطاع تدریسی خدمات انجام دیں، مرحلۂ تصوف وسلوک طے کیا، ۳۵ر سے زائد تصنیفات وتراجم اور ترتیب دادہ کتابوں کی تعداد ہے، اس کے علاوہ وعظ وتذکیر اور تقریر و تعویذ کا بھی عوامی ایک طویل سلسلہ ہے، پھر راہ سلوک طے کرنے والوں کی راہنمائی اور ان کا تزکیہ نفس اور رجال سازی اور مردم گری کا وقت طلب کام وہ عرصۂ زیست کے ہر لمحہ میں کرتے رہے، اور پھر مزید یہ کہ ان امور کو انجام دینے کے لئے نہ کوئی تنظیم نہ کوئی تحریک اور نہ کوئی ادارہ قائم کیا، اور نہ کسی سے معاونت طلب کی، سارے کام تن تنہا بذات خود انجام دیا۔

ان کی زندگی کے لمحات اور ان کے کاموں کی تعداد دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فرصت حیات کے کسی لمحہ کو ضائع نہیں جانے دیا ہے، انہیں استعمال کیا ہے اور بہترین مصرف میں استعمال کیا ہے۔ اخیر عمر میں جب کہ ضعف وبیماری دونوں اپنے شباب پر تھے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اگر ذرا سی قوت محسوس کرتے تو فوراً لکھنے پڑھنے کے کام میں لگ جاتے شدید ضعف کے زمانے میں بھی میں نے انہیں متواتر دو دو تین تین گھنٹے بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا

ہے، کتاب پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے بارے میں تو کچھ مت پوچھئے، خود مجھ سے تاکیداً کہہ رکھا تھا کہ میرے سرہانے کچھ نہ کچھ کتابیں رکھ دیا کرو اور انہیں وقتاً فوقتاً بدلتے رہا کرو، تاکہ مطالعہ کا موضوع بھی کتاب کے ساتھ بدلتا رہے۔

قلمی میدان میں ان کے قلم نے اردو کے نثری ادب میں رائج تقریباً تمام صنف کو برتا ہے، ناول اور افسانہ کو چھوڑ کر تقریباً ہر میدان میں ان کے قلم نے اپنے واضح نقش پا کو چھوڑا ہے، تحقیق وتنقید سے متعلق آپ کو اسی کتاب کی دونوں جلدوں میں متعدد مضامین مل جائیں گے، سوانحی ادب میں ان کی بے مثال کتاب ''حیات مصلح الامت''، شخصی خاکے میں ''کھوئے ہوؤں کی جستجو''، آپ بیتی میں ''حکایت ہستی'' سفرنامہ میں ''بطواف کعبہ رفتم'' اور اس کتاب میں شامل مستقل ایک عنوان سفرنامے کا، مکتوباتی ادب میں ''حدیث دوستاں'' ترجمہ میں ''برکات زمزم'' مودودی صاحب اپنے افکار وخیالات کے آئینے میں'' اور ''اخلاق العلماء'' اور ان کے علاوہ ان کی بہت سی مطبوعہ تصنیفات میری اس بات کی منہ بولتی شہادت ہیں۔ ان کے مسودات میں ایک دو تحریریں ہمیں طنز ومزاح اور ظرافت سے متعلق بھی ملی ہیں جن کو اس جلد میں شامل کرنے کا ارادہ تھا مگر ضخامت کے بڑھ جانے کی وجہ سے اسے معرض التوا میں ڈالنا پڑا، ان شاء اللہ کسی اور مناسب موقع سے ان کی یہ تحریریں بھی شائع کی جائیں گی۔

زیر نظر کتاب والد صاحب کے مختلف مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے، مضامین کے علاوہ اس کتاب میں سفرنامے، تبصرہ وتعارف اور مقدمات وتقریظات بھی شامل ہیں۔ مقدمہ و تقریظ کے سلسلے میں عام مشاہدہ یہ ہے کہ جستہ جستہ دیکھ کر یا مصنف ومرتب پر اعتماد کر کے لکھ دیا جاتا ہے، لیکن والد صاحب کا طریقۂ کار اس سے جدا تھا، وہ اس کو ایک طرح کی شہادت سمجھتے تھے، اس لئے کسی کتاب پر مقدمہ وتقریظ لکھنے سے پہلے بالاستیعاب اس کو دیکھتے تھے، اس کے بعد ہی کچھ لکھتے تھے۔ ممبئی میں قیام کے زمانہ میں جب کہ ڈائلیسیس ہو رہی تھی، اور بہت زیادہ ضعف رہتا تھا، اس وقت ایک عالم نے اپنی کتاب کا مسودہ دیا، اور اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی، تو محض مسودہ دیکھ کر لکھ نہیں دیا بلکہ پورا مسودہ اس بیماری اور کمزوری میں پڑھا اور اس کے بعد لکھا۔

ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زیادہ احتیاط ہو تو مقدمہ ہو یا تقریظ اس کا حرف

حرف صداقت بن جائے گا، اور اس پر بے دغدغہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں کل چار سفرنامے شامل ہیں، جس میں دو تو محض نام کے سفرنامے ہیں، سفر اور مشاہدات سفر سے متعلق اس میں کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ دو اہم کتابوں کا تعارف ہے، ایک سفر کا ندھلہ، اور دوسرا التحفۃ مدینہ۔ مگر چونکہ عنوان سفر ہی کا لگا ہے اس لئے ہم نے ان دونوں کو سفر ناموں کے ذیل میں رکھا۔ سفر بنگلہ دیش کا پہلا حصہ مجلّہ الماثر کا اداریہ ہے، والد صاحب کا مستقل سفرنامہ لکھنے کا ارادہ تھا مگر شرمندۂ عمل نہ ہو سکا، اور دوسرا حصہ ہم نے ان کی ذاتی ڈائری سے قدرے حک واضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے، اس میں سفرنامے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اس میں بنگلہ دیش کے عالمی اجتماع اور وہاں کے مدارس کے متعلق مشاہدات وتأثرات ہیں۔

مجلّہ المآثر، ماہنامہ ضیاء الاسلام اور انوار العلوم کے لئے لمبے عرصے تک والد صاحب نے اداریئے تحریر کئے ہیں، جن میں سے بیشتر اداریئے ''حدیث درد دل'' میں شائع ہو چکے ہیں، مجلّہ الماثر کے کچھ اداریئے ایسے تھے جن کو بوجوہ والد صاحب نے اداریوں کے اس مجموعہ میں شامل نہیں کرنے دیا، ہم نے تمام اداریوں کو ''اداریئے'' کے عنوان کے تحت جمع کر دیا ہے۔

کتاب میں غالب تعداد مضامین ومقالات کی ہے، جن میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن سے بہت سے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے، یعنی ان میں تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار اور اس کے اعتدال سے تجاوز کرنے پر دلائل ومشاہدات کی روشنی میں گرفت کی گئی ہے، ممکن ہے کہ تبلیغی احباب کو یہ ناگوار گزرے مگر ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی بھی فرد یا جماعت غلطی سے مبرا نہیں ہے۔ صحابہ کرام کی جماعت اور ان کا طریقۂ کار ہی معیار حق وصداقت ہے، کیوں کہ وہ بارگاہ نبوت کے تربیت یافتہ اور وہاں سے مبعوث تھے، ان کے بعد کسی بھی تحریک یا جماعت کے صحیح ہونے کے لئے ان کے قائم کردہ خطوط پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے، ورنہ اس کے غلط ہونے میں کوئی دورائے نہیں ہے۔ رہی ازدیاد منفعت کی بات تو وہ کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، بہت سی تحریکیں مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے بظاہر بہت فائدہ ہے مگر حقیقت میں وہ صراط مستقیم سے منحرف ہیں۔ تبلیغی جماعت ابتداءِ کار میں بانی کے خلوص اور بار بار علما کی جانب مراجعت کی وجہ سے بالکل درست خطوط پر کام کر رہی تھی، مگر افسوس کی دیگر تحریکوں کی طرح عموماً

جیسا کہ تحریک کا مزاج ہوتا ہے یہ جماعت بھی غلو اور علما سے بے نیازی کی راہ پر چل پڑی، چونکہ یہ اپنی ہی جماعت کا ایک حصہ ہے، اس لئے درست راستے کی راہنمائی کے لئے بعض علما نے ....جنہیں خدا نے غیر معمولی دینی حمیت وغیرت عطا فرمائی ہے ...ٹوکا، اگرچہ ان کی تعداد ابھی تک بہت کم ہے، اس ٹوکنے کے نتیجے میں انہیں دنیاوی خسران اور تبلیغی احباب کی ناراضگیاں ہی ابھی تک ہاتھ لگیں ہیں مگر **الحق احق ان یقال**

پھر یہ کہ مثبت تنقید بھی ایک ضروری امر ہے، اور اس کا سلسلہ ابتداءِ اسلام ہی سے جاری ہے، احادیث وآثار کے اتنے بڑے ذخیرے میں جو آج جزم ویقین کے ساتھ کسی روایت کے بارے میں حدیث رسول ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے وہ اسی مثبت تنقید کی برکت ہے۔ تنقید اگر مثبت ہو اور خلوص کے ساتھ ہو تو یہ بہت بڑے خیر کا ذریعہ ہے، اس سے افساد نہیں بلکہ اصلاح کا دروازہ کھلتا ہے، الا یہ کہ جس پر تنقید کی جارہی ہو اس کی طبیعت میں ہی کجی اور فساد کا عنصر ہو تو ہر طرح کی تنقید فساد ہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ نقد کرنے والا کس انداز سے نقد کررہا ہے؟ انداز تنقید خود واضح کردے گا کہ ناقد کا مقصد کیا ہے؟ نہ یہ کہ ہماری محبوب و مالوف چیز پر فلاں نے نقد کیا ہے یا اس سے اختلاف کرتا ہے، اس لئے وہ ہمارا مخالف ہے، اس کی ہر بات بلاسوچے سمجھے اور بغیر جانچے پرکھے لائقِ رد ہے، اگر وہ کوئی بات کہتا ہے تو یہ سوچ کر کہ وہ ہمارا مخالف ہے اس کی بات کو سنا ہی نہ جائے، یہ طریقۂ کار غلط ہے۔ اختلاف اور مخالفت میں فرق ہوتا ہے، اختلاف دلائل کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اس میں خلوص اور خیر خواہی کا بھی پہلو ہوسکتا ہے، اور مخالفت بے جا ضد وعناد اور محض تحزب وعصبیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس لئے اختلاف کرنے والے کی بات کو غور سے سن کر یا پڑھ کر اور اس کے دلائل کو سنت وشریعت کی روشنی میں پرکھ کر اپنا محاسبہ کرنا چاہئے، اگر اس کی بات صحیح ہے تو اسے قبول کرنا چاہئے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

یہ طولانی تمہید محض اس لئے ہے تاکہ تبلیغی اکابر واحباب تبلیغی جماعت سے متعلق اس میں شامل مضمون دیکھ کر سیخ پا نہ ہوں، بلکہ اس کو پڑھیں اور لکھنے والے کی دردمندی، خیرخواہی اور سوز دروں کو محسوس کریں، اور یہ بھی دیکھیں کہ لکھنے والے نے ان کی مخالفت کی ہے یا دلائل کی

روشنی میں ان کے موجودہ طریقۂ کار سے اختلاف کیا ہے۔ ہر پڑھنے والا صاف طور سے محسوس کرے گا کہ یہ مخالفت نہیں بلکہ اختلاف ہے، جو انہی کی بہی خواہی اور خیر خواہی کے واسطے کیا گیا ہے،اس میں اختلاف کرنے والے کی نہ کوئی ذاتی منفعت ہے اور نہ کوئی دنیاوی غرض ہے، خالصۃً لوجہ اللہ تبلیغی احباب کی درست راہنمائی کی ایک کوشش ہے۔اللہ کرے یہ کوشش بارآور ہو۔

اخیر میں استاذ محترم مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی،مولانا محمد عابد صاحب اور مولانا محمد عامر صاحب کا ذکر خیر اور شکریہ ضروری ہے کہ انہیں حضرات کی راہنمائیوں،تعاون اور حوصلہ افزائی نے اس کتاب کو مرحلۂ تکمیل تک پہونچایا۔خدا کرے کہ صاحب مضامین کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی حسن قبولیت حاصل کرے اوران کے حق میں صدقۂ جاریہ بنے۔آمین

محمد عرفات اعظمی

۲۰۱۵/۵/۶

☆☆☆☆☆☆

مُقَدِّمَۃ

اللہ تعالیٰ نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ....کے ذریعہ دین حنیف ومذہب اسلام کو قیامت تک کے لئے مکمل فرمادیا۔اوراس میں رخنہ اندازی کو بند کرنے کے لئے ہرزمانے اور ہرعہد میں ایسے راسخین فی العلم اور کامل الفن علماء ربانیین کو پیدا کیا جن کے اندر تفقہ فی الدین کی غیر معمولی صلاحیت اور تجدیدی کارنامے انجام دینے کی اہلیت واستعداد ہوتی ہے، اور وہ مخالفین کے ذریعہ اسلام کے رخ روشن پر اڑائی ہوئی ہر گرد کو چھانٹ کر رکھ دیتے ہیں اور دین کے اندر ان کی دراندازی کے ہر دروازے کو بند کردیتے ہیں، انھیں علماء ربانیین کے لئے زبانِ رسالت سے یہ دعا وارد ہوئی۔**من یرد اللہ بہ خیراً یفقه فی الدین**

فقیہ اس عالم ربانی کو کہا جاتا ہے جسے علوم شریعت اور امور دینی میں منجانب اللہ تعمق اور رسوخ حاصل ہوتا ہے،اور ایسی ایمانی فراست وبصیرت انھیں نصیب ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ درستگی اور صواب کی طرف راہ یاب ہوتے ہیں، وہ کسی مسئلے یا فتوے کا گہرائی کے ساتھ کتاب وسنت وآثار صحابہ اور اقوال ائمہ کی روشنی میں جائزہ لے کر غلط اور صحیح میں امتیاز پیدا کرتے ہیں، اور ان کے پیش نظر صرف اللہ اور اس کے رسول کی مرضی ہوتی ہے اس سلسلے میں وہ کسی خوف لومۃ لائم اور اندیشۂ سود وزیاں کی پرواہ نہیں کرتے،اور پوری قوت کے ساتھ حق بات کو پیش کرتے ہیں۔

اخلاص وللٰہیت کے کے فقدان کے اس دور میں جبکہ قلوب کے اندر انا پرستی ونفسانیت روز افزوں ہے بہت کم ارباب علم خالص اللہ کے لئے نقد وتبصرہ کی ہمت وجرأت کر پاتے ہیں،

اور ایک بات کو درست سمجھتے ہوئے بھی اس کے اظہار سے گریز کر جاتے ہیں، جس کی وجہ سے خاصا التباس واشتباہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جب تک علماء اسلام کے اندر اخلاص وللٰہیت کی دولت بے بہا تھی وہ نقد پر خوش ہوتے تھے، اگر کسی نے ان کی غلطی پر متنبہ کیا تو اس کے شکر گزار ہوتے تھے، لیکن اب ایسا کم ہوتا ہے بلکہ بالعموم اب تنقید کا جواب تنقیص اور بسا اوقات تحقیر سے بھی دیا جاتا ہے اور معاملہ ابتذال تک بھی جا پہونچتا ہے، لیکن اللہ کے کچھ خاص بندے ہر دور اور ہر عہد میں ایسے رہے ہیں جنھیں اللہ سچائی اور حقیقت کے اظہار کے لئے غیر معمولی حوصلہ اور جذبہ عطا کرتا ہے، وھم قلیلون جداً

حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی رحمہ اللہ علیہ وجعل الجنۃ مثواہ درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کی دنیا میں ایک معتبر ومستند شخصیت تھے، اللہ تعالیٰ نے علوم اسلامیہ تفسیر وحدیث اور فقہ میں درک ورسوخ اور گہری بصیرت کے ساتھ زبان وادب اور تاریخ وغیرہ میں بھی غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا، ان سب کے ساتھ انھیں شستہ زبان اور رواں دواں قلم بھی عطا کیا گیا، ان خوبیوں کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصر علماء میں ایک ممتاز ونمایاں مقام رکھتے تھے۔ دینی غیرت وحمیت بھی ان کے اندر بے پناہ تھی، اشاعت دین واعلاء کلمۃ اللہ اور احقاق حق کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، جہاں انھیں محسوس ہوتا کہ دین میں تحریف وترمیم یا مسلک حق سے انحراف کی راہ اختیار کی جارہی ہے فوراً ان کا قلم حرکت میں آتا اور وہ پوری قوت سے اس غلط نظریئے کا احتساب کرتے، اس پر ان کے اداریوں کا مجموعہ ''حدیث درد دل'' گواہ ہے، ہر کوئی اسے دیکھ کر اس کی تصدیق کرسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب حضرت مولاناؒ کے مقالات کا مجموعہ ہے جس کا ایک بڑا حصہ فقہی مضامین سے متعلق ہے، ان کے مطالعہ سے حضرت مولانا کی غیر معمولی فقہی بصیرت اور دقت نظر کا پتہ چلتا ہے، وہ مروجہ فقیہ اور مفتی کی حیثیت سے معروف نہیں تھے، فتویٰ نویسی سے بھی ان کا تعلق بس ضرورت ہی کے وقت بقدر ضرورت ہی رہا، لیکن مسائل فقہیہ سے ان کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ فتاویٰ شامی، بدائع الصنائع اور البحر الرائق وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا۔ مدرسہ دینیہ غازی پور یا مدرسہ شیخ الاسلام سے جاری ہونے والا کوئی بھی فتویٰ ان کی تائید وتصویب کے

بغیر نہیں بھیجا جاتا تھا۔ان فقہی مضامین میں سے بیشتر مضامین قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کی ایما پر لکھے گئے اور بحث ونظر یا ان کے فقہی مجلّہ میں شائع ہوئے ،حضرت مولانا کے نزدیک حضرت قاضی صاحب مرحوم کی بڑی اہمیت تھی،اس لئے ان کے حکم کو حتی المقدور پورا کرتے تھے، ورنہ جیسا کہ مرتب موصوف نے لکھا کہ وہ اصلاً تدریس کے آدمی تھے صرف ضرورت ہی کی بنا پر قلم اٹھاتے تھے،اس بات کو حضرت مولانا نے خود متعدد جگہوں پر لکھا ہے،اس کتاب کا پہلا مضمون جو محکمہ شرعیہ کے ایک فیصلہ پر محاکمہ ہے،وہ بھی حضرت مولانا نیاز احمد صاحب جہانا گنجیؒ کے حکم پر لکھا گیا۔اس کے بارے میں حضرت مولانا لکھتے ہیں:

> میرا ان (حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب) سے پہلا سابقہ اختلاف سے ہوا۔ انھوں نے ایک فقہی مسئلہ پر مبسوط مقالہ لکھا تھا،جس کے بنیادی نقطۂ نظر سے ایک بڑے عالم کو اختلاف تھا،وہ خود صاحبِ قلم نہ تھے،انھوں نے مجھے حکم دیا کہ اس مسئلہ پر لکھو،میں نے اس کے رد میں ایک مفصل مضمون لکھا،وہ قاضی صاحب نے بھی پڑھا،اس میں کہیں کہیں لہجہ میں شوخی آگئی تھی،ایک صاحب نے جو میرے خاص دوستوں میں ہیں،نقل کیا کہ قاضی صاحب اس مضمون کی تحسین کررہے تھے،البتہ لب ولہجہ کی شوخی کی ہلکی سی شکایت کررہے تھے،میں یہ سن کر بہت شرمندہ ہوا،اس واقعہ کے چند ہی روز بعد ڈیری اون سون کے ایک جلسہ میں قاضی صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا،میں تو شرم سے گڑا جارہا تھا ،مگر قاضی صاحب نے اشاروں کنایوں میں بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا،اطمینان سے بیٹھ کر میری تقریر سنی،اس وقت پہلے فقہی سیمینار کی تاریخ متعین ہوچکی تھی،مجھے حکم دیا کہ اس میں حاضر ہوں،ان تاریخوں میں میرے سر پر بعض ناگزیر مشغولیتیں تھیں،میں نے عذر کرنا چاہا ،مگر قاضی صاحب کی گفتگو،ان کا جذبۂ دل ان کے حکم دینے کا انداز ایسا نہ تھا کہ اسے آسانی سے کوئی ٹال دے،میں نے ہاں کرلی،اور کسی نہ کسی طرح سیمینار میں پہونچ ہی گیا،قاضی صاحب مجھے دیکھ کر حد درجہ خوش ہوئے،اور ایسے ایسے انداز سے انھوں نے مسرت کا اظہار کیا کہ میں حیرت میں پڑ گیا کہ مجھ جیسے معمولی فرد کی شرکت سے اتنے بڑے لوگ بھی اس طرح خوش ہوتے ہیں؟فقہی سیمینار میں شرکت تو میں نے کرلی،لیکن بعض حالات کی وجہ سے میں نے اس سے اپنے لئے کنارہ کشی ہی بہتر سمجھی۔

اس مضمون میں حضرت مولانا نے فسخ نکاح کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور محکمہ شرعیہ کے قاضیوں کے فیصلہ کو فقہی اصول وقواعد کی روشنی میں دلائل وشواہد کے ساتھ غلط قرار دیا ہے، اس مضمون سے مولانا کی وسعت نظر اور دقت نگاہ کا پتہ چلتا ہے، اور یہ تحقیقی جائزہ کسی ذاتی بنیاد یا مخالفت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ ایک حق گو وحق پسند عالم کی فقہی رائے ہے، جس کو پڑھ کر خود قاضی صاحب نے اس کی تحسین کی، کسی مضمون کی تردید میں قلم کے اندر شدت کا آجانا غیر معمولی بات نہیں۔

اسی طرح نوٹوں کی شرعی حیثیت......۔دارالحرب میں ربوٰ کی شرعی حیثیت۔زکوٰۃ، فی سبیل اللہ اور مصارف زکوٰۃ وغیرہ مضامین کو پڑھ کر حضرت مولانا کی فقہی بصیرت اور مآخذ پر وسعت نظر اور حسن استدلال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ کی تحقیق کردہ کتب حدیث کا اس قدر عمدہ اور جامع تعارف کرایا ہے کہ اجمالاً کتاب کا پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے، خصوصاً **الالبانی شذوذہ واخطأہ** کی تلخیص وترجمانی، کے مطالعہ سے صاحب مضمون کی قوت اخذ اور مطالب کو سہل انداز میں پیش کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔اسی طرح ''نقد بر حقیقت رجم'' کو پڑھ کر لکھنے والے کی غیرت ایمانی وحمیت دینی صاف طور سے محسوس ہوتی ہے۔

اس مجموعے میں چونکہ مختلف موضوعات پر مضامین ہیں، ان سے بیک وقت حضرت مولانا کی مختلف حیثیتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اوران کے مختلف اسلوب کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، کہ فقہی مضمون کے لئے کیا طرز واسلوب ہو، کتابوں کے تعارف اور دیگر علمی موضوع کے لئے کیا انداز تحریر ہو، لیکن ان سب میں قدر مشترک جو چیز ہے وہ لکھنے والے کا جذبۂ خلوص اور اللہ ورسول اور دین اسلام کے تئیں اس کی محبت ووفاداری ، کہ یہ تمام مضامین کا بنیادی جوہر ہے۔جہاں جہاں لکھنے والے کو محسوس ہوا کہ یہاں قدم صراط مستقیم سے ہٹ رہا ہے اور کسی دوسرے رخ پر جارہا ہے وہاں اس نے سخت احتساب کیا اور کسی قسم کی مداہنت نہیں برتی۔ یہ کتاب بطور خاص حضرات اہل علم کے لئے ہے، اسے پڑھ کر انھیں حضرت مولانا کے بلند علمی مقام کا صحیح اندازہ ہوگا۔

حضرت مولانا کی حیات میں ان کی ان تحریروں کو چھوڑ کر جو خالص علمی موضوع پر تھیں تقریباً سبھی تحریریں راقم الحروف کی سعی وکوشش سے زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں ،حضرت کے وصال کے بعد ارادہ ہوا کہ مطبوعہ تحریروں کے علاوہ وہ تمام تحریریں......خواہ وہ کسی بھی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں......یکجا کر کے شائع کردی جائیں،حضرت کے وصال کے بعد طبیعت میں جو شکستگی اور افسردگی پیدا ہوئی اس نے مجھے اس قدر بجھا دیا کہ کچھ کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا تھا،اس لئے یہ کام پڑا رہا،لیکن دل کبھی اس کے خیال سے غافل نہیں رہا، میں نے حضرت مولانا مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے عزیزم مولوی محمد عرفات سلّمہٗ کو اس کی طرف توجہ دلائی اور اس سلسلے میں جو ممکنہ تعاون مجھ سے ہوسکتا تھا میں نے کیا، ماشاءاللہ عزیز موصوف نے محنت شاقہ برداشت کر کے بہت کم وقت میں اور میری توقع سے کہیں زیادہ بہتر طور پر اس کام کو انجام دیا،ان کے کام کو دیکھ ان کے لئے دل سے دعا نکلی اور وہ حضرت کے تمام متعلقین ومتوسلین کی دعا اور شکریے کے مستحق ہیں ان کی سعی وکاوش سے یہ علمی خزانہ جو مختلف رسائل وجرائد اور مسودات میں پڑا ہوا تھا منظر عام پر آ گیا،فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء

دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ باری تعالیٰ حضرت مؤلف مرحوم کی دیگر تحریروں کی طرح اس کو بھی حسن قبول کی دولت سے مالا مال فرمائے اور ان کے لئے رفع درجات کا سبب بنائے، نیز عزیز مرتب کو ان کی اس محنت وکاوش کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔آمیــــن یــــارب العالمین بحرمة سید المرسلین

ضیاءالحق خیرآبادی
۸؍رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
۲۸؍اپریل ۲۰۱۵ء سہ شنبہ

مُقدّمہ

حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ ایک جامع الجہات شخصیت کے مالک تھے، وہ بیک وقت بہترین معلم ومربی ،سحر نگار انشاپرداز وادیب ، بے مثال مقرر و خطیب اور ایک طرف دین وشریعت کے راز دار تھے تو دوسری طرف سلوک وطریقت کے نکتہ داں اور اداشناس بھی تھے۔خود ان کے بقول کہ انھیں سب سے کم مناسبت قرطاس وقلم سے ہے، اس کے باوجود ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دو درجن سے زائد ہے، جن میں سوانح، شخصی خاکے سفر نامے، آپ بیتی، مکاتیب، فقہی مضامین، تبصرے اور مقدمے وتقریظات سب شامل ہیں، بعض کتابیں تو چھ سات سو صفحات پر مشتمل ہیں، جب حضرات اہل ذوق ان کی تحریر پڑھتے ہیں تو ان کے طرز واسلوب پر بے ساختہ ان کی زبانوں پر داد وتحسین اور ستائش وآفریں کے کلمات آجاتے ہیں۔

میرے دوست مولانا محمد اللہ قاسمی (شعبہ انٹرنیٹ دار العلوم دیوبند) حضرت مولانا کے اسلوب نگارش کے متعلق رقم طراز ہیں:

> طرز نگارش نہایت شستہ، سبک اور بہتے پانی (اور گرتے ہوئے آبشار) کی مانند رواں دواں تھا۔انداز تحریر سے قادر الکلامی اور کہنگی کی جھلک صاف محسوس ہوتی تھی، جس میں کلاسیکی خوبیوں کے ساتھ علمی وادبی چاشنی بھی برابر موجود ہوتی تھی۔انھیں ٹھیٹھ اردو الفاظ کے برمحل استعمال پر بڑی قدرت تھی۔
>
> مولانا بلا کے ذہین اور مطالعہ کے رسیا تھے۔ بڑے ثاقب الذہن اور اخاذ طبیعت کے مالک تھے۔ایسا لگتا ہے کہ جس طرح وہ مطالعہ سے علوم ومعارف کے جواہر اخذ کرتے تھے اسی طرح

وہ طرز واسلوب اور زبان وبیان کی خوبیوں کے موتی بھی سمیٹتے جاتے تھے جو دوران تحریر اُن کے قلم سے چھن چھن کر قرطاس وقلم کی سلامی قبول کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی تحریر کو پڑھنے والا ہر شخص اس کی ہو بہو تصدیق کرے گا۔

یہ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے مقالات کی دوسری جلد ہے، اس کی پہلی جلد پر اس خاکسار اپنے تاثرات تحریر کئے تھے۔ اس کو وہاں ملاحظہ کر لینا چاہئے۔ جلد اول کے تقریباً سبھی مقالات علمی وفقہی نوعیت کے تھے اور اس جلد میں ان مقالات کو اکٹھا گیا ہے جو مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ جس موضوع پر بھی کچھ لکھا گیا اس کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی، جیسے قاضی قاطہر مبارکپوریؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' کا تعارف اور اس کی تلخیص پیش کی گئی، اس مضمون کو پڑھ کر پوری کتاب کا خلاصہ سامنے آجاتا ہے، اسی طرح ایک مضمون ہے ''مولانا زوار حسین صاحب بحیثیت مترجم'' مولانا موصوف پاکستان کے ایک صاحب نسبت بزرگ اور صاحب قلم عالم وفقیہ تھے، حضرت مولانا نے ان کی مترجمانہ خصوصیت کو ذکر کرنے سے پہلے نفس ترجمہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اسے ضرور ملاحظہ کرنا چاہئے، اس سے حضرت مولانا کی اس موضوع پر گہری نظر اور بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

''ترجمہ کا کام ایک مشکل کام ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا بڑی مہارت اور حذاقت کو چاہتا ہے، طبع زاد تصنیف میں مصنف آزاد ہوتا ہے، جن معلومات کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے، انھیں اپنی تعبیر، اپنے اسلوب اور اپنے انداز میں ڈھال لیتا ہے، اختصار کے ساتھ ہو یا تفصیل کے ساتھ! ایجاز کے ساتھ ہو یا اطناب کے ساتھ!

لیکن ترجمہ کرنے میں وہ دوسرے کا پابند ہوتا ہے، اسے مصنف کی زبان میں مصنف کی مراد سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے، پھر ضروری ہوتا ہے کہ اس کی مراد کو بعینہ دوسری زبان میں منتقل کرے، اس پابندی کو نبھانے کے لئے مترجم کو

(۱) دو زبانوں کا ماہر ہونا ضروری ہے، ایک اصل کتاب کی زبان کا، دوسرے ترجمہ والی زبان کا۔ ہر ایک کے اسالیب اور تعبیرات سے وہ کما حقہ واقف ہو، تاکہ مصنف کی مراد اور اس

کے مقصد کو سمجھ سکے، اور پھر دوسری زبان کی اسی تعبیر میں اسے ادا کرے، جو تصنیف کے اسلوب وتعبیر کے مترادف ہو، اگر اس نے مصنف کا مقصد نہیں پایا تو ترجمہ غلط ہوگا، اور اگر اس کا مقصد تو پا گیا، مگر ترجمہ کی زبان میں اس کی تعبیر نہ پا سکا تو مطلب الجھ کر رہ جائے گا۔

(۲) اسی طرح ہر فن میں کچھ اصطلاحی الفاظ ہوتے ہیں، اصطلاحات کا ترجمہ اور مشکل ہوتا ہے، اصل کتاب کی اصطلاحات کو سمجھنا، پھر اس کے مفہوم کو دوسری زبان میں ادا کرنا بغایت دشوار ہوتا ہے، بالخصوص اگر اس کی مترادف اصطلاح دوسری زبان میں موجود ہو، تو اس کی تلاش اور اس کا استعمال بہت وسعت نظر اور دقت نظر کو چاہتا ہے۔

(۳) ہر زبان کا نحوی وصرفی قواعد اور ترکیب الفاظ کے اعتبار سے ایک خاص مزاج اور اسلوب ہوتا ہے، ترجمہ میں اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے، ترجمہ اسی ترکیب واسلوب کے مزاج میں ہو، نرا لفظ کے نیچے لفظ کا ترجمہ، جیسا کہ درس وتدریس میں کبھی بضرورت اختیار کرنا پڑتا ہے، تصنیف میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۴) ہر زبان میں کلمات کے درمیان ربط کے لئے کچھ حروف ہوتے ہیں، جنھیں حروفِ جر، حروفِ ربط یا صلہ کہا جاتا ہے، ان حروف کے استعمال کا طریقہ ہر زبان میں علٰحدہ ہے، انھیں جاننا بہت ضروری ہوتا ہے، ورنہ ترجمہ خبط ہو کر رہ جائے گا۔

(۵) مترجم کو اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ترجمہ کی عبارت اصل عبارت سے بہت زیادہ بڑھنے نہ پائے، مترجم کو اگر دونوں زبانوں پر قدرت ہوتی ہے اور مفہوم کو صحیح طور سے پالیتا ہے تو اصل عبارت کے مطابق ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، اور اگر اس میں کچھ خلل ہوتا ہے تو مطلب ادا کرنے کے لئے اسے طول طویل عبارت لانی پڑتی ہے، یہ ترجمہ کا عیب ہے۔

(۶) پھر ترجمہ اتنا واضح اور سلیس ہونا چاہئے کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مطلب ذہن نشین ہوتا چلا جائے، پڑھنے والا اگر خود صاحب فن ہے تو اسے کہیں الجھن نہ ہو۔

(۷) پھر مترجم کو دیانت دار بھی ہونا چاہئے کہ مصنف نے جس نظریہ کو پیش کیا ہے، مترجم بعینہٖ اسی کو پیش کرے، کوئی تصرف اس میں نہ کرے، اگر اسے اختلاف ہو تو حاشیے میں ظاہر کرسکتا ہے، مگر اس طرح ترجمہ کرنا کہ اصل نظریہ ہی تبدیل ہوجائے درست نہیں۔''

ایک بہت اہم مضمون ''کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضرات شیخین شریک نہ

تھے؟'' ہے،اس میں مدلل طور پر ثابت کیا گیا ہے،حضرات شیخین (حضرت صدیق اکبر وفاروق اعظمؓ)رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں شریک تھے۔

اس میں ایک مضمون ''سبیل المومنین سے انحراف'' ہے، جومشہور عالم اور نامور خطیب مولانا سید سلمان صاحب ندوی کے ایک علمی اور فکری انحراف کا احتساب اور تردید ہے۔

انہوں نے دعوی کیا کہ ''علم دین'' صرف وہی نہیں ہے جسے اب تک علما علم دین قرار دیتے چلے آرہے ہیں، یعنی قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ کا علم! بلکہ علم دین کا دائرہ بہت وسیع ہے،اس دائرے میں وہ علوم بھی آتے ہیں جنہیں لوگ غلط فہمی سے ''علم دنیا'' سمجھتے ہیں، انجینئری،ڈاکٹری، سائنس اور اس کے مختلف شعبے حتی کہ صنعتیں مثلا بڑھئی گری، لوہاری، سناری، معماری، وغیرہ کی صنعتیں یہ سب علم دین کے زمرے میں آتی ہیں۔اس کی تائید میں انہوں نے قرآن کی آیتیں پیش کیں،لیکن ان آیتوں نے ان کے دعوی کی جب تصدیق نہیں کی تو تفسیر بالرائے کے ذریعے ان سے اپنے دعووں کی تصدیق حاصل کرنی چاہی۔

حضرت مولانا نے اس کا جو احتساب کیا ہے اسے پڑھ کر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ سب صرف خطابت کا فسوں اور بیان کی ساحری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اسی طرح ماہنامہ ضیاء الاسلام میں سوال واستفسار کا کالم شروع کیا گیا تھا، اس میں حضرت مولانا نے کئی سوالوں کے جوابات بہت تفصیل سے دئے تھے، اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کردیا گیا ہے۔

اس میں بعض عربی تحریروں کے ترجمے بھی ہیں،اس سے مترجم کی دونوں زبانوں پر بے پناہ قدرت کا پتہ چلتا ہے، جیسے حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجویؒ کی کتاب ''الیاقوت و المرجان فی لغات القرآن'' کے مقدمہ کا ترجمہ جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ نے لکھا ہے، اسی طرح رابطہ عالم اسلامی کی ایک قرارداد کا ترجمہ جس کا عنوان ''فقہی اختلاف رحمت ہیں'' ہے۔

اس کا ایک اچھا خاصا حصہ کتابوں کے تعارف وتبصرہ پر مشتمل ہے،اس سے زبان و ادب سے آپ کی گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے،اس میں بطور خاص ان کتابوں پر تبصرے پڑھ پر

تبصرہ نگار کی وسعت نگاہ سامنے آتی ہے۔وقفة مع اللامذهبية ،مولفہ مولانا محمد ابوبکر غازی پوری،صدیق اکبر:ایک انسان کامل مترجمہ ڈاکٹر بدر الدین الحافظ ،اس پر جو تبصرہ ہے وہ بطور خاص پڑھنے کے لائق ہے اس سے تبصرہ نگار کی عربی زبان وادب پر قدرت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کے بارے میں تبصرہ نگار کا کہنا ہے کہ:''یہ کتاب اغلاط کا عجائب خانہ ہے،کوئی صفحہ ترجمہ کی غلطی سے شاید ہی خالی ہو،اورغلطیاں بھی ایسی کہ ناقابل توجیہہ!بعض ابواب تو اول سے آخر تک اغلاط کا مجموعہ ہیں۔''رحمۃ اللہ الواسعہ ،مولفہ:مفتی سعید احمد پالن پوری۔تقریر دلپذیر (حضرت نانوتویؒ)الفوز الکبیر مترجمہ:مفتی سعید احمد پالن پوری۔

اس کے بعد ایک بڑا حصہ مقدمے اور تقریظات کا ہے،جس میں آپ نے کتاب کے متعلقہ موضوع کا نہایت جامع تعارف کرایا ہے ،خصوصاً مولانا طاہر حسین صاحب گیاوی کی کتاب ''احسن التنقیح '' کا مقدمہ،مولانا انوار احمد صاحب خیرآبادی کی کتاب''شہدائے اسلام''اور''امہات المومنین''کے مقدمے،خود میری کتاب''اندلس میں اسلام''کے مقدمہ کا ابتدائی حصہ تو زبان وادب کا شاہکار ہے۔اس میں کچھ سفرنامے ہیں،جیسے''تحفۂ بہار''اس میں رودادِ سفر کے ساتھ ساتھ تذکیر وموعظت کا بھی ایک بڑا حصہ ہے، پڑھنے والا مصنف کے سوز دروں کو جگہ جگہ محسوس کرے گا۔کئی ایک سفر میں احوال سفر کے ساتھ کئی شخصیات اور کتابوں کا بہت عمدہ تعارف کرایا گیا ہے،جیسے تحفۂ مدینہ منورہ،وسفر کا ندھلہ۔تحفۂ مدینہ منورہ کو تو پڑھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ اللہ کی شان بے نیازی دیکھئے کہ جب وہ کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو ایسے اسباب پیدا کردیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے،ایک شخص ایک غیر مسلم گھرانے میں کفر وشرک کی تاریکیوں میں جنم لیتا ہے،توفیق الٰہی ایمان وہدایت کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے،مختلف صعوبتوں سے گزر کر وہ عمرآباد کی ایک دینی درسگاہ میں پہونچ کر علوم دینیہ سے بہرہ ور ہوتا ہے، پھر وہ مدینہ یونیورسٹی، جامعہ ام القریٰ اور جامع ازہر جیسے اداروں میں پہونچتا ہے اورعلم وفضل کی دنیا میں مولانا ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمی کے نام سے شہرت دوام پاتا ہے۔**ذلک فضل الله یو تیه من یشاء** اس مضمون میں مولانا ڈاکٹر ضیاءالرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ کی ایک بہت اہم خدمت حدیث کا ذکر کیا گیا ہے۔مولانا لکھتے ہیں:

’’مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا، اور اس میں یکسوئی کے ساتھ منہمک ہوگئے، وہ منصوبہ یہ ہے کہ جہاں جہاں جس جس کتاب میں صحیح اور حسن مرفوع حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں سب کو یکجا کردیا جائے، یہ کام بہت ہمت طلب اور پُر مشقت ہے، اس کے لئے تمام ذخائر حدیث کا مطالعہ کرنا ،ان میں سے صحیح یا حسن مرفوع روایتوں کو تلاش کرنا، پھر ان کی صحت کے متعلق دلائل مہیا کرنا، انھیں مرتب کرنا، ایک طویل اور مسلسل جہد ومشقت کا عمل ہے، ایک عرصہ ہوا کہ مولانا اسی محنت وکاوش میں لگے ہوئے ہیں، وہ فرمارہے تھے کہ میری نیت ہے کہ سب صحیح حدیثیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے اور وہ صحت کے ساتھ ثابت ہیں، اور جو دین کی بنیاد ہیں، میں یکجا کرکے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کردوں، اس کے واسطے سے حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں میری حاضری ہوجائے اور اللہ کی رضا حاصل ہوجائے۔

مولانا نے اپنے اس عظیم منصوبہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

قسم اول: ایمان،علم،عبادات

قسم ثانی: معاملات واحکام

قسم ثالث: تفسیر، سیرۃ، مغازی، مناقب، ادعیہ، گزشتہ انبیاء واقوام وملل کے واقعات

اس منصوبہ کے دو حصے بفضل اللہ وعونہ پورے ہوچکے ہیں، جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہیں، ان کے مجموعی صفحات ۷۲۰۰ ہیں، اور ان میں حدیثوں کی تعداد ۶۸۰۰ ہے۔

اب مولانا تیسری قسم مرتب کررہے ہیں، فرمارہے تھے کہ سیرت نبوی پر کام چل رہا ہے، غزوۂ احد تک پہونچا ہوں۔

یہ منصوبہ مولانا نے ۱۴۲۲ھ میں شروع کیا تھا، اور امید ہے کہ ۱۴۳۵ھ میں تکمیل کو ان شاء اللہ پہونچے گا۔

مولانا فرمارہے تھے کہ صحاح ستہ میں کل صحیح حدیثیں بغیر تکرار کے سات ہزار سے کچھ زائد ہیں، اور اتنی ہی ان کے علاوہ میں بھی ہیں، اس طرح تقریباً پندرہ ہزار متونِ حدیث جمع ہوجائیں گی، ان شاء اللہ، اس مجموعہ کا نام مولانا نے ’’**الجامع الكامل في الحديث الصحيح الشامل**‘‘ رکھا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ میری تلاش وجستجو کے مطابق حدیث کے تمام ذخائر میں ساٹھ سے ستر ہزار کے درمیان حدیثیں ہیں جوتقریباً تین لاکھ سندوں سے مروی ہیں، لیکن یہ حدیثیں بکثرت سندوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مکرر سہ کرر ہیں، تکرار سے خالی کر کے جب حدیث صحیح کے متون کو منتخب کیا جائے گا تو ۱۲ سے ۱۵ ہزار کے درمیان ہوں گے۔

''سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ''میں مولانا نورالحسن راشد صاحب کی تصنیف ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، احوال وآثار و باقیات ومتعلقات'' کا تعارف، اس کی فروگزاشتوں کی نشاندہی اور اس کے سلسلے میں کچھ مشورے دیئے گئے ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں:

''حضرت نانوتوی قدس سرہ کے حالات پر یہ کتاب سیرت وسوانح کے انداز پر کوئی مسلسل تحریر نہیں، یہ فرض تو مشہور صاحب قلم، مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے صاحب نظر عالم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نوراللہ مرقدہ''سوانح قاسمی'' کے نام سے ادا کر چکے ہیں، لیکن حیات قاسم کے بہت سے گوشے ابھی مخفی تھے، کئی تحریریں ابھی غیر مطبوعہ تھیں، غیر مطبوعہ مکاتیب کا بھی خاصا ذخیرہ ہے، جو بجائے خود علم وحکمت کے شاہکار ہیں، زیر نظر کتاب میں وہ مخفی گوشے نمایاں کئے گئے ہیں، اور غیر مطبوعہ مضامین ومکاتیب کی تحقیق کی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے علمی وتصنیفی کارناموں کے متعلق متعدد رسائل کا مجموعہ ہے، ان رسائل کے عنوانات ملاحظہ ہو۔

(۱) آئینۂ کمالات (۲) مرقومات قاسمی (۳) متاع دلفروز (۴) افادات قاسمی (۵) مآثر قاسمی (۶) رہنمائے راہ''۔

کچھ مقالات دورحاضر کی مفید وہمہ گیر تحریک ''تبلیغی جماعت'' سے متعلق ہیں، جس میں اس کی بعض بے اعتدالیوں اور افراط وتفریط کی نشاندہی کی گئی ہے اور اکابرین جماعت کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ان معروضات پر غور کریں اور اس کی روک تھام کی کوشش کریں ورنہ فتنوں کا ایک دروازہ کھل جائے گا، اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا اس کی سطر سطر سے لکھنے والے کے خلوص اور دردمندی کو محسوس کیا جا سکتا ہے، اس سے لکھنے والے کا کوئی ذاتی نفع ونقصان متعلق نہیں ہے، محض ایک دینی فریضہ سمجھ کر لکھا گیا، میں نے جلد اول کے مقدمے میں لکھا تھا کہ:

’’اخلاص وللہیت کے فقدان کے اس دور میں جبکہ قلوب کے اندر انا پرستی ونفسانیت روز افزوں ہے بہت کم ارباب علم خالص اللہ کے لئے نقد وتبصرہ کی ہمت وجرأت کر پاتے ہیں، اور ایک بات کو درست سمجھتے ہوئے بھی اس کے اظہار سے گریز کر جاتے ہیں، جس کی وجہ سے خاصا التباس واشتباہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جب تک علماء اسلام کے اندر اخلاص وللہیت کی دولت بے بہا تھی وہ نقد پر خوش ہوتے تھے، اگر کسی نے ان کی غلطی پر متنبہ کیا تو اس کے شکر گزار ہوتے تھے، لیکن اب ایسا کم ہوتا ہے بلکہ بالعموم اب تنقید کا جواب تنقیص اور بسا اوقات تحقیر سے بھی دیا جاتا ہے اور معاملہ ابتذال تک بھی جا پہونچتا ہے، لیکن اللہ کے کچھ خاص بندے ہر دور اور ہر عہد میں ایسے رہے ہیں جنھیں اللہ سچائی اور حقیقت کے اظہار کے لئے غیر معمولی حوصلہ اور جذبہ عطا کرتا ہے، **وهم قليلون جداً**‘‘

کسی بھی تحریر کو پڑھتے وقت یہ مذکورہ باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اور جو بات کہی گئی ہے اسے دیکھنا چاہئے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، صحیح ہو تو مان لینا چاہئے اور اگر غلط ہے تو اس کی غلطی کو واضح کر دینا چاہئے۔

اس کے علاوہ کچھ اداریئے ہیں جو حدیث دردِل کی اشاعت کے بعد لکھے گئے، اور کچھ الماٰثر کے اداریئے ہیں جو حدیث دردِل میں نہیں آسکے تھے۔ یہ اس جلد کا ایک اجمالی اور سرسری تعارف ہے، مطالعہ کے بعد قارئین خود اس کی اہمیت ووقعت کو محسوس کریں گے۔

پہلی جلد کی طرح یہ دوسری جلد بھی تمامتر عزیزم مولانا محمد عرفات سلّمہٗ کی سعی وکاوش کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل وذہن وقلم میں برکت دیں اور مزید خدمات علمیہ کی توفیق بخشیں، اور اس خدمت کو شرف قبولیت سے نوازیں اور انھیں بہترین صلہ دیں۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
۵؍مئی ۲۰۱۵ء سہ شنبہ

☆☆☆☆☆☆

فقہی مضامین

(۱) مسئلہ عنین

(۲) لفظ اللہ میں مد کی تحقیق

(۳) نوٹوں کی شرعی حیثیت اور ان سے قرض کی ادائیگی کا مسئلہ

(۴) دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت

(۵) گاؤں میں جمعہ

(۶) شرعی پنچایت یا قاضی

(۷) زکوٰۃ

(۸) فی سبیل اللہ

(۹) مصارف زکوٰۃ۔ایک اہم استفتاء کا جواب

(۱۰) مسئلہ رفع یدین

حامداً ومصلیاً ومسلماً

محکمہ شرعیہ جمعیۃ العلماء مئوناتھ بھنجن
کے
ایک ''اہم فیصلہ'' فسخِ نکاح
کا
تحقیقی و تفصیلی جائزہ

تمہید

زیرنظر کتابچہ ایک تنقیدی واصلاحی مطالعہ وتحقیق ہے،محکمہ شرعیہ جمعیۃ العلماء مئو نے ''ایک اہم فیصلہ'' کےعنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے،اسے پڑھنے کے بعدمحسوس ہوا کہ فیصلہ کرنے والوں اور تائید کرنے والے حضرات نے اس موضوع پر جس دیانتداری ،محنت وکاوش ، اورعرق ریزی کی ضرورت تھی اس کا حق نہیں ادا کیا،مضامین کی روش سے پتہ چلتا ہے کہ ایک آسان اور صاف مسئلہ کو الجھانے اور پیچیدہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔تحقیق وتدقیق اورنکتہ آفرینیوں کا حاصل بس یہ نظر آیا کہ جس مسئلہ میں فقہاءامت کا اجمالی تواتر منقول ہے، وہ مشتبہ اور پیچیدہ بن کر رہ گیا۔ہمیں اندیشہ ہوا کہ اگر یہ تحقیق تسلیم کرلی گئی اور فیصلہ نظیر بنادیا گیا تو مسلمانوں کا خانگی معاشرہ اپنی تمام ترخرابیوں کے ساتھ ایک نئی الجھن اور دشواری کا شکار بن جائے گا، پھر اسے مان لینے کے بعد تحریف وآزادیٔ رائے کا ایک نیا دروازہ بھی کھل جائے گا،جس کا بند کرنا مشکل ہوجائے گا،ہم نے پوری دیانت داری کے ساتھ محسوس کیا کہ اس مسئلہ میں حضرات قضاۃ سے غلطی ہوئی اور بہت بڑی غلطی ہوئی ،مجبوراً اپنے مزاج کے خلاف قلم اٹھایا،ہم نے لہجہ تنقید کا بہت زیادہ نرم کرنے کی کوشش نہیں کی ،اور اس کے لئے ہم کسی معذرت کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے ،اس کے ذمہ دار وہ حضرات ہیں جنھوں نے خواہ مخواہ ایک صاف قضیہ کو الجھایا،البتہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ہم اپنے اکابر کے احترام میں کسی سے پیچھے ہیں، یہ تنقید اور یہ لہجہ کی تندی صرف اسی اختلافِ رائے کی حدتک محدود ہے،اس کے بعد ہم وہی اصاغر ہیں اور وہ وہی اکابر، ہم انہیں اپنا بزرگ ،پیشوا تسلیم کرنے میں ذرا بھی تأمل نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے ،اوراس سے مسلمانوں کو نفع دے۔آمین

مسئلہ عنّین

محکمہ شرعیہ مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کے اربابِ حل وعقد نے ایک کتابچہ بسلسلۂ عنین شائع کیا ہے، بحالات موجودہ ہندوستان میں یہ ایک بہتر اور خوش آئند کوشش ہے، کہ جگہ جگہ علماء کی کمیٹی محکمہ شرعیہ کی صورت میں قائم کی جائے، تاکہ مسلمان اپنے نجی معاملات بالخصوص نکاح وطلاق کے قضیے جن میں کسی غیر مسلم حکومت اور عدالت کا فیصلہ نافذ نہیں ہوسکتا، اس کی جانب رجوع کریں، اس محکمہ کی ضرورت واہمیت اہل بصیرت پر مخفی نہیں ہے، دراصل اسے اسلامی حکومتوں کے نظامِ قضا کا امکانی حد تک ایک خوشگوار بدل کہنا چاہئے، ہمارے پاس یہ کتابچہ جب آیا تو ہم نے بڑے ذوق وشوق سے اسے پڑھا، اور غور سے پڑھا، لیکن پڑھنے کے بعد دل پر کوئی بہتر تأثر قائم نہ ہوا، ہمیں توقع تھی کہ رسالہ محکمہ قضا کے شایان شان، وقار وعظمت سے مالا مال ہوگا، اس کا حرف حرف شریعت کے تقدس وجمال کا ترجمان ہوگا، اور مرحوم! اسلامی حکومتوں کے قضا کے جاہ وجلال کا ہلکا ہی سہی پرتو دیکھنے کو ملے گا، مگر افسوس ہماری توقع پوری نہ ہوسکی، اس کے جامع ومرتب (جو محکمہ شرعیہ کے قاضی صاحب ہی ہیں) نے حسنِ ذوق کا ثبوت نہیں دیا، ہر علم و فن، اور ہر موضوع ومقالہ کا ایک مخصوص لب ولہجہ ہوتا ہے، جو اس کے مناسب ہوتا ہے، تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری کا اسلوبِ تحریر اگر کوئی شخص فقہی مسائل ومعاملات میں برتنا چاہے، تو بدذوقی کی علامت سمجھی جائے گی، ناول وافسانہ کا سا انداز اگر کسی ٹھوس اور سنجیدہ علمی مضمون میں اختیار کیا جائے تو ذوقِ سلیم پر گراں ہوگا۔ محکمہ شرعیہ ایک بلند مرتبہ حیثیت اور باوقار عظمت کا مالک شعبہ ہے، قاضیٔ شریعت مسلمانوں میں ایک اعلیٰ مرتبہ ومقام کا حامل سمجھا جاتا ہے، محکمہ قضا کی جانب سے شائع ہونے والے رسالے میں اگر متین اسلوب، اور سنجیدہ لب ولہجہ کی کمی محسوس ہو تو بجا طور

پر اسے نقص اور عیب قرار دیا جائے گا،اس کتابچہ کی تمہیدی سطور ناول اور افسانہ کے رنگ میں شروع ہوتی ہے، ملاحظہ ہوں۔

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب
بے خودی نے اب اسے محسوس وعریاں کر دیا

''اکتوبر کی تیسری تاریخ تھی کہ محکمہ شرعیہ ہذا کی عدالت میں شوہر کے عنّین ہونے کی بنیاد پر تفریق وفسخِ نکاح کا بے بس ومجبور یتیم بچی کی طرف سے ایک مقدمہ دائر کیا گیا''۔(ص۔۳)

چندسطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

''اطباءاورڈاکٹروں کے معائنہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ شرعاً مقدمۂ زیر بحث میں شوہر کو علاج کی مہلت دینا بالکل ہی عبث اور لاحاصل ہے، کیونکہ مرض لاعلاج ہے''۔

اسرارِحقیقت کواک ایک سے پوچھا ہے
ہر نغمۂ رنگیں سے ہر شاہد رعنا سے

بغور ملاحظہ کیجئے، کس زاویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں کسی محکمہ شرعیہ کی عدالت کے قلم سے صادر ہورہی ہیں، بالکل ناول کا سا انداز! تھوڑی دور کے بعد۔

''تصویر کا دوسرا رخ'' کے عنوان سے یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

کون جانے مجھ کو کس منزل پہ لے آیا جنوں
اب مجھے بھی حسرتِ دیوار و در ہونے لگی

صورتِ حال کی تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب مدعا علیہ نے محکمہ شرعیہ جمعیۃ العلماء کے نافذ کردہ فیصلے کے بعد ایک استفتاء جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کی خدمت میں پیش کیا، حضرت مفتی صاحب نے فیصلہ محکمہ شرعیہ کے خلاف اپنا فتوی صادر فرمادیا۔

مجھ سے پوچھا کب کسی نے میری بربادی کا حال
ساری دنیا آپ ہی کے ہم زباں ہوتی گئی

اس فتوی سے نغمہ خاتون مدعیہ کا زوجِ ثانی بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

اس پر یہ شعر ارشاد ہوا۔

نغمہ گر مہر بلب حسرت نغمہ خاموش
اور جہاں گوش برآواز یہ قصہ ہے کیا

(ص۔۴)

ماشاء اللہ! کس قدر برجستہ شعر ہے۔نغمہ خاتون اور''نغمہ مہر بلب''حسرت نغمہ'' کی مناسبت پر کوئی ستم ظریف ہی ہوگا جو داد نہ دے گا،اس سے قبل''ہر نغمہ رنگیں سے''اسرار حقیقت پوچھنے کی بات بھی خوب تھی۔افسوس شاعری کا یہی محل ملا تھا۔آگے''نغمہ پر درد'' کا قصہ بھی آرہا ہے،اگر طبیعتوں پر بے حسی کا غلبہ نہ ہوتو مدعیہ کے خاندان سے ساتھ اچھا خاصا مذاق اور استہزا کیا گیا ہے، پھر محض مدعیہ اور اس کے شوہر ثانی کی خاطر وساوس واوہام کے خطرناک موڑ سے بچنے کے لئے منجانب محکمہ ہذا ایک کاروائی عمل میں آئی،جس میں کسی بھی مفتی کے اختلاف کو نا قابل اعتناء قرار دیتے ہوئے یہ مصرعہ ارشاد ہوا۔

یہ نازک استعارہ ہے زمانہ خاک سمجھے گا　　حقیقت داستان وشمع و پروانہ نہیں ساقی
حقیقت ہی حقیقت ہے، یہ افسانہ نہیں ساقی

(ص۔۶)

ممکن ہے حقیقت ہو مگر رنگ بالکل افسانوی ہے،مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب کے مقالے کے ذکر کے بعد یہ شعر صادر ہوا۔

عجب امتحاں ہے کوثر یہ تمیز خیر وشر بھی　　وہی آگ دے اجالا وہی بستیاں جلا دے

(ص۔۶)

ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

''دورانِ کاروائی مقدمہ کی تفصیلات سے متعلق بہت سی ایسی جزئیات سامنے آئیں ہیں کہ ان سب کا اظہار تحریرِ فیصلہ میں نہیں آسکتا، جو قرینِ مصلحت بھی نہیں ہوتا''۔

مطرب فتنہ نوا نغمہ پر درد نہ چھیڑ　　نکلا پڑتا ہے ہر آئینہ سے باہر کوئی

شاید وہ جزئیات قاضی صاحب اورایک فریق کے درمیان طے پائی ہوں اور انہیں صیغۂ راز میں رکھنا بے حد ضروری ہو،مگر ’’نغمہ پر درد‘‘ تو چھڑ گیا،اور’’ آئینہ سے باہر کوئی نکلا ہوا‘‘ صاف محسوس ہوتا ہے۔

ناظرین!بغور ملاحظہ کریں،ان سطروں میں عالمانہ اسلوب،فقیہانہ سنجیدگی،محکمہ قضا کے شایانِ شان وقار کا کہیں نشان ملتا ہے؟ادبی عبارت لکھنا بے شک ذوق ادیبانہ کی دلیل ہے، لیکن ہر علم وفن کا مستقل ادب ہوتا ہے،اگر اس کا لحاظ نہ کیا جائے تو مصنف ومرتب بجائے اس کے کہ داد وتوصیف کا مستحق ہو،الٹے اس کی فہم ودانائی پر حرف آجائے گا،کتابچہ دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نوآموز افسانہ نگار ابھی مشقِ قلم کے مرحلوں سے گزر رہا ہے،عبارتوں پر اشعار کا جوڑ اور بھی دیدہ زیب ہے،بعض اشعار تو (جیسا کہ ہم اشارہ کرآئے ہیں) بیچاری مدعیہ،اس کے شوہر ثانی اور ہر دو کے خاندانوں کے لئے خاصے صبر آزما ہیں۔

قاضیٔ شریعت کا مقام:

ان تمہیدی سطور اور کتابچہ کی اختتامی تحریر پڑھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ محکمہ قضا کے افراد قاضیٔ شریعت کے مقام پر قائم رہنے کے بجائے ایک فریق کی صف میں بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں،ہر جگہ مدعیہ کی جنبہ داری،اس کی مظلومیت کا رونا،ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ محکمہ ابتداءِ کار ہی سے عورت کی پاسداری پر کمر بستہ ہے،چنانچہ لکھتے ہیں۔

> ’’کاش اس منصب قضا وشرعی پنچایت کی اہمیت وضرورت کو کوئی سمجھے،اور بے بس وعاجز مظلوم عورتوں کی درد بھری کہانیوں کو سنے،اوران کے ڈھڑکتے ہوئے دلوں کے ارمانوں کو کوئی خاطر میں لائے،اوران پر رحم کھائے تو یہ شعبہ خود بخود ترقی پاتا رہے گا‘‘۔(ص۔۳۸)

ہم منتظر تھے کہ یہاں بھی کوئی برجستہ شعر ارشاد ہوگا،مگر شاید کوئی شعر یاد نہ آسکا،یہ سطریں اس بات کی واضح علامت ہیں کہ قاضی شریعت کے نزدیک عورتیں بہرحال مظلوم ہیں،یہ واقعہ ہے یا نہیں؟اسے ابھی الگ ہی رکھئے۔تسلیم کہ عورتیں’’بے بس وعاجز مظلوم‘‘ہیں،مانا کہ ان کی’’درد بھری کہانی‘‘’’سنی چاہئے،بیشک ان‘‘ڈھڑکتے ہوئے دلوں کے ارمانوں‘‘کو خاطر میں لانا ضروری ہے،لیکن سوال یہ ہے محترم قاضیٔ شریعت!کیا شریعت نے قاضی کو ایک فریق کا

حامی وناصر بنا کراس منصب پر قائم کیا ہے؟ کیا اس کے لئے جائز ہے کہ دوسرے فریق کونظر انداز کر کے محض ایک فریق کی داستانِ مظلومیت کو ڈرامائی انداز میں پیش کرے؟ یہ انداز تو قاضی کو اول قدم ہی میں حق وصداقت کی شاہراہ سے برگشتہ کر دے گا، ایسا قاضی عدل وانصاف کی صراط مستقیم کبھی نہیں پا سکتا، جس کی نگاہ میں مقدمہ آنے سے قبل ہی ایک خاص فریق کی مظلومیت ثابت شدہ امر بن کر آجائے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اس کا سارا زورِ قلم اسی پر صرف ہوگا کہ فریق ثانی کسی طرح ظالم و بے درد قرار پائے، کوئی اسے غلط کہے یا نہ کہے، شریعت بہرحال اس رویئے کو غلط قرار دیتی ہے۔ فقہا کی تصریحات اس سلسلہ میں بہت واضح اور دوٹوک ہیں، فقہ کی کتاب میں ''ادب القاضی'' کا باب اٹھا کر دیکھ لیجئے، فقہا یہی کہتے ہوئے نظر آئیں گے کہ قاضی کی نگاہ میں ہر دو فریق کی حیثیت یکساں ہونی چاہئے، اس کے لئے جائز نہیں کہ کسی پر توجہِ خاص کرے، اور دوسرے کو نظر انداز کرے، اس مسئلے میں جتنی دقیق رعائتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں، وہ شریعت کی جامعیت اور فقہا کی ژرف نگاہی کی دلیل ہیں۔

''(قوله ويسوى وجوباً بين الخصمين)اطلاقه يعم الصغير والكبير والخليفة والرعيةوالدناوالشريف والاب والابن والمسلم والكافر.....ولا ينبغي ان يجلس احدهما عن يمينه والآخر عن يساره لان لليمين فضلاً''۔
(شامی رابع۔۳۱۲)

ترجمہ! اور واجب ہے کہ فریقین میں مساوات برتے، یعنی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، خلیفہ ہو یا رعایا، ذلیل ہو یا شریف، باپ ہو یا بیٹا، مسلمان ہو یا کافر۔ اور ایک فریق کو اپنے دائیں اور دوسرے کو بائیں بٹھانا بھی مناسب نہیں، کیونکہ داہنے کو ایک نوع کی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

مسئلہ تو یہ ہے، مگر کتابچہ کی روشنی میں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے، خاص اس قضیہ زیر بحث میں تو قاضی صاحب بالکل فریق کی صورت میں جلوہ گر ہیں، معلوم نہیں کہاں سے اس کا جواز نکالا گیا ہے؟ ہمیں شریعت میں اس کی گنجائش بالکل نظر نہیں آتی۔

فیصلہ کا جائزہ:

تمہیدی مضمون کے بعد محکمہ عدلیہ شرعیہ دارالقضا دارالعلوم دیوبند کا فیصلہ تفریق ہے،

اس کے بعد جناب مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاضی شریعت بہار واڑیسہ کا تائیدی مقالہ ہے، یہ دونوں ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا جائزہ الگ الگ لیا جائے، نامناسب نہ ہوگا اگر ہم نقد وتبصرہ سے پہلے تمہیدی مضمون، فیصلۂ تفریق اور تائیدی مقالہ کی روشنی میں اصل مقدمہ اور فیصلہ کی بنیاد اجمالاً اپنے لفظوں میں بیان کردیں۔ واضح ہو کہ معاملہ کو سمجھنے میں ہم نے تینوں مضامین کو بنیاد بنایا ہے۔

''ہندہ زید کی بیوی ہے، بالغ ہونے کے بعد ایک سال کے فصل سے وہ دومرتبہ رخصت ہوکر زید کے پاس گئی، مگر زید نے دونوں بار بیوی سے ملاقات اور خلوت نہیں کی، اسے معلوم ہوا کہ زید ہجڑا ہے، اس کی ختنہ بھی نہیں ہوئی ہے، اس بنیاد پر اس نے مئو کے محکمہ شرعیہ میں تفریقِ نکاح کی درخواست دی، یہ درخواست ۳؍اکتوبر ۱۹۷۷ء کودی گئی، ۱۴؍نومبر ۱۹۷۷ء کو مدعا علیہ کی جانب سے جواب دہی کی گئی، (اس کا مضمون کتابچہ میں مذکور نہیں ہے) ۳۰؍دسمبر ۷۷ء کو مدعا علیہ نے اقرار نامہ پیش کیا۔ ۳؍جنوری ۷۸ء کو مدعیہ کے بھائی نے کمیٹی سے معائنہ کا مطالبہ کیا، تحقیقات کے بعد ۱۷؍جنوری ۷۸ء کو محکمہ نے علاج کے لئے ایک سال کی مہلت کا فیصلہ کیا، مگر ساتھ ہی یہ تصریح بھی کردی کہ تحقیقات جاری رہیں گی، اور حسب حال مفاہمت، رخصتی، تفریق کی صورت جس وقت ہوجائے گی عمل میں لائی جائے گی۔ فیصلہ کے بیان کے مطابق اس تاجیل کے بعد محکمہ نے فریقین کی موجودگی میں ڈاکٹر نیاز احمد صاحب سے معائنہ کرایا، انہوں نے حاصل معائنہ یہ بتایا کہ زید کو ایک پیدائشی مرض ہے، جو آپریشن سے درست ہوسکتا ہے، مگر کامیاب آپریشن کی توقع قبل بلوغ ہی ہوتی ہے۔

مدعا علیہ نے ۳۰؍دسمبر ۷۸ء کو ڈاکٹر نیاز احمد صاحب کے معائنہ کے بعد حکیم سعداللہ صاحب کے یک سالہ علاج کی بنیاد پر اپنے موافق تصدیق حاصل کرلی، مگر چونکہ وہ معائنہ محکمہ کی جانب سے نہیں کرایا گیا تھا، اس لئے اسے تسلیم نہیں کیا گیا، محکمہ نے ان سب کی تفصیلی رپوٹ مرتب کرکے زید کے بارے میں لاعلاج ہونے کا خیال ظاہر کرکے دارالعلوم دیوبند کے دارالقضا میں مسل پیش کردی، قاضیٔ دیوبند نے اس خیال سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے عنین لاعلاج ہونے کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا فیصلہ صادر کردیا، یہ فیصلہ ۲۳؍اپریل ۷۸ء کو

ہوا،محکمہ شرعیہ مئو نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا،اس کے بعد ہندہ نے دوسرا نکاح کرلیا،زید نے اس فیصلہ کے خلاف جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے ایک فتوی حاصل کرلیا،اس لئے عوام میں شورش ہوگئی،محکمہ نے یہ کاغذات قاضئ شریعت بہار کے پاس بھیجے،انہوں نے فیصلہ کی تائید وحمایت میں ایک مضمون لکھا جو مرتب کے الفاظ میں ''تحریر گرانمایہ، جو حجت و براہین کی روشنی میں نہایت قیمتی معلومات کا بیش بہا خزانہ'' ہے، پھر مرتب نے اور بھی علما سے تصدیقات حاصل کیں،قاضی مجاہدالاسلام صاحب نے عنین لاعلاج ہونے ساتھ یہ نکتہ بھی تحریر فرمایا کہ زید صغرِ آلۂ تناسل کی وجہ سے مجبوب (جس کا آلہ تناسل نہ ہو) کے ساتھ ملحق ہے،اس لئے تاجیل فضول ہے''۔

واقعہ کی صورت ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے،اس میں تین مرحلے ہیں، پہلے مرحلے میں محکمہ شرعیہ مئو نے عنین ہونے کی بنیاد پر ایک سال کی مہلت کا فیصلہ کیا، پھر نہ جانے کن اسباب کے تحت تحقیقات جاری رکھنے کو ناگزیر سمجھا۔دوسرے مرحلہ میں محکمہ نے تفصیلی رپوٹ مرتب کی،اور یہ خیال ظاہر کیا کہ زید عنین لاعلاج ہے،اس کو مہلت دینا عبث ہے،لیکن مسئلہ چونکہ اہم اور پیچیدہ تھا اس لئے دیوبند بھیج دیا گیا،وہاں بھی عینن لاعلاج قرار دے کر مہلت کو عبث سمجھا گیا،اور تفریق کردی گئی۔تیسرا مرحلہ اس وقت آیا جب کہ یہ کاغذات قاضی شریعت بہار کے پاس بھیجے گئے،انہوں شاید عنین لاعلاج ہونے کی بنیاد کمزور سمجھی،اس لئے''صِغرِ آلۂ تناسل'' کا اضافہ کر کے ملحق بالمجبوب قرار دیا،اس الحاق کے سلسلے میں ان کی رائے قدرے مضطرب ہے۔اولاً انہوں نے علت کے اصلی ہونے کے بنا پر یا ایسے عارضی ہونے کے باعث جس کے عدم زوال کا غلبۂ ظن حاصل ہو چکا ہے، مجبوب کے ساتھ ملحق قرار دیا ہے،مگر اس کے بعد ہی والے صفحہ میں ''صغر آلہ تناسل'' کو بنیاد الحاق بتایا ہے،ہم دونوں ہی کو بنیاد مان کر گفتگو کریں گے۔

ایک بڑا مغالطہ:

قبل اس کے کہ ہم مقدمہ کے تینوں مرحلوں پر گفتگو کریں،ناظرین کو ایک بڑے مغالطہ پر مطلع کر دینا چاہتے ہیں، یہ مغالطہ جان بوجھ کر دینے کی کوشش کی گئی ہے،تاہم فیصلہ ہی کی عبارت نے یہ راز آشکارا کر دیا،اسکی تفصیل سنئے۔

فیصلہ میں ''قاضی دیوبند'' لکھتے ہیں:

''اس کے بعد (یعنی ایک سال کی مہلت دینے کے بعد) محکمہ نے ڈاکٹر نیاز احمد صاحب سے معائنہ کرایا، فیصلہ میں اس کی کوئی تاریخ درج نہیں ہے، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف سے معائنہ ۷ار جنوری ۷۸ء کے بعد کرایا گیا ہے، جو کہ فیصلہ مہلت کی تاریخ ہے، پھر اسی معائنہ کو بنیاد بنا کر زید کو عنین لا علاج قرار دیا ہے''۔

لیکن درحقیقت یہ ایک جعل ہے، جسے جھوٹ سے تعبیر کیا جائے تو بجا ہوگا، اس جھوٹ کی قلعی چند ہی سطروں کے بعد کھل جاتی ہے، جہاں یہ عبارت ہے۔

''اسی تاریخ یعنی ۳۰ر دسمبر ۷۷ء کو ڈاکٹر نیاز کے معائنہ کے بعد مدعا علیہ نے حکیم محمد سعداللہ صاحب سے ایک سال کے علاج کی بنیاد پر ایک رپوٹ حاصل کر لی''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نیاز کا معائنہ ۳۰ر دسمبر سے قبل کا ہے، جبکہ فیصلہ مہلت ۷ار جنوری کو دیا گیا ہے، اس فیصلہ کے بعد کیا تحقیقات ہوئیں اس سے فیصلہ تفریق خاموش ہے، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ محکمہ نے ایک تفصیلی رپوٹ مرتب کی، جس میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ زید عنین لا علاج ہے۔ اس خیال کی بنیاد اگر وہی رپوٹیں ہیں، جو کتابچہ میں درج ہیں، تو کھلی بات ہے کہ یہ سب معائنہ جات فیصلہ تاجیل سے قبل کے ہیں، پھر مہلت کیوں دی گئی؟ اور اگر دی گئی تھی تو پھر کن تحقیقات کی بنا پر اس فیصلہ کو منسوخ کر کے دوبارہ تفریق کا فیصلہ کیا گیا؟۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ محکمہ نے اولاً مدعا علیہ کو ایک ماہ کی مہلت دی تھی، پھر جب مدعا علیہ کی جانب سے شرعی تاجیل کی درخواست کی گئی تب دوبارہ ایک سال کی مہلت ملی۔ اب یہ کون سمجھے کہ علما کی کمیٹی نے عنین کو کس اصول سے ایک ماہ کی مہلت دی، اسے یا تو ناواقفیت قرار دیا جائے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ محکمہ ہذا شرعی فیصلہ نافذ کرنے کا پابند نہیں، بلکہ اپنی صواب دید کے موافق جو فیصلہ مصلحت کے مطابق سمجھے نافذ کر سکتا ہے۔

پہلا مرحلہ ایک سال کی مہلت:

اب آیئے بالترتیب مقدمہ کے تینوں مراحل کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، پہلے مرحلے میں محکمہ نے ایک سال کی مہلت دی، یہ فیصلہ حسبِ قواعدِ شرعیہ بالکل درست ہے، مگر اس میں

دوخرابیاں شامل کردی گئیں۔

ایک تو یہ کہ محکمہ نے وضاحت کردی کہ تحقیقات جاری رہیں گی،اورحسب حال مفاہمت،رخصتی تفریق کی صورت میں جس وقت پیدا ہوگی،وہ عمل میں لائی جائے گی،یہ وضاحت باطل ہے،کیونکہ عنین کے لئے تاجیلِ سنہ کاحکم قطعی اوراجماعی ہے،اس میں کسی طرح کا استثنانہیں ہے،ورنہ فقہا ضرور تصریح کرتے،جب قاضی کے نزدیک شوہر کاعنین ہونا ثابت ہوگیا،تو تاجیل کے فیصلہ کے بعداس میں کسی طرح کی وضاحت جوتاجیل کے ساتھ مناسبت نہ رکھتی ہو،قطعاًباطل ہے۔

دوسری خرابی یہ ہوئی کہ قاضی کے ذمہ یہ وضاحت اس قضیہ میں ضروری تھی کہ سال بھر کی مہلت کے دوران بیوی شوہر کے ساتھ رہے گی،جتنے دن بغیرعذرِشرعی کے اس سے جدارہے گی وہ مدتِ مہلت میں محسوب نہ ہوگی،کیونکہ کتبِ فقہ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ غیبوبت کے ایام سال میں شمارنہ ہوں گے،چنانچہ فتاوی خیریہ میں ہے۔

"سئل فی زوجة العنین المؤجل لها سنة اذا هربت او اخذها والدها وحبسها عنه هل تحسب تلک الایام ام لا؟اجاب لاتحسب".(فتاوی خیریہ۔ص۶۱)

ترجمہ! شیخ خیرالدین رملی سے دریافت کیا گیا کہ جس عنین کوسال کی مہلت ملی ہو،اس کی بیوی اگراس کے پاس سے بھاگ جائے یااس کے والداسے روک لیں،تو ان ایام کا شمارمہلت کے سال میں ہوگا کہ نہیں؟ جواب دیا کہ نہیں شمار ہوگا۔

قاضی صاحب نے یہ وضاحت بالکل نہیں کی،بلکہ ان کی وضاحت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی رخصتی کا کوئی سوال نہیں۔کتنا فرق ہے فقہا کی تصریحات اور قاضیٔ شریعت کے وضاحت میں؟۔

؎ ببیں تفاوت رہ از کجاست تابکجاست

بہرکیف اس مرحلہ میں اصل فیصلہ تاجیل بالکل صحیح اورنافذ ہے،اوروضاحت مذکور باطل ہے۔

دوسرا مرحلہ فیصلہ تفریق:

دوسرے مرحلہ میں تحقیقات کے حوالے سے تفصیلی رپوٹ مرتب کی گئی ہے، تحقیقات کا مطلب غالباً طبی اور ڈاکٹری معائنہ ہے۔ تحقیقات کے ذیل میں کئی ڈاکٹروں کے بیانات فیصلے میں درج ہیں، لیکن محکمہ کی نگرانی میں صرف ڈاکٹر نیاز احمد نے معائنہ کیا ہے، نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ان تحقیقات کو یہیں دیکھ لیں۔

ڈاکٹر اظہار الحق کا بیان:

''میں نے معائنہ کیا، معائنہ میں حالت بہت خراب پایا، میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا، استادگی کے بعد تیسرے پور انگلی کے درمیان تھا، استادگی میں ٹیڑھا پن اور لوچ تھا، وہ اس وقت ہم بستری کے لائق نہیں تھا، کہ حقوق زوجیت ادا کر سکے''۔

ڈاکٹر عبدالجلیل کا بیان:

''میرے علاج میں نسبۃً پہلے کے اچھا ہے، میرے خیال میں لازماً ان کو چھ ماہ میرے علاج میں رہنا چاہئے، اس کے بعد کسی سے معائنہ کرالیں''۔

ڈاکٹر نیاز احمد کا بیان:

''میں نے جمیل احمد کے عضو تناسل کا ظاہری طریقہ سے معائنہ کیا اور تصدیق کے لئے بدستِ خود بھی دیکھا، جس سے نتیجہ نکلا کہ موصوف کو ایک پیدائشی مرض ہے، جو آپریشن کے ذریعہ درست ہوسکتا ہے، مگر دیکھا گیا ہے کہ کامیاب آپریشن سن بلوغ سے قبل ہی قابل اعتماد ہوتا ہے''۔

حکیم مولانا منیر الدین صاحب نے معائنہ کے بعد ڈاکٹر اظہار الحق صاحب کی تصدیق کی، اور لکھا کہ ٹیڑھا پن بہت ہی زیادہ ہے، مدعا علیہ نے اپنے طور پر حکیم سعد اللہ صاحب سے معائنہ کرایا، مگر ان کے بیان پر محکمہ نے اعتماد نہیں کیا۔

ان بیانات کو ناظرین غور سے پڑھیں، دیکھیں کہ کسی ڈاکٹر نے مرض کو لاعلاج بتایا ہے، ڈاکٹر عبدالجلیل نے نسبۃً پہلے کے اچھا ہونے کی صاف وضاحت کی ہے، ڈاکٹر اظہار الحق اور مولانا حکیم منیر الدین صاحب اس مسئلہ میں خاموش ہیں، ڈاکٹر نیاز احمد اس کو پیدائشی مرض بتاتے ہیں، مگر اس سے لاعلاج ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا، کیا پیدائشی امراض کے کامیاب معالجے

اس دورِ سائنس میں روزمرہ کا مشاہدہ نہیں ہیں؟ بلکہ انہوں نے آپریشن کے بعد درست ہونے کی وضاحت کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کامیابی کی توقع جتنی قبل بلوغ ہوتی بعد بلوغ نہیں۔اس سے زیادہ سے زیادہ عسیرالعلاج (جس کا علاج مشکل ہو) ہونا معلوم ہوا نہ کہ لاعلاج ہونا۔ پھر نہ جانے اربابِ محکمہ شرعیہ نے اسے لاعلاج کیوں کر قرار دیا؟ اور اس نظریہ کو دارالقضا دیوبند نے بھی باقی رکھا۔ ہمارے خیال میں ان بیانات کی روشنی میں کوئی شخص بھی لاعلاج ہونے کا تصور نہیں کرسکتا۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ قاضی مجاہدالاسلام صاحب نے اپنے مقالہ میں لاعلاج ہونے کی بات نہیں چھیڑی، انہوں نے لکھا ہے کہ:

''مدعاعلیہ اب ان حدود میں ہے جہاں یا توعلتِ مانعہ اصلی ہے، یا عارضی، لیکن اس کے عدمِ زوال کا غلبۂ ظن حاصل ہو چکا ہے''۔ (ص۔۲۵)

اگرچہ قاضی صاحب کا یہ ارشاد بھی محلِ نظر ہے، تاہم انہوں نے لاعلاج کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ خیر فرض کیجئے کہ شوہر عنین لاعلاج ہونا ثابت ہوگیا تب بھی تفریق کا فیصلہ باطل ہے۔

پہلی دلیل:

فقہا نے جہاں عنین ہونے کی بنا پر تاجیلِ سنہ کو حکم اجماعی بتایا ہے، کہیں اس میں عنین قابلِ علاج یا لاعلاج ہونے کے کی بحث نہیں چھڑی ہے، فیصلہ میں یہ ضرور لکھا ہے کہ:

''فقہا نے ضرور تصریح کی ہے کہ جب لاعلاج ہونا متحقق ہوجائے تو مہلت دینا عبث ہے''۔

اور قاضی مجاہدالاسلام صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے۔

''لیکن ظاہر ہے صرف ابلاء عذر اور تکمیل اعتذار کے لئے یہ مدت نہیں ہوسکتی، اس کے ساتھ توقع اور اصلاح حال کا پہلو بہر حال ملحوظ رکھنا چاہئے''۔

مگر کسی فقہی کتاب کا حوالہ ہر دو حضرات میں سے کسی نے نہیں دیا، قاضی صاحب نے تو خیر اپنے قیاس سے ایک بات تحریر فرمادی ہے، مگر فیصلہ میں تو فقہا کی تصریح کا حوالہ دیا گیا ہے، کاش فقہا کی ایک آدھ تصریح [ا] نقل بھی کردی ہوتی۔ قاضی صاحب کے ارشاد کو ہم نے قیاس اس سبب سے کہا کہ قاضی کے مفروضہ فقہا نے ''توقع اور اصلاح کی امید'' کا ذکر کہیں نہیں کیا

ہے، تاجیلِ سنہ کو ابلاء اعذار اور تکمیل اعتذار ہی کے لئے لکھتے ہیں، بلکہ عنین میں ان کے نزدیک مطلقاً اصلاح کی توقع رہتی ہے۔ چنانچہ ''فتح القدیر'' کی جس بحث کا حوالہ دیا ہے اس میں یہی مذکور ہے، اگر یہ ضروری امر تھا تو فقہا کی نگاہ سے اوجھل کیسے رہ گیا؟ ظاہر ہے کہ عنین کا مسئلہ دورحاضر کی چیز تو نہیں ہے، اور نہ لاعلاج ہونے کا معاملہ خاص اس زمانہ میں پیدا ہوا ہے۔ قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے، بلکہ اگر ایک اور زاویہ سے غور کیا جائے تو میڈیکل سائنس (جس کا حوالہ قاضی صاحب نے دیا ہے) کے اس دور ترقی میں جبکہ مشکل ترین امراض کے علاج دریافت ہوتے جارہے ہیں، کسی مرض کے لاعلاج ہونے کا تصور بھی مشکل ہے۔ اب سے پہلے کوئی طبیب دل پر ہاتھ لگانے کا خیال تک نہیں کرسکتا تھا، اب بڑے اطمینان سے اس کا آپریشن ہوتا ہے، قاضی صاحب نے میڈیکل سائنس کی ترقی کو لاعلاج ثابت کرنے کے حق میں استعمال کرنا چاہا ہے، حالانکہ اس ترقی کو قابل علاج قرار دینے کے حق میں بھی تو برتا جاسکتا ہے، پھر ایک ہی پہلو پر زور دینے کا کیا مقصد؟ اور فی زمانہ عنین کے علاج کے ایسے ایسے طریقے دریافت ہوچکے ہیں جن کی موجودگی میں عنت خواہ کسی نوعیت کا ہو، اسے لاعلاج قرار دینا مشکل ہے۔

بہرحال مقصد یہ ہے کہ فقہانے جب قابل علاج اور نا قابل علاج ہونے کی بحث نہیں اٹھائی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مدار اس پر نہیں ہے، بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض ایسے امراض جنہیں واقعی لاعلاج کہا جانا ممکن ہے، ان میں حکمِ تاجیل کو قطعی بتاتے ہیں۔

مثلاً خصی (جس کے خصیتین نکال دیئے گئے ہوں) جس کی جنسی خواہش معدوم ہوچکی ہو، اور عضو مخصوص کی استادگی ختم ہوگئی ہو، یا وہ بوڑھا جس کی شہوت درازی عمر کے باعث فنا ہوچکی ہو، اور آلۂ تناسل میں انتشار نہ ہوتا ہو، بظاہر غلبۂ ظن تو اسی کا ہے کہ علاج اور ادویہ کے زور سے ان دونوں کو قابل جماع نہیں بنایا جاسکتا، انہیں لاعلاج کہا جائے تو بجا ہے، اس کے باوجود دونوں کے لئے تاجیل کے حکم کی تصریح ہے۔

''(ولو وجدته عِنّيناً)وهو من لايصل الى النساء لمرض او كبر او سحر (او خصيا) لاينتشر ذكره (اجل سنةً)''. (درمختار۔شامی۔ص۵۹۴)

ترجمہ! اگر عورت اپنے شوہر کو عنین پائے یعنی ایسا ہو کہ کسی مرض یا بڑھاپے یا سحر کی وجہ سے

جماع پر قادر نہ ہو، یا ایسا خصی پائے جس کے آلہ میں انتشار نہ ہوتا ہو، ایسے شوہر کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔

اور

"قال فی الخانیة یوجل الشیخ الکبیر ان کان لایصل الیها".

(البحر الرائق ۔ ج۴ ۔ ص۱۳۵)

ترجمہ! خانیہ میں تصریح ہے کہ اگر بہت بوڑھا شخص جماع پر قادر نہ ہوتو اسے مہلت دی جائے گی۔

جب خصی اور کبیر السن جو کہ لاعلاج ہی سمجھے جاتے ہیں، مہلت دی جاسکتی ہے تو قضیۂ زیر بحث میں تاجیل کو منسوخ کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تاجیل سنہ کا فیصلہ قائم وباقی ہے، اور تفریق کا فیصلہ قطعاً باطل ہے۔ اس بنا پر زوجِ ثانی کا نکاح بھی درست نہیں ہوا۔

خاتمۂ بحث میں ہم چاہتے ہیں کہ "البحر الرائق" سے یہ تصریح بھی نقل کردیں کہ بغیر تاجیل تفریق کا فیصلہ باطل ہے۔

"وقد کتبنا فی القواعد الفقهیه فی مذهب الحنفیه ان قاضیاً لوقضی بعدم تاجیل العنین لم ینفذ قضائه". (البحر الرائق ۔ ج۴ ۔ ص۱۳۵)

ترجمہ! ہم نے "قواعد الفقہیہ فی مذہب الحنفیہ" میں لکھا ہے کہ اگر کسی قاضی نے عنین کے مسئلہ میں عدم تاجیل کا فیصلہ کردیا تو وہ نافذ نہ ہوگا۔

یہیں ہم فقہا کی وہ تصریح بھی دیکھ لینا چاہتے ہیں جس کا دعوی قاضیٔ دیوبند نے کیا ہے کہ "فقہا نے تصریح کی ہے کہ جب لاعلاج ہونا متحقق ہوجائے تو مہلت دینا عبث ہے" اس سلسلے میں انہوں نے "البحر الرائق" سے ایک ادھوری عبارت نقل کرکے خلاف واقع استدلال کیا تھا۔ یہ استدلال بعض مفتیان کرام کے پاس پہونچ گیا، انہوں نے اس پر لے دے کی اور تلبیس واضح کی تو مرتب رسالہ نے اس کو حذف کردیا، لیکن اصل دعوی چونکہ ان کے مقصد کے لئے ضروری تھا، اس لئے اسے باقی رکھا۔ ہمیں اس استدلال کا علم نہیں تھا اس بنا پر ہمیں یک گونہ تردد

تھا کہ ممکن ہے کتابوں میں کہیں تصریح ہو، اور ہماری نگاہ وہاں تک نہ پہونچی ہو۔ہم نے اس مسئلہ میں دیوبند قاضی صاحب کے پاس خط بھی لکھا تاہم وہاں سے کچھ جواب آنے سے قبل ہی ہمیں اس تفریق نامے کی نقل دستیاب ہوگئی، اس میں استدلال بعینہ مذکور ہے۔اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ قاضی صاحب دیوبند کو کیا کہیں؟ اور قاضی مئو کو کس مقام پر رکھیں؟ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ بعینہ وہ تحریر یہاں درج کردیں، جو قاضی مئو نے فیصلہ دیوبند سے التقاط کر کے اس کے نفاذ کے لئے فریقین کو دی تھی، اس میں بھی یہ استدلال مذکور ہے:

''مسل (۳۴) مقدمہ مرکزی محکمہ عدلیہ شرعیہ دارالقضا دارالعلوم دیوبند میں پیش کردی گئی تھی، بعداز ملاحظہ تجویز وفیصلہ کی تکمیل کردی جونافذ کیا گیا، فیصلہ درج ذیل ہے۔

فقہا نے تصریح کی ہے کہ جب لاعلاج ہونا متحقق ہوجائے تو مہلت دینا عبث ہے، چنانچہ البحرالرائق میں ہے۔

''والا علم انہ عنین لو اعتبر ھذا لزم ان یوجل سنۃلان التعجیل لیس الا لیعرف انہ عنین علی ماقالوا اذلافائدۃ فیہ''. (ج۴۔ص۱۲۳)**وھکذا فی الخانیۃ وغیرھا**

ترجمہ از ناقد! ورنہ سمجھ لیا جائے گا کہ عنین ہے، اگر اس کا اعتبار کرلیا جائے تو لازم آئے گا کہ ایک سال مہلت نہ دی جائے، اس لئے کہ تاجیل جیسا کہ لوگوں نے کہا ہے اسی واسطے ہے کہ اس کا عنین ہونا معلوم ہوجائے، کیونکہ اب تاجیل میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اس لئے ضابطہ شرعیہ کے تحت نغمہ خاتون اور شوہر جمیل احمد میں تفریق کا حکم کیا جاتا ہے، آج کی تاریخ سے نغمہ خاتون جمیل احمد کی شرعی بیوی نہیں رہی، مذکورہ تفریق شرعاً طلاق بائن کے حکم میں ہے۔

مذکورہ عبارت پڑھ کر ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اندازہ کرلے گا کہ ابتدا اور انتہا سے کچھ عبارت حذف کردی گئی، جس کا تعلق مذکورہ عبارت ہی سے ہے، کیونکہ '' **وِالّا**''یعنی ''ورنہ'' ابتداءِ کلام میں آ ہی نہیں سکتا، ایسے ہی ''**لو اعتبر ھذا لزم الخ**'' سے عدمِ تاجیل کا مطلب اخذ کرنا بھی بس مخصوص حضرات ہی کا کام ہے، عام اہلِ علم اس سے قاصر ہیں، ہم ''البحرالرائق'' کی پوری عبارت نقل کردیتے ہیں، اس سے بآسانی اندازہ ہوجائے گا کہ کس قدر

تلبیس سے کام لیا گیا ہے، قارئین خود فیصلہ کریں کہ یہ علمی دیانت کی کون سی شاخ ہے۔

"وفی فتح القدیر مانقل عن الهندوانی انه یوتی بطشت فیه ماء بارد فیجلس فیه العنین فان تلقص ذکره وانزوی علم انه لا عنة به والا علم انه عنین لواعتبر هذا لزم ان یوجل سنة لان التعجیل لیس الا لیعرف انه عنین علی ماقالوا اذلافائدة فیه ان اجل مع ذالک ولکن التاجیل لابد منه لانه حکمه". (البحرالرائق۔ج۴۔ص۱۳۴)

ترجمہ! فتح القدیر میں ہے کہ وہ جو ہندوانی سے منقول ہے کہ "ایک طشت میں ٹھنڈا پانی رکھ کر اس میں عنین کو بٹھایا جائے گا، پس اگر اس کا عضو مخصوص سکڑ اور بڑھ جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسے مرض عنت نہیں ہے، ورنہ سمجھ لیا جائے گا کہ عنین ہے"۔ اگر اس روایت کا اعتبار کرلیا جائے، تو لازم آئے گا کہ اسے ایک سال کی مہلت نہ دی جائے، اس لئے کہ تاجیل جیسا کہ لوگوں نے کہا ہے، اسی واسطے ہے کہ اس کا عنین ہونا معلوم ہو جائے، کیونکہ اس علم کے باوجود مہلت نہ دینے میں کوئی فائدہ نہیں ہے، حالانکہ تاجیل ضروری ہے، کیونکہ وہ اس کا حکم ہے۔

فیصلہ میں منقول عبارت پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے، آپ نے پوری عبارت پڑھ لی، قاضی صاحب نے ہندوانی کی روایت کا ایک جملہ لے لیا، پھر فتح القدیر نے اس کے رد میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک خاص حصہ لے کر دونوں کو مسلسل عبارت بنا دیا، جس کی وجہ سے عبارت بالکل خبط ہو گئی۔ ایسا کرنے کے باوجود موصوف کا مقصد حاصل نہ ہوا، پھر معلوم نہیں ہاتھ کی اس صفائی سے کیا فائدہ حاصل ہوا۔ ہم یہ جرأت تو کر نہیں سکتے کہ موصوف نے عبارت سمجھی ہی نہ ہوگی، پھر اسے دیدہ ودانستہ مبتلاءِ فریب کرنے کے علاوہ اور کیا کہا جائے۔

؎ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

کھلی بات ہے کہ صاحب فتح القدیر کا منشا یہاں ہندوانی کی عبارت نقل کرنے سے اس کی تردید کرنی ہے، انہوں نے تردید کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ تاجیل بہرحال ضروری ہے، لیکن قاضی صاحب کو یہی جملہ حذف کرنا ضروری تھا۔

؎ ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا این جاست

تیسرا مرحلہ:

قاضیٔ شریعت بہار کی بارگاہ میں۔

یہ معاملہ تیسرے مرحلے میں اس وقت پہونچتا ہے جبکہ کاغذات قاضی بہار کی عدالت میں پہونچے اور انہوں نے اس کی تائید میں ایک مفصل اور بظاہر مدلل مضمون مرتب فرمایا۔الحاق بالمجبوب کا نکتہ موصوف ہی کا نتیجۂ فکر ہے،مرتب کتابچہ کواس مقالہ پر بہت ناز ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

تقدیر کس کے خرمن ہستی کی کھل گئی　　　طوفان بجلیوں کا تمہاری نظر میں ہے

اب آپ حضرات مولانا مجاہدالاسلام صاحب زیدت حسناتہ کی تحریر گرانمایہ سے جو حجت وبراہین کی روشنی میں نہایت قیمتی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے،استفادہ فرمائیں۔

لوشمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے　　　فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

اس لئے ہم بھی چاہتے ہیں کہ اس تحریر گرانمایہ کا تفصیلی جائزہ لیں۔ہمیں مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب سے حسن ظن ہے،ان کی علمی قابلیت اور فقہی لیاقت کے معترف ہیں،وہ عرصہ سے منصب قضا پر فائز ہیں،ظاہر ہے کہ ان مسائل ومعاملات کی جتنی جزئیات وتفصیلات ان کے پیش نظر ہوں گی ہماری دسترس وہاں تک کہاں؟ان کے مضمون پر ہمارے جیسے بے بضاعت کا قلم اٹھانا بہت مشکل ہے،تاہم اس اعتراف کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ موصوف اس گراں قدر مقالے میں بہت سی بات بے دلیل کہہ گئے ہیں،اور بعض جگہ مطلب سمجھنے میں التباس ہوگیا ہے۔ہم ان کے مرتبہ ومقام کا لحاظ کرتے ہوئے ان اغلاط کی نشان دہی ضروری سمجھتے ہیں۔ابتداء موصوف نے عنین کی تعریف مختلف کتب فقہیہ سے ذکر کی ہے،اور خلاصہ کے طور پر یہ تعریف لکھی ہے:

> ’’پس خلاصہ یہ کہ وہ شخص جس کا آلہ تناسل صحیح وسالم ہو،اتنا بڑا ہو کہ کم ازکم فرج کے اندرونی حصہ میں داخل ہوسکے،اوراس کے باوجود مرض،سحر،استادگی کی کمی،بڑھاپے،خواہش کے فقدان،یا کمی کے باعث اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت پر قادر نہ ہوتو اصطلاحِ شرع میں عنین ہے۔

خط کشیدہ[۲]الفاظ دوبارہ پڑھ لیجئے،یہ ایک مبہم اور غیر واضح جملہ ہے،اورشاید اس

کے ابہام ہی سے فائدہ اٹھا کر محترم قاضی صاحب نے قضیۂ زیر بحث میں زید کو مجبوب کے ساتھ ملحق قرار دیا ہے، حالانکہ یہاں اگر موصوف فقہا کی ذکر کردہ تشریح نقل کر دیتے تو ابہام دور ہو جاتا[۳] بحرالرائق میں ہے۔

"اذا اولج الحشفه فقط فليس بعنين". اگر کوئی شخص صرف حشفہ کا ادخال کر سکے تو وہ بھی عنین میں شمار نہیں ہوگا۔

اسی جیسی عبارت "عالمگیر" میں بھی ہے، ج۱۔ص ۵۴۶

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی عضو خاص کی مقدار اتنی ہو کہ صرف حشفہ کا ادخال ممکن ہو، اور پھر کسی مرض وغیرہ کی وجہ سے قدرت نہ پائے تو وہ بھی عنین میں شمار ہوگا، ملحق بالمجبوب نہ ہوگا۔ البتہ جس کا اس سے بھی چھوٹا ہوا سے فقہا "اوصغيرة كالزر" یعنی گھنڈی کے مانند قرار دے کر مجبوب کے ساتھ ملحق کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کے مقالہ میں وضاحت نہ ہونے کے باعث بات گول مول ہو کر رہ گئی ہے، جو غلط فہمی کا باعث بن سکتی ہے۔

اس کے بعد دوسری صورت مجبوب کی ذکر کی ہے، اور تیسری صورت اسے قرار دیا ہے جس پر نہ عنین کی مذکورۃ الصدر مصطلح تعریف صادق آتی ہے اور نہ مجبوب کی۔ اس کی کئی مثالیں ذکر کی ہیں۔

(۱) شکاز۔ جو آلہ کی صحت وسلامتی اور مجامعت کی قدرت کے باوجود بوجہِ سرعتِ انزال کے عاجز رہ جاتا ہے۔

(۲) خصی۔ جس کی جنسی خواہش مفقود ہو چکی ہو۔

(۳) صغیر الذکر۔ کسی شخص کا عضوِ مذکور اتنا چھوٹا ہو کہ وہ فرج کے اندرون تک نہ پہونچ سکے

(۴) یا اس میں ایسا خلقی نقص ہو جس کی وجہ سے عضو کا ادخال ممکن نہ ہو۔

ان صورتوں کے متعلق موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:

"قاضی کو دیکھنا ہوگا کہ مناطِ حکم کے اعتبار سے یہ عنین کے ساتھ ملحق کرنے کے لائق ہے یا مجبوب کے ساتھ"۔

یہاں قاضی صاحب بہت فنکارانہ انداز میں ایک غیر معقول بات کہہ گئے ہیں۔ آپ

ہر چہار صورت پر خوب غور کر لیجئے، اس میں تیسری صورت وہی ہے جس کی تصریح" او صغیرة کالزر" کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔ اس علاوہ بقیہ سب صورتیں لغت اور عرف کے اعتبار سے خواہ عنین کے دائرہ میں نہ آتی ہوں، لیکن مذکورۃ الصدر شرعی اصطلاحی تعریف ان پر ہو بہو صادق آتی ہے، عنین کی تعریف موصوف نے یہ نقل کی ہے:

"من لایقدر علی جماع فرج زوجته یعنی لمانع منه لکبر سن اوسحر".

ترجمہ! یعنی جو شخص اپنی بیوی کی فرج میں کسی ایسے مانع کی وجہ سے جس کا منشا خود اس کے اندر ہو مثلاً بڑھاپے، یا سحر وغیرہ کی وجہ سے جماع پر قادر نہ ہو۔

"البحر الرائق" میں یہ عبارت ہے۔

"واما عندالفقها فهو من لایصل الی النساء مع قیام الآلة لمرض به"

ترجمہ! فقہا کے نزدیک عنین وہ ہے جو عورت سے جماع پر باوجود آلہ تناسل موجود ہونے کے اپنے کسی مرض کی وجہ سے قادر نہ ہو۔ (ج ۴۔ص ۱۳۳)

قارئین غور کر لیں کہ یہ تعریف مذکورہ بالا تینوں صورتوں پر من وعن صادق آتی ہیں کہ نہیں؟ ہمارے خیال میں ان پر بداہۃً صادق آتی ہے، البتہ فقہا نے جو ان میں بعض صورتوں کو مستقلاً بیان کر کے انہیں عنین میں شامل کیا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عنین کی شرعی تعریف ان پر صادق نہیں آتی تھی، بلکہ چونکہ عرفاً ان کو دوسرے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس لئے عنین میں داخل کرنے کے سلسلہ میں کچھ خفا پیدا ہو گیا تھا، اس لئے تصریح کر دی، چنانچہ "شامی" میں ہے:

"(ولو وجدته عنیناً اوخصیاً)لاینتشر ذکره"وعلیه" فهو من عطف الخاص علی العام لخفاء ه ،قال الشامی(قوله وعلیه)ای علی التقید بقوله لاینتشر،والمراد الجواب عن اعتراض البحر بانه لاحاجة الی عطفه علی العنین لدخوله فیه،فاجاب بانه من عطف الخاص علی العام لکن لابد من نکتة کما فی عطف جبریل علی الملائکة لزیادة شرفه ،وبینهما بقوله لخفاء ه ای خفاء دخوله فیه بسبب تسمیة باسم خاص". (شامی ج ۲۔ص ۵۹۴)

ترجمہ! اور اگر عورت نے شوہر کو عنین پایا یا ایسا خصی جس کے آلہ میں انتشار نہ ہوتا ہو، یہاں خاص کا عطف عام کے اوپر ہے بوجہ خفاء کے، مطلب یہ ہے کہ " لا ینتشر "کی قید جو لگائی ہے اس کے باعث خصی کا عطف عنین پر از قبیل' عطف الخاص علی العام' ہے، مقصد اس کا صاحب بحر کے اعتراض کا جواب ہے، انہوں نے کہا ہے کہ عنین کے اوپر خصی کے عطف کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ خصی تو اس میں داخل ہی ہے، اس کا جواب دیا کہ عنین عام ہے، اور خصی اس کے مقابلہ میں خاص، اور خاص کا عطف عام پر ہوتا ہے، البتہ اس میں کوئی نکتہ ہونا چاہئے جیسا کہ جبریل کا عطف ملائکہ پر ان کی زیادتی شرف کی وجہ سے ہوا ہے، اس نکتہ کو شارح نے'' لخفاء ہ '' سے واضح کیا ہے، یعنی چونکہ ایسے شخص کو عرف میں ایک خاص نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس لئے اس پر عنین کی شمولیت قدرے مخفی ہوگئی تھی۔

یہ تصریح صرف خصی کی صورت میں ہے، باقی صورتوں کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے، پھر اس کے بعد قاضی صاحب کے اس قول کا مطلب کیا ہوگا کہ:

''لیکن درمیانی صورتوں میں قاضی اپنی تحقیق اور فہم کے اور ماہر اطباء کی رائے کے مطابق اس کا مُجاز ہے کہ وہ توقع کی صورت میں عنین کے ساتھ ملحق مان کر تاجیل کرے، اور مایوسی کی صورت میں مجبوب کا حکم دے کر بغیر تاجیل تفریق کرے''۔ (ص۔۲۲)

درحقیقت قاضی صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ عنین اور مجبوب کے درمیان میں کچھ ایسی شکلیں موجود ہیں جنہیں اصطلاحاً نہ عنین کہا جاسکتا ہے اور نہ مجبوب، اور یہ کہ فقہا نے انہیں بالتصریح کسی خاص صورت میں داخل نہیں کیا ہے۔ اس لئے قاضی اپنی فہم و تحقیق اور ماہر اطباء کی رائے کے مطابق کسی ایک کے ساتھ ملحق کرسکتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مغالطہ ہے اور یہی مغالطہ تمہید ہے اس دعوی کی جو آگے چل کر قاضی صاحب کرنے والے ہیں کہ قضیہ مذکورہ میں شوہر اس پوزیشن میں ہے کہ اگر قاضی نے اسے ملحق بالمجبوب کردیا ہے تو درست کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان درمیانی صورتوں کو بے شک عرف میں عنین کے علاوہ اور ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، مگر عنین کی شرعی اصطلاح ان پر صادق آتی ہے، اور جن پر نہیں آتی انہیں فقہا نے بالتصریح مجبوب یا صحیح میں داخل کردیا ہے۔ اس باب میں قاضی کے اجتہاد اور تحقیق کی

ضرورت نہیں ہے۔

’’فتح القدیر‘‘ کی عبارت سمجھنے میں غلطی:

ص۔۷۱پر قاضی صاحب نے تاجیل اورتفریق بغیر تاجیل کے مسئلے میں تعبدی اورقیاسی کی بحث چھیڑی ہے،اور دور تک بحث کی ہے،اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ نے عنین کی صورت میں تاجیل کا اور مجبوب کی صورت میں عدمِ تاجیل کا جو فیصلہ کیا ہے،وہ امر تعبدی نہیں بلکہ قیاسی ہے،اور معلول بعلت ہے۔تفریق کی اصل بنیاد دونوں صورتوں میں مقصد نکاح کا فوت ہونا ہے،مگر چونکہ عنین میں اصلاحِ حال کی توقع رہتی ہے،اس لئے اس کی تدبیر ضروری ٹھہری،جس سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے کہ مقصدِ نکاح حاصل نہیں ہوسکتا۔صحابہ نے اجتہاد کرکے بطور علامت ایک سال کی مدت مقرر فرمائی ہے کہ سال گزرنے پر بھی اگر شوہر قابو نہ پاسکا تو حصولِ مقصود سے مایوسی ہوگئی،اورعورت کے صبر و برداشت کی حد ہوگئی،اس لئے اب تفریق کردی جائے گی،برخلاف اس کے مجبوب ہونے کی صورت میں چونکہ اصلاح کی توقع قطعاً مفقود ہوگئی ہے،اس لئے تاجیل کی ضرورت نہیں۔اس سلسلے میں قاضی صاحب نے ’’مبسوط‘‘ اور’’فتح القدیر‘‘ کی عبارتیں نقل کی ہیں،چنانچہ مناطِ تفریق کے سلسلے میں فتح القدیر کے حوالے سے یہ عبارت نقل کی ہے۔

’’فالحق ان التفريق منوط اما بغلبة ظن عدم زواله لزمانته اوللاصلية‘‘.

اس پر تحریر فرماتے ہیں:

یعنی مقدمۂ عنین میں حکمِ تفریق کا مدار اوراس کے علت دو ہے،ایک یہ کہ آفتِ اصلی ہو،یا یہ کہ یہ آفت تو عارضی ہو لیکن اس کے زائل نہ ہونے کا ظن غالب ہو جائے،اور سال کی مدت کا گزر جانا اور شوہر کا مجامعت پر قادر نہ ہونا ان دونوں باتوں کے لئے دلیل ہے۔

یہاں قاضی صاحب موصوف کو صاحبِ فتح القدیر کا منشا سمجھنے میں یا تو غلطی ہوئی ہے یا انہوں نے مغالطہ دیا ہے،اسے سمجھانے کے لئے ہمیں قدرے تفصیل کرنی پڑے گی۔

صاحب ہدایہ نے تاجیلِ سنہ کی مصلحت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’’فاذا مضت المدة ولم يصل اليها تبين ان العجز بآفة اصلية ففات

الامساک بالمعروف ووجب تسریح بالاحسان".

یعنی سال گزرنے کے بعد بھی جب شوہر جماع پر قادر نہ ہوسکا تو ظاہر ہوگیا کہ اس کا عجز کسی اصلی آفت کی وجہ سے ہے، اس لئے امساک بالمعروف کی صورت ختم ہوگئی، اور عورت کو چھوڑ نا ضروری قرار پایا۔ اس عبارت سے یہ سمجھ میں آتا ہے تفریق کی اصل علت آفت یعنی عنت کا اصلی ہونا ہے، اور یہ بات سال کی مدت گزرجانے سے ثابت ہوجائے گی۔ اس پر صاحب فتح القدیر نے اعتراض کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سال بھر تک عورت سے جماع پر قدرت نہ ہونے سے یہ لازم نہیں کہ مرض اصلی ہے، کیونکہ بسا اوقات عارضی امراض بھی سال بھر سے زیادہ دنوں تک باقی رہ جاتے ہیں، اور مثلاً جو شخص سحر کے باعث صحبت پر قادر نہ ہوا سے عنین میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ عادتاً سحر برسوں باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اول الذکر صورت میں مرض کا عارضی ہونا معلوم ہے، ایسے ہی یہ بھی معلوم ہے کہ سحر عارضی ہے، پھر اگر اس علم ویقین کے باوجود مہلت کا سال گزرجائے اور مریض یا مسحور جماع پر قادر نہ ہوسکے تو تفریق کردی جاتی ہے، حالانکہ اگر مدار تفریق علت کا اصلی ہونا ہوتا تو ان دونوں صورتوں میں ہرگز تفریق نہ کی جاتی، خواہ سال گزرے یا دو سال، کیونکہ علت کا عارضی ہونا متیقن اور معلوم ہے، تاہم ایسا نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ علت کا اصلی ہونا مدار تفریق نہیں ہے، اس کے بعد صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں:

"فالحق ان التفریق منوط اما بغلبة ظن عدم زواله لزمانته اولالاصلیةومضی مع عدم الوصول موجب لذالک اوھو عدم ایفاء حقھا فقط بایِّ طریق کان،والسنة جعلت غایة للصبر وابلاء العذر شرعاً حتی لو غلب علی الظن بعد انقضاء ھاقرب زواله وقال بعد مضی السنة اجلنی یوماًلایجیبه لذالک الا برضاء ھا". (فتح القدیر۔ج۳۔ص۲۶۳)

ترجمہ! پس حق یہ ہے کہ مدار تفریق یا تو مرض کے عدم زوال کا غلبۂ ظن ہے خواہ اس وجہ سے کہ وہ کوئی دیرینہ مرض ہے، یا اس وجہ سے کہ وہ اصلی اور خلقی ہے۔ یہ غلبۂ ظن سال گزرنے کے بعد حاصل ہوجائے گا، یا مدار اس کو قرار دیا جائے کہ شوہر عورت کا پورا حق ادا نہیں کر پا رہا ہے، خواہ کسی

وجہ سے ہو،اورایک سال کی مدت اس کے صبر کی انتہا اورعذر کے امتحان کے لئے شرعاً مقرر ہوئی ہے، یہاں تک کہ مدت کے ختم ہونے کے قریب مرض کا زوال نزدیک محسوس ہو اور شوہر سال گزرنے کے بعد ایک دن کی مہلت مانگے تو عورت کی رضامندی کے بغیر مہلت نہیں دی جائے گی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب فتح القدیر کے نزدیک مدارِتفریق دو امر ہو سکتے ہیں،ایک یہ کہ مرض کے عدم زوال کا ظن غالب ہوجائے ،اوراس عدم زوال کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں،ایک یہ کہ مرض کوئی دیرینہ اور طویل ہو،دوسرے یہ کہ وہ اصلی اور خَلقی ہو۔اس صورت میں معذوری کے ساتھ ایک سال کا گزرجانا اور جماع پر قدرت نہ پانا عدم زوال کے غلبہ ظن کی علامت اور دلیل قرار پائے گا۔دوسری چیز جو مدارتفریق بن سکتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کا حق پورا نہیں ہورہا ہے،اس صورت میں ایک سال کی مدت عورت کے صبر وانتظار کی انتہائی مدت ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ مدارتفریق دو میں سے کوئی ایک چیز ہوسکتی ہے،لیکن سال کی مدت ہر دوصورت میں یکساں معتبر اورضروری ہوگی،دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عنین کا اصل حکم تو تاجیل سنہ ہے، پھرارباب فقہ نے اس کی مصلحت اورحکمت پرغور کرکے یہ دو مدارتفریق مستنبط کئے ہیں،یہ دونوں فی الحقیقت تاجیل سنہ پرمبنی ہیں،اصل بنیاد اورمبنیٰ تاجیل سنہ کا حکم اجماعی ہے۔

اب قاضی صاحب کا مغالطہ ملاحظہ فرمائیے،موصوف نے ’’ لـلاصـلية‘‘ کا عطف ’’بـغـلبة ظن‘‘ پرسمجھ کر دومدارتفریق یہیں اتنی سی عبارت سے اخذ کرلئے ،یعنی ایک آفت کا اصلی ہونا اوردوسرا ایسا عارضی ہونا جس کے عدم زوال کا غلبہ ظن ہو۔پھرتیسرا مدارِتفریق’’ اوهـو عـدم ايـفاء حقها‘‘ کوقراردیا،حالانکہ کھلی بات ہے کہ ’’ للاصلية‘‘ کا عطف ’’ بـغلبة ظن‘‘ پر ہرگز نہیں سوسکتا، کیونکہ اس پرعطف کرنے کا تقاضہ یہ ہے(جیسا کہ عربیت سے واقف افراد جانتے ہیں) کہ بجائے ’’لـلاصـلية‘‘ کے ’’بـالاصـلية‘‘ ہو،تاکہ معطوف علیہ اور معطوف پرایک ہی حرفِ جرہو،اوردونوں میں توافق رہے۔’’لـلاصلية‘‘ میں لام کا ہونا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ عطف’’ لـزمانته ‘‘ پرہے،ہم نے توضیح میں اس رعایت کی ہے۔دوسری غلطی قاضی صاحب موصوف سے ’’زمــــانة ‘‘ کے ترجمے میں ہوئی ہے،انہوں نے اس کا ترجمہ’’عارضی‘‘ کیا ہے،

حالانکہ اس کے معنی دیرینہ اور طویل ہونے آتے ہیں۔ پھرانہوں نے اسی مغالطے کی بنیاد پر نتیجہ نکالا کہ:

''ایسی تمام صورتیں جہاں علت اصلی نہ ہو بلکہ عارضی ہو اور اس کے زائل ہو جانے کی امید ہو، ایک سال کی مدت دے کر عورت کو انتظار کا حکم دیا جائے گا، اور اگر ایک سال گزرنے پر بھی اصلاح نہ ہو سکے اور ایفاءِ حق کی صورت نہ نکلے تو اگر چہ آئندہ اصلاح کی توقع باقی کیوں نہ ہو مزید مہلت دئے بغیر تفریق کردی جائے گی، اور اگر آفت اصلی ہو یا عارضی، لیکن ظن غالب یہ ہے کہ اس کے دفعیہ کی توقع نہیں، ہر ایسی صورت میں فوراً تفریق کردی جائے گی، اور عورت کو لا حاصل انتظار کی زحمت میں نہیں ڈالا جائے گا''۔

موصوف نے علت کے اصلی ہونے کو بھی مدارِ تفریق قرار دیا ہے، حالانکہ ہم واضح کر آئے ہیں کہ یہ چیز سرے سے صاحب فتح القدیر کی تشریح کے مطابق مدار و مناط ہے ہی نہیں۔ بلکہ مرض کے عام زوال کا غلبۂ ظن تفریق کی بنیاد ہے۔

یہاں موصوف کے کلام میں تضاد بھی ہے، خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آفت اصلی ہو تو تاجیل کی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ اس سے پہلے موصوف ہی کا ارشاد گزر چکا ہے کہ ''سال کی مدت کا گزر جانا اور شوہر کا مجامعت پر قادر نہ ہو پانا ان دونوں باتوں کے لئے دلیل ہے''۔ (ص۔۲۰)

یعنی علت کے اصلی ہونے کے لئے یا بصورت عارضی اس کے عدم زوال کے غلبہ ظن کے لئے۔ اس عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں امور سال کے گزرنے کے بعد ہی متحقق اور متیقن ہوں گے، بغیر سال کے گزرے ہوئے دونوں میں کسی ایک کو متحقق نہ قرار دیا جائے گا، اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ تاجیلِ سنہ ضروری ہو اور اس کے بعد تفریق کی جائے۔ حاصل یہ کہ ایک جگہ علت کے اصلی ہونے کی صورت میں مہلت کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں، اور دوسری جگہ علت کے اصلی ہونے کے لئے مدت سال کو دلیل قرار دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مہلت دی جائے۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہے، یا پھر یہ کہا جائے کہ قاضی صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سال کی مدت کے علاوہ ان دونوں امور کی اور بھی کوئی شئی دلیل ہے۔

درحقیقت قاضی صاحب کا مقالہ پڑھنے سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان دونوں چیزوں پر سال کی مدت کے علاوہ ایک اور چیز بھی دلیل اور علامت ہے، وہ طبی اور ڈاکٹری معائنہ، اسی نظریہ کی بنیاد پر موصوف کے نوکِ قلم سے یہ ارشاد صادر ہوا ہے:

''بہرحال ان تمام معائنہ جات سے عضوِ مخصوص کی حد درجہ کوتہی (کہ ہونا نہ ہونا برابر ہے) کجی، ڈھیلا ہونا، پیدائشی طور پر مدعاعلیہ کا ایک نہایت پیچیدہ مرض میں مبتلا ہونا اور اب عمر کی پختگی اور نشو ونما کا وقت گزر جانے کے بعد بذریعہ آپریشن معالجہ کے کامیاب ہونے کی کم سے کم توقع ایسے واضح اسباب ہیں جن کی روشنی میں یہ رائے قائم کرنا کہ اب مدعاعلیہ ان حدود میں ہے جہاں علت مانعہ اصلی ہے یا عارضی، لیکن اس کے عدم زوال کا غلبہ ظن حاصل ہو چکا ہے، ان حالات میں مہلت دینا بے فائدہ امر ہے، لہٰذا اسے بحکم مجبوب مانتے ہوئے فوری تفریق کردی جائے۔ میری رائے میں محکمہ شرعیہ کا ان حالات میں اس نتیجہ تک پہونچنا حق بجانب ہے''۔ (ص۔۲۵)

یہاں قاضی صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ ڈاکٹری معائنوں کو تاجیل سنہ کا بدل قرار دے کر اس کو منسوخ کردیا ہے، اور لطف یہ کہ اس پر موصوف نے پورے مقالے میں کہیں ہلکی سے ہلکی دلیل پیش نہیں فرمائی۔ تاجیل تو ایک اجماعی حکم ہے، دورصحابہ سے آج تک اس پر اجماع چلا آرہا ہے، اہل علم میں سے کسی کا اختلاف اس میں منقول نہیں ہے۔

''ولم احفظ عن مفت لقيته خلافاًفي ان توجل امرأة العنين سنة''.
(کتاب الام ج ۵۔ ص ۳۵)

ترجمہ! جن مفتیوں سے میں ملا ہوں مجھے یاد نہیں کہ کسی نے عنین کی بیوی کے متعلق تاجیلِ سنہ کے مسئلہ میں اختلاف کیا ہو۔

اب اگر قاضی صاحب ڈاکٹری معائنہ اور ڈاکٹروں کی شہادت کو اس کا بدل قرار دیتے ہیں تو دیں، لیکن ان کے ذمہ اس کی کوئی واضح اور قطعی دلیل پیش کرنی ضروری ہے۔ افسوس کہ قاضی صاحب نے اس بے دلیل دعوی پر خاصا اصرار کیا ہے۔

درحقیقت ڈاکٹری معائنہ کی اہمیت ووقعت جتلا کر قاضی صاحب نے ایک صاف قضیہ

کوالجھانے کی کوشش کی ہے، ورنہ اس کی اہمیت شریعت میں اتنی نہیں ہے کہ اس سے کوئی حکم شرعی متأثر ہوجائے۔فقہانے بعض معاملات میں بس اس قدر اس کا اعتبار کیا ہے کہ اس کی بنیاد پر عدالت میں دعوی دائر ہوسکتا ہے، فیصلہ کی بنیاد تو ہرگز نہیں بن سکتا ہے، چنانچہ خیارِعیب کی بحث میں صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں:

"وفی التحفة ان کان یقف علیه الاالخواص کالاطباء والنخاسین فان اجتمع علیه مسلمان اوقاله مسلم عدل قبل". (فتح القدیر ج۵۔ص۱۵۷)

ترجمہ! تحفہ میں ہے کہ اگر عیب ایسا ہو کہ جسے خواص ہی معلوم کرسکیں، مثلاً اطباء اور بردہ فروش تو اگر اس عیب پر دو مسلمان متفق ہوجائیں یا ایک عادل مسلمان کہہ دے تو مان لیا جائے گا۔

صورت یہ ہے کہ کسی نے لونڈی خریدی، خریدنے کے بعد اس نے کسی عیب کا قاضی کے یہاں دعوی کیا، جسے ظاہراً معلوم نہیں کیا جاسکتا، اس صورت میں طبیب وڈاکٹر کی رائے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، اگر وہ کہہ دیں کہ یہ عیب اس میں ہے تو دعوی مقبول ہوجائے گا، ورنہ خارج کردیا جائے گا۔اس میں اختلاف ہے کہ ایک متدین ڈاکٹر کا کہہ دینا کافی ہے یا دو کی ضرورت ہوگی، صاحب بدائع پہلی بات کو ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"وذکر شیخی الامام الزاهد علاوالدین محمد بن احمد السمرقندی فی بعض مصنفاته انه لیس بشرط ویثبت بقول مسلم عدل منهم....وجه هذا القول ان هذه الشهادة لایتصل بها القضاء وانما تصح بها الخصومة فقط فلایشترط فیها العدد". (بدائع الصنائع ج۵۔ص۲۷۹)

ترجمہ! امام علاوَالدین سمرقندی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، اس شہادت میں عدد شرط نہیں ہے، بس ایک متدین مسلمان کے قول سے عیب مان لیا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شہادت کا تعلق قضا سے نہیں ہے، بلکہ اس سے صرف خصومت کا انعقاد ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے لئے عدد شرط نہیں ہے۔

جب بیع وشراء کے معاملہ میں ڈاکٹروں کی شہادت کا صرف اتنا وزن ہے کہ اس سے فقط خصومت کا انعقاد ہوسکتا ہے، فیصلہ کا مدار نہیں بن سکتی، تو نکاح وطلاق اور تفریق کے معاملات

تو بہت اہم اور نازک ہیں، ان میں اس سے زیادہ کیسے وزن دیا جاسکتا ہے؟۔

اور عنین کے مسئلہ میں بھی ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت اس وقت مانی جاسکتی ہے جبکہ عورت ثیبہ ہو اور شوہر عنین ہونے کا انکار کرتا ہو، اس صورت میں بھی مسئلہ یہ ہے کہ شوہر سے قسم لی جائے گی، تاہم یہاں اس بات کی گنجائش کسی حد تک مانی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹری معائنہ کرا کے شوہر کے عنین ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق حاصل کی جائے، بس ڈاکٹری معائنہ کا یہی مقام ہے، اس سے آگے بڑھ کر یہ معلوم کرنا کہ عنین لاعلاج ہے یا قابل صحت کہ اس بنیاد پر اسے ملحق بالمجبوب قرار دیا جائے یا عنین ہی مانا جائے، شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں، اگر ہے تو دلیل ارشاد ہو۔

بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بالفرض اگر ڈاکٹر کہہ بھی دے کہ یہ مرض لاعلاج ہے، یا ظن غالب ہے کہ زائل نہیں ہوگا، تب بھی تاجیلِ سنہ کا حکم شرعی اس سے متاثر نہیں ہوگا، جیسا کہ ہم خصی اور بہت بوڑھے کے باب میں لکھ آئے ہیں کہ ان کے علت کا زوال مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے، اس کے باوجود سال کی مہلت انہیں دی جاتی ہے، مجبوب کے ساتھ ملحق نہیں کیا جاتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مذکورۃ الصدر صورت میں فقط چند ڈاکٹروں کے معائنہ کی بنیاد پر مدعا علیہ کو ملحق بالمجبوب قرار دیا جائے، اس کا مرض تو خصی اور بوڑھے کی علت کی بنسبت بہت ہلکا ہے۔

قاضی صاحب موصوف علت کے اصلی ہونے کی صورت میں (جیسا کہ گزر چکا ہے) تاجیل کی ضرورت نہیں تسلیم کرتے، علت کے اصلی ہونے سے غالباً مراد پیدائشی اور خلقی عنت ہے، اگر ہم نے ٹھیک سمجھا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ فقہا نے اسے بھی عنین کی فہرست میں رکھ کر تاجیل کا حکم دیا ہے۔

”(قولہ او سحر)زاد فی العنایۃ او ضعف فی اصل الخلقۃ او غیر ذالک“. (شامی ج۲۔ص۵۹۴)

ترجمہ! عنایہ میں ضعفِ خلقی وغیرہ کا بھی عنت کے سلسلہ میں اضافہ کیا ہے۔

ان وجوہ اور تصریحات کے ہوتے ہوئے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ قاضی صاحب جیسا بلند پایہ عالم ایک غیر معقول اور بے دلیل امر پر کیوں اصرار کر رہا ہے؟ کیا موصوف کا علمی مرتبہ و مقام اس کی اجازت دیتا ہے؟۔

بلکہ سچ پوچھئے تو اس معاملہ خاص میں جبکہ مدعا علیہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر چکا ہے، اس کو ڈاکٹری معائنہ کے خارزار میں گھسیٹنا نہ صرف یہ کہ فضول اور لاحاصل ہے، بلکہ ظلم اور ناجائز تھا۔آخر بے ضرورت کسی کی سترعورت دیکھنا اور اس کو ہاتھ لگانا کس دلیل سے جائز ہے؟ کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟ کاش قاضی صاحب اپنے موجودہ مقام سے تھوڑا سا نازل ہوکر اس پہلو پر بھی غور کرتے۔

خصی کے بارے میں قاضی صاحب کی غلطی:

قاضی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

''اس اصول کی روشنی میں سرعت انزال کی صورت میں اور اس خصی کے مقدمے میں جس کے آلہ میں انتشار ہو، اور جنسی خواہش موجود ہو، ایک سال کی مہلت دینا ضروری ہے''۔

حیرت ہے جس خصی کے آلہ میں انتشار ہو، اور اس میں جنسی خواہش موجود ہو، اسے قاضی صاحب عنین کیونکر قرار دے رہے ہیں؟ اگر یہ شخص بھی عنین ہے تو دنیا کے تمام صحت مند افراد عنین کی فہرست میں آجائیں گے، اور جن کے آلہ میں انتشار نہ ہوتا ہو وہ مجبوب قرار پائیں جائیں گے۔ نہ معلوم قاضی صاحب جس عالم میں یہ سطریں تحریر کرگئے، اس سلسلے میں ''درمختار'' کی تصریح ملاحظہ ہو۔

''**او خصیاً لاینتشر ذکرہ فان انتشر لم تخیر**'' ۔خصی جس کے آلہ میں انتشار نہ ہو اور اگر انتشار موجود ہو تو عورت کو حقِ تفریق نہ ہوگا۔

فالج زدہ شخص کا قضیہ۔ بے دلیل دعوی:

''لیکن مثلاً ایک فالج زدہ شخص کے مقدمہ میں جس کے عضوِ تناسل پر بھی فالج کا اثر پڑا ہو، اور ماہر اطبا کی رائے کے مطابق ازالۂ مرض کی کمتر توقع ہے، یا عضو تناسل کے بہت زیادہ کوتاہ ہونے کی صورت میں کہ اندرون فرج اس کا ادخال بھی نہ ہو سکے، مجبوب کے حکم پر قیاس کرتے ہوئے مہلت نہیں دی جائے گی''۔

قاضی صاحب کا علمی پایہ دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ سطریں انہیں کے قلم فیض رقم سے صادر ہوئی ہیں؟ عضوِ تناسل کے بہت زیادہ چھوٹے مثل گھنڈی ہونے ، اور فالج میں

کیا ربط ہے؟ کہ دونوں کو ایک لڑی میں پرو دیا؟۔

پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ عضو کے کوتاہ اور بہت کوتاہ ہونے کا ذکر بار بار فرماتے ہیں، مگر اس کی متعین حد ذکر نہیں فرماتے ، اندرونِ فرج داخل نہ ہوسکنا ایک مبہم بات ہے، جس سے کسی خالی الذہن کے لئے کوئی واضح اور متعین نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قضیہ زیر بحث میں مدعا علیہ چونکہ قصیر الذکر ہے، تاہم اتنا نہیں کہ اس کو مجبوب کے حکم میں داخل کیا جاسکے، کیونکہ ہم تصریح کر آئے ہیں کہ جس شخص کا فقط حشفہ بھی داخل ہوسکتا ہو، اسے مجبوب کے حکم میں نہیں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ قاضی صاحب کو اصرار ہے کہ شخص مذکور کو مجبوب کے حکم میں داخل کرنا ہے اس لئے بار بار ذکر کے کوتاہ ہونے کا اور فرج کے اندرون نہ پہونچ سکنے کی بات دہرائی ہے، تا کہ ناظرین کا ذہن ان کی بات کو بآسانی قبول کرلے۔ چنانچہ تدریجاً وہ آخر میں یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ

''عضو مخصوص کی حد درجہ کوتہی کہ ہونا نہ ہونا برابر ہے''۔

اب آپ نے خیال فرمایا کہ اس ابہام وتکرار کا مقصد یہ تھا کہ مدعا علیہ کسی طرح عنت کی صف سے نکل کر مجبوبیت کے دائرہ میں آجائے، تا کہ تفریق بغیر تاجیل کے فیصلہ کے لئے جواز کی صورت پیدا ہوسکے، لیکن قاضی صاحب نے یہ غور نہیں فرمایا کہ ان کی علمی قابلیت اور بلند قامتی تسلیم کرتے ہوئے بھی اہل نظر کا ذہن ودماغ اس درجہ منجمد نہیں ہوگیا ہے کہ '' قصیر الذکر کالزر ''اور تین پوروں کے قریب عضو والے شخص کے درمیان امتیاز نہ کرسکیں، اور قاضی شریعت کے فرمان کو وحی آسمانی سمجھ کر کر مان لیں۔ آخر کھلی آنکھوں میں دھول جھونکنے سے کیا فائدہ؟۔

اور فالج زدہ شخص کے باب میں موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اور بھی حیرت انگیز ہے، تعجب ہے، دعوی اتنا اونچا کردیا اور دلیل معمولی درجہ کی بھی ندارد؟ جس اصول کی روشنی میں یہ جزئیہ ارشاد فرمایا گیا ہے، اس کو تو آپ دیکھ چکے کہ موصوف کس درجہ مغالطہ کے شکار ہوئے ہیں؟ جب اصول ہی کی بنیاد کھوکھلی ہے، تو فروع کو کون پوچھے؟ تاہم اللہ جزائے خیر دے فقہائے امت کو وہ اس طرح کے امراض میں بھی جن سے عضو مخصوص متأثر ہوسکتا ہے، خاموش نہیں ہیں،

بلکہ بہت وضاحت کے ساتھ ان کا بھی قصہ طے کر گئے ہیں، چنانچہ شامی میں ہے:

"(قوله لمرض)ای مرض العنت وهو ما يحدث فی خصوص آلة مامع صحة الجسد فلاينافی مایاتی من ان المریض لایوجل حتی یصح لان المراد به المرض المضعف الاعضاء حتی حصل به فتور فی الآلة ،فتأمل". (شامی ج۲۔ ص۵۹۴)

ترجمہ! (کسی مرض کی وجہ سے) یعنی مرضِ عنت کی وجہ سے، اور عنت وہ مرض ہے جو خاص آلۂ تناسل میں صحتِ جسمانی کے باوجود ہوتا ہے۔ اس تشریح کے بعد اس میں اور بعد میں آنے والے اس مسئلہ میں کہ مریض کو جب تک وہ صحت مند نہ ہو جائے، مہلت نہیں دیجائے گی، کوئی تعارض نہیں رہتا، کیونکہ اس مسئلے میں وہ مرض مراد ہے جو بدن کے اور حصوں میں ہوتا ہے، اور جس کی وجہ سے عضوِ تناسل میں بھی فتور پیدا ہو گیا ہو۔

عبارت قدرے مجمل ہے، اس لئے اس کی تفصیل مناسب معلوم ہوتی ہے، صاحب درمختار نے عنین کو ایک سال کی مہلت کا حکم بیان کرتے ہوئے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ "جو شخص عورت سے کسی مرض وغیرہ کی وجہ سے جماع پر قادر نہ ہو، عنین ہے"۔ پھر تھوڑی دور چل کر یہ فرماتے ہیں کہ:

"یوجل من وقت الخصومة ما لم یکن صبیاً او مریضاًاو محرماًفبعد بلوغه وصحته واحرامه". (شامی ج۲۔ص۵۹۵)

ترجمہ! مہلت کی ابتدا وقتِ خصومت سے ہوگی، بشرطیکہ وہ نابالغ، مریض، یا حالتِ احرام میں نہ ہو، ورنہ پھر بلوغ، صحت، اور احرام سے نکل جانے کے بعد سے مہلت شمار ہوگی۔

اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ مریض کی مہلت صحت ہونے کے بعد شمار ہوگی، اور پیشتر کی تشریح سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو شخص مرض کی وجہ سے صحبت پر قادر نہ ہو اس کو اسی حال میں سال بھر کی مہلت دی جائے گی۔ دونوں عبارتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے علامہ شامی فرماتے ہیں کہ پہلی صورت میں مرض سے مراد مرضِ عنت ہے، جو بطور خاص عضوِ تناسل میں ہوتا ہے، اس میں مہلت اسی حال میں دی جائے گی، اور دوسری

صورت میں مرض سے مراد عام امراضِ جسمانی ہیں،جن سے آلہ میں فتور پڑ جاتا ہے۔اس صورت میں صحت ہونے کے بعد مہلت دی جائے گی۔اس تشریح کے بعد ظاہر ہے کہ فالج مخصوص عضوِ تناسل کا مرض نہیں ہے، بلکہ عام امراضِ بدن میں اس کا شمار ہے،لہٰذا اس کے مقدمہ میں حقِ تفریق کا سوال ہی نہیں اٹھتا، ہاں فالج سے صحت یاب ہونے بعد اگر وہ شخص صحبت پر قادر نہ ہوسکا تو اسے عنین قرار دے کر سال بھر کی مہلت دی جائے گی، نہ کہ اس پر ادھر فالج کا اثر ہوا اور ادھر عورت جھٹ قاضی کی عدالت میں پہونچی،قاضی صاحب نے ڈاکٹری معائنہ کرا کے سرٹیفکٹ حاصل کر لی کہ مرض یا تو لاعلاج ہے یا اس سے شفا کی امید کمتر ہے،بس اس بنیاد پر قاضی صاحب نے مجبوب کے حکم میں ملحق کر کے عورت کے ہاتھ میں جھٹ پروانۂ تفریق تھما دیا۔

غور کیجئے! کس قدر بے اصول اور بے جوڑ بات ہے؟ یہ نکاح وتفریق کا معاملہ کیا ہوا کھیل بن گیا۔ان بنیادوں پر اگر فسخِ نکاح کیا جانے لگا تب تو کسی کا نکاح محفوظ نہیں رہ سکتا، خصوصاً ہمارے دورِ ناخدا ترسی میں، جبکہ دس بیس ٹکے دے کر بے تکلف اچھے اچھے ڈاکٹروں سے جعلی سرٹیفکٹ حاصل کرنا روز مرہ کا مشاہدہ ہے،اب وہ لوگ کہاں جو جھوٹ کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔معاملہ بہت آسان ہے، جہاں کسی عورت کو شوہر سے شکایت ہوئی ،فوراً قاضی کی عدالت میں پہونچی،شوہر کے خلاف عنت کا دعوی کیا، قاضی تو فرض کئے بیٹھا ہے کہ عورت بہرحال مظلوم ہوتی ہے،اس نے شوہر کو عدالت میں گھسیٹ بلایا،رسوائی الگ ہوئی،ڈاکٹری معائنہ کرایا گیا، ڈاکٹر کو دس بیس ٹکے دستیاب ہوگئے،اس نے موافق رپوٹ لکھ دی، قاضی صاحب نے مجبوب قرار دے کر تفریق بغیر تاجیل کا فیصلہ کر دیا، چلئے قصہ ختم ہوا،عورت نے دوسری جگہ شادی رچالی،شوہر غریب کہتا ہی رہے کہ میں عنین نہیں ہوں،کون سنتا ہے؟ قاضیِ شریعت کا فیصلہ ہے کس مفتی میں طاقت ہے کہ دم مار سکے؟اب شوہر اولاً اپنے مرد ہونے کی سند حاصل کرے، پھر کہیں اس کا نکاح ہوسکتا ہے، ورنہ زندگی بھر نامردی کا داغ لگائے بیٹھا رہے،اور گوشۂ رسوائی میں مر جائے۔سبحان اللہ! ؎ ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند

قاضی صاحب نے میڈیکل سائنس کی دہائی دی:

قاضی صاحب موصوف نے میڈیکل سائنس کی ترقی کی دہائی دیتے ہوئے ارشاد

فرمایا ہے کہ:

''موجودہ دور میں میڈیکل سائنس نے جو ترقی کی ہے اور جس کے نتیجے میں بہت سی دقیق اور پس پردہ باتیں آئینہ کی طرح منکشف ہوجاتی ہیں، انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ (ص۔۲۲)

کوئی محترم قاضی شریعت بہار سے دریافت کرے کہ قبلہ! میڈیکل سائنس کی ترقی صرف دریافتِ امراض اور انہیں لاعلاج یا عسیر العلاج ہی ثابت کرنے کے سلسلے میں ہوئی ہے یا علاج کرنے کے باب میں بھی؟ قاضی صاحب گستاخی معاف کریں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میڈیکل سائنس کی ترقی وغیرہ الفاظ بول کر مفتیوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات تو صرف ''شامی، بحرالرائق، اور فتح القدیر'' کی وادیوں میں گم رہتے ہیں، انہیں ان سب باتوں کی کیا خبر؟ ہم اس طرح کے انگریزی الفاظ بول دیں گے، بس مفتی سہم کر خاموش ہوجائیں گے۔

محترم قاضی صاحب! میڈیکل سائنس نے تو ضرور ترقی کی ہے، لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ گزشتہ صدیوں میں طبِ یونانی نے ترقی نہیں کی تھی، بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض امراض کا علاج میڈیکل سائنس اب بھی دریافت نہیں کرسکی ہے، جبکہ طبِ یونانی اس کے علاج سے فارغ ہوچکی ہے۔ بعض امراض میں میڈیکل سائنس صرف چیڑنے پھاڑنے کا حکم دیتی ہے، جب کہ طبِ یونانی معمولی گھاس پات سے ان کا کامیاب معالجہ کرلیتی ہے۔ اور پھر محترم! ترقی تو یہ ہے کہ پہلے کوئی مرض لاعلاج رہا ہو اور اب میڈیکل سائنس نے کوئی کامیاب علاج دریافت کیا ہو، نہ یہ کہ یونانی طبیب تو کامیاب معالجہ کی ضمانت دیتا ہے، اور میڈیکل سائنس کا ماہر اسے لاعلاج کہنے پر بضد ہو، اگر یہی ترقی ہے تو اسے ترقیٔ معکوس کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

قاضی صاحب نے دلیل پیش کی:

ماہر اطباء کی رائے کو موصوف جو غیر معمولی وزن دیتے ہیں، اس کے لئے استدلال میں ''معین الحکام'' سے یہ وضاحت نقل کی ہے:

"ویجب الرجوع الی قول اھل البصر،والمعرفة من النخاسین فی معرفة عیوب الرقیق من الاماء والعبید وسائر الحیوانات".

ترجمہ! لونڈی غلام اورحیوانات کے عیوب کی شناخت کے متعلق ماہر اوراہل بصیرت بردہ فروشوں کی جانب رجوع کرنا ضروری ہے۔

سوال دیگر جواب دیگر۔اسے کہتے ہیں۔دعوی یہ ہے کہ مریض قابلِ علاج ہے یا نا قابلِ علاج ؟اس کے تحقیق میں ڈاکٹروں کی رائے پر اعتماد کرکے اس کے مطابق فیصلہ شرعی کیا جائے گا۔دلیل یہ ہے کہ مرض کی شناخت اور تعیین میں اختلاف ہوتو ماہرین کی جانب رجوع کیا جائے۔کوئی بتائے کہ یہ دلیل مذکورہ دعوی پر کیونکر منطبق ہوسکتی ہے؟ قضیہ زیر بحث میں مرض کی شناخت خود مریض کے اقرار سے ثابت ہے،اور دلیل مذکور میں قابلِ علاج اور لاعلاج ہونے کی تشخیص کے متعلق نہ کوئی صراحت ہے نہ اشارہ، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے استدلال کیسے درست ہوا؟اس تشخیص کے سلسلے میں دلیلِ مذکور کچھ نصرت نہیں کرتی ،حیرت ہے قاضی صاحب جیسا دانش مند عالم اس درجہ بے جوڑ استدلال کیسے حوالۂ قلم کررہا ہے؟۔

الحاق بالمجبوب کا نکتہ:

قاضی صاحب چند فتاوے کے ذکر کے بعد جو فیصلہ کے خلاف مختلف مراکز سے حاصل کئے گئے تھے،لکھتے ہیں:

> ''بہرحال میرے نزدیک جملہ مذکورۃ الصدر فتاوے اصولی طور پر صحیح ہونے کے باوجود اس مقدمہ خاص میں دیئے گئے حکم کو متأثر نہیں کرتے کہ فیصلہ کرنے والوں نے اہل معرفت کی رائے اور معائنہ پر اعتماد کرتے ہوئے علت کو نا قابلِ زوال سمجھا،اوراس ظن غالب کے حصول کے بعد انہوں نے اسے مجبوب کے ساتھ ملحق قرار دیتے ہوئے تاجیل کی ضرورت نہیں سمجھا،اورفوراً حکم تفریق دےدیا''۔(ص۔۲۴)

ان سطروں کے پڑھنے کے بعد اگر آپ کے پاس کتابچہ موجود ہوتو فیصلہ ایک بار پھر غور سے پڑھ جایئے ،اور نہ ہوتو ہم نے فیصلہ کا جو خلاصہ درج کیا ہے اسے ہی دیکھ لیجئے ،اورغور کیجئے، کہ فیصلہ کرنے اورنافذ کرنے والوں کے ذہن ودماغ کے کسی گوشے میں الحاق بالمجبوب کا نکتہ

محسوس ہوتا ہے،ہمیں تو محسوس نہیں ہوا،صاف ظاہر ہے کہ فیصلہ عنین لا علاج ہونے کی بنیاد پر ہوا ہے،لیکن غالبًا اس بنیاد کا ضعف قاضی صاحب بھی محسوس فرماتے ہیں،اور انہوں نے طے کر رکھا ہے کہ مذکورہ فیصلہ صحیح ثابت کرنا ہے،خواہ علم و دیانت کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے،اس بنا پر ایک نکتہ اپنی جانب سے تصنیف کر کے فیصلہ میں نتھی کر دیا،لیکن ہمارے خیال میں ایسا کر کے وہ اپنے وقارِ علم و تفقہ میں کوئی خوشگوار اضافہ نہیں فرما رہے ہیں۔افسوس،ہمیں قاضی محترم کے ساتھ بہت حسن ظن تھا،مگر اس مقالہ کے پڑھنے کے بعد اس کا قائم رکھنا دشوار ہو گیا،انہیں قلم اٹھانے سے پہلے تمام امور پر غور کر لینا چاہئے تھا۔ہمیں سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ مقالہ میں کس بے تکلفی سے متعدد بے دلیل دعوی کرتے چلے گئے ہیں،اور ان پر انہیں اصرار ہے،پھر انہیں بے بنیاد مزعومات پر تفریعات کی عمارت بھی کھڑی کر دیتے ہیں۔اگر اسی کا نام علم و تفقہ ہے تو آدمی کا اس سے خالی رہنا بہتر ہے۔

یہاں جی چاہتا ہے کہ محکمہ شرعیہ مئو کے اربابِ حل وعقد سے گزارش کر دی جائے کہ اگر انہیں مریض کا معائنہ کرانا ضروری تھا تو کیا اس کے لئے کوئی ماہر تجربہ کار اور متدین طبیب و ڈاکٹر ضروری نہیں تھا؟ ہمارے علم میں مئو کے اندر بعض دیندار اطبا خاص انہیں امراض کے ماہر موجود ہیں،آپ نے ان کی جانب رجوع نہیں کیا،ان کی رائے اس مسئلہ میں جو وزن رکھتی وہ خود آپ پر بھی مخفی نہیں ہے۔

مؤیدین سے گزارش:

کتابچہ کے آخر میں بہت سے علماء کرام کی تائیدات ثبت ہیں،ان تائیدات کو دیکھ کر ہمیں اولاً تو یہی خیال ہوا کہ جب ان اکابر نے تصدیق کر دی ہے تو ہماری کیا بساط کہ زبانِ نقد کھولیں،لیکن پورا کتابچہ پڑھ جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ حضرات مؤیدین غالبًا ایک دوسرے پر اعتماد کر کے پورا مضمون پڑھے بغیر دستخط ثبت کر دیئے،یا یہ ہوا ہو کہ پڑھنے کے بعد مضمون کے ظاہری کروفر سے متأثر و مرعوب ہو گئے ہوں۔بہر حال جو بات بھی ہو ان حضرات کے لئے ایسا کرنا مناسب نہ تھا،ان میں بعض تصدیقات تو محض بھرتی کی ہیں،تاہم ان کی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ:

''حضرات مؤیدین کرام! آپ خوب جانتے ہیں کہ شریعت میں نکاح کتنا مقدس رشتہ ہے،اورعورت سے حلِ استمتاع کا معاملہ کس درجہ نازک ہے؟اوراسی کے مقابلہ میں زنا کی قباحت وشناعت کس قدر ہے۔اوراسی لئے نکاح منعقد ہوجانے کے بعد احتیاطیں ملحوظ رکھی گئی ہیں کہ بعض جگہ ناواقفِ حال شخص کو اچھا خاصا تشدد معلوم ہونے لگتا ہے۔اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ مذہب احناف کی رو سے یہ شرعی پنچایت وغیرہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ہمارے علمانے زمانۂ حال کی مشکلات پرنظر رکھتے ہوئے ان مسائل ومعاملات میں بدرجۂ مجبوری امام مالک کا مسلک اختیار فرمایا ہے۔ان باتوں پرنظر کرتے ہوئے ضروری تھا کہ تصدیق کرنے سے پہلے خوب تحقیق فرمالی ہوتی، یہ مسائل عامۃ الورود بھی نہیں ہیں کہ ہروقت ان کی تفصیلات ذہن میں مستحضر رہتی ہوں، بلکہ مدتوں میں کبھی پیش آتے ہیں،اس لئے اور بھی زیادہ تحقیق کی ضرورت تھی، اپنے اہل علم احباب پراعتماد کرنا نامناسب نہیں ہے،لیکن مسئلہ نازک تھا اس لئے بطورخود تلاش بھی ناگزیر تھی۔اب آپ نے دیکھا کہ فیصلہ کس درجہ غلط ہوا،تفریق قطعاً نہیں ہوئی، مدعیہ اب بھی مدعاعلیہ کے نکاح میں ہے،دوسرا نکاح قطعاً باطل ہے،اس کا سارا وبال قاضی پرآئے گا،مگر چونکہ شرکت اس کی تائید میں آپ حضرات کی بھی ہوگئی خواہ بعد ہی میں ہوئی ہو،اس لئے اس وبال سے آپ حضرات بھی اپنا دامن بچانہیں سکتے۔اب اس کی صورت یہی ہے کہ فوراً اس سے رجوع کیجئے،حق کے معاملہ میں مداہنت، یاجنبہ داری،یاخوشامد روانہیں ہے،اوراگرآپ کے نزدیک واقعی فیصلہ صحیح ہےتوہماری ان معروضات کو بدلائلِ واضحہ رد کیجئے،تاکہ ہم اپنے خیال سے بازآئیں

وللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

خاتمہ:

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا انکشاف بھی کردیا جائے کہ جس مریض کے لاعلاج ہونے کا شہرہ اڑا دیا گیا ہے پہلے تو اس کی نامردی کو مخصوص لوگ ہی جانتے تھے، اوراب وہ سربازار رسوا ہوگیا ہے،تھوڑی مدت کے علاج کے بعد مکمل صحت یاب ہوچکا ہے،اس سلسلے میں ایک سندتو خود معالج نے دی ہے،اوردوسری جناب ڈاکٹر اظہارالحق صاحب نے جن کے بیان کا حوالہ باربارآیا ہے۔ہمارا مقصد اس سے صرف اتنا ہے کہ اس کے لاعلاج ہونے کے

فیصلہ میں کس درجہ نامناسب تعجیل کی گئی ہے۔ کتابچہ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ کبھی صحت یاب نہ ہوگا، خدا کا کرنا، وہ کس قدر جلد صحت یاب ہوگیا۔

یہاں جناب مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب کی یہ سطریں پڑھ لیجئے:

''خصوصیت کے ساتھ مقدمۂ زیر بحث میں مدعا علیہ کے نقص کی جو کیفیت واضح ہوکر سامنے آئی ہے، اور جس مرض کا فقہا[۳] نے حوالہ دیا ہے، اس مرض کے بارے میں مَیں نے پٹنہ میڈیکل کالج کے بعض ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا اور ان کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ مرض بہت پیچیدہ ہے، اور خاص کر بلوغ کے بعد اس کی پیچیدگی کئی گنا بڑھ جاتی ہے''۔

غور کیجئے! جس مریض کو پٹنہ سے لے کر دیوبند کے قاضیان کرام لاعلاج ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ڈاکٹروں سے شہادتیں حاصل کی جارہی ہیں، مرض کی پیچیدگی کو بہت اہتمام سے بیان کیا جارہا ہے، وہی مریض خود اسی مقالہ کے ضبطِ تحریر میں آنے سے مہینوں پہلے صحت مند اور شفایاب ہوچکا ہے، معلوم نہیں کن ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا، جن کی مہارت کی خصوصیت بس اتنی ہے کہ جس وقت وہ مریض کو لاعلاج ہونے کا سارٹیفکٹ دے رہے ہیں، عین اسی وقت وہ اپنے مرض سے نجات پاچکا ہے۔ **والقدرة والعلم عند الله**

هذا آخر كلامنا، والله نسأله التوفيق ونرجو منه القبول ولاحول ولاقوة الا بالله العلى العظيم

حاشیہ

(۱) تصریح کچھ نقل کی تھی، مگر اس میں تلبیس اتنی واضح تھی کہ مرتب رسالہ نے شاید رسوائی کے خوف سے نکال دیا۔

(۲) ہم نے یہ مضمون اصل کتاب سے نہیں بلکہ اس کی فوٹو کاپی سے نقل کیا ہے، جس پر جگہ جگہ کالے دھبے پڑے ہوئے ہیں، اس لئے خط کشیدہ الفاظ واضح نہیں ہوسکے۔

(۳) موصوف نے درمختار کے حوالے سے جو طویل اقتباس دیا ہے، اس میں یہ تصریح ضرور موجود ہے لیکن قاضی صاحب نے تشریح کے ذیل میں اسے ذکر نہیں کیا ہے۔

(۳) اصل کتاب میں تو فقہا کا ہی لفظ ہے، لیکن غالبًا یہ سہوِ کتابت ہے، اطباء ہونا چاہئے۔

أَلْمَدُّ التَّعْظِيْمِيْ لِاسْمِ الْجَلَالَةِ
یعنی
لفظ ’’اللہ‘‘ میں مد کی تحقیق

مُقَدِّمَۃ

کم وبیش پچیس سال پہلے یہ خاکسار راقم الحروف الہ آباد مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے قائم کردہ مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس تھا، حضرت مصلح الامت کی برکت سے الہ آباد علماء ومشائخ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ملک کے نامور مشائخ الہ آباد تشریف لایا کرتے، ان دنوں حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ کے ساتھ شیخ طریقت حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی نور اللہ مرقدہٗ کا بھی الہ آباد میں فیضان جاری تھا۔

الہ آباد میں پہلی مرتبہ یہ بات علم میں آئی کہ فلاں بزرگ اذان میں اسم ذات ’’اَللّٰہُ‘‘ میں مد وتطویل پر نکیر فرماتے ہیں، اور اسے جائز نہیں قرار دیتے۔ اور اس بات پر انھیں اصرار ہے، تعجب ہوا کہ قرآنی کلمات کے تلفظ کا مسئلہ جو کہ فن تجوید سے متعلق ہے، اس کے مسائل کا یہ اہتمام بلیغ اذان میں کیوں ہے؟ جہاں تک کلمات اذان کی تصحیح کا مسئلہ ہے، اس کا اہتمام تو ہونا ہی چاہئے، لیکن لفظ ’’اَللّٰہُ‘‘ پر مد کرنا اتنا غلط ہے کہ اس پر اس شد ومد سے نکیر کی جائے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا، چونکہ وقت کے ایک مسلم اور بڑے بزرگ کی جانب سے یہ آواز اٹھ رہی تھی، اس لئے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ایک روز الہ آباد کے ایک بڑے بزرگ جو عالم بھی تھے، قاری بھی تھے، فن تجوید میں

مہارت رکھتے تھے،اور مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ کے خلیفہ بھی تھے، یہ بزرگ حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب[۱] تھے،حضرت موصوف دوتین صفحے کی ایک تحریر لکھ کرلائے ،اس میں انھوں نے اول الذکر بزرگ کے خیال کی تردید فرمائی تھی، انھوں نے یہ تحریر میرے حوالے کی اور فرمایا کہ اس تحریر سے اگر آپ متفق ہوں تو اس پر مفصل مضمون لکھ دیں، مجھے ان کا مضمون پسند آیا اسی کو بنیاد بنا کر میں نے مطالعہ شروع کیا۔اور حاصل مطالعہ ایک مضمون کی صورت میں لکھ کر حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا،انھوں نے پسند کیا، اورتصویب فرمائی ، پھراس وقت کے ماہر مجود وقاری استاذ الاساتذہ حضرت قاری ظہیر الدین صاحب معروفی[۲] مصنف''احیاءالمعانی'' کی خدمت میں پیش کیا،انھوں نے بھی تائید و تحسین فرمائی، اس کے بعد میں نے مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی حضرت مولانا مفتی محمد حنیف صاحب مدظلہٗ[۳] اورشعبۂ تجوید وقرأت کے صدر حضرت مولانا قاری محمد اسماعیل صاحب[۴] کی خدمت میں پیش کیا،ان دونوں بزرگوں نے بھی تائید فرمائی۔ ان حضرات کی تائیدات کے بعداس کی صحت پر اطمینان ہوگیا،اس وقت برادرعزیز مولانا مفتی زین الاسلام صاحب الہ آبادی استاذ ومفتی مدرسہ بیت المعارف الہ آباد، دارالعلوم دیوبند میں دارالافتاء کے طالب علم تھے،انھیں میں نے مذکورہ مضمون دے دیا کہ رسالہ دارالعلوم دیوبند میں شائع کرادیں۔

میں منتظر رہا کہ رسالہ میں چھپ جائے گا ،مگرنہیں چھپا، چند ماہ کے بعد وہ الہ آباد تشریف لائے تو ایک رسالہ میرے ہاتھوں میں دیا،جس کا نام تھا''**أَلْـمَـدُّ التَّـعْـظِيْـمِیُ لِاِسْمِ الْـجَلَالَةِ**''اور مرتب کی جگہ میرا نام لکھا ہوا تھا۔ مجھے تعجب ہوا۔انھوں نے بتایا کہ یہ آپ والا وہی مضمون ہے، جسے دارالعلوم میں آپ شائع کرانا چاہتے تھے، میں نے دارالعلوم رسالہ میں دینے سے پہلے مناسب سمجھا کہ استاذی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب[۵] کو سنادوں،انھوں نے سنا تو بہت پسند فرمایا،اور حکم دیا کہ اسے پرچے میں نہیں رسالہ کی شکل میں چھپواؤ،انھیں نے رسالہ کا یہ نام رکھا،اور چھاپنے کے اخراجات بھی عطا فرمائے اورارشاد فرمایا کہ حافظ محمد طیب صاحب مکتبہ نعمانیہ والوں کو دیدو، وہ شائع کرادیں گے۔ چنانچہ انھوں نے شائع کرادیا ہے اور آپ کی

خدمت میں بھیجا ہے، اس خبر سے اس وقت کتنی خوشی ہوئی اب کیا عرض کروں۔

کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اللہ جانے یہ رسالہ ان بزرگ کی خدمت میں باریاب ہوسکا یا نہیں، لیکن یہ مسئلہ ان کی طرف منسوب ہوکر وجہ نزاع بنا رہا، اساتذہ کی صحبت اور کتابوں کے مطالعے سے میرے دل میں ایک عرصے سے یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اس جیسے فروعی اور اجتہادی مسائل میں کسی پہلو پر شدت اختیار کرنی مناسب نہیں ہے، اس جگہ میں اس بات کو ادا کرنے کے لئے کہ فروعی اور اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کیا ہیں؟ اور ان کے امر کرنے اور ان پر نکیر کرنے میں شدت برتنے کا کیا حکم ہے؟ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں، اس سے میرا مدعا بھی واضح ہوگا۔ اور مناسب راہِ اعتدال بھی سامنے آئے گی۔ ان کا ایک رسالہ ''وحدت امت'' ہے اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نظری مسائل میں آراء کا اختلاف نہ مضر ہے، نہ اس کے مٹانے کی ضرورت ہے نہ مٹایا جاسکتا ہے، اختلافِ رائے نہ وحدتِ اسلامی کے منافی ہے نہ کسی کے لئے مضر! اختلاف رائے ایک فطری اور طبعی امر ہے جس سے کبھی انسانوں کا کوئی گروہ خالی رہا نہ رہ سکتا ہے..........

انتظامی اور تجرباتی امور میں تو اختلافِ رائے خود رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں آپ کی مجلس میں ہوتا رہا اور خلفائے راشدین اور عام صحابۂ کرام ؓ کے عہد میں امورِ انتظامیہ کے علاوہ جب نئے نئے حوادث اور شرعی مسائل پیش آئے جن کا قرآن وحدیث میں صراحۃً ذکر نہ تھا، یا قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت سے یا ایک حدیث کا دوسری حدیث سے بظاہر تعارض نظر آیا، اور ان کو قرآن وحدیث کی نصوص میں غور کر کے تعارض رفع کرنے اور شرعی مسائل کے استخراج میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لینا پڑا، تو ان میں اختلافِ رائے ہوا، جس کا ہونا عقل ودیانت کی بنا پر ناگزیر تھا۔

اذان ونماز جیسی عبادتیں جو دن بھر میں پانچ مرتبہ میناروں اور مسجدوں میں ادا کی جاتی ہیں، ان کی بھی جزوی کیفیات میں اس مقدس گروہ کے افراد کا خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔

ایسے ہی غیر منصوص یا مبہم معاملات میں حلال وحرام، جائز ناجائز میں بھی صحابہ کرام ؓ

کی رایوں کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شاگرد حضرات تابعین کا یہ عمل بھی اہل علم کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت کسی صحابی کی رائے کو اختیار کر لیتی تھی ،اور کوئی ان کے بالمقابل دوسری جماعت دوسرے صحابی کی رائے پر عمل کرتی تھی ،لیکن صحابہ وتابعین کے اس پورے خیرالقرون میں، پھر اس کے بعد ائمہ مجتہدین اوران کے پیروؤں میں کہیں ایک واقعہ بھی ایسا سننے میں نہیں آیا کہ ایک دوسرے کو گمراہ یا فاسق کہتے ہوں ، یا کوئی مخالف فرقہ یا گروہ سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے اقتداء کرنے سے روکتے ہوں[۲] یا کوئی مسجد میں آنے والا لوگوں سے یہ پوچھ رہا ہو کہ یہاں کے امام اور مقتدیوں کا اذان واقامت کے صیغوں میں قرأت فاتحہ، رفع یدین وغیرہ میں کیا مسلک ہے؟ ان اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدال یا سب وشتم ،توہین ، استہزاء اور فقرہ بازی کا تو ان مقدس زمانوں میں کوئی تصور ہی نہ تھا۔

امام ابن عبدالبر قرطبیؒ نے اپنی کتاب ’’جامع بیان العلم‘‘ میں سلف کے باہمی اختلافات کا حال الفاظ ذیل میں بیان کیا ہے،:

’’عن یحییٰ بن سعیدٍ قال مابرح اهل الفتویٰ یفتون فیحل هٰذا یحرم هٰذا فلا یریٰ المحرم المحل ولا یریٰ المحل أن المحرم هلک لتحریمه‘‘۔(ص۸۰) یحیٰی بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتوے دیتے رہے،ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو حلال قرار دیتا ہے دوسرا حرام کہتا ہے،مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک اور گمراہ ہوگیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ حرام کا فتویٰ دینے والا ہلاک یا گمراہ ہوگیا۔

اسی کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسامہ بن زید نے فقیہ مدینہ حضرت قاسم بن محمد سے ایک مختلف فیہ مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ جس پر عمل کر لیں کافی ہے، کیونکہ دونوں طرف صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کا اسوہ موجود ہے۔

یہاں اصولِ دین اور اسبابِ اختلاف سے ناواقف لوگوں کو شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شریعت اسلام میں ایک چیز حلال بھی ہو اور حرام بھی ہو، اور جائز بھی ہو، ناجائز بھی ہو، ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک غلط اور ایک صحیح ہوگی پھر دونوں جانب کا یکساں احترام

کیسے باقی رہ سکتا ہے، جس کو ایک آدمی غلط سمجھتا ہے اس کو غلط کہنا عین دیانت ہے۔

جواب یہ ہے کہ کلام مطلق حرام وحلال اور جائز وناجائز میں نہیں، کیونکہ قرآن وسنت کے منصوصات اور تصریحات کے اعتبار سے کچھ چیزیں واضح طور پر حرام ہیں، جیسے سود، شراب، جوا، رشوت وغیرہ، ان میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں، اور نہ سلف صالحین کا ان میں کہیں اختلاف ہوسکتا تھا، اور ان میں اختلاف کرنا تو دین کے بینات اور واضح نصوص کا انکار کرنا ہے یہ باتفاق امت گمراہی اور الحاد ہے، اور جو ایسا کرے اس سے بیزاری اور برأت کا اعلان کرنا عین تقاضائے ایمان ہے، اس میں رواداری ممنوع ہے۔

یہ رواداری کی تلقین اور اختلاف رائے کے باوجود اپنے مخالف کی رائے کا احترام صرف ایسے مسائل میں ہے جو یا تو قرآن وسنت میں صراحۃً مذکور نہیں ہیں یا مذکور تو ہیں مگر ایسے اجمال وابہام کے ساتھ کہ ان کی تشریح وتفسیر کے بغیر ان پر عمل نہیں ہوسکتا، یا دو آیتوں یا دو روایتوں میں بظاہر کچھ تعارض نظر آتا ہے، ان سب صورتوں میں مجتہد عالم کو قرآن وسنت کے نصوص میں مقدور بھر غور وفکر کرکے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا منشاء اور مفہوم کیا ہے، اور اس سے کیا احکام نکلتے ہیں، اس صورت میں ممکن ہے کہ ایک مجتہد عالم اصول اجتہاد کے مطابق قرآن وسنت اور تعامل صحابہ وغیرہ میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ فلاں کام جائز ہے اور دوسرا مجتہد عالم ان ہی اصولوں میں غور وفکر کرکے اس کے ناجائز ہونے کو صحیح سمجھے، ایسی صورت میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر وثواب کے مستحق ہیں کسی پر کوئی عتاب نہیں، جس کی رائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہے اس کو دوہرا اجر وثواب، اور جس کی صحیح نہیں اس کو ایک اجر ملے گا۔

جس مسئلہ میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن وسنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے، اس لئے دونوں جانب داخل معروف ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جاسکتا ہے، اس لئے ان مسائل مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک منکر ہے، یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز اور حرمت وحلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول

نہیں ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو جیسے منکرات پر کی جاتی ہے، یا ایک دوسرے کو یا اس کے متبعین کو گمراہی یا فسق وفجور کی طرف منسوب کرتا ہو یا اس کو ترکِ وظیفہ یا ارتکابِ حرام کا مجرم قرار دیتا ہو۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے امام شافعیؒ کا جو قول نقل کیا ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ یعنی اس کو خطاوار مجرم کہنا درست نہیں۔ (ماخوذ از ''وحدت امت''، بحذف واختصار)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ کے اسباب کیا ہیں؟ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اب میں ان اسباب وعوامل کو پیش کرتا ہوں، جو میرے غور وفکر کی حد تک مسلمانوں میں باہمی آویزش اور شقاق وجدال کا سبب بنے ہوئے ہیں، اور افسوس اس کا ہے کہ اس کو خدمت دین سمجھ کر کیا جاتا ہے''۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس موضوع پر جس چیز کو تفرقہ کا پہلا سبب بتایا ہے وہ غلو ہے، غلو یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ اور حکم کا جو درجہ اور رتبہ ہو اس کی حد سے آگے بڑھا دیا جائے۔ غلو ہی کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ غیر منصوص اور اجتہادی مسائل کے سلسلے میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ وہ فرض وواجب یا حرام وناجائز معلوم ہونے لگ جائیں۔ حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک اس جنگ وجدل کا ایک بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحزب وتعصب اور اپنی اختیار کردہ راہ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا، اور اس عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے، جو اہل باطل اور گمراہ فرقوں کے ساتھ کرنا چاہیے''۔

پھر لکھتے ہیں کہ:

''مضرت رساں اور تباہ کن ایک تو اس کا یہ منفی پہلو ہے کہ اپنی رائے اور اختیار سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جنگ وجدال کیا جائے، اور دوسرے ان فروعی مسائل کی بحثوں میں یہ غلو ہو کہ علم وتحقیق کا سارا زور اور بحث وتمحیص کی طاقت اور عمر کے اوقاتِ عزیز ان ہی بحثوں کی نذر ہو جائیں، اگرچہ ایمان واسلام کے بنیادی اور قطعی اجماعی مسائل مجروح ہو رہے ہوں، کفر والحاد دنیا میں پھیل رہا ہو، سب سے صرف نظر کر کے ہمارا علمی مشغلہ یہی فروعی

بحثیں بنی رہیں‘‘۔

مفتی صاحب کے اس ارشاد کی روشنی میں غور کرنا چاہئے کہ کلماتِ اذان میں مَد کرنے اور تجوید وترتیل کے غیر منصوص مسائل میں اتنا زورصرف کرنا کہ ان کی بنیاد پر مسلمانوں میں تفرق وانتشار پیدا ہونے لگے، یا وہ حلال وحرام کی اہمیت اختیار کرلیں، کہاں تک بجا ہے؟ اس طرح کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے بڑا میدان موجود ہے، جہاں صراحۃً اللہ ورسول ﷺ کے قطعی فرمانوں کی خلاف ورزی ہورہی ہے، ان پر محنت صرف کریں، تو اصلاح مفید ہو، ان جزئی اور اجتہادی وغیر منصوص مسائل میں تنگی پیدا کرنے اور انھیں منکر کے دائرے میں لاکر ان کی نہی پر زور لگانا بجائے خود منکر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جو کچھ فرمایا، راہِ اعتدال وہی ہے، جو مسائل قرآن وسنت کے نصوص سے صراحۃً ثابت ہیں، اور ان سے مسئلہ کا جو درجہ ثابت ہوتا ہے، اسی درجہ کا امر اور اسی درجہ کی نہی کی جائے گی، فرض یا حرام ہے، تو اس کے امر ونہی میں شدت کی جائے گی، سنت یا مستحب ہے یا مکروہ ہے، تو اسی لحاظ سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو کام میں لایا جائے گا، ہر چیز میں حدود کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اذان میں مدصوت ثابت ہے، لفظ اللہ پر مد کرنے کا مسئلہ قرآن وسنت کے نصوص سے غیر متعلق ہے، حضرات قراء ومجودین کے اجتہادات ہیں، پھر ان اجتہادات کا تعلق الفاظ قرآنی کی ترتیل سے ہے، اذان میں مدصوت سے نہیں، تو اس میں اگر اختلاف ہوسکتا ہے تو اولیٰ غیر اولیٰ کا ہوسکتا ہے، اس میں کسی ایک جانب کو منکر اور غلط کہنا، خود منکر کے دائرے میں آجاتا ہے، حضرات مجتہدین کے یہاں حلت وحرمت اور جائز وناجائز کا اختلاف ہوا ہے، تو بھی انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ کسی ایک پہلو کو بالکل غلط قرار دیا جائے، یہاں تو اس سے بہت ہلکا مسئلہ ہے۔

اسی طرح اور دوسرے بعض آداب ومستحبات کو ان کے درجے سے نکال کر فرائض و واجبات کے دائرے میں لوگ پہنچادیتے ہیں، اور ان کے خلاف پر ایسی نکیر کرتے ہیں، جیسے نہ کرنے والے نے کوئی گناہ کرلیا ہو، ان امور کو مستقل موضوع بنانا، ان پر زور دینا، مسئلہ کو اس کے

حدود سے خارج کرنا ہے۔

مسلمان اللہ جانے کن کن مسائل ومعاملات پرلڑتے ہیں،ان فروعی جزئیات ومسائل میں انھیں الجھا کرمزید اختلاف کی راہ ہموار کرنے سے نقصان ہی نظر آتا ہے۔

اذان میں مدصوت کا یہ مسئلہ بعض بعض جگہوں پر پھرمحلِ نزاع بنا ہوا ہے۔اس کے تدارک کے لئے ''اَلْمَدُّ التَّعْظِیْمِی'' کودوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۲۰؍جمادی الاولیٰ۱۴۲۴ھ

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) حضرت قاری حبیب صاحب کا آبائی وطن ضلع الٰہ آباد،موضع اوجھنی،تحصیل چایل ہے،اوجھنی میں ۶؍رجب۱۳۳۲ھ مطابق یکم جون؍۱۹۱۴ء بروز دوشنبہ پیدا ہوئے،ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک شخصی مکتب میں حاصل کی،حفظ قرآن مجید۱۲؍۱۳سال کی عمر میں مکمل کیا،مدرسہ سبحانیہ میں حضرت قاری محبّ الدین صاحب قرأت حفص کی تکمیل کی،اور وہیں ابتدائی عربی کی کتابیں بھی پڑھیں،اس کے بعد مظاہر علوم سہارن پور میں کافیہ کی جماعت میں داخلہ لیا،۱۳۵۵ھ کے لگ بھگ فراغت وہاں ہوئی،زمانہ طالب علمی میں حضرت تھانوی کی زیارت سے مشرف ہوئے،فراغت کے بعد حضرت مولانا عیسیٰ صاحب سے بیعت ہوئے،حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب سے اجازت وخلافت حاصل کی۔ ۶؍محرم۱۴۲۲ھ مطابق یکم؍اپریل ۲۰۰۱ء کوآپ کی وفات ہوئی۔(مزید تفصیل کے لئے ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' دیکھئے)

(۲) قاری ظہیرالدین صاحب کی پیدائش ۱۴؍محرم ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۴؍دسمبر ۱۹۱۲ء میں ہوئی،حافظ عبدالقادر صاحب معروفی سے حفظ کیا،پھر مدرسہ معروفیہ میں فارسی کی تعلیم حاصل کی،اور ابتدائی عربی تعلیم حضرت مولانا عبدالحی صاحب مئوی سے حاصل کی،پھر دارالعلوم مئو میں مشکوۃ شریف،بیضاوی شریف تک تعلیم حاصل کی۔علم تجوید وقرأت میں آپ امام الوقت ہیں،قرأت بروایت حفص قاری ریاست علی صاحب سے،قرأت سبعہ وعشرہ جناب قاری ضیاء الدین صاحب الٰہ آبادی اور قاری محبّ

الدین صاحب الہ آبادی سے حاصل کی۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں ۱۳۶۲ھ سے ۱۳۸۱ھ تک تدریسی خدمت انجام دی۔ آپ نے اردوخواں کے لئے قرأت سبعہ میں انتہائی جامع کورس چار جلدوں میں سب سے پہلے تالیف کیا۔ (۱) احیاء المعانی من حرز الامانی (جلد اول ،قرأت سبعہ کے اصولی اختلافات) (۲) احیاء المعانی من حرز الامانی (جلد دوم ،قرأت سبعہ کے فروعی اور جزئی اختلافات) (۳) اجراء السبعۃ المتواترۃ فی سورۃ الفاتحۃ والبقرۃ (۴) اصول ورش عن نافع ۔اس کے علاوہ عام حفاظ اور ناظرہ خواں کے لئے ''قواعد غنہ و مدود'' بھی تحریر فرمائی جس کی وجہ سے تلاوت کرنے میں قواعد کی رعایت انتہائی آسان ہوگئی۔ (اپنی باتیں ،آپ بیتی مولانا زین العابدین صاحب)

(۳) مشرقی یوپی کے مشہور صاحب افتا عالم ،حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کے شاگرد خصوصی اور عاشق زار۔ مفتی حنیف صاحب کا آبائی وطن لپری ضلع جونپور ہے، مدرسہ ریاض العلوم گورینی اور مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں عرصۂ دراز تک شیخ الحدیث رہے، اخیر عمر میں ہر طرف سے یکسو ہوکر جوما میں عزلت نشینی اختیار کی، سوسال سے زائد عمر پائی ، مارچ ۲۰۱۴ میں انتقال ہوا۔

(۴) مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے صدر القراء ،فن تجوید وقرأت کے امام ہیں، آپ کا آبائی وطن بہار ضلع رہتاس ہے، آپ کی پیدائش ۱۹۳۹ء میں صوبہ بنگال ضلع چوبیس پرگنہ کے مشہور شہر کانکی نارہ کا گنارہ میں ہوئی، جامعہ اسلامیہ مدنپورہ میں قاری عبداللہ سلیم صاحب دیوبندی سے عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرأت بروایت حفص مکمل کی، اور قاری عتیق احمد صاحب سے تحفۃ الاطفال ،خلاصۃ البیان، شاطبیہ رائیہ اور النشر للجزری پڑھی، اس کے بعد قرأت عشرہ کے لئے قاری محبّ الدین صاحب الہ آبادی کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے۔ بہت سادہ، صاحب تدین اور پر کشش شخصیت کے مالک ہیں عرصۂ دراز سے مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں سرگرم تدریس تجوید وقرأت ہیں۔ (حسن المحاضرات فی رجال القرأت ملخصاً ،ص ۳۸۲)

(۵) گنگوہ کے مشہور صاحب نسبت بزرگ ،مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند ،شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ کے جانشین وخلیفہ۔ آپ کی ولادت ۱۰؍ جمادی الثانی مطابق ۲۱؍ جولائی ۱۹۰۷ء میں قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور میں ہوئی، اور آپ کی وفات ۱۷؍ ربیع الآخر ۱۴۱۷ھ مطابق ۳؍ ستمبر ۱۹۹۶ء کو ہوئی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ''مفتی محمود الحسن صاحب ،حالات وواقعات زندگی کا ایک تاریخی تذکرہ''۔ مصنف۔ سید محمد شاہد سہارن پوری)

لفظ اللہ میں مد کی تحقیق

اہلِ علم حضرات کی مجلس میں ذکر ہوا کہ اذان میں لفظ اَللّٰہُ اَکْبَرُ میں آواز کا دراز کرنا اور لفظ اللہ میں مد پیدا کرنا درست ہے یا نہیں؟ چونکہ قواعدِ تجوید کے لحاظ سے طویل مَد کا ثبوت موجود نہیں ہے، اس لئے خلجان ہوا، خیال ہوا کہ اس سلسلے میں حضرات قراء سے دریافت کیا جائے، بعض حضرات نے کتب تجوید سے عبارتیں نقل کر کے بھیجیں اس کے ساتھ کتب فقہیہ کی مراجعت بھی کی گئی جس سے ذیل کی معلومات فراہم ہوئیں جن کو ترتیب کے ساتھ یکجا کر دیا گیا، یہ ایک طالب علمانہ مطالعہ وتحقیق ہے، اہل نظر دیکھیں اگر خامیاں اور اغلاط محسوس ہوں تو نشاندہی فرمائیں۔

اصولی طور پر لفظ اللہ میں (جو کلمات اذان میں آیا ہوا ہے) مَد کرنے کے سلسلے میں دو پہلوؤں سے گفتگو ہوسکتی ہے، قواعد فقہیہ کی رو سے اور قواعد تجوید کے لحاظ سے، اگر غور کیا جائے تو کلمات اذان کی ادائیگی اور تصحیح کا تعلق قواعد تجوید سے زیادہ قواعد فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ تجوید وترتیل کا وجوب جیسا کہ اہل علم میں معروف ہے، آیت ''ورتل القرآن ترتیلاً'' سے ثابت ہوتا ہے، یعنی قرآن ترتیل کے ساتھ پڑھو، کھلی بات ہے کہ یہ وجوب صرف قرآن کے سلسلے میں ثابت ہوتا ہے اس کے علاوہ احادیث اور دوسری عبارات پر اس کا اطلاق مشکل ہے، علاوہ ازیں اذان واقامت کے باب میں فقہاء ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔

''**الأذان جزمٌ والأقامة جزمٌ والتكبير جزمٌ** :۔اذان واقامت اور تکبیر سب کے آخری حروف ساکن ہیں''۔

مثلاً اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا جائے گا حالانکہ تجوید کا قاعدہ بلکہ عربیت کا قاعدہ بھی یہی چاہتا ہے کہ وصل کیا جائے یعنی اکبر کی راء کو مابعد کے اللہ سے ملا کر پڑھا جائے اور ہمزۂ وصل نہ پڑھا جائے، لیکن حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح ہے، معلوم ہوا کہ کلمات اذان کی شان قواعد کے لحاظ سے قرآن سے کچھ اوسع ہے، پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ فقہاء نے اذان کی غلطیوں سے بحث کی ہے اور بعض ایسی لغزشیں بھی زیر بحث لائے ہیں جن میں ابتلا عام طور سے بکثرت نہیں پایا جاتا اور تنبیہ قواعد تجوید کے لحاظ سے نہیں فرمائی ہے بلکہ فسادِ معنی کے باعث ان کو ذکر کیا ہے مثلاً لفظ اللہ میں الف کے فتحہ کو نہ کھینچنا چاہئے کیونکہ اس سے استفہام کا معنی پیدا ہوتا ہے اور اس طرح مؤذن بجائے اللہ کی کبریائی اور عظمت کے اظہار کے اس میں شک وتردد کا منادی بن جاتا ہے، گویا وہ کہہ رہا کہ کیا واقعی اللہ سب سے بڑا ہے؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس میں کس درجہ قباحت ہے، یا اسی طرح اکبر کی باء کے فتحہ کو اتنا طول نہ دیا جائے کہ الف بن جائے، اس لئے کہ وہ شیطان کا نام ہے نیز یہ بھی مذکور ہے کہ اذان میں لحن نہ کیا جائے یعنی اس کو قواعد موسیقی پر ڈھال کر گانے کا لہجہ نہ بنادیا جائے وغیرہ، بس اس کے علاوہ لام اللہ کے مَد کے ناجائز ہونے کی تصریح نہیں ملتی ہے حالانکہ اذان میں آواز کو طول دینا اور بڑھانا کچھ آج کی چیز نہیں ہے یہ تو توارثاً منقول ہوتی آئی ہے، پچھلوں نے اگلوں سے حاصل کیا، کتابوں میں لہجہ تو لکھا نہیں ہوتا جس طرح قرآن پڑھنے کا انداز قرناً بعد قرنٍ منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے ایسے ہی اذان کا انداز بھی قدیم ہے اور جس طرح قرآن پڑھنے کے سلسلے میں جو غلطیاں واقع ہوتی ہیں انھیں قراء اور مجودین درست کردیتے ہیں ایسے ہی فقہاء اذان میں واقع ہونے والی غلطیوں کی اصلاح کرتے آئے ہیں، اگر یہ چیز غلط ہے تو کتب فقہ خاموش کیوں ہیں؟ بلکہ اذان کا مقصود اعلام واعلان ہے جو بغیر مَدِ صوت کے کما حقہٗ پورا نہیں ہوگا، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

فقہاء میں بڑے بڑے قراء اور مجودین بھی ہوئے ہیں، مَد کی غلطی کو فقہ کی حیثیت سے نہ سہی تجوید ہی کی حیثیت سے بیان کرتے، ماضی کے اکابر علماء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ حدیث وفقہ اور تجوید کے جامع ہوئے ہیں، انھوں نے تجوید کے ساتھ خاص اعتناء بھی فرمایا ہے، کتابیں بھی لکھیں اور ترغیبات بھی دیں اور پھر شان اصلاح کا یہ کمال کہ

مسلمانوں کی جلی اور خفی غلطیوں اور کوتاہیوں کی جانب حضرت کی نگاہ پہونچی اور ان کی اصلاح فرمائی، اس سلسلے میں معاصرین میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اس پر قریب قریب تمام علماء کا اتفاق ہے، مگر حضرت کی نگاہ بھی اس عام رائج اور شائع وذائع طرز کی طرف نہیں گئی حالانکہ ان کی کتب اور مواعظ میں ایسے باریک باریک اغلاط کی نشاندہی ملتی ہے جن کا اول وہلہ میں بعض علماء ادراک نہیں کر پاتے ہیں، اس سے ظن غالب یہی ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اس کو غلطی نہیں سمجھتے تھے اس کا بجا طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ جـــلالة کی مَد قواعد تجوید کے دائرے میں نہیں آتی، اس لئے اصولاً اسے قراء کی مصطلحہ مَد کہنا غالباً صحیح نہ ہوگا بلکہ اسے مَد صوت کہنا غالباً زیادہ قرین قیاس ہے جواز ان میں مطلوب و مستحسن ہے۔ بدائع الصنائع جلد اول ص:۱۴۹ میں ہے:

”منها: أن يجهر بالاذان فيرفع صوتهٗ لأن المقصود وهو الأعلام يحصل بهٖ ألا ترىٰ أن النبی ﷺ قال لعبدا لله بن زيد علِّمه ُبلالاً فانه أندىٰ وأمد صوتاً منک ولهٰذا كان الأفضل أن يوذن فی موضع يكون اسمع للجيران كالمئذنة ونحوها“ ۔

اذان میں سنت یہ ہے کہ بلند آواز سے کہے کیونکہ اذان کا مقصد یعنی عام اعلان اسی سے حاصل ہوسکتا ہے، چنانچہ نبی ﷺ نے عبداللہ بن زید کو حکم دیا کہ یہ کلمات بلال کو سکھاؤ ان کی آواز تم سے زیادہ بلند اور دراز ہے، اسی بنا پر افضل ہے کہ ایسی جگہ اذان دی جائے جہاں سے زیادہ لوگوں کے کان میں آواز پہنچ سکے، مثلاً منارہ وغیرہ۔

اس میں ”أمد صوتاً“ کی تصریح ہے جس سے اذان میں مدصوت کا زیادہ مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔

بدائع الصنائع جلد اول ص ۱۴۷ میں حدیث کا یہ جملہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ”إرجع فمد بهما صوتک“ اور ابوداؤد شریف میں یہ الفاظ ہیں: ”إرجع فامددمن صوتک“، یعنی دوبارہ کہو اور آواز بڑھا کر کہو۔

بدائع الصنائع جلد اول ص:۱۴۸ پر یہ عبارت ہے:

”فانهٗ روى أنهٗ (ابومحذوره) لما أذّن وكان حديث العهد بالاسلام

قال مثلاً اللہ اکبر اللہ اکبرأربع مراتٍ و مد صوتہٗ إلیٰ أن قال فلما بلغ إلیٰ الشهادتین فدعاه رسول الله ﷺ وعرک اذنہٗ وقال إرجع وقل أشهد أن لاإلٰه إلاالله وأشهد أنَّ محمداً رسول الله ومد بهما صوتک غیظاً للکفار“ ۔

مروی ہے کہ حضرت ابومحذورہؓ نے جب اذان کہی اور وہ ابھی نومسلم تھے تو اللہ اکبر اللہ اکبر چار مرتبہ دو آواز میں کہا اور آواز بڑھا کر کہا جب شہادتین پر پہونچے تو شرما گئے اور آواز پست کی، رسول اللہ ﷺ نے بلایا اور کان ملا اور فرمایا کہ دوبارہ أشهد أن لاإلٰــــه إلاالله وأشهد أنَّ محمداً رسول الله کہو اور آواز بڑھاؤ تا کہ کفار کو رنج ہو۔

اس میں تصریح ہے کہ حضرت ابومحذورہؓ نے اللہ اکبر میں آواز دراز کی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے شہادتین میں بھی اسی کا حکم دیا تھا۔

مَد کے اصل معنیٰ دراز کرنے اور بڑھانے کے ہیں جس پر قرآن وحدیث اور کتب لغت شاہد عدل ہیں، **المنهج الفكرية** سے منقول حدیث جو آگے آرہی ہے اس میں یہ لفظ دراز کرنے ہی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے جس کے نتیجے میں آواز فطرتاً زیادہ بلند ہوجاتی ہے، سانس کا زور صرف کئے بغیر آواز قدرے بلند تو ہوسکتی ہے مگر رفع صوت میں مبالغہ مشکل ہے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ عام طور سے پکار اور اعلان میں بھی آواز دراز کی جاتی ہے، دور صحابہ میں بھی مدصوت کی یہ صورت پائی جاتی تھی، کبھی کبھی اس میں بہت مبالغہ ہوجاتا تھا جس کی وجہ سے رگوں کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوجاتا تھا، ظاہر ہے کہ رگوں کا کھنچنا اور ٹوٹنے کا اندیشہ ہونا صرف آواز کے بلند ہونے کی وجہ سے نہیں ہوسکتا، بلکہ جب آواز بڑھائی جائے گی اور سانس کو دراز کیا جائے گا جبھی یہ اندیشہ ہوسکتا ہے، بدائع میں مذکورہ عبارت کے بعد ہی یہ عبارت ہے:

”لا ینبغی أن یجهد نفسہٗ لأنہٗ یخاف حدوث بعض العلل کالفتق و اشباہ ذٰلک دل علیه ما رویٰ أن عمر رضی اللہ عنہ قال لأبی محذوره أو لمؤذن بیت المقدس حین راٰه یجهد نفسہٗ فی الأذان أما تخشیٰ أن ینقطع مریطاء ک وهو ما بین السرة إلیٰ العانة“۔

مناسب نہیں ہے کہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے، کیونکہ اس سے رگوں وغیرہ کے

ٹوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابومحذورہ کو یا بیت المقدس کے مؤذن کو دیکھا کہ اذان میں حد سے زیادہ زورصرف کر رہا ہے تو فرمایا کہ تم کو یہ خوف نہیں ہے کہ تمہارے پیڑو کا حصہ ٹوٹ جائے، مریطاء ناف کے نیچے کے حصہ کو کہتے ہیں۔

کھلی بات ہے کہ فقط بلندئ آواز سے پیڑو کے حصے کا متأثر ہونا اور اس درجہ کہ اس کے ٹوٹنے پھٹنے کا اندیشہ ہو بغیر اس کے دراز کئے اور پورے سانس کا زور صرف کئے نہیں ہوسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خیر القرون میں آواز دراز کرنے کا عام دستور تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو نکیر فرمائی ہے وہ درازئ صوت پر نہیں بلکہ ضرورت سے زائد مشقت پر ہے اسی وجہ سے فقہاء نے درازئ صوت کے حکم کو باقی رکھتے ہوئے دوسرے محتملہ نقصان کا علاج فرمایا اور کان میں انگلیاں رکھنے کا حکم اس حکمت پر بھی مبنی ہے جس کی وجہ سے کان کے پردوں پر غیر معمولی زور پڑنے اور پیڑو کے حصہ کے متأثر ہونے سے حفاظت ہوجاتی ہے اور آواز بھی بندھ کر بلند ہوکر نکلتی ہے۔

ہاں اب یہ غور کرلینا چاہئے کہ آواز کی درازی کا محل کیا ہے؟ یہ تو عادتاً اور عقلاً سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بعض کلمات خوب دراز کئے جائیں مثلاً حیّ علی الصلٰوۃ وغیرہ اور بعض کلمات بالکل مختصر ادا کئے جائیں، مثلاً اللہ اکبر وغیرہ کیونکہ اس طرح اذان کے کلمات میں آواز اور تلفظ کے اعتبار سے اتنا فرق ہوجائے گا کہ وہ مضحکہ بن جائے گی، لامحالہ ماننا پڑے گا کہ تطویل اور درازی سبھی کلمات میں ہوگی، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کون سا حروف بڑھایا جاسکتا ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ کلمات کے اول و آخر کو نہ کھینچے اور نہ آواز دراز کرے کہ کوئی اور حرف پیدا ہوجائے، مثلاً ''اکبار'' ہوجائے، درمیان میں جن کلمات کی تطویل بے تکلف ممکن ہوگی کی جائے گی، ظاہر ہے کہ حروف مدہ یعنی الف اور واؤ اور یاء ہی اس تطویل کا محل ہوسکتے ہیں، اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ لفظ اللہ میں مد کرنا درست ہے اور دور صحابہ سے متوارث چلا آرہا ہے، مزید تصریحات ملاحظہ ہوں:

"قیل بتطویل الکلمات کما فی البحر عن عقد الفرائد و کل ذٰلک مطلوبٌ فی الاذان فیطول الکلمات بدون تغنٍ وتطریبٍ کما فی العنایة".

کہا گیا ہے کہ کلمات کی تطویل کرے جیسا کہ عقد الفرائد سے منقول ہے اور یہ تمام

اموراذان میں مطلوب ہیں ،اسلئے کلمات اس طور پر دراز کئے جائیں کہ تغنی یعنی گانے کا لہجہ نہ پیدا ہوجیسا کہ عنایہ میں ہے۔کہ فقہاء لحن کو منع کرتے ہیں اس کی تعریف درمختار میں یہ ہے کہ:

"قولہٗ :لالحن فیہ أی تغنی یغیر کلماتہٖ فانہٗ لا یحل فعلہٗ وسماعہٗ کالتغنی بالقرآن و بغیر تغیر حسن ".

اذان میں لحن نہ ہو یعنی گانے کا لہجہ جس سے کلمات بدل جائیں اس کا نہ تو کرنا جائز ہے اور نہ سننا جیسا کہ قرآن کو گانے کے لہجہ میں پڑھنا اور تحسین صوت بغیر تغیر اور تبدل کے تو بہتر ہے۔

پھر اسی عبارت کی تشریح "ردالمحتار" میں یہ ہے کہ:

"قولہٗ :لالحن فیه أی تغن یغیر کلماتہٖ" الخ ،تغنی یغیر کلماتہٖ کا مطلب یہ ہے کہ کسی حرف یا حرکت کی زیادتی کردی جائے یا اوائل واواخر کلمات میں مدو غیرہ کا اضافہ کردیا جائے ا

مذکورہ بالا عبارتیں نقل کرنے کے بعد مفتی نظام الدین صاحب 'مفتی دارالعلوم دیوبند' لکھتے ہیں کہ "اس عبارت سے معلوم ہوا کہ لحن ممنوع کا محل اوائل کلمات ہیں یا اواخر کلمات وسط کلمہ اس کا محل نہیں ہے بلکہ وسط کلمات میں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر بغیر تغنی وتطریب کے اور بغیر لحاظ قاعدہ موسیقی کے کچھ تطویل وغیرہ تحسین صوت کے لئے یا رفع صوت کے لئے ہوجائے تو ممنوع نہیں ہوگا اور اس تطویل کو لحن ممنوع نہیں کہیں گے"۔

"البحر الرائق" میں ہے:

"ولحدیث الترمذی أنہٗ ﷺ قال لبلالٍ إذا اذنت فترسل وإذا أقمت فاحدر فکان سنۃ فیکرہ ترکہٗ وفسّر الترسل فی الفرائد باطالۃ الکلمات والحدر قصرھا وایجازھا". (ج ا ص ۲۷۱)

ترسل سنت ہے، کیونکہ ترمذی کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بلال سے کہا کہ اذان کہو تو ترسل کرو اور اقامت کہو تو حدر کرو اور ترسل کی تعریف فرائد میں تطویل کلمات سے کی ہے اور حدر کی اختصار سے کی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ فقہاء کے نزدیک تطویل کلمات مکروہ تو کیا ہوتی مطلوب ہے اور چونکہ اس میں کوئی استثناءنہیں ہے اسلئے اس کے عموم میں لفظ اللہؔ بھی شامل ہے امید ہے کہ اتنی بحث فقہی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے کافی ہوگی۔

اب آیئے! قواعد تجوید کی رُو سے اس کا جائزہ لیں، قراء کے نزدیک مَد کے دو اسباب ہیں، لفظی اور معنوی، عام کتب تجوید میں صرف سبب لفظی کو بیان کیا گیا ہے اور وہ دو ہیں، حرف مد کے بعد ہمزہ یا سکون کا واقع ہونا یا حرف لین کے بعد حرف سکون کا واقع ہونا۔

اور کبھی مد کا سبب معنوی ہوتا ہے، مثلاً تعظیم مبالغہ نفی وغیرہ چنانچہ مشہور محدث ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں:

"ثم إعلم أن اسباب المد منها لفظی ومنها معنوی وهو قصد المبالغة فی النفی وهو سبب قوی مقصود عند العرب وإن كان من سبب اللفظی عند القراء ومنه مد التعظيم فی نحو لاإلٰه إلاالله لاإلٰه إلاالله لاإلٰه إلاانت وهو قد ورد عن اصحاب القصر فی المنفصل لهٰذا المعنیٰ كما نص علیٰ ذٰلک ابو معشر الطبری وابو القاسم الهذلی وابن مهران وغيرهم ويقال لهٗ مدالمبالغة فی نفی الوهية ماسوی الله سبحانه وتعالیٰ وقال هٰذا مذهب معروف عند العرب لأنها تمد عند الدعاء وعند الاستغاثة وقد إستحب العلماء المحققون مدالصوت بلاإلٰه إلاالله لاإلٰه اشعاراً بما ذكرناه ومما يدل علیٰ ذٰلک ما رویٰ فی الحديث عن ابن عمر مرفوعاً إلى النبی ﷺ من قال لاإلٰه إلاالله ومد بها صوتهٗ أسكنهٗ الله تعالیٰ دارالجلال سمیٰ بها نفسهٗ فقال ذوالجلال والاكرام وعن أنسؓ من قال لاإلٰه إلاالله ومدها هدمت لهٗ أربعة آلاف ذنبٍ". (المنهج الفكرية شرح متن الجزرية ۵٦،۵۷)

مد کے دو اسباب ہیں، لفظی جس کی تفصیل گذر چکی، اور معنوی اور وہ نفی میں مبالغہ کا قصد ہے، اہل عرب کے نزدیک مد کا سبب یہ سبب قوی اور مقصود ہے، البتہ قراء کے نزدیک سبب لفظی سے ضعیف ہے ایسے ہی معنوی سبب تعظیم ہے جیسے لاإلٰه إلاالله اور لاإلٰه إلاانت کی مد، یہ مد ان حضرات سے منقول ہے جو مد منفصل میں قصر کے قائل ہیں ان کے نزدیک لاإلٰه میں اسی

معنوی سبب کے باعث مد ہے اس کی تصریح ابومعشر طبری، ابوالقاسم ہذلی اور ابن مہران وغیرہ نے کی ہے، اسے مد مبالغہ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سے ماسوی اللہ کی الوہیت کی نفی میں مبالغہ مقصود ہے، یہ مذہب اہل عرب میں معروف ہے کیونکہ دعا اور استغاثہ کے وقت اس مد کا عام دستور ہے، علماء محققین نے لا إلٰــہ إلا اللہ میں مد صوت کو اسی لئے مستحب قرار دیا ہے اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے لا إلٰہ إلا اللہ کہا ،اور آواز دراز کی، اسے اللہ تعالیٰ دار الجلال میں جگہ دیں گے اور حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جس نے لا إلٰہ إلا اللہ کہا اور اس کو دراز کیا تو اس کے چار ہزار گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اہل عرب اور قراء کے نزدیک مد کی ایک قسم مد تعظیم اور مد مبالغہ بھی ہے اور یہ مد بہت معروف ہے، چنانچہ ''فتح الملک المتعال شرح تحفۃ الاطفال'' ص: ۲۵ میں ہے:

''ولـهٗ سبب معـنـوی کالتعظیم ولا جلہٖ اجاز الفقهاء مد الف الجلالة أربع عشر حرکة فی اللّٰہ اکبر''۔ مد کا ایک سبب معنوی ہوتا ہے جیسے تعظیم اس کے واسطے فقہاء نے اللّٰہ اکبر میں چودہ حرکات جائز قرار دی ہیں (دو حرکت کا مطلب ایک الف ہے یعنی سات الف تک مد کیا جا سکتا ہے)

قاری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ لکھتے ہیں:

''اور معنوی بھی دو ہیں، نفی میں مبالغہ یعنی نفی کو خوب اور پوری طرح ظاہر کرنا اور اسی لئے طیبہ کے طریق سے امام حمزہ نفی جنس کے لاء میں توسط کرتے ہیں جیسے لا ریب ، فلا مر وغیرہ اور اس کو مد مبالغہ کہتے ہیں''۔

(یہ عبارت بتمام وکمال امام القراء مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ کی کتاب مفتاح الکمال شرح تحفۃ الاطفال ص: ۶۵، ۶۶ میں بھی ہے۔)

''تعظیم یعنی شان کی بڑائی بیان کرنا اور یہ لفظ اللہ میں ہوتا ہے، اس میں فقہاء نے غیر قرآن میں سات الف تک مد کرنا درست بتایا ہے اور اس کو مد تعظیمی کہتے ہیں''۔ (العطـایـا الوھبیة شرح جزریة ص:۲۵۶)

مفتی عنایت احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''(فائدہ) ایک اور موقع مدکا ہے جس پر وہی لوگ قادر ہیں جو معانی سے واقف ہیں وہ یہ ہے کہ موقعِ عظمت وجلال میں یا کسی اور جگہ جو قابل اہتمام ہو مد کرے، مثلاً الله الواحد القهار کے سب الفوں پر مد کر کے بہ عظمت وہیبت پڑھے، یاإن ا لابرار لفی نعيم میں'' ابرار'' کے الف اور''لفی'' کی یاء پر مد کرے، امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی''الاتقان''میں یہ موقع مدکا ذکر کیا ہے''۔(البیان الجزیل للترتیل منسلکہ زینت القاری ص:۷۸)

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی تحریر فرماتے ہیں:

''چہارم مد تعظیم چنانچہ بعضے دراسم اللہ یا رحمٰن مدمی کشند (تحفۂ نذریہ ص:۳۷) چوتھے مد تعظیم چنانچہ بعض قراءاسم اللہ اور رحمٰن میں مد کرتے ہیں''۔

قراء کی ان تصریحات سے یہ مسئلہ بے غبار ہوجاتا ہے کہ لفظ اللہ میں بغیر کسی سبب لفظی کے مد جائز ہے اور اسے مدِ تعظیم کہتے ہیں جس کی اجازت غیر قرآن میں سات الف تک ہے، پھر اذان جس میں مدِ صوت مطلوب ہے اور اعلام واعلان جس کا مقصد اصل ہے اس میں اجازت کیوں نہ ہوگی؟۔

اس نکتہ پر غور کیجئے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ تکبیرات انتقالیہ یعنی نماز کے ایک رکن سے دوسرے رکن میں جاتے ہوئے جو تکبیر کہی جاتی ہے وہ رکنِ اول کی انتہاء سے رکنِ ثانی کی ابتداء تک ممتد ہونی چاہئے، مثلاً قومہ سے سجدہ کی جانب جاتے ہوئے پورے درمیانی وقفہ میں تکبیر ہونی چاہئے، ظاہر ہے کہ ایسا اس وقت تک نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ کوئی حرف طویل نہ کیا جائے، تطویل حروف کے سلسلے میں البحر الرائق نے عمدہ بحث نقل کی ہے، ہم اسے من وعن نقل کرتے ہیں:

''وفی المبسوط لو مد الف اللہ لایصير شارعاً وخيف عليه الكفرإن كان قاصداً وكذا لو مد الف اكبر أو باءهُ لايصير شارعاً لان اكبار جمع كبر و هو الطيل قيل اسمٌ للشيطان ولو مد هاء اللہ فهو خطاء لغة وكذا لو مد رأه و مد لام اللہ فهٰذا صواب وجزم الهاء خطاء لانه لم يجئ إلا فی ضرورة الشعر''. (البحر الرائق اول ص:۳۳۲)

مبسوط میں ہے کہ اگر اللہ کے الف میں مد کی تو نماز شروع ہی نہ ہوئی اور اگر بالقصد

کیا ہے تو اندیشۂ کفر ہے، ایسے ہی اکبر کے الف میں مد کی یا اس کے باء کو دراز کیا تو نماز شروع کرنے والا نہ ہوگا کیونکہ اکبار کبر کی جمع ہے بمعنیٰ ڈھول اور بعض لوگوں نے اسے شیطان کا نام بتایا ہے اور اگر ہاء یا راء پر مد کی تو یہ لغت کی رُو سے غلط ہے اور اللہ کے لام کی مد درست ہے اور ہاء کا جزم غلط ہے ایسا صرف ضرورت شعری کی بناپر استعمال ہوا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ اکبر میں سوائے لام کے اور کہیں مد درست نہیں ہے البتہ اس میں بلاشبہ درست ہے اس لئے سمجھا جاسکتا ہے کہ جب تکبیراتِ انتقالیہ میں مد کی اجازت ہے تو اذان مین بدرجۂ اولیٰ ہوگی۔

علاوہ بریں یہ بھی محل غور ہے جیسا کہ ہم سطور بالا میں اشارہ کر آئے ہیں کہ کلمات اذان کا تلفظ کا یہی طریقہ قدیم سے متوارث چلا آرہا ہے اور اب بھی کوئی قابل ذکر استثناء ہمارے علم میں نہیں ہے، عرب اور تمام مراکز اسلامیہ میں مدوں کے ساتھ ہی اذان ہوتی ہے جس کی سانس جتنی دراز ہوسکتی ہے اسی کے بقدر زور صرف کرتا ہے اور اگر ہزار میں دو چار جگہ مستثنیٰ ہو تو اس کا اعتبار نہیں ہے، اگر یہ امر بالکلیہ غلط ہے تو کیا پوری امت بیک وقت اس غلطی میں مبتلاء ہوسکتی ہے؟ کوئی اور جماعت ہوتی تو اس کے سلسلے میں کچھ کہا جاسکتا مگر امت اسلامیہ کے بارے میں یہ بات ناممکن ہے کہ عرب سے عجم تک ایک غلط امر پر متفق ہوجائے کیونکہ حدیث میں صاف تصریح ہے کہ ''یہ امت ضلالت پر متفق نہیں ہوسکتی'' اور کسی غلطی پر قاطبۃً اجتماع گمراہی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے، کوئی شخص کسی ایسی غلطی کی نشاندہی نہیں کرسکتا جس کا ارتکاب امت میں اجتماعی رواج پاچکا ہو خواہ وہ خفی ہو یا جلی ہو پھر اذان جس سے زیادہ واضح اور جلی شاید ہی کوئی عمل ہو اس میں اس کی گنجائش کیسے مانی جاسکتی ہے۔

هٰذا آخر كلامنا والله نسأله التوفيق ونرجوا منه القبول ولاحول ولاقوة إلا بالله العلي العظيم

اعجاز احمد اعظمی

۹؍ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

☆☆☆☆☆☆

نوٹوں کی شرعی حیثیت اوران سے قرض کی ادائیگی

ادھر چند دنوں سے کچھ ایسے فتاوے سامنے آئے جن میں نوٹوں کی شرعی حیثیت کے ضمن میں نوٹوں سے قرض کی ادائیگی میں سونا اور چاندی کو اصل قرار دیا گیا،اور کہا گیا کہ اگر مثلاً دس سال پہلے کا قرض اس وقت ادا کرنا ہوتو دس سال قبل لئے ہوئے نوٹوں کی جتنی چاندی یا سونا ملتا رہا ہو،اتنی چاندی یا سونے میں بوقت ادائیگی جتنے نوٹ ملیں،اتنے ہی نوٹوں سے قرض ادا کیا جائے گا۔کیونہ اصل سکہ نقدین (سونا اور چاندی) ہوتے ہیں،پس نقدین میں سے جو زیادہ رائج ہو اسی کا اعتبار ہوگا،اور نوٹ اسی کے تابع ہوگا۔

انہیں فتاوی کے پسِ منظر میں چند باتیں،حاصلِ مطالعہ اہل علم اور اصحابِ فتوی کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔

ان فتاوے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آج کل روپیوں کے جو نوٹ رائج ہیں،وہ اصلی سکہ نہیں ہیں، بلکہ تابع ہیں،اصل سکہ''نقدین''یعنی سونا اور چاندی ہیں،اس لئے نوٹوں کو جب قرض میں لیا گیا،تو گویا صورت کے لحاظ سے قرض لینے والے نے نوٹ لئے ہیں،لیکن درحقیقت اتنی مقدار سونے یا چاندی پائی،جتنی ان نوٹوں کے عوض اس وقت ملتی،اس لئے وہی مقدار سونا یا چاندی کی قرض میں متعین ہے،اب اسے جس وقت بھی قرض ادا کرنا ہو،نوٹوں کی عدد کا خیال نہ کرے گا، بلکہ چاندی یا سونے کی وہ مقدار ملحوظ رکھے،جس کا تعین قرض کے لیتے وقت ہو چکا ہے، یا تو وہ بعینہ چاندی یا سونا ادا کرے، یا اس مقدار کے سونا یا چاندی کے عوض جتنے نوٹ بوقت ادائیگی ملتے ہوں،وہ دے۔

لیکن اس قاعدہ میں اولاً یہی بات قابل غور ہے کہ''اصلی سکہ''اور''تابع سکہ'' کا

مطلب کیا ہے؟ سکہ کیا ہے؟ ''مالیت کی وہ تغیر شدہ مقدار متعین، جو خرید وفروخت اور دوسرے مالی لین دین میں بغیر رد وانکار کے بطور قیمت رائج ہو''۔ اگر یہ تعریف درست ہے، تو ہر وہ سکہ جو حکومت وقت کا مہر کردہ ہو اور رائج ہو، وہ اصلی سکہ ہے، ہاں ممکن ہے کہ فتوی میں آئے ہوئے لفظ کی مراد یہ ہو کہ نوٹ اصالۃً اور خلقۃً ثمن نہیں ہیں، اصالۃً ثمن سونا اور چاندی ہیں، اور یہ نوٹ اس ثمن کی محض سند اور وثیقہ ہیں۔

ثمن اور اس کی قسمیں:

مالی لین دین میں جو چیز بدل اور عوض بنتی ہے، جسے ہمارے عرف میں قیمت کہتے ہیں، عربی میں اور اصطلاحِ شرع میں اسے ''ثمن'' کہتے ہیں:

''الثمن مایثبت فی الذمة بدلاً من البیاعات من الدراھم والدنانیر''. (احکام القران للجصاص ص۔۱۲)

خرید وفروخت میں جو کچھ بطور بدل کے خریدنے والے ذمے آتا ہے، خواہ درہم ہو یا دینار، وہی ثمن ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ خرید وفروخت میں دونوں جانب مال ہوتا ہے، فروخت کرنے والا ایک مال خریدار کو دیتا ہے، اور خریدار بھی بائع کے حوالے اس کے عوض میں مال ہی کرتا ہے، لیکن غور کیجئے تو خریداری کے اس معاملے میں دونوں مال ایک حیثیت نہیں رکھتے، جو مال فروخت کیا جاتا ہے وہ بذات خود مقصود ہوتا ہے، اور دوسری طرف اس کے عوض میں جو مال دیا جاتا ہے وہ بذات خود مقصود نہیں ہوتا، پہلا مبیع کہلاتا ہے اور دوسرا ثمن۔ مثال کے طور پر خالد نے محمود سے گیہوں خریدا، اور اس کے عوض میں سو روپئے دیئے، تو گو کہ دونوں نے ایک دوسرے سے مال کا تبادلہ کیا، لیکن حقیقت اور عرف دونوں کے لحاظ سے جب کہا جائے گا تو یہی کہا جائے گا کہ خالد نے گیہوں خریدا، یہ کوئی نہ کہے گا کہ محمود نے گیہوں کے عوض روپئے خریدے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گیہوں مقصود ہے، اور اس کا بدل سو روپئے، وہ حیثیت نہیں رکھتے۔ مبیع کے مقصد ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ اس کا متعین ہونا ضروری ہے، یعنی جو خاص گیہوں خریدا گیا ہے، اگر بائع اس کو بدل کر کوئی دوسرا گیہوں، خواہ وہ اس سے بہتر ہی ہو، دینا چاہے تو خریدار اس کے لینے پر مجبور نہ ہوگا،

اس کے برخلاف ثمن چونکہ اس درجہ میں مقصود نہیں ہے، اس لئے اگر خریدار نے کوئی خاص ثمن متعین کر کے خرید کی ہو، جب بھی متعین نہ ہوگا، اس کے عوض میں اسی مالیت کا دوسرا ثمن چاہے تو دے سکتا ہے، اور بیچنے والا اس کے قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ واجب فی الذمہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ کسی کے ذمہ کوئی شئی بغیر تعیین کے لازم ہو۔ اس تصریح سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ثمن بطور عوض آتا ہے اور وہ متعین نہیں ہوتا۔ شریعت کی نگاہ میں خلقت وفطرت کے اعتبار سے ثمن صرف سونا اور چاندی ہے، اصطلاح میں انہیں دونوں کو ''نقدین'' کہتے ہیں۔ بعض مسائل کا استثنا کر کے عقود مالیہ میں نقدین کہیں بھی متعین نہیں ہوتے۔ حق تعالی نے انہیں ثمنیت ہی کے لئے خلق فرمایا ہے۔ مردوں کے لئے سونے اور چاندی کا استعمال جو حرام اور عورتوں کے لئے بھی جو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے، اس میں غالبًا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو شئی بذات خود مقصود نہ تھی اور اسے صرف بطور عوض استعمال کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، اس صورت میں جب کہ براہ راست اسی کا استعمال ہونے لگ جائے، تو اس میں مقصودیت کی شان پیدا ہو جائے گی، جو حق تعالی کے منشاء کے خلاف ہے۔

ثمن کی دو قسمیں:

چونکہ اصل ثمن سونا اور چاندی ہے، اس لئے عموماً دستور یہی رہا ہے کہ سکے سونا اور چاندی ہی کے ڈھالے جاتے تھے، اشرفی اور دینار سونے کے سکے ہیں، اور درہم چاندی کا سکہ۔ ہندوستان میں روپے پہلے چاندی کے ہوا کرتے تھے، اور روپے سے کم مقدار کے لئے تانبے وغیرہ کے سکے، اکنی، دونی، اور پیسوں کا رواج تھا۔ یہ دھاتیں چونکہ براہ راست ثمن نہیں، اس لئے انہیں ''ثمنِ اصلی''، اور ''ثمنِ خلقی''، نہیں کہہ سکتے، یہ ''ثمنِ اصطلاحی'' ہیں، ثمن بن جانے کی صورت میں ان کی بھی تعیین ختم ہو جاتی ہے۔

ثمن کی دونوں قسموں کا فرق:

نقدین کے سکوں اور دوسری دھاتوں کے سکوں میں فرق یہ ہے کہ اگر چاندی، سونے کے سکے کا رواج موقوف ہو جائے، جب بھی ان کی ثمنیت اور قیمت میں فرق نہ آئے گا، سکہ ہونا ان کا باقی رہے یا ختم ہو جائے، ان کا ثمن ہونا جوں کا توں باقی رہے گا، ان کی سکوکیت تابع ہے،

اوران کی ذات اصل ہے۔اس کے برخلاف مثلاً تانبے وغیرہ کے سکوں کا چلن اگر بند ہو جائے تو اس کی ثمنیت ختم ہو کر صرف تانبے کی مالیت باقی رہے گی۔اس لحاظ سے درہم ودینار''سکۂ اصلی'' ہیں،اوران کے مقابلے میں دوسرے دھاتوں کے سکے''ثمنِ اصطلاحی'' ہیں،دونوں طرح کے سکوں کے احکام میں کچھ فرق ہے،تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

نوٹوں کا رواج:

ہندوستان میں عرصہ قدیم سے یہ دونوں طرح کے سکے رائج تھے،اوران کا استعمال بے تکلف ہوتا تھا،تاہم روپیہ صرف چاندی کا ہوتا تھا،اس سے کم مقدار کے سکے دوسری دھاتوں سے ڈھالے جاتے تھے۔بعد میں جب عالمی جنگوں کی وجہ سے قیمتوں میں بحران آیا،تو حکومتوں نے چاہا کہ سونا اور چاندی اپنے کنٹرول میں کر کے ان کے عوض کوئی دوسری چیز ثمنیت کے لئے رائج کریں،اور وہ چیز ایسی ہو کہ بذات خود اس کی کوئی قیمت نہ ہو،اس مقصد کے حصول کے لئے کاغذ کے نوٹ چھاپ کر چاندی کے روپئے حکومت نے اپنے خزانے میں بطور قرض جمع کر لئے،اور صارفین کو ان کے عوض یہی کاغذی نوٹ حوالے کر دیئے۔یہ نوٹ اس بات کے پختہ وعدے ہیں کہ جب چاہو گے حکومت کے خزانے سے اپنا جمع شدہ مال نکال سکتے ہو،چنانچہ ہر نوٹ پر لکھ دیا گیا کہ''میں دھارک کو.....روپئے ادا کرنے کا وچن دیتا ہوں''۔اب حکومت اس کی ذمہ داری ہے کہ نوٹوں پر لکھی ہوئی تعداد کے مطابق مطالبہ کرنے پر روپئے کی ادائیگی کرے۔اس بنیاد پر یہ نوٹ خود روپیہ نہیں ہیں،بلکہ قرض کی سند اور وثیقہ ہیں،گورنمنٹ مقروض ہے،اور نوٹ کا مالک قرض خواہ،اور نوٹ اسی قرض کی دستاویز،جس کے حوالے سے حکومت کے کسی ایسے دفتر سے قرض وصول کیا جا سکتا ہے،جو اس کے لئے متعین ہے۔پھر اگر یہ شخص کسی اور کا مقروض ہو اور اپنے قرض کی ادائیگی میں وہ نوٹ اپنے قرض خواہ کو دیتا ہے تو درحقیقت وہ اپنا قرض حکومت کے حوالے کرتا ہے کہ اس نوٹ کے ذریعے سے جو کچھ میں حکومت سے حاصل کر سکتا تھا،اب وہ قرض خواہ حاصل کرنے کا مُجاز ہے،اور چونکہ حکومت کی جانب سے ایک عام پختہ عہد ہے،اس لئے اس حوالے کو قبول کرنے میں کسی کو تردد نہیں ہوتا،اس لحاظ سے عوام الناس کے باہمی معاملات میں یہی نوٹ''سندِ حوالہ'' ہیں۔

ہمارے دور کے نامور فقہا اور علما، مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ اور مفتی عزیز الرحمان صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ اور دوسرے اکابر نے اپنے فتاوی میں نوٹ کو وثیقۂ قرض اور سندحوالہ قرار دے کر احکام جاری فرمائے ہیں۔

'امداد الفتاوی' میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں:

''اول ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہئے، وہ یہ کہ حقیقت نوٹ کی کیا ہے؟ سو نوٹ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت اول میں روپیہ دے کر گورنمنٹ سے روپیہ لیا تھا، گورنمنٹ اس روپیہ کی مقروض ہوگئی، اور نوٹ اس قرض کی سند ہے، پس اصل حق مالک کا وہ روپیہ ہے، اور آئندہ نوٹ کسی کو دینا اپنے اسی قرضہ کو گورنمنٹ کے حوالہ کر دینا ہے''۔ (امداد الفتاوی ج ۲۔ ص ۴)

نوٹوں پر زکوۃ:

لیکن اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوگا کہ نوٹ جب بجائے خود مال نہیں ہیں، تو جس کے پاس صرف نوٹ ہی نوٹ ہوں، اس پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ کیونکہ نوٹ تو صرف وثیقہ قرض ہیں، اور قرض کا مسئلہ سب جانتے ہیں کہ جب تک وہ وصول ہوکر مالک کے قبضہ میں نہ آجائے اس پر زکوۃ کی ادائیگی فرض نہیں ہوتی، ہاں نفسِ وجوب ہوجاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے جب قرض وصول ہوگا تو سالہائے گذشتہ کی پوری زکوۃ دینی ہوگی۔ اس سلسلے میں حضرت تھانوی نے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''نوٹ حقیقت میں سند ہے روپیہ کی، اور اس روپیہ پر ہر وقت اس کو قدرت ہے، جب چاہے حاصل کرلے، پس نوٹ گو خود مال نہیں ہے، مگر جس روپئے کی سند ہے وہ مال ہے، اور بوجہ مقدور التحصیل ہونے کے ضمار[۱] میں داخل نہیں ہے، لہٰذا اس پر (زکوۃ) واجب ہوگی''۔

(امداد الفتاوی ج ۲۔ ص ۲)

اس کی مزید وضاحت مفتی عزیز الرحمان صاحب کے فتوی میں ملتی ہے، کسی صاحب نے سوال کیا کہ ''نوٹ کو وثیقۂ قرض خیال کرکے اس کی زکوۃ وصولِ نقد پر موقوف ہوگی یا بالفعل اختتامِ سال پر ادا لازم ہوگی''؟۔

اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''وجوبِ اداءِ زکوۃ وصولِ نقد پر ہی ہوگا،اورنفسِ وجوب پہلے ثابت ہے،لہٰذا اگر قبل وصول بھی زکوۃ دیدے گا تو درست ہے،اورایسا ہی کرنا بھی چاہئے، کیونکہ بعد وصول نقد بھی جملہ سنینِ ماضیہ کی زکوۃ دینالازم ہوگئی''۔(فتاوی دارالعلوم مکمل مدلل ج ٦ ـ ص ١٠٩)

زکوۃ کی ادائیگی نوٹوں سے:

اسی طرح نوٹوں کے ذریعہ براہ راست زکوۃ کی ادائیگی کا مسئلہ بھی ایک سوال بن کر سامنے آتا ہے، کیونکہ نوٹ مال نہیں ہے،صرف مال کی سند ہے،اورزکوۃ میں مال کی تملیک ضروری ہے،سندحوالہ کی تملیک کافی نہیں ہے۔چنانچہ''امدادالفتاوی'' میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نوٹ کےمتعلق تحریرفرماتے ہیں کہ:

''چونکہ وہ مال نہیں،محض سند مال ہے،اس لئے نوٹ دینے سے زکوۃ ادانہیں ہوتی،اور یہی حکم ہے دوسری رقوم واجب التملیک کا، بلکہ ان صورتوں میں زکوۃ وغیرہ اداہوجاتی ہے۔

(الف) یاتو خودمسکین کونقد[۲]دے،یا کوئی چیزازقسم مال اتنی قیمت کی دے کہ امام ابوحنیفہ کےنزدیک غیرجنس سےبھی زکوۃ اداہوجاتی ہے''۔

(ب) یامسکین کونوٹ دیا،اوراس مسکین نے اس کونقد یا کسی جنس کے بدلے فروخت کر کے اس نقدیاجنس پر قبضہ کرلیا،اب قبضہ کے وقت زکوۃ وغیرہ ادا ہوگئی،اوراگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوئیں مثلاً اس مسکین کے پاس سے وہ نوٹ ضائع ہوگیا،یااس نے اپنے قرضہ میں کسی کودیدیا،ان صورتوں میں زکوۃ ادانہیں ہوتی''۔(امدادالفتاوی ج ۲ ـ ص ٦۵)

نوٹوں سےنقدین کی فروخت:

نوٹ کوسندحوالہ قراردینے کی صورت میں یہ مسئلہ بھی قابل لحاظ ہے کہ:

''نوٹ سے سوائے روپئے[۳] کے کسی قسم کی چاندی سونے کی خریدوفروخت نہ نقد جائز ہے،نہ قرض،نہ برابری کے ساتھ،نہ کمی بیشی کے ساتھ۔خریدنا ہوتو پہلے ان نوٹوں کو روپیوں سے بھنالے،پھرروپیوں سے جس قسم کا چاہے چاندی سوناخریدے،اس صورت میں کہ مجلس عقد ہی میں دونوں عوض مقبوض ہوجائیں''۔(ضمیمہ تطہیرا الاموال فی تحقیق الحلال والحرام ـ ص ـ ٢١٦ ـ مولفہ مولاناسعیداحمدلکھنوی)

یہ ساری تفصیلیں اس لئے ذکرکردی گئیں تاکہ ناظرین کے سامنے نوٹ کی ابتدائی

حیثیت واضح ہوجائے۔یہ اس عہد کا ذکر ہے جب کہ چاندی کے روپئے عموماً رائج تھے،اور گورنمنٹ کاغذی نوٹ چھاپ کرآہستہ آہستہ اس کی جگہ لا رہی تھی،روپیہ کا چلن رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا تھا،پھرایسا بھی وقت آیا کہ لین دین،کاروبار،زکوۃ وغیرہ کی ادائیگی بدرجۂ مجبوری نوٹوں کے ذریعے کرنی پڑنے لگ گئی،اور چونکہ کاغذ بذات خودکوئی قیمت نہیں رکھتا،اس لئے اسے مال قرار دے کراس دور کے تانبے وغیرہ کے اصطلاحی سکوں کے زمرہ میں [رکھنا] بظاہرکوئی معقول وجہ نہیں رکھتا،اس لئے رہ رہ کر دیندار طبقے کی جانب سے یہ سوالات پیدا ہورہے تھے کہ ان نوٹوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھرعلماء وفقہانے دیکھا کہ حکومت کی جانب سے نوٹ کی جیسی کچھ نوعیت متعین کی گئی ہے،اورجس انداز سے اس کا رواج ہوا،اس کی روشنی میں یہ بات صاف تھی کہ حکومت صارفین کے مملوکہ روپئے بطورقرض اپنے خزانے میں جمع کرا کے قرض کی سندنوٹ کی صورت میں دیدیتی ہے،اور چونکہ یہ سندتمام مملکت میں جاری ہوتی ہے،اس لئے بےتکلف اس سے لین دین کا رواج چل پڑا۔لوگوں کواپنی ضروریات کی تکمیل مقصود ہے،چاندی کے روپئے بجائے خودمقصود نہ تھے،اورنوٹوں میں رکھنے کی اورنگہداشت کی سہولت چاندی کے روپئے سے زیادہ ہے،اس لئے بہت آسانی سے اس کا رواج پھیل گیا،اورآج کی نئی نسل کو چاندی کے روپئے یادنہیں،اب تو نوٹ ہی کوروپیہ سمجھا جاتا ہے،تاہم نوٹ اس قرض کا وثیقہ رہا،اورایک دوسرے کے ہاتھ میں بطورسندحوالہ ہی منتقل ہوتا رہا۔اندریں صورت،جبکہ اس کو مال ہونے کی حیثیت کسی بھی درجہ میں حاصل نہیں ہے،اگرنوٹ کوزکوۃ میں دیدیا گیا تو جب تک اس کے ذریعے کوئی مال خرید کراس پر زکوۃ لینے والے کا قبضہ نہ ہوجائے،زکوۃ ادا نہ ہوگی۔مثلاً زکوۃ لینے والے نے زکوۃ میں دیئے گئے نوٹ کواپنے قرض کی ادائیگی میں دیدے،یا مکان کا کرایہ دیدیا،یا کسی کو ہبہ کردیا،یا ریل اوربس وغیرہ کا ٹکٹ خریدلیا،توزکوۃ ادانہیں ہوئی،اسی طرح اگر بڑے نوٹ کوچھوٹے نوٹ سے بھنانا چاہیں تواصولی اعتبار سے جائزنہیں ہونا چاہئے،کیونکہ یہ تبادلہ جس کو''بھنانا'' کہتے ہیں،بیع ہے، اوربیع کالی بالکالی سے حدیث میں ممانعت آئی ہے،یعنی مبیع اورثمن دونوں ادھار ہوں یہ ممنوع ہے،اورکھلی بات ہے کہ نوٹ سے نوٹ کے تبادلے میں دونوں میں سے کوئی بھی مال نہیں دیتا، بلکہ ایک دوسرے کواپنا اپنا وثیقۂ قرض حوالے کرتا ہے،اس صورت میں مبیع اورثمن دونوں ادھار

ہیں، پھر سب سے بڑھ کر یہ مشکل پیش آتی ہے کہ نوٹ کسی کے پاس خواہ کتنی ہی مقدار میں جمع ہوجائیں، اداءِ زکوۃ اس وقت تک واجب نہ ہوگی، جب تک وہ نوٹ روپئے سے تبدیل نہ ہوجائیں، نفس وجوب تو ہر سال ہوتا رہے گا، مگر ادائیگی کا وجوب وصول نقد پر موقوف رہے گا، ہاں جب وصول ہوگا تو گذشتہ برسوں کی بھی زکوۃ دینی ہوگی، اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگوں کے پاس پوری زندگی نوٹ ہی رہتے ہیں، اور اگر نقدین میں سے کسی کو حاصل کرنا چاہے تو کیا اس کا حصول سہل ہے؟۔

بلاشبہ نوٹ وثیقہ قرض ہیں، اور باہمی معاملات میں سند حوالہ ہیں، لیکن بحالات موجودہ اگر ان پر احکام صرف اسی ایک حیثیت سے نافذ کئے جائیں تو لوگوں کے تمام دینی معاملات اور دنیاوی کاروبار درہم برہم ہوکر رہ جائیں گے۔ جب چاندی کے سکے رائج تھے اور ثانوی حیثیت سے نوٹ چل رہے تھے، تب تو خیر گنجائش تھی، لیکن اب صورت حال نے کچھ ایسا رخ اختیار کرلیا ہے کہ اولاً چاندی کے سکے کالعدم ہوگئے، اور جو روپیہ سکہ کی صورت میں رائج ہے وہ گلٹ وغیرہ معمولی دھاتوں کا مرکب ہوتا ہے، جس کی مالیت خود مفروض اور اصطلاحی ہے، چاندی کی حیثیت سے قطعاً حاصل نہیں ہے۔ دوسرے اس کا رواج نوٹ کے مقابلے میں اتنا قلیل ہے کہ اسے کالعدم ہی سمجھنا چاہئے، اب تو مدت العمر چاندی کے سکے دیکھنے کو نہیں ملتے۔ مذکورہ بالا احکام کا اگر موجودہ وقت میں نفاذ کرنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ حرجِ شدید پیش آئے گا، بلکہ بیشتر کاروبار معطل ہوجائیں گے، ایسی صورت میں ناگزیر تھا کہ نوٹ پر سابقہ حیثیت کے علاوہ دوسری حیثیت سے بھی غور کیا جائے، گو کہ احتیاط اسی پہلو میں تھا، مگر مجبوری اور ضرورت کے پیش نظر سہولت کی تلاش بھی شریعت کی منشا کی تکمیل ہے۔

نوٹ کی دوسری حیثیت:

حق تعالی جزائے خیر دے فقہائے امت کو کہ انہوں نے اس مسئلہ میں اسی وقت پیش رفت کردی تھی، جب عام طور سے نوٹوں کی حیثیت وثیقہ قرض ہی کی متعین تھی، ہمارے علم میں اس سلسلہ کا پہلا قدم مشہور فرنگی محلی محدث وفقیہ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب اور ان کے نامور شاگرد حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائبؔ لکھنوی نے اٹھایا۔ چنانچہ مولانا عبدالحئی صاحب نے

اپنے فتاوی میں، اورمولانا فتح محمد صاحب نے اپنی بے نظیر کتاب ''تطہیرالاموال فی تحقیق الحلال والحرام'' میں نوٹوں پر ایک اورحیثیت سے نظرڈالی، ان دونوں حضرات کے بعد مولانا فتح محمد صاحب کے گرامی قدر صاحبزادے مولانا مفتی سعید احمد صاحب لکھنوی تلمیذ رشید حضرت تھانوی نے اس بحث کی تکمیل فرمادی۔ ہم ان حضرات کی تحقیقات کا ذکر اپنے الفاظ میں کرتے ہیں، بعد میں حوالے بھی ان شاءاللہ پیش کردیں گے۔

نوٹ کے اندر دومختلف حیثیتیں اورجداگانہ دو اعتبارات ہوتے ہیں، ایک تو وہی حیثیت جس کا ذکر اوپر آیا، یعنی وثیقۂ قرض اور سند حوالہ۔ چنانچہ ایک کے علاوہ باقی تمام نوٹوں پر لکھا ہوتا ہے کہ ''میں دھارک کو......روپئے ادا کرنے کا وچن دیتا ہوں''۔ وثیقہ قرض اورعہد نامہ ہونے کی وجہ سے صارفین جب چاہیں حکومت سے اس کے عوض سکہ کی شکل میں لے سکتے ہیں، نیز اگر نوٹ خراب ہوگئے بشرطیکہ نمبر محفوظ ہوں تو حکومت ان کے بدلے میں اسی نمبر کے دوسرے نوٹ دیدے گی، اس کے برخلاف اگر چاندی یا سونے یا گلٹ کے روپئے خراب ہوگئے تو حکومت ان کے بدلنے کی ذمہ دار نہیں ہے۔

دوسری حیثیت نوٹ میں سکہ ہونے کی ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ حکومت نے اپنے حکم اور آرڈر سے اس کو ایسا لازم اور ضروری بنادیا ہے کہ خرید وفروخت اور تمام دوسرے مالی معاملات میں ہر شخص اس کو قبول کرنے اور اسی کے ذریعے تمام معاملات کرنے پر مجبور ہے، اگر محض وثیقہ قرض ہوتا تو ہر شخص کو اختیار ہوتا کہ لے یا نہ لے، جیسے آج کل بینکوں کے چک ہیں، کہ اگر اپنے قرض خواہ کو بینک کا چک دیں تو وہ قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے، اگر وہ شخص چک قبول نہ کرے تو آپ مجبور ہیں کہ اصل رقم اس کے حوالے کریں۔ بینکوں کے یہ چک محض وثیقہ قرض اور سند حوالہ ہیں، اس کے برخلاف نوٹ کے قبول کرنے پر ہر شخص بزورِ حکومت مجبور ہے، اس لئے ضرورۃً وہ بحکمِ سکہ ہی تسلیم کیا جائے گا، آپ سکۂ خلقی نہ کہئے سکۂ اصطلاحی کہہ لیجئے، لیکن اس میں کیا حرج ہے؟ آخر یہ گلٹ کے روپئے اور یہ دس، بیس، پچیس، اور پچاس پیسے بھی سکہ خلقی نہیں ہیں، اور نہ ان کی بذات خود کوئی خاص مالیت ہے، ابھی ان کا رواج اگر ختم ہوجائے تو انہیں کون پوچھے گا؟ یہ بھی تو سکہ اصطلاحی ہیں، اسی طرح اگر نوٹ بھی سکہ اصطلاحی مان لئے جائیں تو کیا

حرج ہے۔

بہرحال اگر نوٹوں کے عوض حکومت سے آپ روپئے حاصل کریں تو یہ وثیقہ قرض ہیں، اوران کے ذریعے عام لوگ باہمی معاملات کریں تو یہ سکے ہیں۔وثیقہ قرض ہونے کی جہت سے ان میں مالیت نہیں ہے،لیکن سکہ ہونے کے اعتبار سے ان میں اسی قدر مالیت پائی جاتی ہے، جتنے روپئے ان پر لکھے ہوئے ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''نوٹ ہر چند کہ خلقۃً ثمن نیست ،مگر عرفاً درحکمِ ثمن است، بلکہ عین ثمن فہمیدہ می شود، ازیں وجہ کہ اگر شخصے نوٹ یک صدروپیہ ہلاک کند اصل مالک تاوان یک صدروپیہ می گیرد''۔
(مجموعۃ الفتاوی برحاشیہ خلاصۃ الفتاوی ج ۳۔ص۱۵)

ترجمہ! نوٹ اگر چہ خلقۃً ثمن نہیں ہے،مگر عرفاً ثمن کے حکم میں ہے، بلکہ بعینہ ثمن سمجھا جاتا ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر کسی نے سوروپئے کا نوٹ ضائع کردیا،تو اصل مالک ایک سوروپئے کا تاوان اس سے لے گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نوٹ بعینہ ثمن ہے، ورنہ نوٹ کے ضائع کرنے کی صورت میں وہ سوروپئے چاندی کے پانے کا مستحق نہ ہوتا، ہاں ویسا ہی نوٹ لیتا۔مولانا عبدالحی صاحب نے اپنے متعدد فتاوی میں نوٹ کے ثمن ہونے کی تصریح کی ہے۔

مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنوی نوٹ کے متعلق لکھتے ہیں:

''اول یہ ایک عہد نامہ قرض ہے، جو بتحکم سکے کی طرح واجب القبول بنایا گیا،اگر ہم کو اختیار ہو کہ دوسرے اموال کی طرح خریدیں یا نہ،تو یہ تمسک ہے،اور جب کہ ہم اس کے قبول کرنے پر سکوں کی طرح مجبور ہیں،تو بضرورت حکم سکہ دیا گیا''۔(تطہیر الاموال۔ص۲۷)

مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں کہ نوٹ کے محض وثیقہ قرض تسلیم کرنے کی صورت میں

''پہلے زمانے میں بھی جب بسہولت سکہ جات منقومہ (مثلاً چاندی وغیرہ کے روپئے) ملتے تھے، بیرون جات میں ادائے زکوۃ وغیرہ صدقات واجبہ دشوار تھا،اوراب تو بوجہ کمیابی بلکہ نایابی سکہ جات منقومہ مقامی فقراء کو بھی زکوۃ میں دینا دشوار ہوگیا،اور ہر شخص بعینہ نوٹ سے سونا چاندی خریدنے،اور بڑے نوٹ کو چھوٹے نوٹوں سے بدلنے،اور ریلوے ٹکٹ گھر میں کرایہ

ریل اور ڈاکخانہ میں اجرتِ ڈاک، اور مالک مکان کو کرایۂ مکان، اور ملازمین کو تنخواہ، اور مزدوروں کو مزدوری، اور بائع کو قیمت مال میں اس کے حقوق سے زائد کا نوٹ دے کر رقم زائد کی واپسی میں نوٹ لینے پر اس قدر مجبور ہوگیا ہے کہ نہ لے تو اس کی دنیا اور دین کے سارے کاروبار درہم برہم ہوجائیں۔ نیز حسبِ تصریح فقہا "**تصح الحوالة برضاء المحتال**" صحت حوالہ رضاءِ محتال پر موقوف ہے، اور صورتِ مجوزہ میں نوٹ لینے والے اس وجہ سے تیار ہوجاتے ہیں کہ اس سے بوجہ سکہ قرار دیئے جانے کے ہم اپنی تمام ضرورتوں اور حاجتوں کو جہاں چاہیں اور جب چاہیں فوراً اسی وقت بلا درنگی بآسانی حاصل کرسکتے ہیں، تو یہ تیاری ان کی محض حوالہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ سکہ اور عہد نامہ مرقوم کی وجہ سے ہوئی، ورنہ اگر حوالہ ہوتا، اور ثمنیت اور سکیت کا اس سے تعلق نہ ہوتا تو کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوتا، اور اگر ہوتا بھی تو بتحکمِ شدید بدونِ رضائے قلب ہوتا، اس لئے ضرور ہے کہ اس کو عہد نامہ قرار دینے کے ساتھ سکہ بھی قرار دیا جائے، ورنہ اگر حوالہ محضہ قرار دیا جائے (نہ برضاء نہ بدونِ رضا) اس کے لینے پر تیار نہ ہونے سے رضائے قلبی کیا رضائے ظاہری تک نہ پائی جائے گی، اور حسب قاعدہ فقہیہ حوالہ صحیح نہ ہوگا''۔ (ضمیمہ تطہیر الاموال۔ص ۲۲۱)

میرا تو خیال یہ ہے کہ آج جب کہ محض نوٹوں کا ہی رواج ہے، نئی نسل چاندی سونے کے سکے کے نام تک سے واقف نہیں، شاید کوئی فقیہ و مفتی ہو جو نوٹوں کو سکہ کی حیثیت نہ دیتا ہو، اس پر مفصل گفتگو کرنے کی بظاہر ضرورت نہ تھی، تاہم دونوں نظریوں کو واضح کرنے کے لئے اتنی طوالت اختیار کی گئی۔

جب نوٹ کی حیثیت سکہ ہونے کی مسلم ہوگئی تو ظاہر ہے کہ جو احکام سکے سے متعلق ہیں وہ سب اس پر نافذ ہوں گے۔ اگر کسی کے پاس بقدر نصاب نوٹ سال بھر تک رہ جائیں تو بعینہ انہیں پر زکوۃ واجب ہوگی، اور نوٹ سے زکوۃ ادا کی جاسکتی ہے، نوٹوں کے ذریعے سونے اور چاندی کی خرید و فروخت بے تکلف جائز ہے، بڑے نوٹوں کو چھوٹے نوٹوں سے بھنانا بھی درست ہے۔

ادائیگیٔ قرض کا مسئلہ:

اب رہ گئی بات ادائیگی قرض والی، تو اسی روشنی میں اس کو بھی حل کیا جاسکتا ہے، نوٹوں کو

جب بجائے خود سکہ تسلیم کیا جاچکا،اوران پر روپیوں کے احکام جاری ہوئے،تو جیسے چاندی اور سونے کے سکے ذوات الامثال ہیں،اوراسی وجہ سے ان سے قرض کا لین دین ہوتا ہے،اور ادائیگی خواہ کتنی ہی مدت کے بعد ہو،لیکن اتنے ہی سکے دینے ہوں گے جتنے لئے تھے،زیادتی اگر مشروط ہوتو سود ہوجاتی ہے،اسی طرح کاغذ کے سکے بھی ذوات الامثال میں سے ہیں،اورقرض کی ادائیگی میں ان کی وہی مقدار برقرار رہے گی،جتنی لی گئی تھی،اضافہ کی شرط باطل ہوگی۔

ذوات الامثال اورذوات القیم:

یہاں ہم ناظرین کی سہولت کے لئے''ذوات الامثال'' کی تشریح کئے دیتے ہیں، حضرات اہل علم کو بتانے کی ضرورت نہیں،لیکن عام ناظرین اس اصطلاح سے واقفیت نہ رکھتے ہوں گے۔شریعت کی نظر میں مال کی دوقسمیں ہیں،مال کی ایک قسم وہ ہےجس کی جنس میں فرق یا تو بالکل نہیں ہوتا،یا ہوتا ہےتو اتنا کم کہ وہ کالعدم سمجھا جاتا ہے،جیسے گیہوں،جو،سونا،چاندی، تیل،وغیرہ،ایک گیہوں دوسرے گیہوں کے اتنے مشابہہ ہوتا ہے کہ فرق وامتیاز مشکل ہے، انہیں''مثلی''یا''ذوات الامثال'' کہتے ہیں۔

مال کی دوسری قسم وہ ہے،جس کی جنس میں واضح فرق وامتیاز ہو،مثلاً جانور،کپڑے، وغیرہ،دیکھ لیجئے گائے ایک جنس ہےمگرایک گائے اوردوسری گائے میں باہم کتنا تفاوت ہوتا ہے، ان میں مثلیت کالحاظ قیمت کی بنیاد پرہوسکتاہے،اس قسم کے مالوں کو''ذوات القیم'' کہتے ہیں۔

قرض کاجوازصرف ذوات الامثال میں:

فقہانے تصریح کی ہے کہ قرض لینااوردینا صرف ذوات الامثال میں جائز ہے، کیونکہ قرض اپنی ابتدا کے لحاظ سے عاریت ہے،اورعاریت میں سب جانتے ہیں کہ بعینہ شئی مستعار کو واپس کرنا ہوتا ہے،لیکن قرض میں چونکہ اصل شئی ختم ہوجاتی ہے،اس لئے اس کامثل جوعینِ شئی کے حکم میں ہوتا ہے،واپس کرنا ہوتا ہے۔یہ صورت ظاہر ہے کہ صرف ذوات الامثال میں ممکن ہے،ذوات القیم میں مثل کا وجود ہی نہیں کہ اسے واپس کیا جاسکے،اس لئے ذوات القیم کوقرض میں دینا جائز نہیں۔نوٹ چونکہ سکہ ہے،اوراس کے ذریعہ قرض کالین دین بغیر کسی نکیر کے جاری ہے،اس لئے وہ یقیناً ذوات الامثال میں سے ہے،نوٹوں کی قیمت خواہ گھٹے یا بڑھے،ہرصورت

میں مثل ہی ادا کرنا ہوگا،کمی اور زیادتی کی شرط یقیناً سود ہو جائے گی۔

اور اگر ہم نوٹوں کو باہمی قرض کے معاملہ میں محض سندِ حوالہ ہی تسلیم کرلیں،تب بھی قرض کی ادائیگی میں چاندی کا لحاظ کرنا کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا۔

اس کی شرح یہ ہے کہ نوٹ اگر سند قرض ہیں،تو خود قرض کیا ہے؟ کیا چاندی ہے؟ یا سونا ہے؟ قرض کوئی مجہول شئی تو ہوگی نہیں،لہٰذا نقدین میں سے جو زیادہ رائج والی بات قابل استناد نہیں،ظاہر ہے اب نقدین کا رواج ہی ختم ہو چکا ہے،نہ قرض دینے والا چاندی یا سونے کا کوئی تصور کرتا ہے،اور نہ لینے والے کے حاشیۂ خیال میں اس طرح کی کوئی بات آتی ہے،ورنہ دونوں پہلے چاندی یا سونے کا نرخ معلوم کرتے،اس کو دستاویزی شکل میں محفوظ کرتے،پھر قرض کا معاملہ کرتے۔ہاں یہ بات کہی جاتی ہے کہ نوٹ حکومت کے نزدیک چاندی یا سونے کا حوالہ ہے،لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب روپئے چاندی کے ہوا کرتے تھے،اب تو گلٹ کے روپئے ہوتے ہیں،اگر نوٹ حوالہ ہوتا ہے تو اسی گلٹ کے روپئے کا۔آپ غور کیجئے دس کے نوٹ پر دس روپئے ادا کرنے کا عہد مرقوم ہوتا ہے،کیا اس کا مطلب یہ کوئی سمجھتا ہے کہ اس نوٹ کے عوض میں دس روپئے چاندی کے موصول ہوں گے،بالکل نہیں،وہی گلٹ کے سکے جو آج کل رائج ہیں ملیں گے،پھر قرض کی ادائیگی میں سونے یا چاندی کے اعتبار کا کیا معنی؟ حوالہ کسی اور چیز کا اور مطالبہ سونے یا چاندی کا یا ان کے مقدار کے مساوی نوٹ کا،یہ شرعاً کسی طرح معقول نہیں ہے

نوٹ کی قیمت میں تفاوت:

ایک بات یہاں یہ بھی کہی جاتی ہے کہ نوٹوں کی قیمت سرکاری طور پر کم وبیش ہوتی رہتی ہے،لہٰذا اس فرق کا لحاظ ہونا چاہئے،اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ گورنمنٹ حساب کے کن اصولوں پر نوٹ چھاپتی ہے؟ اور ان کی قیمت کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور ان میں کمی اور زیادتی کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس کا کیا معیار ہے؟ یہ اور اس طرح کے سوالات ماہرین اقتصادیات تو حل کر سکتے ہیں،باقی عام لوگ ان اصولوں سے بالکل واقف نہیں ہیں۔چنانچہ کسی بھی پڑھے لکھے آدمی سے ان سوالوں کے جواب طلب کر لیجئے،،بہت مشکل ہے یقینی جواب کہیں سے مل سکے،شرعی مسائل ہر خاص وعام کے لئے ہیں،ان کا مدار اس طرح کے حسابی امور پر رکھنا کسی طرح

مناسب نہیں ہے، اور نہ شریعت نے ان حسابات کا اعتبار کیا ہے۔ رویتِ ہلال کے مسائل میں تمام فقہا اس کی تصریح کرتے ہیں کہ احکام شرعیہ کا مدار حسابی امور پر نہیں ہے۔ یہاں اگر قرض کی ادائیگی کا مسئلہ ان حسابی اصولوں پر موقوف کر دیا جائے جن سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں، تو قدم قدم پر ہمیں شرعی حکم کے امتثال میں ماہرین اقتصادیات کا سہارا لینا پڑے گا، جو کہ دین فطرت کی سہولت بخشیوں کے خلاف ہے۔

نوٹوں کی قیمت کی کمی بیشی کا سیدھا اور عام فہم مطلب یہ ہے کہ جوں جوں اشیاء کی گرانی بڑھتی ہے، اسی حساب سے نوٹوں کی قیمت کم ہوتی ہے، مثلاً اگر کل چاندی تیس روپئے تولہ تھی، اور آج ساٹھ روپئے تولہ ہے، تو گویا نوٹ کی قیمت آدھی رہ گئی، درحقیقت یہاں نوٹ کی قیمت کم نہیں ہوئی ہے، وہ تو خود ثمن ہے، اور ثمن کی قیمت کا کیا معنی؟ اس سے خریدے جانے والے سامانوں کا نرخ بڑھ گیا ہے، تو اس کی طرف کمی کی نسبت کر دی گئی، ورنہ یہ تو اپنی حالت پر ہے، ہاں نوٹوں کی قیمت کا کم وبیش ہونا کبھی بین الاقوامی کرنسیوں کے حساب سے ہوتا ہے، لیکن ہماری بحث سے وہ خارج ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نوٹ خواہ سکۂ اصطلاحی قرار دیئے جائیں، یا سندِ حوالہ یا وثیقۂ قرض، کسی صورت میں ان کا مدار چاندی یا سونے پر نہ ہوگا، قرض میں جتنے نوٹ دیئے گئے ہوں گے، خواہ کتنی مدت گزر جائے، اتنی ہی مقدار کی واپسی ضروری ہے، نوٹوں میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی، سو کے نوٹ پہلے بھی سو ہی تھے، اور آج بھی سو ہی ہیں، اگر ایسا ہوتا کہ کل کے سو کے نوٹ آج ہزار کے مساوی قرار پا جاتے، تب یہ کہنا صحیح ہوتا کہ پہلے جو سو کے نوٹ قرض میں دیئے گئے ہیں، آج چونکہ ان کی مالیت ہزار کی ہو چکی ہے، اس لئے قرض میں ہزار روپئے ادا کرنے ہوں گے، لیکن ایسا کب ہے؟۔

ماخذ: ندائے فضلاء مبارک پور۔ جنوری، فروری (۱۹۸۸ء)

حاشیہ

(۱) ضمار وہ مال ہے جو مالک کے قبضہ سے نکل چکا ہو اور غالب گمان ہو کہ اب وہ واپس نہ ملے گا

(۲/۳) ان لفظوں سے چاندی کے روپئے مراد ہیں۔

دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على رسوله سيدالمرسلين .امابعد

ربوا کی تعریف فقہانے ان الفاظ میں کی ہے۔

"الربوا فی الشرع عبارة عن فضل مال لایقابله عوض فی معاوضة مال بمال". (حاشیہ ہدایہ ج۳۔ص۶۱)

ترجمہ! ربوا شریعت کے نزدیک وہ مال فضل ہے جس معاوضۃ المال بالمال میں کوئی عوض نہ ہو۔

اس تعریف کا اطلاق اس پر بھی ہے کہ (۱) کسی نے اضافہ کی شرط کے ساتھ قرض کا معاملہ کیا ہو۔اوراس پر بھی ہے (۲) کسی مثلی چیز کا تبادلہ اسی کی ہم جنس سے اضافہ کی شرط کے ساتھ کیا ہو۔پہلی صورت کوفقہا "ربواالنسئہ" اوردوسری صورت "ربواالفضل" کہتے ہیں۔

ربوا کی یہ تعریف امام مالک،امام شافعی،امام احمد،اورامام ابو یوسف (چند ضمنی قیود کے ساتھ) علی الاطلاق تسلیم کرتے ہیں کہ معاوضہ مالیہ جہاں کہیں ہو،جب اس کا ایک فریق مسلمان ہو،اس میں اضافہ کی شرط سے ربوا کا تحقق ہوجائے گا،لیکن امام ابوحنیفہ اورامام محمد کے نزدیک اس میں ایک اورشرط کا اعتبار کیا گیا ہے،وہ یہ کہ دونوں فریق کا مال "مالِ معصوم" ہونا چاہئے،اگرکسی ایک کا مال معصوم نہیں ہے تو اس میں ربوا کا وجود نہ ہوگا،گوصورۃً ربوامحسوس ہو۔امام علاؤالدین ابوبکر بن کاسانی اپنی مشہور تالیف "بدائع الصنائع" میں تحریرفرماتے ہیں:

"واما شرائط جریان الربوا فمنها ان یکون البدلان معصومین فان کان احدهما غیر معصوم لا یتحقق الربوا عندنا وعند ابی یوسف هذا لیس

بشرط''. (ج۵۔۱۹۲)

ترجمہ! ربوا کے تحقق کے لئے چند شرطیں ہیں، ایک شرط یہ ہے کہ بدلین معصوم ہوں، اگر کوئی بدل معصوم نہ ہوتو ربوا کا تحقق نہ ہوگا، ہمارے نزدیک۔اور امام ابو یوسف کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ربوا کی شرعی حقیقت علی الاطلاق ہر اس معاوضۂ مالیہ میں جس کے اندر اضافہ خالی عن العوض کی شرط لگائی گئی ہو نہیں پائی جاتی، اس کے لئے کچھ شرطیں ہیں، ان شرائط کے بغیر گو کہ صورۃً ربوا معلوم ہو، مگر شریعت کی نظر میں اسے ربوا نہیں سمجھا جائے گا، صاحب بدائع نے اس کے لئے چند شرطیں ذکر کی ہیں، پہلی شرط وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، کہ بدلین کا معصوم ہونا ضروری ہے، معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال شرعاً کسی کی ملک ہو، اور اس پر دوسرے کو دست اندازی کی اجازت نہ ہو۔

حربی کا مال:

فقہا لکھتے ہیں کہ حربی کا مال معصوم نہیں ہوتا، صاحب بدائع لکھتے ہیں، اور تمام ہی فقہا نے اس کی تصریح کی ہے کہ۔

''**ان مال الحربی لیس بمعصوم بل هو مباح فی نفسه**''. حربی کا مال معصوم نہیں ہے، بلکہ وہ فی نفسہ مباح ہے۔

حربی کے مال کے معصوم نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالی نے مالِ غنیمت کو اہل اسلام کے حق میں حلال قرار دیا ہے، اور مالِ غنیمت اہلِ حرب کا وہ مال ہے جو ان سے جنگ میں حاصل کیا گیا ہو، اگر وہ مباح نہ ہوتا تو اس پر ملکیت بھی ثابت نہ ہوتی۔

اموال میں اباحت:

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اموال میں اصل اباحت ہے، گو کہ بعض لوگوں نے توقف کو ترجیح دی ہے، یعنی انہیں حلال یا حرام کچھ نہ کہا جائے جب تک کہ کوئی دلیل شرعی حلت وحرمت کی نہ مل جائے، لیکن علامہ شامی نے امام ابن ہمام کی کتاب التحریر سے نقل کیا ہے کہ:

''**المختار الاباحة عند جمهور الحنفية والشافعية وفی شرح اصول**

البزدوی للعلامة اکمل قال اکثر اصحابنا واکثر اصحاب الشافعی ان الاشیاء التی یجوز ان یرد الشرع باباحتھا وحرمتھا قبل وروده علی الاباحة'.
(ج۴۔ص۱۶۱)

ترجمہ! عام حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مختار اباحت ہے، اور علامہ اکمل کی شرح اصول بزدوی میں ہے کہ ہمارے اور شافعیہ کے اکثر اصحاب نے فرمایا ہے کہ جن چیزوں کی حلت وحرمت شریعت میں وارد ہوسکتی ہے وہ ورود شریعت سے پہلے اباحت پر ہیں۔

غرض اموال میں اباحت اصل ہے، جب تک شریعت انہیں کسی خاص فرد یا جماعت کے ساتھ مختص کر کے دوسروں کے لئے ناقابل دست اندازی نہ قرار دیدے، البتہ جب اس پر کسی کا شرعاً قبضہ اور ملکیت ثابت ہوجائے تب وہ مالِ معصوم اور محظور بن جاتا ہے۔

عصمت کی بنیاد:

اب اس پر غور کرنا ہے کہ مال میں عصمت اور احراز کب اور کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں فقہا کی تصریحات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احراز کا تعلق کسی کے قبضے میں آجانے سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق دارالاسلام میں آجانے سے ہے۔ ''شرح سیر کبیر'' میں امام سرخسی تحریر فرماتے ہیں:

''وفقه فی ھذا کله ان العصمة المقومة انما تثبت بالاحراز بالید لا بالدین وتمام الاحراز بالید انما یکون بمنع المسلمین اوبدارھم وبدون ھذه العصمة لایخرج المال من ان یکون محلاً للاغتنام''. (ج۴۔ص۱۱۳۴)

ترجمہ! ان سب کی بنیاد یہ ہے کہ عصمت مقومہ احراز بالید سے ثابت ہوتی ہے، احراز بالدین سے نہیں، اور احراز بالید کی تکمیل یا تو عسکر اسلام سے ہوگی، یا دارالاسلام سے، اور اس عصمت کے بغیر مال، محل غنیمت ہونے سے محفوظ نہ ہوگا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''وانما یثبت العصمة فی حق الاحکام بالاحراز والاحراز بالدار لا بالدین''.

ترجمہ! عصمت احکام کے حق میں عصمت احراز سے ثابت ہوتی ہے،اوراحراز کا تعلق دار سے ہے دین سے نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حربی کا مال دارالحرب میں مال معصوم نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی اصل اباحت پر ہے، جواہل اسلام کے لئے مال غنیمت بن سکتا ہے،اورمعلوم ہے کہ مال غنیمت بنص قرآنی حلال وطیب ہے''**کلوا مما غنمتم حلالاً طیباً**''۔پس جو کچھ تمہیں مال غنیمت ملا، اسے کھاؤ کہ وہ حلال وطیب ہے۔

واضح رہے کہ یہ مسئلہ یعنی یہ کہ مال حربی دارالحرب میں معصوم نہیں ہوتا،مختلف فیہ نہیں ہے،متفق علیہ ہے،ورنہ اگر وہ مال معصوم ہوتو مال غنیمت بننے کا محل نہیں ہوسکتا،اسی لئے فقہا نے تصریح فرمائی ہے کہ مسلم مستامن یا معاہد کے لئے حربی کا مال دھوکہ، خیانت اور چوری سے لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ امان اور عہد کی خلاف ورزی ہے،اور یہ درست نہیں،ورنہ اس کا مال فی نفسہ مباح ہے،کسی اور ذریعہ سے جس میں اس کی رضا پائی جائے،اس کا لینا درست ہے،اسی طرح مسلم غیر مستامن اور غیر معاہد کے لئے حربی کا مال کسی بھی طرح حاصل کرنا درست ہے،خواہ اس کی رضا ہو یا نہ ہو۔چنانچہ''شرح سیر کبیر''میں ہے کہ:

"**ولو کان المسلم الخارج من دارالحرب اسیراً فیهم........ والمسألة بحالها،فان کان خرج الی دارالاسلام فجمیع مااخرج سالم له لانه ماکان مستامناً فیهم بل کان مقهوراًاو کان متمکناًمن قتلهم واخذ اموالهم لو قدر علی ذالک فلمااحرز اموالهم یکون طیباً لهم**''.(ج۴ص۔۱۱۲۲)

ترجمہ! اگر کوئی مسلمان اہل حرب کا قیدی تھا،اور کسی طرح وہاں سے بچ کر کچھ مال لے کر بھاگ نکلا،اوردارالاسلام میں آ گیا،تو جو کچھ وہ اپنے ساتھ لایا ہے،وہ سب اسی کا ہے، کیونکہ وہ ان میں مستامن نہ تھا، بلکہ وہ مجبور ومقہور تھا،اوراگر اس کا بس چلتا تو وہ انہیں قتل بھی کرسکتا تھا،اور مال بھی لے سکتا تھا،پس جب کچھ مال لے کر آ گیا تو وہ اس کے لئے جائز ہوگا۔

حربی کے مال کا حصول:

اگراہل حرب سے کوئی مصالحت یا معاہدہ ہو، یا کوئی فرد خاص دارالحرب میں امان لے

کر گیا ہوتو اس صورت میں ان سے غدر یا خیانت یا چوری تو حرام ہے،مگر ان کی رضامندی سے کوئی مال لے لینا جائز ہے،خواہ اس کی تحصیل کا طریقہ کچھ بھی ہو، کیونکہ اس جگہ تملیک مال میں طریقۂ تحصیل مؤثر نہیں ہے، بلکہ مال مباح پر قبضہ مؤثر ہے،اگر اس موقع پر طریقِ تحصیل عقودِ فاسدہ ہوں تو وہ کالعدم ہیں۔''شرح کبیر''میں ہے:

"قدبينا ان للمستامن فی دارلحرب ان ياخذ مالهم بای وجه يقدر عليه بعد ان يتحرز عن الغدر وليس له ان يدلس لهم العيب فيما يبيعه ممايجوز مثله فی دارالاسلام اولايجوز لان فيه معنی الغدر". (ج۴۔ص۱۴۸۶)

ترجمہ! ہم بیان کر چکے ہیں کہ دارالحرب میں مستامن کے لئے درست ہے کہ ان کے مال کو جس طرح پر ممکن ہو، لے سکتا ہے،بس شرط ہے کہ غدر نہ ہو،تاہم اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے مال کے عیب کوان سے چھپا کر بیچے، کیونکہ اس میں غدر کا معنی پایا جاتا ہے۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"فلوان اهل دار من دارالحرب وادعوا اهل الاسلام فدخل اليهم مسلم وبايعهم الدرهم بالدرهمين لم يكن بذالک باس لان بالموادعة لم تصر دارهم دارالاسلام وانمايحرم علی المسلمين اخذ مالهم بغير طيب انفسهم لمافيه من غدر الموادعة فاذااسترضاهم بهذه المعاملة فقد انعدم معنی الغدر ولهذ ا اطاب له ما اخذ". (ج۴۔ص۱۴۹۳)

ترجمہ! اگر دارالحرب والوں نے اہل اسلام سے مصالحت کر رکھی ہو اور وہاں کوئی مسلمان داخل ہوا،اوران کے ہاتھ ایک درہم کو دو درہم کے عوض فروخت کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ مصالحت کی وجہ سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن گیا،اور مسلمانوں پر ان کا مال ان کی رضامندی کے بغیر لینا حرام ہے، کیونکہ اس میں معاہدہ کی خلاف ورزی ہے،لیکن ان کی رضامندی اس معاملہ میں حاصل کر لی ہوتو خلاف ورزی کا معنی باقی نہیں رہا، پس جو کچھ وہ حاصل کرے گا حلال ہے۔

''مبسوط''میں ہے:

"وهذا لان مال الحربی مباح ولکن المسلم بالاستیمان ضمن لهم ان لا یخونهم وان لا یاخذ منهم شیئاً الا بطیبة انفسهم فهو یتحرز من الغدر بهذه الاسباب وهذا لان فعل المسلم یجب حمله علی احسن الوجوه واحسن الوجوه ماقلنا". (ج۱۴۔ص۵۷)

ترجمہ! مال حربی مباح ہے، لیکن مسلمان ان کی امان حاصل کر کے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ ان کے ساتھ خیانت نہ کرے گا، اور نہ ان کی رضا کے بغیر کوئی چیز لے گا، پس وہ ان اسباب (عقود فاسدہ) کے ذریعے غدر سے احتراز کر رہا ہے، پھر اسے مال کی ملکیت جو حاصل ہو رہی ہے، وہ قبضہ سے ہے، ان اسباب سے نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان کے فعل کو اچھے محمل پر رکھنا چاہئے، اور بہتر محمل وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔

اسی بنا پر امام ابوحنیفہ اور امام محمد کی ارشاد کی روشنی میں حربی سے جو مال بصورت عقد ربوا حاصل کیا گیا ہے، گو بظاہر ربوا ہے، مگر درحقیقت مال مباح پر اس کے مالک کی رضامندی سے قبضہ ہے، ایسی صورت میں وہ لینے والے کے لئے بالکل جائز ہے، اس قبضہ اور ملکیت میں عقد ربوا مؤثر نہیں ہے، پس ثابت ہوا کہ وہ محض نظر بظاہر ربوا ہے، حقیقتاً ربوا سے اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ علامہ کاسانی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ولهما ان مال الحربی لیس بمعصوم بل هو مباح فی نفسه الا ان المسلم المستامن منع من تملکه من غیر رضاه لما فیه من الغدر والخیانة فاذا بذله باختیاره ورضاه فقد زال هذاا لمعنی فکان اخذ استیلاءً علی مال مباح غیر مملوک وانه مشروع مفید للملک کا لاستیلاء علی الحشیش والحطب وبه تبین ان العقد لیس بتملک بل هو تحصیل شرط التملک وهو الرضالان ملک الحربی لایزول بدونه ومالم یزل ملکه لایقع الاخذ تملکاً لکنه اذا زال فالملک للمسلم یثبت بالاخذ والاستیلاء لابالعقد فلا یتحقق الربوا لان الربوا اسم لفضل یستفاد بالعقد". (ج۵۔ص۱۹۲)

ترجمہ! طرفین کی دلیل یہ ہے کہ حربی کا مال معصوم نہیں ہے، بلکہ وہ فی نفسہ مباح ہے، مگر مسلم مستامن اس کی رضامندی کے بغیر اس کا مالک نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس میں دھوکہ اور خیانت ہے،

جب اس نے اس کی رضامندی اور پسندیدگی حاصل کر لی تو یہ بات زائل ہوگئی،اب اس کا لینا مباح پر تسلط کرنا ہے، جومشروع ہے اور مفید ملک ہے، جیسے لکڑی اور گھاس کا حاصل کرنا، بلکہ شرط تملک کی تحصیل ہے،اوروہ رضامندی ہے، کیونکہ حربی کی ملکیت اس کے بغیر زائل نہ ہوگی، اور جب تک اس کی ملکیت زائل نہ ہو مسلمان کا لینا ملکیت نہ پیدا کرے گا، پھر جب حربی کی ملکیت زائل ہوگئی،تو مسلم کے لئے قبضہ کے بعد ملکیت ثابت ہوگئی،اور یہ ملکیت قبضہ سے ہے، نہ کہ عقد سے، پس ربوا کا تحقق نہیں ہوا، کیونکہ ربوا اس فضل (اضافہ) کو کہتے ہیں جو عقد کے نتیجہ میں حاصل ہو۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دارالحرب میں ربوا کی حلت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ربوا خواہ کہیں ہو حرام ہے،اور نص قطعی کے رو سے حرام ہے،اس میں نہ کسی کا اختلاف ہے اور نہ ہوسکتا ہے، کیونکہ نصوص صریحہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔اختلاف جو کچھ ہے اس میں ہے کہ ربوا کا مصداق کیا ہے؟ جو کچھ ربوا کے دائرے میں آئے گا وہ حرام ہے،خواہ وہ دارالاسلام میں ہو یا دارالحرب میں،اور جو ربوا کے دائرہ سے خارج ہے اسے حرام کہنے کی کوئی وجہ نہیں الا یہ کہ کوئی اور وجہ حرمت پائی جائے۔

ائمہ کے درمیان ایسا اختلاف صرف اسی ایک مسئلہ میں نہیں ہے،ربوا کی دوسری قسم جس کو فقہا ''ربواالفضل'' سے تعبیر کرتے ہیں،جس تذکرہ اس حدیث میں ہے کہ:

''عن عبادة بن الصامت :قال:قال رسول الله ﷺ الذهب بالذهب والفضةبالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء بسواء يداً بيد فاذا اختلف هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يداً بيد''.رواه السته الا البخارى (فتح القدیر ج٦۔ص١٤٧)

ترجمہ! رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گیہوں گیہوں کے عوض،جَو،جَو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض،نمک نمک کے عوض، برابر اور نقدا نقد بیچو، ہاں جب اصناف بدل جائیں تو جس طرح چاہو بیچو،مگر نقد ہو۔

ربواالفضل کے سلسلے میں ان چھ چیزوں کی تصریح احادیث میں وارد ہے،ان کے علاوہ

اور چیزوں میں بھی ربوا ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو مجتہدین اس پر متفق ہیں کہ اور چیزوں میں بھی ربوا کا تحقق ہوسکتا ہے، لیکن اس کے لئے معیار اور بنیاد کیا ہے؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ حنفیہ نے ''قدر وجنس'' کو معیار مانا ہے۔ شافعیہ نے ''طعم اور ثمنیت'' کو جنس کے اتحاد کے ساتھ علت قرار دیا۔ مالکیہ نے ''اقتیات وادخار'' کو علت مانا۔ چونکہ ان حضرات کے درمیان استخراج علت میں اختلاف ہوا، اس لئے ربوا کے مصداق میں بھی اختلاف ہوا، چنانچہ اگر لوہا لوہے کے عوض بیچا جائے تو امام صاحب اس میں کمی بیشی کو جائز نہیں قرار دیں گے کہ ربوا ہو جائے گا، اور امام شافعی کم وبیش کو جائز کہیں گے، کیونکہ اس میں نہ طعم ہے اور نہ ثمنیت، اسی طرح اور بھی بہت سی چیزوں میں اختلاف پیدا ہوگا، بلکہ ظاہریہ کے نزدیک تو ان چھ چیزوں کے علاوہ کسی چیز میں ربوا کا تحقق ہے ہی نہیں، اس لئے ان کے ماسوا ان کے نزدیک ہر چیز میں کم وبیش کے ساتھ مبادلہ جائز ہے۔

تو کیا اس مطلب یہ ہے کہ لوہے میں امام شافعی کے نزدیک ربوا حلال ہے؟ یا ان چھ چیزوں کے علاوہ میں ظاہریہ کے نزدیک سود جائز ہے؟ ہرگز نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان چیزوں میں ان نزدیک ربوا کا تحقق ہوتا ہی نہیں، یہ نہیں کہ دارالحرب میں سود جائز ہے، یہ بات قطعاً نہیں ہے، اسی بات کی تعبیر حضرت مکحول کی حدیثِ مرسل میں کی گئی ہے۔

''عن مکحول ان رسول اللہ ﷺ قال: لاربوا بین اهل الحرب واظنه قال: وبین اهل الاسلام''۔ اخرجه البیهقی من طرق ابی یوسف عن بعض المشیخة عن مکحول (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳۳۳)

ترجمہ! حضرت مکحول (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل حرب کے درمیان۔ اور میرا گمان ہے کہ فرمایا۔ اور اہل اسلام کے درمیان ربوا نہیں ہے۔

حضرت مکحول کی یہ روایت سابقہ استدلال کی تائید اور مسئلہ کی نوعیت کو واضح کرتی ہے، براہ راست اس سے استدلال خدشہ سے خالی نہیں ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب بدائع الصنائع نے اس روایت کو استدلال میں نہیں پیش کیا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا معاملہ:

اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں تصریح موجود ہے کہ وہ

مسلمان ہونے اور سود کی تحریم کے باوجود اہل مکہ سے سودی نوعیت کا کاروبار کرتے تھے، نیز طائف کے بعض قبائل سے بھی ان کا اس نوعیت کا معاملہ تھا، اور معلوم ہے کہ یہ دونوں جگہیں دارالحرب تھیں، فتح مکہ کے بعد جب مکہ شریف دارالاسلام بن گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے تمام سود منسوخ کر دیئے۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اہل حرب سے دارالحرب میں ربوا کی نوعیت کا معاملہ کرنا درست ہے۔ تفصیل شرح سیر کبیر ج۴۔ص۱۴۸۸۔ اور اعلاء السنن ج۱۴۔ص۳۳۴ میں مذکور ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں کہ دارالحرب میں سود جائز ہے، سود تو کسی حال میں جائز نہیں ہے، اصل صورت حال یہ ہے کہ دارالحرب میں جو مال حربی سے لیا جاتا ہے، اس پر شرعاً سود کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلہ کا تعلق اجتہاد سے ہے۔ نصوص قطعیہ میں اس کی تصریح نہیں، حدیث مکحول اور حربی کے مال کی شرعی حیثیت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ وہ مال مباح ہے، جو محل ربوا نہیں ہے، پس اس میں ربوا کی گنجائش نہیں ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں ایک قید کا جائزہ:

بعض اکابر نے لکھا ہے کہ دارالحرب میں حربی سے، اس بظاہر سودی معاملہ کا جواز صرف اس مسلمان کے لئے ہے جو دارالاسلام کا باشندہ ہو، اور امان لے کر دارالحرب میں آیا ہو، خود دارالحرب کے باشندہ کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کی کوئی تصریح کتب فقہ میں نظر سے نہیں گزری، نہ ان حضرات نے اس کا کوئی حوالہ دیا، صرف اتنی بات ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے، اور کتب فقہ میں صراحۃً مسلم مستامن کا ذکر ہے، جو دارالاسلام سے آیا ہو، اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ ایسا کوئی مسلمان جو دارالاسلام سے نہ آیا ہو، بلکہ خود دارالحرب کا باشندہ ہو، اس حکم سے خارج ہوگا، لیکن گزارش ہے کہ کہیں بھی مفہوم مخالف کا اعتبار اس وقت ہوگا، جب کہ اس کے خلاف کی صراحت نہ ہو، اور اگر کسی جگہ اس کے مفہوم مخالف کا خلاف صراحۃً موجود ہو تو پھر مفہوم مخالف کا اعتبار کسی کے نزدیک کہیں نہ ہوگا، ہم جب اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو حضرت عباس کا معاملہ سامنے آتا ہے کہ وہ مکہ کے ہی باشندے تھے، اور وہیں رہ کر ربوی نوعیت

کا معاملہ کرتے تھے، نیز حدیث مکحول کا اطلاق بھی یہی چاہتا ہے کہ اس میں مسلم دارالحرب اور مسلم مستامن کے درمیان فرق نہ ہو[۱]، البتہ یہ بات بالاتفاق ہے کہ مسلم کا مسلم سے سود لینا اور دینا دارالحرب میں بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں کے مابین وہ سود ہی ہوگا۔

کافر حربی کو سود دینا:

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کافر حربی سے دارالحرب میں سود کے نام پر لی ہوئی رقم تو حلال ہے، کیونکہ اس پر شرعاً سود کا اطلاق نہیں ہوتا، تو کیا انہیں سود دینا بھی جائز ہوگا؟ اور اسی سلسلے میں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ سود دینے اور سود لینے میں یکساں حرمت ومعصیت ہے یا کچھ فرق بھی ہے؟ اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ قاعدہ یاد کر لینا چاہئے کہ جس چیز کی حرمت براہ راست قرآن کریم سے ثابت ہو، اور جس چیز کی حرمت خبر واحد سے ثابت ہو، فقہا دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن قطعی الثبوت ہے، اور حدیث ظنی الثبوت، قرآن کا منکر کافر ہوگا اور حدیث کا منکر کافر نہیں ہے۔ اسی طرح دونوں کے آثار میں بھی فرق ہوگا، ایک کی معصیت بڑھی ہوگی، اور دوسرے کی معصیت اس کے مقابلے میں ہلکی ہوگی، ایک میں اباحت کی گنجائش نہ ہوگی، بجز حالتِ اضطرار کے، اور دوسرے میں حالتِ اضطرار سے کم پر بھی گنجائش مل سکتی ہے۔ بہرحال دونوں حرمتوں میں فرق ہوگا، اب غور کرنا چاہئے کہ سود کی تحرتم جن آیتوں میں بیان کی گئی ہے، ان کا تعلق سود لینے سے ہے یا دینے سے، ارشاد ہے:

ان الذ ین یا کلون الربٰوا لایقومون الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطان من المس.

ترجمہ! جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) جب کھڑے ہوں گے تو اس طرح جیسے کوئی ایسا شخص جس کو شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

یاایها الذین آمنوا اتقوا الله و ذروا ما بقی من الربٰوا

ترجمہ! اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو ربوا باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

یمحق الله الربٰوا ویربی الصد قات

ترجمہ! اللہ تعالی ربوا کو مٹا تا ہے اور صدقات کو بڑھوتری بخشتا ہے۔

اور فرمایا:

یاایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربٰوا اضعافاً مضاعفة

ترجمہ! اے ایمان والو! دگنا تگنا کر کے ربوا نہ کھاؤ۔

اور ارشاد ہے:

واخذھم الربٰوا وقد نھوا عنه

ترجمہ! اور ان کے ربا لینے کی وجہ سے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔

ان سب آیات میں سود لینے اور کھانے کا تذکرہ ہے، دینے کے باب میں یہ آیات خاموش ہیں، البتہ ایک جگہ مطلق ربا کو حرام کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

واحل الله البیع وحرم الربٰوا۔ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام کیا ہے۔

لیکن اس میں بھی غور کرنے سے اصالۃً سود لینے ہی کی حرمت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ معنی مصدری میں ہے، یعنی زیادہ کرنا، اور ظاہر ہے کہ زیادہ کرنے کی شرط آخذ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، غرض سود دینے کے سلسلے میں قرآن ساکت ہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ لینا اس وقت تک نہیں پایا جائے گا جب تک دینے کا وجود نہ ہوگا، تاہم دینے میں مجبوری بھی ہوسکتی ہے، غالباً اسی لئے قرآن میں اس سے تعرض نہیں ہوا البتہ حدیث نے اس کی شرح کردی، چنانچہ ارشاد ہے:

"لعن الله آکل الربوا وموکله وکاتبه وشاھدیه وقال ھم سواء".

ترجمہ! اللہ نے سود کھانے اور کھلانے والے، کاتب اور شاہد سب پر لعنت کی ہے۔ مسلم شریف

دلائل شرعیہ سے سود لینے اور دینے کی حرمت ثابت ہے، مگر دونوں میں فرق ہونا ناگزیر ہے، کیونکہ ایک کی حرمت قرآن سے ثابت ہے، اور ایک کی حدیث سے۔ "**ھم سواء**" کی شرح میں ملا علی قاری صاحب مرقات لکھتے ہیں کہ:

"ھم سواء ای فی اصل الاثم وان کانوا مختلفین فی قدره". (مرقات ج۳۔ص۳۰۷)

ترجمہ! یہ سب برابر ہیں، یعنی اصل معصیت میں، اگر چہ اس کی مقدار میں فرق ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتاوی میں تحریر ہے کہ:

''وتحقیق این ست کہ دادنِ سود بالتبع حرام است، کہ مال کسے نمی گیرد، بلکہ مال خود می دہد، و مالِ خود دادن گودراں نقصانِ خود باشد خصوصاً برائے دفعِ حاجت و دفعِ ظلم مباح است۔ پس وجہِ حرمت دراں ہمیں دو چیز است یکے آنکہ غیر را حرام می خوراند مثل دادنِ رشوت بقاضی و حاکم، و دوم آنکہ باعثِ ترویج ایں معاملہ در دارالاسلام می شود، لہٰذا دادنِ سود بنا بر اضطرار دارالاسلام ہم جائز داشتہ اند، غرضیکہ در گرفتن و دادن فرق بسیار است، گو دراصل وزر ہر دو شریک اند''۔ (فتاوی عزیزیہ۔ ج ا۔ص ۴۰)

ترجمہ! تحقیق یہ ہے کہ سود دینا بالتبع حرام ہے، کیونکہ وہ کسی کا مال تو لیتا نہیں، بلکہ خود اپنا مال دیتا ہے، اور اپنا مال دوسرے کو دینا، خواہ اس میں اپنا نقصان ہی ہو، بالخصوص دفع حاجت اور دفع ظلم کے لئے، بالکل مباح ہے، پس سود دینے میں حرمت کی وجہ یہی دو چیزیں ہیں، ایک یہ کہ غیر کو حرام کھلانا لازم آتا ہے، جیسے قاضی یا حاکم کو رشوت دینا۔ دوسرے یہ کہ دارالاسلام میں سودی معاملہ کی ترویج کا سبب بنتا ہے، اسی بنا پر حالت اضطرار میں دارالاسلام میں بھی سود دینے کو جائز قرار دیتے ہیں، غرض سود لینے اور سود دینے میں فرق ہے، گو کہ اصل گناہ میں دونوں شریک ہیں۔

اب اس مسئلہ پر غور کیجئے کہ دارالحرب میں حربی سے ربا کے نام پر مال لینا اگر جائز ہے تو دینے کا کیا حکم ہے؟ حدیث مکحول پر نظر کرنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سود دینے کی بھی گنجائش ہے، لیکن اگر اس کی ابتدائی بنیاد یعنی مال حربی کی اباحت پر غور کیا جائے صرف سودی نوعیت کا اضافہ لینے کی گنجائش نکلتی ہے، دینے کی نہیں، کیونکہ حربی کا مال مباح ہے، مسلمان کا نہیں۔ چنانچہ صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں کہ:

''لا یخفی انہ انما یقتضی حل مباشرة العقد اذا کانت الزیادة ینالھا المسلم والربوا اعم من ذالک اذیشمل ما اذا کان الدرھمان من المسلم ومن جھة الکافر وجواب المسئلة بالحل عام فی الوجھین وکذاا لقمار قد یفضی الی ان یکون المال الخطر للکافر بان یکون الغلب لہ فالظاھر ان الاباحة تفید

نیـل الـمسلم الزیادة وقد التزم الاصحاب فی الدرس ان مرادهم من حل الربوا والـقـمار ماذاحصلت الزیادة للمسلم نظراً الی العلة وان کان اطلاق الجواب خلافه". (ج۶۔ص۱۷۸)

ترجمہ! یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس دلیل کا تقاضہ یہ کہ جب اضافہ مسلمان کو حاصل ہورہا ہے، اس وقت یہ عقد رباجائز ہو، جبکہ (**لاربوا بین الحربی والمسلم** . میں) ربوا کا لفظ عام ہے، وہ اس صورت کو بھی شامل ہے جبکہ دو درہم مسلمان کی جانب سے ہوں، اور اس کو بھی جب کہ وہ دونوں کافر کی جانب سے ہوں، اسی طرح قمار میں بھی شرط کا مال کافر کو بھی حاصل ہوسکتا ہے، جبکہ اس کی جیت ہوجائے، اور اباحت والی دلیل اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ اضافہ مسلمان کو حاصل ہو، اور ہمارے علما نے درس میں اس کا التزام کیا ہے کہ ربا اور قمار کی حلت سے وہی صورت مراد ہے کہ جبکہ اضافہ مسلمان کو حاصل ہو، جیسا کہ علت کا تقاضہ ہے، اگر چہ جواب کا اطلاق اس کے خلاف ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتوی:

شاہ صاحب سے کسی نے سوال کیا ہے کہ:

''سود دادن بحربیاں درست است یانہ؟۔اہل حرب کو سود دینا درست ہے یانہیں''؟۔

شاہ صاحب نے جواب تحریر فرمایا:

''عبارات کتب فقہ عام واقع شدہ اند، دادن وگرفتن راشامل اند، مثلاً'' **لاربـوا بیـن الـمسـلم والحربی فی دار الحرب**''. قاضی ثناءاللہ پانی پتی دررسالہ توجیہ دادن سود نیز نوشتہ اندایں وقت فقیر رایاد نیست، لیکن ایں قدر ظاہر است کہ گرفتن سود از حربیاں بایں وجہ حلال است کہ مال حربی مباح است، اگر درضمنِ آں نقضِ عہد نباشد، وحربی چوں خود بخود بدہد بلاشبہہ حلال خواہد بود، ودادنِ سود بحربیاں بایں وجہ حلال است کہ خورانیدن حرام بمسلماناں درست نیست، وآنہا حرام خورانند، اگر چیزے بطریق سود دادہ خواہد شد بیش ازیں نیست کہ حرام خواہد خورد، واما ذمیاں ہر چند کہ کافر حرام خوار باشند در دارالاسلام دادنِ سود ازیں جہت حرام است کہ ترویجِ معاملۂ سود در دارالاسلام می شود ودارالحرب ایں ہر دو علت مفقود است،

بس مباح باشد، وتحقیق ایں ست کہ دادنِ سود بالتبع حرام است'' (فتاوی عزیزیہ ج ا۔ص ۳۹)
ترجمہ! کتب فقہ کی عبارتیں عام واقع ہوئی ہیں، دینے اور لینے دونوں کو شامل ہیں، مثلاً '' **لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب**''. اور قاضی ثناءاللہ صاحب پانی پتی نے ایک رسالے میں سود دینے کی توجیہ لکھی ہے، فقیر کو اس وقت یاد نہیں ہے، لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ اہل حرب سے سود لینا اس وجہ سے حلال ہے کہ مال حربی مباح ہے، اگر اس کے ضمن میں نقضِ عہد نہ ہو، اور حربی جب خود بخود دیتا ہے تو بلا شبہہ حلال ہے، اور اہل حرب کو سود دینا اس وجہ سے حلال ہے کہ مسلمانوں کو حرام کھلانا درست نہیں ہے، اور اہل حرب تو حرام خور ہیں ہی، اگر کوئی چیز انہیں بطریق سود دی گئی ہو تو بیش بریں نیست کے حرام کھائے گا، رہا یہ کہ ذمیوں کو سود دینا کیوں جائز نہیں؟ تو اگر چہ وہ حرام خور ہیں، لیکن انہیں سود دینے سے دارالاسلام میں سودی معاملہ کی ترویج ہوگی، جو جائز نہیں، اور دار الحرب میں یہ دونوں علتیں مفقود ہیں، پس مباح ہے، اور تحقیق یہ ہے کہ سود دینا (اصالۃً نہیں) تبعاً حرام ہے۔

لیکن ساتھ ہی شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''لیکن مسلمان را باید کہ دادن سود بحربی احتیاط کند بے ضرورت نہ دہد'' (ج ا۔ص ۴۴)

ترجمہ! لیکن مسلمان کو چاہئے کہ حربی کو سود دینے میں احتیاط کرے، بے ضرورت نہ دے۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور استفتاء اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا جواب نقل کر دیا جائے، جو ایک اشکال کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔

سوال: ''بعضے از علما امامیہ پورب بجوازِ اخذِ ربا از انگریزاں فتوی می دہند، ودر فتوی دیدہ ام کہ اگر کفار دارالاسلام استیلاء یابند دارالحرب نمی شود، وبر یک روایت مختلف برائے جر نفع عمل کردن واز نصوص دیگر کہ درعدم جواز موالات کفار وارداست کنارہ کردن وبایشاں مصاحبت و موافقت نمودن ہماں حکم دارد کہ '' **افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض**''. مع ایں ہذا در فتح ایں باب مساہلہ بعمل خواہد آمد ورفتہ رفتہ از کفار ہند بل مابین مسلمین ہم در اخذ ربوا مضائقہ نہ خواہد ماند۔

ترجمہ! پورب کے بعض امامیہ علما نے انگریزوں سے اخذِ ربا کا فتوی دیا ہے، حالانکہ فتاوی میں

مَیں نے دیکھا ہے کہ اگر کفار دارالاسلام پر تسلط حاصل کرلیں، جب بھی وہ دارالحرب نہیں ہوتا، اور ایک اختلافی روایت کی بنیاد پر تحصیلِ نفع کی خاطر عمل کرنا اور دوسرے نصوص، جو کفار سے موالات کے عدم جواز کے سلسلے میں وارد ہیں، اعراض کرنا، اور ان کے ساتھ مصاحبت وموافقت کرنا وہی حکم رکھتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ "**افتـؤمـنون ببعض الكتاب وتـكـفـرون ببعض**". علاوہ ازیں اخذِ ربا کا دروازہ کھل جائے گا، تو پھر اس میں تساہل واقع ہوگا، رفتہ رفتہ لوگ کفار ہند سے بلکہ خود مسلمانوں کے درمیان سودی معاملہ کا رواج ہو جائے گا"۔

یہ اشکال جیسے اس وقت تھا آج بھی ہے، بلکہ آج تو یہ مسئلہ زیادہ سنگین صورت اختیار کرگیا ہے، تاہم شاہ صاحب نے اس کا جواب عنایت فرمایا ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

جواب: "مفاسد یکہ در تجویز اخذ ربوا از حربیاں مرقوم شدہ بود واضح گشت، اباحتِ اصلی ایں معاملہ مجوث عنہا است، ومع ہذا مفاسد یکہ دریں مرقوم شدہ اکثر آں مفاسد منقوض است بجہاد کفار کہ متضمن ست قتلِ رجال ونہبِ اموال وسبیِ ذراری وتخریب عمارات واحراقِ اشجار و زراعات را، وظاہر است کہ ایں عمل با مسلمین در غایت قبیح است و متضمن بودن ایں معاملہ مفاسد دیگر را چیزے دیگر است، کلام دراں نیست بلکہ برفرض خلو ازیں مفاسد است والا مباحات بلکہ مستحبات ومندوبات بسبب مجاورہ مفاسد کسوت حرمت پوشند چہ جائے ایں مسئلہ کہ متفق علیہا نیست مخصوص بعلماء حنفیہ است، وآنچہ مرقوم شدہ کہ دارالاسلام گاہے دارالحرب نمی شود قول مرجوح است، واضح آنست کہ دارالاسلام دارالحرب می شود"۔ (ص۔۱۱۰)

ترجمہ! اہل حرب سے اخذِ ربا کے باب میں جو مفاسد تحریر کئے گئے معلوم ہوئے، یہاں اس معاملہ کی اصلی اباحت مجوث عنہ ہے، مع ہذا اکثر مفاسد جو یہاں لکھے گئے، وہ اس لئے قابل قبول نہیں کہ کفار کے ساتھ جہاد اس سے زیادہ مفاسد کو متضمن ہے، مثلاً قتلِ رجال، غارت گریٔ اموال، گرفتاریٔ اولاد، تخریبِ عمارت، اور احراقِ اشجار وزراعات وغیرہ، ظاہر ہے کہ یہ عمل مسلمانوں کے ساتھ انتہائی قبیح ہے، (اور جہاد میں مسلمان ان امور کا نشانہ بنتے ہیں) اس معاملہ کا دوسرے مفاسد کو متضمن ہونا دوسری چیز ہے، اس میں کلام نہیں ہے، بلکہ اس تقدیر پر گفتگو ہے کہ مفاسد سے خالی ہو، ورنہ مباحات بلکہ مستحبات تک مفاسد کے تضمن کی وجہ سے

حرام ہوجاتے ہیں، چہ جائیکہ یہ مسئلہ جوکہ متفق علیہ بھی نہیں ہے،علما احناف کے ساتھ مخصوص ہے۔اور یہ جولکھا کہ دارالاسلام کبھی دارالحرب نہیں بنتا،قول مرجوح ہے،واضح یہ ہے کہ دارالاسلام دارالحرب بن جاتا ہے''۔

دیگرائمہ کا مسلک:

اب تک کی گفتگو امام ابوحنیفہ اورامام محمد علیہما الرحمہ کے مسلک کی روشنی میں تھی،اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگرائمہ،امام مالک،امام شافعی،امام احمداورامام ابویوسف کے مسلک کا بھی مطالعہ کرلیا جائے۔کتبِ احناف میں امام ابویوسف علیہ الرحمہ کے مسلک ذکر ہے کہ(اور یہی مسلک تینوں ائمہ کا ہے)ان کے نزدیک دارالحرب میں حربی سے سود لیناسود ہی ہے،اس لئے جائزنہیں ہے،ان کے مسلک کا حاصل یہ ہے کہ حربی کا مال گوکہ مباح ہے،مگر چونکہ مسلمانوں کےحق میں عقدربا حرام ہے،خواہ کہیں بھی ہواورکسی کے ساتھ ہو۔مانا کہ دارالحرب میں حربی سے ربوی معاملہ کے ذریعہ حاصل کیا ہوامال اس کی رضامندی سے لیا گیا ہے،مگر دیکھنا چاہئے کہ تحصیل مال عقدربا کی وجہ سے ہے،کھلی بات ہے کہ کافرحربی اپنا مال جومسلمان کےحوالےکررہا ہے،وہ اس لئے کررہا ہے کہ دونوں کے درمیان لین دین کا ایک معاملہ ہورہا ہے،وہ اسی لین دین پررضامند ہے،اس کی رضااس کے علاوہ اورکسی بنیاد پرنہیں ہے،کیاوہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا مال مسلمان کے لئے مباح ہے؟اوروہ اسے لےسکتاہے،جب یہ بات نہیں ہےتو یہ تاویل کہ مسلمان اس کی رضامندی سے مال مباح پر قبضہ کررہاہے،تاویلِ بعید ہے،وہ اس تحصیل میں موثر اورعامل نہیں ہے،مؤثرعقدِ ربا ہی ہے،جوکہ ناجائز ہے۔''مبسوط میں'' ہے کہ:

"والمعنی فیه ان المسلم من اهل دارالاسلام فهو ممنوع من الربٰوا بحکم الاسلام ولایجوز ان یحمل فعله علی اخذ مال الکافر بطیبة نفسه لانه قد اخذ بحکم العقد ولان الکافر غیر راض باخذ هذا المال منه الا بطریق العقد منه ولوجاز هذا فی دارالحرب لجاز مثله فی دارالاسلام بین المسلمین علی ان یجعل الد رهم بالد رهم والد رهم الآخر هبةً". (ج۱۴۔ص۵۷)

ترجمہ! وجہ یہ ہے کہ دارالاسلام کا مسلمان ربا سے ممنوع ہے بحکمِ اسلام،اور یہ جائزنہیں ہے کہ

اس معاملہ کو اس پر محمول کیا جائے کہ اس نے کافر کا مال اس کی رضا سے لیا ہے، کیونکہ اس نے یہ بحکم عقد لیا ہے، اور اس لئے کہ کافر کی رضا اس مال کے دینے پر بحکم عقد ہی ہوئی ہے، اور اگر یہ دارالحرب میں جائز ہو تو اس جیسا معاملہ دارالاسلام میں بھی جائز ہونا چاہئے، کہ ایک درہم ایک درہم کے عوض میں ہو، اور دوسرا درہم ہبہ سمجھ لیا جائے۔

اس مسلک کے لحاظ سے دارالحرب میں ربا کا معاملہ کرنا ناجائز ہے، جیسے دارالاسلام میں، اس سے مال کی حیثیت ونوعیت کے فرق سے کوئی اختلاف نہیں واقع ہوتا، عقد ربا علی الاطلاق حرام ہے۔

دلیل کے لحاظ سے طرفین (امام صاحب اور امام محمد) کا مسلک قوی ہے، اور اجراء عمل کے لحاظ سے امام ابو یوسف کا مسلک احوط ہے، کہ اس سے بہت سے مفاسد سے حفاظت رہتی ہے۔

ہندوستان کی شرعی حیثیت؟ دارالحرب یا دارالاسلام؟:

اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کیا ہے؟ کیا دارالاسلام کبھی دارالحرب بن سکتا ہے؟ اگر بن سکتا ہے، تو کب؟

(۲) ہندوستان اپنے موجودہ حکومت کے لحاظ سے جہاں حکومت کی تشکیل میں کافر اور مسلمان دونوں دخیل ہیں، اور جہاں دستوری اعتبار سے دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں، کیا دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''باید دانست کہ مدار بودن بلدۃ وملکے دارالاسلام ودارالحرب بر غلبۂ اسلام وغلبۂ کفار است وبس، لہٰذا ہر موضع کہ مقہور تحت مسلمین است آں را بلا داسلام گفتہ خواہد شد'' قال فی جامع الرموز کتاب الجهاد. جلد.۴. دارالاسلام مایجری فیه حکم امام المسلمین ودارالحرب مایجری فیه امور رئیس الکافرین کما فی الکافی، وذکر فی الزاهدی انها ما غلب فیه من المسلمین وکانوا فیه آمنین

و دار الحرب ماخافوا فيه من الكافرين''. (تالیفات رشیدیہ۔ص۶۵۵)

ترجمہ! جاننا چاہئے کہ کسی شہر یا ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار غلبۂ اسلام اور غلبۂ کفار پر ہے اور بس، اس لئے ہر وہ جگہ جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت ہو وہ دارالاسلام کہی جائے گی، جامع الرموز، کتاب الجہاد۔ ج۴ میں ہے۔

دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کے حاکم کا فرمان جاری ہو، اور دارالحرب وہ ہے جس میں کافروں کے سردار کا حکم چلتا ہو، ایسا ہی کافی میں ہے، اور زاہدی میں ذکر کیا ہے کہ جس جگہ مسلمانوں کا غلبہ ہو، وہ دارالاسلام ہے، اور جس جگہ کفار سے مسلمان خائف ہوں وہ دارالحرب ہے''۔

یہ اور اس طرح کی عبارت تمام کتب فقہ میں مذکور ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ دارالاسلام ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہاں مسلمانوں کا حاکم ہو، اس کا غلبہ واقتدار ہو، اور مسلمان اپنے احکام کو بطور اقتدار کے ادا کرتے ہوں، اس کے برخلاف جہاں کفار کو غلبہ ہو، ان کے احکام بے دغدغہ چلتے ہوں، اور مسلمان اپنے احکام ان کی رواداری، بے تعصبی، یا ان کی اجازت سے ادا کرتے ہوں، وہ جگہ دارالکفر یا دارالحرب ہے، کسی جگہ صرف مسلمانوں کے آباد ہونے سے مسئلہ میں کوئی تفاوت نہیں آتا۔

دارالاسلام کب دارالحرب بنتا ہے؟:

کسی بھی دارالحرب کے دارالاسلام بننے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہاں اسلام کے احکام بطور غلبہ جاری ہوجائیں۔

''لا خلاف بين اصحابنا في ان دار الكفر تصير دار اسلام بظهور احكام الاسلام فيها''. (بدائع ج۷۔ص۱۳۰)

ترجمہ! ہمارے علما کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دارالکفر اس وقت دار الاسلام بن جاتا ہے جب اس میں اسلام کے احکام کا غلبہ ہوجائے۔

لیکن یہ دارالاسلام دارالحرب کب بنتا ہے؟ اس میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے۔

"قال ابو حنيفه انها لا تصير دار الكفر الا بثلاث شرائط احدها ظهور احكام الكفر فيها والثانی ان تكون متأخمة لدار الكفر والثالث لا يبقى فيها مسلم او ذمی آمناًبالامان الاول وهو امان المسلمين".

ترجمہ! امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ دارالاسلام تین شرطوں سے دارالکفر بنتا ہے، ایک احکام کفر کا غلبہ، دوسرے یہ کہ کسی دارالکفر سے متصل ہو، تیسرے یہ کہ اس میں کوئی مسلمان یا ذمی سابقہ امان کی بنیاد پر نہ ہو، یعنی مسلمانوں کی امان کی بنیاد پر۔

لیکن امام ابویوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ:

"انها تصير دار الكفر بظهور احكام الكفر فيها". (حوالہ بالا) دارالاسلام کفر کے احکام کے غلبہ کے بعد دارالکفر بن جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دارالاسلام پر جب کفار کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ وہاں اسلام کا غلبہ زائل ہو جائے، تو وہ ملک دارالحرب ہو گیا، اور اگر کفار کا غلبہ تو ہوا، مگر بعض حیثیات سے اس میں اسلام کا غلبہ باقی ہے، تو اس کو اب بھی دارالاسلام کہا جائے گا، اتنی بات پر سب کا اتفاق ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہوا کہ غلبۂ اسلام کے بالکل زائل ہونے کی علامت کیا ہے؟ تو صاحبین نے یہ فرمایا کہ جب احکام کفر علی الاعلان جاری ہو گئے، اور اسلام کے احکام مغلوب ہو گئے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کا غلبہ ختم ہو گیا، لیکن امام صاحب اس کے ساتھ مزید دو باتیں اور فرماتے ہیں، ایک یہ کہ دارالحرب سے اس کی سرحد متصل ہو، کیونکہ اگر اس سے دارالاسلام کی سرحد متصل ہو گی تو وہاں سے ہر وقت امداد کی گنجائش ہو گی، اور یہ توقع قوی ہو گی کہ مسلمانوں کا پھر غلبہ ہو جائے، اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص ذمی یا مسلمان سابقہ امان پر باقی نہ ہو، کیونکہ مسلمانوں کے سابقہ دیئے ہوئے امان کی بنیاد پر اگر کوئی ہو گا تو اس کا صاف مطلب ہو گا کہ ابھی کسی قدر غلبہ مسلمانوں کا باقی ہے، حاصل ان دونوں شرطوں کا وہی ہے کہ غلبہ اسلام بالکل ختم ہو چکا ہو۔

مولانا گنگوہی "جامع الرموز" سے نقل فرماتے ہیں کہ:

"الثانی اتصال بدار الحرب بحيث لايكون بينهما بلدة من بلاد الاسلام مايلحقهم المدد منهم ......دوم ایں کہ غرض از شرط اتصال وانقطاع ہموں قوت

است کہ درصورت اتصال مدد بدارے بقریہ معلومہ نمی رسد بخلاف صورت انقطاع از دارحرب کہ لحوق مددمی تواند پس ہنوز قوت اسلام باقی است''۔(تالیفات رشیدیہ ۶۶۴-۶۶۵)

ترجمہ! دوسرے اس کا دارالحرب کے ساتھ ایسا متصل ہونا کہ کوئی شہر اسلامی شہروں میں درمیان میں حائل نہ رہے،جس سے مسلمانوں کو مدد پہونچ سکے،دوسری بات یہ کہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہونے کی جوشرط امام صاحب نے لگائی ہے،اس کا مطلب بھی وہی غلبہ وقوت ہے، کیونکہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو مدد نہیں پہونچ سکتی، بخلاف اس صورت کے کہ دارالحرب سے انقطاع ہوتو مسلمانوں کو استخلاص دارالاسلام میں مدد پہونچنے کا زیادہ احتمال ہے،اس لئے ابھی تک اسلام کی قوت باقی سمجھی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ہر طرح اسلام کا غلبہ کسی ملک سے ختم ہوجائے تو وہ دارالکفر بن گیا،اورامام صاحب نے جوشرطیں متعین کی ہیں،وہ اسی کی علامات ہیں،امام صاحب اور صاحبین کا مقصود ایک ہی ہے،یعنی مسلمانوں کے غلبہ وقوت کا وجود اگرچہ بعض وجوہ سے ہو[تو] اس کے دارالکفر بننے سے مانع ہے،لیکن علماءِ اسلام میں کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ کفار کے ملک میں اگر کوئی ان کی صریح اجازت سے،یا ان کی چشم پوشی کی وجہ سے شعائر اسلام کا اظہار کرے تو یہ ملک دارالاسلام ہوجائے گا۔حاشا وکلا۔کیونکہ یہ خیال تفقہ سے بالکل دور ہے۔ملخصاً از تالیفات رشیدیہ، فیصلہ اعلام فی دارالحرب ودارالاسلام۔

ہندوستان کی موجودہ حالت:

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ تو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ ملک از ابتدا تا انتہا دارالکفر تھا،مسلمان جن جن علاقوں کو فتح کرکے اپنی حکومت قائم کرتے گئے،وہ دارالاسلام بنتے گئے،تاہم پورا ملک (جس کا اطلاق ۱۹۴۷ء سے پہلے موجودہ ہندوستان، پاکستان،اور بنگلہ دیش پر ہوتا ہے) مکمل مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا، کتنے رجواڑے اور ریاستیں ایسی تھیں جو غیر مسلم حکمرانوں کے زیرنگیں تھیں،وہ کبھی مصالحت کرکے مسلمان بادشاہوں سے اپنی ریاست بچائے رہتے تھے،اور کبھی موقع پاتے تو جنگ وجدال بھی کرتے،اس وقت پورا ملک ایک اکائی نہ تھا،مختلف ریاستیں تھیں، کچھ ہندو ریاستیں، کچھ مسلمان

ریاستیں،مغل دور حکومت میں بعض ریاستیں باجگذار تھیں،اور بعض خود مختار،اس قسم کی ہندو ریاستیں تو دارالاسلام بن نہیں سکیں،ہاں جہاں تک مسلمانوں کی حکومت تھی،وہ حصہ دارالاسلام تھا،۱۸۵۷ء میں دہلی کی مغل حکومت کا سقوط ہوا،اس کے بعد پورے ملک میں انگریزوں کا تسلط ہوگیا،البتہ کچھ رجواڑے،اور کچھ مسلم ریاستیں انگریزوں سے صلح کرکے اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے تھیں،اسلامی ریاستوں میں بھوپال،رام پور،حیدرآباد،ٹونک،بھاول پور،وغیرہ مشہور ریاستیں تھیں،اس دور میں جہاں جہاں انگریزوں کا قہراً تسلط ہوا،ان کے سلسلے میں علما کا اختلاف تھا،شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی تو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہندوستان کو دارالحرب قراردے چکے تھے،چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

’’دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست وحکمِ روساءِ نصاریٰ بے دغدغہ جاری ست ومراد از اجراءِ احکامِ کفر ایں است کہ در مقدمۂ ملک داری و بندوبستِ رعایا واخذِ خراج وباج وعشور اموالِ تجارت سیاستِ قطاع الطریق وسراق وفصلِ خصومات وسزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند،اگر بعضے احکامِ اسلام را مثل جمعہ وعیدین واذان وذبحِ بقرہ تعرض نکنند نکردہ باشند لیکن اصل الاصول ایں چیزہا نزد ایشاں ہبا دہدر است،زیرا کہ مساجد را ہدم بے تکلف نمایند وہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر ودرنواح نمی تواند آمد برائے منفعت خود واردین ومسافرین وتجارین مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثل شجاع الملک وولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاری ممتد است آرے در چپ و راست مثل حیدرآباد ولکھنو ورام پور احکام خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحت واطاعت مالکاں آں ملک‘‘۔(فتاوی عزیزیہ۔ج ا۔ص۳۱)

ترجمہ!اس شہر میں امام المسلمین کا حکم قطعاً نہیں چلتا اور روساء نصاری کا حکم بے دغدغہ جاری ہے،اوراحکامِ کفر کے اجرا سے مراد یہ ہے کہ ملک داری،رعایا کے انتظامات،محصول وخراج کی اصولی،اموال تجارت پرٹیکس،چوروں اورڈاکوؤں کی سزادہی،مقدمات کے فیصلے اور جرائم کی سزامیں کفار بطور خود حاکم ہوں،اگر اسلام کے بعض احکام مثلاً جمعہ وعیدین،اوراذان اورگائے کے ذبیحے سے تعرض نہ کریں تو کیا ہوا،ان چیزوں کی اصل الاصول ان کے نزدیک محض بے حیثیت ہے،کیونکہ مساجد کو بے تکلف گرادیتے ہیں،اورکسی مسلمان یا ذمی کی مجال نہیں ہے کہ

ان کی اجازت کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف میں آ سکے، وہ اپنی منفعت کے واسطے آنے والوں اور مسافر و تاجر کی مخالفت نہیں کرتے، دوسرے اکابر مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کے حکم کے بغیر ان شہروں میں قدم نہیں رکھ سکتے، اس شہر (دہلی) سے کلکتہ تک نصاری کی عملداری ہے، ہاں دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنو، اور رام پور میں اپنے احکام کو اس لئے جاری نہیں کیا کہ وہاں ان کے والیان نے ان سے صلح اور ان کی اطاعت کر رکھی ہے''۔

یہ بات ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے لکھی گئی ہے، جب کہ مغلوں کا نام بھی باقی تھا لال قلعہ کے دائرہ میں ہی سہی، ان کی حکومت کا چراغ جل رہا تھا، پھر سن مذکور کے بعد تو حالات اور دگر گوں ہو گئے، حضرت مولانا گنگوہی ان لوگوں میں سے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے جہاد میں بنفس نفیس شریک تھے، اس وقت کے اور اس کے بعد کے حالات کے وہ صرف عینی شاہد نہیں بلکہ براہ راست انقلاب وتداولِ ایام کا تجربہ رکھتے تھے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''چوں ایں مسئلہ محقق شد اکنوں حال ہندرا خود غور فرمایند کہ اجرائے احکام کفار نصاری دریں جا چہ قوت وغلبہ ہست کہ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت ادا نہ کنید ہیچ کس از امیر وغریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید وایں ادائے جمعہ وعیدین وحکم بقواعد فقہ کہ می شود محض بقانون ایشاں است کہ در رعایا حکم جاری کردہ اند کہ ہر کس حسبِ دینِ خود دست، سرکار را بوے مزاحمت نیست''۔ (تالیفات رشیدیہ۔ص ۶۶۷)

ترجمہ! اور جب یہ مسئلہ (کلی طور پر) محقق ہو چکا تو اب ہندوستان کی حالت پر خود غور کر لیں کہ اس جگہ کفار نصاری کے احکام کا اجراء کس غلبہ وقوت کے ساتھ ہے، کہ اگر کوئی ادنیٰ کلکٹر یہ حکم کر دے کہ مساجد میں جماعت نہ ادا کرو تو کسی امیر وغریب کی مجال نہیں کہ ادا کر سکے، اور یہ جو کچھ ادائے جمعہ وعیدین اور عمل (بعض) قواعد فقہیہ پر ہو رہا ہے، محض ان کے قانون کی وجہ سے ہے کہ انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب میں آزاد ہے، سرکار کو اس سے کوئی مزاحمت نہیں۔

اور سلاطین اسلام کا دیا ہوا امن جو یہاں کے رہنے والوں کو حاصل تھا، اب اس کا کہیں نام ونشان نہیں، کون عقل مند کہہ سکتا ہے کہ ہمیں جو امن شاہ عالم نے دیا تھا آج بھی ہم اسی امن کے ذریعے مامون بیٹھے ہوئے ہیں، بلکہ امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے، اور اسی نصاری کے

دیئے ہوئے امن کے ذریعہ تمام رعایا ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔

رہا اتصال بدارالحرب سو یہ ممالک واقالیم عظیمہ کے لئے شرط نہیں ہے، بلکہ گاؤں اورشہروغیرہ کے لئے شرط ہے، جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں سے مدد پہنچنا آسان ہو، کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر شاہ کابل یا شاہ روم کی طرف سے مدد پہونچ جائے کفار کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں، حاشا وکلا، بلکہ ان کا اخراج ہندوستان سے سخت مشکل ہے، بہت بڑے جہاد اور عظیم الشان سامان کی ضرورت ہے۔

''بہر حال تسلط کفار کا ہندوستان پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا تسلط کسی دارالحرب پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا، اور شعائر اسلامیہ جو یہاں مسلمان ادا کرتے ہیں، وہ محض ان کی اجازت سے ہیں، ورنہ مسلمانوں سے زیادہ عاجز کوئی رعایا نہیں، ہندوؤں کو ایک درجہ رسوخ حکومت میں حاصل ہے، مسلمانوں کو وہ بھی نہیں، البتہ ریاست ٹونک، اور رام پور اور بھوپال وغیرہ کہ وہاں کے حکام باوجود مغلوب کفار ہونے کے، اپنے احکام جاری رکھتے ہیں، ان کو دارالاسلام کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم''۔ (تالیفات رشیدیہ۔ص ٦٦٨)

جوصورت حال انگریزی دور حکومت میں تھی، اگر اس وقت ہندوستان دارالحرب تھا تو ظاہر ہے کہ اب اس میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، جس کی بنیاد پر اسے دارالاسلام قرار دیا جاسکے، [۲] پہلے انگریزوں کو غلبہ حاصل تھا، اب اکثریت کو قوت حاصل ہے، اقلیت کا کام صرف اس قدر ہے کہ کسی پلڑے میں اپنا وزن ڈال کر اسے ذرا وزنی بنادے، اور اس کے عوض میں کچھ دستوری حقوق سے مستفید ہولے، مسلمان جو کچھ اسلامی احکام پر عمل کر لیتے ہیں وہ بر بنائے غلبہ و قوت نہیں، بلکہ ملک کا دستور سیکولر ہے، اس میں ہر اقلیت کو تحفظ دیا گیا ہے، اسی تحفظ سے اہل اسلام استفادہ کرتے ہیں، یہی وہ تحفظ ہے جسے فقہا امان سے تعبیر کرتے ہیں، ایسا تحفظ دارالاسلام میں غیر مسلموں کو بھی ملتا ہے اس صورت میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا متعین ہے۔

پھر دارالحرب یا دارالکفر کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جو بالفعل اہل اسلام سے برسر پیکار ہو یا آمادۂ جنگ ہو، دوسرے وہ جس کی مسلمان سے صلح ہو، اور مسلمان وہاں ان کے امان کے تحت رہتے یا آتے جاتے ہوں، اس دوسری قسم کو''دارالموادعۃ'' کہہ سکتے ہیں، لیکن ہے وہ بھی

دارالحرب ہی۔علامہ سرخسی تحریر فرماتے ہیں۔

"ولو ان اھل دار من اھل دار الحرب وادعوا اھل الاسلام فدخل الیھم مسلم وبایعھم الدرھم بالدرھمین لم یکن بذالک باس لان بالموادعة لم تصر دارھم دارالاسلام. (ج۴۔ص۱۴۹۳)

ترجمہ! اگر کسی دارالحرب والوں نے اہل اسلام سے مصالحت کر لی، پھر وہاں کوئی مسلمان گیا اوران سے ایک درہم کے عوض دودرہم کی بیع کی، تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مصالحت سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن جاتا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان مسلمانوں کے حق میں دارالحرب کی دوسری قسم بنتا ہے، یہاں کے غیر مسلموں سے غدر خیانت اور سرقہ تو جائزنہیں، لیکن اس کی رضامندی سے ان کے اموال کو عقود فاسدہ (جن میں ربوی معاملات بھی داخل ہیں) کے تحت حاصل کرنا امام صاحب اور امام محمد کے نزدیک جائز ہے۔

ماخذ۔(مجلّہ فقہ اسلامی۔۱۹۸۹ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) بدائع الصنائع میں اس کی تصریح موجود ہے کہ اگر مسلمان دارالحرب کا باشندہ ہے تو بھی اس کے حربی سے ربوی معاملہ کرنا جائز ہے۔وکذالک لوکان اسیراً فی ایدیھم اور سلم فی دارالحرب ولم یھاجر الینا فعاقد حربیاً۔(۱۳۲/۷)

(۲) بلکہ پہلے جو اسلامی ریاستیں کسی حیثیت سے اپنا وجود بچا کر دارالاسلام قائم کئے ہوئے تھیں، اب وہ سب فنا ہو چکی ہیں۔

گاؤں میں جمعہ

جمعہ کی نماز باتفاقِ امت فرض ہے،اس کی فرضیت ظہر سے زیادہ مؤکد ہے، جہاں اس کی فرضیت پر تمام امت کا اتفاق ہے، وہیں اس پر بھی پوری امت کا اجماع ہے کہ یہ نماز عام نمازوں کی طرح نہیں ہے کہ جہاں چاہے ادا کرلی جائے، اور جس طرح چاہے خواہ تنہا، خواہ جماعت سے پڑھ لی جائے، بلکہ اس کی فرضیت اور صحت ادائیگی کے لئے عام نمازوں سے زائد کچھ شرائط اور قیود ہیں، اگر وہ شرطیں اور قیدیں نہ پائی جائیں تو بعض حالات میں نماز جمعہ واجب نہ ہوگی، اور بعض میں جائز نہ ہوگی۔

جواز جمعہ کی شرطیں:

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی صحت کے لئے عام نمازوں سے زائد بنیادی شرطیں ہیں، (۱) مصر جامع (۲) سلطان (۳) جماعت (۴) خطبہ۔ اخیر کی دونوں شرطیں تمام ائمہ کے نزدیک معتبر ہیں، لیکن پہلی دونوں شرطیں صرف احناف کے نزدیک ضروری ہیں، عام کتب فقہ میں مصر جامع اور سلطان کی شرطیں الگ الگ مذکور ہیں، اوران دونوں کے مستقل احکام بیان کئے گئے ہیں، لیکن مصر کی جو تعریف ائمہ فقہ سے منقول ہے، اور اس سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، انہیں بنظر غائر دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں میں ایک شرط اصل ہے، اور دوسری اس کے تابع اور فرع، اگر اصل ختم ہوجائے تو جو تابع ہے وہ آپ سے آپ ختم ہوجائے گی، تفصیل ملاحظہ ہو۔

مصر جامع کی تعریف:

اولاً ہمیں مصر کی تعریف پر غور کرنا چاہئے، اسی سے اس مسئلہ کی عقدہ کشائی ہوگی، فقہ

حنفی کی معتبر کتاب ''بدائع الصنائع''میں اس کی کئی تعریفیں منقول ہیں۔

(۱) امام ابوحنیفہ سے جوتعریف منقول ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

''انہ بلدۃ کبیرۃ فیھا سکک واسواق ولھا رساتیق وفیھا وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمہ وعلمہ اوعلم غیرہ والناس یرجعون الیہ فی الحوادث وھو الاصح''.

ترجمہ! وہ ایسا بڑا شہر ہو جس میں گلی، کوچے اور بازار ہوں، اور اس کے تحت گاؤں ہو، اور اس میں حاکم رہتا ہو جو ظالم ومظلوم کے درمیان انصاف پر قادر ہو، اپنی شوکت سے یا اپنے علم سے، یا دوسرے کے علم کی مدد سے، اور لوگ معاملات میں اس کی جانب رجوع ہوتے ہوں، یہی تعریف اصح ہے۔

(۲) امام ابویوسف سے دوتعریفیں منقول ہیں، ایک تعریف جو اصل ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

''کل مصر فیہ منبر وقاض ینفذالاحکام ویقیم الحدود فھو مصر جامع تجب علی اھلہ جمعہ''.

ترجمہ! ہر وہ شہر جہاں منبر ہو اور قاضی ہو، جو احکام کا نفاذ اور حدود کا اجرا کرتا ہو، وہ مصر جامع ہے، وہاں والوں پر جمعہ واجب ہے۔

(۳) امام کرخی نے مصر کی تعریف یہ کی ہے کہ:

''المصر الجامع مااقیمت فیہ الحدود ونفذت فیہ الاحکام''.

ترجمہ! مصر جامع وہ ہے جہاں حدود قائم کی جاتی ہوں اور احکام نافذ کئے جاتے ہوں۔

(۴) ہدایہ میں ہے کہ:

''کل موضع لہ امیر وقاض ینفذالاحکام''.

ترجمہ! ہر وہ جگہ جہاں امیر وقاضی ہو، جو احکام نافذ کرتا ہو۔

مصر جامع جو جمعہ کے جواز اور صحت کے لئے شرط ہے، اس کی یہ چار تعریفیں ذکر کی گئیں، اور بھی تعریفیں ہیں مگر زیادہ تر تعریفوں میں مضمون یہی ہے، اور جن میں یہ مضمون نہیں ہے

وہ علامات ہیں تعریف نہیں۔ان میں پہلی تعریف تو خود صاحب مذہب کی روایت ہے،اور اسی کو فقہاء محققین نے اصح قرار دیا ہے۔اور امام ابویوسف،امام کرخی،اور صاحب ہدایہ نے بھی الفاظ کو کم وبیش کر کے اسی کو قبول کیا ہے،اور یہی مضمون امام صاحب کے جلیل القدر استاذ،مشہور تابعی حضرت عطاء ابن رباح سے بھی منقول ہے،چنانچہ امام بخاری نے ایک باب قائم کیا ہے "**من این توتی الجمعه وعلی من تجب**" اس کے تحت حضرت عطاء کا قول نقل کیا ہے۔

"**اذا کنت فی قریة جامعة فنودی بالصلاة من یوم الجمعة فحق علیک ان تشهدها سمعت النداء اولم تسمعه**".

ترجمہ! جب تم کسی قریہ جامعہ میں ہو،اور جمعہ کی اذان ہو جائے،تو جمعہ میں حاضر ہونا واجب ہے،خواہ تم نے اذان سنی ہو یا نہ سنی ہو۔

اس کے تحت حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

"**وزاد عبدالرزاق فی هذا الاثر عن ابن جریح ایضاً قلت لعطاء،ماالقریةالجامعة؟قال ذات الجماعة والامیر والقاضی،والدور المجتمعة الآخذ بعضها ببعض مثل جده**". (فتح الباری ج۲۔ص۳۸۵)

ترجمہ! عبدالرزاق نے اس اثر میں ابن جریج سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عطاء سے پوچھا کہ قریہ جامعہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ ایسا قریہ جہاں جماعت،امیر اور قاضی ہو،اور ملے جلے مکانات ہوں،جیسے جدہ۔

اس تفصیل سے مسئلہ کی یہ صورت سامنے آتی ہے کہ جمعہ کے لئے مطلق مصر کافی نہیں ہے،بلکہ مصر جامع ہونا چاہئے۔جامع کی یہ اصطلاح حضرت عطا کے اثر میں بھی موجود ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ جامع کی اصطلاح دور اول ہی میں رائج ہو چکی تھی،دوسرے یہ کہ مصر،مصر جامع اس وقت بنتا ہے جب کہ اس میں حاکم،نائب حاکم،یا قاضی موجود ہو،ورنہ وہ مطلق مصر تو ہوگا،مصر جامع نہ ہوگا۔

پس حاصل یہ ہے کہ جمعہ اسی مصر میں درست ہوگا جس میں مذکورہ بالا افراد میں سے کوئی ہو،اور جس مصر میں امیر یا قاضی وغیرہ موجود نہ ہوں،وہ مصر جامع نہیں،اور اس میں جمعہ بھی

درست نہ ہوگا،اور پھراسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ کسی گاؤں میں اگران افراد میں سے کوئی موجود ہو،یعنی وہاں مستقل اس کا تعین ہوتو خواہ چھوٹا ہی گاؤں کیوں نہ ہو،اس میں جمعہ جائز ہے، لیکن یہ استدلال چونکہ مفہومِ مخالف سے ہے اوربعض مواقع پر یہ استدلال حنفیہ کے یہاں معتبر نہیں ہے،اسی لئے اس باب میں فقہا کی تصریحات پیش کی جاتی ہے۔

مصر بغیر حاکم کے:

''فتح القدیر'' ج۲۔ص۵۱ ''باب الجمعۃ'' دیکھئے،علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں۔

"ولـو مصر الامام موضعاً وامرهم بالاقامة فيه جازولو منع اهل مصر ان يجمعوا لم يجمعوا".

ترجمہ! اگرکسی جگہ کوخلیفۂ وقت نے مصرقراردیا،اوراس میں جمعہ کاحکم دیا تو جائز ہے،اوراگر کسی مصروالوں کو جمعہ پڑھنے سے منع کردیا،تو وہ لوگ جمعہ نہیں پڑھیں گے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے جواز یا وجوب کے لئے محض مصر ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ امیر کاحکم ہونا بھی ضروری ہے،یہی وجہ ہے کہ اگر امیر کسی وجہ سے (بشرطیکہ ازراہِ تعدی نہ ہو)مصر میں اقامت جمعہ سے منع کردے،تو وہاں جمعہ پڑھنا جائزنہیں۔

پھرص۵۲ پرفرماتے ہیں۔

"ولـو مصـر مصراًثم نفرالناس عنه لخوف ونحوه ثم عادوا لايجمعون الاباذن".

ترجمہ! اگرکوئی شہرآباد تھا، پھرلوگ کسی خوف وغیرہ کی وجہ سے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے، پھر دوبارہ لوٹے تو بغیراذن کے جمعہ نہ پڑھیں۔

یہ عبارت اس مسئلہ میں اوربھی صریح ہے کہ خواہ شہرہی ہو،بغیر امام کی اجازت کے اقامت جمعہ درست نہیں ہے۔''درمختار'' کی عبارت **"وظاهـر الـمذهب انه كل موضع له قاض"** کےتحت علامہ شامی لکھتے ہیں:

"اى يقيمان فلااعتبار لقاض ياتى احياناً يسمى قاضى الناحية".

ترجمہ! یعنی دونوں مقیم ہوں،پس ایسے قاضی کا وجودمعتبرنہیں جوکبھی کبھی وہاں آتا ہے، جسے

''قاضی ناحیہ'' کہتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی جگہ والی یا قاضی نہ رہتا ہوتو وہاں جمعہ جائز نہیں۔

گاؤں جہاں جمعہ پڑھنے کا اذن ہو:

اب دوسری بات دیکھئے کہ گاؤں ہو مگر حاکمِ وقت نے جمعہ کا حکم دے رکھا ہو، تو وہ مصر جامع ہو جاتا ہے، خواہ وہ آبادی کے لحاظ سے چھوٹا ہی ہو، اس کی جانب اول تو ہدایہ میں ذکر کردہ مصر جامع کی تعریف ہی اشارہ کرتی ہے، اس میں ہے کہ ''**کل موضع لہ امیر الخ**'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی جگہ (خواہ وہ گاؤں ہی ہو) قاضی یا امیر وغیرہ موجود ہو تو جمعہ واجب ہے، مزید تصریح ملاحظہ ہو، درمختار میں ہے:

''**وفی القهستانی: اذن الحاكم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقاً**''.

ترجمہ! قہستانی میں ہے کہ حاکم نے اگر کسی گاؤں میں جامع مسجد بنانے کا حکم دیا تو یہ جمعہ کی اجازت ہے بالاتفاق۔

پھر علامہ شامی نے قہستانی کی عبارت نقل کی ہے، الفاظ یہ ہیں:

''**تقع فرضاً فی القصبات والقری الكبيرة التی فيها اسواق**''.

ترجمہ! بڑے گاؤں اور دیہات میں جن میں بازار ہوں جمعہ پڑھنے سے فرض ادا ہو جاتا ہے۔ (قصبہ کے معنی گاؤں کے ہیں، یہ عطف تفسیری ہے۔ حاشیہ بر شامی ۱۳۸/۲) ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

پھر لکھتے ہیں:

''**وفيما ذكرنا اشارة الى انه لايجوز فی القری الصغيرة التی ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما فی المضمرات...... الا تری ان فی الجواهر لو صلوا فی القری لزمهم اداء الظهر، هذا اذا لم يتصل به حكم فان فی فتاوی الديناری اذا بنی مسجد فی الرستاق بامر الامام فهو امر بالجمعة اتفاقاً علی ما قال السرخسی**''.

ترجمہ! اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا اس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ایسے چھوٹے گاؤں

میں جمعہ جائز نہیں ہے، جس میں قاضی، منبر اور خطیب نہ ہوں، ایسا ہی ''مضمرات'' میں ہے، دیکھو ''جواہر'' میں ہے کہ اگر جمعہ نماز گاؤں میں لوگوں نے پڑھ لی، تو انہیں ظہر ادا کرنی ضروری ہے، لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب کہ حاکمِ وقت کی اجازت نہ ہو، اس لئے کہ ''فتاوی دیناری'' میں ہے کہ جب گاؤں میں امام کے حکم سے مسجد بنائی گئی تو درحقیقت جمعہ کا حکم ہے بالاتفاق جیسا کہ امام سرخسی نے فرمایا ہے۔

یہ پوری عبارت بغور دیکھ جائیے، اس سے یہ بات کس قدر واضح ہے کہ گاؤں میں اگر حاکم کا امر ہو تو جمعہ واجب ہو جاتا ہے، اور اس کے پڑھنے سے فریضۂ وقت ادا ہو جاتا ہے۔

''بدائع الصنائع'' ج ا ص ۲۶۰ پر علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''ویتصل بها اقامة الجمعةفی ایام الموسم بمنی قال ابو حنیفه وابو یوسف تجوز اقامة الجمعه بها اذا کان المصلی بهم الجمعة هو الخلیفة او امیر العراق او امیر الحجاز او امیر مکة سواء کانوا مقیمین او مسافرین اورجلاً ماذوناً من جهتهم ولو کان المصلی بهم امیر الموسم وهو الذی امر بتسویة امور الحاج لاغیر لایجوز سواء کان مقیماً اومسافراً لانه غیر مامور باقامة الجمعة الااذا کان ماذوناًمن جهة امیر العراق او امیر مکة وقال محمد لاتجوز الجمعة بمنی''.

ترجمہ! اور اسی سلسلہ سے متعلق منی میں جمعہ کی نماز کا قائم کرنا بھی ہے ایام حج میں، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ ایام حج میں منی میں جمعہ جائز ہے، جب کہ جمعہ کا امام خود خلیفہ ہو، یا حاکم عراق ہو، یا حاکم حجاز ہو، یا حاکم مکہ ہو، خواہ یہ لوگ مقیم ہوں یا مسافر ہوں، یا ان کی طرف سے مقرر کیا ہوا کوئی اور شخص ہو، اور اگر جمعہ کا امام امیر الحج ہو یعنی وہ آدمی جسے صرف حجاج کے انتظام کی ذمہ داری سپرد ہو، تو جمعہ جائز نہیں ہے، خواہ وہ مقیم ہو یا مسافر ہو۔ اس لئے کہ وہ اقامت جمعہ کے واسطے مامور نہیں ہے، ہاں اگر اسے حاکمِ عراق یا حاکمِ مکہ کی جانب سے اس کی اجازت ہو تب جائز ہے۔ اور امام محمد نے فرمایا کہ منی میں جمعہ جائز نہیں ہے۔

موجودہ دور میں منی کی جو بھی کیفیت ہو، لیکن جس وقت اس مسئلہ کا فیصلہ کیا جا رہا تھا،

اس وقت منی شہر نہ تھا، چند گھروں پر مشتمل ایک دیہات تھا، لیکن ایام حج میں وہاں مجمع کثیر ہوجاتا تھا، تو امیر یا نائب امیر کی موجودگی میں جمعہ فرض ہوجاتا ہے، اور اگر محض امیر حج ہے، اور اسے جمعہ قائم کرنے کا اختیار نہ ملا ہو، تو جمعہ جائز نہیں، لیکن امام محمد فرماتے ہیں کہ منی میں سرے سے جمعہ جائز نہیں، کیونکہ اس مجمع کی وجہ سے منی مصر نہیں بن جاتا۔ پھر صاحب بدائع امام محمد کے فتوی کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"والصحیح ان الخلاف فیه بناء علی ان المصر الجامع شرط عندنا الا ان محمداًیقول: ان منی لیس بمصر جامع بل هو قریة فلاتجوز الجمعة بها کما لاتجوز بعرفات وهمایقولان انها تتمصر فی ایام الموسم لان لهابناء ینقل الیه الاسواق ویحضرها وال یقیم الحدود وینفذ الاحکام فالتحق بسائر الامصار".

ترجمہ! صحیح یہ ہے کہ یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ ہمارے نزدیک مصر جامع شرط ہے، مگر امام محمد فرماتے ہیں کہ منی مصر جامع نہیں ہے، بلکہ وہ ایک گاؤں ہے، اس لئے اس میں جمعہ جائز نہیں۔ اور شیخین فرماتے ہیں کہ موسمِ حج میں وہ مصر بن جاتا ہے، کیوں کہ اس میں عمارتیں بھی ہیں، اور اس وقت وہاں بازار بھی آجاتے ہیں، اور حاکم بھی آموجود ہوتا ہے، جو حدود قائم کرتا ہے، اور احکام نافذ کرتا ہے، اس لئے وہ مصر کے حکم میں ہوجاتا ہے۔

اس عبارت سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ منی میں ایامِ حج کے دوران جمعہ کا وجوب اس کے مصر جامع ہوجانے کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اس کا جامع ہونا حاکم ووالی کی موجودگی پر موقوف ہے، ورنہ اگر والی حاکم نہ ہو، صرف امیرِ حج ہو، جب بھی بازار وغیرہ تو وہاں آہی جاتے ہے، اور شہریت کے تمام آثار پیدا ہوہی جاتے ہیں لیکن حاکم کے نہ ہونے کی وجہ سے باوجود مصر بن جانے کے وہ مصر جامع نہیں بن پاتا اور نہ جمعہ جائز ہوتا ہے

حاصل بحث:

حاصل یہ کہ ان فقہی عبارتوں پر غور کرنے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مصریت کی شرط بذات خود مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب اصل حاکم ووالی ہے، اور والی وحاکم چوں کہ عموماً ایسے ہی

شہروں میں رہتے ہیں جن میں بازار وملحقات ہوتے ہیں، نیز ان کی آبادی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے مصر ہونا بھی اس کے ضمن میں مطلوب ہے، ورنہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ موضع آباد ہونا چاہئے، اور اس میں حاکم کا اقامت جمعہ کے لئے امر ہونا چاہئے، پس جمعہ قائم ہوسکتا ہے۔

گو کہ اس حاصل مطالعہ کے تسلیم کرنے میں حضرات فقہا واصحاب فتاوی کو تأمل ہوگا، لیکن وہ خود غور کریں، کیا اس کی کوئی تصریح ملتی ہے کہ جمعہ کے لئے مصر بذات خود مطلوب ہے۔ ہر جگہ ''مصر جامع'' یا ''قریہ جامع'' کی صراحت ہے، اور مصر جامع اور قریہ جامع کی روح ہے حاکم یا نائب حاکم کا اقامت گزیں ہونا۔ تاریخ اسلام میں جہاں جہاں اقامتِ جمعہ کا تذکرہ ملتا ہے، وہاں والی وعامل یا اس کے حکم کا ثبوت بھی ملتا ہے، اور جہاں صراحۃً اس کا ثبوت نہیں ملتا وہاں بھی قرائن وشواہد اس کے موجود ہیں کہ صاحبِ امر کے حکم سے جمعہ قائم کیا گیا ہے، اور فقہی تصریحات تو صاف ظاہر کرتی ہیں کہ بلا اذنِ حاکم اقامتِ جمعہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی کی رائے:

راقم الحروف اس خیال یا نظریہ کا موجد نہیں ہے، اکابر دیوبند میں حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں، وہ حنفیہ کے زبردست وکیل ہیں، چنانچہ تراویح اور فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل پر جس نے ان کے رسائل دیکھے ہوں گے، وہ اس امر سے بخوبی واقف ہوگا۔ یہ خیال انہیں کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہے، جو ''فیوض قاسمیہ'' نامی مجموعۂ مکاتیب میں درج ہے۔ پورا مکتوب پڑھنے کے قابل ہے، مولانا نے حاکم وقت کے اشتراط کی جو توجیہ فرمائی ہے، وہ بڑی لطیف ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ نماز جمعہ کے لئے خطبہ شرط ہے، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

''یاایھاالذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکراللہ وذروا البیع''.

ترجمہ! اے ایمان والو! جب جمعہ کی نماز کے لئے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی جانب دوڑ پڑو، اور بیع وشراء ترک کردو۔

اس میں ہر شخص جانتا ہے کہ ''ذکراللہ'' سے مراد خطبہ ہے، اسی کی جانب لپکنے اور

دوڑنے کا حکم ہے، پھر اسی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر غور کیجئے کہ۔

"لایقص الا امیر او مامور او مختال". وعظ وتذکیر صرف امیر کرتا ہے یا اس کا مامور یا پھر متکبر۔

اس سے معلوم ہوا کہ وعظ وتذکیر کا حق یا تو حاکم کو ہے، یا حاکم کے متعین کردہ شخص کو، ان دونوں کے علاوہ اگر کوئی منبر وعظ پر کھڑا ہوتا ہے تو وہ زمرۂ متکبرین میں داخل ہے۔ اور معلوم ہے کہ شریعت میں واجب خطبے چند ایک ہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم، اور ضرورت کا وعظ خطبۂ جمعہ ہی ہے، ظاہر ہے کہ حدیث کے تقاضے کے مطابق اس واجب خطبے کا حق صرف حاکم یا اس کے نائب کو ہوسکتا ہے، ان مقدمات ضروریہ سے بداہۃً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جمعہ کے قیام کی اجازت جب تک حاکم وقت سے نہ ملے، جمعہ جائز نہ ہوگا، پس اصل شرط وجود حاکم ہے، اور مصریت اس کے تابع ہے، مولانا فرماتے ہیں:

"باقی ماند فقط شرط مصر اگر غور کنند ہمیں ضرورت امیر ومامور دست دیگراں دہد چہ مصرے باشد کہ حاکے دراں نبود"۔

ترجمہ! باقی رہی محض مصر کی شرط تو اگر غور کریں گے تو یہی ضرورت امیر ومامور ہاتھ لگے گی، کیونکہ کوئی شہر ایسا نہیں ہوتا جہاں کوئی حاکم نہ رہتا ہو۔

ہندوستان میں موجودہ حالت میں جمعہ کا مسئلہ:

لیکن اس اصول کو اگر جوں کا توں قبول کرلیا جائے، تو ہندوستان کے کسی شہر پر نہ تو مصر جامع کی تعریف صادق آتی ہے، اور نہ کہیں جمعہ جائز ہوسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود فقہا یہاں کے قصبات، حتی کہ بڑے بڑے گاؤں میں بھی جمعہ کو واجب قرار دیتے ہیں، اب یہ امر قابل غور ہے کہ حاکم کا وجود جو بنیادی شرط ہے، اسے کالعدم کرکے ایک ضمنی شرط پر کیوں اس قدر اصرار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کی جو تفصیلات اوپر ذکر کی گئیں وہ دارالاسلام سے تعلق رکھتی ہیں، جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو، کفار مغلوب ومقہور ہوں، وہاں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ شعائر اسلام کا اہتمام کرے، انہیں شعائر میں نماز جمعہ وعیدین بھی ہے۔ ان سب کا تعلق حکومت

وقت سے ہے، لیکن اس وقت ہندوستان کی صورت یکسر مختلف ہے۔ اس کا دارالاسلام ہونا کب کا ختم ہو چکا ہے، تو کیا شعائر اسلام کے قائم کرنے کی ذمہ داریاں یک قلم موقوف ہو جائیں گی، جب کہ موجودہ حکومت بہت سے امور میں مداخلت بھی نہیں کرتی، صاف ظاہر ہے کہ جن شعائر کے اظہار پر مسلمان قادر ہیں، انہیں موقوف نہیں کیا جا سکتا، نماز جمعہ وعیدین کا مسئلہ ایسا ہے کہ ان پر مسلمان پورے طور پر قدرت رکھتے ہیں، پس اب جماعتِ مسلمین، حکومتِ اسلامیہ کے قائم مقام ہے، مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ والیٔ مسلم تلاش کریں، اور جب تک اس کی کوئی سبیل نہیں نکلتی، اس وقت تک شعائر اسلام کے اظہار واعلان کے لئے اپنی اپنی جگہ پر امام متعین کر کے اسی کی امامت میں نماز جمعہ وعیدین ادا کریں۔

"فلو الولاۃ کفاراً یجوز للمسمین اقامة الجمعة ویصیر قاضی قاضیاًبتراضی المسلمین ویجب علیهم ان یلتمسوا والیاًمسلماً".

ترجمہ! اگر حکام غیر مسلم ہوں تو مسلمانوں کو جمعہ قائم کرنا جائز ہے، اور قاضی مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی بن جائے گا، اور مسلمانوں پر واجب ہے کی والیٔ مسلم کی جستجو کریں۔

غرضیکہ والی وحاکم کی شرط جس شدومد سے کتب فقہ میں مذکور ہے، ہمارے ملک میں قطعاً معتبر نہیں ہے، جب یہ بنیاد ہی کھسک گئی تو مصر جامع کی جو عمارت اس بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی، وہ خود بخود منہدم ہو گئی۔ چنانچہ حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ:

"چوں موافقِ ایں تقریر ایں شرط از میاں برخاست شرط مصر ہم بیک طرف رفت چہ اشتراطش ملزوم اشتراط امیر بود"۔

ترجمہ! جب اس تقریر کے موافق کی یہ شرط درمیان سے اٹھ گئی تو مصر کی شرط بھی ایک طرف جا پڑی، کیوں کہ مصر کی شرط تو ملزوم تھی، اور امیر کی شرط لازم تھی، (جب لازم نہیں باقی رہا تو ملزوم کیوں کر باقی رہ سکتا ہے)

اور فرماتے ہیں کہ:

"واگر کسے در دیہے جمعہ قائم کند دست وگریبانش نہ زنند کہ اول ایں شرط ظنی بود باز حسبِ تقریرِ مذکور ضعفے دگر دراں بہم رسید"۔

ترجمہ! اگر کوئی شخص دیہات میں جمعہ قائم کرے تو اس سے نہ الجھیں، کیوں کہ اول تو یہ شرط

(یعنی مصر کی) ظنی تھی، پھر تقریر مذکور کی روشنی میں مزید ضعف اس میں پیدا ہو گیا۔

پھر جمعہ کہاں ہو؟:

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جب مصر جامع کی شرط باقی نہیں رہی تو کیا ہر چھوٹی بڑی آبادی میں جمعہ کی نماز جائز ہو سکتی ہے؟ اس سلسلے میں جب احادیث کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ ایسے مہتم بالشان مسئلے میں نہ ان لوگوں کے پاس صحیح، مرفوع، صریح الدلالت روایت ہے، جو مصر جامع کے اشتراط کے قائل ہیں، اور نہ ان لوگوں کے پاس ایسی کوئی حدیث ہے جو چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی اجازت دیتے ہیں۔ احناف کے پاس اشتراط مصر کی جو روایت ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ اور دوسرے ائمہ جو مصر کے اشتراط کے قائل نہیں ہیں، ان کے پاس بھی صحیح سند سے جس میں کوئی کلام نہ ہو، کوئی صریح الدلالۃ، مرفوع روایت نہیں ہے، یا تو صحابہ کا قول ہے یا ان کا عمل ہے۔

چنانچہ ایک روایت حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' ج ٢۔ص ٣٨٠ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ:

''**انہ کتب الی اھل البحرین ان جمعوا حیثما کنتم**''. انہوں نے اہل بحرین کو لکھا کہ جہاں بھی رہو جمعہ قائم کرو۔

صاحب فتح الباری اس پر لکھتے ہیں کہ:

''**ھذا یشمل المدن و القری**''. یہ شہر اور گاؤں دونوں کو شامل ہے۔

لیکن اس تبصرہ پر کلام کی بہت گنجائش ہے۔ نیز عبدالرزاق کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک اثر نقل کیا ہے، اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے کہ:

'**انہ کان یری اھل المیاہ بین مکۃ و المدینۃ یجمعون فلایعیب علیھم**'.

ترجمہ! وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں لوگوں کو جمعہ پڑھتے دیکھتے تھے، اور انکار نہیں فرماتے تھے۔

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں کہ:

''**فلما اختلف الصحابۃ وجب الرجوع الی المرفوع**''. جب صحابہ میں

اختلاف ہواتو مرفوع کی طرف رجوع ضروری ہے۔

پھر جس مرفوع روایت کی جانب رجوع کا انہوں نے مشورہ دیا ہے، وہ بخاری کی مشہور روایت ہے، جو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ۔

"قال:ان اول جمعة بعد جمعةفی مسجد رسول اللہﷺفی مسجد عبد القیس بجواثی من البحرین".

ترجمہ! انہوں نے فرمایا کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ مسجد عبد القیس میں بحرین کی آبادی جواثی میں پڑھا گیا۔

اس حدیث سے صاحب فتح الباری یہ متعین کرنا چاہتے ہیں کہ جواثی ایک گاؤں ہے، اور حضور کے زمانے میں اس میں جمعہ پڑھا گیا۔اور ظاہر ہے کہ بنی عبد القیس کے لوگ آپ کے پاس آمدورفت رکھتے تھے،انہوں نے آپ کے علم واطلاع میں جمعہ کی یہ نماز قائم کی ہوگی۔اس طرح گاؤں کا جمعہ ثابت ہوجاتا ہے،لیکن اس حدیث میں متعین کرنا کہ جواثی گاؤں تھا بغایت دشوار ہے۔ایسے آثار وشواہد تاریخ میں موجود ہیں جن سے اس کا شہر،اور تجارت کی منڈی ہونا معلوم ہوتا ہے،لہٰذا اس باب میں یہ حدیث بھی فیصلہ کن نہیں ہے۔

تاہم جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں،احناف کے اقوال کی روشنی میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ مصریت جمعہ کے لئے مقصود بالذات نہیں ہے،اصل شرط امیر یا اس کے حاکم کا پایا جانا ہے،اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ فقہاء احناف اس شرط سے غیر دارالاسلام میں دستبردار ہو چکے ہیں، پس مصر کی شرط پر اصرار بظاہر کوئی معقول معنی نہیں رکھتا۔

فیصلہ کن بات:

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان سب مباحث سے قطع نظر ایک اور بات جو ہر دور اور ہر جگہ چل سکنے والی ہے،تحریر فرمائی ہے۔اس پر موجودہ دور میں غور کرنا چاہئے،اور کسی بھی درجہ میں قابل عمل ہوتو امت کی سہولت کے واسطے اس پر فتوی دینا چاہئے،لکھتے ہیں کہ:

"وقد تلقت الامة تلقیاً معنویاًمن غیر تلقی لفظ انه یشترط فی الجمعة

الجماعة ونوع من التمدن".

ترجمہ! امت میں بغیر کسی لفظ کے معنوی طور پر یہ بات ہر دور میں تسلیم شدہ رہی ہے کہ جمعہ کے لئے جماعت اور ایک طرح کا تمدن شرط ہے۔

اور لکھتے ہیں کہ:

"وذالک لانه لما کان حقیقة الجمعة اشاعة الدین فی البلد وجب ان ینظر الی تمدن وجماعة والاصح عندی انه یکفی اقل مایقال فیه قریة لماروی من طرق شتی یقوی بعضه بعضاخمسة لاجمعة علیهم وعد منهم اهل البادیة".

ترجمہ! اور یہ اس واسطے کہ جب جمعہ کی مصلحت یہ ہے کہ شہروں میں دین کی اشاعت ہو تو واجب ہے کہ کسی قدر تمدن اور جماعت کو ملحوظ رکھا جائے، اور میرے نزدیک اصح یہ ہے کہ کم سے کم جتنی آبادی پر قریہ کا اطلاق ہو سکے وہ کافی ہے، کیوں کہ مختلف طرق سے جن میں سے بعض سے بعض کو تقویت ہوتی ہے، مروی ہے کہ پانچ طرح کے لوگوں پر جمعہ نہیں ہے، اور ان میں اہل بادیہ کو شمار کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس آبادی پر بادیہ کا اطلاق ہو اس میں جمعہ نہیں ہے، اور جس پر قریہ کا اطلاق ہو اس پر جمعہ ہے۔

اور لکھتے ہیں کہ:

"قال ﷺ الجمعة علی الخمسین رجلاً" اقول الخمسون یتقری بهم قریة وقال ﷺ :"الجمعة واجبة علی کل قریة". (۳۰/۲)

ترجمہ! رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جمعہ پچاس آدمی پر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پچاس آدمی سے قریہ کی آبادی ہو جاتی ہے، اور فرمایا کہ جمعہ ہر قریہ پر واجب ہے۔

اگر فی زمانہ اس پر فتوی دیا جائے تو بڑی سہولت ہو جائے۔

علماء کرام سے گزارش:

حضرات علماء کرام! جمعہ کے لئے اشتراط مصر کا مسئلہ ایسے قطعی مسائل میں سے ہرگز نہیں ہے، جن میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو، آپ دیکھ رہے ہیں کہ تین امام اس پر متفق ہیں کہ اس

میں مصر شرط نہیں ہے۔ پھر احناف کے یہاں بھی دور اول کے بعض مسائل وآراء میں نسخ وترمیم کا سلسلہ چلتا رہا، فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیجئے، سلطان وحاکم کا مسئلہ کس شد ومد کے ساتھ مع اس کی جزئیات کے بیان کیا گیا ہے، لیکن اب اس پر عمل نہیں ہے۔ ابتدائی روایات میں ایک شہر میں دو جمعہ کی گنجائش سرے سے نہ تھی، ایک ہی جمعہ جائز تھا، دوسرا کالعدم تھا، پھر بعض خاص حالات میں دو جمعہ کی اجازت دی گئی، اور اب یہ سب قصے کہانیاں ہیں، ایک ہی شہر میں نہ جانے کتنے جمعے پڑھے جاتے ہیں، اور سب جائز ہیں۔ کیا اس صورت حال میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ گاؤں میں جمعہ پڑھنے کی اجازت دیدی جائے، جب کہ ہمارے ملک میں عموماً گاؤں بادیہ کہلانے کے مستحق نہیں ہیں، اچھے خاصے بڑے گاؤں ہیں، جن میں تمدن کی ابتدائی ضروری چیزیں مہیا ہیں۔ ہاں آبادی اس سے کم ہے جتنی کسی بڑے گاؤں کے لئے متعین کی جاتی ہے، اور اکثر گاؤں میں جمعہ کی نماز زمانۂ قدیم سے پڑھنے کا دستور بھی چلا آرہا ہے، اور جمعہ کے شعارِ اسلام ہونے کی بنا پر بے دینی کے رجحان کے باوجود گاؤں کی تقریباً پوری آبادی ہفتہ بھر کی اس ایک نماز پر جمع ہوجاتی ہے۔ دینداری اور اسلام دوستی کی تجدید اس طرح ہر ہفتہ ہوتی رہتی ہے، ورنہ تو ان گاؤں میں مدتوں تک دینی جذبات کی تجدید کا کوئی سامان نہیں ہو پاتا، لوگ اپنے دنیاوی کاروبار اور مشاغل میں اس طرح منہمک ہوتے ہیں کہ سر اٹھا کر اپنے دین وایمان کو دیکھنے تک کی فرصت نہیں پاتے، ایسے گاؤں میں علما کا گزر بھی نہیں ہوتا، اگر جمعہ قائم ہو تو گاہے بگاہے کوئی پہونچ جاتا ہے، اور کچھ وعظ وتذکیر سے قلوب میں گرمی پیدا کر دیتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ہمارے ملک کی اکثریت مسلمانوں کی گو کہ حنفی ہے، مگر اتنی کثرت سے گاؤں میں جمعہ ہوتا ہے کہ اس میں ابتلاء عام کی صورت ہے، اور عموم بلوی کی حالت میں مسائل مختلف فیہا میں تخفیف ہو ہی جاتی ہے۔

بعض حضرات یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ گاؤں جمعہ کا محل نہیں ہے، لہٰذا اس میں جمعہ پڑھنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی بمبئی جا کر حج کر آئے۔ ظاہر ہے بمبئی حج کا محل نہیں ہے، اگر کوئی ایسا کرے تو ساری دنیا اسے بے وقوف کہے گی، ایسے ہی گاؤں جب محل جمعہ نہیں ہے تو اس میں جمعہ کا کیسا سوال؟ بادی النظر میں یہ مثال بہت برمحل معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ

اس جگہ کے لئے یہ مثال قطعاً موزوں نہیں ہے، کیونکہ حج کے لئے عرفات، مزدلفہ، منی، اور مکہ معظّمہ کی سرزمین نص قطعی سے متعین ہے، اسی لئے وہاں تو کسی اور محل کا تصور ہی نہیں۔ اور جمعہ کے لئے کون سی نص قطعی ایسی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ جمعہ کا محل صرف مصر ہے، اور کوئی نہیں، اگر ایسی کوئی نص قطعی یہاں بھی ہوتی تو یہ اختلاف ہی کیوں پیدا ہوتا؟ یہ مثال بے جا تشدد پر مبنی ہے، جو اہل علم کے شایان شان نہیں۔

بظاہر یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اگر گاؤں میں جمعہ نہ ہوتو کیا مضائقہ ہے؟ اور کیا ضرورت ہے کہ ایسے گاؤں میں جمعہ قائم کیا جائے، جہاں حضرات علماءِ احناف کے نقطہ نظر سے جمعہ جائز نہیں؟ لیکن سچ پوچھئے تو جو گاؤں اور گاؤں والوں کے مزاج وحالات سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ایک مسئلہ جمعہ کی وجہ سے آپس میں کتنے تنازعے پرورش پاتے رہتے ہیں، اگر تحقیق کیجئے تو تقریباً ۹۵ ر فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے، اس میں اگر اکا دکا کوئی نہیں پڑھتا، اور ایسا نہ پڑھنے والا کوئی عالم ہوتا ہے، تو وہ اپنے علم و صلاح کا سارا وزن کھودیتا ہے، اس کی بات اور اس کا وعظ سننے کے لئے کوئی آمادہ نہیں ہوتا۔ بعض اہل تشدد قائم شدہ جمعہ کو بند کرانے کی کوشش کرتے ہیں، تو جمعہ تو بند نہیں ہوتا، البتہ جھگڑے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

پس جب مسئلہ مختلف فیہ ہے، تو ان مصالح وضروریات پر نظر کرکے حضرات اہل فتوی اس مسئلہ میں تسہیل کی راہ اختیار فرمائیں تو کیا عجب کہ خیر کی بعض صورتیں پیدا ہوں، گوکہ مسلمانوں کے عام مزاج کے پیش نظر ہم یہ بات پورے یقین اور وثوق سے نہیں کہہ سکتے، کیونکہ طبائع نزاع وشقاق پر اس درجہ مستعد ہیں کہ ذرا سا بہانہ بڑی لڑائی کے لئے کافی ہوتا ہے، تاہم ایک بڑا جھگڑا جو وجہِ انتشار بنا رہتا ہے، کم سے کم ہوجائے گا۔

یہ ایک دردمندانہ گزارش ہے، فتوی نہیں، فتوی تو ارباب فقہ وفتاوی کا ہی معتبر ہے۔

☆☆☆☆☆☆

ماخذ۔ (سہ ماہی بحث ونظر پھلواری شریف پٹنہ۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء)

شرعی پنچایت یا قاضی

سوال اول: ہندوستان جیسے ملک میں کیا فقہ حنفی میں عامۃ المسلمین کی طرف سے تقرر قاضی کا یہ دعوی درست ہے؟۔

جواب اول: ہندوستان جیسے دارالکفر میں جو حضرات عامۃ المسلمین یا ارباب حل وعقد کی متفقہ رائے سے تقرر قاضی کو جائز سمجھتے ہیں ان کے استدلال کی بنیاد علامہ شامی اور علامہ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کی دو عبارتیں ہیں۔

بناءِ استدلال:

علامہ شامی ''فتاوی تاتارخانیہ'' کی عبارت نقل کرتے ہیں کہ:

''واما بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والاعیاد ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین فیجب علیهم ان یلتمسوا والیاً مسلماً منهم''. (شامی ۴/۳۰۸)

ترجمہ! رہے وہ ممالک جن پر کافر حکام مسلط ہیں تو ان میں مسلمانوں کے لئے جمعہ اور عیدین کی اقامت درست ہے، اور قاضی مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی بن جائے گا، تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے میں کسی مسلمان حاکم کی جستجو کریں۔

یہ تاتارخانیہ کی عبارت ہے، اسی صفحہ میں علامہ شامی فتح القدیر کی عبارت نقل کرتے ہیں جو اسی مفہوم کی ہے:

''اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبه الآن یجب علی المسلمین ان یتفقوا

علی واحد منهم یجعلونه والیاً فیولی قاضیاً اویکون هوالذی یقضی بینهم وکذا ینصبوا اماماً یصلی بهم الجمعة"۔

ترجمہ! جب کسی جگہ نہ سلطان ہو نہ ایسا کوئی شخص ہو جس سے منصب قضا کی تحصیل درست ہو جیسا بعض اسلامی ممالک کا حال ہے جن پر کفار کا غلبہ ہو چکا ہے، مثلاً قرطبہ، تو ایسی جگہوں پر مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اپنے میں سے کسی کو والی مقرر کرلیں اور پھر وہ کسی کو قاضی بنائے، یا خود ہی لوگوں کے مابین فیصلے کیا کرے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ کسی شخص کو امامت جمعہ وغیرہ کے لئے متعین کرلیں۔

تاتارخانیہ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے دارالکفر میں قاضی، قاضی بن جاتا ہے، اور فتح القدیر کی عبارت سے مفہوم ہوا کہ دارالکفر میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاملات ومسائل کے تصفیہ کے لئے اولاً کسی والی وامام کا انتخاب کریں اور پھر والی وامام یا تو قاضی کا انتخاب کرے یا خود وہی فریضۂ قضا کو انجام دے۔

''فتح القدیر'' کی عبارت سے بطور مفہوم مخالف کے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت کافرہ اگر قاضی مقرر کرے تو ایسا کرنا مسلمانوں کے حق میں صحیح اور مفید نہیں ہے، اس کا قاضی اہل اسلام کے لئے قابل قبول نہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کسی آدمی کو والی وحاکم مقرر کریں اور پھر وہ قاضی کا انتخاب کرے۔

انہیں دونوں عبارتوں سے رسالہ میں مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اگر بنظر غور دیکھئے تو ان عبارتوں سے دعوی کا اثبات مشکل ہے، استدلال کی کمزوری سمجھنے سے پہلے یہ واضح کردینا مناسب ہے کہ یہاں دو دعوے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کی رائے عامہ سے قاضی کا تقرر صحیح ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت کافرہ کا مقرر کیا ہوا قاضی مسلمانوں کے حق میں قاضی نہیں ہوسکتا۔ اب استدلال کی کمزوری ملاحظہ ہو۔

پہلے استدلال کی کمزوری:

پہلا دعوی یہ ہے کہ عامۃ المسلمین متفقہ طور پر کسی کو قاضی بنا سکتے ہیں، اور دلیل کی عبارت یہ ہے کہ "**ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین**" عربی داں حضرات

جانتے ہیں کہ ’’صیر ورت‘‘ میں کسی چیز کا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا ہے، جیسے دودھ دہی بن گیا۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص قاضی ہے وہ مسلمانوں کے حق میں قاضی اس وقت بن سکتا ہے جب مسلمانوں کی باہمی رضامندی اسے حاصل ہو جائے۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی کون سی صورت ہوگی کہ پہلے سے کوئی شخص قاضی مقرر ہو مگر مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر اس کی قضا معتبر نہ ہو، تو فقہا کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ایسی جگہ سے ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی تو ہو مگر اقتدار کفار کا ہو، اور انہوں نے انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر خاص مسلم مسائل کے تصفیہ کے لئے مسلمانوں ہی میں سے کسی کو قاضی بنا دیا ہو، تو ایسا شخص حکومت کا قاضی تو ہے مگر مسلمانوں کے حق میں اس کے فیصلوں کا نفاذ مسلمانوں کی رضامندی کے بعد ہوگا۔ چنانچہ فتاوی تاتارخانیہ کی عبارت سے اس مطلب کی تائید ہوتی ہے، ورنہ اس عبارت کے بعد ’’**فیجب علیهم ان یلتمسوا والیاً مسلماً منهم**‘‘ کا مطلب کچھ نہیں ہوگا، کھلی بات ہے کہ وہ قاضی خود مسلمانوں کا بنایا ہوا نہیں بلکہ مانا ہوا ہے، اس لئے ان پر اس فریضہ کے عائد کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے لوگوں میں سے ایک مسلم حاکم بھی تلاش کریں، اور وہ کسی کو قاضی مقرر کرے، کیوں کہ حکومت کافرہ کا مقرر کردہ قاضی مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی بن تو جائے گا اور اس کے شرعی فیصلے نافذ بھی ہوں گے، مگر مسلمانوں کو اسی پر اکتفا کرنا درست نہیں ہے بلکہ انہیں کسی والی وحاکم کی جستجو کے لئے جدوجہد کرنی ضروری ہے، اور اپنا قاضی وہی ہوگا جو والی کا مقرر کردہ ہو۔

فقہا کو اس تصریح کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ گزشتہ ادوار میں جب حکومتوں میں انقلاب آیا اور کافروں کا تسلط دارالاسلام پر ہو گیا تو چونکہ غالب تعداد اہل اسلام کی تھی اور وہ بجز شرعی فیصلوں کے اور کوئی صورت قبول نہیں کر سکتے تھے، اس لئے مجبوراً حکومتیں مسلمان قاضیوں کا انتخاب کرتی تھیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے بھی مسلمان قضاۃ کا تقرر کچھ دنوں تک برقرار اور جاری رکھا تھا۔ ایسے ہی قاضیوں کے بارے میں یہ سوال اٹھا کہ ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تو فقہا نے جواب دیا کہ یہ قضاۃ اس وقت شرعی قاضی ہوں گے جب مسلمانوں نے ان پر اپنی رضامندی دیدی ہو، ورنہ حکومت کافرہ کے مقرر کردہ قاضی کا کیا

اعتبار؟اس کے ثبوت کے لئے مزید تصریحات ملاحظہ ہوں۔

مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی اپنے فتاوی میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

درفتاوی بزازیہ می آرد۔"**قال السید الامام والبلادالتی فی ایدی الکفرة الیوم لا شک انها بلادالاسلام بعد ایصالها ببلاد الحرب ان لم یظهروا فیها احکام الکفرة بل القضا ة مسلمون واما البلاد التی علیها وال مسلم من جهتهم فیجوز اقامة الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاة وتزویج الایامی والارامل واما البلاد التی علیها ولاۃ کفارفیجوز فیها ایضاً اقامة الجمع والاعیاد والقاضی قاض بتراضی المسلمین**". (مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی برہامش خلاصۃ الفتاوی ۱/۱۶۱)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ کسی ملک پر کفار کے غلبہ کے بعد صورت حال دوطرح کی ہوسکتی ہے۔ایک یہ کہ ملک کے کسی خاص علاقے میں کفار نے مسلمانوں کو حکومت دیدی ہو،اوروہ اپنی اصول وضوابط کے مطابق احکام جاری کرتا ہو۔جیسے برطانوی ہندوستان میں ریاست حیدرآباد،ریاست بھوپال،اورریاست رام پور کی حیثیت تھی۔یہ ریاستیں تھیں تو حکومت برطانیہ کے ماتحت مگر انتظامات میں نواب خودمختار ہوتے تھے،اپنی فوج رکھتے تھے،عہدے اور مناصب تقسیم کرتے تھے،قاضی مقرر کیا کرتے تھے،اورشرعاً یہ سب تصرفات درست تھے۔

دوسری صورت حال یہ ہے کہ والی وحاکم تو کافر ہی ہولیکن ان کی جانب سے مسلمان قاضیوں کا تقرر ہوتا ہو،انہیں کے بارے میں ہے"**ویصیر قاضی قاضیاً بتراضی المسلمین**"،یعنی مسلمانوں کی رضامندی سے ان کا مقرر کیا ہوا قاضی،قاضی بن سکتا ہے۔

دوسری جگہ مولانا عبدالحی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

در،ردالمختارمی نویسند"**فی معراج الدرایه عن المبسوط** .. ..
(۱)وکل مصر له وال فیه من جهتهم(الکفار)یجوز له اقامة الجمع والجماعات والحد وتقلید القضاة.(۲)فلو کان الولاة کفارا یجوز للمسلمین اقامة الجمعه ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین".انتهیٰ ملخصاً (مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی برہامش خلاصۃ الفتاوی۔۱/۱۶۳)

اس عبارت کا حاصل بھی بعینہ وہی ہے جو اوپر کی عبارت میں مذکور ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ سے تقرر قاضی کے مسئلہ کو فقہا کی عبارت سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے کہ اس عبارت سے ان حضرات کا دوسرا دعوی منہدم ہو رہا ہے، دوسرا دعوی یہ تھا کہ ''حکومت کافرہ کا مقرر کردہ قاضی مسلمانوں کے حق میں معتبر نہیں ہوگا''۔ اس دعوی کی تردید صراحۃً اس سے ہو رہی ہے۔

دوسرے دعوی پر استدلال کی کمزوری:

سابقہ صراحت کے بعد اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ دوسرے دعوی کی غلطی پر مزید گفتگو کی جائے، تاہم اس کی تفصیل ذکر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔

دوسرے دعوی کی دلیل صاحب فتح القدیر کی وہ عبارت ہے جس کو پہلے نقل کیا جا چکا ہے، اس میں صراحۃً حکومت کافرہ کے تقرر قاضی کو غلط نہیں کہا گیا ہے، عبارت کے مفہوم مخالف سے یہ مدعا ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں یہ صراحت ہے کہ ''مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ والی مسلم کی تلاش کریں'' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کافرہ کا مقرر کردہ قاضی معتبر نہ ہوگا، ورنہ والی مسلم کی تلاش کا کیا معنی؟ لیکن کیا مفہوم مخالف سے استدلال صحیح ہے؟ مانا کہ فقہا کی عبارت کا مفہوم مخالف دلیل بنتا ہے لیکن یہ قاعدہ ایسا کلیہ نہیں ہے جس کے خلاف نہ ہو سکے، بالخصوص جب کہ اس مفہوم مخالف کے خلاف کی صراحت موجود ہو، اب ملاحظہ ہو ''تاتارخانیہ'' کا فتوی۔

''**الاسلام ليس بشرط فيه اى السلطان الذى يقلد**''۔ جو بادشاہ قاضی مقرر کرے اس کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔

تاتارخانیہ کی اس صراحت اور فتح القدیر کی عبارت کے مفہوم مخالف میں تعارض ہے، اس سلسلے میں علامہ شامی نے ''نہر الفائق'' کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ ''**وهذا هو الذى تطمئن نفس اليه فليعتمد**'' جو کچھ علامہ ابن ہمام کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے، یعنی حکومت کافرہ کے تقرر قاضی کی عدم صحت، اسی پر طبیعت کو انشراح ہے، لہذا اسی پر اعتماد کرنا چاہئے، اس پر علامہ شامی تبصرہ فرماتے ہیں۔

''**والاشارة بقوله وهذا الى ما افاده كلام الفتح من عدم صحة تقلد**

القضاء من كافر على خلاف ما مر من التتارخانيه ولكن اذا اولى الكافر عليهم قاضياً ورضيه المسلمون صحت توليته بلا شبهة"۔(۳۰۸/۴)

ترجمہ! اور"هذا "کا اشارہ فتح القدیر کی عبارت کے اس مفہوم کی جانب ہے کہ کافر کی جانب سے تقلد قضا درست نہیں ہے، بخلاف اس کے جو تتارخانیہ کے حوالے سے گزرا،لیکن جب مسلمانوں پر حکومت کافرہ قاضی مقرر کرے اور مسلمان اس پر راضی ہوں تو اس کا قاضی بننا بلاشبہہ صحیح ہے۔

علامہ شامی کی اس عبارت سے "ويصير القاضي قاضياً بتراضي المسلمين" کا مطلب واضح ہوگیا،اب اس پر مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔حاصل ان سب عبارتوں کا ایک ہی ہے،وہ حکومت کافرہ کا مقرر کردہ قاضی بشرط رضامندیٔ اہل اسلام معتبر اور صحیح ہے،ان عبارتوں سے عامۃ المسلمین کی جانب سے قاضی کے تقرر پر کوئی روشنی نہیں پڑتی،البتہ اگر ہمیں اجازت ملے تو ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ ان عبارتوں کے مفہوم مخالف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ سے کسی کا قاضی بننا مطلقاً درست نہیں ہے، کیوں کہ اگر اس کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو فقہا کرام اس کا ذکر ضرور کرتے اور اس طول عمل کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ اولاً حکومت کافرہ کسی کو قاضی مقرر کرے پھر اہل اسلام اس پر اظہارِ رضامندی کریں، پھر وہ قاضی بنے،آخر جب ایک مختصر راہ موجود تھی کہ مسلمانوں کی رائے عامہ یا اربابِ حل وعقد کا انتخاب بنانے کے لئے کافی ہے تو اس طول طویل راہ اختیار کرنے کی حاجت کیا تھی؟معلوم ہوا کہ فقہا کا ذہن رائے عامہ سے قاضی بنانے کی صورت سے یکسر خالی ہے،اس لئے اس طریقۂ انتخاب کو اختیار کرنا ایک بدعت ہے، جو بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے۔اب خلاف دلیل ہونا ملاحظہ فرمایئے۔

رائے عامہ سے تقرر قاضی معتبر نہیں:

"عالمگیری"میں"محیط"کے حوالے سے یہ عبارت موجود ہے۔

"اذااجتمع اهل البلدة وقدموا رجلاً على القضاء لايصح لعدم الضرورة وان مات سلطانهم واجتمعوا على سلطنة رجل جاز للضرورة"۔

(بزازیہ برہامش عالمگیری۔۱۳۰/۵)

ترجمہ! شہر کے باشندے اگر اتفاقِ رائے سے کسی کو منصب قضا پیش کریں تو وہ قاضی نہیں بن سکتا، کیوں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر ان کا بادشاہ مرگیا ہو اور سب مل کر کسی کو بادشاہ منتخب کرلیں تو ضرورت کی بنا پر صحیح ہے۔

اس عبارت سے جہاں اس بات کی صراحت ہورہی ہے کہ رائے عامہ سے قاضی کا تقرر صحیح نہیں، وہیں یہ بھی وضاحت ہوگئی کہ مسلمانوں کو ضرورت تقرر قاضی کی نہیں ہے بلکہ تقررِ والی کی ہے۔اور فتح القدیر میں یہی صورت تجویز کی گئی ہے کہ سب مسلمان مل کر کسی کو والی اور سلطان بنائیں، اور وہ قاضی کا انتخاب کرے۔

علامہ شامی کے ایک تبصرہ کی وضاحت:

علامہ شامی تنویرالابصار کی عبارت "**ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر**" کے تحت لکھتے ہیں:

"**وھذا ظاھر فی اختصاص تولیۃ القضاء بالسلطان ونحوہ کالخلیفۃ حتی لو اجتمع اھل بلدۃ علی تولیۃ واحدالقضاء لم یصح بخلاف مالو ولوا سلطاناً بعد موت سلطانھم کما فی البزازیہ**"۔(نہر)

ترجمہ! یہ عبارت اس مسئلہ میں ظاہر ہے کہ تولیتِ قضاء سلطان اور خلیفہ کا حقِ خاص ہے، حتی کہ اگر کسی شہر والے متفق ہوکر کسی کو قاضی مقرر کرنا چاہیں تو یہ صحیح نہیں ہے، اس کے برخلاف اگر بادشاہ کی موت کے بعد سب مل کر کسی بادشاہ بنائیں تو صحیح ہے۔

اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ تقررِ قاضی صرف والی وسلطان کا حق ہے لیکن علامہ شامی نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے موقع پر وہ عامۃ المسلمین کی جانب سے تقررِ قاضی کو صحیح سمجھتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

"**قلت وھذا حیث لاضرورۃ والا فلھم تولیۃ القاضی ایضاً کما یاتی بعدہ**"۔میں کہتا ہوں کہ یہ حکم وہاں ہے جہاں ضرورت نہ ہو، ورنہ ان کو یہ حق ہے کہ ضرورت کے موقع پر قاضی مقرر کریں جیسا کہ بعد میں آرہا ہے۔

گویا یہ عبارت مجمل ہے، تفصیل اس کے آگے کہیں آ رہی ہے، ظاہر ہے کہ مجمل عبارت سے بغیر اس کی تفصیل کا لحاظ کئے ہوئے استدلال درست نہیں ہے، لیکن اس کی تفصیل کیا ہے؟ علامہ شامی نے اس اجمال کا حوالہ دے کر تفصیل نہیں کی ہے بلکہ تفصیل کے لئے صاحب فتح القدیر کی وہی عبارت نقل کر دی ہے جس کا حال اوپر گزر چکا ہے کہ ''مسلمان اولاً اپنا والی کسی کو بنائیں، وہ والی قاضی مقرر کرنے کا مجاز ہوگا'' اور بزازیہ کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ضرورت والی وحاکم بنانے کی ہے، قاضی بنانے کی نہیں۔ لہٰذا علامہ شامی کے اجمال، علامہ ابن ہمام کی تفصیل اور صاحب بزازیہ کے اشارہ سے یہ بات متعین ہے کہ مسلمان بطور خود قاضی مقرر کر نہیں سکتے بلکہ یہ والی وحاکم کا خصوصی منصب ہے، وہی مقرر کریں گے۔

فقہ حنبلی کی تصریحات:

فقہ حنفی کی تصریحات تو گزر چکیں، دوسرے مذاہب فقہ کی کتابیں ہمیں بقدر کفایت میسر نہیں، تاہم فقہا جس انداز سے یہ مسئلہ ذکر کرتے ہیں اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ چند تصریحات پیشِ خدمت ہیں۔

فقہ حنبلی کے مشہور اور معتبر متن ''المنقع'' میں یہ مسئلہ ان الفاظ میں لکھا ہے کہ:

''ولاتثبت ولاية القضا الا بتولية الامام او نائبه لانها من المصالح العامة فلم يجز الا من جهة الامام كعقد الذمة''.

ترجمہ! ولایت قضا کا حصول امام کے یا اس کے نائب کے تقرر پر موقوف ہے، کیوں کہ اس کا تعلق مصالحِ عامہ سے ہے، اسی لئے بجز امام کے اور کوئی صورت اس کی صحت کی نہیں ہے، جیسا کہ عقد ذمہ کا حال ہے۔

یعنی کفار سے عہد و پیمان کے بعد ان کو ذمی قرار دینا بجز امام کے اور کوئی نہیں کرسکتا، اسی طرح قاضی کا تقرر بھی صرف امام ہی کرسکتا ہے۔ یہ عبارت اس مسئلہ میں بالکل صریح ہے کہ انتخاب قاضی بجز امام یا اس کے نائب کے اور کوئی نہیں کرسکتا، ''المنقع'' کے شارح نے اس پر کچھ نہیں لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، ورنہ وہ اپنے دستور کے مطابق ذکر کرتے۔ ماخذ: الریاض۔ دوماہی۔ ریاض العلوم گورینی (۱۹۸۶ء)

زکوٰۃ

زکوۃ اسلام کے پانچ بنیادی فرائض میں سے ایک ہے جو صاحبِ نصاب مسلمان پر عائد ہوتا ہے، اس کے احکام ومسائل (جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں) کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہا نے اس کی درج ذیل تعریف کی ہے۔

"تملیک جزء مال عینه الشارع من مسلم فقیر غیر هاشمی ولا مولاه لله تعالی". (درمختار مع ردمختار ۲/۲۵۷ مطبوعہ کراچی)

کسی مسلمان فقیر کو جو کہ ہاشمی نہ ہو، نہ ہاشمی کے موالی میں سے ہو، مال کے ایک حصہ کا جسے شریعت نے متعین کیا ہے اللہ کے واسطے مالک بنانا۔

اوراس کا سببِ فرض یہ تحریر کیا ہے کہ:

"ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین مطالب من جهة العباد وعن حاجته الاصلیه نام ولو تقدیراً". (حوالہ سابق ۲/۲۵۹)

ایسے نصاب کی ملکیت تامہ جس پر سال پورا ہو چکا ہواوراس پر کوئی ایسا دین نہ ہو جس کا مطالبہ بندوں کی جانب سے ہو، نیز اس کی حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہواور وہ نامی ہو اگر چہ وہ حکماً ہی ہو۔

سوال نامے کے دونوں محور کا جواب اسی سبب کی تفصیل میں مضمر ہے، اس میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) ملکِ تام (۲) نصابِ حولی (۳) فراغت عن الدین (۴) فراغت عن الحاجہ الاصلیہ (۵) نماء۔

یہی پانچ نکتے ہیں جن پر اس مجلس میں غور کرنا ہے۔

سوال: ملکِ تام سے کیا مراد ہے؟۔

"ان المراد بالملک التام المملوکة یداً ورقبةً". (حوالہ سابق ۲/۲۶۹)

ملک تام سے مراد یہ ہے کہ شئی کا مالک ہو، اور قبضہ بھی اسی کا ہو، اگر قبضہ نہ ہو تو ملکیت ناقص ہے، یا قبضہ ہو لیکن شئی کا مالک نہ ہو تو یہ بھی ناقص ہے، لیکن بعض اوقات ملکیتِ ناقصہ ملکِ تام کے حکم میں ہوتی ہے، اس کی تفصیل دین کے اقسام کے سلسلے میں آ رہی ہے۔

سوالات کے جواب:

(۱) مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو اور مال ابھی وصول نہ ہوا ہو

''بحرالرائق''، میں ''محیط'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''اس میں زکوۃ مشتری پر واجب ہوگی، لیکن ادائیگی کا وجوب قبضہ کے بعد ہوگا اور سالہائے ماضی کی بھی دینی ہوگی''۔

"ذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض لا یکون نصابا لان الملک فیه ناقص لافتقاد الید والصحیح انه یکون نصابا لانه عوض عن مال کانت یده ثابتة علیه وقد امکنه احتواء الیه علی العوض فتعتبر یده باقیة علی النصاب باعتبار التمکن شرعا اه. فعلی هذ ا قولهم لا تجب الزکوة معناه قبل قبضة واما بعد قبضة فتجب زکوته فیما مضی کا الدین القوی". (بحرالرائق ۲/۲۰۸، ۲۰۹)

محیط میں مذکور ہے (اقسامِ دین کے بیان میں) کہ مبیع، قبضہ سے پہلے نصاب نہیں ہوتا، کیوں کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے، اور صحیح یہ ہے کہ وہ نصاب ہو جاتا ہے، اس لئے وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت تھا اور اسے عوض پر قبضہ کرنا عین ممکن ہے، پس اس کا قبضہ نصاب پر معتبر مانا جائے گا، کیوں کہ شرعاً وہ قبضہ پر قدرت رکھتا ہے، اس بنیاد پر فقہا نے یہ جو لکھا ہے کہ ''زکوۃ واجب نہیں ہوگی'' اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قبضہ سے پہلے زکوۃ کی ادائیگی واجب نہ ہوگی، لیکن قبضہ کے بعد ماضی کی زکوۃ بھی واجب ہوگی جیسا کہ دین قوی میں ہوتا ہے۔ (دین قوی کی تعریف آگے آ رہی ہے)

اور قیمت جو پیشگی ادا کر دی گئی، اس پر بائع کی ملک تام ہوگئی، اس لئے اس کی زکوۃ بائع کے ذمہ ہوگی، آگے ایک مسئلہ اجارہ کا آرہا ہے، اسی میں اس مسئلہ کی دلیل بھی موجود ہے، فانتظر۔

(۲) کرایہ کی مد میں دی گئی رقم جو پیشگی ادا کر دی گئی ہو، اس کی زکوۃ مالک مکان پر ہوگی، جس نے رقم وصول کی ہے، کیوں کہ وہ اس پر ملکیت تامہ رکھتا ہے۔

"وذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارة الطویلة التی تعارفها اهل البخاریٰ ان الزکوة فی الاجرة المعجلة تجب علی الآجر لانه ملکه قبل الفسخ". (بدائع الصنائع ۶/۲)

امام ابوبکر محمد بن الفضل بخاری نے ذکر کیا ہے کہ اجارۂ طویلہ جس کا تعارف اہل بخاریٰ میں ہے، اس میں پیشگی دی ہوئی اجرت کی رقم کی زکوۃ مالک مکان پر ہوگی، کیوں کہ جب تک اجارہ فسخ نہ ہوگا اس رقم کا مالک وہی ہے۔

اور جو رقم ڈپوزٹ ہوتی ہے اور بعد میں واپس کر دی جاتی ہے وہ بحکمِ رہن ہے۔[۲] اور رہن کے متعلق تصریح ہے کہ اس میں زکوۃ سرے سے واجب ہی نہیں ہوتی، نہ راہن پر، نہ مرتہن پر۔

"ولا فی مرهون بعد قبضه. قال الشامی: ای لا علی المرتهن لعدم ملک الرقبة ولاعلی الراهن لعدم الید واذا استرده الراهن لا یزکی عن السنین الماضیه". (فتاوی شامی ۲۶۳/۲)

اور نہ مالِ مرہون میں قبضہ کے بعد، اس پر علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ یعنی نہ مرتہن پر، ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے، اور نہ راہن پر، قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور جب راہن اس شئ مرہون کو واپس لے لیگا، جب بھی سالہائے گزشتہ کی زکوۃ نہیں ادا کرے گا۔

(۳) جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو، جیسے مدارس، اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم، اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔

"فلا زکوٰة فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملک". (حوالہ سابق ۲۵۹/۲)

وقف کے جانوروں اور فی سبیل اللہ مہیا کئے گئے گھوڑوں میں زکوۃ نہیں ہے، کیوں کہ ان پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

(۴) وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ، اگر یہ حرام مال علیحدہ ہے، حلال مال اس کے ساتھ شامل نہیں ہوا ہے تو اس پر اس کی ملکیت نہیں، اگر چہ قبضہ ہے، اس لئے اگر مالک معلوم ہے اسے واپس کرنا واجب ہے، اور اگر مالک نامعلوم ہے تو پورے کو فقراء اور مستحقین میں تقسیم کر دینا واجب ہے، پس اس میں زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

اور اگر اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے تو اس خلط کی وجہ سے وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا، لیکن چونکہ دوسرے کا مال اس کی ملکیت میں غلط طور سے شامل ہو گیا ہے، اس لئے اس مقدار کا وہ ضامن ہوگا، گویا وہ اتنے کا مدیون ہے، اگر بقدرِ دین اور بقدرِ ضمان علیحدہ کرنے کے بعد نصاب کے برابر مال موجود ہے تو زکوۃ واجب ہوگی، اور بقدر نصاب نہیں بچتا تو چوں کہ یہ مدیون ہے اس لئے زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

"فی القنية: لو كان الخبيث نصابا لايلزمه الزكوٰة لان الكل واجب التصدق عليه فلايفيد ايجاب التصدق ببعضه ومثله فی البزازية.....وفی الفصل العاشر من التاتر خانيه عن فتاوی الحجة من ملک اموالا غير طيبة او غصب اموالا وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامنا وان لم يكن له سواها نصاب فلازكوٰة عليه فيها وان بلغت نصابا لانه مديون ومال المديون لا ينعقد سببا لوجوب الزكوة عندنا". (شامی ۲/۲۹۱)

قنیہ میں ہے کہ اگر ناجائز مال بقدرِ نصاب ہے تو اس میں زکوۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ کل واجب التصدق ہے (جب کہ مالک معلوم نہ ہو) اس لئے اس کے کچھ حصے کے صدقہ کا کوئی فائدہ نہیں، اور اسی طرح "بزازیہ" میں بھی ہے......اور "فتاوی تاتارخانیہ" کی دسویں فصل میں "فتاوی حجۃ" سے نقل کیا ہے کہ جو حرام مال کا مالک ہو یا اس نے کوئی مال غصب کیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو خلط کی وجہ سے وہ مالک ہو گیا، لیکن اس کا ضمان دینا ہوگا، اور اگر اس کے سوا اس کے پاس بقدر نصاب مال نہیں ہے تب تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگر چہ وہ خود

بقدر نصاب ہو، کیوں کہ وہ مدیون ہے، اور مدیون کا مال ہمارے نزدیک وجوب زکوۃ کا سبب نہیں ہوتا۔

(۵) دین کی زکوۃ مدیون پر نہیں واجب ہوتی، ہاں اگر مدیون کے پاس دین سے فاضل نصاب موجود ہے تو اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ دین کے ادا کرنے کی قدرت کے باوجود اگر کوئی شخص ٹال مٹول کررہا ہے تو ظلم ہے، اس کے خلاف دنیا میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے، اور آخرت میں خدا کے حوالے کرنا چاہئے، لیکن اس کی وجہ سے زکوۃ کے مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، زکوۃ کوئی سزا نہیں ہے کہ اس کے اس جرم کے بدلے عائد کی جائے، یہ تو ایک عبادت ہے جو خلوصِ دل اور انشراحِ صدر کے ساتھ ادا کی جانی چاہئے۔

دین کے اقسام:

وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف۔

دین قوی: وہ دین جو قرض یا مالِ تجارت کے عوض میں لازم ہوا ہو۔

دین متوسط: وہ دین جو قرض اور مالِ تجارت کے علاوہ کسی اور مال کے عوض لازم ہوا ہو، جیسے استعمالی کپڑوں، خدمت کے غلاموں اور رہائشی مکان کی قیمت۔

دین ضعیف: ایسا دین جو کسی مال کے عوض نہ لازم ہوا ہو، جیسے مہر، وصیت، اور بدل خلع وغیرہ۔

"قسّم ابوحنیفه الدَین علی ثلٰثة اقسام .قوی:وهو بدل القبض ومال التجارة .متوسط:وهو بدل ما لیس للتجارة کثمن ثیاب البذلة وعبدالخدمة ودارالسکنیٰ .وضعیف:وهو بدل مالیس بمال کالمهر والوصیة وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدیة وبدل الکتابة والسعایة". (بحرالرائق ۲؍۲۰۷)

امام ابوحنیفہ نے دین کی تین قسمیں قرار دی ہیں، قوی: اور وہ بدلِ قرض اور بدلِ مال تجارت ہے۔ اور متوسط: وہ ایسے مال کا بدل ہے جو تجارت کے لئے نہ ہو، جیسے استعمال کے کپڑے، خدمت گزار غلاموں اور رہائشی مکانات کی قیمت۔ اور ضعیف: اور وہ ایسی چیز کا بدل

ہے جو مال نہ ہو، جیسے مہر، وصیت، بدلِ خلع، صلح عن دم العمد، دیت، بدلِ کتابت اور سعایت۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ جب اس پر سال تمام ہوگا تو زکوۃ واجب ہوگی، لیکن اس کی ادائیگی کا وجوب اس وقت تک مؤخر ہوگا جب تک اس میں چالیس درہم کے بقدر دین وصول نہ ہوجائے، جب اتنی رقم مل جائے گی تو اس کی زکوۃ ادا کرنی ضروری ہوگی، اور اس کے بعد جتنی وصول ہوتی جائے گی اسی کے حساب سے چالیسواں حصہ واجب ہوگا۔

اور دین متوسط میں اس وقت تک وجوب ادا نہ ہوگا جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ ہوجائے، لیکن جب اتنا وصول ہوجائے گا تو سالہائے گزشتہ کی بھی زکوۃ دینی ہوگی۔ اور دین ضعیف میں زکوۃ اس وقت تک واجب نہ ہوگی جب تک بقدرِ نصاب دین وصول ہوکر اس پر سال نہ گزر جائے۔

"ففی القوی تجب الزکوٰۃ اذا حال الحول ویتراخی القضاء الی ان یقبض اربعین ففیها درهم وکذا فیما زاد بحسابه .وفی المتوسط لا تجب مالم یقبض نصابا ویعتبر لما مضی من الحول فی صحیح الروایة .وفی الضعیف لا تجب مالم یقبض نصابا ویحول الحول بعد القبض علیه". (بحرالرائق ۲/۲۰۷)

پس دین قوی میں سال گزر جائے تو زکوۃ واجب ہوگی، اور ادائیگی چالیس درہم وصول ہونے تک مؤخر رہے گی، جب اتنا وصول ہوجائے گا تو ایک درہم واجب ہوگا، اور اسی طرح زائد میں اس کے حساب سے۔ اور دین متوسط میں اس وقت تک واجب نہ ہوگی جب تک نصاب نہ وصول کرلے، اور اس میں سالِ گزشتہ کا بھی اعتبار ہے، یہی صحیح روایت ہے۔ اور دین ضعیف میں جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ کرلے اور اس پر قبضہ کے بعد سال نہ گزر جائے اس وقت زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

(۲) سرکاری محکموں اور بعض پرائیوٹ کمپنیوں کے ملازمین کی تنخواہوں میں سے ایک حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فیصد سرکار اس میں اضافہ کرتی ہے جس کو "پراویڈنٹ فنڈ" کہتے ہیں، اس رقم کے دو حصے ہیں، ایک حصہ اصل تنخواہ والا، دوسرا جو اس پر اضافہ ہوا ہے۔

اضافہ کی زکوۃ کا تو کوئی سوال ہی نہیں،اس لئے کہ اس پر نہ اس ملازم کی ملکیت وارد ہےاور نہ وہ بحکمِ دین ہے۔بحکمِ دین اگر کوئی چیز ہےتو وہ اصل تنخواہ والا حصہ ہے،اس لئے اس حصۂ اضافی کی زکوۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ اس پر قبضہ ہوجائے اور اس پر سال گزر جائے۔

البتہ اصل تنخواہ میں وضع شدہ رقم کے بارے میں غور کرنا چاہئے کے آیا وہ دین ہے؟ اگر ہےتو دین کی تین قسموں میں سے کس میں داخل ہے۔امام سرخسی نے''مبسوط''میں اجرت کی حیثیت تفصیل کے ساتھ لکھی ہے،فرماتے ہیں:

"وفی الاجرة ثلٰث روايات عن ابی حنيفة .فی رواية جعلها كا لمهر لانها ليست ببدل من المال لانها بدل عن المنفعة .وفی رواية جعلها كبدل ثياب البذلة لان المنافع مال من وجه لكنه ليس بمعجل لوجوب الزكوة فيه و الاصح ان اجرة دار التجارة اوعبدالتجارة بمنزلة ثمن متا ع التجارة كلما قبض منها اربعين تلزمه الزكوة اعتبار البدل المنفعة ببد ل العين". (مبسوط۲/۱۹۵،۱۹۶)

اجرت کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ سے تین روایتیں ہیں،ایک روایت میں اس کومثل مہر کے قرار دیا ہے،اس لئے کہ یہ مال کا بدل نہیں ہے،کیوں کہ یہ منفعت کا بدل ہے۔اور ایک روایت میں اسے استعمالی کپڑوں کی قیمت کے مانند ٹھہرایا،کیوں کہ یہ منافع ایک طرح کے مال ہیں،لیکن وجوبِ زکوۃ کے محل نہیں ہیں،اور اصح یہ ہے کہ گھر،غلام جو برائے تجارت ہوں اس کی اجرت اور کرایہ سامانِ تجارت کی قیمت کی طرح ہے،جب چالیس درہم وصول ہوں گے ان کی زکوۃ واجب ہوگی،اس میں بدلِ منفعت کو بدلِ عین کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کرایہ اور اجرت دین میں داخل ہیں،اور اصح روایت کے مطابق جوحکم اس شئی کا ہے جس کی اجرت حاصل ہوئی ہے وہی اجرت کی بھی ہے۔اگر مال تجارت کی اجرت حاصل ہوئی تو اس میں اسی طرح زکوۃ واجب ہے جس طرح مال تجارت میں واجب ہوتی،گویا یہ دین قوی ہے،اور اگر استعمالی سامانوں کی اجرت حاصل ہوئی تو اس کا قیاس انہیں پر ہے۔

حوالہ بالا میں جو دوسری روایت ہے ''منحۃ الخالق حاشیہ بحرالرائق'' میں ''محیط'' کے حوالے سے، اسے ظاہر روایت قرار دیا ہے۔غرض پہلی روایت کی بنیاد پر اجرت دین ضعیف میں داخل ہے، اور دوسری روایت کی روشنی میں وہ دین متوسط میں شامل ہے، اور صحیح روایت کے پیش نظر وہ اصل مال مستاجر کے تابع ہے، لیکن واضح ہو کہ یہ تینوں روایتیں ایسی چیزوں کے کرایہ اور اجرت کے احکام بتاتی ہیں جو خود مال ہیں، مثلاً مکان، غلام وغیرہ، لیکن یہاں جو اجرت اور تنخواہ زیر بحث ہے وہ کسی مال کی نہیں ہے بلکہ یہ بدل ہے خدمتِ حُر کی، اور حُر بتصریح فقہا مال نہیں ہے، لہٰذا اس کی خدمت بھی مال نہیں ہوسکتی، پس یہ تنخواہ غیر مال کی بدل ہے، اس لئے یہ دین ضعیف ہے، اور دین ضعیف کا حکم معلوم ہے کہ اس میں قبضہ کے بعد سال گزرنے کے بعد زکوۃ واجب ہوتی ہے، پس پراویڈٹ فنڈ میں خواہ اصل تنخواہ کی وضع شدہ رقم ہو یا اضافی رقم، زکوۃ اسی وقت واجب ہوگی جب وہ بقدر نصاب قبضہ میں آجائے اور اس پر سال گزر جائے، یا اگر اس کے علاوہ نصاب موجود تھا تو یہ رقم اس میں شامل ہوکر اصل نصاب پر سال پورا ہونے کے بعد اسی کے ساتھ اس کی بھی زکوۃ نکل جائے گی۔ واللہ اعلم

دوسری شرط ''نماء'':

نماء کے لغوی معنی ''بڑھنے'' کے ہیں، علامہ شامی فرماتے ہیں۔

''النماء فی اللغة بالمد الزیادة والقصر بالهمزة خطأ، یقال نمی ینمی نماء وینمو نمواً وانماه الله تعالی کذا فی المغرب''. (شامی ۲/۲۶۳)

نماء بالمد لغت میں بڑھوتری کے معنی میں ہے، اور بغیر مد کے ہمزہ کے ساتھ غلط ہے، کہا جاتا ہے ''**نمی ینمی نماءً**'' (س) ''**وینمو نموا**'' (ن) اور ''**انماه الله تعالی. کذا فی المغرب**''.

اور شریعت کے اصطلاح میں بھی نماء کا وہی معنی ہے جو لغت میں ہے، البتہ یہاں اس کی دو قسمیں کردی گئی ہیں، اول یہ کہ ''حقیقۃً'' اضافہ ہو جیسے جانوروں میں توالد وتناسل کے ذریعہ بڑھوتری ہوتی رہتی ہے، اسی طرح تجارت کے واسطے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اضافہ ''تقدیراً اور حکماً'' ہو، جیسے سونا اور چاندی کہ جب یہ اپنی ملک اور قبضہ میں ہے تو

شریعت کی نگاہ میں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، کیوں کہ اس پر قدرت حاصل ہے، یہ مالِ نامی تقدیراً ہے، یعنی ظاہراً بڑھتا ہوا نظر نہیں آتا مگر اسے نامی تسلیم کیا گیا ہے۔

”وفی الشرع وھو نوعان حقیقی وتقدیری،فالحقیقی الزیادة بالتوالد والتناسل والتجارات . والتقدیری تمکنه من الزیادة بکون المال فی یده او ید نائبه“. (شامی ۲/۲۶۳)

شریعت میں نماء کی دوقسمیں ہیں، حقیقی اور تقدیری۔ حقیقی وہ نماء ہے جو توالد وتناسل اور تجارتوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ نماء پر قدرت ہو اس طرح کہ مال خود مالک کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے۔

زکوۃ کی فرضیت کے لئے مالِ نامی کا نصاب ہونا شرط ہے، اگر کسی کے پاس نماء کی دونوں قسموں کے اعتبار سے کوئی مالِ نامی نہیں ہے، اس پر زکوۃ فرض نہ ہوگی، مثلاً کسی کے پاس زمینیں بہت ہیں یا مکانات ہیں یا کارخانہ ہے، جس میں مشینیں قیمتی قیمتی ہیں تو گو اس کے پاس مالیت بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز مالِ نامی نہیں ہے اس لئے ان کا حساب نصاب زکوۃ میں نہ ہوگا۔

تیسری شرط ”حاجتِ اصلیہ“ سے فارغ ہونا:

حاجتِ اصلیہ کے دائرہ میں وہ چیزیں آتی ہیں جن کا تعلق انسان کے جان ومال کی حفاظت اور بچاؤ سے ہے، مثلاً نفقہ، رہائشی مکان، لڑائی کے اوزار، گرمی اور سردی کی ضرورت کے کپڑے، آلاتِ حرفت، گھر کے سامان، سواریاں اور ان کی حفاظت کے گھر، مثلاً اصطبل، گیراج وغیرہ اور اہلِ علم کے واسطے کتابیں۔

”الحاجة الاصلیة ھی ما یدفع الھلاک من الانسان تحقیقا کالنفقة ودورالسکنیٰ وآلات الحرب والثیاب المحتاج الیھا لدفع الحر والبرد . اوتقدیرا کالدین وکالآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الرکوب وکتب العلم الاھلھا“. (شامی ۲/۲۶۲)

حاجتِ اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دفع کرتی ہیں، حقیقۃً جیسے نفقہ،

رہائشی مکانات، آلات حرب اور گرمی وسردی کے لباس۔ یا تقدیراً جیسے آلاتِ حرفت، گھریلو سامان، سواری کے جانور اور اہل علم کے لئے کتابیں۔

حاجتِ اصلیہ میں مزید کچھ اور تفصیلات ہیں جنہیں فقہا اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں، مثلاً استعمالی کپڑے کتنی تعداد میں ہوں؟ رہائشی مکان کس مقدار کا ہو؟ سواری کے جانور کتنے ہوں؟ کتابوں کے کتنے نسخے ہوں؟ تو حاجت اصلیہ میں داخل ہوں گے اور کتنے اس زائد ہوں گے؟ لیکن زکوۃ کی بحث میں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہاں سرے سے حاجت اصلیہ سے فراغ کی قید وجوب میں مؤثر نہیں ہے، کیوں کہ زکوۃ کے لئے نصابِ نامی شرط ہے اور نصابِ نامی بہرحال حاجتِ اصلیہ سے سے فاضل ہوگا، تو یہ قید درحقیقت کسی احتراز کے لئے نہیں ہے، محض بیانِ واقعہ یا اہتمام ذکر کے لئے ہے۔

چنانچہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ:

"فان الحوائج الاصلية اعم من الدين و النامي اعم منها". (شامی۲/۲۶۲)

یعنی حوائجِ اصلیہ دین سے عام ہیں اور نامی ہونا حوائجِ اصلیہ سے عام ہے، تو جب ایک عام قید اور شرط کسی حکم میں لگادی گئی تو اس کے ضمن میں خاص خود بخود آ گیا، اب اس کے ذکر کی ضرورت احتراز کے لئے نہیں ہوتی، ہاں کسی خصوصیت کے اہتمام کی وجہ سے ہو تو اور بات ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ مال کا نامی ہونا بنیادی شرط ہے، حاجتِ اصلیہ سے فراغ کی شرط صرف اظہارِ واقعہ کے لئے ہے۔ چنانچہ علامہ شامی اس کی مثال میں ذکر کرتے ہیں۔

"لانـه يخرج منها كتب العلم لغير اهلها و ليس من الحوائج الاصلية".
(بدائع الصنائع ۲/۶)

دیکھئے غیر اہل علم کے پاس کتاب حوائجِ اصلیہ میں سے نہیں ہیں، لیکن چوں کہ مال نامی نہیں ہیں اس لئے ان پر زکوۃ کا وجوب نہ ہوگا۔

چوتھی شرط "دین سے محفوظ ہونا":

دین سے محفوظ ہونے میں فقہا نے طویل الاجل اور قصیر الاجل کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی ہے، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین مطلقاً خواہ وہ طویل الاجل ہو یا قصیر الاجل

نصاب میں سے پورا وضع کیا جائے گا، دیکھئے مہر مؤجل کتنی طویل المیعاد ہوتی ہے، مگر فقہا نے اسے بھی موانعِ زکوۃ میں سے شمار کیا ہے، لیکن "بدائع الصنائع" میں بعض مشائخ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ مہرِ مؤجل مانعِ زکوۃ نہیں ہے، کیوں کہ عرفاً اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

"قال بعض مشائخنا ان الموجل لا یمنع لانه غیر مطالب عادةً".
(درمختار مع الشامی ۲/۲۷۳)

ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا کہ مہرِ موجل مانعِ زکوۃ نہیں ہے، کیوں کہ عرفاً اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

اس کی علت" **لانه غیر مطالب به عادةً**" پرنظر کی جائے تو بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ سالانہ واجب الاداقسط کے بقدر ہی ہر سال دین سے وضع کیا جائے گا، کیوں کہ عادةً اس سے زائد کا مطالبہ اس سال نہیں ہوتا، نیز یہ کہ امام شافعی کے نزدیک کوئی بھی دین مانعِ زکوۃ نہیں ہوتا، اس خیال سے اگر احتیاطاً صرف قسطِ واجب الادا کے بقدر وضع کر کے باقی کی زکوۃ ادا کی جائے تو مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

کمپنیوں پر زکوٰۃ:

کسی تجارت میں اگر متعدد شرکاء ہوں تو مجموعی سرمایہ پر مجموعی طور سے زکوۃ کا وجوب نہیں ہوگا، بلکہ انفراداً ہر ایک پر علیحدہ زکوۃ کا وجوب ہوگا، جب کہ اس کا حصہ بقدرِ نصاب ہو یا اگر کمپنی میں تو بقدرِ نصاب نہ ہو لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ مالِ زکوۃ موجود ہو تو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔

"فاذا كانت مشتركة بين اثنين فقد اختلف فيه قال اصحابنا انه يعتبر فی حال الشركة ما يعتبر حال الانفراد وهو كمال النصاب فی حق كل واحد منهما فان كان نصيب كل واحد منهما يبلغ نصابا تجب الزكوة والا فلا".
(شامی ۲/۲۶۲)

بہر حال جب تجارت مشترک ہو تو اس میں اختلاف ہے، ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ شرکت کی حالت میں بھی وہی چیز معتبر ہے جو انفراد کی حالت میں ہے، اور وہ نصابِ تام ہے،

ہر ایک کے حق میں۔پس اگر ہر ایک کا حصہ نصاب کے بقدر ہے تب تو زکوۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ:

ہیرے اور جواہرات اموالِ نامیہ میں سے نہیں ہیں،اگر بغرضِ تجارت ہوں تو زکوۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

"لازکوٰۃ فی اللآلی والجواهر وان ساوت الفاً اتفاقاً الا ان تکون للتجارۃ". (درمختار مع الشامی۲/۲۷۳)

موتیوں اور جواہرات میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے گو وہ ہزار کے برابر ہوں مگر یہ کہ تجارت کے لئے ہوں۔(تب زکوۃ واجب ہوگی)

تاہم جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین سے بچنے کے لئے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں،اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نیت کس زمرے میں آئے گی؟ احقر کا خیال ہے کہ یہ نیت درحقیقت تجارت ہی کی نیت ہے کہ ضرورت کے موقع پر اسے فروخت کر کے پھر اسے روپیہ بنالیں گے،اور نفع بھی ہاتھ آئے گا،آج کا ایک لاکھ کا ہیرا عین ممکن ہے کہ دس سال کے بعد ڈیڑھ لاکھ کا ہو جائے،اس لئے ایسے جواہرات پر زکوۃ واجب ہوگی۔

البتہ جو خواتین محض تزئین وآرائش کے لئے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان پر زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

اموالِ تجارت پر زکوۃ:

زکوۃ کی ادائیگی میں اصل یہ ہے کہ وہ نصاب کے جز سے ہو،یعنی جس مال کا نصاب ہو زکوۃ اسی میں ادا کی جائے،البتہ اونٹوں میں شریعت نے ایک خاص حد تک بکریاں متعین کی ہیں، پھر اس کے بعد اونٹ کا وجوب ہوتا ہے۔اس کے علاوہ تمام اموال میں قاعدہ یہی ہے کہ جس مال کی زکوۃ ادا کرنی ہے اسی مال میں سے بقدر زکوۃ کے علیحدہ کیا جائے،صاحب بدائع تحریر فرماتے ہیں:

”واما صفة الواجب فی اموال التجارة فالواجب فیها ربع عشر العین وھو النصاب فی قول اصحابنا“. (بدائع الصنائع ۲/۲۱)

بہرحال اموالِ تجارت میں واجب کی صفت یہ ہے کہ ان میں عین مال یعنی نصاب کا چالیسواں حصہ واجب ہے۔

لیکن علماء احناف کے نزدیک بجائے عین مال کے اس کی قیمت کو زکوۃ میں دینا درست ہے، امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے قول میں تو عین یا قیمت ہر دو میں سے ایک واجب ہے اور صاحبین کے بقول اصل واجب تو عین مال سے ہے، مگر اس کے عوض میں قیمت بھی دی جاسکتی ہے، اس قاعدہ کے پیش نظر مسئلہ کا جواب یہ ہوگا کہ جب سال پورا ہوا تو اس وقت کا جو نرخ ہو اسی حساب سے زکوۃ ادا کی جائے۔

”ثم اختلف اصحابنا فیما بینھم فعند ابی حنیفة الواجب فی الدراھم والدنانیر واموال التجار جزء من النصاب من حیث المعنی لا من حیث الصورة وعند ابی یوسف ومحمد الواجب ھو الجزء منه صورةً ومعنیً لکن یجوز اقامة غیره مقامه من حیث المعنی ویبطل اعتبار الصورة باذن صاحب الحق وھو الله تعالی....وینبنی علی ھذاالاصل مسائل الجامع اذا کان لرجل مأتا قفیز حنطة للتجارة تساوی مأتی درھم ولامال له غیر ذالک وحال علیھا الحول فان ادیٰ من عینھا یودی خمسة اقفزةبلاخلاف لانھا ھی ربع عشر النصاب وھو الواجب علی مامرولواراد ان یودی القیمة جاز عندنا خلافاً للشافعی لکن عند ابی حنیفة فی الزیادة والنقصان جمیعاًیودی قیمتھا یوم الحول وھی خمسة دراھم وعندھما فی الفصلین جمیعا یودی قیمتھا یوم الاداء“(بدائع الصنائع ۲/۲۳) وتعتبر القیمة عند حولان الحول بعد ان تکون قیمتھا فی ابتد اء الحول مأتی درھم من الدراھم القابلة علیھا الفضة کذا فی مضمرات“. (فتاوی ہندیہ ۱/۱۷۹)

پھر ہمارے اصحاب کے درمیان اختلاف ہے، امام صاحب کے نزدیک دراہم ودنانیر اور اموالِ تجارت میں نصاب کا جز معنوی حیثیت سے واجب ہے، صورۃً نہیں، اور صاحبین کے نزدیک واجب اس کا جز صورت اور معنی کے لحاظ سے ہے، لیکن اس کے علاوہ کو معنوی حیثیت

سے اس کی جگہ رکھ سکتے ہیں،اور صورت کا اعتبار صاحبِ حق یعنی اللہ تعالی کے اذن سے ختم ہوجائے گا۔اسی قاعدہ پر'' جامع صغیر'' کا یہ مسئلہ مبنی ہے کہ کسی شخص کے پاس دوسوقفیز گیہوں تجارت کے لئے ہے اور اس کی قیمت دوسودرہم ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے،اور اس پر سال گزر گیا تو اگر گیہوں ادا کرنا چاہے تو بغیر اختلاف کے پانچ قفیز ادا کرے،اور اگر قیمت ادا کرنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے خلافاً للشافعی۔لیکن امام صاحب کے نزدیک کمی اور زیادتی ہر صورت میں سال پورا ہونے کے دن کی قیمت ادا کرے،اور وہ پانچ درہم ہے، اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں ادا کے دن کی قیمت دے گا۔

تھوک اور پھٹکر تجارت میں زکوۃ کے لئے اس کے طریقۂ تجارت کا اعتبار ہوگا،یعنی اگر تھوک کا تاجر ہے تو مال کی قیمت تھوک کے حساب سے لگائی جائے گی ورنہ پھٹکر سے۔

زمین کی تجارت کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ اگر عشری یا خراجی زمین بغرضِ تجارت خریدی ہے تو اس میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس کا فریضہ عشر یا خراج ہے،لیکن امام محمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں زکوۃ واجب ہوگی اور اگر اس میں کھیتی کرے گا تو عشر یا خراج بھی واجب ہوگا۔

''لو اشتریٰ ارض عشر او خراج للتجارة لا تجب فیها الزکوٰة..... وعند محمد اذا اشتریٰ للتجارة ارض عشر تجب الزکوٰة مع العشر ان زرع''.
(فتاوی قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۱/۲۵۳)

اگر عشری یا خراجی زمین تجارت کی نیت سے خریدی تو اس میں زکوۃ واجب نہ ہوگی،اور امام محمد علیہ الرحمہ سے روایت ہے کہ اگر عشری زمین بغرضِ تجارت خریدی تو زکوۃ واجب ہوگی،اور اگر کھیتی کرے تو عشر بھی واجب ہوگا۔

اور اگر غیر عشری وخراجی زمین بغرضِ تجارت لی گئی ہو تو سال گزرنے پر زکوۃ واجب ہوگی،اور اس وقت کے نرخ کے حساب سے ہوگی۔

شیرز اور بونڈ کی زکوٰۃ:

شیرز پر مالِ تجارت ہونے کی وجہ سے زکوۃ فرض ہوگی،ان کی مالیت کا تعین نہ ان کی

بنیادی قیمت سے ہوگا اور نہ مارکیٹ کے نرخ سے، بلکہ وہ شیر جس مالیت پر مشتمل ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، مثلاً شیر کا مالک ابتداءِ سال میں بقدر نصاب ملکیت رکھتا تھا اور پھر درمیان میں بذریعہ تجارت اس میں اضافہ ہوتا رہا تو سال کے آخر میں جس قدر مالیت فراہم ہوگئی ہے اسی سے زکوۃ نکالی جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مالیت کا پتہ کیسے چلے گا؟ تو موجودہ کاروباری نظام میں اس کے معلوم کرنے کا طریقہ واقعی دشوار ہے، ایسی صورت میں آسان راہ یہ ہے کہ مارکیٹ کا نرخ دیکھ لیا جائے، یقینی طور پر تو نہیں لیکن گمان یہ ہوتا ہے کہ بازار کا نرخ اس کی مالیت سے کچھ زائد یا کم از کم برابر ہوتا ہوگا، تو احتیاطاً اسی نرخ سے زکوۃ ادا کی جائے، تا کہ زکوۃ میں کمی کا احتمال نہ رہے کہ خدا کے یہاں مواخذہ ہو، اگر کچھ زیادہ دیدی جائے گی تو مستحسن ہے۔

محور ثانی۔نصابِ زکوٰۃ:

سونے اور چاندی دونوں کا نصاب اصل ہے، دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے تابع نہیں ہے۔ فقہانے لکھا ہے کہ ''مال تجارت کی قیمت کا تعین دونوں سے ہوسکتا ہے، لیکن اگر ایک سے نصاب پورا ہوتا ہو اور دوسرے سے نہیں تو جس سے نصاب پورا ہوتا ہو اسی کا اعتبار ہوگا، وجوب زکوۃ کے اندر بھی اور اسی پر قیاس کر کے حرمتِ اخذِ زکوۃ کے اندر بھی'' اس لحاظ سے موجودہ دور میں چاندی کا اعتبار ہوگا۔

''ثم فی تقویم عروض التجارة التخییر یقوم بایهما شاء من الدراهم والدنانیر الا اذا کانت لا تبلغ باحدهما نصاباً فحینئذ تعین التقویم بما یبلغ نصاباً .هٰکذا فی البحرا لرائق''. (فتاوی ہندیہ ۱/۱۷۹)

پھر سامان تجارت کی تقویم میں اختیار ہے، درہم ودینار میں سے جس سے چاہے قیمت لگائے، البتہ اگر کسی ایک سے نصاب نہ پورا ہوتا ہو تو وہ متعین ہے جس سے نصاب پورا ہو۔

محور ثالث۔مصارفِ زکوٰۃ:

(۱) سوال میں مذکور پہلی صورت زکوۃ کی ادائیگی کے لئے یہ کہ درست ہے بلکہ مستحسن ہے، جسے اہلِ مدارس کو اختیار کرنا چاہئے، مہتمم مدرسہ زکوۃ دہندگان [کا] ظاہر ہے کہ وکیل ہے کہ انہوں

نے زکوۃ کی رقم اسی لئے حوالے کی ہے [کہ] مدارس میں جو مستحق طلبہ ہیں ان پر خرچ کی جائے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ کا نائب بھی ہے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں۔

> ''مہتمم مدرسہ کا قیم ونائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا امیر جملہ عالم کا ہوتا ہے، جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبض ہے، اس کے قبض سے ملکِ معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا، اگر چہ وہ مجہول الکمیت والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے، اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیلِ معطی بھی ہوسکتا ہے''۔ (تذکرۃ الرشید ۱۳۴)

لیکن یہاں یہ قابل لحاظ ہے کہ طلبہ کے نائب اور قیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زکوۃ کی رقم قبضہ کرنے کے بعد آزاد ہے کہ جہاں چاہے خرچ کرے، بلکہ وہ جن کا نائب ہے اور جن کی نیابت میں اس نے زکوۃ وصول کی ہے انہیں پر خرچ کرنا متعین ہے، اگر وہ صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو حسبِ تصریح فقہا زکوۃ دہندگان کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی، انہیں دوبارہ زکوۃ دینی ہوگی، اور اس کا وبال مہتمم مدرسہ پر پڑے گا۔ اگر کوئی مہتمم ایسا کرتا ہے تو اسے زکوۃ کی رقم دینی جائز نہیں ہے۔ یہ تو مدرسہ کے مہتمم کا مسئلہ ہے، جس کو زکوۃ دہندگان پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے، خود صاحبِ امر اور سلطان زکوۃ وصول کرتا اور صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو زکوۃ ادا نہیں ہوتی، چنانچہ مبسوط میں ہے:

"فاما ما ياخذ سلاطين زماننا هولاء الظلمة من الصدقات والعشور والخراج والجزية فلم يتعرض له محمد رحمه الله فى الكتاب وكثير من أئمة بلخ يفتون باداء ثانياً فيما بينه وبين الله كما فى حق البغى لعلمنا انهم لا يصرفون الماخوذ مصارف الصدقة". (مبسوط ۲/۱۸۰)

رہے وہ صدقات اور عشور وخراج اور جزیہ جسے ہمارے زمانے میں ظالم حکام وصول کرتے ہیں تو اس سے امام محمد علیہ الرحمہ نے کوئی تعرض نہیں کیا اور بہت سے ائمہ بلخ فتوی دیتے ہیں کہ دوبارہ ادا کیا جائے فیما بینہ وبین اللہ، جب کہ باغیوں کے متعلق فتوی ہے۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صحیح مصارف صدقہ پر خرچ نہیں کرتے۔

یہاں ایک اور صورت بتائی گئی ہے کہ اگر زکوۃ دینے والا خود انہیں ظالم سلاطین کو دینے کے نیت کرے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی، کیوں کہ انہوں نے ظلم کر کے اور ناجائز اموال جمع کر کے اپنے اوپر دوسروں کے اتنے حقوق جمع کر لئے ہیں کہ سارا مال دے کر بھی ان حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ زبردست مدیون ہیں اور اس کی وجہ سے افلاس کے انتہائی مرتبہ پر ہیں، پس انہیں کو مالِ زکوۃ کا مالک بنادیا جائے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

"والاصح انه يسقط ذالک عن جميع ارباب الاموال اذا نووا بالدفع التصدق عليهم لان ما في ايديهم من اموال المسلمين وما عليم من التبعات فوق مالهم فلوردوا اماعليهم لم يبق في ايديهم شئی فهم بمنزلة الفقراء" (حوالہ سابق)

اور اصح یہ ہے کہ سب مال والوں سے زکوۃ ساقط ہو جائے گی، جب کہ وہ دیتے وقت خود انہیں کو زکوۃ ادا کرنے کی نیت کر لیں، کیوں کہ اتنے اموال مسلمانوں کے غلط طور پر ان کے پاس ہیں اور اتنے تاوان ان پر مسلط ہیں جو ان کے مال سے زیادہ ہیں، اگر وہ سب لوٹا دیں تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ بچے گا تو وہ بمنزلہ فقرا کے ہیں۔

اس عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی زکوۃ ادا ہو جائے گی، لیکن ''بحر الرائق'' میں اس سلسلے میں تھوڑی تفصیل درج ہے، وہ لکھتے ہیں:

"وظاهر ما صححه السرخسی انه لا فرق بين الاموال الظاهرة و الباطنة وصحح الولوالجی عدم الجواز في الاموال الباطنه قال وبه يفتى لانه ليس للسلطان ولاية الزكوة في الاموال الباطنه فلم يصح الاخذ'. بحر الرائق ۲۲۳/۲

امام سرخسی نے جس کی تصحیح کی ہے ظاہراً اس سے معلوم ہوتا ہے [کہ] اموالِ ظاہرہ وباطنہ میں کوئی فرق نہیں ہے، مگر ''ولوالجی'' نے اموالِ باطنہ میں عدمِ جواز کو صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسی پر فتوی ہے کیوں کہ سلطان کو اموالِ باطنہ کی زکوۃ لینے کا حق نہیں ہے، پس اس کا لینا صحیح نہیں ہے۔

یہی بات علامہ ابن ہمام نے بھی حاکم شہید کے حوالے سے نقل کی ہے (فتح القدیر ۱۵۲/۲)انہوں نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے، بہرحال یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کا تعلق ہمارے موضوع زیر بحث سے نہیں ہے، لیکن اس سے اشتباہ ہوسکتا تھا اس لئے وضاحت کردی گئی۔

غرض جب صاحبِ امر غلط مصرف میں زکوۃ خرچ کرے گا تو زکوۃ ادا نہ ہوگی، تو مدرسہ کا مہتمم جو صاحبِ امر اور صاحبِ ولایت بھی نہیں، وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے کیسے خرچ کرسکتا ہے؟ اس مسئلے میں احتیاط بہت ضروری ہے۔

(۲) زکوۃ وصول کرنے کے لئے مدارس میں جو سفراء و محصلین مقرر کئے جاتے ہیں یہ لوگ زکوۃ پر عامل نہیں ہیں، قرآن نے جن لوگوں "**العاملین علیھا**" کہا ہے وہ دوسرے لوگ ہیں، چنانچہ فقہا ان کی تعریف کرتے ہیں۔

"**فھم الذین نصبھم الامام لجبایة الصد قات**". (بدائع الصنائع ۴۴/۲)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو امام [نے] صدقات کی وصولی کے لئے مقرر کیا ہے۔

امام کو جبایتِ صدقات کا حق اس کی ولایت عامہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اور عاملین اس کے کارکن ہوتے ہیں، مدارس کے مہتممین کو اہلِ اسلام پر کون سی ولایت عامہ حاصل ہے، صرف کام کی ظاہری مشابہت دیکھ کر حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، مہتمم مدرسہ کا صرف منتظم ہے، زیادہ سے زیادہ جو لوگوں سے اسے چندہ دستیاب ہوتا ہے ان کا وکیل ہے، اس کے کارکنوں پر شریعت کی مخصوص اصطلاحوں کو منطبق کرنا مناسب نہیں ہے۔

پھر ان سفراء کو زکوۃ کی رقم سے کمیشن دینے کا مسئلہ اور نازک ہے، اول تو یہ "عاملین علی الزکوٰۃ" نہیں ہیں کہ انہیں زکوۃ لینے کا اس بنیاد پر استحقاق ہو۔ دوسرے کمیشن کے طور پر زکوۃ دینا خود محلِ نظر ہے، بلکہ فقہا کی تصریحات اور تعامل کے خلاف ہے۔

"**قال العینی اتفق العلماء علی ان العامل فی الصدقات ھم السعاة المتولون قبض الصدقات وانھم لا یستحقون علی قبضھا جزءاً معلوماً سبعاً او ثمناًوانما اجر عمله علی حسب اجتھاد الامام**". (اوجز المسالک ۱۹/۶،۲۰)

امام عینی نے فرمایا کہ علما اس بات پر متفق ہیں کہ عامل فی الصدقات وہ لوگ ہیں جو زکوۃ

کی وصولی کرنے والے ہیں، یہ لوگ زکوۃ وصول کرنے کے عوض میں کسی متعین جز یعنی ساتویں یا آٹھویں حصے کے مستحق نہ ہوں گے، ان کے لئے عمل کا معاوضہ امام کے اجتہاد کے مطابق ہوگا۔

عاملین کا جو وظیفہ زکوۃ کی رقم سے دیا جاتا ہے وہ بقدر کفایت ہوتا ہے، یہی تمام فقہا لکھتے ہیں، اور اسی پر تعامل رہا ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ اس کی وصول کردہ زکوۃ سے اسے اتنی رقم دیدی جائے کہ اس کے کام کے زمانے کے اخراجات اس کے اور اس کے گھر والوں کے بسہولت پورے ہوجائیں، اس میں اجرت کی مشابہت تو ضرور ہے مگر اجرت نہیں ہے، اسی لئے اس کو اجرت کے بجائے ''عمالہ'' کا نام دیا جاتا ہے[۲] اس کے برخلاف کمیشن اول سے آخر تک اجرت کا معاملہ ہے، اسی واسطے فقہا نے اس طرح کے کمیشن کو ناجائز قرار دیا ہے کہ اجرت بالکل مجہول ہوتی ہے، اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ اجرت کی جہالت معاملہ کو فاسد کردیتی ہے، اگر اس اجرت کے فساد سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو بھی بطور کمیشن کے زکوۃ کی رقم دینا کسی طرح جائز نہیں، کیوں کہ زکوۃ کو کسی مال یا خدمت کے عوض دینا درست نہیں ہے۔

البتہ اگر کمیشن زکوۃ یا اموال واجبۃ التملیک کے علاوہ کسی مال سے طے کیا جائے تو اس میں صرف (اجرت) کی جہالت کا خدشہ باقی رہے گا، اگر یہ دور ہوجائے تو معاملہ صحیح ہوگا۔

زکوۃ کی رقم سے تنخواہ دینا درست نہیں ہے، زکوۃ صدقہ ہیں جو کسی چیز کا عوض نہیں ہوتا، اور تنخواہ اجرت ہے، اجرتوں میں زکوۃ کی رقم خرچ کرنا خلاف موضوع ہے۔

خلاصۂ جوابات

پہلی شرط۔ ملکِ تام:

(۱) مالِ تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو لیکن مال کی وصولی نہیں ہوئی ہے، قیمت پر زکوۃ واجب ہوگی بائع کے اوپر، اور مال جو وصول نہیں ہوا ہے اس کی زکوۃ بھی واجب ہوگی مشتری کے اوپر، لیکن چالیس درہم کے بقدر وصول ہونے کے بعد ادا کرنا واجب ہوگا۔

(۲) کرائے کے مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوۃ مالک مکان پر ہوگی۔

ب: ڈپوزٹ جو عقدِ اجارہ کے فسخ ہوجانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے وہ رہن کے حکم میں ہے، اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے، نہ مالک مکان پر نہ کرایہ دار پر۔

(۳) جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو اس پر زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

(۴) حرام مال اگر غیر مخلوط اور ممتاز ہے تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اور اگر مخلوط و غیر متمیز ہو گیا ہے تو اس کی مقدار جدا کر کے زکوۃ واجب ہوگی۔

(۵) دین قوی کی زکوۃ دائن پر واجب ہے مگر وجوبِ ادا چالیس درہم کے بقدر وصولیابی کے بعد ہے۔ دین متوسط کی زکوۃ بھی دائن پر واجب ہے مگر بقدرِ نصاب وصول ہونے کے بعد۔ اور دین ضعیف کی زکوۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد جب کہ بقدرِ نصاب ہو، سال گزرنے پر زکوۃ واجب ہوگی۔

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی زکوۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر زکوۃ واجب ہوگی۔

چوتھی شرط۔ دین سے محفوظ ہونا:

(۱) دین کے مانعِ زکوۃ ہونے میں طویل الاجل اور قصیر الاجل کی تفصیل نہیں ہے۔

کمپنیوں پر زکوۃ:

☆ ایک تجارت میں کئی افراد شریک ہوں تو انفراداً زکوۃ کا وجوب ہوگا، اجتماعاً نہیں۔

☆ ہیرے جواہرات بغرضِ تجارت ہوں تو زکوۃ واجب ہوگی، سرمایہ محفوظ رکھنے کے لئے اس کو ہیرے جواہرات کی شکل میں رکھ لینے سے اس میں زکوۃ کا وجوب ہوگا، محض تزئین و آرائش کے لئے ہوں تو زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

☆ اموالِ تجارت میں زکوۃ ادا کرنے کے لئے نرخ کا تعین وجوبِ زکوۃ کے دن کے لحاظ سے ہوگا، عشری اور خراجی زمین جو بغرضِ تجارت لی گئی ہو تو اس میں زکوۃ واجب نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی زمین یا گھر برائے تجارت لیا گیا تو اس میں زکوۃ واجب ہوگی۔

☆ کمپنیوں کے شیرز تجارتی مال ہیں، اس کے لئے ان کی زکوۃ واجب ہوگی اور قیمت کا تعین ان کی مالیت سے کیا جائے گا۔

محور ثانی۔ نصابِ زکوۃ:

☆ چاندی اور سونا دونوں نصاب میں اصل ہیں، تجارتی اموال میں جس کے حساب سے

نصاب پورا ہوتا ہو اس کا اعتبار ہوگا۔

محورِ ثالث۔ مصارفِ زکوۃ:

(۱) طالب علموں کے سلسلے میں ادائیگیٔ زکوۃ کی جو صورت سوال نامہ میں درج ہے وہ مستحسن ہے۔

(۲) مہتمم مدرسہ زکوۃ دہندگان کا وکیل ہے اور طلبہ کا نائب اور قیم۔

(۳) مدرسہ کے سفراء عاملینِ شرعی نہیں ہیں، اس لئے مدِ زکوۃ سے نہ ان کو تنخواہ دی جاسکتی ہے اور نہ کمیشن۔ ہاں اگر فقر کی وجہ سے مستحقِ زکوۃ ہوں تو زکوۃ انہیں دی جاسکتی ہے۔

(۴) فی سبیل اللہ کے مصداق اصالۃً مجاہد فی سبیل اللہ ہیں، اگر ان کے ذیل میں منقطع الحاج کو داخل کیا جائے تو گنجائش ہے۔

(۵) فی سبیل اللہ کے جو لوگ مصداق ہیں ان میں فقر بنیادی شرط ہے۔

(۶) مصارفِ زکوۃ آٹھ اصناف میں منحصر ہیں، ان پر قیاس کر کے دوسروں کو مصارف کے دائرہ میں نہیں لایا جاسکتا۔

(۷) فی سبیل اللہ یا کسی بھی مصرفِ زکوۃ کے دائرے میں ایسی کوئی صورت نہیں آسکتی جس میں زکوۃ کی تملیک نہ ہوتی ہو۔

واللہ اعلم والصواب، والیہ المرجع المآب

ماخذ۔ مجلّہ فقہ اسلامی، جزء دوم۔ (۱۹۹۲ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) ''ولو استاجر داراً او شئیا واعطی بالاجر رهنا جاز''. (فتاوی ہندیہ ۵/۴۳۵)
اگر کسی نے مکان کرایہ پر لیا یا کوئی اور چیز، اور اجرت کے عوض کوئی چیز بطور رہن کے دی تو جائز ہے۔

ظاہر یہی ہے کہ ڈپوزٹ کی رقم جو بعد میں واپسی کے ساتھ مشروط ہوتی ہے، وہ رہن اجرت

ہی بنے گی، خودشئ مستاجر کے عوض تو رہن رکھنا درست نہیں ہے کیوں کہ وہ امانت ہے، پس اجرت ہی کے عوض تسلیم کیا جائے گا۔

(۲) **"قال القاری فی شرح النقایه: لیس ما یاخذ اجرةً لانها لاتکون الا علی عمل معلوم ومدة معینة ولاصدقة لانه یاخذ وان کان غنیاً ویحل به العمالة بالاجماع ولکن فیه شبهة الصدقة فلم یجز اخذها للعامل الهاشمی صیانة لقرابتهﷺ عن اوساخ الناس"**(اوجزالمسالک ۶/۲۱)

ملاعلی قاری نے شرح نقایہ میں لکھا ہے کہ عامل جو کچھ لیتا ہے وہ خالص اجرت نہیں ہے، کیوں کہ اجرت، معلوم کام اور متعین مدت پر ہوتی ہے، اور نہ خالص صدقہ ہے، اس لئے کہ غنی ہونے کے باوجود اسے عامل لیتا ہے، اور عمالہ اس کے لئے جائز ہے، لیکن اس میں صدقہ کا شبہہ ہے، اس لئے عامل ہاشمی اسے نہیں لے سکتا، کیوں کہ نبیﷺ کی قرابت کو اوساخ الناس سے محفوظ رکھنا مطلوب ہے۔

فی سبیل اللہ

الف: فی سبیل اللہ کا آپ کے نزدیک مصداق کیا ہے؟ فی سبیل اللہ کے دائرے میں کون کون لوگ آتے ہیں؟ اور اس کے دائرے کی وسعت کہاں تک ہے؟۔

جواب: فی سبیل اللہ کا مصداق اصالۃً تو وہی ہے جو عہدِ صحابہ وتابعین میں معروف تھا، جس کو تمام ائمہ نے نقل کیا ہے، اور وہی عہدِ نزولِ قرآن میں عام طور سے متعارف تھا، اور چاروں ائمہ اس کے قائل ہیں، یعنی ''غازی'' اور ''مجاہد فی سبیل اللہ''، لفظ ''فی سبیل اللہ'' کا یہ مصداق اتنا مشہور ومتعارف ہے کہ اس پر کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ لفظ اپنے عام لغوی معنی میں نہیں ہے، یہ قرآن وسنت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، جسے منطق کے عرف میں ''منقول شرعی'' کہتے ہیں، بلکہ جس عہد میں قرآن نازل ہورہا تھا اس وقت کے لحاظ سے یہ ''منقول عرفی'' ہے۔ اس کا معنی اس دور میں وہی سمجھا جاتا تھا جو اوپر مذکور ہوا۔ مطلق بولے جانے کی صورت میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا معنی ذہنوں میں نہیں آتا تھا۔ پس اس کا یہ مفہوم متواتر اور قطعی ہے، اس میں کسی طرح کے تردد اور ریب کی گنجائش نہیں ہے۔

اب رہا یہ کہ بعض اکابر سلف سے اس کا مصداق ''حاجی'' منقول ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غازی مراد نہیں ہے، غازی تو بالاتفاق مراد ہے، اور یہی اصل ہے۔ ان اکابر کا مقصد یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے دائرے میں حاجی بھی داخل ہے، حاجی اس کا اصل مفہومِ اصطلاحی نہیں ہے، اسی وجہ سے غازی مراد لینے میں کسی نے بجز اس کے کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے کہ یہ لفظ عام طور سے اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حوالے آگے آرہے ہیں، البتہ جن لوگوں نے اس کے مفہوم میں حاجی کو داخل کیا ہے اس کے لئے انہیں چوں کہ استعمال وعرف سے

دلیل نہیں ملی ،اس لئے احادیث سے دلیل کا سہارا لینا پڑا، بلکہ صحیح لفظوں میں یہ ہے کہ چند ایک احادیث ہی کی وجہ سے انہوں نے حاجی کواس مفہوم میں داخل کیا ہے۔

”عن ام معقل قالت :لما حج رسول الله ﷺ حجة الوداع وكان لنا جمل فجعله ابو معقل فى سبيل الله واصابنا مرض وهلك ابو معقل وخرج النبى ﷺ فلما فرغ من حجه جئته فقال يا ام معقل مامنعک ان تخرجی معنا؟قالت: لقد تهيأنا فهلک ابو معقل وكان لنا جمل هوالذى نحج عليه فاوصى به ابو معقل فى سبيل الله قال: فهلا خرجتِ عليه فان الحج فى سبيل الله ،فاما اذ فاتتک هذه الحجة معنا فاعتمرى فى رمضان فانها كحجة“.
مختصراً(ابوداؤد۲/۵۰۶۔مطبوعہ بیروت)

حضرت ام معقل سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کیا اور ہمارے پاس ایک اونٹ تھا جسے ابومعقل نے فی سبیل اللہ وقف کر دیا اور ہم کومرض لاحق ہوا جس میں ابومعقل کا انتقال ہوگیا، نبی ﷺ حج میں تشریف لے گئے، پھر حج سے فارغ ہوکر واپس تشریف لائے تو میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ،آپ نے فرمایا کہ ام معقل کیا بات ہوئی کہ تم ہمارے ساتھ حج میں نہیں گئیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہم نے تیاری کررکھی تھی ،لیکن ابومعقل کا وصال ہوگیا،اور ہمارے پاس ایک اونٹ تھا جس پر ہم حج کرتے ،انہوں نے اسے فی سبیل اللہ وقف کردیا،آپ نے ارشادفرمایا کہ اسی پر چلنا چاہئے تھا، کیوں کہ حج تو فی سبیل اللہ ہے۔خیراب تو ہمارے ساتھ تمہارا حج فوت ہوگیا،اب تم رمضان میں عمرہ کرلووہ حج کے برابر ہے۔

اسی معنی میں اوربھی روایتیں ہیں،ان میں ذکر ہے کہ ام معقل نے اپنے شوہر سے مطالبہ کیا کہ سفرحج کے لئے مجھے اونٹ دیدو،انہوں نے اس کے فی سبیل اللہ ہونے کا عذر بیان کیا،دریافت کرنے پررسول اللہ ﷺ نے حج کے لئے اونٹ دینے کاحکم دیا کہ یہ بھی فی سبیل اللہ ہے۔

اس حدیث سے بلاشبہہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حج بھی فی سبیل اللہ کاایک فرد ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی بہت نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کا مصداق

حضرات صحابہ کرام کے نزدیک حج نہیں تھا (صرف جہاد تھا) کیوں کہ اگر ان کے عرف میں حج اس کا مصداق ہوتا تو ام معقل حضور اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کے آخری حج کی سعادت سے محروم ہونا گوارا نہ کرتیں، وہ خود بخود ساتھ ہو جاتیں، یا اگر شبہہ کے درجے میں بھی فی سبیل اللہ کا مصداق حج کو سمجھتیں تو آپ سے دریافت کر لیتیں، لیکن جب ایسا نہیں ہوا، حالانکہ ان پر حج فرض تھا، جانے کا شوق بھی تھا، تیاری بھی تھی، مگر نہ گئیں، اور نہ مسئلہ دریافت کیا، تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے عرف میں فی سبیل اللہ کا ایک ہی مصداق متعین تھا۔ بعد میں رسول اللہ ﷺ نے امت کی سہولت کے پیشِ نظر مرضیٔ حق پا کر فی سبیل اللہ کے لغوی مفہوم پر نظر فرماتے ہوئے اس میں حج کو بھی داخل فرمادیا، تو درحقیقت یہ اس کا مصداق نہیں ہے، مصداق میں بہ لحاظ عمومِ لفظ کے داخل ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ اللہ تعالی نے آیتِ تطہیر میں اہل بیت کا تذکرہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

"انـما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيراً". (سورہ احزاب)

اللہ تعالی چاہتے ہیں کہ تم سے اے اہل بیت! نجاست دور کردیں، اور تم کو اچھی طرح پاک وصاف کردیں۔

یہ آیت ظاہر ہے اور سیاقِ کلام شاہد ہے کہ ''ازواج مطہرات'' کے حق میں نازل ہوئی ہے، اور وہی اس کا مصداقِ اول ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی، نواسوں اور داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس لفظ کے عموم میں داخل فرمایا، اور فرمایا۔

اللهم هٰؤلاء اهل بيتي۔ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

اس موقع پر آپ نے مذکورہ بالا آیت بھی تلاوت فرمائی، ظاہر ہے کہ آپ نے یہ اہتمام اس لئے فرمایا کہ اہل بیت کے مفہوم میں ازواج مطہرات کا شامل ہونا تو بدیہی تھا لیکن مذکورہ بالا حضرات کا اس مفہوم میں داخل ہونا واضح نہ تھا، اس لئے آپ نے اہتمام کر کے اس میں داخل فرمایا۔

علاوہ ازیں مصارفِ زکوۃ میں آئے ہوئے ''فی سبیل اللہ'' کے لفظ میں ''حاجی'' کے

داخل ہونے کے سلسلے میں ایک اشکال ہے، وہ یہ کہ کیا اس حدیث کو مذکورہ فی سبیل اللہ کی تفسیر میں پیش کرنا برمحل اور مناسب ہے؟ ظاہر ہے کہ حدیث میں فی سبیل اللہ ایک دوسرے موقع سے آیا ہے، گو کہ وہاں بھی فی سبیل اللہ کا اصل معنی غزوہ ہی ہے مگر اس جگہ مسئلہ وقف کا ہے اور یہاں زکوۃ کا ہے، اور جس قدر احتیاط اور اہتمام زکوۃ میں درکار ہے جو اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ایک ہے، اس قدر اہتمام و احتیاط وقف کے مسئلے میں نہیں ہے، کیوں کہ اس کا تعلق فرائض سے نہیں ہے۔

بہر حال حالتِ اطلاق میں اس کا مصداق غزوہ و جہاد ہے، لفظ کے عموم لغوی کی مناسبت سے حج بھی اس میں داخل ہے۔ رہا یہ کہ امام کاسانی صاحب بدائع الصنائع نے یہ جو تحریر فرمایا ہے کہ۔

”واما قوله تعالى وفى سبيل الله عبارة عن جميع القرب فيدخل فيه كل من سعى فى طاعة الله وسبيل الخيرات اذا كان محتاجاً“. (بدائع الصنائع ۴۵/۲)

رہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”وفی سبیل اللہ“ یہ عبارت ہے تمام قربتوں سے، اس لئے اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو اللہ کی اطاعت میں سرگرم ہے، اور بھلائی کی راہوں میں کوشاں ہو، جبکہ وہ محتاج ہو۔

تو یہ اس بات میں بالکل واضح ہے کہ صاحب بدائع نے یہاں فی سبیل اللہ کا مصداق نہیں متعین کیا ہے، بلکہ اس کی عام لغوی تشریح کر کے اس کے تحت کار ہائے خیر کو داخل فرمایا ہے، اس کا مصداق انہوں نے بعد میں ائمہ سے نقل کیا ہے، چنانچہ اس کے معاً بعد فرماتے ہیں کہ۔

”وقال ابو يوسف المراد منه فقراء الغزاة لان فى سبيل الله اذا اطلق فى الشرع يراد به ذالك وقال محمد المراد منه الحاج المنقطع“. (بدائع الصنائع ۴٦/۲)

امام ابو یوسف نے فرمایا کہ اس سے فقراءِ مجاہدین مراد ہیں، کیوں کہ جب فی سبیل اللہ شریعت میں مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے یہی معنی مراد ہوتا ہے، اور امام محمد نے فرمایا کہ اس سے

مراد منقطع حاجی ہے۔

صاحب بدائع کا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ جتنے کارِخیر ہیں سب فی سبیل اللہ (جو آیت میں مذکور ہے) کا مصداق ہیں، البتہ فی سبیل اللہ کے لغوی معنی کے عموم کے تحت داخل ہیں، کسی کے تحت کسی مناسبت سے داخل ہونا امرِ دگر ہے، اور اس کا مصداق ہونا امرِ آخر ہے، علامہ ابن اثیر تحریر فرماتے ہیں:

وفی سبیل الله عام یقع علی کل عمل خالص سلک به طریق التقرب الی الله عز وجل باداء الفرائض والنوافل وانواع التطوعات واذا اطلق فهو فی الغالب واقع علی الجهاد حتی صار لکثرة الاستعمال کانه مقصور علیه". (تاج العروس ربحوالہ النہایہ ٧/٣٦٦)

اور فی سبیل اللہ عام ہے ہر اس خالص عمل پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعے اللہ کے تقرب کی راہ طے ہو، خواہ فرائض ہوں، نوافل ہوں، یا مختلف مستحبات وغیرہ، لیکن جب مطلق بولا جاتا ہے تو اکثر اس کے معنی جہاد کے ہوتے ہیں یہاں تک کہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے گویا اس کا معنی صرف یہی رہ گیا ہے۔

علامہ ابن اثیر کی اس تحریر سے سبیل اللہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی خوب واضح ہے، بہر حال آیت میں فی سبیل اللہ اپنے لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے، ورنہ تو خود زکوۃ دینے والا بھی فی سبیل اللہ کا مصداق قرار پا کر بنصِ قرآنی زکوۃ لینے کا مستحق قرار پاجائے گا۔ **وانی ذالک**

مصارفِ زکوۃ کی بحث میں ''انما'' کے حصر کی بحث لانے کی ضرورت نہیں ہے، حصر کے حقیقی ہوتے ہوئے بھی فی سبیل اللہ کو عام کر کے اس میں بہت سے کارِخیر داخل کئے جاسکتے ہیں، تو اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ یہ حصر حقیقی ہے یا اضافی؟ مقصد تو حقیقی ہونے کی صورت میں بھی ان حضرات کا حاصل ہوجاتا ہے جو فی سبیل اللہ کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب ساری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ حصر حقیقی ہے تو اس کے خلاف جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے چند احادیث لکھ کر بجائے اس کے کہ ان کے مفاہیم کو آٹھوں اصناف میں سے کسی میں داخل کرتے، حصر کے اضافی ہونے کا نظریہ پیش کیا،

لیکن یہ ان کی تنہا رائے ہے، جو احکام کے اسرار وحِکَم کے بیان کے ذیل میں آئی ہے، موقعِ فتوی پہ نہیں ہے، اس لئے ساری امت کے اجماع واتفاق کے خلاف نہ وہ قابلِ قبول ہے اور نہ لائقِ استدلال!

احکام کے باب میں قرونِ اولیٰ میں جس لفظ کا جو مصداق متعین ہو چکا ہے اور اس پر بلا نکیر عمل جاری رہا ہے اس پر تواتر وتعامل کی وجہ سے گویا اجماع منعقد ہو چکا ہے، اس لئے اس کو اختیار کرنا ضروری ہے اور اس کو ترک کرنا درست نہیں ہے، البتہ کسی مناسبت کے لحاظ سے کسی اور کو اس کے تحت داخل کریں تو گنجائش ہے۔

(ب) جو لوگ فی سبیل اللہ کے مصداق ہوں ان کے مستحقِ زکوۃ ہونے کے لئے فقر شرط ہے یا نہیں؟۔

بلاشبہ فقر شرط ہے، یہ شرط کہیں باہر سے نہیں چسپاں کی گئی ہے، خود صدقہ وزکوۃ کے مفہوم سے یہ شرط ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی بقدرِ ضرورت تفصیل یہ ہے کہ شریعت کا عرف جو زمانۂ نبوت سے آج تک رائج ہے اور ہر مسلمان کو بداہۃً معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ زکوۃ اور صدقہ تنگ دست اور غریب ہی کو دیا جاتا ہے، جہاں زکوۃ وخیرات کا ذکر آتا ہے سوائے اہلِ فقر اور اہلِ حاجت کے کسی اور کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہی نہیں، اس لئے یہ بات بطور علم ضروری کے متعین ہے کہ صدقہ کا مصرف ہونے کے لئے فقر بنیادی وصف ہے، اس کے خلاف کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، (اور یہ دلیل صرف عاملین اور مؤلفۃ القلوب میں دستیاب ہے، اس لئے ان دونوں میں فقر شرط نہیں ہے) اور خود فقر کے شرط ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ ان بدیہاتِ شرعیہ پر دلیل کا مطالبہ محلِ حیرت ہے، البتہ جن لوگوں نے مذکورہ بالا دونوں صنفوں کے علاوہ میں غنی کو زکوۃ دینے کی اجازت دی ہے ان سے دلیل کا مطالبہ معقول ہے۔

چنانچہ امام شافعی علیہ الرحمہ نے اس مسئلے پر ایک حدیث سے استدلال کیا، کیوں کہ وہ غازی کو اگر چہ غنی ہو، زکوۃ دینے کے جواز کے قائل ہیں۔ حدیث یہ ہے:

"لاتحل الصدقة لغنى الا لخمسة ،لغاز فى سبيل الله او العامل عليها اولغارم اولرجل اشتراها بماله اولرجل جار له مسكين فتصدق على المسكين

فاهدی المسکین للغنی". رواه مالک فی الموطا(اوجزالمسالک ۱۶/۶)

صدقہ بجز پانچ شخصوں کے اور کسی غنی کے لئے حلال نہیں ہے، ایک غازی فی سبیل اللہ، دوسرے عامل، تیسرے مقروض، چوتھا ایسا آدمی جس نے صدقہ کا مال اپنی رقم سے خرید لیا ہو، پانچویں وہ شخص جس کا کوئی پڑوسی مسکین ہو اسے صدقہ دیا گیا، اس نے وہی صدقہ اس غنی کو ہدیہ کردیا۔

اس روایت سے شوافع نے استدلال کیا ہے کہ غازی کو زکوۃ دینا جائز ہے، اس کے مقابلہ میں جن لوگوں نے فقر کو ضروری قرار دیا ہے انہوں نے بھی حدیث سے استدلال کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن روانہ کیا تو منجملہ اور تعلیمات کے ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی۔

"فاعلمهم ان الله افترض عليهم صد قة فی اموالهم توخد من اغنيائهم وترد فی فقرائهم". (بخاری شریف ۳۳۳/۲)

انہیں بتاؤ کہ اللہ نے ان کے مالوں میں ان کے اوپر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء میں واپس کیا جائے گا۔

یہ تعلیم کا موقع تھا، اس میں احکام کا بیان مقصود تھا، ایسے موقع پر آپ نے مطلقاً فقراء فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ زکوۃ کے مستحقین میں فقر ضروری ہے۔

وروی الامام احمد بسنده ابی عبيدالله بن عدی عن رجلين من اصحاب النبی ﷺ انهما اتيا رسول الله ﷺ فسالاه الصدقة فصعد فيهما البصر فرأهما جلدين فقال ان شئتما اعطيتكما ولا حظ فيها الغنی ولا مكتسب".

"روی عمر بن شعيب عن ابيه عن جده ان النبی ﷺ قال: لا تحل الصدقة لغنی ولذی مرة سوی". رواه ابو دائود، والترمذی وقال حسن صحيح".

امام احمد نے اپنی سند سے عبیداللہ سے روایت کی ہے کہ دو آدمی نبی کریم ﷺ کے

اصحاب میں سے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے صدقہ کا سوال کیا، آپ نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا تو دونوں کو تندرست اور ہٹا کٹا دیکھا تو آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو تمہیں دے دوں، لیکن سن لو کہ اس میں غنی کا اور اس شخص کا جو کمائی پر قادر ہو کوئی حصہ نہیں ہے۔

عمر بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ کسی غنی اور طاقتور تندرست شخص کے لئے حلال نہیں ہے۔ امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے اور امام ترمذی نے اسے ''حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ استحقاقِ زکوۃ کے لئے فقر درکار ہے، رہا کمانے کے لائق ہونا تو دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تغلیظاً تا کہ مفت خوری کا رجحان نہ پیدا ہو، لیاقتِ کسب کی وجہ سے صدقہ کی ممانعت کر دی، اور اگر کسی کو اصرار ہو کہ کمانے کے لائق ہونا بھی زکوۃ لینے سے مانع ہے تو ہمارے مقصد کے لئے کچھ مضر نہیں۔

البتہ ''مؤطا'' والی روایت جس میں غنی غازی کے لئے صدقہ کے جواز پر استدلال کیا گیا، اس سے استدلال خاصا محل نظر ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث مذکورہ میں پانچ قسم کے اغنیاء کے لئے صدقہ جائز قرار دیا دیا گیا ہے، ان میں اول ''غازی'' ہے، وہ تو یہاں زیر بحث ہے۔ دوسرے ''عامل'' ہے تو اس کے سلسلے میں قدرے گفتگو گزر چکی ہے اور کچھ آگے آ رہی ہے۔ تیسرے ''غارم'' ہے، اسے غنی مجازاً کہا ہے، کیوں کہ جو شخص کسی دین یا غرامت میں مبتلا ہے وہ باوجودیکہ ظاہراً مال رکھتا ہو لیکن اس کا سارا مال غرامت کی نذر ہو جانے والا ہے، پھر وہ کیا غنی ہوا؟ چوتھے ''وہ شخص جس نے زکوۃ کا مال خریدا ہو''، یہ بالکل کھلی بات ہے کہ اس نے زکوۃ نہیں لی ہے، خریدی ہوئی زکوۃ تو اسے اپنے مال کے عوض میں دستیاب ہوئی ہے، اس لئے اس پر اطلاق مجاز ہے۔ پانچویں ''وہ شخص جس کو کسی مسکین نے زکوۃ کا مال جو اس کے قبضہ اور ملکیت میں آ چکا ہے بطور ہدیہ کے دیدیا''، یہاں بھی غنی کو زکوۃ لینے والا مجازاً کہا گیا ہے، حقیقتاً اس نے زکوۃ نہیں لی ہے۔ زکوۃ تو مسکین کو ملی تھی اور مسئلہ معلوم ہے کہ تبدلِ ملک سے شئی کی حقیقت بدل جاتی ہے، پس ان تینوں کو زکوۃ لینے والا مجازاً کہا گیا ہے، اگر اس کی روشنی میں کوئی غازی کو بھی مجازاً ہی غنی قرار

دے تو کیا اس کی گنجائش نہیں ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو غنی ہے، اس نے جہاد میں جانے کا ارادہ کیا، اس کے لئے سامانِ جنگ وغیرہ خریدے، زادِ راہ لیا، تو گو وہ پہلے غنی تھا لیکن ان سامانوں کی خریداری میں عین ممکن ہے کہ اس کا غناء حقیقتاً ختم ہو جائے، کیوں کہ اس کی بیشتر رقم مصارفِ جہاد میں اور سامانِ جنگ کی خریداری میں صرف ہوگئی، اور یہ سامانِ جنگ تو حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں، پس وہ مستحقِ زکوۃ ہوگیا۔ اور ایسا فقر وغربت کی وجہ سے ہوا، لیکن چونکہ پہلے وہ غنی تھا اس لئے دیکھنے والے نے اب بھی اسے ظاہراً غنی ہی سمجھیں گے۔ اس اعتبار سے اسے مجازاً غنی کہہ دیا دیا گیا، صاحب بدائع فرماتے ہیں:

"واما استثناء الغازی فمحمول علی حال الحاجة وسماه غنياً علی اعتبار ماكان قبل حدوث الحاجة". (بدائع الصنائع ۴۶/۲)

بہر حال غازی کا استثنا تو وہ محمول ہے حاجت کے پیدا ہو جانے کی حالت پر اور اس کو حدوث حاجت کے پہلے کی حالت کے اعتبار سے کہا گیا۔

اتنا لکھنے کے بعد پھر وہی تفصیل لکھی ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے، یہ توجیہ نہایت عمدہ اور قابل قبول ہے، اس سلسلے میں علامہ سید مرتضٰی بلگرامی نے بھی نہایت عمدہ بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"ان نفس الاسماء المذكور فی الآية تفيد ان المناط فی الد فع اليهم الحاجة لما عرف من تعليق الحكم بالمشتق ان مبدأ اشتقاقه علة".

آیت مذکورہ میں اسماء خود دلالت کرتے ہیں کہ انہیں زکوۃ دیے جانے کے لئے مدارِ حکم احتیاج ہے، کیوں کہ معلوم ہے کہ جب حکم کسی مشتق پر دائر ہوتا ہے تو اس کا ماخذِ اشتقاق علت ہوتا ہے۔

"وماخذ الاشتقاقات فی هذه الاسماء تنبه علی قيام الحاجة فالحاجة هی العلة فی جواز الدفع الا المولفة قلوبهم فان ماخد اشتقاقه يفيد ان المناط التاليف والا العامل فانه يفيد انه العمل......

وما استد ل به اصحاب الشافعی من الحديث المذكور فالجواب عنه

من وجوه:قيل انه لم يثبت ،لو ثبت لم يقو قوة حديث معاذ فانه اتفق عليه الستة ولو قوى قوته ترجح حديث معاذ بانه مانع ومارواه مبيح مع انه دخله التاويل عندهم حيث قيد الاخذ له بان لا يكون له شئى من الديوان والاخذ آمن الفئى وهم اعم من ذالک يضعف الدلالة بالنسبة الى مالم يدخله‘‘. (اتحاف السادۃ المتقین ۲۴۹/۴، ۲۵۰)

اوران اسماء کا ماخذِ اشتقاق قیامِ حاجت کو بتا تا ہے، پس حاجت ہی زکوۃ دینے کی علت ٹھہری، البتہ مؤلفۃ القلوب میں علت تالیفِ قلب ہے، اور عامل میں علت اس کا عمل ہے۔(بس یہی دو مستثنیٰ ہیں ان کو باوجود غنا کے زکوۃ دی جاسکتی ہے)

اور حدیث مذکور سے اصحابِ شافعی نے جو استدلال کیا ہے اس کا جواب کئی طریقوں سے ہے۔بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے، اور اگر ثابت ہوتو حدیثِ معاذ جیسی قوت نہیں رکھتی، کیوں کہ وہ صحاح ستہ کی روایت ہے، اور اگر اس کی جیسی قوت بھی رکھتی ہو تب بھی حدیثِ معاذ ہی کو ترجیح ہوگی، کیوں کہ وہ ’’مانع‘‘ ہے اور جس سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے وہ ’’مبیح‘‘ ہے، علاوہ ازیں اس میں خود ان حضرات نے تاویل کا دروازہ کھول رکھا ہے، چنانچہ انہوں نے قید لگا رکھی ہے کہ وہی غازی غنی زکوۃ کا مستحق ہوگا جس کا وظیفہ بیت المال سے مقرر نہ ہو، اور نہ اسے مالِ فئی سے حصہ ملتا ہو، حالانکہ غازی عام ہے اور اس تاویل کی وجہ سے اس کی دلالت بنسبت اس حدیث کی دلالت کے جس میں تاویل کا دخل نہیں ہے کمزور ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر حدیثِ مؤطا اور حدیثِ معاذ دونوں ایک درجہ کی قوت رکھتی ہوں جب بھی حدیثِ معاذ میں چوں کہ فقرا کے ساتھ زکوۃ کو خاص کیا گیا ہے اس لئے اغنیا کے حق میں وہ عدمِ جواز پر دلالت کرتی ہے، اور حدیثِ مؤطا ایک خاص غنی کے لئے اباحت ثابت کرتی ہے، اور قاعدہ ہے کہ ’’مبیح دلیل‘‘ اور ’’مانع دلیل‘‘ میں تعارض ہو اور دونوں مساوی ہوں تو احتیاطاً مانع کو ترجیح حاصل ہوتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حدیثِ مؤطا خود شوافع کے نزدیک اپنے ظاہری معنی پر محمول نہیں ہے، اس میں یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ اس غنی غازی کو حکومت کے

بیت المال سے وظیفہ نہ ملتا ہو، اسی طرح مالِ فئی جو مال غنیمت کا ایک شعبہ ہے اس میں سے اس کا حصہ نہ ملتا ہو، تب وہ مستحقِ زکوۃ ہوگا، ظاہر ہے کہ اس تاویل کے بعد اس کے ظاہری معنی پر اس کی دلالت اس حدیث کے مقابلہ میں ضعیف ہو جائے گی جس میں اس طرح کی کوئی تاویل نہیں ہے، چنانچہ معلوم ہے کہ حدیثِ معاذ میں کوئی تاویل نہیں ہوئی ہے۔

تکمیل بحث کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور امام، ابوبکر جصاص نے اس سلسلے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے بھی درج کر دیا جائے، فرماتے ہیں کہ:

"وجميع من ياخذ الصدقه من هذه الاصناف فانما ياخذ صدقة بالفقر والمولفة قلوبهم والعاملون عليها لا ياخذونها صدقة وانما تحصل الصدقة فى يدالامام للفقراء ثم يعطى الامام المؤلفة منها لدفع اذيتهم عن الفقراء وسائر المسلمين ويعطيها العاملين عوضاً عن اعمالهم لا على انها صدقة عليهم وانما قلنا ذالک لقول النبى ﷺ "امرت ان آخذ الصدقة من اغنياء كم واردها فى فقراء كم" فبين ان الصدقة مصروفة الى الفقراء فدل ذالک على ان احداً لاياخذها صدقة الا بالفقر وان الاصناف المذكورين انما ذكروا بياناً لاسباب الفقر". (احکام القرآن ۴/۳۳۰)

ان اصناف میں جتنے لوگ صدقہ لیتے ہیں وہ فقر کے وجہ سے بطور صدقہ کے لیتے ہیں، اور مؤلفۃ القلوب اور عاملین علیہا اسے بطور صدقہ کے نہیں لیتے، صدقہ اولاً امام کے قبضہ میں برائے فقرا جاتا ہے، پھر امام اس میں سے مؤلفۃ القلوب کو دیتا ہے، تاکہ فقرا سے اور مسلمانوں سے ان کی ایذا رسانی کا سدباب کرے، اور عاملین کو ان کی محنت کے عوض میں دیتا ہے بطور صدقہ نہیں [۱] اور یہ ہم نے اس لئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیا سے زکوۃ وصول کروں اور تمہارے فقرا میں لوٹا دوں، آپ نے بیان فرمایا کہ زکوۃ کا مصرف فقرا ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی صدقہ لے گا فقر ہی کی وجہ سے لے گا۔ اور مذکورہ اصناف کا بیان اسبابِ فقر کی تفصیل کے لئے کیا گیا، ۔(گویا مذکورہ بالا دونوں اصناف کے علاوہ سارے نام اسبابِ فقر کو بیان کرتے ہیں)

(۵) مصارفِ زکوٰۃ قیاسِ شرعی کا محل ہیں یا نہیں؟۔

جواب مصارفِ زکوۃ پر قیاس کرنا گویا دوسری اصناف کو جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، مصارف کے کے دائرہ میں لانا ہے۔ یہ بات حصر کے منافی ہے، اور گزر چکا ہے کہ حصر پر تمام علما کا اتفاق ہے، پھر یہ کہ قیاس وہاں کیا جاتا ہے جہاں کسی فرد کے بارے میں کوئی حکمِ شرعی ثابت نہ ہو، اور اس کے بارے میں کوئی نص نہ ہو، تو اشتراکِ علت سے اس کو کسی منصوص کے دائرے میں لایا جاتا ہے، اصناف مذکورہ میں سب کلیات ہیں اور ان میں مناطِ حکم جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تین ہیں، بعض اصناف میں فقر ہے، بعض میں عمل اور محنت اور بعض میں تالیفِ قلب۔ اب جن جن افراد میں ان میں سے کوئی علت موجود ہوگی وہ خود بخود انہیں اصناف کے تحت آجائیں گے، الگ سے کسی صنف کے بڑھانے کی گنجائش نہیں، اس لئے قیاس کی ضرورت نہیں۔ جہادِ قلمی، جہادِ ثقافی، جہادِ فکری کے لئے کسی نویں صنف کی کیا ضرورت ہے؟ ان کو جہادِ عسکری کے تحت داخل کیجئے، لیکن ہاں فقر شرط ہے، مدار کار جہاد نہیں ہے، مدار کار فقر ہے، اور فقر کی حدود متعین ہیں۔

(۶) اور اگر فی سبیل اللہ کی توسیع وتعمیم سے یہ مراد ہے کہ جن اشخاص وافراد کو فی سبیل اللہ کے تحت داخل کیا گیا ہے ان کے علاوہ دوسرے ایسے رفاہی پروگراموں کو بھی اس کے دائرہ میں لایا جائے، جن میں کسی فرد کے سپرد مال نہیں کیا جاتا بلکہ بلا واسطہ اعطائے زکوۃ کے اسے دیگر ضروریات پر خرچ کیا جاتا ہے، مثلاً کتابیں چھپوائی جائیں، پمفلٹ شائع کئے جائیں، اور دوسرے منصوبوں اور پروگراموں، جلسہ جلوس اور سیمینار اور کانفرنسوں پر خرچ کیا جائے، اداروں کی مختلف ضروریات میں انہیں لگایا جائے تو یہ توسیع وتعمیم بالکل بے بنیاد، بے دلیل، بلکہ خلافِ دلیل ہے۔

یہ مسئلہ امت میں مجمع علیہ ہے کہ زکوۃ اشخاص وافراد کے حوالے ہونی چاہئے، اس کو اس کے علاوہ کسی اور منصوبے پر خرچ کرنا جس میں زکوۃ کی بطور زکوۃ کے ادائیگی نہ ہو خلاف اجماع ہے، قرون مشہود لہا بالخیر میں بلکہ اس کے بعد بھی امت میں کوئی قابلِ ذکر جماعت اس بات کی قائل نہیں ہوئی ہے کہ زکوۃ اشخاص کے علاوہ دوسرے مواقع پر خرچ کی جاسکتی ہے، اور جو کبھی اکا دکا اس طرح کے خیال کا اظہار کیا گیا ہے تو امت کے اجتماعی مزاج نے اسے قبول نہیں کیا، امام

ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک تو تملیک شرط ہے، یعنی اصناف مذکورہ کو زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، البتہ امام مالک کے نزدیک اور امام احمد کے ایک قول میں صرف 'فی الرقاب' کے سلسلے میں یہ وسعت ہے کہ زکوۃ کی رقم سے غلام خرید کر آزاد کیا جائے، بعض صحابہ سے بھی یہ قول مروی ہے، اس میں گو کہ تملیک نہیں ہے لیکن وہ رقم ایک فقیر ہی کی مد میں خرچ ہو رہی ہے، اس لئے حکماً وہ بھی تملیک میں داخل ہے، اور اس میں بھی ان کے نزدیک کچھ شرائط ہیں۔

"والرقیق المومن لیشتری من الزکوۃ لاجل العتق بشرط ان یکون خالصاً من شوائب الحریۃ فلا یصح عتق المدبر والمکاتب ونحوہ". (اوجز المسالک ۶/۲۵)

مومن غلام جو زکوۃ کی رقم سے آزادی کے واسطے خریدا جائے بشرطیکہ وہ آزادی کے شائبہ سے بھی پاک ہو، پس مدبر اور مکاتب کو خرید کر آزاد کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حضرات مصارفِ زکوۃ کے سلسلے میں بغایت محتاط ہیں، بات یہ ہے کہ ان حضرات کے قلوب میں [احکام] الٰہی کی بڑی عظمت ووقعت ہے، اس لئے ان پر عمل کے سلسلے میں بہت حساس اور نہایت باریک ہیں، اس کے برعکس آج ہمارے قلوب اس عظمت وعقیدت کے احساس سے کافی حد تک عاری ہیں، جس کی وجہ سے متفق علیہ احکام بھی ذہانتوں کا کھلونا بنتے جارہے ہیں۔**فانا للہ وانا الیہ راجعون**

آٹھ اصناف میں منحصر نہ ہونے کا اشارہ سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے کلام میں ملتا ہے، مگر وہ بھی ان پروگراموں کو مصارفِ زکوۃ قرار دینے کے حق میں بالکل نظر نہیں آتے ان کا ارشاد وہیں پڑھئے جہاں انہوں نے عدمِ انحصار کا اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

ونوع وھو صدقات المسلمین جمعت فی بیت المال ومن حقہ ان یصرف الی مافیہ تملیک لاحد وفی قولہ تعالی انما الصد قات للفقراء والمساکین "الآیہ.

اور ایک قسم مسلمانوں کے ان صدقات کی ہے جو بیت المال میں جمع کئے جاتے ہیں، اس کا حق یہ ہے کہ انہیں ایسے مصارف میں خرچ کیا جائے جن میں کسی شخص خاص کے لئے تملیک

ہوتی ہے، اسی بارے میں آیت ’’ انما الصد قات للفقراء والمساکین ‘‘ ہے۔

ملاحظہ ہو اس میں انہوں نے زکوۃ کے مصارف کے لئے تملیک کو بنیادی شرط قرار دیا ہے، حد تو یہ ہے کہ وہ فی سبیل اللہ کو بھی غزاۃ سے آگے لے جانے کے لئے تیار نہیں ہیں، فرماتے ہیں:

’’والجملة فی ذالک ان الحاجات من هذا النوع وان کانت کثیرة جداً لکن العمدة فیها ثلثة: (۱) المحتاجون، وضبطهم الشارع بالفقراء والمساکین وابناء السبیل والغارمین فی مصلحة انفسهم. (۲) والحفظة، وضبطهم بالغزاة والعاملین علی الجبایات. (۳) الثالث مال یصرف الی دفع الفتن الواقعة بین المسلمین اوالمتوقعة علیهم من غیرهم وذالک امایکون بمواطاة ضعیف النیة فی الاسلام بالکفار اوبرد الکافر عما یرید من المکیدة بالمال ویجمع ذالک اسم المولفة قلوبهم اوالمشاجرات بین المسلمین وهو الغارم فی حمالة متحملها‘‘. (حجۃ اللہ البالغۃ ۲/۴۵)

مصارفِ زکوۃ میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ ضروریات اس نوع کی اگرچہ بہت ہیں مگر بنیادی حاجات تین ہیں، اول محتاج، اس کو شارع نے فقرا و مساکین، ابن السبیل اور اپنی ذاتی مصلحت کے سلسلے میں غارم کی صورت میں متعین کیا ہے۔ دوسرے محافظین، انہیں شارع نے غازی اور عامل کے نام سے ضبط کیا ہے۔ تیسرے ایسا مال جو مسلمانوں کے درمیان آپسی فتنوں کو دفع کرنے کے لئے ہوں یا ایسے فتنوں کو روکنے کے لئے جو غیر مسلمین کی طرف سے پیش آسکتے ہوں، اور یہ فتنہ اس طرح پیش آسکتا ہے کہ کوئی کمزور ایمان والا کفار سے ملا ہوا رہے، یا خود کافروں ہی کی طرف سے فتنہ پیش آنے کا امکان ہو تو ان کا کید مال دے کر ٹال دیا جائے، اس کے لئے مولفۃ القلوب کا نام ہے یا خود مسلمانوں کے درمیان کچھ جھگڑے ہوں اور کوئی شخص مالی ذمہ داری لے کر صلح کرا دے، یہ شخص مسلمانوں کے مصلحتوں کی وجہ سے غارمین میں داخل ہے۔

اس میں شاہ صاحب نے فی سبیل اللہ کو فقط غزاۃ میں منحصر کر دیا ہے، عجیب بات ہے کہ ان مشائخ کی جو صاف اور محکم عبارتیں ہیں ان سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے، اور جو عبارت متشابہ

یا مجمل قسم کی ہیں جو کئی وجوہ کا احتمال رکھتی ہیں یا شاذ ہیں، ان سے استدلال کیا جاتا ہے۔

دوسرے بزرگ جو فی سبیل اللہ کی تعمیم کے اس درجہ قائل معلوم ہوتے ہیں کہ تمام وجوہِ خیر میں زکوۃ کو صرف کرنا ان کے خیال میں جائز ہے، وہ نواب صدیق حسن خان مرحوم ہیں، لیکن یہی بزرگ دوسری جگہ جمہور ہی کے مسلک کے قائل ہیں، اور فی سبیل اللہ سے غزاۃ اور مرابطین کو مراد لیتے ہیں، اور اسی کو "**اولی لاجماع الجمهور عليه**" قرار دیتے ہیں، چنانچہ سوال نامہ میں اس کا ذکر ان کی تفسیر "فتح البیان" ۱۴/۱۵۱ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

بھلا جس مسلک کو انہوں نے اولیٰ قرار دیا ہے اس کے خلاف کے لئے انہیں کے قول کو حجت بنانا نہ جانے کس منطق سے درست ہے؟۔

رہے رشید رضا مصری اور شیخ شلتوت، تو یہ لوگ تجدد کی آندھی میں اڑے ہوئے حضرات ہیں، یہ اپنی ذہانت کے بل پر تجدد کی راہ میں اتنی دور تک جا پہونچے ہیں کہ امت اپنے اسلاف کے اتباع پر قائم رہتے ہوئے ان کا ساتھ نہیں دے سکتی، یہ لوگ مسلک سلف پر استقامت اختیار کرنے والوں کو جامد قرار دیتے ہیں، ہمارے خیال میں یہ جمود جوامت کو اسلاف کی راہ پر قائم رکھے مبارک ہے۔ "سیال علماء" امت کو ہمیشہ نقصان پہونچاتے ہیں۔

تعمیم کے اس نظریہ کی تائید میں دو باتیں ذکر کی گئی ہیں، ایک یہ کہ قرآن وسنت میں کوئی ایسی صراحت موجود نہیں ہے جس کی بنا پر ہم فی سبیل اللہ کو کسی خاص کار خیر کے لئے مخصوص کر سکیں، لہٰذا فی سبیل اللہ کا مصداق طے کرنا اجتہادی مسئلہ ہے، اسی طرح کی بات نواب صاحب مرحوم کی کتاب "الروضۃ الندیہ" سے بھی نقل کی گئی ہے کہ:

ولكن لا دليل على اختصاص هذا السهم به بل يصح الصرف بذالك في كل ما كان طريقا الى الله عز وجل هذا معنى الآية لغوية والواجب الوقوف على المعانى اللغوية حيث لم يصح النقل هنا شرعاً".

لیکن اس حصہ کے غازی کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ ہر کار خیر میں جو اللہ تعالی کے قرب کا ذریعہ ہو، اس کا خرچ کرنا درست ہے، یہی آیت کا معنی باعتبارِ لغت ہے اور یہاں معنی پر وقوف واجب ہے، کیوں کہ شرعاً کوئی صحیح نقل اس پر وارد نہیں ہوئی ہے۔

نہ جانے یہ دعوی علم وفضل کے کس جوش میں کیا گیا ہے؟ نواب صاحب اور رشید رضا مصری سے پہلے کے تمام علما جو باتفاق فی سبیل اللہ کا مصداق ''غزاۃ'' اور بعض اس میں ''منقطع الحاج'' کو داخل شمار کر کے قرار دیتے ہیں گویا وہ اس نکتہ سے بے خبر تھے کہ شریعت میں فی سبیل اللہ کا کوئی خاص مفہوم متعین نہیں ہے، اس لئے اس کے لغوی معنی پر اسے محمول کرنا چاہئے، یا وہ محلِ اجتہاد ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ چند افراد کا قول لے کر تمام امت کی، امت کے تمام ائمہ کی، علما کی، حتی کہ صحابہ کرام کی تجہیل کی ذمہ داری قبول کی جائے۔ حضرت ام معقل کو بھی اس لغوی معنی کی خبر نہ تھی، جبھی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے آخری حج میں شرکت سے محرومی برداشت کر لی۔ اس قسم کی باتیں اگر بہت رعایت کی جائے تو ''زلات الحکیم'' میں داخل ہوں گی، ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کا مصداق دورِ رسالت ہی سے متعین ہے، اس کے لئے کسی نقلِ خاص کی ضرورت نہیں ہے، یہ بات تو تواتر سے ثابت ہے، اس کے خلاف مراد لینا قرآن میں تحریف ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور استدلال صدقہ کے اونٹوں سے خوں بہا ادا کئے جانے کا ہے، استدلال کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رفعِ نزاع، اصلاح ذات البین نیز مقتول کے ورثہ کو خوش کرنے کے لئے زکوۃ کے مال سے خوں بہا ادا کیا، جب امن برقرار رکھنے کے مقصد سے رفعِ نزاع کے لئے مقتول کے ورثہ کو خوں بہا میں زکوۃ دینا جائز ہے تو یہ بات بدرجہ اولیٰ جائز ہونی چاہئے کہ اسلامی مملکت میں امن وامان کے قیام اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کے لئے زکوۃ کی رقم صرف کی جائے، مصالح عامہ کے کاموں میں زکوۃ خرچ کر کے اسلامی مملکت کو استحکام بخشا جائے۔

یہ دلیل بھی محلِ نظر ہے اور استدلال بھی محلِ تردد ہے، دلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ استدلال راوی کے اس قول سے ہے کہ:

'فواده مأة من ابل الصد قة '. تو آپ نے صدقہ کے سو اونٹوں سے دیت ادا کی اس کے متعلق مشہور حافظِ حدیث، شارحِ بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی ''فتح الباری''

میں لکھتے ہیں:

"وفی روایة ابی لیلیٰ "فواده من عنده" وفی روایة یحییٰ بن سعید "فعقله النبی ﷺ من عنده" وفی روایة حماد بن سلمه" من قبله" وفی روایة اللیث عنه" فلما رأی ذالک النبی ﷺ اعطی عقله". (فتح الباری۱۲: ۲۸۹)

ابولیلیٰ کی روایت میں "**من عنده**" کا لفظ ہے، یعنی آپ نے اپنے پاس سے دیت ادا کی، اور یحییٰ بن سعید کی روایت میں بھی "**من عنده**" کا لفظ ہے، حماد بن سلمہ کی روایت میں "**من قبله**" ہے، (اس کا بھی وہی مطلب ہے جو "**من عنده**" کا ہے) اورلیث کی روایت میں یہ ہے کہ جب نبی ﷺ نے یہ دیکھا تو اس کی دیت ادا کردی۔ (اس میں نہ "**من عنده**" ہے اور نہ "**من ابل الصدقه**" ہے)

دیکھئے اتنے ثقہ اور معتبر رواۃ کے نزدیک، ،**من ابل الصدقه**" نہیں ہے، مطلب یہ ہوا کہ آپ نے صدقہ کے اونٹوں سے نہیں بلکہ اپنے پاس سے ان کی دیت ادا کی تھی، اس لحاظ سے یہ دلیل ہی ختم ہوئی جاتی ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ "**من ابل الصدقه**" کہنے کی غلطی سعید بن عبید راوی سے ہوئی ہے، کیوں کہ یحییٰ بن سعید نے "**من عنده**" صراحۃً نقل کیا ہے، لیکن بعض دوسرے حضرات کو تردد ہے کہ سعید بن عبید بھی ثقہ ہیں، اس لئے حتی الامکان راوی کی تغلیط سے بچنا چاہیئے۔ یہ حضرات دونوں روایتوں میں تطبیق دیتے ہیں، تطبیق کی وجوہ حافظ ابن حجر نے لکھی ہے، ان سب کے نقل کرنے میں تطویل ہے، فتح الباری میں ملاحظہ فرمالیں، لیکن ساری تطبیقات وتوجیہات کا حاصل ایک ہے، وہ یہ کہ آپ نے صدقات کے اونٹوں کو دیت میں نہیں دیا تھا۔ یا تو یہ کہ اپنے مال سے زکوۃ کے اونٹوں کو خریدلیا ہو یا بیت المال کے عام مال سے دیت دی ہو، لیکن بلاعوض مل جانے کی وجہ سے اس پر صدقہ کا اطلاق کردیا ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صدقہ کے اونٹوں کو بطورقرض کے لے لیا ہو کہ بعد میں مالِ فئی سے ادا کردیا جائے گا۔

واضح ہو کہ یہ ساری وجوہ دونوں روایتوں کے جمع کرنے کی غرض سے ذکر کی گئی ہیں، ان میں سے کوئی وجہ تسلیم کرلی جائے تو کسی روایت اور کسی راوی کی تغلیط نہیں کرنی پڑے گی، ورنہ لازماً ایک کی تغلیط کرنی ہوگی۔

دوایک توجیہات ایسی بھی ہیں کہ ان ذریعہ سے ''من اہل الصدقہ'' کے لفظ پر جو اشکال ہورہا تھا کہ خوں بہا میں صدقہ کے اونٹ بالکل خلافِ دستور کیسے دیدیئے گئے؟ اس پر کہا گیا کہ ممکن ہے مقتول کے اولیاء زکوۃ کے مستحق رہے ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے ''مؤلفۃ القلوب'' والا حصہ ان کو دیا ہو کہ اس میں اولیاءِ مقتول کی تالیفِ قلب کے ساتھ یہودیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک ہے کہ ان کے درمیان میں پائے گئے مقتول کی ذمہ داری سے ان کو بری کردیا گیا، اس طرح وہ متاثر ہوسکتے تھے، اس اعتبار سے ''مؤلفۃ القلوب'' والے حصے کے یہ لوگ مستحق قرار پائے۔

بہر حال یہ مسئلہ پریشان کن تھا کہ خوں بہا کی ادائیگی زکوۃ سے کیسے ہوسکتی ہے؟ جبکہ یہ آٹھوں مصارف میں شامل نہیں ہے، اور یہ ممکن نہ تھا کہ قرآن کے خلاف رسول اللہ ﷺ سے کوئی عمل صادر ہوجائے۔ اور اگر اس حدیث کو ٹھیک ٹھیک اس کے ظاہر کے مطابق قبول کرلیا جائے تو تمام علماء کو محسوس ہورہا ہے کہ قرآن کے خلاف عمل تسلیم کرنا پڑے گا، پھر ایک صورت یہ تھی کہ قرآن کے حصر کو توڑ کر حضور ﷺ کے عمل کی وجہ سے (حسب بیان مرادی) اس کو مصارفِ زکوۃ میں شمار کرلیا جائے، چنانچہ کسی مجہول عالم کا یہ قول حافظ ابن حجر نے قاضی عیاض کے حوالے سے نقل بھی کیا ہے، لیکن اسے کسی درجہ میں قابلِ اعتنا نہیں شمار کیا گیا۔

حضور کا عمل قرآن کے خلاف ہو ممکن نہیں، اس روایت کی وجہ سے حصر توڑ دیا جائے، اس روایت میں اس کی طاقت نہیں، بالخصوص جب کہ اس روایت میں غلطی محسوس کی جارہی ہے، اور دوسرے متعدد ثقہ راوی اسی حدیث میں ایسا لفظ روایت کرتے ہیں جو قرآن سے متعارض نہیں ہے، اور جس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ پس یہاں دو راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ناگزیر ہے، یا تو ''من اہل الصدقہ'' کے لفظ کو خطا کہا جائے یا مذکورہ بالا توجیہات میں سے کسی ایک کو قبول کیا جائے، اس کے علاوہ کوئی تیسری راہ نہیں ہے، ان دونوں صورتوں میں دوسرے اقوال والوں کے مدعا کے لئے یہ حدیث ہرگز دلیل نہیں بن سکتی۔

اور استدلال کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر حدیث کو اس کی ظاہری صورت پر ہی قبول کرلیا جائے تو بھی مدعا پر یہ دلیل منطبق نہیں ہورہی ہے، اس لئے کہ مدعا یہ ہے کہ تملیک سے

آزاد ہوکر کار ہائے خیر میں زکوۃ صرف کرنا جائز ہے اور دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خوں بہا میں زکوۃ دی۔ظاہر ہے کہ اس دلیل میں کھلی ہوئی تملیک پائی جارہی ہے، پھر تملیک سے آزادی کے لئے اس کو دلیل کیوں کر بنا سکتے ہیں؟ یہ قیاس مع الفارق ہے۔

یادرکھنا چاہئے کہ زکوۃ محض رفاہِ عام کی چیز نہیں ہے، یہ ایک عبادت ہے،اس کے حدود حق تعالی کی طرف سے متعین ہیں،ان حدود کی رعایت بطور عبادت کے کرنا چاہئے ،اگر رفاہِ عام کی چیز ہوتی تو اس کے لئے اتنے اہتمام سے مصارف بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔اگر شاذ رایوں کا اعتبار کرلیا جائے تو غربا ومساکین کو زکوۃ ملنی مشکل ہوجائے گی، یہ تنظیمیں، یہ اکادمیاں اور یہ رفاہی ادارے جو اپنی پشت پر مؤثر افراد کی طاقت رکھتے ہیں اور انہیں سرمایہ بھی زیادہ درکار ہوتا ہے،سب زکوۃ لے اڑیں گے،اور غربا ومساکین بلکہ مدرسے بھی منھ دیکھتے رہ جائیں گے۔

تفردات کو پڑھ لیجئے ،مگر نہ انہیں استدلال میں پیش کیجئے اور نہ امت کے سامنے لایئے کہ اس سے عجیب فکری انتشار ہوتا ہے۔

ماخذ۔مجلّہ فقہ اسلامی (۱۹۹۲ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) چوں کہ عاملین کو خالص صدقہ کے طور پر زکوۃ نہیں ملتی بلکہ بطور اجرت ملتی ہے،اور خالص اجرت بھی نہیں ہے،اس لئے غنی کے لئے جائز اور ہاشمی کے لئے جائز نہیں ہے۔تفصیل گزر چکی ہے۔

مصارف زکوۃ کے بارے میں ایک اہم استفتاء
اور
اس کا جواب

ماہنامہ ''جامعۃ الرشاد'' میں مصارفِ زکوۃ کے بارے میں ایک اہم استفتا شائع ہوا، جو خود تو طویل ہے مگر مستفتی نے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کو ہدایت کی ہے کہ جوابات مختصر مگر مدلل ہونے چاہئیں۔ اس معکوس ہدایت کے ساتھ جن صاحب نے استفتاء شائع کیا ہے وہ خود بھی علم وتحقیق کے مدعی ہیں۔ چنانچہ استفتا کی ہر ہر سطر سے علم وتحقیق کی خودنمائی اور چیلنج کی بلند آہنگی نمایاں ہے۔ یہ استفتا ''جامعۃ الرشاد'' کے ساڑھے سات صفحات پر مشتمل ہے، ابتدا میں ایک تمہید لکھی ہے، پھر دس نمبر تک سوالات قائم کئے ہیں، سوالات میں بے جا تکرار ہے، مستفتی اسے بہت مختصر کر سکتے تھے، مگر وہ کسی قدر غصہ میں محسوس ہوتے ہیں، اس لئے انہیں کچھ احساس نہیں ہوا۔

مستفتی کے ہدایت سے قطعِ نظر کرتے ہوئے ہم اولاً ان کی تحریر کردہ تمہید کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں، اس کے ابتدائی کلمات یہ ہیں:

''مصارفِ زکوۃ میں ایک اہم مصرف فی سبیل اللہ بھی ہے، مگر اس کے مفہوم ومصداق کے بارے میں فقہاء کرام اور علمائے امت کے درمیان کافی اختلاف موجود ہیں''۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ فی سبیل اللہ کے ساتھ ''ایک اہم مصرف'' کی قید لگانے کی کیا ضرورت پیش آئی، کیا کوئی مصرف غیر اہم بھی ہے؟ یا مستفتی یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اس کی اہمیت کو اب تک نظرانداز کیا جاتا رہا ہے، اب اس کا حق ادا کیا جائے گا۔

پھر یہ بھی نرالی بات لکھی کہ ''اس کے مفہوم ومصداق میں کافی اختلاف موجود ہیں'' یہ

مستفتی کا قصورِ فہم ہے، ورنہ فی سبیل اللہ کے نہ مفہوم میں اختلاف ہے، اور نہ مصداق میں، اور جو اختلاف نظر آتا ہے وہ محض سرسری اور لفظی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کا ایک لغوی مفہوم ہے، جو عام ہے۔ چنانچہ صاحب بدائع نے اس کی لغوی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"واما قوله وفی سبیل الله عبارة عن جمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة الله وسبیل الخیرات اذا کان محتاجاً". (بدائع الصنائع ۴۵/۲)

رہا اللہ کا ارشاد "وفی سبیل اللہ" یہ عبارت ہے تمام قربتوں سے، اس میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جو اللہ کی طاعت میں سرگرم ہو اور بھلائی کی راہوں میں کوشاں ہو، بشرطیکہ وہ محتاج ہو۔

علامہ کاسانی نے اس تشریح کے ذریعہ اس کا لغوی معنی بتایا ہے، اور اس لحاظ سے اس میں کارِ خیر کرنے والا ہر شخص داخل ہوگا بشرطیکہ وہ فقر واحتیاج کے ساتھ متصف ہو۔ اس کو مستفتی نے امام کاسانی کا فتویٰ سمجھ لیا، حالانکہ یہ صرف لغوی تشریح ہے، اور اس کے دائرۂ عموم کا اظہار ہے، اس معنی میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

دوسرا اس کا اصطلاحی مفہوم ہے، جو اس کا اصل مصداق ہے، یہ وہی مفہوم ہے جو حضرات صحابہ کرام اور ان کے بعد کے ادوار میں عموماً رائج اور شائع رہا ہے، اور جب مطلق "فی سبیل اللہ" بولا جاتا تھا تو وہی اصطلاحی مفہوم ذہنوں میں آتا تھا، وہ ہے "جہاد فی سبیل اللہ"۔ بعض ائمہ نے ایک حدیث کی روشنی میں اس کے تحت "حاجی" کو بھی داخل کیا ہے لیکن ایسا نہیں کہ مجاہد کو انہوں نے اس میں سے خارج کر دیا ہو، تفصیل آگے آرہی ہے۔ رہا یہ کہ اس سے طالب علم مراد ہے تو یہ اس کی لغوی تشریح کے ذیل میں آتا ہے، اور اس کو خصوصیت سے اس لئے ذکر کر دیا گیا ہے کہ یہ ایک بڑے کارِ خیر کے لئے بالکلیہ منقطع ہوتا ہے، اس لئے اس کو ایک گونہ مجاہد فی سبیل اللہ سے زیادہ مشابہت ہوتی ہے۔

اور یہ جو میں نے ذکر کیا کہ صاحب بدائع نے فی سبیل اللہ کی لغوی تشریح کی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے معاً بعد انہوں نے اس کے اصطلاحی مفہوم ومصداق کی تعیین میں امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال نقل کئے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"وقال ابویوسف المراد منه فقراء الغزاة لان سبيل الله اذا اطلق فی الشرع یراد بہ ذالک، وقال محمد المراد منه الحاج المنقطع" (بدائع الصنائع ۴۶/۲)

امام ابویوسف نے فرمایا کہ اس سے مراد فقراءِ مجاہدین ہیں کیوں کہ سبیل اللہ جب شریعت میں مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے یہی مراد ہوتا ہے، اور امام محمد نے فرمایا کہ اس سے مراد حاجی منقطع ہے۔

درحقیقت صاحب بدائع نے پہلے اس کی لغوی تشریح کی پھر اس کا حقیقی مصداق متعین کیا، اس لئے صاحبِ بدائع کسی نئے فتوے کے موجد نہیں ہیں، ائمہ کی باتوں کو نقل کرتے ہیں۔ ان کا اس مسئلہ میں سرے سے کوئی اختلاف وتفرد نہیں ہے، ان کے اس فتوی کی دہائی مستفتی نے بار بار دی ہے، لیکن لا طائل اور فضول۔ علامہ کاسانی کے قول کی بنیاد پر جتنے سوالات مستفتی نے اٹھائے ہیں سب کا جواب ہوگیا۔ مستفتی نے اپنی دانست میں فی سبیل اللہ کے چار مصداق متعین کئے ہیں، غازی، حاجی، طالب علم اور جمیع امور خیر۔ آپ نے اس کی حقیقت دیکھ لی کہ اصل مصداق غازی ہے، حاجی اگر ہے تو تبعاً داخل ہے، اور طالب علم جمیع امورِ خیر کے تحت داخل ہے، اور جمیع امور خیر اس کا لغوی مفہوم ہے، جس کا اس کے مفہومِ اصطلاحی سے کوئی تعارض وتناقض نہیں ہے، مستفتی نے اپنی دانست کی روشنی میں لکھا ہے کہ:

> "متقدمین نے اپنے دور میں ترجیح اولین دو اصناف کو دی ہے جبکہ متأخرین آخری دو اصناف کی ترجیح کے قائل ہیں"۔

متقدمین ومتأخرین کے بھاری بھرکم الفاظ اور پھر ان کی ترجیحات کو بیان کرکے شاید مستفتی نے یہ تأثر پیدا کرنا چاہا ہے کہ یہ اختلاف متقدمین ہی کے دور سے موجود ہے، ان حضرات کے دور میں بھی اس کے چار مصداق بیان کئے گئے تھے، لیکن متقدمین نے اول کے دو کو ترجیح دی اور متأخرین نے بعد کے دو کو۔ حالانکہ یہ بات سرے سے غلط ہے، متقدمین کے دور میں چار اقوال تھے ہی نہیں، ایک ہی قول تھا، یعنی غازی کا۔ بہت تلاش وجستجو کیجئے گا تو اس کے ضمن میں کہیں کہیں حاجی کا تذکرہ مل جائے گا، غازی کے مصداق ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے،

حاجی کے متعلق چند بزرگوں کے اقوال ہیں،لیکن اسے اختلاف نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ وہ بھی غازی کو فی سبیل اللہ کا مصداق ٹھہراتے ہیں۔ان دونوں کے باب میں ترجیح کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے،متأخرین کے دور میں البتہ لغوی معنی کی بنیاد پر بعض حضرات نے دوسرے افراد کو بھی فی سبیل اللہ کے تحت داخل کرنے کی کوشش کی ہے،ان کا یہ خیال بجا ہے،اگر اس میں شرائطِ اخذِ زکوۃ کا لحاظ رکھا جائے۔اور اس کا لحاظ رکھنے کے بعد ان کا اختلاف کوئی حقیقی اختلاف باقی نہ رہے گا کہ اس میں ترجیح کا سوال پیدا ہو،آخر متأخرین بھی تو غازی کے مصداق ہونے کا انکار نہیں کرتے، صرف اتنا چاہتے ہیں کہ طلبہ وغیرہ جو امورِ خیر کے لئے بالکلیہ منقطع رہتے ہیں انہیں بھی فی سبیل اللہ کے تحت داخل مان لیا جائے،تو فقر کی شرط کے ساتھ کیا مضائقہ ہے کہ انہیں عام فقرا کے مقابلہ میں ایک ممتاز مقام دیدیا جائے۔ان کی تشریحات کو اختلاف کا نام دینا، پھر ان میں ترجیحات کا دعوی کرنا دلیلِ کم نظری ہے،اس طرح کی باتوں سے امت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، اس لئے پرہیز کرنا چاہئے۔

مستفتی نے ان آخری دو اقوال کے لئے اپنے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے کہ اس میں تیس سے زیادہ علما وفقہا کی رایوں کا استقصا کیا گیا ہے جو اسی کے قائل ہیں۔افسوس کہ ہم اس مضمون کی زیارت سے محروم ہیں،ورنہ ہم بھی اپنی معلومات میں اضافہ کرتے،لیکن ہمارے سامنے جو استفتا ہے اس کی تحقیقات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ مضمون میں بھی ایسی ہی جدت طرازیاں ہوں گی،جن کا جلوہ یہاں نظر آرہا ہے، بیچارہ مستفتی خفا ہے کہ ہم نے اتنی تحقیق سے تیس سے زائد علما وفقہا کی رایوں کو جمع کیا ہے’’مگر آج کل کے بعض مقلد جامد قسم کے اہل علم ان سب علما کی رایوں اور ان کے دلائل کو نظر انداز کرتے ہوئے محض پہلے قول پر اڑ گئے ہیں،اور کہتے ہیں کہ یہ جمہور کا مسلک ہے،جس سے ہٹنا جائز نہیں ہے،اور اب اس مناقشے نے اچھے خاصے نزاع کی صورت اختیار کر لی ہے‘‘۔

سبحان اللہ! جہاں کوئی مناقشہ نہ تھا۔وہاں آپ نے غلط لکڑی پھیک کر نزاع کی صورت پیدا کی،اور اب آپ فریاد کرتے ہیں کہ اس مناقشے نے اچھے خاصے نزاع کی صورت اختیار پیدا کر لی ہے۔ ؎ خود ذبح بھی کرے ہے خود لے ثواب الٹا

ایک طرف پوری امت کے علما وفقہا ہیں، جن میں قرون مشہود لہا بالخیر کے سلف بھی ہیں، اوران کے بعد ان کے برگزیدہ جانشیں بھی، کئی صدیوں تک ان تمام حضرات کا اتفاق رہا، ان کے عرصہ دراز کے بعد بقول مستفتی چند ایک حضرات نے اس میں ایک نئی راہ نکالی، اورا کا دکا کچھ لوگ اس کے بھی قائل ہوئے، شدہ شدہ مستفتی کی تلاش وجستجو کے مطابق تیس سے کچھ زائد علما وفقہا ہوئے جنھوں نے فی سبیل اللہ کے مفہوم میں توسیع کو درست اور راجح قرار دیا۔ خیال کیجئے، اتنی بڑی تعداد کا اتفاق جسے سوادِ اعظم کہئے، اجماع امت کہئے، ان کے مقابلے میں محض تیس سے زائد حضرات کی رایوں کا کیا اعتبار؟..... اور یہ بھی ہم مستفتی کی بات تسلیم کر کے کہہ رہے ہیں، ورنہ متأخرین کے اختلاف کی حقیقت ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ محض اختلاف لفظی ہے.... پھر جناب مستفتی نے سوادِ اعظم اور اجماعِ امت کی پیروی کرنے والوں پر مقلد جامد کی پھبتی کسی ہے، خیر یہ تو ایک فیشن ہے، کہ اگر کسی ذہین آدمی کی نئی مگر بے بنیاد تحقیق کو علما تسلیم نہیں کرتے تو وہ جدید محقق ان پر یہ آوازہ کس کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ ''مقلدِ جامد'' ہیں، اور ہم سوچتے ہیں کہ یہ سیال اور ہرجائی قسم کے محققین تو شریعت کی ساری عمارت ہی کو غرقاب کر دینا چاہتے ہیں، ان میں سے ہر شخص ایک نئی راہ نکال کر اس پر چلنے کی دعوت سب کو دینے لگتا ہے، تو اب کس کس کے پیچھے یہ علما دوڑتے پھریں، پھر یہ کہ ان میں سے اکثر کے پاس سوائے بلند بانگ دعوؤں اور لفاظی کے دوسرا کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔ بلاشبہہ ہم جمہور کے مسلک سے انحراف نہیں کر سکتے، اور اقوال شاذہ کو کسی نظریہ وعمل کی بنیاد نہیں بنا سکتے، اس پر ہم کو اصرار ہے، آپ نے جمہور کے خلاف نظریہ پیش کر کے امت میں نزاع وشقاق کی راہ کھولی ہے، اس کی ذمہ داری آپ پر جاتی ہے، امت نے تو اب تک یہی سمجھا تھا کہ فی سبیل اللہ کا مصداق غازی ہے، مزید وسعت دی جائے تو بعض کے بقول حاجی بھی ہے، اور جس نے ان دونوں کے علاوہ کوئی بات کہی وہ یا تو شاذ قرار پائی یا اس میں کوئی تاویل کی گئی ہے، لیکن آپ نے ان شاذ اور مأوّل اقوال کو نظریہ اور تحقیق بنا کر پیش کیا، تو اس کی تردید ضروری ٹھہری کہ یہ تحقیق تحریف کی حد میں داخل ہوگئی، اب نزاع کا دروازہ بند کرنا ہے تو عام علماءِ امت سے مت کہئے کہ جمہور سے انحراف کر کے تیس سے زیادہ علماء کی رائے مان لو، بلکہ آپ سے گزارش ہے کہ ان تیس سے زیادہ (وہ بھی آپ کے بقول) علما کی رائے چھوڑ کر جمہور امت کی

راہ پر آجایئے، سارانزاع ابھی ختم ہوجاتا ہے، سلامتی جمہور کی رائے میں ہے۔ آئندہ بھی اس قسم کی نئی تحقیقات سے گریز فرمائیں، ان بدعات ومحدثات سے دین کو فائدہ نہیں پہونچے گا، نفس وہویٰ کا بازیچہ بن کررہ جائے گا، کسی مسئلہ میں مختلف اقوال کا کتابوں میں نقل ہوجانا کچھ زیادہ اہم نہیں ہے، لیکن اقوالِ شاذہ کی کسی غلط نظریہ کی بنیاد بنا کر اصرار کرنا خطرناک ہے۔

تمہید کے اس تجزیہ میں اکثر سوالات کے جواب ہوگئے۔ البتہ چندا سوالوں کا جواب علیحدہ دینا ضروری ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے صرف غزوہ یا جہاد کے ساتھ مخصوص ہونے کی دلیل کیا ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ ایسے متفق علیہ اور اجماعی قول پر دلیل طلب کرنا سخت باعثِ تعجب ہے، کیا یہ کوئی دلیل نہیں کہ نزولِ قرآن کے عہد میں، اس کے بعد تابعین وائمہ کے عہد میں بالاتفاق اس سے یہی معنی مراد لیا جاتا تھا، ان سب کے ساتھ ایک قول حاجی کے متعلق بھی پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بھی بعض صحابہ کے نزدیک فی سبیل اللہ کا مصداق تھا۔ پس فی سبیل اللہ مجاہد کے ساتھ مخصوص نہ رہا، اس کی حقیقت ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہم واضح کریں گے۔

فی سبیل اللہ کے لغوی معنی میں بے شک بہت وسعت ہے، اور یہ اس لحاظ سے تمام امور خیر کو شامل ہے، لیکن یہ بات بھی بے غبار ہے کہ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے، یہ جب قرائن سے خالی مطلق بولا جاتا ہے تو اس کا مفہوم محض جہاد فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں یہ لفظ بکثرت اس معنی میں استعمال ہوا ہے، اس کی تخصیص کی دلیل اہلِ زبان کا استعمال ہے اور لغت میں اس سے بڑی اور کیا دلیل چاہئے، ائمہ لغت نے اسے صراحۃً ذکر کیا ہے، چنانچہ ''القاموس المحیط'' میں ہے:

''واتفقوا فی سبیل الله ای الجهاد ،و کل ما امر الله به من الخیر و استعماله فی الجهاد اکثر''.

فی سبیل اللہ یعنی جہاد، اور ہر وہ خیر جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور اس کا استعمال جہاد میں زیادہ تر ہے۔

صاحبِ قاموس نے پہلے اس کا وہ معنی بتایا جو عام طور سے اس کا مصداق ہے، پھر وہ معنی بتایا جو لغت کے عموم سے مفہوم ہوتا ہے، مگر پھر صراحت کر دی کہ جہاد ہی کے معنی میں اس زیادہ تر استعمال ہے، اس سے ثابت ہوا کہ بغیر قرینہ کے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کا معنی جہاد ہوگا، اور اگر اس کے خلاف کوئی قرینہ موجود ہوگا تو اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ چنانچہ 'لسان العرب' میں دیکھئے:

وقوله فی سبیل الله ارید به الذی یرید الغزو ولایجد ما یبلغه مغزاة فیعطی من سهمه".

اللہ تعالیٰ کا ارشاد "فی سبیل اللہ" اس سے مراد وہ شخص ہے جو غزوہ کا ارادہ رکھتا ہو، لیکن اس کے پاس اس کے اسباب وسامان نہ ہوں تو اسے زکوۃ میں سے اس کا حصہ دیا جائے گا۔

اس معنی کی تعیین کے بعد پھر عام لغوی معنی کا ذکر کرتے ہیں۔

وکل سبیل ارید به الله عزوجل وهو بر فهو داخل فی سبیل الله".

ہر وہ راہ جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد ہو اور وہ عمل نیکی ہو تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی "تاج العروس شرح قاموس" میں لکھتے ہیں کہ:

وقال ابن الاثیر وفی سبیل الله عام یقع علی کل عمل خالص سلک به طریق التقرب الی الله عز وجل باداء الفرائض والنوافل وانواع التطوعات واذا اطلق فهو فی الغالب واقع علی الجهاد حتی صار لکثرة الاستعمال کانه مقصور علیه". (بحوالہ النہایہ ۳۶۶/۱)

علامہ ابن اثیر نے فرمایا کہ سبیل اللہ عام ہے، ہر اس عمل خالص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے، مثلاً فرائض ونوافل، اور مختلف کارِ خیر کی انجام دہی، اور جب وہ مطلق بولا جاتا ہے تو غالب یہ ہے کہ اس سے مراد جہاد ہوتا ہے، بلکہ وہ اس معنی میں کثرتِ استعمال کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے کہ گویا بس یہی اس کا معنی ہے۔

"شرح کبیر علی المقنع" میں ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں کہ:

"لان سبيل الله عندالاطلاق انما ينصرف الى الجهاد فان كل ما فى القرآن من ذكر سبيل الله انما اريد به الجهاد الااليسير فيجب ان يحمل ما فى آية الزكوة على ذالك لان الظاهر ارادته". (۶۹۸/۲)

سبیل اللہ اطلاق کے وقت جہاد کے معنی میں ہوتا ہے، چنانچہ قرآن میں جہاں جہاں سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے اس سے مراد جہاد ہی ہے، مگر کہیں کہیں۔ اس لئے آیتِ زکوۃ میں سبیل اللہ کو اسی معنی پر محمول کرنا واجب ہے، کیوں کہ ظاہراً اسی کا ارادہ کیا گیا ہے۔

مشہور شافعی عالم ومحقق امام محی الدین نووی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"واحتج اصحابنا بان المفهوم فى الاستعمال المتبادر الى الافهام ان سبيل الله هو الغزو واكثر ماجاء فى القرآن العزيز كذ الك". (المجموع ۲۱۲/۶)

ہمارے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ استعمال میں اس کا متبادر مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد غزوہ ہے، اور قرآن پاک میں زیادہ تر اسی معنی میں آیا ہے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فی سبیل اللہ کا مصداق عرفِ عام میں جہاد ہے، اس کے علاوہ کسی مصداق کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اس پر دلیل کا مطالبہ حیرت کی بات ہے، اس کے علاوہ دوسرے مصادیق کے لئے آپ دلیل دیں تا کہ ان کا جائزہ لیا جا سکے۔

تیسرے سوال میں مستفتی نے فی سبیل اللہ کے غزوہ کے ساتھ مخصوص نہ ہونے پر حضرت ام معقل کی حدیث سے استدلال کیا ہے، یہ حدیث ابوداؤد میں کئی طرق سے مروی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ "ان کے شوہر ابو معقل نے اپنا اونٹ فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا، اس لئے یا تو ام معقل نے خود ہی اسے حج میں استعمال نہیں کیا یا انہوں نے ابو معقل سے مانگا تو انہوں نے فی سبیل اللہ کا عذر بیان کیا، اس پر ان حضرات نے حضور ﷺ سے استفتا کیا تو آپ نے حج کو بھی فی سبیل اللہ قرار دیتے ہوئے اونٹ کو دینے کا حکم دیا"۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ صحابہ کرام کے عرف میں اس کا مصداق کوئی دوسرا معنی علاوہ غزوہ کے، تھا ہی نہیں، اگر ہوتا تو اس عذر ومعذرت اور اس استفتا کی نوبت نہ آتی۔

تاہم یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حج کو فی سبیل اللہ میں شامل کردیا تو اب تو اس میں داخل ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ کے داخل کردینے کے بعد کس کو مجالِ انکار ہوسکتا ہے، لیکن یہ بھی غور کرلینا چاہئے کہ فی سبیل اللہ میں آپ نے اس کو کہاں اور کس مسئلہ میں داخل کیا ہے؟ اگر آپ غور کریں گے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اس حدیث کا تعلق مصارفِ زکوۃ سے نہیں ہے، یہ مسئلہ یا تو وقف کا ہے یا نذر کا ہے، یعنی حضرت ابو معقل نے اس اونٹ کو فی سبیل اللہ نامزد کرنے کی نذر کرلی تھی یا یہ کہ اسے فی سبیل اللہ وقف کیا تھا، اس سے مراد زکوۃ نہیں ہے، کیوں کہ زکوۃ کا مال بیوی کو نہیں دیا جاسکتا۔ اونٹ اموالِ ظاہرہ میں سے ہے، اور اموالِ ظاہرہ کی زکوۃ خود مالک نہیں تقسیم کرتا، اولاً وہ امام کی تحویل میں آتا ہے، پھر وہ اپنی صوابدید سے تقسیم کرتا ہے، پس مستفتی نے اس کے بارے میں زکوۃ کا ہونے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ غلط ہے۔

بہر حال یہ اونٹ فی سبیل اللہ خواہ نذر ہو یا وقف، بہر حال زکوۃ کے مسئلے سے اس کا تعلق نہیں ہے، اسی لئے عموماً صحابہ کرام اور بعد کے بیشتر ائمہ بلکہ ائمہ اربعہ نے فی سبیل اللہ سے مراد غزوہ وجہاد ہی لیا ہے، حج نہیں، ورنہ ان حضرات کے سامنے بھی یہ حدیث موجود تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے زکوۃ کے مصارف میں حج کو نہیں شمار کیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حدیث کا تعلق زکوۃ کے مصارف کے ساتھ نہیں۔ امام مالک نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

”سبیل اللہ کثیرۃ ولکنی لااعلم خلافاً فی ان المرادبسبیل اللہ ھٰھناالغزو“. (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸۷۶/۲)

سبیل اللہ تو بہت ہیں لیکن میرے علم میں اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سبیل اللہ سے مراد یہاں (یعنی مصارفِ زکوۃ میں) محض غزوہ ہے۔

اور اگر کوئی اس سلسلہ میں بعض ائمہ یا بعض حضرات صحابہ کرام کے اقوال سے استدلال کرکے اس پر اصرار کرے کہ حج بھی اس میں داخل ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بابِ زکوۃ میں فی سبیل اللہ کا اصل مصداق تو وہی ہے جس پر بیشتر صحابہ وتابعین وائمہ کا اتفاق ہے، البتہ لغوی معنی کی مناسبت سے حضور اکرم ﷺ نے مسئلہ وقف یا مسئلہ نذر میں چونکہ حج کو بھی اس کے تحت

داخل کر دیا ہے، اسی پر قیاس کر کے ان حضرات نے مصارفِ زکوۃ میں بھی حج کو فی سبیل اللہ کے تحت داخل کر دیا ہے، اس طرح یہ مسئلہ قیاسی بن جاتا ہے، تاہم اس سے مصارفِ زکوۃ کے آٹھ میں منحصر ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیوں کہ حج الگ سے مصرف نہیں ہے، فی سبیل اللہ کے اندر داخل ہو کر مصرف ہے۔

فی سبیل اللہ میں جن حضرات نے حج کو داخل کیا ہے، مستفتی نے ان کی ایک فہرست دی ہے، ان میں چند صحابہ کرام کا نام ہے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابولاس رضی اللہ عنہم۔ تابعین میں حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ بھی اسی فہرست میں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت حسن بصری کے متعلق تو ان کا دعوی درست ہے لیکن باقی حضرات کے متعلق ان کا دعوی محل نظر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام بخاری نے ''یُذکَرُ عن ابن عباس'' کا لفظ لکھا ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ یہ لفظ ضعفِ نسبت پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں نقل کیا ہے کہ امام احمد پہلے زکوۃ کے مال سے غلام خرید کر آزاد کرنے کے قائل تھے مگر پھر اس سے رجوع کر لیا، فرماتے ہیں ''میرے نزدیک ایسا کرنا صحیح نہیں ہے'' لوگوں نے ان کے سامنے حضرت عبداللہ بن عباس کا مذکورہ بالا اثر رکھا تو انہوں نے فرمایا کہ ''اس میں اضطراب ہے''۔ (فتح الباری ۳/۴۲۳)

حضرت امام احمد کے اس قول سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ اثر قابلِ استناد نہیں ہے، پھر کیوں کر اس قول کی نسبت ان کی طرف یقینی ہو سکتی ہے؟۔

حضرت ابولاس کی روایت کے رجال تو ثقہ ہیں، لیکن اس میں ایک راوی ''محمد بن اسحاق'' ہیں، جن کی روایتِ عنعنہ [۱] قابل قبول نہیں ہوتی۔ اور یہ روایت اسی طور پر ہے، اس لئے یہ روایت محل نظر بن گئی، چنانچہ ابن منذر فرماتے ہیں کہ ''اگر ابولاس کی یہ حدیث صحت کے ساتھ ثابت ہو جائے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں گا''۔ (فتح الباری ۲/۴۲۳)

دوسرے یہ کہ حضرت ابولاس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مستفتی کے مزعومہ نظریہ کے قائل ہیں، صحیح نہیں ہے، وہ تو ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ ''**حملنا النبی ﷺ علی ابل الصدقة للحج**''۔ (فتح الباری ۳/۴۲۲)

ہم کورسول اللہ ﷺ نے حج کے واسطے صدقہ کے اونٹوں پر سوار کیا،اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ حضرت ابولاس اس کے قائل تھے کہ فی سبیل اللہ میں حج داخل ہے، بالخصوص جبکہ اس حدیث میں تاویل کا احتمال ہے، کہ ان کے فقیر ہونے کی وجہ سے انہیں ان اونٹوں پر حج کرایا گیا ہو،انہیں بطور ملکیت دیا نہ گیا ہو'۔(فتح الباری ۴۳۲/۳)

مستفتی نے ائمہ فقہ میں امام محمد،امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ کا نام لیا ہے۔

امام محمد تو خیر اس کے قائل ہیں،صاحب فتح الباری نے امام احمد اور امام اسحاق سے ایک روایت اسی طرح کی ضرور نقل کی ہے،لیکن ابھی ہم بتا چکے ہیں کہ امام احمد اس سے رجوع کر چکے ہیں، نیز''شرح کبیر''میں ہے کہ:

''اختلفت الروایة عن احمد فی ذالک فروی عنه انه لا یصرف منها فی الحج ...وهی الاصح''. (شرح کبیر لابن قدامہ ۶۹۸/۲)

امام احمد علیہ الرحمہ سے اس باب میں روایت مختلف ہے،ایک روایت میں ہے کہ اس میں سے حج میں نہیں صرف کیا جائے گا۔

پس امام احمد کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں ہے،علماءِ مجتہدین میں سے امام ابن تیمیہ، علامہ شوکانی اور شاہ ولی اللہ صاحب کو بھی پیش کیا ہے، ہمارے پاس اول الذکر دونوں بزرگوں کی بروقت کوئی تصنیف نہیں ہے،اس لئے ان کے متعلق تو کچھ نہیں عرض کر سکتے ،لیکن حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے متعلق یہ دعوی کہ وہ حج کو فی سبیل اللہ میں داخل مانتے تھے،صحیح نہیں ہے۔شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

''والجملة فی ذالک ان الحاجات من هذاالنوع وان کانت کثیرة جداً لکن العمدة فیها ثلاثة المحتاجون، وضبطهم الشارع بالفقراء والمساکین وابناء السبیل والغارمین فی مصلحة انفسهم ، والحفظة، وضبطهم بالغزاة والعاملین علی الجبایات ''الخ. (حجۃ اللہ البالغہ ۴۵/۲)

مصارفِ زکوۃ کے بارے میں حاصل کلام یہ ہے کہ اگر چہ اس نوع کی حاجات بہت ہیں مگران میں تین پر مدار ہے،اول'محتاج''اور شریعت نے ان کو فقراء ومساکین اور ابن السبیل

نیز اپنی ذاتی منفعت کے اعتبار سے مقروض اور اہل غرامت کے ساتھ مختص کیا ہے۔ دوسرے ''حفظ'' انہیں شریعت نے غازی اور عامل کے نام سے منضبط کیا ہے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد صرف غزاۃ ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ دس علما کی فہرست میں صرف چار کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے حج کو فی سبیل اللہ کے دائرہ میں داخل کیا ہے، اور چار کے بارے میں دعوی کی صحت بہت کچھ مشتبہ ہے، اسی طرح اگر تیس سے زیادہ علما کا تجزیہ کیا جائے تو کیا عجب ان میں سے بہت سے اس فہرست سے خارج ہو جائیں۔

(۴) مستفتی نے سوال کیا ہے کہ ''فتاوی ظہیریہ'' اور ''فتاوی غینانی'' کے رو سے (فی سبیل اللہ سے) مراد طالب علم ہے۔ فتاوی ظہیریہ کے مؤلف قاضی ظہیر الدین بخاری (متوفی ۶۱۹ھ) ساتویں صدی کے عالم ہیں، جن کے فتوی پر اعتماد کرتے ہوئے آٹھ سو سال سے اب تک عمل کیا جا رہا ہے، اور عربی مدرسوں کے طلبہ کو بھی زکوۃ کا مستحق قرار دیا جا رہا ہے، جب کہ اصولی طور پر یہ طبقہ زکوۃ کے آٹھ مصارف میں منصوص طور پر شامل نہیں ہے، تو فی سبیل اللہ کا واحد مصداق غزوہ یہاں کہاں رہا''؟۔

مستفتی کو معلوم ہونا چاہئے کہ ''فتاوی ظہیریہ'' پر اعتماد کر کے نہیں، ان سے بہت پہلے سے خود جناب نبی کریم ﷺ کے دورِ مبارک سے علم کے طالبین کو جن کی ایک خاصی تعداد اصحابِ صفہ میں شامل تھی، زکوۃ کا مستحق قرار دیا جا چکا ہے، اور یہ فی سبیل اللہ میں شامل ہونے کی وجہ سے نہیں، ان کے فقر وغربت کی وجہ سے! جو لوگ حدیث کی کتابوں پر نظر رکھتے ہیں وہ اس بات سے خوب واقف ہیں۔ آج بھی طلبہ کو جو مستحقِ زکوۃ قرار دیا جاتا ہے وہ ان کے فقر واحتیاج کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ ''فتاوی شامی'' میں اس کی تصریح موجود ہے ''درمختار'' میں ہے کہ طالب علم کے لئے اگر چہ وہ غنی ہو زکوۃ لینے کی تصریح بعض حضرات نے کی ہے، اس کی تردید کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:

وهذا الضرع مخالف لاطلاقهم الحرمة فی الغنی ولم یعتمده احد

قلت وهو كذالك والاوجه تقييده بالفقير". (فتاوی شامی ۲/۳۴۰)

یہ جز ئیہ فقہا کے اس قاعدہ کے خلاف ہے کہ غنی کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، اسی لئے اس پر کسی نے اعتماد نہیں کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح ہے اور درست یہ ہے کہ فقیر کے ساتھ وہ مقید ہے۔

اس سوال کے ضمن میں مستفتی نے ایک اور عجیب سوال اٹھایا ہے، فرماتے ہیں کہ ''جن علما نے اس قسم کا (یعنی طلبہ وغیرہ کو فی سبیل اللہ کے تحت داخل کرنے کا) فتوی دیا ہے اور جنھوں نے اس پر عمل کیا، کیا وہ سب دین وشریعت سے منحرف تھے''؟۔

یہ سوال بہت تعجب خیز ہے، کیوں کہ شروع تمہید میں خود مستفتی اس بات کا فیصلہ سنا چکے ہیں کہ فی سبیل اللہ کے مصداق ومفہوم کے سلسلے میں ''اختلافات بنیادی نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں جائز وناجائز کی بحث نہیں پیدا ہوتی بلکہ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ راجح اور مرجوح کی سی ہے''۔

غور کیجئے، جناب مستفتی خود اس اختلاف کو فروعی قرار دیتے ہیں، اور یہ کہ اس میں جائز وناجائز کی بحث نہیں پیدا ہوتی، پھر فروعی اختلاف کا حوالہ دے کر اتنا سنگین سوال اٹھانے کا کیا موقع ہے کہ ''کیا یہ علماء، دین وشریعت سے منحرف تھے''؟ کیا جس چیز میں اختلاف کی وجہ سے جائز وناجائز تک کی بحث نہیں پیدا ہوتی اس کے کسی ایک پہلو کو لے کر کسی کو دین وشریعت سے منحرف قرار دیا جاسکتا ہے؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ ان فروعی مسائل پر اختلاف کی بنیاد پر اتنا سخت فتوی کیوں لینا چاہتے ہیں؟۔ یاللعجب

پھر ایک سوال اور بھی بے معنی سا کیا ہے کہ ''ہمارے علماء کرام کیوں آٹھ سو سال تک خاموش رہے؟ بلکہ خاموشی سے عمل کرتے رہے''؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے تحقیق کر لی ہے آٹھ سو سال تک تمام علما خاموش رہے ہیں؟ کاش آپ شامی وہیں پڑھ لئے ہوتے جہاں سے فتاوی ظہیریہ کا یہ فتوی نقل کیا ہے، تو آپ کو پتہ چل جاتا کہ اس پر اعتراض کیا گیا ہے، اور اعتراض بھی معقول ہے، کچھ تو آگے پیچھے دیکھ لیا جاتا ہے۔

(۷) علما اگر فقر واحتیاج کے ساتھ متصف ہوں گے تو وہ بھی مستحقِ زکوۃ ہوں گے؟۔

یہ تو بدیہی بات ہے،اسے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟۔اس سوال کے ذیل میں بھی مستفتی نے ایک عجیب سوال قائم کیا ہے،فرماتے ہیں کہ ''یہ جو کہا جاتا ہے کہ زکوۃ کی رقم صرف طلبہ کے خورونوش ہی پرصرف کی جائے،اس کی دلیل کیا ہے''؟۔

سبحان اللہ! عجیب سوال ہے، بے سر پیر کا،کس نے دعوی کیا ہے کہ زکوۃ کی رقم صرف طلبہ کے خورد ونوش پر ہی صرف کی جائے، پہلے مستفتی اس سوال کی وضاحت کریں، پھر جواب کا مطالبہ کریں۔

(۸) امام کاسانی کا یہ فتوی کہ فی سبیل اللہ میں تمام امورِ خیر شامل ہیں،صرف غازی کے شامل ہونے کے خلاف نہیں ہے،دونوں کا محل الگ الگ ہے،ایک میں اس کا مفہومِ اصطلاحی اور مصداق بتایا گیا ہے۔اور دوسرے میں اس کا مفہومِ لغوی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔اگر کوئی امام کاسانی کے فتوی کی بنیاد پر موجودہ دور میں دینی خدمت گاروں کو بھی فی سبیل اللہ میں داخل کرے،اور وہ لوگ اپنے فقر کی وجہ سے زکوۃ کے مستحق ہوں تو اسے کون گمراہ یا دین سے منحرف قرار دینے کی جرأت کرسکتا ہے؟لیکن اگر کوئی شخص یہ فتوی دینے لگے کہ یہ دینی خدمتگار باوجود غنا کے زکوۃ لینے کے مستحق ہیں یا دینی خدمات سے متعلق ضروریات مثلاً تعمیر،اشاعت،تنخواہ اور دوسرے منصوبوں میں زکوۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے تو بے شک یہ گمراہی اور دین سے انحراف ہے،کیوں کہ باوجود غنا کے عاملین اور مؤلفۃ القلوب اور بعض ائمہ کے نزدیک غازی کے علاوہ کسی کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی،اسی طرح زکوۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک بنیادی شرط ہے،زکوۃ کے مصارف امورِ خیر نہیں ہیں۔اس کے مصارف اشخاص وافراد ہیں،جب تک کسی شخص کی ملکیت میں زکوۃ کی رقم نہیں پہونچے گی ایتاءِ زکوۃ کا معنی پورا نہیں ہوگا،اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ان حدوں کو توڑنا بلاشبہہ گمراہی ہے۔آپ شوق سے دینی خدمتگاروں کو فی سبیل اللہ کا تمغہ امام کاسانی کے فتوے کے سہارے دیں،لیکن اگر اسی بنیاد پر آپ نے یہ کوشش کی یہ خدمتگار غنی ہوں، جب بھی ان پر زکوۃ صرف کی جائے یا ان کے ایسے پراگراموں اور ضروریات پر بھی جن میں تملیک نہیں پائی جاتی،زکوۃ صرف کی جائے،تو یہ امام کاسانی کے فتوی سے انحراف اور جمہورِ امت سے بغاوت ہے۔اس لئے آپ کا یہ قول شاذ اور مردود قرار پائے گا،اس سے جو لوگ موافقت نہ

کریں، انہیں آپ مقلد قسم کے علما کہہ لیں، یہ تقلید تو ہمارے لئے باعث نجات اور سرمایۂ سعادت ہے، یہ حضرات دین میں راسخ القدم ہیں، انہیں سے دین کی حفاظت ہے، ورنہ مجتہد قسم کے علما تو دین کو نہ جانے کس منڈی میں فروخت کرآئیں۔

(۹) اس سوال میں فضول دعاوی اور مہمل تکرار کی کثرت ہے، البتہ دو باتیں اس میں نئی ذکر کی ہیں، اور دونوں میں مستفتی نے غلطی کی ہے، اول طالب علم اور علما کو فی سبیل اللہ میں داخل کرنے کے لئے ایک حدیث پیش کی ہے، اور بزعم خود ایک منصوص دلیل فراہم کردی، حدیث یہ ہے:

"من دخل فی مسجد نا هذا لیتعلم خیراً اویعلمه کان کالمجاهد فی سبیل الله". (ابن حبان، مسند احمد، مستدرک حاکم)

جو شخص ہماری اس مسجد میں اس لئے داخل ہوا کہ خیر سیکھے یا سکھائے، وہ مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔

تعجب ہے کہ طالب علم یا عالم کو حضورﷺ نے مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ تشبیہ میں مشبہ، مشبہ بہ کے اندر داخل نہیں ہوتا ہے، ورنہ تشبیہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ فی سبیل اللہ تو مجاہد ہے، اور طلبہ وعلما ان کے مشابہ ہیں، وہ خود فی سبیل اللہ میں داخل نہیں ہیں۔ یعنی باعتبار مفہوم اصطلاحی کے۔ مفہومِ لغوی کے اعتبار سے ان کے فی سبیل اللہ میں داخل ہونے کا منکر ہی کون ہے؟۔

اور اگر مستفتی کی منطق استعمال کی جائے یعنی لفظ کے صرف ظاہری لغوی معنی کو لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ "حضور نے ہر طالب علم اور ہر عالم کو یہ بشارت کب دی ہے؟ یہ بات اس شخص کے لئے فرمائی ہے جو آپ کی مسجد میں یعنی مسجد نبوی میں داخل ہو' یہاں کیا "**فی مسجدنا هذا**" اپنے ظاہری اور لغوی معنی پر نہیں ہے؟۔

دوسری بخاری ومسلم کی ایک روایت سے استدلال ہے، جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہﷺ نے جنگ خیبر کے موقع پر ایک مقتول کا خوں بہا زکوۃ کے اونٹوں سے ادا کیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ" حافظ ابن حجر نے اس کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ قاضی عیاض کے بیان کے

مطابق بعض علما مصالح عامہ میں زکوۃ صرف کرنا جائز سمجھتے ہیں، ان کی دلیل یہ اور دوسری حدیث ہے"۔(فتح الباری ۱۱/۱۴۸)

افسوس مستفتی کو فتح الباری میں صرف اتنا ہی نظر آیا کہ قاضی عیاض نے بعض علما کا ایسا ایسا قول نقل کیا ہے، اس کے علاوہ گویا اور کچھ لکھا ہی نہیں ہے۔ جس بات کو صاحب فتح الباری نے سب سے زیادہ ناقابل اعتنا سمجھا تھا وہی مستفتی کے یہاں سب سے اہم ہوگئی، نہ جانے یہ بعض علما کون صاحب ہیں؟ کیا ایسے ہی مجہول علما کی تقلید کرنے میں آدمی جامد تقلید سے آزاد ہوتا ہے۔

اس کے متعلق بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ اس حدیث میں "**فواده من ابل الصدقة**" کا جو لفظ آیا ہے وہ صرف سعید بن عبید کی روایت میں ہے، ورنہ ان کے علاوہ اور بھی کئی ثقہ راویوں سے یہ روایت دوسرے الفاظ سے مروی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ۔

"وفی رواية ابی ليلیٰ "فواده من عنده" وفی رواية يحيیٰ بن سعيد "فعقله النبیﷺ من عند ه" وفی رواية حماد بن سلمه" من قبله" وفی رواية الليث عنه "فلما رأى ذالک النبیﷺ اعطى عقله". (فتح الباری ۱۲/۲۸۹)

ابولیلیٰ کی روایت میں "فواده من عنده" (یعنی اپنے پاس سے دیت ادا کی) کا لفظ ہے، اور یحییٰ بن سعید کی روایت میں بھی یہی معنی ہے، اور حماد بن سلمہ کی روایت میں "من قبلہ" کا لفظ ہے، جو سابق روایت کے ہم معنی ہے، اور لیث کی روایت میں صرف یہ ہے کہ "حضورﷺ نے دیت ادا کی"۔

مسلم شریف میں امام مسلم نے اپنے دستور کے مطابق متعدد طرق سے اس روایت کو ذکر کیا ہے، اور ہر ایک کا مضمون یہی ہے کہ "آپ نے اپنے پاس سے دیت ادا کی" صرف یہی ایک طریق یعنی "سعید بن عبید عن بشیر بن یسار" ایسا ہے جس میں یہ ہے کہ آپ نے صدقہ کے اونٹوں سے دیت ادا کی۔ حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ "بعض حضرات نے اسے سعید بن عبید کی غلطی قرار دیا ہے (فتح الباری ۲/۲۹۰) اور بعض حضرات نے دونوں طرح کی روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ دیت تو آپ نے اپنے پاس سے ہی ادا کی ہے، لیکن غالباً بیت المال سے

صدقہ کے اونٹوں کوخرید کردیا، یا بیت المال کے ان اموال سے دیا جومصالح عامہ کے لئے متعین ہوتے ہیں، لیکن چونکہ بلا معاوضہ ملا ،اس لئے اسے صدقہ سے تعبیر کردیا۔غرض یہ کہ صدقہ کا مصرف چونکہ دیت نہیں ہے،اس لئے بہر حال ''من اہل الصدقہ'' کی تاویل کرنی ہوگی ،یا اسے غلطی قرار دینا ہوگا، یہی صحیح طریقہ ہے۔یہ نہیں کہ ''من اہل الصدقہ'' کو اصل قرار دے کر قرآن وحدیث میں تحریف کا دروازہ کھولا جائے۔

حافظ ابن حجر نے بے شک قاضی عیاض کے حوالے سے کسی عالم کا نظریہ نقل کیا ہے کہ ''زکوۃ کی رقم مصالح عامہ پر صرف کی جاسکتی ہے''اور یہ بھی صحیح ہے کہ امام نووی نے شافعیہ میں سے ابواسحاق مروزی کا یہی قول نقل کیا ہے،لیکن یہ قول شاذ ہے،اس کی پیروی درست نہیں ہے،ان تفردات کو پڑھ لیجئے ،ان سے استدلال نہ کیجئے۔

(۱۰) امام کاسانی کی تشریح لغوی جسے آپ فتویٰ قرار دینے پر مصر ہیں،اس میں'' **اذا کان محتاجاً**'' کی شرط لگی ہوئی ہے،یعنی وہ محتاج ہو،غنی نہ ہو۔دوسرے یہ کہ اس میں تملیک بھی شرط ہے، چنانچہ انہوں نے زکوۃ کی تعریف میں '**یتملکه من الفقراء**' لکھا ہے(بدائع الصنائع ۳۹/۲) یعنی فقیر کو مالک بنادینا،اور پھر اس کی تفریعات میں لکھتے ہیں کہ۔

''**وعلى هذا يخرج صرف الزكوة الى وجوه البر من بناء المساجد والرباطات والسقايات واصلاح القناطر وتكفين الموتى ودفنهم انه لم يوجد التمليك اصلاً**''. (بدائع الصنائع ۳۹/۲)

اسی پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ اگر کسی نے زکوۃ کی رقم مصارفِ خیر مثلاً مسجدوں یا مسافر خانوں یا پانی کی سبیل کی تعمیر یا پلوں کی درستگی اور مردوں کی تکفین وتدفین میں صرف کی تو یہ جائز نہیں ہے، کیوں کہ تملیک سرے سے نہیں پائی گئی۔

ان دونوں شرطوں کو نظر انداز نہ کیجئے، پھر کسی بھی اہل علم کو جو کسی علمی اور دینی خدمت میں مشغول ہو،زکوۃ دیجئے ،کون کہتا ہے کہ ایسے اشخاص وافراد کو زکوۃ لینی درست نہیں ہے۔امام کاسانی کی ایک عبارت کی تکرار،اور دوسری عبارتوں سے اغماض کا کیا معنی؟ان کی پوری بات سامنے رکھئے تو جمہور سے الگ ان کا کوئی فتویٰ نہیں۔

آخر میں مستفتی نے ایک نوٹ لکھا ہے،اس نوٹ [کے] لکھنے کی وجہ نہیں سمجھ میں آئی، فرماتے ہیں:

''واضح رہے کہ اس موقع پر غناء اور تملیک کی بحثیں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں، جو محض ضمنی نوعیت کی ہیں۔اصل بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اہل علم جو علم دین کی تعلیم یا تدریس یا اس کی نشر واشاعت میں مشغول ہیں، وہ زکوۃ کے مستحق ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ خواہ وہ فقرا و مساکین کے مصرف میں داخل سمجھے جائیں یا فی سبیل اللہ کے مصرف میں''؟۔

اس نوٹ کو پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ موصوف غنا اور تملیک وغیرہ کے قصہ کو سرے سے ختم کر دینا چاہتے ہیں، ورنہ یہ دونوں چیزیں مصارف زکوۃ میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے علاوہ باقی مصارف میں احتیاج وفقر شرط اول ہے، باقی اوصاف امتیازی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں،اور تملیک کے بغیر زکوۃ کی ادائیگی کا تصور ہی نہیں ہوسکتا، پھر نہ جانے کیا مصلحت ہے کہ ان دونوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ''یہ چنداں اہمیت نہیں رکھتیں''۔ ؎ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے مقصد کی راہ میں یہی دونوں باتیں رکاوٹ ہوں، اس لئے آپ ان کی اہمیت گھٹا کر مصارف کے مضبوط حصار میں کوئی دراڑ پیدا کرنا چاہتے ہوں۔اگر ایسا ہے (اور خدا کرے ایسا نہ ہو) تو آپ جمہور امت سے کٹ کر فکری انتشار کا باعث بن رہے ہیں، اس سے باز آیئے۔

والسلام علی من اتبع الهدیٰ

اعجاز احمد اعظمی

۱۶رمحرم الحرام (۱۴۱۳ھ)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) ''عنعنہ'' کا مطلب یہ ہے کہ راوی بجائے ''حدثنا'' (ہم سے بیان کیا) کے ''عن فلان'' کہے، بعض کمزوریوں کی وجہ سے کچھ راویوں کا یہ طرز بیان حدیث کو نا قابل استناد بنا دیتا ہے۔

مسئلہ رفع یدین

پاکستان سے ایک مولوی صاحب ''برکت اللہ'' نامی آئے، اصلاً وہ ''بزرگا'' ضلع غازی پور کے باشندے ہیں، طبیعت میں تیزی اور خودرائی بہت تھی، علم معمولی، عقل ضرورت سے کم، زبان آوری از بس زیادہ۔ رفع یدین کے مسئلہ پر غازی پور میں ہنگامہ برپا کردیا۔ دعویٰ یہ تھا کہ ترکِ رفع یدین کیلئے احادیث میں کوئی دلیل نہیں ہے، اور بدونِ رفع یدین کے نماز نہیں ہوتی، اس سلسلے میں ایک استفتاء مدرسہ میں موصول ہوا، حسبِ ذیل جواب لکھا گیا۔ (اعجاز احمد اعظمی)

نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت تو بالاتفاق رفع یدین مسنون ہے، اس کے بعد رکوع میں جاتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت اور سجدوں سے اٹھ کر رفع یدین کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، اور روایتوں میں دونوں عمل یعنی رفع یدین اور ترک رفع یدین کا ذکر آتا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک رفع یدین کا معمول ہے، اور امام اعظم ابوحنیفہ اور دیگر علماء کوفہ مثلاً سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ کے نزدیک ترک رفع یدین معمول بہ ہے، امام مالک رحمہ اللہ سے بھی مشہور روایت یہی ہے کہ رفع یدین نہ کیا جائے، **کمانقلہ النووی**۔

رفع یدین کی حیثیت:

بہرکیف اختلاف صرف مسنونیت میں ہے، رفع یدین نماز کے ارکان میں سے کسی کے نزدیک نہیں ہے، لہٰذا اس کے کرنے نہ کرنے کی بنیاد پر نماز نہ ہونے کا فتویٰ صادر کرنا بڑی جسارت کی بات ہے، اور پوری امت کی مخالفت ہے، رہا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ترک رفع یدین،

رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، تو یہ ایک صریح غلطی ہے، ترک رفع یدین کا عمل خود رسول اللہ ﷺ اور متعدد صحابہ سے ثابت ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر تمام احادیث کو یکجا کر کے غور کیا جائے، اور رُوحِ نماز کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے، نیز یہ بھی پیشِ نظر رکھ لیا جائے کہ ابتداء اسلام میں نماز کے اندر پابندیاں کم تھیں، جوں جوں لوگ عبادات کے خوگر اور اسلام سے مانوس ہوتے گئے، نماز میں حدود وقیود کا اضافہ ہوتا گیا، اگر ان سب امور کو مدنظر رکھا جائے تو ترکِ رفع یدین کو ترجیح حاصل ہوگی، اور رفع یدین کا مسئلہ منسوخ ثابت ہوگا، لیکن ترجیح کا مسئلہ ایک طویل بحث کا طالب ہے، اس لئے ہم اس سے صرفِ نظر کر کے صرف وہ نقول وآثار لکھے دیتے ہیں، جن سے ترکِ رفع یدین کا ثبوت ملتا ہے۔

نبی کی نماز:

حضرت علقمہ ایک مشہور اور جلیل القدر تابعی ہیں، انہیں بیک وقت امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر دو کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

قال عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: ألا أصلی بکم صلوٰۃ رسول اللہ ﷺ فصلیٰ فلم یرفع یدیہ إلا فی أول مرۃٍ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ والی نماز پڑھاؤں؟ پھر آپ نے نماز پڑھی، اور اپنے دونوں ہاتھوں کو پہلی مرتبہ کے بعد پھر نہیں اٹھایا۔

یہ روایت ترمذی، ابوداؤد اور نسائی میں ہے، اور صحیح ہے۔ علامہ ابن حزم نے اس کی تصحیح کی ہے، امام ترمذی نے اپنی کتاب میں اسے حسن قرار دیا ہے، امام نسائی کی سند کو علامہ ہاشم مدنی نے ''**کشف الرین عن مسئلۃ رفع الیدین**'' میں لکھا ہے کہ شرط شیخین (امام بخاری ومسلم) کے مطابق ہے۔

دیکھ لیجئے! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے شب وروز کے رفیق ہیں، **صاحب النعلین والعصا** (پاپوش وعصابردار) **صاحب السواک والمطھرۃ** (مسواک اور لوٹا ساتھ لے کر چلنے والے) ہیں، قدیم الاسلام ہیں، احادیث میں آپ کے فضائل ومناقب بکثرت ہیں، رسول اللہ ﷺ کے معتمد ومقرب ہیں، ان سے علم حاصل کرنے کی آپ نے ترغیب

دی ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو آپ کو اور آپ کی ماں کو جناب رسول اللہ ﷺ کے درِ دولت پر اس کثرت سے حاضری دیتے دیکھا کہ انھیں اہل بیت میں سے سمجھنے لگے، یہ تفصیلات بخاری میں موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا معلم بنا کر انھیں بھیجا، یہ عبداللہ بن مسعود اپنے شاگردوں کو رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر نماز پڑھانا سکھاتے ہیں، اور بجز پہلی بار کے دوبارہ رفع یدین نہیں کرتے، اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے اس موقع کے علاوہ رفع یدین نماز میں بالکل ثابت نہیں ہے۔ اہل بصیرت دیکھ لیں کہ حضور ﷺ سے ترک رفع یدین کا ثبوت فراہم ہوا یا نہیں؟ کیا خدانخواستہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور کا نام لے کر آپ کے خلاف نماز پڑھنے کی تعلیم دی؟ نعوذ باللہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حالات کا جاننے والا تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، وہ لوگ دیوانے ہیں جو ایسے جلیل القدر اور علم سے معمور صحابی پر کسی قسم کا الزام لگاتے ہیں۔

تہمت بے جا:

بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کا عمل (رفع یدین) بھول گئے، حیرت ہے، عبداللہ بن مسعود زندگی بھر حضور کے پیچھے نماز پڑھتے رہے، پانچوں نمازوں میں رفع یدین کا عمل بار بار دہرایا جاتا رہا، اور خود عبداللہ بن مسعود صحابہ کے ایک جم غفیر کے ساتھ رفع یدین کرتے ہیں، پھر فرائض ہی تک معاملہ محدود نہ تھا، نوافل میں بھی یہ کام ہوتا رہا، لیکن اچانک ایسا ہوا کہ رسول للہ ﷺ کے بعد عبداللہ بن مسعود یہ عمل فراموش کر گئے اور فراموشی بھی کیسی؟ ایسی کہ زندگی بھر پھر یاد نہ آیا، نہ خود آیا اور نہ کسی کے یاد دلانے سے یاد آیا؟ کیا اس بات کو ابتدائی عقل بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہے، ایک روز کی بات ہوتی تو بھولنے کا امکان تھا، زندگی بھر کا عمل کیسے بھلایا جاسکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ نسیان کا الزام دھرنے والوں نے فطرت انسانی سے اس درجہ بے خبری کا ثبوت دیا ہے، جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل:

حضرت اسود بھی ایک جلیل القدر اور عظیم المرتبت تابعی ہیں، انھیں بھی امیر المومنین عمر بن الخطاب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی شاگردی کا شرف حاصل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

رأیت عمر بن الخطاب یرفع یدیه فی اول تکبیرةٍ۔

میں نے حضرت عمر بن خطاب کو دیکھا کہ صرف پہلی تکبیر میں ہاتھ اٹھاتے تھے۔

یہ اثر امام طحاوی نے اور امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے، اور صحیح ہے۔

حضرت عمر بن خطاب وہ ہیں کہ عبادات تو کجا عادات ومعاشرات میں بھی رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے سرمو انحراف انھیں گوارا نہ تھا۔ نماز میں ایک ہی مرتبہ رفع یدین کرتے ہیں، اس سے کچھ ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل:

حضرت عاصم بن کلیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ:

ان علیاً کان یرفع فی اول تکبیرةٍ من الصلوٰة ثم لایرفع۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کی صرف پہلی تکبیر میں ہاتھ اٹھاتے تھے، پھر نہیں اٹھاتے تھے۔

حضرت علی کا یہ اثر امام طحاوی نے، امام ابوبکر بن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے نقل کیا ہے، اس کی اسناد صحیح ہے، حافظ ابن حجر نے اس کے رجال کو ثقہ قرار دیا ہے، (درایہ) علامہ عینی نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔

یہ چوتھے خلیفہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں شعور کی آنکھیں کھولی ہیں، آپ کے محبّ ومحبوب ہیں، آپ کے چچازاد بھائی اور داماد ہیں، ان کا عمل بھی ترک رفع یدین ہی کا ہے، اس سے بھی کچھ ثابت ہوا یا نہیں؟۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد اور معتمد تابعی حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ:

صلیت خلف ابن عمر فلم یکن یرفع یدیہ إلا فی التکبیرة الاولیٰ من الصلوٰة.

میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے، وہ نماز کی تکبیر اولیٰ کے علاوہ اور کسی جگہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

یہ اثر بھی امام طحاوی نے امام ابوبکر بن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے نقل کیا ہے، اور صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن سے رفع یدین کی روایت منقول ہے، لیکن خود ان کا عمل انھیں کے ایک معتمد شاگرد یہ نقل کرتے ہیں کہ وہ رفع یدین پر عامل نہ تھے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ خود اپنی روایت پر عمل نہیں کرتے تھے، اس سے روایت کے منسوخ ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

تلامذۂ ابن مسعود وعلی رضی اللہ عنہما کا اجماعی عمل:

امام ابوبکر بن شیبہ حضرت ابواسحاق سے نقل کرتے ہیں کہ:

قال: کان أصحاب عبد اللہ و أصحاب علی لایرفعون أیدیھم إلا فی افتتاح الصلوٰۃ قال ثم لایعودون۔

انھوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی کے تلامذہ اپنے ہاتھوں کو بجز تکبیر اولیٰ کے اور کسی موقع پر نہیں اٹھاتے تھے۔

علامہ ابن الترکمانی نے الجوہر النقی میں فرمایا ہے کہ "**ھٰذا أیضاً سند صحیح جلیل**".

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی کے شاگرد ترک رفع یدین پر متفق ہیں۔

کوفہ کی اہمیت:

اور ایک یہی کیا، تقریباً تمام علماء کوفہ ترک رفع یدین کے قائل ہیں، جیسا کہ امام ترمذی نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، اور امام محمد بن نصر مروزی نے لکھا ہے کہ:

لانعلم مصراً من الامصار ترکوا بإجماعھم رفع الیدین عند الخفض إلا أھل الکوفۃ ۔ ہم کسی ایسے شہر کو نہیں جانتے جہاں کے تمام لوگوں نے بالاتفاق رفع الیدین ترک کیا ہو، بجز اہل کوفہ کے۔ (حاشیہ موطا نقلاً عن الاستذکار، بحوالہ فیض الباری، ج:۲)

کوفہ وہ مقام ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت ہی سے علم دین کا مرکز چلا آرہا ہے۔ دولابی نے "الاسماء والکنیٰ" میں لکھا ہے کہ "تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کوفہ میں فروکش ہوئے" سوچنے کی بات ہے کہ کوفہ میں دین وشریعت کا علم انھیں اصحاب کرام سے پھیلا، لوگوں نے نماز

وعبادات کا طریقہ وانداز انھیں حضرات سے اخذ کیا، اور یہاں کے تمام علماء ترک رفع یدین پر متفق ہیں، کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ عمل کی یہ صورت تلامذہ میں اساتذہ ہی سے منتقل ہوئی تھی، اور کیا اس کو کوئی باور کرسکتا ہے کہ تمام اساتذہ تو رفع یدین کیا کرتے تھے، اور سب شاگردوں نے مل کران کے عمل کے خلاف پر اتفاق کرلیا ہو۔

خلفائے راشدین کا عمل:

خلفائے راشدین میں سے دو (یعنی حضرت عمر اور حضرت علی) کا عمل تو آپ دیکھ چکے ہیں، رہے حضرت ابوبکر وحضرت عثمان تو ان سے بھی کسی صحیح اور صریح روایت سے رفع یدین ثابت نہیں ہے، اور جن روایتوں سے یہ عمل ثابت کیا جاتا ہے، ان میں سے بعض تو صحیح نہیں ہیں، اور جو صحیح ہیں ان میں رفع یدین کی صراحت نہیں ہے۔

ایک مرفوع روایت:

ایک روایت اور سنئے! یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ اس لئے سند پر بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ لکھتے ہیں:

عن ابی هريرة أن رجلاً دخل المسجد يصلي ورسول الله ﷺ جالس في ناحية المسجد فجاء فسلم عليه فقال له : إرجع فصلِّ فإنك لم تصلِّ فرجع فصلىّٰ ثم سلم فقال وعليك إرجع فصلِّ فإنك لم تصل قال في الثالثة فاعلمني قال إذا قمت إلى الصلوٰة فاسبغ الوضوء ثم استقبل القبلة فكبر واقرأ بما تيسر معك من القرآن ثم اركع حتىٰ تطمئن راكعاً ثم اركع رأسك حتىٰ تعتدل قائماً ثم اسجد حتىٰ تطمئن ساجداً ثم ارفع حتىٰ تستوي جالساً ثم اسجد حتىٰ تطمئن ساجداً ثم ارفع حتىٰ تستوي قائماً ثم افعل ذٰلك في صلوٰتك كلها، وزاد الترمذي والنسائي وابوداؤد، فإذافعلت ذٰلك فقد تمت صلوٰتك وإن انتقصت منه شيئاً انتقصت من صلوٰتك۔

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے داخل ہوا، رسول اللہ ﷺ مسجد کے ایک گوشے میں تشریف فرما تھے، نماز سے فارغ ہوکر اس نے آپ کی خدمت

میں حاضر ہوکر سلام کیا، آپ نے فرمایا جاؤ نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ گیا دوبارہ نماز پڑھ کے لوٹا اور سلام کیا، آپ نے جواب دے کر ارشاد فرمایا جاؤ نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی، ایسا ہی تین بار ہوا، تیسری بار اس نے عرض کیا کہ مجھے طریقہ بتائیے، آپ نے فرمایا کہ جب تم نماز کا ارادہ کرو تو پورے طور پر وضو کرو، قبلہ رُو کھڑے ہوجاؤ، تکبیر تحریمہ کہو، قرآن میں سے جو کچھ تمہیں بسہولت ممکن ہو پڑھو، پھر رکوع کرو اور اطمینان سے کرو، پھر رکوع سے سر اٹھاؤ اور اطمینان سے کھڑے ہوجاؤ، پھر سجدہ کرو اور اطمینان سے کرو، پھر سر اٹھا کر سکون کے ساتھ بیٹھ جاؤ، پھر باطمینان سجدہ کرو، پھر سر اٹھا کر سیدھے کھڑے ہوجا، اور ایسا ہی پوری نماز میں کرو۔ امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد نے اس روایت میں اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ''جب تم نے اتنا کرلیا تو تمہاری نماز مکمل ہوگئی، اور اگر اس میں کچھ کمی کی تو تمہاری نماز ناقص ہوئی''۔

دیکھئے! اس میں رسول اللہ ﷺ ایک ایسے شخص کو جو بخوبی نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں جانتا، نماز سکھا رہے ہیں، اور وضو سے شروع کر کے تمام ارکان بالتفصیل بتا جاتے ہیں، اور رفع یدین کا ذکر نہیں کرتے۔ اگر رفع یدین ایسا ہی ضروری امر ہوتا کہ اس کے بغیر نماز درست نہ ہوتی، تو تعلیم کے موقع پر اسے ہرگز نہ چھوڑتے، بلکہ لازماً ذکر کرتے، کیونکہ آگے آپ ارشاد فرمارہے ہیں کہ اتنا کرلیا تو نماز مکمل ہوگئی، اور اس میں کمی کی تو نماز ناقص ہوئی۔ معلوم ہوا کہ رفع یدین نہ کرنے کی صورت میں نماز مکمل ہوجاتی ہے، ورنہ اس کا کیا مطلب کہ اتنی تفصیل کے باوجود رفع یدین کا ذکر تک آپ نے نہیں کیا، سمجھنے والوں کے لئے ترکِ رفع یدین کے لئے یہ بہت واضح دلیل ہے اور جھگڑنے والوں کے لئے بڑی سے بڑی دلیل بے کار ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی علیہما الرحمہ کی گفتگو:

اخیر میں میں جی چاہتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی ایک ملاقات اور باہمی گفتگو نقل کردوں، جو مسند ابی حنیفہ میں حضرت سفیان بن عیینہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ:

''امام اعظم ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی ملاقات مکہ مکرمہ میں دار حناطین میں ہوئی، امام اوزاعی نے سوال کیا کہ آپ لوگ نماز میں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت

رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ اس وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلے میں کوئی صحیح چیز منقول نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا کہ کیوں نہیں، مجھ سے زہری نے بیان کیا، ان سے سالم نے، ان سے ان کے والد عبداللہ بن عمر نے، اور وہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ جب نماز شروع کرتے، جب رکوع میں جاتے، اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ ہم سے حماد نے بیان کیا، ان سے براہیم نے، ان سے علقمہ اور اسود نے اور وہ عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بجز تکبیر تحریمہ کے کسی اور جگہ ہاتھ نہ اٹھاتے تھے، امام اوزاعی نے فرمایا کہ میں آپ سے عن **زھری عن سالم عن ابیه** روایت کرتا ہوں، اور آپ **حدثنی حماد عن ابراهیم** کہتے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ حماد، زہری سے بڑھ کر فقیہ ہیں، اور ابراہیم سالم سے زیادہ، اور علقمہ حضرت عبداللہ بن عمر سے تفقہ میں کم نہ تھے گو کہ حضرت ابن عمر کو صحابیت کی فضیلت حاصل ہے، تو اگر ان کو یہ فضیلت حاصل ہے تو اسود کو اور فضیلتیں حاصل ہیں، اور رہے عبداللہ بن مسعود، تو وہ عبداللہ بن مسعود ہی ہیں، اس پر امام اوزاعی خاموش ہو گئے''۔ (زجاجۃ المصابیح، ج:۱)

واضح ہو کہ اس روایت میں امام صاحب نے جو فرمایا کہ رفع یدین کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح چیز منقول نہیں ہے، اس کا مطلب محدثین کی اصطلاح ''صحیح'' کے دائرے میں نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ترک رفع یدین جس قوت کے ساتھ ثابت ہے، رفع یدین کا ثبوت اس درجہ کا نہیں ہے، جیسا کہ خود اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

۴؍جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ

ماخذ: ماہنامہ ضیاء الاسلام۔ اپریل (۲۰۰۸ء)

☆☆☆☆☆☆

تعارفِ کتبِ حدیث

(۱) مسند حمیدی۔حضرت محدث اعظمی کا عظیم کارنامہ
(۲) کتاب الزہد والرّقائق
(۳) المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ
(۴) کشفُ الاستار عن زوائد البزّ ار
(۵) مؤطا امام محمد۔تعارف واہمیت

مسند حُمیدی
حضرت محدث اعظمی کا عظیم کارنامہ

یہ مضمون زیادہ تر حمیدی کے مقدمہ سے ماخوذ ہے، جو حضرت محدث اعظمی نے کتاب کے شروع میں تحریر فرمایا ہے۔ حُمیدی حاء کے پیش اور میم کے زبر کے ساتھ۔

مسلمانوں کے پاس قدرت کا سب سے بڑا عطیہ قرآن پاک ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنا مقدس کلام نازل فرمایا، اور اس کی والہانہ عظمت ومحبت مسلمانوں کے قلوب میں پیدا کر کے اس کی حفاظت وصیانت کا ایسا غیر معمولی اور معجزانہ انتظام فرمایا کہ اس کی حقانیت کی اور کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہی ایک دلیل آج کے لئے کافی ہوتی۔ یہ کلام محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر پر اترا، اور آپ کی سچی زبان سے ادا ہوا، اور جیسے اترا تھا، اور جیسے ادا ہوا تھا، آج تک اسی طرح امت کے دلوں میں محفوظ ہے، اور مسلمانوں کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ قرآن کے بعد جو عظیم ترین دولت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، وہ رسول کا کلام ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں جیسے خدا کے ساتھ محبت وعشق ہے، خدا ہی کی بخشش وعنایت سے اس کے رسول کے ساتھ بھی شیفتگی ودلبستگی ہے، اسی کا اثر ہے کہ رسول کی زبان سے نکلا ہوا شاید ہی کوئی کلمہ ہو جو مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ نہ ہوا ہو، اور پھر سفینے میں منتقل نہ ہوا ہو۔ زمانۂ نبوت میں قرآن کریم کے لکھنے کا بڑا اہتمام ہوتا تھا، مگر حدیث کے باب میں طرز عمل مختلف رہا ہے۔ بعض احوال میں رسول اللہ ﷺ نے کتابت حدیث سے منع فرمادیا تھا، اور دوسرے اوقات میں آپ نے اپنے مخصوص صحابہ کو اجازت دی تھی، اس کی

ممانعت واجازت میں بڑی حکمتیں تھیں، ان کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد متعدد صحابہ کرام نے احادیث کے مجموعے جمع کئے، خود خلیفۂ اول جانشین رسول اللہ ﷺ سیدنا صدیق اکبر نے پانچ سو احادیث کا مجموعہ جمع کیا تھا، مگر بعد میں اسے مصلحتاً ختم کر دیا۔ (تذکرۃ الحفاظ ۱/۵) حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص رضی اللہ عنہ زمانۂ رسالت سے آپ کی اجازت سے حدیث لکھتے تھے۔ (جامع بیان العلم وفضلہ ۱/۰۷) بعض احادیث خود رسول اللہ ﷺ نے حکم دے کر لکھوائیں۔ چنانچہ شاہانِ عصر کے پاس جو مکاتیب بھیجے گئے۔ (بخاری شریف ۱/۵) یا زکوۃ کی تفصیلات لکھ کر عاملین کے حوالے کی گئیں۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۵۸۲ فی تفسیر ''ومنہم من عاہداللہ'' الخ) حضرت ابو شاہ کے لئے نوشتہ لکھوایا گیا۔ (جامع بیان العلم وفضلہ ۱/۰۷) حضرت سیدنا علی کے پاس کچھ تحریرات موجود تھیں۔ (جامع بیان العلم ۱/۰۷) یہ سب اس کی شاہد ہیں۔

صحابہ کے تابعین کا دور آیا تو کتابت حدیث میں مزید وسعت پیدا ہوئی، اور تبع تابعین کے وقت میں کتابت حدیث کا ایک غیر مختتم سلسلہ چل پڑا، اور ائمہ حدیث مثلاً امام بخاری ومسلم کے دور تک تو اس کا اتنا اہتمام ہوا کہ کتابت حدیث تحصیلِ علم کے لئے بنیادی لازمہ بن گئی۔ مختلف انداز سے احادیث کے مجموعے مرتب کئے گئے، کہیں فقہی ابواب کی ترتیب پر کتابیں لکھی گئیں، کہیں سنن کے جمع کرنے کا اہتمام ہوا، کہیں مختلف ابواب کے استیعاب کے ساتھ مدون کیا گیا۔ بعض محدثین نے صحابہ کی مرویات کو نام بنام مرتب کیا، مثلاً سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایات ایک جگہ، سیدنا عمر فاروق کی روایات ایک جگہ، ایسی کتابیں محدثین کی اصطلاح میں ''مسند'' کہلاتی ہیں۔ مسانید بہت ہیں، سب سے مشہور اور جامع ''مسند'' امام احمد بن حنبل کی مرتب کردہ ہے، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مسانید ہیں، جن میں بعض چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں آ گئی ہیں، اور بعض ابھی مخطوطات کی شکل میں کہیں کہیں محفوظ ہوں گی، اور بعض کا تو پتہ ہی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی مسند امام ابوداؤد طیالسی (متوفی ۲۰۳ھ یا ۲۰۴ھ) کی ہے، لیکن یہ بات اس وقت صحیح ہوتی جب کہ اس کو خود امام ابوداؤد نے مرتب کیا ہوتا، درحقیقت

اسے بعد کے بعض حفاظ حدیث نے مرتب کیا ہے۔(الرسالۃ المستطر فہ۴۶)

امام حاکم فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی (متوفی ۲۲۸ھ) نے کوفہ میں، مسدد بن مسرہد (متوفی ۲۲۸ھ) نے بصرہ میں، اوراسد بن موسی المعروف بہ اسد السنۃ (متوفی ۲۱۲ھ) نے مصر میں سب سے پہلے مسند کی تالیف کی۔(الرسالۃ المستطر فہ۴۷)

حضرت محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ مسانید کے قدیم مصنفین میں ایک نام امام حافظ ابوبکر بن زبیر الحمیدی (متوفی ۲۱۹ھ) کا بھی ہے، اورمیرا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے انہیں نے مسند کی تالیف کی ہے، ان کی وفات الحمانی، اور مسدد سے پہلے ہوئی ہے، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ مسند کی تالیف میں بھی ان کا مقام اول ہوگا۔(مقدمہ مسند حمیدی)

امام حمیدی:

یہ ابوبکر عبداللہ بن زبیر بن عبداللہ بن حمید بن اسامہ بن زہیر بن حارث بن اسد بن عبدالعزیز بن قصی قرشی اسدی ہیں، ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ ﷺ سے قصی پر مل جاتا ہے، اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اسد بن عبدالعزیز پر ملتا ہے (عمدۃ القاری) تحصیل حدیث میں امام سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۷ھ) کے درس میں امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کے رفیق ہیں، اوران سے فقہ کا علم حاصل کیا، اوران کے ساتھ مصر تشریف لے گئے (فتح الباری) ان کا شمار امام شافعی کے بڑے تلامذہ میں ہے، انہوں نے امام شافعی کے بعد ان کی جگہ پر بیٹھنا چاہا مگر ابن عبدالحکم (متوفی ۲۶۸ھ) ان پر ناراض ہوئے۔(اس لئے یہ ارادہ ترک کردیا)

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ وہ سفیان بن عیینہ کے کبار تلامذہ میں ہیں، ان کے تلامذہ میں امام بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ ذہلی (متوفی ۲۸۵ھ) الامام الحافظ عبیداللہ بن عبدالکریم ابوزرعہ الرازی (متوفی ۲۶۴ھ) محمد بن ادریس بن المنذر ابوحاتم الرازی، امام جرح وتعدیل (متوفی ۲۷۷ھ) بشر بن موسی (المتوفی ۲۲۸) جیسے ائمہ حدیث ہیں۔امام احمد فرماتے ہیں کہ ''حمیدی ہمارے نزدیک امام ہیں''۔امام ابوحاتم نے فرمایا کہ ''سفیان بن عیینہ کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر حمیدی ہیں''۔ابویوسف یعقوب بن سفیان الفارسی الفسوی ''محدث اقلیم فارس'' (متوفی ۲۷۷ھ) نے کہا کہ ''میں نے اسلام اوراہل اسلام کے لئے حمیدی سے بڑھ کر

خیرخواہ کسی کو نہیں پایا''۔

امام شافعی کے شاگرد ربیع (متوفی ۲۷۰ھ) ان کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ''میں نے کسی بلغمی مزاج آدمی کو حمیدی سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں پایا، انہیں سفیان بن عیینہ کی دس ہزار حدیثیں یاد تھیں''۔ ابن حبان نے فرمایا کہ ''وہ سفیان بن عیینہ کی صحبت میں بیس سال تک رہے''۔ اسحاق بن راہویہ (متوفی ۲۳۹ھ) نے فرمایا کہ ''امام ہمارے دور میں شافعی، حمیدی اور ابوعبید (القاسم بن سلام متوفی ۲۲۴ھ) ہیں''۔ امام بخاری کی شہادت یہ ہے کہ ''حمیدی فنِ حدیث کے امام ہیں''۔ حاکم کا قول ہے کہ ''حمیدی اہل مکہ کے مفتی اور محدث تھے''۔ محمد بن عبدالرحمان ہروی (متوفی ۳۰۱ھ) کہتے ہیں کہ ''سفیان بن عیینہ کے وصال کے بعد مکہ مکرمہ پہونچا تو ان کے جلیل القدر تلامذہ کے متعلق دریافت کیا، لوگوں نے حمیدی کا نام لیا''۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ ''امام بخاری کو جب حمیدی سے حدیث مل جاتی تھی تو پھر کسی اور کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے''۔

حمیدی کے شرف کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ امام شافعی کے رفیق درس اور امام بخاری کے استاذ ہیں، ان کے سلسلے میں اس کے علاوہ اور کوئی بات قابل گرفت نہیں ملتی کہ وہ فقہائے عراق کے سلسلے میں متشدد تھے، اوران کے حق میں سخت گفتگو کرتے تھے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو ان کے جیسے جلیل القدر امام کی شان سے یہ گری ہوئی بات ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کے مزاج میں حدت وشدت تھی، جب انہیں غصہ آتا تھا تو خود پر قابو نہیں رکھ پاتے تھے، اور نوبت درشتی اور تیز کلامی تک پہونچ جاتی۔

امام حمیدی نے کئی کتابیں لکھی ہیں، ان میں مشہور تر یہ ''مسند'' ہے، لیکن ان کی دو کتابیں اور ابن ابی حاتم نے ذکر کی ہیں، ایک کتاب ''الرد علی النعمان'' اور دوسری ''کتاب التفسیر''! امام حمیدی کا انتقال مکہ مکرمہ میں ۲۱۹ھ میں ہوا۔ (امام حمیدی کے متعلق ابتدائی سطر چھوڑ کر باقی سب کچھ حضرت محدث کبیر کے مقدمے سے ماخوذ ہے)

مسانید کی نایابی:

حضرت محدث اعظمی مسند حمیدی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

''(مذکورہ بالا) چند مسانید اوران کے ساتھ نعیم بن حماد (متوفی ۲۲۸) اور اسحاق بن

نصر (متوفی ۲۱۰یا۲۱۳) کی مسانید شامل کر لیجئے تو کہنا چاہئے کہ قدیم ترین مسانید میں ان کا شمار ہے،ہم ان مسانید کے نام اہل علم کی زبانی سنتے تھے،اور کتابوں میں پڑھتے تھے،لیکن ان کا حصول آسان نہ تھا،مسند ابی داؤد طیالسی پہلی بار ۱۳۲۱ھ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ سے شائع ہوئی۔

ایک مدت سے میری خواہش تھی کہ کاش کسی کو اللہ تعالی توفیق دیتے اور جو مسانید رہ گئی ہیں،انہیں بھی کوئی ڈھونڈ نکالتا،اور ان کی تصحیح و درستگی کر کے شائع کر دیتا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش خدمت ہوتی،اور تمام اہل علم کی گردنیں احسان سے جھک جاتیں،نیز ان مغالطہ پردازوں کا جواب بھی ہو جاتا جو صحاح ستہ کے مؤلفین پر الزام رکھتے ہیں کہ انہوں نے حدیثیں وضع کر کے داخلِ کتاب کر لی ہیں۔

نہ جانے کتنی مدت تک یہ خواہش محدث جلیل کے سینے میں پرورش پاتی رہی،وہ ایک لحظہ کے لئے اس آرزو اور جستجو سے خالی نہ رہے۔''مسند طیالسی'' کی اشاعت کے لگ بھگ پچاس برس بعد حضرت محدث اعظمی کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں مسند حمیدی کا ایک مخطوطہ نسخہ ۱۳۲۴ھ کا لکھا ہوا ملا،لیکن ایک قلمی نسخہ کی بنیاد پر کسی غیر مطبوعہ کتاب کی تحقیق وتصحیح اور اس کی اشاعت کا منصوبہ نہیں بنایا جا سکتا،اس لئے حضرت موصوف نے ہندوستان اور مصر کے بڑے بڑے کتب خانوں میں اس کی تلاش شروع کی،اہل علم سے تحقیقات کیں،مگر کہیں سے کامیابی نہیں ملی۔

دسمبر ۱۹۵۸ء میں حضرت محدث اعظمی نے حیدرآباد کا سفر کیا،انہیں مکتبہ سعیدیہ میں جانے کا اتفاق ہوا،یہ مکتبہ قدیم علمی مخطوطات کا بہترین ذخیرہ ہے،وہاں انہیں ''مسند حمیدی'' کا دوسرا نسخہ دستیاب ہوا،جو ۱۳۱۱ھ میں لکھا ہوا ہے،ان دونوں نسخوں کے مقابلہ کے بعد اندازہ ہوا کہ دیوبند والا نسخہ اس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے،کیوں کہ دونوں ہو بہو مطابق ہیں،ان دونوں نسخوں کے مل جانے سے حضرت محدث اعظمی نے اس کی تحقیق وتحشیہ کا عزم پختہ کر لیا۔مولانا نے دیوبند والا نسخہ لے کر دوبارہ حیدرآباد کا سفر کیا،تاکہ دونوں نسخوں کا مقابلہ کریں،قدرت یاوری کر رہی تھی،حیدرآباد پہونچ کر جب مقابلہ کا کام شروع کیا تو ایک تیسرے قلمی نسخہ کا سراغ لگا،جو جامعہ

عثمانیہ کے کتب خانے میں تھا،اب حضرت موصوف کے پاس مسند حمیدی کے تین نسخے ہوگئے، جامعہ عثمانیہ والانسخہ ان دونوں نسخوں سے زیادہ صحیح تھا،اس نسخے پر کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے، لیکن اتنا محقق ہے کہ ۱۱۵۹ھ سے قبل کا لکھا ہوا ہے،کیونکہ اسی سن کی ملکیت کی تاریخ کسی صاحب نے لکھ رکھی ہے،اور دوسری تاریخ ملکیت ۱۲۹۵ھ کی ہے۔

حضرت موصوف نے اپنی تحقیق کی بنیاد ان تین نسخوں پر رکھی،اور پوری مسند انہیں تینوں نسخوں کی روشنی میں مرتب کی،لیکن مزید نسخوں کی جستجو جاری تھی،جب مسند کی طباعت شروع ہوئی تو دمشق کے کتب خانہ ''دارالکتب الظاہریہ'' کے قلمی نسخوں کی فوٹو کاپی مکہ مکرمہ سے دستیاب ہوئی،بعد میں حضرت نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا۔

یہ داستان ہے ایک کتاب مسند حمیدی کی تلاش وجستجو کی،اسے ایک ایسا شخص تلاش کررہا ہے،جس کی پشت پر سرمایہ اور وسائل کی کوئی طاقت نہیں،صرف اس کا ذاتی حوصلہ،اور حدیث نبوی کے ساتھ عشق ومحبت اور لگن ہے،لیکن اللہ تعالی بندہ کی مدد اس کے حوصلہ وہمت کے بقدر کرتے ہیں،چنانچہ اس کام کے لئے اس کے شایان شان حق تعالی نے ایک زبردست عالم دین اور مخیّر صاحب ثروت بزرگ مولانا محمد بن موسی میاں صاحب[۱] بانی موسس مجلس علمی کراچی وسملک کو کھڑا کردیا،انہوں نے اس کام میں حضرت محدث اعظمی کی مالی مدد فرمائی،اور کام کا سلسلہ شروع ہوا۔

مخطوطات کا پڑھنا:

جب تک مطابع کا رواج نہ تھا لوگ کتابوں کو ہاتھوں سے لکھا کرتے تھے،کتابوں سے نقلیں تیار کرتے،پھر نسخوں پر نسخے تیار ہوتے چلے جاتے،خاص اس کام کے لئے کاتب ہوتے، جن کو نساخ کہا جاتا تھا،کتابت کا فن بڑا دقیق اور نازک ہے،کاتب کی ذراسی بے احتیاطی عبارت کو کچھ سے کچھ بنادیتی ہے،کہیں کاتب کوئی لفظ چھوڑ دیتا ہے،کہیں نقطے لگانا بھول جاتا ہے، اور کہیں دائروں اور کشش میں غلطی کرجاتا تو پڑھنے والوں کے لئے بے انتہا مشکلات کا سامنا ہوتا،اور پھر اسی نسخے سے دوسرا نسخہ تیار کرنا ہوتا،تو اس میں مزید غلطیاں ہوجاتیں،اسی لئے کتابت کے بعد نظر ثانی ضروری قرار دی جاتی،لیکن کبھی کتاب ضخیم ہوتی،اور نساخ کو یا صاحب

ضرورت کو عجلت ہوتی، تو جیسے تیسے کتاب لکھ دی جاتی، اور اس پر نظر ثانی نہ ہوتی، تو وہ کتاب اغلاط کا مجموعہ بن کر رہ جاتی۔ پھر سب کاتب خوش نویس ہی نہ ہوتے، بہت سے بدخط ہوتے، ان کے حروف کلمات اور دائروں کی کشش کا کوئی معیار ہی نہ ہوتا، اس سے پڑھنے والوں کو بڑی دشواری ہوتی، ایسی حالت میں غلطیوں کا سمجھنا اوران کی تصحیح کرنا بڑی دردسری اور پتہ ماری کا کام ہوتا ہے، خصوصاً ہمارے دور میں جب کہ مطابع میں ایک سے ایک عمدہ، خوش خط، اور واضح کتابیں ڈھل کر نکل رہی ہیں، جو نگاہیں ان مطبوعات کو پڑھنے کی عادی ہیں، وہ قلمی، بدخط، نامانوس کتابت کو برداشت نہیں کرسکتیں۔

ایسی صورت میں جن کو ان مخطوطات پر کام کرنا ہے، ان کے لئے اس کتاب کے کئی نسخے ہوں تو کام میں قدرے سہولت ہوتی ہے، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی کئی نسخے مل کر بھی بعض اغلاط کی تصحیح نہیں کرپاتے۔ اس کام کے لئے بڑی دقیق نظر، وسیع مطالعہ، اور زبردست حافظہ درکار ہے، ورنہ کاتبوں کی غلطیوں نے بہت کام خراب کیا ہے، کاتبوں کی لاپرواہی یا ان کی مجتہدانہ حرکات سے کتاب کی جو درگت بنتی ہے، اس کی فریاد جاحظ نے ''کتاب الحیوان'' میں کی ہے۔ لکھتا ہے کہ:

''بعض اوقات مؤلف کسی غلطی کو درست کرنا چاہتا ہے، یا کوئی کلمہ کتابت میں چھوٹ گیا ہے، اسے لانا چاہتا ہے، تو دس ورق اعلی درجہ کی فصیح وبلیغ عبارت کے ساتھ لکھنا آسان ہے، لیکن اس نقص اور فتور کی اصلاح آسان نہیں ہے.........وہ بے چارہ بڑی محنت سے بگڑی ہوئی عبارت کو بناتا ہے، اور صحیح عبارت میں مزید حسن پیدا کرتا ہے، لیکن پھر وہ کتاب دوسرے کاتب کے ہاتھ میں پہونچتی ہے اور وہ بھی اس پر وہی مشقِ ستم کرتا ہے، جو کاتبِ اول کرچکا ہے، اور اس طرح وہ ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اغلاط کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے''۔ (مقدمہ سنن ترمذی لاحمد محمد شاکر المحدث المصری ص۔۱۶)

اور واقعہ یہی ہے کہ اگر کتاب نقل کی جائے اور اس کو اصل سے ملا کر تصحیح نہ کی جائے تو یہی حال ہوتا۔ آج پریس کے دور میں جب کہ ایک ہی مرتبہ کتابت کرنی ہوتی ہے، اور پھر اس کی تصحیح کا بھی اہتمام ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود ایسی ایسی لاینحل مشکلات سامنے آتی ہیں کہ علما

حیران ہوجاتے ہیں۔

ایسی حالت میں مخطوطات کا پڑھنا اوران کے اغلاط کوصحیح کرنا،کس قدر مشکل ہے؟ ناواقف توسمجھ ہی نہیں سکتا،البتہ کسی کومخطوطات پڑھنے کا اتفاق ہوتو اس راہ کی مشکلات کا کچھ اندازہ کرسکتا ہے۔

تحقیق وتصحیح کا طریقہ:

حضرت محدث اعظمی نے دیوبند کےنسخہ کواصل قرار دے کراس کا مقابلہ مکتبہ سعیدیہ اور جامعہ عثمانیہ کے نسخے سے کرنا شروع کیا، پوری دقت نظر،اور محنت وکاوش کے ساتھ ایک ایک لفظ کو پڑھنا،اس کا دوسرے نسخوں سے موازنہ کرنا،ایک طویل اور مسلسل محنت کا طالب عمل تھا،اس کام میں حضرت کی معاونت ان کے لائق تلمیذ مولانا عبدالستار معروفی سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلما لکھنونے کی۔

ہر ہر حدیث کوان تینوں نسخوں سے تو ملایا ہی گیا،اس کے علاوہ حدیث کی متداول کتابوں میں وہ حدیثیں جہاں جہاں تھیں،وہاں وہاں انہیں تلاش کیا گیا،اس سلسلے میں ترجیح صحیحین کودی گئی۔جب کوئی حدیث صحیح بخاری اورصحیح مسلم میں یاکسی ایک میں مل جاتی،تواس کے حوالے پر اکتفا فرماتے،اوراگرکسی دوسری کتاب میں حمیدی یاان کے شیخ کے واسطے سے ملتی تواس کا بھی حوالہ دیتے،اوراگروہ روایت صحیحین میں نہ ملتی،تو زیادہ اہتمام اس بات کا کرتے ہیں کہ چاروں سنن (سنن ترمذی،ابوداوٗد،نسائی،ابن ماجہ) سے حوالہ دیں،اورکبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ابتداء کوئی روایت سنن کےعلاوہ کسی دوسری کتاب میں تلاش کی اورمل گئی،اورپھرکسی وجہ سے سنن میں تلاش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی،توصرف اسی کا حوالہ دیا۔ایسا بھی ہوا ہے کہ حدیث کئی ایک کتابوں میں ملی،مگرحوالے کے لئے محدث اعظمی نے اس روایت کا انتخاب کیا جوحمیدی یا ان کے شیخ کے طریق سے ہوتی۔اور جہاں ضرورت سمجھی حدیث کے مشکل الفاظ کی شرح بھی کردی،اورکہیں کہیں حسبِ موقع حدیث کے مطلب کی وضاحت بھی کردی ہے۔

تحقیق وتعلیق کے چندنمونے:

اس پورے عمل کو دیکھنے کے بعدمعلوم ہوتا ہے کہ محدث کبیرکوفن حدیث پر کتنا عبور

حاصل تھا، کیا سند اور کیا متن؟ ہر ایک پر یکساں قدرت تھی۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ تینوں نسخوں کو سامنے رکھنے کے باوجود کتابت کی غلطی کا ازالہ نہیں ہو پایا، اس وقت دوسری کتب حدیث کو سامنے رکھا گیا، اور پھر خداداد حذاقت سے کام لے کر اس کی تصحیح کی گئی، پھر خدا کا کرنا کہ جب مکتبہ ظاہریہ کا نسخہ دستیاب ہوا تو اس سے تصحیح کی تائید ہوگئی۔

بصیرت کے واسطے چند نمونے بغیر کسی خاص ترتیب کے ملاحظہ ہوں۔

(۱) مسند حمیدی کی پہلی حدیث کی سند ملاحظہ ہو۔

"اخبرنا الحمیدی اخبرنا سفیان بن عیینه ابو محمد حدثنا مسعر بن کدام عن عثمان بن المغیره الثقفی عن علی بن ربیعة الوالبی". الخ

دیوبند والے نسخے میں بجائے عثمان کے، عمر بن مغیرہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہی مکتبہ سعیدیہ کے بھی نسخے میں ہے، اور مکتبہ عثمانیہ کے نسخے میں بھی عمر ہی ہے، البتہ دیوبند والے نسخے کے حاشیہ پر کاتب نے عثمان لکھ دیا ہے۔ یہاں دشواری یہ ہے کہ تینوں نسخے بیک زبان عمر بتاتے ہیں، البتہ حاشیہ پر کاتب نے عثمان لکھ دیا۔ اب محقق کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ حاشیہ پر یونہی سرسری طور پر عثمان لکھ دیا گیا ہے یا اس کی کوئی اصل ہے، لیکن ادھر تین کے تین نسخے عمر ہونے پر متفق ہیں، اور محقق کے پاس کوئی چوتھا نسخہ نہیں ہے۔ اس کے لئے ان کو دوسری کتابوں کی طرف مراجعت کرنی پڑی، اور دیکھئے کہ صرف ایک نام کی تصحیح کے لئے کتنی کتابوں کو الٹنا پڑا، اور ان سے دلائل فراہم کئے گئے۔

فرماتے ہیں کہ عثمان ہی صحیح ہے۔ کیوں؟۔

(۱) اس لئے کہ امام احمد نے اپنی مسند میں اس روایت کو مسعر بن کدام اور سفیان ثوری کے طریق سے عثمان بن مغیرہ ہی سے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو مسند احمد ج ۱۔ ص ۱۵۳)

(۲) اور اس لئے کہ امام ترمذی نے ابوعوانہ کے طریق سے عثمان بن مغیرہ ہی سے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ترمذی شریف ج ۱۔ ص ۳۱۳)

(۳) مسند ابوداؤد طیالسی میں بھی عثمان بن مغیرہ ہی منقول ہے۔

(۴) ابن سنی ابوبکر احمد بن اسحاق (متوفی ۳۶۴ھ) کی "عمل الیوم واللیلة" میں بھی عثمان

بن مغیرہ ہی کا نام آیا ہے۔

پھر کاتبوں سے یہ غلطی ہوئی کیسے کہ انہوں نے بجائے ''عثمان'' کے ''عمر'' لکھ دیا؟ فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ کاتب نے عثمان کا نام اس صورت میں (عںمں) لکھا ہوگا اور اس پر نقطے نہیں لگائے ہوں گے، اس کو کاتب نے عمر سمجھ لیا۔

(۲) مسند حمیدی۔حدیث۔۱۹

''**حد ثنا حمیدی، حدثنا سفیان، حدثنا الولید بن مسلم و بشر بن بکر**''آھ

اس سند میں سرسری طور پر کوئی نقص نظر نہیں آتا، سفیان بن عیینہ، حمیدی کے شیخ ہیں، اگر حمیدی ان کا حوالہ کسی حدیث کے لئے دیں تو عین قرین صواب ہے، مگر محدث کبیر کی نظر یہاں ٹھٹکی، ان کے پاس موجود تینوں نسخے اس سند پر متفق ہیں، مگر محقق کو تأمل ہے، انہوں نے دوسرے ماخذ کی تلاش کی ''کتاب الحج'' میں حمیدی ہی سند سے مل گئی۔(۲۵۲/۳۔بخاری شریف ۲۰۷/۱)

اس میں حمیدی نے اس روایت کو براہ راست ولید بن مسلم اور بشر بن بکر سے لیا ہے، اور امام احمد نے بھی اس حدیث کو ولید بن مسلم سے بلا واسطہ نقل کیا ہے۔محدث کبیر فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں اس حدیث میں سفیان کا ذکر کاتب کی سبقتِ قلم کا نتیجہ ہے۔

بعد میں جب مکتبہ ظاہریہ کا نسخہ ملا تو حضرت محدث اعظمی کے خیال کی توثیق ہوگئی، اس میں سفیان کا واسطہ نہیں ہے۔

(۳) حدیث۔۳۲۶''**حد ثنا الحمیدی، قال حدثنا سفیان قال حدثنا ابو المحیاہ عن امه انها قالت**''.الخ

محدث اعظمی کے پاس جو مخطوطے تھے، ان میں سے ہر ایک میں یہی ہے کہ ابوالمحیاہ نے اپنی ماں سے روایت نقل کی ہے، مگر اس میں کچھ خدشہ ہے، کیونکہ کتاب الجرح والتعدیل میں ابوالمحیاہ کے والد یعلی بن حرملہ کے ترجمہ میں ہے کہ انہوں نے حضرت اسماء سے روایت کی ہے، اور ان سے ابوالمحیاہ نے روایت اخذ کی ہے، اور ''مجمع الزوائد'' میں (ج۷۔ص۱۹۳) ہے کہ۔

''**عن ابی المحیاہ یعنی المختار (کذا فی المطبوعه) عن ابیه قال قدمت**

مکة بعد ما قتل ابن الزبیر بثلاثة ایام فکلمت امه اسماء بن ابی بکر الحجاج''.الخ

یعنی ابوالحیاہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے تین روز کے بعد مکہ مکرمہ آیا، تو حضرت اسماء بنت ابی بکر نے حجاج سے بات کی۔ اس کے بعد حجاج کے ساتھ ان کی گفتگو اس کے علاوہ نقل کی ہے، جو مسند حمیدی میں مذکور ہے۔ پھر امام ہیثمی صاحب مجمع الزوائد نے فرمایا کہ میں ابوالحیاہ اور ان کے والد کو نہیں جانتا۔ محدث کبیر فرماتے ہیں، کہ امام ہیثمی کی یہ بات بہت عجیب ہے، کیونکہ ابوالحیاہ اور ان کے والد کا تذکرہ امام بخاری، ابن ابی حاتم، اور امام مزی نے کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ مخطوطہ نسخوں میں غلطی اور تحریف واقع ہوگئی ہے، کیونکہ امام بخاری نے یعلی بن حرملہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ۔

''یعلی بن حرملہ عن اسماء بنت ابی بکر عن النبیﷺ قال:یخرج من بنی ثقیف کذاب ومبیر قالہ الحمیدی عن ابن عیینہ عن ابی المحیاہ واسمہ یحییٰ بن یعلی عن ابیہ''. (ج۴ق۲۔ص۴۱۶)

دیکھئے یہ سند بالکل وہی ہے جو مسند حمیدی میں موجود ہے، مگر اس میں ''عن امہ'' کے بجائے ''عن ابیہ'' ہے، اسی بنا پر درست یہی ہے، لیکن نسخہ ظاہریہ میں بھی **''عن امہ انھا قالت''** ہی ہے۔

ملاحظہ ہو کہ 'عن امہ' کو درست کرنے کے لئے کیسی جگر کاوی اور تلاش وجستجو کرنی پڑی۔

حدیث۔۴۱۶ **''حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان قال حدثنا الزھری قال اخبرنی سالم بن عبداللہ عن ابیہ قال:رأیت رسول اللہﷺ اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ حذو منکبیہ واذا اراد ان یرکع وبعد مایرفع راسہ من الرکوع فلا یرفع ولا بین السجدتین''.**

ترجمہ! حمیدی نے بیان فرمایا کہ مجھ سے سفیان نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا کہ ہم سے زہری نے بیان کیا، فرمایا کہ مجھے سالم بن عبداللہ نے اپنے والد گرامی کے حوالے سے یہ بات بتائی، وہ فرماتے ہیں کہ، میں نے رسول اللہﷺ کو دیکھا کہ جب آپ نماز شروع کرتے تو اپنے

دونوں ہاتھ کو کندھوں کے برابر اٹھاتے، اور جب رکوع کا ارادہ کرتے، اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد تو ہاتھ نہیں اٹھاتے، اور نہ دونوں سجدوں کے درمیان۔

یہ حدیث اپنے متن کے لحاظ سے نادر حدیث ہے، اس میں زہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے ایک ایسی روایت درج ہے، جواب تک کی معلومات کے بظاہر خلاف ہے، کیونکہ اسی سند سے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت ہاتھ اٹھانے کی روایت پیش کی جاتی ہے۔ لیکن حمیدی کی یہ حدیث اس کے برعکس ثابت کرتی ہے کہ ان دونوں وقتوں میں رسول اللہ ﷺ ہاتھوں کو نہیں اٹھایا کرتے تھے، حدیث کی سند بالکل صحیح ہے۔ مسند حمیدی کے تین نسخے تعلیق وتصحیح کے وقت حضرت محدث کبیر کے پاس موجود ہیں، اور تینوں اس بات پر متفق ہیں، پھر کیا اس متن میں غلطی ہے؟ یہ مسئلہ اسماء الرجال کا نہیں کہ ناموں کی تصحیح دوسرے مراجع سے کرلی جائے، یہ تو متن حدیث کے الفاظ کا مسئلہ ہے، اگر اسے غلط کہا جائے تو اس کے لئے دلیل چاہئے، اور صحیح کہا جائے تو دوسری صحیح روایتیں اس کے معارض موجود ہیں، دونوں طرف ثقہ راوی ہیں۔ چنانچہ محدث کبیر لکھتے ہیں، اور وہیں حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ:

''اس حدیث کی اصل امام بخاری نے امام زہری کے دوسرے شاگرد یونس کے حوالے سے نقل کی ہے، اور امام احمد نے اپنی مسند میں سفیان ہی کے حوالہ سے ذکر کی ہے، اور ابوداؤد شریف میں بھی سفیان کے طریق سے یہ روایت موجود ہے، لیکن امام احمد کی روایت میں سفیان کی روایت، حمیدی کی اس روایت سے مختلف ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"رأیت رسول اللہ ﷺ اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ حتی یحاذی منکبیہ واذا اراد ان یرکع وبعد ما یرفع راسہ من الرکوع. وقال سفیان مرۃ: واذا رفع راسہ واکثر ماکان یقول وبعد مایرفع راسہ من الرکوع ولا یرفع بین السجدتین''.

میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپ نماز شروع کرتے تو دونوں کندھے تک ہاتھ اٹھاتے، اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد.....سفیان کبھی یہ کہتے کہ جب سر اٹھاتے، بیشتر یہ فرماتے کہ رکوع سے سر اٹھانے کے بعد، اور دونوں سجدوں کے درمیان ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے''۔

اس روایت میں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کا ثبوت ہے،اورحمیدی کی روایت میں ان دونوں وقتوں میں ہاتھ اٹھانے کی نفی ہے،محدث کبیر فرماتے ہیں کہ:

''اس اختلاف پرمحدثین میں سے کسی نے کلام نہیں کیا''۔

جس وقت یہ تعلیقات محدث کبیر لکھ رہے تھے،اور کتاب کی تحقیق وتصحیح میں منہمک تھے، اس وقت جیسا کہ بتایا جاچکا ہے،کہ ان کے پاس مکتبہ ظاہریہ والانسخہ نہیں تھا،کہ اس سے استفادہ کیا جاتا،اوجو دو تین نسخے مخطوطات کے تھے،وہ حدیث کے انہیں الفاظ پرمتفق تھے،تاہم ان الفاظ کی بنیاد پرانہوں نے استدلال کی کوئی عمارت گری نہیں کی۔البتہ امانت ودیانت کا حق ادا کرتے ہوئے اسی روایت کو دوسرے معتبر راویوں سے نقل کرکے آپ نے اختلاف روایت کو ظاہر کردیا،اور یہ بھی تصریح فرمادی کہ محدثین نے حمیدی کی اس روایت پرکوئی کلام نہیں کیا۔

ناروا حملے:

لیکن ایک صاحب کواس کے باوجود صبر نہیں ہوا،اگر انہیں اختلاف تھا تو تہذیب و شائستگی کے ساتھ پیش کرتے،مگرانہوں نے علم اورعلما کے وقار کو بالائے طاق رکھ کرحضرت محدث کبیر کے متعلق ایک نازیبا عنوان لکھا،وہ عنوان یہ ہے،''مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمان اعظمی کی حدیث رسول میں ناروا خیانت اورجعل سازی''اور پھرلکھا کہ:

''مولانا اعظمی نے دیانت وامانت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری ڈھٹائی سے حدیث رسول میں خیانت وتحریف کرڈالی''۔(محدث،بنارس،بابت مارچ ۱۹۸۶ء)

پھرانہوں نے مکتبہ ظاہریہ کے نسخے کو سامنے رکھ کرحضرت محدث اعظمی پرتہمتیں دھری،لکھتے ہیں کہ:

''درحقیقت آپ زیربحث حدیث میں مولانا اعظمی کے شائع کردہ الفاظ کا تقابل مخطوطہ کے الفاظ سے کریں گےتو واضح ہوجائے گا کہ مولانا اعظمی نے تین جگہ گڑبڑ کی ہے۔

(۱) مخطوطہ میں''حدثنا الحمیدی''کے بعد''ثنا''سفیان ہے،مگرمولانا نے''سفیان''کوساقط کردیا،اس کے بعد''نا''الزہری ہے،مگرمولانا نے''نا''کوگرادیا،اورزہری کوسفیان سے قبل

والے ''نا'' کے ساتھ جوڑ دیا، اس طرح امام زہری کو امام حمیدی کا براہ راست شاگرد بنادیا گیا، امام زہری سے امام حمیدی کا سماع بھی ثابت کردیا گیا، حالانکہ امام زہری رمضان ۱۲۴ھ میں وفات پاچکے تھے، اور امام حمیدی، امام شافعی (پیدائش ۱۵۰ھ) کے شاگرد ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام حمیدی کو اپنی پیدائش سے پہلے ہی امام زہری سے ملاقات، شاگردی اور سماع کا شرف حاصل ہوگیا، بھلا ایسی باکمال تحقیق مولانا اعظمی جیسے ''محدث جلیل'' کے سوا اور کس کے حصے میں آسکتی تھی؟۔ (محدث، بنارس، مارچ ۱۹۸۶ء)

عبارت کی سخافت اور رکاکت سے قطع نظر ہم اتنا عرض کریں گے کہ طباعت کی غلطیوں اور سہواً تصحیح رہ جانے کو اس قدر اہتمام سے بیان کرکے اسے دانستہ گڑبڑی قرار دینا، کس حدیث کی رو سے صحیح ہے؟ کیا طباعت کی دنیا میں یہ بالکل پہلی اور انہونی غلطی ہوگئی ہے، جس کی توجیہہ بجز تحریف اور گڑبڑی کے دوسرے کسی لفظ سے نہیں ہوسکتی؟ اگر محدث اعظمی جان بوجھ کر سفیان کو ساقط کرتے تو انہیں اس سے کون سا مقصد حاصل ہوجاتا؟ اگر کوئی مقصد اس سے وابستہ ہوتا تو کہنے کی گنجائش بھی تھی کہ جان بوجھ کر سفیان کو ساقط کرکے حمیدی کو زہری کا شاگرد بنادیا گیا۔

جب مسند حمیدی شائع ہوئی تو پاکستان کے ایک عالم مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب [۲] استاذ حدیث نصرۃ العلوم گوجرنوالہ نے حضرت محدث اعظمی کے پاس اس مسئلہ میں خط لکھا، اس کا جواب جو کچھ لکھا گیا، اس کو انہوں نے اپنی کتاب ''نورالایضاح فی ترک رفع الیدین بعدالافتتاح'' میں شائع کردیا ہے، ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں کہ۔

مسند حمیدی کے مطبوعہ نسخے میں ''حدثنا سفیان'' کا جملہ چھوٹ گیا ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی مشیع ومحشی مسندِ حمیدی سے جب رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کی صحیح سند یوں ہے۔

''حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان قال حدثنا الزھری''. الخ

مسند حمیدی کے نسخہ مکتبہ ظاہریہ اور اس کے ہندوستانی مخطوطات میں بھی یونہی ہے، مطبوعے نسخے میں حروف جوڑنے والوں کی غلطی سے ''قال حدثنا سفیان'' چھوٹ گیا ہے، اغلاط میں اس کو دینا چاہئے تھا، مگر سہواً رہ گیا، والسلام

حبیب الرحمان اعظمی۔ بقلم خود۔ پٹھان ٹولہ مئو اعظم گڑھ۔ ۱۵/اگست ۱۹۶۵ء

مولانا کا یہ گرامی نامہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔ (نورالایضاح ۸۵۔ یہ مکتوب ۱۹۶۵ء کا ہے، اس کے اکیس سال بعد معترض کے پیٹ میں درد اٹھتا ہے اور اعلان فرماتے ہیں کہ محدث اعظمی نے قصداً ایسا کیا ہے)

سہو کی اس فروگزاشت کو اس قدر بھیانک بنادینا شرع کے بھی خلاف ہے اور معقولیت کے بھی!

''دوسری اور تیسری گڑبڑی بلکہ ''بامقصد تحریف'' یہ بتائی ہے کہ '' واذا ان یرکع و بعد ما یرفع راسه من الرکوع'' کے بعد صرف ایک فقرہ ہے۔''ولا یرفع بین السجدتین''، لیکن انہوں نے ''ولا یرفع'' کے ''واو'' کو ''ف'' سے بدل کر ''فلا یرفع'' کردیا، اور اس تحریف سے پیدا ہونے والے معنی کو یقینی بنانے کے لئے مولانا نے جدید فن کتابت کا سہارا لیتے ہوئے '' حذو منکبیه'' کے بعد اور '' واذا اراد'' سے پہلے قامہ لگادیا، مگر اس کے نتیجہ میں '' بین السجدتین''، مہمل ہوا جارہا تھا، اس لئے اس تحریف کی آبرو سلامت رکھنے کے لئے موصوف نے ایک اور تحریف کی، یعنی '' بین السجدتین '' سے پہلے لفظ ''ولا'' بڑھادیا''۔

ہم نے اختصار کے ساتھ معترض موصوف کی عبارت کا خلاصہ تحریر کردیا ہے، لیکن اس کے پڑھنے کے بعد بے ساختہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

عجیب بات یہ ہے کہ محدث کبیر (نوراللہ مرقدہ) نے اس حدیث پر جو وضاحتی حاشیہ لکھا ہے، معترض نے اس سے بالکل صرف نظر کرلیا ہے، ورنہ اگر اسے بھی نقل کردیتے تو تحریف وخیانت کی ساری درازنفسی الزام تراشی بن کر رہ جاتی۔

اپنی بات کے ثبوت میں نسخہ ظاہریہ کے اس صفحہ کا عکس بھی انہوں نے شائع کیا ہے، ہمیں انکار نہیں، عین ممکن ہے کہ اس نسخہ میں عبارت وہی ہو جس کے آپ مدعی ہیں، لیکن صرف اتنے سے ایک محقق، محدث کی امانت ودیانت پر حرف رکھنا ستم ظریفی ہے۔ آخر تین نسخوں کا ایک

طرح کے الفاظ پر متفق ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے؟ اوراگر بالفرض وہ تینوں نسخے غلط ہوں تو کیا اس کا الزام اسی محقق پر آئے گا جو صراحۃً یہ ظاہر کررہا ہو کہ مسند حمیدی کی یہ روایت بالکل اکیلی روایت ہے، ورنہ اس سند کی دوسری روایتیں اس سے مختلف ہیں، لیکن چونکہ اس کے غلط ہونے کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، اس لئے اس کو باقی رکھا۔ کیا اسی احتیاط کا نام خیانت ہے، تو پھر احتیاط کیا چیز ہے؟۔

مکتبہ ظاہریہ کے نسخے میں غلطی کا امکان:

مکتبہ ظاہریہ کے نسخے میں بھی غلطی کا امکان ہے، کیونکہ یہی روایت اسی سند ومتن کے ساتھ ''مسند ابی عوانہ'' (متوفی ۳۱۶ھ) میں بھی ہے، ملاحظہ ہو:

"حدثنا عبدالله بن ایوب المخرمی وسعد ان بن نصر وشعیب بن عمر وفی آخرین قالوا حدثنا سفیان بن عیینه عن الزهری عن سالم عن ابیه قال: رأیت رسول الله ﷺ اذا افتتح الصلوٰة یرفع یدیه حتی یحاذی بهما وقال بعضهم حذو منكبيه واذا اراد ان یرکع وبعد ما یرفع راسه من الرکوع لا یرفعهما وقال بعضهم ولا یرفع بین السجدتین''.

ابوعوانہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن ایوب مخرمی اور سعدان بن نصر اور شعیب بن عمرو نے حدیث بیان کی، ان سے سفیان بن عیینہ نے زہری کے واسطے سے، انہوں سالم کے واسطے سے، وہ اپنے والد کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے تھے، اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد نہیں اٹھاتے تھے، اور بعض نے کہا کہ دونوں سجدوں کے درمیان نہیں اٹھاتے تھے، پھر اس کے بعد ہے کہ:

"حدثنا الصائغ بمكة قال حدثنی الحمیدی قال حدثنا سفیان عن الزهری قال اخبرنی سالم عن ابیه قال: رأیت رسول الله ﷺ مثله''.

مطلب یہ ہے کہ حمیدی نے بھی سابقہ سند کے ساتھ اسی کے مثل روایت کیا ہے، جیسے پہلی روایت گزری۔

اب تو سفیان سے روایت کرنے والے تنہا حمیدی نہیں ہیں، تین راوی اور اسی طرح روایت کرتے ہیں، تو کیا اس کی بنیاد پر نہیں کہا جاسکتا ہے کہ نسخہ ظاہریہ میں ممکن ہے کہ کاتب سے کچھ تصرف واقع ہو گیا ہو، اور صحیح نسخہ وہی ہو جو حضرت محدث کے پاس پہلے سے تھا، کیا اس کے بعد بھی خیانت وتحریف کا الزام لگانا دیانت کے کسی خانے میں آسکتا ہے؟ علم کا نام لے کر بے علمی کی ایسی باتیں لکھنا نہ جانے رسول اللہ ﷺ کی کس حدیث سے ثابت ہے؟ کاش ایسے مواقع کے لئے بھی کچھ حدیثیں یاد آجایا کرتیں۔

بہر حال یہ حدیث اسی طرح اسی سند ومتن کے ساتھ حافظ ابوعوانہ نے ''صائغ'' کے حوالے سے امام حمیدی سے نقل کی ہے، تو اس میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسند حمیدی کے مطبوعہ ایڈیشن میں جو متن درج کیا گیا ہے، اس کی نسبت امام حمیدی کی جانب درست ہے، اور مسند حمیدی کی روایت وہی ہے، کیونکہ اسی کی تائید مسند ابی عوانہ سے ہورہی ہے، اور مکتبہ ظاہریہ کے نسخے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے حضرت سفیان بن عیینہ کے دوسرے جلیل القدر تلامذہ مثلاً یونس اور امام احمد بن حنبل سے جو الفاظ منقول ہیں، وہی لکھ دیئے ہیں، ورنہ حمیدی سے جو کچھ منقول ہے وہ وہی ہے جو مسند میں ہے۔ اب یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ یونس اور امام احمد نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ لائق ترجیح ہے، یا حمیدی، عبداللہ بن ایوب، سعدان بن نصر، اور شعیب بن عمرو نے جو کچھ نقل کیا ہے، وہ قابلِ ترجیح ہے؟ اس باب میں جو چاہیں ارشاد فرمائیں، لیکن حضرت محدث کبیر پر خیانت یا تحریف کی الزام تراشی سراسر ظلم اور بہتان مبین ہے۔

مسند حمیدی کے اجزاء:

متعدد علما نے ذکر کیا ہے کہ مسند حمیدی کے گیارہ اجزاء ہیں، حضرت محدث کبیر فرماتے ہیں کہ لیکن اس مسند میں گیارہویں جزء کا نام نہیں ہے، اس سے یہ شبہہ نہیں ہونا چاہئے کہ شاید اس کا کچھ حصہ ناتمام رہ گیا ہے، کتاب پوری ہے، لیکن ناسخین بعض اوقات اجزاء چھوٹا بڑا کردیتے ہیں، اس سے کمی بیشی واقع ہوجاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس نسخہ میں حدیث ۱۲۴۶ پر ''تم الجزء'' لکھا ہوا ہے، یعنی دسواں جزء پورا ہوا، اس کے بعد قاعدہ کے مطابق گیارہواں جزء شروع ہورہا ہے، لیکن اس کی ابتدا میں

''اول الجزء الحادی عشر'' نہیں لکھا گیا، حالانکہ وہاں لکھنا ضروری تھا، اس طرح گیارہ مکمل ہوجاتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان صاحب نے ''اتحاف النبلاء'' میں تحریر کیا ہے کہ:

مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے، جس میں ان کے والد کی تمنائے حیات اور قتل فی سبیل اللہ کی آرزو کا ذکر ہے۔ (ص۔۱۳۸۵)

میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تقلید کی ہے، شاہ صاحب نے ''بستان المحدثین'' میں یہی لکھا ہے۔ گمان یہ ہے کہ ان کے پاس مسند حمیدی موجود نہ تھی، انہوں نے کسی اور مصنف سے نقل کیا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مسند کی پہلی حدیث حضرت صدیق اکبر کی روایت ہے، اور یہی بات قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ مسانید کی ترتیب ان کے مصنفین حضرت صدیق اکبر خلیفہ اول ہی سے شروع کرتے ہیں، پھر باقی خلفا کی مسانید بالترتیب ذکر کرتے ہیں، پھر باقی عشرہ مبشرہ کی روایات لاتے ہیں۔ چنانچہ یہی ترتیب ''مسند ابی داوٗد طیالسی'' اور ''مسند احمد'' میں بھی ہے، اور حضرت شاہ صاحب نے مسند ''عبد بن حمید''، ''مسند ابویعلی'' اور ''مسند بزار'' کی بھی یہی ترتیب لکھی ہے۔

رسالہ اصول سنت:

مسند حمیدی کے ساتھ ان کا ایک مختصر سا رسالہ اصول سنت کے سلسلے میں ملحق ہے، یہ رسالہ چاروں مخطوطات میں شامل ہے، محدث کبیر نے حدیثوں کے نمبر بالترتیب لگا دیئے ہیں، اور فہرستوں میں حوالہ نمبر حدیث کا ہی دیا گیا ہے، البتہ مسانید کی فہرست میں صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

فہارس:

چونکہ یہ کتاب اسماءِ صحابہ کے عنوان سے مرتب ہوئی ہے، اس لئے اگر کسی خاص صحابی کی روایت تلاش کرنی ہوتو اگر اس میں موجود ہے تو بآسانی مل جائے گی، لیکن اگر ابوابِ فقہ کے متعلق کوئی حدیث درکار ہوتو اس کا تلاش کرنا مشکل ہے، اس لئے استفادہ کی سہولت کے لئے حضرت محدث کبیر نے فقہی ابواب کے لحاظ سے حدیثوں کی ایک فہرست مرتب کردی ہے، تاکہ

اگر صحابی کا نام یاد نہ ہوتو متعلقہ موضوع کے تحت اس حدیث کو ڈھونڈھا جاسکے،اس کے ساتھ ساتھ ایک اور فہرست ان اسماء کی مرتب کی گئی جن کا ذکر حدیث میں آیا ہے،اس فہرست کا بھی استفادہ کی سہولت میں خاص دخل ہے۔

ایک فہرست مسانید کی بھی اس کتاب میں موجود ہے، کہ کس صحابی کی مسند کس جگہ سے شروع ہوتی ہے، یہ فہرست محدث کبیر کی مرتب کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ دارالعلوم دیوبند کے نسخے میں مولانا محی الدین صاحب الہ بادی کے قلم سے ہے۔مولانا موصوف کو علم حدیث سے بڑا شغف تھا،انہوں نے امام بخاری کی تاریخ صغیر اور شیخ عبدالغنی بن سعید کی ''المؤتلف والمختلف'' کو شائع کیا ہے، دیوبند والا نسخہ پہلے انہیں کی ملکیت تھا، بعد میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں وقف کردیا تھا،اس فہرست کو بھی حضرت محدث اعظمی نے شکریے کے ساتھ کتاب میں شامل کردیا ہے۔

اخیر میں حضرت محدث نے کبیر نے اپنے صاحبزادہ گرامی قدر جناب مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ کو دعائیں دی ہیں، کہ انہوں نے مسند حمیدی کے نقل اور تبییض کی ذمہ داری اپنے اوپر لے کر کام آسان کردیا، اور حضرت مولانا عبدالستار صاحب[۳] کو دعائیں دی ہیں کہ انہوں نے نسخوں کے مقابلہ میں معاونت کی ہے۔

ماخذ: المآثر جولائی، اگست، ستمبر (۱۹۹۲ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مولانا محمد موسی میاں صاحب اصلاً سملک گجرات کے تھے، جوہانسبرگ ساؤتھ افریقہ میں ان کا خاندان متوطن تھا، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء اور علامہ انورشاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، مجلس علمی کے بانی تھے۔۲۱/ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۶/اپریل ۱۹۶۳ء کو جنوبی افریقہ میں وفات پائی۔(حیات ابوالمآثر جلد دوم، ص ۴۸)

(۲) مولانا حبیب اللہ صاحب پاکستان کے مشہور عالم دین ہیں،آپ کی ولادت ۱۹۴۶ء میں بستی خانہ شریف تحصیل وضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں ہوئی،آپ نے غیر مقلدیت، بریلویت اور فتنۂ مماتیت کے تعاقب میں کئی کتابیں تصنیف فرمائیں،آپ کی کل تصنیفات کی تعداد ۳۱ ر ہے، کچھ کے نام ذکر کئے جاتے ہیں۔(۱) نور الصباح فی ترک رفع الیدین بعد الافتتاح (۲) قہر حق، تین جلدوں میں (۳) اثبات علم غیب پر ایک نظر (۴) اہل حدیث کے چشم و چراغ (۵) فقہ حنفی پر اعتراضات کا جواب (۷) ہدایہ علما کی عدالت، دو جلدوں میں۔

(۳) مولانا عبد الستار صاحب معروفی ضلع مئو کے مردم خیز قصبہ پورہ معروف سے تعلق رکھتے تھے، ابتدائی تعلیم مدرسہ معروفیہ میں پائی،اس کے علاوہ مصباح العلوم کوپا گنج،احیاء العلوم مبارک پوراور دار العلوم مئو میں بھی تعلیم حاصل کی،مظاہر علوم سہارن پور سے سند فراغت حاصل کی۔دارالعلوم مئواور قاسم العلوم ہریا بھٹنی میں تدریسی خدمات انجام دیں،اس کے بعد مدرسہ معروفیہ اور پھر اشاعت العلوم پورہ معروف میں صدر مدرس مقرر ہوئے، مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں میں صدر مدرس اور دار العلوم ندوۃ العلما میں شیخ الحدیث رہے،اس کے علاوہ مدرسہ امدادیہ ممبئی میں بھی فریضہ تدریس انجام دیا۔آپ علامہ اعظمی کے خاص شاگرد اور سعادت مند تلامذہ میں سے تھے، غالبًا دار العلوم مئو کے زمانہ طالب علمی میں علامہ اعظمی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔علامہ اعظمی کے بعض علمی و تحقیقی کاموں میں معاون بھی رہے ہیں۔آپ کی وفات ۲۲ ر رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۶ ر جنوری ۱۹۹۴ء کو مالیگاؤں میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔(حیات ابوالمآثر جلد اول،ص ۴۴۶)

کتاب الزہد والرّ قائق
حضرت محدث اعظمی کی ایک عظیم خدمت حدیث

راقم الحروف جن دنوں مبارک پور جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں زیر تعلیم تھا، درس نظامی کا غالبًا چوتھا درجہ تھا، شرح جامی اور شرح وقایہ وغیرہ زیر درس تھیں، ایک دن مدرسہ کے کتب خانہ میں ایک نئی خوبصورت مطبوعہ کتاب نظر آئی، بے اختیار اسے ہاتھوں میں اٹھایا تو اس کی پیشانی پر "**کتاب الزهد والرقائق**" **للامام شیخ الاسلام عبدالله بن المبارک المروزی**" (المتوفی ۱۸۱ھ) کی تحریر جگمگا رہی تھی، اور اس کے نیچے "**حققه وعلق علیه الاستاذ المحقق الشیخ حبیب الرحمان الاعظمی**" کی عبارت دامنِ نگاہ کو کھینچ رہی تھی۔

حضرت مولانا اعظمی کی علمی شہرت ابتداءِ شعور سے کانوں میں پڑی ہوئی تھی، دل میں عقیدت بھی بہت تھی، لیکن طالب علمانہ لا ابالی پن کی وجہ سے کبھی ان کے کاموں کی طرف سنجیدگی کے ساتھ دھیان دینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ کتاب جو اچانک نظر آئی تو سوئی ہوئی عقیدت یکا یک جاگ اٹھی، اس وقت باوجودیکہ عربی کی اتنی شد بد نہیں ہوئی تھی کہ ایسی معیاری کتاب کا مطالعہ کر سکوں، تاہم اسے پڑھنا شروع کر دیا، اور اب یاد نہیں کہ مکمل پڑھ ڈالا تھا یا قلتِ استعداد کی وجہ سے تھک کر چھوڑ دیا تھا، آج جب اس کتاب پر چند سطریں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تو اس وقت کی لطیف اور روح پرور یاد کا ایک جھونکا آیا اور دل و دماغ کی دنیا پر ایک نشاط انگیز کیف طاری کر گیا۔

زہد ورقائق:

زہد کے لفظی معنی 'بے رغبت ہونا' ہے کسی بھی چیز سے بے رغبتی لغت کے اعتبار سے

زہد ہے،لیکن عرفِ عام اور محاورۂ شرع میں دنیا اور متاعِ دنیا سے بے رغبت ہوکر آخرت کی جانب لولگانے کا نام زہد ہے۔امام غزالی فرماتے ہیں:

'الزهد عبارة عن رغبته من الدنيا عد ولا الىٰ الآخرة'(احیاء العلوم ۴/۲۱۷)

زہد نام ہے شوقِ آخرت میں دنیا سے بے رغبتی اور اعراض کا۔

علامہ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں کہ:

"واعلم انه ليس من الزهد ترك المال وبذله على سبيل السخاء والقوة واستمالة القلوب وانما الزهد ان يترك الدنيا للعلم بحقادتها بالنسبة الى نفاسة الآخرة". (مقدمہ کتاب الزہد والرقائق۔۸)

زہد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی مال کو ترک کردے،اور قوتِ قلب کی وجہ سے اور دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے مال بے دریغ خرچ کرے۔زہد یہ ہے کہ آخرت کی نفاست وعمدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کو اس کی حقارت ودنائت کی وجہ سے ترک کردے۔

اور رقائق جمع ہے''رقیقۃ'' کی۔بعض علما نے 'رقاق' کا عنوان اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں ''کتاب الرقاق'' ہے۔یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں،عربی میں رقت کے معنی''نرمی'' کے ہیں،جن آیات واحادیث سے دلوں میں نرمی پیدا ہوتی ہے انہیں ''رقائق'' کہتے ہیں۔(فتح الباری ج۱۱۔ص ۲۷۵)

حاصل یہ کہ''کتاب الزہد والرقائق''میں ایسی آیات واحادیث اور آثار واقوال سلف جمع کئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ وقرأت سے دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو،آخرت کا ذوق وشوق دلوں میں جاگے،اور قلوب میں سوز وگداز اور نرمی پیدا ہو۔

زہد کی اہمیت:

جس شخص کی نگاہ قرآن وسنت اور اسلامی تعلیمات پر ہوگی اس کے سامنے روز روشن کی طرح یہ حقیقت واضح ہوگی کہ زہد اسلام کے اعلی مقاصد میں سے ہے۔اللہ تعالی نے اپنے بندوں کے لئے دنیا کے انہماک کو قطعاً پسند نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے کم سے کم تعلق رکھنے کی تاکید کی ہے، اس موضوع پر قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص شاہد ہیں،جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے، اور نہ اس وقت ہمارا یہ موضوع ہے۔

اس کی روشن تر دلیل خود رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور آپ کے خلفا واصحاب کا طریقۂ زندگی ہے، جو شخص رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی سیرت سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہو وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تأمل نہ کرے گا کہ ان حضرات کی زندگی میں لذاتِ نفس اور خواہشاتِ طبع کا بالکل دخل نہ تھا۔ آج کل جن فضولیات ولغویات کو لوگوں نے ضروریاتِ زندگی کا نام دے کر خود کو دھوکہ میں مبتلا کر رکھا ہے اور دنیا کو بھی اس ورطہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کا حضرات صحابہ کی زندگیوں میں کہیں پتہ نہ تھا۔

علماءِ اسلام اور محدثین کرام نے اس موضوع کو ابتدا ہی سے نہایت اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ چنانچہ بکثرت علما نے اس موضوع پر احادیث اور روایات جمع کی ہیں۔ بعض اکابر نے محض اسی موضوع کو اپنی تالیف کے لئے مختص کرلیا ہے، اور بعض نے مختلف عناوین کے تحت احادیث جمع کرتے ہوئے اس باب کو بھی بڑی اہمیت کے ساتھ درج کتاب کیا ہے۔ چنانچہ حدیث کے صحیح ترین دونوں مجموعوں یعنی بخاری ومسلم میں بھی یہ باب موجود ہے، ان کے علاوہ جامع ترمذی، سنن کبریٰ للنسائی، سنن ابن ماجہ، مستدرک حاکم، مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں اس باب کو اہمیت کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔

حضرت محدث کبیر نے اس کتاب کے مقدمے میں سترہ ایسے بزرگ علما ومحدثین کے نام شمار کرائے ہیں جنہوں نے اس عنوان پر مستقل کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ یہ علما دوسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک کے ہیں، ان میں چار بزرگ ہم عصر ہیں، حضرت عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) حضرت معافی بن عمران الموصلی (۱۸۵ھ) حضرت محمد بن فضیل کوفی (متوفی ۱۹۵ھ) اور حضرت وکیع بن الجراح (متوفی ۱۹۷ھ)

خاص اس موضوع پر اس کثرت سے کتابوں کا تالیف کیا جانا کس بات کی دلیل ہے؟ اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ۱۳۸۶ھ تک بجز امام احمد بن حنبل کی کتاب الزہد کے اور کوئی تالیف زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی تھی، کتابوں میں، رجال کے تذکروں میں، ان کتابوں کے نام موجود تھے، دنیا کے مختلف اہم کتب خانوں میں کہیں کہیں ان کے تمام یا نا تمام نسخے مل جاتے تھے، مگر عام طور سے علما کی دسترس سے یہ نسخے باہر تھے۔

کتاب الزہد والرقائق لعبداللہ بن المبارک:

زہد اور رقائق کے موضوع پر غالباً یہ قدیم تر اور مفصل کتاب ہے، حضرت عبداللہ بن مبارک ۱۱۸ء میں خلافت بنوامیہ میں ہشام بن عبدالملک کے عہد میں پیدا ہوئے، اس وقت صحابہ کرام کا دور ابھی جلد ہی ختم ہوا تھا، ہدایت وارشاد کے یہ جگمگاتے ہوئے ستارے تو غروب ہو چکے تھے، لیکن اپنی روشنی وتابانی اپنے بعد کی نسل یعنی تابعین میں منتقل کر گئے تھے۔ تابعین نے حضرات صحابہ سے استفادہ کیا تھا، ان کی صحبت سے مشرف ہوئے تھے، یہ اکابر بیک واسطہ رسول اللہ ﷺ کے شاگرد تھے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے ان مبارک ہستیوں سے بھرپور استفادہ کیا، یہاں تک کہ وہ خود علم وعمل اور اخلاق ودیانت کی ایک زندہ علامت بن گئے۔ اللہ تعالی نے انہیں علم کے ساتھ اخلاق وکرم، سخاوت وفیاضی، مال ودولت، شجاعت وبہادری، اور جوش جہاد سے نوازا تھا، ان کے حالات کے لئے مستقل ایک مقالہ درکار ہے۔

انہیں حضرت عبداللہ بن مبارک نے پیش نظر کتاب الزہد والرقائق مرتب کی ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ زہد کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ قدیم تر اور جامع تر کتاب ہے، لیکن ابھی طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی تھی۔

حضرت محدث اعظمی جن دنوں مصنف عبدالرزاق کی تحقیق وتعلیق میں مصروف تھے، اسی دوران اس کی طباعت کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا، حضرت کو اس کا نسخہ، سابق والیٔ قطر شیخ علی بن عبداللہ نے ہدیہ کیا، جو استانبول کے ایک نسخے سے بذریعہ مائیکروفلم تیار کیا گیا تھا، جب یہ نسخہ دستیاب ہوا تو اسے آپ نے مالیگاؤں مجلس احیاء المعارف بھیج دیا، تاکہ اس کی مدد سے ایک صاف نسخہ تیار کرلیا جائے۔

مجلس احیاء المعارف کے ناظم جناب مولانا محمد عثمان صاحب مرحوم[ا] نے اپنے ایک شاگرد کو جو مصر میں زیر تعلیم تھے، لکھا کہ ''اگر مصر کے قدیم کتب خانوں میں کتاب الزہد کا کوئی نسخہ مل جائے تو انہیں بھیج دیں'' اللہ تعالی انہیں جزائے خیر دے انہوں نے محنت وکوشش کر کے تین مزید نسخے مائیکروفلم سے فوٹو لئے ہوئے مالیگاؤں بھیجے۔

مولانا محمد عثمان صاحب مرحوم کے اہتمام ونگرانی میں کتاب کا نسخہ تیار کیا گیا، پھر مولانا

موصوف نے تینوں نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا، اور جہاں جہاں نسخوں میں اختلاف تھا اس کی نشان دہی کی۔ اب کتاب اس لائق ہوگئی تھی کہ اسے پریس کے حوالے کردیا جائے، لیکن ارکان مجلس کی رائے تھی کہ کتاب کو تحقیقات وتعلیقات سے مزین کیا جائے، حضرت مولانا ان دنوں مصنف عبدالرزاق کی تحقیق میں برسوں سے ہمہ تن منہمک تھے، لیکن یہ کام ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت نے اس کی ذمہ داری قبول فرمائی اور اپنے عزیز اور مخلص شاگرد حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئوی سابق شیخ الحدیث جامعہ مظہرالعلوم بنارس، اور فرزند گرامی قدر مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی کے تعاون سے یہ کام شروع کردیا، اور مسلسل شبانہ روز کی محنتِ شاقہ برداشت کرکے اس کی تعلیق وتحشیہ کی خدمت انجام دی۔

چونکہ یہ موضوع حضرت مولانا کے ذوقِ طبیعت کا تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت اقدس زہد وتقوی کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے، آپ کی پوری زندگی زہد وقناعت اور دنیا اور متاعِ دنیا سے بے رغبتی پر مشتمل تھی۔ اس لئے اس کتاب کی ترتیب وتہذیب کا آپ نے بہت اہتمام کیا، زہد کے سلسلے میں ابتدا میں ایک مبسوط مقدمہ لکھا، اور حضرت عبداللہ بن مبارک کے حالات مرتب کئے۔ مقدمہ کا ذکر آگے آرہا ہے۔ غرض اس کتاب کی تحقیق وتحشیہ میں حضرت کا رنگِ طبیعت جھلکتا ہے۔

تینوں نسخوں کا تعارف

پہلا نسخہ:

حضرت اقدس کے سامنے کتاب کے تین نسخے تھے، پہلا نسخہ جسے مولانا نے اصل قرار دیا، وہ وہی نسخہ تھا جو انہیں سابق حاکمِ قطر سے دستیاب ہوا تھا، یہ نسخہ دراصل استامبول میں ولی الدین جاراللہ کے مکتبہ میں تھا، اس کا فوٹو مائیکروفلم کے ذریعے لیا ہوا، حاکم قطر کے پاس تھا۔ اس نسخے کی کتابت ساتویں ہجری سے پہلے کی ہے، کیوں کہ اس پر ۶۰۰ھ کا سماع درج ہے [۱] یہ نسخہ مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتا ہوا ولی الدین جاراللہ تک پہونچا، اور انہوں نے اسے وقف کردیا۔ اس نسخہ میں گیارہ اجزا ہیں، پہلا جز ابوغالب احمد بن الحسن بن احمد بن البناء متوفی ۵۲۷ھ کی روایت سے ہے۔

اور پوری کتاب (جزء اول سمیت) ابوعلی حسین بن محمد بن حسین بن ابراہیم دلفی متوفی ۴۸۴ھ کی روایت سے ہے، اوران دونوں بزرگوں نے اس کی روایت ابومحمد الجوہر متوفی ۴۵۴ھ سے کی ہے، حضرت عبداللہ بن مبارک تک اس نسخہ کا سلسلۂ سند ہے۔

(۱) ابوعلی دلفی (متوفی ۴۸۴ھ) وابوغالب احمد بن البناء (متوفی ۵۲۷ھ) (۲) ابومحمد الجوہری (متوفی ۴۵۴ھ) (۳) ابن حیویہ (متوفی ۳۲۸ھ) وابوبکر الوراق (متوفی ۳۷۸ھ) (۴) حافظ ابومحمد بن صاعد (متوفی ۳۱۸ھ) (۵) ابوعبداللہ حسین بن حسن بن حرب المروزی (متوفی ۲۴۶ھ) حضرت عبداللہ بن مبارک۔

ان تمام راویوں کا تعارف حضرت محدث کبیر اعظمی نے مقدمہ میں مفصل تحریر کیا ہے۔

اس نسخہ کو ''نسخۂ مزوری'' یا ''روایتِ مزوری'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تمام تر خطِ نسخ میں لکھا ہوا ہے، البتہ پہلا صفحہ خطِ رقعہ میں ہے۔ اس کی کتابت واضح اور صاف ہے، کاتب نے منقوط اور غیر منقوط حروف میں امتیازی علامات کا اہتمام کیا ہے۔ یہ نسخہ مکمل اور محفوظ ہے، صرف چند جگہوں پر پانی کے اثر سے کچھ حروف مٹ گئے ہیں۔ یہ نسخہ ۶۰۰ھ اور ۶۰۱ھ میں شیخ عبدالرحمان بن ابراہیم المقدسی الفقیہ الزاہد کے درس میں پڑھا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے قلم سے اس میں جگہ جگہ سماع تحریر ہے۔ شیخ موصوف کا انتقال ۶۲۴ھ میں ہوا ہے۔ مذکورہ نسخہ ۱۳۵ر ورق یعنی ۲۷۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ کے آخری راوی ابوعلی الدلفی سے یہ کتاب اسی نسخہ میں شیخ سلامہ بن حسین بن سعدان المعروف بابن الدجاج حرانی نے ۴۸۲ھ میں پڑھا ہے، اور سلامہ ہی اس نسخے کے پہلے مالک ہیں۔ چنانچہ اس کی تصریح کتاب میں لگے ہوئے زائد صفحات میں ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ ''سماع لصاحبه: سلامه بن الحسين''

محدث کبیر نے لکھا ہے کہ میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ انہیں کے قلم سے تحریر ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی کتابت کم از کم پانچویں صدی ہجری کی ہے، اس نسخہ کی روایت مزوری سے علماءِ مشرق نے کی ہے۔

دوسرا نسخہ:

یہ نسخہ اسکندریہ کی پبلک لائبریری (مکتبہ عامہ) کا ہے، جو ۱۵۳ر اوراق پر مشتمل ہے،

اس کا سائز ۱۸×۲۶ سینٹی میٹر ہے، اور مغربی (اندلسی) طرزِ کتابت میں لکھا ہوا ہے۔ یہ باوجود مکمل ہونے کے جگہ جگہ درمیان سے ناقص ہے، اس کا سنہ کتابت ۴۶۶ھ ہے، یہ حضرت عبداللہ بن مبارک کے دوسرے شاگرد نعیم بن حماد (متوفی ۲۲۸ھ) کی روایت سے ہے، جسے ان سے علماءِ مغرب نے روایت کیا ہے۔ حضرت محدث کبیر فرماتے ہیں کہ:

''پہلے نسخے اور اس نسخے میں بہت زیادہ فرق ہے، ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے، ابواب کے عنوانات بھی مختلف ہیں، تعداد کا بھی فرق ہے، پہلے نسخے میں پچاس ابواب ہیں، اور اس نسخے میں ۱۷۷ ابواب ہیں اور جو مشترک ابواب ہیں ان کے بھی عنوانات مختلف ہیں، مثلاً پہلے نسخے میں پہلا باب ''باب التخصیص علیٰ طاعۃ اللہ عزوجل'' ہے اور نعیم بن حماد کے نسخے میں ''باب الترغیب فی مبادرۃ العمل'' ہے۔

اسی طرح کچھ احادیث وآثار ایک نسخہ میں ہیں تو دوسرے میں نہیں ہیں، اور کچھ دوسرے میں ہیں تو پہلے میں نہیں ہیں''۔ (مقدمہ کتاب الزہد۔ ص ۲۵)

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ کچھ احادیث وآثار مزوری [۲] کے نسخے میں زائد ہیں، اور کچھ نعیم بن حماد کے نسخے میں۔ محقق نے چونکہ اصل مزوری کے نسخے کو قرار دیا ہے اس لئے اس کی تمام روایتوں کو بتمام وکمال ایک جگہ جمع کر دیا ہے، البتہ اس میں جو روایت نعیم بن حماد کے نسخے سے زائد ہیں، حاشیہ میں اس کو ذکر کر دیا ہے [۳] اسی طرح نعیم بن حماد کے بھی کچھ زوائد کو حاشیہ میں ذکر کر دیا ہے [۴] لیکن حاشیہ میں عموماً ایسے مقامات پر تنبیہ کی ہے جہاں روایت کے اجزاء زائد ہوتے ہیں، اور جہاں پورا باب یا پوری روایت زائد ہے، اسے الگ مرتب کر کے کتاب کے آخر میں ''زیادات نعیم بن حماد'' کے نام سے ملحق کر دیا ہے۔ یہ ایک مشکل کام اور کامل استحضار کا طالب عمل تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس شخصیت کو اسی خدمت کے لئے چن لیا تھا اس کے اوپر اس کو آسان فرما دیا، زیادات نعیم بن حماد کی تعداد ۴۳۶ ہے۔

نعیم بن حماد کے نسخے کی اہم خصوصیت:

اس نسخے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کتابت ایک ایسے نسخے سے ہوئی ہے جو اندلس کے زبردست محدث ومحقق حضرت امام حافظ ابوعمر بن عبدالبر کے نسخے نقل کیا گیا تھا، پھر

اس کا مقابلہ حافظ موصوف کے اصل نسخے سے بھی کرلیا گیا ہے، اس نسخے کا سلسلۂ سند یہ ہے۔

(۱)ابوبکر عبدالعزیز بن محمد بن سعد (متوفی ۴۸۳ھ) (۲) حافظ المغرب ابوعمرو بن عبدالبر (متوفی ۴۶۰ھ) (۳) ابوالفضل احمد بن قاسم (متوفی ۳۹۶ھ) وابوعثمان سعید بن نصر وابوعمر احمد بن محمد بن احمد بن سعید المعروف بابن الجسور (متوفی ۴۰۱ھ) (۴) ابومحمد قاسم بن اصبغ (متوفی ۳۴۰ھ) (۵) ابواسماعیل الترمذی (۲۸۰ھ) (۶) نعیم بن حماد (متوفی ۲۲۸ھ) (۷) عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ)

تیسرا نسخہ:

یہ نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق سے بذریعہ مائیکروفلم حاصل کیا ہوا تھا۔ یہ ستر ورق پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت ۶۰۶ھ میں ہوئی ہے۔ یہ نسخہ ناتمام ہے، پہلے نسخہ سے اگر اس کی مطابقت کی جائے تو نویں جز کے آخری ورق سے تیرہویں جز کے اوائل تک ہے۔ اس کے راوی عمر بن طبرزد بغدادی (متوفی ۶۰۷ھ) ہیں، انہوں نے ابوغالب البناء سے اس کی سماعت کی ہے، اس کی سماعت علما کی ایک بڑی تعداد نے عمر بن طبرزد سے کی ہے۔ ان کے اسماء کتاب پر درج ہیں، اور ابن طبرزد کے دستخط بھی ہیں۔

ان تین نسخوں کو سامنے رکھ کر مطبوعہ ایڈیشن مرتب کیا گیا ہے۔

حضرت محدث اعظمی کی تحقیق وتعلیق:

اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں جیسا کہ اوپر بتایا گیا حضرت مولانا نے باوجود عدیم الفرصتی کے بہت محنت وکاوش کی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، اس میں ابتداء زہد کا مکمل تحقیقی تعارف کرایا ہے، اس کا مرتبہ ومقام، اس کی ضرورت واہمیت، آیات واحادیث اور معتمد علما کے اقوال کے حوالے سے ثابت کی ہے، اس کے سلسلے میں ذہن ودماغ میں جو غلط فہمیاں ہوسکتی ہیں، ان کا ازالہ فرمایا ہے۔ اس کے مطالعہ سے حضرت والا کی وسعتِ نظر اور ذوقِ تحقیق کے ساتھ آپ کے قلبی احوال اور احسانی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد کتاب الزہد کے تینوں نسخوں اور ان کے راویوں کا مفصل تعارف کرایا ہے، جس کا ہلکا سا نمونہ آپ نے اس مقالہ میں ملاحظہ کیا۔ اس کے بعد مصنفِ کتاب حضرت عبداللہ

بن مبارک کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، یہ تذکرہ بہت لذیذ اور ایمان کو تازگی بخشنے والا ہے۔ ان شاء اللہ اس کا ترجمہ نذرِ قارئین کیا جائے گا۔ اس کے بعد حضرت نے مصنف کتاب تک اپنا سلسلۂ سند بھی تحریر کیا ہے، مقدمہ کے خاتمہ پر کتاب کے تحشیہ وتعلیق کے سلسلے میں اپنے طریقۂ کار اور منہاجِ عمل کو بھی ذکر کر دیا ہے، ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں۔

(۱) ہم نے مزوری کی روایت سے یہ نسخہ مرتب کیا ہے، پھر دوسرے نسخوں سے اس کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے۔

(۲) آیات کے مواقع اور ان کے نمبر لکھ دیئے ہیں۔

(۳) کتاب میں آئی ہوئی روایات وآثار کی تخریج دوسری متداول کتابوں سے بھی کر دی ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ روایتیں دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور اس میں یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر ان کی شرح وتفصیل کی ضرورت کسی کو ہوئی تو متعلقہ شروح میں دیکھ سکے گا۔ (مثلاً ایک روایت جو اس کتاب میں بھی ہے، اور بخاری ومسلم میں بھی ہے، جب اس کی نشان دہی بخاری ومسلم میں ہو جائے گی تو ان کی شروح میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے) لیکن اس تخریج اور حوالے میں ہم نے کاوش اور استقصاء سے کام نہیں لیا ہے۔ (پھر بھی دیکھنے والے دیکھیں کہ کس قدر حوالے تعلیقات میں آتے ہیں)

(۴) کہیں کہیں ہم نے حوالہ کی احادیث کے الفاظ بھی ذکر کر دئے ہیں، تاکہ متن کتاب میں کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے یا مبہم ہے تو اس کی وضاحت ہو جائے۔ [۵]

(۵) رواۃ حدیث کی (جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے) ہم نے تعیین بھی کر دی ہے۔ [۶] (یہ مشکل ترین کام ہے، کیوں کہ ایک نام ونسب کے متعدد راوی اسماء الرجال کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان میں یہ متعین کرنا کہ یہ فلاں راوی ہے، بے حد مشکل ہے، مگر یہی مشکل حضرت محدث کبیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسان کر دی تھی) پھر بہت سے راویوں کے سلسلے میں جہاں ضرورت کا احساس ہوا ان کے احوال وتراجم کے مراجع کی بھی نشان دہی کر دی ہے، خصوصاً جب کہ وہ صحاح ستہ کے رجال نہ ہوں۔

(۶) نسخہ میں کہیں غلطی یا تصحیف ہوگئی ہے تو اس کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

(۷) غامض اور مشکل الفاظ کی شرح کر دی ہے۔

(۸) ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔

(۹) نعیم بن حماد کی زائد روایات کو الگ کر کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔(یہ بھی ایک نہایت مشکل امر تھا، کیوں کہ دونوں نسخوں کی مجموعی روایات میں جو کہ دو ہزار سے زائد ہیں، یہ یاد رکھنا کہ فلاں روایت مزوری کے نسخے میں نہیں ہے، زبردست قوتِ حافظہ اور دقتِ نظر کا محتاج ہے)

(۱۰) کتاب سے استفادہ کی سہولت کے لئے چار فہرستیں مرتب کی ہیں۔

پہلی فہرست مرفوع احادیث کی ہے، اور یہ کہ وہ کس صحابی سے مروی ہے، ہر صحابی کا نام اور نمبر صفحہ کا حوالہ دے دیا ہے۔

دوسری فہرست مرسل روایتوں کی ہے، اور جس تابعی نے ارسال کیا ہے ان کا نام بقید صفحہ درج کر دیا ہے۔

تیسری فہرست آثار صحابہ کی ہے، اس میں صحابی کا نام اور صفحہ کی تعیین ہے۔

چوتھی فہرست تابعین و تبع تابعین کے اقوال وفرمودات کی ہے بقید نام وصفحہ۔

یہ فہرستیں نہایت جامع ہیں، ان کے واسطہ سے کسی بھی صحابی، تابعی یا تبع تابعی کی روایات کو تلاش کر لینا سہل ہو گیا ہے۔ ایک فہرست ان روایات کی بھی ہے جن میں گزشتہ انبیاء کا ذکر آیا ہے یا ان سے منقول ہیں۔

فہرستوں کی وضع و ترتیب میں جس قدر مشقت اور کاوش کی گئی، اس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جنہیں کبھی اس قسم کے کام کی نوبت آئی ہو۔

روایات کی تعداد:

اس کتاب میں مزوری کی روایت سے ۱۶۲۷/احادیث وآثار ہیں۔ اور نعیم بن حماد کی زائد روایات جو آخر میں ہیں ۴۳۶ کی تعداد میں ہیں۔

آخر میں تعلیقات کی تحریر کے بعد مزید جو نئی تحقیقات حاصل ہوئیں، انہیں ’’الاستدراک والتعقیب‘‘ کے عنوان سے چودہ صفحات میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ بھی معلوماتِ نادرہ کا

بیش بہاخزانہ ہیں،اس کتاب کی تعلیق وتحشیہ میں حضرت اقدس نے پچاس کتابوں سے استفادہ کیا ہے،ان کی فہرست بھی آخری میں دیدی ہے۔

طباعت:

اس کتاب کوابتداء مجلس احیاءالمعارف مالیگاؤں نے ۱۳۸۶ھ میں شائع کیا، پھراسی کا فوٹو لے کر بیروت کے ایک ناشر کتب نے متعدد ایڈیشن شائع کئے، میرے سامنے بیروت والا ایڈیشن ہے۔

ترجمہ:

یہ کتاب زہدوورع اور ترغیبِ آخرت کے موضوع پراتنی مکمل اور مفید ہے کہ ہر شخص جو اپنے دل کوسنوارنا چاہتا ہو،اوراسے آخرت کا کچھ بھی اہتمام وخیال ہواس کے مطالعہ میں رہنی چاہئے،لیکن عربی میں ہونے کی وجہ سے صرف عربی داں حضرات ہی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں،اردوخواں حضرات کے لئے اس کا ترجمہ ضروری تھا۔اللہ تعالی نے حضرت اقدس کے تلمیذ بااختصاص جن کوحضرت کی بارگاہ میں انتہائی قرب حاصل تھا،اورانہیں حضرت کی صحبت ومعیت اوراستفادہ کا طویل ترین موقع نصیب ہواتھا،اورحضرت ان پرغایت درجہ اعتمادفرماتے تھے،یعنی حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئوی مدظلہ [۸] کوتوفیق بخشی کہ انہوں نے اس کا سلیس اور عام فہم ترجمہ کردیا۔احادیث وآثار کے ترجمہ کے ساتھ زہد کے موضوع پرحضرت کا جوایمان افروز مقالہ بطورمقدمہ شروع کتاب میں شامل ہےاس کا بھی ترجمہ کرکے داخل کتاب کردیا ہے،اب یہ کتاب اردو جاننے والے حضرات کے لئے بھی قابل استفادہ ہوگئی ہے۔ترجمہ کا نام ''ایثار آخرت'' ہے۔

ماخذ:المآثر۔اکتوبر،نومبر،دسمبر(۱۹۹۲ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مولانا عثمان صاحب مالیگاؤں کے آباء واجداد کا تعلق یوپی کے ضلع بارہ بنکی کے موضع

سعادت گنج سے تھا،آپ کی پیدائش ۱۹۰۵ء میں شہر مالیگاؤں کے ایک محلّہ نیاپورہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اردو پرائمری اسکول نمبر ۱ مصری خاں کا باڑہ میں حاصل کی۔اس کے بعد دینی تعلیم کے لئے مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں میں داخلہ لیا، ۱۹۲۸ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی،اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور ۱۹۳۲ء تک وہاں رہے۔

۷؍جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۸؍دسمبر ۱۹۵۸ء میں محدث اعظمی کی سرپرستی میں ادارہ احیاء المعارف کا قیام عمل میں آیا،اور مولانا عثمان صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے،اس ادارے کے قیام کا مقصد تصنیف وتالیف تھا، چنانچہ اس کے تحت عربی زبان میں احادیث کی دو بہت ہی اہم کتابیں شائع ہوئیں، پہلی ''الترغیب والترہیب'' اور دوسری یہی زیر تعارف کتاب ''کتاب الزہد والرقائق''۔

مولانا عثمان صاحب کی وفات ۲۸؍ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ مطابق یکم فروری ۱۹۸۴ء بروز بدھ تہجد کے وقت صبح پانچ بجے ہوئی۔(یہ معلومات مولانا کے صاحبزادے ہلال سر کے مضمون سے ماخوذ ہیں)

(۲) قدیم محدثین کا دستور تھا کہ کتاب کے جس نسخے میں استاذ سے پڑھتے تھے اس پر پڑھنے کی تاریخ درج کردیتے تھے،اور یہ کہ کس سے پڑھا ہے،اور کون کون لوگ درس میں شریک تھے، یہ تفصیلات لکھ کر دستخط ثبت کردیتے تھے،اسی کو اصطلاح میں ''سماع'' کہتے ہیں۔

(۳) اس نسخے میں بعض زائد روایات حضرت ابوعبداللہ حسین بن حسن مروزی سے منقول ہیں،اور بعض ان کے شاگرد ابومحمد یحییٰ بن محمد بن صاعد سے۔

(۴) دیکھئے کتاب الزہد ص ۵ روایت ۱۲،اس کے بارے میں حضرت نے تحریر کیا ہے کہ ''هــذا الاثـر مـن زيادات ابن صاعد'' اسی طرح۔ص ۸، روایت ۲۴ میں بھی ایک جزء ابن صاعد کا اضافہ کردہ ہے، نیز۔ص ۹ روایت ۲۸ کے بارے میں بھی حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ ''لـيـس هذ ا الاثر فـي نسـخة حماد بن نعيم'' اور۔ص ۱۰۹، روایت ۳۲۴ بھی ابن صاعد کے اضافات میں سے ہے، مزید۔ص ۲۸ روایت ۸۴ پر ''هـذا مـن زيـادات المروزی'' تحریر ہے،اور روایت ۱۰۸۷ سے ۱۱۴۱ تک مسلسل روایتیں نعیم بن حماد کے نسخے سے زائد ہیں،اور یہ سب مروزی کے اضافے ہیں۔

(۵) دیکھئے کتاب الزہد۔ص ۲۰ روایت ۶۱،اس میں کچھ عبارت نعیم بن حماد کی روایت میں زائد ہے، حاشیہ میں اس پر تنبیہ فرمادی ہے۔اور روایت ۵۱۸ کے ذریعے اس کی شرح بھی کردی ہے،اسی طرح۔ص ۶۷ روایت ۲۰۳ میں نعیم بن حماد کا قدرے اضافہ ہے، حاشیہ میں اس کو نقل کردیا ہے، نیز

ص۲۳۱روایت ۶۵۷ میں درمیان میں نعیم بن حماد کی روایت میں دوسطریں زائد ہیں،انہیں حاشیہ میں نقل کر کے حضرت نے لکھا ہے کہ ''وظنی انه سقط من الاصل سهواً''۔ یہ چندمثالیں بطورنمونہ کے ذکر کر دی گئی ہیں۔

(۶)　اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو،۳۷۸پرایک روایت کے الفاظ یہ ہیں''**فصلی (سليمان عليه السلام)ذات يوم العداة فطلعت بين عينيه شجرة فقال ما انت؟ولا شئى طلعت قالت انا الخروب طلعت لخراب هذه الارض قال: فعلم سليمان ان بيت المقدس لن يخرب وهوحي وان اجله قد اقترب**''.

یعنی سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک روز فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک پودا ظاہر ہوا،آپ نے پوچھا کہ تم کیا ہو؟اور کیوں ظاہر ہوئے ہو؟اس نے کہا میں بربادی کا پودا ہوں،اس زمین کو برباد کرنے کے واسطے ظاہر ہوا ہوں،فرمایا کہ تب حضرت سلیمان نے جان لیا کہ بیت المقدس ان کی حیات میں برباد نہ ہوگا،اور یہ کہ ان کی موت قریب ہے۔

جتنی عبارت پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس کا پہلی والی عبارت سے ربط نہیں ہے،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عبارت رہ گئی ہے،حضرت والا نے اس کا حوالہ حاشیہ میں ''تفسیر طبری'' سے نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ لکھ دیئے کہ ''**لخراب هذاالمسجد قال سليمان ماكان الله ليخربه وانا حي انت الذى على وجهك هلاكي وخراب بيت المقدس**''. (۲۲/۴۴)پودے نے کہا کہ میں اس مسجد کے برباد کرنے کے لئے ظاہر ہوا ہوں،حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے زندہ ہوتے ہوئے اللہ تعالی اس کو برباد نہ کریں گے،تمہارے طلوع وظہور پر میری موت ہے،اور بیت المقدس کی بربادی ہے۔

اس عبارت سے متن کی عبارت کا مطلب کھل گیا۔

(۷)　اس کی بھی مثال ملاحظہ ہو،ص۵۷روایت ۲۲۴ میں ایک راوی ابوعیسیٰ شیخ قدیم ہیں،ظاہر ہے کہ ابوعیسیٰ کنیت کے راوی بہت ہیں،حضرت نے لکھا ہے کہ ''**هو عندى يحيىٰ بن رافع الثقفى ذكره ابن ابى حاتم والدولابى**'' اس تحقیق کی قدروقیمت وہی جان سکتے ہیں جنہیں اسماء الرجال کے دقیق و وسیع فن میں کسی راوی کے تلاش وجستجو کی نوبت آئی ہو،حضرت نے راوی کی تعیین بھی کر دی ہے اور مراجع کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔

ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ ہو،ص ۱۱۷ روایت ۳۴۷ میں ایک راوی ابوالمکرّم ہیں،ان کی تعیین میں آپ نے تحریر فرمایا"هو حشرج بن نباته من رجال التهذيب" اوراسی کے دوسرے راوی "سریج بن مسروق" کے بارے میں فرمایا کہ "ذكره ابن ابى حاتم فى الجرح والتعديل' ان مثالوں کواس لئے ذکر کیا گیا کہ اہل علم کوحضرت کے وسعتِ علم اور قوتِ مطالعہ کا اندازہ ہو۔

(۸) علامہ اعظمی کے تلمیذ اعز وارشد مولانا عبدالجبار صاحب مئوی ۱۳۲۳ھ کے لگ بھگ مئو میں پیدا ہوئے،سکونت اصلاً چھتر پورہ کے قریب محلّہ باغیچہ میں تھی،بعد میں وہاں سے ملک ٹولہ منتقل ہو گئے اور وہیں رہائش اختیار کی۔علامہ اعظمی نے ۱۳۴۱ھ میں فراغت کے بعد دارالعلوم مئو میں مسند تدریس سنبھالی تو اس وقت مولانا عبدالجبار صاحب اس مدرسہ کے ایک طالب علم تھے،علامہ اعظمی کے زمانہ تدریس میں ہی دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔فراغت کے بعد مختلف مدارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔مولانا نے قلمی میدان بھی کچھ اہم کام انجام دیئے ہیں،دارلعلوم ندوہ کے نصاب میں داخل کتاب "منثورات" کا سلیس اردو ترجمہ کیا،جو"باکورات" کے نام سے شائع ہوا ہے۔پھراس کے بعد مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق وتشریح "دلیل المنثورات" کے نام سے کی۔مولانا کا ایک اہم قلمی کام "کتاب الزہدوالرقائق" کا اردو ترجمہ ہے،جو ایثار آخرت کے نام سے شائع ہوا ہے۔

مولانا کی وفات ۱۷؍رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۳ء میں عین جمعہ کی اذان کے وقت ہوئی،اسی روز عشا کی نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور علامہ اعظمی کے پہلو میں داہنی جانب سپرد خاک کیا گیا۔(حیات ابوالمآثر جلد اول ملخصاً)

المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ
تحقیق و تعلیق
محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی علیہ الرحمۃ

حافظہ وذکاوت اور ذہانت وفطانت، جب ذوقِ تحقیق اور شوقِ علم اور جفاکشی اور جد وجہد کے ساتھ جمع ہوتی ہے تو علم ونظر کی دنیا دورتک روشن ہو جاتی ہے، مئو جیسی کاروباری زمین پر ایک سفالہ پوش اور مختصر سے حجرے میں ایک ضعیف العمر مگر جواں ہمت صاحبِ نظر عالم، جس کی ہڈیاں کمزور ہوگئی تھیں، مگر اس کے قلب میں بڑی قوت تھی، ساری دنیا کے کتب خانوں کو کھنگال کر اوران کے علمی ذخائر کوٹٹول کر علم حدیث کے نادر ونایاب جواہر پارے تلاش کر کے انہیں عام کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ کئی گمشدہ کتابیں اس کی تعلیق وتحقیق سے مزین ہوکر اہل علم کی آنکھیں روشن کر چکی ہیں، علما کی گردنیں ان کے احسان سے جھکی جارہی ہیں، حدیث نبوی کی خدمت گزاری، اس کے ساتھ عشق وشغف نے اس کے بڑھاپے کو صد رشکِ شباب بنا رکھا تھا۔ اس کا ناسوتی جسم ایک چھوٹے سے مکان میں کتابوں کے انبار اور کاغذات کے ہجوم میں دبا اور سمٹا رہتا تھا، مگر اس کی ملکوتی نگاہ علم کے وسیع افق پر بڑی دور تک پھیلی رہتی تھی، آیئے ہم آپ کو اس سیاحِ علم وتحقیق کے ایک ''رحلۃ علمیہ'' کی روداد سنائیں۔

احادیث رسول (ﷺ) کی ابتدا اور بنیادی ترتیب وتدوین کا دور جب پورا ہوا، اور اس مقدس اور پاکیزہ علم کے چھوٹے بڑے بہت سے مجموعے جب مرتب ہو چکے تو محدثین کو خیال ہوا کہ ان مجموعوں میں بکھرے ہوئے ذخیروں کو زیادہ سے زیادہ یکجا کر دیا جائے تاکہ امت کے ہر طبقہ کو ان سے استفادہ سہل ہو، اور صاحبِ شریعت کے اقوال وفرمودات بیک نگاہ اصحاب

علم کی دسترس میں آجائیں۔

چنانچہ کئی اصحاب نے متعدد کتابوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی، اس طرح کی کاوش کی اولین مستحق امام بخاری اور امام مسلم کی صحیحین تھی، کیونکہ ان میں تمامتر ذخیرہ صحیح اور مستند احادیث کا ہے، اس لئے ان دونوں کتابوں کی احادیث کا جمع کرنا گویا ایک نہایت صحیح اور معتبر مجموعہ کا مرتب کردینا ہے، چنانچہ محمد ابن ابی نصر اندلسی (متوفی ۴۸۸ھ) کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" معروف ہے، ان کے علاوہ بعض اور علما نے بھی اس سلسلے میں کاوشیں کی ہیں۔

پھر علما نے صحاح ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) کی روایات کو یکجا کرنے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ابوالحسن بن زرین العبدری (متوفی ۵۳۵ھ) نے، اور ان کے بعد انہیں کے نقشِ قدم پر ابوالسعادت مبارک بن محمد ابن اثیر (متوفی ۶۰۶ھ) نے "جامع الاصول" مرتب کی۔ ان حضرات نے صحاحِ ستہ میں بجائے "ابن ماجہ" کے "موطا امام مالک" کو شمار کیا ہے۔

ان حضرات کے بعد علامہ نورالدین الہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) نے احادیث کو ایک دوسرے انداز سے مرتب کیا۔ اہل علم جانتے ہیں کہ حدیث کے ان چھ مجموعوں کے علاوہ حضرات محدثین نے اور بھی بہت سے مجموعے مرتب کئے ہیں، اور ان میں وہ حدیثیں بھی پائی جاتی ہیں، جن سے صحاح ستہ خالی ہیں، کیونکہ یہ مشہور چھ کتابیں تمام احادیث رسول کی جامع نہیں ہیں، ایسی احادیث جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں، اور دوسری کتب میں ہیں، محدثین کی اصطلاح میں انہیں "زوائد" سے تعبیر کیا جاتا ہے، حافظ نورالدین ہیثمی نے چھ کتابوں کے زوائد کا انتخاب انتہائی تحقیق وتدقیق کے ساتھ کیا۔ یہ کتابیں "مسند احمد، مسند بزار، مسند ابویعلی، معجم کبیر، معجم اوسط، معجم صغیر للطبرانی" ہیں، ان چھ کتابوں کے زوائد کو یکجا کرکے پانچ کتابیں مرتب کی ہیں۔ مسند احمد کے زوائد کو دو جلدوں میں "غایۃ المقصد فی زوائد احمد" کے نام سے اکٹھا کیا۔ مسند بزار کے زوائد کو "البحر الذخار فی زوائد البزار" (یہ سبقت قلم ہے، البحر الذخار اصل کتاب یعنی "مسند بزار" کا نام ہے، زوائد کا نام "کشف الاستار" ہے) مسند ابویعلی کے زوائد کو "المقصد الاعلی فی زوائد ابی یعلی"، معجم کبیر کے زوائد کو "البدر المنیر فی زوائد المعجم الکبیر" اور معجم اوسط اور معجم صغیر کے زوائد کو "مجمع البحرین

فی زوائد المعجمین ‘‘ کے نام مرتب کیا، ان کتابوں کی تمام حدیثیں سند کے ساتھ لکھی گئی تھیں، لیکن بعد میں ان کے شیخ واستاذ حافظ زین الدین عراقی نے مشورہ دیا کہ ان سب کو ایک مجموعہ میں سندیں حذف کر کے جمع کر دو، چنانچہ انہوں نے از سر نو محنت کی، اور سندیں حذف کر کے زوائد کا ایک نیا مجموعہ مرتب کیا، اس مجموعے میں انہوں نے تین کام کئے۔

اول یہ کہ اسناد کو حذف کر کے کتاب کے حجم کو مختصر کیا۔

دوسرے یہ کہ ان تمام زوائد کو فقہی ابواب کے لحاظ سے مرتب کیا، یہ ایک مشکل عمل تھا، مگر انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اسے انجام دیا۔

تیسرے یہ کہ احادیث کے درجات متعین کئے، ان کے راویوں پر کلام کیا، اس طرح ہر حدیث کی حیثیت واضح ہو گئی۔

اس مجموعہ کا نام ان کے شیخ حافظ عراقی نے ’’مجمع الزوائد ومنبع الفوائد‘‘ رکھا۔ یہ کتاب دس جلدوں میں ہے، اگر کسی کے پاس اس ایک کتاب کے ساتھ صحاحِ ستہ ہوں تو گویا اس کے پاس حدیث کی بارہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

پھر ان کے بعد، ان کے اور ان کے شیخ حافظ عراقی کے مشترک شاگرد، جو درحقیقت فخر الاساتذہ ہیں، یعنی حافظ الدنیا حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس طرزِ تدوین میں وسعت پیدا کی، انہوں نے مزید آٹھ مسانید مکمل اور دو نا تمام مسانید کے زوائد کو مرتب کیا۔ وہ آٹھ یہ ہیں۔

مسند ابو داؤد طیالسی (متوفی ۲۰۳ھ) مسند حمیدی (متوفی ۲۱۹ھ) مسند ابن ابی عمر (متوفی ۲۴۳ھ) مسند مسدد بن مسرہد (متوفی ۲۲۸ھ) مسند احمد بن منیع (متوفی ۲۴۲ یا ۲۴۴ھ) مسند ابی بکر بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) مسند عبد بن حمید (متوفی ۲۴۹ھ) مسند حارث بن اسامہ (متوفی ۲۸۲ھ)۔

ان آٹھوں کتابوں کے مکمل نسخے حافظ ابن حجر کے پاس تھے، ان کے علاوہ مسند ابی یعلی (متوفی ۳۰۷ھ) کا بھی مکمل نسخہ تھا، مگر اس کے کچھ حصے کے زوائد کو حافظ نور الدین ہیثمی ’’مجمع الزوائد‘‘ میں شامل کر چکے تھے، باقی حصے کے زوائد کو حافظ ابن حجر نے منتخب کیا، اور مسند اسحاق بن راہویہ (متوفی ۲۳۷ھ) کا نا تمام مجموعہ ان کے پاس تھا، اس کے زوائد کو بھی انہوں نے لے لیا۔

حافظ ابن حجر نے زوائد کے انتخاب کے باب میں صحاح ستہ کے ساتھ مسند احمد کو بھی شامل کیا ہے، یعنی زوائد ان احادیث کو قرار دیا ہے، جو صحاح ستہ اور مسند احمد میں نہ ہوں، کیونکہ مسند احمد کے زوائد ''مجمع الزوائد'' میں آچکے ہیں۔ اس مجموعے کا نام حافظ ابن حجر نے ''المطالب العالیہ بزوائد الثمانیہ'' رکھا، اور حافظ نورالدین ہیثمی کے اتباع میں انہوں نے بھی اس کو فقہی ابواب کی ترتیب پر تحریر کیا۔

یہ ایک طویل اور مشکل کام تھا، اس بات کا استحضار کہ کون کون سی روایت مذکورہ سات کتابوں میں نہیں ہے، بہت دشوار امر ہے، اور زبردست قوتِ یادداشت کا طالب ہے۔ اگر کسی عالم کے پاس صحاح ستہ کے علاوہ ''مجمع الزوائد'' اور ''المطالب العالیہ'' موجود ہوں تو گویا اس کے پاس بائیس کتابوں کی مجموعی احادیث کا خزانہ ہے۔ ان کتابوں میں سے کئی کتابیں اس وقت نایاب ہیں، بعض شائع ہوچکی ہیں، لیکن ان کا مطالعہ ہر ایک کے لئے سہل نہیں۔ ان مجموعوں نے مطالعۂ حدیث کو بہت سہل کردیا ہے، جو کتابیں نایاب ہیں وہ بھی ان کی وجہ سے گویا موجود ہیں، لیکن خود یہ کتاب ''المطالب العالیہ'' ناپید تھی۔

محدث الہند حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی علیہ الرحمۃ والرضوان کو عرصہ سے اس کی جستجو تھی، ہندوستان اور حجاز کے کتب خانوں میں اسے تلاش کرتے رہے، مگر کہیں اس کا پتہ نشان نہیں ملا، صرف حیدر آباد کے مکتبہ سعیدیہ میں اس کا ایک نا تمام نسخہ جو محض نصف اول پر مشتمل تھا، ۱۹۵۸ء میں ملا، مگر اس سے کیا کام ہوتا؟۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ۱۹۲۶ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے ایک مقالہ میں مَیں نے پڑھا تھا کہ اس کا ایک نسخہ مدینے منورہ میں مکتبہ محمودیہ میں ہے، ۱۹۶۱ء میں اور پھر ۱۹۶۵ء میں مجھے مدینہ شریف کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو میں نے دونوں مرتبہ مکتبہ محمودیہ میں تلاش کیا، مگر کامیابی نہیں ہوئی، فہرست میں اس کا نام موجود ہے، مگر اس کے سامنے گم ہونے کا اشارہ تحریر تھا، امید کی ایک کرن چمکی، وہ اس طرح بجھ گئی۔

بعد میں مدینہ منورہ کے ایک دوسرے مکتبہ ''کتب خانہ علمیہ'' کے مالک شیخ محمد سلطان النمنکانی کو مولانا کی اس تلاش وجستجو کا علم ہوا، تو انہوں نے ترکی کے کسی کتب خانے سے اس کے

دومختلف نسخوں کے فوٹو منگوا کر مولانا کی خدمت میں بھیجے۔انہیں دونوں نسخوں کی بنیاد پر حضرت نے تحقیق وتعلیق کا عمل کیا،اور اسے شائع کیا۔

دونوں نسخوں کے تفصیلی تعارف اور حضرت مولانا کی کاوش ومحنت کے ذکر سے پہلے مناسب ہے کہ مؤلف کتاب حافظ ابن حجر کا مختصر تعارف تحریر کردیا جائے،گوکہ وہ اہل علم کے درمیان اس درجہ معروف ہیں کہ ان کے تعارف کی ضرورت نہیں،لیکن مضمون پڑھنے والوں میں کتنے ایسے ہوں گے جنہیں ان کے نام اور ان کی مشہور کتاب ’’فتح الباری‘‘ کے علاوہ ان کے سلسلے میں زیادہ معلومات نہ ہوں گی۔حضرت مولانا نے ’’المطالب العالیۃ‘‘ کی تعلیقات کی تمہید میں ان کا اجمالاً تعارف کرایا ہے،ہم اسی کی تلخیص پیش کررہے ہیں۔

حافظ ابن حجر:

حافظ ابن حجر کا اسم گرامی احمد ہے،نسب اس طرح ہے۔احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد۔کنیت ابوالفضل،اور لقب شہاب الدین ہے،اور ابن حجر کے نام سے معروف ہیں۔حجر کے بارے میں دوقول ہیں،بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ایک قوم کا نام ہے،آپ کا تعلق چونکہ اسی قوم سے تھا اس لئے ’’ابن حجر‘‘ کہلائے،لیکن حافظ سخاوی جو ان کے تلمیذ خاص ہیں،وہ کہتے ہیں کہ آپ کے سلسلۂ نسب میں کوئی صاحب ’’حجر‘‘ نامی تھے،انہیں کی طرف یہ نسبت ہے۔(الضوء اللامع ج۲۔ص۳۶)

انہیں ’’عسقلانی‘‘ بھی کہا جاتا ہے،کیونکہ آپ کے آباء واجداد فلسطین کے ساحلی علاقے میں ’’عسقلان‘‘ نامی ایک بستی میں آباد تھے،پھر وہ لوگ مصر میں منتقل ہوگئے،مصر میں ہی حافظ ابن حجر کی ولادت ہوئی،بعد میں قاہرہ منتقل ہوگئے۔

ولادت ونشونما:

حافظ ابن حجر کی ولادت ۲۲/شعبان ۷۷۳ھ کو ہوئی،ولادت کے دوایک سال کے بعد والدہ ماجدہ کی وفات ہوگئی،چارسال کے ہوئے تو والد مکرم بھی داغ یتیمی دے گئے۔اس یتیم وبیسیر بچے کی پرورش شیخ زکی الدین خروبی نے کی،جو مصر کے ایک بڑے تاجر تھے،۹/سال کی عمر شیخ صدرالدین سفطی کی خدمت میں حفظ کلام اللہ کی تکمیل کی،اس کے بعد اس عہد کی درسی کتابوں

میں مشغول ہوئے۔ یہ کتابیں مختلف اساتذہ سے کچھ مصر میں، اور کچھ مکہ مکرمہ زادہا اللہ شرفا واجلالا میں پڑھیں۔ مکتبی تعلیم کے دوران آپ کو فنِ تاریخ اور اسماء الرجال سے دلچسپی پیدا ہوئی، حافظہ چونکہ قدرت کی جانب سے بے حد قوی لائے تھے، اور ذہانت وذکاوت بھی بدرجۂ اتم تھی، اس لئے بکثرت راویوں کے احوال اسی وقت خزانۂ ذہن ودماغ میں محفوظ ہو گئے تھے۔ ۷۹۲ھ میں علمِ ادب سے شغف پیدا ہوا، اور انشا پردازی اور شعر گوئی کی مشق بڑھائی، یہاں تک کہ آپ کا شمار اچھے ادباء وشعراء میں ہونے لگا۔ ۷۹۳ھ میں علم حدیث کی جانب توجہ ہوئی، اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی، لیکن پورا انہماک اور بالکلیہ اس کی جانب انقطاع ۷۹۶ھ میں ہوا، پھر تو وہ کیفیت ہوئی کہ:

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ یار کہ تکرار می کنیم

دس سال تک اس وقت کے سب بڑے شیخ الحدیث حافظ زین الدین عراقی (متوفی ۸۰۶ھ) کی صحبت میں استفادہ کرتے رہے۔

اساتذہ:

اللہ تعالی جب کسی پر علم وفضل کا انعام کرنا چاہتے ہیں تو ذہانت وذکاوت کی فیاضانہ بخشش کے ساتھ اس کے لئے ایسے باکمال اور ماہر فن اساتذہ کا بھی انتخاب فرماتے ہیں، جو اپنا ثانی نہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ حق تعالی نے حافظ ابن حجر کے ساتھ اس باب میں بڑی فیاضی کا معاملہ فرمایا، ان کے تلمیذ خاص حافظ سخاوی لکھتے ہیں:

"اجتمع له من الشيوخ......مالم يجتمع لاحد من اهل عصره لان كل واحد منهم كان متبحرا فى علمه وراساً فى فنه الذى اشتهر به لايلحق فيه". (الضوء اللامع ج۲۔ص۳۷)

حافظ ابن حجر کے واسطے منجانب اللہ ایسے شیوخ واساتذہ جمع ہو گئے تھے، جو ان کے معاصرین میں سے کسی اور کو میسر نہیں آئے ان میں سے ہر ایک اپنے فن میں تبحر کا اعلی درجہ رکھتا تھا کہ اس میں کوئی دوسرا اس کا مثیل نہ تھا، پھر اس کی تفصیل کرتے ہوئی علامہ سخاوی نے لکھا ہے:

مثلاً امام تنوخی فنِ تجوید و قرأت کے امام تھے، اور اس باب میں سند عالی رکھتے تھے، علامہ زین الدین عراقی علومِ حدیث میں بے نظیر تھے، امام ہیثمی حفظِ متون میں معروف تھے۔ امام بلقینی وسعتِ حفظ اور کثرتِ اطلاع میں بے مثال تھے۔ ابن ملقن کثرتِ تصانیف میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مجد الدین فیروز آبادی صاحبِ قاموس امام لغت تھے۔ علامہ غمازی عربیت میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، اور عز بن جماعۃ کثرت علوم میں بلند پایہ تھے''۔ (الضوء اللامع ج ۲۔ ص ۳۷)

تلامذہ و تصانیف:

جس طرح انہیں اساتذہ باکمال ملے تھے، ایسے ہی تلامذہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک آفتاب ماہتاب تھے۔ علامہ سخاوی نے لکھا ہے کہ ہر مذہب و مسلک کے اکابر علما و اعیان کو حافظ ابن حجر کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے۔

حافظ ابن حجر کی تصانیف بھی بکثرت ہیں، اور ہر ایک تصنیف ان کے وسعتِ علم، کثرتِ استحضار، جودتِ ذہانت اور دقتِ مطالعہ نیز امانتِ کامل کی شاہد عدل ہے، یعنی جہاں کہیں سے کسی کا قول اخذ کرتے ہیں اس کا حوالہ ضرور دیتے ہیں، کسی دوسرے کی بات کو اپنی بات بنا کر کبھی نہیں پیش کرتے۔ حافظ سخاوی نے ان کی تصنیفات کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد بتائی ہے۔

ان کی اہم تصنیفات میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(۱) ''فتح الباری'' صحیح بخاری کی شرح ہے، جو تیرہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اور اس کا مقدمہ ''ہدی الساری'' بھی ایک ضخیم جلد میں ہے، امام بخاری نے صحیح بخاری مرتب کے کر کے پوری امت پر احسان کیا، اس کی شرح کا قرض علما کی گردنوں پر تھا، حافظ ابن حجر نے یہ شرح لکھ کر اس قرض کو ادا کیا۔

حافظ ابن حجر نے اپنے معمول کے خلاف ''فتح الباری'' کی تصنیف میں کافی وقت صرف کیا ہے، ورنہ وہ سرعتِ قرأت اور سرعتِ تالیف میں معروف ہیں۔ ۸۱۷ھ میں اس کی تحریر کا آغاز کیا، اور ۸۴۲ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، کتاب کی تکمیل کے بعد انہوں نے علما و فضلا کی ایک عظیم دعوت کی، جس میں پانچ سو اشرفیاں خرچ ہوئیں۔ وہ دن قاہرہ کی تاریخ میں اہل علم کے

زبردست اجتماع، نیز علمی، ادبی لطائف وظرائف اور تحقیقی مباحثات کے لحاظ سے یادگار دن تھا، اس روز ان کی یہ کتاب تین سو دینار میں فروخت ہوئی۔

(۲) ''تغلیق التعلیق'' یہ ان کی پہلی تصنیف ہے، امام بخاری نے بہت سی روایتوں کو اپنی شرائط پر پورا اترتا ہوا نہ پایا، لیکن وہ صحیح تھیں، اور انہیں کتاب میں لانے کی ضرورت تھی، انہیں بغیر سند کے ابواب کے عنوان کے ذیل میں درج کر دیا، ایسی روایات کو محدثین کی اصطلاح میں ''تعلیقات'' کہا جاتا ہے۔ تعلیقات کی سندوں کا تلاش کرنا ایک دشوار امر ہے، حافظ ابن حجر نے اس مشکل کو آسان کر دیا ہے، اس کتاب میں تعلیقات کی سندیں تحریر کر دی ہیں۔

(۳) ''اتحاف المہر ۃ باطراف العشر ۃ'' اس کتاب میں دس مسانید کی احادیث کے ابتدائی الفاظ بطور فہرست کے مرتب کئے ہیں، پھر اس میں سے مسند احمد کے اطراف کو الگ کر کے مستقل کتاب بنا دیا ہے، اس کا نام 'اطراف المسند المعتلی' ہے، اول الذکر کتاب آٹھ جلدوں میں ہے۔

(۴) تہذیب الکمال (۵) تقریب التہذیب (۶) لسان المیز ان۔ یہ تینوں کتابیں علم اسماء الرجال میں مرجع وماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں (۷) ''الاصابۃ فی تمیز الصحابہ'' احوالِ صحابہ میں (۸) ''الدررالکامنہ فی اعیان المأ ۃ الثامنۃ'' تاریخ میں۔ ''المطالب العالیہ بزوائد الثمانیہ'' (زیرنظر کتاب)

خصوصیات:

حافظ ابن حجر سرعتِ قرأت ومطالعہ میں معروف تھے، کسی کتاب کو وہ اتنی جلد پڑھ لیتے تھے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے، انہوں نے پوری صحیح بخاری از اول تا آخر دس مجلسوں میں پڑھی، اور یہ مجلس بس ظہر کے بعد عصر تک ہوتی۔ اگر دونوں کا درمیانی وقفہ تین گھنٹے مان لیا جائے تو گویا تیس گھنٹے میں کتاب کی قرأت مکمل ہوئی، اور یہ پڑھنا محض سرسری نہ تھا، فہمِ مطالب اور اخذِ معانی کے ساتھ تھا۔ اسی طرح صحیح مسلم ڈھائی دن میں پڑھی، ملک شام کے سفر میں انہوں نے، ''معجم صغیر للطبرانی'' فقط ایک مجلس میں بعد نماز ظہر، عصر تک پڑھ ڈالی، جامع صغیر ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ دمشق میں وہ تقریباً ستر دن رہے، اس دوران انہوں نے مختلف کتابوں کی تقریباً سو جلدیں پڑھیں، اور صرف پڑھا ہی نہیں، ان کے منتخبات کے نوٹ بھی تیار کرتے رہے۔

لکھتے بھی بہت جلد تھے،لیکن خط اچھا نہ تھا،اور ایک انداز پر نہیں لکھ سکتے تھے،کاٹتے پیٹتے بھی بہت تھے،حتی کہ ان کا مبیضہ بھی مسودہ بن کر رہتا تھا،اسی لئے ان کی کتابوں کے نسخوں میں بسا اوقات اختلاف ملتا ہے۔

حافظ موصوف ایک عمدہ شاعر بھی تھے،ان کا دیوان بھی تھا، بلکہ ابن العماد نے ان کے بارے میں یہاں تک نقل کیا ہے کہ:

''كان شاعراً طبعاًمحدثاً صناعةً فقيها تكلفا''. وہ فطری طور پر شاعر تھے،تحصیل و تصنیف کے اعتبار سے محدث تھے،اور بتکلف فقیہ تھے۔

اس رتبہ کمال کے باوجود حد درجہ متواضع بھی تھے،حضرت مولانا لکھتے ہیں کہ:

''وہ اپنے بارے میں کہا کرتے تھے کہ میں اپنی تصانیف میں چند ایک علاوہ کسی کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ سب ابتدا میں لکھی گئی ہیں،اور پھر ان کی نظر ثانی اور ترتیب وتہذیب کما حقہ نہیں ہوسکی ۔البتہ شرح بخاری،اوراس کا مقدمہ،تہذیب التہذیب ،لسان المیزان،تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ کو پسند فرماتے تھے،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر متواضع تھے،ورنہ ان کی ہر تصنیف وسیع علم اور نادر تحقیقات سے مالا مال ہوتی ہے،اور اپنے موضوع پر بنیادی مرجع کا مقام رکھتی ہے''۔

کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے جیسا کوئی عالم وفاضل دیکھا؟تو انہوں نے اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیت پڑھی''فلا تزكوا انفسكم'' اپنے آپ کو پاکیزہ مت قرار دو۔

وفات:

علم وفضل کا یہ روشن آفتاب ۲۸/ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو قاہرہ میں غروب ہوگیا،ان کے جنازہ میں اہل علم کا اتنا بڑا مجمع تھا جس کی نظیر نہیں،خود بادشاہ مصر بھی جنازہ میں حاضر تھا،حق تعالی درجات کو بلند فرمائیں۔

المطالب العالیہ:

اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے خود حافظ ابن حجر نے فرمایا:

''علم کی مشغولیت، بالخصوص علمِ حدیث سے اشتغال بہترین عبادت ہے، ہمارے ائمہ نے احادیث کومختلف انداز سے جمع کیا ہے، کسی نے مسند مرتب کی، کسی نے ابواب (فقہیہ) کی بنیاد پر احادیث کوترتیب دیا، میرا ارادہ ہوا کہ جس قدر احادیث سے مجھے واقفیت ہے انہیں ایک کتاب میں جمع کردوں، تاکہ ان سے استفادہ سہل ہوجائے، پھر میں نے ارادہ بدل دیا، اور چاہا کہ مشہور کتابوں میں جو حدیثیں ہیں، ان سے زائد احادیث دوسرے مسانید سے انتخاب کرکے یکجا کردوں۔ مشہور کتابوں سے مراد ''صحاح ستہ اور مسند احمد بن حنبل'' ہیں، اور مسانید سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں حضرات صحابہ کرام کی روایات ان کے اسما کے اعتبار سے جمع کی گئی ہیں، آٹھ مسانید تو میرے پاس مکمل ہیں، (ان کا ذکر پہلے آچکا ہے) اور ''مسند اسحاق بن راہویہ'' نصف ملی، ''مسند ابویعلیٰ'' سے بھی استفادہ کیا ہے، اس طرح دس کتابوں کی روایتوں کو یکجا کردیا۔

اور میرا طریقہ یہ ہے کہ کسی صحابی کی جس حدیث کو صحاح ستہ اور مسند احمد میں نہیں ذکر کیا گیا ہے، اور ان مسانید میں سے کسی ایک میں موجود ہے، یا وہ حدیث تو صحاح ستہ اور مسند احمد میں سے کسی ایک میں ہے، مگر کسی دوسرے صحابی کے واسطے سے ہے، اسے میں لکھ لیا ہے۔
اور ان کو بجائے اسماءِ صحابہ کے، سہولت واستفادہ کے لئے احکامِ فقہیہ کی ترتیب پر ذکر کیا ہے''۔

حافظ ابن حجر نے کہیں کہیں روایات پر محدثانہ طرز پر کلام کیا ہے۔

ایک اور کتاب:

المطالب العالیہ ہی کے طرز پر لکھی ہوئی ایک اور کتاب حافظ ابن حجر ہی کے معاصر اور خواجہ تاش جو ان کے شاگرد بھی ہیں، کی تصنیف ہے۔ یہ بزرگ حافظ شہاب الدین بوصیری (متوفی ۸۴۰ھ) ہیں۔ یہ حافظ بوصیری قصیدہ بردہ والے بوصیری نہیں ہیں، ایک دوسری شخصیت ہیں۔ انہوں نے حافظ ابن حجر کے طرز پر کتاب ''اتحاف السادة المہر ة بزوائد المسانید العشر ة'' مرتب کی، اس کی سندیں حذف کرکے مختصر ''اتحاف'' تیار کی۔ حافظ ابن حجر اور حافظ بوصیری کی دونوں کتابیں بالکل ایک جیسی ہیں، کیونکہ حافظ بوصیری نے بھی انہیں کتابوں کے زوائد کو منتخب کیا ہے، جن سے حافظ ابن حجر نے استفادہ کیا ہے، البتہ حدیث کے درجات، صحت وحسن اور ضعف وغیرہ کے سلسلے میں حافظ بوصیری کا کلام بنسبت حافظ ابن حجر کے زیادہ ہے۔

المطالب العالیہ کی تحقیق وتعلیق کے دوران حضرت محدث اعظمی کو مختصر اتحاف ...کا ایک فوٹو اسٹیٹ نسخہ دستیاب ہوگیا تھا، کتاب کی تحقیق میں حضرت نے اس کو اول سے آخر تک پیش نظر رکھا، اور اس سے استفادہ کیا۔

المطالب العالیہ کے مخطوطے:

حضرت محدث کبیر کو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، المطالب العالیہ کی تلاش تھی، شیخ محمد سلطان النمنکانی نے ترکی سے دو نسخے بذریعہ فوٹو حاصل کر کے حضرت کی خدمت میں بھیجے، یہ دونوں نسخے مکمل تھے، مگر دونوں میں فرق یہ تھا کہ ایک میں تمام احادیث مع اسناد کے درج تھیں، اور دوسرے نسخے میں کسی صاحب نے سندیں حذف کر کے صرف صحابی کا نام باقی رکھا تھا۔ اول کو ہم ''مسند'' کہیں اور دوسرے کو ''مجردہ''۔ قارئین یہ دونوں نام ذہن میں محفوظ کر لیں، تا کہ کہیں الجھن نہ پیش آئے۔

مخطوطہ مسندہ:

یہ مخطوطہ مشرقی طرزِ کتابت میں لکھا ہوا ہے، مغرب یعنی اندلس کا اندازِ کتابت مشرق سے مختلف ہے۔ یہ نسخہ ۸۴/اوراق پر مشتمل ہے، اور ہر ورق کے دونوں صفحات پر لکھا ہوا ہے، گویا ۱۶۸/صفحات ہیں، ہر صفحہ میں ۶۵/سطریں ہیں، سطریں بہت قریب قریب اور خط نہایت باریک ہے، چونکہ صفحات بڑے تھے فوٹو میں انہیں چھوٹا کر دیا گیا ہے، خط تو پہلے ہی دقیق تھا، حجم گھٹانے سے دقیق تر ہوگیا، فوٹو بھی صاف نہیں ہے، مطبوعہ کتاب میں اس کے نمونے دیئے گئے ہیں، انہیں دیکھ کر ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ اس کا پڑھنا دشوار ہی نہیں ناممکن سا ہے۔ حضرت محدث اعظمی جیسے قلیل الوسائل بزرگ کے لئے اس کا دوسرا عمدہ فوٹو حاصل کر لینا آسان نہ تھا، مزید بر آں یہ کہ کتابت کی غلطیوں اور تحریفات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۱۰ھ میں ملا محمد بن ملا محمد فرید سلیمانی افغانی نے لکھا ہے:

باوجودیکہ مذکورہ نسخہ کا پڑھنا، اس سے استفادہ کرنا، اس کی تحریفات واغلاط کی گرفت اور تصحیح کرنا کوہ کندن سے کم نہ تھا، لیکن محدث کبیر نے اپنی خداداد حذاقت ومہارت، زبردست حافظہ وذکاوت، اور سلامتِ ذوق کی وجہ سے اسے پورا پڑھا، اس سے بھرپور استفادہ کیا، اور اغلاط

کی نشان دہی کی، اور انہیں درست کیا۔

مخطوطہ مجردہ:

یہ مخطوطہ بھی مشرقی رسم الخط میں لکھا ہوا ہے، یہ نسخہ ۵۱۴ر صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۲۹ر سطریں ہیں، خط اس کا بھی باریک ہے، اس کی کتابت ۱۱۱۲ھ میں احمد بن عبدالقادر الرفاعی المکی نے ملک شام کے شہر ادلب میں کی ہے، چنانچہ آخر میں انہوں نے لکھا ہے:

''قد تم الكتاب الشريف المسمى بالمطالب العاليه بزوائد الثمانيه وذالك بقرية ادلب المعصورة صحى يوم الاحد ثانى عشر ربيع آخر سنة الف ومآة واثنى عشر من الهجرة على يد العبد المذنب احمد بن السيد عبدالقادر الرفاعى المكى''.

لیکن کتاب سے احادیث کی سند کس نے حذف کی، اس کا کوئی اشارہ کتاب میں موجود نہیں ہے، غالب گمان یہ ہے کہ مذکورہ کاتب نے ہی یہ کام کیا ہے۔

دونوں نسخوں میں فرق:

ان دونوں نسخوں میں ایک فرق تو یہی ہے کہ ایک کی سندیں محذوف ہیں، اور دوسرے کی موجود ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ نسخۂ مجردہ میں سندوں کو حذف کرنے کے ساتھ بہت سی جگہ حافظ ابن حجر کا کلام بھی جو روایت پر کیا گیا ہے، اور اس کا ہونا ضروری ہے، حذف کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ نسخۂ مجردہ میں کہیں کہیں حدیث مرفوع کی علامت کے طور پر '' رفعه'' کا لفظ بڑھا دیا گیا ہے، یہ لفظ بعض مواقع پر بے ضرورت اور بعض جگہ بے محل آ گیا ہے، کہیں کہیں احادیث کے حوالے میں سہو ہو گیا ہے، ایسی جگہوں پر حضرت نے تنبیہ کر دی ہے۔

کتابت اور فوٹو کے لحاظ سے نسخہ مجردہ ذرا صاف اور واضح ہے، گو کہ اس میں بھی اغلاط واوہام کی بڑی تعداد ہے۔

تحقیق کے لئے مخطوطہ کا انتخاب:

کتاب کے دونوں نسخے حضرت محدث اعظمی نے بتمام وکمال پڑھ لئے، تحقیق کے لئے دونوں میں سے کسی ایک اصل قرار دے سکتے تھے، مگر کویت کے'' وزارة الاوقاف والشؤن

الاسلامیہ'' کے'' شعبہ تراث اسلامی'' نے جسے یہ کتاب شائع کرنی تھی، مشورہ دیا کہ نسخہ مجردہ کو اصل قرار دے کر اسی پر کام کیا جائے، کیونکہ موجودہ دور میں نسخہ مسندہ کے مقابلہ میں اسناد ذکر کئے بغیر ہی شائع کرنا زیادہ مناسب ہے، بالخصوص جب کہ نسخہ مسندہ سے پورا پورا استفادہ کیا گیا ہے، لیکن نسخہ مجردہ کو بنیاد بنا کر تحقیق وتعلیق کا عمل بھی کچھ بہت سہل نہ تھا، بس یہ ہے کہ اس کا خط صاف اور قابلِ خواندگی ہے، ورنہ اس میں بھی غلطیاں کم نہیں ہیں۔ بہت سی عبارت کاتب کی غلطی سے چھوٹ گئی ہے، نیز سند جس کسی نے حذف کی ہے اس کی جانب سے بھی اوہام کی کثرت ہے۔

بہر حال اغلاط دونوں نسخوں میں بہت تھے، اور نسخہ مسندہ کا پڑھنا خود درد سر تھا، مگر چونکہ کوئی نسخہ اور نہ تھا اس لئے یہ درد سر برداشت کرنا پڑا، دونوں کا مقابلہ کیا گیا، غلطیوں کی اصلاح کی گئی، چھوٹے ہوئے الفاظ لکھے گئے، اوہام کی نشاندہی کی گئی، اس سلسلے میں نسخہ مسندہ سے اور احادیث کی دوسری کتابوں سے، اور آخر میں ''مختصر الاتحاف'' سے مدد لی گئی۔

حیدرآبادی نسخہ گو کہ نسبتاً ان دونوں سے بہتر تھا مگر نامکمل تھا، اور اس کا فوٹو بھی مہیا نہ ہوسکا، اس لئے اس سے استفادہ نہ کیا جاسکا۔

طریقۂ تحقیق:

سب سے پہلے تو نسخہ مجردہ سے موجودہ طرزِ تحریر کے مطابق ایک نسخہ تیار کیا گیا، اس میں کتابت کے رموز واشارات مثلاً قوسین، کاما، واوین، وغیرہ کی رعایت کی گئی۔

(۲) احادیث پر اول سے آخر تک نمبر شمار ڈالے گئے۔

(۳) نسخہ مجردہ کا نسخہ مسندہ سے بالاستیعاب مقابلہ کرکے دونوں کے اختلاف کو جہاں کہیں تھا، ظاہر کیا گیا، جن احادیث پر حافظ ابن حجر نے کلام کیا تھا مگر نسخہ مجردہ سے وہ محذوف تھا، اسے بڑھایا گیا، اور اس کے اجمال واختصار کی حسبِ ضرورت توضیح کردی گئی، اور اس کا التزام کیا گیا کہ حافظ ابن حجر کی کوئی بات چھوٹنے نہ پائے۔

(۴) اس کتاب کا حافظ بوصیری کی کتاب ''مختصر اتحاف السادة المهرة فی زوائد مسانید العشرة'' سے بھی مکمل مقابلہ کیا گیا ہے، کیونکہ دونوں کا موضوع اور طریقہ کار ایک ہے، اور جہاں کہیں دونوں میں کوئی اہم فرق ہوا ہے اس کو ذکر کردیا گیا ہے، نیز مخطوطہ کی اصلاح میں بھی اس

سے کافی مدد لی گئی ہے،اور محقق نے اس کا بھی التزام کیا ہے کہ جہاں کہیں حافظ بوصیری نے حدیث پر کوئی کلام کیا ہے اسے ضرور نقل کر دیا جائے،اور جہاں انہوں نے سکوت کیا ہے وہاں محقق نے 'سکت علیہ البوصیری' کہہ کر متنبہ کر دیا ہے،لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا سکوت کوئی خاص ''اصطلاحی معنی'' رکھتا ہے،جیسا کہ بعض ممتاز محدثین کی اصطلاح معروف ہے کہ ان کا کسی حدیث پر سکوت کرنا گویا اس حدیث کی توثیق کی دلیل ہے،امام بوصیری کا سکوت اس طرح کے کسی معنی پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اس حدیث پر کوئی کلام نہیں کیا

(۵) حدیث کے درجات بھی بیان کئے گئے ہیں،اور اس کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔

(الف) کہیں کہیں خود حافظ ابن حجر نے درجات کی تعیین کی ہے،لیکن وہ نسخہ مجردہ میں حذف کر دیئے گئے ہیں،انہیں نسخہ مسندہ کی مدد سے دوبارہ لکھا گیا ہے۔

(ب) حافظ بوصیری کے بیان سے مدد لی گئی ہے۔

(ج) اگر وہ حدیث امام ہیثمی کے ''مجمع الزوائد'' میں موجود ہے اور اس پر انہوں نے صحت و حسن یا ضعف کا کوئی حکم لگایا ہے تو اسے ذکر کیا گیا ہے۔

(د) جہاں کہیں ان علماءِ اعلام کا کوئی کلام نہیں ہے،اور کسی دوسرے محدث کا بھی کوئی کلام نہیں ملا،وہاں روایت کے ''مرفوع'' یا ''موقوف'' یا ''مرسل'' یا ''موصول'' ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے،اور اس کے راویوں پر اسماء الرجال کی کتابوں کے مطابق حکم ذکر کر دیا گیا ہے،لیکن ہر جگہ اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔

(۶) اصل کتاب میں ہر حدیث کا حوالہ موجود ہے،لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کتاب میں وہ حدیث مل گئی تو حاشیہ میں اس کا بھی حوالہ دیدیا گیا ہے،بالخصوص جب کہ ''مجمع الزوائد'' میں موجود ہو،اور یہ حوالے عموماً اصل ماخذ سے دیئے گئے ہیں،البتہ کہیں کہیں ''کنز العمال'' کے واسطے سے دیئے گئے ہیں۔

یہ طریقہ حضرت محدث اعظمی کی علمی دیانت کی دلیل ہے،ورنہ آج کل کتنے محققین و مؤلفین ایسے ہیں کہ اصل کتاب کی صورت بھی نہیں دیکھی ہوتی،کسی کتاب سے اس کے اقتباس

نقل کر کے اسی پر اعتماد کرتے ہوئے بڑے بڑے طمطراق کے ساتھ اصل ماخذ کا حوالہ نقل کر دیتے ہیں، پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ مصنف نے اصل کتاب سے عبارت نقل کی ہے، حالانکہ اس غریب کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ یہ ایک طرح کی علمی خیانت، فریب اور احسان ناشناسی ہے، آخر جس کتاب سے وہ حوالہ اخذ کیا گیا ہے اس کا احسان ہے یا نہیں؟ پھر اسے چھپایا کیوں جائے؟ اور بسا اوقات حوالے میں غلطی ہوتی ہے، عبارت میں کچھ تصرف ہو جاتا ہے، لیکن اس غریب کو اس کی خبر نہیں، اور جاننے والوں کے نزدیک اس کا بھرم کھل کر رہتا ہے۔

پرانے محدثین میں حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ اس کا بہت اہتمام کرتے ہیں، کہ جہاں سے کوئی بات لی ہے، اس کا حوالہ دے دیا، حضرت محدث اعظمی بھی اس کے نہایت شدت سے پابند تھے، جو کتاب دیکھی نہیں، اس کا براہ راست حوالے دے کر لوگوں کو دھوکہ میں نہیں مبتلا کرتے تھے، جب کہ بعض مدعیانِ علم وتحقیق کا کل سرمایہ یہی سرقاتِ علمی ہیں، دوسروں کی محنت ان کی تلاش وجستجو اور ان کی کاوش وکوشش پر اپنا نام لگا کر اپنے کو چمکاتے ہیں۔

(۷) کہیں کہیں حافظ موصوف نے ایسی روایتیں بھی نقل کر دی ہیں جو ان کی شرط کے مطابق نہیں ہیں، یعنی صحاح ستہ اور مسند احمد میں سے کسی کے اندر موجود ہے، ایسی جگہوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

(۸) کتاب پر حسبِ ضرورت مختصر حاشیے تحریر کر کے نادر اور مغلق الفاظ کے معانی کی وضاحت کر دی گئی ہے، جہاں رجال کے تعارف کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اسے لکھ دیا گیا۔

(۹) صحیح اور مستند احادیث پر شروع ہی میں ہلکا سا تارہ (☆) بنا کر ممتاز کر دیا گیا ہے، کہ اولِ نظر میں معلوم ہو جائے کہ یہ حدیث لائقِ استناد ہے، لیکن اس علامت کے کسی حدیث نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لائقِ اعتماد نہیں ہے، علامت نہ ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کی تحقیق کر لی جائے۔

(۱۰) کہیں کہیں حدیث کے آخر میں یہ نشان (=) ملے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق بعد کی حدیث سے ہے، ایسی صورت میں حدیث کا حوالہ دوسری یا تیسری حدیث کے بعد آتا ہے، جب کہ سب کا ماخذ ایک ہوتا ہے۔

تحقیق کے ان اصولوں کو پھر پڑھ لیا جائے ،اور غور کیجئے کہ ان کی پابندی کس قدر مشکل امر ہے،آج تو حدیث کی مفصل فہرستوں نے کام بہت آسان کر دیا ہے، کتنے ایسے لوگ جو حدیث کی بنیادی چیزوں سے بھی بے خبر ہیں ان فہرستوں کی ورق گردانی کے بدولت وہ محدث بن گئے ہیں۔حالانکہ جب کوئی صاحبِ نظر انہیں دیکھتا ہے تو فوراً بھانپ لیتا ہے کہ یہ سارا مال دریوزہ گری کا ہے، جسے چھپایا جارہا ہے۔آج کل جونئی نئی کتابیں دھڑادھڑ ابازار میں آرہی ہیں، ان میں بیشتر تحقیقات اسی طرح کا ردی مال ہوتا ہے،اصاغر کی ان نامعتبر تحقیقات نے اکابر کی تحقیقات کا وزن بہت کچھ بڑھا دیا ہے۔حضرت محدث کبیر نے جس طرح خون جگر جلا کر، چراغوں کا دھواں کھا کر، راتوں کو آنکھوں میں کاٹ کر،اور ساری لذاتِ دنیا سے کٹ کر علم حدیث کا جو عظیم سرمایہ حاصل کیا ہے،اس کا نمونہ اس کتاب کی تعلیقات کی ہر ہر سطر سے ملتا ہے،کون سی حدیث کس کتاب میں ہے؟ صرف اپنے حافظہ اور استحضار کی مدد سے نکالنا،اس کا حوالہ دینا،اور ایک دو جگہ نہیں بکثرت ایسا کرنا، یہ انتہائی وسعتِ مطالعہ، وفورِ علم،اور قوتِ یادداشت کا کرشمہ ہے، جو اللہ کا بڑا فضل وکرم ہے۔

تعلیقات کے نمونے:

کتاب کا تعارف تو ہو گیا،لیکن نہ تو ہر ایک شخص کو اتنا موقع ہے کہ اصل کتاب کا مطالعہ کرسے،اور نہ سب لوگ اسے حاصل کر سکتے ہیں،اس لئے اگر ہم یہاں چند نمونے تعلیقات وتحقیقات کے پیش کر دیں تو ان شاء اللہ بے محل نہ ہوگا،اور اس سے حضرت کے علمی مقامِ بلند کا اہل علم کو اندازہ ہو سکے گا۔

المطالب العالیہ جلد اول ص ۱۸ ایک حدیث ملاحظہ کیجئے:

''بنت قیس وهی خوله وهی جدة خارجه بن الحارث انه سمعها تقول:قد اختلفت یدی ویدی رسول الله ﷺ فی اناء واحد''.

حدیث کے راوی خولہ بنت قیس کے تعارف میں دونوں مخطوطے **''جدة خارجه بن الحارث''** پر متفق ہیں،یعنی وہ حارثہ بن حارث کی دادی ہیں،لیکن حارثہ کے نام پر محقق کی نگاہ ٹھٹکی ان کی معلومات کے مطابق ''حارثہ بن حارث'' درست نہیں ہے،وہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ

دونوں نسخے یہی نام بتاتے ہیں،لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ ''خارجہ بن حارث'' ہے،اور دلیل میں انہوں نے حافظ ابن حجر کی ''الاصابۃ'' اور ''تہذیب التہذیب'' کا حوالہ پیش کیا۔

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعینہ یہی روایت ''ابوداوٗد'' اور ''ابن ماجہ'' میں بھی مل گئی، ابوداوٗد میں تصریح ہے کہ یہ ''خارجہ بن حارث'' ہیں، پھر یہ بھی فرمایا کہ چونکہ یہ حدیث ابوداوٗد اور ابن ماجہ میں موجود ہے اس لئے اس کو زوائد میں شمار کرنا صحیح نہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ حافظ ابن حجر جیسے حافظِ حدیث اور صاحبِ استحضار محدث کی نگاہ اس حدیث سے کیونکر چوک گئی؟ حضرت نے اس کی توجیہ یہ کی کہ ابوداوٗد اور ابن ماجہ میں ''خولہ بنت قیس'' کا نام نہیں آیا ہے، بلکہ ان کی کنیت ''ام صبیہ'' آئی ہے، اور ''مسند ابویعلی'' میں ''خولہ بنت قیس'' ہے۔غالباً حافظ موصوف کے تصور میں یہ دو شخصیتیں آ گئی ہوں اور ایسا ہونا محلِ تعجب نہیں ہے، کیونکہ ایک جگہ محض ''ام صبیہ'' ہے، اور دوسری جگہ '' بنت قیس وھی خولة '' کا لفظ ہے۔اس جگہ عین ممکن ہے کہ کسی محقق کی نگاہ چوک جائے، مگر حضرت محدث اعظمی کی علم اسماء الرجال پر گہری نگاہ نے یہ حقیقت کھول دی کہ ابوداوٗد اور ابن ماجہ میں، جو خاتون ''ام صبیہ'' کی کنیت کے ساتھ مذکور ہیں، وہ وہی ہیں جو مسند ابویعلی ''بنت قیس وھی خولة'' کے لفظ کے ساتھ ذکر کی گئیں ہیں، اس کے لئے حضرت نے حافظ ابن حجر ہی کی کتاب ''الاصابۃ'' کا حوالہ دیا ہے۔

(۲) نام کی تصحیح کا ایک نمونہ اور دیکھئے، ج ا۔ص ۱۵ا پر ایک حدیث کے راوی کا نام مخطوطہ مجردہ میں ''طلحہ بن ابی صادقہ'' آیا ہے، اور مسندہ میں ''طلحہ بن ابی صافنہ''، لیکن محدث اعظمی کا حافظہ ان میں سے کسی کو قبول نہیں کرتا، انہوں نے مراسیل اور ابوداوٗد کے حوالے سے اس کی تصحیح کی اور بتایا کہ صحیح ''طلحہ بن ابی قنان'' ہے۔

(۳) اسی طرح، ج ا۔ص ۶۱ پر ایک حدیث کے ذیل میں ''حضرمی بن عامر'' کا ذکر آیا ہے، لیکن دونوں مخطوطوں میں ''حضرمی بن عمار'' کا لفظ ہے، مگر یہ خطا ہے۔''الاصابۃ'' میں یہ نام ''حضرمی بن عامر'' ہے۔

(۴) ایک مثال متن کے تصحیح کی ملاحظہ ہو، دونوں مخطوطوں کے الفاظ یہ ہیں:

"ابو حازم رای سھل بن سعد قال بول الشیخ الکبیر وھو قائم".

اس متن میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ" قال" کے بعد کوئی لفظ یا تو لکھنے سے رہ گیا ہے، یا لفظ" بول" میں کوئی تصحیف ہوئی ہے، تاہم کوئی بات واضح نہیں ہے۔محدث کبیر نے اپنے ذوق سے اس کی تصحیح کی، اور فرمایا کہ صحیح بجائے "قال" کے "بال بول الشیخ" ہے۔فرماتے ہیں کہ اس تصحیح کے بعد میں نے "نصب الرایہ" میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت دیکھی۔"یبول بول الشیخ "اور پھر "اتحاف" میں بعینہ " بال بول الشیخ "کے لفظ سے ملی۔

(۵) بریدۃ:ان النبی ﷺ کان اذا انتبه من اللیل دعا بجاریة یقال لھا بریرۃ بالسواک(لابن ابی عمر)

حضرت محدث فرماتے ہیں کہ علامہ بوصیری کا ارشاد ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی منذر بن ثعلبہ عبدی ہیں، ان کا تذکرہ مجھے نہیں ملا۔حضرت فرماتے ہیں "سبحان من لا یسھو ولا ینسی" سبحان اللہ سہو ونسیان سے تو وہی ایک ذات پاک ہے۔علامہ بوصیری جیسے صاحب نظر عالم کو منذر بن ثعلبہ کا تذکرہ نہیں ملا، حالانکہ ان کا تذکرہ اسماء الرجال کی مشہور و متداول کتابوں میں مثلاً "کمال تہذیب الکمال" اور "تہذیب التہذیب" میں موجود ہے۔

(۶) مصعب بن ابی عمر رأی قوماً یتوضون فقال خللوا یعنی بین الاصابع(مسدد)

اس حدیث میں بظاہر کوئی بات قابل گرفت نہیں ہے، صاف اور سیدھی سی بات ہے کہ مصعب بن ابی عمر نے کچھ لوگوں کو وضو کرتے ہوئے دیکھا، تو انہوں نے فرمایا کہ انگلیوں کے درمیان خلال کرو۔

لیکن اس صاف اور واضح حدیث میں حضرت کے علم ونظر نے مصعب بن ابی عمر کے لفظ کو تسلیم نہیں کیا، حضرت کی دوررس نگاہ اور عمیق مطالعہ نے "مصنف ابن ابی شیبہ" ایک روایت سے اس کی غلطی پکڑ لی، اس میں یہ حدیث اس طرح ہے۔

"عن مصعب بن سعد قال مر عمر علی قوم یتوضون".

اس سے معلوم ہوا کہ مصعب بن ابی عمر نہیں ہے، بلکہ مصعب بن سعد ہے، مگر سوال یہ

ہے کہ یہ غلطی ہوئی کیسے؟ فرماتے ہیں کہ مسدد کی روایت میں "مصعب بن سعد انّ عمر رأی" کا لفظ ہے۔ ناسخ کی چوک سے لفظ "سعد" تو ساقط ہوگیا، اور اس نے "انّ" کو "ابی" سمجھ لیا، اور عبارت اس طرح لکھ دی "مصعب بن ابی عمر" ایسی غلطیوں پر گرفت اور ان کی تصحیح ایک صاحب نظر محدث ہی کرسکتا ہے، جس کی نظر حدیث کے بیشتر ذخائر پر ہو اور کامل استحضار رکھتا ہو۔

(۷) چند راویوں پر علامہ بوصیری نے ضعف کا حکم لگایا ہے، اور اس کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ فلاں راوی مجہول ہے، مگر محدث کبیر نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ ص ۲۱ پر ایک روایت سہل بن ابی امامہ سے منقول ہے۔ ان کے بارے میں علامہ بوصیری نے فرمایا کہ یہ مجہول ہیں، اس لئے روایت ضعیف ہے۔ شیخ محدث نے فرمایا کہ یہ سہل معروف ہیں، مجہول نہیں، اور ثقہ ہیں، اور جو صاحب مجہول ہیں وہ شامی ہیں، وہ اس روایت کے راوی نہیں ہیں۔

اور، ج ۱۔ ص ۳۳ پر تین روایتوں کو ان کے کسی کسی راوی کے مجہول ہونے کے باعث علامہ بوصیری نے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن شیخ محدث فرماتے ہیں کہ ان تینوں روایتوں کے رجال ثقہ اور معروف ہیں، لہٰذا تینوں صحیح ہیں۔

(۸) ج ۱۔ ص ۳۷ حدیث ۱۲۲ میں ایک دلچسپ غلطی ہوئی ہے، نظر میں وسعت اور گیرائی نہ ہوتو ہرگز اس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ الفاظ یہ ہیں "ابن حسرۃ انه رای ابا هريرة" پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ ابن حسرۃ کوئی تابعی ہیں، جو حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں، لیکن حضرت نے فرمایا کہ صورت حال یہ نہیں ہے کہ ابن حسرہ حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد ہیں، درحقیقت یہ کاتب کی غلطی ہے، یہ "عمن اخبره" ہے، اصل الفاظ اسی طرح ہونے چاہئے، اس کی تصحیف نے ابن حسرہ بنادیا ہے "منصور بن مهران عمن اخبره" علامہ بوصیری نے "اتحاف" میں ایسے ہی لکھا ہے۔

(۹) المطالب العالیہ جلد دوم ص ۱۸۷ میں ایک صاحب کا نام ابو حدیرج لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ دونوں مخطوطے اس پر متفق ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ تصحیف ہے، صحیح "ابو حدیدہ" ہے۔ (حوالہ کے لئے اصابہ ج ۴۔ ص ۴۸ دیکھئے)

(۱۰) ایک حدیث کے سلسلے میں مخطوطہ مسندہ کے کاتب سے ایک دلچسپ غلطی ہوئی ہے، اور

اس غلطی کے نتیجہ میں مجردہ کے کاتب سے ایک دوسری چوک ہوگئی ہے، حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے ایک باب قائم کیا ہے۔

"باب الزجر عن صید الطیر لیلاً"۔ ج۲۔ص۳۰۸

مسندہ کے کاتب نے اس عنوان کے ساتھ متصلاً لفظ "الحدیث" کا اضافہ کردیا ہے، اور پھر اس باب کے تحت جو حدیث تحریر کی اس کا پہلا راوی یعنی سند کے شروع کا راوی نہیں لکھا، بلکہ دوسرے راوی سے سند شروع کی، اور جب مجردہ کے کاتب نے راویٔ اول کا نام نہیں دیکھا تو وہ یہ نہ دریافت کرسکا کہ یہ روایت کس مسند کی ہے، اس لئے اپنی عادت کے مطابق وہ اس روایت کا حوالہ نہ دے سکا، کیونکہ حوالہ اولِ سند ہی سے اخذ کیا جاتا ہے، اور مسندہ میں اول مسند مذکور نہیں ہے۔

حضرت محدث فرماتے ہیں کہ عنوان کے بعد "الحدیث" کا اضافہ غلط ہے، میرا خیال ہے کہ یہ لفظ "الحارث" ہے، اور وہی راوی اول ہیں، یعنی ابتدائے سند میں الحارث کا لفظ ہونا چاہئے، اور اسی سے حوالہ متعین ہوگا کہ یہ روایت "مسند حارث بن ابی اسامہ" کی ہے۔ چنانچہ حضرت نے مطبوعہ کتاب میں "الحدیث" کا لفظ ذکر نہیں کیا ہے، اور آخر میں مسند الحارث کا حوالہ دیا ہے۔

(۱۱) ابن عمر ان النبی ﷺ اتی بجبنة فقیل :ان هذا لطعام یصنعه المجوس،فقال:اذکروا اسم الله علیه وکلوا قلت (رواه)(د)من طریق عمر بن منصور بهذا الاسناد بلفظ آخر۔ ج۲۔ص۳۲۱

اس حدیث میں "قلت" کے بعد "رواہ" کا لفظ دونوں مخطوطوں میں نہیں ہے، اور اس کے بعد "دال"، بشکل "واؤ"، لکھی ہوئی ہے، یعنی "**قلت ومن طریق عمرو بن منصور الخ**" اس پر کوئی صاحب نظر عالم ہی چونکے گا، کہ شاید اس میں کوئی غلطی ہو۔ چنانچہ حضرت محدث اس پر چونکے اور آپ کی دقتِ نظر اور وسعتِ علم نے بتایا کہ یہ لفظ "واؤ" نہیں ہے "دال" ہے، جو ابوداؤد کا رمز ہے، اور اس سے پہلے "رواہ" لفظ چھوٹ گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ اس حدیث کو اسی سند سے ابوداؤد نے عمرو بن منصور کے طریق سے دوسرے الفاظ سے نقل کیا ہے۔

یہی وہ دقیقہ رسی ہے جو ایک صاحبِ ذوق، ماہرِ فن، اور رمز شناس عالم ومحدث کو خصوصی امتیاز بخشتی ہے۔

(۱۲) آخر میں ہم محدث اعظمی کے عمقِ مطالعہ اور غور وتدبر کی گیرائی کی ایک اور مثال پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

کتاب کی تیسری جلد کے ص ۱۳۸ پر حاشیہ میں حضرت نے مسندہ سے حافظ ابن حجر کا ایک کلام نقل کیا ہے، جو مجردہ میں موجود نہیں ہے، لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ نسخہ مسندہ اغلاط وتحریفات سے پر ہے۔ اس عبارت میں بھی ایسی تحریف ہوئی ہے کہ مطلب سمجھنا سخت دشوار ہے، عبارت ملاحظہ ہو:

"رواه الطبراني في معجمه الكبير عن يوسف قاضي عن سليمان (بن حرب شيخ اسحاق) رواه الروهاني في مسنده عن الصنعاني عن خلف بن هشام وهذا اسناد صحيح ولكن له علة رواه علي بن عبدالعزيز في مسنده عن حازم (كذا) كلاهما عن حماد ......رواه غير واحد عن ابي حازم عن سعيد مقبري عن ابي هريره ومن هذ ا الوجه علقمة (خ) يعني البخاري، فان كان حماد بن زيد حفظه فيتحمل ان يكون ابو حازم سمعه من وجهين".

اس عبارت کو حضرات اہل علم بغور پڑھیں، اور دیکھیں کہ کوئی تسلی بخش مطلب نکلتا ہے؟ حافظ صاحب موصوف نے اس روایت میں علت کا تذکرہ کیا ہے، لیکن عبارت سے وہ علت واضح نہیں ہوتی، حضرت فرماتے ہیں کہ اس عبارت میں تحریف ہوئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ "**كلاهما عن حماد**" اپنی صحیح جگہ پر نہیں ہے، اس کی صحیح جگہ "عن خلف بن ہشام" کے بعد ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں، اس عبارت میں اور بھی کچھ غلطیاں ہیں، حضرت حافظ علیہ الرحمہ کے کلام کا حاصل یہ لکھا ہے کہ:

"یہ روایت کئی لوگوں نے "حماد عن ابی حازم عن سہل بن سعد" کے طریق سے روایت کی ہے، اور کئی لوگوں نے "حماد عن ابی حازم عن سعید المقبری عن ابی ہریرۃ" کے طریق سے نقل کیا ہے، ان دونوں میں سند کا اختلاف ہے، ایک سند میں ابو حازم، سہل بن سعد سے روایت کرتے

ہیں،اور دوسری سند میں سعید مقبری سے،اور وہ ابوہریرہ سے۔اسی اختلاف کو حافظ ابن حجر نے علت کہا ہے۔پھر اس کا حل یہ تحریر فرمایا ہے کہ شاید ابوحازم نے دونوں طریق سے اس حدیث کی سماعت کی ہو،اس لئے اس کو علت نہ قرار دیا جائے،لیکن حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں جہاں یہ حدیث دونوں طریق سے ذکر کی ہے،وہاں انہوں نے اس علت کا تذکرہ نہیں کیا ہے، غالباً انہوں نے اس علت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے''۔

اس تشریح کے بعد عبارت کا مطلب واضح ہو گیا۔

مخطوطہ مسندہ کی تحقیق:

حضرت محدث کبیر نے تحقیق وتعلیق کے لئے کویت کے شعبہ تراث اسلامی کے مشورہ کے باعث ''نسخہ مجردہ'' کو اصل قرار دیا تھا،لیکن یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ نسخہ بعینہ حافظ ابن حجر والا نسخہ نہ تھا،اس میں سندیں حذف ہیں،بہت سی جگہ حافظ صاحب موصوف کا کلام حذف کر دیا گیا ہے، بعض جگہ کسی کسی اصطلاح کا اضافہ ہے،جو کہیں کہیں بے محل بھی ہے۔نسخہ مسندہ میں یہ کوتاہیاں نہیں ہیں،لیکن وہ اتنا ناصاف گنجلک اور باریک ہے کہ اس کا پڑھنا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے،لیکن تحقیق کا حق ادا کرنے کے لئے حضرت نے یہ کوہ کنی کی۔بعد میں حضرت کو خیال آیا کہ نسخہ مسندہ کو مرتب ومحقق کر دینا چاہئے،چنانچہ صاحبزادہ محترم حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ نے بتایا کہ ایک حد تک اس کا بھی کام ہو چکا ہے۔راقم الحروف کی رسائی ابھی اس مسودہ تک نہیں ہوئی ہے،کہ اس کا بقدر ضرورت تعارف تحریر کرتا۔**لعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً**

ماخذ:المآثر۔جنوری،فروری،مارچ(۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆☆☆

کشفُ الاستار عن زوائد البزّ ار
تحقیق وتعلیق المحد ث الاعظمی

ناظرین کرام! المطالب العالیہ کے تعارف میں پڑھ چکے ہیں کہ احادیث نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے چھ مجموعے جو اہل علم کی اصطلاح میں ''صحاح ستہ'' کہلاتے ہیں، اور وہ اپنے عہدِ تصنیف سے لے کر اب تک معروف ومتداول ہیں، ان کے علاوہ مختلف زمانوں میں محدثین نے اپنی اپنی سند سے اور بھی بہت سے مجموعے تالیف کئے ہیں، ان مجموعوں میں کچھ وہ حدیثیں بھی تھیں جو صحاح ستہ میں موجود ہیں، اور کچھ ان کے علاوہ وہ بھی تھیں جو صحاح ستہ میں مختلف وجوہ واسباب کی سے درج نہیں ہوئیں، اور ایسی احادیث کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ یہ آبدار موتی مختلف ذخائر حدیث میں منتشر طور پر بکھرے ہوئے تھے، ان کی تلاش وجستجو اور پھر ان سے استفادہ کچھ سہل نہ تھا۔ فنِ حدیث کے نامور صاحب نظر امام علامہ نورالدین ہیثمی کا امت پر، اور علماءِ امت پر یہ ناقابلِ فراموش احسان ہے کہ انہوں نے چھ مزید کتابوں کا انتخاب کیا، جن میں ہزار ہا حدیثیں ہیں، ان کتابوں کے نام پھر ملاحظہ فرمالیجئے۔ مسند احمد، مسند بزار، مسند ابویعلی، معجم کبیر، معجم اوسط، معجم صغیر للطبرانی۔ ان میں اخیر کے علاوہ سب ضخیم ضخیم متعدد جلدوں میں ہے۔ امام ہیثمی نے ان کی سب حدیثیں پڑھیں، صحاح ستہ کی احادیث سے ان کا موازنہ ومقابلہ کیا، ایک ایک حدیث کا سند ومتن سمیت جائزہ لیا، جو حدیثیں صحاح میں نہ تھیں، انہیں الگ قلمبند کیا، اور ہر ایک کے زوائد کو الگ الگ مجموعوں میں ترتیب دیا۔ مذکورہ بالا کتابیں ابوابِ فقہ کے لحاظ سے مرتب نہ تھیں، ان کے زوائد کو فقہی ابواب کے اصولوں پر مرتب کیا، ہر ایک کا الگ الگ نام تجویز کیا، پھر ان کے شیخ حافظ زین الدین عراقی نے مشورہ دیا کہ ان کی سندیں حذف کر کے

سارے مجموعوں کو یکجا کردیا جائے۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق انہوں نے ان چھ کتابوں کے زوائد کو سندیں حذف کر کے یکجا کردیا، اور جو روایت جس جس کتاب میں تھی اس کا حوالہ دے دیا، نیز ہر روایت پر، اس کی سند پر، اس کے رواۃ پر کلام کیا، یہ بڑا مشکل کام تھا، اور بڑی دیدہ وری کا طالب تھا، مگر علامہ ہیثمی نے یہ مشکل کام کر ڈالا۔ اس مجموعے کا نام حافظ عراقی نے ''مجمع الزوائد ومنبع الفوائد'' رکھا۔ اس کے بارے میں علامہ محمد بن جعفر کتانی لکھتے ہیں۔ ''**وهو من انفع كتب الحديث بل لم يوجد مثله كتاب ولا صنف نظيره في هذاالباب**'' یہ کتاب ذخائر حدیث کی نافع ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، بلکہ اس جیسی دوسری کوئی کتاب نہیں ہے، اور نہ اس باب اس کے پایہ کی کوئی کتاب لکھی گئی۔ ''مجمع الزوائد'' دس جلدوں میں اب سے بہت پہلے شائع ہوچکی ہے، اور اہل علم کے لئے مرجع استفادہ بنی ہوئی ہے، اس کے بعد ان کتابوں کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی، جو الگ الگ ناموں سے مرتب کی گئی تھیں، حالانکہ ابتداء محنت انہیں پر کی گئی تھی، مگر مجمع الزوائد کے بعد وہ پردۂ خفا میں چلی گئیں، اسی لئے ان میں سے ایک دو کے علاوہ شاید کوئی اب تک طبع بھی نہیں ہوسکی ہے۔

مسند بزّار:

ان چھ کتابوں میں سے ایک کتاب امام ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار البصری المتوفی ۲۹۲ھ کی ''مسند کبیر معلل'' ہے، جس کا نام ''البحر الذخار'' ہے۔ اس کتاب کے زوائد کو حافظ نورالدین ہیثمی نے ''کشف الاستار'' کے نام سے جمع کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک نفیس قلمی نسخہ محدث اعظمی کو کہیں سے دستیاب ہوگیا تھا، اسی کو بنیاد بنا کر حضرت مولانا نے تحقیقات وتعلیقات سے مزین کر کے اسے شائع کرایا۔ غالباً مذکورہ بالا چھ کتابوں کے زوائد کے سلسلہ میں یہی ایک کتاب شرمندۂ طباعت ہوسکی ہے۔ یہ حضرت مولانا کا عظیم علمی کارنامہ ہے۔ کتاب اور اس کے تحقیقات وتعلیقات کا تعارف آگے آرہا ہے، یہاں مناسب ہے کہ اصل صاحب کتاب یعنی امام بزار اور صاحب کشف الاستار علامہ نورالدین ہیثمی تعارف تحریر کردیا جائے۔

امام بزار:

بزار کا تلفظ علامہ سمعانی نے الانساب میں ''**بفتح الباء المنقوطه بواحدة**

والزاء المشدده وفی آخرها الراء'' بتایاہے۔(الانساب۔ج۲۔ص۱۹۴)یعنی باءکوفتحہ اورزاءکوتشدیداورآخر میں راء۔فرماتے ہیں بزاران حضرات کا نام ہے جودانوں سے تیل نکالتے یاان کے بیچنے کا کام کیا کرتے تھے۔اس پیشہ سے منسوب بہت سے علما اور ائمہ ہیں،مثلاً ابوعمر دینارالبزار،بشر بن ثابت البزار،خلف بن ہشام البزارالمقری وغیرہ۔

امام بزار کا نام احمد بن عمرو بن عبدالخالق ہے،کنیت ابوبکراور بصرہ کے باشندے ہونے کی وجہ نسبت البصری۔ان کے اساتذہ میں ہدبہ بن خالد،عمرو بن موسیٰ الحادی،اسماعیل بن سیف،حسن بن علی بن راشدالواسطی،اورابراہیم بن سعیدالجویری ہیں۔

علامہ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں کہ''**ذکره قطنی فاثنی علیه وقال ثقة یخطی وکان یتکل علی حفظه**''۔(تذکرۃ الحفاظ ج۲۔ص۶۵۴)

امام دارقطنی نے ان کا تذکرہ کیا ہے،اورفرمایا کہ ثقہ ہیں،لیکن ان سے غلطیاں بھی ہوتی تھیں،وہ اپنے حافظہ پراعتماد کیا کرتے تھے۔

امام بزار نے دومسند مرتب کی تھیں،ایک''کبیر''اور دوسری''صغیر''۔مسند کبیر کا نام ''البحرالذخار''ہے،اس میں امام بزار نے احادیث اوراس کے علل پرکلام کیا ہے۔(الانساب ج۲ ص۱۹۵)اسی لئے اسے''مسند کبیر معلل''کہاجاتا ہے،مگرحافظ عراقی فرماتے ہیں کہ''حدیث کے علل پرتو کم گفتگوفرمائی ہے،البتہ راویوں کے تفرداور متابعت وعدم متابعت کوبکثرت بیان کیا ہے''۔(الرسالۃ المستطرفہ۔ص۵۱)

اخیر عمر میں وہ اصفہان اورشام اوراس کے اطراف میں چلے گئے تھے،اور وہیں علم حدیث کی نشرواشاعت کرتے رہے،ان کے تلامذہ کی تعداد بہت ہے،عبدالباقی بن قانع،محمد بن العباس بن نجیح،ابوبکر الختلی،عبدالرحمان بن حسین اور ابوالشیخ ان کے شاگردوں میں ہیں۔امام بزار کی وفات مقام رملہ میں ۲۹۲ھ میں ہوئی ہے۔

علامہ نورالدین الہیثمی القاہری الحافظ:

علامہ ہیثمی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں،جن کے بارِاحسان سے ایک زمانہ دبا اور جھکا ہوا ہے،ان کے علمی کارناموں کی گونج آج تک دنیائے علمِ حدیث میں سنائی دیتی ہے،

حدیث کے متون کا جس درجہ انہیں استحضار تھا، کم لوگوں کو یہ مقام حاصل ہوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے علم حدیث کی خدمت کے لئے انہیں چن لیا تھا، اسلام کی معجزانہ ہستیوں کو اگر شمار کیا جائے تو علامہ ہیثمی کا نام نمایاں ہوگا، کیا علم و فضل، کیا حفظ و اتقان، کیا حفظ و استحضار، کیا ذہانت و ذکاوت، کیا زہد و عبادت، اور کیا خدمت و اطاعت، ہر ایک میں وہ یکتائے روزگار تھے۔

علامہ ہیثمی کا اسم گرامی علی بن ابی بکر تھا، نورالدین لقب اور ابوالحسن کنیت تھی۔ پیدائش قاہرہ میں رجب ۷۳۵ھ میں ہوئی۔ ابتداء قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد انہوں نے مشہور حافظ حدیث اور محدث وقت شیخ زین الدین عراقی (ولادت ۷۲۵ھ وفات ۸۰۶ھ) کی صحبت و معیت اختیار کی، اور اس طرح اختیار کی کہ سفر و حضر کہیں ان سے جدا نہیں ہوئے۔ علامہ عراقی اس وقت تحصیلِ علمِ حدیث کے لئے مختلف امصار و بلاد کے دورے کر رہے تھے، جہاں جہاں وہ جاتے علامہ ہیثمی بھی ساتھ جاتے، حرمین اور مصر و قاہرہ کے علاوہ بیت المقدس، دمشق، بعلبک، حلب، حماۃ، حمص، طرابلس، اور دوسرے مقامات میں حصولِ علم کی غرض سے گئے۔ وہ دور سفر کی سہولیات کا نہ تھا، کبھی پاپیادہ، کبھی اونٹ اور گھوڑے کی سواری، آج کی برق رفتار سواریوں کے مقابلے میں یکسر سست رفتار۔ پھر کبھی غربت و تنگدستی، کبھی فاقہ مستی۔ غرض سفر کیا ہوتا بس ''نمونہ سقر'' ہوتا، لیکن علم کے یہ دو دیوانے شہر شہر کی خاک چھانتے اور علم حدیث کے موتی چنتے۔ یہ وقت وہ تھا جبکہ عالم اسلام علم کے چرچوں سے معمور تھا، بستی بستی علما اور اہلِ کمال علم کی درسگاہیں کھولے ہوئے تھے۔ آدمی اگر چاہتا تو ایک ہی جگہ رہ کر علم کے خزانے حاصل کر لیتا، پھر بھی علم کے شیدائی جہاں علم کی خوشبو محسوس کرتے، لپکے چلے جاتے۔ اب کون بتا سکتا ہے کہ کتنے اساتذہ سے انہوں نے کسبِ فیض کیا ہے، بس مورخ چند نام گنا کر اور یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا ہے کہ ان کے اساتذہ کثیر تعداد میں ہیں، اور انہوں نے بکثرت حدیث کی سماعت کی ہے۔ علامہ ہیثمی حافظ عراقی کے رفیق درس بھی ہیں، اور شاگرد رشید بھی، لیکن انہوں نے شاگردی ہی کی نسبت غالب رکھی۔ حافظ عراقی سے انہیں جو تعلق تھا، اس کے اظہار کے لئے شاید ''عشق'' کا لفظ بھی ناتمام ہے۔ عالم یہ تھا کہ شیخ عراقی کی تمام چھوٹی بڑی خدمات، آخر تک جب کہ وہ خود بڑھاپے کی منزل میں جا پہونچے تھے، اور علم و فضل کے منصبِ امامت پر فائز ہو چکے تھے، انجام دیتے، انہیں وضو

کراتے ،ان کے غسل کا انتظام کرتے ،ان کے کپڑوں کی دیکھ ریکھ کرتے ۔انہیں شیخ کی خدمت سے عار نہ تھا، وہ خود امامِ فن بن چکے تھے،اگر چاہتے تو اپنی الگ درسگاہ قائم کر لیتے ،اور طلبہ علوم نبوی کو مستفید کرتے ،مگر انہوں نے استاذ کی محبت میں اپنا حلقہ الگ نہیں قائم کیا،شیخ املا کراتے ، اور یہ لکھتے رہتے ، یہ خود بھی تصنیف وتالیف کرتے ،مگر روایت سب کی اپنے استاذ ہی سے کرتے ، اپنا استقلال انہیں گوارا نہ تھا۔

اپنے استاذ کو''یاسیدی'' کے علاوہ اور کسی لفظ سے مخاطب نہ کرتے ،اوران کی خدمت میں بالکل غلاموں کی طرح رہتے ،اورصرف شیخ ہی کی نہیں ،ان کے اہل وعیال اوران کے گھر کے سبھی افراد کی بھی ہرطرح خدمت کرتے ۔اس باب میں ان کا صبر وتحمل بہت بڑھا ہوا تھا،وہ نہایت جفاکشی اور مستعدی کے ساتھ ہمہ وقت آمادۂ خدمت رہتے ۔

شیخ کو بھی ان سے بہت تعلق تھا،ان کا سارا اعتماد انہیں پر تھا،شیخ کی تصانیف کو یہی لکھتے ،اور پھر ان سے پڑھتے ۔شیخ عراقی نے ہی انہیں ''زوائد'' لکھنے کا حکم دیا تھا، پھر انہیں کے مشورہ سے ''مجمع الزوائد'' تیار ہوئی،اس کا نام بھی علامہ عراقی ہی نے رکھا،شاگردوں کی کتاب کے خطبے استاذ ہی لکھتے تھے۔شیخ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح بھی ان سے کر دیا تھا۔

علامہ ہیثمی کو متونِ حدیث کا استحضار بدرجۂ کمال تھا،استاذ کی خدمت میں ہوتے ،اور ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو امام ہیثمی برجستہ جواب دیتے ،اور صحیح دیتے ،جس سے شیخ بہت مسرور ہوتے ۔امام ہیثمی کا مقام تدین اور تقوی میں بھی بہت اونچا تھا، دنیا سے بے تعلق، بڑے درجہ کے زاہد تھے۔تحصیلِ علم میں سراپا منہمک رہتے ،کوئی وقت بیکار نہ گزرتا،اوراد وعبادت کے بھی نہایت پابند تھے،حدیثِ رسول سے عشق تھا،اوراسی نسبت کے باعث طلبہ حدیث سے بڑی محبت رکھتے ، اوران کا بہت اکرام کرتے ۔

اوائل شعبان ۸۰۶ھ میں استاذ کا انتقال ہوا تو انہیں تنہائی محسوس ہونے لگی ،اب طلبہ کا ان پر ہجوم ہوا لیکن جس نے خود کو استاذ کی خدمت میں فنا کر رکھا تھا وہ ان کے بعد کیونکر زندہ رہتا، بالآخر چودہ ماہ کے بعد ۲۹ر رمضان ۸۰۷ھ میں یہ پھر استاذ کی خدمت میں جا حاضر ہوئے ۔

حافظ ابن حجر ''معجم الشیوخ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ نورالدین ہیثمی بہت نیک دل،

مطمئن، نرم خواور سلیم الفطرت عالم تھے، البتہ منکرات پر قوت سے نکیر فرماتے، اپنے شیخ اوران کی اولا د کی خدمت میں بہت صبر وتحمل سے کام لیتے، میں استاذ وشاگرد دونوں کی خدمت میں مدتوں رہا ہوں، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان کی تہجد قضا ہوئی ہو۔ استاذ کی خدمت اورادب جیسا ان کو کرتے دیکھا، کوئی اوران کی نظیر نہیں دیکھی۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کی طرح کوئی بھی اپنے استاذ کی خدمت اورحسنِ معاملہ پر شاید قادر ہو۔

علامہ برہان حلبی فرماتے ہیں، شیخ ہیثمی جمالِ قاہرہ تھے، بہت نیک اورنہایت پارسا تھے، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مشغولیت تحریر وتصنیف، اورشیخ کی خدمت گزاری میں صرف ہوتا تھا۔ طلبۂ علوم، غرباء ومساکین، اور صالحین سے بہت محبت رکھتے تھے، استحضارِ علمی غضب کا تھا۔ غرض ان کی دینداری، ان کا زہد واتقاء اوران کا استحضار ایک معروف اور مسلم بات ہے۔ علامہ نورالدین ہیثمی کے حالات۔ (الضوء الامع)

مخطوطہ کا تعارف:

محقق علام فرماتے ہیں کہ ایک مجھے اتفاقاً ''کشف الاستار'' کا ایک نفیس قلمی نسخہ مل گیا، جونہایت واضح اور صاف لکھا ہوا تھا، اوراچھی حالت میں تھا، یہ مخطوطہ میرے دل کو لگ گیا، بڑی کوششوں کے بعد میں اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، اورمنہ مانگی قیمت ادا کی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجھے کشف الاستار کے صرف دو نسخوں کی واقفیت حاصل ہوسکی، ایک تو یہی جس پر میں نے اپنے کام کی بنیاد رکھی ہے، اور دوسرا ''خدا بخش لائبریری پٹنہ'' میں ہے، لیکن اس سے میں استفادہ نہ کرسکا۔ یہ مخطوطہ جو میرے پاس ہے، تصحیح شدہ نسخہ ہے، اورمؤلف کتاب امام ہیثمی سے پڑھا گیا ہے، اس کا طرزِ کتابت مشرقی خط نسخ ہے، اور صاف ستھرا اور واضح ہے۔ بکثرت کلمات نقطوں اورحرکات سے مزین ہے، ۸۳۶ اوراق پر مشتمل ہے، سائز ۲۶۔۱-۲×۱۹ سینٹی میٹر ہے۔

اس نسخے کی کتابت کرنے والے ایک عالم وفاضل شیخ علی بن احمد بن علی حلبی ہیں، کتابت کی تکمیل ۵/رجب ۸۰۷ھ میں ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت علامہ ہیثمی زندہ تھے، حضرت محقق فرماتے ہیں میرا خیال ہے کہ کاتب نے علامہ ہیثمی کے اصل نسخے سے اسے نقل کیا

ہے،اوراس بات کا اہتمام کیا ہے کہ نقل اصل کے بالکل مطابق ہو۔چنانچہ انہوں نے اصل نسخہ کا حرف حرف ٹھیک انہیں کے طرز پر نقل کیا ہے،حتی کی وہ حدیثیں اور وہ ابواب جنہیں امام ہیثمی نے لکھ کر کاٹ دیا ہے،انہیں کاتب نے پہلے لکھا اور پھر کاٹ دیا ہے۔اسی طرح علامہ ہیثمی نے جو عبارتیں حاشیہ پر لکھی تھیں،گوکہ وہ اصل کتاب کا جز تھیں،انہیں کاتب نے بھی حاشیہ پر ہی برقرار رکھا،کاتب،صرف کاتب ہی نہیں ہیں،صاحبِ علم وکمال بھی ہیں،وہ کہیں کہیں حاشیہ میں مشکل کلمات کی توضیح وتشریح کر دیتے ہیں،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے صاحبِ علم ہیں،وہ اپنی تعلیق کے بعد ''کتبه علِی الحلبی'' لکھ دیتے ہیں۔

یہ نسخہ بار بار پڑھا گیا ہے،اس کی از اول تا آخر قرأت حافظ عثمان بن محمد دیمی المتوفی ۹۰۸ھ کی مجلس درس میں ایک جماعت کے ساتھ شیخ شمس الدین حنفی نے کی ہے۔چنانچہ ایک جگہ یہ عبارت علامہ عثمان دیمی کے قلم سے حاشیہ پر درج ہے۔''**ثم بلغ الشيخ شمس الدين الحنفي قرأة والجماعة سماعا على عثمان بن محمد الديمي**'' اس کے علاوہ دوسرے حضرات کی بھی تحریرات ہیں،جنہوں نے یہ کتاب پڑھی ہے،یا جن سے پڑھی گئی ہے۔اس کے علاوہ دوجگہ حافظ عثمان دیمی کے قلم سے سماع بھی تحریر ہے،غالباً مصنف نے یا شاید کاتب نے کتاب کے دو حصے قرار دیئے ہیں،ایک سماع پہلے حصہ کے خاتمہ پر ہے۔اور ایک دوسرے حصہ کے اخیر میں۔ابتداء سے جزء اول تک کی قرأت مختلف مجالس میں ۱۵؍ربیع الاول ۸۶۲ھ بروز دوشنبہ کو مکمل ہوئی(کشف الاستارج ۳ص ۳۸)اور دوسرے جزء کی قرأت ۷؍شعبان ۸۶۴ھ بروز چہارشنبہ کو مکمل ہوئی۔(کتبه عثمان بن محمد الديمي)(کشف الاستارج ۴ص ۲۷۲)

اس نسخہ کی قدر وقیمت میں مزید اضافہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یہ حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری کے مطالعہ میں رہا ہے،اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ موصوف بکثرت اس کی مراجعت کرتے رہتے تھے،اور بغور ملاحظہ فرماتے تھے۔انہوں نے اس پر جابجا تعلیقات لکھ رکھی ہیں،ان میں بیشتر علامہ ہیثمی کی فروگزاشتوں پر تنبیہات ہیں۔حضرت محدث اعظمی نے وہ تمام تعلیقات ان کے مواقع پر حافظ موصوف کے حوالہ سے درج کر دی ہیں۔

تحقیقات وتعلیقات:

محقق علام فرماتے ہیں کہ کتاب جب حاصل ہوگئی تو میں نے اپنے فرزند عزیز مولوی

رشید احمد اعظمی سلمہ کو دیا کہ اسے نقل کر کے صاف ستھرا نسخہ تیار کریں، یہ تازہ نسخہ میں نے اپنے نہایت خصوصی عزیز مولانا عبدالجبار صاحب کے حوالے کیا کہ وہ ''زوائد بزار'' کو ''مجمع الزوائد'' میں تلاش کریں، اور ہر ہر حدیث پر علامہ ہیثمی نے جو کلام کیا ہے، اسے موقع بموقع نقل کر دیں۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے نہایت عرق ریزی اور دیدہ وری سے یہ کام انجام دیا، ''کشف الاستار'' کی ایک ایک حدیث کو ''مجمع الزوائد'' میں ڈھونڈھا، اور علامہ ہیثمی نے جو کچھ نقد وجرح یا توثیق وتعدیل ذکر کی ہے، انہیں ان کے مواقع پر نقل کیا:

یہ مولانا عبدالجبار صاحب کون ہیں؟ مناسب ہے کہ ان کے متعلق وہ جملہ نقل کر دیا جائے جو حضرت محدث کبیر نے اس جگہ تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں ''**الذی هو منی بمنزلة الهيثمی من العراقی فی الملازمة والصحبة، ولكن اين انا وهو؟واين العراقی والهيثمی**''؟.

یعنی صحبت ومعیت کے اہتمام والتزام میں میرے ساتھ ان کا وہی حال ہے، جو علامہ ہیثمی کا حافظ عراقی کے ساتھ ہے، لیکن کہاں میں اور وہ؟ اور کہاں عراقی اور ہیثمی؟

واقعہ یہی ہے کہ مولانا عبدالجبار صاحب خود نہایت عمر رسیدہ اور ضعیف ہونے کے باوجود ہمہ وقت حضرت محدث کبیر کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ حضرت مولانا جب صاحبِ فراش تھے، تو شب وروز مولانا عبدالجبار صاحب خدمت میں حاضر رہتے تھے، نہایت خاموش اور مشغول، ہر جانے والا وہاں ان کو ضرور دیکھتا۔ حضرت کی نماز جنازہ انہیں نے پڑھائی، ضعف اپنے شباب کو پہونچا ہوا ہے، مگر اس کے باوجود حضرت کے قائم کردہ ''مدرسہ مرقات العلوم'' میں تشریف لاتے ہیں اور طلبہ واساتذہ کو مستفید کرتے ہیں (یہ مضمون مولانا کی حیات میں لکھا گیا تھا)

کتاب جب اس مرحلہ تک پہونچ گئی تو حضرت محدث کبیر نے اس کو اول سے آخر تک بغور وتأمل پڑھا، کہیں کہیں کاتب سے غلطی ہوئی تھی، اس کی نشان دہی کی، جو الفاظ محتاج شرح تھے، ان کی تشریح کی، کہیں علامہ ہیثمی کا کلام ناتمام یا مشکل تھا، اسے مکمل کیا، اور آسان کیا، کسی کسی جگہ دوسرے مصنفین کی غلطیوں کی بھی اصلاح کی۔

مجمع الزوائد ایک بحر ذخار ہے، علامہ ہیثمی نے ہر ہر حدیث پر محدثانہ کلام کیا ہے، اتنی

طویل وعریض میں چند غلطیاں رہ جانا مستبعد نہیں ہے،لیکن ان غلطیوں کو سمجھنا اوران کی اصلاح کرنا کچھ آسان نہیں ہے۔حضرت محدث کبیر نے یہ کام کیا،آپ حواشی وتعلیقات میں بار بار دیکھیں گے کہ امام ہیثمی کی فروگزاشتوں کی اصلاح کی گئی ہے،بالخصوص رواۃ کے سلسلے میں بڑی بیش قیمت معلومات جمع ہوگئی ہیں،حضرت اس فن میں بےنظیر تھے،اوران کی نظر بڑی وسیع تھی۔

جیسا کہ گزرچکا ہے کہ غالبًا مؤلف نے یا شاید کاتب نے اس کتاب کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے،لیکن طباعت کے لحاظ سے دوحصوں میں اس کی ضخامت بہت زیادہ ہوجاتی ،اس لئے محقق علام نے اسے چارحصوں میں تقسیم کردیا ہے۔کل صفحات ''کلمۃ المحقق'' اورفہرست سمیت ۱۶۷۴ ہیں،جن میں چارصفحے''کلمۃ المحقق'' کے ہیں،اور چالیس صفحات پر مشتمل فہرست ہے،حدیثوں کی تعداد اس میں ۳۶۹۸ ہے۔

اس کی اشاعت ''مؤسۃ الرسالۃ'' بیروت نے کی ہے، پتہ یہ ہے۔مؤسۃ الرسالہ شارع سوریہ بنایہ حمدی صالحۃ بیروت۔ص۔ب ۱۱۷۴۶

تعلیقات کے نمونے:

کتاب کا تعارف آپ نے پڑھ لیا، یہاں ہم ناظرین کے سامنے حضرت محدث کبیر کی تحقیقات وتعلیقات کے کچھ نمونے ذکرکرنا چاہتے ہیں،جن سے حضرت مولانا کی ذہانت و ذکاوت،استحضاراورغزارتِ علم کا قدرے اندازہ ہوگا۔

علامہ ہیثمی کی فروگزاشتیں

ج۱۔ص۱۰۲۔ح۱۸۱

اس حدیث کے بارے میں علامہ ہیثمی مجمع الزوائد میں تحریرفرماتے ہیں کہ ''**فیہ عبد الله بن شبیب وھو ضعیف جداً**''۔(ج۱۔ص۱۰۷)

محقق علام لکھتے ہیں کہ علامہ ہیثمی نے راوی کو عبداللہ بن شبیب سمجھا ہے،حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ عبداللہ بن نسیب ہیں(ملاحظہ ہواصابہ اورابن ابی حاتم)عبداللہ بن شبیب بہت چھوٹے ہیں،ان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اوپر کے راوی مسلم بن عبداللہ کے شاگرد ہوں،اوران سے حدیث سنی ہو۔

ج۱۔ص۱۰۶۔ح۱۸۸

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ''اشعث بن براز'' ہیں، ان کے بارے میں امام ہیثمی نے فرمایا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے ان کا تذکرہ کیا ہو''**لم اَرَ من ذکرہ** ''(ج۱۔ص۱۵۰)
مولانا فرماتے ہیں کہ علامہ ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں ان کا ذکر کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے بھی ''لسان المیزان'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور یہ بہت ضعیف راوی ہیں، اور خاص ان کی اس حدیث کو عقیلی اور ذہبی نے منکر قرار دیا ہے۔

ج۱۔ص۲۸۹۔ح۶۰۱

سند حدیث میں ایک راوی ''ابوالاوبر'' ہیں، ان کو علامہ ہیثمی نے ''زیاد بن اوبر حارثی'' لکھا ہے، اور فرمایا ہے کہ ان کا ترجمہ نہ توثیق کے ساتھ کہیں ملا، نہ تضعیف کے ساتھ۔

محدث اعظمی لکھتے ہیں کہ یہ زیاد بن اوبر نہیں ہیں، بلکہ ''زیاد ابوالاوبر'' ہیں، اور یہی حارثی ہیں۔ امام دولابی نے ''الکنیٰ'' میں ان کا ذکر کیا ہے، ان کے والد کا نام حارث ہے، چنانچہ امام بزار نے اس کی تصریح کی ہے، اور ابن معین اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، جیسا کہ ''تعجیل المنفعۃ'' میں ہے۔

ج۱۔ص۳۴۵۔ح۷۰۶

امام ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس حدیث کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ'' **رواہ البزار وفیہ یحییٰ بن عثمان القرشی البصری ولم اعرفہ**''۔اس میں یحیٰی بن عثمان ہیں، میں انہیں نہیں جان سکا، البتہ ابن حبان نے'' کتاب الثقات'' میں ایک یحیٰی بن عثمان کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ طبقہ ثالثہ میں ہیں۔(ج۲۔ص۲۵۱)

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ علامہ ہیثمی کا وہم ہے، سند میں یحیٰی بن عثمان سرے سے ہیں ہی نہیں، یہاں تو یحیٰی بن عباد، ابوعباد البصری ہیں ''تہذیب'' میں ان کا ذکر ہے۔ ان کے بارے میں ''**صدوق محتمل**'' لکھا ہے، خطیب کا قول ہے کہ ''ان کی احادیث درست ہیں''، اس حدیث کو انہوں نے محمد بن عثمان سے روایت کیا ہے، اور وہ معروف ہیں، ان کی روایت امام بخاری نے ''الادب المفرد'' میں ذکر کی ہے، وہ اس کو'' ثابت عن انس'' نقل کرتے ہیں۔

ج ا۔ص ۳۷۲۔ ح ۸۴۷

اس حدیث کی سند ’’**عمر و بن ابی عمرو عن جعفر بن محمد عن ابیه قال: سمعت الحارث بن الخزرج حدثنی ابی**‘‘۔ کے بارے میں علامہ ہیثمی تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں عمر بن شمر الجعفی اور حارث بن الخزرج کا تذکرہ میں نے نہیں پایا۔(ج ۲۔ص ۳۲۰)

مولانا فرماتے ہیں کہ ’’عمر‘‘ نہیں عمرو بن شمر ہیں، اور وہ بہت ضعیف ہیں، امام ذہبی نے ان کا تذکرہ ’’میزان‘‘ میں اور حافظ ابن حجر نے ’’لسان المیز ان‘‘ میں کیا ہے۔ بزار کی سند میں راوی نے تدلیس سے کام لیا ہے، اس نے بجائے عمرو بن شمر کہنے کے عمرو بن ابی عمرو کہا ہے، اس کو حافظ نے بھی ذکر کیا ہے، البتہ حارث کا تذکرہ مجھے بھی نہیں ملا، ان کے والد خزرج کا ذکر حافظ ابن حجر نے ’’اصابہ‘‘ میں کیا ہے۔

ج ا۔ص ۴۴۳۔ ح ۹۳۶

حدیث کی سند میں ایک راوی محمد بن سلیم ہیں، ان کے نام کے ساتھ یہ تصریح ہے کہ وہ مکہ کے رہنے والے ہیں۔ اس کی سند پر کلام کرتے ہوئے امام ہیثمی نے لکھا ہے کہ بزار کی روایت میں ابو ہلال ہیں، اور ان میں کچھ کلام ہے، تاہم وہ ثقہ ہیں۔(ج ۳۔ص ۱۰۵)

حضرت محقق فرماتے ہیں کہ یہ ہیثمی کا وہم ہے، انہوں نے محمد بن سلیم کو ابو ہلال بصری سمجھ لیا ہے، حالانکہ جو محمد بن سلیم اس روایت کے بیان کرنے والے ہیں، وہ مکی ہیں، اور ان کی کنیت ابوعثمان ہے، جیسا کہ ’’تہذیب‘‘ میں ہے۔ اور یہی ابن ملیکہ سے روایت کرتے ہیں، جو بزار کی اس روایت میں ہیں، اور ان سے وکیع اور ابو عاصم روایت کرتے ہیں، اور یہ ثقہ ہیں۔ اور وہ محمد بن سلیم جن کی کنیت ابو ہلال ہے، وہ بصری ہیں (ملاحظہ ہو تہذیب) اس وہم کی بنیاد یہ ہے کہ امام جمال الدین المزی نے ابوعثمان مکی کا ذکر نہیں کیا ہے، انہوں نے صرف ابو ہلال بصری کا ذکر کیا ہے، انہیں کی تقلید میں امام ہیثمی سے چوک ہوئی۔

ج ا۔ص ۲۴۴۔ ح ۵۰۲

اس حدیث کی سند کے بارے میں امام ہیثمی نے لکھا ہے کہ ’’اس کے سب راوی ثقہ ہیں‘‘۔

محقق علام لکھتے ہیں کہ اس میں معاویہ بن یحییٰ صدفی بھی ہیں، جن کے بارے میں خود امام موصوف لکھ چکے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۴۹۳ بحوالہ مجمع الزوائد ج ۲۔ص ۹۷)

ج ۲۔ص ۷۔ح ۱۰۸۰

اس حدیث کی سند کے بارے میں امام ہیثمی نے لکھا ہے کہ " **رجاله رجال الصحیح**"۔ (ج ۳۔ص ۲۰۸)

اس پر حضرت محقق لکھتے ہیں کہ اس میں ایک راوی محمد بن ابی حمید بھی ہیں، جو صحیح کے نہیں بلکہ ترمذی اور ابن ماجہ کے راوی ہیں۔

ج ۳۔ص ۳۹۲۔ح ۳۰۳۲

اس روایت کے متعلق حضرت مولانا لکھتے ہیں کہ امام ہیثمی نے اسے مجمع الزوائد کے "باب الاکتحال" میں ذکر نہیں کیا ہے، اور یہ صحیح کیا ہے، لیکن زوائد میں اس کا شمار کیا ہے، یہ غلطی ہے۔ کیونکہ یہ حدیث ترمذی میں "ابوداؤد طیالسی و یزید بن ہارون عن عباد بن منصور" کے طریق سے ہے، اور امام ترمذی نے اسے "حسن" کہا ہے، اور مولانا عبدالرحمان مبارکپوری نے اس تحسین کو برقرار رکھا ہے، اور ابن حبان نے بھی اس کی تصحیح کی ہے، حالانکہ امام بزار فرماتے ہیں عباد نے عکرمہ سے نہیں سنا ہے۔

ج ۴۔ص ۲۴۲۔ح ۳۶۲۷

حدثنا محمد بن المثنی ثنا ابو عامر ثنا عبد الواحد بن میمون عن عروۃ الخ۔

اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں فرمایا ہے کہ اس میں عبدالواحد بن قیس ہیں، ان کی توثیق کئی لوگوں نے کی ہے، اور بعض لوگوں نے ضعیف بھی کہا ہے۔ حضرت محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ بزار میں عبدالواحد بن میمون ہیں، اور میرا خیال ہے کہ عبدالواحد بن میمون ہی صحیح ہے، گو کہ عروۃ سے دونوں عبدالواحد روایت کرتے ہیں، مگر میں نے عبدالواحد بن میمون کے تلامذہ میں ابو عامر کو پایا ہے، عبدالواحد بن قیس کے تلامذہ میں نہیں۔

ج ۴۔ص ۲۵۱۔ح ۳۶۵۶

اس روایت میں امام بزار کے شیخ کا نام عمر بن الحسن الاسدی آیا ہے، یہی طبرانی کے بھی شیخ ہیں، انہوں نے بھی ان کے حوالے سے حدیث نقل کی ہے۔امام ہیثمی لکھتے ہیں کہ یہ محمد بن الحسن بن الزبالہ ہیں، اور ضعیف ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ راوی کا نام غلطی سے عمر لکھ گیا ہے، وہ محمد بن الحسن ہیں، اور ابن الزبالہ کہنے میں امام ہیثمی کو وہم ہوا ہے، یہ محمد بن الحسن بن الزبیر المعروف بالتل ہیں، یہی اسدی ہیں، اور ابن الزبالہ تو مخزومی ہیں۔

رواۃ جن کا تذکرہ امام ہیثمی کو نہیں ملا:

ج ا۔ص ۴۶۶۔ح ۹۸۱

اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے علامہ ہیثمی نے لکھا ہے کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کا نام عبدالکریم ہو، اور اس نے کسی صحابی سے کوئی روایت سنی ہو۔(ج ۳۔ص ۱۰۲)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ''تہذیب''میں دو شخصوں کا تذکرہ ہے، جن کا نام عبدالکریم ہے، اور انہوں نے حضرت انس سے روایت سنی ہے۔

ج ۲۔ص ۱۷۔ح ۱۲۲۸

اس روایت میں امام بزار کے شیخ کا نام سعید بن بحر ہے، ان کا تذکرہ علامہ ہیثمی کو نہیں ملا۔(ج ۲۔ص ۴۳)

مولانا فرماتے ہیں کہ ان کا ذکر ابن اثیر نے ''لباب''میں کیا ہے، لیکن انہوں نے ان کے والد کا نام محمد بتایا ہے، ''الانساب للسمعانی'' کی مراجعت کرنی چاہئے۔

ج ۳۔ص ۴۲۔ح ۲۱۹۴

حدیث کی سند ملاحظہ ہو''**حدثنا ابو الخطاب زیاد بن الحارث الحسانی ثنا یزید بن هارون ثنا محمد بن عمرو عن ابی عمر بن حماس عن حمزه بن عبدالله بن عمر عن عبدالله**''. (ج ٦۔ص ۳۲٦)

اس سند کے بعض رواۃ کو امام ہیثمی نہیں جان سکے۔

محقق علام فرماتے ہیں کہ اسناد کے رجال معروف ہیں، ابوعمرو بن حماس کا تذکرہ ابن

ابی حاتم نے کیا ہے، البتہ زیاد بن الحارث کے نسب میں امام بزار سے سہو ہوا ہے، وہ زیاد بن یحییٰ بن زیاد ہیں، اور وہی حسانی ہیں، انہیں کی کنیت ابوالخطاب ہے، امام بزار نے ان سے اور بھی روایتیں نقل کی ہیں۔

ج ۴۔ص ۱۹۹۔ح ۳۵۲۸

اس حدیث کے بارے میں امام ہیثمی نے لکھا ہے کہ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے، اور بزار نے بہت اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے، اور دونوں کی سند میں حسن بن عنبسہ ہیں، اور یہ ثقہ ہیں، امام مسلم کے شیخ ہیں، صحیح مسلم میں ان سے روایت موجود ہے۔

ص ۲۲۴۔ح ۵۰۰

اس حدیث کے ایک راوی" **مليح بن عبدالله الخطمي عن ابيه عن جده**" ہیں، ان کے متعلق علامہ ہیثمی تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے ملیح اوران کے باپ عبداللہ اوران کے دادا کا تذکرہ نہیں ملا۔

محقق علام فرماتے ہیں کہ ملیح کا تذکرہ ابن ابی حاتم نے کیا ہے، اور کہا ہے کہ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔

ج ۱۔ص ۳۷۷۔ح ۷۹۷

اس حدیث میں "**مصعب بن عبيدالله بن جناده عن ابيه عن جده**" سے روایت ہے، امام ہیثمی فرماتے ہیں کہ میں نے مصعب اوران کے والد عبیداللہ کا ذکر نہیں پایا۔

حضرت محقق لکھتے ہیں کہ ان دونوں کا ذکر ابن ابی حاتم نے کیا ہے، البتہ جرح وتعدیل سے سکوت اختیار کیا ہے۔

ج ۲۔ص ۴۷۔ح ۱۲۳۷

اس روایت کے بارے میں امام ہیثمی نے لکھا ہے کہ اسے طبرانی نے بھی روایت کیا ہے، لیکن ان کے شیخ احمد بن مسعود الخیاط المقدسی کو امام ذہبی نے "میزان الاعتدال" میں ذکر نہیں کیا ہے۔

محقق علام فرماتے ہیں کہ ان سے امام طحاوی نے بھی روایت کی ہے، ابن عسا کر نے

اپنی تاریخ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور امام ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں تو نہیں البتہ ''تاریخ الاسلام'' میں ان کا ذکر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ ۲۶۴ھ میں وفات پائی۔ (لیکن شاید صحیح ۲۹۴ھ ہے)

ج ۲۔ص ۱۴۶۔ح ۱۳۹۴

حدیث کے ایک راوی عبداللہ بن سندر ہیں، ان کے متعلق امام ہیثمی فرماتے ہیں کہ ''انہیں میں نہیں جان سکا''۔ محدث کبیر فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن سندر کا ذکر ابن ابی حاتم نے کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے ''اصابہ'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے، ان کا رجحان یہ ہے کہ وہ صحابی ہیں۔

کاتب کی غلطی:

ج ۱۔ص ۲۵۳ح ۵۲۲

اس حدیث کی سند میں ایک راوی عباس بن یونس ہیں، ان کے بارے میں علامہ ہیثمی نے تحریر فرمایا ہے کہ ''میں نے ان کا تذکرہ نہیں پایا''۔ (ج ۲۔ص ۱۰۵)

محقق علام کی تحقیق یہ ہے کہ کاتب کی غلطی سے عباس بن یونس ہو گیا ہے، ورنہ یہ ''عیاش بن یونس'' ہیں، ان کی کنیت ابومعاذ ہے۔ (دیکھئے کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم۔ تاریخ بخاری۔ اور المؤتلف والمختلف لعبدالغنی ص ۱۲۱)

ج ۱۔ص ۴۰۸۔ح ۸۶۳

سند میں ایک راوی عبید بن حنین ہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ مخطوطہ میں حنین ہی ہے، بلکہ حنین کے نیچے چھوٹی سی ''ح'' الگ سے لکھی ہوئی ہے، امام بغوی فرماتے ہیں کہ ابن عبدالبر اسی کو متیقن قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تصحیف ہے، درحقیقت یہ عبید بن جبیر ہیں (اصابہ)

ج ۱۔ص ۴۸۴۔ح ۱۰۲۸

اس سند میں ''**عبد اللہ بن الجهم ثنا بن ابی عبس عن الزبیر بن عدی**'' آئے ہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے عمر بن ابی عبس کا تذکرہ نہیں پایا، انہیں دیکھنا چاہئے۔ پھر لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ عمرو بن ابی قیس ہی ہیں، جو زبیر بن عدی کے شاگرد اور ان سے روایت کرنے والے ہیں، انہیں سے عبداللہ بن الجہم روایت کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تہذیب، ابن الجہم اور عمرو بن ابی قیس کا ترجمہ)

ج ۲۔ص ۳۶۔ح ۱۱۴۴

یہ روایت ''اعمش عن ابی سفیان عن جابر'' کے واسطے سے ہے،اس کے بارے میں امام بزارفرماتے ہیں کہ:

''ہم اس حدیث کوان الفاظ میں اس سے بہتر طریق سے نہیں جانتے،البتہ اعمش کی سماعت ابوسفیان سے نہیں ہے،انہوں نے تقریباً سوحدیثیں ان سے روایت کی ہیں،اسی وجہ سے ہم ان کی صرف اسی حدیث کو ذکر کرتے ہیں،جو ان کے علاوہ کسی اور سے ہمارے پاس نہیں ہوتی،اوروہ(ابوسفیان)فی نفسہ ثقہ ہیں''۔(**لا نعلمه بهذ االلفظ من وجه احسن من هـذا على ان الاعمش لم يسمع من ابى سفيان وقد روى عنه نحو مأة حديث وانما نذكر من حديثه مالا يحفظه عن غيره لهذه العلة وهو فى نفسه ثقة**)

اس پرعلامہ ہیثمی لکھتے ہیں:

''حیرت ہے کہ انہوں نے یہ کیونکر لکھا کہ اعمش نے ابوسفیان سے روایت نہیں سنی''۔

عجبت من قوله:لم يسمع اعمش عن ابى سفيان.

امام ہیثمی کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعمش کا سماع ابوسفیان سے معروف ہے،پھرامام بزارنے یہ کیوں کہا؟۔

حضرت محدث کبیر اپنی خدادادحذاقت سے یہ مسئلہ حل کرتے ہیں،کہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے،یاامام بزار سے سبقتِ قلم کی وجہ سے یہ لغزش ہوگئی ہے،میرے خیال میں وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ:

''ابوسفیان نے حضرت جابر سے روایت نہیں سنی ہے،کیونکہ ان کے بارے میں علماءِفن نے یہی تصریح کی ہے،کہ ان کی احادیث ''صحفی''،یعنی کتابی ہیں،سماع پرمبنی نہیں ہیں۔بجز چار حدیثوں کے،اورسبقتِ قلم کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ''**فى نفسه ثقه**'' لکھاہے،ظاہر ہے کہ امام اعمش کی ثقاہت اورابوسفیان سے ان کا سماع تو معروف ہے،اس لئے ان کی اس تصریح اوراستدراک کی ضرورت نہیں ہے،اس صراحت اوراس استدراک کامحل ابوسفیان ہی ہیں،اور جب استدراک ان سے متعلق ہے تو کھلی بات ہے کہ عدم سماع کی بات بھی انہیں سے متعلق ہوگی،گوکہ انہوں نے حضرت جابر سے حدیث نہیں سنی ہے،لیکن فی نفسہ وہ ثقہ ہیں،

اس لئے روایت ایک درجہ میں قابل اعتبار ہے‘‘۔

ج۳۔ص۲۰۵۔ح۴۵۲

اس حدیث کے ایک راوی کا نام عمرو بن ثابت ابواسحاق مذکور ہے، کتاب کے شائع ہونے کے بعد بھی حضرت کی تحقیقات جاری رہتی تھیں، چنانچہ انہوں نے اپنے مطبوعہ نسخے کے حاشیہ پر ’’تھذیب التھذیب‘‘ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ ابو اسحاق، عمرو بن ثابت کی کنیت نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے شیخ ہیں، عبارت اس طرح ہونی چاہئے۔ ’’**عمرو بن ثابت قال اخبرنا ابو اسحاق**‘‘.

مواخذات:

ج۱۔ص۲۲۴۔ح۴۵۲

سند کے کچھ الفاظ ملاحظہ ہوں ’’حماد بن مسلم عن علی بن زید عن مطرف بن عبداللہ الخ‘‘

اس پر مخطوطہ کے حاشیہ میں غالباً حافظ ابن حجر کے قلم سے تحریر ہے کہ اس روایت کو ابن ماجہ نے اسی طریق سے روایت کیا ہے، اس لئے یہ زوائد میں نہیں ہے۔ محدث کبیر تحریر فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ نے اس طریق سے نہیں روایت کیا ہے، انہوں نے اسے ’’حماد بن ثابت عن ابی ایوب‘‘ روایت کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ باب لزوم المساجد وانتظار الصلوٰۃ) بہر حال یہ حدیث زوائد میں نہیں ہے۔

ج۳۔ص۲۲۔ح۱۱۱۱

اس حدیث کی روایت ایوب عن ابی الزبیر عن جابر ہے، علامہ ہیثمی نے اس متعلق تحریر فرمایا ہے کہ ’’**رجالہ رجال الصحیح**‘‘۔ (ج۲۔ص۲۴۵)

حضرت محقق فرماتے ہیں کہ امام ہیثمی تو اس سند کی توثیق فرماتے ہیں، مگر شیخ ناصرالدین البانی کے نزدیک ابوالزبیر کی وہی روایت قابلِ احتجاج ہے جو ان سے لیث نقل کرتے ہیں، باقی قابلِ احتجاج نہیں۔

اسی طرح، ج۲۔ص۵۱ پر ایک روایت عن موسیٰ بن عقبہ عن ابی الزبیر عن جابر ہے، اسے بھی علامہ ہیثمی نے حسن قرار دیا ہے۔ (ج۳۔ص۳۰۴)

نیز ج ۲۔ص ۵۲ پر ایک روایت عن ابی الہیعہ عن ابی الزبیر عن جابر ہے اسے بھی علامہ ہیثمی نے حسن قرار دیا ہے۔(ج ۳۔ص ۲۹۸)اور شیخ احمد محمد شاکر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (مسند احمد ج ۳۔ص ۳۴۷)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تینوں روایتوں کو ابوالزبیر سے نقل کرنے والے لیث نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود محققین فن انہیں ''حسن'' یا ''صحیح'' قرار دے رہے ہیں، مگر شیخ البانی کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہے۔

ج ۳۔ص ۳۵۷۔ح ۲۹۳۵

اس حدیث میں ایک راوی میمون بن استاذ الصدفی ہیں، ان کے بارے میں حضرت مولانا نے ''تہذیب'' سے حافظ ابن حجر کا قول نقل کیا ہے کہ ''وہ میمون ابوعبداللہ'' ہیں۔

لیکن حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ابوحاتم نے میمون بن استاذ اور میمون ابوعبداللہ کے درمیان فرق کیا ہے، کہ یہ دو آدمی ہیں، ایک نہیں ہیں، میمون بن استاذ ثقہ ہیں، ان کی توثیق ابن معین نے کی ہے، لہٰذا حافظ ابن حجر کے اس قول پر کہ وہ ضعیف ہیں، اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

تشریحات:

ج ۱۔ص ۱۳۹۔ح ۲۲۶

روایت کے الفاظ یہ ہیں ''**قال رسول اللہ ﷺ مالی لا ایھم ورفع احدکم بین انملتہ وظفرہ**''.

اس میں ''لا ایھم''، مشکل لفظ ہے، جو محتاجِ شرح ہے، محدث کبیر نے اس پر لکھا ہے کہ یہ ''وَھِمَ'' کا ''فعل مضارع'' ہے۔اصل مضارع تو اس کا ''یَوھَمُ'' اور ''اَوھَمُ'' ہے، کیونکہ یہ باب ''سمع'' سے ہے، لیکن اس میں ایک لغت یہ ہے کہ علامتِ مضارع کو کسرہ پڑھا جائے۔ چنانچہ بعض قبائل ''اَعلَمُ'' کا تلفظ ''اِعلَمُ'' کرتے ہیں، اس صورت میں ہمزہ مکسورہ کی رعایت میں واو کو یاء سے بدل دیا، اس طرح ''اِیھَمُ'' ہو گیا (قالہ فی النہایہ)

ج ۲۔ص ۶۹۔ح ۱۲۲۵

اس حدیث کے متعلق امام ہیثمی لکھتے ہیں کہ ''یہ روایت مسند احمد بھی ہے، اور اس کے

رجال صحیح کے رجال ہیں، بجز اس کے کہ وہاں یہ روایت یحییٰ بن کثیر عن سفینہ مذکور ہے‘‘۔ علامہ ہیثمی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ بن کثیر عن سفینہ کی روایت مخدوش ہے، لیکن کیوں مخدوش ہے؟ اس کی وضاحت نہیں ہے، اس کی شرح محدث کبیر نے فرمائی کہ یحییٰ کا سماع کسی صحابی سے ثابت نہیں ہے، اس لئے یہ روایت منقطع ہے، بزار میں سند یہ ہے۔ ’’یحییٰ بن کثیر عن عمر بن ہارون عن صہیب عن سفینہ‘‘۔

ج ۳۔ ص ۱۱۵۔ ح ۲۳۷۱

حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے سینہ کے شق کئے جانے کا ذکر ہے، اس میں ایک لفظ آیا ہے ’’رھرھۃ‘‘۔ ارشاد ہے ’’**ثم دعی بالسکینۃ کانھا رھرھۃ بیضاء فادخلت قلبی**‘‘ یہاں لفظ ’’رھرھۃ‘‘ ایک مشکل لفظ ہے، حاشیہ میں حضرت محدث کبیر تحریر فرماتے ہیں کہ ’’علامہ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ایک روایت میں ’’برھرھۃ‘‘ ہے، اس کا معنی بتایا گیا ہے ’’نئی سفید شفاف چھری‘‘ امام خطابی نے فرمایا ’’میں نے اس کی بہت تحقیق کی، سوالات کئے، مگر کوئی یقینی صحیح بات نہیں ملی‘‘ پھر انہوں نے چھری ہی والا معنی قبول کیا۔ ایک روایت میں ’’**جئی بسطت رھرھۃ**‘ کا لفظ آیا ہے، اس پر قتیبی نے لکھا ہے کہ ’’شاید اس سے مراد ’’**طست رحرحۃ**‘‘ ہو، جس کے معنی کشادہ کے ہوں، حاء کو ہاء سے بدل دیا‘‘۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ’’یہ ’’**جسم رھرھۃ**‘‘ سے ماخوذ ہے، یعنی سفید، اور مراد اس سے روشن اور سفید طشت ہو‘‘۔

محقق فرماتے ہیں کہ بزار میں ’’رھرھۃ‘‘ کا لفظ ہے، اور یہ ’’**سکینۃ**‘‘ کی صفت ہے، اور وہ سکین کی تانیث ہے، جب اس کے معنی چھری کے ہوں، تو اس صورت میں اس کا معنی ہوگا ’’سفید نئی چھری‘‘ لیکن اس معنی پر ایک بڑا اشکال ہے۔ وہ یہ کہ جسم کے اندر چھری ڈال کر اوپر سے جسم کو سی دینا کچھ معقول معنی نہیں، معقول بات جسے دل قبول کرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ’’**فعیلۃ**‘‘ کے وزن پر ’’**سکینۃ**‘‘ ہے، گویا آسمان سے ’’سکینہ‘‘ نازل ہوا، اور وہ روشن سفید جسم کی طرح تھا، اور یہ مطلب اس روایت کے مطابق ہوگا، جس میں کہا گیا ہے کہ ’’**جئی بسطت رھرھۃ**‘‘ یعنی سفید روشن طشت لایا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سکینہ طشت میں تھا، لیکن ایک روایت میں ’**دھرھۃ**‘ کا لفظ ہے۔ ’’**دھرھۃ**‘‘ ٹیڑھے سرے کی چھری کو کہتے تھے، اس سے پہلے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

(معنی تو وہی درست معلوم ہوتا ہے جو حضرت مولانا نے بیان کیا،شاید دھرھة، رھرھة کی تصحیف ہو)

روایت کی دریافت:

ج ۳۔ص ۲۲۱۔ح ۲۶۱۰

اس حدیث کے بارے میں شیخ جلال الدین المزی نے لکھا ہے کہ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ترمذی کے نسخے میں اس کو نہیں پایا۔

محقق لکھتے ہیں کہ ہم کو یہ حدیث ترمذی شریف مطبوعہ حلب میں، جو طبع بولاق سے فوٹو لے کر چھاپی گئی ہے، مل گئی۔ (ملاحظہ ہو ج ۹۔ص ۳۴۰)

آپ نے حضرت محدث کبیر کی تحقیقات وتعلیقات کے چند نمونے پڑھ لئے، یہ باتیں بظاہر چند الفاظ میں ادا کردی گئی ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مختصر الفاظ کے لکھنے میں کیا محنت ہوئی ہوگی، مگر جنہیں تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ ایک لفظ لکھنے کے لئے کتنے صفحات دیکھنے پڑتے ہیں، بالخصوص علم اسماء الرجال تو وہ نازک اور دقیق فن ہے، جس کے لئے صرف کتابوں کی ورق گردانی سے کام نہیں ہوتا، اس کے لئے زبردست یادداشت، قوتِ گرفت درکار ہوتی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں نام پر نام آتے جاتے ہیں، کبھی کبھی ایک ہی نام، ایک ہی ولدیت، اور ایک ہی نسبت کے کئی کئی افراد ہوتے ہیں، ان پر رک کر غور کرنا، ان میں امتیاز پیدا کرنا، ہر ایک کی حیثیت متعین کرنا، کس قدر مشکل امر ہے، اس کا اندازہ کسی ایسے ہی شخص کو ہوگا، جس نے ایک ایک راوی کی تحقیق میں اپنا سر کھپایا ہوگا، کتنی جگہ امام ہیثمی فرماتے ہیں کہ ’’میں اس راوی کو نہیں جانتا، مجھے فلاں کا تذکرہ نہیں ملا‘‘ حالانکہ ان کی وسعتِ نظر میں کسی کو تردد نہیں ہے، مگر ایسا ہوا، اور بارہا ہوا ہے، حضرت محدث کبیر ان راویوں کو تلاش کرلاتے ہیں، کبھی نام میں چوک ہوجاتی ہے، کبھی ولدیت میں غلطی ہوجاتی ہے، اور وہ راوی نہیں ملتا، حضرت کی وسعتِ نظر اور قوتِ گرفت اس کی اصلاح کرتی ہے، اور اس کا پتہ بتاتی ہے۔

علم اسماء الرجال پر ہی حدیث کی صحت وحسن، قوت وضعف، اور وضع وانقطاع کا مدار ہے، اس کے بغیر کسی حدیث پر اعتماد کرنے کی کوئی صورت نہیں، اور ظاہر ہے کہ احادیث شریعت کے چار دلائل میں سے دوسری دلیل ہے، اس طرح اس کا درجہ کس قدر اہم ہوگا، واضح ہے۔

حضرت مولانا نے اس فن کو خوب برتا، اور اس پر پورا عبور حاصل کیا، آپ کے اس کمال کا دریا انہیں چھوٹے چھوٹے حواشی کے کوزوں میں بھرا ہوا ہے۔ **اعلی اللہ درجاتہ**

☆☆☆☆☆☆

ماخذ: المآثر۔جنوری، فروری، مارچ (۱۹۹۴ء)

مؤطاامام محمد۔تعارف واہمیت

از

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ تعالیٰ

مؤطاامام محمد حدیث کی ایک بلند پایہ کتاب ہے، یہ درحقیقت امام مالک علیہ الرحمہ کی مرتب کردہ مؤطا ہے، جس کی روایت امام محمد نے کی ہے، ہندوستان میں یہ کتاب قدیم طرزِ طباعت کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔اس پر فخر المتأخرین حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے بیش قیمت تعلیقات ''التعلیق الممجد'' کے نام تحریر فرمائے تھے، جو مؤطا کے حاشیہ پر شائع ہوئے تھے، دورِ جدید میں جب کہ طباعت کا معیار نہایت اعلی ہو چکا ہے، سابقہ طباعت بحکم مخطوطہ ہو چکی ہے، ضرورت تھی کہ جدید طرزِ طباعت میں اس کا بہترین ایڈیشن شائع کیا جائے کہ مخطوطات کا پڑھنا دشوار ہے، اللہ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا تقی الدین مظاہری ندوی کو کہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اور مالِ کثیر صرف کر کے مؤطاامام محمد مع التعلیق الممجد کا بہترین ایڈیشن نہایت خوب صورت طباعت کے ساتھ نفیس کاغذ اور حسین جلد کے ساتھ اہل علم کے ہاتھوں میں بطور تحفہ نادرہ کے پیش کیا، اور اس پر عالم عرب کے مشہور حنفی عالم جو علمائے ہند کے حد درجہ قدر دان ہیں، اور حضرت محدث اعظمی کے تلمیذ رشید ہیں، یعنی شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مدظلہ سے ایک بیش قیمت علمی مقدمہ لکھوایا، ہم اس مقدمہ کا ترجمہ قدرے تلخیص کے ساتھ اردو داں ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں (ادارہ)

رسول اللہ ﷺ کی سنتیں یعنی احادیث شریف میں آپ کے ارشادات ،آپ کے افعال واعمال اور آپ کی تقریرات[۱] شامل ہیں،اللہ تعالی نے ابتدا ہی سے ان سنتوں کی حفاظت کا انتظام فرمایا تھا، چنانچہ صحابہ کرام اور مشائخ تابعین نے انہیں یادرکھنے،ان پر عمل کرنے اورانہیں دوسروں تک پہونچانے میں کا اہتمام بلیغ کیا،اللہ تعالی کا ارشاد ہے"**انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون**" ہمیں نے اس ذکرکواتارا ہےاور ہمیں اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ذکر سے مراد قرآن کریم ہے،اور سنتوں کی حفاظت قرآن کریم کی حفاظت کا ذریعہ ہے، کیوں کہ احادیث میں قرآن کی تفسیر ہوتی ہے،اس کے احکام ومقاصد کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔حق تعالی فرماتے ہیں"**وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیهم**" اورہم نے تمہارے پاس ذکرکو نازل کیا تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کردو جس کا نزول ان کی جانب ہوا ہے۔

اللہ تعالی نے اسلام کے ابتدائی تینوں بہترین عہد میں ایسے بزرگوں کو کھڑا کردیا تھا، جنہوں نے اعلی درجہ کی فہم وبصیرت ،نہایت شغف ومحبت اور بڑی عزت وتکریم کے ساتھ دین کو حاصل کیا،انہوں نے اس کے لئے اپنی جان اپنے اہل وعیال اوراپنے وطن ودیار سب کوقربان کردیا،انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ایک ایک حدیث اور اس کے متعلق آثارِسلف کو حاصل کرنے کے لئے ہرقسم کے عیش وراحت کوتج دیا،مشقتیں اٹھائیں،شہر درشہر پھرے،اوراس سلسلہ میں سعی وکوشش کوآخری نقطہ تک پہونچا کرچھوڑا، بلاشبہہ وہ خیرامت تھے۔

اسلام کی فتوحات کا جب سیل رواں چلا ہےتو جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنے قدم جمائے ،اوران کی آبادیاں ہوئیں، ہرجگہ علم کا چرچہ رہا،کہیں کم کہیں زیادہ،کہیں صحابہ کرام کی تعداد زیادہ پہونچی توعلم کا زیادہ فروغ ہوا،کہیں یہ حضرات قدرے قلیل پہونچے تو اسی نسبت سے علم کا چرچہ قدرے کم رہا،اس دور میں جن شہروں کوعلم کی مرکزیت حاصل ہوئی ان میں سب سے نمایاں نام اس مقدس شہر کا ہے،جس کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف ہے،یعنی مدینہ طیبہ زادہا اللہ شرفاً وتعظیماً۔یہاں صحابہ کرام کی تعداد سب سے زیادہ تھی ،مدینہ منورہ اورمکہ مکرمہ یہی دوشہر ہیں جو سب سے پہلے دارالاسلام بنے،اور مسلمانوں کے قلوب کے لئے مرکزمحبت ثابت ہوئے۔

مدینہ منورہ میں احادیث نبوی کا خوب چرچا رہا اور تسلسل اور تواتر کے ساتھ رہا، حدیث کی تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کا سلسلہ بلا انقطاع چلتا رہا، بڑی کثرت سے یہاں فقہا ومحدثین پیدا ہوئے، امام مالک فرماتے ہیں کہ ''میں نے اپنی کتاب مؤطا مدینہ کے ستر فقہا کی خدمت میں پیش کی''۔

امام مالک علیہ الرحمہ کے دور میں سنت کی تدوین کا آغاز ہو چکا تھا، اور یہ آغاز مدینہ منورہ میں ہی ہوا تھا، چنانچہ امام مالک کے شیخ امام زہری مدنی (متوفی ۱۲۴ھ) موسی بن عقبہ مدنی (متوفی ۱۴۱ھ) محمد بن اسحاق مدنی (متوفی ۱۵۱ھ) ابن ابی ذئب مدنی (متوفی ۱۵۸ھ) تصنیف وتالیف کا ڈول ڈال چکے تھے۔

اس دور میں اس کے بعد دوسرے ائمہ حدیث دوسرے شہروں میں بھی تصنیف کا کام شروع کر چکے تھے، چنانچہ مکہ مکرمہ، کوفہ، بصرہ، خراسان، وغیرہ میں متعدد کتابیں وجود میں آئیں، لیکن آغاز کا سہرا علمائے مدینہ کے سر ہے۔ امام مالک علیہ الرحمہ کی کتاب ''مؤطا'' کی تصنیف مدینہ منورہ میں ہوئی ہے، حدیث کی تدوین کے سلسلے میں یہ دسویں کتاب ہے، اور اس لحاظ سے کہ یہ کتاب فقہی ابواب کے اعتبار سے مرتب ہوئی ہے، پہلی کتاب ہے، جیسا کہ ''الرسالۃ المستطرفہ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفۃ'' سے معلوم ہوتا ہے۔

مؤطا کی تالیف:

علما نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک علیہ الرحمہ نے مؤطا کی تالیف خلیفہ بنی عباس منصور کے مشورے سے کی ہے، منصور کی ولادت ۹۵ھ اور وفات ۱۵۸ھ میں ہوئی ہے۔

خلیفہ منصور نے اپنے کسی سفر حج میں امام مالک علیہ الرحمہ کو بلایا، اور ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی، ان سے متعدد سوالات کئے، اور ان کے حسنِ سیرت ان کے وفورِ علم، ان کی غزارتِ عقل، ان کی اصابتِ رائے اور ان کی صحتِ جواب سے وہ بہت متأثر ہوا، اسے محسوس ہوا کہ امام صاحب علم دین اور امامت کے منصبِ رفیع پر فائز ہیں۔

چنانچہ اس نے امام صاحب کی خدمت میں یہ تجویز رکھی کہ آپ ایک کتاب مرتب کر دیجئے کہ میں سرکاری طور پر لوگوں کو اس کا پابند بنا دوں، لیکن امام صاحب نے اس تجویز کو قبول

نہ کیا، یعنی لوگوں اس کا پابند بنایا جائے، اسے رد کر دیا۔ تب منصور نے کہا کہ اچھا آپ کتاب تو ضرور مرتب کر دیجئے، کیوں کہ اس وقت میرے علم میں آپ سے بڑا عالم اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ امام صاحب نے مؤطا مرتب کی، لیکن اس کے مرتب ہونے سے پہلے منصور کا انتقال ہو گیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے، جس کی تفصیل خود امام مالک کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں کہ ''میں علی الصباح ابوجعفر منصور کے پاس پہونچا، وہ مجھے دیکھ کر اپنے تخت سے اتر آیا، اور کہا کہ آپ ہر خیر و اکرام کے مستحق ہیں، پھر باتیں ہونے لگیں، وہ اس وقت سے لے کر ظہر کی اذان تک مجھ سے سوالات کرتا رہا، آخر میں اس نے کہا کہ آپ سب سے بڑے عالم ہیں، میں نے کہا کہ امیر المومنین ایسا نہیں ہے، اس نے اصرار کیا کہ نہیں ایسا ہی ہے، لیکن آپ چھپاتے ہیں، آج امیر المومنین کے بعد آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے''۔

اے ابوعبداللہ! (امام مالک کی کنیت ہے) لوگوں کے واسطے کچھ کتابیں تصنیف کرو، ان میں عبداللہ بن عمر کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں، اور عبداللہ بن مسعود کے تفردات سے پرہیز کرنا، اور درمیانی امور کو اور ان کی باتوں کو ان میں درج کرنا جن پر امت اور صحابہ کا اتفاق ہے، اگر میں زندہ رہا تو انہیں سونے کے پانی سے لکھواؤں گا، اور لوگوں کو ان کا پابند بناؤں گا۔

میں نے کہا امیر المومنین! ایسا نہ کیجئے، لوگوں کے پاس پہلے سے اقوال پہنچ چکے ہیں، وہ احادیث کو سن چکے ہیں، روایات بیان کر چکے ہیں، اور جو کچھ ان کے پاس پہونچ گیا ہے اسے وہ اختیار کر چکے ہیں، اور اس پر عمل جاری ہو چکا ہے، اور جن مسائل میں صحابہ وغیرہ اختلاف ہے ان میں ایک پہلو کو وہ تسلیم کر چکے ہیں، اب جو کچھ ان کے دل میں جم چکا ہے اس سے ہٹانا بہت دشوار ہے، اس لئے لوگ جس طریق پر ہیں، اور ہر شہر والوں نے جو کچھ اپنے لئے پسند کیا ہے، بس اسی پر چھوڑ دیجئے۔ اس پر خلیفہ نے کہا کہ میری جان کی قسم! اگر آپ اس بات پر میری موافقت کر لیتے تو میں ضرور اس حکم کو نافذ کر دیتا۔ (یہ دونوں روایتیں 'ترتیب المدارک' للقاضی عیاض ۲/۱۷۔۷۳ میں ہیں)

علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ابوجعفر منصور کو خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد علم اور دین میں ایک خاص مرتبہ حاصل تھا، اور اسی نے مؤطا امام مالک لکھنے کا

مشورہ دیا تھا،اس نے کہا تھا کہ اے ابوعبداللہ!اب روئے زمین پر مجھ سے اور تم سے بڑا کوئی عالم موجود نہیں،اور میں تو کارِخلافت میں مشغول ہوں،آپ ایک کتاب لکھ دیجئے،جس سے لوگوں کو نفع ہو،اس میں ابن عباس کی رخصتیں،ابن عمر کے تشددات،اور ابن مسعود کے تفردات [نہ] درج کیجئے گا،اور اسے لوگوں کے واسطے ذرا سہل لکھئے گا[۲]امام مالک فرماتے ہیں کہ منصور نے اس دن مجھے تصنیف کی رہنمائی کی،اس کے بعد امام مالک نے مؤطا کی تالیف کی۔مؤطا کے لفظی معنیٰ ’’آسان کردہ چیز‘‘۔

علما نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک کے معاصر اور ہم وطن بزرگ ابن ابی ذئب نے امام مالک کی مؤطا سے بڑی مؤطا مرتب کی تھی،چنانچہ امام مالک سے لوگوں نے کہا بھی کہ آپ کے لکھنے سے کیا حاصل؟امام صاحب نے جواب دیا،’’جواللہ کے واسطے ہوگی،وہی جاوداں ہوگی‘‘۔

مؤطا کب مرتب کی گئی؟:

علما نے یہ بات تو لکھی ہے کہ منصور نے اپنے دورِخلافت میں حج کے موقع پر امام صاحب کو مؤطا لکھنے کی فرمائش کی تھی،لیکن یہ بات کس سن میں ہوئی؟اس کی تعیین نہیں ہوسکی،میں نے تاریخ طبری میں منصور کے حجوں کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ منصور نے اپنے عہدِ خلافت میں پانچ حج کئے ہیں۔پہلا حج ۱۴۰ھ میں،دوسرا ۱۴۴ھ میں،تیسرا ۱۴۷ھ میں،چوتھا ۱۵۲ھ میں،اور پانچواں ۱۵۸ھ میں،اور اسی سال مکہ میں احرام کی حالت میں وہ فوت ہوا۔امام طبری نے ان پانچوں حجوں کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن یہ بات کہیں نہیں ذکر کی ہے کہ اس کی گفتگو مؤطا کے سلسلے میں امام مالک سے ہوئی تھی۔ہاں انہوں نے اس گفتگو کا ذکر اپنی ایک دوسری کتاب ’’ذیل المذیل‘‘ میں کیا ہے،یہ تاریخ طبری کے آخر میں ملحق ہے۔(ج۱۱۔ص۶۵۹)انہوں نے اس واقعہ کو اولاً مہدی کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے،اس کے بعد واقدی کی روایت سے ابوجعفر منصور کی طرف اس کی نسبت کی ہے۔

امام ابن عبدالبر نے بھی’’الانتقاء‘‘میں یہ دونوں روایتیں اسی ترتیب کے ساتھ نقل کی ہیں،اور ابن جریر طبری ہی کے طریق سے نقل کی ہیں،پہلی روایت کے ناقل امام مالک سے ابراہیم بن حماد زہری ہیں،اور دوسری روایت کے راوی امام مالک سے واقدی ہیں۔

ہمارے شیخ علامہ زاہد الکوثری نے اس پر تعلیقات میں لکھا ہے کہ علامہ ابن جریر کا طرزِ عمل ''ذیل المذیل'' میں جیسا کہ یہاں ہے، صاف بتلاتا ہے کہ وہ پہلی روایت کو ترجیح دیتے ہیں، اور واقدی کی اس روایت سے کہ یہ واقعہ منصور کے ساتھ پیش آیا، اجتناب کرتے ہیں، لیکن ابن عساکر نے ''کشف الغطاء من فضل المؤطا'' میں کئی طریقوں سے امام مالک سے وہی بات نقل کی ہے جس سے واقدی کی روایت کی تائید ہوتی ہے، اگرچہ ہر سند میں کچھ نہ کچھ کلام ضرور ہے۔

مختلف روایات کے مطالعے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ منصور نے امام مالک سے اہل مدینہ کے علم کی تدوین کے سلسلے میں اجمالی گفتگو اولاً ۱۴۸ھ میں کی، اور جس سال آخری حج سے پہلے والا حج کیا، اس سال اس نے انہیں ابن عمر کے شدائد، ابن عباس کی سہولتوں، اور ابن مسعود کے تفردات سے بچنے کی تلقین کی، رضی اللہ عنہم۔ پھر انہوں نے مؤطا کی ترتیب ۱۵۹ھ میں مہدی کے دور خلافت میں مکمل کی۔

ہمارے شیخ علامہ زاہد الکوثری نے دارقطنی کے رسالہ ''احادیث المؤطا واتفاق الرواۃ عن مالک واختلافھم'' کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ عبدالعزیز بن عبداللہ ابوسلمہ ماجشون نے اہل مدینہ کے اجماعی مسائل کے موضوع پر ایک کتاب لکھی، حضرت امام مالک بن انس نے جب اس کو ملاحظہ فرمایا تو ان کو یہ کتاب پسند آئی، مگر انہیں محسوس ہوا کہ اس میں مختلف ابواب کی بعض احادیث اور بعض آثار فوت ہوگئے ہیں۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ وہ خود ایک کتاب لکھیں جس میں ابوابِ فقہ کے لحاظ سے صحیح روایات اور اہل مدینہ کا عمل ذکر کریں۔ چنانچہ انہوں نے کام کا آغاز کردیا۔

خلیفہ منصور عباسی کو امام مالک کے اس عزم کی ہلکی سی خبر مل گئی، اس نے اپنے آخری حج سے پہلے والے حج میں امام صاحب سے ملاقات کی، اور انہیں تلقین کی کہ وہ اہل مدینہ کے علم کو مدون کریں، لیکن ابن عباس کی تسہیلات، ابن عمر کے تشددات، اور ابن مسعود کے تفردات سے احتراز کریں۔ اس وقت ان حضرات کے تلامذہ کی ایک جماعت تھی جو ان کے علوم کو مدینہ میں پھیلا رہی تھی، حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے زمانے میں مدینہ طیبہ کے دس فقہا بھی ان حضرات

کے تلامذہ میں شامل تھے، پھر ان فقہا کے شاگرد تھے، اور شاگردوں کے شاگرد تھے، جنہیں امام مالک نے پایا۔

منصور کی گفتگو سے امام مالک کے عزم میں مزید پختگی آئی، اب وہ ہمہ تن ان احادیث کی جمع وتدوین میں لگ گئے، جو اہل مدینہ کے نزدیک ثابت ہیں، اور اسی ساتھ ان اعمال کو شامل کیا جو اہل مدینہ کے درمیان متوارث تھے، اور اس سلسلے میں انہوں نے صرف شیوخِ مدینہ کی روایات پر اکتفا کیا ہے۔ اس میں مدینہ کے باہر کے صرف چھ مشائخ کی روایت انہوں نے لی ہے۔ مکہ کے ابوالزبیر، شام کے ابراہیم بن ابی عبلہ، جزیرہ کے عبدالکریم بن مالک، خراسان کے عطا بن عبداللہ، اور بصرہ کے حمید الطّویل اور ایوب سختیانی۔ مؤطا کی تدوین کا عمل مہدی عباسی کے دور میں مکمل ہوا، یہ گفتگو علامہ زاہد الکوثری کی ہے۔

ہمارے شیخ کے نزدیک یہ بات راجح ہے کہ اہل مدینہ کے علم کی تدوین کے سلسلے میں امام مالک سے منصور نے ۱۴۸ھ میں گفتگو شروع، اور اپنے آخری حج سے پہلے والے حج میں انہیں تاکید کی تھی کہ ابن عمر کے شدائد وغیرہ سے اجتناب کریں، لیکن یہ ترجیح بظاہر قرینِ قیاس نہیں ہے، کیوں کہ منصور نے آخری حج ۱۵۸ھ میں کیا ہے، اور اسی سال اس کی وفات ہوئی ہے، اور اس سے پہلے اس کا حج ۱۵۲ھ میں ہوا تھا، اور اس سے پہلے ۱۴۷ھ میں ہوا، منصور نے ۱۴۸ھ میں حج کیا ہی نہیں ہے، اس سال اس کا بیٹا جعفر حج میں آیا تھا، اس لئے ۱۴۸ھ سہوِ قلم ہے۔

پھر یہ بات کہ ۱۴۷ھ والے حج میں اس نے امام مالک سے گفتگو کی اور جس اجتناب کا تذکرہ اوپر ہوا، اس کی وصیت اس نے ۱۵۲ھ والے حج میں کیا، یہ بھی بعید از قیاس ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس نے اپنے پہلے یا دوسرے حج میں یہ گفتگو کی ہے، یعنی ۱۴۰ھ یا ۱۴۴ھ میں، یہ بھی امکان ہے کہ یہ گفتگو تیسرے حج ۱۴۷ھ میں ہوئی ہو، لیکن چوتھے حج یعنی ۱۵۲ھ میں ہونا کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ اگر ۱۵۲ھ میں انہوں نے مؤطا کی تالیف شروع کی ہے تو ماننا پڑے گا کہ مدتِ تالیف سات سال سے بھی کم ہو، کیوں کہ مہدی نے ان سے ۱۵۹ھ میں اس کی سماعت کی ہے، جیسا کہ ہمارے شیخ نے اس کو ذکر کیا ہے، حالانکہ مشہور یہ ہے کہ امام مالک نے مؤطا کی تالیف میں چالیس سال یا اس سے کم بسر کئے ہیں۔ بہر حال سات سال مدتِ تالیف کا ہونا بعید

ہے، بالخصوص جب اس کو نظر میں رکھا جائے کہ امام مالک احادیث کے سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط واتقان سے کام لیتے تھے، اور ایک مجلس میں حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی مجالس میں معدودے چند احادیث سے زائد نہیں بیان کرتے تھے، اس لئے یہ یقینی ہے کہ مؤطا کی تالیف کا آغاز ۱۴۰ھ کے بعد ہے یا ۱۴۷ھ کے بعد ہے، اور اس سے فراغت ۱۵۸ھ کے بعد ہے۔ واللہ اعلم

اس کتاب میں امام مالک علیہ الرحمہ نے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، صحابہ کے فرمودات، تابعین کے اقوال، اور اہل مدینہ کی اجماعی رایوں کو جمع کیا ہے، اور اپنی مقرر کردہ اس حد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔

مؤطا کا مقام ومرتبہ

روایتِ حدیث اور تفقہ کی جامعیت:

احادیث کو کسی کتاب میں فقہی ابواب کے مطابق مرتب اور جمع کرنا ایک اہم کام ہے، یہ کام کوئی فقیہ ہی کرسکتا ہے، جو احادیث کے معانی کو سمجھتا ہو، ان کے مدارک ومقاصد پر نگاہ رکھتا ہو، ہر ہر لفظ کے امتیازات کو پہچانتا ہو۔ ایسے علما جو محدث بھی ہوں اور فقیہ بھی ہوں، ان علما کی بنسبت جو کثرتِ روایت، حفظِ حدیث، اور ضبط واتقان میں معروف وممتاز ہیں، بہت کم ہیں۔ یاد رکھنا ایک الگ شئی ہے، اور تفقہ ودانائی الگ چیز ہے۔ تفقہ کا درجہ حفظِ حدیث سے اشرف واعلی اور اہم وانفع ہے، کیونکہ تفقہ کا حاصل یہ ہے کہ کتاب وسنت کے کے نصوص کو دقتِ نظر کے ساتھ سمجھا جائے، خواہ عبارت النص سے یا اشارۃ النص سے، اور پھر صراحۃً ہو یا کنایۃً ہو۔ پھر ہر ایک نص کو احکام کے مراتب میں اس کے خاص مرتبہ اور مقام پر رکھا جائے، اس میں نہ کمی ہو، نہ زیادتی، نہ ضرورت سے زائد وسعت ہو، نہ بالکل جمود ہو۔

یہ اوصاف متقدمین میں بھی نادر الوجود تھے، متأخرین میں ان کی اور کمی آ گئی، اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ محض حدیث کے یاد کر لینے، اس کی کتابوں کو جمع کر لینے اور ان سے واقف ہوجانے سے آدمی فقیہ ہوجاتا ہے، احکامِ شرع کو کما حقہ جان لیتا ہے، اور استنباط واجتہاد پر قادر ہوجاتا ہے، اگر کسی کا یہ گمان ہے تو وہ بڑی سخت غلطی میں مبتلا ہے۔

محمد بن یزید مستملی نے امام احمد حنبل سے ان کے استاذ شیخ عبدالرزاق صاحبِ مصنف کے متعلق پوچھا کہ کیا ان کو تفقہ حاصل تھا، تو اس کے جواب میں امام صاحب نے فرمایا کہ اصحابِ حدیث (یعنی محدثین) میں تفقہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ (طبقات الحنابلہ ج ۳۔ص ۳۲۹)

مشہور امام حدیث ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل کے مقدمہ (ص ۲۹۳) میں اور امام ابن جوزی کی کتاب ''مناقب الامام احمد'' (ص ۶۳) میں اور امام ذہبی کی ''تاریخ الاسلام'' (مخطوطہ) میں لکھا ہے کہ:

''امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ میں عراق میں احمد بن حنبل اور یحیٰی بن معین اور اپنے دوسرے اصحاب کے پاس بیٹھا کرتا تھا، ہم احادیث کا مذاکرہ کرتے تھے، کبھی ایک طریق سے، کبھی دو طریق سے، کبھی تین طریق سے، پھر ان کے درمیان میں یحیٰی بن معین بول پڑتے کہ فلاں طریق بھی تو ہے، میں کہتا کہ اس کی صحت پر ہمارا اجماع نہیں ہوگیا؟ سب کہتے کہ بیشک، میں کہتا کہ اچھا اس حدیث کی مراد اور اس کی تفسیر بتاؤ، اور اس سے کیا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے؟ یہ سن کر سب خاموش ہوجاتے، صرف احمد بن حنبل بولتے''۔

اکابر حفاظ اور ان کا تفقہ:

ان تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ علمِ حدیث میں خواہ کسی کو کتنا ہی درک حاصل ہو، اور خواہ علم کے روشن اور تابناک دور میں فنِ حدیث کے اندر امامت کے درجہ پر فائز ہو، لیکن اس سے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ حافظِ حدیث، فقیہ اور مجتہد بھی ہو۔ اگر فنِ حدیث کا اشتغال وانہماک ایک محدث کو فقیہ بنانے کے لئے کافی ہوتا، تو وہ بے شمار حفاظ جن کے حافظہ میں (ایک ایک شخص کے حافظہ میں) متون واسانید کا اتنا اتنا بڑا ذخیرہ ہوتا تھا کہ آج پورے شہر والوں کو اتنا یاد نہ ہوگا، اگر حافظِ حدیث ہونا ہی کافی ہوتا تو یہ سب اجتہاد کے مرتبہ پر فائز ہوتے، لیکن اللہ تعالی نے ان کی حفاظت فرمائی، انہوں نے کبھی اپنے حق میں اجتہاد کا دعوی نہیں کیا، بلکہ اس کا وہم بھی نہیں ہوا۔

ملاحظہ سید الحفاظ امام یحیٰی بن سعید القطان البصری امام المحدثین ہیں، جرح وتعدیل کے معیار ہیں، وہ احکام کے استنباط میں اجتہاد نہیں کرتے، بلکہ امام ابوحنیفہ کے قول پر عمل کرتے

ہیں۔(ملاحظہ ہوتذکرۃ الحفاظ ترجمہ وکیع بن الجراح۔ج ا۔ص ۳۰۷)

اور تہذیب التہذیب ج ا۔ص ۴۵۰ میں امام ابوحنیفہ کے حالات میں حافظ ابن حجر، احمد بن سعید قاضی کا قول نقل کرتے ہیں، انہوں نے یحییٰ بن معین (تلمیذ یحییٰ بن سعید القطان) سے سنا کہ یحییٰ بن سعید فرمایا کرتے تھے کہ ''ہم اللہ سے جھوٹ نہیں بولتے، ہم نے امام ابوحنیفہ کی رائے سے بہتر اور کوئی رائے نہیں پائی، ہم نے ان کے بہتیرے اقوال کو اختیار کیا ہے''۔

مشہور حافظِ حدیث وکیع بن جراح کوفی جو اپنے دور کے حفاظِ حدیث کے امام اور محدثِ عراق تھے، وہ بھی اجتہاد نہیں کرتے تھے، امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام ذہبی کے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں اور حافظ ابن حجر کی ''تہذیب التہذیب'' میں حسین بن حبان کے واسطے سے یحییٰ بن معین (تلمیذ وکیع) کا قول نقل کیا گیا ہے، کہ ''میں وکیع سے بہتر کسی شخص کو نہیں پایا، وہ قبلہ رو ہوکر حدیثیں یاد کیا کرتے تھے، راتوں کو نماز پڑھتے تھے، مسلسل روزے رکھتے تھے، امام ابوحنیفہ کے قول پر فتوی دیتے تھے''۔(تذکرہ ا/۳۰۷ تہذیب ۱۱/۱۲۶، ۱۲۷)

ابھی اوپر امام اسحاق بن راہویہ کا قول بڑے بڑے ائمہ حدیث کے متعلق گزر چکا ہے، اور ان میں یحییٰ بن معین بھی شامل ہیں کہ یہ حضرات اجتہاد نہیں کرتے تھے، ایک ایک حدیث کو کئی کئی طریق سے نقل کرتے تھے، مگر جب اس حدیث کا مطلب پوچھا جاتا تو سب خاموش رہتے صرف امام احمد بن حنبل جواب دیتے تھے۔

یہ ان کے تدین وامانت اور بےنفسی وتقوی کی روشن دلیل ہے، کہ جس چیز کی مہارت انہیں نہ ہوتی، وہاں خاموش ہوجاتے، اور جس فن میں درک ہوتا اس میں حوب چلتے۔ بات یہ ہے کہ فقہ ایک مشکل فن ہے، اس میں بڑی پختہ درایت اور کتاب وسنت کی گہری فہم درکار ہے، اور یہ کہ متعارض نصوص میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ اور ناسخ کون ہے؟ منسوخ کون ہے؟ کس پر اجماع ہے؟ کہاں اختلاف ہے؟ ان سب کی معرفتِ کاملہ ہونی چاہئے۔ پھر جرح وتعدیل میں بھی درک ہونا ضروری ہے، نیز اتنی قدرت ہونی چاہئے کہ دلائل کے درمیان وجہ ترجیح کی شناخت کرسکے، اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی حذاقت ومہارت ہو، یعنی مفرد الفاظ کو بھی جانتا ہو، وجوہِ بلاغت کی بھی معرفت رکھتا ہو، نحو وصرف بھی جانتا ہو، حقیقت ومجاز سے بھی واقف ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب امام احمد سے محمد بن یزید مستملی نے (جیسا کہ گزر چکا) مشہور محدث، حافظ کبیر امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کے متعلق پوچھا، یہ امام عبدالرزاق بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اوران کی مشہورتر تصنیف ''مصنف عبدالرزاق'' ہے، اور یہ خود امام احمد کے شیخ ہیں، اوران کے علاوہ مشہور ائمہ حدیث اسحاق بن راہویہ، یحیٰ بن معین، محمد بن یحیٰ ذہلی کے شیخ ہیں، یہ سب حضرات اس دور میں علمِ حدیث اور فنِ روایت کے بنیادی ارکان تھے، اوران کے علاوہ بے شمار اصحابِ روایت کے شیخ تھے، ان کی وفات ۸۵؍سال کی عمر میں ۲۱۱ھ میں ہوئی۔ ان جیسے امام کے متعلق امام احمد بن حنبل جیسے بزرگ عالم سے سوال کیا گیا کہ کیا انہیں تفقہ حاصل تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اصحابِ حدیث میں فقاہت بہت کم ہوتی ہے ''مـــا اقـل الفقه في اصحاب الحديث''.

امام بیہقی نے اپنی کتاب ''مناقب الشافعی'' میں امام شافعی کے مشہور شاگرد ربیع مرادی سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام شافعی علیہ الرحمہ اپنے ایک دوسرے شاگرد ابوعلی بن مقلاص (عبدالعزیز بن عمران المتوفی ۲۳۴ھ الامام الفقیہ) سے فرما رہے تھے کہ ''تم احادیث کے حفظ کرنے کا قصد رکھتے ہو، اور چاہتے ہو کہ فقیہ ہو جاؤ، کبھی نہیں ہوسکتا، یہ بہت بعید ہے''۔ (امام شافعی نے یہ بات ان کے غبی ہونے کی وجہ سے نہیں فرمائی، وہ غبی نہ تھے)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کا مقصد یہ ہے کہ تم حدیثوں کو اہل حدیث کے طریقے کے مطابق یاد کرنا چاہتے ہو، بلاشبہہ یہ بھی بڑا علم ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ اس میں لگ کر تفقہ کی فرصت نہ مل سکے، اس لئے جن احادیث کی ضرورت فقہ کے لئے ہے، ان کا یاد کرنا ضروری ہے، کیوں کہ فقہی قواعد کی بنیاد کتاب وسنت پر ہی ہے۔

یہی امام بیہقی اپنے شیخ ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری کے واسطے سے بسندِ متصل امام اسحاق بن راہویہ کا قول نقل کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ میں نے امام شافعی علیہ الرحمہ سے حدیث کا مذاکرہ کیا، وہ فرمانے لگے ''اگر میں بھی تمہاری طرح حدیثوں کو حفظ کئے ہوتا تو ساری دنیا پر غالب آجاتا''۔

انہوں نے یہ اس لئے فرمایا کہ اسحاق احادیث کو اہل حدیث کے طریقہ پر یاد کرتے

تھے،امام شافعی علیہ الرحمہ کی طرح استنباط واجتہاد سے کام نہیں لے سکتے تھے۔امام شافعی علیہ الرحمہ انہیں احادیث یاد کرنے کا اہتمام کرتے تھے،جن کی تفقہ میں ضرورت ہوتی تھی، جہاں انہیں اشتباہ ہوتا تھا، وہ کاملینِ فن کی جانب رجوع کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے، یہ شان تھی ان کی خداترسی،تقوی اور دین میں احتیاط کی۔(انتہیٰ کلام البیہقی)

یہ دوبیش قیمت تصریحات امام شافعی علیہ الرحمہ کی آپ کے سامنے ہیں،ان کے فوائد پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

(۱) اہل حدیث کے طریق پر حدیث کی تحصیل کے ساتھ تفقہ کا حاصل ہونا ممکن نہیں،مگر یہ کہ اللہ تعالی کسی کے ساتھ خصوصی کرم فرمائے، چنانچہ امام شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا کہ ''یہ بہت بعید ہے''۔(ہیہات)

(۲) اس چیز کو امام بیہقی جیسے بلند پایہ امام محدث وفقیہ [نے] نہایت وضاحت اور اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے،ان کے کلام کی جو کچھ عظمت ہے وہ ظاہر ہے۔

(۳) امام شافعی علیہ الرحمہ نے ابوعلی بن مقلاص سے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا اس کی جو تشریح امام بیہقی نے فرمائی اور پھر اس کی تائید میں امام شافعی کا دوسرا قول انہوں نے نقل کیا، جو امام اسحاق بن راہویہ سے انہوں نے کہا تھا،اس سے ان تمام اہل حدیث اور رواۃ کی زبان بند ہو جانی چاہئے جو فقہا سے الجھتے ہیں،اور اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ بھی احکامِ شرع کے سلسلے میں اجتہاد واستنباط کے اہل ہیں۔

دیکھ لیجئے یہ یحییٰ ابن معین ہیں،حفظِ حدیث کے امام ہیں، جرح وتعدیل کے امام ہیں، لیکن جب ان کے سامنے یہ سوال آیا کہ کیا حائضہ عورت میت کو غسل دے سکتی ہے یا نہیں؟ تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں تا آنکہ امام احمد بن حنبل تشریف لاتے ہیں،اور اس کے جواز کا فتوی دے کر دلیل میں وہ روایت پیش کرتے ہیں جو ان محدثین کو پورے طور پر بلکہ کئی کئی طرق سے حفظ تھی، عنقریب اس حدیث کا ذکر آرہا ہے۔

اور یہ امام شافعی ہیں، جو اسحاق بن راہویہ سے کہتے ہیں کہ اگر تمہاری طرح میں بھی حدیث یاد کئے ہوتا تو دنیا پر غالب آجاتا،اس میں اس بات کی وضاحت ہے کہ امام شافعی تفقہ

میں ممتاز ہیں،اور اسحاق بن راہویہ حفظِ حدیث میں امتیازی شان رکھتے ہیں،لیکن اس کے باوجود وہ تفقہ میں امام شافعی کے رتبے کونہیں پہونچتے،حالانکہ حفظِ حدیث میں ان کی فوقیت خود امام شافعی تسلیم کرتے ہیں، کیوں کہ بقول بیہقی تمام احادیث ان کے نوک زبان تھیں۔خیال رہے کہ بعض لوگوں نے اسحاق بن راہویہ کی طرف بھی ایک مسلکِ فقہی منسوب کیا ہے(یعنی بعض لوگ انہیں بھی مجتہد تسلیم کرتے ہیں،تب ان کے بارے میں امام شافعی اور امام بیہقی کا یہ خیال ہے،اس سے نرے محدث کے بارے میں سمجھا جاسکتا ہے)

معلوم ہوا کہ حدیث کو یاد رکھنا،اس کے الفاظ کو دہرانا اور بیان کرنا الگ چیز ہے،اور اس کے معانی کو سمجھنا،اس سے احکام کا استنباط کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔اللہ تعالی ہر ایک کام کے لئے الگ الگ افراد پیدا کئے ہیں، جو اپنے فن میں دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

ایک فن میں امامت دوسرے میں برنگ عوام:

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایک شخص کسی فن میں امام ہو،اور دوسرے فن میں اس کی حیثیت ایک عام آدمی کی ہو،علم اللہ کی طرف سے ایک روزی ہے،بخشش ہے،علم بہت ہے، بہت بھاری ہے،اور ہر امام ہر علم پر فائز نہیں ہوسکتا۔امام ابو حامد غزالی نے اپنی کتاب ''المستصفی''میں اور امام ابن قدامہ حنبلی نے اپنی کتاب''روضۃ الناظر''میں ذکر کیا ہے کہ ''**کم من عالم امام فی علم عامی فی علم آخر**'' بہترے عالم ایک علم میں امام ہوتے ہیں،اور دوسرے علم میں عامی ہوتے ہیں۔

امام غزالی نے ہی اپنے رسالہ''قانون التاویل''کے آخر میں لکھا ہے کہ''علمِ حدیث میں میری پونجی بہت قلیل ہے''۔

یہ بات جو تواضع وانکسار سے لبریز ہے،امام غزالی جیسا امام، یکتائے روزگار عالم جو کہ حجۃ الاسلام ہے ہرگز نہ کہتا اگر اس کی طبیعت میں وہ بلند پایہ سلوک اور اخلاقِ حسن رچا بسا نہ ہوتا، جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی''**انتم اعلم بامور دنیاکم**'' (تم لوگ اپنے دنیاوی معاملات سے زیادہ واقف ہو) سے ظاہر ہوتا ہے۔[۲]

کیا آج کل کے مدعیانِ اجتہاد میں بھی کوئی شخص ایسا ہے کہ حقیقتِ واقعہ کے سلسلہ میں

انصاف سے کام لے، اور جس چیز کی مہارت نہیں رکھتا اس کے بارے میں بے تکلف امام غزالی جیسا اعتراف کر لے۔

خلق الله للعلوم رجالاً

ورجالا لنفشة ودعاوی

اللہ نے کچھ لوگوں کو علم کے واسطے پیدا کیا، اور کچھ لوگ صرف لاگ گزاف اور دعاوی کے لئے ہیں۔

حافظ ابوعمر بن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں امام احمد بن حنبل کا ایک قول نقل کر کے اس پر جو فائدہ تحریر کیا وہ قابلِ ملاحظہ ہے:

''امام صاحب نے یحییٰ بن معین کے متعلق فرمایا کہ وہ امام شافعی کو کیا جانیں، وہ نہ امام شافعی کی معرفت رکھتے ہیں، اور نہ ان کی باتوں کو سمجھتے ہیں۔ اس پر حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں، امام احمد بن حنبل نے سچ فرمایا، بلاشبہہ ابن معین امام شافعی کو نہیں پہچانتے، ان کا تو حال یہ ہے کہ ان سے تیمّم کا ایک مسئلہ پوچھا گیا تو اسے بھی نہیں بتا سکے''۔

''پھر وہ اپنی سند سے یحییٰ بن معین کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اختیار دیا، اس نے اپنے کو اختیار کیا تو کیا مسئلہ ہوگا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے متعلق اہل علم سے پوچھو''۔ (۱۶۰/۲)

حافظ ابن رجب کی ''ذیل طبقات الحنابلہ'' میں اور علیمی کی ''المنہج الاحمد'' میں یحییٰ بن مندہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک صاحب کی بیوی کا انتقال ہوا، وہ یحییٰ بن معین اور دورقی کے پاس آئے، کہ اس میت کو غسل دینے کے لئے بجز ایک حائضہ عورت کے اور کوئی نہیں ملی، (انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا) امام احمد حنبل تشریف لائے، پوچھا کیا بات ہے؟ بتایا گیا کہ ایک حائضہ عورت کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جو اسے غسل دے سکے، امام احمد نے فرمایا کہ آپ ہی حضرات تو نبی علیہ ﷺ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ ''**یاعائشہ! ناولینی الخمر، قالت: انی حائض فقال: ان حیضتک لیست فی یدک**'' اے عائشہ! رومال دیدو، انہوں نے عرض کیا کہ میں حیض سے ہوں، فرمایا کہ حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت

نہلا سکتی ہے، اس پر وہ لوگ شرمندہ ہوگئے''۔(ذیل ۱/۱۳۱۱۔منہج ۲/۲۰۸)

روایت حدیث آسان ہے، تفقہ مشکل ہے:

یہ بات بلاشبہہ درست ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالی نے حافظہ کی قوت بخشی ہو اور وہ حفظ ویادداشت میں اہتمام سے مشغول ہو، اس کے لئے روایتِ حدیث بہت آسان ہے، اسی لئے روایت کی صلاحیت رکھنے والے تفقہ واجتہاد کی استعداد رکھنے والوں سے بہت زیادہ ہوئے ہیں، حافظ رامہرمزی نے اپنی کتاب ''المحدث الفاضل'' میں اپنی سند سے انس بن سیرین کا قول نقل کیا ہے کہ میں کوفہ پہونچا، تو وہاں دیکھا کہ چار ہزار علما حدیث کی تحصیل میں لگے ہوئے ہیں، لیکن ان میں صرف چار سو ایسے تھے جنہیں فقہ میں درک حاصل تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقیہ کا عمل بہت دشوار ہے، اسی لئے ان تعداد اتنی نہیں ہے جتنی راویانِ حدیث کی ہے، اور یہ بالکل ظاہر ہے، جب یحییٰ بن قطان، وکیع بن جراح، عبدالرزاق اور یحییٰ بن معین جیسے ائمہ حدیث، اجتہاد وتفقہ کے میدان میں گھسنے کی ہمت نہیں رکھتے، تو ہمارے زمانے کے مدعیانِ اجتہاد کی جرأت کا اندازہ کیجئے کہ کس قدر بڑھی ہوئی ہے، اور اس پر طرہ یہ کہ یہ بہادر لوگ بے حیائی سے سلف کو جاہل بھی سمجھتے ہیں۔نعوذ باللہ

میں نے اکابر حفاظ حدیث اور ائمہ مجتہدین کے یہ واقعات، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یادداشت الگ چیز ہے، اور نصوص کا سمجھنا اور فقہ میں گیرائی پیدا کرنا الگ شئی ہے، اس لئے نقل کئے ہیں کہ ہمارے زمانے میں بہتوں کے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ اگر کسی کے پاس کتابیں کثیر تعداد میں ہوں، جو دھڑا دھڑ اپریس سے نکل نکل کر آرہی ہیں، اور ان کی فہرستیں ہوں جن کی مدد سے ہر حدیث کو آسانی سے وہ پا سکتا ہے، بس اتنے ہی سے اس کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھل جاتا ہے، حالانکہ یہ خیال باطل اور وہم محض ہے۔

دیکھئے قرون اولیٰ کے محدثین کا حافظہ کتنا عجیب وغریب تھا، اور ان کے اذہان میں کس قدر جودت اور سرعت تھی، وہ جامد اور گونگی کتابوں کی طرح نہ تھے، اور جس ماحول میں وہ تھے اس میں فقہ وحدیث کے حلقے بکثرت تھے، سماع وتدریس کا دور دورہ تھا، محدثین وفقہا بے شمار تھے، ان سب کے باوجود انہیں یہ خیال کبھی نہ آیا کہ وہ مجتہد بن جائیں، اور اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا

ہوں۔انہوں نے اللہ کے ساتھ بھی سچا معاملہ کیا،اپنے آپ کے ساتھ بھی،اور لوگوں کے ساتھ بھی!۔

یہ حضرات ذکاوت وذہانت میں ہمارے زمانے کے مجتہدین سے کسی طرح کم نہ تھے، بلکہ ان کی ذکاوت مشہور تھی،وہ بڑے ذہین وفطین تھے،ان کی قوتِ یادداشت زبردست تھی،اور وہ علم کے لئے بالکل یکسو تھے،لیکن اس کے باوجود جس فن میں انہیں مہارت نہ تھی اس میں وہ داخل نہیں ہوئے،اور جس کی انہیں مہارت تھی بس اسی پر اکتفا کیا۔اس سے ان کی زندگی میں حسن پیدا ہوا،اور لوگوں کی نگاہ میں ان کی عظمت قائم ہوئی،یہ طریقہ ان کی خوبیٔ اسلام اور اعترافِ حقیقت کی روشن دلیل ہے،ان پر اللہ تعالی کی رحمت ورضامندی کا نزول ہو۔

حافظ خطیب بغدادی نے ''الفقیہ والمتفقہ'' میں لکھا ہے کہ ''کتبِ حدیث کے بکثرت جمع کرنے اور ان کی روایت کرنے سے آدمی فقیہ نہیں ہوتا،ایک عالم،فقیہ اس وقت ہوتا ہے جب اس میں معانی کے استنباط اور گہرائی سے غور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے،انہوں نے اس سلسلہ میں بہت سے شواہد ودلائل نقل کئے ہیں''۔(۸۱/۲)

اب سنئے کہ مؤطا تالیف ہے ایک محدث کی،جو فقیہ بھی تھا،مجتہد بھی تھا،امام بھی تھا، ماہر فن بھی تھا،اس لئے اس میں وہ خصوصیات وامتیازات ہیں جو حدیث کی دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔

مؤطا کے امتیازات:

مؤطا کے امتیازات جن کے باعث وہ حدیث کی دوسری کتابوں سے ممتاز ہے،بہت ہیں،ان میں چند کو یہاں اختصار کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

(۱) وہ ایک امام،فقیہ،محدث،بڑے مجتہد اور عظیم پیشوا کی تالیف ہے،جس کے حق میں ان کے معاصرین نے بھی اور ان کے بعد کے علمانے بھی فقہ وحدیث میں امامت کی شہادت دی ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔حافظ ابن ابی حاتم نے ''الجرح والتعدیل'' میں علی ابن مدینی کا قول نقل کیا ہے کہ ''اہل علم کے حلقے میں فقہا کی حدیثیں،شیوخِ حدیث کی روایتوں کے مقابلے میں زیادہ پسند کی جاتی تھیں''۔(۲۵/۱۱۱)

امام ابن تیمیہ نے ''منہاج السنۃ'' میں امام احمد بن حنبل کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ''حدیث وفقہ کی معرفت مجھے اس کے حفظ سے زیادہ پسند ہے''۔ علی ابن مدینی نے فرمایا کہ ''بہترین علم متونِ حدیث میں تفقہ اور راویوں کے احوال کی معرفت ہے۔ انتہی (۱۱۵/۴)

حافظ سیوطی نے ''تدریب الراوی'' میں امام اعمش کا قول ذکر کیا ہے ''وہ حدیث جو فقہا کے درمیان متداول ہے، اس سے بہتر ہے جو شیوخِ حدیث کے حلقے میں متداول ہے''۔ (ص ۸)

حافظ رامہرمزی نے اپنی کتاب میں ایک طویل باب روایت ودرایت کی جامعیت پر منعقد کیا ہے، خطیب بغدادی نے بھی اپنی کتاب ''الکفایۃ'' کے آخر میں ایک باب احادیث کی ترجیح کے متعلق تحریر کیا ہے، جس میں فقیہ کی حدیث کی ترجیح غیر فقیہ کی حدیث پر تفصیل سے ذکر کی ہے۔

(۲) اس کتاب کی تعریف وتبجیل پر علما کا اتفاق ہے، اور اس کی مدح وتعریف میں بکثرت اقوال ہیں، یہاں اختصار کی غرض سے صرف امام الائمہ، فقیہ، محدث، مجتہد، اور امام متبوع امام شافعی علیہ الرحمہ کا قول نقل کیا جاتا ہے، اور وہی بہت کافی ہے۔ فرمایا کہ ''روئے زمین پر اللہ کی کتاب کے بعد امام مالک کی کتاب سے زیادہ صحیح کتاب اور کوئی نہیں ہے''، کبھی فرمایا کہ ''روئے زمین پر کوئی کتاب قرآن کریم سے قریب تر امام مالک کی کتاب کے سوا نہیں ہے''، کبھی فرمایا: ''کتاب اللہ کے بعد مؤطا امام مالک سے زیادہ باصواب کتاب دوسری نہیں ہے''، کبھی انہوں نے اسے ''کتاب اللہ کے بعد سب سے نافع کتاب قرار دیا''۔

عبارتوں کا یہ تنوع بتاتا ہے کہ انہوں نے مؤطا کی تعریف بار بار اور بکثرت کی ہے۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری صدی ہجری کے درمیانی حصہ کی تالیف ہے، اس لئے وہ سابق ہے مسبوق نہیں، وہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے، اور سابق کی فضیلت مسلم ہے۔ اسی کتاب نے حدیث کی کتابوں کو فقہی ابواب پر مرتب کرنے کا راستہ دکھایا، بعد والوں نے اسی کی اقتدا کی۔ چنانچہ عبداللہ بن مبارک، امام بخاری، امام مسلم، امام سعید بن منصور، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور ابن ماجہ نے اسی کی پیروی کی۔

(۴) اس کتاب کی روایت اس کے عالی مقام مصنف سے ایک دوسرے بلند پایہ امام، فقیہ، محدث، مجتہد کبیر نے کی، جن کے حق میں فقہ وحدیث اور عربیت کے سلسلے میں امامت کی گواہی دی گئی ہے، یعنی امام محمد بن حسن شیبانی علیہ الرحمہ۔ یہ تین سال تک مسلسل امام مالک کی صحبت میں رہے، اور کتاب کی سماعت خود ان سے کی، اور ان کے علم وفقہ اور روایت ودرایت سے سیر ہوکر فائدہ اٹھایا۔ اس باب میں اپنی خداداد ذہانت وذکاوت، دانائی کامل اور فقاہتِ طبع سے خوب خوب کام لیا۔

(۵) یہ کتاب امام محمد بن حسن کی روایت سے ہے، جو امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے شاگرد ہیں، اور امام شافعی کے استاذ ہیں، اور اپنے شیخ امام مالک سے ان کی روایت کو باتقانِ کامل اخذ کیا ہے، اور ہر باب سے متعلق احادیث کی روایت کے بعد اس مسئلہ میں اپنے مذہب کو بھی بیان کیا ہے، خواہ موافق یا مخالف، اور اپنے استاذ امام ابوحنیفہ کا مذہب اور ان کی موافقت یا مخالفت کو بھی تحریر کیا ہے، اور کبھی کبھی اپنے شیخ امام مالک اور دوسرے فقہا کے مذہب کو بھی بیان کرتے ہیں۔

اور بہت سے ابواب میں حدیث کا مطلب، اس کی توجیہ کو بھی بیان کرتے ہیں، اور وجوہِ مسئلہ میں اپنی پسند وناپسند کو بھی ذکر کرتے ہیں، اور کبھی کبھی پوری تفصیل سے مختلف اقوال کو بیان کرتے ہیں، اور اپنے مذہب اور اپنے استاذ امام ابوحنیفہ یا امام مالک کے مذہب کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں، اور مسئلہ کے احوال واحکام کی تفصیل لکھتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو، باب الوضو من الرعاف)

اور کبھی کبھی اپنے مسلک کی تائید میں جو اس باب کی حدیثوں کے خلاف ہوتا ہے، امام ابوحنیفہ وغیرہ سے روایات لاتے ہیں۔ چنانچہ ''باب الوضو من مس الذکر'' میں اپنے مسلک کی تائید میں کہ مسِ ذکر سے وضو نہیں ٹوٹتا سولہ حدیثیں امام مالک کے علاوہ دوسرے طرق سے لائے ہیں، یہ بہت بڑی تعداد ہے۔

اور بعض ابواب میں اپنے مذہب کی تائید میں چھ یا سات یا اس سے کچھ زائد حدیثیں امام مالک کے علاوہ دوسرے طرق سے لائے ہیں۔ (ملاحظہ ہو، باب الاغتسال یوم الجمعۃ)

مؤطا امام محمد سے موسوم ہونے کی وجہ:

چونکہ اس کتاب میں بکثرت حدیثیں دوسرے طرق سے بھی ہیں، اور چونکہ اس میں انہوں نے بکثرت اپنے اور امام ابوحنیفہ اور دوسرے علما کے اجتہاد وفقہ کو درج کیا ہے، نیز بعض ابواب میں کسی کسی صحابی کے بھی مسلک کو لکھا ہے، اسی لئے یہ بجائے مؤطا امام مالک کے مؤطا امام محمد کے نام سے مشہور ہوئی۔

اور اس میں کچھ غرابت نہیں ہے، کیوں کہ مؤطا امام محمد محض ایک کتاب نہیں ہے کہ راوی نے اس کے مرتب سے جو الفاظ وحروف سنے بس ان کی روایت کردی، اور اس میں نہ کوئی اضافہ کیا نہ تعلیق لکھی، اور نہ استدراک کا اہتمام کیا۔ بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں امام محمد کی ذہانت ہے، ان کے شیخ امام ابوحنیفہ کی فقاہت ہے، اور ہمارے دوسرے اصحابِ حنفیہ کی فقہ ہے، جو امام محمد سے پہلے کے ہیں، اور بعض صحابہ کے مذاہب ہیں، اور امام مالک علیہ الرحمہ کے مسلک کے ساتھ اس میں مناقشہ بھی ہے۔ اس طرح یہ کتاب حجاز اور عراق کے اہل حدیث اور اہل اجتہاد وقیاس کی فقہ سے مرتب ہوئی ہے، مزید یہ کہ اس میں ان مذاہب اور رایوں کے درمیان موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

جس شخص کو مذکورہ بالا خصوصیت کی اہمیت اور اس کی قدر وقیمت کی معرفت ہوگی، اس کے نزدیک اس کی یہی خصوصیت سب سے اہم ہے۔ اس لئے اگر یہ کتاب اپنے راوی کی طرف منسوب ہوکر معروف ہوئی تو کچھ تعجب کی بات نہیں، اور اس لئے بھی کہ انہوں نے اس میں بہت سی احادیث کا اضافہ کیا ہے، اور اس میں بکثرت ایسا علم شامل کیا ہے جو فقہِ حدیث اور احکامِ باب سے تعلق رکھتا ہے، اور ایک اجتہاد کے مقابلہ میں اسی جیسا دوسرا اجتہاد بھی اس میں پیش کیا ہے۔

امام مالک علیہ الرحمہ سے مؤطا کی روایت:

امام دارقطنی نے مؤطا کی روایت اور اس کے راویوں کے اختلاف واتفاق کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے، اس کا نام "**احادیث المؤطا واتفاق الرواة عن مالک واختلافهم فيها زيادةً ونقصاً**" ہے، اس پر ہمارے شیخ علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ

علیہ نے مقدمہ لکھا ہے۔مقدمہ میں شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابوسلمہ الماجشون نے ایک کتاب تالیف فرمائی،اس میں انہوں نے وہ مسائل ذکر کئے جن پر اہل مدینہ کا اتفاق ہے،حضرت امام مالک نے اسے جب ملاحظہ فرمایا تو انہیں یہ طریقہ کار پسند آیا،لیکن چونکہ انہوں نے ان مسالک کے سلسلے میں احادیث وآثار کو ذکر نہیں فرمایا تھا،اس لئے امام صاحب کو اس میں کمی اور نقص کا احساس ہوا،پھر انہوں نے طے کیا کہ وہ خود ایک کتاب مرتب کریں گے، جس میں ہر باب اور ہر مسئلہ کے متعلق صحیح احادیث کو بھی ذکر کریں،اور اہل مدینہ کا عمل بھی درج کریں،اسی کے پیش نظر انہوں نے مؤطا کی ترتیب شروع کی۔

انہوں نے کتاب اس لئے نہیں مرتب کی تھی کہ اسے مکمل کر کے لوگوں کے حوالے کر دیں،اور لوگ اس کی نقلیں لے کر اپنے اپنے نسخے تیار کرلیں،اور اس طرح وہ اہل علم اور عوام کے درمیان عام ہو جائے،جیسا کہ عام طور سے تصنیف وتالیف کا یہی طریقہ رائج ہے،لیکن اس وقت یہ طریقہ نہ تھا،بلکہ یہ طریقہ تھا کہ مصنف اپنی کتاب اپنے شاگردوں کو پڑھ کر سناتا تھا،تلامذہ اسے یاد کرتے تھے اور اسے لکھ لیتے تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ کتاب اپنے لئے لکھی تھی،تاکہ شاگردوں کو جب حدیث سنائیں تو اس میں غلطی نہ ہو،اسی لئے وہ مختلف وقتوں میں اس میں تغیر وترمیم اور حذف و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مؤطا کے نسخوں میں ترتیب کے لحاظ سے بھی اور ابواب کے اعتبار سے بھی کافی اختلاف ہے۔اسی طرح کسی نسخہ میں احادیث کچھ زائد ہیں،کسی میں کم،کسی میں کوئی حدیث مسند ہے،کسی میں مرسل،مجالسِ درس اور تلامذہ کے لحاظ سے یہ تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

پھر جو لوگ ان سے احادیث کا سماع کرتے تھے،اور انہیں لکھتے تھے،ان کے مراتب میں فہم وضبط اور قوت وضعف کے اعتبار سے فرق ہوتا تھا،تو جن مقامات پر تمام رواۃ کا اتفاق ہو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا ثبوت امام مالک علیہ الرحمہ سے نہایت پختہ اور موثوق ہے،اور جہاں جہاں رواۃ کا اختلاف ہے،یا کوئی ایک ہی راوی اسے بیان کرتا ہے تو ان راویوں یا اس تنہا راوی کے مرتبۂ قوت وضعف کا اثر اس پر پڑے گا۔

ابوالقاسم غافقی نے مؤطا امام مالک کے بارہ راویوں کا تذکرہ کیا ہے،ان میں سے عبداللہ بن یوسف تینیسی ،محمد بن مبارک صوری،اورسلیمان بن بردہ ہیں،علامہ سیوطی نے بطور استدراک کے دواورراویوں کا نام لیاہے،جن کے مؤطا کے نسخے زیادہ مشہور ہیں۔

ابن طولون نے ''**الفهرس الاوسط**'' میں مؤطا کی ۲۴؍سندیں ذِکرکی ہیں،اسی طرح ابوالصبر ایوب الخلوتی نے بھی ابن طولون وغیرہ کے طریق سے اتنی ہی سندیں ذکر کی ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے''ثبت''میں مذکور ہیں۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مدظلہ فرماتے ہیں کہ مجھے مؤطا کی روایت کی اجازت میرے شیخ حافظ،محدث،ناقد علامہ محمد زاہدالکوثری رحمۃ اللہ علیہ سے ملی ہے،ان کی اجازت کے طرق حسب ذیل ہیں۔

(الف) شیخ حجار کے طریق سے مندرجہ ذیل نسخوں کی روایت کرتے ہیں۔

(۱) امام محمد بن حسن (۲) یحییٰ بن یحییٰ النیسا پوری (۳) قتیبہ بن سعید (۴) عبداللہ بن عمر بن غانم (۵) عبدالعزیز بن یحییٰ الہاشمی (۶) عبدالملک بن عبدالعزیز بن الماجشون (۷) ابن القاسم (۸) عبداللہ بن نافع

(ب) ابوہریرہ بن ذہبی کے طریق سے حسب ذیل روایات ہیں۔

(۹)مطرف بن عبداللہ یساری(۱۰)مصعب بن عبداللہ زبیری(۱۱) علی بن زیاد تونسی (۱۲)اشہب

(ج) محمد بن عبداللہ بن المحب کے طریق سے۔

(۱۳)عبداللہ بن وہب کی روایت ہےاور(۱۴)اسحاق بن عیسیٰ طباع کی۔

(د) ابراہیم بن محمد ارموی کے طریق سے۔

(۱۵)عبداللہ بن مسلم القنعبی کی روایت۔

(ھ) زینب بنت الکمال المقدسیہ سے حسب ذیل روایتیں ہیں۔

(۱۶)امام شافعی(۱۷)محمد بن معاویہ الاطرابلسی(۱۸)اسد بن فرات

(و) حافظ ابن حجر کے طریق سے۔

(۱۹) یحییٰ بن یحییٰ لیثی (۲۰) ابومصعب احمد بن ابوبکر زہری (۲۱) یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر مصری (۲۲) سوید بن سعید (۲۳) سعد بن کثیر بن عفیر (۲۴) معن بن عیسیٰ قراز

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ امام مالک کے تلامذہ میں مؤطا امام مالک کے یہ چوبیس راوی ہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام مالک کی روایات زیادہ تر ابن مہدی کے طریق سے لاتے ہیں۔ امام ابوحاتم معن بن عیسیٰ کے طریق سے، امام بخاری عبداللہ بن یوسف کے واسطے سے، امام مسلم یحییٰ بن یحییٰ نیساپور کے طریق سے، امام ابوداؤد قعنبی کے طریق سے اور امام نسائی قتیبہ بن سعید کے واسطے سے ذکر کرتے ہیں۔

حافظ ابن ناصرالدین نے اپنی کتاب ''اتحاف السالک برواۃ المؤطا عن مالک'' میں مؤطا کے راویوں کی تعداد ۸۳؍ شمار کی ہے۔

ہمارے زمانہ میں اہل مشرق میں امام محمد بن حسن کا نسخہ مشہور ہے، اور اہل مغرب میں یحییٰ بن یحییٰ لیثی کا۔

امام محمد کے نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ اہل حجاز کی وہ روایتیں جو مؤطا میں مذکور ہیں، ان میں اہل عراق نے کن احادیث کو لیا ہے اور کن حدیثوں کو کن دلائل کی وجہ سے نہیں اختیار کیا ہے، انہیں بیان کیا گیا ہے، اور ان کے دلائل کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اہل مدینہ اور اہل عراق کے راویوں کا موازنہ کرنا چاہے اور ان کے دلائل کو پرکھنا چاہے تو اس کے لئے یہ بہت نافع ہے۔

اور دوسرے نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امام مالک علیہ الرحمہ کی فقہی رائیں جس قدر مذکور ہیں کسی اور نسخے میں نہیں ہے، یہ تقریباً تیس ہزار مسائل ہیں۔

یہ دونوں نسخے دنیا کے کتب خانوں میں بکثرت ہیں اور متداول ہیں، اور ابن وہب کا نسخہ آستانہ میں مکتبہ فیض اللہ اور مکتبہ ولی اللہ میں موجود ہے، اور سوید بن سعید اور ابومصعب الزہری کے نسخے کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں ہیں، اور دانی کی ''اطراف م۔طا'' مکتبہ کوپریلی آستانہ میں ہے۔

حدیث کا ایک طالب علم اگر اپنی تعلیم ودراست کا آغاز مؤطا امام مالک کے رجال

ورواۃ سے کرے، اس کے اسناد ومتون کی تحقیق میں لگے، تو اسے تدریجاً علمِ حدیث اور علمِ فقہ کا بیک وقت ذوق اور درک حاصل ہوتا چلا جائے گا، اور پھر اس کے سہارے حدیث کی دوسرے مباحث میں بھی اسے اللہ کی توفیق سے نورِ بصیرت حاصل ہوگا، اور علم کی بلندیوں پر پہونچ جائے گا، یہ علم اسے خود بھی نفع دے گا اور دوسروں کو بھی اس سے فائدہ پہونچے گا۔

امام محمد بن حسن علیہ الرحمہ کے حالات:

مؤطا امام محمد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام محمد علیہ الرحمہ کے شیوخ واساتذہ بہت ہیں، اور جیسے ان کا رتبہ فقہ واجتہاد میں بلند ہے اسی طرح علم حدیث میں بھی انہیں بڑا مقام حاصل ہے۔ بعض محدثین نے ان کے اجتہاد وقیاس کی وجہ سے ان پر بڑا ظلم کیا ہے، بہت سے محدثین کے نزدیک قیاس ورائے کی وجہ سے راوی کی ثقاہت مجروح ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ راویوں کے اسبابِ جرح میں اسے بھی ذکر کرتے ہیں، گو کہ وہ راوی فن حدیث میں امام ہو، اور پوری طرح ثقہ ومعتبر ہو! حالانکہ بغیر رائے وقیاس کے فقہ کا وجود ہی نہیں ہوسکتا، اور ائمہ مجتہدین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ اس نے رائے وقیاس سے کام نہ لیا ہو، لیکن جس راوی کے پاس یہ محدثین رائے وقیاس دیکھتے ہیں اس کے اوپر نقد کرنے میں ان کا قاعدہ یہ ہے کہ ''جو ہماری طرح نہیں وہ ہمارا مدمقابل ہے''۔ انا للہ

یہاں میں امام محمد علیہ الرحمہ کے کچھ حالات، امام ذہبی کے رسالہ ''مناقب ابی حنیفہ وصاحبیہ ابی یوسف ومحمد بن الحسن'' سے نقل کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''امام ابو یوسف کے بعد عراق میں علم وفقہ کی ریاست ان کو ملی، بہت سے ائمہ نے ان سے تفقہ حاصل کیا، بکثرت کتابیں لکھیں، ان کا شمار دنیا کے اذکیاء میں ہے، خلیفہ ہارون رشید نے انہیں قاضی القضاۃ بنایا، اور انہوں نے وہ جاہ ومرتبہ پایا کہ اس سے آگے کا تصور نہیں ہوسکتا۔ علم حدیث میں امام شافعی نے انہیں حجت گردانا، ان کی حد درجہ ذہانت وذکاوت، عقلِ کامل، سیادت اور بکثرت تلاوت کی حکایات معروف ہیں۔[۴]

امام شافعی علیہ الرحمہ نے امام محمد علیہ الرحمہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''میں امام مالک کے آستانہ پر تین سال تک مقیم رہا ہوں، اور میں نے سات سو سے زیادہ حدیثیں ان کی زبان سے اور

ان کے لفظ میں سنی ہیں‘‘۔

امام شافعی ہی کا ارشاد ان کے شاگرد ربیع بن سلیمان مزنی نقل کرتے ہیں کہ ’’میں اگر یہ کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کریم امام محمد بن حسن کی زبان میں نازل ہوا ہے، کیوں کہ وہ بہت اعلیٰ درجے کے فصیح تھے‘‘، اور وہی فرماتے ہیں کہ ’’میں نے امام محمد علیہ الرحمہ کے علاوہ کسی تندرست اور موٹے آدمی کو اتنا سبک روح نہیں دیکھا، جتنے سبک روح وہ تھے، اور نہ ان سے زیادہ کسی کو فصیح پایا، جب میں انہیں قرآن پڑھتے دیکھتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ قرآن کا نزول انہیں زبان میں ہوا ہے‘‘۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے تھے کہ ’’کتاب اللہ کو امام محمد سے بڑھ کر میں نے جاننے والا نہیں دیکھا، معلوم ہوتا تھا کہ قرآن کا نزول انہیں کی زبان میں ہوا ہے‘‘۔

امام طحاوی نے اپنی سند سے امام شافعی علیہ الرحمہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ’’جب بھی کوئی آدمی بات کرتا تو مجھے یہ خیال کبھی نہ گزرتا کہ قرآن کریم اس کی زبان میں نازل ہوا ہوگا، البتہ امام محمد کے بارے میں یہ خیال گزرتا تھا۔ میں نے ان سے ایک بختی اونٹ کے بوجھ کے بقدر علم کی کتابت کی ہے‘‘۔ امام شافعی ہی ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ ’’مجھے جب بھی کسی سے مباحثہ کا اتفاق ہوا ہے، اس کا چہرے بگڑا ضرور ہے، بجز امام محمد کے، کہ ان چہرے پر کبھی تغیر کا اثر ظاہر نہیں ہوا‘‘۔

آپ خیال کیجئے! ایک بختی اونٹ جو اونٹوں میں سب سے جسیم اور طاقت ور ہوتا ہے اس کے بوجھ کے بقدر کاغذ میں کتنی حدیثیں ہوں گی؟ اور امام شافعی علیہ الرحمہ کی اس گراں قدر شہادت کی وقعت وعظمت کس قدر ہے؟۔

مشہور محدث ابن معین فرماتے ہیں کہ ’’میں نے امام محمد بن حسن سے سن کر ’’جامع صغیر‘‘ لکھی ہے‘‘۔

محمد بن سماعہ کہتے ہیں کہ ’’امام محمد علیہ الرحمہ مسائل کے غور وخوض میں اس درجہ مستغرق ہوتے تھے کہ انہیں گردوپیش کی خبر نہیں ہوتی تھی، آدمی آکر انہیں سلام کرتا تو وہ بجائے جواب دینے کے اس کو دعائیں دینے لگتے تھے، وہ آدمی پھر سلام کرتا تو پھر اسی دعا کو بعینہ دہرانے لگتے‘‘۔

محمد بن سماعہ فرماتے ہیں کہ امام محمد اکثر اوقات یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

محسو د و ن و شر ا لنا س منز لۃ!

من عاش فی الناس یوماً غیر محسود

ہم لوگ محسود ہیں،اور سب سے کمتر مرتبہ کا آدمی وہ ہے جو ایک دن بھی اس حال میں گزار دے کہ اس پر حسد کرنے والا کوئی نہ ہو۔(امام ذہبی کا کلام ختم ہوا)

امام شافعی علیہ الرحمہ نے امام محمد کی وسعتِ قلبی اور کثرتِ حلم کا ذکر کیا ہے کہ مناظرہ اور مباحثہ میں اور اپنے مخالفین ومعترضین پر وہ کبھی چیں بجبیں نہ ہوتے تھے،اس کی مناسبت سے ان کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

امام محمد کا حلم اور کثرتِ علم:

حافظ خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' میں مشہور محدث اور فقیہ حضرت عیسی بن ابان کے تذکرہ میں محمد بن سماعہ سے ایک روایت نقل کی ہے،وہ فرماتے ہیں کہ ''عیسیٰ بن ابان ہمارے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے،میں ان سے کہتا تھا کہ امام محمد کی مجلس میں آیا کیجئے،وہ کہتے تھے کہ نہیں،یہ لوگ حدیث کے خلاف عمل کرتے ہیں۔عیسیٰ بن ابان اچھے حافظِ حدیث تھے،ایک روز ہم دونوں نے فجر کی نماز ساتھ ہی پڑھی،اس دن امام محمد کی مجلسِ درس تھی،میں ان کے سر ہو گیا،آخر وہ امام صاحب کی خدمت میں آہی گئے،جب مجلس ختم ہوئی تو میں عیسی ابن ابان کو ان کے قریب لے گیا،اور عرض کی کہ یہ آپ کے بھتیجے عیسیٰ بن صدقہ الکاتب ہیں،انہیں علم حدیث کی بڑی مہارت وذکاوت حاصل ہے،میں انہیں آپ کی خدمت میں لانا چاہتا تھا مگر یہ انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم لوگ حدیث کے خلاف عمل کرتے ہو۔یہ سن کر امام محمد علیہ الرحمہ ان کی طرف متوجہ ہوئے،اور فرمایا بیٹے!کس بات میں تم نے ہم کو حدیث کی مخالفت کرتے دیکھا ہے؟یہ بات اس وقت تک نہ کہو جب تک ہم سے ہماری بات سن نہ لو۔

عیسیٰ بن ابان نے اس دن امام محمد علیہ الرحمہ سے حدیث کے متعلق پچیس ابواب کے بارے میں سوالات کئے،امام صاحب نے ان کے جوابات دیئے،ناسخ اور منسوخ کی وضاحت کی،اور دلائل وشواہد پیش کئے۔جب ہم وہاں سے نکلے تو عیسیٰ بن ابان نے کہا کہ میرے اور نور کے درمیان ایک حجاب تھا،اب وہ اٹھ گیا،مجھے گمان نہ تھا کہ اللہ کی اس سرزمین میں کوئی ایسا بھی

آدمی ہوگا جس کو اللہ تعالی لوگوں کے لئے ظاہر کریں، اس کے بعد انہوں نے امام محمد کی صحبت کا بڑی پابندی سے التزام کیا اور ان سے تفقہ حاصل کیا۔

رائے اور قیاس۔ جس کو امام محمد اور ابو حنیفہ کے سر پر تہمت قرار دیا گیا:

میں نے امام محمد علیہ الرحمہ کے حالات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رائے اور قیاس کو تہمت سمجھ کر انہیں مطعون کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ راوی اگر عادل اور صاحبِ ضبط واتقان ہو تو اس کا صاحبِ رائے ہونا روایت کی صداقت میں قادح نہیں ہے، اور نہ اس سے اس میں ضعف پیدا ہوگا، اور نہ اس سے راوی کی صداقت متأثر ہوگی، کیوں کہ نقلِ روایت میں اس کی امانت واحتیاط قائم اور تام ہے، اور عدالت کا تحفظ اسے کسی حرف کے کم وبیش کرنے سے مانع ہوگا، کیوں کہ روایت میں وہ صاحبِ دیانت ہے، اور اپنی سلامتِ طبع کی وجہ سے اپنی ساکھ کو محفوظ رکھے گا۔

اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ بکثرت محدثین وفقہا نے رائے وقیاس پر عمل کیا ہے، خواہ وہ اہل مدینہ ہوں یا اہل کوفہ وبصرہ اور اہل عراق ہوں، بلکہ بعض اکابر کے نام کے ساتھ لفظ ''رائے'' لگا ہوا ہے، مثلاً ربیعۃ الرائے (ابوعثمان ربیعہ بن ابی عبدالرحمان) تابعی مدنی، جو امام مالک، امام سفیان ثوری، امام شعبہ بن الحجاج، امام لیث بن سعد مصری اور ان کے طبقے کے اکابر محدثین کے شیخ ہیں۔ (متوفی ۱۳۶ھ)

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہی رائے حضرات حنفیہ کے حق میں تہمت اور سببِ طعن بن گئی، امام فخر الدین بزدوی نے اپنی کتاب ''اصول الفقہ'' کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ۔

''ہمارے اصحاب ہی اس باب یعنی فقہ میں پیش رو ہیں، یہ حضرات کتاب وسنت کے علم اور لزومِ اتباع میں علمائے ربانی ہیں، یہی درحقیقت اصحابِ حدیث اور اربابِ معانی ہیں۔ معانی کے سلسلے میں ان کی پیشوائی تو عام طور سے علما نے تسلیم کی ہے، اسی لئے ان کے لئے اصحابِ رائے کا لقب تجویز کیا ہے، اور رائے، تفقہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے فرمایا ہے کہ ''کتبِ فقہ کو کتبِ رائے سے موسوم کیا جاتا ہے''۔ (مجموع الفتاویٰ ج ۱۸۔ ص ۴۷)

اور یہی حضرات اصحاب الحدیث بھی ہیں، بلکہ بدرجۂ اولیٰ۔ دیکھو کہ یہ اکابر کتاب کا

نسخ سنت سے جائز قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک سنت کا درجہ بھی بڑا اہم اور قوی ہے، انہوں نے مراسیل روایات پر بھی عمل کیا ہے، اور اس سلسلے میں ان کا استدلال سنت اور حدیث ہی سے ہے، انہوں ارسال کے باوجود حدیث پر عمل کرنے کو رائے کے مقابلے میں اولیٰ قرار دیا ہے، اور جن لوگوں نے مرسل روایتوں کو رد کیا ہے، وہ بہت سی سنتوں سے دستبردار ہوگئے ہیں، اور اصل کو معطل کر کے فرع پر ان کا عمل جاری ہوا، اور حضرات حنفیہ نے مجہول راوی کی روایت کو بھی قیاس پر مقدم رکھا ہے۔ اسی طرح ان کے نزدیک صحابی کا قول بھی قیاس سے بہتر ہے۔ امام محمد علیہ الرحمہ نے کتاب ''ادب القاضیٰ'' میں فرمایا ہے کہ ''**لایستقیم الحدیث الا بالرای و لایستقیم الرای الا بالحدیث**'' حدیث کی درستگی و پختگی بجز رائے، اور رائے کی درستگی بجز حدیث کے نہیں ہوسکتی۔

علامہ علاؤالدین بخاری اس کی شرح ''کشف الاسرار'' ۷ا؍ میں فرماتے ہیں کہ:

''اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں جب تک رائے کو کام میں نہ لایا جائے یعنی جب تک اس کے شرعی معنی کا جو کہ مناطِ احکام ہے، ادراک نہ کیا جائے، اس وقت تک اس کی تعمیل نہیں ہوسکتی، اسی طرح رائے وقیاس پر پر عمل جب تک حدیث کی روشنی میں نہ ہو، درست نہیں ہوتا''۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مدظلہ فرماتے ہیں کہ اصحابِ رائے کا لقب کوفہ کے علما وفقہا کو حدیث کے ان راویوں کی طرف سے ملا ہے، جن کا سارا علم یہ ہے کہ وہ الفاظِ حدیث کے ظاہر کی خدمت کرتے ہیں، اس کے علاوہ وہ معانی کے حقائق اور استنباط کے دقائق سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کو ہر اس شخص سے انقباض ہوتا ہے جو نصوص کو سمجھنے اور علت ومناط کی تحقیق وتخریج میں اپنی عقل وفہم کو کام میں لانا چاہتا ہے، اور جو کچھ ان لوگوں نے ظاہرِ حدیث سے سمجھا ہے، اس کے علاوہ وہ مزید کچھ بحث وتحقیق کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا شخص راستے سے منحرف ہوگیا ہے، اور حدیث کو ترک کر کے رائے پر چلا گیا ہے، یہ شخص ان کے خیال میں مذموم ہے، اور اس کی روایت قابلِ ترک ہے۔

اس وصف کی وجہ سے انہوں نے بہت سے ثقہ اور قابلِ اعتماد فقہا پر جرح کی ہے۔

چنانچہ اس کی مثالیں رجالِ حدیث کے تذکروں میں بکثرت ملتی ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

(۱) امام بخاری کے شیخ محمد بن عبداللہ مثنی انصاری کے متعلق حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' کے مقدمہ ''ھدی الساری'' میں لکھا ہے کہ ''یہ امام بخاری کے قدیم شیوخ میں ہیں، ثقہ ہیں، ابن معین وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے''۔

امام احمد نے فرمایا کہ محدثین کے نزدیک ان کی تضعیف کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ رائے سے کام لیتے تھے، رہی سماعتِ حدیث کی بات تو وہ ثابت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان کا تذکرہ ''تذکرۃ الحفاظ للذہبی'' ج ۱۔ص ۳۷۱ اور ''تہذیب التہذیب'' ج ۲۔ص ۲۷۴ میں ملاحظہ ہو۔

(۲) حافظ ابن حجر نے ''ہدی الساری'' ہی میں ولید بن کثیر مخزومی کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''ابراہم بن سعد، ابن معین اور ابوداؤد نے ان کی توثیق کی ہے، ساجی نے فرمایا کہ یہ ثقہ اور ثبت تھے، ان کی حدیث قابلِ احتجاج ہے، کسی نے ان کی تضعیف نہیں کی، البتہ رائے کی وجہ سے لوگوں نے ان کی گرفت کی ہے''۔

(۳) حافظ ذہبی نے ''المغنی'' میں لکھا ہے کہ:

''معلّٰی بن منصور رازی، مشہور امام ہیں، ثقہ ہیں، ابوداؤد نے فرمایا کہ امام احمد ان سے رائے کی وجہ سے روایت نہیں کرتے تھے۔ امام ابوحاتم نے فرمایا کہ احمد سے پوچھا گیا کہ آپ ان کی روایت کیوں نہیں لکھتے؟ فرمایا کہ وہ شروط لکھتے ہیں، اور جو شخص شروط لکھتا ہے، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ جھوٹ سے بچ جائے''۔

ان کا تذکرہ ''تذکرۃ الحفاظ'' ج ۱۔ص ۳۷۷، اور ''تہذیب التہذیب'' ج ۱۰۔ص ۲۳۸، میں پڑھیئے۔ اس میں ہے کہ خود امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ معلّٰی بن منصور امام ابو یوسف اور امام محمد کے بڑے اصحاب میں ہیں، اور نقلِ روایت میں نہایت معتبر ہیں۔

ملاحظہ ہو! خود امام صاحب انہیں معتبر قرار دیتے ہیں، لیکن ان سے روایت اس لئے نہیں لیتے کہ وہ اصحابِ رائے میں ہیں۔

اس طرح ان اصحابِ حدیث نے بہت سے اہل رائے کو ترک کر دیا ہے، اور ان کی

روایات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔اصحاب حدیث کی یہ بات سخت قابلِ گرفت ہے،اسی لئے بعض ائمہ حنابلہ مثلاً امام ابوالوفا ابن عقیل حنبلی وغیرہ نے امام احمد علیہ الرحمہ کے اس قسم کے اقوال پر کلام کیا ہے، یا ان کی کوئی مناسب توجیہ کرنی چاہی ہے۔

''مسودہ آل تیمیہ فی اصول الفقہ''میں ہے کہ:

''ہمارے شیخ کے والد نے امام احمد کے اس قول ''**لایروی عن اھل الرای**'' اہل رائے سے روایت نہیں لی جائے گی، کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس پر علامہ ابن عقیل نے بہت کلام کیا ہے۔اور عبداللہ کی روایت میں ہے کہ ''**اصحاب الحدیث لایروی عنھم الحدیث**'' اس پر قاضی ابویعلی نے فرمایا کہ یہ قول ان اہل رائے کے باب میں ہے، جن کا تعلق قدریہ وغیرہ کے متکلمین سے ہے۔

میں کہتا ہوں (یعنی علامہ ابن تیمیہ) کہ یہ توجیہ درست نہیں ہے، امام احمد بن حنبل کی تصریحات اس سلسلہ میں بہت ہیں، یہ ایک طرح کا ترک ہے۔چنانچہ انہوں نے بعض حضرات کی توثیق کی ہے،اس کے باوجود ان کی روایت کو ترک کیا ہے، جیسے امام ابویوسف وغیرہ،اسی لئے ان کی روایتیں حدیث کی بنیادی کتابوں مثلاً صحیحین میں نہیں ہیں۔

امام ابویوسف اور امام محمد کے ساتھ محدثین کی زیادتی:

علامہ جمال الدین قاسمی علیہ الرحمہ نے اپنی ''کتاب الجرح والتعدیل''میں لکھا ہے کہ ''اربابِ صحاح نے اہل رائے کی روایت لینے سے اجتناب کیا ہے، چنانچہ صحیح احادیث اور مسانید وسنن کی کتابوں میں ان کا نام شاید کہیں نہ ملے، جیسے امام ابویوسف، اور امام محمد علیہما الرحمہ۔محدثین نے ان دونوں حضرات کو ہلکا کر کے رکھا ہے۔ملاحظہ ہو میزان الاعتدال، واللہ! ان لوگوں نے ان دونوں ائمہ کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔یہ دونوں بحر ذخار ہیں، ان کے حالات وآثار، ان کی وسعت وتبحر علمی کی شہادت دیتے ہیں، کہ بہت سے حفاظ حدیث سے ان کا رتبہ فائق ہے، اس کے لئے امام ابویوسف کی ''کتاب الخراج''اور امام محمد کی ''موَطا'' کا مطالعہ کر لینا کافی ہے، میں اسے بعض حضرات کے حق میں تعصب کا نتیجہ سمجھتا ہوں، کیوں کہ ان بعض حضرات کے پاس ایسا علم اور ایسا تفقہ ہے جس کو حاصل کرنا چاہئے، اور ان کے علم وعقل سے استفادہ کرنا چاہئے، مگر وائے بر عصبیت!۔

بعض محدثین کی رائیں ائمہ اہل رائے کے حق میں ایسی ملتی ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد شرم آتی ہے، انہیں لکھنا تو درکنار! اور اس کا سبب بس اختلافِ مشرب ہے، اور انہیں وہم ہوگیا ہے کہ یہ مخالفت ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کی رسائی ان ماخذ ومدارک تک نہیں ہوئی جن تک پہونچنے میں ہوسکتا ہے کہ یہ ائمہ اہل رائے برحق ہوں۔ حق کسی ایک متعین گروہ میں منحصر ہوکر رہ جائے، یہ محال ہے۔ اور منصف وہ ہے کہ مدارک کی تحقیق وتدقیق کرلے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کرے۔

احادیث وسنت کے جمع کرنے والوں کی ساری خواہش ان لوگوں کے حق میں رہی ہے جو شہر در شہر چلتے رہے، اور حفظِ حدیث میں شہرت پاتے رہے، اور سنت کے علم اور اس کی تحصیل میں انہیں خصوصیت حاصل رہی۔ اور علمائے رائے اس چیز کے ساتھ مشہور نہیں ہوئے، بلکہ ان کے بارے میں یہ خبر اڑا دی گئی کہ وہ حدیث میں بھی عقل ورائے ہی کو فیصل بناتے ہیں، حالانکہ ان کی مسند روایتیں معروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے راضی ہو اور ہمارا اور ان کا حشر انہیں لوگوں کے زمرے میں کرے جن پر اللہ کا انعام ہوا۔

علامہ احمد شاکر علیہ الرحمہ نے مسند امام احمد بن حنبل کے تعلیقات میں لکھا ہے کہ:

''ابو یوسف قاضی ثقہ ہیں، صدوق ہیں، ان کے بارے میں لوگوں نے ناحق قیل وقال کیا ہے۔ ان کا تذکرہ امام بخاری نے'' تاریخ کبیر'' ۲/۴/۳۹۷ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ اور'' ضعفاء'' ص۔۳۸ میں کہا ہے کہ انہیں یحیٰی اور ابن مہدی وغیرہ نے ترک کیا ہے، ان کا ذکر امام ذہبی نے'' میزان الاعتدال'' ۴/۴۴۸ میں، حافظ ابن حجر نے'' لسان المیز ان' ۶/۳۰۰ میں کیا ہے، اور خطیب نے بھی'' تاریخ بغداد' میں ان کا طویل تذکرہ ۱۴/۲۴۲۔۲۶۲ میں تحریر کیا ہے:

ان کے سلسلے میں انصاف کی بات وہ ہے جسے خطیب نے احمد بن کامل سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ'' یحیٰی بن معین، احمد بن حنبل، اور علی بن مدینی کا نقل ودرایت میں امام ابو یوسف کی ثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں ہے''۔

☆☆☆☆☆

ماخذ: المآثر۔ جولائی (۱۹۹۶ء) تا مارچ (۱۹۹۷) یہ مضمون جلد ۵ شمارہ ۱ تا ۳ شائع ہوا ہے۔

حاشیہ

(۱) تقریر کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ کے سامنے یا آپ کے علم میں کوئی کام ہوا ہو، اور آپ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو، تو گویا آپ نے اس کی اجازت دی ہے، یہی آپ کا سکوت اور عدمِ انکار تقریر کہلاتا ہے۔(مترجم)

(۲) امام ابن جریر طبری نے خلیفہ منصور کا طویل تذکرہ لکھا ہے، چنانچہ ۵۴ صفحہ میں ان کے حالات وواقعات اور اس کی وصیتوں کو لکھا ہے، ۵۴/۸ سے ۱۰۸/۸ تک۔امام زرقانی نے مؤطا کی شرح کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مہدی اور ہادی نے امام مالک سے مؤطا کی سماعت کی تھی، اور ہارون رشید اور اس کے تینوں بیٹوں، امین، مامون اور موتمن نے امام مالک سے مؤطا کا درس لیا، قرون اولیٰ میں علم کے باب میں بادشاہوں کی یہ دلچسپی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے [کہ] خود خلیفہ منصور جو اور اچھے دور میں تھا، اسے علم سے کتنا شغف رہا ہوگا۔

(۳) کھجور کی کاشت کے سلسلے میں انصار مدینہ کے یہاں ایک خاص طریقہ رائج تھا، جس کو رسول اللہ ﷺ نے ٹوٹکا سمجھ کر اشارۃً منع فرما دیا، مگر اس کے بعد کھجوریں کم آئیں، اس وقت آپ نے انہیں اس طریقہ کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''تم لوگ اپنے دنیاوی معاملات سے زیادہ واقف ہو''۔

دیکھئے یہاں پیغمبر نے کاشت کے ایک خاص طریقے میں دوسروں کی واقفیت کا اظہار کیا، کیوں کہ کاشتکاری آپ کا فن نہ تھی۔(مترجم)

(۴) آداب شرعیہ میں ابن مفلح حنبلی نے حضرت ربیع مرادی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ ''اگر امام محمد بن حسن اپنی عقل کے معیار سے کلام کرتے تو ہم ان کی بات سمجھ نہیں سکتے تھے، لیکن وہ ہماری عقل وفہم کے معیار سے گفتگو کیا کرتے تھے''۔

متعلقاتِ حدیث

(۱) شرح مسند احمد اور محدث اعظمی کے علمی استدراکات

(۲) استدراکات علمیہ

(۳) استدراکات علمیہ

(۴) ضعیف اور موضوع احادیث

(۵) کتابت حدیث کے اصول وقواعد

(۶) محدث کبیر کی اسناد حدیث

(۷) محدث کبیر کی اسناد حدیث

(۸) محدث کبیر کی اسناد حدیث

شرح مسند احمد
اور
محدث اعظمی کے علمی استدراکات

مسند امام احمد اہل علم کے حلقہ میں محتاج تعارف نہیں ہے، یہ امام احمد بن حنبل کا حدیث کے سلسلے میں ایک نادر اور عجیب کارنامہ ہے۔صحیح احادیث کی جتنی بڑی تعداد اس میں یکجا کردی گئی ہے،اس کے نظیر ملنی مشکل ہے۔امام احمد نے اس عظیم القدر کتاب میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ بے اصل اور موضوع روایات نہ درج کی جائیں،اور نہ ایسے راویوں کی روایات لی جائیں، جو کذب اور وضع کے ساتھ مُتّہم ہوں،لیکن اس کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام رہا کہ معتبر احادیث کا بڑے سے بڑا ذخیرہ جمع ہوجائے۔چنانچہ خود امام احمد فرماتے ہیں۔

”ان هذا لكتاب جمعته واتقنته من اكثر من سبع مأة وخمسين الفاً فما اختلف المسلمون من حديث رسول الله ﷺ فارجعوا اليه فان كان فيه والا فليس بحجة“. (خصائص المسند) مسند احمد بشرح احمد محمد شاکر ج ا۔ص ا)

ترجمہ! اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ احادیث سے زیادہ سے انتخاب و مرتب کیا ہے،اگر رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ہوتو اس کی جانب رجوع کرو،اگر اس میں موجود ہے تو خیر ورنہ وہ حجت نہیں۔

ساڑھے سات لاکھ یا اس سے زیادہ احادیث کا تذکرہ جو آپ کتبِ احادیث میں پڑھتے ہیں،اس پر چونکئے مت۔یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ ساری احادیث متن اور مضمون کے لحاظ

سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جولوگ فنِ حدیث کی اصطلاحات سے ناواقف ہیں، انہیں یہ دھوکہ اکثر ہوتا ہے، حدیث کے معاندین اور مخالفین اسی کثرتِ تعداد کا نام لے لے کر مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں، کہ جب احادیث اس کثرت سے وضع ہوئیں کہ لاکھوں لاکھ احادیث کے ذخیرے سے بس یہ چند ہزار صحیح نکلی ہیں، توان کا بھی کیا اعتبار؟ لیکن خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ احادیث کی کثرتِ تعداد میں بہت کچھ دخل ان کی سندوں اور راویوں کے تعدد کا ہے۔ ایک ہی مضمون کی حدیث ایک ہی شخص اگر دس مختلف اساتذہ اور رواۃ سے لیتا ہے تو ہمارے آپ کے نزدیک تو وہ ایک حدیث ہے، مگر محدثین کی اصطلاح میں وہ دس حدیثیں ہیں، پھر محدثین جو کسی حدیث پر صحت، قوت، اور ضعف کا حکم لگاتے ہیں، وہ زیادہ تر سند کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک روایت کی ایک سند قوی ہو اور دوسری سند ضعیف یا موضوع ہو، بس باوجودیکہ حدیث کا مضمون صحیح ہے، لیکن اس خاص سند کے اعتبار سے محدثین فرمائیں گے کہ یہ روایت ضعیف یا موضوع ہے، اس لئے کسی روایت کے بارے ضعیف یا موضوع کا حکم دیکھ کر بغیر علم کے اس مضمون سے بدگمان نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح محدثین کی اصطلاح میں صحابہ وتابعین کے آثار بھی احادیث کے شمار میں آتے ہیں، ان سے احادیث کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ (حوالہ مذکورہ)

امام احمد حنبل نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے فرمایا کہ:

"احتفظ بهذاالمسند فانه سيكون للناس اماماً" ۔(مقدمہ مسند احمد مذکور ج ا۔ص ۱۰ بحوالہ مناقب احمد لابن جوزی۔ص ۱۹۱)

اس مسند کو حفظ کرلو یہ لوگوں کے لئے رہنما اور پیشوا ثابت ہوگی۔

بلاشبہ یہ جلیل القدر کتاب اسی شان کی ہے، لیکن حضرت الامام نے اس کو ابواب و فصول پر مرتب نہیں کیا ہے، بلکہ حضرات صحابہ کرام جو حدیث کے اصل اور بنیادی راوی ہیں، ان کے لحاظ سے جمع کیا ہے، یعنی ایک صحابی کی جتنی روایات ہیں، خواہ وہ کسی موضوع سے متعلق ہوں، سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس ترتیب کی وجہ سے اس سے استفادہ خاصا دشوار ہے، کسی کو پوری کتاب حفظ ہو تو وہ استفادہ بسہولت کرسکتا ہے، لیکن اس عظیم الشان ذخیرے کو حافظہ کی

گرفت میں لانا اوراسے یادرکھنا کتنوں کے بس کی بات ہے؟۔

اسی دشواری کے احساس سے مشہور حافظ حدیث امام ذہبی نے فرمایا ہے:

"فلعل الله تبارک وتعالی ان یقبض لهذا الدیوان السامی من یخدمه ویبوب علیه ویتکلم علی رجاله ویرتب هیئته ووضعه فانه محتو علی اکثر الحدیث النبوی وقل ان یثبت حدیث الا وهو فیه " (المصعد الاحمد) مسنداحمد ج۱۔ص۳۹)

ترجمہ! شایداللہ تعالی اس عظیم القدر ذخیرۂ حدیث کے لئے کوئی ایسا آدمی مقدرفرمائے جواس کی خدمت کو لے،اس پر ابواب قائم کرے،اس کے رواۃ پر گفتگو کرے،اس کی ہیئت ووضع کو ازسرنومرتب کرے، کیونکہ یہ بیشتر احادیث پر مشتمل ہے،اورکم ایساہے کہ کوئی حدیث ثابت ہواور اس میں نہ ہو۔

محدث اعظمی کے قلمی مسودات میں ایک مضمون ملا،اس میں تحریرفرماتے ہیں کہ اس کتاب کوعلامہ ابن زکنون (علاؤالدین علی بن حسین بن عروہ ابوالحسن شرقی ثم دمشقی المعروف بابن زکنون،متوفی ۸۳۷ھ) نے بخاری کے طرز پر مرتب کیا تھا،چنانچہ علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

"انه یرتب المسند علی ابواب البخاری وسماه الکواکب الدراری فی ترتیب مسند الامام احمد علی ابواب البخاری وشرحه فی مأة وعشرین مجلداً". (الضوءاللامع ج۵۔ص۲۱۴)

انہوں نے مسندکوابواب بخاری کی ترتیب پرمرتب کیا،اوراس کانام **"الکواکب الدراری فی ترتیب مسند الامام احمد علٰی ابواب البخاری"** رکھا،اوراس کی شرح ایک سوبیس جلدوں میں کی۔

محدث اعظمی اپنی کتاب''دست کاراہل شرف''میں تحریرفرماتے ہیں کہ:

''الکواکب الدراری'' کی صرف ایک ضخیم جلد''کتاب الزکوٰۃ سے کتاب الحج'' کے آخر تک رام پور کے کتب خانے میں موجود ہے،جوان کے داماد ابراہیم بن محمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے،اس کی قدر وقیمت کااندازہ مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔(ص۔۶۹)

مسند احمد مکمل پہلی مرتبہ مصر میں ۱۳۱۳ھ میں معمولی کاغذ پر باریک حروف میں طبع ہوئی، اس کے بعد عرصہ دراز تک دوبارہ طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ ۱۳۶۵ھ میں مصر ہی کے ایک نامور عالم ومحقق علامہ احمد محمد شاکر کو اللہ تعالی نے توفیق بخشی، کہ انہوں نے برسہا برس کی عرق ریزی اور جانکاہی کے بعد اس کی نئی طباعت کا انتظام کیا، انہوں مطبوعہ نسخے کا دوسرے مخطوطہ صحیح نسخوں اور دوسرے مراجع سے مقابلہ کیا، اغلاطِ کتاب کی تصحیح کی، حدیثوں پر نمبر لگائے، مشکل الفاظ کی شرح کی، رواۃ کے سلسلے میں تحقیقات کیں، جرح وتعدیل کے لحاظ سے ان کی حیثیتیں متعین کیں، تا کہ اس بحرِ ذخار سے استفادہ سہل ہو۔ ان فہرستوں میں سب سے اہم اور مفید فہرست وہ ہے، جو مسائل واحکام کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے، اس فہرست نے استفادہ کو بہت سہل کر دیا ہے۔

شیخ احمد محمد شاکر کا علامہ ابن زکنون کے بعد یہ ایک زبردست کارنامہ ہے، اور اس سلسلے میں وہ اپنے بعد والوں کے پیش رو ہیں، بعد کے لوگوں نے اس پر مزید کام کئے، لیکن اولیت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

شیخ کی مرتب کردہ جلدیں وقفہ وقفہ سے شائع ہوکر اہل علم کے پاس پہونچتی رہیں، پہلی جلد ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء میں طبع ہوئی، شیخ کی مساعی جمیلہ جوں جوں آگے بڑھتی رہیں، اور معلومات ومطالعہ کا دائرہ پھیلتا رہا، انہیں ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ پچھلی جلدوں میں جو کوتاہیاں اور غلطیاں رہ گئی ہیں، ان کی تلافی کی جائے، چنانچہ انہوں نے تیسری جلد میں ’الاستدراک والتعقیب‘ کا ایک نیا عنوان قائم کیا، اس میں جہاں انہوں نے خود استدراکات لکھے وہیں دوسرے اہل علم ونظر کو اس کتاب کی تحقیقات پر دعوتِ نقد دی، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ’’مجھے تمام دنیا کے علمائے حدیث سے امید ہے کہ جیسے جیسے ان کے پاس مسند کی جلدیں پہونچتی رہیں گی، اس کی احادیث کے سلسلے میں جہاں کہیں نقد ونظر، استدراک واضافہ کی ضرورت محسوس کریں گے، میرے پاس تحریر کر کے بھیجتے رہیں گے، ان کی یہ تحریرات میرے لئے قابلِ اہتمام اور باعثِ استفادہ ہوں گی، پھر میں خود اپنے طور پر ان کی تحقیق کروں گا، اس بحث وتحقیق کے بعد جیسی رائے قائم ہوگی، اگلی جلدیں ان کے حوالہ سے شائع کردی جائیں گی۔ (مسند احمد ج ۳۔ ص ۳۶۵)

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی نوراللہ مرقدہ کو (جیسا کہ ان کے مکتوب سے ظاہر ہے) اس کی پہلی جلد شروع ہی میں دستیاب ہوگئی تھی، اوراس کا بغور مطالعہ کیا، مگر بعد کی آٹھ جلدیں کئی سال کے بعد ملیں، مولانا ان سب کا نہایت غور وتدبر سے مطالعہ کیا، مولانا کا مطالعہ سرسری نہیں ہوتا تھا، ایک ایک لفظ پر نگاہِ تعمق ڈالتے تھے۔ حافظہ محدثین کرام کے حافظے کی طرح نہایت قوی تھا، حدیث ورجال کی کتابوں پر بڑی گہری نظر تھی، اور معلومات پر بڑا قابو تھا۔ پڑھا اور بہت اہتمام کے ساتھ پڑھا، جہاں جہاں ضرورت ہوئی نوٹ لکھتے گئے، اس سلسلے میں پہلا خط جو محدث کبیر نے علامہ احمد محمد شاکر کو تحریر کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

''آج سے دس سال قبل میں نے مسند احمد کی پہلی جلد جو آپ کی شرح کے ساتھ طبع ہوئی ہے، ایک صاحب کے نجی کتب خانہ میں دیکھی تھی، اس کے بعد برابر سنتا رہا کہ اس کی جلدیں شائع ہورہی ہیں، لیکن وہ مجھے دستیاب نہ ہوسکیں، پھر حسنِ اتفاق کی اس کی ابتدائی نو جلدیں مجھے یکجا جامعہ مفتاح العلوم کے کتب خانہ میں مل گئیں، اس کے مہتمم انہیں بمبئی سے خرید کر لائے تھے، اس جامعہ میں مَیں نے ۱۳۴۹ء سے ۱۳۶۹ء تک پڑھایا ہے، میں نے وہاں سے بطور عاریت کے یہ جلدیں حاصل کیں''۔

پھر شیخ کے کارنامے کی توصیف وتعریف اوراعتراف وشکر کے بعد لکھتے ہیں:

''ان جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت میں نے کچھ ملاحظات واستدراکات لکھے ہیں، انہیں آپ کے ملاحظے کے لئے بھیجتا ہوں، آپ انہیں دیکھ لیں، اگر آپ کو ان سے اتفاق ہو، اوران پر شرح صدر ہو تو بہتر ہے، ورنہ میں نے علم کی امانت ادا کردی ہے''۔

شیخ محقق نے حضرت محدث اعظمی کے ملاحظات کو بہت اہتمام وتوجہ سے دیکھا، اوران میں سے بیشتر کو بہت پسند کیا اور قبول کیا، کہیں کہیں کچھ اختلاف بھی کیا۔ یہ شیخ کے وسعتِ قلب کی دلیل ہے کہ انہوں نے ان ملاحظات کو پندرہویں جلد کے آخر میں بتمام وکمال شائع کردیا، اوراس میں مزید تحقیقات کی درخواست کی۔ چنانچہ حضرت مولانا نے دوبارہ پانچویں جلد تک کچھ اور ملاحظات لکھے، اورانہیں ارسال کیا، لیکن اللہ کو منظور نہ تھا، ابھی سولہ جلدیں شائع ہوئیں تھی کہ شیخ احمد محمد شاکر کا بلاوا حضرت حق سے آگیا، اور وہ اپنی خدمات کا صلہ حاصل کرنے بارگاہ قدس میں

حاضر ہو گئے۔شیخ احمد محمد شاکر نے حضرت محدث کبیر کے ملاحظات کو دیکھنے کے بعد جو خط لکھا ہے،اس کے بعض اقتباسات قابل ملاحظہ ہیں:

''حضرت الاخ العلامة الكبير المحقق الاستاذ حبيب الرحمان الاعظمی

جائنی كتابكم النفيس....اما استدراتكم فكلها نقية عالية ولا اقول هذا مجاملة.....واشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة وارجوا ان تزيدونی من اشاراتكم وارشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة وانتم كما رأيت من علمكم من اعظم العلما بهذا لعصر ،فالحمدلله على توفيقكم''.

كتبه المخلص احمد محمد شاكر

آپ کا نفیس گرامی نامہ ملا،آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور بلند رتبہ ہیں، میں یہ بات محض آپ کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص دل کے ساتھ آپ کا شکر گزار ہوں،اور مجھے امید ہے کہ آپ سنتِ نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبے سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے،اور جہاں تک میں نے آپ کے اس کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اس زمانے میں سنتِ نبویہ کے عظیم تر علما میں سے ایک ہیں۔فالحمد لله

اس خط کے علاوہ جب انہوں نے پندرہویں جلد کے اخیر میں ''الاستدراک و التعقیب'' کے تحت ان استدراکات کو شائع کیا تو تمہید میں تیسری جلد کی مذکورہ بالا تحریر کا حوالہ دے کر لکھا کہ:

''میں نے شوال ۱۳۶۶ھ میں یہ تحریر لکھی تھی، پھر کئی سال مسلسل گزر گئے، مگر کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی، حالانکہ مجھے اس کی بڑی آرزو تھی، کیونکہ علم ایک امانت ہے، خصوصاً کتاب وسنت کا علم، پھر میرے پاس ایک بزرگ کا خط آیا، مجھے ان سے شرفِ تعارف حاصل نہ تھا، لیکن ان کے مکتوب سے ان کے علم وفضل کا اور بحث ونظر میں ان کی تحقیق وتدقیق کا اندازہ ہوا، ان کا یہ مکتوب ۲۶/ذی قعدہ ۱۴۷۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں جلد اول سے جلد ثامن تک نہایت قابل قدر اور دقیق استدراکات ہیں، یہ صاحب ہیں، العلامۃ الاستاذ حبیب الرحمان

الاعظمی سابق خادمِ حدیث جامعہ مفتاح العلوم مئو، اور حال ممبر اسمبلی اتر پردیش، چونکہ پہلے میں نے وعدہ کیا تھا، نیز ان دقیق ابحاث سے چونکہ مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے، اس لئے ان کے استدراکات کو انہیں کی عبارت میں مختلف مقامات میں ''قال الاعظمی'' کے عنوان سے درج کروں گا، ان میں سے جو کچھ میری تحقیق کے مطابق ہوگا، اس پر کوئی نوٹ نہیں تحریر کروں گا، اور جہاں میری رائے ان کی رائے سے کچھ مختلف ہوگی (اور ایسے مقامات بہت کم ہیں) وہاں جو کچھ میرے نزدیک درست ہوگا تحریر کروں گا''۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۵۱)

اس تعارف کے بعد حضرت محدث کبیر کے استدراکات کے چند نمونے ملاحظہ ہوں، اس سے پہلے بطور خاص یہ بات میں ذہن میں رکھئے کہ وقت کا بڑا منجھا ہوا تجربہ کار محقق ومحدث پوری تحقیق وتدقیق کے ساتھ، بیس پچیس سال کے عرصہ سے میدانِ تحقیق میں اترا ہوا ہے، اس کی نظر بڑی وسیع ہے، اس کے وسائل وذرائع زیادہ ہیں، مصر جیسی قدیم علمی جگہ ہے، جہاں علم وحکمت کے گراں قدر ذخائر دستیاب ہیں۔ کثرتِ مزاولت کی وجہ سے اسے فنِ حدیث میں کافی بصیرت حاصل ہوچکی ہے، اور وقفہ وقفہ سے مسند احمد کی ایک ایک جلد شائع کرتا ہے، اس کی ہر جلد تحقیق وتدقیق کے موتیوں سے مالا مال ہے، ان موتیوں کی چمک دمک سے اہل علم کی نگاہیں خیرہ ہیں، اس نے نو سال پہلے اہل علم کو، ساری دنیا کے اہل علم کو دعوتِ نقد ونظر دی، کام بھی اہم تھا، دعوت بھی قابلِ لحاظ تھی، محققین موجود تھے، مستشرقین بھی علم وتحقیق کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے، مگر نو سال کی مدت میں کوئی آواز نہیں آئی، اور امید کی کرن پھوٹی تو ہندوستان جیسے ظلمت کدہ کے ایک گوشے سے۔ اور یہ نو سال بھی اس لئے لگے کہ جس نے یہ آواز لگائی، جس نے یہ روشنی دکھائی، اس کو یہ جلدیں دستیاب ہی نہ تھیں، پھر جب دستیاب ہوئیں تو تاخیر نہیں ہوئی، یہ آواز ایک ایسے شخص کی تھی جو عالم عرب ہی میں نہیں، اس وقت اپنے دیار میں بھی کچھ زیادہ نامور نہ تھا۔ اس کے پاس وسائل بھی کم تھے، اس کے پاس علمی کتابوں کا ذخیرہ بھی نہ تھا، اس کی جگہ کوئی اہم علمی جگہ نہ تھی، لیکن اس کو علم کی جستجو تھی، مطالعہ وتحقیق کا بے پناہ شوق تھا، وہ اس کے لئے جگہ جگہ سفر کرتا تھا، اس کا حافظہ غضب کا تھا، اسے علمِ حدیث سے عشق تھا، اس عشق اور اس حافظہ نے اسے علم کا پیکر بنا دیا، اس نے گویا چیونٹیوں کے منہ سے دانہ دانہ اکٹھا کیا تھا، دنیا بھر میں کسی نے شیخ

محقق کی امید پوری نہ کی، یہ امید پوری ہوئی تو ایک ایسے شخص سے جس سے اس کا کوئی تعارف نہ تھا، پھر اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا، کہ یہ استدراک لکھنے والا وقت کا عظیم تر عالم ہے۔

محدث اعظمی کے استدراکات بغور دیکھنے کے بعد اس کو کئی حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایسے استدراکات جن تعلق متنِ حدیث یا سند کی تصحیح سے ہے۔

(۲) ایسے ملاحظات جن کا تعلق سندوں کے رجال اور روات سے ہے۔

(۳) وہ تنقیدات و تصحیحات جو احادیث کی شرح اور ان کے الفاظ کی تفسیر سے متعلق ہیں۔

(۴) ایسی تحقیقات جو کسی ایسی حدیث کے متعلق ہیں، جو شارح محقق کو باوجود تلاش و جستجو کے نہیں مل سکیں۔

(۵) کوئی کوئی استدراک شارح کے استنباط سے متعلق ہے۔

(۶) بعض جگہ طباعت کی غلطی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۷) کہیں شیخ محقق کی کسی بات کو مدلل کیا گیا ہے۔

ہم ان میں سے ہر ایک کی چند مثالیں دیں گے، ان میں سے بعض تو وہ ہوں گی جو شائع ہو چکی ہیں، ان کا حوالہ دے دیا جائے گا، اور بعض حضرت مولانا کے قلمی مسودات کی شکل میں ہیں، ان کا کوئی حوالہ نہ ہوگا، علی الترتیب مثالیں ملاحظہ ہوں، سہولت کے لئے جلد صفحہ اور حدیث کے نمبرات لکھ دیئے گئے ہیں۔

متن حدیث کی تحقیق

(۱) ج۲۔ص۷۷۔ح۸۴۹

''وتجعلون رزقکم انکم تکذبون'' ۔اس میں '' رزقکم ''کی تفسیر ''شرککم'' کی گئی ہے۔(قال شرککم)

محدث اعظمی نے لکھا کہ یہ صحیح نہیں ہے، صحیح '' شکرکم '' ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسی کتاب کی ج۲۔ص۱۵۴ پر یہ لفظ آیا ہے، اور یہی لفظ ترمذی میں بھی موجود ہے۔(دیکھئے ترمذی مع تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج۴۔ص۱۹۲)

(۲) **واللہ ان رجاء ھذہ الامۃ بعد مأۃ عام** ۔یہ عبارت ج ۲۔ص ۹۲۔ح ۷۱۷ میں بھی ہے،اورص ۹۵۔ح ۷۱۸ میں بھی ہے۔دونوں جگہ شارح محقق نے لفظ ''رجاء'' کو باقی رکھا ہے،لیکن یہ صحیح نہیں ہے، یہاں پر درست لفظ ''رخاء'' بخاء المعجمہ ہے۔چنانچہ اسی جلد کے ص ۲۸۰ پر یہ لفظ آیا ہے۔حدیث ۱۱۸۷(اس روایت میں ''**انما رخاء ھذہ وفرجھا بعدالمأۃ** ''کا لفظ ہے،اس میں ''**فرجھا**'' کے اضافہ نے ''**رخاء**''کو متعین کردیا ہے۔اعجاز) نیز ''مشکل الآثار'' ج ۱ ص ۱۶۱ ''کنز العمال''،''مجمع الزوائد''اور''مستدرک حاکم''میں بھی ''رخاء'' کا لفظ آیا ہے۔

(۳) ج ۴۔ص ۸۷۔ح ۲۳۱۳

لاتستقبلوا والاتحفلوا ،ولا ینعق بعضکم لبعض ۔اس میں شارح محقق نے ''**ولاینعق**'' کو ''**نعیق**'' سے مشتق سمجھا ہے،مگر ایسا نہیں ہے۔ترمذی شریف میں بھی یہ حدیث موجود ہے،درحقیقت یہ لفظ ''**ولا ینفق بعضکم لبعض** ''ہے،اوریہی اپنے ماقبل کے دونوں لفظ کے معنوی حیثیت سے مناسب بھی ہے۔

(۴) ج ۴۔ص ۲۰۵۔ح ۲۵۹۷

''**لوان احدکم اولوان احدھم اذا اتی امرأتہ قال اللھم جنبنی الشیطان وجنب الشیطان مارزقنی ثم کان بینھما ولا والا لم یسلط علیہ الشیطان اولم یضرہ الشیطان**''۔

اس حدیث میں کلمہ ''الا'' زائد ہے،شارح کو چاہئے تھا کہ اسے ذکر کردیتے،ورنہ اس کی کوئی اور توجیہ کئے ہوتے۔

اس کے زائد ہونے اور ناسخین کی طرف سے اضافہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے محمد بن جعفر عن شعبہ عن منصور کے طریق سے اس کو روایت کیا ہے،امام بخاری نے آدم عن شعبہ کے طریق سے اس کی تخریج کی ہے، بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

''**لوان احدکم اذااتی اھلہ قال اللھم جنبنی الشیطان وجنب الشیطان مارزقنی فان کان بینھما ولا یضرہ الشیطان او لم یسلط علیہ**''۔

اس میں ''**لم یسلط**'' سے پہلے کلمہ ''الا''نہیں ہے۔

اسی روایت کوامام مسلم نے جریرعن منصور کے طریق سے نقل کیا ہے،اوراس کا متن بھی ذکر کیا ہے، پھر مذکورہ بالا روایت کی سند یعنی محمد بن جعفرعن شعبہ کے طریق سے بھی اس کی تخریج کی ہے،مگر حدیث کے الفاظ نہیں نقل کئے ہیں،صرف یہ کہا ہے کہ "**بمعنی حدیث جریر غیر ان شعبة لیس فی حدیثه ذکر بسم الله**". میں کہتا ہوں کہ حدیث جریر میں لفظ"الا" نہیں ہے،اس کے الفاظ یہ ہیں۔"**لو ان احدهم اذا اراد ان یاتی اهله قال بسم الله اللهم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقنا ،فانه ان یقدر بینهما ولافی ذالک لم یضره الشیطان ابداً**".

حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج ۹۔ص۱۸۱میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام مسلم اورامام احمد کے یہاں شعبہ کی روایت میں "**لم یسلط علیه الشیطان اولم یضره الشیطان**" ہے۔ دیکھئے حافظ ابن حجر مسند احمد سے "**لم یسلط**"نقل کرتے ہیں"**الالم یسلط**"نہیں نقل کرتے۔

امام طیالسی نے بھی اپنی مسند میں اس حدیث کو"حدثنا شعبہ عن منصور والاعمش" کہہ کر نقل کیا ہے،اس میں بھی کلمہ"الا" نہیں ہے۔

(۵) ج۲۔ص۲۷۳۔ح ۱۱۶۷

سند میں مسعر بن الحکم آئے ہیں،یہی لفظ قدیم عبارت میں بھی ہے،لیکن صحیح مسعود بن الحکم ہے۔چنانچہ اسی جلد میں ص ۲۴۷۔ح ۱۰۹۴ میں مسعود بن الحکم ہی ہے۔

لیجئے چند منٹ میں آپ نے بغیر کسی محنت کے کئی مثالیں پڑھ لیں،مگر خیال کیجئے ان تحقیقات ومعلومات کے لئے کیسی کچھ جگر کاوی اور دماغ سوزی کرنی پڑی ہوگی۔ ہر ہر بات کے لئے مختلف ذخائر سے دلائل فراہم کرلینا کیا ہر کسی کے بس کی بات ہے؟۔

رجال ورواۃ پر استدراک:

(۱) ج۴۔ص۶۸۔ح ۲۲۶۵

"**حدثنا اسماعیل بن عمر حدثنا ابن ابی ذئب عن شعبه عن ابن عباس**"۔اس سند کو شارح محقق نے منقطع قرار دیا ہے،اوراس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ شعبہ بن الحجاج اگر چہ امامِ جرح وتعدیل ہیں،ثقہ و مامون ہیں،ثبت اور حجت ہیں،لیکن انہوں نے حضرت

عبداللہ بن عباس کونہیں پایا ہے۔

اس پر محدث اعظمی نے نقد کیا کہ یہ شعبہ جو حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت بیان کررہے ہیں، وہ شعبہ نہیں ہیں جو ابن حجاج ہیں، امام اہل فن ہیں۔ بلکہ یہ شعبہ مولی ابن عباس ہیں، جن کا تذکرہ ''تاریخ بخاری'' ۲/۲/۲۴۴ میں ہے۔اس میں ہے کہ بشر بن عمر نے شعبہ کے متعلق جن سے ابن ابی ذئب روایت کرتے ہیں، امام مالک سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ثقہ نہیں ہیں۔اسی طرح ابن ابی حاتم نے ''کتاب الجرح والتعدیل'' ۲/۱/۳۶۷، ۳۶۸ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور امام احمد سے نقل کیا ہے کہ ''**ماادری بہ باساً**'' اور ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ''**لا یکتب حدیثہ**'' ابوحاتم سے یہ کہ ''**لیس بقوی**'' اور ابوزرعہ سے یہ کہ ''مدنی ضعیف الحدیث'' ہیں۔ یہ تہذیب کے رجال میں سے ہیں۔شیخ محقق اس پر لکھتے ہیں۔

''**ھذا استدراک جید نفیس جزاء اللہ خیراً**''.

> ''پھر لکھتے ہیں کہ شعبہ مولی ابن عباس کو اس سے پہلے ہم حدیث ۲۰۷۳ میں بیان کرچکے ہیں، اور اس کے بعد حدیث ۲۸۰۱ میں بھی کہ وہ ''حسن الحدیث'' ہیں، یہاں ہم سے غلطی ہوگئی کہ ہم انہیں شعبہ بن الحجاج سمجھ لیا''۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۶۴)

(۲) ج ۴۔ص ۱۵۹۔ح ۲۴۷۸

''**حدثنا عبداللہ بن ولید العدنی قال حدثنا سفیان عن دوید عن اسماعیل بن ثوبان عن جابر بن زید عن ابن عباس**''.

اس پر حاشیہ میں شیخ محقق نے فرمایا کہ یہ دوید بصری ہیں، اور یہ ثقہ ہیں.....ان کا تذکرہ امام ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں ان کی پیروی کی ہے، لیکن ''تعجیل المنفعۃ'' میں اسماعیل بن ثوبان کے تذکرے میں ان سے چوک ہوگئی ہے، انہوں نے اس میں لکھ دیا کہ اسماعیل بن ثوبان وہی ہیں جن سے دوید بن نافع نے روایت کی ہے، اور اس کو قطعیت کے ساتھ لکھ دیا ہے، اسی لئے انہوں نے ''تہذیب'' میں دوید بصری کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ کہ وہ دوید بن نافع کا تذکرہ لکھ چکے ہیں۔

اس پر محدث اعظمی نے استدراک لکھا کہ حافظ ابن حجر کی چوک اس سلسلے میں نہیں ہے

کہ انہوں نے دوید بصری اور دوید بن نافع کو ایک شخصیت سمجھ لیا ہے، چوک ان سے امام بخاری کی مراد سمجھنے میں ہوئی ہے۔ امام بخاری نے جہاں دوید کا جو اسماعیل بن ثوبان کے راوی ہیں، تذکرہ کیا ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے لکھا کہ یہ دوید، دوید بن نافع ہیں، حالانکہ امام بخاری نے خود دوید بن نافع اور اسماعیل کے راوی دوید کے درمیان فرق کیا ہے، اور بلاشبہہ یہ حافظ ابن حجر کا سہو ہے، لیکن اس کے باوجود نہیں کہا جاسکتا کہ حافظ ابن حجر یقینی طور پر دوید بن نافع ہی کو اسماعیل کا راوی سمجھتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو آپ نے دلیل پیش کی ہے کہ ''اسی غلط فہمی کی وجہ سے حافظ نے دوید بصری کا تذکرہ تہذیب میں چھوڑ دیا ہے'' اس کے متعلق عرض ہے کہ حافظ نے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن ''دال مہملہ'' کی فصل میں نہیں کیا ہے، بلکہ ''دال معجمہ'' کی فصل میں کیا ہے، اور وہاں تصریح کی ہے کہ اسماعیل بن ثوبان کے راوی یہی ہیں، ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

''ذوید بصری عن اسماعیل بن ثوبان وعنه الثوری ذکر ابن ابی حاتم عن ابیه لیس هو ذوید بن نافع هذا شیخ لین وقال ابن حبان فی الثقات ذوید بن نافع یروی عن ابی منصور عن ابن عباس''.

شیخ اعظمی فرماتے ہیں کہ ابوحاتم کا یہ قول ''هذا شیخ لین'' تعجیل میں بھی موجود ہے، اور لسان، اور میزان اور مجمع الزوائد میں بھی اسی جیسی بات ہے، اور تاریخ بخاری کے مصحح کی تعلیقات میں ابوحاتم سے منقول ہے کہ وہ ذوید بن نافع نہیں ہیں، ''وهو شیخ لین''. البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے دال معجمہ میں ان کا تذکرہ لکھا کیوں؟ جب کہ امام بخاری اور ابن ابی حاتم نے ان کا تذکرہ دال مہملہ کی فصل میں کیا ہے، شاید ابن حبان نے دال معجمہ میں ان تذکرہ لکھا ہو۔ ہاں حافظ ابن حجر نے تہذیب میں دال معجمہ کے تحت ذوید بن نافع کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور کہا ہے کہ ''انہیں ذوید کہا گیا ہے''، اور دال میں ان کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

اس پر شیخ محقق نے لکھا کہ '' وهو تحقیق جید'' ۔اس دقتِ نظر کا کیا کہنا کہ لفظوں کے فرق کو بھی پرکھ لیتی ہے، تحقیق اسے کہتے ہیں۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۶۶)

(۳) علم اسماء الرجال میں محدث اعظمی کی وسعتِ نظر کا ایک اور نمونہ دیکھتے چلئے۔

مسند احمد ج ۴۔ص ۲۷۲۔ح ۱۷۷۱

"حدثنا حسن حدثنا دويد عن سلمه بن بشير عن عكرمه عن ابن عباس".

اس پر شیخ محقق لکھتے ہیں کہ میں نے ان سلمہ بن بشیر کا تذکرہ کہیں نہیں پایا، اور "تاریخ کبیر" کے جس حصے میں ان کا ذکر ہونے کا احتمال ہے، وہ ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے، مزید انہوں نے یہ بھی لکھا کہ سلمہ بن بشیر کا ترجمہ حافظ حسینی نے سالم بن بشیر کے نام سے تحریر کیا ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے "تعجیل المنفعۃ" میں نقد کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"سالم بن بشير عن عكرمه وعنه دويد الخراساني مجهول قلت هذا غلط نشأ عن تحريف وانما هو سلمه بسكون اللام بعدها ميم وهاء ذكره على الصواب ان شاء لله ،ثم جاء في ص١٥٨ وقال سلمه بن بشير تقدم في سالم ، ثم لم يقل شيئاً ولم يف بما وعد".

حافظ ابن حجر کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ سالم بن بشیر غلط ہے، یہ سلمہ ہے، اور میں بعد میں اسے صحیح طور پر ذکر کروں گا، مگر ہوا یہ کہ جب سلمہ بن بشیر کا تذکرہ لکھنے کا موقع آیا حافظ نے حوالہ دیدیا کہ سالم بن بشیر کے تذکرہ میں بات گزر چکی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اور انہوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔

شیخ محقق کے نزدیک یہ گتھی ایسی الجھی ہوئی ہے کہ وہ حیران ہیں، اولاً تو انہیں سلمہ بن بشیر کا تذکرہ کہیں نہیں مل رہا ہے۔ ثانیاً انہیں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اب محدث کبیر کے ناخنِ گرہ کشا کا کمال ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ سلمہ بن بشیر کا ترجمہ تاریخ بخاری ۱۵۸/۲/۲ میں، اور کتاب الجرح والتعدیل ۲۲۶/۱/۲ میں ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ ابن معین نے ان کے بارے میں "**ليس به باس**" کہا ہے۔

رہی یہ بات کہ حافظ ابن حجر نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا، تو میں کہتا ہوں کہ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا، لیکن یہ وعدہ بجائے سلمہ کے اسمہ "سلیم" کے تحت پورا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ان کے تذکرہ میں وہی بات ذکر کی ہے جو ابن ابی حاتم نے "سلمہ" کے تذکرہ میں لکھی ہے، پھر کہا کہ ابن حبان نے "کتاب الثقات" میں ان لوگوں کے تحت ان کا ذکر کیا ہے، جن کا نام سلمہ ہے۔

محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ ابن حبان اس میں تنہا نہیں ہیں، امام بخاری نے بھی، اور ابن ابی حاتم نے بھی سلمہ ہی کے تحت لکھا ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ حافظ نے کس کے اتباع میں سلیم لکھا ہے؟ البتہ حافظ کو یہ ضرور چاہئے تھا کہ سلمہ بن بشیر کے ذکر میں بجائے "**تقدم فی سالم**" کہتے "**باقی فی سلیم بن بشیر**" فرمادیتے۔

شیخ محقق فرماتے ہیں "**وھو تحقیق نفیس**"۔ ایک فرد سلمہ پر دیکھئے کہ تحقیقات کے کیسے کیسے موتی کہاں کہاں سے لائے گئے۔ یہ جہاں ایک طرف محدث کبیر کی وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ، اور تعمقِ مطالعہ کی دلیل ہے، وہیں اس سے علمِ حدیث کی معجزہ کاری کا بھی ثبوت ملتا ہے، کہ کیسی ذہانتوں اور کیسی کیسی عبقری شخصیات کو اس نے اپنی خدمت پر لگا رکھا ہے، اور یہ بھی منجملہ حقانیتِ اسلام کے دلائل کے ہیں۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۶۸)

(۴) میں نے ارادہ کیا تھا کہ چند نمونے پیش کر کے بات ختم کر دی جائے گی، مگر حضرت محدث کبیر کا جو استدراک پڑھتا ہوں، دامن دل کھینچتا ہے کہ جا ایں جا است۔ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے، مگر دل گوارا نہیں کرتا کہ سامنے آئی ہوئی بیش قیمت بات بغیر ذکر کے چھوڑ دوں۔ درحقیقت یہ پوری ایک کتاب کا موضوع ہے، خیر کتاب کا مسئلہ بعد میں حل ہوگا، فی الحال ایک اور نمونہ دیکھئے:

مسند احمد ج ۵۔ ص ۹۔ ح ۳۰۱۷

سند میں نوح بن جعونہ السلمی خراسانی آئے ہیں، اس پر شیخ محقق لکھتے ہیں۔

ان کا ترجمہ تعجیل میں ہے، ص ۴۲۵، ۴۲۶ لیکن وہاں انہیں حجازی کہا ہے، اور یہ کہ ابن حبان نے "کتاب الثقات" میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور "میزان" میں ج ۳۔ ص ۲۴۳ میں ہے "**اجوز ان یکون نوح بن ابی مریم . اتی بخبر منکر**".

امام ذہبی کے اس قول پر شارح محقق اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا یہ قول بہت بعید ہے، کیونکہ یہ نوح بن جعونہ خراسانی ہیں، جیسا مسند احمد کی سند میں اس کی صراحت ہے، حجازی نہیں ہیں، جیسا کہ تعجیل میں مذکور ہے، اور نوح ابن ابی مریم مزوری ہیں۔

یہاں محدث اعظمی نے تحریر فرمایا کہ نوح بن جعونہ کو حجازی قرار دینے میں حافظ ابن حجر

نے حافظ حسینی کی تقلید کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی ''اکمال'' میں انہیں حجازی قرار دیا ہے۔ نوح کا تذکرہ کتاب الجرح والتعدیل میں بھی ہے، وہاں انہیں حجازی نہیں کہا گیا ہے، اور تاریخ بخاری میں سرے سے ان کا تذکرہ ہی نہیں ہے۔

اور جہاں تک امام ذہبی کے اس احتمال وتجویز کا تعلق ہے کہ وہ نوح ابن ابی مریم ہوں، تو اس بات کی تردید کتاب الجرح والتعدیل کے مصحح نے بھی کی ہے، اور کہا ہے ''نوح بن جعونه سلمی و نوح ابن ابی مریم قرشی ولاءً''۔

شارح محقق نے فرمایا کہ ''وهو كما قال''۔ (مسند احمد ج ۱۵ ص ۲۷۰)

یہ استدراک تو مطبوعہ ہے، اس کے بعد حاشیہ پر محدث اعظمی نے اپنے قلم سے مزید اضافہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے جزماً نوح بن جعونہ، اور نوح ابن ابی مریم کو ایک شخصیت قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ ابو مریم کا نام یزید بن جعونہ ہے، ابن حبان نے اس کو جزماً لکھا ہے، پھر انہوں نے حسینی کے اس قول کی تردید کی ہے کہ یہ دو شخصیتیں ہیں، حسینی کی دلیل یہ ہے کہ ابن حبان نے نوح بن جعونہ کی وفات ۱۵۳ھ میں بتائی ہے، جب کے ابن ابی مریم کی وفات ۱۷۳ھ میں لکھی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی کہ راویوں کے سنین وفات میں اختلاف تو ہوتا ہی رہتا ہے، لہٰذا یہ اختلافِ سن کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔

نیز حافظ حسینی نے امام ذہبی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے قطعیت کے ساتھ نوح کو ابن ابی مریم ہی کہا ہے۔ (جزم بكونه ابن ابی مریم) اس کی بھی تردید حافظ ابن حجر نے کی ہے، اور کہا ہے کہ امام ذہبی میزان الاعتدال میں اس باب میں متردد ہیں، شاید انہوں نے کسی دوسری جگہ جزماً لکھا ہو۔

محدث اعظمی نے حسینی کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ حسینی نے ''جوز'' لکھا ہوگا، کتابت کی غلطی سے (جسے محدثین تصحیف کہتے ہیں) وہ ''جزم'' ہو گیا ہے۔

(۵) علم اسماء الرجال میں وسعتِ معلومات کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

مسند احمد ج ۵۔ ص ۸۴۔ ح ۳۲۴۳

’’حدثنا یحیی عن عبد المطلب عن ابن عباس‘‘.

اس کے متعلق شارح محقق لکھتے ہیں کہ عبدالمطلب مطبوعہ نسخے میں ہے، اور ایک قلمی نسخے میں، جو شارح کے نزدیک معتبر ہے، یہ سند اس طرح ہے ’’یحیٰ عن المطلب عن طاؤس عن ابن عباس‘‘۔ شارح کو دونوں سندوں پر اعتراض ہے، وہ کہتے ہیں کہ جن رواۃ کا ترجمہ لکھا گیا ہے، ان میں کوئی راوی عبدالمطلب نامی نہیں ہے، بجز ’’عبدالمطلب بن ربیعہ بن الحارث‘‘ کے، لیکن یہ صحابی ہیں، اور عبداللہ بن عباس سے بڑے ہیں، اور کتبِ رجال میں مُطِّلِب نام کے جو راوی ملتے ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں احتمال ہو کہ طاؤس سے روایت کرسکتا ہے، اور اس سے یحیٰ بن قطان نے روایت لی ہو۔

اس پر محدث اعظمی کا استدراک ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ مُطَّلِب نام کے دو راوی ایسے ہیں جو طاؤس سے اگر روایت کریں تو گنجائش ہے، ایک مطلب بن عبداللہ بن مطلب بن حنطب، جن کا تذکرہ تہذیب میں ہے، یہ خارجہ بن زید کے شاگرد ہیں، اور خارجہ بن زید طاؤس کے ہم عصر ہیں۔ ایک قول کے مطابق دونوں بزرگوں کا ایک ہی سال انتقال ہوا ہے۔

دوسرے مطلب بن عبداللہ بن قیس، ان کا تذکرہ بھی تہذیب میں ہے، یہ سعید بن ہند سے روایت کرتے ہیں، اور سعید کی وفات طاؤس کے بعد ہوئی ہے، نیز یہ اپنے والد گرامی سے بھی روایت کرتے ہیں، جن کا وصال جہاں تک میرا خیال ہے کہ طاؤس سے پہلے ہوا ہے، یہ مدینہ میں ۷۳ھ سے ۷۶ھ تک قاضی رہے ہیں۔

شیخ محقق لکھتے ہیں کہ ’’هذا كلام جيد ينبى عن اطلاع واسع‘‘ (یہ عمدہ کلام ہے جس سے وسیع علم کی خبر ملتی ہے)

واقعی اسماء الرجال کے لق ودق صحرا سے ایسے گمشدہ افراد کو تلاش کرنا کسی زبردست صاحبِ بصیرت ہی کا کام ہے۔

(۶)　مسند احمد ج ۵۔ ص ۳۳۹۔ ح ۳۸۸۵

حدیث کی سند میں ایک صاحب ابوالرضراض آئے ہیں، شیخ محقق فرماتے ہیں کہ یہ تابعی ہیں، ابن سعد نے ج ۶۔ ص ۱۴۱ پر ان کا ترجمہ تحریر کیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ

ص ۱۳۰ میں انہیں اضراض لکھا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ یہی صاحب ابو رضراض ہیں، کنیتوں کے باب میں ان کا ذکر آئے گا، لیکن وہاں نہیں ذکر کر سکے، شاید بھول گئے ہوں۔ دارقطنی نے بھی انہیں رضراض ہی کہا ہے۔ (دیکھئے لسان المیز ان ج ۴۔ص ۴۷۷)

اب یہ بات معرضِ بحث میں آ گئی کہ یہ صاحب رضراض ہیں یا ابوالرضراض؟ علامہ شیخ عبدالرحمان یمانی مصححِ تاریخ کبیر فرماتے ہیں، دونوں روایات میں اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ رضراض ہی ابوالرضراض ہوں، نام پر کنیت رکھنے کا ثبوت موجود ہے۔

اس پر محدث کبیر فرماتے ہیں اس حدیث کی تخریج امام طحاوی نے ''معانی الآثار'' میں ۱/۲۶۳، ۲۶۴ پر فرمائی ہے، ان کی سند یہ ہے۔ ''**حدثنا فهد حدثنا الحمانی قال حدثنا محمد بن فضيل عن مطرف عن ابی الجهم عن ابی الرضراض عن عبدالله**''.

حافظ حسینی نے ''اکمال'' میں ابوالرضراض کا ذکر کیا ہے، فرمایا ہے کہ ابوالرضراض۔ ''**وقيل رضراض بن اسعد**'' انہوں نے حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے، اور ان سے ابوالجہم سلیمان بن ابی الجہم نے۔ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور حسینی نے ''الاسماء'' میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے، وہاں کہا ہے، الرضراض (مطبوعہ نسخہ میں کاتب کی غلطی سے الرضاض ہوگیا ہے) **عن علی وابن مسعود عن النبی ﷺ فی الصلوٰة.** اور امام عینی نے بھی ''معانی الاخبار'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور ابن حبان سے ان کی توثیق اور ازدی سے ان کی تضعیف نقل کی ہے، اور کہا ہے کہ ان کو رضراض بن اسد کہا جاتا ہے۔ (حکاہ السندی فی کشف الاستار)

پھر محدث اعظمی نے مزید لکھا کہ شیخ عبدالرحمان الیمانی نے یہ جو فرمایا ہے کہ وہ رضراض عن علی کی کوئی حدیث نہیں جانتے، اور انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس حدیث کی سند میں رضراض بن اسعد واقع ہوا ہوگا، تو میں کہتا ہوں کہ شیخ کا خیال صحیح ہے، مجھے رضراض عن علی کی روایت ''معانی الآثار'' ج ۲۔ص ۸۰ میں قتادہ عن الرضراض بن اسعد مل گئی ہے، فرماتے ہیں کہ ''**شهدت عليا رضی الله عنه جلد شراحة ثم رجمها**''۔ شیخ محقق فرماتے ہیں کہ ''**هذا التحقيق بديع ممتاز**''۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ص ۳۷۸)

محدث اعظمی کی قوتِ علمیہ ملاحظہ ہو، کہ جس بات کو حافظ ابن حجر نے مجملاً کہہ کر آگے ذکر کرنے کا حوالہ دے دیا، اور پھر ذکر نہ کر سکے، امام بخاری کی تاریخ کبیر میں محض رضراض ہے، دارقطنی کا اشارہ بھی یہی ہے، شارح محقق اور علامہ عبدالرحمان یمانی کے نزدیک راجح ابوالرضراض ہے، پھر یہ بھی احتمال ظاہر کیا ہے کہ دونوں ایک ہی شخصیت ہوں، محدث اعظمی نے اسی کو دلائل کے ذریعہ مکمل کر دیا، پھر اتنا ہی نہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوالرضراض دو صحابی سے روایت کرتے ہیں، حضرت ابن مسعود، اور حضرت علی سے، مگر علامہ عبدالرحمان کو حضرت علی سے ان کی کوئی روایت نہیں ملی، اسے محدث کبیر کی وسیع نظر نے کھوج نکالا۔

(۷) مسند احمد ج ۶۔ص ۱۸۔ح ۳۹۳۸

''حدثنا سلیمان بن داؤد الهاشمی حدثنا سعید یعنی بن عبدالرحمان الجمعی عن موسی بن عقبه عن الاودی عن ابن مسعود ان رسول اللهﷺقال: حرم علی النار کل هین لین سهل قریب من الناس''.

حدیث میں ایک تابعی محض الاودی کے نام سے آئے ہیں، شارح محقق ان کے متعلق لکھتے ہیں ''میں بالیقین نہیں بتا سکتا کہ یہ کون ہیں؟ تاہم میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ دو شخصوں میں سے کوئی ایک ہوں گے، یا تو عمرو بن میمون الاودی ہوں، یا ہزیل بن شرجیل الاودی ہوں، یہ دونوں عبداللہ بن مسعود کے شاگرد ہیں''۔

محدث اعظمی اس پر نقد کرتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے، یہ عبداللہ بن عمرو الاودی ہیں۔ چنانچہ تہذیب میں ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے۔ ''**هل تدرون علی من تحرم النار غداً**'' والی حدیث روایت کی ہے، اور ان سے موسی بن عقبہ نے یہ روایت لی ہے، ابن حبان نے کتاب الثقات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

لیجئے! الاودی کی شخصیت دلیل کے ساتھ متعین ہوگئی، شارح محقق نے جن کے بارے میں خیال ظاہر کیا تھا، ان میں سے کوئی نہ نکلا، ایک تیسرے صاحب ثابت ہو گئے۔

آگے پھر شارح محقق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مجھے اس سند کے ساتھ صرف ''جامع صغیر'' میں ملی ہے۔ ح ۳۷۰۳ اور وہاں صرف مسند احمد کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن اس کے شارح علامہ

سناوی نے حافظ عراقی کا قول نقل کیا ہے کہ اسے ترمذی نے بھی روایت کیا ہے، اور ''حسن غریب'' کہا ہے، اور'' ترغیب وترہیب'' ج۳۔ص۲۶۳ میں بھی ایک روایت اسی مفہوم کی ہے، اور صاحبِ ترغیب نے بھی کہا ہے''رواہ الترمذی، قال حدیث حسن'' شارح فرماتے ہیں کہ''میں نے ترمذی میں یہ روایت بہت تلاش کی، مگر نہ ملی، اور مجھے تقریباً یقین ہے کہ ترمذی کی روایت کسی اور طریق سے ہوگی''۔

بہر حال شارح محقق کو یہ روایت سرے سے ترمذی میں ملی ہی نہیں، پھر بعض قرائن کی بنا پر جن کا تذکرہ انہوں شرح میں کیا ہے، یہ فرمایا کہ'' اگر اس میں اس قسم کوئی روایت ہوگی، تو دوسرے طریق سے ہوگی''۔

اب محدث الہند کا استدراک ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ'' روایت ترمذی میں اسی سند سے ہے، یعنی موسی بن عقبہ عن الاودی، جیسا کہ تہذیب میں ہے، اور حدیث بحمد للہ مجھے مل گئی ہے، ترمذی شریف'' **باب ماجاء فی صفة اوانی الجنة**'' ۔کے بعد والے باب میں یہ حدیث موجود ہے۔(دیکھئے ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج۳۔ص۳۱۴)

کیسا عمدہ فیصلہ ہوا، شارح محقق فرماتے ہیں''**وهذا كله صحيح صواب**''۔
(مسند احمد ج۱۵۔ص۲۷۹)

(۸) محدث کبیر کے استدراکات میں ایک مقام ایسا آتا ہے، جہاں شیخ محقق نے ان سے شدید اختلاف کیا ہے، اور ان کے استدراک پر اچھا خاصا تبصرہ ہی نہیں بلکہ دو الزام بھی عائد کر دئے ہیں، انہیں ملاحظہ کرنے کے بعد محدث الہند کے علم وتحقیق کا دریا امنڈ آیا، اور واقعی تحقیق اسی کا نام ہے، اور علم کی رسائی اسے کہتے ہیں، تفصیل ملاحظہ ہو۔

مسند احمد ج۷۔ص۱۷۔ح۴۹۵۷

اس حدیث کی سند میں'' **عبدالعزيز بن عمر بن عبدالعزيز عن اسماعيل بن جرير عن قزعه قال: قال عبدالله بن عمر** '' آتے ہیں۔شارح محقق نے لکھا ہے کہ اس سند میں دو اختلاف ہے، بعض روایات میں عبدالعزیز بن عمر اور قزعہ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے، اور دوسری روایات میں واسطہ ہے۔ پھر واسطے میں بھی اختلاف ہے کہ وہ اسماعیل بن

جریر ہیں یاان کے بیٹے یحییٰ بن اسماعیل بن جریر؟ حافظ ابن حجر نے ''تہذیب التہذیب'' میں یحییٰ بن اسماعیل کو ترجیح دی ہے، بلکہ انہیں جزماً متعین کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسماعیل کے تذکرے میں بس اتنا کہا کہ صحیح یحییٰ بن اسماعیل بن جریر ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ ج ا۔ص ۲۸۷ اور اس پر ابوداؤد کا رمز تحریر کیا ہے، پھر یحییٰ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ''**یحییٰ بن اسماعیل بن جریر بن عبدالله البجلی الکوفی عن الشعبی ونافع مولی ابن عمر وقزعه بن یحییٰ وعنه عبدالعزیز وھشیم و الحسن بن قتیبه المدائنی ذکره ابن حبان فی الثقات قلت (القائل ابن حجر) قال الدارقطنی لا یحتج به**'' ۔اس کے بعد اور کچھ نہیں لکھا، صرف نسائی کا رمز تحریر کیا ہے، گویا نسائی میں یہ روایت اسی سند سے موجود ہے۔ شارح کہتے ہیں کہ میں نے نسائی شریف میں یہ روایت تلاش کی مگر مجھے نہیں ملی، شاید وہ سنن کبریٰ میں ہو۔ اور وہ جو ہم نے ابن حجر کا فیصلہ نقل کیا ہے، کہ واسطہ یحییٰ بن اسماعیل ہیں، میرا گمان یہ ہے کہ بلکہ یہی میرے نزدیک راجح ہے کہ یہ بات حافظ ابن حجر نے اپنی طرف سے کہی ہے ''تہذیب الکمال'' میں حافظ مزی نے اس کو نہیں ذکر کیا ہے، کیونکہ خزرجی نے ''خلاصہ'' میں جو تہذیب الکمال کا اختصار ہے، اس میں سرے سے یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، اگر تہذیب الکمال میں ان کا ذکر ہوتا تو خزرجی بھی ضرور تذکرہ کرتے، کیونکہ انہوں نے اختصار کے ساتھ تہذیب الکمال کے تمام رجال کو لے لیا ہے''۔

محدث اعظمی نے شارح کی اس بات پر کہ ''خزرجی نے خلاصہ میں یحییٰ کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اگر تہذیب الکمال میں اس کا تذکرہ ہوتا تو خزرجی بھی ضرور کرتے'' تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ تہذیب الکمال میں ضرور ہوا ہوگا، خواہ قزعہ کے راوی ابوداؤد کی روایت میں اسماعیل ہوں، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں، یا ان کے بیٹے یحییٰ ہوں، کیونکہ یحییٰ مذکور کی روایت ابوداؤد کی روایت کے علاوہ بھی موجود ہے، اور اس میں ان کے نام کی تصریح ہے، یہ روایت نسائی نے ذکر کی ہے، جیسا کہ آپ نے حافظ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نسائی کا رمز تحریر کیا ہے، اس لئے ان کا ذکر ''تہذیب الکمال للمزی'' میں ہونا ضروری ہے، رہا یہ کہ خزرجی نے ان کا تذکرہ 'خلاصہ' میں نہیں کیا، تو یہ ان کا یا تو سہو ہو، یا کاتبوں کی غلطی کی وجہ سے حذف ہو گیا ہو۔

پھر محدث اعظمی نے یہ بھی لکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ ’’میں نے سنن نسائی میں یہ روایت تلاش کی مگر مجھے نہیں ملی، شاید وہ ’’سنن کبریٰ‘‘ میں ہو‘‘ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ حافظ نے جو رمز تحریر کیا ہے وہ ’’س‘‘ نہیں ہے، کہ سنن نسائی مراد لی جائے، بلکہ انہوں نے رمز ’’سی‘‘ بالیاء والسین لکھا ہے، جس سے ان کی مراد ان کی دوسری کتاب ’’عمل الیوم واللیلۃ‘‘ ہے۔

شیخ محقق نے اس جگہ اعتراف کیا کہ محقق اعظمی کی گرفت بالکل صحیح ہے۔ بلاشبہہ حافظ نے ’’سی‘‘ کا رمز لکھا ہے ’’س‘‘ کا نہیں لیکن محدث کبیر کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ ’’تہذیب الکمال میں یحییٰ کا تذکرہ ضرور ہوگا، اور یہ کہ خزرجی نے خلاصہ میں ان کا ذکر جو نہیں کیا تو یہ ان کا سہو ہے‘‘ فرماتے ہیں کہ ’’یہ محلِ ظن پر یقینی فیصلہ صادر کرنا اور بے وجہ خزرجی کے سر تہمت لگانا ہے۔ (فانه جزم فی موضع الظن واتهام للخزرجي فی غير موضع التهمة) کیونکہ حافظ ابن حجر نے خود بھی ’’تقریب التہذیب‘‘ میں یحییٰ کا ترجمہ نہیں لکھا ہے، انہوں نے ان کا ذکر صرف ’’تہذیب التہذیب‘‘ میں کیا ہے، اس سے ہمارے گمان کی تائید ہوتی ہے کہ یہ ترجمہ تہذیب التہذیب کے تراجم پر اضافہ ہے‘‘۔

پھر لکھتے ہیں کہ ’’یقینی اور واقعی بات یہ ہے کہ حافظ مزی نے یحییٰ بن اسماعیل بن جریر کا تذکرہ سرے سے تہذیب الکمال میں کیا ہی نہیں، اور اس کا ہم کو یقین اس لئے ہے کہ ہم نے اس کے ایک نفیس قلمی نسخہ کا فوٹو حاصل کیا ہے، اس میں یحییٰ بن اسماعیل کی جانب محض ایک ہلکا سا اشارہ ہے، حالانکہ حافظ مزی کے لئے ان کے دستور کے مطابق یحییٰ بن اسماعیل کا علیحدہ تذکرہ کرنا ضروری تھا، کیونکہ ان کی ایک روایت ’’عمل الیوم واللیلۃ لنسائی‘‘ میں موجود ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ بخاری نے ان کے والد کا ترجمہ نہیں لکھا، بلکہ صرف یحییٰ ہی لکھا ہے، اور انہیں کا اتباع ابن ابی حاتم نے کیا ہے‘‘۔ غرض شارح محقق کو یقین ہے کہ حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں یحییٰ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۸۲)

اب محدث کبیر کے ارشادات سنئے، پہلے تو انہوں نے شیخ محقق کے اس دعوی کی تردید کی ہے کہ حافظ ابن حجر نے تقریب میں یحییٰ کا تذکرہ نہیں کیا ہے، یہ نقد بصورت مکتوب ہے، مطبوعہ نہیں ہے، یہ مکتوب شیخ کے یہاں بھیجا گیا تھا، مگر چونکہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اس لئے

شائع نہ ہوسکا۔میرے سامنے محدث کبیر کے مکتوب کا اصل مسودہ ہے۔''فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے تقریب میں یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ کیا ہے۔(دیکھئے تقریب ص۳۸۹مطبوعہ احمدی شاہدرہ ۱۲۷۰ھ اور مطبوعہ مطبع فاروقی ۱۲۹۰ھ ۱۳۰۸ھ اور مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لکھنو ۱۳۱۲ھ)اور یہ آخری نسخہ علامہ امیر علی ہندی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوا ہے،اورانہوں نے کتاب کے آخر میں تنبیہات کے تحت لکھا ہے کہ ''انہوں نے کتاب کی تصحیح کا مدت دراز تک اہتمام کیا ہے، جہاں بھی کوئی نسخہ تقریب کا ملا ہے،اس سے تصحیح کی ہے''۔

پھر دوسرے مکتوب میں لکھا کہ ''مزید ملاحظہ ہو،حافظ بن العجمی نے یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ ''نہایت السول فی رواۃ السنۃ الاصول''میں لکھا ہے،اس کی عبارت یہ ہے۔

"یحییٰ بن اسماعیل بن جریر بن عبدالله البجلی عن الشعبی وقزعه وعنه عبد العزیز بن عمر بن عبد العزیز وهشیم والحسن بن قتیبه ذکره ابن حبان فی ثقاته ،قال فی المیزان یحییٰ بن اسماعیل الکوفی الجریری قال الدار قطنی :لا یحتج به''.

یہ عبارت میں نے رام پور کے نسخے سے نقل کی ہے،جس کا نمبر ۱۰۱۹ ہے،اور یہ خود مؤلف کا تحریر کردہ ہے،اور آپ کو معلوم ہے کہ ''نہایۃ السول'' تہذیب الکمال ہی کا اختصار ہے، جیسا کہ مؤلف نے شروع کتاب میں اس کی تصریح کی ہے۔

اور خود تہذیب التہذیب میں حافظ نے یحییٰ کا تذکرہ جس انداز سے لکھا ہے،اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ تہذیب الکمال سے ماخوذ ہے،حافظ کا اضافہ نہیں ہے، کیونکہ حافظ نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ جو تراجم تہذیب الکمال میں ہیں ان کے اثنا میں اگر مجھے کوئی اضافہ کرنا ہوگا تو اپنے اضافہ سے پہلے ''قلت'' کہوں گا،پس '' قلت'' کے بعد والی عبارت میری ہوگی،تہذیب الکمال کی نہ ہوگی۔(ج۱۔ص۵)اب آپ یہاں تہذیب التہذیب میں یحییٰ بن اسماعیل کا ترجمہ دیکھیں کہ بالکل آخر میں حافظ نے '' **قلت**'' کہا ہے،اوراس کے بعد کی عبارت یہ ہے''**وقال الدار قطنی لا یحتج به**''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ''قلت'' سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے،وہ تہذیب الکمال کی بات ہے۔

اوران سب سے بڑھ کر دلیل یہ ہے کہ مکتبہ آصفیہ حیدرآباد میں تہذیب الکمال کا جونسخہ ہے، اس میں یحییٰ مذکور کا ترجمہ ہے، اس کی اطلاع مجھے شیخ ابوالوفا افغانی[۱] نے دی ہے، میں نے شیخ کو لکھا ہے کہ اس کو نقل کر کے میرے پاس بھیج دیں، جیسے ہی یہ ترجمہ میرے پاس پہونچے گا میں آپ کے پاس فوراً بھیجوں گا، ان شاء اللہ۔ اتنی تصریحات کے بعد تو میں اس الزام سے بری ہوں گا جس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ ''یہ محلِ ظن پر یقین کرنا اور بے موقع خزرجی کے سر تہمت لگانا ہے''۔

پھر محدث کبیر نے اپنا وعدہ پورا کیا، چنانچہ تہذیب الکمال سے یحییٰ بن اسماعیل کا ترجمہ نقل کرا کے بھیجا، ہم اسے من وعن نقل کر دیتے ہیں:

''یحییٰ بن اسماعیل بن جریر بن عبدالله البجلی الکوفی روی عن عامر الشعبی وقزعه بن یحییٰ علی خلاف فیه ونافع مولی ابن عمر وروی عنه الحسن بن القتیبه المدائنی وعبدالعزیز بن عمر بن عبدالعزیزوهشیم بن بشیر ذکره ابن حبان فی کتاب الثقات روی له النسأئی فی الیوم واللیلة حدیثاًواحداً وقد وقع لنا بعلو عنه اخبرنا حنبل بن عبدالله قال اخبرنا ابوالقاسم بن الحصین قال اخبرنا ابو علی بن مذیب قال اخبرنا ابوبکر القطیعی قال حدثنا عبدالعزیز بن عمر بن عبدالعزیزعن یحییٰ بن اسماعیل بن جریر عن قزعه قال ارسلنی ابن عمر فی حاجة ،فقال استود ع الله دینک وامانتک وخواتیم عملک رواه عن احمد بن سلیمان الرهاوی عن ابن نعیم فوقع لنا بدلاً.

واخرجه من وجهین آخرین عن عبدالعزیز عن اسماعیل بن جریر والصواب روایة النسأئی ،والله اعلم،وقد اختلف فیه علی عبدالعزیز''.

اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان دونوں مکتوب کو پا کر شیخ محقق کس درجہ متأثر ہوئے ہوں گے، واقعہ یہ ہے کہ علم ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اور محدث اعظمی نے اس بحر کی خوب غواصی کی ہے، جبھی تو ایسے نفائس حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

احادیث کی شرح پر استدراک:

(۱) مسند احمد ج ۵۔ ص ۲۹۴۔ ح ۳۷۸۰

میں ابواسحاق شیبانی سے روایت ہے کہ'' **اتیت زر بن حبیش وعلی دربان فالقیت علی محبة منه** ''۔اس میں لفظ'' دربان'' کی تفسیر میں شارح نے لکھا ہے کہ بظاہر کپڑے کی یہ کوئی قسم ہے۔

محدث کبیر نے اس پر نقد کیا کہ'' دربان'' فارسی کلمہ ہے،جس کو عربی میں'' حاجب'' اور ''بواب'' کہتے ہیں۔شیبانی کی مراد یہ ہے کہ ان کے دروازے پر ایک دربان تھا،اللہ تعالی نے اس کے دل میں میری محبت ڈال دی،اوراس نے مجھے ملاقات کی اجازت دیدی، یہ مطلب بالکل ظاہر ہے،شارح سے یہاں چوک ہوئی۔

(۲) مسند احمد ج۸۔ص۳۲۔ح ۵۶۴۸

ایک شاعر نے حضرت ابن عمر کے سامنے مصرعہ پڑھا۔

ے **وبلال عبد الله خير بلال**

اس پر عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ تم غلط کہہ رہے ہو''**ذاک بلال رسول الله** ﷺ''اس کی شرح میں شیخ محقق نے بتایا کہ لغت میں بلال کے معنی'' تری اور نمی'' کے ہیں،لیکن یہاں یہ لفظ بطور کنایہ کے استعمال ہوا ہے،مراد سخاوت اور فیاضی ہے،یعنی شاعر نے یہ کہنا چاہا ہے کہ عبداللہ کی فیاضی سب سے بڑھ کر ہے،اس پر انہوں نے ٹوکا کہ رسول اللہ ﷺ کی فیاضی سب سے بڑھ کر ہے۔

محدث اعظمی اس کی تصحیح کرتے ہیں کہ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، بلکہ پہلے بلال سے مراد حضرت عبداللہ بن عمر کے فرزند ہیں،ان کا نام بھی بلال تھا۔اور دوسرے بلال سے مراد بلال بن رباح مشہور صحابی اور خادم رسول ﷺ ہیں،اوراس کی دلیل یہ ہے کہ حافظ ابوالقاسم التیمی نے ''سیر السلف''میں لکھا ہے کہ سالم سے مروی ہے کہ ایک شاعر نے بلال بن عبداللہ بن عمر کی مدح میں یہ مصرعہ پڑھا۔

ے **بلال عبدالله خير بلال**

اس پر عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بلکہ:

ے **بلال رسول الله خير بلال**

دیکھئے ذراسی چوک نے بات کہاں سے کہاں تک پہونچادی تھی، محدث کبیر اس کو اس کی جگہ واپس لائے اور دلیل کے ساتھ لائے۔

احادیث کی تخریج:

(۱) مسند احمد ج ۲۔ص ۳۰۳۔ح ۱۲۴۸

''**عن علی قال: قال لی رسول الله ﷺ لا تبرز فخذک ولا تنظر الی فخذ حی ومیت**''.

اس کے بارے میں شارح لکھتے ہیں کہ کئی حفاظ حدیث جن میں امام منذری اور حافظ ابن حجر جیسے لوگ شامل ہیں، اس روایت کو ابن ماجہ کی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ صاحب ذخائر المواریث نے ابن ماجہ کی ''کتاب الجنائز'' کو متعین بھی کر دیا ہے، مگر باوجود تلاشِ بسیار کے مجھے یہ روایت نہیں ملی۔

محدث اعظمی لکھتے ہیں کہ یہ روایت ابن ماجہ میں ہے، دیکھئے ''کتاب الجنائز'' ''**باب ماجاء فی غسل المیت**'' کی تیسری حدیث۔

(۲) مسند احمد ج ۵۔ص ۲۳۷۔ح ۳۶۵۲

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چوکور خط کھینچا (**خطاً مربعاً الخ**) اس بارے میں شارح لکھتے ہیں کہ ''ذخائر المواریث'' میں اس حدیث کے سلسلے میں ترمذی کا حوالہ دیا گیا ہے، مگر میں نے باوجود تلاش کے نہیں پایا۔

محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ترمذی میں ''**باب ماجاء فی صفة اوانی الجنة**'' کے بعد والے باب میں ہے۔(ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج ۴۔ص ۳۰۴)

(۳) مسند احمد ج ۴۔ص ۱۹۳۔ح ۲۵۶۱

''**حدثنا عبد الرزاق اخبرنا سفیان عن الاحلج عن یزید بن اصم عن ابن عباس ان رجلاً قال: ماشاء الله وشئت، فقال جعلتنی لله عدلاً بل ماشاء الله وحده**''.

اس حدیث کے بارے میں شارح محقق لکھتے ہیں کہ ''باوجود کوششِ بلیغ کے یہ حدیث

مسند کے علاوہ کسی اور کتاب میں مجھے نہ ملی، حتی کہ ''مجمع الزوائد'' میں بھی نہیں، البتہ ابن ماجہ میں اس کے متقارب ایک حدیث بطریق ''**عیسی بن یونس عن الاحلج عن یزید بن اصم عن ابن عباس مرفوعاً اذا حلف احدکم فلا یقل ماشاء الله وشئت، ولیقل ماشاء الله ثم شئت**''، شاید صاحب زوائد نے ان دونوں حدیثوں کو ایک سمجھ لیا، اس لئے اس کی تخریج نہیں کی، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے، دونوں حدیثیں الگ الگ ہیں، اگر چہ معنی کے لحاظ سے قریب قریب ہیں''۔

محدث کبیر نے اس پر استدراک فرمایا کہ ''اس حدیث کو امام بخاری نے ''الادب المفرد'' ص۔۱۱۵ میں بطریق ابونعیم عن سفیان عن الاجلح ذکر کیا ہے، اور امام نسائی نے بھی مسند کے الفاظ ہی میں نقل کیا ہے، جیسا کہ اس کا حوالہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں دیا ہے۔ (ج ۱۱۔ ص ۴۳۵) شاید یہ روایت سنن کبریٰ میں ہو، اور میرا خیال ہے کہ امام نسائی کے نقل کرنے کی وجہ سے صاحب زوائد نے اسے اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا، اور امام طحاوی نے بطریق شیبان نحوی عن الاجلح ''مشکل الآثار'' میں ذکر کیا ہے۔ (ج ۱۔ ص ۹۰)

لیجئے حوالوں کی قطار لگ گئی، کیا ٹھکانہ ہے وسعتِ علم کا اور کتنا حیرت انگیز حافظہ ہے؟۔

(۴) مسند احمد ج ۵۔ ص ۲۰۳۔ ح ۳۵۸۲

''**حدثنا سفیان عن یزید عن ابی الکنود اجبت خاتما یوما فذکرہ فراہ ابن مسعود فی یدہ فقال نہی رسول الله ﷺ عن حلقة الذهب**''۔

اس حدیث کے متعلق شارح محقق نے لکھا ہے کہ اس کو میں نے مسند احمد کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں پایا، اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں بھی اس کو نہیں لکھا، شاید انہوں اس حدیث پر جس میں سونے کی انگوٹھی پہننے کی کراہت کا بیان ہے، جو مسند میں ص ۳۶۰۵ پر آرہی ہے، اکتفا کیا ہے، لیکن وہ دوسری حدیث ہے۔

محدث کبیر اس پر تحریر فرماتے ہیں کہ امام طیالسی نے اپنی مسند میں اسے ایسی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، جس میں انقطاع نہیں ہے، اور یہ بعینہ وہی سند ہے، جو مسند میں حدیث ۳۸۰۴ پر آرہی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ امام احمد نے عن محمد بن جعفر عن شعبہ سے روایت بیان کی ہے،

اورامام طیالسی نے خود شعبہ سے براہ راست روایت لی ہے۔

شیخ محقق کے استنباط پر نقد:

مسند احمد ج ا۔ص ۱۵۶۔ح ۵

"حدثنا محمد بن جعفر قال حدثنا شعبه عن يزيد بن خمير عن سليم بن عامر عن اوسط قال خطبنا ابوبكر" الخ.

اس سند پر شارح نے لکھا ہے کہ یہ اوسط بن اسماعیل بن اوسط بن بجلی ہیں، حافظ ابن حجر نے "اصابۃ" اور "تہذیب" میں انہیں تابعی لکھا ہے، اور دلیل یہ دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ایک سال کے بعد مدینہ پہونچے ہیں، لیکن حدیث ۱۷ پر آرہا ہے کہ "**انه حدث عن ابى بكر انه سمع حين توفى رسول الله ﷺ**". یہ روایت اس بات پر دلیل ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی ہے، اوسط مدینہ میں تھے، اس لئے قوی احتمال ہے کہ انہوں نے وفات سے پہلے آپ کی زیارت کی ہو۔

محدث کبیر نے اس پر نقد کیا کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث آگے ۴۴ پر بھی آرہی ہے، اس میں اوسط خود فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ پہونچا تو میں نے ابوبکر کو خطبہ دیتے سنا، اور حدیث ۱۷ میں ہے کہ انہوں نے یہ خطبہ اس وقت سنا جب حضور کی وفات ہوئی تھی (**حين توفى رسول الله ﷺ**) لیکن حدیث ۴۴ میں "**توفى**" کا مطلب صاف ہوجاتا ہے کہ جس وقت انہوں نے حضرت ابوبکر کا خطبہ سنا تھا، اس وقت حضور کی وفات ہوچکی تھی، یہ نہیں کہ جس وقت وفات ہوئی تھی اس وقت سنا تھا۔

اس پر شارح محقق لکھتے ہیں کہ "**هذا استدراك جيد محقق**".

اس استدراک میں ایک خاص لطیفہ بھی ہے، اس سے محدث اعظمی کی دقتِ نظر، اور استحضارِ تام کا اندازہ ہوتا ہے، ورنہ سرسری طور پر اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ لطیفہ یہ ہے کہ حدیث ۵ کی سند میں محض اوسط ہے، بغیر کسی نسبت کے، اور حدیث ۱۷ میں اوسط بن اسماعیل بن اوسط بجلی ہے، اور حدیث ۴۴ میں اوسط بن عمرو ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے والا ہرگز نہیں ادراک کرسکتا کہ تینوں جگہ ایک ہی بزرگ ہیں، جب کہ ولدیت میں فرق ہے، غالباً اسی فرق کی وجہ سے شیخ محقق

کی نظر بھی چوک گئی۔ چنانچہ ولدیت کے اختلاف کی طرف حضرت محدث کبیر نے توجہ دلائی اور لکھا کہ۔

''بہتر یہ تھا کہ اوسط بن اسماعیل کے تذکرہ میں ان کے باپ کے نام میں جو اختلاف ہے، اسے بھی ذکر کر دیا جاتا کہ وہ اسماعیل ہیں، یا عامر، یا عمر؟ تا کہ حدیث ۴۴ کو دیکھنے والا یہ نہ سمجھ لے کہ اس میں جو اوسط بن عمر ہیں، یہ دوسرے ہیں، اور دوسری حدیثوں میں دوسرے ہیں''۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۱۵۳)

طباعت کی غلطی کی نشان دہی:

(۱) مسند احمد ج ۲۔ ص ۲۸۸۔ ح ۱۲۰۶

متن حدیث میں ''ثم انی رأیت ابی'' آیا ہے۔ صحیح ''ثم انی رأیت انی'' ہے۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۵۸)

(۲) مسند احمد ج ۴۔ ص ۳۸۔ ح ۲۱۹۳

متن حدیث میں ''باقة'' آیا ہے، صحیح ''تاقته'' ہے، بظاہر یہ طباعت کی غلطی ہے۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۶۳)

(۳) مسند احمد ج ۵۔ ص ۲۶۷۔ ح ۳۷۱۲

شارح محقق کا جملہ ہے ''وکلام الذهبی فی انه لا یدری من هو'' اس پر محدث اعظمی نے فرمایا کہ شاید یہ جملہ اس طرح ہو ''وکلام الذهبی فی المیزان انه لا یدری من هو الخ'' شیخ محقق نے اس کی تائید کی، اور فرمایا کہ 'هذا صحیح سقطت 'کلمة المیزان''. (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۷۵)

شیخ محقق کے کلام کی دلیل بیان کرنا:

مسند احمد ج ۵۔ ص ۳۳۵۔ ح ۳۸۷۶

اس حدیث کی سند میں ایک صاحب عیزار بن جرول حضرمی آئے ہیں، ان کے متعلق شیخ محقق نے لکھا ہے کہ یہ تنعی ہیں، اور بنوتنع (بکسر التاء وسکون النون) کی جانب منسوب ہیں، یہ ہمدانی کا ایک خاندان ہے، حافظ ابن حجر کی تعجیل المنفعة میں انہیں ثقفی لکھا گیا ہے۔ شارح

فرماتے ہیں کہ یہ کاتب کی غلطی (تصحیف) ہے۔

حضرت محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ آپ نے درست فرمایا، کیونکہ حافظ حسینی نے تصریح کی ہے کہ عیزار، سلمہ بن کہیل کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، اور سلمہ بن کہیل یقیناً تنعی ہیں، جیسا کہ تہذیب وغیرہ میں ہے۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۷۸)

ایک بات جو اندازہ اور بصیرت سے کہی گئی تھی، محدث کبیر کی وسعت نگاہ نے اس کی دلیل پیش کردی۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی نور اللہ مرقدہ کی وسعتِ نظر، وفورِ علم، عمقِ مطالعہ، قوتِ گرفت، اور دقیقہ رسی کی یہ چند مثالیں ذکر کی گئیں، بالخصوص علمِ اسماء الرجال میں، جو فنونِ حدیث میں غالباً سب سے مشکل فن ہے، اعلیٰ درجہ کی حذاقت ومہارت کے نمونے آپ نے دیکھ لئے۔ ویسے تو علم وفن کا یہ شاداب چمن اپنے ہر گوشے میں بہارِ بےخزاں لئے ہوئے تھا، مگر اسماء الرجال میں اسے جو خصوصیت حاصل تھی، اس کی نظیر نہیں ملتی، اسی طرح دقتِ نظر کی جو شان آپ میں تھی کم علما میں پائی جاتی ہے۔

ایک بار محدث کبیر کی خدمت میں ملک ایک نامور عالم جو خود بھی علم وتحقیق کے مردِ میداں تھے، تشریف لائے۔ ان دنوں ''علل ابن مدینی'' طبع ہوکر آئی تھی، اور حضرت مولانا اس کے حاشیے پر جگہ جگہ استدراک لکھ رہے تھے، کسی وقت ان عالم نے حضرت مولانا کے صاحبزادے مولانا رشید احمد سے سوال کیا کہ یوں تو مولانا بہت عظیم القدر ہیں، اور جلالت شان کے مالک ہیں، مگر حضرت مولانا کی خاص خصوصیت کیا ہے؟ صاحبزادہ محترم نے تھوڑی دیر تأمل کیا، اور پھر وہی کتاب ان کے سامنے رکھ دی، اور فرمایا کہ حضرت مولانا کے استدراک دیکھے بغیر اصل کتاب میں غور کیجئے اور دیکھئے کہ کہیں کوئی غلطی نظر آتی ہے؟ کیونکہ اس کو ایک بڑے محقق نے تحقیق کرکے شائع کیا ہے، انہوں نے دیکھنا شروع کیا، انہیں کہیں کوئی کمی کوتاہی محسوس نہیں ہوئی۔ پھر مولانا کے استدراکات پڑھے تو معلوم ہوا کہ کھلی غلطیاں تھیں۔

بس یہی مولانا کی خاص بات تھی، علم حدیث میں علل کا علم ایک مشکل علم ہے، علی بن مدینی اس کے ماہرین میں سے ہیں، ایسی کتاب کی تحقیقات کی غلطیوں کا ادراک بہت وسیع

مطالعہ، اعلی درجہ کی قوتِ حفظ، اور کامل استحضار چاہتا ہے۔ حضرت مولانا میں یہ صفات بدرجۂ اتم تھیں۔ مولانا کے استدراکات، تعلیقات وتحقیقات پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے زمانہ کے محدثین میں سے کوئی صاحب ہمارے دور میں تشریف لائے تھے۔ آہ کہ ہم نے رمضان المبارک کی گیارہ تاریخ کو ایک شخصیت نہیں علم وفن کے ایک بڑے کتب خانے کو دفن کردیا، اسلاف کی یادگار ہم سے کھوگئی، اسلاف کی ایک حجت بالغہ جاتی رہی۔ جب تک وہ رہے کسی بڑے صاحبِ علم کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوتا تھا، ان کی ذات اسے پر کردیتی تھی، اطمینان رہتا تھا کہ ابھی علم کا جبلِ عظیم موجود ہے، اب وہ نہیں ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام علما کا وصال ہوگیا۔ انہوں نے اتنے لوگوں کی جگہ پر کی تھی، وہ اپنی ذات سے ایک امت بن گئے تھے، اب یہ امت اٹھ گئی، ہر طرف خلاء ہی خلاء محسوس ہوتا ہے۔ خیر اللہ ہر جانے والے کا خلیفہ ہے، سب کے لئے فنا ہے، وہی ایک ذات باقی ہے، اسی پر بھروسہ اور اعتماد ہے۔ رہے نام اللہ کا

☆☆☆☆☆☆

ماخذ: ترجمان الاسلام خصوصی اشاعت محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی
از جولائی تا دسمبر (۱۹۹۲ء)

حاشیہ

(۱) مولانا ابوالوفا افغانی اس دور کے محقق اور جید وباکمال اہل علم میں تھا، اصلاً افغانی تھے، ۱۳۱۰ھ میں عیدالاضحیٰ کے دن قندھار میں پیدا ہوئے، نام سید محمود شاہ قادری حنفی بن مبارک شاہ قادری حنفی تھا، مگر ابوالوفا افغانی کے نام سے شہرت پائی، زمانہ طالب علمی میں ہندوستان آئے اور رامپور و گجرات میں تحصیل علم کے بعد ۱۳۳۰ھ میں حیدرآباد پہونچے، مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا اور وہیں سے فارغ ہوئے، اور پھر حیدرآباد ہی کے ہورہے، فراغت کے بعد مدرسہ نظامیہ میں درس دینا شروع کیا، پھر ''لجنة احیاء المعارف النعمانية'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس سے بہت سی قیمتی اور نادر کتابیں شائع ہوئیں۔ فقہ حنفی کے ساتھ ان کا شغف مثالی تھا، علم کے لئے انہوں نے دنیا کو تج دیا تھا، پوری عمر تجرد کی حالت گزاری۔ متعدد بیش قیمت کتابیں ان کی تحقیق وتعلیق سے شائع ہوئیں، جن میں سے اکثر حنفی فقہ ومذہب سے تعلق اور نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا افغانی کا علامہ اعظمی سے خاص تعلق تھا۔ (حیات ابوالمآثر ملخصاً جلد اول ص ۵۴۶)

استدراکات علمیہ

از

حضرت محدث اعظمی علیہ الرحمہ

بعض اتفاقات عجیب ہوتے ہیں، جو بسا اوقات اہم کاموں کی بنیاد بن جاتے ہیں، آدمی کی ناواقفی انہیں ''اتفاقات'' کا نام دیتی ہے، ورنہ درحقیقت وہ حق تعالی کے انتظامات ہیں، جو پردۂ غیب سے علم وارادہ کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ جن چیزوں کو آدمی اتفاق کا نام دیتا ہے وہ حقیقۃً اللہ تعالی کے علم وارادہ سے صادر ہونے والی حکمت بھری تدبیریں ہیں۔

۱۰ر رمضان ۱۴۱۲ھ کو حضرت محدث اعظمی کا وصال ہوتا ہے، حضرت کے وصال کے بعد ان کے صاحبِ علم وقلم شاگرد مولانا نظام الدین اسیر ادری کو خیال ہوتا ہے کہ مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' کا ایک خصوصی نمبر حضرت کی یادگار کے لئے مختص کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس یادگاری مجلّہ کے لئے مضامین کی فراہمی جو حضرت کے مختلف گوشہائے حیات کو اجاگر کریں، ایک کارِ اہم تھا۔ اسیر صاحب نے مضمون کی فرمائش کے لئے جن لوگوں کا انتخاب کیا، ان میں ازراہ عنایت و محبت انہوں نے اس خاکسار کا نام بھی شامل کر دیا، حالانکہ بندہ صرف ایک مدرس ہے، جو کبھی کبھی وعظ بھی کہہ لیتا ہے، ایک مدرس اور ایک واعظ سے کسی محقق، محدث اور زبردست عالم کے سلسلے میں مضمون کی فرمائش ایک عجیب چیز ہے، لیکن دنیا میں عجائبات کی کمی نہیں ہے، اور اس سے عجیب تر یہ ہوا کہ میں نے اپنے جہل کو جانتے ہوئے بھی مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا، لیکن یہ سوچتا رہا کہ کیا لکھوں؟ اور کیوں کر لکھوں؟ میں تو حضرت کے بارے میں سوائے اس کے کہ ''وہ بڑے مولانا

ہیں'' کچھ زیادہ جو لکھے جانے کے قابل ہو، جانتا نہیں۔دن گزرتے رہے بات ٹلتی رہی، بالآخر ایک بار بنارس کی حاضری میں اسیر صاحب نے قطعی حکم سنادیا کہ فلاں تاریخ تک کچھ لکھ کر دیدو، اب خصوصی نمبر کا انتظام ہورہا ہے۔میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، جی چاہا کہ انکار کردوں، کہ جو جانے وہ لکھے، میں کچھ جانتا ہی نہیں، اور یہ واقعہ ہے، کیوں کہ بجز اخیر کے ایک ڈیڑھ سال کے حضرت محدث اعظمی کی انتہائی عظمت کے باوجود ان کے قریب نہیں ہوا تھا، اخیر میں تھوڑا سا قرب ہوا تو ان کا وقت آخر آچکا تھا، تو واقعی جی چاہا کہ انکار کردوں، مگر اسیر صاحب کے تیور دیکھ کر اس کی ہمت نہ کرسکا۔آخر مجبوری نے ایک راستہ دکھایا، بقرعید کی تعطیل میں مَیں مئو حضرت کے صاحبزادہ ذی جاہ حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے اس سلسلے میں مشورہ چاہا، پھر انہیں کے مشورہ سے یہ بات طے ہوئی کہ حضرت مولانا اعظمی نے ''مسند احمد'' کی شرح پر جو ''استدراکات'' لکھے ہیں، ان کا تعارف کرایا جائے۔چنانچہ انہوں نے مطبوعہ استدراکات اصل نسخہ جو علامہ احمد محمد شاکر نے خاص طور سے حضرت کے نام بھیجا تھا، عطا فرمایا، اس کے علاوہ حضرت کے قلم سے لکھا ہوا اصل مسودہ بھی دیا، اس طرح مئو میں رہ کر ہی میں نے وہ مضمون مرتب کیا جو ''ترجمان الاسلام'' کی خصوصی اشاعت میں شامل ہوا۔

مئو میں رہ کر حضرت محدث اعظمی کی علمی تحقیقات دیکھنے اور پڑھنے کا جو اتفاق ہوا تو حقیقت یہ ہے کہ میں حیرت زدہ ہوکر رہ گیا کہ علم وفضل ایسی عظیم شخصیت ہمارے درمیان تھی اور چلی بھی گئی، اور ہم نے نہ کچھ جانا اور نہ قدر کی۔اسی وقت دل میں خیال ہوا کہ حضرت نے اپنی بے نیازیٔ طبع کے باعث ان تحقیقاتِ علمیہ کی عام اشاعت کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں فرمایا، لیکن ان کا حق ہے کہ انہیں منظر عام پر لایا جائے، ان کا تعارف کرایا جائے، اور یہی خیال بنیاد بنا ''المآثر'' کے اجرا کی، جس کا یہ چوتھا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔راقم الحروف نے استدراکات کا کچھ حصہ بطور نمونے کے ترجمان الاسلام کی خصوصی اشاعت کے لئے لکھا تھا، اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ مستقل ایک کتاب کا موضوع ہے۔چنانچہ اسی وقت اس کی تکمیل بھی کرڈالی تھی، اب بقیہ حصہ ہم المآثر کے صفحات میں نذرِ قارئین کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جناب اسیر صاحب کو کہ انہیں کی تحریک سے اس علمی خدمت میں لگنے کا موقع میسر آیا۔

مصر کے مشہور محقق علامہ احمد محمد شاکر نے حدیث کے عظیم الشان ذخیرے ''مسند احمد'' کی شرح لکھنی شروع کی تھی، اورانہوں نے تمام دنیا کے علمائے حدیث کو اس پر دعوت نقد و استدراک دی، اور کسی نے ہمت نہیں کی، مگر محدث کبیر نے بالاستیعاب مطبوعہ جلدوں کا مطالعہ کر کے ان پر استدراک لکھا، اورانہیں علامہ کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے ان استدراکات کو بے حد پسند کیا، اور ازراہِ قدردانی کتاب کی پندرہویں جلد میں ان تمام استدراکات کو حضرت کے اعترافِ کمال اور شکریئے کے ساتھ شائع کیا۔

چنانچہ تفصیل سے اس کو ''ترجمان الاسلام'' کے ''محدث اعظمی نمبر'' میں دیکھا جاسکتا ہے، ہم نے مضمون میں اسی مسند کا حوالہ دیا ہے جو علامہ احمد محمد شاکر کی تحقیق وشرح کے ساتھ شائع ہوئی ہے، حدیث کے نمبر کا حوالہ بھی وہیں سے ماخوذ ہے۔

(۱) مسند احمد ج ۱۔ص ۵۵۔سطر ۱۱۔مقدمہ

''ابو الفضل محمد بن محمد بن فهر الهاشمي المكي''

محدث اعظمی نے اس پر نوٹ لکھا کہ فھر صحیح نہیں ہے، صحیح ''فہد'' ہے، بالدال المہملہ۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۵۳)

دیکھنے میں کتنی چھوٹی بات ہے، مگر اہل تحقیق سے پوچھئے کہ کتنی باریک اوراہم بات ہے

(۲) مسند احمد ج ۳۔ص ۱۵۵۔ح ۱۷۰۶

حدثنا عبد الله بن بكر السهمي حدثنا هشام بن حسان عن القاسم بن مهران عن موسى ابن عبيد.

اس روایت کے بارے میں شیخ محقق نے لکھا ہے کہ یہ ''مجمع الزوائد'' ج ۱۰۔ص ۴۱۱، ۴۱۱ میں موجود ہے، اس پر علامہ ہیثمی صاحب مجمع الزوائد نے تحریر کیا ہے کہ:

''رواه احمد والبزار بنحوه والطبراني بنحوه''۔ اور پھر لکھا کہ ان سب میں سند کے اندر قاسم بن مہران عن موسی بن عبید، خالد بن عبداللہ بن اسید کے مولی ہیں، چنانچہ ابن حبان نے ''کتاب الثقات'' میں ان کا ذکر کیا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ۔

قاسم بن مہران کا علامہ ذہبی نے ''میزان'' میں تذکرہ کیا ہے، اور یہ بات لکھی ہے کہ ان

سے سوائے سلیم بن عمر نخعی کے کسی اور نے روایت نہیں کی، حالانکہ ایسا نہیں ہے،ان سے یہ حدیث ہشام بن حسان نے روایت کی ہے''۔

اس پر محدث کبیر لکھتے ہیں کہ'' شیخ نے صاحب مجمع الزوائد سے سلیم بن عمر تو نقل کیا ہے،مگر اس نام میں چوک ہوئی ہے،اس پر متنبہ نہیں کیا، یہ سلیم نہیں ہیں سلیمان ہیں۔

نیز ان کے شیخ موسی بن عبید نہیں ہیں،موسی بن عبیدہ ہیں''۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۶۰)

راویوں کے ناموں کی اتنی باریک غلطیوں پر گرفت کرنا پھر ان کی تصحیح کرنا کیا معمولی مطالعہ اور عام قوت حفظ واستحضار کے بس کی بات ہے؟۔

(۳) مسند احمد ج ا۔ص ۲۷۲۔ح ۴۵۹۷

عن نافع سمعت رجلاً من بنی سلمة یحدث ابن عمران جاریة الکعب

اس حدیث کو امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمر کی مسانید میں ذکر کیا ہے،شیخ محقق فرماتے ہیں کہ'' یہ عبداللہ بن عمر کی مسانید میں نہیں ہے،اس کے اصل راوی حضرت کعب بن مالک ہیں۔چنانچہ ان کے مسانید میں یہ روایت آرہی ہے'' حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ'' اس حدیث کے جتنے طرق ہیں، کسی میں یہ نہیں ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اس روایت کو بیان کیا ہے، سب میں یہ ہے کہ حضرت کعب بن مالک کے ایک صاحبزادے نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر سے بیان کی ہے،اور انہیں صاحبزادے سے نافع نے روایت کی''۔(فتح الباری ج ۹۔ص ۵۴۴،۵۴۵)

رہی یہ بات کہ حضرت کعب بن مالک کے صاحبزادے کون ہیں؟ تو حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ'' حافظ جمال الدین مزی نے ''الاطراف'' میں انہیں عبداللہ قرار دیا ہے،لیکن اسی حدیث کا ایک حصہ ابن وہب عن اسامہ بن زید عن ابن شہاب کے طریق سے عبدالرحمان بن کعب بن مالک عن ابیہ سے نقل کیا گیا ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت کعب کے فرزند عبدالرحمان مراد ہیں''۔

شارح محقق فرماتے ہیں کہ''میں نے ابن وہب کی یہ روایت تو نہیں دیکھی،البتہ مسند احمد میں،ہی مسانید کعب بن مالک کے ذیل میں یہ روایت ''عن اسامۃ بن زید عن الزہری عن ابن

کعب بن مالک'' آرہی ہے، اس میں نام نہیں ہے، پھر آگے چل کر یہی روایت ابومعاویہ سے منقول ہے کہ ''حدثنا الحجاج عن نافع عن ابی بن کعب عن ملک عن ابیہ'' اس میں کعب کے فرزند کا نام ''ابی'' بتایا گیا ہے، لیکن یہ ابی بن کعب کون ہیں؟ میں انہیں نہیں جانتا، مجھے معلوم نہیں کہ حضرت کعب کے فرزندوں میں ''ابی'' نامی بھی ہے، شاید یہ کاتبوں کی غلطی ہو''۔

محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ ''کاتب کی غلطی متعین ہے، درست ''عن ابن کعب بن مالک'' ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے ''تہذیب'' کے حصہ ''الکنی'' میں ابن کعب کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہی مستفاد ہوتا ہے''۔ (ج ۱۲۔ص ۳۰۸، ۳۰۹)

اور ابن کعب اس روایت میں عبدالرحمان ہی ہیں، ان شاء اللہ، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے کہا ہے۔ اس پر شیخ محقق لکھتے ہیں:

''هذا كله صواب ان شاء الله''. یہ سب درست ہے ان شاء اللہ۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۸۱)

(۴) مسند احمد ج ۴۔ص ۳۲۔ح ۲۱۸۱

اس حدیث کی سند میں ایک صاحب ابوکعب مولی ابن عباس ہیں، ان کے متعلق شیخ محقق لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے ''تعجیل المنفعۃ'' میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

''وفيه جهالة. قال ابو زرعة لا يسمى ولا يعرف الا فى هذا الحديث''.

یعنی یہ قدرے مجہول ہیں، ان کا اصل نام روایت میں نہیں آیا ہے، اور سوائے ایک حدیث کے اور کہیں ان کا ذکر بھی نہیں ہے۔ اس پر محدث کبیر نے لکھا کہ ابوکعب کا ترجمہ حافظ حسینی نے ''اکمال'' میں لکھا ہے، لیکن انہوں نے ''جہالۃ'' نہیں لکھا۔

پھر شیخ محقق لکھتے ہیں کہ مسند احمد کے مطبوعہ حلبی نسخہ میں یہ سند اس طرح ہے ''عن ابی بن کعب مولی بن عباس'' اس میں کلمہ ''بن'' کا اضافہ غلط ہے، اور ان کا ترجمہ تو ''تعجیل'' میں لکھا گیا ہے، اس میں ایک اور غلطی ہے۔ اس میں ہے ''ابوکعب عن مولاہ عن ابن عبداللہ بن عباس'' یہ غلط ہے، درست عبارت جیسا کہ ظاہر ہے ''ابوکعب عن مولاہ عبداللہ بن عباس'' ہے۔ یہ حدیث ''مجمع الزوائد'' میں بھی ہے۔ (ج ۵۔ص ۱۶۷) اس میں کہا ہے کہ ''رواه احمد والطبرانى

وفیہ ابو کعب مولی ابن عباس قال ابوحاتم: لایعرف الا فی ھذاالحدیث"۔ اسے احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے، اور اس میں ابوکعب مولی بن عباس ہیں، ابوحاتم نے فرمایا کہ "وہ صرف اسی حدیث میں پائے گئے ہیں"۔

اس پر محدث کبیر نے دو استدراک لکھے، پہلی بات تو یہ لکھی کہ جس سند کو آپ نے درست قرار دیا ہے، اسی طرح "اکمال" میں بھی ہیں، لیکن ابن ابی حاتم نے "کتاب الجرح والتعدیل" میں لکھا ہے کہ ابوکعب، علی بن عبداللہ بن عباس کے مولی ہیں، ان سے اسماعیل بن قیس بن سعد بن زید بن ثابت نے روایت کی ہے، ہم سے عبدالرحمان نے بیان کیا کہ ابوزرعہ سے ان کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "**لایعرف الا فی ھذ االحدیث ولا یسمی**"۔ (۴/۲/۴۳۰، ۴۳۱)

ابن ابی حاتم کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوکعب عبداللہ بن عباس کے مولی نہیں ہیں، ان کے صاحبزادے "علی" کے مولی ہیں۔

دوسرا استدراک یہ کیا کہ "**لایعرف الا فی ھذاالحدیث**" کو صاحب مجمع نے ابوحاتم کا قول قرار دیا ہے، جب کہ وہ درحقیقت امام ابوزرعہ کا قول ہے، جیسا کہ ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے بھی یہی کہا ہے۔ شیخ محقق نے فرمایا کہ:

"اقول: **والذی قال العلامۃ الاعظمی ھو کما قال**". بات وہی ہے جو علامہ اعظمی نے فرمائی ہے۔

(۵) مسند احمد ج ۵۔ ص ۳۱۵۔ ح ۳۸۲۲

حدیث کی سند میں ایک صاحب کریم بن ابی حازم ہیں، ان کے بارے میں شیخ محقق لکھتے ہیں کہ تابعی ہیں، حضرت علی سے انہوں نے روایت کی ہے، ابن حبان نے "ثقات" میں ان کا ذکر کیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے "تعجیل المنفعۃ" میں امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ "**لا یصح حدیثہ**" ان کی حدیث صحیح نہیں ہوتی۔ (ص۔۳۵۳) فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ نقل صحیح نہیں ہے، کیونکہ امام بخاری نے "تاریخ کبیر" ۴/۱/۲۴۴ میں ان کا ذکر کیا ہے، اور وہاں ان پر کوئی جرح نہیں کی ہے، اور نہ ان کا شمار ضعفاء میں کیا ہے، البتہ ایک اور راوی کریم کا ذکر کیا

ہے،ص۳۰،اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ’’**کریم عن الحارث لایصح**‘‘ یہ دوسرے راوی ہیں،جس نے بھی امام بخاری کا قول نقل کیا ہے اس کو اشتباہ ہو گیا ہے۔

اس پر محدث کبیر لکھتے ہیں کہ ’’آپ نے صحیح کہا،واقعی یہ نقل غلط ہے،حافظ ابن حجر سے یہ چوک اس بنا پر ہوئی کہ انہوں نے کریم ابن ابی حازم کا ترجمہ ’’**اکمال للحسینی**‘‘ سے نقل کیا ہے،اور اکمال میں ان کریم کے متصلاً بعد کُریم (بضم الکاف) کا ترجمہ تحریر کیا گیا ہے۔ان کے بارے میں امام بخاری نے فرمایا ہے کہ ’’**انه لایصح حد یثه**‘‘ یہیں حافظ ابن حجر سے سہو ہوا ہے،انہوں نے اس لفظ کو کریم بن ابی حازم کے ترجمہ میں نقل کر دیا،پھر جب کُریم (بضم الکاف) کا موقع آیا تو وہاں بھی امام بخاری کا قول نقل کیا‘‘۔

غلطی کی بنیاد کو پکڑنا بڑی ذہانت وذکاوت کا کام ہے،جو محدث کبیر ہی کا حصہ ہے،شیخ محقق لکھتے ہیں ’’**هذا تحقیق جید**‘‘. یہ عمدہ تحقیق ہے۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۷۶)

(۶) مسند احمد ج ۵۔ص ۳۲۱۔ح ۳۸۴۷

سند میں ایک راوی ابن معیز السعد ی ہیں،ان کے متعلق شیخ محقق نے لکھا ہے کہ ’’میں نے ان کا ترجمہ کہیں نہیں پایا،صرف حافظ ابن حجر نے ’’تعجیل المنفعۃ‘‘ ص ۵۳۵ میں یہ کہا ہے کہ ’’اسمہ عبداللہ‘‘ لیکن اسماء کے باب میں نہ ’’تعجیل‘‘ میں ان ذکر ہے اور نہ ’’تہذیب‘‘ میں۔امام ذہبی نے ’’کتاب المشتبہ‘‘ ص ۴۸۹ میں اتنی بات اور لکھی ہے کہ ’’**وھو تصغیر معز ،عبدالله بن معیز السعدی عن ابن مسعود عنه ابو وائل**‘‘.

اس پر محدث اعظمی لکھتے ہیں کہ ان کا ترجمہ ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں تحریر کیا ہے۔چنانچہ لکھا ہے کہ ’’**ابن معیز السعدی روی عن ابن مسعود وروی عنه ابو وائل سمعت ابی یقول بذ الک**‘‘. ۳۲۸/۲/۴۔اتنا ہی ترجمہ حسینی نے بھی اکمال میں لکھا ہے،دونوں نے ان کو ان رواۃ کے ذیل میں لکھا ہے،جو باپ کی نسبت سے معروف ہیں، لیکن اکمال میں کاتبوں کی غلطی سے ابن معن ہو گیا ہے۔

اور کتاب الجرح والتعدیل کے مصحح نے ذہبی کی تجرید سے نقل کیا ہے کہ ’’**له ادراک**‘‘ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو پایا ہے۔

شیخ محقق فرماتے ہیں کہ ''کل هذا صحیح''. (مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۷۷)

(۷) مسند احمد ج ۵۔ص ۳۲۸۔ح ۳۷۵۷

حدیث کی سند میں ابو الصلت عن عقرب آئے ہیں، شیخ محقق ان دونوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ابو الصلت کا ترجمہ تعجیل میں ہے ص ۴۹۶۔اس میں حافظ ابن حجر نے انہیں ''مجہول'' کہا ہے، امام بخاری نے ''کتاب الکنیٰ'' میں ۳۶۹ پر ان کا ذکر کیا ہے، اور انہوں نے کوئی جرح نہیں کی ہے، اور ابوعقرب اسدی کا ترجمہ تعجیل میں ہے۔(ص ۵۰۶، ۵۰۷) قال الحسینی مجهول.

اس پر محدث اعظمی لکھتے ہیں کہ ''ابو الصلت کا ترجمہ اکمال میں حسینی نے بھی لکھا ہے، انہوں نے ان کے بارے میں ''مجہول'' نہیں کہا ہے، نیز ابن ابی حاتم نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے، اور انہوں نے بھی کوئی جرح نہیں کی ہے''۔

اور ابوعقرب کا ذکر ابن ابی حاتم نے بھی کیا ہے، اور کوئی جرح نہیں ذکر کی ہے، ان سے طلق بن حبیب نے اور ابو الصلت نے روایت کی ہے، اور میرے پاس جو نسخہ اکمال کا ہے اس میں '' انه مجهول' نہیں ہے۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۷۷)

(۸) مسند احمد ج ۶۔ص ۳۲۸۔ح ۴۷۲۸

حدیث کی سند میں ایک راوی ابو دہقانہ آئے ہیں، ان کے بارے میں شیخ محقق نے لکھا ہے کہ امام بخاری ''الکنیٰ'' میں لکھتے ہیں کہ ''ابو دهقانه عن ابن عمر روی عنه فضیل بن غزوان'' امام بخاری کی یہ تحریر ان کے تابعی ہونے کی توثیق ہے، اور امام دولابی نے ''الکنیٰ والاسماء'' ج ۱۔ص ۱۷۰ میں لکھا ہے کہ ''سمعت العباس بن محمد یقول سمعت یحییٰ بن معین یقول: ابو الد هقانه یروی عن ابن عمر وقد روی فضیل بن غزوان عن ابی الدهقانه'' ۔پھر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے ان کا ترجمہ نہیں لکھا ہے، نہ تعجیل میں اور نہ تہذیب میں۔یہ بات قابل استدراک ہے، اور جس قدر میں نے اوپر نقل کیا ہے، اس کے علاوہ کتبِ رجال میں کہیں ان کا تذکرہ نہیں ہے''۔

اس پر محدث اعظمی نے بتایا کہ ابوالدہقانہ کا ترجمہ حسینی نے اکمال میں کیا ہے۔چنانچہ

کہاہے''ابو دهقانه عن ابن عمر فی الصرف وعنه فضیل بن غزوان وسئل عنه ابو ذرعة فقال کوفی لا یعرف اسمه ذکره ابن حبان فی الثقات'' (ص۱۲۷،۱۲۸ من الاکمال)

نیزان کا ترجمہ ابن ابی حاتم نے بھی کتاب الجرح والتعدیل میں کیا ہے(۳۶۸/۲/۴)

''اقول :وھو کما قال''(الشیخ المحقق). بات وہی ہے جوانہوں نے کہی۔

(۹) مسند احمد ج ۷۔ص۸۴۔ح۴۹۹۳

حدیث کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن مقدم ہیں،ان کے متعلق شیخ محقق نے حافظ ابن حجر کا قول نقل کیا ہے کہ ''لیس بمشهور'' ص۲۳۷۔پھر کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ میں نے ان کے متعلق اور کوئی چیز نہیں پائی۔

محدث کبیر لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل ۱۷۵/۲/۲میں ان کا تذکرہ لکھا ہے،فرماتے ہیں ہیں کہ:

''عبد الله بن مقد ام بن الوردالطائفی روی عن عمر بن حبشی روی عنه عبدالملک بن المغیرة الطائفی سمعت ابی یقول ذالک قال ابو محمد وروی عن ابن عمر انه راه طاف بین الصفا والمروة(یشیر الی هذاالحدیث) ولم یذکر فیه جرحاً''.

شیخ محقق لکھتے ہیں کہ ''هذ ا کله صحیح'' پھر اپنا عذر بیان کرتے ہیں کہ ''جب میں اس حدیث پر لکھ رہا تھا اس وقت کتاب الجرح والتعدیل شائع نہیں ہوئی تھی۔چار سال کے بعد اس کا وہ حصہ طبع ہوا،جس میں عبداللہ بن مقدام کا ترجمہ ہے''۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۸۱)

(۱۰) مسند احمد ج ۷۔ص۲۶۹۔ح۵۵۶۵

حدثنا محمد بن جعفر حدثنا شعبه عن توبة العنبری قال:قال لی الشعبی ارأیت حدیث الحسن عن النبیﷺ،قد قاعدت ابن عمر قریباًمن سنتین اوسنة ونصف فلم اسمعه روی عن النبی ﷺ غیر هذا،قال:کان ناس من اصحاب النبیﷺفیهم سعد ،قدهبوا یاکلون من لحم فنادتهم امرأة من

ازواج النبی ﷺ انہ لحم ضب فامسکوا فقال رسول اللہ ﷺ کلوا او اطعموا فانہ حلال و انہ لاباس بہ توبۃ الذی شک فیہ لکنہ لیس من طعامی.

اس میں دو باتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک امام شعبی کا یہ قول کہ " **ارأیت حدیث الحسن عن النبی ﷺ**" یہ بظاہر ایک مبہم سا جملہ ہے، جو قابلِ شرح ہے، مگر شارح محقق نے اس سے تعرض نہیں کیا۔

محدث کبیر لکھتے ہیں کہ شعبی کی مراد یہ ہے کہ حسن بصری تابعی ہیں، ان کی حضور ﷺ سے ملاقات نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بکثرت رسول اکرم ﷺ سے روایات بیان کرتے ہیں، اور ابن عمر حالانکہ صحابی ہیں، لیکن روایت کرنے میں حتی الامکان احتیاط کرتے ہیں، اور کم سے کم روایت بیان کرتے ہیں "**قالہ الکرمانی کما فی الفتح**"۔ (ج۱۹۔ص۱۳۰)

دوسری بات اس میں قابل ذکر یہ ہے کہ امام شعبی تصریح کرتے ہیں کہ میں دو سال کے قریب حضرت ابن عمر کے پاس رہا ہوں، لیکن حیرت ہے کہ ابن ابی حاتم نے مراسیل میں اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ شعبی کی حضرت عبداللہ بن عمر سے سماعت ثابت نہیں ہے۔ (ص۹۵) اور یہی بات تہذیب میں حافظ ابن حجر نے ابن ابی حاتم سے نقل کی ہے، اور انہوں نے کوئی تعقب نہیں کیا۔

اس پر محدث اعظمی لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر مذکورہ بالا روایت سے واقف ہیں، اور انہیں علم ہے کہ صحیحین اور مسند میں یہ روایت موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے فتح الباری میں مذکورہ بالاسند والی روایت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ (اس کے باوجود انہوں نے تعقب نہیں کیا)

محدث اعظمی نے لکھا ہے کہ یہ روایت مسلم شریف ج۲۔ص۱۱۳ مطبوعہ بولاق میں ہے، نیز بخاری نے بھی اس کی تخریج "عن محمد بن الولید عن محمد بن جعفر" کی ہے۔

شیخ محقق نے تو اتنا لکھا تھا کہ "**لم یتعقبھا الحافظ**"، ممکن ہے کہ اس میں یہ احتمال ہوتا کہ حافظ ابن حجر کو اس روایت کی اطلاع نہ ہو، لیکن محدث کبیر نے یہ بتلا کر کہ یہ روایت صحیحین میں بھی ہے، اور فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے مسند احمد کی روایت کی جانب اشارہ کیا ہے، پختہ ثبوت مہیا کر دیا کہ حافظ ابن حجر کو اس حدیث کی اطلاع ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود

خاموش رہے۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۸۵)

(۱۱) مسند احمد ج ۷۔ص ۲۷۰۔ح ۵۵۶۶

اس روایت میں ایک راوی حکیم الحذاء ہیں، ان کے متعلق شیخ محقق نے لکھا ہے کہ یہ ''ابوحنظلہ'' ہیں، جن کا ترجمہ ''تعجیل المنفعۃ''''الکنی للبخاری'' اور''الکنی للدولابی'' میں فقط کنیت کے ساتھ ہے، نام کسی نے نہیں لکھا، البتہ حافظ ابن حجر نے تعجیل میں اتنا اور لکھا ہے کہ یہ معروف ہیں اور انہیں 'الحذاء' کہا جاتا ہے، بمہملہ ثم بمعجمہ۔ نام انہوں نے بھی نہیں لکھا، شیخ محقق فرماتے ہیں کہ ان تمام حضرات سے یہ روایت مخفی رہ گئی، جس میں شعبہ نے ابوحنظلہ کا نام حکیم الحذاء ذکر کیا ہے۔

محدث کبیر فرماتے ہیں کہ حافظ حسینی سے بھی اکمال میں ان کا نام فوت ہوگیا ہے، انہوں نے صرف ابوحنظلہ کا ذکر کیا ہے، نام نہیں لکھا ہے۔ خیر یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے، کہ ابو حنظلہ کے تذکرہ میں ان کا نام نہیں لکھا جاسکا، حیرت تو اس پر ہے کہ حافظ حسینی اور حافظ ابن حجر پر اس حدیث کی سند کیوں کر مخفی رہ گئی، کہ انہوں نے سند کے رجال میں سرے سے حکیم الحذاء کا ذکر ہی نہیں کیا، جب کہ یہ دونوں کتابیں خاص طور سے مسند احمد کے رجال کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۸۵)

(۱۲) مسند احمد ج ۵۔ص ۲۵۷۔ح ۳۶۹۶

حدثنا وكيع حد ثنى بشير بن سلمان عن سيار ابى الحكم عن طارق بن شهاب.

اس سند میں سیار ابوالحکم کے سلسلے میں شیخ محقق نے ایک طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت ابوداؤد نے بھی نقل کی ہے (ج ۲۔ص ۴۲) لیکن اس میں سیار ابوحمزہ ہیں، اور امام منذری نے فرمایا ہے کہ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے، اور''حسن صحیح غریب'' کہا ہے، اور تہذیب میں حافظ ابن حجر نے سیار ابوالحکم اور سیار ابوحمزہ کے متعلق لمبی گفتگو کی ہے۔(دیکھئے ج ۴۔ص ۲۹۱ تا ۲۹۳) اس کا حاصل یہ ہے کہ جس نے سیار ابوالحکم کہا اس سے غلطی ہوئی، صحیح سیار ابوحمزہ ہے۔ پھر دارقطنی کا قول نقل کیا ہے کہ امام بخاری کا یہ ارشاد ہے کہ ''سیار ابوالحکم نے طارق بن شہاب سے حدیث سنی ہے'' ان کا اور ان کے متبعین کا وہم ہے، جو

صاحب طارق بن شہاب سے روایت کرتے ہیں، وہ سیار ابوحمزہ ہیں، یہی قول امام احمد اور یحییٰ وغیرہ کا ہے، حافظ نے ابوداؤداور ترمذی کی حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پھر دوسرے ترجمہ میں نقل کیا ہے کہ خطیب نے ''تلخیص'' میں کہا ہے کہ سفیان نے ''عن بشیرعن سیار ابی حمزۃ عن طارق عن ابن مسعود'' ایک حدیث نقل کی ہے، اس سلسلے سفیان کے تلامذہ میں اختلاف ہوا ہے، عبدالرزاق وغیرہ نے ان سے سیار ابوحمزہ نقل کیا ہے، اور معافی بن عمران نے سفیان عن بشیر سے سیار ابوالحکم نقل کیا ہے، پھر حافظ نے کہا کہ میں نے ابوحمزہ کا ذکر ''ثقات لابن حبان'' میں نہیں پایا۔ فینتظر

شیخ محقق فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر کی یہ پوری بات محض دعوی ہی دعوی ہے، دلیل کوئی نہیں، ابوحمزہ کا کوئی ترجمہ نہیں ملتا، اور ثقہ راویوں نے عن بشیر عن سیار ابی الحکم روایت کیا ہے، ان میں ثقہ ترین وکیع ہیں، جن کی روایت یہاں مذکورہ بالاسطور میں ہے، اور سید النقاد امام بخاری جزماً کہتے ہیں کہ سیار ابوالحکم نے طارق شہاب سے حدیث سماعت کی ہے، تو پھر اس کے بعد کیا چاہئے، بلکہ حافظ ابن حجر نے تو یہ بھی نقل کیا ہے، کہ جن لوگوں نے اس باب میں امام بخاری کا اتباع کیا ہے، ان میں امام مسلم، امام نسائی، امام دولابی، اور ابن حبان وغیرہ ہیں، پھر اس کے بعد عجب بات لکھ گئے ہیں کہ ''وهو وهم كما قال الدار قطني'' بھلا اس وہم کے دعوی پر کوئی دلیل بھی ہے، ہم کو تو نہیں ملی۔

شیخ محقق کا تیور ملاحظہ ہو، کس قدر شدت کے ساتھ ''وهو وهم'' کو رد کررہے ہیں، اور ان کی یہ شدت بجا بھی معلوم ہوتی ہے، ایک طرف امام بخاری جیسے ناقد بصیر ہیں، پھر ان کے ساتھ ایسے ائمہ فن کا ایک گروہ ہے، جن میں ہر ایک بجائے خود سند ہے، یعنی امام مسلم، امام نسائی، امام دولابی، امام ابن حبان۔ بھلا ان اساطین کے بعد کس پر نگاہ جم سکتی ہے، لیکن دوسری طرف بھی امام احمد، یحییٰ بن معین، دارقطنی، اور حافظ ابن حجر جیسی شخصیت ہیں، اب اس معرکہ آرا بحث میں دیکھئے کہ محدث کبیر نے کس تدبر سے اور دھیمے لہجے میں شیخ محقق کے گرم اور کڑے لہجے کو ٹھنڈا اور نرم کیا ہے؟ محدث اعظمی کا یہ کمال ہے کہ وسعتِ معلومات اور وفورِ علم کے باوجود تواضع اور نرمی کا توازن کبھی بگڑنے نہیں پایا۔

محدث کبیر فرماتے ہیں کہ ابوحمزہ کا کوئی ترجمہ نہیں ملتا، تو عرض ہے کہ ان کا ترجمہ امام بخاری کی کتاب ''تاریخ کبیر'' میں ہے۔(ملاحظہ ہو جلد دوم، قسم دوم، ص ۱۶۱) اور ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل میں بھی ان کا ذکر ہے۔(ملاحظہ ہو، ۲/۱/۲۵۵)

اس پر شیخ محقق نے معذرت پیش کی کہ جس وقت اس حدیث کی شرح لکھی جارہی تھی، اس وقت تک مصر میں تاریخ بخاری اور کتاب الجرح والتعدیل کے وہ اجزاء نہیں پہونچے تھے، جن میں ابوحمزہ کا تذکرہ ہے۔

پھر محدث اعظمی نے مزید تحریر فرمایا کہ آپ نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''سید النقاد امام بخاری جزماً فرماتے ہیں کہ سیار ابوالحکم نے طارق بن شہاب سے حدیث سماعت کی ہے''۔اس پر گزارش ہے کہ امام بخاری نے جزماً تو کیا سرے سے اس کی تصریح ہی نہیں کی ہے، ہاں سیار ابوالحکم کا جہاں تذکرہ آیا ہے وہاں ''عن طارق بن شہاب'' کہا ہے، جیسا کہ مسند احمد کی سند میں بھی ہے، لیکن لفظ ''عن'' سے سماعت پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ بغیر سماعت کے ''عن طارق بن شہاب'' کہا گیا ہو۔لہٰذا ان کی یہ بات امام احمد کی اس بات سے کہ سیار ابوالحکم نے طارق بن شہاب سے حدیث نہیں اخذ کی ہے، متعارض نہیں ہے، امام احمد نے سماعت کی نفی کی ہے، اور امام بخاری نے سماعت کا اثبات نہیں کیا ہے، بس دونوں میں کچھ تعارض نہیں۔

غرض دار قطنی نے امام بخاری کی طرف جو قول منسوب کیا ہے، اور اسے وہم قرار دیا ہے، محدث کبیر فرماتے ہیں کہ امام بخاری کی تحریروں میں اس قول کا کہیں پتہ نہیں ہے، ان کی تحریر سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ''سیار ابوالحکم عن طارق بن شہاب'' کہا ہے، اور اہل فن جانتے ہیں کہ اس سے سماعت کا ثبوت نہیں ہوتا۔

اب شیخ محقق اپنا عذر تحریر کرتے ہیں، امام بخاری کے بارے میں یہ قول کہ جزماً انہوں نے سیار ابوالحکم کی سماعت طارق بن شہاب سے ثابت کی ہے، یہ میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا ہے، بلکہ شرح میں ملاحظہ فرمائیں کہ میں نے اسے ''تہذیب'' سے نقل کیا ہے، اور تہذیب میں دار قطنی سے نقل ہوا ہے، میں نے انہیں نقول پر اعتماد کیا۔ بلاشبہ تاریخ کبیر میں سیار ابوالحکم کے ترجمہ میں عن طارق بن شہاب آیا ہے، اور یہ لفظ سماعت پر دلالت نہیں کرتا، پس اس سے دار قطنی

کے نقل کی تردید نہیں ہوتی، یعنی جس طرح طارق سے یقینی طور پر سماعت ثابت نہیں ہوتا، اسی طرح سماع کی یقینی نفی بھی نہیں ہوتی۔ شاید امام بخاری کا قول ان کی کسی اور کتاب میں ہو، مثلاً ''تاریخ اوسط'' میں، جس کا کوئی نسخہ اب تک میرے علم میں نہیں دستیاب ہوا ہے۔

دیکھئے، کہاں تو شیخ محقق نہایت شدومد سے حافظ ابن حجر کے قول کو محض دعوی، دلیل سے خالی باور کرارہے تھے، اور کہاں اب خود معذرت اور احتمال آفرینی کے مقام پر آگئے ہیں، جو کتابیں دستیاب ہیں ان کی روشنی میں تو محدث اعظمی ہی کا قول راجح نظر آتا ہے (ج ۱۵ ص ۴۷۴)

(۱۳) مسند احمد ج ۵۔ص ۲۱۶۱، ۲۶۲۔ح ۳۷۰۴

اس کی سند میں عثمان ثقفی ایک راوی ہیں، ان کے بارے میں شیخ محقق نے تعجیل المنفعۃ لابن حجر ص ۲۸۴ کی یہ عبارت نقل کی ہے ''**عثمان الثقفی عن عبید ة النھدی وعنه المسعودی لعله عثمان بن المغیرة اوابن رشید قلت(القائل ابن حجر) کذا قرأته بخط الحسینی**'' یعنی عثمان ثقفی، عبیدہ النہدی سے روایت کرتے ہیں، اوران سے مسعودی روایت لیتے ہیں، شاید یہ عثمان بن مغیرہ ہیں، یا ابن رشید ہیں، میں کہتا ہوں (یعنی حافظ ابن حجر) یہ بات میں نے حافظ حسینی کے ہاتھ کی تحریر میں پڑھی ہے۔

محدث اعظمی نے اس پر لکھا ہے کہ ''اکمال'' کے مطبوعہ نسخے میں ''اوابن رشید'' نہیں ہے، اس میں صرف ''لعله ابن المغیرة'' ہے۔ شیخ محقق نے اس پر نقد کیا کہ اکمال کا مطبوعہ نسخہ قابل اعتماد نہیں ہے، اس میں اغلاط بہت ہیں، اس سلسلے میں حافظ ابن حجر کی نقل زیادہ لائقِ وثوق ہے، خصوصاً جب کہ انہوں نے تصریح کی ہے ''خود انہوں نے حسینی کے ہاتھ کی تحریر پڑھی ہے''۔ یہاں تک مطبوعہ عبارت ختم ہوئی۔ اس کے بعد محدث کبیر نے ایک مفصل خط شیخ محقق کے نام لکھا، افسوس کہ وہ طبع نہ ہوسکا، خوش قسمتی سے حضرت محدث اعظمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکتوب کاغذوں میں دستیاب ہوگیا۔ تکمیلِ بحث کے لئے ہم اس کے مطالب درج کرتے ہیں، اس مکتوب سے حضرت محدث کبیر کی شانِ تحقیق جیسی کچھ ظاہر ہوتی ہے محتاجِ تشریح نہیں، فرمایا کہ۔

''آپ نے استدراک میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ حافظ ابن حجر نے اکمال کو حسینی کے خط میں پڑھا ہے، لیکن میں نے اکمال کے بارے میں حافظ کی تصریح نہیں پائی، میرے

نزدیک اکمال کوانہوں نے بخط حسینی نہیں پڑھا ہے، حسینی کے ''التذکرہ'' کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''قرأت بخط الحسینی'' اس کی دلیل یہ ہے کہ مثلاً وہ ابراہیم بن الجعد کے ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ ''کذا وجدت بخط الحسینی'' حالانکہ ابراہیم بن الجعد اکمال کے رجال میں سے نہیں ہیں۔ پس وہ ضرور ''تذکرہ'' میں ہوں گے، اور مثلاً وہ ابراہیم بن ابی الخداش کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''کذا قرأت بخط الحسینی واقتصر علی رقم الشافعی'' اور معلوم ہے کہ شافعی کی علامت صرف تذکرہ میں ہے، اکمال میں نہیں ہے۔

یہاں لائق ذکر ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ ''تعجیل المنفعۃ'' کی اصل ''کتاب التذکرہ برجال العشرۃ'' ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ص ۳ پر اس کی تصریح کی ہے، اور اکمال تو تعجیل کی تالیف کے بعد انہیں ملی ہے۔ چنانچہ انہوں نے آخر کتاب ص ۵۹۸ پر اس کی تصریح کی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ تعجیل کے رجالِ مسند کا انہوں نے اکمال سے پورے طور پر مقابلہ نہیں کیا ہے، کہیں کہیں سے مقابلہ کیا ہے، اور بعض بعض جگہوں پر اس سے استفادہ کیا ہے، اسی لئے اکمال کے بعض رجال کا ترجمہ تعجیل میں نہیں ہوا ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مسند کے رجال کے حق میں ''اکمال'' ''تذکرہ'' سے زیادہ جامع اور کامل ہے۔

ہاں یہ بات مجھے تسلیم ہے کہ اکمال جو ہندوستان میں چھپی ہے، اغلاط اور تصحیفات سے پر ہے، لیکن میں نے اپنا نسخہ علامہ سید صدیق حسن خان مرحوم کے نسخہ سے ملالیا ہے، ان کا نسخہ اس وقت دار العلوم ندوۃ العلما کے کتب خانے میں موجود ہے، اور یہ نسخہ لائق اعتماد ہے۔

محدث اعظمی کی تلاش وجستجو اور محنت وعرق ریزی ایک نمونہ ہے طالب علموں کے لئے، علما کے لئے، صرف اتنی سی بات کے لئے کہ حسینی کی تحریر حافظ ابن حجر نے پڑھی ہے، کیسی کیسی تحقیقات فرمائیں۔

(۱۴) مسند احمد ج ۴۔ ص ۱۴۱۔ ح ۲۴۰۶

حدیث میں ایک عورت کا ذکر آیا ہے، جس کے متعلق 'لعلها مغیب فی سبیل الله' کا جملہ آیا ہوا ہے۔ شارح نے ''مغیب فی سبیل اللہ'' کی تشریح نہیں کی۔ محدث کبیر نے فرمایا کہ اگر مغیب کی تشریح کر دیئے ہوتے تو مناسب تھا، مغیب اور مغیبہ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا

شوہر غائب ہو۔

شارح محقق لکھتے ہیں کہ "**هذا صواب منه وتنبيه مفيد**"۔ یہ درست ہے، اور مفید تنبیہ ہے۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۶۳)

مسند احمد ج ۵۔ ص ۱۶۵۔ ح ۳۴۹۰

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی نماز تہجد کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن عباس راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "**ثم جاء الى قربة شجب فيها ماء**". شجب کی تفسیر میں شارح محقق نے فرمایا کہ "بفتح الشین وسکون الجیم" بمعنی "ستون" اور یہ بھی احتمال ہے کہ شجب "بضمتین" ہو، اس کے معنی ہیں "لکڑیوں کی ٹٹی" جس پر کپڑے وغیرہ پھیلائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ ایک مشک کے پاس آئے، جو کھمبے پر لکڑیوں کی ٹٹی پر رکھی ہوئی تھی، اس میں پانی تھا۔

پھر لکھتے ہیں کہ ابن اثیر نے یہ حدیث ان لفظوں میں ذکر کی ہے "**فقام رسول الله** ﷺ **الى شجب فاصطب منه الماء وتوضأ.**" اور شجب "بسکون الجیم" کی تفسیر "پرانی اور بوسیدہ مشک" سے کی ہے۔

حضرت محدث کبیر تحریر فرماتے ہیں کہ ابن اثیر کی اس بات میں کچھ غرابت نہیں ہے۔ چنانچہ ابوعوانہ نے اپنی مسند میں ج ۲۔ ص ۳۱۶ پر "ابن وہب عن مالک عن مخرمہ عن کریب عن ابن عباس" کی سند سے یہ حدیث نقل کی ہے، پھر لکھا ہے کہ "**ورواه عياض بن عبدالله عن مخرمه وقال ثم عمد الى شجب من ماء فتسوك وتوضأ**".

رہا شجب کی تفسیر مشک سے تو قاموس میں ہے کہ "**الشجب يحرك فيه حصى تدغر بذ الك الابل**" ایسی مشک جس میں کنکریاں ڈال کر اونٹ کو ڈرانے کے لئے ہلا کر بجاتے ہیں۔ نیز اس کے معنی "قبیلہ کے باپ" کے ہیں، اور "لمبے" کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہے۔

سقاء ایسی مشک کو کہتے ہیں جس کے نصف کو کاٹ کر باقی کو گھڑے جیسا بنالیتے ہیں۔ (مسند احمد ج ۱۵۔ ص ۲۷۱)

(۱۶) مسند احمد ج ۸۔ ص ۹۰۔ ح ۵۷۴۶

حدیث میں ایک عورت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس منیٰ میں آئی، وہ ریشمی کرتا پہنے ہوئی تھی، اس نے پوچھا کہ آپ ریشم کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے''۔

اس پر شارح محقق لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا عورتوں کو مطلقاً ریشم پہننے کی ممانعت ہے، حالانکہ صحیح احادیث سے عورتوں کے لئے ریشم پہننے کی اباحت وارد ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اس طرح کی روایت بیان کی ہے، یا یہ کہ صرف حالتِ احرام میں عورتوں کو ریشم پہننے کی ممانعت ہے، لیکن اس کی کوئی دلیل نظر سے نہیں گزری۔

اس مسئلے میں محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی بات ''یعنی عورتوں کو مطلقاً ریشم پہننے کی ممانعت'' صحیح ہے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عورتوں کے لئے بھی ریشم کے استعمال کو مکروہ قرار دیتے تھے، حالانکہ وہی رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کے راوی ہیں کہ ''فامره ان یشقها خمراً بین نساء ه'' عورتوں کے درمیان اوڑھنی بنا کر تقسیم کرنے کا حکم آپ نے دیا۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ:

''فبین فی هذه الآثار من قصد الیه بالنهی فی الآثار الاول وانهم الرجال دون النساء ،فقال الآخرون فقد روی عن ابن عمر وعن ابن زبیر انهما جعلا قول النبی ﷺ من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسه فی الآخرة ، علی الرجال والنساء''.

حاصل یہ ہے کہ بعض لوگوں نے ریشم کی ممانعت کی روایات کو صرف مردوں کے حق میں تسلیم کیا ہے، لیکن دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اس قول کو کہ جو دنیا میں ریشم پہنے گا وہ آخرت میں ریشم پہننے سے محروم ہوگا، مردوں اور عورتوں کے حق میں عام رکھا ہے۔

اس کی دلیل میں وہ لوگ یہ روایت پیش کرتے ہیں:

''حدثنا ابوبکرة قال حد ثنا ابوداؤد قال حدثنا هشیم عن ابی بشر عن

یوسف بن ماهک قال سألت امرأة ابن عمر قالت اتحلی بالذ هب قال نعم قالت فما تقول فی الحریر قال یکره ذالک،قالت ما یکره اخبرنی احلال هو ام حرام؟ قال کنا نتحدث ان من لبسه فی الد نیا لم یلبس فی الآخرة".

دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی عورت نے حضرت عبداللہ بن عمر سے ریشم کے پہننے کے بارے میں پوچھا،تو انہوں نے مکروہ قراردیا،اس پر عورت کو اطمینان نہ ہوا،اس نے مزید وضاحت چاہی کہ حلال ہے یا حرام؟ تو فرمایا''ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ جو شخص دنیا میں ریشم پہنے گا،وہ آخرت میں محروم رہے گا''۔

پھر امام طحاوی نے عبداللہ بن زبیر کی روایت بیان کی،اس میں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیا ہے،راوی کہتے ہیں کہ۔

"سمعت ابن الزبیر یخطب،یقول یا ایها الناس!لاتلبسوا نساء کم الحریر فانی سمعت عمر بن الخطاب یقول:سمعت رسول الله ﷺ یقول :من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسه فی الآخرة".

اور یوم ترویہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا ہے،اس میں ہے **"ولا تلبسوا نساء کم وابناء کم"** اپنی عوتوں کو بچوں کو ریشم نہ پہناؤ۔

اس کے بعد امام طحاوی نے حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث نقل کی ہے،اس میں ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کو سونے اور ریشم سے منع فرماتے تھے،کہ اگر تم لوگوں کو جنت کا زیور اور ریشم پسند ہے تو دنیا میں نہ پہنو''۔

اس کے بعد امام طحاوی نے عورتوں کے لئے ریشم کی اباحت کو ترجیح دی ہے۔

محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ عقبہ بن عامر کی حدیث کا منشا یہ ہو کہ دنیاوی زینت میں تقلیل اختیار کی جائے،اگر یہ مطلب ہو تو حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت اور ان کے فتوی کے درمیان تطبیق ہوسکتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ اصلاً ریشم عورتوں کے مباح ہے،لیکن عورتوں کو بھی چاہئے کہ ریشم وغیرہ جو انتہائی ترفہ کی چیز ہیں،ان کا استعمال نہ کریں،کیونکہ ان کا استعمال زہد کے خلاف ہے۔

شارح محقق فرماتے ہیں کہ ''وهو بحث جيد'' لیکن اس میں بھی تتمہ کی ضرورت ہے، جن روایات کو امام طحاوی نے نقل کیا ہے، ان کی تحقیق کر لینی چاہئے، صحت وضعف کے اعتبار سے ان کا درجہ متعین کر لینا چاہئے، پھر اور جو صحیح روایات اس مسئلہ میں وارد ہیں، انہیں بھی جمع کر لینا چاہئے، یہ ایک لمبی بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۸٦)

(۱۷) مسند احمد ج ۵۔ص ۲۰۵۔ح ۳۵۸۵

''حدثنا سفيان قال: ليس منها من يقدمها وقرئ على سفيان سمعت عبدالله يقول سألنا رسول الله ﷺ عن السير بالجنازه فقال متبوعة لا تابعة''.

حاصل یہ ہے کہ سفیان ثوری نے فرمایا کہ جو جنازہ سے آگے چلے وہ شریکِ جنازہ نہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ہم نے جنازہ لے جانے کے متعلق سوال کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنازہ آگے رہے گا پیچھے نہیں۔

اس پر شارح محقق لکھتے ہیں کہ ''**ليس منها من يقدمها**'' یہی لفظ مطبوعہ اور مخطوطہ دونوں نسخوں میں ہے، اور مخطوطہ میں اس کے اوپر کلمہ ''کذا'' لکھا ہوا ہے، لیکن میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ صحیح اس طرح ہے ''**ليس منا من يقدمها**'' یعنی جو جنازہ سے آگے چلے ہم سے اس کا تعلق نہیں ہے، گویا حضرت سفیان کا یہی مسلک ہے۔ چنانچہ اس کی تائید آگے حدیث ۳۷۳۴ سے ہوتی ہے، اس میں ہے کہ ''**الجنازة متبوعة ولاتتبع وليس منا من يقدمها**'' یہ لفظ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں۔ پس ''**ليس منها**'' کے بجائے ''**ليس منا**'' متعین ہے۔

اس پر محدث کبیر فرماتے ہیں کہ ''**ليس منا**'' درست نہیں ہے، صحیح۔ ''**ليس منها**'' یا ''**ليس معها**'' ہے۔(مسند احمد ج ۱۵۔ص ۲۷۲)

پھر حدیث ۳۷۳۴ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''**ليس منها**'' کا لفظ ''ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج ۲۔ص ۱۳۷'' میں ہے، اور ترمذی مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی ج ۱۔ص ۱۲۰ میں بھی ہے، نیز ابن ماجہ کے ایک نسخے میں بھی یہی لفظ ہے، اور ''تلخیص'' میں بھی بجز نسائی کے تینوں سنن کی طرف منسوب کر کے یہی لفظ نقل کیا ہے، ص ۱۵۷۔ یا یہ کہ لفظ ''**معها**'' درست ہے۔ چنانچہ ''**معها**'' لفظ ابوداؤد مطبوعہ اصح المطابع ج ۲۔ص ۳۹ اور ابن ماجہ کے ایک نسخہ ص ۱۰۸ میں ہے،

نیز''درایہ نصب الرایۃ'' اور''مشکوۃ'' میں بھی لفظ''**معھا**'' ہے، اوران میں بھی نسائی کے علاوہ باقی تینوں کتابوں کا حوالہ ہے (ص۔۱۳۹) اور''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں''ابن فضیل عن یحییٰ'' اور''سنن بیہقی'' میں''زہیر والحسن بن صالح عن یحییٰ'' کے طریق سے یہی لفظ ہے، اور ''کنز العمال'' میں ایک جگہ''**معھا**'' ہے، اور ایک جگہ''**منھا**''۔ جہاں''**منھا**'' ہے وہاں ''مسند احمد'' کا رمز تحریر ہے۔ یہ حدیث امام ترمذی نے''شعبہ عن یحییٰ'' اور ابوداؤد نے''ابوعوانہ عن یحییٰ'' اور ابن ماجہ''عبدالواحد عن یحییٰ'' کے طریق سے تخریج کی ہے۔

اللہ اکبر! ایک لفظ کی تصحیح کے لئے حوالوں کے ڈھیر لگ گئے، یہ ہے وسعتِ مطالعہ، استحضارِ ذہن، اور بسطۃً فی العلم کا نمونہ، جبھی تو شیخ محقق نے بنظرِ استحسان لکھا''**ھذا کلہ جید وصحیح**''، یہ سب عمدہ اور صحیح ہے۔

ماخذ۔ المآثر (اپریل، مئی، جون، ۱۹۹۳)

☆☆☆☆☆☆

استدراکاتِ علمیہ

شرح مسند احمد مرتبہ محدث مصر احمد محمد شاکر علیہ الرحمہ پر حضرت محدث اعظمی کے گراں قدر استدراکات دو قسطوں میں شائع ہو چکے ہیں، پہلی قسط مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس کے خصوصی نمبر میں شائع ہوئی ہے، اور دوسری قسط المآثر کے چوتھے شمارہ میں، اب اس کے آخری قسط پیش خدمت ہے، پہلی دونوں قسطوں میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، شرح مسند احمد کی پندرہویں جلد میں شیخ محقق شائع کر چکے ہیں، لیکن یہ آخری قسط غیر مطبوعہ ہے، استدراکات کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ شیخ محقق احمد محمد شاکر جوار رحمت میں پہونچ گئے، یہ استدراکات حضرت محدث اعظمی کے قلمی مسودات میں موجود ہیں، انہیں سے استفادہ کر کے اس مضمون کو مرتب کیا گیا ہے۔

مسند احمد ج ۲۔ص ۲۸۰۔ح ۱۱۸۷

قال: كنت عند عَلِيّ فدخل عليه مسعود فقال له يا فروج انت القائل لا ياتى على الناس مأة وعلى الارض عين تطرف اخطت استک الحضرة، انما قال رسول الله ﷺ لاياتى على الناس مأة سنة وعلى الارض عين تطرف ممن هو اليوم الحى وانما رخاء هذا وفرجها بعد المأة.

محدث کبیر نے اس حدیث کے متعلق ارشاد فرمایا کہ "**اخطت استک الحضرة**" صحیح نہیں ہے "**اخطأت استک الحضرة**" صحیح ہے۔ چنانچہ یہ لفظ "کنز العمال" میں اسی طرح آیا ہے، اور اس میں مسند احمد کا حوالہ دیا ہے، اسی طرح "مجمع الزوائد" میں بھی ہے۔

مسند احمد ج ۲۔ص ۱۹۸۔ح ۹۵۹

طویل حدیث ہے، اس میں ایک جملہ آیا ہے ''ولاتلتقط لقطتها الا لمن اشار بها''.

محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک درست ''اشاد'' بالدال المہملہ '' ہے، ابن اثیر نے فرمایا کہ ''یقال اشادة واشاد به اذا اشاعه ورفع ذكره'' یعنی ''کسی چیز کا اعلان کرنا، اس کی تشہیر کرنا''۔

مسند احمد ج ۲۔ص ۲۳۶۔ح ۱۰۶۴

ان قوماً باليمين حضروا ن بية لاسد فوقع فيها فكاب الناس عليه.

محدث کبیر نے فرمایا کہ شیخ نے '' فکاب'' کو باقی رکھا، حالانکہ صحیح '' فتكاب الناس'' ہے، چنانچہ مطبوعہ نسخہ میں '' فتكاب'' ہی ہے۔

شیخ گجراتی نے فرمایا کہ ''فتكابوا عليها اى ازدحموا عليها وهى تفاعلوا من الكبة بالضم وهى جماعة من الناس وغيره''۔(مجمع البحار ج ۳۔ص ۱۸۸)

مسند احمد ج ۴۔ص ۱۸۰۔ح ۹۱۹

حدیث کی سند میں ایک صاحب الحسن بن عقبہ ابو کبران ہیں، ان کے متعلق شیخ محقق لکھتے ہیں کہ ان کا ترجمہ امام بخاری نے تاریخ کبیر ۲۹۲/۲/۱ میں ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں۔

''الحسن بن عقبة ابو كبران المرادى سمع الضحاك بن مزاحم سمع منه عبيدالله بن موسى وابو نعيم''.

اور امام دولابی نے ان کا تذکرہ ''الکنی'' ۹۰/۲ میں کیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

''سمعت العباس بن محمد قال سمعت يحيىٰ بن معين يقول: ابو كبران اسمه الحسن ابن عقبه المرادى وهو ثقة''.

اور ابن سعد نے ''طبقات'' میں ۲۵۰/۶ میں بغیر ترجمہ کے محض نام ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اور کہیں میں نے ان کا ترجمہ نہیں پایا، اور نہ کہیں ان کا ذکر دیکھا، حتی حافظ نے بھی ''تعجیل المنفعۃ'' میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

اس پر محدث اعظمی لکھتے ہیں کہ:

حافظ حسینی نے ''اکمال'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''**الحسن بن عقبہ ابو کبران المرادی الکوفی روی عن شعبی والضحاک بن المزاحم وعن عبد خیر عن علی فی الوضو وعنہ وکیع وعبداللہ بن موسی وابو نعیم وقال ابن معین ثقة وقال ابو حاتم یکتب حدیثہ**''.

اس استدراک سے معلوم ہوا کہ جن جگہوں کا حوالہ شیخ محقق نے دیا تھا، ان کے علاوہ بھی ابو کبران کا تذکرہ موجود ہے، اور یہ تذکرہ جسے محدث کبیر نے نقل کیا ہے، قدرے مفصل ہے۔ چنانچہ ''تاریخ بخاری'' کے اوپر ابو کبران کے اساتذہ میں شعبی اور عبد خیر کا اضافہ ہے، اور تلامذہ میں وکیع زائد ہیں، مزید اس میں ابو حاتم کے قول کا بھی اضافہ ہے۔

مسند احمد ج ۲۔ ص ۳۰۹۔ ح ۱۲۵۹

''**قال عبداللہ بن احمد حدثنا یحییٰ بن عبدویہ ابو محمد مولی بنی ہاشم**''.

یحییٰ کے متعلق شیخ محقق نے لکھا کہ ''**لم یترجم لہ الحافظ فی التعجیل**''. اس پر محدث اعظمی نے لکھا کہ حافظ نے ان کا ترجمہ ''تعجیل'' میں لکھا ہے، لیکن باپ کا نام بجائے عبدویہ کے عبداللہ لکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''**یحییٰ بن عبداللہ ویقال ابن عبدویہ البغدادی ابو محمد مولی بنی ہاشم عن شعبہ وحماد بن سلمة وزبیر وغیرہم وھاہ ابن معین فقال لیس بشئی وقال ابن غدی ارجوا انہ لا باس بہ واحادیثہ عن شعبہ وحماد بن سلمة لیست محفوظة وقد کتب عنہ عبداللہ بن احمد عن ابیہ (کذا) وماقل مالہ من الروایات، قلت (القائل ابن حجر) کذا وقع فی الحسینی ابن عبد ربہ بالراء بعدھا موحدة وزاد فیھا تارةً ھاء وتارةً حذفھا وھو غلط والصواب عبدویہ بوزن راھویہ وکذا ھو فی میزان الذھبی**''. (ص۔۴۴۳)

شیخ محقق یحییٰ کو ابن عبدویہ کی نسبت سے تلاش کر رہے تھے، نہ پا سکے، لیکن محدث کبیر

کی دقیقہ رس نگاہ اور سراپا استحضار حافظہ نے انہیں یحییٰ بن عبداللہ کے نام سے ڈھونڈ ھ نکالا۔

مسند احمد ج ۴۔ص ۳۲۲۔ ح ۲۹۰۰

اس حدیث کے راوی" **عبدالرحمان بن وعله عن ابن عباس**"ہیں، شیخ محقق فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو حافظ ابوعمر بن عبدالبر نے" **القصد والامم بمعرفة انساب العرب والعجم**" میں "عن علقمہ بن وعلۃ عن ابن عباس" نقل کیا ہے، نیز انہوں نے اپنی تاریخ میں بھی انہیں سے تخریج کی ہے (۱۹۵/۲) اور مجمع الزوائد ۹۴/۷ میں بھی یہی راوی ہیں، اور اس میں حوالہ "طبرانی" اور "مسند احمد" کا ہے۔

پھر شیخ محقق لکھتے ہیں کہ علقمۃ بن وعلۃ کا نہ میں نے کہیں تذکرہ پڑھا، اور نہ اس جگہ کے علاوہ ان کا کہیں ذکر دیکھا، اور میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہیں؟ شاید عبدالرحمان بن وعلۃ کے بھائی ہوں۔

محدث کبیر نے لکھا کہ علقمۃ بن وعلۃ کا ذکر ابن یونس نے اپنی تاریخ میں کیا ہے، چنانچہ امام سمعانی کی "کتاب الانساب" میں نقل کیا ہے، اور واقعی یہ عبدالرحمان بن وعلہ کے بھائی ہیں، ابن اثیر نے ان کا ذکر "لباب" میں کیا ہے۔

مسند احمد ج ۷۔ص ۱۷۱،۲۷۲۔ ح ۵۵۵۹

"**حدثنا محمد بن جعفر حدثنا شعبه ،سمعت ابا جعفر يعني المؤذن يحدث عن مسلم ابی المثنی يحدث عن ابن عمر قال: انما كان الاذان على عهد رسول اللهﷺمرتين ،قال حجاج يعني مرتين مرتين،والاقامة مرة**".الخ

اس روایت کو امام حاکم نے مستدرک میں تین طرق سے روایت کیا ہے، اول "عبداللہ بن حیزان" کے طریق سے۔ دوسرے "عبدان" کے طریق سے۔ تیسرے "عبداللہ بن احمد عن ابیہ" کے طریق سے۔ یہی مسند کی روایت ہے، اور ان تینوں نے "ابوجعفر مدائنی عن مسلم ابی المثنی القاری عن ابن عمر" سے۔ پھر امام حاکم نے فرمایا کہ یہ روایت صحیح الاسناد ہے، کیونکہ یہ ابوجعفر، عمیر بن یزید بن حبیب الخطمی ہیں، جنہوں نے سعید بن المسیب اور عمارۃ بن خزیمۃ بن ثابت سے روایت کی ہے، اور ان سے سفیان ثوری، شعبہ اور حماد بن سلمۃ وغیرہ ائمہ نے روایت لی ہے، امام

ذہبی نے بھی اس سلسلے میں حاکم کی موافقت کی ہے۔

شیخ محقق فرماتے ہیں کہ ''ان دونوں بزرگوں سے عجیب غلطی ہوئی ہے کہ ابوجعفر کو مدائنی کہا اور پھر بتایا کہ وہ عمیر بن یزید بن حبیب الخطمی ہیں، حالانکہ عمیر بن یزید مدائنی نہیں 'مدنی' ہیں، ان کی بھی کنیت ابوجعفر ہے، لیکن وہ اس حدیث کے راوی نہیں ہیں، اور میں نہیں جانتا کہ حاکم کی روایت میں مدائنی کا لفظ کس نے بڑھا دیا؟ کیونکہ اس کا طریق تو یہاں مسند میں موجود ہے، اس میں یہ لفظ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد والی حدیث میں اس کے بالکل برخلاف'' **سمعت اباجعفر مؤذن العربان مسجد بنی ھلال**'' کا لفظ ہے، یہ صاحب یقیناً ابوجعفر عمیر بن یزید الخطمی مدنی کے علاوہ ہیں''۔

اس پر محدث کبیر لکھتے ہیں کہ ''مدنی اور مدائنی الگ الگ ہیں، اول کی نسبت مدینہ کی طرف ہے، اور دوسرے کی مدائن کی طرف، اور دونوں کے درمیان مسافت بعیدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ حاکم کی روایت میں لفظ ''المؤذن'' میں تصحیف ہوئی ہے، یہ لفظ سماعت کے ذرا سے فرق سے غالباً المدینی ہوگیا ہوگا، امام حاکم کو اس پر تنبہ نہیں ہوا، اس تصحیف کی بنا پر انہوں نے انہیں عمیر بن یزید گمان کرلیا، بعد میں کاتبوں نے اسے تصرف کرکے المدائنی بنا دیا۔

مسند احمد ج ۷۔ص ۲۰۹۔ح ۵۳۹۵

''حدثنا شریح بن نعمان حدثنا ھشیم اخبرنا یونس بن عبید عن نافع عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ مطل الغنی ظلم واذا احلت علی ملئی فاتبعه ولا بیعتین فی واحد''.

شیخ محقق نے اس حدیث پر ایک طویل بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث کا ابتدائی حصہ '' **فاتبعه**'' تک ابن ماجہ نے بطریق ''ہشیم عن یونس بن عبید عن نافع'' روایت کیا ہے، اس پر ابن ماجہ کے شارح علامہ سندی نے حافظ بوصیری کی زوائد سے نقل کیا ہے کہ یونس بن عبید کی نافع سے سماعت ثابت نہیں ہے، اس لئے سند میں انقطاع ہے۔ چنانچہ امام احمد حنبل فرماتے ہیں کہ ''انہوں نے نافع سے کچھ نہیں سنا ہے، البتہ ان کے بیٹے سے سنا ہے''۔ یہی بات ابوحاتم اور ابن معین سے بھی منقول ہے کہ ''انہوں نے نافع سے کچھ نہیں سنا ہے''۔ امام بوصیری

فرماتے ہیں کہ ''ہشیم بن بشیر مدلس ہیں''اوران کی یہ روایت معنعن ہے۔

شیخ محقق فرماتے ہیں کہ ''لیکن اس نفی سماعت پر دلیل کیا ہے؟ جب کہ وہ نافع کے ہم عصر ہیں، بلکہ طبقہ کے اعتبار سے ان کے قریب ہیں،اور وہ مدلس بھی نہیں ہیں،اور ثقہ معاصر کی روایت متصل سمجھی جاتی ہے، جب تک اس کے خلاف دلیل نہ ملے۔رہا حافظ بوصیری کا یہ شبہہ کہ ہشیم مدلس ہیں،اورانہوں نے ابن ماجہ میں عن یونس بن عبید پایا ہے،لیکن یہاں مسند میں ''عن'' کے بجائے ''اخبرنا'' ہے، جو سماع پر دلالت کرتا ہے،اس لئے اس روایت میں تدلیس کا بھی شبہہ نہیں ہے،علاوہ ازیں ان کی تدلیس بھی محل نظر ہے''۔حاصل یہ ہے کہ یونس بن عبید کا سماع نافع سے شیخ محقق کے نزدیک راجح ہے،اب محدث کبیر کا اس پر نہایت دقیق استدراک ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ:

''یہاں یونس بن عبید کے نافع سے سماع اور عدم سماع کے باب میں ایک تیسرا مسلک بھی ہے،اور یہ مسلک امام طحاوی نے ''شرح مشکل الآثار'' میں ذکر کیا ہے۔وہ یہ کہ انہوں نے نافع سے بعض احادیث ضرور سنی ہیں،لہٰذا ان پر مطلق عدم سماع کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے،انہیں روایات میں سے جن کو انہوں نے نافع سے سنا ہے،رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ ''**اذا احلت علی ملئی فاتبع**''، لیکن ''**مطل الغنی ظلم**'' کا جملہ ان سے نہیں سنا ہے۔اس کو امام طحاوی نے یحییٰ بن معین سے بالتصریح نقل کیا ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ابن معین کا کلام ''عدم سماع'' کا علی الاطلاق نقل کر دیا ہے،ان سے چوک ہوگئی ہے،مشکل الآثار کی عبارت ملاحظہ ہو:

''انا وجدنا یحییٰ بن معین قد تکلم فی حدیث ابن عمر هذا اوذکر ان یونس بن عبید لم یسمعه من نافع کما حدثنا ابن ابی دائود قال:قال لی یحییٰ بن معین فی حدیث یونس بن عبید لم یسمعه عن نافع عن ابن عم مطل الغنی ظلم قال قد سمعته من هشیم ولم یسمعه یونس من نافع ،قال ابن ابی داؤد فلقت لیحییٰ لم یسمع یونس بن نافع شیئاً قال بلی ولکن هذا لحدیث خاصة لم یسمعه یونس من نافع ،قال ابوجعفر:فتأملنا ماقاله یحییٰ من ذالک فوجدناه

جوابا لماسأله ابن ابی داؤد عنه من مطل الغنی ظلم فاجابه یحییٰ عنه بما اجابه،ثم وجدنا فی حدیث المعلی(ابن منصور الذی ساقه باسناده فی اول هذه الصحیفة وهو النهایة فی الباب)عن هشیم فی هذاالحدیث قال اخبرنا یونس بن عبید قال حدثنا نافع عن ابن عمر کما قد ذکرناه عن ابی امیة فی ذالک،فقلنا بذالک ان الذی اراده یحییٰ مما نفی سماع یونس ایاه من نافع هو مطل الغنی ظلم لامافیه من سوی ذالک من اذا احلت علی ملئی فاتبع". (ج۴۔ص۹)

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ یحیٰی بن معین نے حضرت ابن عمر کی اس حدیث پر کلام کیا ہے،انہوں نے کہا ہے کہ اس حدیث کو یونس بن عبید نے نافع سے نہیں سنا ہے۔چنانچہ ہم سے ابن داوٗد نے بتایا کہ مجھ سے یحیٰی بن معین نے یونس بن عبید کی روایت کے سلسلے میں فرمایا کہ انہوں نے نافع سے "**مطل الغنی ظلم**"نہیں سنا ہے،ابن داوٗد نے کہا کہ میں نے یحیٰی سے پوچھا کہ کیا یونس نے نافع سے کچھ سنا ہے؟ فرمایا کہ کیوں نہیں،لیکن خاص یہ روایت نہیں سنی ہے، امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ہم نے یحیٰی کے کلام پر غور کیا،تو ہم نے دیکھا کہ ابن داوٗد نے ان سے "**مطل الغنی ظلم**" کے بارے میں سوال کیا تھا،اورانہوں نے اس کے بارے میں مذکورہ جواب دیا، پھر معلیٰ (بن منصور) کی حدیث (جس کوامام طحاوی نے اس صفحہ کے شروع میں نقل کیا ہے،اور یہی اس باب کی آخری حدیث ہے) میں جو ہشیم سے مروی ہے، یہ ہم نے دیکھا کہ وہ "**اخبرنا یونس بن عبیدہ قال حدثنا نافع عن ابن عمر**" فرماتے ہیں،اوراس میں وہی الفاظ ذکر کئے جن کو ہم ابی امیۃ کی روایت میں نقل کر چکے ہیں،تو ہم نے کہا کہ یحیٰی بن یونس کے حضرت نافع سے سماع کی جونفی کی ہے،وہ صرف "**مطل الغنی ظلم**" سے متعلق ہے،اس کے سوااس میں جودوسرا جملہ "**اذااحلت علی ملئی فاتبع**"ہے،وہ اس سے مراد نہیں۔

ظاہر ہے معلیٰ کی روایت میں "حدثنا نافع" کی تصریح ہے،جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نافع سے یونس بن عبید کے سماع کی مطلق نفی درست نہیں ہے۔یہ ہے محدث اعظمی کی وسعتِ نظر اوردقتِ مطالعہ۔

مسند احمد ج ۷۔ص ۲۲۶۔ح ۵۴۵۲

اس روایت کی سند میں ایک راوی علی بن نعمان بن قراد ہیں،ان کے بارے میں شیخ محقق لکھتے ہیں کہ ''ان کا ترجمہ ان کتبِ رجال میں نہیں ہے،جن تک ہماری دسترس ہے،تعجیل المنفعۃ میں نعمان کے ذکر میں ضمناً ان کا تذکرہ آیا ہے، چنانچہ اس میں ہے۔

''نعمان بن قراد عن ابن عمر وعن رجل عنه وعنه زياد بن خيثمه قال ابن ابی حاتم ويقال علی بن نعمان بن قراد وذكره ابن حبان فی الثقات.

تعجیل میں اس ترجمہ پر مسند کا رمز تحریر کیا ہے، یہ عجیب کوتاہی ہے، کیونکہ مسند میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے،جس میں نعمان بن قراد ہوں۔پس ضروری تھا کہ ان کا ترجمہ اصالۃً کرتے،اورنعمان کی روایت کی جانب اشارہ کردیتے، کیونکہ تعجیل میں مسند کے رواۃ کا ترجمہ لکھا گیا ہے۔اورمزید غلطی یہ کہ علی بن نعمان کا ''باب العین''میں سرے سے تذکرہ ہی نہیں ہے، نعمان بن قراد کا حوالہ ہوتا،مگر وہ بھی نہیں ہے''۔

اس پر محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر پر آپ کی یہ گرفت بہت عمدہ ہے، درحقیقت انہوں نے حافظ حسینی کی تقلید کی ہے، جتنا کچھ انہوں نے اکمال میں لکھ دیا اس کو نقل کردیا، یہ اوراس جیسی بعض چیزیں دلالت کرتی ہیں کہ حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ میں تدقیق سے کام نہیں لیا ہے۔

مسند احمد ج۱۱۔ص۱۴۔ح ۶۴۲۷

''عن عمر بن شعيب عن ابيه عن جده عن النبیﷺ انه قال:من حمل علينا السلاح فليس منا ولا رصد بطريق''.

رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو ہم پر ہتھیار اٹھائے ،اس کا تعلق ہم سے نہیں،اور نہ وہ شخص جس نے راستے پر گھات لگائی۔

اس کے بارے میں شیخ محقق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت سے بجز مسند کے اور کہیں نہیں ہے،مجمع الزوائد میں بھی نہیں ہے،اورا حادیث کے مراجع میں کسی میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے۔

اس پر محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے دونوں جملوں کے ساتھ 'کنزالعمال'

ج ۷۔ص ۲۸۸ میں موجود ہے،اوراس میں ابن نجار کا حوالہ دیا گیا ہے،اورروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہی کی ہے،البتہ اس میں'' **ولا رصد بطریق**'' کے بجائے'' **ولا راصد بطریق** '' ہے۔اور میرے نزدیک یہی درست ہے،اگر چہ معنی ان الفاظ کا بھی صحیح ہوسکتا ہے جو مسند میں ہے وہ یہ کہ''**لیس منا من حمل علینا السلاح ولا من رصد مسلماًبطریق لیقتله بغرة**''.

بات یہ ہے کہ اصل متن میں ''**من حمل علیناالسلاح فلیس منا**'' کےاوپر ''**ولا رصد بطریق**'' کا عطف ذرامناسب نہیں ہے،اس کی تصحیح اس تاویل ہوسکتی ہے جوحضرت محدث کبیر نے کی ہے۔

مسنداحمدج ۴۔ص ۱۲۹۔ح ۱۴۰۲

حدیث میں ایک جملہ ہے''**ارأیتم ان وردت بکم ریاضا معشبة وحیاضا رواءً تتبعونی**''.

شارح محقق فرماتے ہیں کہ''**رواءً بضم الراء والمد**''.**المنظر الحسن**،یعنی خوبصورت ہے،اس تحقیق کی بناپر جملہ کا ترجمہ یہ ہوگا۔

بتاؤ،اگر میں تمہیں شاداب باغ اورخوبصورت حوضوں پر لے جاؤں،تو تم میرے پیچھے آؤ گے۔

محدث کبیر نے فرمایا کہ میرے نزدیک''**رواءً بفتح الراء**'' ہے''نہایہ''میں ہے کہ ''بالفتح والمد'' کثیر پانی،اوربعض لوگوں نے''شیریں پانی'' کہاہے،جو پیاسوں کوسیراب کردے اس بناپر'' **حیاضا رواءً**''کاترجمہ''پانی سے لبریز حوض یاشیریں حوض ہوگا''۔

ناظرین غورکرلیں،کہ حوض کے لحاظ سے کون ساترجمہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مسنداحمدج ۴۔ص ۱۱۷۔ح ۲۳۷۶

''**عن ابن عباس قال:اقبلت وقد ناهزت الحلم اسیر علی اتان و رسول اللهﷺقائم یصلی بالناس ،یعنی حتی صرت بین یدی بعض الصف الاول ثم نزلت عنها فرتعت فصففت مع الناس وراء رسول اللهﷺ**''.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک گدھی پر سوار ہوکر آیا، اور میں قریب البلوغ تھا، اور رسول اللہ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھارہے تھے، میں پہلی صف کے کچھ آگے چلا گیا، پھر میں گدھی سے اترا، وہ چرنے لگی اور میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صف میں کھڑا ہوگیا۔

محدث کبیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بخاری نے بھی صحیح بخاری میں نقل کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۴۔ ص ۵۰)

اس میں مزید وضاحت ہے، فرماتے ہیں کہ ''**ورسول الله ﷺ يصلى بمنى حتى سرت بين يدى بعض الصف الاول**''۔ یعنی منی میں نماز پڑھارہے تھے۔

شیخ محقق کا عموماً دستور ہے کہ جو روایت دوسری کتابوں بالخصوص صحیحین میں ہوتی ہے، اس کا تذکرہ ضرور کردیتے ہیں۔ یہ روایت حالانکہ صحیح بخاری میں ہے، لیکن اس کا حوالہ انہوں نے نہیں دیا، غالباً اسی لئے محدث کبیر نے استدراک تحریر فرمایا۔

مسند احمد ج ٦۔ص ۱۸، ۱۹۔ ح ۳۹۳۸

''**عن الاودی عن ابن مسعود ان رسول الله ﷺ قال: حرم على النار كل هين لين سهل قريب من الناس**''.

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہنم ہر اس شخص پر حرام ہے، جو متواضع، نرم، سہل اور لوگوں سے قریب ہو۔

اس روایت کے بارے میں شیخ محقق لکھتے ہیں کہ یہ روایت ''جامع صغیر'' میں بھی ہے، اور اس میں حوالہ صرف مسند احمد کا دیا ہے، لیکن اس کے شارح علامہ عبدالرؤف مناوی نے لکھا ہے کہ حافظ عراقی نے فرمایا کہ ''ورواه الترمذی لكن بدون لفظ لين'' اور ''ترغیب و ترہیب'' میں بھی ایک حدیث اسی معنی میں ہے (۲۶۳/۳) اور اس میں بھی حوالہ ترمذی ہی کا ہے، اور ابن حبان کا بھی، لیکن میں نے باوجود تلاش کے یہ حدیث ترمذی میں نہیں پائی۔

اس پر محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مجھے ترمذی میں بعینہ اسی طریق سے ملی، جس طریق سے مسند میں ہے، یعنی ''موسی بن عقبی عن الاودی''۔ (دیکھئے ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج ۴۔ص ۳۱۴)

مسند احمد ج ۷۔ص ۲۴۹۔ح ۵۵۲۴

’’حدثنا روح حدثنا ابن جريج اخبرنی ابو الزبير انه سمع عبدالرحمان بن ايمن يسأل ابن عمر و ابو الزبير يسمع فقال كيف ترى فی رجل طلق امرأته حائضاً فقال: ان ابن عمر طلق امرأته علی عهد رسول اللهﷺ فقال عمر، ان عبدالله طلق امرأته وهی حائض فقال النبیﷺ ليراجعها علی ولم يرها شيئا وقال فردوها اذا طهرت فليطلق ان يمسک‘‘.

اس متن کے متعلق شارح محقق لکھتے ہیں کہ ’’اس میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے، اس کی توجیہ میں بہت تکلف ہے، اور میرے خیال میں عبارت کی یہ بے ربطی مسند احمد کے قدیم نسخوں میں ہوئی ہے، جو ہم تک نہیں پہونچے ہیں، کیونکہ یہی عبارت مسند کے اس تین نسخوں میں ہے جو میرے پاس ہیں، اور دار الکتب المصریہ میں بھی ایک نسخہ ہے، اس میں بھی اسی طرح ہے، میرا گمان ہے کہ پرانے علما اور کاتبین جنہوں نے مسند کی روایت وکتابت کی ہے، انہوں نے اس عبارت کو اسی حالت پر رہنے دیا کہ روایت جن الفاظ میں ان کے پاس پہونچی ہے، وہی الفاظ باقی رہیں۔ انہوں نے اس بات پر اعتماد کیا کہ قاری محدث اس کی درست عبارت بداہۃً سمجھ لے گا، شیخ فرماتے ہیں کہ صحیح متن اس طرح ہوگا‘‘۔

’’فقال النبیﷺ ليراجعها فردوها علی ولم يرها شيئا وقال اذا طهرت فليطلق او يمسک‘‘.

حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے رسول اللہﷺ کے زمانے میں اپنی بیوی کو بحالتِ حیض طلاق دی، حضرت عمر نے رسول اللہﷺ کی خدمت میں یہ بات عرض کی، تو آپ نے فرمایا، اسے رجعت کر لینی چاہئے، پس بیوی کو آپ نے لوٹا دیا، اور اس کو کچھ نہیں سمجھا، اور فرمایا کہ جب پاک ہوجائے تو چاہے طلاق دے یا روک رکھے۔

محدث کبیر فرماتے ہیں کہ ’’آپ نے متن کی جو تصحیح کی ہے وہ درست ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں یہ روایت ’’عبدالرزاق عن ابن جریج عن ابی الزبیر‘‘ وارد ہے، اور اس میں ہے ’’قال عبدالله فردها علی ولم يرها شيئا‘‘ مگر اس میں لفظ ’’ليراجعها‘‘ نہیں ہے‘‘۔ (سنن ابی

داؤد کتاب الطلاق)

شارح محقق کی تصحیح ابوداؤد سے مدلل ہوگئی ،حضرت محدث کبیر کی وسعتِ نگاہ اور استحضار نے ظن وتخمین کو یقین سے بدل دیا۔

مسند احمد ج ۷۔ص ۲۹۔ح ۳۸۳۴

’’حدثنا معاذ حدثنا ابن عون عن مسلم مولی لعبد القیس قال معاذ کان شعبة یقول القری قال:قال رجل لابن عمر أرأیت الوتر اسنة هو؟قال: ماسنة؟اوتر رسول اللهﷺواوتر المسلمون قال:لا اسنة هو؟قال مه،اتعقل؟اوتر رسول اللهﷺ واوتر المسلمون‘‘.

ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وتر کے بارے میں فرمایئے کہ کیا وہ سنت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سنت کیا ہے؟ رسول اللہﷺ نے وتر پڑھی ہے،اور مسلمانوں نے بھی وتر پڑھی ہے،اس نے کہا نہیں ، یہ بتایئے کہ کیا وہ سنت ہے؟ آپ نے فرمایا چپ رہو، کچھ سمجھتے بھی ہو؟ رسول اللہﷺ نے وتر پڑھی ہے،اور مسلمانوں نے وتر پڑھی ہے۔

اس حدیث کے بارے میں شیخ محقق فرماتے ہیں کہ ’’اس کو امام مالک نے مؤطا ۱/۱۴۶ میں اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے،مگر موصولاً نہیں ، بلکہ اس طرح کہ ’’**مالک: بلغه ان رجلاً سأل عبدالله بن عمر عن الوتر**‘‘ (اس طرح کی روایات کو اصطلاح میں ’’بلاغاتِ مالک‘‘ کہتے ہیں۔ پھر بعد کے شارحین ومحدثین جب ایسی روایتوں کی سند کو موصولاً پاتے ہیں تو بیان کر دیتے ہیں) شیخ فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے حفاظِ حدیث نے موصولاً اس بلاغ کو نہیں پایا۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے ’’التقصی‘‘ میں یہ روایت ذکر کی ہے،مگر اس کے موصول ہونے کے متعلق کچھ نہیں کہا، یہی حال امام سیوطی کا ’’شرح مؤطا‘‘ میں رہا،اور امام زرقانی بھی اس سلسلے میں ’’شرح مؤطا‘‘ میں خاموش ہیں،اب یہ مسند میں موصولاً مل گئی ہے۔ فالحمدللہ البتہ حافظ مروزی نے ’’کتاب الوتر‘‘ میں اس کو تعلیقاً مسلم القری کے حوالے سے لکھا ہے،جیسا کہ یہاں مسند میں ہے،یعنی مسلم القری تک سند نہیں بیان کی‘‘۔(کتاب الوتر مع قیام اللیل ص ۱۱۴)

اس پر محدث کبیر لکھتے ہیں کہ تعلیقاً کسی روایت کا ذکر کرنا حافظ مروزی کا دستور نہیں ہے، انہوں نے ''قیام اللیل'' اور ''کتاب الوتر'' میں جتنی روایات درج کی ہیں، سب موصولاً درج کی ہیں۔ یہ طریقہ علامہ مقریزی کا ہے، جنہوں نے دونوں کتابوں کی تلخیص لکھی ہے، انہوں نے مرفوعات کو تو موصولاً لکھا ہے، اور موقوفات کو تعلیقاً یعنی بحذف الاسانید لکھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی تصریح شروع کتاب میں ص۲ پر کردی ہے، اور دونوں کتابوں کا مجموعہ جو ہندوستان میں طبع ہوا ہے، وہ ''مختصر المقریزی'' ہے، اصل کتاب نہیں ہے۔

اس استدراک سے محدث کبیر کی دقتِ مطالعہ کا پتہ لگتا ہے۔

مسند احمد ج ۷۔ص ۱۶۳۔ح ۵۲۶۴

''**عن ابن عمر يقول ان رفعكم ايديكم بدعة،مازاد رسول اللهﷺعلى هذا يعني الى الصدر**''.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ تمہارا اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھانا بدعت ہے، رسول اللہ ﷺ نے سینے سے اوپر نہیں اٹھایا۔

اس پر شیخ محقق لکھتے ہیں کہ ''یہ لفظ میں نے مراجع میں کہیں نہیں پایا، شاید ان حضرات نے حضرت عبداللہ بن عمر کی اس روایت پر اکتفا کیا ہے۔''**رفع يديه حتى يحاذى منكبيه**'' اور **رفع يديه حذو منكبيه** اور شاید اسی بنا پر امام ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس کو ذکر نہیں کیا''۔

محدث کبیر اس پر لکھتے ہیں کہ ''امام ہیثمی نے اس لفظ کو'' ج ۱۰۔ص ۱۶۸ پر **باب ماجاء في الاشارة في الدعا**'' میں رفع یدین کی حدیث کے تحت ذکر کیا ہے، ان کے اس طرز سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں ہاتھ اٹھانے سے دعا میں ہاتھ اٹھانا مراد ہے، تکبیر تحریمہ کے وقت اٹھانا مراد نہیں۔ یہی میرے نزدیک راجح اور متبادر ہے، کیونکہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانا تو کندھوں تک خود حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں، پھر کیسے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سینے سے اوپر ہاتھ اٹھایا ہی نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ شارح محقق نے مذکورہ بالا روایت میں ہاتھوں کے اٹھانے کو تکبیر تحریمہ کے وقت پر محمول کیا ہے، اسی لئے وہ ''مجمع الزوائد'' میں تکبیر تحریمہ کے مواقع پر تلاش کرتے رہے،

اورنہیں پاسکے، توانہوں نے ان حدیثوں کا حوالہ دیا جن میں تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانا منقول ہے، لیکن اگر اس روایت اور شیخ محقق کی ذکر کردہ روایات کو ہم معنی مان لیا جائے، تو تضاد لازم آئے گا، کیونکہ مسند کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سینے سے اوپر ہاتھ اٹھانے کو بدعت قرار دیا ہے، جب کہ بعد کی روایات میں کندھوں تک ہاتھ اٹھانا صراحۃً منقول ہے۔ پس ضروری ہے کہ متن کی روایت کو عندالدعاء پر محمول کیا جائے، جیسا کہ ہیثمی نے ذکر کیا ہے، اور بعد کی دونوں روایتوں کو عندالتحریمہ پر، تا کہ تعارض نہ رہے۔

مسند احمد ج ۷۔ ص ۳۵۔ ح ۴۸۵۳

’’عن الحسن بن هاوية قال: لقيت ابن عمر (قال اسحاق) فقال لی ممن انت؟ قلت من اهل عمان، قال: من اهل عمان؟، قلت نعم، قال: افلا احدثک ما سمعت من رسول الله ﷺ يقول انی لأعلم ارضاً يقال لها عمان ينضح بحابنها وقال اسحاق بناحيتها البحر الحجة منها افضل من حجتين من غيرها‘‘.

حسن بن ہادیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے ملاقات کی، انہوں نے پوچھا کہ تم کہاں کے ہو؟ میں نے عمان کا، فرمایا کہ عمان کے؟ میں نے کہا ہاں، تو فرمایا کہ کیا میں وہ بات نہ تم سے بیان کردوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے، آپ فرماتے تھے کہ میں ایک ملک کو جانتا ہوں، جس کو عمان کہا جاتا ہے، اس کے برابر میں سمندر بہتا ہے، وہاں سے حج کرنا دوسری جگہوں سے دو حج کرنے کے برابر ہے۔

اس روایت کے بارے میں شیخ محقق فرماتے ہیں کہ یہ ’’روایت زوائد میں سے ہے، کیونکہ حسن بن ہادیہ کی کوئی روایت صحاح ستہ میں نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود صاحبِ مجمع الزوائد نے اس کو ذکر نہیں کیا‘‘۔

محدث کبیر فرماتے ہیں کہ ’’صاحب مجمع الزوائد نے اسے ’’**باب من احرم قبل الميقات**‘‘، میں ذکر کیا ہے۔ (ج ۳۔ ص ۲۱۷)

مسند احمد ج ۷۔ ص ۱۱۹۔ ح ۵۱۱۰

’’عن عائشه وعن ابن عمر ان النبی ﷺ زار ليلاً‘‘.

شارح محقق فرماتے ہیں کہ " زار لیلاً "، کا مطلب صاف سمجھ میں نہیں آیا، مسند احمد میں حضرت عائشہ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ منی سے رات میں مکہ تشریف لائے۔ ح ۲۶۱۱ اور ح ۲۶۱۲ بھی انہیں دونوں اصحاب سے ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر کے طواف کو رات تک مؤخر کیا، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ " زار لیلاً"، کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے طوافِ زیارت رات میں کیا، اس سے قریب تر معنی یہ ہے کہ آپ بقیع میں رات کے وقت تشریف لے گئے، جیسا کہ صحیح مسلم ج ا۔ص ۲۶۶ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ جس معنی کو شیخ محقق نے قریب تر فرمایا ہے وہ بعید تر ہے، کیونکہ مطلق زیارت کا اطلاق کسی حدیث میں زیارتِ قبور پر نہیں ہوا ہے، قریب تر وہی معنی ہے جس کی انہوں نے نفی کی ہے، یعنی طوافِ زیارت۔ مطلق زیارۃ کا لفظ جب آتا ہے، تو یہی معنی مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے باب قائم کیا ہے "باب الزيارة يوم النحر" اور اس میں ابوالزبیر کی وہ حدیث تعلیقاً لائے ہیں، جو مسند ۲۶۱۱ میں ہے، اور بخاری کا لفظ ہے "اخر النبی ﷺ الزيارة الى الليل" (بخاری مع فتح الباری ج ۳۔ص ۳۶۸) اور علامہ ہیثمی نے حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس کی وہ روایت جو مسند میں ہے، بایں لفظ نقل کی ہے "ان النبی ﷺ زار البيت ليلاً". (ج ۳۔ص ۲۶۵)

ماخذ۔ المآثر (جولائی، اگست، ستمبر۔۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆☆☆

ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق
حضرات محدثین کی اصطلاحات

یہ مضمون شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ کے ایک مقالے کی روشنی میں لکھا گیا ہے جو انہوں نے حضرت ملاعلی قاری علیہ الرحمہ کی کتاب ''المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع'' پر تعلیقات کے لئے بطور مقدمہ کے تحریر فرمایا ہے۔

علمِ حدیث ایک مکمل اور منضبط فن ہے، جس کے دائرے میں اس فن کی تمام شاخیں آجاتی ہیں، ان شاخوں میں اہم ترین شاخ ''رجالِ حدیث'' اور ''متنِ حدیث'' کی معرفت ہے، اسی کی بنیاد پر حدیث کے صحت وضعف اور ثبوت ووضع کا حکم لگتا ہے، پھر اس حکم کے لگانے لئے الفاظ واصطلاحات کا ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آیا۔ محدثین نے اپنی صواب دید کے مطابق احادیث کا درجہ متعین کرنے کے لئے خاص خاص اصطلاحات متعین کیں، ان کے معانی کی تشریح فرمائی، تاکہ جس حدیث کے بارے میں جو اصطلاح بولی جائے اس کا وہی مطلب سمجھا جائے، جو بولنے والے نے مراد لیا ہے، مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، منکر، شاذ، وغیرہ کے خاص خاص معانی ہیں۔ ناواقف آدمی ''حسن'' لکھا ہوا دیکھے گا تو نہ جانے کیا مطلب سمجھے گا۔ حدیث کی ایک اصطلاح ''غریب'' ہے، ایک جاہل آدمی جو الٹے سیدھے مطالعہ کے بل پر مصنف بن گیا، اپنی بعض تحریرات میں از راہِ تمسخر غریب کے مقابلہ میں امیر کا لفظ استعمال کرتا ہے، حالانکہ یہ اس کا محض جہل ہے۔ پس ان اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے، تاکہ حضرات محدثین کی باتوں کے سمجھنے میں غلطی نہ ہو۔

یہاں ہم کو تمام اصطلاحات کی تشریح نہیں کرنی ہے، کیونکہ اصولِ حدیث کی کتابوں میں ان اصطلاحات کی مکمل شرح کردی گئی ہے، اور فن کو حاصل کرنے کے لئے ان کا ضابطہ پڑھنا ضروری ہے۔ اس مضمون میں صرف ان اصطلاحات کی شرح اور تعیین کرنی منظور ہے جو حضرات محدثین ' ضعیف' اور ' موضوع' احادیث کو بتانے کے لئے تحریر فرماتے ہیں، ضعیف اور موضوع احادیث کی تعیین کے لئے حضرات علماءِ حدیث نے بڑی جدوجہد کی ہے، اور اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ان کتابوں میں چند الفاظ بار بار ملتے ہیں یہاں ہم ان کا ذکر کرتے ہیں

(۱) لااصل لہ:

آپ موضوعات کی کتابوں میں بکثرت پڑھیں گے کہ **''ھذا الحدیث لااصل لہ''** اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے، **''لااصل لہ بھذا اللفظ''** اس لفظ کے ساتھ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں، یا **''لیس لہ اصل''**، یا **''لایعرف لہ اصل''**، یا **''لم یوجد لہ اصل''** وغیرہ۔

ان سارے الفاظ کا مطلب:

(الف) کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ حدیثِ مذکور کی کوئی سند منقول نہیں ہے، بغیر سند کے یہ افواہی روایت ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے ''تدریب الراوی'' میں ''النوع الثانی والعشرون'' کے آخر میں امام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ **''معناہ لیس لہ اسناد''** اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

ظاہر ہے جب حدیث کی سند ہی ندارد ہوگی تو اہل علم حضرات کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ اس کی طرف سرے سے التفات کرنا ہی درست نہ ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی جانب کسی بات کی نسبت کرنے کے لئے سندِ صحیح کا ہونا ضروری ہے۔

اس کی مثال میں وہ روایت پیش کی جاسکتی ہے جس میں ذکر ہے کہ 'ہرنی نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا' یہ حدیث گو کہ بہت مشہور ہے، واعظین اسے اپنے وعظوں میں بیان کرتے ہیں، نعت گویوں نے اسے نظم بھی کیا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ اس کی سرے سے سند ہی موجود نہیں ہے۔

حضرت ملاعلی قاری علیہ الرحمہ اپنی کتاب **''المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع''** میں لکھتے ہیں کہ **''حدیث تسلیم الغزالۃ اشتھر علی الالسنۃ وفی**

المدائح النبويه قال ابن کثیر ولیس له اصل ومن نسبه الی النبی فقد کذب"

(حدیث ۹۱) ہرنی کے سلام کرنے کی حدیث زبان زد ہے، اور نعتوں میں اس کا ذکر ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اور جس نے اس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کی ہے وہ جھوٹ بولا ہے۔

(ب) اور کبھی یہ لفظ یعنی "لا اصل لہ" ایسی حدیث کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے، جس کی سند موجود ہوتی، ایسی صورت میں اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف یا صحابی کی طرف یا تابعی کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کی سند میں کوئی جھوٹا اور حدیث گھڑنے والا راوی موجود ہوتا ہے، یا کوئی ایسا صریح قرینہ ہوتا ہے یا واضح دلالت ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث موضوع اور مکذوب ہے۔ اس صورت حال میں "لا اصل لہ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس حدیث کی کوئی سند نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ حدیث ہی غلط اور من گھڑت ہے۔

اس کی مثال ملاحظہ ہو، حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے "تہذیب التہذیب" میں ہشام بن عمار دمشقی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ **"قال ابو دائود: حدثنا هشام باربع مأة حديث مسندة ليس لها اصل"** امام ابوداؤد نے فرمایا کہ ہشام نے چار سو ایسی حدیثیں سند کے ساتھ نقل کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس کلام میں "لا اصل لہ" کا مطلب یہی ہے کہ وہ حدیثیں بالکل غلط ہیں۔

اسی طرح حافظ ذہبی نے "میزان الاعتدال" میں نعیم بن حماد کے ذکر میں لکھا ہے، الفاظ یہ ہیں:

"نعيم عن عيسىٰ بن يونس عن حريز بن عثمان عن عبد الرحمان بن جبير بن نفير عن ابيه عن عوف بن مالک مرفوعاً، ای مسنداً الی قول رسول الله ﷺ: تفترق امتی علی بضع وسبعين فرقة اعظمها فتنة علی امتی: قول يقيسون الامور برايهم فيحلون الحرام ويحرمون الحلال".

یہ حدیث نعیم نے سندِ متصل کے ساتھ ذکر کی ہے، لیکن امام ذہبی لکھتے ہیں، محمد بن علی

بن حمزہ مروزی نے مشہور ناقدِ حدیث حضرت یحییٰ بن معین سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا، توانہوں نے فرمایا کہ ''لیس لہ اصل''، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ نعیم کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ فرمایا کہ وہ ثقہ ہیں، انہوں نے عرض کیا ثقہ شخص غلط روایت کیونکر بیان کرتا ہے؟ فرمایا کہ کبھی اشتباہ ہوجاتا ہے۔

حافظ ذہبی امام ابوداؤد کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ ''**کان عند نعیم بن حماد نحو عشرین حدیثاً عن النبی ﷺ لیس له اصل**''، نعیم بن حماد کے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب تقریباً بیس حدیثیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اس طرح کی متعدد احادیث کتب موضوعات میں ملتی ہیں، جن میں بصراحت سندیں مذکور ہیں، لیکن ان پر حکم لگتا ہے ''**هذاالحديث باطل لااصل له**'' یا ''**موضوع لااصل له**'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سندیں بالکل بے اعتبار اور ناقابلِ التفات ہیں۔

(ج) کبھی حضرات محدثین یوں لکھتے ہیں کہ ''**هذا الحديث لااصل له فی الكتاب ولا فی السنة الصحيحة ولا الضعيفه**'' اس لفظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حدیث مذکور کا مضمون قرآن وسنت کی صراحتوں کے خلاف اور ان سے بعید ہے، اس کے معنی ومطلب کی تائید کسی بھی نص شرعی سے نہیں ہوتی۔

(د) اور کبھی اس نفی کا تعلق صرف کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہوتا ہے، ضعیفہ سے نہیں، ایسے موقع پر ان کے الفاظ یہ ہوتے ہیں ''**هذاالحديث لااصل له فی الكتاب ولا فی السنة الصحيحة**'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث مذکور کا مضمون نہ کتاب اللہ میں ہے، نہ سنت صحیحہ میں ہے۔ رہا یہ کہ حدیث ضعیف میں ہے یا نہیں؟ تو اس سے اس لفظ میں کوئی تعرض نہیں ہے۔

(۲) لااعرفہ:

کبھی حضرات محدثین وناقدین کسی حدیث کے بارے میں ''لااعرفہ'' (میں نہیں جانتا) یا اس کے ہم معنی الفاظ کا اطلاق کرتے ہیں، مثلاً ''**لم اعرفه**'' یا ''**لم اقف عليه**'' یا ''**لا اعرف له اصلاً**'' یا ''**لم اقف له علی اصل**'' یا ''**لا اعرفه بهذ االلفظ**'' یا ''**لم اره بهذا اللفظ**'' یا ''**لم اجده**'' یا ''**لم اجده هٰكذا**'' یا ''**لم يرد فيه شئی**'' یا ''**لايعلم من اخرجه و**

لااسناد"، وغیرہ۔

اس طرح کی عبارتیں اگر کسی معروف حافظِ حدیث نے لکھی ہیں، اور کسی نے اس کی تردید نہیں کی ہے، تو اس حدیث پر موضوع ہونے کا حکم متعین ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے "تدریب الراوی" میں "النوع الثانی والعشرون" کے اواخر میں لکھا ہے کہ "**قال الحافظ المطلع الناقد فی حدیث: "لااعرفه" اعتمد ذالک فی نفیه**" حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ اگر کوئی ایسا حافظ حدیث جو وسیع الاطلاع بھی ہو اور حدیث کی پرکھ بھی رکھتا ہو، کسی روایت کے بارے میں "لااعرفہ" کہتا ہے، تو اس پر اعتماد کر کے اس حدیث کی نفی کی جا سکتی ہے۔

اس کی وجہ علامہ سیوطی نے یہ بیان کرتے ہیں کہ جب سب حدیثیں مدون ہو چکی ہیں، اور حدیث کے مجموعوں اور ذخیروں میں ہر حدیث کو تلاش کر کے نکالا جا سکتا ہے، تو یہ بات بہت بعید ہے کہ کوئی ماہر حدیث ان میں موجود احادیث سے چوک جائے۔ اس لئے جب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں اس حدیث کو نہیں جانتا، تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث ان ذخائر میں موجود نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ماہر حدیث جس کی تلاش و تحقیق پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کیسا ہو؟ ہمارے دور میں بہت معمولی علم رکھنے والے بھی لمبے چوڑے دعوے کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس سلسلہ میں حافظ علائی لکھتے ہیں کہ اس تحقیق و تلاش کے سلسلے میں ایسے حافظ حدیث کا قول معتبر ہوگا جس نے تمام احادیث کو یا اس کے بہت بڑے حصے کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رکھا ہو۔ اس سلسلے میں معیار امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی، یحیٰ بن معین ہیں، پھر ان کے بعد والوں میں امام بخاری، امام ابوحاتم، ابوزرعہ رازی، پھر امام نسائی، پھر امام دارقطنی وغیرہ ہیں، کیوں کہ جس بنیاد پر عموماً حدیث کے موضوع ہونے کا فتوی دیا جاتا ہے، وہ حدیث کے تمام طرق اور اسانید کا احاطہ اور دور دراز علاقوں میں جو احادیث روایت کی جاتی ہیں، ان سے واقفیتِ تامہ ہے، اس سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ کون سی روایت معتبر راویوں کے ذریعے ہم تک پہونچی ہے، اور کون سی روایت بغیر راوی کے ہے، یا غیر معتبر راوی سے ہے۔

اور جو محدث اس مرتبہ تک نہ پہونچا ہو، وہ اگر کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث نہیں پائی، تو

اس کے اس کہہ دینے سے حدیث کوموضوع نہیں قرار دیا جاسکتا ہے،خواہ وہ کتنے ہی بڑے الفاظ میں اس کا دعوی کرتا ہو۔(المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع ص ۲۶ مقالہ شیخ ابوغدہ)

ایک مثال اس کی بھی ملاحظہ ہو۔اللہ مغفرت فرمائے مرحوم شیخ ناصر الدین البانی کی! اس میں شبہ نہیں کہ ان کی نظر علم حدیث میں بہت وسیع تھی،لیکن اتنی نہیں کہ وہ بڑے بڑے حفاظ حدیث کی صف میں جگہ پاسکیں،لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کواس طرح لکھتے ہیں جیسے وہ اکابر محدثین سے بھی دوقدم آگے ہوں۔

مشکوۃ شریف ''باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ'' کی دوسری فصل میں صاحبِ مشکوۃ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے،جس کے الفاظ یہ ہیں''**اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شذ فی النار،رواه.....**''

صاحب مشکوۃ کا یہ دستور ہے کہ ہر حدیث کا وہ حوالہ پیش کرتے ہیں،لیکن یہاں وہ ''**رواہ**'' لکھ کر خاموش ہوگئے ہیں،اللہ جانے لکھتے وقت حوالہ انہیں مستحضر نہ تھا،تحقیق کے بعد لکھنے کا ارادہ کیا ہو،اور پھر نہ لکھ سکے ہوں،یا کیا بات ہے؟ بعد میں کسی محدث نے اس جگہ لکھ دیا ہے،''**رواه ابن ماجه من حديث انس**''۔

اس پر شیخ البانی لکھتے ہیں کہ:

> ''**ويظهر من المؤلف تعمد تركه لانه لم يجد من اخرجه كما اشار اليه فی مقدمة الكتاب وكذالک لم اجده فی شئی من كتب السنة المعروفة حتى الا مالی والفوائد والاجزاء اللتی مررت عليها وهی تبلغ المئات ولا اورده السيوطی فی الجامع الكبير**''۔(مشکوۃ شریف ج۱۔ص۶۲)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے حوالہ کو بالقصد ترک کردیا ہے،کیوں کہ ان کو یہ حدیث کسی مصنف کے یہاں نہیں ملی،جیسا کہ انہوں نے کتاب کے مقدمہ میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے،اسی طرح میں نے بھی حدیث کی معروف ومتداول کتابوں میں اسے نہیں پایا حتی کہ ''امالی'' میں،''فوائد'' میں،اور''اجزاء'' میں بھی مجھے یہ حدیث نہیں ملی،سیکڑوں کی تعداد میں مَیں نے کتب اور اجزاء دیکھے،مگر کوئی سراغ نہیں ملا،علامہ سیوطی نے''جامع کبیر'' میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ملاحظہ ہو،شیخ البانی خودکوصاحبِ مشکوۃ کی صف میں کھڑا کرکے بلکہ ان سے آگے رکھ کر دعوی کردیا کہ سینکڑوں تحریرات پڑھنے کے بعدبھی اس حدیث کا سراغ نہیں ملا،اس سے تأ ثر ہوتا ہے کہ جب اس درجہ وسیع الاطلاع محدث کوسینکڑوں ہزاروں صفحات کی چھان بین کے بعد بھی یہ حدیث نہیں ملی تو غالبًا موضوع ہی ہوگی،لیکن حقیقتِ حال وہ نہیں جس کا شیخ البانی نے دعوی کیاہے۔ یہ حدیث امام حاکم کی مشہور کتاب ''المستدرک''میں سند کےساتھ موجود ہے۔(دیکھئے مستدرک ج۱۔ص۱۱۵،ملاحظہ ہوکنزالعمال ج۱۔ص۱۸۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ البانی [نے] حدیثوں کی فہرست کا مطالعہ کیا،جس میں حدیث کے پہلےلفظ کا حوالہ ہوتا ہے،انہوں نے ابتداء میں ''اتبعوا''کوتلاش کیا ہوگا،وہ نہیں ملا، کیوں کہ حاکم کی حدیث میں پہلا لفظ ''اتبعوا''نہیں، بلکہ یوں ہے۔

''لایجمع الله هذه الامة علی الضلالة ابداً وقال:یدالله علی الجماعة فاتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شذ فی النار''.

صاحبِ مشکوۃ نے حدیث کومختصراًنقل کیا ہے،شیخ البانی مرحوم نے اسے پوری حدیث سمجھ کر ''اتبعوا''کوتلاش کیااورنہیں پایا۔(واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ ہروہ شخص جوصاحبِ علم کہلاتا ہو،یا جومحدث ہونے کا دعوی رکھتا ہو،یاعام لوگ اسے محدث سمجھتے ہوں،اس کی بات کا اعتبار نہیں،ہاں متأخرین میں حافظ ضیاء مقدسی،علامہ ابن صلاح،شیخ صغانی،علامہ منذری،امام نووی،شیخ ابن دقیق العید، علامہ دمیاطی،حافظ ابن تیمیہ،علامہ جمال الدین المزی،امام ذہبی،شیخ سبکی،علامہ زیلعی،حافظ ابن کثیر،حافظ ابن رجب،شیخ ابن الملقن،علامہ عراقی،علامہ ہیثمی،حافظ ابن حجر،علامہ عینی،علامہ ابن ہمام،امام سخاوی،امام سیوطی،امام زرقانی،اورشیخ ابن ہمات دمشقی وغیرہ اس مرتبہ ومقام کے محدث ہیں کہ اگر وہ کسی حدیث کےمتعلق ''لااعرفہ''یا''لااصل لہ''کہیں،تو اس کوموضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۳)لایصح ولایثبت:

بسااوقات ناقدین حدیث کسی روایت کےمتعلق لکھتے ہیں کہ ''لایصح''یا'لایثبت'

یا"لم یصح" یا"لم یثبت" یا"لیس بصحیح" یا"لیس بثابت" یا"غیر ثابت" یا"لا یثبت فیه شئی" وغیرہ۔

یہ الفاظ جب ضعفاء اور موضوعات کی کتابوں میں آئیں،تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث مذکور موضوع ہے،اس میں صحیح ہونے کا کوئی مرتبہ موجود نہیں ہے،اور یہی الفاظ جب احکام کی حدیثوں کی کتاب میں آئیں تو اس مطلب یہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں جس حدیث کو صحیح کہا جاتا ہے،وہ نہیں ہے،پھر خواہ حسن ہو یا ضعیف ہو،یہاں اس کی اصطلاحی صحت کی نفی مذکور ہے۔

علامہ زاہد الکوثری علیہ الرحمہ نے 'انتقاد المغنی عن الحفظ والکتاب' کے مقدمہ میں لکھا ہے

"تنبیہ:یقول المسند الا وحد ابن همات الدمشقی فی التنکیت والافادة فی تخریج احادیث خاتمة سفر السعادة:اعلم ان البخاری وکل من صنف فی الاحکام یرید بقوله"لم یصح"الصحة الاصطلاحیة ،ومن صنف فی الموضوعات والضعفاء یرید بقوله"لم یصح"او"لم یثبت"المعنی الاعم ولایلزم من الاول نفی الحسن اوالضعیف ویلزم من الثانی البطلان". (ص۱۱)

امام ابن ہمات دمشقی نے لکھا ہے کہ امام بخاری اور وہ علما جنہوں نے احکام کے متعلق کتابیں لکھی ہیں،وہ اپنے قول ''لم یصح'' سے اصطلاحی صحت کی نفی مراد لیتے ہیں،اور جن حضرات نے موضوعات اور ضعفاء کے سلسلے میں کتابیں لکھی ہیں،وہ اپنے قول ''لم یصح'' یا ''لم یثبت'' سے عام لغوی معنی مراد لیتے ہیں،پہلی صورت میں حسن اور ضعیف کی نفی لازم نہیں آتی، اور دوسری صورت میں حدیث کا بطلان لازم آتا ہے۔

بہت سے علما نے ''لم یصح'' وغیرہ الفاظ کے سلسلے میں اس فرق کو نظر انداز کر دیا ہے، اس سے بسا اوقات بات کے صحیح سمجھنے میں غلطی بھی ہوتی ہے،اور اشکالات بھی پیش آتے ہیں۔

علامہ بدر الدین زرکشی نے ''النکت علی مقدمۃ ابن صلاح'' میں لکھا ہے اور ان سے علامہ سیوطی نے "اللآلی المصنوعة'' میں،اور مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے "الرفع و التکمیل'' میں نقل کیا ہے کہ:

بین قولنا"موضوع"وبین قولنا"لایصح"بون کبیر:فان الاول اثبات

الكذب والاختلاق والثانی اخبار عن عدم الثبوت ولايلزم منه اثبات العدم و هذا يجی فی كل حديث قال فيه ابن الجوزی (لايصح) ونحوه" (الرفع والتكميل ص۔۱۳۸)

ہمارے قول ''موضوع''اور ہمارے قول''لایصح''کے درمیان بڑا فرق ہے، پہلے لفظ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ حدیث غلط اور من گھڑت ہے،اور دوسرا لفظ عدم ثبوت کی خبر ہے،اس سے اس حدیث کا غلط ہونا نہیں لازم آتا،اور یہ فرق اس حدیث میں ملحوظ رکھنا چاہئے جس کے بارے میں علامہ ابن جوزی نے''لایصح''وغیرہ کہا ہے۔

عام طور سے علامہ زرکشی کے اس قول سے لوگوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ محدث جب بھی ''لایصح'' کہے گا،تو اس سے صحتِ اصطلاحی ہی کی نفی منظور ہوگی۔وہ حدیث علی الاطلاق غلط اور موضوع ہو،ایسا ضروری نہیں،لیکن یہ قول اپنے عموم کے ساتھ صحیح نہیں ہے، ہمیشہ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ''لایصح'' کا لفظ کس طرح کی کتابوں میں آیا ہے،اگر وہ احادیث احکام کی کتابوں میں ہے،تب تو بیشک اس سے صحتِ اصطلاحی کی نفی ہوگی،اور اگر وہ ضعفاء اور موضوعات کی کتابوں میں ہے تو اس میں صحتِ اصطلاحی سے تعرض نہیں ہوتا۔

علامہ ابن جوزی کی کتاب موضوعات کے متعلق ہے،لہٰذا اس میں''لایصح'' کا مطلب وہ نہیں ہوگا، جو مذکورہ عبارت میں بیان کیا گیا ہے۔

ماخذ:المآثر۔فروری،مارچ،اپریل۔(۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆☆

کتابت حدیث کے اصول وقواعد

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد امت کے ہاتھوں میں دو چیزیں سونپیں، جن کی روشنی میں یہ امت ہمیشہ اسی راہ پر چلتی رہ سکتی ہے، جسے خدا کے اس آخری پیغامبر نے استوار کیا تھا۔ اول قرآن، دوسرے سنت۔ یہی دونوں وہ مشعلیں ہیں جن کی روشنی میں ہدایت کی راہ ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔ چونکہ مذہبِ اسلام رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں میں اپنی آخری شکل میں تکمیل کو پہونچ چکا ہے، اب اس میں کسی نسخ وترمیم کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے ضروری تھا کہ رہتی دنیا تک روشنی کے ان دونوں مشعلوں کی حفاظت بھی ہوتی رہے، امت کی ذمہ داری ہے کہ حفاظت کے جوممکن طریقے ہوں، ان دونوں کے لئے اختیار کرے۔ چنانچہ اسی فریضہ کے احساس سے اہل اسلام نے قرآن وسنت کی حفاظت کا ایسا حیرت انگیز اہتمام کیا کہ اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ قرآن کریم کے تحفظ وبقا کے لئے تو من جانب اللہ خصوصی انتظام ہوا، اولاً کہ یہ اس کا حرفاً حرفاً یاد کرنا سہل کردیا گیا، دوسرے یہ کہ اس کی تلاوت وتکرار کا بطور خاص حکم دیا گیا، اور اس پر ثواب کے زبردست وعدے کئے گئے، نیز دنیاوی برکات کو اس سے متعلق قرار دیا گیا، پھر ابتداء ہی سے سینوں کے ساتھ سفینوں اور کتابوں میں اس کی محفوظیت کا اہتمام کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کا لفظ لفظ ٹھیک اسی طرح محفوظ ہے، جیسے وہ رسول اللہ ﷺ کے قلبِ اطہر پر اترا تھا۔

سنت کا ماخذ جناب نبی کریم ﷺ کے اقوال وفرمودات اور آپ کی سیرتِ مطہرہ ہے، مسلمانوں نے ان کی حفاظت میں بھی جان کی بازی لگادی، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے وہ اصول وقواعد نہ تھے، جو تحفظِ قرآن کے لئے تھے۔ ابتداء میں حدیثیں زیادہ تر زبانی یاد کی جاتی تھیں، کچھ کچھ لکھی بھی جاتیں تھیں، مگر لکھنے کا اہتمام نہ تھا، عربوں کا حافظہ نوادرات میں سے ہے،

وہ پوری پوری بات لفظ بلفظ یاد رکھتے تھے، تاہم حافظہ خطا کر جاتا ہے، اس لئے لکھ لینا اس کی بقا کے لئے ضروری امر تھا۔ اس لئے حضور ﷺ کے وصال کے بعد جب قرآن یکجائی اور تکمیلی شان کے ساتھ امت کے ہاتھوں میں آ گیا، اور اب اس میں احتمال نہ رہا کہ دوسری عربی عبارتیں شامل ہوکر اسے مشتبہ بنا دیں گی، تو امت نے حدیث کی تدوین وکتابت کی طرف پورے اہتمام سے توجہ کی۔

ظاہر ہے کتابت شدہ اوراق صرف لکھنے والے تک محدود نہیں رہتے، بلکہ اس کو پڑھنے والے بہت ہو سکتے ہیں، اس لئے اگر کاتب نے بہت واضح اور صاف نہ لکھا ہو، اور مشکل اور مشتبہ الفاظ کا صحیح تلفظ نہ بتادیا ہو، یا نقطے اور شوشے وغیرہ چھوڑ دیئے ہوں، تو پڑھنے والا نہ جانے کیا سے کیا پڑھ لے گا، کیونکہ بے جان نقوش اپنا تلفظ خود تو نہیں بتا سکتے، زبانی سننے میں تو جیسا بتانے والے نے بتایا، سننے والا اس کی نقل وحکایت کر سکتا ہے، مگر لکھے ہوئے الفاظ کو صحیح صحیح پڑھنا کارِ مشکل ہے۔

مشہور ہے کہ اطباءِ قدیم نسخہ اس طرح لکھتے تھے کہ ان کے خاص عطار (دوا فروش) کے علاوہ کوئی پڑھ نہیں سکتا تھا، اگر کوئی مریض غلطی سے کسی دوسرے شخص سے نسخہ پڑھوانے کی کوشش کرتا تو عجیب عجیب غلطیاں اور الجھنیں پیش آ جاتی تھیں۔ کسی طبیب نے اپنے نسخہ میں ''شربت بنفشہ اور دانہ الائچی'' لکھا، اس پر نقطے نہیں لگائے، مریض اس نسخے کو کسی لالہ جی کے پاس لے گیا، انہوں نے ملاحظہ فرمایا، اور غمگین چہرہ بنا کر فرمایا کہ لے جاؤ، دوا مت کرو، مریض نہیں بچے گا، یہ شخص تعجب میں پڑ گیا، اس نے وجہ دریافت کی تو لالہ جی فرماتے ہیں کہ حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ ''شُربَتُ بِنَفْسِه وانّه لا يَحْيىٰ'' اور اس کا ترجمہ کیا کہ مریض کی جان پی جا چکی ہے، اور یہ زندہ نہیں رہے گا۔ دیکھئے کتابت کے غیر واضح اور مبہم ہونے کی وجہ سے بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔

ایک دلچسپ غلطی:

علامہ ابن جوزی نے ''اخبار الحمقاء والمغفلین'' میں ایک دلچسپ لیکن خطرناک غلطی کا ذکر کیا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے مدینہ کے گورنر ابوبکر بن حزم کے

پاس ایک فرمان بھیجا، اس میں لکھا کہ "احص من قبلکم من المخنثین" تمہارے حلقہ میں جولوگ مخنث ہوں، انہیں شمار کرلو۔ کاتب نے لکھنے میں غلطی سے نقطہ لگا دیا، اور لکھا "اَخْصِ" اس کا مطلب یہ ہوا کہ "جو مخنث ہوں ان کو خصی بنا دو" یعنی ان کے خصیتین کاٹ دو۔ چنانچہ گورنر نے اس حکم کی تعمیل کردی، اس پر کسی مخنث نے بطور ظرافت کے کہا کہ "اب ہم واقعۃً اس نام کے مستحق ہو گئے"۔

ایک اور غلطی:

اس سے زیادہ دلچسپ غلطی ایک اور صاحب نے کی، ابوبکر انباری کہتے ہیں کہ میں ایک مغفل شیخ کی مجلس میں پہونچا، وہ ایک حدیث بیان کرر ہے تھے، اس کی سند رسول اللہ ﷺ تک پہونچا کر کہتے ہیں کہ "عن جبریل عن الله عن رجل" مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جبریل سے روایت کیا، انہوں نے اللہ سے، اور اللہ نے ایک آدمی سے۔ میں نے کہا یا اللہ! وہ کون سا آدمی ہے؟ جس سے حق تعالی روایت کرتے ہیں، پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ "عن الله عز وجل" لکھا ہوا تھا، اس کو انہوں نے "عن رجل" پڑھ لیا۔ (ص۔۶۳)

اس قسم کی دلچسپ غلطیاں ابن جوزی نے بہت سی نقل کی ہیں، اسی لئے محدثین نے صرف کتابت پر اور کتاب سے روایت کرنے پر اعتماد نہیں کیا، تاہم چونکہ تحریر و کتابت ایک ناگزیر چیز ہے، اور اس میں غلطیاں بھی ضروری ہیں، اس لئے محدثین نے روایت حدیث کے دوسرے اصول وضوابط کی طرح، کتابت کے بھی قواعد اور طریقے منضبط کئے، تاکہ غلطی کا امکان کم سے کم رہے۔ علم حدیث کے سلسلے میں محدثین کا ہر کارنامہ عجیب ہے، کتابتِ حدیث کی طرف بھی جب انہوں نے رخ کیا، تو اس میں ایسی ایسی ذہانتیں دکھائیں، کہ عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ اگر کاتب ان اصول کی رعایت کرے، تو بہت کم غلطیاں ہوں گی۔ ہم اس مضمون میں کتابت کے ان چند قواعد کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جن کا اہتمام کتابتِ حدیث میں کیا گیا ہے، یا کیا جانا چاہئے۔ آج مطابع اور پریس کے دور میں ان قواعد کی اتنی اہمیت نہیں رہ گئی، پھر بھی ان کی ضرورت باقی ہے، کیونکہ پریس میں بھی کاتب سے بے نیازی نہیں ہے، یا پھر حروف کو جوڑنے والوں سے بھی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان قواعد وضوابط کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ محدثین

نے حدیث رسول کی حفاظت کے لئے کیسی کیسی کاوشیں کی ہیں۔ ہمارے یہاں سرپھروں کی ایک جماعت جس نے علم وتحقیق کے لئے ذرا سا پسینہ بھی نہیں بہایا، بڑی بے باکی سے محدثین کی خدمات کا بیک جنبشِ قلم انکار کردیتی ہے، اسے کیا معلوم کہ اس کے لئے کیسی کیسی جگر کاویاں اور دیدہ ریزیاں کی گئی ہیں۔

ہمارے سامنے حافظ ابوعمر بن الصلاح (المتوفی ۶۴۳ھ) کی مشہور تالیف 'مقدمہ ابن صلاح' ہے۔ یہ کتاب اصولِ حدیث کے سلسلے میں معروف ومتداول ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

"ان علی کتبة الحدیث وطلبته صرف الهمة الیٰ ضبط ما یکتبونه او یحصلونه بخط الغیر من مرویاتهم علی الوجه الذی رووه شکلاً ونقطاًیومن معهما الالتباس وکثیر اما یتهاون بذالک الواثق بذهنه وتیقظه وذالک وخیم العاقبة فان الانسان معرض للنسیان واول ناس اول الناس واعجام المکتوب یمنع من استعجامه وشکله یمنع من اشکاله". (ص۔۸۸)

حدیث کے طلبہ اور کاتبوں پر ضروری ہے کہ وہ جو کچھ تحریر کریں، یا دوسروں کی روایتیں ان کی تحریر سے نقل کریں، اس میں اس بات کا خاص اہتمام رکھیں، کہ جس طریقہ سے انہوں نے روایت بیان کی ہے، ٹھیک اسی طریقے پر لکھیں، ویسے ہی حرکات بھی، اور ویسے ہی نقطے بھی ہوں، تا کہ اشتباہ کا اندیشہ نہ ہو۔ بسا اوقات ذہین اور قوی الحفظ طلبہ اپنی ذہانت اور یادداشت کے اعتماد پر اس میں غفلت برتتے ہیں، لیکن اس کا انجام برا ہوتا ہے، کیونکہ بھول چوک انسان کے لئے لازم ہے، اور سب سے اول بھولنے والا سب سے پہلا آدمی ہے (یعنی حضرت آدم علیہ السلام) اور الفاظ پر اگر نقطے اور حرکات ان کے مواقع پر لگادیئے جائیں، تو ابہام واشکال سے محفوظ رہے گے۔

اس سلسلہ میں حافظ ابن صلاح اصولی بات یہ بتاتے ہیں کہ جو الفاظ بہت واضح اور معروف ہیں، ان کی توضیح وتقیید کے اندر زیادہ کاوش نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ ان میں اشتباہ کا اندیشہ نہیں ہے، کسی نے کہا "انما یشکل ما یشکل"، مشکل الفاظ پر حرکات لگانی چاہئیں، لیکن بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ الفاظ مشکل ہوں یا واضح ان کی وضاحت ہونی چاہئے، کیونکہ ابتدائی طلبہ کے لئے اس کی تمیز دشوار ہے کہ کیا مشکل ہے اور کیا آسان؟۔

حافظ صاحب موصوف نے کتابتِ حدیث کے متعلق سولہ اصول اور قاعدے ذکر کئے ہیں، ہم انہیں قدرے اختصار وتوضیح کے ساتھ یہاں ذکر کرتے ہیں۔

پہلا قاعدہ:

فنِ حدیث میں چونکہ راویوں کا واسطہ ہوتا ہے، اس لئے محدثین کو بکثرت اشخاص و افراد کا ان کے نسب کے ساتھ نام لینا پڑتا ہے، اور بہت سے نام نامانوس اور اجنبی ہوتے ہیں، اسی طرح بسا اوقات دو نام حروف کے اعتبار سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے ناموں کے ضبط کرنے کا خاص اہتمام ہونا چاہئے، کیونکہ ناموں کی تصحیح نہ تو معنی سے ہوسکتی، اور نہ سیاق وسباق کے قرینے سے۔

مثلاً سلاّم اور سلام، عُمارۃ اور عِمارۃ، حزام اور حرام، بزار اور بزاز، وغیرہ، یہ سارے نام ہم شکل ہیں، اگر ان پر حرکت نہ لگائی جائے، یا نقطے نہ لگائے جائیں، یا ادھر کے ادھر کردیئے جائیں، تو سخت غلطی واقع ہوگی۔

علامہ ابن جوزی نے ناموں میں غلطی کی بہت پر لطف مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"**حدثنا سُقیان البوری عن جلد المدا عن اِتش عن النبی ﷺ**" اس ظالم نے ہر راوی کا نام غلط پڑھا، صحیح یہ ہے 'سفیان الثوری، خالد الحذّاء، اور انسؓ'۔ (اخبار الحمقاص ۲۷)

اس لئے ناموں کے ضبط کا خاص اہتمام ہونا چاہئے۔

دوسرا قاعدہ:

مشکل اور نامانوس الفاظ کے متعلق مناسب یہ ہے کہ متنِ کتاب میں اسے صحیح طور پر ضبط کرنے کے بعد حاشیہ میں اس کی وضاحت کردی جائے، اس طرح سے اشتباہ کا اندیشہ ختم ہوجائے گا۔ سطروں کے درمیان میں لکھنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں لفظوں اور حرکات کے التباس کا اندیشہ ہے، بالخصوص جب کے خط باریک ہو، اور سطریں گھنی ہوں۔

مصر کے مشہور محقق محدث شیخ احمد محمد شاکر لکھتے ہیں کہ:

"یہ بہت دقیق احتیاط ہے، اس سلسلے میں سب سے قدیم تحریر جس کا مطالعہ میں نے کیا ہے، اور اس میں اس نوع کی احتیاط موجود ہے، امام شافعی علیہ الرحمہ کے شاگرد ربیع بن

سلیمان المرادی کی تحریر ہے،انہوں نے امام شافعی کی کتاب ''الرسالۃ'' کوخود امام صاحب کی حیات میں ۱۹۹ھ سے لے کر ۲۰۴ھ تک کے درمیان لکھا ہے۔اس میں جوکلمہ بھی انہیں مشتبہ معلوم ہوتا ہے،اورمحسوس کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں غلطی کرسکتا ہے،اسے حاشیہ پر بہت صاف اورواضح لکھ دیتے ہیں''۔

بعض علما نے اس سے بھی زیادہ احتیاط کا طریقہ اختیار کیا ہے،حافظ عراقی نے مقدمہ ابن صلاح کی شرح میں اس کی وضاحت کی ہے،فرماتے ہیں:

''مصنف نے صرف اتنا ہی لکھا کہ مشکل الفاظ کو حاشیہ پر علیحدہ لکھ دینا چاہئے،اور یہ نہیں ذکر کیا کہ ان کے حروف کو الگ الگ بھی لکھ دینا چاہئے،جب کہ اہلِ ضبط کے یہاں یہ طریقہ بھی رائج ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر حرف کی منفرد شکل واضح ہوجائے گی،جیسے''ن'' اور''یاء''۔(مقدمہ شرح ترمذی للشیخ احمد محمد شاکر ج۱۔ص۲۳)

مثلاً ایک نام یُسیر اور دوسرا نام ''نسیر'' اور تیسرا نام ''بشیر'' ہے،اول کے حاشیہ پر''ی'' اور دوسرے کے حاشیہ پر''ن'' اور تیسرے کے حاشیہ پر''ب'' لکھ دیا جائے،تو اشتباہ کا احتمال نہ رہے گا۔ایک نام''حِبّان'' ہے اور دوسرا نام''حَیّان'' ہے،اول کے حاشیہ پر''ح۔ب'' اور دوسرے حاشیہ پر''ح۔ی'' لکھ دینا مناسب ہے۔

تیسرا قاعدہ:

بغیر کسی معقول وجہ کے باریک خط ناپسندیدہ ہے،حنبل بن اسحاق کہتے ہیں کہ''مجھے امام احمد بن حنبل نے باریک خط میں لکھتے دیکھا تو فرمایا کہ ایسا نہ کرو،جب تم کو اس کی زیادہ ضرورت ہوگی اسی وقت یہ تم سے خیانت کرے گا''۔مطلب یہ کہ بڑھاپے میں جب حافظہ کمزور ہوجائے گا تو اس کی زیادہ ضرورت پڑے گی،اوراس وقت نگاہ بھی کمزور ہوچکی ہوگی،تو اس کے پڑھنے میں دقت ہوگی۔

چوتھا قاعدہ:

لکھنے میں ہر حرف صاف اور خوش خط لکھنا چاہئے،گھسیٹ کر نہ لکھے،اور جن حروف کو ایک دوسرے سے علیحدہ لکھنا چاہئے،انہیں ملا کر نہ لکھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ''بدترین تحریر گھسیٹ کی تحریر ہے،اور بدترین قرأت ھذرمہ یعنی حرف کاٹ کاٹ کر پڑھنا ہے،

اور بہترین تحریر واضح اور خوش خط ہے‘‘۔

گھسیٹ کی تحریر پڑھنا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہیں کچہریوں کے محرروں کی تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ الجھی ہوئی تحریر میں غلطی کی مثال علامہ ابن جوزی نے دی ہے۔

ایک شخص نے کوئی تحریر دیکھی، اس میں لکھا ہوا تھا کہ ”المرجئة یهود القبلة“ مرجئہ (ایک فرقہ کا نام ہے) اہل قبلہ کے یہود ہیں۔ یہ تحریر ناصاف تھی، اس کو اس نے پڑھ دیا ”المرء حیث یهوی قلبه“ آدمی وہاں ہے جہاں اس کا دل لگا ہوا ہے۔ الجھی ہوئی ناصاف تحریر کا یہ کرشمہ ہے کہ جو بات کہنے والے نہیں کہی ہے، وہ اس کے سر تھوپ دی گئی۔

پانچواں قاعدہ:

عربی زبان میں کئی حروف ایسے ہیں جو بالکل ہم شکل ہیں، ان میں فرق صرف نقطوں سے ہوتا ہے، مثلاً ’’ب‘‘ اور’’ ت‘‘ اور’’ث‘‘ اسی طرح ’’ج‘‘ اور’’ح‘‘ اور’’خ‘‘۔ اور’’د‘‘ اور ’’ذ‘‘۔’’ر‘‘ اور’’ز‘‘۔’’س‘‘ اور’’ش‘‘۔’’ص‘‘ اور’’ض‘‘۔’’ط‘‘ اور’’ظ‘‘۔’’ع‘‘ اور’’غ‘‘۔’’ف‘‘ اور’’ق‘‘ وغیرہ۔ ان حروف میں امتیاز کرنے کا واحد ذریعہ نقطوں کو ان کے محل پر تحریر کرنا ہے، لیکن دورانِ کتابت اس کی احتیاط بغایت مشکل ہے، ممکن ہے کہ جس کو کاتب نے غیر منقوط لکھا ہے، وہ منقوط ہو۔ اس لئے مناسب ہے کہ منقوط حرف پر صحیح نقطہ لگایا جائے، اور جو غیر منقوط ہوں ان کے لئے بھی کوئی ایسی علامت لکھی جائے، جس سے یہ بات کھل جائے کہ اس کے منقوط ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اہلِ ضبط کے طریقے مختلف ہیں، بعض لوگ انہیں نقطوں کو الٹ دیتے ہیں، یعنی حروف منقوطہ میں جو نقطہ اوپر لگتا ہے، غیر منقوط میں اسی کو نیچے لگا دیتے ہیں، مثلاً ’’بزاز‘‘ میں ’’ز‘‘ منقوط ہے، اور’’بزاز‘‘ میں ’’ر‘‘ غیر منقوط ہے، تو’’ر‘‘ کے نیچے نقطہ لگا دیں گے۔

حافظ عراقی کہتے ہیں کہ ’’اس قاعدے سے’’حاء‘‘ مہملہ کا استثنا ضروری ہے، کیونکہ اگر حاء کے نیچے نقطہ لگا دیں گے تو وہ جیم بن جائے گا، پڑھنے والا غلطی میں پڑ جائے گا‘‘۔ (مقدمہ شرح ترمذی للشیخ احمد محمد شاکر علی الترمذی ج ۱۸۔ ص ۲۴)

بعض لوگوں نے سین غیر منقوط کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ شین منقوط کے نقطے یوں

ہوتے ہیں (ش۔دو نقطے ایک ساتھ اور تیسرا دونوں کے اوپر درمیان میں) تو سین غیر منقوط کے نیچے اس طرح نقطے لگائے جائیں (•••) کچھ لوگوں نے غیر منقوط مشتبہ حروف کے لئے اس حرف کے اوپر (ہ) بنائی ہے۔بعض لوگ انہیں حرفوں کے نیچے باریک سا حرف مفرد لکھ دیتے ہیں، مثلاً ''حبان'' لکھنا ہے تو یوں لکھیں گے (ححبان) حروف غیر منقوط کی یہ علامات معروف ہیں۔

کچھ علامتیں غیر منقوط حروف کی متقدمین کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، جو اب معروف نہیں ہیں، مثلاً یہ کہ حرف غیر منقوط کے اوپر چھوٹا سا خط لگا دیتے ہیں، اور بعض لوگ اس کے لئے بشکل ہمزہ ایک خط بنا دیتے ہیں۔(حافظ عراقی نے قاضی عیاض کی ''الماع'' کے حوالے سے اوپر والے خط کو بھی بشکل ہمزہ ہی ہونا بتایا ہے۔شرح مقدمہ ترمذی، ۱/۲۵)

چھٹا قاعدہ:

کاتب کو چاہئے کہ اپنی کوئی ایسی اصطلاح نہ وضع کرے جس کو صرف وہی جانتا ہو، اور دوسرا کوئی شخص اس سے واقف نہ ہو، البتہ اگر شروع کتاب میں اس اصطلاح کی تشریح کردے، تب مضائقہ نہیں، تاہم اولیٰ یہی ہے کہ خصوصی اصطلاحات اور رموز سے کام نہ لے۔

ساتواں قاعدہ:

حدیث کی کتابت کے دوران جب ایک حدیث مکمل ہو جائے تو اس کے درمیان گول نشان (o) بنا دینا چاہئے۔خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ یہ گول نشان خالی ہونا چاہئے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا، پھر جب احادیث پر نظر ثانی اور اس کا اصل سے مقابلہ کیا جائے تو جس جس کی نظر ثانی ہوتی جائے، اس اس کے دائرہ میں نقطہ یا خط لگاتے جائیں۔(•)(ـ)

آٹھواں قاعدہ:

اگر عبارت میں عبداللہ بن فلاں بن فلاں بن فلاں کا لفظ مثلاً آئے، تو یہ نامناسب ہے کہ اخیر سطر میں عبد اور دوسری سطر میں اللہ لکھا جائے، یہی قاعدہ ان تمام اسماء میں ہے، جن میں عبدیت کی اضافت اسماء حسنی میں سے کسی کی جانب ہو، مثلاً عبدالرحمان، عبدالرحیم۔ان صورتوں میں سطر کے آخر میں عبد اور دوسری سطر کے شروع میں الرحمان، یا الرحیم لکھنا ناپسندیدہ ہے۔
اسی طرح یہ بھی بہتر نہیں ہے کہ ''قال رسول'' آخر سطر میں لکھا جائے، اور ''اللہ ﷺ''

دوسری سطر میں۔

نواں قاعدہ:

طالب علم اور کاتب کے لئے مناسب ہے کہ جہاں جہاں رسول اللہ ﷺ کا ذکر آئے، آپ کے اوپر درود وسلام ضرور لکھے، اگر بار بار نبی کریم ﷺ کا نام آئے تو درود وسلام کی تکرار سے اکتانا اور گھبرانا نہیں چاہئے، یہ بہت زبردست فائدہ کی چیز ہے، اور اس کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ اور جو شخص اس سے غفلت میں پڑا وہ بڑے فائدے سے محروم رہا، اس سلسلے میں بکثرت مناماتِ صالحہ مروی ہیں۔ یہ درحقیقت دعا ہے، کسی کلام کی روایت نہیں ہے، اسی لئے اس کا لکھنا اور اس کا پڑھنا روایت میں ہونے کے ساتھ متعلق نہیں ہے، کہ اصل روایت میں درود ہو تو اسے پڑھا یا لکھا جائے، اور نہ ہو تو اداءِ امانت کے طور پر اسے چھوڑ دیا جائے۔ نہیں، بلکہ اسے ہر حال میں لکھنا اور پڑھنا چاہئے، تاکہ درود وسلام کی برکات سے محرومی نہ ہو۔

اسی طرح حق تعالیٰ کے اسم مبارک کے ساتھ ''عزوجل'' یا ''تبارک وتعالیٰ'' وغیرہ لکھنا چاہئے، اور اگر روایت میں یہ الفاظ پہلے سے آئے ہوئے موجود ہوں تب تو اور زیادہ اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

درود لکھنے میں کوتاہی:

درود شریف لکھنے میں بعض لوگ دو طرح سے قصور کرتے ہیں، بعض تو صورتاً ناقص لکھتے ہیں، مثلاً کوئی ایک حرف جیسے ''ص'' یا ''صلعم'' لکھدیتے ہیں، گویا درود شریف کی طرف اشارہ ہو گیا، اور بعض معنیً ناقص کر دیتے ہیں، مثلاً صرف ''صلی اللہ علیہ'' لکھتے ہیں، اور ''وسلم'' نہیں لکھتے، دونوں صورتوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ حمزہ کنانی فرماتے ہیں کہ میں حدیث لکھنے کے دوران رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے بعد ''صلی اللہ علیہ'' لکھتا تھا، اور ''وسلم'' چھوڑ دیتا تھا، میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ فرماتے ہیں، تم میرے اوپر پورا درود کیوں نہیں بھیجتے؟ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے کبھی ایسی کوتاہی نہیں کی۔

حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ صرف 'علیہ السلام' لکھنا بھی ناقص اور ناپسندیدہ ہے۔

دسواں قاعدہ:

لکھ لینے کے بعد سب سے ضروری امر یہ ہے کہ اس کا اصل کتاب سے جہاں سے نقل

کیا ہے یا جس سے سن کر لکھا ہے، اس سے مقابلہ ومراجعہ کرلیا جائے۔نظر ثانی اور مقابلہ کے بغیر کتاب کی کوئی حیثیت نہیں۔مشہور تابعی حضرت عروہ بن زبیر اپنے فرزند ہشام سے ہوچھتے ہیں کہ تم لکھ چکے ہو؟انہوں نے عرض کیا، ہاں۔آپ نے پوچھا اس پر نظر ثانی کرلی، کہاں نہیں، فرمایا کہ تم نے نہیں لکھا۔

امام شافعی[۱] اور یحییٰ بن کثیر سے منقول ہے کہ ''جس نے کچھ لکھا، اور اس پر نظر ثانی اور مقابلہ نہیں کیا، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے پانی میں داخل ہوا، مگر استنجاء پاک نہیں کیا''۔اخفش سے منقول ہے کہ ''جب کوئی کتاب لکھی جائے اور اس پر نظر ثانی نہ کی جائے، تو وہ کتاب عجمی (مغلق) بن کر رہ جاتی ہے''۔

نظر ثانی کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ طالب علم نے شیخ کی جس کتاب سے نقل کیا ہے، اسی کتاب کو شیخ سناتا جائے، اور یہ خود اپنی تحریر کا اس سے مقابلہ کرتا جائے، یہ سب سے بہتر طریقہ ہے، کیونکہ اس میں دونوں طرف سے احتیاط کی تمام شرطیں بخوبی پائی جاتی ہیں۔شیخ سے سن کر تلفظ کی صحت بھی ہوتی رہے گی، لکھنے میں اگر کچھ چھوٹ گیا ہو یا کچھ بڑھ گیا ہو تو اس کی اصلاح بھی ہوتی رہے گی۔پھر اس کے مقابلے میں جن صورتوں کے اندر احتیاط کی جتنی شرطیں فوت ہوں گی اسی کے بقدر اس کا رتبہ فروتر ہوگا۔

اس طریقہ میں اگر اس کے شرکاءِ درس میں سے کوئی اور بھی ہو، جس کے پاس کتاب کا نسخہ نہ ہو، اس تحریر کے دیکھنے میں اس کا ساتھ دیدے تو اور مناسب ہے، بالخصوص جب کہ وہ اسے نقل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

لیکن نظر ثانی کے لئے اوپر بیان کردہ صورتیں شرط لازم نہیں ہیں، اگر کوئی شخص شیخ کے پڑھتے وقت نظر ثانی نہ کرے، بلکہ الگ سے اصل نسخے سے مقابلہ کرے تو یہ بھی صحیح ہے۔اور اگر خود طالب علم نے نظر ثانی اور مقابلہ نہیں کیا، بلکہ دوسرے کسی بااعتماد شخص نے مقابلہ کرلیا، جب بھی مضائقہ نہیں۔

نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصل سے مقابلہ کرنے کے بجائے کسی اور کے نسخے سے مقابلہ کیا جائے، بشرطیکہ وہ دوسرا نسخہ اسی اصل سے نقل کیا گیا ہو، اور اس سے مقابلہ کیا جاچکا ہو۔اسی

طرح یہ بھی درست ہے کہ اصل سے مقابلہ کرنے کے بجائے اصل کی اصل سے مقابلہ کیا جائے۔ غرض نسخۂ صحیحہ سے مقابلہ ہونا چاہئے، خواہ براہ راست ہو یا بالواسطہ۔

گیارہواں قاعدہ:

کبھی کبھی دورانِ کتابت کوئی عبارت یا کوئی لفظ چھوٹ جاتا ہے، تو اسے کہاں لکھا جائے؟ اور کس طرح لکھا جائے؟ اس کے لئے بھی محدثین نے قاعدہ متعین کیا ہے کہ اشتباہ نہ ہو۔ ایسی چھوٹی ہوئی عبارت کو "لَحق" کہتے ہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس جگہ عبارت چھوٹی ہے، وہاں ایک کھڑا خط کھینچ کر درمیان سطر تک لاکر جس طرف حاشیہ پر لکھنا ہو ادھر منحرف کر دیا جائے، مثلاً دائیں طرف حاشیہ پر لکھنا ہو تو اس طرح ┐ اور اگر بائیں طرف لکھنا ہو تو اس طرح ┌ پھر اسی کی سیدھ میں حاشیہ پر چھوٹی سی عبارت لکھی جائے، اگر گنجائش ہو تو دائیں طرف زیادہ بہتر ہے، اور اس طرح لکھا جائے کہ سطریں نیچے سے اوپر کی طرف جائیں، اور جب عبارت پوری ہو جائے تو وہاں "صح" لکھ دیں، اور بعض لوگ "صح" کے ساتھ "رجع" بھی لکھتے ہیں۔ بعض لوگ اس خط منحرف کو حاشیہ تک کھینچ کر لاتے ہیں، مگر یہ مناسب نہیں ہے۔

اور ہم نے نیچے سے اوپر کی جانب لکھنے کو اس لئے کہا کہ اگر اوپر سے نیچے کی طرف لائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ بعد والی سطر میں بھی کچھ عبارت چھوٹی ہو، تو اس کے لئے گنجائش نہیں رہے گی، اور جب نیچے سے اوپر کی جانب لے جائیں گے تو بعد کے اغلاط کے لئے جگہ خالی رہے گی۔ اور داہنے حاشیہ پر لکھنا اس لئے مناسب ہے کہ اگر بائیں حاشیہ پر لکھا جائے اور بالفرض اسی سطر میں کوئی دوسری غلطی نکل آئی تو اس کو دائیں حاشیہ پر لے جانا پڑے گا، اس صورت میں دونوں خطوط میں التباس واقع ہو جائے گا، کیونکہ خط کی صورت یہ ہوگی ┐.................┌ ┐ اس صورت میں دونوں خطوط کے مل جانے جانے کا خطرہ ہے، اور اگر پہلا "لحق" دائیں طرف لکھا، اور دوسرا بائیں طرف تو اس کی شکل یہ ہوگی ...┐...┌ اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ ہاں اگر نقص سطر کے بالکل آخر میں ہو تو بائیں حاشیہ پر لکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس کے بعد دوسرے نقص کا احتمال نہیں ہے، اور اگر شروع سطر میں نقص ہو تو دائیں جانب لکھنا متعین ہے۔

اور اگر حاشیہ پر کسی لفظ کا معنی لکھنا ہو، یا کسی غلطی پر تنبیہ کرنی ہو، یا اختلافِ روایت یا

اختلافِ نسخہ بیان کرنا ہو یا ایسی کوئی بھی بات ذکر کرنی ہو، جو اصل کتاب میں داخل نہیں ہے، تو اس سلسلہ میں قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس کے واسطے خط نہ کھینچا جائے کہ اس سے اصل کتاب میں داخل ہونے کا شبہہ ہوگا۔ البتہ جس لفظ پر حاشیہ لکھنا منظور ہے، اس پر کو علامت ''ص'' یا ''صح''، وغیرہ بنادیا جائے۔ آج کل ایسے مواقع پر نمبر لگا کر حاشیہ لکھتے ہیں۔

بارہواں قاعدہ:

فنِ حدیث کے ماہرین چند علامات کا بہت اہتمام کرتے ہیں، ان علامتوں کو ان کی اصطلاح میں ''تصحیح''، ''تضبیب'' اور ''تمریض'' کہتے ہیں۔

تصحیح کا مطلب یہ ہے کہ عبارت سے اوپر یا اس سے متصل ''صح'' لکھ دیا جائے، یہ علامت ایسی عبارت پر لکھی جاتی ہے جو روایت اور معنی کے اعتبار سے صحیح ہو، مگر اس میں شک یا اختلاف کا اندیشہ ہو۔ ایسے مواقع پر کاتب اس لئے یہ علامت لگا دیتا ہے کہ وہ یہاں غافل نہیں ہے، بلکہ اس نے پورے یقین کے ساتھ یہ عبارت لکھی ہے۔

تضبیب کا دوسرا نام تمریض ہے، اس کی یہ صورت (صہ) ہے، یہ علامت ایسے لفظ پر بنائی جاتی ہے جو نقل وروایت کے اعتبار سے تو صحیح ہے، مگر لفظ یا معنی کے اعتبار سے فاسد ہے، یا ضعیف ہے، یا ناقص ہے۔ مثلاً یہ کہ قواعد عربیت کے لحاظ سے نادرست ہے، یا شاذ ہے، یا مصحف ہے، ایسی صورت میں اس پر یہ علامت (صہ) بنادی جاتی ہے، لیکن اس کو کلمہ سے تھوڑا علیحدہ رکھا جاتا ہے، تاکہ عبارت کٹی ہوئی نہ معلوم ہو۔

آج کل ایسے مواقع پر آگے کلمہ ''کذا'' لکھ دیا جاتا ہے۔ تضبیب کی یہ علامت (صہ) گویا تصحیح ناقص ہے، یعنی (ص) اشارہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں اسی طرح پایا گیا ہے، اس لئے نقل صحیح ہے۔ مگر ''ح'' نہیں لکھا گیا، یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ اس میں قدرے خرابی پائی جارہی ہے۔ ناقل یہ علامت بنا کر کتاب کا مطالعہ کرنے والے کو متنبہ کرتا ہے، کہ اس محل پر وہ سرسری طریقے سے نہیں گزرا ہے، بلکہ وہ اس خرابی اور نقص پر متنبہ ہے، لیکن اس نے اصل کے مطابق نقل کردیا، شاید کوئی دوسرا شخص صحیح لفظ سے واقف ہو، یا یہی کاتب بعد میں صحیح لفظ پالے اور اس کی تصحیح کردے۔

یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کاتب اپنے قیاس یا قرائن کی روشنی میں جو کچھ اسے صحیح معلوم ہو، بدل کر وہی لکھ دے، جیسا کہ بعض جری لوگ کر دیا کرتے ہیں، مگر اس میں بڑی خرابی ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جس کو اس نے غلط سمجھا ہے، وہی صحیح ہو، اور جسے بدل کر رکھ دیا ہے وہ غلط ہو۔

حدیث کی سند میں کبھی ارسال یا انقطاع ہوتا ہے، ایسی جگہ بھی کاتبین ''تضبیب'' کی علامت بنا دیتے ہیں، گویا اس کے نقص کو اس سے ظاہر کرتے ہیں۔

حدیث کی بعض قدیم کتابوں میں تضبیب جیسی شکل ایسی سندوں میں بھی پائی جاتی ہے، جن میں کئی راویوں کے نام باہم عطف کے ساتھ آئے ہوئے ہوتے ہیں، اور ہر نام پر تضبیب کے مشابہہ علامت بنی ہوئی ہوتی ہے۔ ناواقف اسے تضبیب سمجھ لیتا ہے، لیکن درحقیقت وہ تضبیب نہیں ہے، بلکہ وصل کی علامت ہے کہ سب اسماء باہم عطف کا تعلق رکھتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ غلطی کی وجہ سے بجائے ''عن'' کے ''واو'' لکھ دیا گیا ہو۔

بعض لوگ تصحیح کو تضبیب کی شکل میں اختصاراً لکھ دیتے ہیں، اس لئے خوب تأمل کر لینا چاہئے۔

تیرہواں قاعدہ:

کتابت میں کبھی غلطی سے کوئی جملہ یا عبارت غلط ہو جاتی ہے، اس کو قلم زد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے طلبۂ حدیث میں تین طریقے رائج تھے، اول اس پر خط کھینچ دینا، دوسرے اسے کھرچ دینا، تیسرے اسے مٹا دینا، لیکن پہلا طریقہ زیادہ مروج اور پسندیدہ ہے تھا۔

قاضی ابومحمد بن خلاد نے اپنے اصحاب کا قول نقل کیا ہے کہ کھرچنا ایک طرح کی تہمت ہے۔ بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ اساتذہ مجلسِ درس میں چاقو وغیرہ لانے کو پسند نہیں کرتے تھے، کہ اس سے کھرچ کر کسی غلطی کو محو کریں۔ ممکن ہے جس لفظ کو کھرچ دیا ہے وہی صحیح ہو، کھرچنے کی صورت میں اس کا علم ہوگا، تو دوبارہ لکھنا پڑے گا، اور اگر اس پر خط کھینچا گیا ہوگا تو اس پر تصحیح کی علامت بنا دینا کافی ہوگا۔

خط کھینچنے کی صورت کیا ہوگی؟ اس میں مشائخ کے طرز عمل مختلف ہیں، ابومحمد بن خلاد کا قول ہے کہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو عبارت غلط ہوگئی ہے، اس پر روشنائی نہ پھیری جائے، بلکہ اس

کے اوپر ایک واضح خط لگا دیا جائے، جو اس کے غلط ہونے کی دلیل ہو، اور وہ عبارت پڑھی جا سکے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اہل ضبط کے پسندیدہ طریقے اس باب میں مختلف ہیں، اکثر لوگ زائد یا غلط عبارت کو قلم زد کر دیتے ہیں، یعنی اسی عبارت پر خط کھینچ دیتے ہیں، اسے اصطلاح میں ''شق'' کہتے ہیں۔

اور بعض لوگ بجائے قلم زد کرنے کے اس کے اوپر ایک خط کھینچ دیتے ہیں، اور خط کے دونوں کناروں کو جھکا دیتے ہیں |...........|۔ اور بعض نفیس الطبع لوگ اسے برا سمجھتے ہیں، کہ اس سے کتاب بدنما ہو جاتی ہے۔ وہ غلط عبارت کو قوسین (......) میں کر دیتے ہیں، اور جب غلط عبارت کئی سطر ہو جاتی ہے تو کبھی تو ہر سطر کو قوسین میں کر دیتے ہیں، اور کبھی ابتداء اور انتہاء کو قوسین کے اندر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اور بعض مشائخ اس کو بھی پسند نہیں کرتے، وہ بس ابتداء اور انتہاء میں انگریزی کا (0) صفر (زیرو) لگا دیتے ہیں، اور بعض ابتدا میں ''لا'' اور انتہا میں ''الی'' لکھ دیتے ہیں۔ (لیکن یہ صورتیں مبہم ہیں، بہتر پہلا طریقہ ہی ہے)

اور اگر غلطی سے کوئی لفظ مکرر لکھا جاتا ہے، تو اس کو قلم زد کرنے کے باب بھی رائیں کسی قدر مختلف ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلا لفظ چونکہ صحیح لکھا گیا، دوسرا لفظ غلطی سے لکھا گیا، اس لئے اسے ہی قلم زد کرنا چاہئے، اور بعض دوسرے لوگوں نے کہا کہ دونوں میں جو بہتر لکھا، اسے باقی رکھا جائے، اور دوسرا کاٹ دیا جائے۔

قاضی عیاض نے اس سلسلہ میں اچھا فیصلہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر شروع سطر میں لفظ مکرر ہو گیا تو دوسرا لفظ کاٹا جائے، تاکہ سطر کی ابتدا بدنما نہ ہو۔ اور اگر آخر سطر میں تکرار ہو تو پہلا لفظ کاٹا جائے، تاکہ سطر کا آخر بدنما ہونے سے بچا رہے۔ کیونکہ سطر کا اول اور آخر اچھا ہونا چاہئے، اور اگر لفظ مکرر اس طرح ہوا ہو کہ پہلا لفظ سطر کے آخر میں ہو، اور دوسرا سطر کے شروع میں، تو سطر کے آخر والا کاٹنا چاہئے۔ اور اگر تکرار مضاف یا مضاف الیہ، یا صفت یا موصوف میں ہو تو سطر کے اول و آخر کی رعایت نہیں کی جائے گی، بلکہ اس میں مضاف و مضاف الیہ اور صفت و موصوف کے

اتصال کی رعایت کی جائے گی، بس اس لفظ کو نہیں کاٹا جائے گا جس کے کٹنے سے دونوں میں فصل ہو جائے۔ کھرچنا اور مٹانا دونوں کا حکم قریب قریب ہے، یعنی دونوں غیر مناسب ہیں۔

چودھواں قاعدہ:

جس حدیث میں روایات مختلف ہوں، اس میں کاتب کو چاہئے کہ اختلاف روایت کو اچھی طرح واضح اور ممتاز کر دے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ متنِ کتاب کو کسی ایک روایت سے لکھ دے، پھر اگر دوسری روایت میں اس پر کچھ اضافہ ہو، یا کمی ہو، یا کچھ اختلاف ہو تو اسے حاشیہ پر یا اصل کتاب ہی میں لکھ دے، اور اسے ظاہر کر دے، اور ہر ایک کے راوی کا نام وضاحت کے ساتھ بتائے، اور اگر اس کے لئے کوئی رمز متعین کر رکھا ہے تو کتاب کے اول یا آخر میں اس کی وضاحت کر دے، تا کہ بعد میں کہیں خود نہ بھول جائے، یا کسی دوسرے کے ہاتھ میں کتاب پڑے تو وہ حیرت میں پڑ کر نہ رہ جائے۔ رموز کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب بکثرت روایات میں اختلاف ہو۔

بعض لوگوں نے روایات کے اختلاف کو اس طرح بھی ممتاز کیا ہے کہ زائد الفاظ کے لئے سرخ روشنائی کا استعمال کرتے ہیں، اس کا طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ اگر بعد والی روایت میں الفاظ زائد ہیں، تو ان الفاظ کو سرخ کر دیتے ہیں، اور اگر متن کے الفاظ زائد ہیں اور بعد والی روایت میں وہ الفاظ نہیں ہیں، تو متن والے زائد الفاظ کو سرخ قوسین میں کر دیتے ہیں، لیکن کاتب کو ان اصطلاحات کی وضاحت اول کتاب یا آخر کتاب میں کر دینی چاہئے۔

پندرہواں قاعدہ:

حدیث میں سند کا درجہ بنیادی ہے، کس نے کس سے یہ روایت سنی ہے۔ اگر یہ نہ معلوم ہو تو اس حدیث کو حدیثِ رسول کہنا درست نہیں ہے۔ جو شخص بھی کوئی روایت بیان کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ تک بیان کرنے والوں کا سلسلہ پہونچائے۔ انہیں راویوں سے حدیث کا درجہ متعین ہوتا ہے، اس پر اعتماد و اعتبار ہوتا ہے، سند ہی کی برکت ہے کہ موضوع روایات صحیح روایات سے بالکل ممتاز ہو گئی ہیں، ورنہ جس کا جی چاہتا حضور ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کر دیتا۔ محدثین بیانِ روایت کے لئے دو لفظ بکثرت استعمال کرتے ہیں،

''حدثنا''ہم سے بیان کیا،اور''اخبرنا''ہم کوخبر دی۔یہ دونوں لفظ بہت کثرت سے سندوں کے درمیان آتے ہیں، بار باران کا لکھنا تکلف سے خالی نہیں ،اس لئے عام طور سے حدثنا کے لئے بطور رمز کے''ثنا''استعمال ہوتا ہے،اوراخبرنا کے لئے''انا''۔بعض لوگ''اخبرنا'' کا رمزاس طرح لکھتے ہیں''اننا''بغیر نقطہ کے،مگر یہ مناسب نہیں ہے،اس میں اشتباہ ہے۔

تحویل:

کبھی کبھی ایک حدیث دو یا زائد سندوں سے آتی ہے،تو محدثین سب سندیں ایک ساتھ لکھ کرآخر میں متنِ حدیث لکھتے ہیں،اور جہاں ایک سلسلہ سندختم کوکر کے دوسری سند شروع کرنا چاہتے ہیں،وہاں''ح'' لکھ دیتے ہیں،مگر کسی قابل اعتماد عالم ومحدث سے اس''ح'' کی شرح ہم کونہیں ملی۔البتہ بعض اکابر علما مثلا حافظ ابوعثمان صابونی،حافظ ابومسلم عمر بن علی لیثی بخاری اورفقیہ محدث ابوسعد خلیلی کی تحریر میں دیکھا کہ وہ بجائے''ح'' کے''صح'' لکھتے ہیں،گویا اس پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ پہلی والی سند درست ہے،ساقط نہیں ہے۔اور اس لئے بھی کہ دونوں سندیں ایک ساتھ مخلوط نہ کردی جائیں۔

حافظ ابوعمرو بن صلاح فرماتے ہیں کہ خراسان کے سفر میں میرے ایک رفیقِ سفر نے کسی صاحب علم وفضل کے حوالے سے بتایا کہ یہ''ح''تحویل کا رمز ہے،یعنی یہاں سے سند بدل رہی ہے۔

''ح'' کوکیا پڑھیں؟

پھر فرماتے ہیں کہ اندلس کے ایک اہل علم سے میری گفتگو ہوئی،میں نے ان کے سامنے ایک محدث کا قول نقل کیا،جن سے میری ملاقات ہوئی تھی کہ''ح''اشارہ ہے''الحدیث'' کا،توانہوں نے کہا کہ اہل مغرب(اندلس)میرے علم کے مطابق بغیر اختلاف کے جب عبارت پڑھتے ہوئے اس لفظ پر پہونچتے ہیں،تو''الحدیث'' پڑھتے ہیں،اورانہوں نے بعض اہل بغداد کے حوالے سے بھی یہی بات بتائی،اورمزید یہ بھی کہا کہ بعض لوگ صرف''حاء'' پڑھ کرگزر جاتے ہیں

حافظ ابوعمرو بن صلاح فرماتے ہیں کہ میں حافظ ابومحمد عبدالقادر بن عبداللہ رہادی رحمہ

اللہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا یہ ’’حائل‘‘ کا رمز ہے، یعنی دونوں اسنادوں کے درمیان یہ حائل ہے۔ اور فرمایا کہ اس کا تلفظ نہیں کیا جائے گا، اور انہوں نے ’’الحدیث‘‘ کا رمز ہونے سے انکار کیا۔ وہ اپنے مشائخ سے مذکورہ بالا توجیہ کے علاوہ اور کوئی بات نہیں جانتے، جب کہ ان کے اساتذہ ومشائخ میں بکثرت حفاظِ حدیث ہیں۔

پھر حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک احوط یہ ہے کہ قاری اسے ’’حاءٗ‘‘ پڑھ کر گزر جائے

سولہواں قاعدہ:

حضرات محدثین رحمہم اللہ کے نزدیک کسی کتاب سے نقل کر کے اس کا دوسرا نسخہ تیار کر لینے کی کوئی اہمیت نہ تھی، اصل بات جس کے بغیر روایتِ حدیث معتبر نہ ہوتی، یہ تھی کہ شاگرد اس کتاب کو استاذ سے سن لیتا، یا استاذ کو سنا دیتا، یعنی استاذ اس کتاب کو اپنے نسخے سے یا اپنے حافظے سے پڑھتا، اور شاگرد اپنے نسخے میں اس کی سماعت کرتا، یا شاگرد اپنے استاذ کے روبرو پڑھتا، اور وہ اپنے نسخے سے یا اپنے حافظے سے اس کی سماعت کرتا۔ اس قرأت وسماعت کے اور بھی طریقے جزوی تبدیلی کے ساتھ رائج تھے، جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔ غرض استاذ کی مجلس میں جب اس کا سماع تکمیل کو پہونچتا تب شاگرد کو اس کتاب کی روایات بیان کرنے کی اجازت حاصل ہوتی، اس کو اصطلاح میں ’’سماعِ حدیث‘‘ کہتے ہیں۔

شاگرد جب کتاب کو اپنے استاذ سے سن لیتا تو اسی کتاب پر اپنے سماع کو تحریر کر دیتا، اس کو ’’تسمیع‘‘ کہتے ہیں۔

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ طالبِ حدیث بسم اللہ کے بعد اپنے شیخ کا نام تحریر کرے، جس سے یہ کتاب سماعت کی ہے، اس کی کیفیت، اس کا نسب لکھے، پھر وہ احادیث ہوں جنہیں استاذ سے سنا ہے۔

اور یہ بھی مناسب ہے کہ کتابِ مسموع کو لکھتے وقت بسم اللہ کے اوپر ان لوگوں کے نام بھی لکھے جنہوں نے اس کے ساتھ اس کتاب کی سماعت کی ہے، اور سماعت کی تاریخ بھی لکھے۔ اس تحریر کو ابتدائی صفحہ کے حاشیہ پر اگر لکھے تو بھی مضائقہ نہیں، اور اس کے بعد متصلاً اپنا

سماع بھی لکھ دے تو زیادہ مناسب ہے،اوراس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ کتاب کے آخر میں یا اس کی پشت پر سماع تحریر کرے۔اور سماع ایسے شخص سے لکھوائے جو قابل اعتماد اور خوشخط ہو۔ایسی صورت میں خود شیخ کی تصحیح کی عبارت نہ ہوتو مضائقہ نہیں،اوراگر صاحب کتاب اپنے سماع کو خود ہی تحریر کردے جب بھی حرج نہیں۔

عبدالرحمان بن ابوعبداللہ بن مندہ نے بغداد میں ابواحمد الفرضی کے درس میں ایک کتاب پڑھی،اوران سے درخواست کی ،کہ اس پر کچھ لکھ کر دستخط کر دیجئے،انہوں نے فرمایا کہ اے فرزند!تم سچائی کو لازم پکڑو،جب تمہارا سچا ہونا لوگوں میں معروف ہوگا تو کوئی تمہاری تکذیب نہ کرے گا،اور جو کچھ تم کہو گے اور نقل کرو گے،سب اس کی تصدیق کریں گے،اوراگر ایسا نہ ہوا،تو اگر تم سے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ ابواحمد الفرضی کی تحریر نہیں ہے،تب تم کیا کہو گے؟۔

پھر جو شخص تسمیع کی کتابت کرے اسے چاہئے کہ پورے احتیاط کے ساتھ لکھے،اور سامع اور جس سے وہ کتاب سنی گئی ہے،سب کا نام وضاحت کے ساتھ غیر مشتبہ طور پر لکھے،اور سامعین میں سے کسی کے نام کو کسی غرضِ فاسد سے حذف نہ کرے،اگر سماع کی کتابت کرنے والا مکمل مجلسِ سماع میں حاضر نہیں رہا ہے،جب بھی قابلِ اعتماد حاضرین کی خبر کی بنیاد پراس کو لکھ سکتا ہے۔

پھر جن لوگوں کا سماع اس کتاب میں لکھ دیا گیا ہے،اور وہ اس سے اس کتاب کو دیکھنے کے لئے یا اس سے نقل کرنے کے لئے مانگیں تو اسے چھپانا یا نقل سے روکنا جائز نہیں ہے۔اور جس نے بطور عاریت کتاب لی ہے،اسے دیر تک اپنے پاس روکنا نہیں چاہئے۔

امام زہری سے منقول ہے کہ ''کتاب کی خیانت سے احتراز کرو،پوچھا گیا کہ کتاب کی خیانت کیا ہے؟فرمایا کہ کتاب لے کر واپس نہ کرنا''۔حضرت فضیل بن عیاض کا ارشاد ہے کہ ''کسی شخص کے سماع اوراس کی کتاب کو لے کر اسے روک لینا نہ تو اہل تقوی کا کام ہے،اور نہ حکماء کا''۔

اوراگر سامع جس کا سماع لکھا گیا ہے،صاحبِ کتاب سے مانگ رہا ہے،مگر دینے سے انکار کرتا ہے تو کیا کرنا چاہئے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کوفہ میں ایک شخص نے سماع کا دعوی کیا،مگر صاحبِ کتاب نے انکار کیا،تو دونوں وہاں کے قاضی حفص بن غیاث کے پاس پہونچے،قاضی نے صاحبِ کتاب سے کہا کہ تم اپنی کتابیں لے آؤ،اگر ان میں سے کسی پر خود تمہارے قلم سے اس کی سماعت تحریر ہوگی،وہ تو تمہارے ذمے لازم ہوگی،اور اگر تمہارے قلم سے نہیں ہوگی تو ہم تم سے درگزر کریں گے۔

ابن خلاد کہتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ ابوعبداللہ زبیری سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ"اس مسئلہ میں اس سے بہتر فیصلہ نہیں ہوسکتا،کیونکہ صاحبِ کتاب کی تحریر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس شخص کی سماعت پر راضی ہے"۔

خطیب بغدادی نے اسی جیسا قاضی اسماعیل بن اسحاق کا واقعہ نقل کیا ہے،انہوں نے دیر تک غور کرنے کے بعد مدعاعلیہ سے کہا کہ اگر اس شخص کا سماع تمہاری کتاب میں تمہارے قلم سے ثبت ہے،تب تم کو یہ کتاب اسے بطور عاریت کے دینی ہوگی،اور اگر کسی اور کی تحریر سے ہے تو تم جانو۔

حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حفص بن غیاص امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں طبقہ اولیٰ میں شمار کئے جاتے ہیں،اور ابوعبداللہ زبیری ائمہ شافعیہ میں ہیں،اور اسماعیل بن اسحاق اصحابِ مالک کی زبان اور ان کے امام مانے جاتے ہیں۔اور ان سب کے اقوال ایک دوسرے کے مؤید ہیں،پس قولِ فیصل یہی ہے کہ اگر کسی کتاب میں دوسرے کا سماع خود صاحبِ کتاب کے قلم سے تحریر ہوتو بطور عاریت کے دینا لازم ہے۔

حافظ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں غور کرتا تھا کہ یہ عاریت اس کے لئے کیوں لازم ہے؟ مگر اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی،پھر اس کی توجیہ میں نے یہ کی،کہ یہ تحریر سامع کے حق میں بمنزلہ اس کی شہادت کے ہے۔لہٰذا جب اس کی ادائیگی کا مطالبہ ہوتو شہادت کا ادا کرنا ضروری ہے،اور یہاں ادائیگیٔ شہادت کی یہی صورت ہے،کہ کتاب بطور عاریت کے اس کو دی جائے،جس کے حق میں شہادت ہے،تاکہ وہ اسے پڑھے یا نقل کرے۔

پھر جب کتابِ مسموع سے نقل کرکے دوسرا نسخہ تیار کرلیا جائے،تو اس وقت تک اس

پرسماع نہیں لکھا جاسکتا جب تک کہ قاعدے کے مطابق اس کا مقابلہ اور نظر ثانی نہ کر لی جائے۔

اور یہ قاعدہ عام ہے کسی بھی کتاب سے کوئی نسخہ تیار کیا جائے تو جب تک اس پر مناسب نظر ثانی نہ کر لی جائے اور جب تک اس کا مقابلہ کتابِ مسموع سے نہ کرلیا جائے، اس پر سماعت نہیں لکھی جائے گی۔ فرض کرو اگر اسی نسخہ میں سماعت کر رہا ہے، تو بھی ابتداءِ سماعت میں ''تسمیع'' کا لکھنا درست نہیں ہے، تسمیع اسی وقت لکھی جائے گی جب اس کا سماع مکمل ہو جائے۔

اور اگر کسی وجہ سے مقابلہ نہ ہو سکا ہو تو کتاب پر اس کو واضح کر دینا چاہئے، تا کہ کسی کو دھوکہ نہ ہو۔

یہ سولہ قواعد وضوابط ہم نے ''مقدمہ ابن صلاح'' سے کسی قدر اختصار اور کہیں کہیں قدرے توضیح کے ساتھ لکھے ہیں۔ انہیں بغور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات محدثین نے حدیث کی تصحیح روایت کے لئے کتنا اہتمام بلیغ کیا ہے، دنیا کی کسی قوم کے پاس اس حزم واحتیاط کی نظیر نہیں مل سکتی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کسی اور کو اس احتیاط اور ضبط واہتمام کی ضرورت بھی نہیں، آخر دنیا میں کس قوم وملت کے پاس ایسی شخصیت ہے جس کا فرمان، اللہ کا فرمان، اور جس کی اطاعت، اللہ کی اطاعت سمجھی جائے، اور جس کے ساتھ کسی ایسی بات کے منسوب کرنے میں جو اس نے نہیں کہی ہے، جہنم کی وعید شدید وارد ہے۔ یہ فخر تنہا اہل اسلام کو حاصل ہے، کہ ان کے پاس اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ شخصیت اپنی پوری آب تاب کے ساتھ تاریخ کے روشن صفحات پر جگمگا رہی ہے۔ قرآن کے فرمان کے مطابق ان کا ہر کلام خدا کی طرف سے وحیِ صادق ہے، اور ان کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پس ان کی طرف کسی بات کی نسبت درحقیقت اللہ کی طرف اس کی نسبت کرنی ہے، اس لئے اس نسبت میں جتنی بھی احتیاط کی جائے، بجا ہے۔ پھر آپ نے اعلاناً وجہاراً بار بار فرمادیا کہ ''**من کذب علی معتمداً فلیتبوأ مقعده من النار**'' یہ حدیث بحدِ تواتر پہونچی ہوئی ہے، کہ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف غلط طور سے کوئی بات منسوب کرے، اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں ڈھونڈھ لینا چاہئے۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ ''**کفیٰ بالمرأ کذ باً ان یحدث بکل ماسمع**'' آدمی کے جھوٹے ہونے کے

لئے یہی بات کافی ہے کہ جو کچھ سنے، بیان کرنے لگے، ان دونوں حدیثوں نے محدثین کو اتنا پابند بنادیا ہے کہ ان کی احتیاط دیکھ کرنا واقفوں کو ان کے وہمی ہونے کا شبہہ ہونے لگتا ہے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے تو رسول اللہ ﷺ کے حق میں جھوٹ کا دروازہ کھل جاتا، اور حق و باطل میں امتیاز باقی نہ رہ جاتا، اور جو روایتیں غلط سلط وضع کر لی گئی ہیں، انہیں باہم ممتاز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لیکن ان احتیاطی کاوشوں نے نور و ظلمت کو الگ الگ واضح کر کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ تو آپ نے صرف قواعدِ کتابت کے متعلق احتیاط دیکھی ہے، روایتِ حدیث کے باب میں ایسے کتنے قواعد ہیں جن کو دیکھنے کے بعد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ نبی کریم ﷺ کا عظیم الشان معجزہ ہے۔

ماخذ: المآثر۔ اپریل، مئی، جون (۱۹۹۴ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ اس روایت میں مصنف نے امام شافعی کا نام لیا ہے، لیکن یہ روایت امام اوزاعی اور یحییٰ بن کثیر سے معروف ہے، امام اوزاعی سے علامہ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم''، میں نقل کیا ہے اور ابن عبدالبر ہی طریق سے قاضی عیاض نے اپنی کتاب ''الالماع''، میں نقل کیا ہے، اور مصنف ''الماع'' سے بکثرت باتیں لیتے ہیں، اندازہ یہ ہے کہ حافظ ابن صلاح نے سبقتِ قلم کے نتیجہ میں بجائے اوزاعی کے شافعی لکھ دیا ہے، میں نے علوم الحدیث کے موضوع پر کسی کتاب میں یہ روایت امام صاحب سے نہیں دیکھی، اور ''مناقب شافعی''، میں بھی اس کا کہیں نہیں سراغ ملتا۔ (مقدمہ شرح ترمذی ج ا۔ص ۲۸)

محدث کبیر کی اسناد حدیث

دینی علوم واعمال اور عقائد وافکار کی بنیاد اصلاً دو چیزوں پر ہے، ایک اللہ کا کلام قرآن کریم، دوسرے جناب نبی کریم ﷺ کی احادیث۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "**ترکت فیکم امرین لن یضلوا اما تمسکتم بھما کتاب اللہ ،سنة رسول اللہ**"۔(مشکوٰۃ شریف، الفصل الثالث من باب الاعتصام بالکتاب بالسنۃ، بحوالہ موطا امام مالک)

میں نے اپنے بعد تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے، گمراہ نہ ہوگے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے اس کے رسول کی سنت۔

ہدایت اور خیر کے سرچشمے یہی دونوں ہیں، اسلام کے علم کا محور یہی دونوں چیزیں ہیں، ان دونوں میں سے قرآن کی نقل وحفاظت کا ذمہ تو براہ راست اللہ نے لیا، پھر اس کے حروف وکلمات کی حفاظت اس کی قرأت وسماع کے تسلسل، اس کی تحریر وکتابت اور اس کے حفظ ودراست کا ایسا اہتمام عہدِ نبوت سے آج تک ہوا کہ اس کا حرف حرف ہر قسم کے شک وشبہہ سے قطعی پاک ہے۔ جن حروف وکلمات کے ساتھ وہ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ میں پڑھا گیا، آج بھی اسی طرح پڑھا جاتا ہے۔

لیکن احادیثِ نبوی کی حفاظت وصیانت کا اہتمام اس پیمانے پر نہیں ہوا، رسول اللہ ﷺ کی گفتگو اور آپ کا فرمان جو لوگ سنتے تھے، انہیں حکم تھا کہ وہ اسے نہ جاننے والوں تک پہونچا دیں۔ صحابہ کرام نے اپنی معلومات اپنے بعد والوں تک نہایت امانت ودیانت کے ساتھ پہونچائیں، انہیں ہمیشہ اس کا اہتمام رہا کہ وہی بات رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کریں،

جنہیں آپ سے براہ راست سنا ہے، یا سننے والوں سے سنا ہے۔اس سلسلے میں ان کے سامنے وہ مشہور حدیث تھی، جس کوامام مسلم علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں متعدد سندوں سے روایت کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ''**من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار**''. جس نے میری طرف منسوب کرکے قصداً کوئی غلط بات کہی، وہ اپناٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

بلکہ اس سے بڑھ کر ایک اور حدیث انہوں نے حضرت سمرۃ بن جندب اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا'' **من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احدالکذابین**'' ۔جس نے میری طرف منسوب کرکے کوئی ایسی حدیث بیان کی ،جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے،تو وہ خود بھی ایک جھوٹا ہے۔

ان حدیثوں نے حضرات صحابہ کرام کو بے حد محتاط بنادیا تھا،انہیں جب تک یقین نہ ہوتا کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے،اس وقت تک آپ کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔صحابہ کرام کے اسی احتیاط وتقوی کی وجہ سے پوری امت کی جانب سے انہیں ''عدول'' کا خطاب ملا۔

لیکن ان کے بعد جولوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، وہ سب ایسے نہ تھے،ان میں بھی محتاطین کی تعداد غالب تھی،لیکن بہت سے فتنہ پرداز بھی تھے، جو غلط طور سے حدیثیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا کرتے تھے۔صحابہ کرام کے دور ہی میں ایسے لوگ وجود میں آ گئے تھے،جن میں احتیاط کی صفت نہ تھی، بالخصوص عبداللہ بن سبا اور اس کے ماننے والوں نے بہت فتنہ پھیلایا۔

شروع میں یہ عالم تھا کہ جہاں کسی نے کہا'' قال رسول اللہ ﷺ'' ،مسلمان فوراً ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے،انہیں ذاتِ نبوی سے عشق تھا،اورعشق کا خاصہ ہے کہ محبوب کی ہر بات پر فدائیت کا جذبہ پیدا کردیتا ہے،صحابہ کرام اور تابعین میں یہ فدائیت اس درجہ تھی کہ اس سے زیادہ کا تصورنہیں ہوسکتا۔اسی دور میں فتنہ پردازوں نے غلط طور پر'' قال رسول اللہ ﷺ'' کہنا شروع

کیا۔یہ ایک فتنہ تھا جس میں سیدھے سادھے مسلمانوں کے مبتلا ہوجانے کا اندیشہ تھا،اسی لئے صحابہ کرام نے احتیاط سے کام لینا شروع کیا۔

امام مسلم نے اپنی کتاب کے مقدمے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات حدیثوں کے بارے میں کتنے چوکنا ہوگئے تھے،اس واقعہ کی روایت حضرت ابن عباس کے مشہور شاگرد حضرت مجاہد کرتے ہیں،وہ فرماتے ہیں کہ ''بشیر بن کعب عدوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا،اور آکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حدیثیں سنانے لگا،وہ کہے جارہا تھا'' قال رسول اللہ ﷺ قال رسول اللہ ﷺ''،لیکن حضرت ابن عباس نہ اس کی طرف متوجہ ہوتے،اور نہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے۔وہ جھنجھلا گیا،اور بولا کہ اے ابن عباس! آپ میری بات کیوں نہیں سنتے؟میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کررہا ہوں،اور آپ ہیں کہ التفات تک نہیں کرتے،تب اس حبر الامت نے فرمایا کہ''**انا کنا مرۃ اذا سمعنا رجلاً یقول :قال رسول اللہ ﷺ ابتدرتہ ابصارنا،واصغینا الیہ بآذاننا،فلما رکب الناس الصعبۃ والذلول لم ناخذ من الناس الا ما نعرف**'' ۔(صحیح مسلم ج۱۔ص۱۰)کبھی ہمارا حال یہ تھا کہ جب کوئی شخص کہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،تو بے ساختہ ہماری نگاہیں اٹھ جاتیں،اور اپنے کانوں کو ہم ادھر جھکا دیتے،لیکن جب لوگ ہر سخت اور نرم پر سوار ہونے لگے(یعنی جھوٹ سچ کی تمیز جاتی رہی)تو ہم لوگوں سے وہی بات قبول کرتے ہیں جو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔

صحابہ کرام تو رسول اللہ ﷺ کے اقوال وارشادات کو پہلے سے جانتے تھے،اس لئے ان کے سامنے جب کوئی نئی انجانی بات رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوکر آتی تھی،تو وہ کھٹک جاتے تھے،ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد تھا کہ''**سیکون فی آخر امتی اناس یحدثون بمالم تسمعوا انتم ولا آباؤکم ،فایاکم وایاھم**''.(صحیح مسلم ج۱۔ص۱۰)

میری امت میں آخری دور میں کچھ ایسے لوگ بھی ظاہر ہوں گے جو تم سے ایسی باتیں بیان کریں گے،جن کو نہ تم نے سنا ہوگا،نہ تمہارے آباء اجداد نے،ان سے بچے رہنا،ایسے لوگوں کو دوسری روایت میں''دجال وکذاب'' بھی فرمایا گیا ہے۔

صحابہ کرام ایسے لوگوں کو بآسانی پہچان لیتے تھے، اوران کی دروغ بافی کو سمجھ لیتے تھے، لیکن ایک شخص جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نہیں، آپ کی صحبت میں رہا نہیں، آپ کے ارشادات کو سنا نہیں، اس نے صحابہ کی صحبت بھی نہیں پائی، وہ اپنے اگلوں سے سن کر ہی حدیثیں معلوم کرسکتا ہے۔ اس کے لئے جھوٹ سے سچ کو تمیز کرنے کی صورت کیا ہو؟۔

اللہ تعالی نے اس دشواری کو حل کرنے کے لئے مخلص علما کے دل میں ایک عجیب و غریب الہام فرمایا، وہ یہ کہ صحابہ کے علاوہ کسی کا ''قال رسول اللہ ﷺ'' کہنا اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک وہ یہ نہ بتا دے کہ اس تک رسول اللہ ﷺ کی یہ بات کس طرح پہونچی ہے، اگر وہ تابعی ہے تو کس صحابی سے سنا ہے؟ اور اگر ان کے بعد کا ہے تو درمیان میں رسول اللہ ﷺ تک کون کون لوگ ہیں؟ یہ طریقہ اس معنی کر عجیب وغریب نہیں ہے کہ نسل انسانی کے لئے یہ کوئی نئی دریافت ہے، ظاہر ہے کہ کسی بات کی صداقت کو جانچنے کے لئے یہ ایک فطری طریقہ ہے، جس سے ہر زمانے میں لوگ کام لیتے رہے ہیں، لیکن اس معنی میں یہ عجیب وغریب ہے کہ دنیا میں کبھی اس طریقہ کو بطور فن کے اس منظم طور پر نہیں برتا گیا ہے، اور نہ اس کے اصول وقواعد منضبط ہوئے، جس طرح اس امت میں اس کو برتا گیا، اور اس کے ضوابط مدون ہوئے۔

اور یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ کوئی بات رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط منسوب ہوکر دین وشریعت نہ بن جائے۔ اس دین کو قیامت تک باقی رہنا ہے، اگر اس میں خلط ہوجائے گا تو اللہ کی مرضی پانا محال ہوجائے گا، جب درمیانی واسطے معلوم ہوجائیں گے تو پھر یہ تحقیق کی جائے گی کہ یہ واسطے کیسے ہیں؟ معتبر ہیں یا غیر معتبر؟ اس کی معرفت کے اصول وقواعد مدون ہوئے، جو شریعت اور فطرت کی روشنی میں مرتب کئے گئے۔

انہیں درمیانی واسطوں کو ''اسناد'' کہتے ہیں، اسناد کو دین میں کلیدی حیثیت حاصل ہے، اسی لئے مشہور جلیل القدر محدث وامام حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **''الاسناد من الدين ولو لاالاسناد لقال من شاء ماشاء''**. (مسلم شریف ج۱۔ص۱۲) اسناد کا تعلق دین سے ہے، اگر اسناد نہ ہوتی، تو جس کا جو جی چاہتا، کہہ دیتا۔ اور امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں ''**ان هـذاالعلم دين فانظروا عمن تاخذون دينكم**'' (مسلم شریف ج۱ص۱۱)

یہ علم دین ہے، اس لئے دیکھ بھال لیا کرو کہ تم کس سے اپنا دین حاصل کر رہے ہو۔

اسناد کی وجہ سے جہاں یہ فتنہ مر گیا کہ جس کا جو جی چاہتا رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے کہہ دیتا، اور اس کی وجہ سے بڑا خلط پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا، اب یہ فتنہ اپنی موت مر گیا، کیونکہ جو کوئی آنحضرت ﷺ کی طرف کوئی چیز منسوب کرے، اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کے ایک ایک جزء کا حساب دے، اور حق و باطل کے جانچنے کی جو کسوٹی ہے اس پر اپنی بات کو پیش کرے، اگر سرے سے وہ کوئی سند پیش نہیں کرتا تو بلا تأمل رد کئے جانے کے قابل ہے، اور اگر پیش کرتا ہے تو یہ بھی ثابت کرے کہ درمیانی واسطوں کی ہر کڑی معتبر ہے، اس زحمت کشی کے بعد جو کچھ ثابت ہوگا، وہ کھرا مال ہوگا۔

اسناد کی وجہ سے جہاں یہ فتنہ مرا، وہیں ایک اور بڑا فتنہ مر گیا، وہ یہ کہ جب حدیثوں میں خلط ملط شروع ہوا تو کچھ لوگوں کا یہ رجحان بننے لگا تھا، اور آج تک یہ رجحان کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، کہ احادیث کا کیا اعتبار؟ نہ جانے اس سچ میں کتنا جھوٹ اور اس حق میں کتنا باطل شامل ہے؟ لہٰذا کیوں نے اس مشکوک ذخیرے سے دستبردار ہو جایا جائے، اور دین کا ماخذ صرف قرآن کو قرار دیا جائے، اس فتنہ کی خبر رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی دے دی تھی، چنانچہ ارشاد ہے:

”لا الفین احدکم متکئاً علی الاریکة یاتیه الامر من امری مما امرت به او نهیت عنه فیقول لاادری ماوجدنا فی کتاب الله اتبعناه“ ۔رواه احمد ، ابو دائود، والترمذی، وابن ماجه، والبیهقی، فی دلائل النبوة (مشکوٰۃ شریف باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

اس مضمون کی متعدد روایتیں ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ ایک آدمی خوش عیشی اور مرفہ الحالی میں آسودہ شکم اپنے گدے مسہری پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا، اس کے سامنے جب رسول اللہ ﷺ کا کوئی امر و نہی، یا کوئی حدیث پیش کی جائے گی، تو کہے گا، میں یہ سب نہیں جانتا، ہم کو تو اللہ کی کتاب میں جو چیز ملے گی، ہم اسی کا اتباع کریں گے۔ فرماتے ہیں کہ میں ایسا کوئی شخص نہ پاؤں، ایسے شخص پر آپ کی سخت ناراضگی ہے۔

چنانچہ دور صحابہ میں یہ فتنہ جاگنے لگا تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب

''تدوین حدیث'' میں ''الکفایة للخطیب'' کے حوالے سے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عمران کی مجلس میں ایک شخص نے ان سے مطالبہ کیا کہ ''**لا تحدثونا الا بالقرآن**'' قرآن کے سوا ہمارے سامنے کچھ نہ بیان کرو، اس کے اس مطالبہ میں وہی رجحان پوشیدہ تھا کہ احادیث کو مرتبۂ اعتبار سے ساقط کردیا جائے، حضرت عمران نے اسے اپنے قریب بلایا، جب وہ قریب آگیا تو آپ نے اسے سمجھانا شروع کیا، پہلے آپ نے نماز کو لیا، جس کا بار بار قرآن میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے، پوچھنا شروع کیا ''**ارأیت لو وکلت انت واصحابک الی القرآن أکنت تجد فیه صلوٰة الظهر اربعاً وصلوٰة العصر اربعاً والمغرب ثلاثاً**''. تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا رفقاء ہیں، صرف قرآن ہی پر ٹیک لگالیں گے، تو کیا قرآن میں پاسکتے ہو ظہر کی نماز چار رکعتوں پر، عصر کی نماز چار رکعتوں پر، اور مغرب کی نماز تین رکعتوں پر مشتمل ہے۔ پھر تمثیلاً حج کا ذکر فرمایا ''**ارأیت لو وکلت انت واصحابک الی القرآن أکنت تجد الطواف بالبیت سبعاً والطواف بالصفا والمروة سبعاً**''. تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا رفقا ہیں، صرف قرآن پر ٹیک لگالیں گے، تو تم قرآن میں پاسکتے ہو کہ بیت اللہ کا طوات سات چکر کرنا چاہئے، اور صفا و مروہ کا طواف بھی سات چکر کرنا چاہئے، پھر چور کا ہاتھ کاٹنے کا قرآن میں تذکرہ ہے، اس کے متعلق پوچھا کہ ''**والید من این تقطع، أمن هٰهنا او من هٰهنا ؟**'' اور ہاتھ کس طرح سے کاٹا جائے گا؟ کہاں سے؟ یہاں سے یا یہاں سے؟۔

راوی کا بیان ہے کہ پہلے آپ نے گٹے پر ہاتھ رکھ کر بتایا، کہ یہاں سے، پھر کہنی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ یہاں سے؟ پھر کندھے کے قریب ہاتھ لے کر گئے، اور پوچھا کہ یہاں سے؟ پھر آخر میں فرمایا ''**خذوا عنا فانکم والله ان لم تفعلوا لضللتم**'' ہم لوگوں یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں سے دین کو لو، قسم ہے اللہ کی، اگر تم نے یہ نہیں کیا تو راہ کھو بیٹھو گے۔ (تدوین حدیث ص ۳۵۳)

یہ رجحان کیوں پیدا ہو رہا تھا؟ اس کی بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ فتنہ پردازوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے غلط باتیں پھیلانی شروع کردی تھیں، ظاہر ہے کہ کسی ذخیرہ

میں صحیح کے ساتھ غلط چیزیں شامل ہوجائیں، اور اصلی کے ساتھ جعلی باتیں گھس پڑیں، اور امتیاز دشوار ہوتو وہ پورا خزانہ ہی مشکوک ہوجاتا ہے۔

لیکن روایتِ حدیث میں جب محدثین وعلما نے اسناد کی شرط رکھ دی اور اس کے قواعد وضوابط ایسے بنادیئے، جن کو ہر انسان کی عقلِ سلیم قبول کرلے، اور جن کو قرآن کی تائید حاصل ہے، تو غلط کو صحیح سے الگ کرنے کا ایک عمدہ معیار ہاتھ آگیا، اب یہ ذخیرہ مشکوک نہیں رہ گیا، دودھ الگ ہوگیا، پانی الگ ہوگیا، اب اطمینان کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فلاں حدیث واقعی صحیح ہے، اور فلاں فلاں سقیم، ورنہ اگر سارا ذخیرۂ حدیث ساقط کردیا جاتا تو جیسا کہ حضرت عمران بن حصین نے فرمایا قرآن پر عمل کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

اسناد کے عمل نے ان دونوں فتنوں کا سر کچل کر رکھ دیا، بعد میں احادیث کے مجموعے مدون ہوگئے، اور ان کے مصنفین سے کثیر تعداد میں ان کے تلامذہ نے ان کو پڑھا، اور روایت کیا، اب روایتیں ان مجموعوں میں محفوظ ہیں، اس لئے سند کا پہلے جیسا اہتمام باقی نہیں رہا، کیونکہ کتابوں میں مدون ہوجانے کی وجہ سے حدیثیں اپنی اسناد سمیت محفوظ ہوگئی ہیں، تاہم ان کتابوں بالخصوص صحاح ستہ کے پڑھنے کا دستور اساتذہ کے سامنے جاری ہے، اور اساتذہ اپنے تلامذہ کو حدیث کی روایت کی اجازت دیتے ہیں، اس سلسلۂ درس واستفادہ میں بڑی خیر وبرکت ہے۔ اپنے طور سے کتاب کا مطالعہ کرلینے سے وہ بات کبھی حاصل نہیں ہوسکتی، جو اساتذہ سے پڑھنے اور ان سے اجازت حاصل ہونے سے ہوتی ہے، وہ لوگ جو استاذ سے بے نیاز ہوکر محض کتاب پڑھ لیتے ہیں، ان کی روایت ودرایت چنداں قابلِ اعتبار نہیں شمار ہوتی۔ ان حضرات سے کتاب کے پڑھنے اور سمجھنے میں ایسی ایسی غلطیاں ہوجاتی ہیں، جو بظاہر ناقابل یقین ہوتی ہیں، لیکن استفادہ کا جو فطری طریقہ ہے، اس سے انحراف کیا جائے گا تو بکثرت غلطیاں واقع ہوں گی، حضرات محدثین نے ایسے بہت سے دلچسپ لطیفے اپنی کتابوں میں ذکر کئے ہیں۔ حضرت محدث جلیل الاعظمی نوراللہ مرقدہ بخاری شریف کے افتتاحی درس میں فرماتے ہیں کہ:

”اسناد بہت اہم چیز ہے، یہ دین کی بات ہے، یہ محض علمی بات نہیں ہے، بلکہ اسناد کا اہتمام کرنا، اسناد کا بیان کرنا، اسناد کا یاد رکھنا، اس کی طرف توجہ دینا ایک دینی بات بھی ہے۔

چنانچہ یہ اہتمام حضرات مصنفین نے تو کیا ہی،ان سے جن لوگوں نے ان کی یہ کتاب حاصل کی،اخذ کی،اس کو پڑھا،یا سنا،انہوں نے بھی اسی طرح اسناد کا اہتمام کیا،کس اسناد کا؟یعنی ان کی اپنی اسناد جو مصنفین تک ہے،اس کو بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا،تمہارے سامنے بخاری کی جو مشہور شرحیں ہیں،ان میں ایک حافظ ابن حجر کی شرح ''فتح الباری'' ہے،دوسرے علامہ عینی کی شرح ''عمدۃ القاری'' ہے،ان دونوں کتابوں کو تم دیکھو کہ شرح کرنے سے پہلے وہ بتاتے ہیں کہ صحیح بخاری کس کے پاس پڑھی ہے،یا کس سے سنی ہے،اپنا پورا سلسلہ اسناد امام بخاری تک پہونچاتے ہیں،تمہارے سامنے صحیح بخاری کا جو نسخہ ہے،اس کی تصحیح مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری نے کی ہے،اس پر انہوں نے ایک مقدمہ لکھا ہے،اس کے آخر میں انہوں نے اپنی سند اپنے استاذ سے شروع کر کے امام بخاری تک ذکر کی ہے''۔(مجلّہ المآثر،ش ا۔ج ۴)

اسناد کے یہ فائدے تو بنیادی ہیں،اور یہی اسناد کی غرضِ اصلی ہے،تاہم اسناد اور بیانِ اسناد کا ایک فائدہ اور بھی ہے،اگر چہ وہ اسناد کے براہ راست اغراض میں نہیں ہے،تاہم وہ بھی اتنا اہم ہے کہ اگر اسے مقصود کے ہم پہلو رکھ دیا جائے تو مضائقہ نہیں ہوگا،وہ فائدہ یہ ہے کہ صحیح احادیث اور کتبِ احادیث کی روایت کرنے والے حضرات وہ ہیں،جو امت کے اساطین علما کرام،اور رسول اللہ ﷺ کے نائبین ہیں،اور ان کی روایات پر دینی مسائل واحکام کی بنیاد ہے، ان کے علم وفضل،ان کی امانت ودیانت،اور ان کے ورع وتقوی کا اعتراف جب علمائے امت نے کیا ہے تو امید ہے،ایسی امید جو یقین کے قریب ہے،کہ یہ لوگ اللہ کے نزدیک مقبول وبرگزیدہ ہیں،طالب علم سے لے کر جناب رسول اللہ ﷺ تک مقبولین کی ایک فہرست ہے،جن سے محبت وتعلق ایمان کی علامت ہے،جن کی صحبت میں رہنا علم وعرفان میں اضافہ کا ایک سبب ہے،جن کے زمرہ میں شامل ہونا سعادت وبرکت ہے،طالب علم حدیث پڑھنے میں اپنے آپ کو مسلسل ان حضرات سے مربوط رکھتا ہے،اور رسول اللہ ﷺ کے ایک ایک بات کو حاصل کرنے اور اسے دہرانے کے لئے اتنے بزرگوں اور علما کا نام لیتا ہے،تو امید ہے کہ اللہ تعالی ان کی برکت سے اس کو بھی حدیثِ نبوی اور سرکار نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیض عطا فرمائیں گے،اور یہ بھی انہیں بزرگوں کے زمرے میں شمار کر لیا جائے گا۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ''المرأ مع من

احب“ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ تمام حضرات طالب علم کے اساتذہ ہیں، اور اساتذہ سے محبت اور تعلقِ خاطر ہونا فطری امر ہے، پس ان شاء اللہ قیامت کے دن یہ طالب علم بھی انہیں کی جماعت میں محشور ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ جب ان کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کے کلمات طیبات کو پڑھا اور دھرایا جائے گا، تو اس کا ثواب اور اس کی برکت ان ارواح طیبہ کو بھی پہونچتی رہے گی، یہ ان کے حق میں عمل باقی ہے، جس کے لئے مرنے کے بعد بھی دفتر اعمال کھلا رہے رہتا ہے۔”**اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلثة اشياء: صدقة جارية اوعلم ينتفع به اوولد صالح يدعوا له**“. (**رواه مسلم**)

جب انسان مرجاتا ہے تو اس سے اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے، البتہ تین چیزیں باقی رہتی ہیں۔ صدقہ جاریہ، اور علم جس کا فائدہ پہونچ رہا ہو، اور نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی ہو۔

اس طرح علمِ حدیث کا یہ سارا سلسلہ سراپا خیر و برکت بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو بھی بہرورفرمائے۔

حضرت کی سند بخاری:

درسِ بخاری میں مذکورہ بالا وضاحت کے بعد حضرت اقدس نے اپنی سندِ حدیث ذکر کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

”صحیح بخاری مکمل میں نے حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی سے، انہوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے، انہوں نے مولانا قاسم صاحب نانوتوی سے، انہوں نے مولانا عبدالغنی مجددی سے، انہوں نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے، شاہ محمد اسحاق صاحب نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے، اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے والد شاہ ولی اللہ صاحب سے پڑھی یا سنی ہے“۔ (مجلّہ المآثر مذکور، ص ۱۷)

مولانا کریم بخش سنبھلی:

متوسطات تک کتابیں اپنے وطن سنبھل میں پڑھ کر امروہہ پہونچے، وہاں حضرت

مولانا سید احمد حسن صاحب محدث امروہوی سے کچھ اسباق پڑھے، بعدازاں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر ۱۳۱۷ھ میں حضرت شیخ الہند سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ جید الاستعداد عالم تھے، مختلف مدارس میں مدرس رہے، ہاپوڑ کے زمانۂ تدریس میں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد نے بھی ان سے پڑھا تھا، مدرسہ جامع العلوم کانپور میں صدر مدرس رہے، پھر مدرسہ دارالعلوم مئو کے صدر مدرس مقرر ہوئے، اس زمانے میں مولانا حبیب الرحمان الاعظمی، مولانا عبدالطیف الاعظمی، اور مولانا منظور نعمانی نے حدیث کی کچھ کتابیں ان سے پڑھیں۔ ۱۳۲۶ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲۔ ص ۸۵)

حضرت محدث کبیر نے ان سے ۱۳۴۰ھ میں دورۂ حدیث شریف پڑھا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی:

حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں، دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم ہیں، یہ حسنِ اتفاق بلکہ حسنِ تقدیر کہ دارالعلوم کا پہلا استاذ بھی محمود ہے، اور پہلا طالب علم بھی محمود۔

شیخ الہند کی ولادت ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی، نصابِ دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی خدمت میں رہ کر علمِ حدیث کی تحصیل فرمائی، زمانہ طالب علمی میں آپ کا شمار حضرت نانوتوی کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا۔ ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی خدمت پر حضرات اکابر نے مامور فرمایا، ۱۳۰۸ھ میں صدر مدرس وشیخ الحدیث مقرر ہوئے، اور یہ سلسلہ ۱۳۳۳ھ تک رہا، سن مذکور میں شیخ الہند نے حجاز کا سفر فرمایا، اور وہیں گرفتار کرکے انگریزوں نے مالٹا پہونچادیا۔

ظاہری علم وفضل کی طرح حسنِ باطنی سے بھی آراستہ تھے، حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اسرارہم سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

دارالعلوم میں صدارتِ تدریس کا مشاہرہ اس وقت پچھتر (۷۵) روپئے تھا، مگر آپ نے پچاس روپئے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمایا، بقیہ پچیس روپئے دارالعلوم کے چندے میں

شامل فرمادیتے تھے۔

شیخ الہند کے شاگرِ رشید حضرت مولانا سید اصغر حسین (میاں صاحب) لکھتے ہیں:

''حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا، اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ وتابعین، فقہاء ومجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتیں تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے، نہایت سبک اور سہل الفاظ بامحاورہ اردو میں، اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دریا امنڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں، کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مشت استخواں، ضعیف الجثہ مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا، مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے، جو قوت وشوکت کے ساتھ اعلانِ حق کر رہا ہے، خدا تعالی نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دل نشیں ہو جاتی تھی، اور سننے والا یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ جو فرما رہے ہیں حق ہے۔

بہت سے ذی استعداد اور ذہین وفطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں میں استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنے شکوک وشبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے معانی اور مضامین عالیہ سن کر سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی کو نہیں ہے، اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے''۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲۔ ص ۱۸۱)

حضرت شیخ الہند میں تعلیم وتربیت اور جوشِ جہاد کی اعلی شانیں موجود تھیں، ان کے حلقۂ درس سے حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت مولانا منصور انصاری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی، حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور نامور علما کی جماعت اٹھی۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی:

ہندوستانی مسلمانوں پر اللہ تعالی نے جو خصوصی احسانات فرمائے ہیں، ان میں ایک اہم اور عظیم الشان احسان حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ کی ذات بابرکات ہے، مولانا اس دور میں پیدا ہوئے جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا نفس باز پسیں تھا، مغل سلطنت کا چراغ جھلملا رہا تھا، ہجری سن ۱۲۴۸ تھا، اور عیسوی ۱۸۳۲، مولانا ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ نانوتہ میں پیدا ہوئے، ابتداء تھوڑی سی تعلیم سہارن پور میں حاصل کی، وہاں سے اپنے استاذ گرامی حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے ساتھ دہلی آ گئے، یہاں ان سے تمام علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی، اور حدیث شریف کا درس حضرت شاہ عبدالغنی مجددی نوراللہ مرقدہ سے لیا، اور حاجی امداداللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ سے بیعت ہوکر سلوک کی منزلیں طے کیں۔

حضرت نانوتوی ذہانت وذکاوت اور اجتہاد وتدبر کے جس مرتبہ پر فائز تھے، اس کا تصور بھی ہم کوتاہ بینوں کے لئے مشکل ہے، حقائقِ شرعیہ پر مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، اس کے ساتھ نیکی وتقوی اور اتباعِ سنت میں بھی نہایت درجہ رسوخ تھا، حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھا ہے کہ ''**وکان ازھد الناس واعبدھم واکثرھم ذکراً ومراقبۃً**''۔ مولانا نہایت زاہد اور عبادت گزار تھے، اور ذکر ومراقبہ میں مشغول رہا کرتے تھے۔ مولانا کی متعدد تصانیف ہیں، جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ حقائقِ شریعت پر کس درجہ گہری ہے، اور وہ اس گہرائی میں اتنی دور تک اترتے ہیں کہ ہم جیسے سوادخوانوں کی باوجود کوشش کے وہاں تک رسائی نہیں ہوتی۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس وتعمیر ہے، اللہ تعالی نے اس ادارہ سے ہند اور بیرونِ ہند میں جو کام لیا ہے، ہر شخص اس کو جانتا اور اس کا معترف ہے، حضرت نانوتوی کے کمالِ علمی وعملی کے اظہار کے لئے یہ چند سطریں نہایت ناقص ہیں، اور سچ یہ ہے کہ میرا قلم بالکل گنگ ہے۔ مولانا کے معاصر سرسید احمد خاں مرحوم تھے، ہر چند کہ مولانا اور سرسید کے نظریات میں بہت تفاوت تھا، لیکن سرسید مرحوم نے مولانا کے سلسلے میں ان کی وفات کے بعد جو مضمون لکھا ہے، وہ کمالِ دیانت وانصاف اور بے تعصبی کا آئینہ دار ہے، اس مضمون سے مولانا کی

سیرت وشخصیت کی جھلک ملتی ہے،طبیعت نہیں مانتی کہ اس کا اختصار کیا جائے، پورا مضمون ہی پڑھ لیجئے۔ یہ مضمون علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء میں چھپا تھا،اسے ''سوانح قاسمی'' جلد سوم صفحہ ۱۷۳ میں شامل کر دیا گیا ہے،ہم وہیں سے نقل کرتے ہیں:

''افسوس کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا قاسم نانوتوی) نے ۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء (۴/جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ) کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رویا ہے،اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا،لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشیں نظر نہ آئے،نہایت رنج اورغم اورافسوس کا باعث ہوتا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علما میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم وفضل اورتقوی اور ورع میں معروف ومشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے،لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کے مثل ان تمام صفات کا پیدا ہونے والا نہیں ہے،مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمالِ نیکی اور دینداری اورتقوی اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اسی دلی کی تعلیم وتربیت کے بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کے مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت کم لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے،انہوں نے جناب مولوی مملوک العلی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں،ابتدا ہی سے آثارِ تقوی اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کہ ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے،اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　　می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم وفراست میں معروف تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زدِ اہلِ فضل وکمال تھے،ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباعِ سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا،اور حاجی امداداللہ کے فیضِ صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلی درجہ کا دل بنا دیا تھا،خود پابند شریعت وسنت تھے،اور لوگوں کو بھی پابند شریعت وسنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا،انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت

مفید مدرسہ دیوبند قائم ہوا، اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی، علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر ومرشد بننے کی نہیں کرتے تھے، لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاعِ شمال ومغرب میں ہزار ہا آدمی ان کے معتقد تھے، اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے، اور بعضوں سے وہ ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے، ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی، یا ضد اور عداوت پر نہیں محمول کر سکتے، ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے، بلاشبہہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے، اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا، صرف خدا کے واسطے تھا، اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا برا نہیں جانتے تھے، بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے برا جانتے تھے، مسئلہ حب للہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا، ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں، جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے تھے کہ اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت وہ فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے‘‘۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجددی:

شاہ صاحب حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کی اولاد میں ہیں، والد محترم کا نام حضرت شاہ ابوسعید تھا، جو حضرت شاہ غلام علی نوراللہ مرقدہ کے خلیفہ وجانشین تھے۔ ۱۲۳۵ھ میں ولادت ہوئی، مولانا حبیب اللہ دہلوی کے پاس قرآن پاک یاد کیا، اور نحو وعربیت کی تعلیم پائی، پھر فقہ وحدیث پر خاص توجہ کی، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے حدیث کا درس لیا،

اپنے والد سے مؤطا امام محمد، اور مولانا مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ دہلوی سے مشکوٰۃ شریف پڑھی۔

۱۲۴۹ھ میں جب آپ کی عمر چودہ سال کی تھی، اپنے والد شاہ ابوسعید مجددی کے ساتھ حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور شیخ عابدی سندی و شیخ اسماعیل رومی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ حج کے بعد حضرت شاہ ابوسعید بیمار ہوگئے، زیارت حرمین کے بعد ہندوستان کی طرف کوچ کیا، ۲۲ رمضان المبارک ۱۲۵۰ھ کو ٹونک پہونچے، اور عید کے دن داعیٔ اجل کو لبیک کہا، نعش مبارک دہلی لائی گئی، چالیس دن کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی غسل دیا گیا ہے۔

شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ والد کے انتقال کے بعد چند مہینے ٹونک میں مقیم رہے، پھر دہلی آ کر برسوں درس دیا، اور مریدوں کی تربیت فرمائی۔ شاہ ابوسعید صاحب نے انتقال کے دن آپ کو اجازت مرحمت فرمائی، اور چند وصیتیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ "دنیاداروں کے دروازے پر جاؤ گے تو ذلت اٹھاؤ گے، ورنہ تمہارے دروازے پر آ کر ناک رگڑیں گے"۔

محمد حسین مرادآبادی نے لکھا ہے کہ "میں چند روز خانقاہ میں شاہ عبدالغنی صاحب کے خدمت میں رہا ہوں، میں نے ان کو تعلیم علمِ ظاہر و باطن میں مشغول پایا، فجر کے بعد مراقبہ کرتے تھے، اشراق کے بعد مریدوں کو توجہ دیتے تھے، پھر حدیث کا درس دیتے تھے، قیلولہ و نماز ظہر کے بعد فقہ کا درس دیتے تھے، نماز عصر کے بعد تعلیمِ باطن والقائے نسبت فرماتے تھے۔ دنیا و اہل دنیا کی باتوں سے پرہیز کرتے تھے"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "انگریزوں کے نوکروں اور ملازموں کا ہدیہ اور دعوت قبول نہیں کرتے تھے، غایت احتیاط کی بنا پر بازار کے آم نہیں کھاتے تھے، فرماتے تھے کہ بیچنے والوں نے مالکوں سے بیعِ فاسد کے ذریعے خریدا ہے"۔

۱۲۷۳ھ (نزہۃ الخواطر) ۱۲۷۴ھ (انوارالعارفین) میں آشوبِ دہلی (جو غدر کے نام سے مشہور ہے) کے وقت اپنے اہل وعیال کو لے کر حجاز کی طرف ہجرت فرمائی، شریف نے مسجد نبوی کے سامنے آپ کے رہنے کے لئے ایک ایک حجرہ عنایت کیا، اسی میں آپ مقیم رہے، اور جب تک زندہ رہے، مسجد نبوی میں بقول مرادآبادی سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے تعلیم علم وظاہر و باطن فرماتے رہے۔

ہندوستان میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی آپ کے حلقۂ درسِ حدیث میں شریک ہوئے، اور سند واجازت سے مشرف ہوئے، اور حجاز میں مولانا عبدالحی لکھنوی اور مولانا عبداللہ مئوی نے آپ سے سندِ حدیث حاصل کی۔

ابن ماجہ پر شاہ صاحب کا حاشیہ ''انجاح الحاجۃ'' ان کی یادگار ہے، اردو میں بھی ایک رسالہ آپ کا میں نے (حضرت محدث اعظمی) دیکھا ہے، آپ کی وفات ۱۲۹۶ھ میں ہوئی ہے۔

مسند الدیار الہندیہ حضرت شاہ اسحاق صاحب دہلوی:

آپ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسہ تھے، ۱۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے، اپنے نانا کے یہاں پرورش پائی، کافیہ تک مولانا عبدالحی بڑھانوی سے اور باقی کتبِ درسیہ شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ انہیں کی خدمت میں فقہ وحدیث میں بھی مہارت حاصل کی، حضرت شاہ عبدالعزیز سے سلسلۂ سند استوار کیا، شاہ صاحب نے اپنا جانشین مقرر کیا، اور اپنی ساری کتابیں نیز مکانات ان کو ہبہ کردیئے۔

شاہ محمد اسحاق صاحب نے ۱۲۴۰ھ میں حج وزیارت کا شرف حاصل کیا، اسی سفر میں شیخ عبدالکریم مکی سے حدیث کی سند لی، اس کے بعد ہندوستان آکر سولہ سال تک دہلی میں درس دیا۔ ۱۲۸۵ھ میں اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد یعقوب اور تمام اہل وعیال کے ساتھ دوبارہ حجاز گئے، اور حج زیارت کے بعد مکہ میں مقیم ہوگئے، مکہ میں آپ سے شریف محمد بن ناصر حازمی نے استفادہ کیا۔ ہندوستان کے اکابر اہل علم نے آپ سے حدیث کا درس لیا، دیوبند سہارن پور اور ہندوستان کے اکثر مدارس کے علما ومدرسین کا سلسلۂ سند آپ ہی سے ملتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی، قاری عبدالرحمان پانی پتی، نواب قطب الدین دہلوی، مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا عبدالقیوم بھوپالی، اور مفتی عنایت احمد کاکوری، آپ کے جلیل القدر تلامذہ میں ہیں، پورہ معروف کے مولانا طاہر صاحب نے بھی حدیث کی سند آپ سے مکہ میں لی تھی۔

شیخ عبداللہ سراج مکی شاہ صاحب کی وفات کے بعد غسل دینے کے وقت فرماتے تھے کہ اگر یہ زندہ رہتے، اور میں عمر بھر ان کے پاس حدیث پڑھتا جب بھی ان کے مرتبہ کو نہ پہونچتا۔ اور شیخ عمر بن عبدالکریم فرمایا کرتے تھے کہ ان میں ان کے نانا کی برکت حلول کرگئی ہے۔

شاہ محمد اسحاق صاحب نے مکہ میں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔(اعیان الحجاج۔ص ۲۴۱)

سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی زمین اور اہل زمین پر اللہ تعالی کی حجت بالغہ تھے، علم وفضل، ذہانت وذکاوت، فہم وفراست، قوتِ استنباط واستدلال، اور وسعتِ معلومات میں دین محمدی کے برہانِ مبین تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند رشید اور خلیفہ وجانشین تھے، ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے، پیدائش کے بعد نہلا دھلا کر شاہ صاحب ان کو مسجد کی محراب میں لے گئے، اور اللہ کے حضور ان کو نذر کیا کہ ''یہ بچہ آپ کے دین کی خدمت کرے گا''۔ اللہ تعالی نے اس نذر کو قبول فرمایا، اور حیرت انگیز طور پر اس کی قبولیت ظاہر ہوئی۔

پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم وفنون کے تعلم واکتساب سے فراغت حاصل کی، نہ صرف ہندوستان کے تمام اطراف بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک سے بھی لوگ جوق در جوق ان کی خدمت پہونچتے، اور اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے، شاہ صاحب علم کے سمندر تھے، شاید کوئی فن ایسا ہو جس میں شاہ صاحب کو درک نہ رہا ہو، اس کے ساتھ نہایت اعلی درجہ کے ادیب وشاعر تھے، عبارتیں برجستہ لکھتے، اور ایسی لکھتے کہ بڑے بڑے ادیب وبلیغ غور وفکر کے بعد ایسی عبارت نہ لکھ سکتے۔ شیعہ کے رد میں ''تحفہ اثناعشریہ'' لکھی، اس کتاب کے شیعوں کی طرف سے بہت سے جواب لکھے گئے، لیکن ہنوز تشنگی باقی ہے۔

اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سارے کمالات گونا گو امراضِ شدیدہ کے ساتھ تھے، پچیس سال کی عمر میں کچھ خاص اسباب سے شاہ صاحب کو اتنے سخت امراض نے آگھیرا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک مرض طاقتور سے طاقتور آدمی کو بیکار کر دینے کے لئے کافی تھا، مگر شاہ صاحب ان سب کا تحمل کرتے ہوئے فیضانِ علم وفضل میں مشغول رہا کرتے۔ شاہ صاحب کی درس گاہِ علم سے ایسے ایسے اساطین اٹھے کہ ان میں ہر شخص ایک ایک امت پر بھاری تھا، شاہ صاحب کے تینوں بھائی شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، اور شاہ عبدالغنی صاحب اور ان کے دونوں نواسے شاہ محمد اسحاق صاحب، اور شاہ محمد یعقوب صاحب انہیں کے فیض یافتہ تھے، ان کے علاوہ ان کے داماد حضرت مولانا عبدالحی صاحب، ان کے بھتیجے شہرۂ آفاق عالم ومجاہد حضرت شاہ

اسماعیل شہید، ان کے خلیفہ اکبر اور شہید فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہید، حضرت غلام علی دہلوی، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، اور دوسرے بہت سے اکابر حضرت شاہ صاحب کے ظلِ عاطفت میں تربیت پاکر آفتاب و ماہتاب بنے۔

ہندوستان کا کوئی علمی خاندان ایسا نہ ہوگا جس کا تعلق شاہ عبدالعزیز صاحب سے نہ ہو۔ شاہ صاحب کی وفات ۷؍شوال ۱۲۳۹ھ میں ہوئی، ان کی عمر اس وقت اسی سال تھی۔ رحمہ اللہ رحمةً واسعةً

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے اوصاف وکمالات نہ تو محتاج بیان ہیں، اور نہ ہر کسی کی زبان وقلم میں صلاحیت ہے کہ ان کا کچھ حصہ بھی بیان کر سکے، مختصر یہ ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا آفتاب جب غروب ہو رہا تھا، اندھیرا پھیل رہا تھا، اور اندیشہ ہو چلا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی امت بدعت وجہالت اور پستی وغلامی کی اندھیری میں بھٹک کر فنا ہو جائے گی، اس وقت اللہ تعالی کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ نے حضرت شاہ صاحب کو حیّزِ ہستی میں نمودار کیا۔ انہوں نے قرآن وسنت اور روحانیت اور عمل صالح کا صور اتنی قوت اور بلند آہنگی سے پھونکا، اور ہدایت کی ایسی نور فشاں مشعل روشن کی، کہ مردہ قلوب اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں یکا یک زندگی کی لہر اور بینائی کی چمک پیدا ہوگئی، اور حق وہدایت کی راہ جگمگا اٹھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب مجددِ وقت تھے، اور آج تک جو برصغیر پاک وہند میں دین اور علمِ دین کی خدمت ہو رہی ہے، انہیں کی تجدید کی روشنی میں ہو رہی ہے۔

شاہ صاحب کی ولادت باسعادت ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ میں ہوئی، عمر کا پانچواں سال تھا کہ مکتب میں بٹھا دیئے گئے، ساتویں سال ان کے والد بزرگوار نے ان کو نماز میں کھڑا کیا، اور روزہ رکھوایا، اسی سال کے آخر میں قرآن پاک ختم کیا، اور فارسی شروع کی، دسویں سال شرح جامی پڑھنا شروع کی، پندرہویں سال میں علوم وفنونِ متعارفہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ ۲۹؍ برس کے ہوئے تو حرمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، ۱۱۴۳ھ میں حج کی سعادت حاصل کر کے اگلا سال بھی اسی مقدس سرزمین میں گزارا، طواف وزیارت کے ساتھ ساتھ محدثین سے احادیث کی

روایت واجازت اور مشائخ کی صحبت کے برکات وفیوض حاصل کرتے رہے، بعد ازاں مدینہ منورہ کی حاضری کا شرف حاصل کیا۔ سال کے باقی ایام وہیں گزارے، یہاں مزارِ فیض بار کی طرف اکثر متوجہ رہے، اور بڑا فیض حاصل کیا، اور یہاں بھی محدثین سے روایت واجازتِ حدیث اور مشائخ طریقت سے فوائد سلوک حاصل کرتے رہے۔

شیخ ابوطاہر کے ہاتھ سے وہ خرقہ پہنا جو تمام خرقہائے صوفیہ کا جامع ہے، علماءِ حرمین کے ساتھ خوب صحبتیں رہیں، اور اسی سال کے آخر میں دوسرا حج کر کے ۱۱۴۵ھ کے آغاز میں وطن کا قصد کیا، اور جمعہ رجب ۱۱۴۵ھ کو بخیر وعافیت گھر پہونچے۔ شاہ صاحب اپنے ایک رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''حق تعالیٰ کا عظیم ترین احسان اس بندے پر یہ ہے کہ اس کو ''خلعت فاتحیہ'' بخشا گیا، یعنی اس آخری دور کا افتتاح اس سے کرایا گیا، اس سلسلے میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو ''مرضی'' (یعنی مقبول) ہے، اس کو جمع کیا گیا، اور فقہ اور حدیث کی ازسرنو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی، اور آنحضرت ﷺ کے تمام احکام وترغیبات اور تعلیمات کے اسرار ومصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے یہ کام اس طور پر نہیں کیا تھا، ایک کام مجھ سے یہ بھی لیا گیا کہ اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل وبراہین سے ثابت کیا، اور معقولیت کے شکوک وشبہات کے خس وخاشاک سے ان کو قطعی پاک کردیا، اور ان کی تقریر بحمد للہ ایسی کی ہے کہ جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی''۔

حکمت عملی بھی مجھے بھرپور دی گئی ہے، اور کتاب وسنت اور آثار صحابہ سے اس کی تطبیق وتفصیل کی توفیق بھی نصیب ہوئی، ان سب کے سوا مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا ہے، جس کے ذریعہ سے میں یہ تمیز کرسکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی ہے، وہ کیا ہے؟ اور کون کون باتیں جو بعد میں اس میں اضافہ ہوئی ہیں، کس بدعت پسند فرقے کی تحریف کا نتیجہ ہیں؟۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ج ا۔ ص ۸۹)

صاحب نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی لکھنوی نے مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی کا قول نقل کیا ہے کہ:

''ان الشیخ ولی اللہ مثلہ کمثل شجرۃ طوبیٰ اصلھا فی بیتہ وفرعھا

فی کل بیت من بیوت المسلمین ،فما من بیت من بیوت المسلمین و امکنتھم الا فیه فرع من تلک الشجرۃ لا یعرف غالب الناس این اصلھا''.الخ

شاہ ولی اللہ کی مثال جنت کے درخت طوبیٰ کی سی ہے، کہ اس کی جڑ تو ان کے گھر میں ہے، لیکن اس کی شاخیں ہر مسلمان کے گھر میں ہے، کسی مسلمان کا گھر اس کی شاخ سے خالی نہیں ہے، گو کہ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اس کی جڑ کہاں ہے؟۔

شاہ صاحب کی وفات ۲۹؍محرم الحرام ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔

ماخذ: المآثر۔اپریل، مئی، جون (۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆☆

محدث کبیر کی اسناد حدیث

اب تک جو سلسلہ سند بیان کیا گیا اس میں تمام علما واساتذہ ہندوستانی ہیں، یہ سلسلہ ہندوستان کی روایتِ حدیث کا گویا سلسلۃ الذہب ہے، ان میں کا ہر فرد معتبر اور قابلِ اعتماد ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو اس ملک میں گرتی ہوئی مسلمانوں کی حکومت کے بعد اسی سلسلے کے علما سے اللہ تعالی [نے] حفاظتِ دین اور نصرتِ سنت وشریعت کا کام لیا ہے۔ان حضرات نے درس و تدریس، تصنیف وتالیف اور مردم سازی ہر اعتبار سے دین کی خدمت کی۔اللہ تعالی نے ان حضرات کی مساعی کو قبول فرمایا، اور آج تک سنت اور شریعت کا اجالا ہندوستان و پاکستان کے طول وعرض میں پھیلا ہوا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر سلسلۂ اسناد کا یہ حصہ جو ہندوستانی علما پر مشتمل ہے، مکمل ہو جاتا ہے، اس کے بعد شاہ صاحب کو اجازتِ روایت مدینہ طیبہ کے ایک عالم ومحدث حضرت شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم بن حسن کردی مدنی سے حاصل ہے۔ یہاں سے سلسلۂ اسناد ہندوستان کے باہر نکل جاتا ہے۔حضرت شاہ صاحب نے اپنے رسالہ ''الارشاد الٰی مہمات الاسناد'' میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے ''العجالۃ النافعۃ'' میں، شیخ محسن ترہتی نے ''الیانع الجنی'' میں، اور عصر حاضر میں حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری ثم مدنی مدظلہ نے ''العقانید الغالیہ من الاسانید العالیہ'' میں اس سند کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، شاہ صاحب کے آگے سند کا سلسلہ یوں ہے۔

(۱) شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم (۲) شیخ ابراہیم بن حسن الکردی (۳) شیخ احمد القشاشی (۴) شیخ احمد بن عبدالقدوس ابوالمواہب الشناوی (۵) شیخ شمس الدین محمد بن احمد بن محمد الرملی (۶) شیخ الاسلام زین الدین زکریا بن محمد ابو یحییٰ الانصاری (۷) شیخ الاسلام الحافظ ابوالفضل

شہاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی (۸) شیخ ابراہیم بن احمد التنوخی (۹) شیخ ابوالعباس احمد بن ابی طالب الحجاز (۱۰) شیخ سراج الدین الحسین بن المبارک الزبیدی (۱۱) شیخ ابوالوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب السنجر ی الہروی (۱۲) شیخ جمال الاسلام ابوالحسن عبدالرحمان بن المظفر الداوٗدی (۱۳) شیخ ابومحمد عبداللہ بن احمد بن حمویہ السرخی (۱۴) شیخ ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر الفربری (۱۵) امیر المومنین فی الحدیث ابوعبدمحمد بن اسماعیل بن ابراہیم البخاری (رضی اللہ عنہم اجمعین) (الیانع الجنی)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے رسالہ ’’انسان العین فی مشائخ الحرمین‘‘ میں اپنے چند مشائخ کا تذکرہ کیا ہے، ہم اسی کی روشنی میں سند کے اندر آئے ہوئے کچھ مشائخ کا تذکرہ تحریر کرتے ہیں۔

(۱) شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنی: (متوفی ۱۱۴۵ھ)

شیخ ابوطاہر کو اوائل عمر ہی سے علم کا بے حد شغف اور علما سے بہت انس تھا، کتب عربیہ کی تعلیم آپ نے سید احمد ادریس مغربی سے حاصل کی۔ فقہ شافعی کی تحصیل شیخ طولونی مصری سے کی، اور معقولات کا استفادہ اپنے وقت کی متبحر عالم منجم باشی سے کیا، اور علم حدیث کی سماعت وقرأت اپنے والد بزرگوار شیخ ابراہیم بن حسن کردی کے حضور کی، والد بزرگوار کے بعد شیخ حسن عجیمی سے بہت کچھ استفادہ کیا، پھر شیخ احمد نخلی اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری کی خدمت میں پہونچے۔ شیخ عبداللہ سے شمائل النبی ﷺ پڑھی، اور انہیں سے مسند احمد دو ماہ سے کم عرصے میں سنی۔ ان کے علاوہ آپ وقتاً فوقتاً حرمین شریفین میں باہر سے آنے والے علما ومشائخ سے بھی بہت استفادہ کیا، ان میں ایک شیخ عبداللہ لاہوری تھے، جن سے آپ نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی کتابیں پڑھیں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں، شیخ سعید کوکنی سے بھی آپ نے بعض عربی کتابیں اور فتح الباری کا چوتھائی حصہ پڑھا۔

آپ سلفِ صالحین کے تمام اوصاف مثلاً تقوی، عبادت، علمی شغف، بحث وتمحیص میں انصاف پسندی سے متصف تھے، جب آپ سے کسی مسئلہ میں رجوع کیا جاتا تو آپ جب تک پوراغور وفکر نہ کر لیتے، اور کتابوں سے اس کی تحقیق نہ کر لیتے، جواب نہ دیتے۔ آپ اس قدر

رقیق القلب تھے کہ جب بھی کوئی ایسی حدیث جس سے قلب میں نرمی اور گداز پیدا ہو، پڑھی جاتی تو بے اختیار آپ کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں، لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ تھا، اپنے تلامذہ اور خدام سے بھی تواضع سے پیش آتے۔

صحیح بخاری کی قرأت کے دوران جب روایات حدیث اور فقہ کے اختلاف سامنے آتے تو شیخ ابوطاہر فرماتے کہ یہ تمام اختلافات سرور کائنات ﷺ کی ''جامعیت کبریٰ'' کے آثار ہیں، جو اپنے اندر کونین کے اضداد و موافقات کو سموئے ہوئے ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک نہایت گہرا نکتہ ہے، جس پر تدبر کرنا چاہئے۔

ایک دن احوالِ صوفیہ پر گفتگو ہو رہی تھی، تو شیخ ابوطاہر نے فرمایا کہ میں صوفیا کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے بہت ڈرتا ہوں، اگرچہ میرے بعض اسلاف بعض صوفیہ کے بارے میں ناقدانہ رائے رکھتے ہیں، مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میرے دل میں ان کے لئے تنقید و تردید کا معمولی جذبہ بھی موجود نہیں ہے۔

اس موقع پر انہوں نے دو قصے سنائے، ان دونوں میں ہمارے زمانے کے ان لوگوں کے لئے جو ذرا سا شوشہ پا کر بے تأمل بزرگوں اور علما پر طعن کرنے لگتے ہیں، بہت کچھ نصیحت کا سامان ہے۔ لوگوں پر زبانِ طعن کھولنے سے پہلے ان کے احوال ومقامات کو پہچاننے کی کوشش کرنی چاہئے، ان کے عذروں کا سراغ لگانا چاہئے، نہ جانے کون کس مرتبہ کا آدمی ہو؟۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں آپ نے ایک قصہ سنایا کہ ''شیخ شاذلی میرے والد سے کچھ اختلاف رکھتے تھے، یہ بات ان کی طرف سے میرے دل میں کھٹکتی تھی، اسی اثنا میں ان کا انتقال ہو گیا، ایک عرصہ کے بعد جب انہیں کسی وجہ سے قبر سے باہر نکالا گیا تو اسی طرح صحیح وسالم تھے، جیسے آج سوئے ہیں بس کسی پر کسی عارف سے اختلاف کی وجہ سے طعن وتشنیع نہیں کرنی چاہئے۔''

یہاں انہوں نے مزید فرمایا کہ شیخ محی الدین بن عربی نے اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب وصیت فرمائی ہے، یہ کہہ کر انہوں نے شیخ ابن عربی کے اپنے قلم سے لکھا ہو''افتوحات'' کا نسخہ نکالا، اور اس میں سے''باب الوصیۃ'' پڑھ کر سنایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ اکبر فرماتے ہیں

کہ ”میں ایک شخص سے اس لئے سے عداوت رکھتا تھا کہ وہ شیخ ابومدین مغربی پر طعن وتشنیع کرتا تھا، جبکہ میں شیخ مغربی کی مقبولیت وبزرگی کا معترف تھا، ایک دن سرکار دوعالم ﷺ کو خواب میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تمہیں فلاں شخص سے کیوں بغض ہے؟ میں نے عرض کیا، اس لئے کہ وہ ابومدین سے عداوت رکھتا ہے، جبکہ میں انہیں بزرگ سمجھتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ کیا وہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے محبت نہیں رکھتا؟ میں نے عرض کی، رکھتا ہے، فرمایا گویا تمہیں ابومدین سے اس کے بغض کی بنا پر عداوت ہے لیکن میرے محبّ ہونے کی حیثیت سے الفت نہیں۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں، اس کے بعد میں نے اللہ کے حضور اس کے بغص سے توبہ کی، اور اس شخص کے گھر گیا، اسے معذرت کے ساتھ سارا واقعہ سنایا، اور ایک قیمتی کپڑا اس کی نذر کر کے اسے راضی کیا۔ اس کے بعد میں نے ابومدین سے اس کی ناراضگی کا سبب پوچھا، اس نے جو وجہ بتائی وہ ایسی نہ تھی کہ اس کی بنا پر ابومدین سے عداوت رکھی جائے، میں اسے حقیقت حال سمجھائی، جس پر اس نے خدا تعالی سے توبہ کی، ابومدین کے بارے میں طعن وتشنیع سے رجوع کرلیا، اس طرح سب کے دلوں میں الفتِ نبی کی برکات جاری ساری ہوگئیں۔ والحمدللہ علیٰ ذالک

جس روز شاہ صاحب کو وطن واپس ہونا تھا، اور وہ آخری ملاقات وکلام کے لئے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت بے اختیار شاہ صاحب کی زبان پر یہ شعر آ گیا۔

نسيت كل طريق كنت اعرفه

ا لا طر يقاً يو د يني لر بعكم

میں تیرے گھر کی طرف جانے والے راستے کے علاوہ سب راستے جنہیں میں جانتا پہچانتا تھا، بھول گیا۔ یہ شعر سنتے ہی شیخ ابوطاہر مدنی پر گریہ طاری ہوگیا، اور بہت متاثر ہوئے۔ آپ کا وصال رمضان المبارک ۱۱۴۵ھ کو ہوا۔

(۲) شیخ ابراہیم بن حسن کردی: (متوفی ۱۰۷۱ھ)

آپ عالم وعارف تھے، فقہ شافعی، حدیث اور عربی ادب میں مہارت کاملہ رکھتے تھے، ان تمام علوم میں آپ کی تصانیف موجود ہیں۔ آپ نے اپنے وطن میں علم کی تکمیل فرمائی، پھر حج کے ارادے سے نکلے اور تقریباً دو سال تک بغداد میں مقیم رہے، اس کے بعد آپ نے شام میں

چار سار سال قیام فرمایا، پھر مصر ہوتے ہوئے حرمین شریفین تشریف لائے، اور شیخ احمد قشاشی سے ملاقات کی، دونوں کے درمیان گہرے روابط اور مستحکم تعلقات قائم ہوگئے۔ شیخ ابراہیم کردی نے شیخ قشاشی سے حدیث کی روایت کی، ان سے خرقہ پہنا، اور ان کی صحبت کے فیض سے اعلیٰ کمالات پر فائز ہوئے۔ آپ فارسی، کردی، ترکی اور عربی سب زبانوں کے ماہر تھے، آپ ذہانت وذکاوت، تبحر علم، زہد وانکسار، صبر وحلم اور ہمت وحوصلہ وغیرہ اوصافِ حمیدہ سے آراستہ تھے۔

شیخ ابوطاہر کا بیان ہے کہ بادشاہ روم کا استاذ جسے وہاں کے لوگ ''خوجہ'' کہتے ہیں، مدینہ منورہ کی زیارت کو آیا، اور علما واحباب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ شیخ ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا، ملاقات کے دوران اس نے شیخ سے کہا کہ میں نے شام میں ایک کھلم کھلا بدعت دیکھی، جس کا قلع قمع کرنے میں مَیں نے انتہائی کوشش سے کام لیا۔ شیخ فرمایا کہ وہ بدعت کیا تھی؟ کہنے لگا مساجد میں ذکر بالجہر، شیخ نے یہ آیت پڑھی۔ ''**ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعی فی خرابھا**'' اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے؟ جو اللہ کی مسجدوں میں نام خدا لینے سے روکے، اور ان کی ویرانی کی کوشش کرے۔

خوجہ کا رنگ متغیر ہوگیا، وہ نہایت مشکل میں پڑ گیا ''فتاویٰ قاضی خاں'' وغیرہ سے فقہ کی چند جزئیات جو لکھ کر لایا تھا، جیب سے نکالیں، اور شیخ کے ہاتھ میں تھما دیں۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر تقلید کی بات ہے تو میں کسی کا مقلد ہوں، اور آپ کسی اور کے۔ اس لئے اس صورت میں آپ کے دلائل تسلیم کر لینا میرے لئے ضروری نہیں، اور اگر تحقیق مطلوب ہے تو بندہ حاضر ہے۔ حضرت شیخ نے بہت جلد ایک مدلل رسالہ تحریر فرمایا، اور خوجہ کے شبہات کے مسکت جوابات دیئے، چونکہ شیخ کے احباب نے خوجہ کے تغیر مزاج کو دیکھ لیا تھا، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ دولت عثمانیہ میں بلند رتبے پر فائز ہے، اس لئے انہوں نے شیخ سے عرض کیا کہ اس قدر تردید مناسب نہیں ہے، شیخ نے کہا کہ ''حق بات کہنے سے نہیں ٹلنا چاہئے''۔

شیخ ابراہیم سادہ مزاج اور پاکباز عالم تھے، خود پسند، فقہا اور صوفیہ کی طرح بڑے بڑے عمامے، لمبی لمبی آستینیں اور پھٹے پرانے نمائشی لباس نہیں پہنتے تھے، بلکہ اہل حجاز کی طرح متوسط درجے کا لباس پہنتے تھے، جو مختصر سی پگڑی، اون کی دھاری دار عبا اور بڑے رومال پر مشتمل

ہوتا،آپ محفل میں نمایاں جگہ بیٹھنے،اور گفتگو میں پہل کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے،اگران سے کوئی کسی کے بارے میں سوال کرتا تو توقف فرماتے، یہاں تک کہ تحقیق وانصاف کے ساتھ اس اشکال کوحل کردیتے،آپ کی مجلس نمونۂ جنت تھی۔

آپ کی تاریخ وفات اس زمانے کےایک خطیب نے ان الفاظ میں نکالی ہے۔

والله انا علی فراقک یا ابراهیم لمحزونون.

۱۰۷۱ھ

(۳) شیخ احمد قشاشی:(متوفی ۱۰۷۱ھ)

آپ محمد بن یونس القشاشی کے فرزندارجمند ہیں،آپ کوقشاشی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے مدینہ منورہ میں قشاشہ فروشی کی دوکان کیا کرتے تھے، قشاشہ پرانے سامان کو کہتے ہیں،مثلاً دواتیں، پرانے جوتے،اوراسی طرح کی دوسری اشیاء۔ آپ کے والد بزرگوارمحمد مدنی بھی عالم اورمردصالح تھے،شیخ احمد قشاشی علمِ حقیقت وشریعت کے امام تھے،حقائق معرفت کے بارے میں آپ کی گفتگو آیات واحادیث سے مدلل ہوتی تھی،کئی مشائخ کی صحبت میں رہے،اورخرقۂ خلافت اپنے والد سے حاصل کیا،مگرانہیں گوہرمقصود شیخ احمد شناوی سے حاصل ہوا،اسی لئے انہوں نے خودکوانہیں کی طرف منسوب کیا۔

شیخ قشاشی کی زندگی عین سنت کے مطابق تھی،تکلف سے خالی،اورسراپا اعتدال،آپ امراء کے یہاں کبھی نہیں جاتے تھے،اوراگروہ خودان کی زیارت کوآتے تو خوش خلقی اور بشاشت سےان کے ساتھ ملاقات کرتے،اور ہرایک سےاس کی قدرومنزلت کے موافق سلوک فرماتے، قوم کے سردار کی بہت عزت فرماتے۔آپ نیک بات کی بڑی نرمی کے ساتھ تلقین فرماتے،اور زیارت کرنے والوں کونصیحت کے بغیر جانے نہ دیتے۔

شیخ عیسیٰ مغربی نے آپ کے بارے میں کہا کہ’’جب بھی میں شیخ قشاشی کی محفل سے اٹھا تو دنیا میری نظروں میں حقیر ترین اور میرا نفس انتہائی ذلیل ہوتا تھا،خواہ میں کتنی بار بھی ان کے پاس حاضر ہوتا،میرا تاثر اپنی جگہ قائم رہتا‘‘۔

آپ نے ۱۹؍ذی الحجہ ۱۰۷۱ھ میں انتقال فرمایا۔رحمہ اللہ تعالی

(۴) شیخ احمد شناوی: (متوفی ۱۰۲۸ھ)

آپ علی بن عبدالقدوس بن محمد عباس شناوی کے فرزند ہیں، آپ کے آباء واجداد اولیائے کبار ہوئے ہیں، شیخ عبدالوہاب شعراوی نے ان کے کچھ حالات لکھے ہیں، آپ علوم شریعت وطریقت کے جامع تھے، علم حدیث شیخ شمس الدین رملی، اوراپنے والد بزرگوار، سید غضنفر اور شیخ محمد بن ابی الحسن بکری سے حاصل کیا، اوراپنے والد بزرگوار سے خلافت پائی۔ ان کی صحبت کے بعد سید صبغۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اوران کے ہاتھوں بھی خرقۂ خلافت پہنا، آپ ان کی صحبت سے درجات عالیہ پر پہونچ کر ان کے خلیفہ بنے۔

آپ کا وصال ۱۰۲۸ھ میں ہوا، جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(۵) شیخ شمس الدین رملی: (متوفی ۱۰۰۴ھ)

محمد بن احمد حمزہ شمس الدین رملی اپنے عہد میں مصر کے نامور فقیہ تھے، فتاوی کے سلسلے میں مرجع امام تھے، ان کو ''شافعی صغیر'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ آپ کی نسبت رملہ کی طرف ہے، لیکن آپ کی پیدائش اور وفات دونوں قاہرہ میں ہوئی ہے، آپ نے بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے ہیں، ان میں ''نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج'' مشہور ہے۔ ''فتاوی شمس الدین رملی'' بھی معروف ہے۔ ۱۰۰۴ھ میں انتقال فرمایا۔ (الاعلام للزرکلی ۶/۲۲۵)

(۶) شیخ الاسلام زکریا انصاری: (متوفی ۹۲۵ھ)

مشہور شافعی قاضی وعالم اور حافظ حدیث تھے، ۸۲۳ھ میں مصر میں پیدا ہوئے، قاہرہ میں تعلیم پائی، ابتدا میں بہت غریب تھے، اکثر فاقہ ہوتا تھا، بھوک سے بیتاب ہوتے تو رات میں سبزی فروشوں کے بازار میں جاتے، اور گرے پڑے خربوزوں کے چھلکے اٹھا لیتے اور انہیں دھوکر کھا لیتے۔ بعد میں جب ان کے علم وفضل کا شہرہ ہوا تو اللہ تعالی نے خوب دولت وثروت عنایت فرمائی، انہوں نے اپنی دولت کا خوب فائدہ اٹھایا، ایک بڑا کتب خانہ بنایا، جس میں عمدہ اور نادر کتابیں جمع کیں، اس کے علاوہ اہل علم کی بہت مدد کیا کرتے تھے۔ بادشاہ وقت نے انہیں قاضی القضاۃ بنانا چاہا، انہوں نے شدت سے انکار کردیا، پھر بہت اصرار کے بعد اس منصب کو قبول کرلیا، مگر انہیں محسوس ہوا کہ بادشاہ بعض امور میں جادۂ حق سے منحرف ہے، انہوں نے نصیحت کی

اور ظلم سے باز رہنے کی تلقین کی، اس پر بادشاہ ناراض ہوگیا، اور انہیں معزول کردیا، یہ پھر اپنے علمی مشاغل کی طرف لوٹ آئے، ان کی تصانیف بہت ہیں۔

۴؍ذی الحجہ ۹۲۵ھ میں وصال ہوا۔ (الاعلام ۳؍۸۰)

(۷) حافظ الدنیا شیخ الاسلام احمد بن علی بن حجر عسقلانی: (متوفی ۸۵۲ھ)

احمد بن علی نام، ابوالفضل کنیت، شہاب الدین لقب ہے، ابن حجر کے نام سے معروف ہیں۔ حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ آپ کے سلسلہ نسب میں کوئی صاحب اس نام کے تھے انہیں طرف یہ نسبت ہے۔ (الضوء اللامع ۲؍۳۶)

انہیں عسقلانی بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ آپ کے آباء واجداد فلسطین کے ساحلی علاقہ میں ''عسقلان'' نامی ایک بستی میں آباد تھے، پھر وہ لوگ مصر میں منتقل ہوگئے، مصر ہی میں حافظ ابن حجر کی ولادت ہوئی۔

حافظ موصوف کی ولادت ۲۲؍شعبان ۷۷۳ھ کو ہوئی، دو سال کی عمر ہوئی تو والدہ کی وفات ہوگئی، اور چار سال کی عمر کو پہونچے تو والد بھی داغ یتیمی دے گئے، علوم کی تحصیل مصر میں کی، پھر مکہ مکرمہ حاضری ہوئی، وہاں بھی استفادہ کیا۔

قوتِ حفظ اور ذکاوت وذہانت خداداد تھی، مکتبی تعلیم کے دوران ہی علم اسماء الرجال سے دلچسپی پیدا ہوئی، اور رواۃِ حدیث اور ان کے حالات کا اچھا خاصا ذخیرہ حافظہ میں محفوظ ہوگیا، ۲۰؍سال کی عمر میں حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی، لیکن اس کی طرف پورا انہماک اور بالکلیہ انقطاع ۲۳؍سال کی عمر میں ہوا، پھر تو وہ کیفیت ہوئی کہ:

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ یار کہ تکرار می کنیم

ہم جو کچھ پڑھا لکھا تھا یکسر فراموش کردیا ہے، بس ایک ''حدیث یار'' ہے کہ اسی کو دہرائے جارہے ہیں۔

دس سال تک اس وقت کے سب سے بڑے شیخ الحدیث حافظ زین الدین عراقی سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ حافظ صاحب کے تلامذہ بھی بہت ہیں، اور ان کی تصنیفات بھی بہت

ہیں، اور سب کی سب اعلی پایہ کی، نہایت مستند اور محقق، علم حدیث کا کوئی طالب علم ان کی کتابوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ بخاری شریف کی شرح ''فتح الباری'' لکھ کر اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ اس کے بارِ احسان سے آج تک علما کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔

حافظ ابن حجر سرعتِ مطالعہ وقرأت میں بے نظیر تھے، کسی کتاب کو وہ اتنی جلدی پڑھ لیتے کہ عقل حیران ہوجاتی ہے، انہوں نے پوری صحیح بخاری از اول تا آخر دس مجلسوں میں پڑھی تھی، اور یہ مجلس بس ظہر کے بعد سے عصر تک ہوتی تھی، اگر دونوں کا درمیانی وقفہ تین گھنٹے مان لیا جائے تو گویا تیس گھنٹے میں کتاب کی قرأت مکمل ہوئی، اور یہ پڑھنا صرف سرسری نہ تھا، بلکہ فہمِ مطالب اور اخذِ معانی کے ساتھ تھا۔ اسی طرح صحیح مسلم ڈھائی دن میں پڑھی، دمشق میں وہ صرف ستر دن رہے، اس دوران انہوں نے مختلف کتابوں کی تقریباً سو جلدیں پڑھیں، اور صرف پڑھا ہی نہیں، ان کے منتخبات کے نوٹ بھی تیار کرتے رہے۔

علم وفضل کا یہ روشن آفتاب ۲۸/ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو قاہرہ میں غروب ہوگیا، ان کے جنازہ میں اہل علم کا اتنا بڑا مجمع تھا جس کی نظیر نہیں ملتی، خود بادشاہِ مصر بھی جنازہ میں حاضر تھا، حق تعالی ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ (مقدمہ المطالب العالیہ۔ از۔ محدث کبیر الاعظمی)

(۸) شیخ ابراہیم بن تنوخی: (متوفی ۸۰۰)

مشہور عالم تھے، اصلاً رہنے والے بعلبک کے تھے، پھر شام میں منتقل ہوئے، اس کے بعد قاہرہ آگئے تھے۔ ۷۰۹ھ یا ۷۱۰ھ میں پیدا ہوئے، فن تجوید وقرأت کے زبردست امام تھے، فن حدیث میں ابوالعباس الحجار اور دوسرے اکابر علما سے استفادہ کیا، فقہ وحدیث کے بھی امام تھے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ''میں ان کی صحبت میں مدتوں رہا ہوں، اور ان سے بہت فوائد حاصل کئے ہیں''۔ اخیر میں نابینا ہوگئے تھے، اور زبان بھی ناصاف ہوگئی تھی۔

جمادی الاول ۸۰۰ھ میں انتقال ہوا۔

(۹) مسند الدنیا شہاب الدین احمد بن ابی طالب الحجار: (متوفی ۷۳۰ھ)

دمشق کے رہنے والے تھے، امام برزالی نے فرمایا کہ ''ان ولادت ۶۲۳ میں ہوئی'' (شذرات الذہب ۶/۹۳) بخاری شریف انہوں نے شیخ سراج حسین بن المبارک زبیدی سے

۶۳۰ھ میں سنی۔مولانا عاشق الٰہی بلندشہری نے ''العقانید الغالیہ'' میں لکھا ہے کہ یہ ۶۲۴ھ کے قریب پیدا ہوئے، بلکہ اس سے پہلے، کیوں کہ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ''میں نے ۷۰۶ھ میں ان سے ان کی عمر کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ناصر نے جب دمشق کا محاصرہ کیا تھا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے''۔ یہ واقعہ ۶۲۶ھ کا ہے،ان کی پیدائش اگر ۶۲۳ھ کی مان لی جائے تو محاصرہ کے وقت ان کی عمر فقط تین برس ہوگی،اتنی چھوٹی عمر کے بچے کو کسی واقعہ کا اچھی طرح یاد رہ جانا قدرے مستبعد ہے،اس لئے اس سے پہلے کی پیدائش تسلیم کی جانی چاہئے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو،ان کا سماع ابن زبیدی سے کم عمری میں ہوا،ابن زبیدی کے علاوہ دوسرے مشائخ اور محدثین سے بھی ان کا سماع ثابت ہے،اوران حضرات نے انہیں روایتِ حدیث کی اجازت دی ہے۔

انہوں نے بہت طویل عمر پائی،اخیر میں ابن زبیدی کے شاگرد یہی تنہا رہ گئے،سماع کے سو سال کے بعد ۷۳۰ھ میں ان کا وصال ہوا۔۷۰۶ھ میں ان کی شہرت کا آغاز ہوا،اس کے بعد بکثرت علما نے ان سے بخاری شریف کا سماع کیا۔شیخ موصوف امی تھے،جب تلامذہ کے ہجوم سے فرصت پاتے تو پتھر کاٹنے والوں کے ساتھ پہاڑوں میں چلے جاتے،اور پتھر کاٹتے رہتے، اس مناسبت سے انہیں ''حجار'' کہا جاتا ہے۔بسا اوقات اسی حال میں طلبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتے،وہ انہیں پڑھنے کا حکم دیتے،طلبہ حدیث سنانے لگتے۔حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی طالب علم حدیث کی سند میں کچھ ادھرادھر کردیتا تو آپ فرماتے کہ میں نے اس طرح نہیں سنا ہے، پھر اصل سند سنا کر اس کی تصحیح کرتے۔(شذرات الذہب ۹۳/۲)

شیخ حجار کو ان کی سندِ عالی کی وجہ سے متعدد شہروں اور ملکوں میں نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ دعوت دی گئی،اور لوگوں کی درخواست پر قاہرہ،مصر،حماۃ،بعلبک،حمص وغیرہ تشریف لے گئے،ستر مرتبہ سے زیادہ انہوں نے اپنے تلامذہ کو بخاری شریف سنائی۔حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ''امام زبیدی سے ان کے سماع کا پتہ لوگوں کو ۷۰۶ھ میں چلا،اس سے محدثین کو بہت خوشی ہوئی، پھر تو ان سے بخاری شریف تقریباً ساٹھ مرتبہ پڑھی گئی''۔اپنے بارے میں حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''ہم نے بھی ان سے دارالحدیث الاشرفیہ میں تقریباً پانچ سو اجزاء کی سماعت و اجازت کا شرف حاصل کیا ہے،اوران سے مصروشام کے اتنے لوگوں نے استفادہ کیا جن کا شمار

نہیں ہوسکتا۔

شیخ بہت خوبصورت اور وجیہہ تھے،طبیعت بہت پاکیزہ پائی تھی،اور ہوش وحواس اور طاقت اخیر تک قائم رہی،حالانکہ ان کی عمر سو تو یقیناً تھی،کیوں کہ ۶۳۰ھ میں امام زبیدی سے انہوں نے بخاری شریف کی سماعت کی،اور ۹/صفر ۷۳۰ھ کو انہوں نے بخاری شریف سنائی،جس میں مَیں شریک تھا''۔والحمدللہ (البدایۃ والنہایۃ ۱۴/۱۵۰)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ جس دن ان کا انتقال ہوا ہے اس دن بھی بخاری شریف سنائی تھی (شذرات الذہب ۲/۹۳) حافظ سخاوی نے ''فتح المغیث''میں لکھا ہے کہ ان سے ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں نے بخاری شریف کی سماعت کی ہے۔

۲۵/صفر ۷۳۰ھ کو دمشق میں انتقال ہوا۔

(۱۰) شیخ سراج الدین حسین بن المبارک الزبیدی: (متوفی ۶۳۱)

ابوعلی حسین بن ابی بکر المبارک زبیدی ثم بغدادی نیک وصالح شیخ تھے،حنفی تھے،بہت سے علوم کے ماہر اور فاضل تھے۔(البدایۃ والنہایۃ ۱۳/۱۳۳)

''الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ''میں شیخ عبدالقادر قرشی لکھتے ہیں کہ''انہوں نے ابوالوقت عبدالاول سنجری سے حدیث کی سماعت کی،طویل عمر پائی،ان سے تلمذ کی وجہ سے چھوٹی عمر والے بھی بڑوں کی صف میں آگئے۔میں نے امام نووی کی تحریر دیکھی ہے،انہوں نے لکھا ہے کہ یہ ثقہ تھے۔۲۴/صفر ۶۳۱ھ میں انتقال ہوا (۱/۲۱۶) ولادت ۵۴۶ھ میں ہوئی تھی (شذرات)

مولانا عاشق الٰہی بلندشہری فرماتے ہیں کہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ۔ص ۱۴۱۳ میں ان کا سن وفات ۶۲۹ھ لکھا ہے،لکھتے ہیں''**وفیھا توفی.....والامام المسند ابوعلی الحسین بن المبارک بن محمد بن الزبیدی البغدادی الحنفی**''۔نیز حافظ ابن کثیر نے بھی''البدایۃ والنہایۃ''میں ۶۲۹ھ میں لکھا ہے،لیکن بظاہر صحیح وہی ہے جو حافظ قرشی نے لکھا ہے،کیوں کہ ابن کثیر نے شیخ حجار کے تذکرہ میں خود لکھا ہے کہ انہوں نے زبیدی سے بخاری کی سماعت ۶۳۰ھ میں کی ہے۔(العقانید ۱۴۵)''شذرات الذہب''میں حافظ ابن عماد حنبلی نے بھی ۶۳۱ھ میں لکھا ہے،البتہ تاریخ ۱۳/صفر بتلائی ہے۔(شذرات الذہب ۵/۱۴۴)

شیخ حجار اور شیخ زبیدی دونوں حنفی محدث ہیں، علامہ سخاوی نے ''الضوء اللامع'' اور ''التبر المسبوک'' میں لکھا ہے کہ بدرالدین عینی کی روایت ابن الکشک سے، ان کی حجار سے، ان کی زبیدی سے ایک لطیف اسناد ہے، کیوں کہ چاروں حنفی ہیں۔ اور ابن کثیر نے ''بدایہ'' میں اور حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں تصریح کی ہے کہ حسین بن مبارک حنفی ہیں۔ (العقانید ۱۴۵)

لیکن صاحبِ شذرات نے انہیں حنبلی لکھا ہے، اور لکھتے ہیں کہ **"قــرأ الــقــرآن بـالـروايـات وتفقه فی المذهب وافتی وكانت له معرفة حسنة وصنف تصانيف منها "كتاب البلغه فی الفقه" وله منظومات فی اللغة والقرأت وكان فقيهاً فاضلاً ديـنـاخيـر احسـن الاخـلاق متواضعاً وحدث بغداد ودمشق وحلب وغيرها من البـلاد وسـمـع مـنـه امـم وروى مـنه خلق كثير من الحفاظ وغيرهم** ۔(شذرات الذہب ۱۴۴/۵)

قرآن کو مختلف روایات سے پڑھا، فقہ میں مہارت حاصل کی، اور فتوی دیتے رہے، انہیں علم ادب میں اچھا درک تھا، متعدد کتابیں لکھیں، فقہ میں ایک ''کتاب البلغہ'' تصنیف کی، فن لغت، اور قرأت میں کئی نظمیں لکھیں، فقیہ تھے، صاحب فضل وکمال تھے، اچھے دین دار، بااخلاق، متواضع تھے۔ بغداد، دمشق اور حلب وغیرہ میں حدیث کا درس دیا، ان سے بہت سارے لوگوں نے حدیث پڑھی، اور حفاظ حدیث کی ایک بڑی تعداد نے ان سے حدیث کی روایت کی۔

(۱۱) شیخ ابوالوقت عبدالاول عیسیٰ السنجری: (متوفی ۵۵۳ھ)

حافظ ذہبی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"مسـنـدالدنيا ابوالوقت عبدالاول بن عيسىٰ بن شعيب السنجرى ثم الهـروى الـمـالـيـنـى الـصـوفى الزاهد سمع الصحيح ومسند الدارمى وعبدبن حميد من جمال الاسلام الداؤدى فى سنة خمس وستين واربع سنة.

شیخ عبدالاول صوفی زاہد تھے، صحیح بخاری اور مسند دارمی اور مسند عبد بن حمید شیخ جمال الاسلام داؤدی سے ۴۶۵ھ میں پڑھی۔ بغداد تشریف لائے تو خلقت کا ہجوم ہوگیا، بہت نیک، متواضع اور محبت کرنے والے بزرگ تھے، نیک سیرت، پختہ دین دار تھے، روایت حدیث سے

خاص شغف تھا۔ ٦ / ذی القعدہ ۵۵۳ھ میں وصال ہوا۔ (العبر فی خبر من غبر ۱۵۱)

ابن شہبہ نے ''تاریخ الاسلام'' میں لکھا ہے کہ ان کے والد انہیں ہرات سے بوشیخ لے آئے، وہاں انہوں نے صحیح بخاری اور دوسری بعض کتابیں شیخ جمال الاسلام داؤدی سے سماعت کیں، آخر عمر میں حج کا ارادہ کیا، اوراس کے لئے اسباب مہیا کر لئے تھے لیکن مقدر نہ تھا، انتقال ہوگیا۔ آخری بات جوان کی زبان مبارک سے ادا ہوئی، یہ آیت تھی۔ ''**یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی واجعلنی من المکرمین**(یٰس). اے کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے میری مغفرت فرمادی، اور مجھے معزز لوگوں میں شامل کردیا ہے۔ (شذرات الذہب ۴/ ۱٦٦)

(۱۲) شیخ ابوالحسن عبدالرحمان بن مظفر داؤدی جمال الاسلام: (متوفی ۴٦۷ھ)

حافظ ذہبی ۴٦۷ھ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ:

''**جمال الاسلام عبدالرحمان بن محمد بن المظفر البوشیخی شیخ خراسان علماً وفضلاً وجلالۃً وسند اًروی الکثیر عن ابی محمدبن حمویہ وھو آخر من حدث عنہ وتفقہ علی القفال المروی ابی الطیب الصلعوکی وابی حامد الاسفرائینی وتوفی فی شوال ولہ اربع وتسعون سنۃ**''. (العبر فی خبر من غبر ۳/ ۲٦۴)

شیخ جمال الاسلام علم وفضل، جلالت قدر اور سند کے لحاظ سے خراسان کے شیخ ہیں، ابومحمد بن حمویہ سے بکثرت روایت کی، اور وہ ان کے آخری تلمیذ ہیں، قفال مروزی، ابوطیب صلعوکی اور ابوحامد اسفرائینی کی صحبت میں رہ کر فقہ کی مہارت حاصل کی۔ شوال ۴٦۷ھ میں انتقال ہوا، اس وقت ان کی عمر ۹۴ / سال کی تھی۔

(۱۳) شیخ ابومحمد عبداللہ بن احمد السرخسی: (متوفی ۳۸۱ھ)

عبداللہ بن احمد بن حمویہ ابومحمد السرخسی ،المحدث الثقہ روی عن العربری صحیح البخاری وروی عن عیسیٰ بن عمر السمرقندی کتاب الدارمی وروی عن ابراھیم بن خزیم مسند عبد بن حمید وتفسیرہ ،

توفی فی ذی الحجه و له ثمانون سنةً۔ (العبر ۱۷)

شیخ ابومحمد عبداللہ بن احمد بن حمویہ سرخسی ثقہ محدث ہیں، صحیح بخاری کی روایت انہوں نے شیخ محمد بن یوسف فربری سے کی، اور سنن دارمی عیسیٰ بن عمر سمرقندی سے پڑھی، اور مسند عبد بن حمید اوران کی تفسیر ابراہیم بن خریم سے پڑھی۔ ذی الحجہ ۳۸۱ھ میں ۸۸؍سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(۱۴) شیخ محمد بن یوسف فربری: (متوفی ۳۲۰ھ)

یہ براہ راست امام بخاری کے شاگرد ہیں، ۲۳۱ھ میں ان کی ولادت ہوئی، انہوں نے امام بخاری سے صحیح بخاری کی سماعت دوبار کی ہے، ایک فربر میں، دوسری بار بخارا میں ۲۵۲ھ میں۔ (فتح الباری ۱؍۴)

مشہور ہے کہ امام بخاری سے ان کی کتاب ستر ہزار آدمیوں نے سماعت کی ہے، ان میں آخری فرد جوزندہ رہے، شیخ فربری تھے، لیکن حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ خبر دیتے ہیں کہ صحیح بخاری کی امام بخاری سے روایت کرنے والے آخری فرد ابوطلحہ منصور بن محمد النبر دوی ہیں، ان کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی، جبکہ شیخ فربری کا انتقال ۳۲۰ھ میں ہوا ہے۔ البتہ بخاری کے تلامذہ میں سے ایک صاحب اور بھی ان کے بعد تک زندہ رہے ہیں، وہ قاضی حسین بن اسماعیل محاملی ہیں، لیکن ان کو ''الجامع الصحیح'' کا سماع حاصل نہیں ہے، بلکہ امام بخاری جب آخری مرتبہ بغداد تشریف لائے تھے تو املا کی چند مجالس انہوں نے منعقد کی تھیں، جس میں یہ شریک ہوئے تھے، جن لوگوں نے محاملی کے طریق سے صحیح بخاری کی روایت کی ہے، ان سے کھلی غلطی ہوئی۔ (فتح الباری ۱؍۴)

شیخ فربری ثقہ اور متقی تھے، ان سے بخاری شریف کی سماعت بکثرت لوگوں نے کی ہے، بخاری کے راویوں میں سب سے بہتر اور معتمد یہی ہیں۔

حضرت اقدس محدث کبیر علیہ الرحمہ کو دوسرے طریق سے بھی بخاری شریف کی اجازت حاصل ہے، ان کی قدرے تفصیل اس کے بعد والے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔ جولائی، اگست، ستمبر (۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆☆

محدث کبیر کی اسناد حدیث

حضرت محدث کبیر نور اللہ مرقدہ کا ایک سلسلہ سند آپ نے ان کے استاذ حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی علیہ الرحمہ سے امام بخاری تک قدرے تفصیل سے ملاحظہ فرمالیا، اب ہم حضرت کی دوسری سند کی قدرے تفصیل کرنا چاہتے ہیں، اس سلسلہ سند میں آپ کے استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی نور اللہ مرقدہ ہیں، حضرت نے اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ انہیں سے استفادہ کیا ہے۔ حضرت خود فرماتے ہیں کہ ''ناچیز کو بھی آپ ہی خدمت میں کچھ شد بد حاصل ہوئی ہے''۔(اعیان الحجاج ۔ج ۲۔ص ۲۸۳) لیکن صحاح ستہ بجز ترمذی شریف کے ان سے درساً نہیں پڑھی ہے، تاہم ان سے حدیث کی تمام کتابوں کی اجازت آپ کو حاصل ہے۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئوی علیہ الرحمہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی محدث قدس سرہ کے شاگرد ہیں، حدیث کی کتابیں انہوں نے حضرت گنگوہی سے پڑھی ہیں، اور ''مسلسلات'' کی اجازت انہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ سے، نیز حضرت مولانا عبدالحق صاحب الہ بادی ثم المکی شیخ الدلائل [۱] سے بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ''رسالۃ الاوائل'' میں اجمالاً اس طرح ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

''قد اجازنی الشیخ المذکور مولانا عبدالغفار مشافھة بجمیع ما تصح لہ روایتہ عن شیوخہ مولانا رشید احمد الکنکوھی ومولانا اشرف علی التھانوی ومولانا عبدالحق وغیرھم رحمھم اللہ عن کتب الصحاح والجوامع والسنن والمسانید والمسلسلات وغیر ھا من مجامیع الحدیث

والاوراد والاذکار وغیرھا"۔

یعنی مجھ کو حضرت مولانا عبدالغفار صاحب نے کتب صحاح، جوامع ،سنن، مسانید، مسلسلات، اوران کے علاوہ حدیث اوراوراد واذکار کے دوسرے مجموعے، جن کی روایت کی اجازت انہیں ان کے شیوخ ،حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ،حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا عبدالحق صاحب الہ بادی وغیرہ (رحمہم اللہ) سے ہے، ان سب کی اجازت مجھے زبانی عطافرمائی ہے۔

اس سند کی کسی قدر تفصیل ذکر کرنی مناسب ہے، گوکہ اس سند میں حضرت گنگوہی اور حضرت تھانوی بہت معروف ومشہور ہیں، ان کے ذکر کی چنداں حاجت نہیں ہے، لیکن جس طرح اورمشائخ کا اس ترتیب میں ذکر آیا ہے، اس کا تقاضہ ہے نیز یہ کہ بزرگوں اور اللہ والوں کا ذکر باعثِ برکت ہوتا ہے، اس لئے پچھلے انداز پرسبھی حضرات کا تعارف تحریر کردینا مناسب ہے۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی:

مولانا عبدالغفار صاحب کا دادیہالی خاندان اصلاً قاسم آباد ضلع غازی پور کا باشندہ تھا، مولانا کے دادا کے دادا شیخ ہمت علی نے قاسم آباد کی سکونت ترک کر کے مئو کو وطن بنایا۔مئو ہی میں مولانا ۲۰ رصفر ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے ،مولانا کے دادا شیخ تراب علی اور پردادا شیخ میہاں ،سیدزاہد علی نصیرآبادی سے بیعت تھے، اورمولانا کے والد شیخ عبداللہ، حضرت چاندشاہ صاحب کے مرید تھے۔چاندشاہ صاحب اپنے وقت کے قوی النسبت بزرگ تھے، جن سے فیض آباد، اعظم گڑھ، جونپور وغیرہ اضلاع میں بہت فیض پھیلا،مولانا عبدالغفار صاحب نے اپنے والد کے حالات میں لکھا ہے کہ:

"جب چاندشاہ صاحب ساکن ٹانڈہ سے مرید ہوئے اور دوتین سال تک برابر آپ کی خدمت میں حاضر رہے، تصوف کا ایسا مذاق ہوا کہ سب کاروبار چھوڑ کر عزلت گزیں اور پورے متوکل ہوگئے۔دس بارہ برس تک بجز ذکر وشغل اور کچھ مشغلہ نہ تھا، آپ کا دل تصوف سے ایسا رنگ گیا کہ ظاہری نمائش اور تصنع اور تکلف سے سخت نفرت ہے، دنیا پرست ابلہ فریب کو اپنی فراست سے بہت جلد پہچان لیتے ہیں، مذہب حنفی اورمشرب نقشبندی رکھتے ہیں، اسی وجہ سے سنت کی پابندی اور بدعت سے اجتناب خاص آپ کا مسلک ہے، کیمیائے سعادت اورسراج

السالکین وغیرہ کوآپ نے مکرر دیکھا ہے،ان کتابوں کے بہت مضامین آپ کومحفوظ ہیں۔
(نخبۃ الاخبارمن سوانح ابی الانوار۔ص۷۱)

گویا یہ خاندان اباً عن جدٍ بزرگوں کا خاندان تھا،جس میں محبتِ خداوندی،ذکر الٰہی، حبِ نبوی،اورفکرِ آخرت کا چرچا تھا۔شیخ عبداللہ کے تین بیٹے تھے،مولانا عبدالغفار صاحب، مولانا ابوالبرکات صاحب،مولانا ابوالحسن صاحب،شیخ صاحب نے تینوں کوعلم دین میں لگایا،اور ماشاءاللہ تینوں چندے آفتاب اور چندے ماہتاب بنے۔

شیخ صاحب فارسی زبان کے ماہر تھے،ابتداء اردو فاسی کی تعلیم مولانا عبدالغفار صاحب کوانہیں نے دی، پھرفارسی کی انتہائی کتابیں مئو کے دوسرے اساتذہ کے پاس آپ نے پڑھیں،اس زبان میں جب پوری مہارت حاصل ہوگئی،تو عربی کی طرف متوجہ ہوئے،اور بہت کد وکاوش اور تحقیق وتدقیق کے ساتھ نحو،صرف،فقہ،اصول فقہ،بلاغت،فرائض،حساب ، اقلیدس،اورطب کی کتابیں،مختلف کامل الفن اساتذہ کی خدمت میں پڑھیں۔ایک کتاب پڑھ چکے ہوتے ،لیکن دوسرا استاذ عمدہ پڑھانے والامل جاتا تواس سے بھی پڑھتے ،اس کے لئے انہوں نے مئو کے علاوہ نوانگر ضلع بلیا،غازی پور،مرزاپور،اورلکھنو کا سفر کیا،مئو میں مولانا جمال الدین، مولانا فیض اللہ صاحب،مولانا امام الدین صاحب پنجابی سے،نوانگر میں حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے شاگرد مولانا حکیم عبداللہ مئوی سے،غازی پور میں ملا عارف ولایتی سے،اور مرزاپورمیں مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے شاگرد مولانا عبدالاحد صاحب الہ بادی سےکسب فیض کیا

مذکورہ بالافنون میں مہارت حاصل کرنے کے بعدآپ حدیث کی تحصیل اور تکمیل کے لئے لکھنوحضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کی خدمت میں حاضر ہوئے،لیکن اس وقت مولانا بہت بیمار تھے،انہوں نے وعدہ کیا کہ صحت ہوجائے گی توپڑھاؤں گا،مگر وہ مرض سے جانبر نہ ہوسکے۔مولانا کی حاضری کے چندہی دن بعد۳۰؍ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کوان کا وصال ہوگیا۔

مولانا عبدالغفار صاحب بہت شکستہ دل ہوئے،اورلکھنو میں رہ کرعلمِ طب میں مہارت حاصل کی،اپنے ذوق وشوق اورمحنت وکاوش کی بدولت سال بھرمیں یہ فن بھی بدرجہ کمال آپ نے حاصل کرلیا،لیکن علم حدیث پڑھنے کی جودھن دل میں سمائی تھی،اورجس کے لئے لکھنو کا سفر اختیار

کیا تھا،اس سے غافل نہیں ہوئے،مگر اس میں انہیں استاذِ کامل کی تلاش تھی،ورنہ لکھنو میں بعض اساتذہ کے یہاں علم حدیث کی تعلیم ہوتی تھی۔آپ نے ۱۳۰۵ھ میں گنگوہ کا قصد کیا،جہاں اس وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی علیہ الرحمہ علمِ حدیث کا نور پھیلا رہے تھے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس دور کی ساری برکتیں حضرت گنگوہی کی ذات اور آپ کے درس میں سمٹ آئی تھیں،مولانا کا درس اس وقت عروج پر تھا،مولانا عبدالغفار صاحب نے حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں صحاح کی تکمیل کی،حضرت گنگوہی نے انہیں سند عطا فرمائی ہے،اس میں تصریح کی ہے کہ انہوں نے صحیح بخاری و مسلم،سنن ابوداؤد اور نسائی شریف مکمل،اور ترمذی شریف کتاب النکاح سے آخر تک آپ کی خدمت میں پڑھی۔حضرت نے ان سب کی اور اس کے علاوہ صحاح ستہ کی باقی کتابوں کی آپ کو اجازت عطا فرمائی۔

حضرت مولانا کو دو سندیں عطا فرمائیں،ایک مطبوعہ اور ایک اپنے قلم سے لکھ کر۔مولانا کا شمار حضرت گنگوہی کے اخص تلامذہ میں ہوتا ہے۔شعبان ۱۳۰۶ھ میں مولانا گنگوہ شریف سے فارغ ہوئے۔

حضرت کے یہاں سے فراغت کے بعد مولانا نے تدریس کا سلسلہ شروع کیا،بلکہ تعلیم کے دوران ہی نیچے کے درجے کے طلبہ کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔چنانچہ مولانا خود تحریر فرمایا ہے:

> ''جب میں نوانگر میں پڑھتا تھا،تو اس وقت بھی فارسی کی کتابیں پڑھایا کرتا تھا، غازیپور،مرزاپور،اور لکھنو میں بھی بعض طلبہ مجھ سے صرف ونحو،ادب وفقہ،اور معقول پڑھا کرتے تھے''۔(نخبۃ الاخبار۔ص۷۶)

مولانا اپنے خودنوشت حالات میں مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''۱۳۰۸ھ میں تقریباً ایک سال تک مئو کی مسجد شاہی میں درس دیا تھا،چونکہ تنخواہ محض چندہ سے تھی،بہت جلد وہ مدرسہ درہم برہم ہو گیا،بعدازاں داناپور بھوٹی خان کے مدرسہ میں دو تین ہفتہ میں نے تعلیم دی،چونکہ محض ابتدائی کتابیں مجھے سپرد تھیں،اس وجہ سے مجھے وحشت ہوئی،اور سراج نگر ضلع پٹنہ سے مولوی عبدالباری بنگالی نے بذریعہ ٹیلی گراف مجھے اپنے مدرسے میں بلالیا،اور میں دانا پور سے سراج گنج چلا گیا،اور وہاں دو تین سال تک ٹھہر گیا،

سکتری اور ممبران مدرسہ میری لیاقت سے زیادہ میری قدر کرتے تھے،مگر آب وہوا وغذا کی مخالفت سے میں وہاں سے کشیدہ دل ہوگیا،بعدازاں ۱۳۱۱ھ میں مہتممین مدرسہ نوانگر نے مجھے بذریعہ خط بلایا۔چنانچہ ۲۲؍شعبان بروز جمعہ ۱۳۱۱ھ کو اس مدرسہ میں جس کا نام اس وقت مدرسہ انوارالعلوم ہے،میری تقرری ہوئی‘‘۔(نخبۃ الاخبار۔ص ۷۶)

مولانا کی یہ خودنوشت آپ بیتی ۱۳۲۰ھ کی لکھی ہوئی ہے،اس کے بعد مزید ۹؍برس آپ کا قیام نوانگر میں رہا اس دوران نوانگر علما وطلبہ کا مرکز بن گیا،آپ کے علم وفضل کا شہرہ ہوا، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ نے غالبًا یہیں آپ سے استفادہ کیا۔

نوانگر کے قیام کے دوران جاذبہ توفیق الٰہی نے مولانا کو اس دیار کی طرف کھینچا،جہاں کی باتوں سے ان کا حلقۂ درس گونجا کرتا تھا،دل میں زیارتِ حرمین کا داعیہ پیدا ہوا،اور چار شعبان ۱۳۲۱ھ کو سفر حج کے لئے روانہ ہوئے،اور ۲۰؍رمضان ۱۳۲۱ھ کو جدہ کے ساحل پر اترے، حج وزیارت سے مشرف ہوئے،اور ساتھ ہی شیخ الدلائل حضرت مولانا عبدالحق مہاجر مکی سے ’’رسالۃ الاوائل‘‘ اور’’دلائل الخیرات‘‘ سنا کر ان کی اجازت حاصل کی۔

حج سے فارغ ہوکر عرصہ تک نوانگر میں آپ مصروفِ درس وافادہ رہے،سراج گنج کے لوگ دوبارہ مصر ہوئے تو کچھ دنوں کے لئے پھر وہاں تشریف لے گئے،پھر انجمن اسلامیہ گورکھپور میں مسندصدارت کو رونق بخشی۔جامعہ مظہرالعلوم بنارس کے منتظمین کی درخواست پر ڈھائی تین سال وہاں درس دیا،پھر تادم آخر انجمن اسلامیہ گورکھپور میں نشرعلم فرماتے رہے۔

۱۳۴۱ھ میں مولانا وصال ہوا۔

بیعت:

مولانا کا پورا گھرانہ عشقِ الٰہی ومحبتِ نبوی کا ذوق آشنا تھا،گزر چکا ہے کہ مولانا کے دادا اور پردادا حضرت سیدزاہدعلی نصیرآبادی سے بیعت تھے،مولانا کے والدشیخ عبداللہ اپنے زمانہ کے مشہور قوی النسبت ،متبع سنت بزرگ حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی علیہ الرحمہ سے بیعت تھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا کوبھی یہ ذوق عشق ومحبت حضرت چاند شاہ صاحب کی خدمت میں لے گیا۔۱۳۰۹ھ میں جبکہ فراغت کے بعد تیسرا سال تھا،حضرت چاندشاہ صاحب

کی خدمت میں بار بار حاضری دی، شاہ صاحب نے سلسلہ نقشبندیہ میں داخل کر کے شجرہ عنایت فرمایا۔ بیعت کے بعد چاند شاہ صاحب کی خدمت میں بار بار حاضری دی، شاہ صاحب کا وصال ۱۳۱۷ھ میں ہوا، اس سال بھی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا تھا۔[۲]

تصانیف:

مولانا ایک متبحر عالم، نکتہ رس فقیہ، اور صاحبِ نظر محدث تھے، مسائل و دلائل پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے، مولانا کا علمی تبحر ان کے تلامذہ اور تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا کی چند تصانیف ذکر کی جاتی ہیں۔

غرائب البیان فی مناقب النعمان:

اس کتاب میں امام ابوحنیفہ کی زندگی کے حالات، ان کی فقاہت، کثرتِ عبادت، زہد وتقوی، تبحر فی الحدیث والاجتہاد، اور ذہانت وفراست وغیرہ کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، ساتھ ہی مخالفین کے اعتراضات کا مدلل اور معقول جواب بھی دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۱۲ھ میں ۱۱۴صفحات پر شائع ہوئی تھی۔

مسلک البررہ فی الحج والعمرہ:

حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''مولانا عبدالغفار صاحب نے ۱۳۲۱ھ میں حج کیا اور اسی سال حج سے پہلے محرم ۱۳۲۱ھ میں یہ رسالہ تصنیف فرمایا، اس کی ضخامت ۱۱۶صفحات ہے، مناسک میں بہترین رسالہ ہے، حیرت ہے کہ مولانا نے یہ رسالہ حج سے پہلے لکھا ہے، مگر مواقیت ومقامات متبرکہ اور مساجد ومشاہد کا بیان پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں''۔
> (اعیان الحجاج۔ج۲۔ص۲۸۳)

الجام المتعنتین فی تعدیل ائمة المتبوعین:

یہ مولانا کی نہایت گراں قدر اور محققانہ کتاب ہے، جو ائمہ کرام بالخصوص امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں، اور انہیں کم علم، قرآن وحدیث سے ناواقف، اور سنت کے مقابلے میں رائے کو ترجیح دینے والا قرار دیکر اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں اضافہ کرتے ہیں،

ان کے اعتراضات کے جواب قدیم مصنفین کی تقریباً تین سو کتابوں کے حوالے سے دیئے ہیں۔ افسوس کہ اب تک طبع نہیں ہوئی، اس کا قلمی نسخہ مولانا کے پوتے مولانا ریاض الحق صاحب کے پاس موجود ہے، اس کی طباعت ان پر قرض ہے۔

مولانا کے تفصیلی حالات حضرت اقدس محدث کبیر علیہ الرحمہ کی سوانح میں ان شاء اللہ درج کئے جائیں گے [۳] کیونکہ حضرت کا ہر بُنِ مو، مولانا کے احسانات کے شکریے میں شرسار تھا، اس احسان مندی کا اقتضایہ ہے کہ مولانا کی سوانح عمری میں اعترافِ نعمت تفصیل سے کیا جائے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ:

زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا!
کہ نطق نے مرے بوسے مری زباں کے لئے

حضرت گنگوہی کا نام آیا، تو قلم تعظیم میں جھک گیا، اور کچھ لکھنے سے معذرت کرنے لگا، کہ بحر فضل وکمالات کے حالات کیونکر لکھے؟ اور کیا لکھے؟ مجبوراً بنظر اختصار صاحب نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی صاحب علیہ الرحمہ کے الفاظ نقل کرتا ہوں، جو اختصار کے باوجود بہت جامع ہیں، لکھتے ہیں:

"الشيخ الامام العلامة المحدث رشيد احمد بن هدايت احمد الانصاری الحنفی ....الگنگوهی احدالعلماء المحققين والفضلاء المدققين ،لم يكن مثله فی زمانه فی الصدق والعفاف،والتوكل والتفقه والشهامة والاقدام فی المخاطر والصلابة فی الدين والشدة فی المذهب ولد لست خلون من ذی القعده فی اربعين ومأتين والف ببلدة گنگوه فی بيت جده لامه"۔(نزہۃ الخواطر۔ج۸۔ص۱۶۳)

شیخ امام علامہ محدث رشید احمد بن ہدایت احمد انصاری حنفی گنگوہی ایک محقق عالم اور نکتہ رس اور دیدہ ور فاضل تھے، ان کے زمانے میں ان کا مثل کوئی نہ تھا، نہ صدق وعفاف میں، نہ توکل وتفقہ میں، نہ ہمت وجرأت میں، پرخطر مرحلوں میں بھی انہیں قدم رکھنے میں کوئی تکلف نہ تھا، دین ومذہب کے اندر مضبوطی اور شدت میں بے مثال تھے۔ ۶/ذی القعدہ ۱۲۴۴ھ میں

گنگوہ میں اپنے نانیہال میں پیدا ہوئے۔

تعلیم کی تکمیل دہلی میں ہوئی، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ کے رفیق درس تھے، زیادہ تر علوم کی تحصیل اپنے زمانہ کے نامور عالم وفاضل، جن کے علم کے احترام وعظمت کے سامنے پوری دلی کا سر جھکا ہوا تھا، یعنی مولانا مملوک العلی نانوتوی سے کی۔ اس کے بعد حدیث کی کتابیں، محدث وقت حضرت شاہ عبدالغنی مجددی قدس سرہ سے پڑھیں، اور سند حاصل کی۔ اور سلسلۂ طریقت میں بیعت کا شرف حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حاصل کیا، اور کمالِ علم واخلاق سے آراستہ ہوکر گنگوہ میں افادۂ خلق کے لئے بیٹھ گئے، اور زندگی بھر علوم ومعرفت، نورِ شریعت وطریقت اور اخلاص وللّٰہیت کا فیضان فرماتے رہے، ہندوستان میں بدعات کا زور وشور ان کے دم سے ٹوٹا۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”کان آیة باهرة ونعمة ظاهرة فی التقوی واتباع السنة النبویه والعمل بالعزیمة والاستقامة علی الشریعة ورفض البدع ومحدثات الامور ومحاربتها بکل طریق والحرص علی نشر السنة واعلام شعائر الاسلام والصدع بالحق وبیان الحکم الشرعی ثم لا یبالی بما یتقاول فیه الناس، لا یقبل تحریفاً ولا یتحمل منکراً ولایعرف المحاباة والمداهنةفی الدین مع ما طبعه الله علیه من التواضع والرفق واللین دائراً مع الحق حیث ما دار یرجع عن قوله اذا تبین له الصواب انتهت الیه الامانة فی العلم والعمل ورئاسة تربیة المریدین وتزکیة النفوس والدعاء الی الله واحیاء السنة واماتة البدع“

حضرت مولانا کی شان یہ تھی کہ وہ تقوی، اتباعِ سنت نبوی، عزیمت واستقامت اور ترکِ بدعت کے ایک روشن نمونہ اور اللہ کی کھلی ہوئی نعمت تھے، انہوں نے بدعات سے ہر ممکن جنگ کی، وہ سنت کے نشر واشاعت کے نہایت درجہ دلدادہ تھے، شعائر اسلام کی سربلندی کے خواہاں رہتے تھے، حق بات اور حکمِ شرعی کو برملا بیان کر دیتے تھے، اس سلسلہ میں لوگوں کے قیل وقال کی کوئی پرواہ نہ کرتے، دین میں نہ کسی تحریف کو قبول کرتے، اور نہ کسی منکر کا تحمل کرتے، دینی امور میں مداہنت اور کسی کی پاسداری وہ جانتے ہی نہ تھے، پھر ان اوصاف عالیہ کے

ساتھ طبعاً نہایت متواضع ،نرم خو،اور خوش اخلاق بھی تھے، ہمیشہ حق کے ساتھ رہتے ،وہ جدھر بھی ہو۔صحیح بات ان کے نزدیک ثابت ہو جاتی تو اسے بے تکلف قبول کر لیتے علم وعمل،تربیتِ مریدین،تزکیۂ نفوس، دعوت الی اللہ،احیاءِ سنت،اور محوِ بدعات میں انہیں امامت وریاست کا رتبہ حاصل تھا۔

یہی مولانا عبدالحی صاحب اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں،ان کا وجود مغتنمات میں سے ہے،اس تورع واستقامت کا دوسرا شیخ ان کے سوا اس عالم آشوب میں نظر نہیں آتا،علمِ الٰہی میں جو کوئی ہو،اس کی خبر نہیں۔مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف تورع ہے، جو تمام اوصاف کو شامل ہے، کفِ لسان اور صدقِ گفتار میں مولوی صاحب ضرب المثل ہیں''۔(دہلی اور اس کے اطراف۔ص ۱۰۶)

جن دنوں مولانا عبدالحی صاحب حضرت گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے،حضرت کو ایک طویل وشدید بیماری سے افاقہ ہوا تھا، بیماری کے احوال اس وقت کے حاضر باشوں سے سن کر مولانا لکھتے ہیں کہ:

''اس شدتِ مرض کی حالت میں بھی مولانا نے کبھی رخصت پر عمل نہیں کیا،مرض کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی نقل وحرکت میں دست آجاتا تھا،کسی نے پیر چھوا اور حاجت ہوئی، کھڑے ہوئے اور دست آیا،دن بھر میں ستر ستر دست آتے تھے،مگر باوجود اس کے کبھی چارپائی یا کپڑے میں نہیں کیا، ہمیشہ چوکی پر تشریف لے جاتے تھے،حالانکہ اٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، لوگوں نے ہر چند سمجھایا مگر نہیں مانا۔دوسرے کبھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی،فرض ہمیشہ کھڑے ہو کر پڑھتے تھے،جب لوگ زیادہ سمجھاتے تو کہتے تھے کہ جب تک کھڑا ہوا جاتا ہے،بیٹھ کر نہ پڑھوں گا، چاہے گر ہی کیوں نہ پڑوں،مرض سے ادھر افاقہ ہوا اور مسجد جانے لگے''۔(دہلی اور اس کے اطراف۔ص ۱۰۸)

یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت کی عمر ستر کے قریب تھی،اس عمر اور بڑھاپے میں اتنا شدید مرض کہ دن بھر میں ستر ستر دست آجاتے تھے،پھر عزیمت کا یہ حال کہ کبھی کپڑا خراب نہیں ہوا،فرض نماز کبھی بیٹھ کر نہیں پڑھی، یہ خاص قوتِ قدسیہ اور محبتِ الٰہی وعشقِ نبوی کی

طاقت کا کرشمہ ہے۔

مولانا عبدالحیؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مولوی صاحب بہت ضعیف ونحیف ہیں، عمر کی حیثیت سے یہ ضعف نہیں ملتا، کیوں کہ عمر غالبًا ساٹھ سے کچھ ہی متجاوز ہوگی''۔

یہ مولانا کا اندازہ ہے ورنہ اس وقت حضرت کی عمر ۶۸ رسال کی ہوچکی تھی، مولانا کا یہ سفر ۱۳۱۲ھ میں ہوا ہے، اور حضرت کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی تھی، لیکن آگے لکھتے ہیں:

''بڑھاپے کے آثار نمودار نہیں ہیں، بلکہ بیماری کا ضعف ہے، چہرے سے نحافت معلوم ہوتی ہے، قد بالا اور گورے چٹے آدمی ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے، لانبی کھچڑی بال، وقار وہیبت غالب ہے، سکوت ووقار کے ساتھ ہروقت رہتے ہیں، کسی کو زیادہ مجالِ گفتگو نہیں ہے، سب چپ چاپ ہروقت سامنے بیٹھے رہتے ہیں''۔ (دہلی اوراس کے اطراف۔ص ۱۰۱)

حضرت گنگوہی قدس سرہ کے متعلق ان کے شیخ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی نے لکھا ہے کہ:

''جولوگ اس فقیر سے محبت وارادت رکھتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ مولوی رشید احمد سلمہ، مولوی محمد قاسم سلمہ، کو جو تمام علوم ظاہری وباطنی کے جامع ہیں، مجھ راقم اوراق کی جگہ پر بلکہ مجھ سے بدر جہا بلند سمجھیں، اگر چہ معاملہ برعکس ہوگیا ہے، کہ وہ دونوں میری جگہ پر اور میں ان کی جگہ پر ہوگیا ہوں''۔

یعنی ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ میرے مرشد ورہنما ہوتے، اور میں ان کا مرید و متبع ہوتا، لیکن تقدیر نے معاملہ برعکس کردیا ہے کہ مجھے مرشد کے منصب پر بیٹھا دیا ہے، اور وہ دونوں ارادت مندوں کے حلقے میں آگئے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں:

''ان کی صحبت کو غنیمت جانیں، ایسے لوگ اس زمانہ میں نایاب ہیں''۔ (ضیاء القلوب)

حضرت گنگوہی قدس سرہ کا وصال ۸ر جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ کو گنگوہ میں ہوا، گنگوہ ہی میں مزار پرانوار ہے۔

حضرت گنگوہی کے بعد سند کا سلسلہ وہی ہے جو پہلے مذکور ہوا، یعنی حضرت گنگوہی کے شیخِ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی ہیں، ان کا ذکر مضمون کی پہلی قسط میں آچکا ہے۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب علیہ الرحمہ کو کتبِ حدیث کی اجازت 'رسالۃ الاوائل' کے ذریعہ سے حضرت مولانا عبدالحق صاحب مہاجر مکی شیخ الدلائل سے بھی ہے، شیخ الدلائل اوران کے سلسلہ کے اساتذہ واکابر کا تذکرہ اگلے شمارے میں آپ پڑھیں گے۔

ماخذ: المآثر۔اکتوبر، نومبر، دسمبر (۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) شیخ الدلائل مولانا عبدالحق صاحب ضلع الہ آباد کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، مولانا تراب علی لکھنوی سے رسڑا ضلع بلیا میں تعلیم حاصل کی، مولانا عبداللہ گورکھپوری سے بیعت سے تھے، اور ان سے اجازت وخلافت بھی حاصل تھی، فراغت کے بعد مدرسہ غفاریہ رسڑا ضلع بلیا میں ایک عرصہ تک تعلیم دیتے رہے، ان کی ایک تفسیر ''الاکلیل'' کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں ہے، خود رسڑا میں اکلیل پریس قائم کر کے اس کی طباعت کرائی، مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہیں ۱۹ رشوال ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء انتقال ہوا۔(کاروان رفتہ ص ۱۵۷)

(۲) حضرت چاندشاہ صاحب کی شخصیت نادرۂ روزگاراور جامع کمال تھی، جہاں جہاں شاہ صاحب کا فیضان پہونچا، فاسد عقائد ورسوم کی بیخ کنی ہوگئی، ان کے فیوض وبرکات سے فیض آباد سلطان پور، جونپور، پرتاب گڑھ اور اعظم گڑھ کے بہت سے خطے منور ومعمور ہوئے ہیں۔شاہ صاحب اوران کے سلسلے کا تفصیلی تذکرہ کے لئے'' چاندشاہ صاحب اوران کا خانوادۂ تصوف'' تالیف۔''مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ'' دیکھیں۔

(۳) حضرت والد صاحب حضرت محدث کبیر الاعظمی علیہ الرحمہ کی سوانح حیات لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے بلکہ سوسوا سو صفحات لکھ بھی چکے تھے، پھر بوجوہ قلم کا سفر رکا تو رکا ہی رہ گیا، اس کے بعد حضرت محدث اعظمی کے نواسے ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی صاحب نے ''حیات ابوالمآثر'' کے نام سے دو جلد میں مفصل سوانح لکھی۔ مولانا عبدالغفار صاحب کا تذکرہ جلد اول صفحہ ۱۲۷ سے ۱۳۱ تک ہے۔

متفرقات

(۱) نقد بر حقیقت رجم

(۲) امام محمد اور اہل الرائے ہونے کی حقیقت وحیثیت

(۳) البانی شذوذہ واخطاءہ

(۴) البانی شذوذہ واخطاءہ

(۵) سنت مؤکدہ کی اہمیت

نقد بر حقیقت رجم

کسی جگہ ایک لطیفہ پڑھا تھا، ایک عورت کو نمائش کا بڑا شوق تھا، اس نے عمدہ قسم کی چوڑیاں پہنیں، اور پھر ہاتھ مٹکا مٹکا کر اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کو ان کی طرف متوجہ کرتی تھی، کہ شاید کسی سے داد ملے، مگر کسی نے توجہ نہ دی، اس عورت کو بہت طیش آیا، غصہ میں اس نے اپنے ہی مکان میں آگ لگالی، لوگ دوڑے، کسی طرح آگ بجھائی گئی، گھر کا کافی نقصان ہوا، اب پاس پڑوس کی عورتیں تعزیت میں آنے لگیں، اور عادت کے مطابق آپس میں باتیں کرنے لگیں، گفتگو کے دوران کسی نے کہا کہ بہن جی! آپ کے ہاتھوں میں چوڑیاں بڑی خوبصورت ہیں، کہاں سے آپ نے لی ہیں؟ وہ سنتے ہی جھلا گئی، اور بولی، اگر یہی بات پہلے تم نے کہہ دی ہوتی تو میرے گھر میں آگ کیوں لگتی؟۔

یہ قصہ ہمیں اس وقت یاد آیا جب ایک کتاب ''حقیقت رجم'' نامی پڑھنے کا موقع ملا، بیچارہ مصنف چاہتا ہے کہ اس کی شہرت ہو اور نہیں ہوئی، تو اس نے اپنے گھر کے ایک اجماعی مسئلہ میں آگ لگانے کی ٹھان لی، شاید اسی بہانے شہرت ہو۔ بہت مشہور مسئلہ ہے کہ زمانۂ رسالت سے عہد حاضر تک اس میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہوا کہ ''زانی مُحصن''یعنی چند خاص شرائط کے ساتھ شادی شدہ زانی، خواہ مرد ہو یا عورت'' اس کی سزا شریعت میں رجم ہے، یعنی پتھروں سے مار کر اس کو ہلاک کر دینا ہے۔ اس مسئلہ میں ابتدائی دور میں خوارج نے اختلاف کیا تھا، اور کچھ معتزلہ نے، مگر امت نے اس اختلاف کو رد کر دیا تھا۔ تفصیلات کے لئے المغنی لابن قدامہ حنبلی کا مطالعہ کیجئے۔ ہم کو اس مسئلہ کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ یہ مسئلہ قطعاً اجماعی ہے، ہم صرف مصنف کتاب کی علمی دیانت، اور ان کی عقل وذہانت اور ان کے

معروضی مطالعہ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، یہ کتاب اہل علم کے لئے ایک تماشا گاہِ عبرت ہے کہ کوئی شخص جب دین کے کسی اجماعی مسئلے سے انحراف کرتا ہے تو کیسی کیسی ہمالیائی غلطیوں میں مبتلا ہو کر بھی مگن رہتا ہے کہ میں نے تحقیق وتدقیق کی وادی سر کر لی۔ مصنف نے اس سلسلہ میں اپنا نظریہ اجمالاً ابتدا میں عربی زبان میں دو صفحات میں تحریر کیا ہے، ہم اپنی گفتگو کا آغاز وہیں سے کرتے ہیں، ساری کتاب ہی علمی وعقلی اعجوبہ کاریوں کی جلوہ گاہ ہے، سب سے تعرض کرنا تو مشکل ہے، بس خاص خاص جلوہ گاہوں کی سیر ہم ناظرین کو کرائیں گے، اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا مصنف کن کن بوالعجبیوں کا مرقع ہے؟ سب سے پہلی عبارت (جو فہرست سے بھی پہلے ہے، پیش لفظ سے بھی پہلے ہے) مصنف نے یہ لکھی ہے، اور اسے نمایاں اور جلی قلم سے رقم کیا ہے:

"الرجم حقيقة ظاهرة ثابتة، حقيقة جاء بها الكتاب وجاءت بها السنة واجمعت عليها الامة".

رجم ایک کھلی ہوئی ثابت شدہ حقیقت ہے، ایسی حقیقت جو کتاب اللہ سے بھی ثابت ہے، سنت رسول سے بھی ثابت ہے، اور امت کا اس پر اجماع ہے۔

اس عبارت کے پڑھنے کے بعد جب ہم نے کتاب کا مطالعہ کیا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ مصنف نے از ابتدا تا انتہا اس پر آخری حد تک زور لگایا ہے کہ رجم کا ثبوت کتاب اللہ سے نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ:

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ رجم کا حکم قرآن پاک میں موجود نہیں ہے، وہ سرتاسر نبی کریم ﷺ کی سنت سے ماخوذ ہے"۔ (ص۔۱۴۸)

ایک طرف تو یہ صراحت ہے اور دوسری طرف یہ دعوی ہے کہ رجم ایک حقیقت ظاہرہ ثابتہ ہے جو کتاب اللہ سے ثابت ہے، (جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی)

بہر کیف مصنف نے رجم کے شریعت میں ہونے سے صاف انکار نہیں کیا، تاہم ان کا نظریہ اجماع کے قطعاً خلاف ہے، انہیں الفاظ میں ان کا نظریہ ملاحظہ ہو:

"الا ان الذى يجب ان ندرك.......وهو الذى يستفاد من الكتاب والسنة......ان الرجم لا ينفذ على كل متزوج اذا تورط فى الزنا وهو

صاحب زوج وانما ينفذ على من تعوده وتربى عليه واستسرى فيه هذا الداء وتفاقم بحيث لا يجدى معه علاج ولايرجى له شفاء فهذا الذى يحكم عليه بالرجم سواء كان بكراً اوثيباًاو غير متزوج فان آخر الدواء الكى وآخر العمل السيف". (ص-۳)

یعنی رجم کی سزا محض زنا میں مبتلا ہوجانے کی وجہ سے شادی شدہ شخص پر نافذ نہیں ہوتی، اس کا نفاذ صرف اس شخص پر ہے جو زنا کا عادی مجرم ہو، اور یہ مرض اس میں اس درجہ جڑ پکڑ چکا ہو کہ اس کے لئے کوئی علاج کارگر نہ باقی رہا ہو، اور نہ اس کے شفایاب ہونے کی توقع ہو، پس صرف اسی شخص پر رجم لاگو ہوگا، خواہ شادی شدہ ہو، یا غیر شادی شدہ، کنواری ہو یا ثیبہ۔

پھر مصنف نے اس کی مثال میں ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو پیش کیا ہے کہ وہ زنا کے عادی مجرم تھے (نعوذ باللہ) اور ان میں یہ بیماری اس طرح سرایت کر چکی تھی کہ اب امید شفا باقی نہ رہی تھی، اس لئے حضور ﷺ نے انہیں رجم کرادیا تھا۔

پھر لکھتے ہیں کہ:

''جو شخص فی نفسہ صالح ہو، اور اتفاق سے زنا کے گناہ میں مبتلا ہوگیا، پھر وہ امام وحاکم کی گرفت میں آنے سے پہلے، اور قانون جنایت کے اس پر نافذ ہونے سے پہلے، توبہ کرلیتا ہے تو ایسے شخص پر نہ رجم کی سزا لاحق ہوگی، اور نہ سو کوڑوں کی، خواہ وہ شادی شدہ ہو، یا غیر شادی شدہ، فرماتے ہیں یہ مسئلہ حق تعالی کے اس ارشاد سے مستفاد ہوتا ہے۔

الا الذين تابوا من قبل ان تقدروا عليهم فاعلموا ان الله غفور رحيم. (مائدہ-۳۴)

ترجمہ! مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کرلی قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ، تو سمجھ لو کہ اللہ تعالی مغفرت کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل بہت سے ایسے لوگوں کے ساتھ رہا جو زنا میں مبتلا ہوئے، پھر انہوں نے توبہ کرلی، ہاں جس شخص کا یہ گناہ مشہور ہوگیا ہو، اور توبہ کرنے سے قبل قاضی تک اس کا مقدمہ پہونچ گیا ہو، اس پر البتہ کوڑوں کی سزا نافذ ہوگی۔ (یہ ان کے اجمالی نظریہ کی تلخیص ہے)

اس نظریہ پر چند مواخذات ہیں۔

(۱) آپ نے فرمایا کہ رجم کی سزا محض زنا کی وجہ سے نہیں نافذ ہوتی۔اس پر گزارش ہے کہ اس حکم میں رجم کی تخصیص کیوں فرمائی؟ آپ نے تو کوڑوں کی سزا کو بھی محض زنا پر موقوف نہیں رکھا، بلکہ اس کے مشہور ہونے اور توبہ کرنے سے پہلے قاضی تک مقدمہ پہونچنے کی قید لگائی ہے، گویا مطلق نہ یہ، نہ وہ، پھر ایک کی وجہِ تخصیص کیا ہے؟۔

(۲) آپ فرماتے ہیں کہ ’’زنا کے عادی مجرم کو جو کسی طرح اس کے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو،تو رجم کی سزادی جائے گی‘‘۔یہ بات خود آپ کے نظریہ کے خلاف ہے، کیوں کہ آپ نے آگے چل کر ’’الزانیة والزانی‘‘ کو عام قرار دیا ہے،اور یہ عام لفظ عادی اور غیر عادی دونوں کو شامل ہے، اس لئے خواہ زانی عادی ہو یا غیر عادی،آپ کے قول کے مطابق اسے کوڑوں ہی کی سزا ملنی چاہئے، جیسے کہ آپ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لئے یہ حکم عام رکھا ہے، پھر اس میں عادی زانی کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ آخر قرآن میں عادی مجرم کا کوئی اشارہ تو نہیں ملتا اور نہ ہی اس پر رجم کا کوئی اشارہ ملتا، پھر آپ پر بھی وہی الزام آئے گا جو آپ نے فقہا پر رکھا ہے کہ ’’قرآن کے حکم کو غیر محصن کے ساتھ خاص کر دینا یقیناً قرآن کے خلاف ہوگا‘‘۔ٹھیک اسی طرح ہم بھی گزارش کریں گے کہ قرآن کے حکم کو غیر عادی کے ساتھ خاص کرنا یقیناً قرآن کے خلاف ہوگا۔

(۳) حضرت ماعز کے متعلق یہ الزام لگانا کہ وہ زنا کے عادی مجرم تھے،اور اس سے کسی طرح باز نہیں آتے تھے،اب اس مرض سے ان کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ایک ایمان سوز اور نفاق افروز تہمت ہے،اس کے خلاف صحیح احادیث،اور عقل سلیم،اور سب سے بڑھ کر قرآن کی آیات گواہ ہیں،اور رسول اللہ ﷺ کے جس ارشاد سے اس تہمت پر استدلال کیا گیا ہے، وہ توجیہ القول بمالا یرضی بہ القائل کے قبیل سے ہے،اس پر مکمل بحث آئندہ آرہی ہے۔

(۴) مصنف کا کہنا ہے کہ ’’جو شخص فی نفسہ صالح ہو،اور اتفاق سے زنا کے گناہ میں مبتلا ہو گیا ہو، پھر قبل اس کے کہ امام کی گرفت میں آئے اور قبل اس کے کہ اس پر قانون نافذ ہو، وہ توبہ کر لیتا ہے،تو ایسے شخص پر نہ رجم عائد ہوگا اور نہ جلد‘‘۔یہ بات بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے،

قرآن وحدیث میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

(۵) اوراس کے لئے جس آیت کا حوالہ دیا ہے، وہ اللہ اوراس کے رسول کے محاربہ اور ملک میں فساد برپا کرنے کے باب میں وارد ہوئی ہے،اس کے علاوہ دوسرے حدود سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

(۶) مصنف کا یہ ارشاد کہ ''رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل بہت سے ایسے لوگوں کے ساتھ رہاہے، جو زنا میں مبتلا ہوئے ،اور پھر اس سے توبہ کرلی''۔قطعاً بے دلیل ہے،اورآگے چل کر دلیل کے نام پر جوکچھ پیش کیا ہے وہ ان کے علمی وعقلی افلاس کی دلیل ہے۔

(۷) مصنف کا تأثر یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام کثرت سے زنا میں مبتلا ہوئے،لیکن انہوں نے توبہ کرلی،اس لئے سزا سے بچ گئے،صرف دوتین صحابہ نے توبہ نہیں کی اس لئے مبتلائے سزا ہوئے۔صحابہ جیسی مقدس جماعت کے بارے میں یہ کس قدر گھناؤنا تصور ہے،دشمنانِ صحابہ شیعہ شاید اس سے اجتناب کریں۔

(۸) آگے ان کا ارشاد ہے کہ ''ہاں جس شخص کا گناہ مشہور ہوگیا ہو،اورتوبہ کرنے سے پہلے قاضی تک اس کا مقدمہ پہونچ گیا ہو،اس پرالبتہ کوڑوں کی سزا نافذ ہوگی''۔یہ بات بھی بالکل غلط اور بے دلیل ہے، بلکہ خلافِ دلیل ہے،گناہ کی شہرت کا کیا مطلب ہے؟ اوراس پر شریعت نے حدود کی بنیاد کب رکھی ہے؟ ذرا اس کو قرآن سے یا صحیح حدیث سے ثابت کریں۔

(۹) اس طرح کے جرائم میں شہرت افواہی حکایات سے ہوتی ہے،شریعت نے تو اسے بجائے خود حرام قرار دیا ہے،ارشاد ہے:

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا لهم عذاب الیم فی الدنیا والآخرہ والله یعلم وانتم لاتعلمون. (سورہ نور)

یا مصنف کی مراد شہرت سے کچھ اور ہے،اس کی وضاحت فرمائیں،ورنہ شہرت تو حضرت ماعز کے جرم کی بھی نہیں ہوئی تھی۔انہوں جب آکر خود اقرار کیا یا یہ کہ انہوں نے اپنے گناہ کے احساس سے مغلوب ہوکر اپنے سرپرست حضرت ہزال سے بطور مشورہ کے اس کا تذکرہ کردیا تھا،تب لوگوں نے جانا۔

(۱۰) مصنف کو خبر ہی نہیں کہ حدِ زنا خواہ رجم ہو یا جلد، اس کا مدار شہرت اور عدمِ توبہ پر نہیں ہے، اس کی بنیاد چار عینی گواہوں کی شہادت پر ہے، یا یہ کہ مجرم خود چار مرتبہ قاضی کے پاس اقرار جرم کرے۔ اس کے ساتھ مزید کچھ اور بھی شرطیں ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اسے قانونی احکام میں شہرت وغیرہ کا نام لینا، پتہ دیتا ہے کہ مصنف کو اسلامی احکام کے علم سے قطعاً مناسبت نہیں ہے، قرآن سے تو کیا مناسبت ہوگی۔

دو صفحہ کی مختصر عبارت سے مصنف کی گردن پر گیارہ مواخذات ہیں، (دس یہ اور ایک ان سے پہلے گزرا) اسی سے باقی کتاب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، تاہم کچھ اور نمونے ان کی عقل وذہانت کے پیش کرنے مناسب ہیں۔

مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہ ممکن نہیں کہ قرآن ایک مسئلے کو ایک بار نہیں کئی بار چھیڑے اور نہایت شدومد کے ساتھ چھیڑے، لیکن اس کے باوجود اس کے سلسلے میں اس کی ہدایات نامکمل ہوں، اس کی کوئی نظیر ہمیں قرآن میں نہیں ملتی (ص۔۲۱)

مصنف نے یہ بات بڑے جذباتی انداز میں لکھی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا علم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ ہدایات کے مکمل ہونے سے مصنف نے کیا مراد لیا ہے؟ اس کو اگر وہ واضح کردیتے تو گفتگو کرنے میں آسانی ہوتی۔ اگر اس کا منشا یہ ہے کہ قرآن نے جن احکام کو شدومد سے بیان کیا ہے، ان کی تمام تفصیلات کو ذکر کیا ہے، تو یہ بات بالکل غلط ہے، قرآن میں احکام کا بیان نامکمل نہیں، البتہ اجمالی ہے۔ احکام کی تفصیلات قرآن میں بہت کم بیان ہوئی ہیں، قرآن کریم میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج، ربوا، خمر، قصاص، دیت وغیرہ کے مسائل کس شدومد کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، لیکن ان کی تمام تفصیلات جن کی روشنی میں ان احکام کے مطابق عمل ہوسکے، ان کا بیان قرآن میں کہاں ہوا ہے؟ کتنے وقت کی نماز فرض ہے؟ نماز کے ارکان کیا کیا ہیں؟ ان میں ترتیب کیا ہوگی؟ اس کے شرائطِ صحت کیا کیا ہیں؟ کن چیزوں سے نماز باطل ہوجاتی ہے؟ ان کی تفصیل قرآن میں تلاش کرکے ذرا یہ صاحب بتلا تو دیں۔

اور اگر ہدایات کے مکمل ہونے کا کوئی اور مطلب ہو تو اسے واضح کریں، مبہم اور غیر

واضح بات ایسے اصولی مسائل میں لکھنی عقل کی نارسائی کی دلیل ہے۔

جو صاحب یہ گفتگو کررہے ہیں ان کی عقل ونظر کو ایک بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا،فقہ اسلامی اکیڈمی کا پہلا سیمینار ہورہا تھا،اس میں اعضاء کی پیوند کاری کا مسئلہ زیر بحث تھا،اور اصولی طور پر یہ گفتگو ہورہی تھی کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک ہے یانہیں؟ سیمینار کے تمام شرکاء متفق تھے کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے،یہ جسم اور جان اس کے پاس بطور امانت ہیں۔ یہ بات پورے اتفاق کے ساتھ لکھی جانے والی تھی کہ اچانک پیچھے سے ایک آواز آئی کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک ہے،یہ بات قرآن سے ثابت ہے۔حاضرین کو سخت حیرت ہوئی،لوگوں نے گردنیں گھما گھما کر دیکھنا شروع کیا،تو ہمارے یہ مصنف ہی ارشاد فرمارہے تھے،پوچھنے پر انہوں بتایا کہ اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ کا قول قرآن میں نقل کیا ہے۔''رب انی لااملک الا نفسی''. اے میرے رب میں صرف اپنے نفس کا مالک ہوں۔اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے جسم اور اعضاء کے مالک تھے،پس ہر آدمی اپنے جسم اور اعضاء کا مالک ہوا۔موصوف کی اس جرأت و نظر پر سخت تعجب ہوا،مجمع سے آواز آئی کہ پوری آیت پڑھئے،اس میں آگے ایک اور لفظ ہے، ''لااملک الا نفسی واخی''. تو انسان اپنے اعضاء کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کے اعضاء کا بھی مالک ہوگا؟ اس پر یہ دیدہ ور مصنف خاموش ہوگیا۔اگر اسی نظر سے انہوں نے قرآن کو پڑھا ہے تو سچ یہ ہے کہ انہیں قرآن میں کچھ نظر نہیں آیا ہے۔

اسی نظر کی بنیاد پر آپ لکھتے ہیں:

> ''حدیث وقرآن تمام اہل ایمان کی مشترکہ میراث ہے،لہٰذا جذباتیت سے بلند ہوکر ہر صاحب نظر کو اس کا حق دینا چاہئے کہ وہ ان پر غور کرے،اور دیانت داری کے ساتھ جس نتیجے پر پہونچے اس کا اظہار کرے''۔(ص۔۲۱)

اس سے مراد اگر انہیں جیسے صاحب نظر ہیں،تو انہیں بالکل اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ انہیں تو سامنے کا لفظ نظر نہیں آتا،تو معلوم نہیں کہاں کس کھائی میں کس کو گرادیں۔

اس طرح کے صاحب نظر افراد جب یہ لکھتے ہیں:

> ''حدیث قرآن کی شرح ہے،لیکن قرآن بھی حدیث کی صحت کے لئے ایک زبردست

کسوٹی ہے، حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ:

"تکثر لکم الاحادیث بعدی فاذاروی عنی حدیث فاعرضوا علی کتاب اللہ فما وافق فاقبلوا وما خالف فردوہ"۔

ترجمہ! میرے بعد تمہارے سامنے بہت سی احادیث آئیں گی، تو جب میرے حوالے سے تم سے کوئی حدیث بیان کی جائے تو اسے کتاب الٰہی پر پیش کرو، جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کرلو، اور جو اس کے مخالف ہو، اسے رد کردو"۔ (ص۔۱۴)

تو ان سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کتاب اللہ کی موافقت اور مخالفت کا فیصلہ کون کرے گا؟ اگر آپ ہی اس کے فیصل ہیں تب تو دین وایمان کی خیر نہیں، کیوں کہ آپ کی نظر کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک تجربہ اور ہم بتاتے ہیں، آپ نے حقیقت رجم پر لکھا، اور پوری کتاب اسی پر مبنی ہے کہ زانی محصن کے رجم والی احادیث اپنے ظاہر کے اعتبار سے کتاب اللہ کی آیت "**الزانیة والزانی الخ**" کے خلاف ہیں، اس لئے وہ قبول نہیں۔ پس صرف زنا کی وجہ سے کسی کو رجم کرنا صحیح نہیں ہے، پھر آپ نے اس حدیث کا صحیح محل تجویز کیا کہ:

"ان لوگوں کو رجم اس وجہ سے کیا گیا کہ یہ سارے لوگ اس معاشرے میں رہنے کے قابل نہ تھے، یہ لوگ شرم وحیا سے بہت دور جنسی بے راہ روی کے شکار تھے، یہ لوگ اسلامی اقدار سے یکسر عاری اور نفسانیت سے پوری طرح مغلوب تھے، اور یہ لوگ اپنی عادتوں کی اصلاح کرنے اور اپنی حرکتوں سے باز آنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے"۔ (ص۔۱۹۳)

اول تو حضرت ماعز اور غامدیہ وغیرہ کے بارے میں ایسی گھناؤنی تصویر واقعہ کے بالکل خلاف ہے، ایک شخص جو گناہ ہو جانے کے بعد اتنا متأثر ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ زنا کی سزا خود رجم ہو یا کوڑا، بہت سخت ہے، اپنے آپ کو خوف خدا کی وجہ سے پیش کر دیتا ہے، اس کی یہ تصویر بنانا کہ وہ انتہائی بدقماش قسم کا انسان تھا، کس قدر مبنی بر غلاظت انداز فکر ہے؟ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے ان صاحب نظر کی بات مان لی جائے اور یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حضرت ماعز نے جو چار مرتبہ اقرار زنا کیا تھا، یہ چار الگ الگ واقعات کا اقرار ہے، اور اسی سے ان کا عادی مجرم ہونا ثابت ہوتا ہے[۱] تو سوال یہ ہے کہ کیا اس بات کو قرآن پر نہیں پیش کیا جائے گا؟ قرآن میں "**الزانیة والزانی**" مطلق فرمایا گیا ہے، اس میں چار چھ مرتبہ کی کوئی قید نہیں ہے، تو بس ہر ایک

کے لئے سوکوڑے کافی ہیں؟ یہ رجم کی بات کہاں سے آ گئی؟ مگر ایک مرتبہ زنا کرنے سے رجم کرنا قرآن کے خلاف ہے، تو چار، چھ، دس مرتبہ، بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ زنا کرنے سے رجم کرنا یقیناً قرآن کے خلاف ہے، ان صاحب نظر نے دونوں کے درمیان فرق کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔

ناظرین! دیکھ لیں، کہ انہوں نے ایک ہی حدیث کے دو مصداق کے لئے الگ الگ پیمانہ بنا رکھا ہے، ایک مصداق کو قرآن پر پیش کر کے اس کو خلاف قرآن قرار دے کر رد کرتے ہیں، اور دوسرے مصداق کو سرے سے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے، شاید اس لئے کہ وہ خود ان کی تجویز ہے۔ اب غور کیجئے، ان کے فیصلے پر کیسے اعتماد ہو؟۔

اس گفتگو کی روشنی میں انہیں صاحب نظر کا ایک تحریر کردہ اصول اور پڑھئے، لکھتے ہیں:

''حدیث صحیح اور قرآن میں اختلاف ممکن نہیں، اور اگر اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کی مزید تحقیق کی ضرورت ہے''۔ (ص۔۱۵)

حدیث صحیح اور قرآن میں اختلاف ممکن نہیں ہے، یہ اصول بالکل درست ہے، مگر اختلاف کی صورت میں اس کا جو محل تجویز کیا گیا ہے، وہ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ حدیث کی تحقیق کے ساتھ اس بات کی بھی تحقیق ضروری ہے کہ صاحب نظر قسم کے لوگ قرآنی آیت کا جو مفہوم سمجھ رہے ہیں، وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی غلط فہمی یا غلط بینی کی وجہ سے صحیح حدیث اور قرآن میں اختلاف نظر آ رہا ہو، پھر یہیں سے ان کے ایک اور اصل کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب قرآن وحدیث میں اختلاف ہو (تو) تطبیق نہ ہو سکنے کی صورت میں قرآن کو لیا جائے گا اور حدیث چھوڑ دی جائے گی، اس لئے قرآن قطعی اور حدیث ظنی ہے، اور قطعی پر ظنی کو ترجیح دینا زیادتی ہے''۔ (ص۔۱۵)

قرآن کا ثبوت قطعی ہے، یہ تو بالکل درست ہے، اور حدیث ظنی ہے، یہ دعوی اپنے عموم کے ساتھ قطعی باطل ہے۔ احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ تعامل اور تواتر کی راہ سے آیا ہے، وہ بالکل قطعی ہے، مثلاً نماز کے پانچ اوقات، نمازوں کی رکعات، موزوں پر مسح وغیرہ کی احادیث، اسی طرح قطعیت کی حامل ہیں، جیسے قرآنی احکام۔

یہ تو ثبوت کی بات ہے، لیکن ایک چیز اور ہے، جس کی شاید مصنف کو خبر نہیں، یا خبر ہے تو بالقصد مغالطہ دیتے ہیں، وہ ہے قرآن وحدیث کے الفاظ کی کسی حکم پر دلالت۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیات اپنے ثبوت کے لحاظ سے تو یقیناً قطعی ہیں، یعنی یہ کہ قرآن کا ہر ہر لفظ اللہ کی طرف سے ہے اور رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے، اور آج جو آیات وکلمات ہم پڑھتے ہیں، بعینہ یہی آیات وکلمات نازل ہوئے ہیں، اس میں یقیناً قطعیت ہے، لیکن ہر آیت اور ہر کلمہ کا مفہوم جو اس سے سمجھنے والے نے سمجھا ہے، وہ بھی قطعی ہو، ایسا بالکل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآنی آیات کے مفہوم ومستدل میں کبھی اختلاف نہ ہوتا، جیسا کہ ان کلمات وحروف میں اختلاف نہیں ہے، اگر آیات قرآنی کی تمام دلالتیں قطعی ہوتیں تو ان میں اختلاف کرنے سے آدمی کفر میں پڑ جاتا۔ کیا ایسا کہنے کی کوئی جرأت کرسکتا؟ آخر خود ان صاحب نظر مصنف نے " الزانیة والزانی'' کے مفہوم میں تمام علما وفقہا سے اختلاف کیا ہے کہ اس کو عام قرار دے کر محصن اور غیر محصن سب کو اس میں داخل کر دیا ہے، جب کہ امت کا اجماع ہے کہ غیر محصن اس سے خارج ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن اپنے لفظ اور دلالت دونوں اعتبار سے قطعی ہے تو جو لوگ صاحب نظر مصنف کی بتائی ہوئی دلالت قبول نہیں کرتے، انہیں یہ کیا کہیں گے؟۔

اس معلوم ہوا کہ قرآن کو مطلقاً قطعی کہنا گو کہ بظاہر خوبصورت بات ہے، مگر اس میں التباس ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ پورا قرآن ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے، لیکن دلالت کے اعتبار سے اس کے بہت سے احکام ظنی ہیں، اور ظنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سمجھنے والوں نے اس سے جو کچھ سمجھا ہے، وہ سب قطعی نہیں۔ اسی کو اصول فقہ کی اصطلاح میں ''ظنی الدلالت'' کہتے ہیں، ظنی ہونے کا تعلق اللہ کے کلام سے براہ راست نہیں ہے، بلکہ استدلال کرنے والوں کے استدلال وفہم سے ہے، لیکن ہمارے صاحب نظر قسم کے لوگ جو اپنے مزعومات کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کے قطعی ہونے کی دہائی دیتے ہیں، اس دہائی کا تعلق قرآن کی دلالتوں ہی سے ہوتا ہے، اس کے ثبوت سے نہیں ہوتا۔ اور یہیں سے وہ سادہ لوح عوام اور علما کو دھوکہ دیتے ہیں.... یعنی وہ اپنے مزعومہ نظریہ کے لئے قرآن کی آیت پیش کرکے اس کی قطعیت کا حوالہ دیتے ہیں، حالانکہ جس مطلب کے لئے وہ حوالہ دیتے ہیں، بسا اوقات وہ بالکل غلط اور خود ساختہ ہوتا ہے،

اس میں التباس بہت ہو رہا ہے، اس لئے اس کی قدرے تفصیل کر دی گئی۔

صاحب نظر مصنف لکھتے ہیں کہ:

''سورہ نور کے بعد اگر آپ نے کسی کو رجم کرایا ہے تو حد زنا کے طور پر نہیں بلکہ کسی اور سنگین تر جرم کی سزا میں''۔ (ص۔۳۰)

خالص تہمت ہے، تمام روایتیں بتاتی ہے کہ آپ نے بطور حد زنا کے رجم کرایا ہے، ہاں بعض روایات میں ایک شخص کو بطور قصاص کے بھی رجم کرانا ثابت ہے، اس کے علاوہ ذرا مصنف اپنی عقلی اور قیاسی تکوں کو چھوڑ کر تاریخ وروایت کا کوئی ٹھوس اور صریح ثبوت پیش کریں، کہ آپ نے بجز حدِ زنا کے اور بجز ایک بار قصاص کے کسی اور سنگین تر جرم میں کسی کو رجم کرایا ہو۔

صحیح مسلم کے حوالے سے ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے مصنف نے نقل کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ:

"رجم النبی ﷺ رجلاً من اسلم ورجلاً من الیہود وامرأته"۔

(اس کا ترجمہ لکھتے ہیں کہ) نبی ﷺ نے بس قبیلہ اسلم کے ایک شخص کو اور یہود کے ایک مرد اور ایک عورت کو رجم کرایا۔ (ص ۳۱)

پھر لکھتے ہیں کہ:

''اس واقعہ میں حضرت جابر بن عبداللہ صرف تین واقعات رجم کا ذکر فرماتے ہیں، جب کہ عہد رسالت میں ان تین کے علاوہ بھی رجم کے واقعات ہوئے ہیں، ماعزؓ کا واقعہ، غامدیہؓ کا واقعہ، یا عسیف والا واقعہ''۔

اتنی سی عبارت میں صاحب نظر مصنف سے دو فاش غلطیاں ہوئی ہیں، ایک غلطی تو جہل کی بنا پر ہے، اور دوسری غلطی دیدہ ودانستہ خیانت ہے۔ جہل کی غلطی یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے قبیلہ اسلم کے جس شخص کا تذکرہ کیا ہے، وہ حضرت ماعزؓ ہی ہیں، کوئی دوسرا نہیں ہے۔

اور خیانت یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ میں صرف تین آدمیوں کے رجم کرنے کا کوئی ذکر نہیں، صرف اتنا ہے کہ حضرت جابرؓ نے تین آدمیوں کے رجم کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس سے کسی اور کی نفی نہیں ہوتی، مگر دیدہ ور مصنف نے ترجمہ میں خیانت کی اور ترجمہ کیا۔ بس قبیلہ اسلم کے

ایک شخص الخ۔گویا کسی اور کا رجم نہیں ہوا،اور پھر اسی ترجمہ کی خیانت پر مفروضات کی عمارت کھڑی کردی، جوصرف ان کے ذہن کی پیداوار ہے،روایات میں اس کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا، پھر نہایت شدومد کے ساتھ یہ بات لکھتے ہوئے کہ حضرت جابر جیسے صحابی جو مدینہ کے رہنے والے تھے،اور حضور سے ان کے قریبی تعلقات تھے، بھلا رجم کے باقی واقعات سے بے خبر ہوں گے، ایسا ممکن نہیں ہے۔آگے لکھتے ہیں کہ:

''اس پس منظر میں ان کے اس بیان کو دیکھا جائے کہ رسول اللہﷺ نے بس قبیلہ اسلم کے ایک شخص کواور ایک یہودیہ کو رجم کرایا تھا،تو ان کا یہی منشا سامنے آئے گا کہ رجم کے یہ تینوں واقعات اپنی نوعیت کے لحاظ سے بقیہ واقعات رجم سے مختلف تھے''۔(ص۔۳۱)

بناءالفاسد علی الفاسد کی واضح مثال،جس چیز کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں وہم تک نہیں،اسے یہ شخص زبردستی اس میں داخل کررہا ہے،اور مزید طرہ اس پر یہ کہ یہ شخص لکھتا ہے کہ:

''اور فرق واختلاف اسی پہلو سے تھا، کہ یہ تینوں رجم سزائے زنا کے طور پر ہوئے تھے، .....اور بعد میں رجم کے جو واقعات ہوئے وہ اس نوعیت کے نہ تھے،ان کا تعلق سزائے زنا یا حدزنا سے نہیں تھا، بلکہ کچھ دوسرے ہی اسباب تھے،جوان کے پیچھے کام کررہے تھے''۔

اپنے اوہام وخیالات کو نص قطعی کے ہم رتبہ سمجھنے کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی؟ واقعی نظر ہوتو ایسی ہو کہ جس چیز کا حضرت جابرؓ کی روایت تو کیا؟ کسی روایت میں نام ونشان تک نہیں،اس کو دریافت کرلیتی ہے، بلکہ بس اسی کو دیکھتی ہے،اور سزائے زنا جس کا ہر روایت میں صراحۃً ذکر ہے،وہ اسے دکھائی ہی نہیں دیتی۔ایسی ہی نظر پر حق مانگا جاتا ہے کہ ہم بھی قرآن وسنت میں اجتہاد کریں گے۔

ترجمہ غلط کیا:

مصنف نے قرآن کی ایک آیت کا ایسا شاندار ترجمہ کیا ہے جس سے ان کی دیدہ وری کا پوارا جلوہ سامنے آجاتا ہے،حق تعالی کا ارشاد ہے:

الزانی لاینکح الا زانیۃً اومشرکۃً والزانی لا ینکحھا الا زان

اومشرک وحرم ذالک علی المومنین. (سورہ نور)

اس کا ترجمہ ہم ''تدبر قرآن'' مصنفہ مولانا امین احسن اصلاحی سے نقل کرتے ہیں، جو رجم کے مسئلہ میں مصنف کے پیش رو ہیں، انہوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

''زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے، اور کسی زانیہ سے نہ نکاح کرے مگر کوئی زانی یا مشرک، اور اہل ایمان پر یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی ہے''۔ (ج ۵۔ص ۳۶۰)

اب اس کے بعد ہمارے صاحب نظر مصنف کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ترجمہ! ''کوئی زنا کار کسی زانیہ یا کسی مشرکہ ہی سے زنا کرسکتا ہے، اور کسی زانیہ سے کوئی زنا کار یا کوئی مشرک ہی زنا کرسکتا ہے، اور مومنین کے لئے یہ چیز مطلقاً حرام ہے''۔ (ص۔۳۳)

کیا کوئی صاحب بقید ہوش وخرد اس مضمون کو قرآن کا مضمون بتا سکتے ہیں؟ یہ مصنف کی وہ معراج ہے، جہاں تک شاید ہی کوئی بڑے سے بڑا محرف قرآن پہونچ سکے، اس ترجمہ کی روشنی میں اگر انہیں جیسا کوئی صاحب نظر ان سے یہ کہے کہ جناب! اس سے معلوم ہوا کہ غیر زانیہ سے غیر زنا کار اور غیر مشرک زنا کرسکتا ہے، کیوں کہ اس کی حرمت کا ذکر اس آیت میں نہیں ہے، تو آپ کیا جواب دیں گے؟ اگر آپ کہیں گے کہ قرآن میں اللہ تعالی نے دوسری جگہ **''ولا تقربوا الزنا''** فرمایا ہے، تو پھر وہ آپ ہی کی زبان میں الٹ کر سوال کرے گا کہ **''القرآن یفسر بعضہ بعضاً''** ، لہٰذا دونوں آیتوں میں یوں تطبیق دی جائے کہ **''ولا تقربوا الزنا''** اجمال ہے، اور سورہ نور کی مذکورہ آیت اس کی تفصیل ہے، اور آپ نے جو مفہوم بتایا ہے اس کی روشنی میں زنا کا خاص یہی طریقہ جو آپ کے ترجمہ سے واضح ہے، حرام ہے، باقی اور طریقوں کی حرمت نہیں ہے۔ ذرا اپنے ترجمہ اور اپنی قرآن فہمی کے اصول پر اس سوال کا جواب تحریر فرمادیں۔ **نعوذ باللہ من ھذا الھذیان**

اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ کتابت کی غلطی ہوسکتی ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مصنف نے یہ ترجمہ کتاب میں دو جگہ کیا ہے، یہاں جو الفاظ ہم نے نقل کئے ہیں، وہ صفحہ ۳۳ پر ہیں، اور دوسری جگہ صفحہ ۱۹۱ پر ان الفاظ میں ترجمہ کیا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے، دونوں کا مفہوم بالکل ایک ہے، معلوم ہوا کہ دیدہ ور مصنف اس آیت کا یہی مطلب سمجھتا ہے۔

''کوئی زانی زنا نہیں کرے گا مگر کسی زانیہ یا کسی مشرکہ سے،اور کسی زانیہ سے زنا نہیں کرے گا مگر کوئی زانی یا مشرک ہی''۔(ص۔۱۹۱)

ناظرین!اب خود بتائیں کہ ایسے شخص کو قرآن کو حدیث میں رائے زنی کا حکم دیا جاسکتا ہے؟اور کیا یہ کتابت کی غلطی ہوسکتی ہے؟۔

طمانچہ بر رخسارِ خود:

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''چنانچہ ان کا(باندیوں کا)نکاح ہوجانے کی صورت میں ان پر نصف حد رکھی،اور نکاح نہ ہونے کی صورت میں کوئی حد نہیں رکھی''۔(ص۔۶۱)

چلئے،باندیوں کو نکاح سے قبل حدِ زنا سے رخصت مل گئی،صاحب نظر مصنف کا یہ فتوی ہے۔اسی صاحب نظر مصنف کا جس نے فقہا کو جب دیکھا کہ ایک سنت متواترہ کی بنا پر وہ ''الزانیۃ والزانی'' کوزانی غیرمحصن کے ساتھ خاص کرتے ہیں،تو وہ چیخ پڑا کہ یہ یقیناً قرآن کے خلاف ہوگا،لیکن اب وہ خود باندیٔ غیر منکوحہ کو اس کے عموم سے خارج کررہا ہے،اور وہ بھی بے دلیل،تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سنت سے بے نیازی:

ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

''اگر کسی مسئلے میں قرآن پاک کی واضح تعلیمات موجود ہیں تو پھر ہمیں کسی اورطرف دیکھنے کی ضرورت نہیں،حتی کہ اس جستجو کی بھی ضرورت نہیں کہ اس سلسلے میں نبیﷺ کی سنت کیا ہے؟یا اس باب میں آپ کی ہدایات کیا ہیں؟''۔(ص۔۶۷)

سنت اور حدیث سے یہ شان بے نیازی قابل دید ہے،پھر آپ کے نزدیک حدِ زنا کے سلسلے میں واضح تعلیمات جب موجود ہیں،تو آپ کو کتب حدیث کی ورق گردانی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟آپ صرف یہ اعلان کردیتے،وہ کافی ہوتا کہ''حد زنا کے سلسلے میں رجم کا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا،اور جو کچھ روایات میں نظر آئے،چونکہ وہ قرآن کی واضح تعلیمات کے خلاف ہیں،اس لئے قابل رد ہیں''۔مانس مصنف کو واضح تعلیمات کے مفہوم کا پتہ ہی نہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ سنت سے بے نیازی کسی حکم کے عملی تشکیل کے سلسلے میں ہو ہی نہیں سکتی۔

فقہا پر نوازش:

پھر اسی بنیاد پر لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے فقہائے عظام کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس اصول کی رعایت نہیں کر سکی، جس کی وجہ سے خود اس مسئلے میں بڑی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں''۔(ص۔۶۷)

مصنف نے بڑی رعایت کی ہے، ورنہ ان کے حساب سے تو یہ فرد جرم تمام فقہاء پر عائد ہوتی ہے، کیوں کہ رجم کے مسئلے میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا، صرف خوارج اور بعض معتزلہ کا اختلاف ہے، جن کے ہم نوا یہ صاحب نظر مصنف ہیں، لیکن ان کی نظر معلوم ہو چکی ہے۔

لغت میں قیاس:

فرماتے ہیں کہ:

''رجل او امرأۃ'' کا جو واضح اور متبادر مفہوم ہے، وہ پختہ سن مرد اور پختہ سن عورت ہے، جس میں شادی شدہ ہونے کا پہلو غالب ہوتا ہے''۔

علمائے لغت کا کہنا ہے کہ لغت میں قیاس کا دخل نہیں ہوتا، لیکن مصنف بہادر ہے، اس حصار کو توڑ کر اپنا قیاس اس میں ٹھونس رہا ہے، ابھی جگہ بنا رہا ہے، ابھی قیاس کو قطعیت کا درجہ نہیں دیا ہے، آگے ملاحظہ ہو:

''یہ دونوں الفاظ اپنی اصل اور حقیقت کے لحاظ سے یہی مفہوم رکھتے ہیں، اور عام طور سے اسی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں''۔

مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ مرد وعورت کے لئے ''رجل'' اور ''امرأۃ'' کا لفظ حقیقت ہے، اور غیر شادی شدہ کے مجاز، اور معلوم ہے کہ مجاز کے لئے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''لہٰذا غیر شادی شدہ مرد یا عورت کے مفہوم میں وہ اسی صورت میں لئے جا سکتے ہیں، جب کوئی واضح قرینہ اس دوسرے مفہوم کے لئے موجود ہو''۔(ص۷۲،۷۳)

یہ بالکل نئی تحقیق ہے، جس سے نہ اہل لغت واقف ہیں، اور نہ ارباب بلاغت۔ واقعی

اِیں کارازتو آید ومرداں چنیں کنند

اورآپ جانتے ہیں کہ ''رجل'' اور''امرأۃ'' میں اتنی دور کی کوڑی لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟بات یہ ہے کہ دیدہ ورمصنف نے امام ابویوسف کی''کتاب الخراج'' سے چار واقعات نقل کئے ہیں،ان چاروں میں کوڑا لگانے کا تذکرہ ہے،اب مصنف چاہتے ہیں کہ یہ سزا شادی شدہ کے لئے ثابت ہوجائے تاکہ شادی شدہ کے لئے زنا کی سزائے رجم کے خلاف دلیل بن جائے۔ان میں سے تین روایات میں''اتـی بـرجـل '' کا لفظ ہے،اور چوتھی روایت میں ''عـلـی امـرأۃ'' کا لفظ ہے،اوراس کا کوئی ذکرنہیں ہے کہ وہ مرد یا وہ عورت شادی شدہ تھی،مگر مصنف نے اس میں محض اپنی رائے سے شادی شدہ ہونے کو نص قطعی بنادیا۔اسی کا نام''معروضی مطالعہ'' ہے جس کا دعوی مصنف نے ابتداءِ کتاب میں کیا ہے۔(ص۔۱۳)

مصنف کی زبردستی:

صاحب نظر مصنف نے زانی محصن سے رجم کی نفی کے سلسلے میں ایک روایت نقل کرکے اس سے استدلال کیا ہے،حالانکہ ان کے بقول قرآن کی واضح تعلیمات کے بعد اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی،بلکہ سرے سے کتاب ہی لکھنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی،مگر جب بیکار ہی کی ٹھن چکی تھی تو اور سہی،فرماتے ہیں کہ:

''حضرت عبداللہؓ کے واسطے سے عہدرسالت کا اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی آتا ہے، جس میں آپ نے ملزم خاتون کو رجم نہیں کرایا،باوجودیکہ وہ شادی شدہ تھی،......اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے۔

''ان رجلاً جاء الی النبیﷺفقال ان امرأتی لاترد یدلا مس قال غربها قال اخاف ان تتبعها نفسی قال فاستمع بها''.

ترجمہ!ایک شخص نبیﷺ کے پاس آیا اورعرض کیا کہ میری بیوی کسی بھی لامس کے ہاتھ کو نہیں لوٹاتی،آپ نے فرمایا کہ اسے وطن سے کہیں دور بھیج دو،اس نے عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ میری جان نکل جائے گی،آپ نے فرمایا کہ اگرایسا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ''۔

اس حدیث کے ترجمے میں صاحب نظر مصنف سے دوایسی فاش غلطیاں ہوئی ہیں،

جس کی توقع کسی ایسے شخص سے نہیں ہوسکتی جس کو اسلامی فقہ سے ذرا بھی مناسبت ہوگی۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے " **غربها** " کا ترجمہ " وطن سے کہیں دور بھیج دو " لغت کے اعتبار سے یہ ترجمہ درست ہے، لیکن جس کو بھی ذرا عقل ہوگی، یہاں ' **غربها** " کا یہ ترجمہ ہرگز نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے کہ بیوی زانیہ ہو، اور اس کو وطن سے دور بھیجنے کا عقلاً اور شرعاً کوئی معنی ہی نہیں، مصنف غریب کو معلوم ہی نہیں کہ لفظ " غرب " طلاق سے کنایہ ہے۔ صاحب سبل السلام علامہ امیر صنعانی لکھتے ہیں کہ " **قال فی النهایه ای ابعدها یرید الطلاق** ". (ج ۳۔ ص ۱۹۴) مطلب یہ ہے کہ اسے دور کردو، یعنی طلاق دے دو۔

دوسری غلطی " **اخاف ان تتبعها نفسی** " کے ترجمہ میں کی ہے، اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد مجھے اندیشہ ہے کہ میری طبیعت اسی کے پیچھے لگی رہے گی، جس کی وجہ سے میرے برائی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے، تب آپ نے فرمایا کہ ایسا ہے تو پھر اسی کو رکھو، اس کا ترجمہ جان نکلنے سے کرنا قطعاً غلط ہے۔

پھر مصنف نے زبردستی کا زور اس پر لگایا ہے کہ " **لاترد ید لامس** "، کا معنی قطعی طور پر زنا کا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ باوجود زانیہ محصنہ ہونے کے آپ نے اسے رجم نہیں کیا، اگر مصنف کی یہ بات مان لی جائے تو ان سے چند سوالات ہیں۔

(۱) یہ لفظ کھلی بات ہے کہ زنا کے معنی میں نہیں ہے، کنایہ ہے، اور کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ کنایہ سے حدِ زنا یا حدِ قذف یا کسی بھی حد کا ثبوت ہو جاتا ہے، اگر آپ کی نظر میں اس کا کوئی ثبوت ہو تو ہم بھی مشتاق ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الفاظِ کنائی سے حدود کا ثبوت قطعاً نہیں ہوتا، اس لئے یہاں نہ زنا کا ثبوت ہے، نہ قذف کا۔ پس نہ رجم کا حکم ہوگا نہ لعان کا، مگر مصنف نے قلم پکڑنا سیکھ لیا تو سمجھ گیا کہ احکام میں بھی قلم چل سکتا ہے۔

(۲) اگر مصنف کے بقول زنا کا ثبوت اس لفظ سے ہو بھی جائے تب بھی محض اتنی سی بات سے کسی حد کا تصور مصنف کی عالی دماغی کا کرشمہ ہے، کیونکہ ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ صرف شوہر کے الزام سے کوئی حد نافذ نہیں ہوتی، جب تک کہ چار گواہ نہ ہوں۔ اور گواہوں کی شرط قرآن کریم کی نص قطعی سے ثابت ہے، یا جب تک عورت کے دعویٰ برأت کے بعد شوہر کی طرف

سے چار قسمیں، اور عورت کی طرف سے قسم کھانے کا انکار نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر جب بیوی پر زنا کا الزام لگاتا ہے، اور عورت قاضی کے یہاں برأت کا دعوی کرتی ہے، تو قاضی دونوں سے چار چار قسمیں لیتا، اور پانچویں مرتبہ جھوٹے ہونے کی صورت میں دونوں پر اللہ کی لعنت اور غضب کی بددعا انہیں سے کرواتا ہے، اسی کو ''لعان'' کہتے ہیں۔ اگر دونوں ایسا کر لیتے ہیں تو عورت کے اوپر سے زنا کی تہمت اور حد ختم ہو جاتی ہے، اور اگر دونوں میں سے کوئی قسم سے انکار کر دیتا ہے، تو چند شرطوں کے ساتھ یا تو مرد پر حد قذف یا عورت پر حد زنا لگتی ہے۔ اس کے بغیر عورت پر حد زنا کا تصور، اور پھر رسول اللہ ﷺ کا اس کو ٹال دینا، اس کا خیال تک مصنف کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔

(۳) اور اگر مصنف کو اصرار ہو کہ صرف شوہر کے کہہ دینے سے ہی زنا کا ثبوت ہو جاتا ہے، تو اولاً تو یہ قرآن کے خلاف ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔ ''**ولم یکن لھم شھد اء الا انفسھم**' تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے مصنف کا نظریہ مان بھی لیا جائے، تو مصنف سے سوال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کم از کم سو کوڑے تو لگوانے چاہئیں تھے، آخر قرآن کے قطعی حکم کو آپ نے کیوں معاف کر دیا؟۔

بحمد للہ مصنف کو بھی یہاں کھٹک پیدا ہوئی ہے، معلوم ہوتا ہے کچھ ہوش درست تھے، مگر پھر فوراً ہی اس ہوش کو رخصت کر دیا، جو جواب حضرت نے دیا ہے وہ بغیر بے ہوشی یا جنون کے دیا ہی نہیں جا سکتا، جواب میں ایک وہم و گمان پیش کیا ہے، جیسے وہ کوئی تاریخی واقعہ ہو، فرماتے ہیں:

> ''رہا سو کوڑے لگانے کا مسئلہ تو یہاں اس کا احتمال ہے کہ اس عورت کو اس سے پہلے اس جرم میں سو کوڑے لگوائے جا چکے ہوں، اس کے باوجود اس نے اپنی روش کی اصلاح نہ کی ہو، اس پر اس کے شوہر نے حضور ﷺ کے سامنے دوبارہ یہ مسئلہ رکھا ہو، تو آپ نے وہ مشورہ دیا ہو جس کا ذکر روایت میں موجود ہے''۔

سبحان اللہ! محض احتمال سے سو کوڑے لگائے جانے کا ثبوت علم و تاریخ کا بالکل نیا استدلال ہے، جو ہمارے صاحب نظر مصنف کی ایجاد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی زانیہ کو جرم زنا کی سزا میں سو کوڑے لگائے جا چکے ہیں، اور وہ پھر اسی گناہ کی مرتکب ہوتی ہے، تو اسے معاف

کر دیا جائے گا،اوراس پر حد نہیں لگے گی؟ مصنف جواب دیں۔

(۴) اچھا چلئے یہ بھی مان لیا کہ اس عورت پر پہلے سو کوڑے لگائے جا چکے ہیں،مگر پھر بھی اس نے اپنی روش کی اصلاح نہ کی،تو آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ عورت اسلامی معاشرہ میں رہنے کے قابل ہے؟ وہ کسی لامس کے ہاتھ کو نہیں لوٹاتی،تو کیا اس کی اصلاح حال کی امید ہے؟ اور کیا جنسی بے راہ روی اس کے رگ وریشے میں سرایت نہیں کرگئی ہے؟ اس کا جواب آپ نفی میں نہیں دے سکتے۔پس آپ کے اصول کے مطابق تو یہ عورت مستحق رجم تھی، نہ کہ قابل درگزر۔کبھی کبھی اپنے فرمودات پر غور کرلیا کیجئے۔

(۵) پھر ایک پیچیدہ سوال یہ ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی بیوی کے زنا جیسے سنگین جرم کا معاملہ پیش کرتا ہے،تو وہاں آپ کو مشورہ دینا چاہئے یا بحیثیت امام وحاکم اس کا فیصلہ کرنا چاہئے،خواہ کوڑا ہو یا رجم۔کیا یہ بھی کوئی قانون ہے کہ ایک شخص پر زنا کی حد کے طور پر مثلاً کوڑا لگایا جا چکا ہے،اور پھر دوبارہ وہ زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو دوبارہ اس پر حد جاری کرنے کے بجائے گھر والوں کو مشورہ دیا جائے کہ اسے وطن سے دور بھیج دو،اور اگر وہ کہیں کہ اس کے جانے سے ہماری جان نکل جانے کا اندیشہ ہے،تو انہیں رخصت دے دی جائے کہ اچھا ایسا ہے تو پھر اسے رہنے دو،کیا حد کا ثبوت ہونے کے بعد امام کو اس کو معاف کرنے کا اختیار ہے؟۔

(۷) پھر ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا زنا کی عادی عورت کو رسول اللہ ﷺ کسی مومن کے نکاح میں رہنے دینے کو گوارہ فرمائیں گے؟ کیا یہ" **والزانية لاينكحها الا زان اومشرك وحرم ذالك على المومنين**" کے خلاف نہیں ہے؟ اور کیا آپ کسی شخص کو دیوث بننے کا مشورہ دیں گے؟۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نظر مصنف کی صرف نظر ہی نہیں دل ودماغ بلکہ ذوق واحساس تک مردہ اور بے جان ہیں،جوان سے اس قسم کی باتیں سرزد ہوئی ہیں۔

یہ ساری مصیبت اس لئے آئی کہ انہوں نے "**لاترد يدلامس**" سے مراد فعل زنا لے لیا،مگر یہ کھلی ہوئی غلطی ہے۔اس کا مطلب یہاں زنا ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ ہے جو علامہ امیر صنعانی نے"سبل السلام"میں لکھا ہے،وہ فرماتے ہیں:

"فالاقرب ان المرادانها سهلة الاخلاق ليس فيها نفور ووحشة عن الاجانب لانها تاتى الفاحشة وكثير من النساء والرجال بهذه المثابة مع البعد من الفاحشة. (ج۳۔ص۱۹۵)

مطلب یہ ہے کہ "**لاتـرديد لامـس**" کا قریب تر مطلب یہ ہے کہ اس کے اخلاق میں لچک ہے، اس میں اجنبیوں سے وحشت اور نفور نہیں ہے، نہ یہ کہ وہ زنا کا ارتکاب کرتی ہے، اور بہت سے مرد وعورت باوجود زنا سے دور ہونے کے اس صفت کے ہوتے ہیں، یعنی ان میں نرمی اور لچک پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ غیروں سے بہت جلد بے تکلف ہوجاتی ہیں، اور انہیں حجاب نہیں ہوتا۔ کسی غیرت مند شخص کے لئے ایسی عورت سوہان روح بن جاتی ہے، شکایت کرنے والے صاحب غیرت مند بھی ہیں، اور محبت کے ہاتھوں مجبور بھی ہیں، غیرت کے باعث انہوں رسول اللہ ﷺ سے مشورہ لیا، اور رسول اللہ ﷺ نے غیرت کے ہی تقاضے کے مطابق جواب دیا کہ اسے چھوڑ دو، مگر وہ محبت کے ہاتھوں بے بس ہوگئے، ان کی جب یہ کیفیت حضور نے دیکھی تو مجبوراً اسی کو رکھنے کی اجازت دیدی۔ اس مطلب کی صورت میں مذکورہ بالا اعتراضات سے نجات ہوجاتی ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی شان میں ہرزہ سرائیاں:

اس واقعہ کے بعد صاحب نظر مصنف نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر بہتان زنا کے قصے کو چھیڑا ہے، اور اس کو اتنے شرح وبسط کے ساتھ تمام جزئیات سمیت بیان کیا ہے، جیسے یہ ان کا محبوب موضوع ہو۔ تہمت کا یہ واقعہ بصرہ میں پیش آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں یہ مقدمہ پیش ہوا، آپ نے معاملہ کی تحقیق کی، گواہیاں لیں، تین گواہوں نے زنا کی گواہی دی، اور ایک گواہ نے زنا کی گواہی سے انکار کردیا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہؓ کو اس تہمت سے بری قرار دیا، اور تینوں گواہوں پر حد قذف لگوائی۔ اس صورت واقعہ کو تفصیل سے مصنف نے ذکر کیا، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صاحب نظر مصنف کو حضرات صحابہ سے کچھ عداوت ہے، محض اپنے وہم وخیال کی بنیاد پر یہ دعوی کردیا کہ راویوں سے صورت واقعہ کے بیان کرنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ واقعہ دراصل یہ ہوا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے نزدیک زنا ثابت ہوگیا ہوگا، کیونکہ چار گواہیاں مکمل تھیں، پھر انہوں نے (مصنف کے زعم کے مطابق زنا کی سزا مطلقاً سو کوڑے ہیں) سو کوڑے بطور حد زنا حضرت مغیرہ کو لگوائے ہوں گے، لیکن راویوں نے اپنے اس گمان باطل اور شہرۂ عام کی وجہ سے کہ زانی محصن کی سزا رجم ہے اور یہاں رجم کا نفاذ ہوا نہیں، اس لئے راویوں پر بات الٹ گئی، اور بجائے حضرت مغیرہ کے، گواہوں پر حد لگانے کی بات کہہ ڈالی۔ استغفر اللہ، اور پھر اپنے اس وہم باطل کو مؤکد کرنے کے لئے بالکل بے موقع اور غلط طور پر حضرت عائشہ کے واقعہ افک کو لے بیٹھے، اور وہ گل کھلائے کہ شاید معتزلہ وخوارج کو بھی نہ سوجھے ہوں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بالکل بے معنی نو صفحے سیاہ کئے ہیں، اس کی ایک ایک سطر بتاتی ہے کہ مصنف کو روایت و درایت، اصول وقواعد اور ہوش وعقل کسی چیز سے مس نہیں ہے، اس بحث کی تردید کرنا محض وقت کی تضییع ہے، لیکن جی چاہتا ہے کہ چند ایک باتیں ذکر کردی جائیں، بطور لطیفہ کے مصنف کی ایک ذرا طویل عبارت ملاحظہ ہو:

''معاملے کے تمام پہلو پر غور کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان گواہوں پر حد قذف نہیں جاری کی گئی، بلکہ خود حضرت مغیرہ پر حد زنا جاری کی گئی، اس لئے کہ چاروں گواہ ثقہ تھے، اور گواہی اتنی واضح اور دوٹوک تھی کہ وہ کسی صورت سے رد نہیں کی جاسکتی تھی۔ فطری طور پر یہاں سوال پیدا ہوگا کہ پھر معاملے کی صحیح صورت ہمارے سامنے کیوں نہیں آئی؟ اور حد زنا کے بجائے حد قذف کی بات کہاں سے چل پڑی؟۔

جواب بالکل واضح ہے رجمِ محصن کی حکایت (باوجودیکہ اس کی کوئی اساس نہ تھی) چھیڑنے والوں نے کچھ اتنے زور وشور سے چھیڑی کہ عام ذہنوں میں اچھی طرح رچ بس گئی، اور اچھے اچھوں کے ذہن ودماغ میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہی ہے، تو جب انہوں نے یہ سنا کہ حضرت مغیرہ کو رجم نہیں کیا گیا، باوجودیکہ وہ شادی شدہ تھے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس موقع پر کوڑے برسائے گئے، تو اس سے انہیں یہ گمان ہوا کہ اس موقع پر کوڑوں کی بارش ہونے اور حضرت مغیرہ کے رجم نہ کئے جانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ جرم ثابت نہ ہوسکا، اور پھر جن لوگوں نے اس واقعے کی گواہی دی، ان پر حد قذف کے کوڑے برسائے گئے۔ حالانکہ صورت حال اس سے مختلف تھی، یعنی وہ کوڑے حد قذف کے نہیں حد زنا کے تھے، اس لئے کہ قذف کا معاملہ یہاں تھا ہی نہیں، یہاں معاملہ بس زنا کا تھا، جس کی سزا

اسلام میں بس سو کوڑے ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ ملزم شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ''۔ (ص۔۹۰)

شاباش آفریں، اب نہ کسی روایت کی ضرورت ہے نہ حکایت کی، بس صاحب نظر مصنف غور وفکر کر کے کسی بھی واقعہ کی صورت حال متعین کر دیں، وہی نص قطعی ہے، تمام راوی متفق ہیں کہ تین گواہیاں زنا پر آئیں، چوتھے نے زنا کی گواہی نہیں دی۔

سب راوی کہتے ہیں کہ تین گواہوں کو کوڑے لگائے گئے، روایت میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان گواہوں سے توبہ کا مطالبہ کیا گیا، دو گواہوں نے توبہ کر لی، تیسرے نے نہیں کی۔ (نصب الرایہ۔ص۳۴۵)

اتنی تفصیل کے بعد جب مصنف غور وفکر کرتا ہے تو صورت حال بالکل برعکس اسے نظر آتی ہے، اس نظر کا کمال ہے کہ چودہ صدیوں کے حجاب کو بغیر کسی اوزار واسباب کے چیر کر صحیح صورت حال کو دیکھ لیتی ہے، اور جو گ وہاں موجود تھے انہیں نظر نہ آسکی۔

البتہ ایک بات مصنف کے اقرار سے ثابت ہوگئی کہ زانی محصن کے رجم کا مسئلہ بعد کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ قرون اولی ہی میں اس زور وشور سے اس کی حکایت چھڑی تھی کہ اس کے خلاف کا وہم وگمان بھی نہ ہوا، کیوں کہ اس روایت کے آخری راوی شیخ عبدالرزاق الصنعانی ۲۱۱ھ میں وفات پائے ہیں، ان سے لے کر دور صحابہ تک راویوں کی کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے، سب کے ذہنوں میں ایک ہی بات کا چھایا ہونا قطعی دلیل اس بات کی ہے کہ یقینی اور بنیادی بات وہی ہے، اور مصنف کا جو کچھ ارشاد ہے، اس کی قیمت خواب میں براتے ہوئے آدمی سے زیادہ نہیں ہے۔

عقل کی خوبی:

اس واقعہ میں چار گواہ تھے، تین گواہوں نے حضرت مغیرہ پر صریح زنا کی شہادت دی، اور ایک گواہ نے زنا کی گواہی نہیں دی، چوتھے گواہ کے بیان سے زنا کا ثبوت نہیں ہوتا، چونکہ چار گواہی نہ تھی، اس لئے اللہ تعالی قانون ''**ثم لم یاتوا باربعة شهدا فاجلدوهم ثمانين جلدة**''. چار گواہ نہ لاسکیں تو انہیں اسی کوڑے مارو، کے مطابق اب مسئلہ شہادت زنا کا نہیں تہمت

زنا کا ہوگیا، اوراس کی سزا اسی کوڑے ہیں، اس لئے ان گواہوں پر اَسّی اَسّی کوڑے کی حد قذف نافذ کی گئی، اور چوتھا گواہ بچ گیا، اس پر صاحب نظر مصنف کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''اگر حضرت ابوبکرۃ اوران کے دونوں ساتھیوں پر حد قذف جاری ہوئی، تو وہ حد قذف زیاد پر بدرجۂ اولی جاری ہوئی ہوگی، کیونکہ گواہی دینے میں تو وہ بھی شریک تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ ان تینوں بزرگوں کی گواہی مکمل سمجھی گئی، اور زیاد کی گواہی ناقص یا نامکمل قرار دی گئی، تو کیا گواہی کا ناقص ہونا بھی کوئی خوبی ہے، اوراس وجہ سے اس گواہ کے ساتھ رعایت کی جائے گی، اور کیا گواہی کا مکمل ہونا کوئی عیب ہے، اوراس کی وجہ سے گواہ کی زدوکوب کی جائے' (ص۸۲)

بے دانشی کا طغیان اسی کو کہتے ہیں، گواہی کے مکمل یا نامکمل ہونے کی بنیاد پر حد قذف کون لگاتا ہے؟ حد قذف تو تہمت زنا کی بنیاد پر لگتی ہے، اوراس صورت میں لگتی ہے جب قاضی کے دربار میں چار گواہ تہمتِ زنا کے نہ پیش ہوسکیں، بلکہ اس سے کم ہوں، خواہ ایک یا دو یا تین، ان پر حد قذف جاری کرنا قرآن کا حکم ہے، اللہ تعالی کے قانون میں چار گواہ سے کم زنا کے باب میں جھوٹے ہیں ''**لولاجاء وا علیه باربعة شهداء فاذ لم یاتوا بالشهداء فاولئک عند الله هم الکاذبون**''. (سورہ نور)

یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہیں لاتے، پس جب اتنے گواہ نہ لاسکیں، تو یہی لوگ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔

مذکورہ بالا واقعہ میں چار آدمی زنا کی گواہی کے لئے چلے، تین شخصوں نے تو زنا کا صریح الزام عائد کیا، اور چوتھے شخص نے اس سے گریز کیا، گویا تین شخصوں نے زنا کی تہمت لگائی، اور ایک اس سے ہٹ گیا، نصاب شہادت مکمل نہ تھا، لہٰذا تین گواہ جھوٹے قرار پائے، اور چوتھا اس سے خارج ہوگیا۔ اب کوئی عقل وہوش رکھنے والا بتائے کہ حد قذف کس پر لگے گی؟ ان پر جو اللہ کے قانون میں جھوٹے ثابت ہوئے، یا اس پر جس کے جھوٹے ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں؟ یہاں گواہوں کے بیان کے مکمل یا نامکمل ہونے سے کیا غرض ہے؟ بس یہ ان صاحب کی عقل کا حال ہے، جو سارے فقہا کو غلط فہمی شکار بتاتے ہیں، اور پھر اپنی اسی ناتمام عقل کے ترنگ میں لکھتے ہیں کہ:

''عقل تو کہتی ہے کہ ناقص گواہی ایک جرم ہے، جس کی دہری سزا اس گواہ کو ملنی چاہئے، کیونکہ جب اس کی معلومات ناقص تھیں تو گواہی کے لئے وہ آگے بڑھا کیوں''؟ (ص۔۸۳)

واقعی اگر عقل یہی کہتی ہے تو نہ جانے بے عقلی کیا کہے گی؟ محترم! یہ عقل نہیں کہتی، بے عقلی کہتی ہے، کیونکہ جھوٹی گواہی کو تو جرم پڑھا اور جانا گیا ہے، مگر ناقص بیان بھی جرم ہے، یہ بات بالکل پہلی دفعہ کان میں پڑی ہے، یعنی گواہ جتنا جانتا ہے بیان کرتا ہے، لیکن اس کے بیان اور گواہی کی بنیاد پر مدعا علیہ پر مطلوبہ فرد جرم عائد نہیں ہوتی، ایسی گواہی کو عدالت فرد جرم عائد کرنے کے لئے گواہی تسلیم نہیں کرتی، یہ تو ہر شخص جانتا ہے، لیکن ایسی گواہی کوئی جرم ہے، جس کی دہری سزا ملنی چاہئے، یہ بات آج صاحب نظر مصنف نے واضح کی۔ عدالتوں کو چاہئے کہ اپنے مجموعۂ قوانین میں اس کا اضافہ کرلیں، کہ اگر کسی گواہ کی گواہی سے مدعا علیہ پر فرد جرم نہ عائد ہوسکتی، تو وہ دہری سزا کا مستحق ہوگا۔

اگر ان حضرات کے ہاتھ میں قانون سازی کا کوئی مرحلہ آ گیا تو نہ جانے کتنے ناکردہ گناہ بڑی بڑی سزاؤں میں از روئے قانون ماخوذ ہوجائیں گے۔

کہاں وہ شوراشوری اور کہاں یہ بے نمکی ؟:

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ والی بحث میں ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے:

''اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ کا موقف بہت صحیح اور متوازن ہے، وہ فرماتے ہیں، جب کوئی گواہی دینے والا یہ گواہی دے کہ اس نے کسی مرد اور عورت ایک ہی لحاف میں، یا کسی ایک ہی حمام دیکھا ہے، یا ان دونوں کو برہنہ دیکھا ہے، یا ان دونوں کا تہبند یا پاجامہ کھلا ہوا دیکھا ہے، اور اس کے ساتھ کوئی قرینہ بھی پایا جاتا ہو، جو اس بات کی تائید کرتا ہو، مثلاً یہ کہ لحاف اپنی اصل جگہ سے ہٹ کر ان دونوں کی جگہ پر ہو، یا ان میں سے کسی کے پاس یا ان دونوں کے پاس کوئی روشنی ہو، جس کو جلتے ہوئے اس نے دیکھا ہو، پھر اسے انہوں نے بجھا دیا ہو، تو اس روشنی کو بجھا دینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کام کو چھپانا چاہتے ہیں، جس کو وہ کررہے ہیں، تو اگر وہاں چھپانے کی کوئی بات نہ ہو، سوائے اس بات کے جس کی گواہی اس گواہ نے دی، تو یہ نہایت زبردست ثبوت ہوگا اس بات کے حق میں جس کی اس نے گواہی دی'' (ص۸۶)

اس عبارت پر ناظرین غور کرلیں، کیا یہ صراحۃً زنا کی گواہی کا تذکرہ ہے؟ اور کیا اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی گواہی دینے والا اس طور پر جس کو علامہ ابن تیمیہ نے تحریر فرمایا ہے، گواہی دے تو اس سے حدِ زنا کا ثبوت ہو جائے گا؟ اور کیا علامہ موصوف کا مقصد یہ ہے کہ زنا کے لئے ایک گواہ ہو تو وہ کافی ہے؟ ان سوالات پر غور کریں، اور صاحب نظر مصنف کے آب زر سے لکھنے کے لائق استنباط کو ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں کہ:

''معلوم ہوا کہ ثبوتِ زنا کے لئے ہمیشہ چار گواہوں کی گواہی شرط نہیں ہوا کرتی، بلکہ قرائن کی موجودگی میں ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہوسکتی ہے، بشرطیکہ وہ گواہ مشتبہ اور ناقابل اعتبار نہ ہو''۔(ص۔۸٦)

لیجئے۔قرآن نے چار گواہوں کی گواہی کو حد زنا کے لئے جو شرط قرار دیا تھا، اس سے چھٹی مل گئی، ابن تیمیہ کی ایک مبہم عبارت سے مصنف نے جو کچھ سمجھا ہے، اس نے قرآن کے نص قطعی کو منسوخ کر دیا۔ چنانچہ فرما دیا کہ ثبوت زنا کے لئے ہمیشہ چار گواہوں کی گواہی شرط نہیں ہوا کرتی ہے، بلکہ قرائن کی موجودگی میں ایک گواہی بھی کافی ہوسکتی ہے، اور یہ کون کہہ رہا ہے؟ وہ کہہ رہا ہے جس نے شروع کتاب میں دعوی کیا تھا کہ:

''اگر کسی مسئلہ میں قرآن پاک کی واضح تعلیمات موجود ہیں، تو پھر ہمیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، حتی کہ اس جستجو کی بھی ضرورت نہیں کہ اس سلسلے میں نبی ﷺ کی سنت کیا ہے؟ اس باب میں آپ کی ہدایت کیا ہیں''؟۔

کہاں وہ شورا شوری تھی کہ حدیث رسول کی طرف بھی دیکھنے کی ضرورت نہیں، اور کہاں یہ بے نمکی کہ قرآن کے نص قطعی کے مقابلے میں علامہ ابن تیمیہ کی عبارت سے استدلال کرنے لگے۔

بریں عقل ودانش بباید گریست

استدلالات غریبہ کا عجائب خانہ:

یوں تو پوری کتاب ہی استدلالات غریبہ کا عجائب خانہ ہے، کسی بحث کو کہیں سے پڑھیئے، کوئی بات ڈھنگ اور قرینے کی نہیں ملتی، آوارگی ذہن وفکر کی اس سے واضح مثال ملنی مشکل

ہے۔اگر ہرایک بحث پر گفتگو کی جائے تو اس کے لئے بہت فالتو وقت چاہئے، جتنا کچھ لکھ دیا گیا ہے،اور یہی کتاب مصنف کے علمی وعقلی جغرافیہ کو جاننے کے لئے کافی ہے،تاہم چند بحثوں پر کلام کرنا ضروری ہے، کیونکہ مصنف نے ان پر بہت زور صرف کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ:

زانی محصن کے حق میں رجم کے ثبوت کے لئے جو روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں،ان پر مصنف نے بہت اہتمام سے بحث کی ہے،اس سلسلے میں سب سے مشہور حضرت عمر کا ایک خطبہ ہے، جو انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک اہم موقع پر ایک بڑے مجمع میں دیا تھا، یہ پورا خطبہ بخاری شریف میں ''باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت'' کے تحت ''کتاب الحدود'' میں موجود ہے۔ یہ ایک طویل خطبہ ہے جس میں انہوں نے رجم کا بھی تذکرہ کیا ہے،اس خطبہ کو کلاً یا جزءاً امام بخاری اور مسلم کے علاوہ دوسرے بیشتر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے،مصنف نے اس روایت کو مسلم شریف کے حوالے سے نقل کیا ہے،الفاظ یہ ہیں:

''قال عمربن الخطاب وهو جالس على منبر رسول اللهﷺ،ان الله قد بعث محمداً ﷺبالحق وانزل عليه الكتاب ،فكان مما انزل عليه آية الرجم قرأناها ووعيناها وعقلناها ،فرجم رسول الله ﷺورجمنا بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل: ما نجد الرجم فى كتاب الله فيضلوا بترك فريضة انزلها الله وان الرجم حق على من زنىٰ اذااحصن من الرجال والنساء اذا قامت البينة اوكان الحبل او الاعتراف.صحيح مسلم.كتاب الحدود،وباب الرجم الثيب فى الزنا''.

ترجمہ! حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک روز فرمایا جب کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے منبر پر جلوہ افروز تھے،اللہ نے محمد ﷺ کو حق دے کر بھیجا،اور آپ پر کتاب نازل فرمائی،تو آپ پر جو چیزیں نازل ہوئیں ان میں آیت رجم بھی تھی،ہم نے اسے پڑھا،اسے محفوظ کیا،اور اسے اچھی طرح سمجھا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کرایا ہے،اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کرایا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اگر لوگوں پر ایک لمبا زمانہ گزرا تو کہنے والے یہ نہ کہیں کہ ہم کتاب اللہ میں رجم

نہیں پاتے ،اس طرح وہ گمراہ ہوجائیں،ایک ایسے فریضے کوچھوڑ کر جسے اللہ نے نازل فرمایا، بلا شبہہ اللہ کی کتاب میں رجم حق ہے مردوں اورعورتوں میں اس پر جوزنا کرے جب کہ وہ محصن ہو اور بینہ ثابت ہوجائے، یاحمل قرار پائے، یااقبالِ جرم ہوجائے۔(۱۴۳)

اس خطبہ پر متعدد اشکال وارد کر کے مصنف نے یہ تأثر دیا ہے کہ گو یہ روایت بخاری، مسلم اور دوسری معتبر کتبِ احادیث میں ہیں،اور گو اس کے راوی سب ثقہ اور قابل اعتبار ہیں،مگر پھر بھی موضوع ہے۔یہ حضرت عمر کا ارشاد ہرگز نہیں ہوسکتا،اس پر مصنف نے چھ باتیں تحریر کی ہیں،ہم بالترتیب سب پر کلام کرتے ہیں۔

پہلی بات:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس آیت رجم کا اس میں ذکر آتا ہے، باتفاق محدثین اس سے مراد یہ آیت ہے"**الشیخ والشیخة اذازنیا فارجموهما البتة،نکالا من الله والله عزیز حکیم**". روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ قرآن پاک کی آیت تھی، بعد میں اس کی تلاوت تو منسوخ ہوگئی، البتہ اس کا حکم باقی ہے۔

اس پر''سبل السلام'' کے کسی محشی کا قول نقل کیا ہے کہ جب رجم شریعت میں باقی ہے اور فرض ہے تو اس کی آیت منسوخ کیوں ہوجائے گی؟اس کو مصنف نے نہایت زبردست اشکال قرار دیا ہے۔حاصل اس کا یہ ہے کہ جس حکمِ شریعت کی حکمت سمجھ میں نہ آئے ،وہ حکم قابلِ انکار ہے،ورنہ اس کی حکمتیں تو شرح حدیث میں موجود ہیں،لیکن آپ کی سمجھ کا حال معلوم ہو چکا ہے، خیر یہ تو مانگا ہوا اشکال ہے،خود صاحبِ نظر مصنف کا اشکال ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس آیت میں" الشیخ والشیخة'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں،جس کے معروف معنی''بوڑھے مرد''اور'' بوڑھی عورت'' کے ہیں''۔(ص۔۱۴۳)

یہاں تک معاملہ غنیمت ہے،معروف معنی کا ذکر کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی غیر معروف معنی بھی ہوگا،مگر پھرفوراًہی اس بات کو یوں بدلتے ہیں:

> ''یہ لفظ ہمیشہ اسی معنی میں استعمال ہوتا آیا ہے،اس کے علاوہ کسی اور معنی میں اس کا استعمال ثابت نہیں ہے''۔

ملاحظہ فرمایا، پینترا کتنی جلد بدل گیا، پہلے یہ بات کہی کہ بوڑھا اور بوڑھی معروف معنی ہے، پھر دوسرا قدم یہ کہ ہمیشہ اسی معنی میں استعمال ہوتا آیا ہے، پھر آخری اور حتمی فیصلہ کہ اس کے علاوہ کسی اور معنی میں اس کا استعمال ثابت نہیں ہے۔ یہ ہمارے صاحب نظر مصنف کی ہوشیاری اور قلابازی ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ یہ لفظ ''بوڑھے مرد'' اور ''بوڑھی عورت'' کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زانی محصن کے حق میں رجم کی بنیاد محض یہی آیت منسوخہ نہیں بلکہ اس کے لئے مدار تو سنتِ متواترہ ہے، تاہم مصنف کے اس دعوی کو کہ ''اس کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال ہوتا ہی نہیں'' پرکھ لینا چاہئے۔

قاموس میں جہاں مذکورہ بالا معنی لکھا ہے، وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ''**والشیخ شجرة وللمرأة زوجها**'' شیخ ایک درخت کو بھی کہتے ہیں، اور عورت کے لئے اس کا شوہر بھی شیخ کہلاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شیخ دوسرے کسی معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور استاذ یا بزرگ کے معنی میں تو اس کا استعمال عام ہے، بس مصنف کا دعوئ انحصار غلط ہے، پھر لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ حقیقت سامنے رکھتے ہوئے اگر اس روایت پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات ایک طالب حدیث کے لئے بڑی الجھن کا باعث ہوتی ہے، کہ اگر اس روایت کی اصل یا اس کی اساس یہی آیت ہے تو اس روایت میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے، جب کہ آیت میں یہ بات موجود نہیں، یہ آیت بوڑھے زانی یا بوڑھی زانیہ کا حکم تو بتاتی ہے لیکن شادی شدہ زانی کے سلسلے میں بالکل خاموش ہے، اس سے کوئی تعرض نہیں''۔

یہ الجھن اور یہ اعتراض قطعاً بے محل ہے، کیوں کہ زانی کے احصان کی شرط کے لئے اس آیت سے استدلال نہیں کیا گیا ہے کہ الجھن ہو۔ احصان کا ثبوت دوسرے دلائل سے ہوتا ہے، اس آیت سے صرف اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ کتاب اللہ میں رجم کا تذکرہ موجود تھا، مصنف خود سے ایک بات فرض کرتا ہے، اور اس پر الجھتا ہے۔

دوسری بات:

لکھتے ہیں کہ:

''دوسری چیز جو اس روایت میں قابل غور ہے اس کے یہ الفاظ ہیں ''**وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی**''اس عبارت میں قابل غور چیز یہ ہے کہ وہ زبان کے عام استعمالات کے خلاف ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ''حق'' کا لفظ جب بصلہ ''علی'' استعمال ہوتا ہے تو وہاں حق فرض یا واجب کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی اس کے ذریعے کسی فعل کے فرض یا واجب ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں اس فرد یا اس گروہ پر داخل ہوتا ہے جو اس فعل کا ذمہ دار ہوتا ہے، یا جس کے ذمہ یہ واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو انجام دے یا اس حکم کا نفاذ کرے''۔ (ص ۱۴۴)

پھر چند مثالوں سے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ چند مثالیں ہیں جو اس اسلوب اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں، یہ اسلوب اور اس کا یہ مفہوم سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم متذکرہ بالا عبارت ''**وان الرجم فی کتاب الله حق علی من زنی**'' کا ترجمہ کریں تو اس طرح ہوگا۔ اور رجم اللہ کی شریعت میں اس کے ذمہ واجب ہے جو زنا کرے، اب یہاں قابل غور چیز یہ ہے کہ کیا رجم کرنا زانی کے ذمے واجب ہوتا ہے یا امام، قاضی، یا حاکم وقت کے ذمے.......۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو متذکرہ بالا عبارت زبان و بیان کے معیار پر پوری نہیں اترتی، اب اس کے بعد یہ باور کرنا کسی طرح ممکن نہیں رہ جاتا کہ یہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کا جملہ ہوگا، جو اپنے عہد میں زبان و بیان کے تاجداروں میں تھے''۔ (ص ۱۶۴)

ماشاءاللہ آپ صرف کتاب وسنت ہی کے امام نہیں، زبان و بیان پر بھی مجتہدانہ قدرت رکھتے ہیں، کتنی دور کی کوڑی لائے ہیں، اور ایک ایسے نکتے کا پتہ دیا ہے جس کی خبر شاید آپ سے پہلے کسی کو نہ تھی، آپ کی شان اہل زبان سے بھی بڑھ کر ہے۔ اچھا چند مثالیں ہم آپ کو کلمۂ 'حق' بصلۂ 'علی' استعمال کی دیتے ہیں، ان کا مفہوم اپنے بنائے ہوئے نکتہ کے مطابق ہمیں سمجھادیں، یا انہیں بھی زبان و بیان کے معیار سے گرا ہوا کہہ دیں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولکن حقت کلمة العذاب علی الکافرین. سورہ زمر. آیة. ۷۱

لقد حق القول علی اکثرهم فهم لایومنون. سورہ یس. آیة. ۷

ویحق القول علی الکافرین. سورہ یس. آیة. ۷۰
و کذالک حقت کلمة ربک علی الذین فسقوا. سورہ یس. آیة. ۳۳
و کذالک حقت کلمة ربک علی الذ ین کفروا. سورہ مومن. آیة. ۶

ان سب آیات میں کلمہ ''حق'' بصلہ ''علی'' آیا ہے، تو کیا آپ فرمائیں گے کہ کلمہ عذاب کے نافذ کرنے کے ذمہ دار کفار ہیں وغیرہ۔ آخر آپ کا بتایا ہوا نکتہ ان آیات پر کیسے منطبق ہوگا؟ اور اگر نہیں منطبق ہوگا تو کیا آپ کی ہمت ہے کہ اسے بھی معیار سے گرا ہوا کلام قرار دیں؟ کچھ تو قرآن پڑھا ہوتا صاحب نظر مصنف نے۔

تیسری بات:

''تیسری چیز جو اس روایت سے متعلق قابل غور ہے وہ یہ کہ اس میں استقرارِ حمل کو بھی ان اسباب میں شمار کیا گیا ہے، جن کی بنا پر رجم واجب ہوتا ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور جمہور علماء نے اس سے انکار کیا ہے''۔ (ص۔۱۴۶)

''یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان علمائے کرام اور ائمہ عظام کا ظہورِ حمل کے باب میں اس روایت سے ہٹ کر ایک دوسرا موقف اختیار کرنا اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ وہ کم از کم اس روایت کے اس جزء کو غیر محفوظ نہیں سمجھتے تھے، اور اگر روایت کا جزء غیر محفوظ ہے تو کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ روایت کے بقیہ اجزاء بالکل محفوظ ہیں''؟۔ (ص۔۱۴۸)

یہاں مصنف نے حدیث کے صحت وسقم کے لئے ایک ایسا قاعدہ وضع کیا ہے جس کا پتہ اب تک کسی محدث اور عالم کو نہیں تھا۔ ہمارا شیر ہر فن میں مجتہد ہے، آپ نے کبھی نہ سنا ہوگا کہ امام ابوحنیفہ نے یا فلاں یا فلاں عالم نے فلاں روایت کے اتنے جزء کو نہیں اختیار کیا، جب کہ اس کے سب رواۃ ثقہ ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے نزدیک وہ غیر محفوظ ہیں، اور پھر اس کی غیر محفوظیت کے باعث پوری روایت مشکوک ہے۔ بالکل جدید علم ہے، تازہ قاعدہ، اہل علم کی ضیافت کا سامان، اگر اس اصول کو بروئے کار لایا جائے تو نقد رجال کا قصہ ہی تہ کر کے رکھ دینا چاہئے، پھر اسماء الرجال کا ایک بڑا حصہ سرے سے ناقابلِ اعتناء ہو جائے گا۔

چوتھی بات:

''چوتھی چیز جو اس روایت کے تعلق سے قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ اس روایت سے

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں ابتداء رجم کی آیت موجود تھی، بعد میں اس آیت کے الفاظ منسوخ ہو گئے، لیکن اس کا حکم باقی رہا، اس طرح گویا اس روایت کے بموجب رجم کا حکم قرآن سے ثابت ہے۔ اس کے بالمقابل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے جو انہوں نے شراحہ ہمدانیہ کا واقعہ پیش آنے پر فرمایا تھا کہ "جلدتها بكتاب الله ورجمتها بسنة رسول الله" اس سے صاف ظاہر ہے کہ رجم کا حکم قرآن میں موجود نہیں ہے، وہ سرتاسر نبی کریم ﷺ کی سنت سے ماخوذ ہے"۔ (ص۔۱۴۸)

اس پر عرض ہے کہ اس بات کے لئے حضرت علی کے قول سے استدلال کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو واقعہ ہے کہ پورے قرآن میں رجم کا حکم کہیں مذکور نہیں ہے، یہ تو ہر پڑھنے والا جانتا ہے، کہ حضرت عمر کے فرمان ہی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کتاب اللہ میں رجم کی آیت موجود تھی، گویا اس آیتِ رجم کا ثبوت اسی روایت سے ہے۔ پھر اگر حضرت علی اس سلسلے میں قرآن کا حوالہ نہ دیں تو کیا اس سے وہ روایت غیر معتبر ہو جائے گی، انہوں نے بجا فرمایا کہ میں نے سنت رسول اللہ سے اسے رجم کیا ہے، کیونکہ کتاب اللہ میں یہ آیت موجود ہی نہیں ہے، پھر اس کا حوالہ کیوں کر دیتے؟ یہ تو آپ کا کمال ہے کہ رجم کا حکم باوجودیکہ کتاب اللہ میں موجود نہیں ہے، لیکن بڑے طمطراق سے دعوی کرتے ہیں کہ " الرجم حقيقة جاء بها الكتاب" اپنے استنباط کو قرآن کی نصِ قطعی بنا دینے کا فن آپ ہی کو آتا ہے۔

پانچویں بات:

پانچویں بات کو پڑھ کر ہم حیران ہو گئے کہ اسے تحریر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بالکل لغو اور بے ضرورت، لہٰذا اس سے صرفِ نظر کرنا ہی مناسب ہے۔

چھٹی بات:

چھٹی بات کے لئے علامہ انور شاہ کشمیری کا حوالہ دیا ہے کہ:

"یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ رجم کا حکم یا تو قرآن ہی کا حکم ہے، یا اس کا حکم نہیں ہے، اب اگر وہ قرآن ہی کا حکم ہے تو حضرت عمر کے لئے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اسے قرآن میں نہ لکھیں، اور اگر وہ قرآن کا حکم نہیں ہے، تو ان کے لئے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اسے قرآن میں لکھ دیں"۔ (ص۔۱۵۰)

یہ اشکال ظاہر ہے کہ روایت زیر بحث پر نہیں ہے، اس لئے اس کو اس جگہ لانا بے موقع بات ہے۔ ایک دوسری روایت میں حضرت عمر سے یہ الفاظ منقول ہیں "**لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لکتبتُھا بایدی**" ان کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اس آیت کے نزول کا اور اس کے حکم کے باقی رہنے کا اس درجہ یقین ہے کہ اگر لوگوں سے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا، تو میں اسے اپنے ہاتھ سے لکھ دیتا۔ اس پر مذکورہ اعتراض وارد ہوتا ہے، مگر اس کا حل آسان ہے، وہ یہ کہ حضرت عمر تسلیم کرتے ہیں کہ اب یہ الفاظ قرآن میں نہیں ہے، اگر لکھ دیئے جائیں تو لوگ سمجھیں گے کہ یہ بھی قرآن پاک کا جزء ہے، اور کچھ لوگ کہیں گے کہ عمر نے اس میں اضافہ کر دیا، اس لئے انہوں نے لکھنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

یہ پانچ باتیں مصنف نے اپنی دانست میں ایسی ذکر کی ہیں جن کی روشنی میں مذکورہ خطبہ کا موضوع ہونا ثابت ہوتا ہے، ناظرین غور کریں کس بات میں کتنا دم ہے؟۔

ماخذ: ماہنامہ دارالعلوم۔ اگست، ستمبر، اکتوبر (۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) حالانکہ جب کوئی شخص ہوش وحواس کی تمہیدات سے بھی خالی نہ ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی عادی مجرم چار مرتبہ زنا کر کے ہر مرتبہ امام وقاضی کے دربار میں آکر الگ الگ اقرار جرم کرے گا، اور یہ بات تو اس سے بھی بعید ہے کہ امام وقت پہلی ہی مرتبہ سزا دینے کے بجائے اسے عادی مجرم بننے کا موقع فراہم کرے گا۔

سیدنا الامام محمد بن حسن الشیبانی علیہ الرحمہ اوراہل الرائے ہونے کی حقیقت وحیثیت

یہ مقالہ شیخ عبدالفتاح ابوغدۃ علیہ الرحمہ کے اس مضمون کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، جو انہوں نے ’’التعلیق الممجد علیٰ مؤطا الامام محمد‘‘ کے جدید ایڈیشن کے لئے بطور مقدمہ لکھا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کے جلیل القدر شاگرد، حنفیت کے مدار ومحور، مشہور امام وفقیہ، دور عباسیہ کے قاضی القضاۃ، حضرت امام محمد بن حسن شیبانی جن کے حق میں امام شمس الدین الذہبی نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

’’انتهت اليه رياسة الفقه بالعراق بعد ابى يوسف وتفقه به ائمة وصنف التصانيف وكان من اذكياء العالم......احتج به الشافعى فى الحديث يحكى عنه ذكاء مفرط وعقل تام وسوددو كثرة تلاوة‘‘.

امام ابو یوسف کے بعد عراق میں علمِ فقہ کی ریاست ان پر ختم تھی، متعدد ائمہ نے ان سے تفقہ حاصل کیا، متعدد کتابیں انہوں نے تصنیف کیں، دنیا کے ذہین ترین لوگوں میں ان شمار ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ نے ان سے علم حدیث میں استدلال کیا ہے، ان کی ذہانت وذکاوت، عقلِ کامل، سیادت اور کثرتِ تلاوت معروف ہے۔ (مناقب ابی حنیفہ وصاحبیہ.....۷۹)

امام شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ ’’اگر محمد بن حسن اپنی عقل وفہم کے اعتبار سے ہم سے کلام کرتے تو ہم ان کی باتیں ہرگز نہ سمجھ پاتے، لیکن وہ ہماری عقل کے معیار سے تکلم کرتے

تھے،اس لئے ہم سمجھ لیتے تھے''۔(الآداب الشرعیہ لابن مفلح حنبلی ۲؍۱۶۵)

امام شافعی علیہ الرحمہ خود امام محمد سے نقل کرتے ہیں،انہوں نے فرمایا کہ''میں امام مالک علیہ الرحمہ کی ڈیوڑھی پر تین سال تک رہا ہوں،میں نے سات سو سے زائد حدیثیں ان سے لفظاً لفظاً سنی ہیں''۔

امام شافعی فرماتے ہیں''اگر میں کہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کریم محمد بن حسن کی لغت پر اترا ہے،کیوں کہ وہ کم بولتے تھے،اور جو کچھ بولتے تھے بہت فصیح ہوتا تھا۔میں نے کسی بھاری جسم والے کو ان سے زیادہ سبک روح نہیں دیکھا،اور نہ ان سے زیادہ فصیح وبلیغ پایا،جب میں انہیں قرآن پڑھتے ہوئے دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔میں نے ان سے بڑا کتاب اللہ کا عالم نہیں پایا،ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرآن انہیں پر نازل ہوا ہے۔میں نے جب بھی کسی سے بحث ومباحثہ کیا تو اس کا چہرہ ضرور متغیر ہوا ہے،بجز امام محمد کے،کہ ان بشاشت ہر حال میں باقی رہتی تھی۔میں نے ان سے بختی اونٹ کے بوجھ کے بقدر علم حاصل کیا ہے یعنی اتنا علم حاصل کیا ہے کہ اگر اسے کاغذ پر لکھا جائے تو ان کاغذوں کا وزن ایک بختی اونٹ کے بوجھ کے بقدر ہوگا''۔(مناقب ابی حنیفہ للذہبی)

بختی اونٹ عرب کا سب سے بڑا اونٹ ہوتا ہے،آپ اندازہ کیجئے،کتنا وسیع اور زبردست علم انہوں نے امام محمد علیہ الرحمہ سے حاصل کیا تھا۔

مشہور محدث حضرت یحیٰی بن معین نے امام محمد علیہ الرحمہ کے درس میں ان کی کتاب ''جامع صغیر''،لکھی تھی۔محمد بن سماعہ فرماتے ہیں کہ''امام محمد جب علمِ فقہ میں غور کرتے تھے تو ان پر استغراقی کیفیت طاری ہوجاتی تھی،اور گردوپیش سے تقریباً بے خبر ہوجاتے تھے،اس دوران اگر انہیں کوئی سلام کرتا تو وہ اسے دعا دینے لگتے،پھر دوبارہ سلام کرتا تو پھر وہ اسی دعا کو دہرانے لگتے۔(مناقب ابی حنیفہ للذہبی)

تحمل کا نمونہ:

اوپر امام شافعی علیہ الرحمہ کا ارشاد گزرا ہے کہ بحث ومباحثہ کے دوران مجھے کوئی عالم ایسا نہیں ملا جو ترش رو نہ ہوا ہو،یہ صرف امام محمد کی خصوصیت تھی کہ ان کا حلم وتحمل ہر حال میں برقرار

رہتا تھا۔اس سلسلہ میں ایک واقعہ کونقل کرنا باعثِ بصیرت ہوگا،اس میں امام شافعی علیہ الرحمہ کے ارشاد کی دلیل بھی موجود ہے،اور مزید فوائد بھی ہیں۔ یہ واقعہ مشہور محدث ومورخ حافظ خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' ۱۱/۱۵۸ میں نقل کیا ہے،انہوں نے معروف فقیہ ومحدث حضرت عیسیٰ بن ابان کے احوال کے ضمن میں امام محمد علیہ الرحمہ کے تلمیذ خاص حضرت محمد بن سماعہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''عیسیٰ بن ابان ہمارے ساتھ نماز میں شریک رہا کرتے تھے، میں کبھی کبھی انہیں امام محمد کی مجلس میں آنے کی دعوت دیا کرتا تھا،اس کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ حدیث کے خلاف عمل کرتے ہیں۔عیسی بن ابان حدیث کے اچھے حافظ تھے،ایک دن انہوں نے فجر کی نماز پڑھی، وہ دن امام محمد کے درس کا تھا، میں نے زور دے کر کہا کہ آج تو اس مجلس میں شرکت کر ہی لیجئے،انہوں نے مجبوراً میرے اصرار پر شرکت کی۔

جب امام صاحب درس سے فارغ ہوئے تو میں عیسیٰ بن ابان کو امام صاحب کے پاس لے گیا،اورعرض کیا کہ یہ آپ کے بھتیجے عیسی بن ابان بن صدقہ کاتب ہیں،انہیں حدیث کا اچھا علم حاصل ہے، میں انہیں آپ کے پاس لانا چاہتا تھا،مگر یہ انکار کردیتے تھے،انہیں یہ اشکال ہے کہ ہم لوگ حدیث کے خلاف عمل کرتے ہیں۔اس پر امام محمد متوجہ ہوگئے،اور ان سے فرمایا۔اے فرزند!تم نے ہمیں کس بات میں حدیث کے خلاف عمل کرتے دیکھا ہے، دیکھو!جب تک ہم سے نہ سن لو ہمارے خلاف کسی بات کو بیان نہ کرو۔

انہوں نے حدیث کے پچیس ابواب میں امام صاحب سے سوالات کئے،امام صاحب ہرسوال کا جواب دیتے،اوران میں ناسخ ومنسوخ کو بتاتے،اس کے دلائل وشواہد ذکر کرتے۔

جب ہم وہاں سے باہر نکلے تو میری طرف متوجہ ہوئے،اور کہنے لگے کہ میرے درمیان اورنور کے درمیان ایک پردہ تھا،آج وہ پردہ ہٹا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اللہ کے ملک میں اس جیسا کوئی آدمی ہوگا، جسے حق تعالی لوگوں کے واسطے نمایاں کریں،اس کے بعد عیسی بن ابان نے ان کی صحبت اختیار کی،اوران کی خدمت میں تفقہ کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

عمل بالرائے کی تہمت:

امام محمد علیہ الرحمہ کے یہ حالات ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کئے ہیں،اس میں

ہم نے ان حضرات کا حوالہ دیا ہے جو امام محمد علیہ الرحمہ سے الگ اپنا مسلک رکھتے ہیں، لیکن وہ امام محمد کی عظمت اور جلالت قدر کے قائل ہیں، ان شہادتوں سے قطعِ نظر اگر کوئی شخص انصاف اور بے تعصبی کی نظر سے امام محمد کی تصانیف بالخصوص ''موَطا'' اور ''کتاب الحجۃ'' وغیرہ کا مطالعہ کرے گا وہ اپنے آپ کو اس اعتراف پر مجبور پائے گا کہ امام صاحب کو جیسے تفقہ واجتہاد میں رسوخِ تام حاصل تھا، اسی طرح علم حدیث میں بھی روایۃً ہو یا درایۃً مہارتِ کاملہ حاصل تھی، وہ جہاں اعلی درجہ کے فقیہ تھے وہیں ایک بلند پایہ محدث بھی تھے، اور پھر تفقہ فی الحدیث میں امتیازی شان کے مالک تھے۔

مگر وہی ایک بات جو ان کی دستارِ کمال میں طرۂ افتخار تھی، بہت سے لوگوں کی نظروں میں وہی بات باعثِ نقص بن گئی، وہ یہ کہ انہیں احادیث وروایات میں اجتہاد کا ملکہ حاصل تھا، اور وہ اپنی عقل ونظر سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی (جو مختلف راویوں کے واسطہ کی وجہ سے مختلف صورت میں نظر آتے ہیں) روح اور ان کے منشا کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ حضرات جو اس خوبی وکمال کو راویٔ حدیث کے اندر عیب اور خلل تصور کرتے ہیں، یہ ان اہل حدیث بزرگوں کا گروہ ہے جس کی ساری کدوکاوش الفاظِ حدیث کی یاد کرنے، راویوں کی چھان بین کرنے اور اختلافِ الفاظ کو یاد کرنے تک محدود ہے، احادیث کے مفہوم کو کس طرح سمجھا جائے؟ ان سے مسائل کا استنباط کس طرح ہو؟ استنباط کے اصول کیا کیا ہیں؟ انہیں کس طرح برتا جائے؟ تنقیحِ مناط اور تخریجِ مناط کیا ہے؟ اور انہیں کس طرح اخذ کیا جائے؟ جس کا تمام تر تعلق اجتہاد ورائے سے ہے، اس سے انہیں سروکار نہیں، یا ہے تو بہت کم۔ ان حضرات نے راویٔ حدیث میں جہاں اور وجوہِ طعن اور اسبابِ جرح ذکر کئے ہیں، وہیں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ فلاں راوی حدیث کے سمجھنے میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے، یعنی اس کے فہم میں عقل سے کام لیتا ہے۔

یہاں ہم یہ بات واضح کردیں کہ رائے پر عمل کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کو خواہ صحیح حدیث مل جائے، اور یہ بھی معلوم ہو کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے، اور یہ بھی جانتا ہو کہ یہ حدیث منسوخ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود محض اپنی رائے اور عقل سے اس کو رد کردے، جیسا کہ ایک زمانہ میں اہل اعتزال نے کیا تھا، کہ دیدارِ الٰہی کی حدیث رواۃ کے لحاظ سے بالکل صحیح

ہے،اس میں کوئی دوسری تاویل بھی نہیں چل سکتی،اوراس کے منسوخ ہونے کا بھی کوئی سوال نہیں ہے، کیوں کہ وہ ازقبیل خبر ہے،اور خبر منسوخ نہیں ہوا کرتی،ورنہ رسولِ معصوم کی جانب کذب کا انتساب لازم آئے گا،لیکن محض اس وجہ سے کہ ان کی عقل میں دیدارِالٰہی کا امکان نہیں آتا،انہوں نے صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے اس کا انکار کردیااور حدیث کورد کردیا۔

اگرعمل بالرائے کا مطلب یہ ہےتو ائمہ کرام تو خیر بڑی چیز ہیں،عوام الناس سے اس کا تصورنہیں ہوسکتا،بجزاس کے کہ اس کوگمراہی نے آگھیرلیا ہو۔ہم نہیں جانتے کہ کسی امام نے رائے پر اس طرح عمل کیا ہوجس کا اوپر ذکر آیا،آگے اس کی تفصیل علامہ ابن تیمیہ کے کلام میں آرہی ہے۔

رائے پرعمل کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ایک مجتہد جسے اللہ تعالیٰ نے وافرعلم،کامل عقل، وسعت نظر،اور تاویل الاحادیث کی قدرت عطا فرمارکھی ہے،اس کے سامنے جب قرآن کی آیت آئے،کوئی حدیث آئے،تو وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ یہ آیت اور یہ حدیث کس محل سے تعلق رکھتی ہے؟اس کے الفاظ میں کیا کیا معانی پنہاں ہیں؟اگراسی مفہوم کی حدیث دوسرے الفاظ سے مروی ہےتو وہ معنی مشترک کیا ہے؟جس سے تمام الفاظ میں تطبیق ہوسکے،اگررائے کا یہ مفہوم ہے،اور جب وہ ائمہ کی طرف منسوب ہوتی ہےتو یقینی طور پراس کا یہی مفہوم ہوتا ہے،تو کون اسے باعثِ نقص کہہ سکتا ہے؟یہ تو ایک ہنرہے،ہرہنرسے بڑھ کر۔یہ ایسا ہی جیسے ایک حافظِ قرآن ہے،اسے قرآن پورایاد ہے،مگروہ اس کے معانی ومطالب سے آشنانہیں ہے،وہ کثرتِ تلاوت میں ممتاز ہے،اور ایک دوسرا حافظ ہے،جوقرآن کے معانی ومطالب کوخوب سمجھتا ہے،اور اس کے ذریعے سےلوگوں کی راہنمائی کرتا ہے،لوگ اس سے اپنے معاملات ومسائل میں فائدہ اٹھاتے ہیں،وہ بھی تلاوت کرتا ہےمگراس کی امتیازی شان تلاوت نہیں،فہمِ معانی ہے۔

ناظرین کرام!خودغورکرلیں کہ دونوں میں کس کا درجہ اونچا ہے،اگرنرے حفاظ سب مل کر پکارنے لگیں کہ ہم ہی قرآن کا حق ادا کرنے والے ہیں،اور جوشخص مفہوم ومطلب پرغورکرتا ہے،وہ قابل اعتمادنہیں ہے،تو یہ کس قدرعقل سے بعید ہے۔

ایک نرے محدث اورایک محدث فقیہ میں فرق بکثرت نمایاں ہوتا رہتا ہے،حافظ ابن

رجب نے ''طبقات الحنابلہ'' میں اور شیخ علیمی نے ''المنہج الاحمد'' میں یحییٰ بن مندہ اصفہانی کے حالات میں تحریر کیا ہے کہ ایک صاحب علم کی بیوی فوت ہوگئی، اس کو غسل دینے والی کوئی خاتون نہیں مل رہی تھی، اور جو غسل دے سکتی تھی وے حائضہ تھی، وہ شخص مسئلہ معلوم کرنے کے لئے مشہور محدث یحییٰ بن معین اور الدورقی کی خدمت میں آیا، ان حضرات سے کوئی جواب نہیں بن پڑا، اتنے میں امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ تشریف لے آئے، انہوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ مسئلہ پوچھنے والے نے کہا کہ میت کو غسل دینے کے لئے سوائے حائضہ عورت کے اور کوئی عورت نہیں مل رہی ہے، امام صاحب نے ان محدثین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آخر آپ ہی لوگ تو حضرت عائشہ کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا۔ ''**یاعائشہ! ناولینی الخمرۃ ، قالت انی حائض ،فقال ان حیضتک لیست فی یدک**'' اے عائشہ! ذرا رومال دیدینا، انہوں نے کہا کہ میں حیض سے ہوں، آپ نے فرمایا کہ حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حائضہ غسل میت دے سکتی ہے، یہ سن کر یہ اہل حدیث حضرات متحیر اور ہکا بکا رہ گئے۔

بتادینے کے بعد کتنی آسان بات تھی، مگر حفاظِ حدیث پر بہت بھاری تھی، اب اندازہ کرنا چاہئے کہ جن لوگوں کو بغیر بتائے اتنی بات تک رسائی نہ ہوسکی، حالانکہ اس سلسلے میں بہت واضح حدیث ان کے حافظے میں موجود تھی، یہ حضرات اگر استعمالِ رائے وعقل کو وجہِ طعن قرار دیں تو ان کی بات میں کتنا وزن ہوگا؟ اور اس سے کس کو مطعون قرار دیا جاسکتا ہے؟ مطعونین کو یا طاعنین کو؟۔

لیکن مصیبت یہی ہے کہ ان تمام اہل حدیث بزرگوں یا اکثر اہل حدیث حضرات کے نزدیک راوی کی ثقاہت مجروح ہوجاتی ہے، اگر وہ فہم وتفقہ کے لئے رائے اور عقل کو عمل میں لاتا ہے، خواہ وہ کوئی معتبر اور مسلم امام ہی ہو، اور صرف فقہ ہی نہیں، خواہ وہ حدیث میں مستند امام ہو، لیکن چونکہ اس نے عمل بالرائے کی غلطی کی ہے اس لئے وہ متروک ہے، نا قابل اعتناء ہے وغیرہ، حالانکہ رائے کے بغیر تفقہ کا وجود نہیں ہوسکتا، اور نہ کوئی معتبر ومتبوع امام ایسا ہوگا جس نے رائے پر عمل نہ کیا ہو، لیکن ان اہل حدیث بزرگوں کا عجیب مسلک ہے، راویٔ حدیث پر نقد کرنے میں

انہوں نے بھی ایک رائے قائم کررکھی ہے، اور وہ رائے یہ ہے کہ ''جو ہماری طرح نہیں ہے وہ ہمارا مدِ مقابل ہے'' انا اللہ۔ جو لوگ رائے کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھی رائے سے مفر نہیں پاتے، مگر ان کی رائے کا جو حشر ہے وہ سامنے ہے۔

عمل بالرائے کے متعلق اہل حدیث علما کی رائے:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اہل حدیث علما نے اپنی جو رائے قائم کی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اسے قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کردیا جائے۔

بطور تمہید کے یہ بات ذکر کردینی چاہئے کہ ''اصحابِ رائے'' یا ''اہل رائے'' کا لقب کوفہ کے علما وفقہا کے لئے ان حضرات نے تجویز کیا ہے، اور اس کی اشاعت کی ہے، جو بعض الفاظ حدیث کے راوی ہیں، جن کا سارا علم یہ ہے کہ وہ الفاظ حدیث کے ظاہر کی خدمت کرتے ہیں، انہیں اس سے عموماً کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ ان الفاظ کے پردے میں کتنے دقیق معانی اور لطیف استنباط پنہاں ہیں، یہ لوگ ہر اس شخص سے اپنے سینے میں تنگی محسوس کرتے ہیں جس نے فہمِ نصوص اور تحقیقِ علت ومناط میں عقل ورائے کو استعمال کیا ہو، ظاہرِ حدیث سے ان حضرات نے جو مطلب سمجھا اس سے آگے بڑھ کر اگر کسی نے اور معانی کی تحقیق وتلاش کی تو اس پر ناراض ہوتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ راستے سے منحرف ہوگیا ہے، بلکہ انہیں یہ وہم ہوتا ہے کہ اس نے حدیث کو چھوڑ دیا ہے، اور رائے کو اختیار کرلیا ہے، اس لئے وہ ان کی رائے میں مذموم ہے متروک ہے۔

ان کے اس رویہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حدیث وہ نہیں ہے جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ کے الفاظ وکلمات پر آدمی غور کرے، بلکہ حدیث وہ ہے جو ان حضرات نے سمجھا ہے، اسی وجہ سے جس نے ان کے فہم سے تجاوز کرکے الفاظِ حدیث پر غور کیا اسے یہ مخالفِ حدیث قرار دینے لگتے ہیں، ۔ یاللعجب

اب سنئے کہ راویانِ حدیث کی ایک جماعت نے اس لقب (اہل الرائے) کی وجہ سے معتبر ومسلم فقہا کو مجروح قرار دے دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) امام بخاری علیہ الرحمہ کے استاذ ہیں، محمد بن عبداللہ بن المثنیٰ الانصاری، ان کے متعلق حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ ''یہ قدمائے شیوخِ بخاری میں سے ہیں، ثقہ

ہیں، ابن معین وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، امام احمد نے فرمایا کہ اہل حدیث کے نزدیک ان میں کوئی اور وجہ ضعف نہیں ہے، بجز اس کے کہ انہیں رائے کا اہتمام رہتا تھا، رہ گئی سماعتِ حدیث تو وہ ایک ثابت شدہ چیز ہے۔

(۲) حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں ولید بن کثیر مخزومی کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کی توثیق ابراہیم بن سعد، ابن معین اور ابوداؤد نے کی ہے، ساجی نے کہا کہ یہ ثقہ اور ثبت تھے، ان کی حدیث قابل احتجاج ہوتی ہے، کسی نے انہیں ضعیف نہیں قرار دیا ہے، ان میں لوگوں نے صرف ''رائے'' کا عیب پایا ہے۔

(۳) حافظ ذہبی نے ''المغنی'' میں لکھا ہے کہ معلیٰ بن منصور، مشہور امام ہیں، لائق اعتماد ہیں، ابوداؤد نے فرمایا کہ امام احمد ان سے روایت محض رائے کی وجہ سے نہیں لیتے تھے، ابوحاتم نے کہا کہ امام احمد سے دریافت کیا گیا کہ آپ ان کی حدیث کیوں نہیں لکھتے؟ انہوں نے کہا کہ یہ شروط لکھا کرتے تھے، اور جو شخص شروط لکھتا ہے وہ کذب سے خالی نہیں ہوتا۔

پھر یہی امام احمد بن حنبل ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ معلیٰ بن منصور ابو یوسف اور محمد کے بڑے تلامذہ میں ہیں، اور نقل و روایت میں نہایت ثقہ ہیں۔ (تہذیب التہذیب)

ملاحظہ ہو، معلیٰ بن منصور کی ثقاہت مسلم ہے، لیکن ان سے روایت اس لئے نہیں لی کہ وہ ''صاحب رائے'' ہیں۔ اس طرح ان حضرات اہل حدیث نے بکثرت اہل الرائے اصحابِ حدیث کو اور ان کی روایتوں کو ترک کر دیا ہے، اور اس کے نتیجے میں بہت سی معتبر احادیث کو جن کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں ہونا چاہئے، ترک کر کے ان سے امت کو محروم کر دیا ہے، یا کم از کم ان کی طرف سے دلوں میں بے اطمینانی پیدا کر دی ہے۔ ایک راوی کی ثقاہت وعدالت تسلیم ہے لیکن اس کی روایت متروک ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کا شمار اہل الرائے میں ہے، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد کی روایتیں بخاری و مسلم میں اسی لئے موجود نہیں ہیں کہ وہ اہل الرائے میں ہیں، کتنے لوگوں کے دلوں میں ان کی طرف سے بے اطمینانی اور خلش صرف اس وجہ سے ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم نے ان بزرگوں سے کوئی روایت نہیں لی۔ (ملاحظہ مسودہ آل تیمیہ فی اصول الفقہ ۲۶۴/۱)

امام ابو یوسف اور امام محمد پر بعض اہل حدیث علما کی زیادتی:

علامہ جمال الدین قاسمی نے اپنی کتاب ''الجرح والتعدیل'' میں لکھا ہے کہ:

''ارباب صحاح ستہ نے اہل الرائے کی روایت لینے سے اجتناب کیا ہے، چنانچہ عموماً کتب صحاح، مسانید، اور سنن کی سندوں میں ان میں سے کسی کا نام نہیں ملتا، مثلاً امام ابو یوسف، امام محمد بن الحسن۔ اہل حدیث نے انہیں کمزور قرار دے رکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو میزان الاعتدال) لیکن میری عمر کی قسم ان دونوں کے ساتھ ان حضرات نے انصاف نہیں کیا ہے، یہ دونوں علم کے بحر ذخار تھے، ان کے آثار شہادت دیتے ہیں کہ ان کا علم بہت وسیع تھا، اور انہیں اس میں تبحر حاصل تھا، بلکہ یہ بہت سے حفاظ حدیث سے فائق ہیں، اس کی شہادت کے لئے امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' اور امام محمد کی [مؤطا] کا مطالعہ کافی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بعض اہل الرائے کے حق میں یہ بات از راہ تعصب کہی گئی ہے، کیوں کہ اہل انصاف پر خوب واضح ہے کہ ان بعض حضرات کے پاس اس درجہ کا علم وفقہ ہے کہ اسے حاصل کرنا چاہئے، اور ان کی عقل وعلم سے استفادہ کرنا چاہئے، لیکن عصبیت!

بعض اہل حدیث حضرات نے تو ان ائمہ اہل رائے کے حق میں ایسی باتیں کہی ہیں کہ ان کی تدوین تو دور کی بات! انہیں پڑھ کر شرم آتی ہے، اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کا مشرب مختلف تھا، جس کو انہوں نے مخالفت سمجھ لیا، نیز انہوں نے ان کی رائے کے مآخذ ومدارک میں غور نہیں کیا، اگر وہ غور کرتے تو شاید انہیں احساس ہوتا کہ حق اس رائے کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ بات تو کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ حق کسی ایک متعین گروہ میں منحصر ہوکر رہ جائے، انصاف کی بات تو یہ ہے کہ پہلے مدارک ومآخذ کو خوب سمجھ لیا جائے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

ہاں! یہ بات ہے کہ سنت وحدیث کے مصنفین کو انہیں لوگوں کے ساتھ شغف تھا جو تحصیلِ حدیث کے لئے شہر در شہر پھرتے رہے اور حفظ حدیث میں مشہور ہوئے، اور علمائے اہل الرائے اس میں معروف نہ تھے، ان کے بارے میں یہ بات پھیلا دی گئی کہ وہ حدیث میں رائے کو فیصل قرار دیتے ہیں، اگرچہ ان کی روایات مسند اور معروف ہیں''۔ **رضی اللہ عن الجمیع وحشرنا ایاھم ومع الذین انعم اللہ علیھم: انتھیٰ**

علامہ احمد محمد شاکر محدث مصر نے مسند امام احمد کے تعلیقات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''ابو یوسف القاضی ثقہ ہیں، صدوق ہیں، ان کے متعلق لوگوں نے ناحق کلام کیا ہے، امام بخاری نے تاریخ کبیر (۳۹۷:۲/۴) میں فرمایا ہے کہ لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے، اور ''کتاب الضعفاء'' (ص ۳۸) میں لکھا ہے کہ یحییٰ اور ابن مہدی وغیرہ نے انہیں ترک کیا ہے، ان کے حالات امام ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں، اور حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں لکھے ہیں، اور خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' میں ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے''۔

امام ابو یوسف کے متعلق انصاف کی بات وہ ہے جسے خطیب نے احمد بن کامل کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، اور علی بن مدینی کا ان کی ثقاہت فی النقل میں کوئی اختلاف نہیں ہے''۔ (انتہیٰ)

علامہ ابن تیمیہ کا ارشاد:

علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب ''**اقامة الدليل على ابطال التحليل**'' میں رائے کے سلسلے میں عمدہ بحث کی ہے، فرماتے ہیں کہ:

''جن احادیثِ نبوی اور آثارِ صحابہ وتابعین میں رائے اور اہل رائے کی مذمت وارد ہے ان کا تعلق ان حیلوں سے ہے جو محض رائے سے ایجاد کئے گئے ہیں، وہ رائے محض ہیں، اس سلسلے میں صحابی سے کوئی اثر وارد نہیں ہے، اور نہ ان حیلوں کی کوئی نظیر ہے، جو کسی اصل سے ثابت ہو، جس پر انہیں قیاس کیا گیا ہو، اور جب بھی کوئی حکم ایسا ہو جو کسی اصل اور نظیر سے ثابت نہ ہو، وہ رائے محض ہے، جو باطل ہے۔

رائے کی مذمت میں حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس، اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے آثار منقول ومشہور ہیں، اور ان کے بعد تابعین سے بھی روایات ہیں، ان میں قدر مشترک یہ بات ہے کہ رائے پر عمل کرنے سے حرام کی تحلیل اور حلال کی تحریم لازم آتی ہے۔

یہ یقینی بات ہے کہ یہ آثار جن سے رائے کی مذمت ثابت ہوتی ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کتاب وسنت اور اجماع کی اصولی بنیادوں پر رائے کا اجتہاد ممنوع و مذموم ہے، جبکہ کتاب وسنت اور اجماع میں اس مسئلہ کی صراحت نہ ہو، اور اجتہاد کرنے والا اشباہ ونظائر کی

شناخت رکھتا ہو، احکام کے معانی کی سمجھ رکھتا ہو، اور وہ تشبیہ قیاس تمثیل یا قیاس تعلیل وتاصیل کے طور پر قیاس کرتا ہو، پھر وہ قیاس ایسا ہو کہ اس سے اعلی درجہ کی کوئی دلیل اس کے مقابل و معارض نہ ہو، اتنے شرائط وقیود کے ساتھ اگر کوئی قیاس ورائے سامنے آئے تو یہ بالکل جائز ہے، خواہ دوسروں کے لئے قیاس کرے، خواہ عمل کرنے والا خود اپنے لئے قیاس کرے، اور حاکم وامام پر تو اس قسم مذکور کا اجتہادِ رائے واجب ہے، اور اس کے دلائل اتنے مشہور ہیں کہ انہیں ذکر کرنے کی سرے سے حاجت ہی نہیں، اس طرح کے قیاس ورائے میں نہ تو کسی تحریم کی تحلیل ہے اور نہ کسی حلال کی تحریم۔

حقیقت یہ ہے کہ جو قیاس اور جو رائے اسلام کو منہدم کرتی ہے، حلال کو حرام بناتی ہے اور حرام کو حلال کرتی ہے، وہ، وہ ہے جو کتاب وسنت کے بالمقابل ہو، یا اسلاف امت کے طریقہ سے منحرف ہو، یا کتاب وسنت کے معانی معتبرہ سے ٹکراتی ہو۔

قیاس جو اصولِ شرع کے مخالف اور اس سے متصادم ہو، اس کی دو قسمیں ہیں۔

اول یہ کہ وہ اصولِ شرع کے کھلم کھلا خلاف ہو اور اس کی تائید میں کسی اور اصولِ شرع کی پشت پناہی بھی حاصل نہ ہو، یہ مخالفت تو ایسی ہے کہ کوئی مفتی اس کی جرأت نہیں کر سکتا، الا یہ کہ اسے اس کا سرے سے علم ہی نہ ہو۔ چنانچہ یہ صورت بہت سے ائمہ کو پیش آئی ہے کہ انہیں کسی کسی سنت کا علم نہ ہوا، تو انہوں نے غلطی سے اس کے خلاف مسئلہ بیان کر دیا، لیکن جو اصول مشہور ہیں ان کے خلاف تو کوئی مسلمان نہیں جا سکتا، جب تک ان کا معارضہ دوسری کسی اصل سے نہ ہو، پھر ان حضرات علماء وائمہ کے بارے میں اس مخالفت کا تصور کیوں کر ہو سکتا ہے؟ جو صاحبِ فتویٰ مشہور ہیں۔

دوسرے یہ کہ کسی اصلِ شرع کے خلاف کسی طرح کی تاویل کی بنیاد پر کوئی حکم لگائیں، جبکہ وہ تاویل غلط ہو، مثلاً کسی اسم کو اس کے محل کے خلاف رکھ دیا، یا اس اسم کو اس کے بعض مصداق ومحل کے ساتھ خاص کر دیا، یا اس میں صرف لفظ کی رعایت کی، مفہوم ومقصود کو نظر انداز کر دیا۔

قیاس وتفقہ کے لحاظ سے تمام علمی مراکز میں اہل کوفہ کو امتیاز حاصل ہے، چنانچہ کوفہ کی فقہ اور بصرہ کی عبادت معروف ہے۔ حضرات علماءِ کوفہ کا علم زیادہ تر حضرت عمر، حضرت علی، اور

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے ماخوذ ہے،اور ان تینوں کبار صحابہ کے تلامذہ کا علم وتفقہ میں جومقام ہے وہ کسی پر مخفی نہیں۔

اہل کوفہ میں سب سے بڑے فقیہ اپنے زمانے میں ابراہیم نخعی تھے، وہ کوفہ میں وہی مقام رکھتے ہیں جو مدینہ میں حضرت سعید بن مسیّب کو حاصل تھا، وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک حدیث سنتا ہوں، اور اس پر سو حدیثوں کو قیاس کرتا ہوں، اور ان حال یہ تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے تلامذہ کے قول سے باہر نہیں نکلتے تھے، امام شعبی کو آثار کا علم ان سے زیادہ تھا، اور اہل مدینہ سنتوں سے بمقابلہ اہل کوفہ کے زیادہ واقف تھے۔

کوفہ کے بعض قدیم علما کے متعدد اقوال ایسے ملتے ہیں جو سنت کے خلاف ہیں، اور اس لئے کہ انہیں اس سنت کا علم نہیں پہونچا تھا، اس لئے وہ اس باب میں معذور ہیں، مطعون نہیں ہیں، اور نہ مذموم ہیں، بلکہ انہیں اسلام میں وہ مرتبہ ومقام حاصل ہے جو سیرت سلف کے جاننے والے پر پوشیدہ نہیں ہے، اس طرح کی بات تو خود حضرات صحابہ سے بھی منقول ہے، کیوں کہ تمام سنن واحادیث کا احاطہ ممکن نہیں ہے، خواہ وہ ایک فرد ہو یا علما کی کوئی جماعت ہو، اور جس نے ایسی سنت کے خلاف کوئی بات کہی جس کا علم اسے نہیں پہونچا تھا تو وہ معذور ہے‘۔

علامہ ابن تیمیہ کے اس تفصیلی کلام سے معلوم ہوا کہ کسی راوی پر جرح کرنا کہ وہ اہل الرائے میں ہے، قابل رد ہے، بڑے علما اور معتبر اصحاب علم کو اس سلسلے میں چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے۔

عصر حاضر کے مشہور عالم ومحدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ ’’التعلیق الممجد‘‘ کے جدید ایڈیشن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اگر راویٔ حدیث عدالت اور ضبط وحفظ کا مالک ہو تو محض رائے پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ روایت، حدیث کے باب میں مجروح نہیں قرار دی جائے گی، نہ اسے ضعیف کہا جائے گا، اور نہ وہ رائے راوی کے صدق میں خلل انداز ہوگی، کیوں کہ نقل و روایت میں اس کی امانت قائم رہتی ہے، اور وہ اپنے ورع وتقوی کی وجہ سے روایتِ حدیث میں نہ کوئی حرف زیادہ کرسکتا، نہ کم کرسکتا۔

ہر شخص جانتا ہے، مدینہ ہو یا کوفہ یا بصرہ وعراق، ہر جگہ کے بکثرت فقہا ومحدثین نے رائے سے کام لیا ہے، بلکہ بعض ائمہ کرا کے نام کے ساتھ ’’الرائے‘‘ کا لفظ بطور جزء کے شامل

ہو گیا تھا، جیسے امام ربیعۃ الرائے، جو امام مالک، سفیان ثوری، شعبہ بن سعد اور ان کے طبقہ کے علما کے شیخ تھے۔

لیکن اس کھلی حقیقت کے باوجود دیکھا یہی جاتا ہے کہ روایتِ حدیث میں جو علما مشغول ہیں انہیں اہل رائے حضرات کی طرف سے گرانی رہتی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی توجہ تمام تر روایت وسماع پر مرکوز ہوتی ہے، اور ماخذ ومدارک پر غور وفکر ان کے حوصلے سے خارج ہے، پھر جو کوئی ادھر متوجہ ہوتا ہے اس سے ناراض ہونے لگتے ہیں۔

ان کی کمزوری یہ ہے کہ ان کے نزدیک سارا علم یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ وسند کی روایت کی جائے، اس کے معانی کی بحث وتحقیق نہ کی جائے، اگر کسی نے اس کے سمجھنے میں عقل ورائے کو دخل دیا تو اسے وہ حدیث سے خروج قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ انہیں جب معلوم ہوتا ہے کہ فلاں فقیہ نے کسی مسئلہ میں تحقیق واجتہاد کی راہ اختیار کی ہے، یا کسی متکلم نے اللہ کی صفات میں کچھ کلام کیا ہے، یا کسی شیخ نے احوالِ نفس کی تشریح وتحقیق کی ہے، یا کسی محدث نے کوئی شعر نقل کیا ہے تو انہیں سخت ناراضگی ہوتی ہے، اور اس پر وہ سخت جرح کرتے ہیں۔

یاقوت حموی نے اپنی کتاب ''معجم الادباء'' میں امام شافعی علیہ الرحمہ کے حالات کے ضمن میں مصعب زبیری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے والد اور امام شافعی دونوں آپس میں ایک دوسرے کو اشعار سناتے تھے، اس دوران امام شافعی علیہ الرحمہ نے ہذیل کے اشعار سنائے، پھر فرمایا: یہ بات اہل حدیث میں سے کسی سے نہ کہنا، وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ فرماتے ہیں ''اہل حدیث بزرگوار تو اس سے کم کو بھی برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، انہیں تو یہ بھی گوارا نہیں ہو رہا تھا کہ ابواب کے لحاظ سے حدیثوں کو مرتب کیا جائے''۔

حافظ ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء'' (۱۶۵/۸) میں امام جلیل، عالم خراسان، فقیہ ومحدث، عابد وزاہد، حضرت عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ احمد بن ابی الحواری نے مشہور حافظ حدیث ابواسامہ حماد بن اسامہ کوفی کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں طرسوس میں عبداللہ بن مبارک کے پاس گزرا، وہ حدیث بیان کر رہے تھے'' میں نے کہا: اے

عبدالرحمان! میں ان ابواب اور تصانیف کو جو آپ لوگوں کے وضع کئے ہیں ، ناپسند کرتا ہوں، ہمارے مشائخ نے ایسا نہیں کیا ہے"۔

یہ ایک بڑے محدث کا حال ہے، شیخ المحد ثین والزہاد، امام المجاہدین والعباد حضرت عبداللہ بن مبارک کے ساتھ، جبکہ ان کا سارا عمل اس قدر ہے کہ انہوں نے احادیث کو ابواب وعناوین کے تحت جمع کیا ہے، جب اس مسئلہ میں ان کے انکار کا یہ حال ہے تو جو حضرات فہم نصوص میں رائے سے کام لیں گے، یا کسی دلیل کی وجہ سے ان میں تاویل کی راہ اختیار کریں گے، ان پر ان کا انکار کتنا شدید ہوگا۔

غرض یہ کہ یہ قطعاً سطحی بات ہے کہ آدمی رائے وقیاس سے بھڑکے، اور اسے مطلقاً ممنوع ومذموم قرار دے، اور اس کی وجہ سے راویٔ حدیث کو متروک قرار یدے۔

اللهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه ،وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه

ماخذ: المآثر۔ اگست، ستمبر، اکتوبر (۱۹۹۸ء)

البانی شذوذہ واخطاؤہ

از

افادات محدث کبیر علیہ الرحمہ

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نوراللہ مرقدہ کے اہم کارناموں سے جہاں یہ کارنامہ نہایت قابل قدر اور بیش بہا ہے کہ حدیث کے قدیم غیر مطبوعہ ذخائر کو دنیا جہاں سے تلاش کر کے نکالا، ان کے پرانے بوسیدہ اوراق کا مطالعہ کیا، قدیم طرز کی تحریرات کو باوجود قلتِ وسائل کے حرف حرف پڑھا، نامانوس کتابت، مٹے مٹے مسودات، کج مج حروف کی قرأت و تصحیح میں راتیں بسر کیں، پھر ان پر قیمتی تعلیقات لکھ کر انہیں اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچایا، اور اس سلسلے میں اکیلی شخصیت کے عزم وحوصلہ نے پوری اکیڈمی کا کام کیا۔ یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا، اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا، جہاں یہ نا قابل فراموش کارنامہ ہے وہیں حق تعالیٰ نے آپ کو وہ دینی غیرت وحمیت اور سنت وشریعت کی وہ محبت والفت بھی بخشی تھی کہ اگر کسی طرف سے کوئی ایسا ہاتھ اٹھتا جس کے بارے میں اندیشہ ہوتا کہ اس سے حق تعالیٰ کی پاکیزہ شریعت اور رسول اللہ ﷺ کی روشن سنت پر کوئی حرف آئے گا، تو بے خطر اور لومۃ لائم سے بے نیاز ہو کر سنت وشریعت کی حفاظت ودفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، اور اس باب میں اپنے تحقیقی ذوق، اور اپنے استحضارِ علم اور قوتِ گرفت سے اتنی معلومات اکٹھا کر دیتے کہ منصف مزاج آدمی بالکل مطمئن ہو جاتا، اور جو کچھ غبار اڑایا گیا ہوتا، وہ چھٹ کر الگ ہو جاتا۔ حضرت مولانا کی اس طرح کی متعدد تصنیفات اور گراں قدر مقالے ہیں، بعض مطبوعہ اور کئی ایک غیر مطبوعہ!۔

ان رسائل میں ایک نہایت اہم رسالہ ’’البانی شذوذہ واخطاءہ‘‘ ہے، شیخ ناصرالدین البانی کا نام فن حدیث کے علما اور طلبا کے درمیان غیر معروف نہیں ہے، البانیہ کے رہنے والے اب سے کئی سال پہلے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں استاذ تھے، حافظہ اللہ نے اچھا بخشا تھا، علما اور اساتذہ سے باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا تھا، مطالعہ وسیع ہے، پہلے گھڑی سازی کیا کرتے تھے۔علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے تو بہت کچھ مطالعہ کیا، غیر مقلدیت کے رجحان نے حنفیت کا دشمن بنادیا۔مزاج میں حدت وشدت بہت ہے، لب ولہجہ نرمی اور حلاوت سے محروم، جس پر حملہ کرتے ہیں غیظ وغضب کی آخری حد تک پہونچ جاتے ہیں، علم وفضل میں اپنا ہمسر متقدمین ومتأخرین میں سے غالباً کسی کو نہیں سمجھتے، اپنی کتابوں میں خود کو اسی طرح پیش کرتے ہیں جیسے ان کے رتبہ کا کوئی دوسرا عالم ہے ہی نہیں۔کتابیں بہت لکھیں، کتبِ حدیث پر تعلیقات وحواشی بھی بکثرت لکھے، ائمہ متقدمین سے ہٹ کر حدیثوں کے درجات بھی متعین کئے، اور ہر جگہ ان کا ادعائے ہمہ دانی نمایاں رہا۔ان کی تحریرات میں توازن اور اعتدال کا فقدان ہے، سواد اعظم سے انحراف کرنے میں انہیں لطف آتا ہے، سادہ لوح کم علم افراد پر خوب سکہ جما رکھا ہے، ابتدا میں ان کا ایسا شہرہ ہوا، اوران کے لمبے چوڑے دعاوی کی وجہ سے ایسا علمی رعب قائم ہوا کہ بڑے بڑے لوگ بھی ان کی بات کو حرفِ آخر سمجھنے لگے، کسی کو ہمت نہ تھی کہ انہیں ٹوکتا، اوران کی غلطی پر تنبیہ کرتا، جب کہ تجربہ ہے کہ مدعیانِ علم وتحقیق بیشتر بڑی بڑی غلطیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، یہ اپنے دعویٰ اور نظریہ کی دھن میں دائیں بائیں نظر انداز کرکے آگے کی طرف اندھا دھند بڑھتے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ’’حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاءً‘‘، تم نے ایک چیز کی تو حفاظت کی اور متعدد چیزیں تم سے رہ گئیں۔گاڑی کی ہیڈ لائٹ بہت تیز ہوتی ہے، مگر اس کے آس پاس گہرا اندھیرا ہوتا ہے، لالٹین کی روشنی مدھم ہوتی ہے مگر ہر چہار جانب نور رہتا ہے۔تیز اور ذہین علما جو گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی طرح صرف سامنے دیکھتے ہیں، ان کی تیز رفتاری سے نہ جانے کتنے کچل جاتے ہیں، کتنے مجروح ہوجاتے ہیں، لیکن وہ اپنی چال کی مستی میں ہر نقصان سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں ایسے لوگوں کی بہتات ہے، اور شیخ ناصرالدین البانی ان سب سے آگے ہیں۔ ان سے علم حدیث میں اتنی غلطیاں ہوئی ہیں کہ انہیں سامنے رکھنے کے بعد ان کو علم حدیث کا

ماہر یا عالم کہنا ایک طرح کی تہمت معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک وقت تھا کہ ان کا کلام کسی حدیث کے بارے میں حرفِ آخر سمجھا جانے لگا تھا، بعض عرب ملکوں میں سطحی لوگوں کے درمیان اب بھی مستند ہے ان کا فرمایا ہوا

ان کا طلسم عرصہ تک عرب علما پر چھایا رہا، پہلا وہ عالم ربانی جس نے ان کا یہ طلسم توڑا ہے، اور ان کی اغلاط کی وضاحت کی ہے، وہ محدث الہند حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی ہیں۔ مولانا نے چار اجزا میں ان کی علمی وحدیثی غلطیوں کی نشان دہی کی، اور بتایا کہ ان سے اتنی کثرت سے غلطیاں ہوئی ہیں کہ وہ محدث کے لقب کے شایان شان نہیں ہیں، کوئی عالم معصوم نہیں ہے، ہر ایک سے غلطی ہوتی ہے، مگر جو واقعی علم وتحقیق کے مردِ میدان ہوتے ہیں وہ بہت چھان بین اور احتیاط سے کچھ لکھتے ہیں، کچھ بولتے ہیں، لکھنے اور بولنے سے پہلے وہ بار بار غور کرتے ہیں، بات کی صحت کا اچھی طرح اطمینان کر لیتے ہیں، مراجع ومصادر سے خوب تحقیق کر لیتے ہیں، پھر نہایت محتاط انداز میں بولتے ہیں، ان سے بہت کم غلطیاں ہوتی ہیں، اور اگر کبھی ہو جاتی ہیں تو انہیں جلد ہی تنبہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہوتے ہیں، انہیں دنیاوی اغراض نہیں، صرف حق تعالیٰ کی رضا مطلوب ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ انہیں غلطی پر باقی نہیں رہنے دیتا۔ کبھی تو وہ خود اپنی تحقیقات ومطالعات کے ذیل میں غلطی کا احساس کر لیتے ہیں، کبھی کوئی دوسرا عالم بتا دیتا ہے، اور چونکہ انہیں اپنے منصب وجاہ کا زعم نہیں ہوتا، اس لئے وہ بے تکلف اپنی غلطی کی تصحیح کر لیتے ہیں۔

اس کے برخلاف جو لوگ بڑے بڑے بول اور اونچے دعاوی کے ذریعے اپنا قد اونچا کرتے ہیں ان سے بکثرت غلطیاں ہوتی ہیں، اور انہیں اللہ کی جانب سے تنبیہ سے محرومی ہوتی ہے، دوسرے لوگ کچھ ٹوکیں تو انہیں اپنا بنایا ہوا قد گرتا محسوس ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنی بات پر بے جا اصرار کرتے ہیں۔

ناظرین نے پچھلے استدراکات میں پڑھا کہ جب علامہ احمد محمد شاکر کو حضرت محدث اعظمی نے استدراکات لکھ کر بھیجے تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے نہایت خوشی ومسرت کے ساتھ انہیں قبول کیا، اور حضرت محدث اعظمی کا شکریہ ادا کیا، بلکہ بغایت امتنان وتشکر انہیں اپنی کتاب کا جز

بنا کر شائع کیا، لیکن جہاں یہ کیفیت نہیں ہوتی وہاں ٹو کئے تو رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہے۔

مولانا اعظمی نے شیخ ناصرالدین البانی کو ٹوکا تو وہ بہت ناراض ہوئے، جی بھر کر مولانا کو برا بھلا کہا، اس کے بعد تو اور حضرات کو بھی ہمت ہوئی۔ چنانچہ آج کل عمان/اردن کے ایک صاحبِ نظر شافعی عالم ومحدث شیخ حسن بن علی السقاف مدظلہ ان کا زبردست تعاقب کر رہے ہیں، ''تناقضات الالبانی'' کے نام سے دو جلدوں میں ان کی غلطیاں شائع کر چکے ابھی اور کئی جلدیں آئیں گی۔ ان شاءاللہ

ہم آج کی مجلس میں ''الالبانی شذوذہ واخطاءہ'' کے کچھ نمونے ذکر کریں گے، ان کا مقصد صرف یہ نہیں کہ البانی کی غلطیاں واضح ہو جائیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ حضرات علمائے کرام ملاحظہ فرمالیں کہ علم کی وسعت و گیرائی کیا چیز ہے، اور اس باب میں حضرت مولانا کا پایہ کس قدر بلند ہے، اور نیز یہ کہ حضرت مولانا کے یہاں کس قدر توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔

بطور جملہ معترضہ ایک بات یہاں اور عرض کرتا چلوں ممکن ہے کچھ لوگوں کو گراں گزرے لیکن ''**الحق احق ان یقال**'' حق بات کہہ دینی چاہئے ممکن ہے کسی کو راہ نمائی مل جائے۔

ہمارے زمانے سے کچھ پہلے تمام علما عموماً ائمہ اربعہ سے میں کسی کی تقلید سے منسلک رہے ہیں، کوئی امام ابوحنیفہ کا متبع ہے، تو کوئی امام شافعی کا، کسی نے امام مالک کی تقلید کی، اور کسی نے امام احمد بن حنبل کی۔ یہ لوگ ائمہ کرام کی تحقیقات پر اعتماد کرتے، انہیں پیشوا مانتے، اور سمجھتے کہ ان حضرات نے اپنی پوری زندگی نہایت خلوص اور انہماک کے ساتھ اللہ اور رسول کے منشا کو سمجھنے اور اسے مدون کرنے میں صرف کی ہے، اور ان کے پاس حصولِ علم کے ذرائع بھی آسان تھے، رسول اللہ ﷺ تک واسطے بھی کم تھے، قیاس اور اجتہاد کی صلاحیت بھی ان میں بدرجۂ اتم تھی، شریعت کی عظمت ومحبت سے ان کے سینے معمور تھے، اللہ اور اس کے رسول کی مرضی پر اپنی عزت وآبرو اور جان ومال کو داؤں پر لگا دینے کا حوصلہ بھی تھا۔ بعد والوں میں جیسے اور چیزوں میں اضمحلال آتا گیا خاص علم کے باب میں بھی بہت اضمحلال وضعف آ گیا، اس لئے عافیت دین و ایمان کی اسی میں سمجھی گئی کہ یہ لوگ جو انابت الی اللہ کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، انہیں کا اتباع کیا

جائے[۱] کہ یہ حضرات ٹھیک رسول اللہ ﷺ کے قدم بقدم تھے۔

ان ائمہ نے جو فقہ مدون کردی تھی وہ ان کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ سے ہوتی ہوئی سلسلہ بسلسلہ ہمارے دور تک پہونچی ہے، چونکہ یہ علم اساتذہ سے واسطہ در واسطہ ہوتا ہوا آیا ہے، اس لئے سلسلۂ تقلید میں علما وفقہا ومحدثین کا بے حد ادب واحترام پایا جاتا ہے، جو علم اور دین کی جان ہے، کیوں کہ اوپر جہاں تک نگاہ جاتی ہے سب اساتذہ نظر آتے ہیں، اور اساتذہ کا ادب واحترام اولاً تو فطرتِ انسانی میں داخل ہے، دوسرے اسے شریعت نے تقدس وعبادت کا درجہ دے دیا ہے، تو یہاں اساتذہ کا ایک طویل سلسلہ ہے، اور ان کا احترام دلوں میں جاگزیں ہے۔ پس ادب واحترام ان کی طبیعت ثانیہ ہے، اسی کا اثر ہے کہ یہ ان علما کا بھی احترام کرتے ہیں اور ان کی شان میں بھی بے ادبی نہیں کرتے جن سے مسلک کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ائمہ اربعہ کے متبعین سب کو برحق سمجھتے ہیں، ایک دوسرے کا حد درجہ احترام واعتراف کرتے ہیں، ان کے لئے برابر دعاءِ رحمت کرتے ہیں، نام لینا ہوتا ہے تو بصد احترام نام لیتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں متعدد جگہ احناف کا رد کیا ہے، مگر احناف جب بھی ان کا تذکرہ کریں گے تو ''امام بخاری علیہ الرحمہ'' کہیں گے، یہ تعظیم واحترام حاصلِ علم وعمل ہے۔

لیکن کچھ دنوں سے آزادی کا دور آیا، لوگ اپنے اپنے طور پر مطالعہ وتحقیق کو کافی سمجھنے لگے، اپنی عقل وفہم پر اعتماد بڑھنے لگا، اپنی رائے سب پر بالا نظر آنے لگی، حدیث نبوی کی خبر ''**اعجاب کل ذی رای برایه**'' (ترمذی کتاب التفسیر سورہ مائدہ) کے مطابق ہر شخص اپنی رائے پر نازاں نظر آنے لگا، ائمہ اربعہ کی تقلید کو حرام کہا جانے لگا۔ ایک مستقل گروہ تقلید کے خلاف آمادۂ پیکار ہوگیا۔ اس اباحیت اور آزادی نے نوجوانوں اور نوتعلیم یافتہ گروہ کو لبھایا، مطالعۂ کتب کے لئے چونکہ استاذ کی چنداں ضرورت نہیں ہے، اس لئے وہ ادب واحترام جو اساتذہ کے حضور میں سیکھا جاتا تھا قصۂ پارینہ بن گیا، تعظیم واکرام کے قضیوں کو ذہنی غلامی، شعبۂ شرک وغیرہ قرار دے کر اس سے پیچھا چھڑالیا گیا، ان لوگوں کو چوں کہ اپنی فہم وخرد پر اعتماد بڑھا ہوا ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ ان کی رائے کے خلاف کوئی رائے رکھتے ہیں، ان کے حق میں سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں، انہیں ہوش وخرد سے بیگانہ سمجھتے ہیں۔ مختلف فیہ مسائل میں بھی کسی طرف اپنا

رجحان قائم کر کے دوسری جانب کو بالکل غلط اور باطل کہنے لگتے ہیں، جب کہ وہ مسئلہ قرن اول سے مختلف فیہ ہوتا ہے، ایسے مسائل میں کسی کی تجہیل وتحمیق کرنا درحقیقت سلفِ صالح کے ایک بڑے طبقے کو مجروح ومطعون کرنا ہے، مگر انہیں اپنے زعم کے آگے کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ لوگ فروعی مسائل کو اتنی اہمیت دیتے ہیں جیسے یہی مدارِ ایمان ونجات ہوں، مسائل واحکام کی ترجیح وتصحیح میں فرقِ مراتب کو یہ لوگ نظر انداز کرتے ہیں، خبر واحد کی حیثیت قرآن کے محکمات سے بڑھ کر ہوجاتی ہے۔ سب سے بڑی قیامت یہ ہوتی ہے کہ اختلاف کرنے والوں کے حق میں ان کا لہجہ اتنا دلخراش اور تلخ ہوجاتا ہے کہ قلب وجگر مجروح ہوجاتے ہیں، بالکل ''**اذا خاصم فجر**'' (جب جھگڑیں تو بیہودہ بکنے لگیں) کے مصداق ہوجاتے ہیں، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو مخالفینِ تقلید کا لٹریچر ملاحظہ فرمالیں، قدم قدم پر یہی سوغات ملے گی، حتی کہ احادیث کی شرحوں میں موقع ہو یا نہ ہو، تیر ونشتر چلاتے ہی رہتے ہیں، اس آزادی واباحیت کا اول وآخر تحفہ یہی بے ادبی وبے احترامی اور اللہ کے نیک اور صالح بندوں پر لعن طعن ہے، اور وہ بھی صرف اپنی عقل کے بل بوتے پر!

احناف کی اصولِ فقہ کی کتابوں میں اختلافی مسائل میں عام طور سے یہ اصول ملتا ہے کہ ہم اپنی رائے قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں، لیکن احتمالِ خطا کے ساتھ۔ یعنی ممکن ہے کہ اس باب میں ہم سے غلطی ہو رہی ہو، اور قابل قبول رائے وہی ہو جو دوسرے فریق کے پاس ہے، اس اصول کی بنا پر مسائلِ اختلافیہ میں کسی جانب قطعیت کا پہلو ختم ہو کر آپس میں احترام ولحاظ کی فضا باقی رہتی ہے۔ اس کے برخلاف یہ مدعیانِ تحقیق جو رائے قائم کرلیتے ہیں، اس پر انہیں ایسا جمود اور اصرار ہوتا ہے کہ دوسرے پہلو کو دیکھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

شیخ البانی اباحیت اور غیر مقلدیت کے ان تمام ہتھیاروں سے لیس ہیں، انہیں شاید وہم نہیں تھا کہ ان سے غلطی ہو سکتی ہے، مگر جب حضرت محدث کبیر نے ایک آئینہ ان کے سامنے رکھا جس میں ان کے علمی چہرے کا خط وخال نظر آنے لگا اور انہوں نے خود دیکھ لیا تو بہت ناراض ہوگئے، اتنا ناراض ہوئے کہ باوجود یہ جاننے کے کہ حضرت مولانا کی پوری زندگی حدیث وسنت کی خدمت وتحقیق میں بسر ہوئی ہے، اور اس کا انہیں اعتراف بھی ہے، لیکن جب حضرت مولانا نے انہیں ٹوکا تو انہیں ''سنت کا دشمن'' کہہ ڈالا۔ شاید اپنے دعاوی کو سنت سمجھتے ہوں، اور مولانا

نے انہیں رد کیا ہے، اس لئے وہ سنت کے دشمن ہو گئے ہوں۔ واللہ اعلم

حقیقت یہ ہے کہ آدمی جب دوسروں کی کھال نوچتا ہے تو خود اس کی کھال محفوظ نہیں رہ سکتی۔

حضرت مولانا شیخ ناصر الدین کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے کہ:

"الشیخ ناصر الدین الالبانی شدید الولوع بتخطئة الحذاق من کبار علماء الاسلام ولا یجابی فی ذالک احداً کائناً من کان، فتراه یوهم البخاری ومسلما ومن دونهما ویغلط ابن عبدالبر وابن حزم وابن تیمیه والذهبی وابن القیم وابن حجر والصنعانی والشوکانی ویکثر من ذالک حتیٰ یظن الجهلة والسذج من العلماء ان الالبانی نبغ فی هذا العصر نبوغاینَدر مثله"۔ (ص۹)

شیخ ناصر الدین البانی کو بڑے بڑے ماہر علماءِ اسلام کی غلطیاں ثابت کرنے کا بے حد شوق ہے، اس سلسلے میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے، خواہ وہ کوئی ہو، چنانچہ امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا وہم نکالتے ہیں، اور حافظ ابن عبدالبر، ابن حزم، علامہ ابن تیمیہ، امام ذہبی، ابن قیم، حافظ ابن حجر، علامہ صنعانی، اور علامہ شوکانی کی غلطیاں گناتے ہیں، اور یہ کام اتنی کثرت سے کرتے ہیں کہ سادہ لوح علماء اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اس زمانے میں ان کے جیسا ماہر فن حدیث بہت کم ہے۔

ایسی غلط فہمی پیدا کرنے والے ان کے دعاوی بہت ہیں، کبھی کسی تحقیق کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں "**اغتنم هذا التحقیق فانک لا تجده فی غیرهذا الموضع**" اس تحقیق کو غنیمت سمجھو، اسے اس جگہ کے علاوہ اور کہیں نہیں پاؤ گے، یعنی دوسرے علما کو اس کی ہوا نہیں لگی ہے، کہیں وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں خاص طور سے انہیں کو شرف بخشا ہے کہ کسی حدیث میں آئے ہوئے زائد الفاظ جو مختلف طرق میں منتشر ہیں، ان کے دائرۂ علم میں ہیں، جب کہ دوسروں کو معلومات کی یہ وسعت حاصل نہ تھی، اسی لئے وہ اگلے پچھلے تمام محققین پر فوقیت رکھتے ہیں۔

لیکن جولوگ البانی کو جانتے ہیں اور انہیں ان کے حالات سے واقفیت ہے، انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے علما واساتذہ سے علم نہیں حاصل کیا ہے، اور نہ ان سے استفادہ کے لئے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جیسا کہ مجھے معلوم ہے ان کا مبلغِ علم قدوری تک ہے، البتہ گھڑی سازی کے ماہر تھے، اس مطالعاتی علم کی مہارت کے چند دلچسپ نمونے حضرت مولانا نے ذکر کئے ہیں۔

(۱) شیخ البانی نے اپنی انفرادیت ثابت کرنے کے لئے ''سلسلة الاحاديث الصحيحة والضعيفة والموضوعة'' کے نام سے الگ الگ کتابیں لکھی ہیں، جن میں اپنی تحقیقات ذکر کی ہیں۔ چنانچہ ''الصحیحہ'' ج ۲۔ص ۱۶۱ میں لکھتے ہیں۔ ''تصدق باتوار من الاقط'' اور اتوار کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''جمع تور بالمثناة الفوقيه: اناء من صفر''، یعنی اتوار تور کی جمع ہے، جس کے معنی پیتل کا ایک برتن ہے (یعنی سینی) مطلب یہ ہوا کہ چند سینی پنیر صدقہ کیا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ حدیث کے طلبہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ یہ لفظ ''اتوار'' نہیں ''اثوار'' ہے، ثاء مثلثہ سے، جو ثور کی جمع ہے، جس کے معنی ٹکڑے کے ہیں، یعنی پنیر کے چند ٹکڑے صدقہ کئے۔

(۲) شیخ البانی نے ''المسح علی الجوربین'' کی فہرست میں صاحب تحفۃ الاحوذی مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کو حنفی لکھا ہے، حالانکہ وہ متعصب غیر مقلد ہیں۔

اسی سے معلوم ہوا کہ شیخ البانی بعض اوقات خود مطالعہ نہیں کرتے، دوسروں سے کوئی سنی سنائی بات کان میں پڑی رہتی ہے، اسے نقل کر دیتے ہیں، ورنہ اتنی فاش غلطی نہ کرتے۔

(۳) الصحیحہ ج ۳۔ص ۱۸۸ میں ایک بحث کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ ''هذا تحقيق استفدنا من تحقيقات الائمه''، یہ ایسی تحقیق ہے جو ہم نے ائمہ کی تحقیقات سے اخذ کی ہے۔

محدث کبیر فرماتے ہیں کہ یہ بات وہی لکھ سکتا ہے جس کے علم میں وسعت نہ ہو، ورنہ اگر ان کا دائرۂ علم وسیع ہوتا تو انہیں معلوم ہوتا کہ یہ تحقیق دقیق ان سے بہت پہلے ہندوستان کے مشہور حنفی محدث شیخ ظہیر احسن شوق نیموی اپنی کتاب ''التعلیق الحسن'' میں لکھ چکے ہیں۔ (ملاحظہ

ہو،ابواب المیاہ حدیث وقوع الزنجی فی زمزم)

(۴) شیخ البانی کا ایک علمی شاہکار یہ بھی ہے کہ انہوں نے ابن زید کو جن سے ابن وہب نے روایت نقل کی ہے، (ملاحظہ ہو''تفسیر طبری'' ج۵۔ص۳۹۹) عمر بن محمد بن زید قرار دیا ہے، جو کہ شیخین (بخاری ومسلم) کے رواۃ میں سے ہیں۔

شیخ البانی کی یہ ایسی غلطی ہے جس میں علم حدیث کے طلبہ بھی دھوکا نہیں کھا سکتے، اگر انہوں نے یہ علم اساتذہ سے حاصل کیا ہوتا تو انہیں خوب معلوم ہوتا کہ جس ابن زید سے امام طبری اپنی تفسیر میں روایت نقل کرتے ہیں یا ان کا کوئی تفسیری قول نقل کرتے ہیں، وہ عبدالرحمان بن زید بن اسلم ہیں۔

اپنی اسی غلط فہمی کی بنیاد پر انہوں نے مزید لکھا ہے کہ ''اس حدیث کے تمام رجال ثقہ ہیں، اور طرقِ حدیث میں بہترین اور معتبر ترین طریق ہے''۔ (الصحیحہ ج۲۔ص۱۶/۵)

حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ عبدالرحمان بن زید کو امام احمد اور علی بن مدینی نے ضعیف قرار دیا ہے، جیسا کہ امام بخاری نے اور ابوحاتم نے نقل کیا ہے، امام نسائی اور ابوزرعہ نے ضعیف کہا ہے، امام ابوحاتم فرماتے ہیں کہ حدیث میں قوی نہیں ہیں، حدیث میں کمزور ہیں، ابن حبان نے فرمایا کہ وہ مستحق ترک ہیں، ابن سعد کا قول ہے کہ کثیر الحدیث ہیں، لیکن بہت ضعیف ہیں، ابن خزیمہ کا ارشاد ہے کہ ان کی حدیث کو اہل علم حجت نہیں سمجھتے، کیوں کہ ان کا حافظہ خراب تھا، ساجی نے کہا کہ وہ منکر الحدیث ہیں، امام حاکم اور ابونعیم نے کہا کہ انہوں نے موضوع احادیث روایت کی ہیں، ابن جوزی نے لکھا کہ ان کے ضعف پر اجماع ہے، امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث علماءِ حدیث کے نزدیک انتہائی ضعیف ہے۔

اب ملاحظہ فرمایئے کہاں وہ دعوی کہ یہ حدیث کا بہترین طریق ہے، اور کہاں ائمہ حدیث کا یہ تبصرہ کہ راوی حد درجہ ضعیف ہے۔

(۵) بعض چیزیں واقعی ایسی عجیب وغریب ہیں کہ کسی عالم حدیث سے ان کا تصور مشکل ہے، خطبۂ جمعہ کے سلسلے میں مشہور ہے کہ **''اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ انصت والامام یخطب فقد لغوت''** اگر تم اپنے ساتھی سے جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے دوران یہ

بھی کہو کہ خاموش رہو تو تم نے لغو کام کیا۔

یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ مختلف طرق سے مروی ہے، شیخ البانی نے اپنی کتاب ''الصحیحہ۔ج۲۔ص۱۱۷'' میں یہ روایت امام احمد کے حوالے سے ان الفاظ میں نقل کی ہے۔''**اذا قلت للناس انصتوا وھم یتکلمون فقد ألغیت علی نفسک**'' جب لوگ بات کررہے ہوں، اورتم نے لوگوں سے کہا کہ خاموش رہو تو تم نے ایک لغو کام کیا۔

روایت میں اگرچہ جمعہ کے خطبہ کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن الفاظ بتارہے ہیں کہ اس کا تعلق خطبہ ہی سے ہے، راوی نے الفاظ میں اختصار کردیا ہے، لیکن شیخ البانی نے اس کو ایک بالکل دوسرے معنی پر محمول کردیا ہے جو نہ عقلاً ثابت ہے اور نہ نقلاً۔انہوں نے اس کے معنی یہ بتلائے ہیں کہ اگر کچھ لوگ آپس میں باتیں کررہے ہوں تو ان کی بات منقطع نہیں کرنی چاہئے، بلکہ خاموش رہنا چاہئے، تا آنکہ وہ بات پوری کرلیں۔

مطلب یہ کہ اگر چند لوگ باتیں کررہے ہوں تو انہیں کوئی نہ کہے کہ خاموش رہو کہ یہ ایک لغو کام ہوگا۔

بات کاٹنے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے بات کررہا ہو اور تیسرا بات کاٹ کر اپنی بات شروع کردے، یہ تو بلاشبہ ممنوع ہے، لیکن اس حدیث کے الفاظ سے یہ مفہوم ہرگز نہیں نکلتا، اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر چند لوگ بات کررہے ہوں تو انہیں خاموشی کا حکم دینا لغو کام ہے، ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہ عقلاً صحیح ہے، کیوں کہ اگر چند افراد لغو بات کررہے ہوں تو انہیں خاموشی کا حکم دینا نہی عن المنکر میں داخل ہے، اور عین صواب ہے۔اور نہ نقلاً اس مطلب کی گنجائش نکلتی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بات کرتے ہوئے لوگوں کو خاموش کرایا ہے۔(ملاحظہ ہو بخاری شریف کتاب العلم باب الانصات للعلماء)

غرض یہ کہ شیخ البانی نے اس حدیث کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ کسی طرح نہیں ہوسکتا، لیکن اس پر طرہ یہ کہ امام سیوطی پر عیب لگاتے ہیں کہ جامع کبیر میں ان سے یہ روایت چھوٹ گئی ہے، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ۔

''درست یہ ہے کہ یہ وہی روایت ہے جو بخاری ومسلم میں حضرت سعید بن مسیّب کے

طریق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور مسلم شریف میں ایک اور طریق سے بھی منقول ہے، الفاظ یہ ہیں: ''**اذا قلت لصاحبک انصت یوم الجمعة والامام یخطب فقد لغوت**''.

اس کی دلیل یہ ہے کہ البانی نے اس حدیث کی تخریج ''امام احمد عن عبدالرزاق عن معمر'' الخ کی روایت سے کی ہے، اور امام احمد نے اس حدیث کو مختصر کر دیا ہے، مصنف عبدالرزاق میں یہ روایت مکمل ہے، اس میں ہے: ''**عن معمر عن ابن همام بن منبه انه سمع اباهريرة يقول: قال رسول اللهﷺ: اذاقلت للناس انصتوا يوم الجمعة وهم ينطقون والامام يخطب فقد لغوت على انفسك**''. (ج ۳۔ ص ۲۲۳)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم نے لوگوں سے جمعہ کے دن جب کہ وہ بات کر رہے ہوں، اور امام خطبہ دے رہا ہو، یہ کہا کہ خاموش ہو جاؤ، تو تم نے لغو کام کیا۔

اور احمد بن یوسف سلمی نے عبدالرزاق سے بعینہ انہیں الفاظ سے روایت ذکر کی ہے، جسے شیخ البانی نے نقل کیا ہے، اور اس کے آخر میں یعنی ''یوم الجمعۃ'' بڑھایا ہے، یعنی مراد جمعہ کے دن ہے۔ (صحیفہ ہمام بن منبہ۔ ۱۲)

حقیقت واقعہ تو یہ ہے، لیکن علامہ البانی نے اسے دوسری حدیث سمجھ لیا ہے، اور اس پر مزید یہ کہ یہ خیال باندھ لیا کہ علامہ سیوطی سے یہ رہ گئی، چنانچہ لکھتے ہیں ''**خذه فائدة عزيزة قد لا تجد ها في مكان آخر**''۔ (الصحیحہ ۱۱۸/۲)

اسے زبردست فائدہ سمجھ کر لو، دوسری جگہ ہوسکتا ہے کہ نہ ملے۔

سبحان اللہ! دعویٰ اتنا بڑا، اور اس کا حال وہ ہے جو ذکر کیا گیا۔

(۶) شیخ البانی نے اپنی کتاب ''الصحیحہ میں ۶۲۳'' پر ایک حدیث ''موارد الظمآن'' سے نقل کی ہے، اس کی سند کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ''**هذا اسناد رجاله كلهم ثقات معروفون من رجال البخاری غير الكناني**''. اس سند کے تمام روات ثقہ ہیں، معروف ہیں، بخاری کے رواۃ ہیں، علاوہ کنعانی کے، کہ وہ بخاری کے راوی نہیں ہیں۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ''اس حدیث کے ایک راوی عاصم بن عمر ہیں، اور وہ

بہت کمزور ہیں، ان کے ہوتے ہوئے "**کلهم ثقات معروفون من رجال البخاری**" کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے"۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ "مواردالظمآن" کے مطبوعہ نسخے میں کاتب کی غلطی سے راوی کا نام عاصم بن محمد چھپ گیا ہے، اس غلطی کا ادراک نہ عبدالرحمان معلّٰی کو ہوا، نہ عبدالرزاق حمزہ کو، اور نہ البانی کو، انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ کتابت کی غلطی سے راوی کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اتنی باریک غلطی پکڑنے کے لئے وسیع مطالعہ، بغایت مستحضر علم درکار ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت محدث کبیر کو نوازا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "بعینہ یہی روایت بالکل اسی سند کے ساتھ امام بزار نے بھی نقل کی ہے، اس میں عاصم بن عمر کی تصریح ہے۔ چنانچہ "مجمع الزوائد" میں بھی ہے، اور "زوائد بزار" میں بھی۔

اور عاصم بن عمر کے بارے میں بخاری کا قول ہے کہ وہ منکرالحدیث ہیں، اور ابن حبان نے فرمایا کہ وہ بہت زیادہ منکرالحدیث ہیں، امام ترمذی نے کبھی انہیں متروک کہا، اور کبھی کہا کہ "**لیس بثقة**"، بعض لوگوں نے ان کی رعایت کی، اور ضعف کو کسی قدر ہلکا کر کے دکھایا ہے، لیکن صورتِ حال وہی ہے جیسا کہ امام بخاری نے فرمایا کہ وہ منکرالحدیث ہیں، ان سے روایت درست نہیں ہے، خود البانی نے امام بخاری کا یہ قول اپنی کتاب 'الضعیفہ' ج ۵۔ص ۱۱۸ میں نقل کیا ہے۔

اور البانی امام ابن حبان کی توثیق کا اعتبار نہیں کرتے، چنانچہ بار باران کی توثیق کو کمزور ثابت کرتے ہیں، اور عاصم بن عمر کو تو انہوں نے بھی ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔

اس بحث سے البانی کے مبلغِ علم کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۷) محدثین اپنی کتابوں میں بہت سی روایتوں کو مجہول صیغے سے ذکر کرتے ہیں، مثلاً "رُوِیَ" یا "یُروىٰ" (روایت کی گئی ہے) یا "ذُکِرَ" (ذکر کیا جاتا ہے) شیخ البانی کو اصرار ہے کہ جہاں کہیں محدثین ان الفاظ سے روایت نقل کرتے ہیں، ضرور ہے کہ ان میں کوئی کمزوری ہو، ایسی روایت قوی نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے، اور اس پر یقین کرنا قطعی باطل

ہے، بہت سی مثالیں ایسی ملیں گی کہ کسی حدیث یا کسی قول کی جانب اس جیسے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ صحیح اور قوی ہیں، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

(۱) امام ترمذی نے فرمایا۔"روی عن النبی ﷺ انه قال :ویل للاعقاب الخ" رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ "ویل للاعقاب ".امام منذری فرماتے ہیں امام ترمذی نے جس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے اسے امام طبرانی نے"کبیر" میں اور ابن خزیمہ نے" صحیح ابن خزیمہ" میں روایت کیا ہے،۔

(۲) امام ترمذی نے فرمایا "روی عن ابی هريرة ان النبی ﷺ توضأ ثلاثاً ثلاثاً" حضرت ابوہریرہ سے روایت کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین تین مرتبہ کر کے وضو کیا۔اس پر مولانا عبدالرحمان مبارک پوری لکھتے ہیں کہ "اخرجه ابن ماجه بسند لاباس به" ج ا۔ص۵۲ (ابن ماجہ نے اس کو روایت کیا ہے اور اس کی سند میں کچھ مضائقہ نہیں۔"لاباس بہ" توثیق کالفظ)

(۳) امام ترمذی نے فرمایا"هذا اصح من حديث شريك لانه قد روی من غير وجه"(یہ شریک کی حدیث سے اصح ہے اس لئے کہ ایک سے زائد وجہوں سے مروی ہے)۔

(۴) امام ترمذی نے فرمایا"حديث عمار حديث حسن صحيح وقد روی عن عمار من غير وجه". (ج ا۔ص۱۳۳)

(۵) وقد روی عن عمار انه قال :تيممنا الخ۔(ج ا۔ص۱۳۶)

(۶) قال الترمذی:وقد روی عن النبی ﷺ انه كان يقول بعد التسليم : لااله الا الله الخ ۔مولانا عبدالرحمان مبارک پوری لکھتے ہیں کہ اس کو بخاری ومسلم نے روایت کیا۔(ج ا۔ص۲۴۴)

(۷) قال الترمذی:قد روی عن النبی ﷺ قرأ فی الظهر قدر تنزيل السجدة"، اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(تحفۃ الاحوذی۔ج ا۔ص۲۵۱)

(۸) قال الترمذی:وروی عن عمر انه كتب الى ابی موسی (ج ا۔ص۲۵۱)

(۹) قال الترمذی:روی عنه(ﷺ)انه كان يقرأ فی الفجر من ستين آية الٰی

مـــأـة. مولانا مبارک پوری لکھتے ہیں کہ اس روایت کوامام بخاری ومسلم نے ذکر کیا ہے۔(ج ا۔ ص ۲۵۰)

(۱۰) قال الترمذی:وروی عنه انه قرأ اذا الشمس کورت۔مولانا مبارک پوری لکھتے ہیں کہ اس روایت کوامام نسائی نے نقل کیا ہے۔(ص۔۲۵۰)

(۱۱) قال الترمذی:وروی عن النبی ﷺ انه قرأ فی المغرب بالطور۔ صاحب تحفۃ الاحوذی لکھتے ہیں کہ اسے امام بخاری ومسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔(ج ا۔ص ۵۱)

(۱۲) قال الترمذی وروی عن ابی بکر انه قرأ فی المغرب بقصار المفصل۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ اس حدیث کوامام مالک،ابن ابی شیبہ،بیہقی اورعبدالرزاق (ج ۲۔ ص ۱۰۹) نے روایت کیا ہے،اور یہ صحیح ہے۔

(۱۳) امام ترمذی نے فرمایا"قدروی عن النبی ﷺ انه قال: من تمام الصلوٰۃ الخ۔وروی عن علی وعثمان انهما کانا یتعاهدان ذالک الخ ۔۱۹۳/۱یہ دونوں روایتیں ثابت ہیں،اوران میں ضعف نہیں ہے۔

(۱۴) امام ترمذی کاارشاد ہے"قد روی من غیر هذ االوجه عن انس الخ ۔مولانا عبدالرحمان مبارک پوری نے فرمایا۔"رواہ البخاری ومسلم وغیرهما"۔(۳/۲)

(۱۵) امام ترمذی نے فرمایا"قد روی عن عائشة عن النبی ﷺ نحو هذا ۔مولانا مبارک پوری نے لکھا ہے کہ "اخرجه مسلم"۔(۱۹۳/۲)

(۱۶) امام ترمذی نے فرمایا"قد روی عن ابی بن کعب انه کان یحلف الخ" پھر امام ترمذی نے اس کوسند کے ساتھ بیان کیا،اورفرمایا"ہٰذاحدیث حسن صحیح"۔(۶۹/۲)

(۱۷) امام ترمذی نے فرمایا"وهذا اصح لانه روی عن ابن جریح" ۵۰/۲۔ملاحظہ ہوامام ترمذی نے ابن جریح کےقول پراعتماد کیا ہے،مگراسے لفظ"روی"سے تعبیر کیا،معلوم ہوا کہ امام ترمذی کےنزدیک یہ لفظ ہمیشہ ضعف پر دلالت نہیں کرتا۔

(۱۸) ترمذی میں ہے"وقد روی من غیر هذ ا الوجه" پھراس کی سند ذکر کی اورفرمایا "حدیث حسن"۔(۴۰/۳)

(۱۹) امام ترمذی کا ارشاد ہے"قد روی من غیر وجه عن ابی هریرة"مولانا مبارک پوری نے فرمایا"اخرجه الشیخان"۔(۳۸۹/۳)

(۲۰) امام ترمذی نے فرمایا"وقد روی عن ابن عباس" مولانا مبارک پوری نے حوالہ دیا ''رواہ ابن خزیمہ''(فی صحیحہ)(۳۹۱/۳)

(۲۱) امام بخاری نے فرمایا"ویذکر عن ابن عباس فی الرقی بفاتحة الکتاب" پھر دوسری جگہ اس کی سند بیان کی،جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ (ص۔۱۷)

(۲۲) امام بخاری نے فرمایا"ویذکر عن عبد الله ابن السائب" حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے انہوں نے اپنی کتاب میں اس کی تخریج کی ہے۔

(۲۳) امام بخاری نے فرمایا"ویذکر عن عثمان اذابعتَ فکِل" حافظ ابن حجر کا ارشاد ہے''یہ حدیث حسن ہے''۔

یہ تیئیس (۲۳) مثالیں حضرت محدث اعظمی نے ارتجالاً پیش کی ہیں،ان سب میں ''روی''یا''یذکر'' کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے،لیکن ضعیف ان میں ایک بھی نہیں ہے،اس سے جہاں شیخ البانی کی غلطی واضح ہوتی ہے وہیں حضرت مولانا کے کمال استحضار کا بھی روشن ثبوت ملتا ہے،کہ صرف اس ایک مسئلہ کے لئے امثال وشواہد کا ذخیرہ جمع کر دیا۔

قول فیصل:

ان مثالوں کے پیش کرنے کے بعد حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں واقعی بات جو قابل تسلیم ہے،وہ یہ ہے کہ جزم اور تمریض کے الفاظ کی رعایت کرنی چاہئے،یعنی کسی کمزور قول یا ضعیف روایت کو جزم کے صیغے سے،اور کسی قوی حدیث کو تمریض کے صیغے سے نہیں بیان کرنا چاہئے،لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سے اہل تصنیف فقہا ومحدثین اس کی پوری رعایت نہیں کرتے۔حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں امام نووی سے اس کو نقل کیا ہے۔ (مقدمہ فتح الباری ص۲۰ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۰ھ)

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مجھول کا صیغہ جس کے بارے میں یہ قاعدہ بیان

کیا جاتا ہے کہ وہ تمریض وتضعیف کے لئے آتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمریض کے لئے وضع کیا گیا ہے، یعنی وہی اس کا حقیقی معنی ہے، اور وہ جب بولا جائے گا تو اس سے تمریض ہی کا معنی سمجھا جائے گا، یہ بات نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہ کبھی کبھی تمریض کے لئے استعمال ہوتا ہے، البتہ اگر کسی مصنف نے اسے تمریض کے لئے استعمال کرنے کا التزام کرلیا ہوتو وہ اس کی اصطلاح کے مطابق دائماً اسی معنی میں استعمال ہوگا، جیسے امام عبدالعظیم منذری (المتوفی ۶۵۶ھ) نے اپنی کتاب ''ترغیب وترہیب'' میں اس کی تصریح کی ہے، کہ وہ جب کسی حدیث کولفظ ''رُوِی'' یا ''یُـروی'' سے شروع کریں گے تو وہ ضعیف ہوگی، لیکن ہر مصنف پر اس قاعدہ کا اطلاق نہ ہوگا، مثلاً امام بخاری بھی کبھی تمریض کا صیغہ استعمال کرتے ہیں مگر اس سے ہر جگہ تضعیف مراد نہیں ہوتی۔ حافظ ابن حجر کے بقول اس لفظ سے روایت کی صحت مفہوم نہیں ہوتی، یعنی امام بخاری جب مجہول کا صیغہ لکھیں گے تو اس سے یہ استدلال نہیں ہوسکتا کہ یہ حدیث صحیح ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ حدیث صحیح ہو، حسن بھی ہوسکتی ہے، ضعیف بھی ہوسکتی ہے، حافظ ابن حجر نے اس کو ذکر کیا ہے اور اسے مثالوں سے مدلل کیا ہے۔ (مقدمہ فتح الباری۔ ص۱۹ بیروت)

حاصل یہ ہے کہ تمریض کے الفاظ سے روایت کا صحیح ہونا تو معلوم نہیں ہوتا، تاہم یہ بھی ضروری نہیں کہ جو کچھ اس صیغہ سے ذکر کیا جائے وہ یقیناً ضعیف ہی ہو۔ چنانچہ بعض اوقات شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب ''الکلم الطیب'' میں کوئی حدیث لفظ ''یُـذکـرُ'' سے نقل کرتے ہیں، حالانکہ وہ فی نفسہ صحیح ہوتی ہے، لیکن البانی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ ایسی ہی ایک روایت کے باب میں فرماتے ہیں ''لا وجه عندی لتمریضه''. (ص۵۷) ان کا یہ کہنا اسی نظریہ کی بنیاد پر ہے کہ جہاں کہیں مجہول کے صیغے سے روایت لائی جائے لازماً وہ ضعیف ہی ہوگی، لیکن بتایا جاچکا ہے کہ یہ مفروضہ غلط ہے۔

جمعہ سے پہلے سنت کا مسئلہ:

(۸) احناف اور شوافع کے یہاں عام طور سے یہ بات معلوم ہے کہ جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعت یا دو رکعت سنت ہے، اور یہ بات تمام ائمہ کے نزدیک مسلم ہے کہ احادیث میں جمعہ کی نماز سے پہلے نماز پڑھنے کی ترغیب وارد ہے، اکثر احادیث میں رکعتوں کی تعیین نہیں ہے، اور کسی کسی

میں رکعت کی تعیین بھی ہے، ظاہر ہے کہ کسی نماز کی ترغیب اور فضیلت جب احادیث میں اہتمام سے ذکر کی گئی ہوتی ہے تو فی الجملہ اس میں تاکید پیدا ہوجاتی ہے، یہی نوافل سنن مؤکدہ کہلاتی ہیں۔شیخ البانی کو انفرادیت کا شوق ہے، انہوں نے چند علما کی تقلید میں یہ اعلان کیا، اور انہیں اس پر سخت اصرار ہے کہ جمعہ کی نماز سے پہلے کوئی سنت حدیث سے ثابت نہیں ہے، یہ ایک نئی چیز ہے جو بدعت کے ذیل میں آتی ہے۔ان کے نزدیک زوال ہوتے ہی خطبہ شروع ہونا متعین ہے، لہٰذا سنت کا کوئی موقع نہیں ہے، اور جن نمازوں کی ترغیب احادیث میں آئی ہے وہ سنت نہیں ہیں، بلکہ مطلق نوافل ہیں، ان کا جمعہ سے کوئی ربط نہیں ہے، صرف اتنا ہے کہ اگر کوئی شخص اذانِ خطبہ سے پہلے مسجد میں آجائے تو بجائے بیٹھ کر انتظار کرنے کے نوافل میں مشغول ہوجائے، وہ جمعہ کی سنت نہیں شمار ہوں گی۔اور چونکہ ان کے نزدیک زوال ہوتے ہی خطبہ کی اذان ہونی چاہئے اس لئے زوال اور زوال سے پہلے کا جو وقت مکروہ ہے اسی میں نفل پڑھی جائیں گی۔کہتے ہیں کہ جمعہ کے دن وقتِ زوال کی کراہیت ختم ہوجاتی ہے، بلکہ ان کو تو اس پر بھی اصرار ہے کہ زوال سے پہلے جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔بہرکیف یہ تو ایک الگ مسئلہ ہے، اس وقت جمعہ کے پہلے کی سنت زیر بحث ہے، حاصل یہ ہے کہ انہیں جمعہ کی نماز سے پہلے سنت کا انکار ہے۔حضرت مولانا لکھتے ہیں کہ:

شیخ البانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:"**وقد استدل بالحديث (يعني حديث ما من صلاةمفروضة الا بين يديها ركعتان)بعض المتأخرين على مشروعية صلاة سنة الجمعه القبلية،وهذ ا استدلال باطل لانه ثبت فى البخارى وغيره انه لم يكن فى عهد النبىﷺ سوى الاذان الاول والاقامة وبينهما الخطبه**" (الصحیحہ ۶۸/۳)

مطلب یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ ہر فرض نماز کے پہلے دو رکعتیں مسنون ہیں، مگر اس حدیث کو جمعہ کی نماز پر منطبق کرنا صحیح نہیں ہے، اگرچہ بظاہر حدیث کے عموم میں جمعہ کی نماز بھی آجاتی ہے، جن لوگوں نے سنتِ جمعہ کی مشروعیت پر اس سے استدلال کیا ہے، البانی ان کا مواخذہ فرماتے ہیں کہ بخاری شریف وغیرہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہﷺ کے زمانے میں

صرف خطبہ کی اذان ہوتی تھی، اور اس دور میں بس یہی ایک اذان تھی، اسی کو اذانِ اول کہا جاتا ہے، اور اذانِ خطبہ سے پہلے جو اذان ہوتی ہے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت سے شروع ہوئی ہے، اس لئے وہ اذانِ ثانی کہلاتی ہے۔غرض نبی کریم ﷺ کے عہد میں صرف خطبہ کی اذان ہوتی اس کے فوراً بعد خطبہ شروع ہو جاتا، اور خطبہ کے ختم ہوتے ہی جمعہ کی نماز شروع ہو جاتی، پھر سنت پڑھنے کا موقع کہاں؟ اس لئے حدیث مذکورہ بالا گو کہ عام ہے مگر اس کا اطلاق جمعہ کی نماز پر نہیں ہوتا۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ایک حدیث اور ہے جو حضرت عبداللہ بن مغفل سے مروی ہے، اس میں فرمایا گیا ہے کہ "بین کل اذانین صلوٰۃ" (ہر اذان و اقامت کے درمیان نماز ہے) اگر جمعہ کے پہلے والی سنت پر اس حدیث سے استدلال کیا جاتا تو شیخ البانی کا مواخذہ قدرے درست ہوتا، کہ یہ حدیث گو کہ عام ہے مگر اس کا اطلاق جمعہ کی نماز پر نہیں ہوگا، کیونکہ جمعہ کی نماز میں اذانِ خطبہ اور اقامت کے درمیان کسی نماز کا موقع نہیں ہے، مگر جب استدلال عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث سے کیا گیا ہے، تو ان کا مواخذہ قطعی بے معنی ہے، کیوں کہ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر فرض نماز سے پہلے دو رکعت ہے، تو اس کی جہاں یہ صورت ہے کہ اذان کے بعد اور فرض نماز سے پہلے سنت پڑھی جائے، وہیں دوسری صورت یہ بھی ہے کہ اذان اور نماز دونوں سے پہلے سنت پڑھی جائے، اس صورت میں بھی حدیث کا مضمون صادق ہوگا کہ فرض نماز سے پہلے دو رکعت پڑھی گئی، اسی لئے حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ جمعہ سے پہلے دو رکعت سنت کی مشروعیت پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان میں یہ قوی ترین استدلال ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری ۲/۲۹۱)

عجیب بات یہ ہے کہ جس کو حافظ ابن حجر نے قوی ترین استدلال قرار دیں، شیخ البانی اس کی قوت تو کیا تسلیم کرتے، سرے سے اسے باطل قرار دیتے ہیں، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز کیا ہے؟ اور ان کے مواخذات و استدلالات کتنے سطحی ہوتی ہیں؟۔

شیخ البانی کا عجیب حال ہے، کوئی حدیث اگر ان کے مزعومہ نظریئے کے خلاف پڑتی ہے تو خواہ وہ کسی درجے کی حدیث ہو، اور خواہ اس سے کم درجے کی حدیث کو دوسری جگہ انہوں

نے قبول کیا ہو، مگر اپنی خواہش کے خلاف پاکر اسے شد و مد سے رد کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ایسے مواقع پر وہ بکثرت تناقض کے شکار ہوتے ہیں، ایک راوی کو ایک جگہ قبول کرتے ہیں اور دوسری جگہ اسی کو رد کر دیتے ہیں، کیوں کہ روایت ان کی مرضی کے خلاف پڑتی ہے، کسی جگہ ان کو صحیح صورتِ حال معلوم ہوتی ہے مگر یا تو اسے چھپا جاتے ہیں یا اس سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے انہیں خبر نہ ہو، کیوں کہ خبر ہو گی تو ان کا خاص نظریہ مجروح ہو گا۔

حضرت محدث کبیر فرماتے ہیں ''ایسے ہی مقامات سے جہاں انہوں نے بات چھپائی ہے، ایک جمعہ کی ابتدائی سنتوں کا مسئلہ ہے، اس میں انہوں نے کہہ دیا ہے کہ ''**کل ما ورد من الاحادیث فی صلاۃ سنۃ الجمعہ القبیلۃ لا یصح منھا شئی**'' جمعہ سے قبل سنت پڑھنے کے سلسلے میں جتنی روایات ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے''۔

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ البانی نے ان تمام حدیثوں کو الگ الگ بیان کر کے ہر ایک کا تجزیہ نہیں کیا، ورنہ حقیقت واضح ہو جاتی، میں چاہتا ہوں کہ البانی نے جس چیز کو چھپانا چاہا ہے اسے ظاہر کر دوں۔

اس باب میں چھ حدیثیں ہیں، جنہیں علیحدہ علیحدہ لکھتا ہوں۔

(۱) عن عبد اللہ بن مسعود قال: کان رسول اللہ ﷺ یصلی قبل الجمعہ اربعاً وبعد ھا اربعاً. (رواہ الطبرانی فی معجمہ الوسط)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں کوئی راوی متروک الحدیث نہیں ہے، طبرانی کے استاذ علی بن سعید رازی، خود البانی کے نزدیک حسن الحدیث ہیں۔ (ملاحظہ ہو الصحیحہ رقم ۲۳۶) اور اس میں ابو عبیدہ بن مسعود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، ایسی سند کو کئی محدثین نے حسن قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام ترمذی بھی ابو عبیدہ بن عبد اللہ عن ابیہ کی سند کو حسن قرار دیتے ہیں، اور حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے بارے میں ضعف اور انقطاع کا جو دعوی کیا ہے وہ محل نظر ہے۔

(۲) عن علی قال: کان رسول اللہ ﷺ نحوہ سواء. (رواہ الطبرانی فی

الوسط،والاثرم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی رسول اللہ ﷺ کے متعلق وہی بات مروی ہے جو پہلی حدیث میں گزری۔اثرم نے کہا کہ یہ کمزور حدیث ہے،اور حافظ ابن حجر کا ارشاد ہے کہ اس میں ایک راوی محمد بن عبدالرحمان السہمی ہیں،اور وہ امام بخاری وغیرہ کے نزدیک ضعیف ہیں،لیکن حافظ کا یہ قول محل نظر ہے،کیوں کہ امام بخاری نے ان کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے،لیکن اس میں ان سے ایک حدیث نقل کرنے کے بعد صرف اتنا فرمایا ہے کہ "لایتابع علیه" اسی بات کو حافظ نے لسان المیز ان میں اس طرح نقل کیا"لا یتابع علی روایته"اس سے امام بخاری کے قول کے خلاف معنی کا ایہام ہوتا ہے،کیوں کہ پہلی بات سے صرف اس حدیث کے بارے میں معلوم ہوتا ہے،کہ اس کے لئے کوئی متابع نہیں ہے،اور دوسری بات سے معلوم ہوتا ہے،مطلق ان کی کسی روایت کے لئے متابعت نہیں ہے،دونوں میں فرق ہے۔

بس تاریخ میں اسی قدر ہے۔رہا یہ کہ انہوں نے کہیں ان کے ضعیف ہونے کی تصریح کی ہو تو اس کا میں نے کہیں نشان نہ پایا،امام بخاری کے علاوہ دوسرے ائمہ فن کی بات یہ ہے کہ ابوحاتم نے ان کے مشہور ہونے کی نفی کی ہے،لیکن اس سے صراحۃً تضعیف نہیں ہوتی،البتہ حافظ ابن حجر نے ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں،اور یہ بات ابن ابی حاتم کے حوالے سے لکھی ہے،لیکن ابن ابی حاتم کی کتاب ہمارے سامنے ہے،اس میں یہ بات کہیں نہیں ہے،ہوسکتا ہے کہ ان کی کسی اور کتاب میں ہو۔ابن عدی کا قول ہے کہ "عندی لا باس به"اور ابن حبان نے"ثقات"میں ان کا ذکر کیا ہے،اور ان کی یہی حدیث نقل کی ہے۔

میرے نزدیک حق یہ ہے کہ وہ حسن الحدیث ہیں،اس لئے کہ ان سے ابن المثنیٰ،نصر بن علی،اور سفیان عصفری نے روایت بیان کی ہے،اس سے ثابت ہوا کہ ابوحاتم کا"لیس بمشهور" کہنا صحیح نہیں ہے،اور ابن عدی اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے،لہٰذا ان کی یہ حدیث حسن لذاتہ ہے،اور حسن لغیرہ ہونے میں تو ذرا بھی شبہہ نہیں ہے،کیوں کہ اس کے شواہد موجود ہیں۔

(۳) امام زیلعی اور حافظ ابن حجر نے ایک تیسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

سے نقل کی ہے،اس کے الفاظ یہ ہیں۔"**انہ کان یطیل الصلوٰۃ قبل الجمعۃ ویصلی بعدھا رکعتین فی بیتہ ویحدث ان رسول اللہﷺ کان یفعل ذالک**"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جمعہ سے پہلے طویل نماز پڑھا کرتے تھے،اور جمعہ کے بعد دو رکعت گھر میں پڑھتے تھے،اور فرماتے تھے کہ رسول اللہﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

اس حدیث میں امام نووی نے جمعہ کی سنت کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے،لیکن اس استدلال پر حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کو اشکال ہے،وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ جمعہ کا وقت داخل ہونے کے بعد وہ لمبی نماز پڑھا کرتے تھے تو یہ بات حضور اکرمﷺ کے حق میں درست نہیں ہوسکتی،کیوں کہ رسول اللہﷺ زوالِ شمس کے بعد باہر تشریف لاتے اور خطبہ میں مشغول ہوجاتے۔حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ یہ اشکال اس وقت درست ہوگا جب کسی دلیل سے صراحتاً یہ ثابت ہو کہ آپ باہر تشریف لاتے ہی منبر پر بیٹھ جاتے تھے،اور درمیان میں کوئی اور کام نہ کرتے تھے،لیکن کیا کوئی دلیل روایات میں ایسی ہے؟۔

حافظ ابن حجر کو دوسرا اشکال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد (کہ آپ ایسا ہی کیا کرتے تھے) کا تعلق جمعہ کے بعد والی دو رکعتوں سے ہے،اس کا قرینہ وہ پیش کرتے ہیں کہ مسلم شریف میں بھی یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، مگر اس میں صرف اتنا ہے کہ۔"**انہ کان اذا صلی الجمعۃ انصرف فسجد سجدتین فی بیتہ ثم قال کان رسول اللہﷺ یصنع ذالک**" (فتح الباری ۲/۵۴۱)یعنی حضرت عبداللہ بن عمر جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے گھر تشریف لے جا کر دو رکعت پڑھتے تھے،اور فرماتے کہ رسول اللہﷺ ایسا کیا کرتے تھے۔

لیکن حافظ صاحب موصوف کی یہ تخصیص بلا مخصص کے ہے،اور جو قرینہ انہوں نے پیش کیا ہے وہ کچھ دل لگتا سا نہیں ہے،کیوں کہ رواۃِ حدیث کسی کسی مصلحت سے حدیثوں میں اختصار وا کمال کا تصرف کرتے رہتے ہیں،یعنی کبھی پوری روایت نقل کرتے ہیں،کبھی اس کا کوئی جزء نقل کرتے ہیں۔مولانا فرماتے ہیں کہ یہاں بھی راوی کا تصرف کارفرما ہے،مسلم شریف کے راوی نے اس کا ایک جزء نقل کیا ہے۔

اس حذف واختصار کی وجہ سے پوری روایت میں سے دو باتوں کا علم کم ہوگیا،ایک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا جمعہ سے پہلے طویل نماز پڑھنا،دوسرے "**کان یفعل ذالک**" کا اس سے متعلق ہونا۔ظاہر ہے کہ مسلم شریف کی مختصر حدیث کی وجہ سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت عبداللہ بن عمر جمعہ سے پہلے طویل نماز نہیں پڑھا کرتے تھے،کیوں کہ اس میں مذکور نہیں ہے،اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اگر راوی پوری روایت ذکر کرے گا جب بھی "**و کان یفعل ذالک**"کا تعلق جزءِ اول سے نہ ہوگا،کیوں کہ وہ مسلم شریف کی حدیث میں مذکور نہیں ہے،کھلی بات ہے کہ جب مکمل روایت آئے گی اور اس میں "**کان یفعل ذالک**" حضرت عبداللہ بن عمر فرمائیں گے تو اس کا تعلق حدیث کے دونوں جزء سے ہونا ہی چاہئے،اگر ایسا نہ ہوتو عجیب بات ہوگی۔

اگر برسبیل تنزل مان لیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس جملہ کا تعلق صرف بعد والی دو رکعتوں سے ہے،اور پہلے والی سنت کا اس سے مرفوع ہونا ثابت نہیں ہوتا،تب بھی اس پہلو سے غور کرنا چاہئے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اتباعِ سنت میں خاص امتیازی مقام رکھتے ہیں۔صحابہ بھی سنت کے شیدائی تھے،مگر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اس سلسلے میں جو اہتمام تھا وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے،جو عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوتا اسے وہ اختیار کرتے اور جو چیز ثابت نہ ہوتی اس سے بشدت اجتناب کرتے،ان کا کسی کام کو کرنا، بالخصوص عبادات کے باب میں،یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے،لیکن اس دلیل کو سمجھنے کے لئے صحیح ذوق کی ضرورت ہے،جس کا ظواہر اصول والفاظ پر عکوف کرنے والے اس فرقہ حدیثہ میں فقدان ہے،جس کی قیادت البانی کررہے ہیں۔

(۴) حافظ ابن حجر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت نقل کی ہے،اس کے الفاظ یہ ہیں۔"**کان یصلی قبل الجمعة رکعتین وبعد ھا اربعاً**"(**رواہ البزار**) فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ضعف ہے۔(فتح الباری ۱۹۱/۲)

اس روایت کو "تلخیص الجبیر" میں طبرانی کی اوسط سے نقل کیا ہے،اور اس میں بجائے "**اربعاً**" کے "**بعدھا رکعتین**" ہے،اور اس پر سکوت کیا ہے۔

(۵) امام زیلعی اور حافظ ابن حجر نے ابن ماجہ کے حوالے سے ایک پانچویں روایت نقل کی ہے، یہ روایت حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"جاء سليک الغطفاني ورسول الله ﷺ يخطب فقال له النبی ﷺ: اصليت قبل ان تجيي؟ قال: لا، قال: فصل رکعتين وتجوز فيهما"۔

حضرت سلیک غطفانی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے، اور آپ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، آپ نے فرمایا کہ آنے سے پہلے تم نے دو رکعت پڑھ لی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، فرمایا کہ مختصر سی دو رکعتیں پڑھ لو۔

حافظ ابن حجر نے "تلخیص الجبیر" میں فرمایا کہ مجد بن تیمیہ (علامہ ابن تیمیہ کے دادا) نے "منتقی" میں لکھا ہے کہ "قبل ان تجئی" جمعہ کی سنتِ قبلیہ پر دلیل ہے، یعنی آپ کا یہ فرمانا کہ "آنے سے پہلے پڑھ چکے ہو یا نہیں؟" اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا سوال تحیۃ المسجد کے بارے میں نہیں تھا، کیوں کہ تحیۃ المسجد مسجد میں آنے سے پہلے نہیں پڑھی جاتی، اس صورت میں "قبل ان تجئی" کا سوال بے محل ہوتا، پس ضروری ہے کہ یہ سنتِ جمعہ ہو، مگر پھر انہوں نے حافظ ابوالحجاج مزی کا قول نقل کیا کہ روایت میں "قبل ان تجئی" کسی راوی کی تصحیف ہے، یہ لفظ درحقیقت "قبل ان تجلس" ہے، اس توجیہ کی صورت میں یہ نماز تحیۃ المسجد قرار پائے گی۔

حضرت محدث کبیر فرماتے ہیں کہ تصحیف کا دعویٰ محض بے دلیل ہے، اسی لئے مجد بن تیمیہ نے اس پر کوئی التفات نہیں کیا، اور حافظ ابن حجر نے بھی صرف نقل کر دیا ہے، مزید اس سے کوئی اعتناء نہیں کیا۔

خاکسار راقم السطور کہتا ہے کہ "معارف السنن" میں مولانا محمد یوسف بنوری نے علامہ انور شاہ کشمیری کا قول نقل کیا ہے کہ حافظ ابوالحجاج المزی کا دعویٰ تصحیف کیوں کر درست تسلیم کر لیا جائے؟ جب کہ ٹھیک اسی حدیث کے مطابق امام اوزاعی کا مسلک ہے، انہوں نے فرمایا ہے کہ اگر گھر میں نماز پڑھ کر مسجد میں آیا ہے تو اگر امام خطبہ دے رہا تھا تو نہ پڑھے، اگر گھر سے پڑھ کر نہیں آیا ہے، تو اگرچہ امام خطبہ دے رہا ہو، مگر پڑھ لے۔ امام اوزاعی کا یہ قول حافظ نے "فتح الباری" ۲/۳۴۰ میں نقل کیا ہے۔ (ص۔۵۲۱)

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ امام بخاری کے ''رسالۃ جزء القرأۃ'' (ص ۳۷ مطبوعہ مطبع محمدیہ لاہور) میں سلیک کے واقعہ کے متعلق حضرت جابر کی حدیث کے بعد ہے کہ ''**وکان جابر یعجبہ اذا جاء یوم الجمعۃ ان یصلیھا فی المسجد**'' جمعہ کے روز حضرت جابر مسجد ہی کے اندران دونوں رکعتوں کو پڑھنا پسند کرتے تھے، ان الفاظ کے اشارے سے پتہ چلتا ہے کہ گو کہ حضرت جابر گھر میں دو رکعتیں پڑھ چکے ہوتے تھے تاہم مسجد میں آ کر پڑھنے کو پسند کرتے تھے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحیۃ المسجد نہیں ہے، بلکہ دو رکعت سنت ہے، اور ابن ماجہ کی حدیث میں ''**ان تجئی**'' کا لفظ صحیح ہے، اس میں تصحیف نہیں ہوئی ہے، گو کہ مجموعی اعتبار سے حضرت جابر کا عمل مسلکِ احناف کے خلاف ہے مگر بہر حال اس سے اس بات کا ثبوت حاصل ہوتا ہے کہ تصحیف کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔

مولانا بنوری فرماتے ہیں کہ اس مقصد پر مزید روشنی حضرت امام احمد کی مسند میں آئے ہوئے الفاظ سے پڑتی ہے، اس میں ہے کہ ''**ان صلی فی بیتہ یعجبہ اذا دخل ان یصلیھما**'' گھر میں اگر دو رکعتیں پڑھ چکے ہوتے، تو بھی مسجد میں داخل ہونے کے بعد انہیں پڑھ لینا ان کو پسند تھا۔ اس کی تائید ''کنز العمال'' ۴/۶۱ کی ایک روایت سے ہوتی ہے، جو ابن ابی شیبہ سے منقول ہے۔ ''**جاء سلیک غطفانی والنبی ﷺ یخطب ولم یکن صلی الرکعتین فامرہ النبی ﷺ ان یصلی رکعتین یتجوز فیھما**'' حضرت سلیک غطفانی اس وقت مسجد میں آئے جب رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اور انہوں نے دو رکعتیں نہیں پڑھی تھیں، تو آپ نے حکم دیا کہ مختصر سی دو رکعتیں پڑھ لیں۔ بہر حال ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دو رکعتیں تحیۃ المسجد نہ تھیں، جمعہ کی سنت تھیں، اور تصحیف کا قول صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے بھی تصحیف کے دعویٰ کو قابل اعتناء نہیں سمجھا ہے، اسی لئے وہ ''فتح الباری'' ۲/۳۴۰ میں ''**قبل ان تجئی**'' کی تاویل کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت جہاں تم آ چکے ہو، یہاں آنے سے پہلے تم دو رکعتیں پڑھ چکے ہو؟ اور اس استفہام کا فائدہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ مسجد کے پچھلے گوشے میں وہ پڑھ چکے ہوں، اور اب خطبہ سننے کے لئے آگے بڑھ آئے ہوں، اس کی تائید مسلم کی روایت سے ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہے کہ ''**اصلیت**

الرکعتین ‘‘ کیاتم نے وہ دورکعتیں پڑھ لیں؟اس میں ’’الف لام‘‘ عہد کا ہے،اور یہاں بجزتحیۃ المسجد کے کوئی اور نماز معہود قریب نہیں ہے،اس لئے وہی مراد ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ محض تاویل ہے،روایت کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے،کیوں کہ رسول اللہﷺ نے تو انہیں مسجد میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا،آپ کو تو یہ معلوم ہی ہوگیا تھا کہ بیٹھنے یا اس مخصوص جگہ آنے سے پہلے انہوں نے دورکعتیں نہیں پڑھی ہیں،پس یہ سوال ہی بے معنی ہوا جاتا ہے،اور اگر آپ کا سوال مسجد میں آنے سے پہلے کے متعلق ہو تو البتہ بر محل ہے۔(معارف السنن ۴/۳۷۲۔۳۷۳)

(۶) امام زیلعی اور حافظ ابن حجر نے ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھی ہے۔’’**کان النبیﷺ یرکع قبل الجمعة اربعاً لا یفصل شئی منهن**‘‘اس کے بارے میں حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی سند بے حد کمزور ہے۔

پس یہ چھ حدیثیں ہیں،ان میں بعض صحیح ہیں،بعض حسن ہیں،اور بعض ضعیف ہیں،اور بہت زیادہ ضعیف آخری حدیث ہے،اور اگر مان لیا جائے کہ سب ضعیف ہیں،تب بھی کیا ایک کو دوسرے سے قوت نہ حاصل ہوگی؟اور ان احادیث کے مجموعہ سے ان کا حاصل مضمون درجہ حسن تک نہ پہونچے گا؟جب کہ شیخ البانی نے حدیث کی تحسین کا یہ طریقہ متعدد جگہوں پر برتا ہے،چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ایک ضعیف حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ چونکہ اس کے لئے شاہد ہے،اس لئے ’’حسن لغیرہ‘‘ ہے۔(صحیحہ ۳/۶۷)

(۲) ایک جگہ لکھتے ہیں کہ یہ سب روایات ضعیف ہیں،لیکن ایک کو دوسرے سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔(۱/۴۲)

(۳) **وجملة القول ان الحديث بهذه الطريق صحيح**۔(۲/۱۶)

(۴) **وبالجملة فالحديث بهذاالطريق والشواهد يرتقى الٰى درجة الصحة**۔ (۲/۳۹)

(۵) **الكديمى متهم لكنه قد توبع فالحديث حسن ان شاء الله**۔(۵/۱۷۱)

(۶) حاصل کلام یہ ہے کہ یہ اسناد ضعیف ہے،لیکن بہت ضعیف نہیں ہے۔پس حدیث ابوامامہ کے لئے شاہد بننے کی صلاحیت رکھتی ہے،اس لئے درجۂ حسن تک پہونچ جاتی ہے۔ (۱۵۱/۳)

(۷) ایک روایت کے بارے میں ''صحیحہ''میں کہا ہے کہ مرسل ہے،لیکن اس کے لئے ایک شاہد ہے جوموصول ہے،اس سے اس کی تقویت ہوتی ہے، پھراس شاہد کوذکر کیا ہے،اس کی سند میں عبداللہ العمری ہیں، جو کہ ضعفِ حافظہ میں معروف ہیں،اس پر البانی نے لکھا کہ اس جیسی روایت شاہد بن سکتی ہے،اس لئے کہ راوی کا ضعف ان کی ذات میں کسی تہمت کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ قوتِ حفظ میں خرابی کی وجہ سے ہے، یہ ضعف ہلکا ہے، پس زہری کے مرسل کے لئے شاہد قوی ہے،اوراس کی وجہ سے یہ حدیث صحیح قرار پائے گی،جیسا کہ علم حدیث کے قواعد کا اقتضا ہے (لیکن اس شرط کے ساتھ کہ علامہ البانی کے نظریئے اورخواہش کے مطابق ہو،ورنہ اس کے صحیح ہونے کا امکان نہیں ہے)

(۸) **وبالجملة فالحديث بهذه المتابعات جيد۔(۲۵۳/۵)**

(۹) آداب الزفاف میں صحیح مسلم کی ایک روایت ذکر کی ہے،اوراس کی سند کوضعیف قراردیا ہے، پھراس کے لئے شواہد ذکرکر کے لکھا ہے کہ ان شواہد کی وجہ سے حدیث ''صحیح'' ہے،یا کم ازکم ''حسن'' ہے۔(۶۳)

(۱۰) آداب الزفاف میں ایک اورجگہ لکھتے ہیں کہ مانا کہ حدیث کی سند ضعیف ہے،لیکن اس کا ضعف زیادہ نہیں ہے،اس جیسے ضعف کا تدارک دوسرے طریق سے آنے ، یا کسی شاہد کی وجہ سے ہوجاتا ہے،جیسا کہ اصولِ حدیث میں معروف ہے۔

(۱۱) صحیحہ میں فرماتے ہیں کہ ''شریک سئی الحفظ ہیں''اوران کے متابع قیس بھی ایسے ہی ہیں،لیکن دونوں کے مل جانے کی وجہ سے حدیث ''حسن'' ہے، بلکہ ''صحیح لغیرہ'' ہے، کیوں کہ وہ دوسرے طرق سے بھی وارد ہے۔(۱۶۴/۵)

(۱۲) صحیحہ میں لکھتے ہیں کہ حدیث کی سند گوکہ ضعیف ہو،لیکن سند کا ضعف فی نفسہ مضمون حدیث کے ضعف یااس کے عدم ثبوت پر دلیل نہیں ہوتا، کیوں کہ ممکن ہے کہ اس کے واسطے کوئی

اسناد حسن یا اسناد صحیح موجود ہو، یا یہ کہ اس کے لئے دوسرے شواہد موجود ہوں، جن کے مجموعے سے حدیث کا ثبوت ہوتا ہو۔اور واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث ایسی ہی ہے، کیوں کہ اس کے لئے کئی شواہد ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی اصل ضرور ہے۔(رقم۔۴۰۱)

ان کے الفاظ یہ ہیں۔''**والحدیث ان کان اسنادہ ضعیفاً فانه لا یدل علی ضعفه وعدم ثبوته فی نفسه لاحتمال ان له اسناداً حسناً اوصحیحاًاوان له شواهد یدل مجموعها علی ثبوته ،والواقع ان هذاالحدیث کذالک فان له شواهد تدل ان له اصلاً**''۔

راقم السطور عرض کرتا ہے کہ شیخ البانی نے یہ اصول بہت کارآمد اور صحیح بتایا ہے، مگر جہاں ان کی خواہش کے خلاف اس اصول سے کام لیا جاسکتا ہے، وہاں انہوں نے اسے یکسر فراموش کردیا ہے، بالخصوص احناف کے مقابلے میں تو شاید انہیں کہیں یہ اصول یاد ہی نہیں آیا۔

(۱۳) **وجملة القول ان الحدیث بمجموع طریقیه وهذا الشاهد صحیح بلاریب**۔(رقم۔۳۸۱)

(۱۴) صحیحہ میں ایک حدیث کو اس کے شواہد سمیت ذکر کیا، اور ہر ایک کو ضعیف قرار دیا، پھر کہا ''**وجملة القول ان الحدیث بمجموع طریق عمروو طریق ابی سعید یرتقی الی درجة الحسن لغیره علی اقل الاحوال.**

(۱۵) آداب زفاف میں ایک حدیث ذکر کر کے ضعف کی طرف اشارہ کیا، پھر ارشاد ہوا کہ ''لیکن پہلے طریق کے متن کے دو شاہد ہیں، جن کو امام ہیثمی نے ذکر کیا ہے، اسی لئے میں نے اسے حسن قرار دیا ہے''۔(۳۸)

(۱۶) صحیحہ میں لکھتے ہیں کہ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ حدیث متعدد طریق سے ان صحابہ کرام سے، جن کا ہم نے تذکرہ کیا، مروی ہے۔اگرچہ انفراداً کوئی ضعف سے خالی نہیں ہے، لیکن بعض کا ضعف زیادہ شدید نہیں ہے، (معلوم ہوا کہ بعض کا ضعف شدید ہے)[۲] اسی لئے میرا خیال ہے کہ یہ حدیث مجموعی لحاظ سے کم از کم حسن کے درجے تک پہونچ جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ البانی نے ضعیف شواہد اور متابعات کی وجہ سے بکثرت روایات کو حسن

قرار دیا ہے، کہاں تک نقل کیا جائے، پڑھنے والے تو اتنے ہی سے اکتا رہے ہوں گے، حالانکہ یہ بہت کم ہے، اس سلسلے میں ان کے تصرفات عجیب وغریب ہیں، ''صحیحہ'' میں کسی حدیث کو ثابت کرتے ہیں، پھر ''ضعیفہ'' میں اسی کو توڑ دیتے ہیں، صحیحہ میں جن قواعد کی رعایت کرتے ہیں، ضعیفہ میں انہیں کو بے وزن اور مہمل کر دیتے ہیں۔

ایسے تناقضات بکثرت واقع ہوئے ہیں، اور اس وجہ سے واقع ہوئے ہیں کہ وہ تصحیح و تضعیف کی بنیاد اپنے نظریہ اور اپنی خواہش کو قرار دیتے ہیں، اگر کسی حدیث کو وہ صحیح قرار دینے کا ارادہ کر لیتے ہیں، تا کہ ائمہ اجتہاد سے انحراف کر سکیں، اور ماہر فن محدثین سے اپنی راہ الگ کریں، تو کوئی قاعدہ استعمال کر لیتے ہیں، اور جب کسی حدیث کو ضعیف قرار دینا چاہتے ہیں تو اسے پیٹھ پیچھے ڈال دیتے ہیں۔

اس کی ایک واضح مثال جمعہ کی سنت کا مسئلہ ہے، وہ اس کا انکار تو کر نہیں سکتے کہ اس باب میں متعدد احادیث وارد ہیں، مجبوراً اعتراف تو کرتے ہیں مگر یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ان میں سے بعض، بعض سے زیادہ ضعیف ہیں، اور اپنا عمل فراموش کر جاتے ہیں، کتنی ایسی احادیث جو ایک دوسرے سے بڑھ کر ضعیف ہیں، لیکن جب ان کی خواہش کے موافق ہوئیں تو انہیں صحیح یا حسن قرار دے دیا، مثالیں گزر چکی ہیں۔ (غیر مقلدیت کا انجام یہی اتباعِ اہواء ہے)

اس باب میں موقوف روایات اور آثارِ صحابہ بھی ہیں، لیکن شیخ البانی نے انہیں سرے سے نظر انداز کر دیا، گویا وہ وارد ہی نہیں ہوئے ہیں، حالانکہ ان سندوں کی صحت میں کلام بھی نہیں ہے۔ یہ آثار صحابہ بھی جمعہ سے پہلے سنت کے دلائل ہیں، لیکن البانی نے ان سے اعراض اور تجاہل اختیار کیا، کیوں کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہیں۔

آثار صحابہ:

(۱) ابوعبدالرحمان سلمی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیں جمعہ کے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔ (مصنف عبدالرزاق ۳/ ۲۴۷)

(۲) حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جمعہ کے پہلے رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔ (عبدالرزاق ۳/ ۲۴۷)

(۳) ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ایک اور طریق سے نقل کیا ہے۔

(۴) ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ جمعہ کے دن سویرے مسجد میں پہونچتے تھے، اور امام کے آنے سے پہلے لمبی نماز پڑھتے تھے۔

(۵) حضرت عمر بن عبدالعزیز کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ جمعہ کے پہلے دس رکعت پڑھتے تھے

(۶) عبدالرزاق نے حضرت عطاء بن ابی رباح کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ جمعہ کے پہلے بارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

(۷) ابن ابی شیبہ نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ لوگ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(۸) حضرت طاؤس جمعہ کے دن گھر میں دو رکعت پڑھ کر ہی مسجد آتے تھے۔

(۹) حضرت ابومجلز کے بارے میں بھی اسی طرح کا عمل مروی ہے۔

(۱۰) ابن سعد نے ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کے متعلق نقل کیا ہے کہ انہوں نے جمعہ کے پہلے چار رکعت پڑھی۔ اسے حافظ ابن حجر نے ''درایہ'' میں بیان کیا ہے۔

یہ آثار صحابہ وتابعین ہیں، جن سے صاف پتہ چلتا ہے، دور صحابہ وتابعین میں جمعہ سے پہلے سنت پڑھنے کا عام رواج تھا۔ ابراہیم نخعی کا قول عام عمل کو بتلاتا ہے، لیکن شیخ البانی نے ان سب سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمعہ کی سنتِ قُبلیہ توارثاً اور تعاملاً منقول ہے، اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ احادیث کے مختلف مجموعوں میں ائمہ حدیث نے جمعہ کی سنت قُبلیہ کے مستقل ابواب قائم کئے ہیں۔ مثلاً مصنف عبدالرزاق (المتوفی ۲۱۱ھ) میں ''باب الصلوٰۃ قبل الجمعة وبعدها''۔ مصنف ابن ابی شیبہ (المتوفی ۲۳۵ھ) میں ''الصلوٰۃ قبل الجمعه''۔ بخاری (المتوفی ۲۵۶ھ) میں ''الصلوٰۃ بعد الجمعه وقبلها''۔ اور ترمذی (المتوفی ۲۷۹ھ) میں ''الصلاۃ قبل الجمعه وبعدها'' کے عنوان سے ابواب ہیں۔

ان ائمہ حدیث نے جو ابواب قائم کئے ہیں یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جمعہ سے پہلے کی سنت کا ثبوت ہے، مگر شیخ البانی انہیں دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیتے ہیں، حالانکہ معمولی عقل وہوش کا آدمی بھی جان سکتا ہے کہ ان ائمہ محدثین کے دور میں سنتِ جمعہ کا عام دستور تھا اور اگر اس

کو وہ غلط سمجھتے تو اس کی تردید کرتے، تائیدی ابواب وروایات ذکر نہ کرتے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس تفصیل کے بعد میں کہتا ہوں کہ اگر شیخ البانی کا یہ دعوی سچا ہے کہ انہوں نے تقلید کا جوا اپنی گردن سے نکال دیا ہے، اور واقعی حدیثِ رسول کو اپنے اجتہاد سے سمجھتے اور پرکھتے ہیں، تو انہیں صحیح احادیث میں ایسی باتیں مل جائیں گی جن سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مسجد میں جمعہ سے پہلے اور امام کے آنے سے قبل پہونچے تو اسے نماز پڑھنی مسنون ومشروع ہے، مگر کچھ علما نے ان نمازوں کو مطلق نفل قرار دیا ہے، جمعہ سے ان کا تعلق نہیں مانتے، شیخ البانی درحقیقت انہیں کے مقلدِ جامد ہیں، اسی تقلیدِ جامد کی وجہ سے ان روایات سے صرف نظر کرتے ہیں[۳]

نماز جمعہ سے پہلے نماز کی ترغیب میں متعدد احادیث وارد ہیں، حضرت مولانا نے سات احادیث کی طرف اشارے کئے ہیں، ہم ان میں سے بخاری شریف کی روایت پوری نقل کئے دیتے ہیں، اور باقی روایات کے اشارے جس قدر حضرت مولانا نے کئے ہیں انہیں پر اکتفا کرتے ہیں، اہل علم کی نگاہ سے یہ روایات مخفی نہیں ہیں۔

(۱) **عن سلمان الفارسی قال: قال النبی ﷺ: لا یغتسل رجل یوم الجمعة ویتطهر ما استطاع من طهر ویدهن من دهنه او یمس من طیب بیته ثم یخرج فلا یفرق بین اثنین ثم یصلی ما کتب له ثم ینصت اذا تکلم الامام الا غفر له ما بینه وما بین الجمعة الاخریٰ۔** (بخاری ۱/۱۲۱)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر کوئی آدمی جمعہ کے دن غسل کرے اور اپنی وسعت بھر طہارت ونظافت حاصل کرے، تیل اور خوشبو لگائے، پھر جامع مسجد میں داخل ہو، اور کسی دو شخص کے درمیان گھس کر تفریق نہ کرے، پھر جتنا مقدور ہو نماز پڑھے، پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو خاموش رہے، تو ضرور ہے کہ اس جمعہ اور دوسرے جمعہ تک کی اس کی خطائیں بخش دی جائیں۔

(۲) امام احمد نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے اس مضمون کی روایت ذکر کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔ "**ثم یرکع ما قضی له**"۔

(۳) ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے میں "**فیرکع ان بدالہ**" ہے۔

(۴) حضرت ابوایوب ابوسعید رضی اللہ عنہما سے بھی مسند احمد میں اسی طرح روایت ہے۔

(۵) مسند احمد میں نبیشہ الہذ لی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں "**فان لم یجد الامام خرج صلی ما بد الہ**"۔

(۶) امام بغوی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، اس کے الفاظ ہیں۔ "**فصلی ما قدر لہ ثم ینصت**"۔

(۷) امام بغوی ہی نے حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔"**ثم یرکع ما شاء ان یرکع وانصت اذا خرج الامام**"۔

حضرت محدث کبیر فرماتے ہیں کہ ان سب روایتوں میں رسول اللہ ﷺ نے جمعہ سے پہلے نماز پڑھنے کی ترغیب دی ہے، ہاں یہ ہے کہ آپ نے واجب نہیں فرمایا، اور رکعتوں کی تعداد متعین نہیں کی۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بخاری شریف کی مفصل روایت پر غور کیجئے، اس میں کئی چیزیں جمعہ کے ذیل میں بیان کی گئی ہیں، مثلاً غسل کرنا، پاکی حاصل کرنا، تیل لگانا، خوشبو استعمال کرنا، مسجد میں دو قریب بیٹھے ہوئے مصلیوں کے درمیان نہ گھسنا، گردن نہ پھلانگنا، نماز پڑھنا، پھر امام کے خطبے کے وقت خاموش رہنا، ان میں سے ہر چیز کا تعلق جمعہ کی نماز سے ہے، کچھ واجب ہے، کچھ مسنون ہے، کچھ مستحب ہے، لیکن ہے سب کا ربط جمعہ کی نماز ہی سے، لیکن اس سے ربط و تعلق نہیں (بقول شیخ البانی) تو صرف ان نمازوں کا نہیں جو مسجد میں جا کر امام کے آنے سے پہلے پڑھی گئی ہیں، بس وہ مطلق نفل ہیں، جمعہ کے ساتھ ان کی خصوصیت نہیں ہے۔ یاللعجب

اس تفصیل سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عموماً فقہا ومحدثین نے جمعہ کی نماز سے پہلے جو سنت کا ذکر کیا ہے، اگرچہ سند کے اعتبار سے کوئی مضبوط روایت خاص سنتِ راتبہ کے عنوان سے ان کے سامنے نہیں ہے لیکن وہ ارشاداتِ رسول کی روح کو سمجھتے ہیں، وہ صرف ظواہر پرست نہیں ہیں، انہیں ایمانی فراست حاصل ہے، جس کی روشنی میں وہ صحیح فیصلہ کرتے ہیں، اور جن لوگوں نے اس کے خلاف اصرار کیا وہ شذوذ میں جا پڑے۔

(۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ہیثم بن حنش بیان کرتے ہیں کہ۔

" کنا عند عبدالله بن عمر رضی الله عنهما،فخدرت رجله فقال له رجل:اذکر احب الناس الیک ،فقال :یا محمد(ﷺ)فکانما نشط من عقال". (الاذکار للنووی بحوالہ ابن سنی)

یعنی ہم لوگ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے،ان کے پاؤں میں جھُن جھُنی ہوئی،ان سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے محبوب ترین آدمی کو یاد کیجئے،انہوں نے کہا ''یا محمدؐ'' یہ کہنا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے بندھن کھل گیا ہو۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ یہ حدیث شیخ البانی کو پسند نہیں آئی[۴] انہوں نے چاہا کہ اس کو ضعیف قرار دیں تو اس پر کئی اعتراض کئے،لیکن ہر اعتراض خواہش نفس کی بنیاد پر ہے۔

پہلا اعتراض یہ کیا کہ خطیب کا ارشاد ہے "**الهيثم هذا مجهول**" یہ ہیثم مجہول ہیں۔ بس اتنا ہی نقل کیا،اس سے شاید یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ خطیب کے علاوہ اور کسی نے ہیثم کا ذکر ہی نہیں کیا ہے،اور ان کے بارے میں بس اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ مجہول ہیں،حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں سے شیخ البانی نے خطیب بغدادی کا قول نقل کیا ہے وہ امام بخاری کی تاریخ کا حاشیہ ہے،خطیب بغدادی کا یہ قول شیخ عبدالرحمان المعلمی نے تاریخ بخاری کے حاشیہ پر نقل کیا ہے، جب ان کے سامنے یہ حاشیہ ہے تو ضروری ہے کہ انہوں نے تاریخ کا مطالعہ بھی کیا ہو،امام بخاری نے ان کا ذکر اپنی اسی کتاب میں کیا ہے،نیز ابن ابی حاتم مشہور امامِ جرح وتعدیل نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے،اور دونوں نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ان سے سلمی بن کہیل نے روایت کی ہے۔اس طرح ان کے دو راوی ہوئے،ایک ابواسحاق سبیعی،جو اس حدیث کے راوی ہیں،اور دوسرے سلمی بن کہیل۔اور جس شیخ سے دو راوی روایت بیان کریں وہ مجہول نہیں رہتا، معلوم ہوا کہ ہیثم مجہول نہیں ہیں،اور اس سلسلے میں خطیب سے سہو ہوا ہے۔

اگر البانی امانت سے کام لیتے تو پوری بات سامنے رکھ کر فیصلہ کرتے،اور شیخ معلّمی کا حوالہ دے کر خطیب کا قول نقل کرتے،لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو جس چیز کو چھپانا چاہتے تھے وہ کھل جاتی،اور معلوم ہو جاتا کہ امام بخاری نے ان کا ذکر کیا ہے،اور وہ مجہول نہیں ہے۔

البانی اپنی تصانیف میں بار بار یہ دعویٰ دہراتے ہیں کہ وہ سنتِ صحیحہ کے داعی اور نقیب ہیں، اور وہ خود بھی اس کے متبع ہیں۔ حضرت محدث کبیر فرماتے ہیں کہ سنتِ صحیحہ کے سلسلے میں اگر یہی ان کا طرزِ عمل ہے اور اسی کا نام اتباع ہے تو ایسے اتباع کو دور سے سلام!

دوسرا اعتراض اس حدیث پر یہ کیا کہ ہیثم سے اس روایت کو ابواسحاق سبیعی نے نقل کیا ہے، ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ''وہ اخیر عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، یعنی حافظہ خراب ہو گیا تھا، اس لئے ان کی روایات محفوظ نہ رہ گئی تھیں''۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ البانی کو یا تو خبر نہیں، یا خبر ہے تو جان بوجھ کر انہوں نے چھپانا چاہا ہے کہ اس حدیث کو ابواسحاق سبیعی سے اخذ کرنے والے سفیان ثوری بھی ہیں، اور سفیان ثوری ان کے ان تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، جنہوں نے اختلاط سے پہلے ان سے حدیثیں سنی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں اس کی تصریح کی ہے۔ (ملاحظہ ہو، ص ۶۰۳ مطبوعہ دار الکتب بیروت ۱۴۱۰ھ)

تیسرا اعتراض انہوں نے یہ کیا ہے کہ اس حدیث میں اضطراب ہے، کیوں کہ ابواسحاق اس حدیث کو کبھی ہیثم سے نقل کرتے ہیں، کبھی ابوشعبہ سے بیان کرتے ہیں، اور کبھی عبدالرحمان سے (اور چونکہ شیخ البانی انہیں مختلط قرار دے چکے ہیں، اس لئے تین مختلف اساتذہ کا نام لینے سے بآسانی دعویٔ اضطراب قابل قبول ہو جاتا ہے)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ اضطراب کا دعوی درست نہیں ہے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے تینوں اساتذہ سے یہ حدیث سنی ہو، نہ جانے کتنی حدیثوں کو البانی اس جیسے احتمال کی بنیاد پر صحت کی سند عطا کرتے رہتے ہیں، پھر یہاں کیا استبعاد ہے؟۔

ماخذ: المآثر۔ جولائی تا دسمبر (۱۹۹۴ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) اشارہ ہے آیت کریمہ ''واتبع سبیل من اناب الیّ'' اور اس شخص کا اتباع کرو جو میری

طرف انابت اختیار کرے۔(سورہ لقمان)

(۲) اور واقعہ یہی ہے، کیوں کہ پہلی حدیث جیسا کہ ابن ابی حاتم نے فرمایا''منکر'' ہے، دوسری میں ولید ہیں، جنہیں ابن معین اور نسائی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، تیسری میں ایک کذاب ہے، دوسرا ہالک ہے، اور حدیث بہت کمزور ہے، اور اس میں ایک واضع حدیث بھی ہے، جس کو ابن منذر نے جھوٹا قرار دیا ہے، اور اس میں ایک مجہول بھی ہے، اور چوتھی کے بارے میں امام عراقی نے فرمایا کہ ''**اسنادہ ضعیف**'' اور پانچویں میں ایک کمزور راوی منفرد ہے۔(رقم ۳۴۳)

(۳) ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ جن نمازوں کو یہ حضرات مطلق نفل قرار دیتے ہیں، انہیں رسول اللہ ﷺ نے نماز جمعہ کے ذیل میں بیان کیا ہے، ان کی ترغیب دی ہے، نماز جمعہ ہی کے ضمن میں ان کے فضائل بیان کئے ہیں، پھر نماز جمعہ سے ان کا تعلق نہ ماننا، اور عام نوافل میں ان کا شمار کرنا، اگر عجیب نہیں تو دنیا میں کون سی چیز عجیب ہوگی؟ واقعی حیرت کی بات ہے کہ نماز ظہر سے پہلے اگر نماز کا ذکر ہوتو وہ ظہر کی سنت، نماز فجر سے پہلے اگر نماز کا تذکرہ ہوتو وہ فجر کی سنت، حتی کی نماز جمعہ کے بعد نماز کا تذکرہ ہوتو وہ جمعہ کی سنت ہو، لیکن اگر جمعہ کی نماز سے پہلے نماز کا تذکرہ ہوتو وہ جمعہ کی سنت نہیں، مطلق نفل بن جائے، ذرا اس پر غور فرمالیں، اگر غور کرنا جرم نہ ہو۔(اعجاز احمد اعظمی)

(۴) یہاں قلم پر بے ساختہ یہ بات آ رہی ہے کہ غلو ہر چیز کا گمراہ کن ہوتا ہے، اہل نجد کو توحید میں غلو ہے، اور وہم کی حد تک غلو ہے، انہیں جب کوئی ایسی حدیث یا کسی عالم و بزرگ کا کوئی ایسا قول یا عمل نظر آتا ہے، جسے وہ اپنے مزعومہ توحید کے خلاف سمجھتے ہیں، تو اس حدیث کو کمزور کرنے اور عالم و بزرگ کو گمراہ قرار دینے کے درپے ہو جاتے ہیں، حدیث مذکورہ بالا میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے زبان مبارک سے ''یا محمد'' کا لفظ ادا ہوا تو، توحید میں غلو کرنے والوں کی پیشانی پر بل پڑ گیا، یہی حال توسل بالنبی ﷺ کی حدیثوں سے بھی ان کا ہوتا ہے۔

البانی شذوذہ واخطاؤہ
از۔افادات حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ

اختلاف العلماء

تمہید:

خاکسار راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ دینی احکام جو قیامت تک آنے والی نسل انسانی کے تمام واقعات وحوادث کومحیط ہیں، جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، ان کا ثبوت قرآن کریم سے ہوتا ہے، یا سنتِ رسول اللہﷺ سے، یا اجماعِ امت سے۔اور اگر تینوں میں سے کوئی دلیل موجود نہ ہوتو قیاس سے، جو بہرحال انہیں تینوں اصولوں کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ثبوت کے اعتبار سے ان دلائل میں فرقِ مراتب ہے، قرآن کریم کا حرف حرف قطعی الثبوت ہے، کسی کلمہ اور حرف کے بارے میں اس شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ شاید یہ خدا کی طرف سے نہ ہو، اس میں تحریف وترمیم ہوگئی ہو، اسی طرح بہت سی سنتیں ہیں، یعنی رسول اللہﷺ کے اقوال واعمال اور آپ کے طریقے بطور تواتر اور تعامل کے ثابت ہیں، جن میں شبہہ کی ادنی گنجائش نہیں ہے۔دوسرے درجہ میں وہ حدیثیں ہیں جو''خبر واحد'' کہلاتی ہیں، ان کے ثبوت کے لئے رسول اللہﷺ تک راویوں کا ایک سلسلہ ہے، انہیں راویوں کے مستند ہونے کے لحاظ سے احادیث میں صحت وحسن اور ضعف وغیرہ کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔اخبارِ آحاد میں چوں کہ وہ عموم واشتہار نہیں ہوتا جس سے انہیں قطعیت کا درجہ حاصل ہو، اس لئے ان کا درجہ ثبوت کے لحاظ سے قرآن کے بعد ہے، اجماع کا درجہ اس کے بعد ہے، اور قیاس تو بالکل آخری چیز ہے، اور اس کا لحاظ اس وقت ہوتا ہے جب ان تینوں میں سے کوئی دلیل موجود نہ ہو۔یہ گفتگو تو ثبوت کے لحاظ سے ہوئی، پھر کسی حکم کو ان چاروں دلائل میں سے کسی ایک سے ثابت کرنے کے لئے الفاظ کے مفہوم ومعانی اور ان کے لوازم

وملزومات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے،اورلغت میں اس کی اصل وضع کیا ہے؟اس کالحاظ کرنا ہوتا ہے،اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت سے الفاظ کے معانی قطعی طور پر متعین ہوتے ہیں،بعض الفاظ کے معانی میں اشتباہ ہوتا ہے۔اول الذکر''قطعی الدلالت''ہوتے ہیں،اور دوسرے کی دلالت اپنے معنی پر قطعیت کے ساتھ نہیں ہوتی،اس لئے انہیں اصطلاح میں''ظنی الدلالت'' کہتے ہیں۔پھر جو مسائل قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلائل سے ثابت ہوں،ان میں تو کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے،کیونکہ ان کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہونا بالکل ایسا ہی یقینی ہے جیسا کہ دن میں سورج کا نکلا ہوا ہونا،لیکن جو احکام ومسائل دلائل قطعیہ کے علاوہ دوسرے دلائل سے ثابت ہوتے ہیں،خواہ ظنی الثبوت ہوں،یا ظنی الدلالت ہوں،تو چوں کہ ان میں انسانی غور وفکر اور انسانی کاوش کسی نہ کسی درجہ میں دخل پا جاتی ہے،مثلاً ایک لفظ قرآن میں آیا ہے،جس کے معانی لغت کے اعتبار سے مثلاً دو ہیں،اور ہر معنی کے لحاظ سے الگ حکم ثابت ہوتا ہے،اور اس جگہ دونوں معنی لینے کی گنجائش بھی موجود ہے،تو لامحالہ ایک عالم غور وفکر اور چھان بین کر کے اس کا ایک معنی متعین کرے گا،خواہ اس کا ذریعہ احادیث کی طرف رجوع کرنا ہو یا خود قرآن کے سیاق وسباق پر نظر کرنا ہو۔اور یہ طے شدہ امر ہے کہ جہاں انسانی عقل کا دخل ہوگا،تو چوں کہ عقلیں اور قویٰ ادراکیہ متفاوت ہوتے ہیں،اس لئے وہاں اختلاف ضرور ہوگا،یہیں سے مسائل شرعیہ میں رایوں کا اختلاف شروع ہوتا ہے،اور ایسا ہونا فطری امر ہے۔

ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف دیکھئے تو قرآن وحدیث میں اختلاف کی سخت مذمت وارد ہے،اس سے منع کیا گیا ہے،اور اختلاف کرنے والوں کو عذاب عظیم کی دھمکی دی گئی ہے۔یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر اختلاف برا ہے؟اگر ہر اختلاف برا ہے تو کیا یہ تمام علمائے امت جو باہم دگر مسائل شرعیہ میں اختلاف کرتے رہتے ہیں،سب گنہ گار اور اللہ کے نافرمان ہیں؟عام علمائے امت کے نزدیک تو یہ طے شدہ اور مسلم امر ہے کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے،جو مسائل دلائل قطعیہ سے ثابت نہیں ہیں،ان میں اختلاف ہوا ہے،اور اسے مذموم نہیں کہا جاسکتا۔البتہ اگر کوئی شخص ایسے مسائل کو اپنا موضوع بنا کر انہیں حق وباطل کا معیار بنادے،اور انہیں کی بنیاد پر الگ ٹولی بانٹ کر ان سے اختلاف کرنے والوں کو گمراہ اور منحرف قرار دینے لگ جائے،تو

البتہ یہ رویہ سخت مذموم اور حرام ہے، جو فطری اختلاف تھا وہ برا نہ تھا، لیکن اس فطری اختلاف کی حدود سے پھلانگ کر جو ارادی اور عنادی اختلاف پیدا کیا گیا، اس کے معصیت ہونے میں شبہہ نہیں۔

بعض لوگ اختلاف کی ان حدود کو نظر انداز کر کے ایک طرف سے اختلاف کو مذموم کہنے لگتے ہیں، اور اس سلسلہ میں وہ آیتیں پیش کرتے ہیں جن کا تعلق یا تو ایسے اختلاف سے ہے جو قطعی اور یقینی اور ایمانی اور اعتقادی امور میں کیا جاتا ہے، یا ان کا تعلق ارادی مخالفت سے ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا، اور حدود کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے نہ جانے کتنی قیامتیں کھڑی ہوئی ہیں۔

اس نظریہ کے لوگ کچھ ایسا خیال رکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے درمیان مسائل شرعیہ میں اختلاف پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن وسنت سے اعراض کیا ہے، ان کے خیال میں قرآن وسنت نقطۂ اتحاد ہے، اس کی طرف رجوع کرنے سے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔

یہ نظریہ بظاہر بہت خوش نما معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو بظاہر معلوم ہوتی ہے، اس نظریہ کے حامل بہت سے اہل علم ہوئے ہیں، مگر نہایت شدومد سے اس کو اٹھانے والے، اور ایک خاص طریقہ سے اس پر اصرار کرنے والے چندہی ہیں، جن میں گزشتہ ادوار میں علامہ ابن حزم اندلسی (۴۵۶ھ) خاص خصوصیت رکھتے ہیں، اور زمانہ حال میں شیخ ناصرالدین البانی اس کے زبردست جارح ترجمان اور داعی ہیں۔

حضرت محدث کبیر لکھتے ہیں کہ شیخ ناصرالدین البانی نے اپنی کتاب ''الاحادیث الضعیفہ'' میں ابن حزم کا ایک قول نقل کیا اور اس کو تسلیم کیا ہے کہ ''**انما الفرض علینا اتباع ماجاء به القرآن عن الله تعالىٰ الذی شرع لنا دین الاسلام وماصح عن رسول اللهﷺ الذی امره الله تعالىٰ ببیان الدین**'' (الاحادیث الضعیفہ ج۱۔ص۶۳)

ہمارا فرض ہے کہ جو کچھ قرآن میں اللہ تعالیٰ (جس نے ہمارے لئے دین اسلام کو مشروع فرمایا) نے نازل فرمایا، اور جو کچھ رسول اللہﷺ (جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی توضیح

وتشریح پر مامور فرمایا) سے صحت کے ساتھ ثابت ہے، بس اسی پر عمل کریں۔

اور یہ بھی نقل کیا کہ ''**قد نهى الله تعالىٰ عن التفرق والاختلاف بقوله تعالىٰ "ولا تنازعوا" فمن المحال ان يامر رسول الله ﷺ باتباع كل قائل من الصحابة وفيهم من يحلل الشئى وغيره يحرمه**''.

اللہ تعالیٰ نے تفرق واختلاف سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے ''**ولا تنازعوا**'' (آپس میں نزاع مت کرو) تو یہ محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمام صحابہ کے اقوال کی پیروی کا حکم دیں، کیوں کہ ایسا بھی ہے کہ ایک صحابی اگر کسی چیز کو حلال کہتا ہے تو دوسرا اسی کو حرام کہتا ہے، (لہٰذا ہر ایک کے اتباع کا حکم کیوں کر دیا جاسکتا ہے)

اس نقل وحکایت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کی پیروی میں تفرق اوراختلاف لازم آئے گا، اور قرآن وسنت کی پیروی کرنے سے اختلاف کا خاتمہ ہوجائے گا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اتباعِ سنت کی ہانک اور پکار لگانے میں علامہ ابن حزم اور شیخ البانی دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہیں، اور دونوں ایک ہی بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تفرق واختلاف سے منع فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ اس کے داعی ہیں تو ضرور ہے کہ تمام مسائل واحکام میں کم ازکم یہ دونوں کتاب وسنت ہی طرف رجوع کرتے ہوں، اوران میں اقوال رجال کا دخل نہ قبول کرتے ہوں، چنانچہ وہ اس کے مدعی بھی ہیں، تو اس کا کھلا ہوا تقاضہ ہے کہ کم از کم ان دونوں میں تفرق واختلاف نہ ہو، کیوں کہ انہیں کا دعویٰ ہے کہ کتاب وسنت کی جانب رجوع کرنے سے اختلاف مٹ جاتا ہے، مگر افسوس بھی ہے اور حیرت بھی کہ باوجود رجوع الی الکتاب والسنۃ کے خود انہیں ہی اتفاق کا سراغ نہ مل سکا، اچھا خاصا اختلاف یہاں بھی موجود ہے، مولانا نے اس کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا۔

''علامہ ابن حزم گانے بجانے اوراس کے آلات کو حلال ومباح قرار دیتے ہیں، اور البانی حرام کہتے ہیں، تو کیا یہ تحلیل وتحریم دونوں اللہ اوراس کے رسول سے ثابت ہیں، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے، تو اس سے بدتر کون سا اختلاف ہوگا''؟ اوراس صورت میں علامہ ابن حزم کی اس بات کا کیا ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس میں اختلاف نہیں ہوسکتا،

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (**ولو کان من عند غیر الله لوجدوا فیه اختلافاً کثیراً**) اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

اسی طرح ایک مشہور نزاعی مسئلہ ایک مجلس میں، یا ایک لفظ سے تین طلاق دینے کا ہے، ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ یہ تین طلاق تین ہی پڑتی ہیں، اگر چہ بعض ائمہ اسے معصیت قرار دیتے ہیں، مگر وقوع کو بہر حال تسلیم کرتے ہیں، اس کا کوئی قائل نہیں ہے کہ یہ تین طلاق تین نہیں ایک بن جائیں گی۔ اس مسئلہ میں جب علامہ ابن حزم نے کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا، تو انہیں نصوص ائمہ اربعہ کے مطابق ہی ملیں، مگر شیخ البانی کتاب وسنت پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ پاتے ہیں کہ تین طلاقیں، تین نہیں ایک بن جائیں گی۔ علامہ ابن حزم کے نزدیک ایسی مطلقہ عورت شوہر پر تاوقتِ نکاحِ زوجِ ثانی حرام رہے گی، اور شیخ البانی اسے حلال قرار دیتے ہیں، اس سے وہ رجعت کرسکتا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ۔

''کیا یہ تحلیل اور یہ تحریم دونوں حق تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ہیں؟''

کھلی بات ہے کہ اس کا جواب قطعاً اور قطعاً نفی میں ہے، **فمن این جاء الاختلاف؟ ولیس واحد منها من عند غیر الله** ۔ تو یہ اختلاف کہاں سے آیا، جب کہ دونوں نظریئے غیر اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔

غور کرنے کی بات ہے، جب اس تحریم کو علامہ ابن حزم اللہ اور رسول کی جانب سے سمجھتے ہیں تو یقیناً وہ مسلمانوں کے ذمہ لگائیں گے کہ اسے قبول اور اختیار کریں، اس کے خلاف کوئی دوسری بات نہیں کہہ سکتے ورنہ ان کے حق میں ''**ومن لم یحکم بما انزل الله فاولٰئک هم الکافرون**'' (سورہ مائدہ) اور جو اللہ کی نازل کردہ بات کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں'' کی وعید لازم آئے گی۔ اور جب شیخ البانی اس تحلیل واباحت کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سمجھتے ہیں تو ان کے لئے بھی بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ تمام مسلمانوں کو اس پر کاربند رہنے کا حکم دیں، تاکہ رسول کی مخالفت لازم نہ آئے، اور وہ مستحقِ جہنم نہ ٹھہریں، نیز وہ ''**ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الفاسقون**'' اور جو اللہ کی نازل کردہ بات کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ فاسق ہیں'' کے مصداق نہ بن

جائیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ علامہ ابن حزم تو دنیا سے جاچکے ہیں، لیکن البانی تو ماشاءاللہ زندہ وسلامت ہیں، میں انہیں سے پوچھتا ہوں کہ اگر مذکورہ بالا بات کا کوئی جواب ہے تو اسی کو صحابہ کے اختلاف کے سلسلے میں نوٹ کرلیں، اوراسی کو علامہ ابن حزم کے اس اعتراض کا جواب بھی سمجھ لیں جوانہوں نے "**اصحابی کالنجوم**" والی حدیث پر وارد کیا ہے۔

پھر ایک بات اور قابل غور ہے، اگر ان کی بات مان لی جائے کہ چوں کہ صحابہ کرام آپس میں اختلاف کرتے تھے، اس لئے ان کی پیروی کا حکم رسول اللہ ﷺ نہیں دے سکتے، تو ایک اہم سوال اس کی بنیاد پر اور بھی پیدا ہوگا، ذخیرۂ روایات میں بعض حدیثیں بھی مختلف ملتی ہیں، ایک حدیث سے ایک شئی کی حلت معلوم ہوتی ہے، اور دوسری سے اس کی حرمت! چنانچہ علامہ ابن حزم کو وہ حدیث ہی ملی ہے جس کی پیروی میں وہ معازف ومزامیر کو جائز اور مباح قرار دیتے ہیں، اور شیخ البانی کے پاس بھی احادیث ہیں جن کی روشنی میں وہ انہیں حرام کہتے ہیں، تو پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی احادیث کی اتباع کا حکم دیں، یہ محال ہے، کیوں کہ بعض احادیث ایک چیز کو حلال قرار دیتی ہیں، اور بعض اسی شئی کو حرام! آخر جو قاعدہ اختلافِ صحابہ کے باب میں ہے، وہی قاعدہ اختلافِ احادیث کے باب میں بھی ہونا چاہئے۔

شیخ البانی اپنے رسالہ "حجۃ النبی ﷺ" میں لکھتے ہیں "**ننصح لکل من اراد الحج ان یدرس مناسک الحج علی ضوء الکتاب والسنۃ.....ولان المناسک قد وقع فیھا من الخلاف (مع الاسف) ماوقع فی سائر العبادات**"۔

ہم ہر اس شخص کو جو حج کرنا چاہتا ہے، نصیحت کرتے ہیں کہ مناسکِ حج کی تعلیم کتاب وسنت کی روشنی میں حاصل کرے.......اور اس لئے کہ جس طرح دوسری عبادات میں اختلاف واقع ہوا ہے (افسوسناک بات یہ ہے کہ) اسی طرح مناسک حج میں بھی اختلاف ہوا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ البانی کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ کیا انہوں نے مناسک کا علم کتاب وسنت کی روشنی میں نہیں حاصل کیا ہے؟ اور آخر ان سے پہلے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے بھی تو اسی روشنی میں مناسک کا علم سیکھا ہے، پھر کیا نتیجہ نکلا، یہی تو! کہ دونوں کے

درمیان اختلاف ہوا۔(ملاحظہ ہو''حجۃ النبی ﷺ''ص۹۰،۹۸،۱۳۳)

اسی طرح شیخ البانی نے،علامہ ابن قیم نے،اورعلامہ ابن حزم نے عبادات ومعاملات کے بہت سے ابواب کا مطالعہ کتاب وسنت کی روشنی میں کیا،لیکن یہ مطالعہ انہیں آپس کے اختلاف وانتشار سے نہ بچاسکا۔کتنے ہی مسائل میں ان سب کا باہم اختلاف ہے،مثلاً ایک مجلس کی تین طلاق ہی کا مسئلہ لے لیجئے،علامہ ابن تیمیہ،علامہ ابن قیم،اورشیخ البانی تینوں اس بات کے قائل ہیں کہ اس صورت میں شوہر رجعت کرسکتا ہے،لیکن علامہ ابن حزم کہتے ہیں کہ رجعت نہیں کرسکتا،اورمثلاً علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ مسّ ذکر کے بعد وضوکرنا مستحب ہے،اورالبانی کہتے ہیں کہ واجب ہے،اورمثلاً علامہ ابن تیمیہ ابوداؤد کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا ضروری ہے،اورشیخ البانی فرماتے ہیں کہ اس پرعمل کرنا جائزنہیں ہے۔

اورمثلاً علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ مقیم ہونے کی حالت میں دونمازوں کوایک وقت میں جمع کرنا رسول اللہ ﷺ کا طریقہ نہیں ہے،اورالبانی فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے(الصحیحہ رقم ۱۶۴)اورمثلاً علامہ ابن تیمیہ اورعلامہ ابن قیم قرآن وسنت سے استدلال کرتے ہیں کہ تین مجموعی طلاق بدعت ہے،اورابن حزم قرآن وسنت ہی سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ سنت ہے۔

یہ سارے مطالعے اور یہ ساراعلم کتاب وسنت ہی کی روشنی میں حاصل کیا گیا ہے،لیکن اس کے باوجودان لوگوں کونقطۂ اتحاد ہاتھ نہیں لگ سکا،اورتحلیل وتحریم،اباحت وکراہت،اورسنت وبدعت کا اختلاف ہوکررہا۔اب یاتو یہ کہا جائے کہ یہ تحقیقات کتاب وسنت کی روشنی میں نہیں ہوئیں،لیکن ایسا کہنا ممکن نہیں،کیوں کہ یہ سب حضرات اسی کے داعی ومنادی ہیں،اوران کے ماننے والے انہیں کتاب سنت کی علامت سمجھتے ہیں،یا یہ سمجھا جائے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں مطالعہ کے بعدبھی اتنا اہم اورزمین وآسمان کا اختلاف پیدا ہوسکتا ہے،اوراسے تسلیم کرلیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ سببِ اختلاف یہ نہیں ہے کہ کسی نے یا ہرایک نے کتاب وسنت سے انحراف کیا ہے۔

بات درحقیقت یہی ہے کہ علمائے امت باوجودیکہ اپنا نصب العین قرآن وسنت ہی کو بناتے ہیں،تاہم اختلاف پھربھی پیدا ہوکررہتا ہے،اوراگرکوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اختلاف پیدا

ہونے کی علت محض قرآن وحدیث سے اعراض واغماض ہی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے بھیجے میں عقل نام کوئی شئی نہیں ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ:

"انما السبب الوحيد ة لهٰذ االاختلاف هو عدم مساواة الناس بعضهم بعضاً في العقل والفهم وتفاضلهم في ثقوب النظر وشحاذة الذهن وتوفرمراد الاجتهاد وآ لاته وهذا من فطرة الله اللتي فطر الناس عليها".

اس اختلاف کا واحد سبب یہ ہے کہ لوگوں کی عقل وفہم میں بڑا فرق پڑتا ہے، نظر کی گیرائی، ذہن کی تیزی، اور شرائطِ اجتہاد کی فراہمی کے لحاظ سے ہر ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے، یہ ایک فطری بات ہے، اسی فطرت پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتیں خوب جانتے ہیں۔

شیخ البانی اپنی کتاب "الصحیحہ" میں لکھتے ہیں کہ:

"بعض مذاہبِ فقہیہ میں سنت اور قیاس صحیحہ کے خلاف جو بعض اقوال پائے جاتے ہیں، ان کا کھلا ہوا اقتضا یہ ہے کہ ایک صاحبِ بصیرت مومن جو اپنے اوپر رحم کی نگاہ رکھتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ اپنی عقل وفکر اور عقیدہ ونظریہ کی لگام کسی غیر معصوم کے ہاتھ میں نہ دے، خواہ وہ علم وتقویٰ اور صالحیت کے کتنے ہی اونچے مقام پر کیوں نہ فائز ہو، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ جس کتاب وسنت سے ان علما وائمہ نے مسائل واحکام کا علم حاصل کیا ہے، وہیں سے یہ بھی حاصل کرے، اگر اس میں اس کی اہلیت ہو، ورنہ جو اس کا اہل ہو اس سے پوچھے"۔ (ج ۱۔ ص ۱۴۳)

خیر اللہ بھلا کرے، علامہ البانی نے اتنا تو تسلیم کیا کہ ائمہ کرام نے کتاب وسنت ہی سے احکام ومسائل اخذ کئے ہیں، لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ جب اس کے باوجود ان سے سنت کے خلاف اقوال صادر ہوئے ہیں تو کیسے اطمینان کرلیا جائے [کہ] اس صاحبِ بصیرت مومن سے سنت کے خلاف کوئی قول وعمل صادر نہ ہوگا؟ کیا آپ مجھے کسی ایسے صاحبِ بصیرت مسلمان کا پتہ بتا سکتے ہیں، جو ہمارے زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم سے بڑھ کر دیدہ ور، متقی اور

پرہیزگار ہو،تو یہ لوگ جبکہ انہوں نے اپنی زمامِ فکر کسی غیر معصوم کے ہاتھ میں نہیں پکڑائی،اس کے باوجود سنت کی مخالفت سے نہ بچ سکے،تو بھلا ہمارے دور میں کوئی مسلمان اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟۔

کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب علامہ ابن قیم نے فرمایا کہ ’’جمع بین الصلاتین‘‘ مقیم ہونے کی حالت میں رسول اللہﷺ کا طریقہ نہیں تو آپ نے اعتراض کر دیا اور لکھا کہ یہ قول سنت کے خلاف ہے،اس لئے کہ رسول اللہﷺ سے حالتِ نزول میں جمع بین الصلاتین ثابت ہے۔اور کیا آپ بھول گئے کہ علامہ ابن تیمیہ نے جب یوم عرفہ میں غسل کرنے کو رسول اللہﷺ سے منقول بتایا تو آپ نے کہہ دیا کہ یہ بدعت ہے۔اسی طرح علامہ ابن حزم نے بھی کسی غیر معصوم کو اپنی فکر کی قیادت نہیں سونپی،لیکن اس کے باوجود (بقول آپ کے) وہ بھی سنت کی مخالفت سے بچ نہ سکے۔چنانچہ انہوں نے معازف اور مزامیر کو مباح قرار دیا۔آپ نے لکھا کہ بکثرت احادیث میں جن میں بعض صحیح ہیں،یہ مضمون وارد ہے کہ گانے بجانے کے آلات حرام ہیں،اور ابن حزم سے غلطی ہوئی ہے۔اور یہ بھی لکھا کہ ابن حزم باوجود اپنے علم وفضل اور کمالِ عقل وفہم کے فنِ حدیث اور طرق وروات کے باب میں ذرا کمزور ہیں۔

علامہ ابن حزم کے متعلق شیخ البانی نے فن حدیث کے اندر ان کی کمزوری بیان کر کے اپنی بات کا ایک جواز پیدا کر لیا،لیکن وہ حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟ کیا وہ بھی فن حدیث میں کوتاہ اور قاصر تھے؟ اور کیا انہیں احادیث کے طرق اور ان کے روات کا کافی علم نہ تھا؟ اب شیخ البانی کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان دونوں بزرگوں کو بھی ابن حزم کی صف میں شمار کریں،اور ان کے حق میں بھی وہی بات کہیں جو ابن حزم کے حق میں کہہ چکے ہیں،یعنی فن حدیث میں وہ ناتمام ہیں۔اور البانی کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شاید ایسا ہی گمان کرتے ہیں۔چنانچہ حافظ ابن تیمیہ کی مرتب کردہ کتاب ’’الکلم الطیب‘‘ کی تعلیقات کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں کہ:

’’میں اس شخص کو جو اس کتاب سے واقف ہے،اور دوسروں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ اس کتاب میں جو حدیثیں ذکر کی گئی ہیں ان پر بغیر تحقیق وتفتیش کے عمل نہ کرے،اور ہم نے اس

پر تعلیقات وحواشی لکھ کر اس کی تحقیق کا راستہ سہل کر دیا ہے، تو جو کچھ اس میں ثابت ومحقق ہے (یعنی علامہ البانی نے اپنی وسعت علم سے جس کو محقق وثابت کر دیا ہے) اس پر تو عمل کرو، اور باقی کو ترک کر دو''۔(ص۔۱۶)

اسی طرح کی ایک بات انہوں نے علامہ ابن حزم کے بارے میں بھی ایک جگہ کہی ہے

''مناسب یہ ہے کہ حدیث کی اچھی طرح تحقیق کر لی جائے، کہ وہ پایۂ صحت تک پہونچتی اور شذوذ سے خالی ہے یا نہیں؟ جبھی اس پر عمل کیا جائے''۔

شیخ البانی کی ان نصیحتوں سے ان کی اس پوشیدہ خواہش کا احساس ہوتا ہے کہ احادیث کی تحقیق وتفتیش اور ان کی تصحیح وتحسین اور تضعیف کے سلسلے میں مومنِ بصیر انہیں طرف رجوع کرے، اور اپنی زمامِ فکر انہیں کے حوالے کر دے، کیوں کہ اگر وہ خود اس کی کوشش اپنے طور کرے گا تو یقیناً سنت کے خلاف کسی وادی میں جا پڑے گا، اس لئے سلامتی کی راہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ وہ شیخ البانی سے علم وتحقیق کی دریوزہ گری کرے۔ اس ساری بحث کے پس منظر میں ان کا یہ قول پڑھئے۔

''**والا سأل المتاهلين لذ الک**'' تو اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اہل محض شیخ البانی ہیں، کیوں کہ جب ابن تیمیہ اہل نہیں ہیں، ابن قیم اہل نہیں ہیں، ابن حزم اہل نہیں ہیں، تو شیخ البانی کے علاوہ کون اہل ہوگا؟۔

روضۂ اطہر نبوی کی زیارت کے لئے سفر:

زیارتِ قبور کی علی العموم اجازت ہے، بلکہ اس کا استحباب ثابت ہے، اور رسول اکرم ﷺ کی قبر کی زیارت تو ایک کارِ عبادت اور بہترین باعث اجر وثواب ہے، اس مسئلے میں علامہ ابن تیمیہ سے پہلے کوئی قابل ذکر اختلاف نہ تھا، اسی لئے فقہا زیارتِ قبرِ نبوی کے آداب وغیرہ اپنی کتابوں میں بیان کرتے ہیں، حافظ ابن تیمیہ نے سب سے پہلے اس مسئلے میں شد ومد سے کلام کیا۔ قبر نبوی کی زیارت کو تو وہ بھی جائز قرار دیتے ہیں، مگر اس کے لئے سفر کرنے کو بدعت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شیخ البانی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''علامہ ابن تیمیہ رسول اکرم ﷺ کی قبر اطہر کی زیارت کی مشروعیت واستحباب کے قائل

ہیں، بشرطیکہ اس میں خلافِ شریعت کوئی عمل اور بدعات وغیرہ نہ شامل ہوں، مثلاً صرف اسی کی نیت سے سفر نہ ہو، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے عام ہے۔"**لاتشدوا الرحال الا الیٰ ثلثة مساجد**" سفر کا قصد صرف تین مسجدوں کے لئے کیا جاتا ہے، اس کا مستثنیٰ منہ صرف مساجد نہیں ہیں، بلکہ ہر وہ جگہ ہے جہاں بہ نیت ثواب حاضر ہوا جائے، خواہ مسجد ہو یا قبر ہو، یا کچھ اور۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک بار طور پہاڑ پر تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی میں حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہیں؟ فرمایا طور سے، بصرہ نے فرمایا کہ اگر جانے سے پہلے مجھ سے ملاقات ہوگئی ہوتی تو آپ نہیں جاتے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے "**لاتعمل المطی الا الیٰ ثلثة مساجد**" سواریوں کو تین مسجدوں کے علاوہ کہیں اور کے لئے کام میں نہیں لایا جاتا، اس کو امام احمد وغیرہ نے سند صحیح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (الضعیفہ۔ص ۶۴)

مولانا فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو بدعت قرار دینا ایک نئی بات ہے، اور علامہ ابن تیمیہ کے ان اقوال میں ہے جن کا شمار ان کے شذوذ اور تفردات میں ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کے زمانہ میں قبروں کی تعظیم وتکریم اور بزرگوں کے مزارات پر حاضری اور اس سلسلہ کی بدعات مسلمانوں میں بہت پھیل گئی تھیں، علامہ ابن تیمیہ نے ان خرافات پر شدت سے نکیر کی، لیکن وہ اس میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ قبر نبوی کے لئے بھی سفر کرنے کو بدعت کہنے لگے، پھر ان کے شاگردوں نے اور بعد کے سلفی کہلانے والوں نے اس قول میں ان کی تقلید کی۔ یہ سلفی حضرات تو تلاش کر کر کے ان کی منفرد اور شاذ رایوں کی تقلید کرتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ اس مسئلہ میں ایسے مجتہد ہیں، جن کا اجتہاد غلط ہے، اس لئے وہ ایک ثواب کے مستحق ہیں، لیکن ان کے متعصب مقلدین جو ان کے اقوال کو نصِ قطعی کا درجہ دیتے ہیں، اس غلطی میں ان کی تقلید کرنے کی وجہ سے گنہگار ہیں۔

اگر یہ مقلدین تھوڑی دیر کے لئے ابن تیمیہ کی تقلید سے چھٹکارا حاصل کر کے اس باب کی حدیثوں پر غور کرتے تو ان کے سامنے نصف النہار کی طرح یہ بات آجاتی کہ یہ حدیثیں ان کے دعویٰ پر قطعاً دلالت نہیں کرتیں۔

اول تو اس لئے کہ "**لا تشدالرحال الاالیٰ ثلثة مساجد**"، میں مستثنیٰ منہ صرف

مساجد ہیں، یعنی تینوں مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے یا وہاں بہ نیت ثواب جانا منع ہے، یہ نہیں کہ تین مسجدوں کے علاوہ کہیں اور کا سفر کرنا ہی ممنوع ہے، کیوں کہ جب کہیں استثنا ہوتا ہے تو بے تکلف ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہوگا۔[۱]

اور یہ قطعاً معقولیت کے خلاف ہے کہ مستثنیٰ منہ کو عام مان لیا جائے، جس کے نتیجے میں تجارت کے لئے، طلب علم کے لئے، جہاد کے لئے، دوستوں سے ملاقات کے لئے، سفر کرنا سب ممنوع ہو جائے گا، پھر اس میں تخصیص کر کے ان جائز اور عبادت کے اسفار کو اس میں سے خارج کیا جائے، آخر کون نہیں جانتا کہ مذکورہ بالا مقاصد کے لئے سفر کرنا مباح یا کار ثواب ہے۔

اور ایک حدیث میں تو صراحۃً مستثنیٰ منہ مساجد کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے شہر بن حوشب کے طریق سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو سعید کی خدمت میں طور پر نماز پڑھنے کا ذکر آیا، تو میں نے سنا، وہ فرمانے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "**لاینبغی للمصلی ان یشد رحاله الیٰ مسجد یبتغی فیه الصلاة غیر المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی هذا**" کسی نماز پڑھنے والے کے لئے مناسب نہیں ہے کہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سفر کرے سوائے مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد کے"۔ (فتح الباری۔ ج ۳۔ ص ۴۳)

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ شہر بن حوشب حسن الحدیث ہیں، اگر چہ ان میں قدرے ضعف ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی بعض حدیثوں کو حسن قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "المطالب العالیہ" حدیث ۳۵۲۶) اور البانی نے بھی بطور شاہد کے ان کی ایک حدیث کو حسن قرار دیا ہے، (ملاحظہ ہو، الصحیحہ ج ۱۔ ص ۴۷/ رقم ۳۶)

ہاں یہ سوال ہے کہ حضرت بصرہ ابن ابی بصرہ نے حضرت ابو ہریرہ کے سفر طور پر اعتراض کیا، اور اس کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پیش کیا کہ "**لاتعمل المطی الا الیٰ ثلاثة مساجد**" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستثنیٰ منہ عام ہی سمجھتے تھے، لیکن یہ بات نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا سفر کوہ طور پر نماز پڑھنے کے لئے ہوا تھا، تو وہاں مسجد نہ بھی ہوتی تو بھی نماز کی نیت کی وجہ سے وہ مسجد کے حکم میں ہوتا، چہ جائیکہ وہاں مسجد موجود ہے، جیسا کہ مجم

البلدان میں مذکور ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ سفر کوہ طور کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے تھا، اس کے دلیل یہ ہے کہ عمر بن عبدالرحمان حضرت ابوبصرہ سے نقل کرتے ہیں کہ طور سے واپسی میں حضرت ابوہریرہ کی ان سے ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا، آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ فرمایا کوہ طور سے آرہا ہوں، وہاں میں نے جا کر نماز پڑھی ہے۔(**رواہ احمد والبزار والطبرانی فی الکبیر والاوسط ورجال احمد ثقات اثبات قالہ الھیثمی فی الزوائد ج۴۔ص۳**)

اور مرثد بن عبداللہ الیزنی حضرت ابوبصرہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کی ملاقات حضرت ابوہریرہ سے اس وقت ہوئی جب وہ کوہ طور کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نکل چکے تھے۔(اخرجہ احمد واسنادہ حسن، الزوائدج٦۔ص۳۹۷)

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ صحابہ نے اس حدیث کے مستثنیٰ منہ کو عام نہیں سمجھا ہے۔اور شیخ البانی کا ان کے عام سمجھنے کی دلیل میں اس روایت کو پیش کرنا قطعاً غلط ہے، اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

دوسری وجہ اس حدیث کے مدعا پر دلیل نہ ہونے کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ”**لاتشد الرحال یا لاتعمل المطی**“ فرمایا ہے، اور یہ دونوں خبر کے صیغے ہیں، مگر معنی ان کا ”نہی“ کا ہے۔”شدرحال“ کو منع فرمارہے ہیں، اگر یہ صیغہ صراحۃً نہی کا ہوتا تو بھی اس کا مدلولِ اصلی یعنی تحریم مراد نہ ہوتا، اس کی کئی وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ کہ اس حدیث کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی حدیث ”مجمع الزوائد“ میں موجود ہے، لیکن اس سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا [کہ] مذکورہ تینوں مسجدوں کے علاوہ کسی اور جگہ کے لئے سفر کرنا حرام ہے، کیوں کہ مصنف عبدالرزاق میں حضرت عمر کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ”**لوکان مسجد قباء فی افق من الآفاق ضربنا الیہ اکباد المطی**۔(ج۵۔ص۱۲۳)

اگر مسجد قبا کہیں دور دراز ہوتی جب بھی ہم اپنی سواریاں لے کر وہاں پہونچ جاتے۔تو جب مسجد قبا کے واسطے انہوں نے سفر کو جائز قرار دیا، جب کہ وہ مذکورہ تینوں مسجدوں سے الگ

ہے،تو اسی سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ’’لاتشدالرحال‘‘ کا مطلب ہرگز یہ نہیں سمجھا ہے کہ ان تینوں مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی جانب ’’شد رحال‘‘ حرام ہے۔معلوم ہوا یہاں نہی اپنے اصل معنی یعنی تحریم کے لئے نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی روایت کرتے ہیں، یعنی وہ اس حدیث سے باخبر تھے،لیکن انہوں نے اس کے باوجود طور کا سفر اختیار کیا،اور وہاں جا کر نماز پڑھی،اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبصرہ نے فرمایا کہ میری ملاقات حضرت ابو ہریرہ سے اس وقت ہوئی جب مسجد طور میں نماز پڑھنے کے لئے نکل چکے تھے، میں نے ان سے کہا کہ نکلنے سے پہلے اگر میری ملاقات ہوجاتی تو آپ یہ سفر نہ اختیار کرتے، انہوں نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سنا ہے۔لاتشدالرحال۔

حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے،اور ملاحظہ فرمائیے،حضرت ابوبصرہ یہ نہیں فرمارہے ہیں کہ طور پر مت جایئے، مدینہ لوٹ جایئے،اسی طرح راوی یہ بھی نہیں بیان کرتا کہ انہوں نے اپنا ارادہ فسخ کردیا،اور واپس لوٹ گئے، بلکہ دوسرے طریق میں ہے کہ بصرہ ابن ابوبصرہ سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ کوہ طور پر نماز پڑھ کر وہاں سے لوٹ کر آرہے تھے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث ان الفاظ سے بھی مروی ہے کہ ’’**خیر ما رکبت الیه الرواحل مسجد ابراهیم علیه السلام ومسجدی(رواه احمد والطبرانی من حدیث جابر واسناده حسن،ورواه البزار ایضاً وفیه ابو الزناد وقد وثقه غیر واحد وضعفه جماعة وبقیة رجاله رجال الصحیح قاله الهیثمی۔ج۳۔ص۴۰۳)**

یعنی جہاں کے لئے سفر کیا جاسکتا ہے ان میں سب سے بہتر جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسجد ہے،اور میری مسجد ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس حدیث کی روایت ان الفاظ میں کرتی ہیں۔’’**احق المساجد ان یزار وتشد الیه الرواحل المسجد الحرام ومسجدی(رواه البزار وفیه موسیٰ بن ابی عبیده الزیدی وهو ضعیف)**

یعنی مساجد کے لئے سفر کئے جانے کی حق دار سب سے زیادہ مسجد حرام ہے،اور میری

مسجد ہے۔

ان دونوں روایتوں سے ثابت ہوا کہ مذکورہ تینوں مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنا بھی خیر سے خالی نہیں ہے اگر چہ زیادہ افضل اور بہتر انہیں تینوں مسجد کے لئے ہے۔

اور حضرت سعید بن میسّب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ''تشدالرحال الٰی ثلٰثۃ الخ''اور سعید ابن سعید کے طریق سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔ (مصنف عبدالرزاق۔ج ۵۔ص۱۳۲،واحمد بن عیینہ۔ج ۲۔ص ۲۳۸) یعنی تین مسجدوں کے واسطے سفر کیا جاتا ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رسول اللہ ﷺ کا فرمان ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ **''تشد الرحال الیٰ ثلٰثة مساجد''** (اخرجہ عبدالرزاق) ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ مذکورہ تینوں مسجدوں کے لئے سفر کرنا مطلوب اور مستحب ہے،اور ان کے علاوہ کسی اور مسجد کی جانب سفر کرنے کے حکم سے یہ حدیثیں ساکت ہیں۔

اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔**''لا ینبغی للمصلی ان یشد رحالہ''**. **لاینبغی** (مناسب نہیں ہے) کا لفظ ہے،اگر چہ کبھی کبھی حرام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے،لیکن حرام کے لئے صریح نہیں ہے،کیوں کہ خلاف اولی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے،جیسا کہ ریشم کے حرام ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔**''لاینبغی ھذا للمتقین''**. (متقیوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے)

چوتھی وجہ یہ ہے کہ مسند بزار میں خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں جب طور سے لوٹا تو جمیل بن بصرہ سے میری ملاقات ہوئی،انہوں نے پوچھا،کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ میں نے کہا طور سے،انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میری اس مسجد میں نماز پڑھنا دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نماز سے افضل ہے،تو اگر آپ اسی مسجد میں نماز پڑھتے تو بہتر ہوتا۔

ملاحظہ کیجئے،حضرت جمیل نے طور کے سفر کو حرام نہیں فرمایا بلکہ انہیں یاد دلایا کہ مدینہ کی مسجد میں نماز زیادہ افضل ہے۔اور یہ جمیل وہی ابو بصرہ غفاری ہیں جو اس حدیث کے راوی ہیں۔

پس بلاشبہہ یہ بات ثابت ہوگئی،اوراس میں شک کی ذرابھی گنجائش نہیں ہے کہ صحابہ کرام ''**لا تشدالرحال**'' سے مذکورۃ الصدر مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد میں سفر کر کے جانے کو حرام نہیں سمجھتے تھے۔بس وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ ان تینوں مسجدوں میں سفر کر کے پہونچنا دوسری جگہوں کے مقابلے میں افضل ہے،اگرچہ کوئی اور مسجد بہت مقدس اور بابرکت ہو،لیکن یہ تینوں ان سے بڑھ کر ہیں،اوراپنے احباب واصحاب کو افضل کے اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے۔اور بعض اوقات تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس کی زیارت کے واسطے سفر کرنے پر بھی شدید نکیر فرماتے تھے۔چنانچہ ''مصنف عبدالرزاق'' میں ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس دوآدمی آئے،آپ نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ان دونوں نے عرض کیا کہ بیت المقدس سے،اتنا سننا تھا کہ انہوں نے درہ اٹھایا،اورفرمایا،بیت اللہ کی طرح اس کا بھی سفر کیا جاتا ہے؟ان دونوں نے عرض کیا کہ ہم فلاں جگہ سے آرہے تھے،بیت المقدس کے پاس سے گزرہوا تو ہم نے اس میں نماز پڑھی،فرمایا تب ٹھیک ہے۔

کیا حضرت عمر کے اس عمل اوران کی سرزنش کی وجہ سے کوئی سمجھ لے گا کہ وہ بیت المقدس کے لئے سفر کرنے کو حرام خیال کرتے تھے،حالانکہ خود انہوں نے بھی اوردوسروں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس کا استحباب نقل کیا ہے،اوراس میں نماز پڑھنے کی فضیلت پر متعدد احادیث وارد ہیں۔ہرگز نہیں،حضرت عمر کا مقصود یہ ہے کہ اس کے ساتھ بیت اللہ جیسا معاملہ نہ کیا جائے،یعنی بیت اللہ کی طرح اس کا بھی حج نہ شروع ہوجائے،اورکثرت سے اس کا سفر نہ ہونے لگے،اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو کعبہ مقدسہ کے مساوی سمجھ لیا جائے،اگر یہ مطلب نہ سمجھا جائے تو ان کے خلاف خود ان کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت دلیل بنے گی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔''**انما تشد الرحال الیٰ ثلٰثة مساجد مسجد الحرام ومسجد النبی ﷺ والمسجد الاقصی**''۔

اورشیخ البانی نے یہ جو کہا ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے بارے میں کہیں یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے کسی قبر کی زیارت کے لئے سفر کیا ہو،تو اس کا جواب یہ ہے کہ منقول نہ ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ انہوں نے کبھی اس مقصد سے سفر کیا ہی نہ ہو؟اسی طرح اس کا منقول

نہ ہونا اس کی حرمت کو بھی مستلزم نہیں ہے،اور منقول نہ ہونا کچھ قابل تعجب نہیں ہے، کیوں کہ کسی مخصوص قبر کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہے کہ اس کی زیارت کا اہتمام ہوتا،بس عام حدیث ہے کہ قبروں کی زیارت کرو۔لہٰذا قبر کی زیارت مطلقاً مستحب ہے،خواہ سفر کر کے ہو،یا بغیر سفر کئے۔اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر تمام قبروں سے افضل ہے،اور بلاشبہہ وہ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں،اس لئے ان کی قبر اطہر کی زیارت بہترین زیارت ہے، بلکہ ایک معنی کر کے گویا نبی ﷺ کی زندگی کی زیارت کی طرح ہے،اگر چہ ہم محسوس نہ کرسکیں۔

ماخذ: المآثر۔جولائی،اگست،ستمبر(۱۹۹۴ء) تا۔اکتوبر،نومبر،دسمبر(۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس پر دلیل کا مطالبہ کرنا درحقیقت بدیہات کا منہ چڑانا ہے،آخر کون نہیں جانتا کہ جب کوئی شخص کہے کہ میرے پاس سو روپئے کے علاوہ کچھ نہیں ہے،تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بس اتنا ہی روپیہ ہے،اس سے زائد روپئے نہیں ہیں،اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ تمہارے پاس تو لباس بھی ہے، جوتے بھی ہیں، ہاتھ پاؤں بھی ہیں،مکان جائداد بھی ہے،تو آپ خود خیال کیجئے کہ ایسا شخص کہاں پہونچنے کا مستحق ہے؟اسی طرح جب یہ کہا گیا کہ تین مسجدوں کے علاوہ کہیں کے لئے سفر نہیں کیا جاسکتا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کسی اور مسجد کے لئے سفر نہیں ہوگا،اب اگر کوئی کہے کہ اس حدیث سے طلب علم کے لئے سفر کرنا،تجارت کے لئے سفر کرنا،والدین سے ملاقات کے لئے سفر کرنا،سب ممنوع ہوگیا،صرف تین مسجدوں کے لئے سفر ہوسکتا ہے،تو آپ خود سوچ لیجئے،اس میں کتنی معقولیت ہوگی؟۔(اعجاز احمد اعظمی)

سنن مؤکدہ کی اہمیت

''حضرت اقدس محدث کبیر علیہ الرحمہ کے مسودات میں ایک مختصر رسالہ سنت مؤکدہ کے موضوع پر عربی زبان میں دستیاب ہوا، آج کل عرب ممالک میں اوران کی تقلید میں ہمارے یہاں بھی بعض حلقوں میں نماز سے پہلے اور بعد کی سنتوں کی اہمیت گھٹادی گئی ہے، بہت سے لوگ بغیر کسی عذر کے محض فرائض پر اکتفا کرتے ہیں، اور سنتوں کو ترک کردیتے ہیں۔اس سلسلہ میں کوئی شیخ محمد نور مکی مرحوم تھے، انہوں نے رسالہ بھی تحریر کیا، جس میں انہوں نے سنن مؤکدہ کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی، حضرت مولانا نے اس کے پڑھنے کے بعد یہ رسالہ تحریر فرمایا، خاکسار کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کہیں شائع ہوا ہے یا نہیں؟ بندہ اس کا ترجمہ پیش کرتا ہے''۔

الحمد لله و كفىٰ و سلام على عباده الذين اصطفىٰ .اما بعد

میں نے مرحوم شیخ محمد نور مکی کا رسالہ بغور پڑھا، مجھے محسوس ہوا کہ اس رسالہ کو پڑھ کر سنن م۔کدہ کی اہمیت نگاہوں سے جاتی رہے گی، اور قلوب میں ان کی جو عظمت ووقعت ہے وہ محو ہوجائے گی، نظروں سے ان کا مرتبہ ساقط ہوجائے گا، اور نمازیوں کو جرأت ملے گی کہ جب چاہیں وہ ان سنتوں کو ترک کردیں، لیکن یہ بات رسول اللہ ﷺ کی منشاء ومرضی کے خلاف اور آپ کی تعلیم کے بالکل برعکس ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ان سنتوں کو ہمیشہ ادا کرتے تھے۔ تفصیل حضرت ابوامامہ اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آرہی ہے۔رسول اللہ ﷺ بعض سنتوں کی تو بہت تاکید فرماتے تھے، اور بعض کی مختلف طرح سے ترغیب دیتے تھے، اس سلسلہ میں احادیث کی تلاش وتتبع سے صاف پتہ چلتا ہے، اور اس میں ذرا بھی شبہہ باقی نہیں

رہتا کہ رسول اللہ ﷺ نہ تو ان کے ترک سے راضی ہیں، اور نہ ہی ان میں کوتاہی کرنے کو روا رکھتے ہیں، خواہ کوتاہی کرنے والے کو گنہگار قرار دیا جائے یا گنہگار نہ سمجھا جائے، لیکن بہر کیف حضور ﷺ اس پر راضی نہیں ہیں، ایسی صورت میں کسی مسلمان کو زیبا نہیں کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی مرضی کے خلاف کوئی سعی و کاوش کرے۔

ہوسکتا ہے کہ مصنف کے حق میں یہ عذر بیان کیا جائے کہ بہت سے مزدور اور ملازم محض اس وجہ سے فرائض کو بھی ترک کر دیتے ہیں کہ یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ صرف فرائض کا ادا کرنا کافی نہیں ہے، جب تک ان کے ساتھ سنتوں کو ادا نہ کیا جائے، تو جب انہیں سنتیں ادا کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تو وہ ان کے ساتھ فرائض کو بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اس خیال کی اصلاح کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا ہے، لیکن یہ عذر صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر یہی مقصد تھا تو عام پھیلے ہوئے خیالات کی اصلاح کرنی چاہئے، انہیں یہ بتانا چاہئے تھا کہ فرائض کا ادا کرنا تو قطعی ضروری ہے، خواہ سنت پڑھنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ ملازمت اور کام کے اوقات میں سنت پڑھنے کی گنجائش نہیں ملتی تو ان اوقات میں صرف فرائض ادا کر لیا کرو، اور جب وقت میں گنجائش میسر آئے تو سنتیں بھی پڑھا کرو۔ اگر مؤلف مرحوم یہ طرز اختیار کرتے تو سنتوں کا حق بھی ادا ہو جاتا، اور ملازمت میں مشغول افراد کے لئے کام کے اوقات میں سہولت بھی میسر آجاتی۔

احادیث میں سنن کا ذکر:

یہاں ہم چند ایسی احادیث ذکر کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شریعت کی نگاہ میں ان سنتوں کا کیا مقام ہے۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "**رکعتا الفجر خير من الدنيا وما فيها**". (مسند احمد، مسلم، ترمذی ج ا۔ ص ۳۲۰)

فجر کی دو رکعت (سنت) دنیا سے جو کچھ دنیا میں ہے، اس سے بہتر ہے۔

(۲) **لم يكن النبي ﷺ على شئى من النوافل اشد تعاهد ا منه على ركعتى الفجر**". (بخاری و مسلم)

رسول اللہ ﷺ فجر کی سنتوں کی جس قدر پابندی فرماتے تھے اتنی کسی اور نفل کی پابندی

نہیں فرماتے تھے۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی سنتیں کس قدر افضل ہیں اوران کی پابندی کتنا پسندیدہ اوران میں کوتاہی کرنا کتنا مکروہ ہے (نیل الاوطار ۱۷/۳

(۳) **لا تدعوا رکعتی الفجر ولو طردتکم الخیل** (احمد، ابوداؤد)۔

فجر کی سنتیں نہ چھوڑو، خواہ تمہیں گھوڑے روندڈالیں۔

علامہ شوکانی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ فجر کی سنت واجب ہو، کیوں کہ جب اس کے ترک سے ممانعت وارد ہوئی تو اس کا حقیقی معنی یہ ہوا کہ وہ حرام ہے.....گھوڑوں کے روندنے کی حالت تو وہ ہے کہ اس میں واجبات کے ترک کی گنجائش نکل آتی ہے، لیکن اس حالت میں بھی فجر کی سنت ترک کرنے کی ممانعت امام حسن بصری علیہ الرحمہ کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ یہ دورکعت صرف سنت نہیں بلکہ واجب ہیں۔ (نیل الاوطار ۱۶/۳)

(۴) **لاتدعوا رکعتین اللتین قبل صلوٰۃ الفجر فان فیھا الرغائب** (مجمع الزوائد ۱۷/۲

نماز فجر کے پہلے کی دورکعت نہ چھوڑو، ان میں حق تعالی کی طرف سے بڑی نوازشیں ہیں۔

(۵) **اوصانی خلیلی برکعتی الفجر فان فیھا رغائب الدھر** (مجمع الزوائد ۲۱۸/۲)

میرے خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے فجر کی دورکعت سنت کی تاکید فرمائی ہے کہ اس میں زمانہ بھر کی بخششیں ہیں۔

(۶) **من ثابر علی ثنتی عشرۃ رکعۃ من السنۃ بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ اربع رکعات قبل الظھر ورکعتین بعدھا ورکعتین بعد المغرب ورکعتین بعدالعشاء ورکعتین قبل الفجر.** (ترمذی شریف)

جوشخص بارہ رکعت سنتوں پر مداومت کرے گا اس کے لئے اللہ تعالی جنت میں ایک گھر تعمیر کریں گے، چار رکعت ظہر سے پہلے، دورکعت اس کے بعد، دو رکعت مغرب کے بعد، دورکعت عشاء کے بعد، دورکعت فجر سے پہلے۔

اسی مضمون کی روایت حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

(۷) عن ابی امامة قال:صلیت مع رسول اللهﷺعشر سنین فکانت صلوته کل یوم عشر رکعات،رکعتین قبل الفجر الخ. (مجمع الزوائد۲/۲۳۱)

(۸) من صلیٰ اربع رکعات قبل الظهر واربعاً بعدها حرمه الله علی النار.

علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ظہر کے قبل اور بعد چار چار رکعتوں کے استحباب کی تاکید معلوم ہوتی ہے،اور اس پر عمل کرنے کے لئے اتنی ترغیب کافی ہے۔(نیل الاوطار۳/۵)

(۹) عن ابی ایوب قال:لما نزل رسول اللهﷺعلیّ،رأیته یدیم اربعاً قبل الظهر. (مجمع الزوائد۲/۲۱۹)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہﷺ میرے گھر تشریف فرما تھے تو میں دیکھتا کہ آپ ظہر سے پہلے ہمیشہ چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(۱۰) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ''مغرب کے بعد دو رکعتیں نہ چھوڑو اگرچہ تم کو تیر سے چھلنی کر دیا جائے''۔

(۱۱) حضرت ابراہیم نخعی (مشہور تابعی) فرماتے ہیں کہ ''لوگ (یعنی صحابہ) مغرب کے بعد دو رکعت کو سنت شمار کرتے تھے''۔

(۱۲) امام نخعی ہی فرماتے ہیں ''ظہر کے پہلے چار رکعت سنت ہے،اس کے بعد دو رکعت بھی سنت ہے،مغرب کے بعد دو رکعت سنت ہے،عشاء کے بعد دو رکعت سنت ہے،فجر سے پہلے دو رکعت سنت ہے''۔

(۱۳) ابوعبیدہ فرماتے ہیں کہ'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو نوافل کبھی نہیں چھوڑتے تھے،وہ فجر سے پہلے دو رکعت،ظہر سے پہلے چار رکعت،ظہر کے بعد دو رکعت،مغرب کے بعد دو رکعت،عشاء کے بعد دو رکعت تھیں''۔

(۱۴) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ مغرب کے بعد دو رکعت اور فجر کے پہلے دو رکعت کو واجب قرار دیتے تھے۔

(۱۵) حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ اگر مغرب کے بعد دو رکعت ترک کر دوں تو مجھے

اندیشہ ہے کہ میری مغفرت نہ ہوگی۔(یہ ساری روایتیں ۱۰ سے اخیر تک امام محمد بن نصر مزوری کی ''قیام اللیل'' سے اخذ کی گئی ہیں)

ان احادیث اوران آثار پر خوب غور کر لینا چاہئے، کہ ان سے کیا ثابت ہوتا ہے، ان سے ان سنن مؤکدہ کی فضیلت اوران کے ادا کرنے کا اہتمام معلوم ہوتا ہے؟ یا یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی اہمیت گھٹائی جائے، اوران میں کوتاہی کو روا رکھا جائے؟ ناظرین خود غور کر لیں کہ کیا سمجھ میں آتا ہے۔

کتب تفسیر میں سنتوں کا ذکر:

اس کے بعد کتبِ تفسیر کا بھی مطالعہ کر لینا چاہئے، وہاں ہم پاتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آیت''**وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن الليل فسبحه وادبار السجود**''.(ق۔۳۹۔۴۰)

(اور اپنے رب کی پاکی وحمد بیان کرو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے، اوراس کے غروب ہونے سے پہلے، اوررات کے ایک حصے میں، اورسجدوں کے بعد۔) میں لفظ ''**ادبار السجود**'' کی تفسیر مغرب کی سنت سے کی ہے۔ اورسورہ طور کی آخری آیت''**من الليل فسبحه وادبار النجوم**'' (اوررات کے ایک حصے میں تسبیح پڑھو، اور جب ستارے چھپنے لگیں) میں''**ادبار النجوم**''، کی تفسیر فجر کی سنت سے کی ہے، اوراس سلسلہ میں حضرت علی، حضرت حسن بن علی، اورحضرت ابو ہریرہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

ابوتمیم سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ ''مغرب کی سنت ہی ''**ادبار السجود**'' کا مصداق ہے، اور فجر کی سنت''**ادبار النجوم**''کا مصداق ہے''۔

حضرت مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، شعبی، اورقتادہ یہ سبھی حضرات فرماتے ہیں کہ ''**ادبار السجود**'' سے مراد مغرب کے بعد کی سنت ہے۔

سنتوں سے فرائض کی تکمیل ہوتی ہے:

پھر یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ سنن مؤکدہ اگر چہ واجب نہیں ہیں، لیکن ان سے فرائض کی تکمیل ہوتی ہے، اورکون اس کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے فرض کما حقہ ادا کر دیا ہے،

جب یہ ہے تو ضروری ہے کہ نماز کے دفتر اعمال میں کچھ نوافل اور سنن بھی ہوں، جن سے فرائض میں رہ جانے والی کوتاہیوں کی تلافی ہو سکے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں رسول اللہ ﷺ سے یہ ارشاد سنا:

اول ما یحاسب بہ العبد یوم القیامۃ من عملہ صلاتہ فان صلحت فقد افلح وانجح وان فسدت فقد خاب وخسر فان انتقص من فریضۃ شیئا قال الرب تبارک وتعالیٰ: انظروا ھل لعبدی من تطوع فیکمل ما انتقص من الفریضۃ ثم یکون سائر عملہ علی ذالک. (ترمذی)

کہ قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا، اگر وہ ٹھیک ٹھاک نکلی تو وہ کامیاب و بامراد ہو گیا، اور اگر وہ خراب و تباہ نکلی تو بندہ بھی برباد و ناکام ہوا، اور اگر فریضہ میں کچھ قصور ثابت ہوا تو اللہ تعالی فرمائیں گے کہ دیکھو! میرے بندے کے پاس کچھ نوافل ہیں ان سے فرائض کی کمی پوری کی جائے گی، پھر باقی اعمال بھی اسی طرح پیش ہوں گے۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی مرفوعاً روایت ہے۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

مؤلف رسالہ کی غلطیاں:

اس رسالہ میں مصنف سے متعدد غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی ایک غلطی یہ ہے کہ وہ فجر کی سنت کو مؤکد نہیں سمجھتے، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس کو علم حدیث کی خوشبو بھی حاصل ہوگی اور اس کے سامنے وہ ساری روایات ہوں گی جنہیں ہم نے نقل کیا، وہ کیوں کر اس کے مؤکد ہونے کا انکار کر سکتا ہے؟۔

پھر وہ یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ سنن مؤکدہ صرف ان فقہا کے نزدیک ہیں جنہیں علم حدیث سے مس نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ بالا فقہا کے علاوہ اور کسی کے نزدیک سنن مؤکدہ کا ثبوت نہیں ہے، لیکن یہ بڑی غلطی ہے۔

شاید مؤلف کو یہ بات نہیں معلوم کہ حضرات تابعین رحمہم اللہ انہیں سنت شمار کرتے تھے، اور وہ لوگ جب جس چیز کو سنت کہیں تو اس سے مؤکد ہونا خود بخود ثابت ہوتا ہے، اور حسن بصری تو فجر سے پہلے دو رکعت اور مغرب کے بعد کی دو رکعت کو واجب قرار دیتے تھے، اور مغرب کی

سنت کے سلسلے میں حضرت سعید بن جبیر کے قول سے بھی ان کی موافقت ہی معلوم ہوتی ہے۔کیا یہ حضرات بھی حدیث کی خوشبو سے محروم تھے۔

اور شاید مؤلف کو اس کی بھی خبر نہیں کہ مشہور امام حدیث امام طحاوی نے ''شرح معانی الآثار'' میں صراحۃً لکھا ہے کہ ''جمعہ کے بعد کی سنت اور ظہر کے بعد کی دو رکعت اور مغرب کے بعد کی دو رکعت ان سنتوں میں سے ہیں جنہیں ترک نہیں کرنا چاہئے'' آخر تاکید اور کسے کہتے ہیں؟۔

امام طحاوی نے لکھا ہے کہ ''جمعہ کے بعد کی سنت جسے چھوڑنا نہیں چاہئے، کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ چار رکعت ہے، بعض دوسرے علما نے فرمایا کہ نہیں بلکہ وہ دو رکعت ہے، جیسے کہ ظہر کے بعد ہے، کچھ دوسرے علما نے فرمایا کہ نہیں بلکہ جمعہ کے بعد سنت جس کا ترک کرنا مناسب نہیں، چھ رکعت ہے......پھر فرماتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ جمعہ کے بعد چھ رکعت سنت ہے، جسے چھوڑنا نہیں چاہئے، یہی امام ابو یوسف کا قول ہے، اور امام ابوحنیفہ کا قول وہ ہے جسے ہم نے ابتدا میں ذکر کیا۔یعنی چار رکعت''۔(شرح معانی الآثار ۱/۱۹۹)

یہ تو جمعہ کے بعد کی سنت کی شان ہے، اور ہر منصف مزاج شخص جس کو فقہ سے کچھ مناسبت ہے، جانتا ہے کہ روزانہ کی سنتوں کا رتبہ تاکید کے لحاظ سے بھی اور دلیل کے اعتبار سے بھی جمعہ کی سنت سے بڑھا ہوا ہے۔

امام طحاوی مزید فرماتے ہیں کہ ''بعض علما کے نزدیک نوافل کو مسجد میں ادا کرنا مناسب نہیں ہے، البتہ وہ نوافل جنہیں ترک کرنا نہیں چاہئے (انہیں مسجد میں پڑھ سکتے ہیں) جیسے ظہر کے بعد کی دو رکعت، مغرب کے بعد کی دو رکعت، اور مسجد میں داخل ہونے کے وقت دو رکعت تحیۃ المسجد''۔(شرح معانی الآثار ۱/۱۹۹)

سنن مؤکدہ کی تاکید کا ثبوت:

مصنف نے اپنے رسالہ میں یہ تأثر دینا چاہا ہے کہ سنتوں کے مؤکد ہونے کی دلیل صرف ایسی ہی حدیثیں ہیں جن کے موضوع ہونے کی فلاں فلاں محدثین نے تصریح کی ہے، لیکن یہ بات درست نہیں ہے، سنتوں کی تاکید کی دلیلیں ابھی ناظرین کرام ملاحظہ کرچکے ہیں۔

چنانچہ سنتِ فجر کی دلیل **''لاتدعوا رکعتی الفجر ولو طردتکم الخیل الخ''**

ہے اور ظہر کے پہلے والی چار رکعت کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی ان پر مواظبت ہے، جیسا کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت گزرچکی ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ''آپ ظہر سے پہلے چار رکعت اور صبح صادق کے بعد دو رکعت ترک نہیں فرماتے تھے''۔ (بخاری شریف)

اور انہیں سے یہ بھی روایت ہے کہ اگر ظہر کے پہلے کبھی چار رکعت نہ پڑھ پاتے تو اس کے بعد انہیں پڑھتے۔ (ترمذی شریف)

حضرت عمرو بن میمون سے منقول ہے ''انہوں نے فرمایا کہ اگر ظہر کے پہلے چار رکعت کسی کی فوت ہو جائے، تو ظہر کے بعد پڑھ لے، اور تمام سنن مؤکدہ کے لئے مجموعی طور پر حضرت ابوامامہ وغیرہ حضرات کی روایات موجود ہیں۔

مصنف نے اپنے اس رسالہ میں بہت سی غلطیاں کی ہیں، ان سب کا ذکر مقصود نہیں ہے، اور نہ سب پر تنقید کرنا ہے۔ یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کے رسالہ ''تحفۃ الاخیار'' کی ایک فصل نقل کر دوں، جس میں انہوں نے سنت مؤکدہ کے ترک کرنے کا حکم بیان کیا ہے۔ **هو هذا**

سنت مؤکدہ ترک کرنے کا حکم:

تیسری اصل سنت مؤکدہ اور اس کے ترک کے حکم کے بیان میں۔ ''تلویح'' میں ہے کہ واجب کا ترک کرنا حرام ہے، جس سے آدمی عذاب جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، اور سنت مؤکدہ کا ترک حرام کے قریب ہے، اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے محرومی ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''**من ترک سنتی لم ینل شفاعتی**''، جس نے میری سنت ترک کی، وہ میری شفاعت سے محروم ہوا۔

حرام کے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے عذاب جہنم سے کم سزا کا مستحق ہوگا، جیسے شفاعت سے محرومی۔ تلویح کی اس بات پر مولانا خیالی نے شرح عقائد وغیرہ میں یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ حدیث میں کہ ''**شفاعتی لاهل الکبائر من امتی**''، میری شفاعت امت کے ان گنہگاروں کے لئے ہے جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ

گناہ کبیرہ کرنے سے بھی شفاعت سے محرومی نہیں ہوتی، تو جو چیز اس سے کم درجہ کی ہے اس سے شفاعت سے حرمان کیوں کر ہوگا؟ اور مکروہ کا ارتکاب اس کا سبب کیسے بن جائے گا؟۔

اس کا لوگوں نے جواب دیا ہے کہ تارکِ سنت کے حق میں شفاعت سے محرومی کا مطلب یہ ہے کہ اس کے درجات کی بلندی کے لئے شفاعت نہیں ہوگی، یا یہ مراد ہے کہ حشر کے بعض مواقع پر وہ شفاعت سے محروم ہو جائے گا۔

مولانا عبدالحی صاحب فرماتے ہیں کہ اس اعتراض وجواب سے معلوم ہوا کہ سنت مؤکدہ کا ترک اگرچہ مکروہ تحریمی ہے لیکن وہ گناہ کبیرہ نہیں ہے، کیوں کہ فقہا نے اسے کبیرہ سے کم قرار دیا ہے۔ اور علامہ ابن نجیم مصری صاحب بحرالرائق نے بھی اپنے ایک رسالہ میں جو صغائر وکبائر کی تفصیل میں لکھا گیا ہے، مکروہ تحریمی کو صغائر میں ہی شمار کیا ہے۔

مگر حق یہ ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے، کیوں کہ فقہا نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ مکروہ تحریمی حرام کے قریب ہوتا ہے، جس سے جہنم کے عذاب کا استحقاق نہیں ہوتا لیکن اس سے کم درجہ کی سزا کا مستوجب ہوتا ہے، مثلاً اس سے شفاعت سے محرومی ہو جاتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کبائر میں ہے، لیکن فرض وواجب کے ترک اور حرام کے ارتکاب سے کم ہے۔

اور تحقیق میں شمس الائمہ نے فرمایا ہے کہ سنت کا حکم اتباع ہے، کیوں کہ دلیل سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دین کے ہر اس طریق میں جس پر آپ چلے ہیں، مطاع اور لائقِ تقلید ہیں۔ اور آپ کے بعد صحابہ بھی۔ اور یہ اتباع مطلق سنت کا اتباع ہے، اس میں فرضیت اور وجوب کی صفت نہیں ہے، ہاں کوئی ایسی سنت ہو جو دین کے شعائر کی حیثیت اختیار کر چکی ہو، جیسے نمازِ عید، اذان، اقامت، نماز باجماعت، تو عمل کے اعتبار سے یہ واجب کے درجہ میں ہے۔ سنت کے قابل اتباع ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہم کو اس کے احیاء وترویج کا حکم دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مطاع ہونے کے چند دلائل یہ ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے ”**لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة**“ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں ”**ما آتاكم الرسول فخذوه ومانهاكم عنه فانتهوا**“ رسول

جو کچھ تمہیں دیں، اسے لے لو، اور جس سے روکیں اس سے باز رہو۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "**علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین**"۔ تم میری سنت کولازم پکڑو، اور خلفائے راشدین کی سنت کولازم پکڑو۔ اور آپ نے فرمایا "**من ترک سنتی لم ینل شفاعتی**" جس نے میری سنت ترک کی وہ میری شفاعت سے محروم ہوا۔

پس سنت کے ترک کرنے سے آدمی دنیا میں مستحقِ ملامت ہوتا ہے، اور آخرت میں محرومِ شفاعت ہوتا ہے۔ (انتہیٰ) قہستانی کی شرح ''مقدمہ الصلوٰۃ'' میں ہے، مسعود میں لکھا ہے کہ جس نے سنت کا اعتقاد رکھا اور اس پر عمل کیا وہ سنی مومن ہے، اور جس نے اعتقاد تو رکھا مگر اس پر عمل نہیں کیا وہ گنہگار مومن ہے۔

تمرتاشی میں ہے کہ تارکِ سنت صحیح قول کے مطابق گنہگار ہے۔ علامہ ابوالیسیر نے فرمایا کہ تارکِ سنت کی مذمت کی جائے گی اور اسے کچھ گناہ بھی ہوگا۔

امام محمد علیہ الرحمہ نے فرمایا ''جو لوگ ترکِ سنت پر مصر ہیں ان سے لڑائی کی جائے گی''۔ اور امام ابو یوسف علیہ الرحمہ نے فرمایا ''ان کی تادیب وتنبیہ کی جائے گی''۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک اس کی تکفیر کی جائے گی، اور یہی حکم ہے جب سنت کو ہلکا سمجھے اور اس کا استخفاف کرے جیسا کہ ''خزانہ'' میں ہے۔

اور ''خلاصہ'' میں ہے کہ جس نے سنت کو بلا عذر معمولی سمجھ کر ترک کر دیا اس کا فرض بھی قبول نہ ہوگا۔ اور سنن غیر مؤکدہ کا تارک نہ مستحق سزا ہوگا اور نہ گنہگار۔ اس کا حکم یہ ہے کہ کرے تو بہتر، نہ کرے تو حرج نہیں۔ کما فی التحقیق وہ مستحب کے قریب ہے، اس کا ترک مکروہ تنزیہی ہے۔

محمد بن مقاتل سے روایت ہے کہ ''کسی جگہ کے تمام لوگ مسواک ترک کرنے پر اتفاق کر لیں تو ہم ان سے لڑائی کریں گے، اسی طرح جیسے ہم کفار سے لڑتے ہیں''۔ (**کذا فی نسخة الامام الخجوانی**)

تجنیس اور محیط وغیرہ میں ہے کہ کسی آدمی نے اگر نماز کی سنتوں کو ترک کیا، اگر وہ سنتوں کو حق نہیں سمجھتا تب تو اس نے کفر کیا، اس لئے کہ وہ انہیں بطور استخفاف کے چھوڑتا ہے، اور اگر وہ انہیں حق سمجھتا ہے تو بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ گنہگار نہ ہوگا، اور صحیح یہ ہے کہ وہ گنہگار ہوگا،

کیوں کہ ترکِ سنت پر وعید آئی ہے۔ انتہیٰ

علامہ ابن ہمام صاحب ''فتح القدیر'' نے اس پر اشکال وارد کیا ہے کہ گناہ کا مدار واجب پر ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اس شخص کے بارے میں جس نے یہ کہا تھا ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں اس پر (یعنی فرائض پر) اضافہ نہیں کروں گا''۔ آپ نے اس کے حق میں ارشاد فرمایا کہ '' افلح ان صدق'' اگر سچ کہتا ہے تو کامیاب ہوا۔ (معلوم ہوا کہ ترک سنن کامیابی میں خلل انداز نہیں ہے)

صاحبِ بحرالرائق نے اس کا جواب دیا ہے کہ سنت مؤکدہ بمنزلہ واجب کے ہے، اس کے ترک سے گناہ ہوتا ہے، چنانچہ بہت سے علما نے اس کی تصریح کی ہے، اور ''محیط'' میں ہے کہ سنن مؤکدہ کا ترک جائز نہیں ہے اگرچہ تنہا نماز پڑھے۔

اور مذکورہ بالا حدیث پہلے کی ہے، اس کے بعد کئی چیزیں مشروع ہوئی ہیں۔ چنانچہ نماز وتر اس کے بعد ہی مشروع ہوئی ہے، ہوسکتا ہے کہ سنن کا تاکیدی حکم بھی بعد ہی کا ہو، اس میں صدقۂ فطر کا بھی ذکر نہیں ہے، حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کے ترک کرنے سے گنہگار ہوتا ہے۔ انتہیٰ

''قنیہ'' میں بقالی کی ''جامع التفاریق'' سے امام محمد علیہ الرحمہ کی روایت نقل کی ہے کہ ''اگر کسی آبادی کے لوگ اذان کے ترک کرنے پر متفق ہو جائیں، یا کوئی بھی سنت سب مل کر ترک کردیں تو ان سے لڑائی کی جائے گی، اور اگر ایسا ایک شخص کرے تو میں اس کو ماردوں گا، اور قید کردوں گا''۔

اور امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے مروی ہے کہ ''سنت کے ترک پر لڑائی نہیں کی جائے گی''۔ ہاں اذان کے بارے میں ان سے بھی روایت ہے کہ اس کے ترک پر قتال کیا جائے گا۔ اور وتر کے بارے میں نصیر سے مروی ہے کہ ''اس کے تارک کی تادیب کی جائے گی، اور ترک مسواک پر لڑائی کی جائے گی''۔ انتہیٰ

مولانا عبدالحی صاحب فرماتے ہیں کہ حاصل یہ ہے کہ بطور استخفاف کے سنت کا چھوڑنا اور اس کا استہزا کرنا خواہ وہ سنن زوائد ہی ہوں، کفر ہے۔ اور اس کا عمداً ترک کرنا بغیر

استخفاف کے،مکروہ تحریمی ہے، جو گناہ وعتاب کا باعث ہے، بشرطیکہ وہ سنت مؤکدہ ہو،خواہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو یا صحابہ کے سنت ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ ''بحرالرائق''اور''النہر الفائق''اور''درمختار''وغیرہ میں کہیں کہیں یہ جو ملتا ہے کہ سنت مؤکدہ کا ترک مکروہ تنزیہی ہے،لائقِ التفات نہیں۔(تحفۃ الاخیار۔۱۸۴،۱۸۵،۱۸۶)

ماخذ:المآثر۔اپریل،مئی،جون(۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆☆

شیخو پور سے چھپرہ تک

۱۹۸۹ء میں مَیں مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں مدرس تھا۔ وہاں میرے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب جوہر قاسمی بھی استاذ تھے، اس وقت وہاں ایسے حالات رونما ہوئے کہ استاذ وشاگرد دونوں نے وہاں سے تعلق منقطع کر لینے میں عافیت محسوس کی۔

مولانا علیہ الرحمہ وہاں سے نکل کر گورکھپور تشریف لے گئے، میں نکلا تو حضرت الاستاذ کا خیال تھا کہ میں بھی گورکھپور پہونچوں، مگر میں اپنے بعض حالات اور خیالات کی بنا پر اپنے وطن اور اپنے ضلع میں رہنا چاہتا تھا۔ میرے ایک اور خصوصی استاذ حضرت مولانا محمد مسلم صاحب اعظمی علیہ الرحمہ نے بڑے لطیف انداز میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں شیخو پور چلنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ بلریا گنج میں جماعت اسلامی کا ادارہ جامعۃ الفلاح ہے، اس کی وجہ سے جماعت اسلامی کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے، تم پہونچوگے تو خود بخود اس کا دامن سکڑ جائے گا۔ میں شیخو پور سے تو واقف تھا مگر یہ کہ وہاں کوئی عربی تعلیمی ادارہ بھی ہے، اس سے ناواقف تھا۔ اسی دوران دارالعلوم اسلامیہ بستی سے مجھے تدریس کی دعوت ملی تھی، مگر قربِ وطن کی وجہ سے شیخو پور کو ترجیح دینا چاہ رہا تھا، مولانا کے حکم پر میں شیخو پور حاضر ہوا۔ تو وہاں علمی اور تعلیمی اور تعمیری ہر اعتبار سے سناٹا تھا۔ جامع مسجد بن کر کھڑی تھی، جس میں ایک بلب روشن تھا اور اندھیرے کو شکست دینے کی ناتمام کوشش کررہا تھا، جامع مسجد کے مشرق میں ایک لمبی چوڑی پانی سے لبریز گڑھی تھی، گڑھی کے جنوبی حصے میں دو تین کھپریل کے کمرے تھے، مشرقی حصے میں چھ کمرے نیچے اور چھ کمرے اوپر کا ایک ڈھانچہ کھڑا تھا، شمالی جانب ایک ادھورا سا کھپریل کا مطبخ تھا۔

اس احاطہ میں بیس پچیس طلبہ حفظ کے اور چار پانچ طالب علم عربی کے فروکش تھے،

مکتب کے گاؤں کے بچے تعلیم کے وقت آتے اور چھٹی پا کر چلے جاتے، میں یہاں آ کر سوچ میں پڑ گیا، ایک طرف استاذ گرامی کا حکم اور دوسری طرف یہ بے سروسامانی! پھر میرے دل نے فیصلہ کیا کہ مجھے نہ دنیا کی شہرت مقصود ہے نہ آسائش مطلوب ہے، دین اور دینی تعلیم کی خدمت میرا مقصد زندگی ہے، امید ہے کہ یہاں اس ویرانے میں وہ بے غل وغش حاصل ہوگا۔ مجھے انشراح صدر ہوگیا اور میں نے یہاں قیام منظور کرلیا، میرے سامنے تنخواہ کا کبھی کوئی مسئلہ نہ رہا، استاذ محترم نے جو فرمادیا، میں نے آمنا و صدقنا کہا۔ میں وہاں رہ پڑا، میرے حصے میں درجہ فارسی کے چند طلبہ اور عربی اول وعربی دوم کے چند طلبہ جو میرے خاندان اور سابقہ تعلیمی ادارے میں مجھ سے قریب تھے آ گئے۔ میں پڑھانے لگا، لیکن ابتداء سے اوپر کی جماعتوں کو پڑھاتا آیا تھا، مجھے آسودگی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ میں انھیں طلبہ پر محنت کرتا تھا، بقرعید کے بعد چند طلبہ جامعہ حسینیہ جونپور سے آئے، جو عربی پنجم کے طلبہ تھے، انھوں نے اصرار کیا کہ ہم آپ سے پڑھیں گے، میں نے عذر کیا کہ یہاں نہ ابھی جگہ ہے نہ کتابیں ہیں، تم لوگ پریشان ہوجاؤ گے، انھوں نے مجھے اطمینان دلایا، میں نے اس کا تذکرہ مدرسہ کے اس وقت کے ناظم مولانا محمد عارف عمری سے کیا، انھوں نے حوصلہ افزائی کی اور ان کا داخلہ کرلیا۔ اب میرے لئے آسودگی فراہم ہوگئی، میں نے عربی کی تمام کتابیں از ابتداء تا انتہا پڑھائیں۔ اس تعلیم میں ایک اور استاذ بھی شریک تھے، اور وہ بھی اس طرح کہ چھ ماہ وہ رہ کر دوسری جگہ چلے گئے، پھر دوسرے استاذ آئے۔ عربی پنجم کی ایک کتاب کے علاوہ تمام کتابیں اور عربی دوم کی زیادہ تر کتابیں اور قدرے قلیل فارسی کی کتابیں میں پڑھاتا رہا۔ سال پورا ہوا، عربی پنجم کے یہ طلبہ تعلیم کی تکمیل کے لئے دیوبند حاضر ہوئے اور انھوں نے تعلیم وتعلم اور دینداری واخلاق میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ وہیں سے مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کی دارالعلوم دیوبند اور ملک کے دوسرے علاقوں میں شہرت حاصل ہوئی۔

اب مدرسہ کا قافلہ باوجود غربت وبے سروسامانی کے ایک اعلیٰ معیار پر چل پڑا، عمارتیں بھی بنیں، طلبہ کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ بہتر سے بہتر اساتذہ جن میں زیادہ تر مجھی سے تعلیم پائے ہوئے تھے فراہم ہوئے۔ مالیات کا مسئلہ مستحکم ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ شیخ الاسلام ملک وبیرون ملک کا معروف ادارہ بن گیا۔

جب کوئی چیز اپنے عروج وارتقاء پر پہونچتی ہے، اور حسن ورعنائی سے مزین ہوتی ہے تو اس پر نظر بد بھی پڑنے لگتی ہے، اب مدرسہ کا انتظام کچھ ایسے افراد کے ہاتھ میں آیا جن میں وسعت قلبی کے بجائے تنگ دلی کا مادہ زیادہ تھا، انھوں نے مدرسہ کے تعلیمی واخلاقی ماحول میں خرابیاں پیدا کیں، بعض بے جا و نامعقول اقدامات کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ میں بددلی پھیلائی، پھر مزید ان کو اس واقعہ سے موقع مل گیا کہ میں سخت بیمار ہوگیا، ڈاکٹروں کے قول کے مطابق میرے دونوں گردے کمزور ہوگئے، اس کے علاج کے سلسلے میں مجھے کافی مدت اعظم گڈھ اور حیدرآباد میں رہنا پڑا۔ میری عدم موجودگی سے خرابی وبربادی کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں، میں تھک ہار کر صحت کی تلاش میں بمبئی گیا، وہاں کے مخلصین نے بہت جدوجہد کے بعد مجھے گردے کی دھلائی یعنی ڈائیلیسس پر راضی کرلیا، اِدھر میری ڈائیلیسس شروع ہوئی، اُدھر مدرسہ کی جدید انتظامیہ نے میرے مشورے اور اطلاع کے بغیر ایک دوسرے مدرس کو عارضی اور کارگزار سہی صدر مدرس نامزد کردیا۔ اس واقعہ سے اساتذہ وطلبہ میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، پھر ساتھ ہی ایسا ماحول بنایا گیا جس میں امن وعافیت کے بجائے جنگ وجدال کے شرارے تھے، پولیس کو بھی آکر مداخلت کرنی پڑی، میں اس پوری مدت میں بمبئی رہا۔

ماحول گرم ہوا، اور اسی گرم ماحول میں مجلس شوریٰ کا انعقاد ہوا، اس مجلس شوریٰ میں کچھ بااثر لوگ میرے خلاف نئی انتظامیہ کے زیر اثر ذہن بنائے ہوئے تھے، میں اندازہ سے سمجھ رہا تھا کہ اس شوریٰ میں کیا ہوگا؟ میں نے ماحول کو درست کرنے کے لئے ایک مفصل خط شوریٰ کے نام لکھا، کہ شاید اس سے صورت حال بہتری کی طرف لوٹ آئے، مگر جب دل بدگمانیوں کی آگ میں جل رہے ہوں، تو پانی بھی آگ لگاتا ہے، میرے خط کو غیر آئینی قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا، بلکہ اسے میرا فردِ جرم شمار کیا گیا۔ [۱] اور میرے اوپر ایسے الزامات لگائے گئے جسے ناظم مدرسہ سے لے کر مدرسہ کا ہر فرد جانتا ہے کہ ان کا کوئی چھینٹا میرے دامن پر نہیں ہے۔

بہر حال ماحول ایسا گرم کردیا گیا کہ میں نے فتنوں سے بچ نکلنے میں دین ودنیا کی عافیت محسوس کی۔

☆☆☆☆☆

ضلع مئو، جو پہلے اعظم گڈھ کا ایک جز تھا، اس کے ایک مشہور قصبہ چریا کوٹ کے قریب ایک گاؤں چھپرہ ہے، میں نے اپنے بعض احباب کے مشورے سے ایک مدرسہ، سراج العلوم کے نام سے ۱۴۲۰ھ میں قائم کیا تھا۔ یہ علاقہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادی پر مشتمل ہے، جس کی غالب اکثریت ہندوؤں کی ہے اور مسلمان بھی بکثرت ہندوانہ تہذیب میں رنگے ہوئے ہیں، میں نے اس علاقہ کا جائزہ لیا تھا، تو اندازہ ہوا کہ ایک مضبوط تعلیمی ادارے کی یہاں سخت ضرورت ہے، جس میں مختلف قریہ جات کے مسلمانوں کے بچوں کو لاکر دینی تعلیم سے بہرہ ور کیا جائے چنانچہ اسی منصوبہ کے تحت مدرسہ وجود میں آیا، اور ایک ہلکی رفتار سے ترقی کرتا رہا۔ میں جب شیخوپور سے فارغ ہوا تو میرے سامنے ملک کے طول وعرض میں بہت سی بڑی بڑی جگہیں تھیں جہاں میرے لئے ہر طرح کی سہولتیں بھی مہیا ہیں، مگر میں نے اپنے ضعف وعلالت کے باوجود اس جگہ کو منتخب کیا، دین کی خدمت کا یہ اچھا میدان ہے۔ میرے آنے کے بعد یہاں قرب جوار کے علاوہ اور حلقوں سے اچھے خاصے طلبہ آگئے، بہت مناسب اور دین کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے اساتذہ بھی فراہم ہوگئے، تعمیرات کی کمی کی وجہ سے بہت سے طلبہ کو واپس کرنا پڑا، اور عربی کی صرف دو جماعتیں ہفتم (مشکوٰۃ شریف) اور ششم (جلالین شریف) قائم کی جاسکیں۔

تعمیرات میں وسعت ہوئی تو دین اور علم دین کا ایک اچھا مرکز بنے گا۔ ان شاءاللہ

خدمت دین کی نیت سے ایک سہ ماہی رسالہ ''سراج الاسلام'' نکالنے کا ارادہ کیا گیا ہے جو ان شاءاللہ آئندہ برسوں میں ماہانہ ہوجائے گا۔

یہ پہلا شمارہ ہے جو استاذی واستاذ العلماء حضرت مولانا زین العابدین المعروفی علیہ الرحمہ پر خصوصی اشاعت ہے، اس خاص نمبر کی سب سے اہم اور خصوصی چیز حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی خودنوشت سوانح ہے جو پہلی مرتبہ شائع ہورہی ہے۔ اس کے بعد دوسرا شمارہ ان شاء اللہ حضرت مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوریؒ سے متعلق ہوگا۔ اور تیسرا شمارہ استاذ محترم حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب جوہر قاسمی علیہ الرحمہ کی یادگار میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ توفیق دیں اور قبول فرمائیں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مجلس شوریٰ مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور کے نام جو خط میں نے لکھا تھا، وہ من وعن اس مضمون کے بعد درج ہے، ناظرین غور فرمائیں کہ اس میں کون سی بات غیر آئینی ہے۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم

بخدمت گرامی ارکان شوری مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الهادين ونعوذ بالله من شرور انفسنا وسيئات اعمالنا برحمته فانه ارحم الراحمين

اما بعد مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور کا خادم چند گزارشیں اس کے محترم ارکان شوری اور انتظامیہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہے، اور امید کرتا ہے کہ ٹھنڈے دل سے محض دین اور مدرسہ کے مفاد میں اس پر غور کریں گے۔

(۱)

اللہ تعالی کو کسی جگہ خیر منظور ہوتا ہے تو وہاں دین اور علم دین کی خدمت کے اسباب مہیا کرتے ہیں، اور ان کی ترقی کی راہ کھولتے ہیں، شیخو پور میں دینی تعلیم مکتب کی شکل میں عرصہ سے جاری تھی، اللہ کو منظور ہوا کہ اسے ترقی دیں، تو یہاں کے مخلصین کی تحریک سے متأثر ہو کر استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نور اللہ مرقدہ نے ادھر توجہ فرمائی، انھوں نے حسن ظن کی بنیاد پر اپنے اس شاگرد کو یہاں بیٹھایا، اور ان کی دعاؤں اور توجہات کی برکت سے آناً فاناً مدرسہ ترقیات کی منزل طے کرنے لگا، چند ہی سالوں میں یہ مدرسہ ملکی پیمانہ پر تعلیم وتربیت کا ایک مثالی ادارہ بن گیا، چنانچہ یوپی، بہار، آسام بنگال، مہاراشٹر، حیدرآباد دکن، تک سے طلبہ آنے لگے، اور اعتماد کی کیفیت اسے یہ حاصل ہوئی کہ دینی مدرسوں کے ذمہ داران اور اساتذہ اپنی اولادوں اور اپنے متعلقین کو زیور تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے کے لئے یہاں بھیجنے لگے، ابتدائی سالوں میں

ایک بارحضرت مولانا نعمت اللہ صاحب،استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند شیخو پورتشریف لائے اور طلبہ کا ہجوم دیکھ کران کے درمیان خطاب کرتے ہوئے فرمار ہے تھے۔

یہ جگہ جہاں زندگی اورمعیشت کے سامان کم سے کم پائے جاتے ہیں، جہاں کوئی بازار نہیں،ایسی جگہ طلبہ کا ہجوم بتا رہا ہے کہ ان کی تشنگی دور کرنے اوران کے اطمینان وتسلی کا سامان یہاں موجود ہے۔

طلبہ نہ صرف یہاں آتے تھے، بلکہ جم کرشرح صدر کے ساتھ یہاں رہ کرعلم حاصل کرنے میں مشغول رہتے تھے،جب یہاں کی تعلیم مکمل ہو جاتی تب یہاں سے بادل ناخواستہ جاتے تھے۔

یہ اللہ کا بڑا احسان ہوا،چھوٹے بڑے تمام مدارس سے آگے بڑھ کر ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں بھی اس کا وقار محسوس کیا گیا،اس احسان پر اللہ کا جتنا شکرادا کیا جائے کم ہے۔

(۲)

نعمتوں پر شکرگزاری ہوتی ہے تو ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے،یہ شکرگزاری کچھ عرصے تک خوب محسوس ہوتی رہی،اورنعمتوں میں اضافہ تعلیمی،اخلاقی،تعمیری اور مالی اعتبار سے ہوتا رہا، مگر چندسالوں کے بعداس شکرگزاری کے بجائے طبیعتوں میں گرانی کا احساس ہونے لگا،اس گرانی کے نتیجہ میں مدرسہ ایک بہترین منتظم اور ناظم مولانا محمد عارف عمری صاحب سے محروم ہوا، یہاں سے زوال نعمت کا احساس بھی شروع ہوا،نئی انتظامیہ جوآئی ،وہ جن حالات میں آئی،اور جن اثرات سے وہ متاثر ہوئی اس کا نتیجہ پہلا یہ ظاہر ہوا کہ مدرسین کے باہمی محبت وتعلقات میں فرق پڑ گیا،یکجہتی کے بجائے انتشار وتفریق کی دراڑیں دکھائی دینے لگیں،ایسا تأثر دیا جانے لگا کہ جس شخص کے آنے کے بعد مدرسہ ترقی کی راہ پر تیزی سے آگے بڑھا ہے،وہ کچھ خاص اہم نہیں نہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہے،اگر وہ نہ رہے گا تو کیا مدرسہ نہ چلے گا؟ وغیرہ۔

بلاشبہ کسی ادارہ کو چلانے والے اللہ تعالی ہیں،لیکن اللہ خاص خاص افراد کے ذریعہ احسان فرماتے ہیں،جن سے ادارہ بہتر سے بہتر کارکردگی پیش کرتا ہے،مدرسہ شیخ الاسلام کے آغاز کارہی میں اچھے، باصلاحیت،محنتی مخلص اور بے لوث افراد کوحق تعالی نے جمع فرمادیا،طلبہ

بھی اچھے مل گئے، اور چند ہی دنوں میں مدرسہ کی نیک نامی کے ساتھ شہرت ہوگئی۔

مگر اب جو انتظامیہ آئی اس نے ان قابل اعتماد افراد پر شکوک وشبہات کی نگاہ ڈالنی شروع کی، مختلف شکایات، ناراضگیاں ظاہر ہونے لگیں، عملہ میں بے چینی اور طلبہ میں انتشار محسوس ہونے لگا، یہ خرابیاں بہت تیزی سے نہیں، آہستہ آہستہ آتی رہیں، یہاں تک کہ مدرسہ کے تعلیمی اور اخلاقی حالت میں زوال محسوس ہونے لگا، اس کا اثر مجلس شوری کے مباحثوں اور کاروائیوں سے لے کر مدرسہ کے آخری انتظامی وتعلیمی امور تک پڑا۔

(۳)

ان خرابیوں کے اظہار میں اس وقت تیزی آگئی جب یہ خاکسار شدید بیماری میں مبتلا ہوا، اور اس کی وجہ سے ڈاکٹروں کے حکم کے مطابق دو ماہ تک آرام کی غرض سے مدرسہ کے باہر اعظم گڑھ اور حیدرآباد میں رہا، لیکن اعظم گڑھ میں چونکہ قریب رہا اس لئے زیادہ فرق نہیں پڑا، مگر جب اس بیماری کی وجہ سے مجھے ممبئی قیام کرنا پڑا، اور طویل سلسلہ علاج میں ڈاکٹروں کی رائے سے مجھے گرفتار ہونا پڑا، تو انتظامیہ نے غالباً یہ سمجھ لیا کہ اب میں مدرسہ میں نہ لوٹ سکوں گا، پھر مجھے بالکل نظرانداز کردیا گیا، مدرسہ کے کسی معاملہ میں نہ مجھ سے مشورہ کیا، مشورہ تو درکنار، مدرسہ میں کچھ بھی ہو جائے، انتظامیہ نے مجھے کبھی خبر بھی نہ دی، مجھ سے مشورہ کے بغیر دوسرا صدر مدرس بنا دیا گیا، بنا دینے کے بعد اس کی اطلاع سے مجھے بے خبر رکھا گیا، میں چند روز کے وقفہ میں مدرسہ پہونچا تب بھی کچھ نہیں بتایا گیا۔

اس صورت حال نے میرے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ اب انتظامیہ کے نزدیک میں ایک غیر ضروری فرد ہوں، میں بھی خاموش رہا، واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اتنا اہم نہیں سمجھتا کے میرے بغیر کوئی کام رک جائے، مگر مجھے اندیشہ یہ ضرور ہوتا رہا کہ ناشکرگزاری کافی بڑھ گئی ہے، ظاہری اسباب کے اعتبار سے بھی اور تکوینی انتظامات کے اعتبار سے بھی مدرسہ میں جو چہل پہل تھی، اس کی جو نیک نامی تھی، مدارس کے درمیان اس کا جو امتیاز تھا، اس کے ذریعہ سے حفظ قرآن، تعلیم علم دین، اور مجلّہ ضیاء الاسلام کی وجہ سے علم کا جو پھیلاؤ، اور شہرت ومقبولیت کی جو برکتیں نظر آرہی تھیں، ان کا آغاز اور ان کی ترقی اسی شخص کے ذریعہ اللہ تعالی نے بخشی تھیں، جسے

اس کے استاذ نے یہاں بٹھایا تھا، جن لوگوں کے درمیان وہ کام کر رہا تھا اسے ان لوگوں نے جب نظرانداز کر دیا تو یہ ناشکری کی انتہا ہے۔

(۴)

اس ناشکری کے ثمرات پھر جلد ہی ظاہر ہونے لگے، مجھے اندیشہ تو ضرور تھا مگر اتنی جلد نہیں کہ بڑھتی ہوئی نیک نامی والا مدرسہ اس طرح اچانک فتنوں کا شکار ہو جائے گا، ساری نیک نامی بدنامی سے بدل جائے گی، پوری جماعت مدرسہ خالی کر دے گی، اور پھر بھگدڑ کا تسلسل جاری ہو جائے گا۔

عجیب بات یہ کہ ان سارے معاملہ میں انتظامیہ اپنی کسی غلطی، اپنی کسی خامی پر نظر نہیں کرتی، اسے طلبہ کے سر ڈالتی ہے، دوسروں کو اس کا ذمہ دار بناتی ہے، حالانکہ بدیہی نظر یہ دیکھ رہی ہے قصور سارا انتظامیہ کا ہے، مدرسہ میں طلبہ آتے ہیں اور یہ اللہ کے منتخب بندے ہوتے ہیں، اور یہ درجہ بدرجہ تعلیم حاصل کر کے اللہ جانے کن کن مرتبوں پر پہونچیں گے، ان کے ذریعہ دین کی کتنی خدمات انجام پائیں گی، انکے ذریعہ کتنی برکتیں نازل ہوں گی، آج کے بڑے بڑے علماء ومشائخ کل کے طلبہ ہی تو تھے، مدرسہ کے باورچی خانہ میں کام کرنے والا بیچارہ، باورچی سے آگے ترقی نہیں کرتا، بلکہ اپنی بہت سی بدعنوانیوں کی وجہ سے اور نیچے گر جاتا ہے، ان دونوں میں کیا تقابل کہ اس کی وجہ سے طالب علم کا بلکہ بہت سے طلبہ کا اخراج کر دیا جائے، کیا حل کی اور کوئی صورت نہیں تھی؟۔

مدرسہ اب جس مقام پر پہنچ چکا ہے بہت صدمہ کا مقام ہے، بہت دانائی، اخلاص اور اپنی انانیت سے بالاتر ہو کر اس سے لوٹانے کی ضرورت ہے۔

میں نے یہ سطریں اپنی صفائی کے لئے نہیں لکھی ہیں، اللہ کو غیب کی خبر ہے، میرے دل میں درد ہے، اس کو ظاہر کیا، ارکان شوری اسے سمجھیں اور اس کا تدارک کریں، ورنہ اب یہ بہار اجڑ جائیگی، گلشن ویران ہو جائے گا، اللہ کو جہاں جس سے کام لینا ہوگا وہاں پہونچا دیگا۔

میں جب یہاں آیا تھا تو ایک بڑے عالم نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے اندر قوتِ کار بہت ہے، جہاں جاتے ہیں ایک چمن آباد ہو جاتا ہے، مگر وہاں کے لوگوں کو آپ سے حسد ہو جاتا

ہے، یا کیا ہوجا تا ہے؟ اور آپ وہاں سے فتنے سے بچنے کے لئے ہٹ جاتے ہیں، اور دوسری جگہ چمن لگاتے ہیں، میں نے عرض کیا تھا کہ اب اس جگہ سے ہٹنے کا ارادہ نہیں ہے، اسی سال مجھے حج نصیب ہوا تو میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اسی جگہ مجھے دینی خدمات کی توفیق دیجئے اور یہاں سے ہٹنے کی ضرورت نہ پیش آئے، حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب علیہ الرحمہ تشریف لائے تھے تو بھرے جلسے میں مولانا مستقیم احسن صاحب نے بھرائی آواز میں میرا نام لے کر دعا کی تھی، کہ خدا کرے ان کی ہڈیاں اسی خاک کی امانت بنیں۔

میں سمجھتا تھا کہ اب مجھے یہیں سپرد خاک ہونا ہے، مگر حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ طبیعت کا سکون غارت ہو گیا ہے۔

ارکان شوری خدا کے یہاں اور خلق خدا کے یہاں جواب دہ ہیں، اچھی طرح غور کرلیں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۲؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ

۲؍جون ۲۰۱۳ء

مقالات ومضامین

(۱) قاضی اطہر صاحب۔معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں
(۲) دیار پورب میں علم اور علما۔قاضی اطہر مبارک پوری کی ایک قابل قدر تصنیف
(۳) حضرت مولانا نازوار حسین صاحب بحیثیت مترجم
(۴) کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضرات شیخین شریک نہ تھے؟
(۵) کتب شیعہ کی شہادت
(۶) تصوف اور علماء دیوبند
(۷) بہار کا ایک مرد عظیم۔شیخ شرف الدین یحییٰ منیری
(۸) نصیحت نامۂ پیرومرشد
(۹) قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام۔معارف وحقائق
(۱۰) سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا ارادۂ حج
(۱۱) ترجمہ مقدمہ ''الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن''
(۱۲) فقہی اختلاف رحمت ہیں
(۱۳) سبیل المومنین سے انحراف
(۱۴) تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کی شرعی حیثیت
(۱۵) جماعت تبلیغ۔مشورے وگزارشیں
(۱۶) تبلیغی جماعت اور اس کے اجتماعات
(۱۷) بے احتیاطیوں کا طوفان
(۱۸) صبر
(۱۹) اخلاص
(۲۰) اہل بیت کون ہیں؟
(۲۱) قوم انصار کی حقیقت وقطب وابدال اور مجذوب کی شرعی حیثیت

قاضی اطہر صاحب
معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ **المعاصرة اهل المنافرة**، ہم عصر ہونا باہمی منافرت کی بنیاد ہے، یہ کہاوت تجربہ کی روشنی میں بہت حد تک صحیح ہے، دیکھا یہی جاتا ہے کہ، لوگ اپنے ہم عصر اصحابِ کمال کے اعتراف میں عموماً بخل سے کام لیتے ہیں، ان کی خوبیاں نظر انداز کر دیتے ہیں، بسا اوقات باہمی چشمک اور حسد کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن اس مثل سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے تواضع اور سادگی کا جذبۂ فراواں رکھا ہے۔ یہ حضرات اپنی فطری تواضع کی بنا پر اصحاب کمال بلکہ بے کمالوں کے سامنے بھی جھکے رہتے ہیں، اور ان کے سامنے اپنے کو اس طرح پیش کرتے ہیں، جیسے انھیں کوئی عظمت حاصل نہ ہو اور دوسرے کو تمام عظمتیں حاصل ہوں، اور یہ معاملہ از راہ تصنع نہیں ہوتا، انھیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں ہوں تو بڑا، لیکن از راہ تواضع خود کو چھوٹا بنا کر پیش کر رہا ہوں۔ ایسا کوئی شائبہ ان کے دل میں نہیں ہوتا، وہ واقعی دل وجان سے خود کو چھوٹا دوسروں کو بڑا دیکھتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے حق تعالیٰ کے دستور **من تواضع لله رفعه الله** کا ظہور ہوتا ہے، کہ جو اللہ کے لئے پستی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

حضرت قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ ایسی ہی مستثنیٰ شخصیات میں ہیں، آپ جتنے بھی مضامین اس نمبر [۱] میں اور اس کے علاوہ دوسرے جرائد ومجلّات میں مختلف اہل علم حضرات کے قلم سے پڑھیں گے، سب قاضی صاحب کی تواضع، کسر نفسی اور سادگی کا ذکر کرتے ہیں، جن

لوگوں نے قاضی صاحب کو دیکھا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قاضی صاحب میں دینی غیرت اور خود داری گوکہ بہت تھی، مگر ان میں کبر ونخوت کا شائبہ نہ تھا۔ بلکہ سچی تواضع اور بے نفسی ان کی طبیعت اور مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی، وہ بہت بڑے تھے، بہت نامور صاحب علم تھے، کثیر التصانیف بزرگ تھے، اعلیٰ درجے کے محقق تھے، اور انھیں معلوم تھا کہ علم وتحقیق میں ان کا پایہ کتنا بلند ہے، مگر جب کسی سے ملتے تو نہ اپنی کسی بڑائی کا اظہار کرتے، نہ اپنے علم کا دباؤ ڈالتے، ہر شخص سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو، بے تکلف ملتے، بسا اوقات اسی کی زبان میں بات کرتے، جو انھیں پہلے سے نہ جانتا ہوتا اسے احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ علمی دنیا کی ایک عظیم ہستی سے مل رہا ہے۔

قاضی صاحب کی اسی تواضع کا اثر تھا کہ معاصرین کو ان سے حسد کرنے اور ان کا رتبہ گھٹانے کا موقع ہی نہ مل پاتا تھا، قاضی صاحب کے انداز اور ان کے معاملات سے ہر شخص محسوس کرتا کہ وہ اسے بلند رتبہ دے رہے ہیں، پھر کوئی کس بنا پر نفرت کرے۔ وہ تو محبت کا اسیر ہوکر رہ جاتا ہے، اس سلسلے میں اکابر تو خیر اکابر ہیں، وہ جو چھوٹے ہیں، بہت چھوٹے ہیں، ان کے ساتھ بھی ان کے رتبے اور درجے سے بڑھ کر قاضی صاحب معاملہ فرماتے۔

قاضی صاحب کو معاصرین کس نگاہ سے دیکھتے تھے؟ قاضی صاحب کا رتبہ ان کے نزدیک کیا تھا؟ اس کی کچھ جھلکیاں ان مکاتیب ومراسلات میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو معاصر علماء نے انھیں لکھے ہیں، قاضی صاحب کی عظمت یہاں بھی جھلکتی ہے کہ انھوں نے خطوط کا بڑا ذخیرہ نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا، ملک کے بہت سے نامور علماء اور بڑے اصحابِ علم نے یہ خطوط لکھے ہیں۔ ہم اس مضمون میں ان معاصر علماء کے خطوط کے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ المتوفی ۱۹۹۲ء:

ہمارے علم میں ہندوستان کے بڑے علماء میں سب سے قدیم اور مستحکم تعلق محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ تھا۔ قاضی صاحب کے دل میں ان کی بڑی عظمت تھی، اور مولانا اعظمی بھی قاضی صاحب کے بڑے قدرداں تھے، دونوں حضرات میں ملاقاتوں کے علاوہ مراسلت کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہتا تھا، میرے پاس حضرت محدث کبیر کے خطوط کا ایک حصہ موجود ہے، یہ ۱۰/مارچ ۱۹۵۹ء سے ۳/مارچ ۱۹۸۱ء تک کے مکاتیب ہیں۔

ان کی تعداد ۶۸ رہے، اللہ جانے ان کے علاوہ اور کتنے خطوط ہوں گے۔ یہ خطوط زیادہ تر علمی کتابوں کی تحقیق وتفتیش، گھریلونجی حالات اور سفر وغیرہ سے متعلق ہیں، ان کی سطر سطر سے بے تکلفی، بے ساختگی، محبت وتعلق کی گرمی اور باہم مخلصانہ مناسبت کی خوشبومحسوس ہوتی ہے، چند ایک خطوط کے اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں، حضرت مولانا اعظمی اور قاضی صاحب کو یہ خیال ہوا کہ ایک علمی وتصنیفی اور نشر واشاعت کا ادارہ قائم کیا جائے، جو علمی وتحقیقی کاموں کا مرکز ہو، اس کیلئے غور وفکر اور باہم مشورے ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں دو جگہیں زیر غور تھیں، مئو اور بمبئی۔ مئو میں حضرت مولانا اعظمی تھے، بمبئی میں قاضی صاحب رہتے تھے، ایسا ادارہ غالباً مولانا چاہتے تھے کہ بمبئی میں ہو اور قاضی صاحب چاہتے تھے کہ مئو میں ہو۔ قاضی صاحب نے اس کیلئے کوشش بھی کی تھی، مگر حضرت مولانا اِدھر کے حالات سے مطمئن نہ تھے، چنانچہ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

> ''مالیگاؤں میں ۱۹ر دن لگ گئے، اس کے بعد بمبئی آنے کا موقع نہیں معلوم ہوا، نیز بڑا محرک آنے کا یہ خیال تھا کہ آپ سے، یحییٰ زبیر سے بمبئی میں کسی ادارہ کیلئے بات ہوئی ہوگی، جب معلوم ہوگیا کہ یہ بات نہیں ہے، تو کوئی خاص محرک نہیں رہا، اپنے قرب وجوار میں اب بھی میرا خیال یہی ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں، قائم ہونا مشکل ہے، اسی طرف (بمبئی میں) ایسے ادارے قائم ہوسکتے ہیں اور چل سکتے ہیں، اِس طرف بخل، حسد اور بے ذوقی نے راستے بند کررکھے ہیں لیکن اُدھر جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں، آپ دور رہتے ہیں اس لئے قرب مطلوب ہے، مگر مستقل قرب حاصل ہوجائے تو یقین ہے کہ یہاں کے حالات چند ہی دنوں میں بعد کو مرغوب ومطلوب بنادیں گے۔
>
> میں آج کل کھانسی سے بہت پریشان ہوں، آج خصوصیت سے بہت مضمحل ہوں، بہت جبر کرکے یہ خط لکھ رہا ہوں، میری صحت اتنی کمزور ہے کہ ہمت نہیں پڑتی، اگرچہ شوق بے نہایت ہے''۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۰ء

ایک خط میں، جو اکتوبر ۱۹۶۱ء کا لکھا ہوا ہے، چند کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے

مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے ذوق ومناسبت کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں:

''الحمدللہ خیریت ہے، ادھر میرا ایک نواسہ سخت بیمار ہوگیا تھا، اس سلسلہ میں بہت پریشان تھا، الحمدللہ اب وہ اچھا ہے، **العبر** جب واپس آجائے، عبارت نقل کرکے بھیجئے گا، (**العبر للذهبي** میں جنگ صفین کے ذکر میں بدری صحابہ کی شرکت کا ذکر ہے، غالباً اس کی تعداد بتائی ہے، اسی عبارت کی نقل حضرت مولانا نے طلب کی تھی) اب اعظم گڈھ کیا لکھوں، مجمع البحرین جہاں تک یاد ہے محمد بن علی الطریحی (کٹر شیعہ اثناء عشری) کی تصنیف ہے، ایران میں چھپی ہے، لکھنؤ میں غالباً میں نے اسے دیکھا تھا، الفاظ آیات واحادیث کی تفسیر تمامتر کتب اہل سنت سے ماخوذ ہے۔

آپ نے جو عبارت لکھی ہے اس میں حلق کا فاعل متعین طور پر معلوم نہیں، اغلب یہ ہے کہ وہ حدیث مرفوع (فعلی) نہیں ہے، کسی صحابی یا تابعی کا واقعہ ہوگا۔ خیال میں رکھوں گا، کہیں کوئی بات نظر آئی تو لکھوں گا، ....فضائل اعمال انھوں نے مجھے دکھائی تھی............اس کا ترجمہ بڑے کام کا ہوگا۔

حیدرآباد سے مولانا سید فضل اللہ نے سلام لکھنے کو لکھا ہے، وہ اپنی کتاب کا غلط نامہ چھپوار ہے ہیں، مجھ کو بار بار لکھا کہ کوئی خامی ہو تو لکھئے، آج ان کو چند باتوں کی طرف متوجہ کررہا ہوں۔

آج سنن سعید بن منصور کی تیسری جلد کے تین ورق کا عکس ایک صاحب نے بھیج کر دریافت کیا ہے کہ یہ کون سی کتاب ہے، افسوس ہے کہ بس اتنی ہی مل سکی، یعنی فقط ایک جلد، باقی جلدوں کا ابھی پتہ نہیں چل سکا۔

ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

''خط ملا، سب حالات معلوم ہوئے، خوشی ہوئی شیخ عبدالعزیز بن باز (المتوفی ۱۹۹۹ء) کا جواب آگیا، لکھتے ہیں کہ ۸۱ھ کے لئے داخلہ کی مدت ختم ہوگئی، لیکن خالد کمال (قاضی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال صاحب، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان سے ابتداً گئے تھے) ۸۲ھ کے داخلہ کیلئے

اپنی درخواست مع شرائط قبول ومؤہلات سعودی سفیر کے پاس بھیج دیں، اسلئے آپ دوسری درخواست ۸۲ھ کیلئے بھیج دیجئے ،اس کے بعد میں دوسرا خط ابن باز کولکھوں گا۔

مارچ ۱۹۸۱ء کے خط میں محدث کبیر لکھتے ہیں:

''ایک صاحب تاریخ گجرات خوب مفصل لکھوانا چاہتے ہیں ،صوبہ کی تاریخ کے ساتھ تاریخی مقامات اور نامور گجراتیوں کا تذکرہ لکھوانا چاہتے ہیں ،موادفراہم کرنے کی ذمہ داری ان کی ہوگی ،میری نگاہ آپ پر پڑتی ہے ،اگر آپ کی رضامندی معلوم ہوتو میں ان سے معاملہ طے کروں۔

میں نے سنا ہے کہ آپ مبارکپور جلد ہی آنے والے ہیں ،کیا یہ صحیح ہے؟

خطوط کے ان اقتباسات سے باہمی مناسبت اور بے تکلفی اور مخلصانہ تعلقات کی لطافت کا احساس بخوبی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ کا شمار اس دور کے محقق اور جید علماء میں تھا ، اصلاً افغانی تھے ،مدرسہ نظامیہ حیدرآباد سے فارغ ہوئے ،اور پھر وہیں کے ہو رہے ،**لجنة احياء المعارف النعمانيه** کے نام سے فقہ حنفی کی امہات الکتب کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا ،جس سے امام ابوحنیفہ ،امام ابو یوسف اور امام محمد **عليهم الرحمة** کی کتابیں شائع ہوئیں ، علم وفضل میں مولانا ابوالوفاء افغانی کا پایہ بہت بلند تھا ،ادب وتاریخ اور فقہ وحدیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے ،بالخصوص فقہ حنفی کے ساتھ ان کا شغف مثالی تھا ،علم کیلئے انھوں نے دنیا کو تج دیا تھا ،متعدد بیش قیمت کتابیں ان کی تعلیق وتحقیق سے شائع ہوئیں ،جن میں سے اکثر فقہ حنفی سے متعلق نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں ،مولانا کے ساتھ قاضی صاحب کے نہایت گہرے اور مخلصانہ روابط وتعلقات تھے۔

مولانا ابوالوفاء صاحب افغانی کا ایک گرامی نامہ قاضی صاحب کے نام ملاحظہ ہو۔تبرکاً اسے من عن نقل کرتا ہوں۔

از:۔جلال کوچہ ۴۶۵۔حیدرآباد دکن ،یوم شنبہ ۲۰ ؍رجب ۱۳۹۴ھ

عزیزم قاضی جی! رفعهُ الله إلى الدرجة العليا و اطال عمرهُ مع السلامة

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل آپ کا ہدیہ عالیہ موصول ہوکر موجب مسرت ہوا، بارک الله فی قلمک و شکرک مساعیک ۔آپ نے ماشاءاللہ قوم کی ایسی خدمت کی، جس کو اب تک کسی نے نہیں کیا تھا اور ایسے مضایق سے جواہر پارے نکالے کہ جن کی روشنی سے عالم منور ہوا، یہ خدمت آپ کے مقسوم میں تھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر اس پر اللہ جل شانہٗ نے آپ کو ادب سے نوازا ہے کہ کسی کا نام بغیر احترام کے نہیں لیا۔ جزاک اللہ خیراً

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ المتوفی ۱۹۷۲ء:

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ مرادآباد کے رہنے والے تھے، عرصۂ دراز تک مدرسہ شاہی مرادآباد میں شیخ الحدیث رہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے اخیر عمر میں دارالعلوم دیوبند بلایا تھا۔ حضرت شیخ کے انتقال کے بعد دارالعلوم میں کامیاب شیخ الحدیث رہے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب نے بخاری شریف انھیں سے پڑھی تھی۔ قاضی صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے، اور شیخ کو بھی ان سے بہت تعلق تھا۔ ایک مکتوب ان کا ملاحظہ ہو:

''میرا جی چاہتا ہے کہ میں مدینہ منورہ جا کر زیارت رسول ﷺ سے مشرف ہوکر خالد کمال سے بھی ملاقات کروں، سنا ہے کہ وہ مدینہ یونیورسٹی میں ہیں، میری حج کی درخواست نامنظور ہوگئی ہے، قدوائی صاحب سے کہلوایا ہے، امید ہے کہ منظور ہوجائے گی، آپ سے بھی درخواست ہے کہ اس بارے میں سعی فرمائیں۔ شعبان ۱۳۸۵ھ

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ المتوفی ۱۹۷۵ء:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ قاضی صاحب کے خاص اساتذہ میں ہیں، جنھوں نے لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں قاضی صاحب کی بہت کچھ رہنمائی اور حوصلہ افزائی

فرمائی ہے، مدرسہ شاہی مرادآباد میں استاذ تھے،اور ایک رسالہ وہیں سے بنام''قائد'' نکالا کرتے تھے،اس میں قاضی صاحب کے مضامین شائع فرماتے تھے، قاضی صاحب نے ان سے اخیر تک طالب علمانہ تعلق برقرار رکھا۔قاضی صاحب نے جب بمبئی چھوڑنے کا ارادہ کیا،تو مولانا محمد میاں صاحب کواس کی اطلاع دی۔اس پر مولانا لکھتے ہیں:

نامہ عزیز باعثِ مسرت ہوا......اچھاآپ کا دل بمبئی سے گھبرا گیا، اب کیا ارادہ ہے؟ وطن میں دل لگتا ہے،تو کیا پارچہ بافی کا کارخانہ قائم کریں گے، یا مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیمی اور تدریسی خدمت انجام دیں گے؟ اگر ایسا ہےتو بمبئی سے دل گھبرا جانا مبارک ہو،مگر شاید یہ بھی نہ ہو سکے،تو پھر کیا؟

احقر کے ذہن میں آپ کے مناسب چند کام ہیں۔

(۱)انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا، بہت بڑا کام ہے،اگر وسائل مہیا ہوں تو حکومت سے اس میں امداد بھی مل سکتی ہے۔

(۲)اگر یہ نہ ہوتو دوسرا کام ہے تاریخ مذاہب ہند، یہ پہلے کے مقابلے میں آسان ہے۔

(۳) تیسرا کام جوان دونوں کے مقابلے میں آسان ہے،تاریخ علماء ومشائخ ہند۔

تینوں کاموں کیلئے جاں فشانی اور ہمت مردانہ کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری المتوفی ۱۹۷۶ء:

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کے ممتاز شاگرد اور ان کے علوم کے شارح تھے،علم حدیث میں خصوصی کمال انھیں حاصل تھا،عربی زبان وادب پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

۱۳۹۷ھ میں ان کا وصال ہوا،**معارف السنن** کے نام سے ترمذی شریف کی بہترین شرح لکھی۔ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی المحدث نے لکھا تھا:

''اس دور قحط الرجال میں مولانا کا فقدان اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی،ایسا کامل مدتوں میں پیدا ہوتا ہے''۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ،قاضی صاحب کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

تقریباً ایک ماہ کے بعد نامۂ گرامی کا جواب دے رہا ہوں،اس اضطراری تاخیر کے لئے

معافی چاہتا ہوں، رجال السند والہند کا شکریہ، ماشاءاللہ خوب زیورطبع سے آراستہ ہوئی، جزاکم اللہ خیراً۔ رجال السند والہند کے سلسلے میں ایک بہت بڑے محقق، جوامام صاغانی کے معاصر ہیں، گزرے ہیں، مسعود بن حسین بن شیبہ ہندی صاحب کتاب التعلیم، جنھوں نے امام ابوحنیفہ کی حمایت میں امام الحرمین وغزالی کی سخت تردید کی ہے، غالباً اس کو میں نے دیکھا ہوگا، اس وقت مزید کچھ یاد نہیں، تقریظ عند الفرصت لکھ کر ارسال خدمت کردوں گا، ان شاءاللہ۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

نامۂ گرامی نے ممنون فرمایا، کل ان شاءاللہ معارف السنن خالد صاحب کے یہاں پہونچا دی جائے گی، سنن سعید بن منصور کا کام مکمل ہوگیا، الحمدللہ، خوش خبری آپ سے سنی۔

جواہر الاصول للتقی الفاسی المکی کا مجھے بالکل علم نہیں، دیکھ لیجئے کہ اگر فوائد ہوں تو اس پر کام کیجئے، بہرحال یہ فن تو اب بہت غنی ہوگیا، اچھا ذخیرہ مطبوعات میں آگیا ہے۔

آپ کے صاحبزادے سے مل کر بہت خوشی ہوئی، ماشاءاللہ ذکی اور باوقار ہیں، اللہ تعالیٰ جید عالم بنائے۔ ۲۰ رصفر ۱۳۸۴ھ

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی المتوفی ۱۹۸۴ء:

دار العلوم دیوبند کے ابتدائی مفتی، ولی صفت، پاک فطرت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے صاحبزادے تھے، دین وسیاست دونوں میدانوں میں صف اول کے لوگوں میں رہے۔ بڑے مدبر صاحب فراست اور صاحب علم تھے، قاضی صاحب سے خصوصی تعلق تھا، قاضی صاحب کی اردو کی تمام اہم کتابیں انھوں نے اپنے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین سے شائع کیں، اور ہر کتاب میں پیش لفظ کے طور پر بہترین تعارف لکھا۔ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

مکرمت نامہ ملا، مضمون گرامی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کردی گئی ہے، بہرحال معذرت خواہ ہوں، ان شاءاللہ جنوری کے برہان میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون برہان کے معیار پر پورا نہ اترے یہ کیسے ہوسکتا ہے، جماعت میں آپ کا

وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں پنہاں ہیں۔

۲۲/اکتوبر ۱۹۶۰ء

حضرت مولانا فضل اللہ صاحب المتوفی ۱۹۷۹ء:

بہار کے مشہور بزرگ حضرت مولانا محمد علی مونگیری یکے از بانیان ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پوتے ہیں، بڑے بزرگ صاحب علم اور نیک نفس تھے، امام بخاری کی تصنیف ''الادب المفرد'' کی شرح ''فضل اللہ الصمد'' کے نام سے لکھی، اس پر قاضی صاحب نے البلاغ میں تبصرہ کیا تو انھوں نے خط لکھا:

> آپ کا مرسلہ البلاغ پڑھا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ یقین مانئے کہ آپ نے تبصرہ لکھنے میں دیر کی، اس کا ذرا ملال نہیں، انسان شے کی خوبی کو دیکھتا ہے، نہ یہ کہ وہ چیز جلد حاصل ہوئی یا دیر سے۔ حافظ مجیب اللہ نے ایک سال سے زیادہ ہی دیر لگائی، بڑے اچھے الفاظ میرے متعلق اور کتاب کے متعلق لکھے، مگر پھر بھی کتاب کا حق ادا نہیں کیا، ''زندگی'' نے بڑی ہوشیاری برتی، کتاب کے شروع میں جو تعارف کتاب کا ہے، اسکو مختصر کر کے تبصرہ کا نام دے دیا۔
>
> مولانا عبد الماجد دریابادی بڑے لوگوں میں ہیں، مجھ فقیر کو ان کی بارگاہ میں بار کہاں مل سکتا تھا، آپ نے تمام ہندوستانی جریدوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے''۔ ۲۰/اپریل ۱۹۶۳ء

حضرت مولانا عبد الباطن صاحب جونپوری:

حضرت مولانا عبد الباطن صاحب جون پوری ان خاصان خدا میں تھے، جنھیں دیکھ کر خدا کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے، جن کی مجلس میں بیٹھ کر مجلس نبوت کی خنکی حاصل ہوتی ہے، جونپور کے مشہور صاحب کرامت بزرگ، مصلح بنگال حضرت مولانا کرامت علی جون پوری کے پوتے، حضرت مولانا عبد الاول صاحب جونپوری کے فرزند گرامی ہیں، ایک بار ان کی خدمت میں اس خاکسار کی حاضری ہوئی ہے، طالب علمی کا دور تھا، نوجوانی کا زمانہ تھا، مگر انھوں نے ایسی خاطر مدارات کی، اور اتنی تواضع وفروتنی کا معاملہ فرمایا کہ حیرت ہو ہوگئی، چہرہ اتنا روشن اور نورانی

تھا کہ اب تک اس کی تابانی آنکھوں میں محفوظ ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہو گیا، اتنا بڑا جنازہ اب تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ اخبارات کی خبر تھی کہ چوبیس لاکھ سے زائد مجمع نے ان کی نماز جنازہ ادا کی تھی، ان کے چھوٹے چھوٹے متعدد رسائل ہیں جو بہت مؤثر اور دلآویز ہیں۔ ایک مکتوب اس بزرگ ہستی کا بھی قاضی صاحب کے ذخیرے میں ملا، برکت کے واسطے اسے نقل کرتا ہوں:

''البلاغ کے پرچے آجاتے ہیں، اور آپ سے غائبانہ علمی ملاقات ہو جاتی ہے، مارچ کے البلاغ کے شذرات میں جو مضمون دوسرے صفحہ پر ارقام فرمایا ہے، جس میں ہند وپاک کے اہل علم کی کس مپرسی کا رونا رویا گیا ہے، وہ ہو بہو میرے حسب حال ہے، کتاب ''واقعات النبی'' مکمل ہوکر مسودہ صاف ہوکر رکھا ہوا ہے، لیکن طباعت واشاعت کی نوبت نہیں آئی، اس کی طباعت کے لئے چند مشہور اداروں اور مستند ہستیوں کو خط لکھا اور متوجہ کیا، افسوس کہ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں آیا، بعض حضرات نے تو جوابی خط کا جواب تک نہ دیا،...... واقعات النبی' میری جملہ تالیفات میں محبوب ترین کتاب ہے، آنحضرت ﷺ کے دوسو منتخب واقعات جو کہ سبق آموز دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں، دل کی خواہش ہے کہ کیسے امت مسلمہ کے سامنے پیش کر دئے جائیں۔

تعلیقات میں کشکول کے حصہ سے بھی انتخاب فرما سکتے ہیں، اگر میری دی ہوئی کتابیں ساتھ ہوں تو ان پر تبصرہ بھی فرمادیجئے۔ آپ نے اپنی قیمتی تالیفات مجھے دے کر جو عزت ومحبت فرمائی اس کا دل سے شکریہ، یقینی استاذ مرحوم کی روح اس تعلق سے خوش ہوئی ہوگی''۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم المتوفی ۲۰۰۲:

فرانس کے مشہور شہر پیرس میں رہ کر اسلامی علوم وفنون کے بلند پایہ مخلص خدمت گزار، مشہور حیدر آبادی عالم ومحقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو کون نہیں جانتا، دنیائے اسلام کی یہ عجیب وغریب مایۂ ناز ہستی ایک عرصہ تک یورپ کے کفرستان میں اسلام وایمان کی روشنی بکھیرتی رہی، ان کا بھی ایک خط قاضی صاحب کے نام ملاحظہ فرمائیے:

''آج نوازش نامہ ملا، سرفراز ہوا......آپ کی فاضلانہ کتاب کا ذکر سن چکا ہوں خاص کر بمبئی کے پروفیسر عبدالرحمٰن مؤمن صاحب سے، لیکن ادھر کی ڈاک اب انگریزوں کے زمانے کی طرح نہیں ہے، مشیة الله غـالبة، کتاب آپ کی اور تالیفوں کی طرح نفیس اور مفید ہی ہوگی، اور اس کی قطعاً محتاج نہیں کہ ایک ناچیز اس کا تعارف کرائے

عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید ؎ ۲۶/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

شبلی اکاڈیمی دار الـمـصنفين اعظم گڈھ کے سابق ناظم مشہور اہل علم واہل قلم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قاضی صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

آپ کے مضامین محفوظ ہیں ان شاء اللہ جنوری یا فروری سے چھپیں گے، بمبئی کے ماحول وہاں کی زندگی اور معاشی جدوجہد میں علمی ذوق کا قائم رکھنا آپ ہی کا کام ہے۔

۲۴/دسمبر ۱۹۶۳ء

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سنی شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا تقی امینی مرحوم (المتوفی ۱۹۹۱ء) نے ایک خط میں لکھا:

اللہ کا بہت بڑا فضل ہے، آپ کے حال پر، جو اس قسم کے علمی کام (آپ سے) لے رہا ہے، بمبئی میں رہ کر یہ کام کرتے رہنا محض آپ کی کرامت ہے۔ ۲۵/جنوری ۱۹۷۳ء

حافظ غلام مرتضیٰ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

کل لائبریری میں ''صدق جدید'' نظر آیا، اس میں ''حکومت کویت کی جانب سے ایک ہندوستانی عالم کو اعزاز'' کے عنوان کے تحت یہ خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ حکومت کویت نے آپ کو اپنے یہاں کے نشریاتی شعبہ کا معتمد اور مشیر قرار دیا ہے، میں اس موقع پر آپ کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ ایک سادہ لیکن مصروف زندگی گزارتے ہوئے جو نمایاں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے پیش نظر آپ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ میں نے آپ کی قابل قدر تصنیف رجال السند والہند کو بغداد میں جن جن اساتذہ کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی، اور جب اس کا ایک نسخہ المتحف العراقی کی لائبریری میں رکھوانے کے لئے

لے گیا، تو اس کے ناظم جناب کورکیس عواد نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ آج بھی ہندوستان میں عربی کے ایسے جلیل القدر علماء موجود ہیں۔ ۳۱/مارچ ۱۹۶۳ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۹۹۹ء) بھی قاضی صاحب کے بڑے قدر رداں تھے، اس سلسلے میں ان کا ایک مکتوب گرامی پڑھیئے:

افسوس ہے کہ ۸/جون کو جب میں بمبئی واپس ہوا تو آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، صرف چند گھنٹے قیام رہا، ایک خاندانی حادثہ کی اطلاع پاکر بہ عجلت وہاں سے روانہ ہوگیا، محمد بھائی کے یہاں آپ کا لفافہ ملا، جس میں انقلاب کے دو تین تراشے تھے، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، پہلی مرتبہ آپ کے قلم سے الہند فی العہد الاسلامي کا ایک کثیر الاشاعت اخبار میں نام آیا، اور اس کا مختصر لیکن وقیع تعارف ہوگیا، اس کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ لکھنؤ کے قومی آواز میں ادارتی صفحہ پر ایک اچھا نوٹ، اس کتاب کی اشاعت کے متعلق دیا گیا، جو اول سے آخر تک آپ ہی کے مضمون پر مبنی اور اس سے ماخوذ تھا، اگر چہ ظاہر یہ ہوتا تھا کہ ان کو براہ راست اس کتاب کی طباعت کی اطلاع ملی ہے، اور وہ اس کو ایک علمی خبر کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔ اس سے بھی بہت سے اہل علم اور اہل ذوق کو کتاب کے مکمل ہونے کی خبر مل گئی، یہ کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا، جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، میری اس وقت بھی نیت ہدیہ کی تھی، معلوم نہیں آپ کو کیوں تردد رہا؟

ابھی تک میرے پاس اس کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں پہونچا............

مجھے تو پہلے خیال نہ تھا اور نہ کتاب پیش کرتے وقت یہ نیت تھی کہ آپ سے اس کتاب پر کچھ لکھنے کی فرمائش کروں، لیکن آپ کے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ آپ سے اس کتاب پر ایک مفصل مضمون اور تبصرہ کی درخواست کروں، جس کو آپ اشاعت کے لئے معارف میں بھیجیں، ہندوستان میں اس کتاب پر تبصرہ کرنے کا جن چندگنی چنی ہستیوں کو حق ہے، ان میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر گہری نظر بھی ہے، اور آپ کا یہ

موضوع بھی ہے، آپ مصنف کی کاوش ومحنت کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں، پھر آپ کا قلب اور قلم گروہی عصبیتوں سے بھی پاک ہے، جو ہمارے اہل علم، اور اہل قلم کا پرانا مرض ہے، اس لئے اگر آپ کی طبیعت پر بار نہ ہو، تو آپ پوری کتاب پر نظر ڈال کر ایک علمی مضمون معارف کے لئے سپرد قلم فرمائیں۔ والسلام

مخلص ۔ابوالحسن علی

مولانا ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ (المتوفی ۲۰۰۹) ان کے متعلق قاضی صاحب فرماتے تھے کہ میری نگاہ میں یہ ہندوستان کے عظیم ترین عربی کے اسکالروں میں ہیں، اور انھوں نے میری کتاب ''رجال السند والہند'' حرف بحرف پڑھی ہے...... ایک خط میں لکھتے ہیں:

محترم المقام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب۔ **حرسه الله ومتعنا بطول بقائه**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف بعافیت تمام باد، امید کہ آپ دیوبند سہارنپور سے بخیریت واپس پہنچ چکے ہوں گے، آپ کے غائبانہ راقم نے مبارک پور کی سیر کی، آپ سے نہ ملنے کا افسوس رہا، لیکن صاحبزادگان مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود حفظہما اللہ نے مہمان نوازی کا حق پوری مستعدی وانشراح صدر سے ایسا ادا کیا جس کی توقع بزمانہٗ حال نہیں کی جا سکتی، **فجزاهم الله احسن الجزاء وزادهم خيراً وميراً.**

دارالمصنفین کی دعوت پر اعظم گڈھ کا سفر کرنا پڑا۔ ۱۸/اپریل دوشنبہ کو یہاں سے روانہ ہوا، ۱۹/اپریل سہ پہر کے لگ بھگ شاہ گنج اترا، اعظم گڈھ کی ٹرین جانے ہی والی تھی اس پر بیٹھ کر اعظم گڈھ پہونچا، دارالمصنفین پہونچتے پہونچتے ساڑھے چار شام کا وقت ہو چکا تھا، مؤرخہ ۲۰/اپریل دارالمصنفین کی نذر رہوا، ۲۱ کو مبارکپور جانا طے کرلیا کہ اب کی دفع آپ کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا، علاوہ بریں یہ خیال بھی ہوا کہ زندگی میں تو مولانا عبیداللہ مبارکپوری سے ملاقات میسر نہ آسکی، کم از کم سنت تعزیت تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے مل کر ادا ہو جائیگی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب (المتوفی

۲۰۰۸ء) نے بڑی فراخ دلی اور محبت سے کتب خانہ دارالمصنفین کے جواں سال ملازم مولوی ابوالبرکات اصلاحی کو رہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا، غرض مبارکپور کی آمد ورفت میں سہولت پیدا ہوگئی اور بڑا آرام رہا، آپ کو پیشگی اطلاع نہیں دی کہ دراصل یہ سفر تذبذب کے عالم میں کیا گیا، اور خود دارالمصنفین کو اپنے پہونچنے کی خبر صرف ٹیلیگرام کے ذریعہ بھیجی، ٹیلیگرام کی رفتار بھی ایسی ثابت ہوئی کہ اس سے پہلے بندہ خود دارالمصنفین جا پہنچا، اور مبارکپور سے واپسی پر ۲۲/اپریل کی صبح تک شاید ہمارا ٹیلیگرام نہیں پہونچ پایا۔

مبارکپور کی یاد اب مشہود ہونے کے بعد تو نقش برحجر ہے، واپسی میں اعظم گڈھ پہونچتے پہونچتے کچھ اشعار موزوں ہوئے جو کلکتہ پہونچ کر اتمام کو پہونچے، آپ کو مولانا ظفر مسعود نے کچھ تفصیلات بتائی ہوں گی، ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے اپنی موٹر بائیک پر بیٹھا کر رسول پور کی بھی سیر کرادی، فجزاہ اللہ خیراً.

باقی باتوں کا اندازہ اس شعری دستاویز سے کیجئے جو اپنی نااہلی کی دلیل ہے:

قصة المسير إلىٰ مبارك فور

(فی الیوم التاسع من ذی القعدة ۱۴۱۴ھ وفق الحادي والعشرين من شهر إبريل ۱۹۹۴م)

أعظم بيوم سرت من "أعظم كر" ا معي أبو البركات، خرّيت حرى

كانت (مبارك فور) غاية مذهبي حتى انتهيت أمام منزل (أطهر)

اى الشيخ المؤقر مولانا القاضي اطهر حرسه الله ومتعنا ببقائه الطويل

فوجدتهٔ عن داره متنائيا إذ لم يكن أخبرتهٔ بتصدّری

ھو في (سهارنفور) أو جنباتها ما بين كتب خزائن والمحبر

غررا يؤلف درها وعقيقها في سلک منتظم بهيّ المنظر

فلقيت حساناً وبعد هنيهة "ظفرا" وقد أتيا بوجه مسفر

حسان بن مسعود و ظفر مسعود حرسهما الله من أنجال صديقنا القاضي

الأطهر حفهم الله بنعمائهٖ

فـاستـوقـفـانـي دون مـا متكلف　　　واستبشــرا بــي، دون أي تــأخــر
لله درهــــمـــا ودر أبيهـــمــــا　　　طبـعـوا عـلـى كــرم وطيبة عنصـر
ومـضـى بـنا ’ظفر‘ إلى دار المحدْ　　　دِث، مـن تـوفـى قبـل عـدة أشهـر

أي الشيخ الكبير مولانا عبيد الله المباركفوري رحمه الله

قـابـلـت نـجيـلـه عـلى وجه العزا　　　ءِ،وفاح طيب الاصل من فرع طرى

أحدهما مولانا عبد الرحمٰن وهو وأخوه كلاهما من الفضلاء حفظهما الله

وإذا أبـو الـحسـن الإمـام، برهطه　　　وافـى هـنالک واستحث، بمحضري

أي الشيخ العلامة الهمام ابوالحسن علي الندوي أبقاه الله ورفاقه الكرام

فمضوا إلى غاياتهم، ومضيت من　　　مـغنى ’المحدث‘، صوب مغنى ’أطهر‘
فـأتــي بـنــا ’ظفـر‘ إلـىٰ دهليـزه　　　حيـث استـرحـنـا مـن كلال يعتري
وأتـىٰ عـقيب (الظهر) غدّانا بكلْـ　　　لِ اطـايـب ومـطـايـب المتخيَّـر
هــذا، وأردفــنـي عــلــىٰ دراجة　　　ألية قـــد ســــاقهـــا بتـــمهـــر
فـخـرجـت نـحـو مـقـابر معهودة　　　وتهــمــنــي مـنهـا ثـلاثــه أقبــر
ذا قبـــر مــولانـــا عبـيـد الله، مـن　　　خـدم الـحـديث وعاش غير مقصرٍّ
متـورعـاً، متـواضـعـاً، متخشعـاً　　　نشـر الـحـديـث بـفـكـره والمزمر
’مــرعــاتــه‘ دلـت علـىٰ إحـرازه　　　مــن ســنة الهـــادي بـحـظ أوفــر
وهـنـاک قبر الشيخ صاحب تحفة　　　ضـمـنـت شـفــاء مـزورا وممترى

أي الشيخ المحدث مولانا عبد الرحمٰن المباركفوري رحمه الله المتوفى في ١٦ شوال ١٣٥٣ھ وفق ١٩٣٥م

برسول فور‘ ضريح(أحمد) حائز’　　　عــربيّة وطـراز شعـر البـحـتـري

أي الشيخ الأديب الكبير مولانا أحمد حسين بن عبد الرحيم رحمه الله كان من أصدقاء أبي غفر لهما الله وقد رأيته في طفولتي وهو جد صديقنا ’قاضي أطهر‘ من جهة أمه المرحومة

زهــداً وعــلــمـاً زاخــراً وتــورعــاً وجــمــال مـعــروف وردّ المنكــر
بـــطـــلاقة بــــدوية وطـــلاوـــة حـــضــرية، وبهـاء جـودـة عبـقـر
و'الـعصر' صلينا بمسجدها، وزُر نـا دار هـذا الـمـضـرحي العبقري
حـوت الـقبـور مـعـالـمـاً علمية عـــمـــلية أعيـــت لســـان مـعبِّـــر
بحبوحة الفردوس يدخلهم وجمـ ـع الـمـؤمـنـيـن بـديـنــه المتيسـر
ســـردي لـقـصـتـي الـعـجيبة منبئ عـمـــا بـــه امـتـازت سلالة 'أطهـر'
حيـــاهـمـو رب الـورىٰ بيـــاهـمو فـي مـنتهـــى دعة وعيـــش مـزهــر
ثـم انـصـرفـنـا شـاكـرين لجمعهم عـوداً عـلـىٰ بـدءٍ، إلىٰ 'أعظم كر'

ترجمہ

مبارکپور کا سفر

۹/ذی قعدہ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۱/اپریل ۱۹۹۴ء

وہ دن کتنا بابرکت اور عظمت والا تھا، جب میں اعظم گڈھ شہر سے روانہ ہوا، اور میرے ساتھ ایک معتبر رہبر مولوی ابوالبرکات صاحب تھے۔

قصبہ مبارکپور میرے اس سفر کی منزل تھا، میں قاضی اطہر صاحب کے مکان پر پہونچا۔

مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر سے باہر دور گئے ہوئے ہیں، پہلے سے میں نے انھیں آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔

وہ سہارنپور میں یا اسی علاقہ میں کہیں قرطاس وقلم کے درمیان ہیں۔

جہاں وہ علم وفن کے حسین موتیوں اور جواہر پاروں کو تصنیف وتالیف کی لڑی میں پرو رہے ہیں

وہاں میری ملاقات پہلے حسان سے ہوئی، پھر تھوڑی دیر کے بعد مولوی ظفر مسعود سے ہوئی، دونوں بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔

(حسان احمد اور مولوی ظفر مسعود، قاضی صاحب کے صاحبزادگان گرامی ہیں)

صاحبزادگان محترم نے بے تکلفی اور بشاشت کے ساتھ مجھے اپنے گھر ٹھہرایا، انھیں اس سے بڑی مسرت ہوئی۔

دونوں کیا خوب فرزند ہیں، اوران کے والدمحترم بھی کیا خوب ہیں، نہایت شریف اور پاک طینت لوگ ہیں۔

پھر مولوی ظفر مسعود مجھے ان محدث کے گھر لے گئے، جن کا ابھی چند ماہ پہلے انتقال ہوا ہے۔

(یعنی شیخ کبیر مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ)

میں ان کے دوصاحبزادوں سے بطورتعزیت کے ملا، اس تازہ شاخ سے اصل کی خوشبو محسوس ہوئی۔

(ایک مولانا عبدالرحمٰن صاحب اوردوسرے ان کے بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب دونوں عالم وفاضل ہیں)

وہاں اتفاقاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی موجود تھے، میری حاضری سے وہ خوش ہوئے۔

پھرسب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے، اور میں بھی وہاں سے قاضی اطہر صاحب کے گھر آ گیا۔

ظفر مسعود اپنے گھر لے آئے اوران کی بیٹھک میں ہم نے آرام کیا۔

ظہر کی نماز کے بعد انھوں نے کھانا کھلایا، عمدہ اور لذیذ کھانا۔

پھرانھوں نے اپنی موٹرسائیکل پر مجھے بیٹھایا، اور بڑی مہارت سے چلا کر لے گئے۔

یہ مولانا عبیداللہ صاحب کی قبر ہے، جنھوں نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، اوراچھی خاصی بابرکت زندگی گزاری ہے۔

صاحب ورع تھے، متواضع اور خاشع وخاضع تھے، انھوں نے حدیث کی نشر واشاعت کی
اپنی فکر وذہانت سے بھی کی اور تحریر وکتابت سے بھی۔
ان کی کتاب مرعاۃ المفاتیح، اس بات کی دلیل ہے کہ ہادیٔ اکرم ﷺ کی سنتوں سے
انھوں نے حظ وافر پایا تھا۔
وہیں صاحب تحفۃ الاحوذی کی بھی قبر ہے، تحفۃ الاحوذی جو ہر شک وتزویر کے لئے شفا
ہے۔
(یعنی شیخ محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری علیہ الرحمہ متوفی ۱۶ ؍شوال ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء)
رسول پور میں مولانا احمد حسین صاحب کا مرقد ہے، جو علوم عربیت کے ماہر اور بحتری کے
طرز کے شاعر تھے۔
(یعنی شیخ ادیب کبیر مولانا احمد حسین ابن عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ، میرے والد محترم کے دوستوں میں
سے تھے، میں نے بچپن میں ان کی زیارت کی تھی، وہ ہمارے دوست قاضی اطہر صاحب کے نانا تھے)
وہ صاحب زہد وورع تھے، علم کے بحر ذخار تھے، نیکی وسعادت کے جمال اور برائی کی سراپا
تردید تھے۔
انہیں بدوی طلاقت، شہری جگمگاہٹ اور عمدگی کی رونق حاصل تھی۔
ہم نے عصر کی نماز وہیں کی مسجد میں پڑھی، اوران بزرگ کے گھر کی زیارت کی۔
یہ قبریں ایسے علمی وعملی کمالات کو سمیٹے ہوئے ہیں جن کے بیان سے زبانیں قاصر ہیں۔
اللہ تعالیٰ ان پر بھی اور ہم پر بھی رحم فرمائے اور اپنے فضل عمیم سے سب کی مغفرت
فرمائیں۔
انھیں اور تمام مسلمانوں کو اپنے دین یسیر کے طفیل باغ فردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔
میرے اس بیان واقعہ سے قاضی اطہر صاحب کے خاندان کے امتیازات نمایاں ہیں۔
رب کائنات انھیں انتہائی خوشحالی اور پھلتی پھولتی زندگانی عطا فرمائے۔
پھر ہم ان سب کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں یعنی اعظم گڈھ شہر لوٹ
آئے۔
میری یاوہ گوئی سے درگذر فرمایئے اور دعا فرمایئے کہ بقیہ زندگی لاف زنی کے بجائے

فکرِ آخرت میں گذرے۔ ابھی ایک بڑے سانحہ سے یوں دوچار ہوا کہ میری بیوی ۷؍مارچ (۱۹۹۴ء) یعنی ۲۴؍رمضان ۱۴۱۴ھ کو صبح ۹؍بجے انتقال کرگئی، اناللہ و انا الیہ راجعون

دہم؍فروری کو اچانک بیہوش ہوگئی، آج کل کی زبان میں جس کو ''کوما'' میں چلا جانا کہتے ہیں، فوراً اسپتال میں داخل کیا اور انتہائی احتیاطی وارڈ I.T. میں رکھ کر تدبیریں کی گئیں جو لاحاصل رہیں اور مشیت ایزدی کے آگے سرخم کرنا ہی پڑا، بحمداللہ علاج کی دوادوش بھی داووا عباداللہ ''الحدیث'' کے تحت شروع کی تھی اور نتیجہ جو نکلا اس پر بھی انا للہ و انا الیہ راجعون ہی موجب سکون وتحمل ہے۔ آپ بھی رحمت ومغفرت کی دعا فردیں۔ عزیزان کو میں نے دانستہ اس کی اطلاع نہیں دی تھی اب جو آپ دعا فرمائیں گے تو وہ بھی آمین کہنے مین شریک ہوجائیں گے،

جملہ عزیزان و متعلقین کو علیٰ قدر مراتب سلام ودعا، اور مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود صاحبان کو خصوصی سلام وشکریہ۔

اپنی اور عزیزان کی خیریت وعافیت سے حسب موقع مطلع فرمائیں

والسلام ابومحفوظ الکریم معصومی

جمعہ ۱۷؍ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ۔ ۲۹؍اپریل ۱۹۹۴ء

1/33۔ سی، ہرے کرشنا کونار روڈ کلکتہ۔ 700014

جناب اصغر مجاہد صاحب سکریٹری تنظیم فکر ونظر، سندھ، پاکستان لکھتے ہیں:

محترم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ آپ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ہر طرح بعافیت ہوں گے۔

حضرت قاضی صاحب! برصغیر پاک وہند کے سب اہلِ علم، اہل فکر ونظر، مؤرخ، محقق، آپ کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے ''مسلمانوں کی عظمت رفتہ'' کو جس طریقے سے اجاگر کیا ہے کہ مسلمانوں کا تابناک وشاندار ماضی، چاند وسورج سے بھی زیادہ روشن نظر آرہا ہے، دنیا کے چاند وسورج تو ابھرتے وڈوبتے رہیں گے، مگر آپ کا روشن کیا ہوا محققانہ سورج رہتی دنیا تک یونہی چمکتا دمکتا رہے گا، خشک وسوکھے ہوئے ذہنوں کو آپ

حیات کی طرح سیراب کرتا رہے گا۔ یہ علم وادب کی ایسی روشنی ہے جو کبھی بھی ماند نہیں ہوتی، آپ کا تاریخ انسانیت پر عموماً اور تاریخ اسلام پر خصوصاً بڑا احسان اور قرض ہے، جو اتارے نہیں اترتا۔ یہ قرض اس طرح اتر سکتا ہے کہ آپ کی سب کتب کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کرا کے شائع کیا جائے، تاکہ مسلمانوں کی تاریخ عزیمت سے مُسلم تو کیا غیر مُسلم بھی باخبر ہو جائیں، بلا مبالغہ آپ تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام کے محسن ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ آمین

آپ کی دو کتابیں سندھی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو گئی، جو ان شاء اللہ عنقریب آپ کی خدمت میں ارسال کی جائیں گی۔

پاکستان کے معروف اہل قلم ومصنف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر وفکر کے داعی حضرت علامہ طالب ہاشمی صاحب کو صدر تنظیم جناب پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب نے ان کی علمی ودینی خدمات کے پیش نظر آپ کی کتابوں کا سیٹ تحفتاً دیا، جنھیں پڑھ کر موصوف نے جناب بھٹو صاحب کے نام شکریہ کا خط لکھا ہے، اور فرمایا ہے کہ ''مجھے قاضی صاحب کی کتابوں سے اپنی زیر تالیف کتب کی تکمیل کیلئے بہت بڑا مواد ملا ہے''۔ (ہاشمی صاحب کے خط کی نقل پیش خدمت ہے)

علامہ ہاشمی صاحب نے آپ کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کے حصول کیلئے اشد ضرورت کا اظہار فرمایا ہے، اس خط کی روشنی میں ہم آپ کی خدمت عالیہ میں ادب واحترام سے عرض کرتے ہیں کہ آپ اپنی بلند پایہ کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کی کچھ کاپیاں ارسال فرمائیں، ہم آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے۔

آنجناب سے استدعاء ہے کہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ساتھ ہی میرا پُرخلوص سلام میرے پیارے بھائی اور دوست جناب حسان احمد صاحب تک پہونچائیں، اللہ کرے آپ ہمیشہ خیر وعافیت سے ہوں۔

والسلام آپ کا مخلص، احقر اصغر مجاہد
جوائنٹ سکریٹری تنظیم فکر ونظر سندھ (پاکستان)

محترم جناب طالب ہاشمی صاحب کے خط کا اقتباس پیش خدمت ہے:

جناب مخدوم ومعظم مجاہد اسلام پروفیسر صاحب! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

لاہور میں آپ کی صحبت میں جو لمحات میسر آئے وہ ہمیشہ یادرہیں گے۔

آپ نے مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کی تالیفات کی صورت میں جن گرانقدر ہدیوں سے نوازا، ان کیلئے صمیم قلب سے سپاس گذار ہوں۔ میرا احساس تشکر اور بھی بڑھ گیا جب ان بلند پایہ کتابوں کو اپنی زیر تالیف کتابوں کی تکمیل کیلئے نہایت کارآمد پایا، بخدا آپ کیلئے دل سے دعائیں نکلیں۔ یہ کتابیں اور دوسرا لٹریچر پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ جو مہتم بالشان ملی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی،

علاوہ ازیں مجھے قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کی اشد ضرورت ہے، اگر یہ کتاب یا اس کی فوٹو اسٹیٹ مہیا فرماسکیں تو آپ کا احسان ہوگا، اس پر جو خرچ بھی آئے اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔

ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

والسلام مع الاکرام　　　　　　دعاگو۔ طالب ہاشمی غفرلہٗ

مولانا لقمان سلفی صاحب ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

دارالافتاء۔ الریاض۔ ۵؍جون ۱۹۶۸ء

ذوالمجد والکرم حضرت قاضی صاحب، مدظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، میں بھی آپ کی دعاؤں سے بخیر ہوں۔

کل ''المنهل'' میں آپ کا خط عبدالقدوس انصاری صاحب کے نام پڑھا، بے حد خوشی ہوئی، انھوں نے آپ کو بھی عدد مذکور کا ایک نسخہ بھیجا ہے، امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

آپ کی تحقیقی کتابیں اصحاب علم ودانش کیلئے خزینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، امید ہے کہ آپ کی کتاب ''العقد الثمین'' جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر آجائے گی، میں

اپنے کوخوش قسمت سمجھوں گا اور میرے احساس کی رفعت کا باعث ہوگا اگر ایک نسخہ سے مجھے بھی نوازا جائے۔

میری تو رائے ہے کہ آپ مملکت سعودیہ کے مجلوں اور جرائد میں گاہے گاہے اپنے مضامین ضرور بھیجتے رہیں، علمی حلقوں میں اچھا اثر پیدا کریں گے، اب آہستہ آہستہ یہ علم کی قدر پہچاننے لگے ہیں۔

کل بھائی خالد کمال کا خط آیا تھا، خیریت سے ہیں، اور مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے تعاقد کے بعد فوراً ہی خط کیوں نہ لکھا، میں نے ان کو خط لکھ دیا ہے، اور معذرت کی ہے، ان کی چھٹی ۸/ربیع الثانی سے شروع ہوگی، انکے کام سے نائب مفتی خوش ہیں، خدا مزید کی توفیق دے۔

میں دارالافتاء میں مستقل ہوگیا ہوں، یہ خدا کا کرم ہے، اب کوئی قانونی پریشانی باقی نہیں رہی ہے، امید ہے کہ جواب سے ضرور نوازیں گے، میں آپ کو اپنا بزرگ اور نہایت مخلص بزرگ مانتا ہوں، آپ کی علمی گیرائی کے ساتھ بے حد سادگی اور تقویٰ مجھے ہمیشہ دعوت فکر وعمل دیتے رہتے ہیں۔ جناب قمر صاحب اور دیگر پُرسانِ حال کو سلام کہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ طالب دعا۔ محمد لقمان سلفی

قاضی صاحب کے نام ایک تعزیتی مکتوب

محترم المقام جناب الحاج مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری

السلام علیکم

ایک خط روانہ کر دیا ہوں، ملا ہوگا، ابھی ابھی مبارکپور سے حاجی ظفر مسعود سلمہٗ کا خط ملا جس سے معلوم کر کے بیحد افسوس ہوا کہ آپ کے والد محترم کا [۲] انتقال ہوگیا، مرحوم کا ایسے وقت جدا ہو جانا جب کہ آپ نہ صرف وطن بلکہ ملک سے ہزاروں میل دور ہیں۔ ظاہر ہے آپ کے لئے زبردست اور ناقابل برداشت المیہ ہے مگر مرضئ مولیٰ کے آگے ہر انسان مجبور ہے۔ آپ اور خالد کمال سلمہٗ صبر کیجئے۔ میں بحیثیت ایک دیرینہ رفیق اور قریبی دوست اور اگر کہوں تو سب سے زیادہ مخلص ہونے کے ناطے اس حادثہ پر بے حد غم زدہ ہوں آپ سب لوگوں کو صبر جمیل کے لئے

تلقین کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین منزل عنایت فرمائے، آمین

ظفر مسعود سلمہٗ کے خط کا ایک روشن پہلو بڑا ہی خوش کن رہا کہ جب والد مرحوم کی قبر کی کھدائی آپ کی والدہ مرحومہ[۳] (جن کو انتقال فرمائے ہوئے ۴۴ سال گزرے ہیں) کے پہلو میں ہورہی تھیں تو ایک سوراخ نظر آیا، کفن تو کالا ہو چکا تھا مگر پھٹا نہیں تھا، اور والدہ کی نعش مبارک بالکل صحیح وسالم حالت میں پائی گئی، اس سے ان کے عذاب قبر سے محفوظ رہنے اور جنتی ہونے کی دنیا ہی میں سب لوگوں کو بشارت ہوگئی، اور لوگ جوق در جوق اس منظر کو دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگے، اس سے آپ کے گھر والوں نے غم واندوہ کے ساتھ ساتھ خوشی ومسرت کے آنسو بھی بہائے، اس لئے آپ کی تربیت دینے والی اس جنتی ماں کے دنیا میں ہی ثبوت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، جن کے نیک اور.....خون کی آمیزش آپ کے ایک ایک قطرہ خون میں گردش کررہی ہے، اور جن کی دعاؤں کے طفیل آپ کو تمام ممالک اسلامیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہورہی ہے، خدا آپ کی ساری خدمات دینیہ کو قبول فرمائے اور پھر مکرر طور پر میری جانب سے میرے ساتھیوں اور رفقاء کار کی جانب سے آپ کو صبر کی تلقین ہے، کمالِ حبیب الرحمٰن، انیس الرحمٰن، صلاح الدین اور عرفان سلام کہتے ہیں، مولوی خالد کمال کو بھی سب کا سلام قبول ہو۔

والسلام

قمر (مولانا عبیدالرحمٰن صاحب قمر) مبارکپوری بمبئی ۔۴؍مارچ ۱۹۷۸ء

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) یہ مضمون ماہنامہ ضیاء الاسلام، قاضی اطہر مبارک پوری نمبر میں شائع ہوا تھا، اسی کی جانب اشارہ ہے۔

(۲) میاں جی محمد حسن، متوفی ۲۸؍فروری ۱۹۷۸ء

(۳) حمیدہ بنت حضرت مولانا حکیم احمد حسین صاحب، (متوفیہ ۲۲؍ذی قعدی ۱۳۵۲ھ)

دیار ''پورب'' [۱] میں علم اور علماء
قاضی اطہر مبارکپوری کی ایک قابل قدر تصنیف
تعارف اور قدرے تلخیص

مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے علامہ غلام آزاد بلگرامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''پورب کی سمت میں تین صوبے تھے۔صوبہ الہ آباد،صوبہ اودھ [۲] اور صوبہ عظیم آباد۔مغلوں سے پہلے اودھ اور جونپور ایک ساتھ بولے جاتے تھے اور قنوج سے لے کر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا جس میں اودھ اور جون پور دونوں شامل تھے اور دوسرا صوبہ کڑا یعنی الہ آباد کا تھا جس میں گنگا کے اس پار کا علاقہ موجودہ کان پور سے کڑہ مانک پور، فتح پور، موجودہ رائے بریلی،سلون وغیرہ سے گزرتا ہوا غازی پور تک چلا جاتا تھا، صوبہ عظیم آباد، موجودہ بہار کا صوبہ ہے۔(حیات شبلی:ص:۱۰)

قاضی اطہر صاحب نے اپنی کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' میں اس خطے کے علم اور علماء کی تاریخ مرتب کی ہے، خود قاضی صاحب کے قلم سے اس علاقہ کا تعارف ملاحظہ کر لیجئے:

''مسلم دور حکومت میں دہلی کے مشرق میں صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد پر مشتمل جو وسیع اور محدود خطہ ہے اس کو ملک پورب کہتے تھے، ہر صوبہ میں دارالامارت ہر دارالامارت سے متعلق بڑے بڑے شہر، ہر شہر سے متعلق قصبات اور ہر قصبہ سے متعلق دیہات تھے، ملک پورب کے قصبات شہروں کے حکم میں تھے جن میں عالی شان عمارتیں، شرفاء کے محلات، علماء ومشائخ، مختلف قسم کے پیشہ ور، مدارس ومساجد تھیں جو جمعہ و جماعت سے معمور

رہتی تھیں،اسی ملک کوہم دیار پورب سے تعبیر کرتے ہیں‘‘۔(ص:۲۱)

ہندوستان کا یہ مشرقی حصہ اس کے مغربی حصہ ہی کی طرح بڑا مردم خیز اورعلم و ہنر کا گہوارہ تھا، اسلام کا ابر کرم سرزمین عرب سے اٹھ کر جانب سندھ بڑھا تو مکران، سندھ، ملتان سے ہوتا ہوا دہلی تک کی سرزمین کونہال اورخوش حال کر گیا، پھر چشم فلک نے دیکھا کہ یہ ابر نیساں پورب کی طرف بڑھ رہا ہے اور مشرق کے اس خطے پر جس کا ہم نے ابھی اوپر کی سطروں میں تعارف کرایا۔موسلا دھار برس رہا ہے۔ یہ مٹی بڑی زرخیز تھی۔اس ابر کرم کا ہر قطرہ گہر بن بن کر اس علاقہ کو روشن کرنے لگا۔اس علاقے کا ہر شہر ہر قصبہ بلکہ ہر قریہ معدن علم وعلماء بن گیا۔ بالخصوص جونپور کی تاسیس وتعمیر کے بعد اس کے اطراف ونواح،مسجدوں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے ساتھ علماء وفضلاء اور مشائخ سے کچھ اس طرح معمور وآباد ہوئے کہ دیار پورب شیراز ھند بن گیا۔اس خطہ میں بڑے بڑے نامور علماء و مشائخ پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے علم وعمل اور روحانیت وتقویٰ سے پورے خطے کو جگمگا دیا۔

ان علماء ومشائخ کی ایک مختصر اجمالی فہرست دیکھنی ہوتو زیر تذکرہ کتاب ’’دیار پورب میں علم اورعلماء‘‘ کی مختصر سی تمہید پڑھ لیجئے جوخود قاضی صاحب کے قلم سے ہے، لکھتے ہیں:

’’اس خطۂ زمین سے شیخ الاسلام فریدالدین اودھی، شیخ الاسلام شرف الدین یحییٰ منیری ،مولانا علاءالدین نیلی اودھی، شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی، شیخ نصیرالدین اودھی، چراغ دہلی، شیخ حسام الدین مانک پوری، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ملامحمود جونپوری، ملامحمد افضل جونپوری، مولانا حاجی ابوالخیر بھیروی، مولانا الہداد جونپوری، دیوان محمد رشید جون پوری، شیخ احمد عبدالحق ردولوی، سید اشرف جہاں گیر سمنانی، شیخ علی متقی جونپوری، برہان پوری مکی، علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی، شیخ محبّ اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسی، ملا احمد جیون امیٹھی، ملا نظام الدین فرنگی محلی، شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی، مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی اوران کے علاوہ بہت سے عباقرہ دوراں اور جہابذۂ زماں پیدا ہوئے، اس دیار میں روحانی طرق سلاسل میں چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ، اشرفیہ، قلندریہ عاشقیہ، مداریہ کوفروغ حاصل ہوا۔آخری دور میں اس سرزمین سے مجاہدین کی تحریک عام ہوئی جو بنگال سے سرحد تک پھیلی ہوئی تھی‘‘۔(ص:۱۷)

علماء ومشائخ کے یہ نام جو آپ نے پڑھے ان میں سے ہر ایک آسمان علم وکمال کا آفتاب وماہتاب تھا، جہاں اتنے اتنے صاحبان علم وفضل رہے ہوں۔حق یہ تھا کہ ان کی مفصل تاریخ لکھی جاتی، ان کے سوانح حیات کی چھان بین کی جاتی۔ان کے علمی وذہنی کارناموں کو یاد رکھا جاتا، ان کی روحانی تربیت کے آثار کومحفوظ کردیا جاتا۔لیکن عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے علماء وفضلاء اور مشائخ کے مقابلہ میں دیار پورب کے ان بزرگوں کے تذکرے کم لکھے گئے۔قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''علمائے پورب پر اب تک کوئی ایسی جامع اور مفصل کتاب نہیں لکھی گئی جس سے ان کی شخصیت اوران کے کارناموں کا تفصیلی تعارف ہو سکے اور معلوم ہو کہ اس قدیم معدن علم وعلماء اور شیراز ھند پورب سے کیسے کیسے سرآمدگان روزگار اٹھے ہیں اورانھوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں؟''۔(ص:۱۹)

زیرنظر کتاب میں اسی علمی وتاریخی قرضہ کی ادائیگی کی پہلی کوشش ہے قاضی صاحب نے پورب کی علمی تاریخ کو چار دور میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی علمی ودینی سرگرمی اور ارباب فضل وکمال کا اجمالی تعارف کرایا ہے۔اس کے بعد اس علاقے کے آٹھ بڑے بڑے علماء ومشائخ کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے ان کے ضمن میں بہت سے دوسرے ارباب کمال کا بھی ذکر آگیا ہے۔

پہلا علمی دور:

اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے بڑی جستجو اور تحقیق کے بعد یہ بتایا ہے کہ پورب کے اس خطہ میں اسلام کی روشنی کب چمکی اور کیسے پھیلی اور پھیلتی چلی گئی، یہ روشنی پہلی بار کب چمکی؟ اور کس جگہ سے اس کا آغاز ہوا؟ یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے مسلسل فتوحات کے عہد میں یہ خطہ اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا اس کے بعد حضرت سید سالار مسعود غازی (شہادت ۴۸۸) اوران کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے اس روشنی کو عام کیا

سید سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد ایک صدی تک تاریخ پر سناٹا چھایا رہا، پھر ۵۹۱ھ میں سلطان شہاب الدین نے قنوج پر فوج کشی کی، اس فوج کشی میں مسلمان کامیاب رہے، اس کے بعد قنوج سے بنارس تک تمام علاقوں میں مسلمانوں کا غلبہ ہوگیا اور بنارس سے

نیپال کی سرحد تک پھراس کے آگے پورب کی طرف بنگال تک راستہ صاف ہوگیا۔اس دور میں کڑہ مانک پوراس دیار کا دارالحکومت بنا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو۵۵۴ھ میں نظام سلطنت سونپا تھا۔قطب الدین ایبک نے۶۰۲ھ میں دہلی کو فتح کرکے غلام سلطنت کی بنیاد رکھی اس کے دور میں پورب میں قنوج اوراودھ کے علاقے فتح ہوئے اور نیپال کے نیچے سےلیکر بنارس تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیرنگیں آگیا۔یہ حکومت مختلف بادشاہوں کی ماتحتی میں ۶۸۹ھ تک رہی۔۶۸۹ھ میں خلجیوں کی حکومت قائم ہوئی۔۷۲۰ھ تک رہی۔۷۲۰ھ میں خاندان تغلق مسند حکومت پرآیا۔جس نے ۸۱۶ھ تک اپنا قبضہ جمائے رکھا،اس خاندان کے نامور اورعلم پرور بادشاہ سلطان فیروزشاہ نے جس کا نام جونا تھااپنے نام پر جون پورآباد کیا۔

قاضی صاحب نے۶۰۲ھ سے لےکر۷۷۲ھ تک یعنی شہر جون پور کی تاسیس وتعمیر تک پورب کی علمی تاریخ کا دوراول قرار دیا ہے، پھرتفصیل سے ہرعہد سلطنت میں علم وعلماء کی تاریخ مرتب کی ہےاس میں بڑی قیمتی معلومات اور تاریخی حقائق قاضی صاحب نے تحریر کئے ہیں۔اس دور کے بکثرت علماء کا اجمالی تذکرہ آگیا اورعلم وفضل کے چمن اوراس کی بہار کا تذکرہ بڑے دلآویزانداز میں کیا ہے۔

غلام خاندان کے دورحکومت میں قاضی صاحب نے حسب ذیل علماء کا نام لیا ہے۔

شیخ الاسلام شیخ فریدالدین اودھی ان کا شماراس دور کے نامورعلماء میں تھا۔پھران کے تلامذہ میں مولانا علاءالدین نیلی اودھی اورمولانا شمس الدین محمد بن یحیٰی اودھی خاص شہرت کے مالک ہوئے۔

اودھ کے مشہورقدوائی خاندان کے جداعلیٰ شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی جوحضرت عثمان ہارونی کے مریداورخواہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے پیر بھائی تھے۔ ہندوستان تشریف لائے اوراودھ میں مقیم ہوئے سلطان التمش کے دور میں مولاناابوتوامہ شرف الدین حنفی دہلوی نے دہلی سے بنگال کا رخ کیا اور وہاں کے سنارگاؤں میں درس وتدریس کی بساط بچھائی،ان سے مشہورشیخ بزرگ حضرت شرف الدین یحیٰی منیری قدس سرہ نےتعلیم حاصل

کی۔اسی دور میں دو بھائی سید شمس الدین اور سید شہاب الدین شہر گردیز سے دہلی آئے ،سید شہاب الدین دہلی سے آکر کٹرہ مانک پور میں آباد ہوگئے،ان کی نسل سے سید راجہ مانک پوری ہیں جنھوں سلاطین شرقیہ کے عہد میں دیار پورب کو اپنا دینی اور روحانی مرکز بنایا،ان کی اولاد میں راجہ سید مبارک نے مبارک پور اور راجہ سید خیر اللہ نے خیر آباد کی تعمیر کی۔

غلام خاندان کے بعد خلجیوں کا دور حکومت آیا۔اس دور میں بھی علم اور علماء کی بہار رہی، یہ دور ۳۰ رسال تک رہا قاضی صاحب خبر دیتے ہیں کہ:

''اس مختصر دور سلطنت میں پورب اور بہار و بنگال میں دینی اور علمی رونق بڑھتی رہی اور ان علاقوں میں علماء ومشائخ مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعے اپنے اپنے انداز میں کام کرتے رہے''۔(ص:۲۹)

اس دور میں کچھ خاص خاص علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے مولانا بدر الدین حنفی اودھی کا نام لیا ہے کہ وہ سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں اودھ کے علماء کبار میں تھے اور یہاں سے دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے اور کئی کئی ماہ وہاں رہ کر وعظ وتذکیر کی خدمت انجام دیتے تھے۔

اس سلسلے میں انھوں نے بہار کے مشہور بزرگ مخدوم شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ وہ ۶۶۱ھ میں بعہد سلطان ناصر بن محمود بن التمش پیدا ہوئے،انھوں نے خلجی دور میں بہار میں دین و ایمان کی بزم سجائی ان کے فیوض و برکات سے خلجی دور خوب مستفید ہوا۔(ص:۲۹)

خلجی خاندان کے بعد ہندوستان کی زمام حکومت تغلق خاندان میں آئی،اس خاندان کے تیسرے بادشاہ فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں جونپور شہر آباد کر کے بلاد پورب کو علم ومعرفت کے نئے دور میں داخل کیا۔

اسی خاندان کے دور حکومت میں مولانا فرید الدین اودھی شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز تھے،ان کے علم وفضل کی دھوم اودھ سے دہلی تک مچی ہوئی تھی۔ان کے دو شاگرد ہندوستان کے مایۂ ناز علماء میں ہوئے۔ایک مولانا شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی ہیں جن کے تلامذہ میں

مشہور عالم و بزرگ حضرت مولانا شیخ نصیر الدین محمود ہیں، جو حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں اور ''چراغ دہلی'' کے لقب سے ممتاز ہیں۔

ان کے دوسرے شاگرد مولانا علاء الدین نیلی اودھی ہیں جو خاص شہرت کے مالک ہیں، اس دور میں یہ اودھی علماء ومشائخ دہلی کی علمی وروحانی فضا پر چھائے ہوئے تھے اور کفرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے دہلی کے بام و در روشن تھے۔

اسی دور میں اودھ کی بزم علم ومعرفت کے ایک چراغ نے سرزمین بنگال کو بقعۂ نور بنایا تھا، یعنی مولانا سراج الدین عثمان چشتی اودھی (خلیفہ حضرت محبوب الٰہی) بنگال تشریف لے گئے اور ان سے خلق اللہ نے فیض پایا، ان ہی میں حضرت شیخ علاء الدین عمر بن اسعد لاہوری پنڈوی متوفی ۷۵۸ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے مرشد سراج الدین عثمان اودھی کے کام کو آگے بڑھایا اور پنڈوہ میں مستقل قیام کرکے ارض بنگال کو علم ومعرفت کا گلستان بنادیا۔

ان حضرات کے علاوہ قاضی صاحب نے اور متعدد علماء کبار اور مشائخ کرام کا نام لکھا ہے، یہ دیار پورب کی علمی وعملی تاریخ کا دور اول ہے جو ۶۰۲ھ سے شروع ہوکر ۷۷۲ھ میں ختم ہوتا ہے۔

دوسرا علمی دور:

قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں دوسرے علمی دور کا تعارف کراتے ہوئے بتایا ہے کہ دور اول جو پونے دوسو سال کے عرصے کو محیط ہے، میں علماء وفضلاء کی اچھی خاصی تعداد مختلف قصبات وقریات میں پائی جاتی تھی۔

> ''مگر مانک پور کڑہ کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا تا آنکہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں شہر جونپور آباد کرکے ایک عظیم علمی و دینی مرکز قائم کیا اور قطب الاسلام حاجی صدر الدین چراغ ہند ظفر آبادی کی ذات والا صفات سے سواد جونپور میں اسلام کو فروغ ہوا، اور عہد فیروز شاہ تغلق سے لے کر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کے دور تک تقریباً چار سو سال یہ شہر حدود سمیت علم وفضل اور علماء و فضلاء کا گہوارہ بنا رہا ہے''۔ (ص:۳۲)

قاضی صاحب نے دوسرے علمی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے تاسیس جونپور۷۷۲ھ سے لودھی سلطنت کے خاتمہ ۹۳۲ھ تک قرار دیا ہے۔

اس دور میں پورب کے اندر علما اور علماء کی تاریخ بڑی تابناک رہی ہے، فیروز شاہ تغلق نے مولانا علاء الدین دہلوی سے درخواست کی کہ وہ جون پور تشریف لے جائیں، وہ جب جونپور کیلئے دہلی سے نکلے ہیں تو بادشاہ نے اپنا خاص گھوڑا سواری کیلئے پیش کیا اور خود رکاب پکڑ کر سوار کرایا، مولانا چار سوطلبہ کو لے کر جونپور تشریف لے آئے، شاہزادہ فتح خاں جو اپنے والد فیروز شاہ کی طرف سے جونپور کا حاکم تھا اس نے شہر سے بارہ کوس آگے بڑھ کر مولانا کا استقبال کیا اور دو مرتبہ انہیں سونے کے سکوں سے تولا اور وہ رقم انہیں نذر کی۔

مولانا نے اشاعت علم کیلئے ایسی جدوجہد کی کہ تھوڑے ہی عرصے میں جونپور اور اس کے اطراف میں تعلیم وتدریس کے چوالیس مدرسے قائم ہوگئے، اور ہر طرف علم وفن کا چرچہ عام ہوگیا، مولانا کا انتقال ۷۸۲ھ میں ہوا۔

۷۹۷ھ میں تغلق خاندان کے آخری فرمانروا سلطان محمود شاہ تغلق نے اپنے باپ کے وزیر ملک سرور خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جونپور کی فرمانروائی عطا کی، وہ اپنے ساتھ دہلی سے مولانا شرف الدین لاہوری کو جون پور لایا۔ ان دونوں کی آمد سے جون پور علم و فضل کے لحاظ سے اور چمک اٹھا۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''درحقیقت سرزمین پورب کا سارا علمی افتخار ان ہی چاروں کا مرہون منت ہے جن میں دو امراء (فتح خاں اور خواجہ جہاں ملک الشرق) اور دو علماء (مولانا علاء الدین دہلوی اور شیخ شرف الدین لاہوری) شامل ہیں، ان ہی عناصر اربعہ سے یہاں کا علمی مزاج بنا، اس پچیس سالہ دور میں باہر کے کئی علمی خانوادے دیار پورب میں آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے جن میں صدیوں علم وفضل کا چرچا رہا''۔ (ص:۳۸)

شرقی سلطنت:

۷۹۶ھ یا ۷۹۷ھ میں حاکم جونپور ملک سرور خواجہ جہاں نے اپنی مستقل حکومت کا

اعلان کیا اور سلطان الشرق کے خطاب کے ساتھ تخت نشیں ہو کر ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی، اسی حکومت میں جو شرقی سلطنت کے نام سے معروف ہوئی۔ چھ بادشاہ ہوئے جن میں سب سے نامور اور سب سے زیادہ علم پرور سلطان ابراہیم شاہ شرقی از ۸۰۴ھ تا ۸۴۲ھ بادشاہ ہوا۔

شرقی سلطنت کی حدود طبقات اکبری کے بیان کے مطابق مشرق میں بہار کے صوبے میں علاقہ ترہت تک تھیں، یعنی مظفر پور اور دربھنگہ تک، قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''جون پور کی تاسیس ۷۷۲ھ سے لے کر شرقی سلطنت کے پہلے حکمراں کے آخری زمانے ۸۰۳ھ تک دیار مشرق میں علم و علماء کی تازہ بہار آتی رہی، اس دور میں جب کہ دہلی کا مرکز حوادث وفتن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور وہاں کی علمی اور دینی محفلیں اجڑ اجڑ کر دوسرے دیار و امصار کی طرف منتقل ہو رہی تھیں جون پور دار العلوم دار الامان اور دہلی ثانی بن رہا تھا''۔ ص:۴۱

''شرقی سلطنت کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دور اس سلطنت کا عہد زریں، اور پورب میں علمی بہار کا زمانہ ہے، ابراہیمی دور میں تمام اطراف کے علماء ومشائخ کھنچ کھنچ کر جون پور آ گئے اور ہندوستان کے علم کا خلاصہ یہاں جمع ہو گیا''۔ (ص:۴۵)

اس دور میں علماء کی فہرست طویل ہے اس مختصر مضمون میں ان سب کے ذکر کی گنجائش نہیں ہے تاہم چند ناموں کا ذکر ناگزیر ہے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نصیر الدین دہلوی، مولانا قیام الدین دہلوی شیخ محمد عیسیٰ دہلوی، شیخ فتح اللہ اودھی انصاری، شیخ محمد بن خضر دہلوی۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ کے مرکزی بزرگ حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ ابراہیمی دور کے اکابر اولیاء اللہ میں تھے، شیخ محمد بن خضر متوفی ۸۱۱ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور تشریف لائے، ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد گہنہ میں قریہ ولید پور وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیئے گئے، بعد میں شیخ مشید کا خاندان وہیں منتقل ہو گیا جس میں شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر شاہ اسمٰعیل ملا محمود، شاہ ابوالغوث ملا محمود اور شاہ ابواسحاق وغیرہ پیدا ہوئے۔ (ص:۴۹)

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے خیال میں دیار اعظم گڈھ میں سب سے پہلا مدرسہ شیخ مشید کی جاگیرداری میں موضع سلطان پور (بھیرا)[۳] میں جاری ہوا''۔(ص:۴۹)

اسی دور میں شیخ فتح اللہ بن عبداللہ انصاری اودھی دہلی سے جون پور آئے، جامع مسجد میں ان کا وعظ ہوتا جس میں عمائدین سلطنت شریک ہوتے، بعد میں انہیں پرگنہ ماہل میں کئی گاؤں جاگیر میں ملے، ان کی اولاد میں علمی سلسلہ باقی رہا۔مولوی حسن علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ انہیں کی اولاد میں ہوئے۔

حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری متوفی ۸۷۰ھ دور ابراہیمی کے کبار اولیاء اللہ میں تھے۔

اس دور میں علماء ومشائخ کی جو کثرت تھی وہ حد بیان سے باہر ہے، ان میں سب سے اہم اور مشہور ومقبول شخصیت حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تھی۔

قاضی صاحب نے شرقی سلطنت کے زمانے میں علماء وفضلاء کی ایک اجمالی فہرست بھی لکھی ہے جو تقریباً ستر علمائے کبار کے ناموں پر مشتمل ہے، اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اس وقت پورب کا ملک علم وعلماء کی کثرت سے کیسا بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

مشرق سلطنت کا خاتمہ بہلول شاہ لودھی کے ہاتھوں ہوا، اس حکومت کا اختتام ۸۸۱ھ میں ہوا، لودھی حکومت ۸۸۱ھ سے ۹۳۳ھ تک رہی، لودھیوں میں سلطان سکندر لودھی کا عہد سلطنت قریب قریب ویسا ہی رہا۔جیسا کہ ابراہیم شاہ شرقی کا تھا، اس کا اٹھائیس سالہ دور بہت خیر وبرکت کا تھا۔

اس دور کے چند علماء کے نام یہ ہیں۔

شیخ نظام الدین میران شاہ چشتی مانک پوری، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، مولانا الہداد حنفی جونپوری، شیخ قطب الدین بینائے دل وغیرہ۔قاضی صاحب نے تقریباً بیس نام شمار کرائے ہیں۔

تیسرا علمی دور:

دیار پورب میں تیسرا علمی دور مغل سلطنت کے قیام ۹۳۲ھ سے شروع ہوکر ۱۱۳۰ھ تک

پھیلا ہوا ہے، قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''اس دوسو سالہ مدت میں ہندوستان کے مختلف دیار وامصار کی طرح دیار پورب میں بھی بہت سے علمی و دینی مرکز پورے انبساط ونشاط کے ساتھ اپنے اپنے علمی حلقوں میں کام کرتے رہے، کہنا چاہئے کہ گذشتہ دونوں ادوار کے حسنات وبرکات تیسرے دور میں پوری طرح کھل کر سامنے آگئے تھے اور اس دیار کے قصبات وقریات علم وعلماء کی کثرت اور سرگرمی کی وجہ سے ہرات اور نیشاپور معلوم ہوتے تھے، اور اسی دور کے پانچویں سلطان شہاب الدین محمد شاہ جہاں کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ ''پورب شیراز ماست''۔(ص:۷۰)

مغلیہ حکومت کے دور میں دو بادشاہوں نے خاص طور سے پورب کے علمی چمنستان کی رکھوالی کی اور اسے آباد وشاداب رکھنے کا اہتمام کیا۔ایک جہاں گیر، دوسرے شاہجہاں۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''واضح ہو کہ صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ، اور صوبہ عظیم آباد تینوں ملکوں کے مجموعے کو ملک پورب کہا جاتا تھا اور تینوں علاقوں میں مسجدیں، مدارس، خانقاہیں ارباب علم وفن اور علماء ومشائخ سے آباد تھیں، البتہ ان میں الہ آباد اور صوبہ اودھ تیموری عہد میں جداگانہ شان رکھتے تھے، پھر ان دونوں میں صوبہ اودھ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی''۔

قاضی صاحب علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام اور مولانا خیرالدین محمد جون پوری کی کتاب تذکرۃ العلماء کے دو طویل اقتباس نقل کئے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں ملک پورب کی علمی و دینی سرگرمیوں اور رونق کا کیا حال تھا۔

ہمایونی عہد سلطنت میں دیار پورب میں کئی ایسے علماء ومشائخ آباد ہوئے جن کے خانوادوں میں صدیوں تک علم وفضل اور علماء وفضلاء کی رونق رہی، اسی دور میں ایک مشہور بزرگ میر علی عاشقان متوفی ۹۵۰ھ علاقۂ سرہند سے آکر یہاں آباد ہونے اور اپنے نام سے ایک بستی سرائے میر ضلع اعظم گڈھ میں بسائی۔

اسی زمانہ میں خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم وچراغ راجہ سید مبارک شاہ نے مبارک پور [۴] کو اپنے نام سے آباد کیا، اسی دور میں چریاکوٹ کا نام بھی دینی وعلمی تاریخ کے صفحات پر نظر آتا ہے۔

دور ہمایوں میں قاضی خاں ظفر آبادی علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔

دور اکبری میں بھی ملک پورب علم اور علماء کے لازوال سرمایہ سے مالا مال تھا۔ کبار علماء اس عہد میں یہاں موجود تھے، دور جہانگیری تو اس حیثیت سے امتیاز رکھتا ہے کہ علم اور دین کے گلستاں پر بہار چھا رہی تھی۔ جہانگیری دور میں ایک زبردست عالم وفاضل ملا محمد افضل جونپوری تھے۔ جن کے شاگردوں میں ملا محمود جونپوری اور دیوان محمد رشید جونپوری نہایت نامور ہوئے۔

دور جہانگیری میں گلستان علم پر جو بہار آنی شروع ہوئی تھی دور شاہجہانی میں وہ اپنے شباب پر آ گئی تھی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ''شاہ جہاں نے تقریباً تیس سال حکومت کی، اس کا طویل دور سلطنت علم وعلماء کے حق میں بڑا پر بہار تھا......اس کا زمانہ ہر اعتبار سے بہتر تھا بلاد پورب میں علم وفن کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور جون پور دار العلم، دار الامن اور دہلی ثانی کے القاب کے بعد شیراز ہند کے لقب سے یاد کیا گیا''۔(ص:۸۲)

دیار پورب پر شاہجہاں نے خاص توجہ کی، شاہجہاں نے اپنی بیٹی شہزادی جہاں آراء کو قصبہ مئو بطور جاگیر کے دیا۔ شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے والے کاریگروں کو جمع کیا اور جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کیلئے حجرے بنوائے۔

شیخ مشید کے خاندان میں ایک بزرگ مولانا حاجی ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ میں ملا محمود جونپوری کے بہنوئی اور معاصر تھے، وہ شاہجہانی دور میں پورب کے علمائے فحول میں شمار ہوتے تھے اور شاہی دربار سے انکے تعلقات نہایت گہرے تھے۔

جہانگیر نے ملا محمد افضل جونپوری بھیروی متوفی ۱۰۶۲ھ تھے اور دوسرے دیوان محمد رشید جون پوری متوفی ۱۰۸۳ھ تھے، استاذ الملک فرمایا کرتے تھے کہ علامہ جرجانی اور علامہ تفتازانی کے بعد ایک عہد اور ایک شہر میں ان دو فضلاء کے جیسے اب تک دو فاضل جمع نہیں ہو سکے تھے۔(ص:۶۸)

ملا محمود جونپوری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد حکمت وفلسفہ میں ان کی ٹکر کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔

اس دور میں بڑے علماء و مشائخ میں ملا رکن الدین بحری آبادی غازیپوری ،مفتی عبدالسلام دیوی ، قاضی محمد حسین جون پوری ،مفتی مبارک بن مفتی ابوالبقاء جونپوری مفتی محمد صادق بن شیخ شمس الدین جون پوری وغیرہ تھے۔

مشائخ چشتیہ میں ایک بڑے مقام ومرتبہ کے بزرگ حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی بھی اس دورشاہجہانی کی ایک عظیم برکت تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر خود ایک صاحب علم وفضل بادشاہ تھے ،انھوں نے علماء کی بڑی سر پرستی فرمائی،فتاویٰ ھندیہ کے نام سے فقہ وفتاویٰ کا عظیم الشان ذخیرہ جمع کرایا تھا۔

قاضی صاحب نے عہد عالمگیری کے علماء ومشائخ اوران کے بعد عہد تیموری کے اکابرو بزرگان کی ایک طویل فہرست لکھی ہےاور ہرایک کا مختصر مختصر تعارف کرایا ہے۔

عہد تیموری کے اواخر میں علم وفضل کی محفلیں اجڑنے لگیں تھیں ، سیاسی اتھل پتھل اور انگریزوں کی دخل اندازیوں نے بہار علم کو بڑا نقصان پہونچایا۔۱۱۳۰ھ کے بعد دہلی کی مرکزیت طوائف الملوکی سے بدل گئی۔قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''اس بدامنی میں علمی مراکز بھی تباہی سے دوچار ہوئے ،مدتوں کے جمے ہوئے مدرسے اکھڑ گئے ، خانقاہیں ویران ہوگئیں اور علماء وطلبہ ادھرادھر منتشر ہو گئے ،مورخین بغداد کی تباہی کو روتے ہیں،لیکن ہندوستان کی بربادی کی داستان اس سے کچھ کم دردناک نہیں ہے''۔ص:۱۰۳

چوتھا علمی دور:

دیار پورب کا چوتھا علمی دوراودھ کی نوابی کے قیام ۱۱۳۰ھ سے اس کے خاتمے ۱۲۷۳ھ تک کل ۱۴۳رسال ہے۔ یہ دورعلم اور علماء کیلئے بڑا نا مبارک دورتھا۔نوابان اودھ شیعی تھے،نہایت تنگ نظر تھے۔عیش وعشرت میں مست رہتے تھے انہیں علم اور علماء سے دلچسپی نہ تھی۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''اس دور میں ان اطراف کی ساری علمی رونق سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ (شیعوں) میں محدود ہوکر رہ گئی ، قدیم علمی و دینی خانوادے تباہ و برباد ہوگئے ۔ ان کی جاگیریں اور معافیاں ضبط کر لی گئیں ، وظائف بند کر دیئے گئے اور مختلف طریقوں سے ان کو شیعہ بنایا جس

کے نتیجے میں ایک نیا علمی ماحول اور نئی مذہبی زندگی قائم ہوئی‘‘۔(ص:۱۰۳)

قاضی صاحب نے اس دور کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، انھوں نے یہ داستان بھی سنائی ہے کہ کس طرح علمی و دینی خانوادوں کو جو صدیوں سے علم اور دین کی خدمت کرتے آئے تھے، شیعہ مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا اور جو لوگ سنی ہونے پر مصر ہوتے، انہیں کن کن ایذاؤں سے دوچار ہونا پڑتا، اور پھر یہ کہ شیعہ علماء کس کس طرح انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔ اس کے باوجود حوصلہ مند حضرات متعدد جگہوں پر علم وفضل کا چراغ روشن کئے ہوئے تھے۔

قاضی صاحب نے اپنی اس کتاب میں ۶۰۲ھ سے شروع کرکے ۱۲۷۳ھ تک کو چار دور میں تقسیم کرکے پورب میں علم وعلماء کی تاریخی داستان سنائی ہے۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں تاریخ کی ایک نئی جہت کا سفر شروع کیا ہے، یہ کام بہت مشکل تھا مگر قاضی صاحب کی ہمت مردانہ ایسی ہی مشکل جہتوں کو اختیار کرتی تھی اور مظفر ومنصور ہوا کرتی تھی۔ عرب و ہند کے قدیم تعلقات کی تلاش میں نکلے تو کئی کئی مجلدات تیار کر دیئے، پورب میں علم وعلماء کی کہانی سنانے بیٹھے تو تقریباً پانچ سو صفحات کا ایک ضخیم دفتر تیار کر دیا۔

اس اجمالی تاریخ اور تذکرے کے بعد قاضی صاحب نے کچھ خاص خاص بڑے بڑے علماء کے تفصیلی تذکرے لکھے ہیں جن کے ضمن میں اور بھی بہت سے علماء کا ذکر آ گیا ہے، اس طرح یہ کتاب نادر معلومات کا گنج گرانمایہ بن گئی ہے، جن علماء کا تفصیلی تذکرہ قاضی صاحب نے کیا ہے ان کی فہرست علی الترتیب یہ ہے۔

(۱) ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ۔ قاضی صاحب کا تذکرہ ص:۱۲۱ سے ص:۲۱۰ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۲) حضرت راجہ سید حامد مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ ان کا اور ان کے خانوادے کے حالات کا سلسلہ ص:۲۱۱ سے ص:۲۴۸ تک ہے۔

(۳) حضرت میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ ان کا تذکرہ ص:۲۴۹ سے ص:۲۸۷ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۴) ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ یہ تذکرہ ص:۳۸۸ سے ص:۳۷۵ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۵) مولانا حافظ امان اللہ بنارسی متوفی ۱۱۳۳ھ۔ یہ تذکرہ ص: ۳۷۶ سے شروع ہوتا اور ص:۳۹۷ پر اختتام کو پہونچتا ہے۔

(۶) مولانا شیخ غلام نقشبندی گھوسوی متوفی ۱۱۲۶۔ان کا تذکرہ ص:۳۹۸ سے شروع ہوکر ص: ۴۲۶ پر ختم ہوتا ہے۔

(۷) مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی متوفی ۱۱۷۸ھ۔ص:۴۲۷ تا ص:۴۶۳

(۸) مولوی حسن علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ۔ازص:۴۶۴ تا ص:۴۸۰

تفصیلات اصل کتاب میں پڑھنے کے لائق ہے،اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں قاضی صاحب نے پچاس کتابوں سے استفادہ کیا ہے،ان کے نام شروع کتاب میں انھوں نے درج کردیئے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) کتاب کے نام اور ہمارے اس مضمون میں ’’پورب‘‘ کا لفظ بطور وصف کے نہیں بلکہ بطور علم اور نام کے استعمال ہوا ہے اور یہ علم مغل بادشاہ شاہجہاں کے ایک جملہ ’’پورب شیراز ماست‘‘ سے ماخوذ ہے، یہ ایک خاص علاقے کا نام ہے، جس کی تفصیل آپ کو اس مضمون میں ملے گی۔اس لئے دیارِ پورب کی فارسی اضافت پر اعتراض صحیح نہیں ہے، کہ دیار عربی لفظ ہے، اور پورب ہندی، اور ایسے دو لفظوں جن میں ایک عربی یا فارسی ہو، اور دوسرا ہندی، کی فارسی اضافت صحیح نہیں ہوتی، پس جب لفظ ’’پورب‘‘ ایک خاص علاقے کا نام ہے، تو چونکہ علم ناقابل تغیر ہوتا ہے، اس لئے یہ اضافت درست ہے۔

(۲) سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

یہ (اودھ) اصل میں اس شہر کا نام تھا، جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل تھا، جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے، مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں (اودھ)

کیااورایک پورے صوبے کا نام ہے۔(حیات شبلی ص:۷)

(۳) بھیراایک متوسط آبادی کا گاؤں ہے، جومحمد آباد کے شمال میں مائل بہ مغرب تین کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے،ٹونس ندی کے شمالی کنارے پرآباد ہے،راقم الحروف کا مولد یہی گاؤں ہے۔

(۴) قاضی اطہر صاحب مبارکپور ہی کے رہنے والے تھے، اوراسی نام کی نسبت سے اپنے کو مبارکپوری لکھتے ہیں۔

حضرت مولانا سیّد زوّار حسین شاہ صاحب علیہ الرحمہ

بحیثیت مترجم

رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر یافتاح بک نستعین

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ انبیائہ المرسلین خصوصاً علیٰ اشرفھم وخاتمھم سیدنا محمد المصطفیٰ احمد المرتضیٰ وعلیٰ آلہ وأصحابہ وأتباعہ نجوم الھدی، أمابعد!

اسلامی علوم ومعارف کے خزانے سے اولاً عربی زبان مالا مال ہوئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب کے لئے عربی زبان کا انتخاب کیا، اور اپنے آخری نبی کو عرب میں مبعوث فرمایا، اس کا قدرتی اور فطری اثر یہی ہونا تھا کہ ابتداءً اسلامی علوم کا تمامتر ذخیرہ عربی زبان میں آیا۔ پھر اہل عرب کے قریب تر جو زبان تھی وہ فارسی تھی، جب اسلام کے ابر کرم کا فیضان عرب سے آگے بڑھا تو سب سے پہلے دوسری زبانوں میں جو زبان اس سے مانوس اور شاداب ہوئی، وہ فارسی زبان تھی، چنانچہ عربی کا یہ ذخیرہ آہستہ آہستہ فارسی میں منتقل ہوتا رہا۔ ترجمے کی شکل میں بھی اور مستقل تصنیف وتالیف کی شکل میں بھی! فارسی زبان بولنے اور لکھنے والے بکثرت حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان میں ایک بڑی تعداد تو عربی زبان میں ضم ہوگئی، لیکن ایسے بھی بہت ہوئے جن کی بولنے اور لکھنے کی زبان فارسی ہی رہی، پھر جب مسلمان فاتحین کے ذریعے فارسی زبان ہندوستان میں داخل ہوئی تو علوم اسلامی کا بیشتر سرمایہ یہاں بھی فارسی زبان میں آ گیا، ہندوستان میں مسلمانوں کی بنیادی علمی زبان فارسی قرار پائی، اس لئے دینی علوم زیادہ تر فارسی زبان میں

منتقل ہوگئے، علماء ومشائخ نے تصنیف وتالیف کے لئے زیادہ تر فارسی زبان کو اختیار کیا۔

اس علمی اور دینی سرمایہ کا ایک اہم حصہ وہ کتابیں ہیں جن کا تعلق تصوف وسلوک سے ہے۔ اس موضوع پر فارسی زبان میں ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آیا، تصوف وسلوک کی جو کتابیں ہندوستان میں زیادہ مشہور ومقبول ہوئیں، وہ (۱) حضرت خواجہ علی بن عثمان داتا گنج بخش ہجویری لاہوری کی ''کشف المحجوب''۔ (۲) محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی کے ملفوظات ''فوائد الفؤاد''۔ (۳) بہار کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی سہ صدی اوران کے ملفوظات ''معدن المعانی''۔ (۴) امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات، (۵) ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات ہیں۔ جب تک ہندوستان میں فارسی زبان کا رواج رہا، یہ کتابیں فارسی زبان میں پڑھی جاتی رہیں۔ پھر جب فارسی وعربی کے سائے میں ایک نئی زبان اردونشو ونما پانے لگی تو عربی اور فارسی کا ذخیرہ اس نئی زبان میں منتقل ہونے لگا، اس زبان کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے بڑی مناسبت تھی، اس لئے اسلامی علوم وفنون کو اردو زبان میں منتقل کرنا آسان تھا۔ اردو زبان آہستہ آہستہ ترقی کرتی گئی اور حالات ایسے پیدا ہوئے کہ فارسی زبان سمٹتی چلی گئی۔ اس صورت حال میں علماء نے اس خزانہ کو اردو زبان میں منتقل کرنا ضروری سمجھا، تاکہ اردو بولنے والی نسل دین سے بے بہرہ نہ ہوجائے، چنانچہ مستقل تصنیف کے علاوہ ترجمہ کا کام بھی بڑے پیمانے پر ہوا، لیکن ترجمہ کا کام ایک مشکل کام ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا بڑی مہارت اور حذاقت کو چاہتا ہے، طبع زاد تصنیف میں مصنف آزاد ہوتا ہے، جن معلومات کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے، انھیں اپنی تعبیر، اپنے اسلوب اور اپنے انداز میں ڈھال لیتا ہے، اختصار کے ساتھ ہو یا تفصیل کے ساتھ! ایجاز کے ساتھ ہو یا اطناب کے ساتھ!

لیکن ترجمہ کرنے میں وہ دوسرے کا پابند ہوتا ہے، اسے مصنف کی زبان میں مصنف کی مراد سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے، پھر ضروری ہوتا ہے کہ اس کی مراد کو بعینہٖ دوسری زبان میں منتقل کرے، اس پابندی کو نبھانے کے لئے مترجم کو

(۱) دو زبانوں کا ماہر ہونا ضروری ہے، ایک اصل کتاب کی زبان کا، دوسرے ترجمہ والی

زبان کا ۔ ہرایک کے اسالیب اور تعبیرات سے وہ کما حقہ واقف ہو، تاکہ مصنف کی مراد اور اس کے مقصد کو سمجھ سکے، اور پھر دوسری زبان کی اسی تعبیر میں اسے ادا کرے، جو تصنیف کے اسلوب وتعبیر کے مترادف ہو، اگر اس نے مصنف کا مقصد نہیں پایا تو ترجمہ غلط ہوگا، اور اگر اس کا مقصد تو پا گیا، مگر ترجمہ کی زبان میں اس کی تعبیر نہ پا سکا تو مطلب الجھ کر رہ جائے گا۔

(۲) اسی طرح ہر فن میں کچھ اصطلاحی الفاظ ہوتے ہیں، اصطلاحات کا ترجمہ اور مشکل ہوتا ہے، اصل کتاب کی اصطلاحات کو سمجھنا، پھر اس کے مفہوم کو دوسری زبان میں ادا کرنا بغایت دشوار ہوتا ہے، بالخصوص اگر اس کی مترادف اصطلاح دوسری زبان میں موجود ہو، تو اس کی تلاش اور اس کا استعمال بہت وسعت نظر اور دقت نظر کو چاہتا ہے۔

(۳) ہر زبان کا نحوی وصرفی قواعد اور ترکیب الفاظ کے اعتبار سے ایک خاص مزاج اور اسلوب ہوتا ہے، ترجمہ میں اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے، ترجمہ اسی ترکیب واسلوب کے مزاج میں ہو، نرا لفظ کے نیچے لفظ کا ترجمہ، جیسا کہ درس وتدریس میں کبھی بضرورت اختیار کرنا پڑتا ہے، تصنیف میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۴) ہر زبان میں کلمات کے درمیان ربط کے لئے کچھ حروف ہوتے ہیں، جنھیں حروفِ جر، حروفِ ربط یا صلہ کہا جاتا ہے، ان حروف کے استعمال کا طریقہ ہر زبان میں علیٰحدہ ہے، انھیں جاننا بہت ضروری ہوتا ہے، ورنہ ترجمہ خبط ہو کر رہ جائے گا۔

(۵) مترجم کو اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ترجمہ کی عبارت اصل عبارت سے بہت زیادہ بڑھنے نہ پائے، مترجم کو اگر دونوں زبانوں پر قدرت ہوتی ہے اور مفہوم کو صحیح طور سے پالیتا ہے تو اصل عبارت کے مطابق ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، اور اگر اس میں کچھ خلل ہوتا ہے تو مطلب ادا کرنے کے لئے اسے طول طویل عبارت لانی پڑتی ہے، یہ ترجمہ کا عیب ہے۔

(۶) پھر ترجمہ اتنا واضح اور سلیس ہونا چاہئے کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مطلب ذہن نشین ہوتا چلا جائے، پڑھنے والا اگر خود صاحب فن ہے تو اسے کہیں الجھن نہ ہو۔

(۷) پھر مترجم کو دیانت دار بھی ہونا چاہئے کہ مصنف نے جس نظریہ کو پیش کیا ہے، مترجم بعینہٖ اسی کو پیش کرے، کوئی تصرف اس میں نہ کرے، اگر اسے اختلاف ہو تو حاشیے میں ظاہر کرسکتا

ہے،مگراس طرح ترجمہ کرنا کہ اصل نظریہ ہی تبدیل ہوجائے درست نہیں۔

اردو زبان میں ترجموں کی بہتات ہے، بہت اچھے ترجمے بھی ہیں، اور اغلاط کے مجموعے بھی! اس مقالہ میں ہم ایک ممتاز اور کامیاب مترجم اور ان کی ترجمہ کی ہوئی کتاب کا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔

حضرت مولانا سیّد زوّار حسین شاہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ:

یہ ہیں پاکستان کے نامور شیخ ومرشد، سلسلۂ نقشبندیہ کے گل سرسبد، صاحب نسبت بزرگ، صاحب تصانیف، عالم ربانی حضرت مولانا زوار حسین صاحب نقشبندی مجددی نور اللہ مرقدہٗ۔ہم ان کا تعارف بحیثیت مترجم کرانا چاہتے ہیں۔

ہمارے سامنے حضرت موصوف کے دو ترجمے ہیں (۱) حضرت امام ربانی سیّدنا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے مکتوبات کا ترجمہ۔(۲) حضرت مجدد صاحب کے فرزند گرامی اور جانشین عروۃ الوثقیٰ حضرت خواجہ محمد معصوم فاروقی قدس سرہٗ کے مکتوبات کا مکمل ترجمہ۔

دونوں بزرگوں کے مکاتیب کا موضوع تصوف وسلوک ہے! یہ دونوں حضرات تصوف کے بڑے امام گزرے ہیں، انھوں نے تصوف وسلوک کی گہرائیوں میں اتر کر علم معرفت کے تابدار موتی نکالے ہیں۔

حضرت مجدد صاحب کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے، اور نہ ان کے علوم ومعارف جو مکتوبات کے تین دفتروں میں دریا بکوزہ کے مصداق ہیں، یہ علوم ومعارف اتنے بلند اور دقیق ہیں کہ ان تک رسائی بہت مشکل ہے، جب تک حضرت مجدد صاحب علیہ الرحمہ کے علوم سے کسی کو مناسبت نہ ہو، اور تصوف کی اصطلاحوں پر پورا عبور نہ رکھتا ہو، نیز عملی طور پر ان منازل ومقامات کا تجربہ نہ رکھتا ہو، جنھیں مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ اپنے مکتوبات میں بکثرت بیان کرتے ہیں، جب تک یہ نہ ہو، وہ ان علوم ومعارف کو سمجھ بھی نہیں سکتا، ترجمہ کرنا تو دور کی بات ہے۔

حضرت مولانا زوار حسین صاحب علیہ الرحمہ کے ترجموں کے مطالعہ اور ان کے اصل کے ساتھ مقابلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موصوف ان تمام اوصاف سے بوجہٗ اتم متصف ہیں، جن کا اس خاکسار نے ذکر کیا ہے، فارسی زبان اور اردو زبان پر پورے عبور ومہارت کے

ساتھ ساتھ خاص بات یہ ہے کہ وہ بحرِ تصوف وسلوک کے بہترین اور ماہر شناور تھے، وہ ان مقامات ومنازل سے واقف تھے، جن کا حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات میں تذکرہ آیا ہے۔

حضرت موصوف نے امام ربانی کے سو مکتوبات کا ترجمہ کیا ہے، باقی ترجمہ کا کام ان کے خصوصی مسترشد اور خلیفہ حضرت حاجی محمد اعلیٰ صاحب نے اور ان کے دوست پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد عادل صاحب سہارن پوری نے مکمل کیا، چنانچہ پیش لفظ میں حاجی محمد اعلیٰ صاحب لکھتے ہیں:

''سیّدی ومرشدی حضرت مولانا سید زوّار حسین شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے جو سو مکتوبات کا اردو ترجمہ کیا تھا وہ محفوظ ہے، علاوہ ازیں آپ کی تالیف ''حضرت مجدد الف ثانی'' میں بھی جگہ جگہ بکثرت مکتوبات کے اجزا کا ترجمہ موجود ہے، لہٰذا ان کی روشنی میں بسم اللہ کر دی جائے اور جہاں ضرورت ہو دوستوں کو تکلیف دی جائے، چنانچہ کام شروع کئے ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک مہربان دوست جناب پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد عادل صاحب سہارن پوری مدظلہ العالی نے ازخود بقیہ اجزا کے ترجمہ کی خدمت اپنے ذمہ لے لی۔

چونکہ ترجمہ کا زیادہ تر حصہ اور تشریح وتعلیقات، نیز مکتوب الیہم اور دیگر بزرگوں کے تذکرے وغیرہ حضرت شاہ صاحب کی کتاب سے استنباط کئے گئے ہیں، اس لئے پیش نظر ترجمہ کو حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے نام نامی اسم گرامی سے شائع کیا جا رہا ہے۔''

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، پیش لفظ، ص:۲۷، ج:۱)

پیش لفظ کے اس اقتباس سے ترجمہ کی تفصیلات معلوم ہوگئیں، لیکن یہ سوال رہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے صرف سو ہی مکتوبات کے ترجمے پر کیوں اکتفا کی، اس کا جواب حاجی صاحب مدظلہٗ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''مزید ترجمہ اس خیال سے نہیں کیا کہ مکتوبات شریف کے ترجمے تو بہرحال موجود ہیں، لیکن مکتوبات معصومیہ کے ترجمہ کو تو کسی نے بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے، لہٰذا اس کو مقدم کرنا چاہئے، چنانچہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے بفضلہٖ تعالیٰ مکتوبات معصومیہ کے تینوں دفتروں کا اردو ترجمہ فرمایا، جس کو ادارہ مجددیہ شائع کر چکا ہے اور دستیاب ہے''۔

اس تفصیل کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے ترجمے کے کچھ

نمونے پیش کردئے جائیں، یہ نمونے آسان مضامین سے بھی لئے جائیں گے اور ان مقامات سے بھی لئے جائیں گے، جو دقیق اور مشکل علوم و معارف پر مشتمل ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت موصوف کو ترجمہ و تفہیم پر کیسی قدرت حاصل تھی۔

مقام عبدیت:

حضرت مجدد صاحب کے وہ مکتوبات جو انھوں نے اپنے شیخ و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کو اپنے سیر وسلوک کے احوال میں لکھے ہیں، وہ بہت دقیق ہیں، ایک نمونہ اس میں سے درج کیا جاتا ہے:

''پس لاجرم مقام عبدیت فوق جمیع مقامات باشد چہ ایں معنی در مقام عبدیت اتم واکمل است، محبوباں را بایں مقام مشرف می سازند، محبان بذوق شہود متلذذ اند، التذاذ در بندگی وانس بآں مخصوص بمحبوبان ست، انس محبان بمشاہدۂ محبوب ست وانس محبوبان بہ بندگی محبوب ودریں انس ایشاں را بایں دولت می رسانند و بایں نعمت سرفراز می سازند، شہسوار یکہ تاز ایں میدان آں سرور دنیا ودیں وسیّد اولین وآخرین حبیب رب العالمین است **علیه من الصلوٰة أتمها ومن التحيات أكملها**

وکسے را کہ بمحض فضل خواہند کہ بایں دولت رسانند اورا بکمال متابعت آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام می سازند و بتوسل آں بآں ذروۂ علیا می برند، **ذٰلک فضل الله يوتيه من يشاء، والله ذو الفضل العظيم**۔ (دفتر اول، مکتوب:۹)

ترجمہ: پس لازمی طور پر عبدیت کا مقام تمام مقامات سے بلند ہوگا، اس لئے کہ یہ معنی (یعنی اپنے نقص کو دیکھنا) مقام عبدیت میں کامل اور مکمل طور پر پائے جاتے ہیں (لہٰذا) محبوبوں کو اس مقام سے مشرف فرماتے ہیں اور محبین (محبت کرنے والے) ذوق شہود کے ساتھ لذت حاصل کرتے ہیں، بندگی میں لذت حاصل کرنا اور اس کے ساتھ انس اختیار کرنا محبوبوں کے ساتھ مخصوص ہے، محبوں کا انس محبوب کے مشاہدے میں ہے، اور محبوبوں کا انس محبوب کی بندگی میں ہے، اسی انس (بندگی) میں ان کو اس (دید نقص) کی دولت کا شرف بخشتے اور اس نعمت کے ساتھ سرفراز کرتے ہیں،

اس میدان کے یکتا شہسوار دنیا ودین کے سردار، اولین وآخرین کے آقا، حبیب رب العالمین ہیں (**علیہ من الصلوٰۃ أتمہا ومن التحیات أکملہا** آپ پر کامل ترین درود اور اکمل ترین سلام ہوں)

اور (کارکنان قضاوقدر) جس کو محض فضل وکرم سے (نقص اعمال کے دیکھنے کی) یہ دولت عطا فرمانا چاہتے ہیں اس کو آں سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کمال متابعت سے نصیب فرماتے ہیں، اور اس متابعت کے وسیلے سے اس کو مقامات بلند کی دہلیز تک لے جاتے ہیں، **ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ، واللہ ذوالفضل العظیم**۔ (مکتوب:۹)

انسان نقائص اور عیوب کا مجموعہ ہے، اس کی اصل نہاد عدم ہے، اور عدم ہی ہر نقص اور ہر عیب کا سرچشمہ ہے، لیکن یہ نقص ہی ہے، جو کمال کا آئینہ ہے، کمالات اسی آئینۂ نقص میں جھلکتے ہیں، اور عیب ہی ہنر کی جلوہ گاہ ہے، اسی عیب کے پس منظر میں کمالات کا ظہور ہوتا ہے، پانی وہیں پہونچتا ہے، جہاں پستی ہوتی ہے، پس انسان کا یہ نقص وعیب ہی کمالات کا مظہر ہے، اس نقص وعیب سے مناسبت رکھنے والی چیز بندگی اور غلامی ہے۔ ''دید قصور'' سے غلامی کا احساس بیدار ہوتا ہے، پس آدمی جب اپنی اصل پر نگاہ رکھتا ہے تو اس کے سامنے حق تعالیٰ کی کبریائی جلوہ گر ہوتی ہے، اور اس کا صحیح عرفان حاصل ہوتا ہے، جو کہ مقصود خلقت انسانی ہے، **وما خلقت الجن والانس إلا لیعبدون** کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس سے ''**لیعرفون**'' منقول ہے، یعنی جن وانس کو حق تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ انھیں معرفت الٰہی نصیب ہو۔

پس بندگی میں اپنے قصور ونقص کی بھی معرفت ہے، اور حق تعالیٰ کے کمال وجلال کی بھی! یہ درجہ انسانیت کا بلند ترین درجہ ہے، جس سے وہی لوگ نوازے جاتے ہیں، جو حق تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں، محبوبیت کے مقام بلند پر حضرت سرور دنیا ودین، پیغمبر آخریں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ فائز ہیں، اس لئے جب ان کے انتہائے عروج کا وقت آیا تو انھیں ''عبد'' بندہ وغلام سے حق تعالیٰ نے تعبیر فرمایا: **سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام إلی المسجد الاقصیٰ**۔ (سورہ اسراء) پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو ایک رات میں

مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ میں پہونچادیا، اور فرمایا: **وأنه لما قام عبد الله يدعوه كادوا يكونون عليه لبداً** (سورہ جن:۱۹) اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ عبادت کے لئے کھڑا ہوتو ایسا لگتا ہے کہ اس پر ہجوم کر آئیں گے) نماز کی حالت انسان کی انتہائی بلندی کا وقت ہے، اور اسی حالت میں اس کا انتہائی تذلل ظاہر ہوتا ہے، پس یہ بھی عبدیت ہی کا مقام ہے، عجب حق تعالیٰ کی مہربانی ہے، کہ جو کمی اور کوتاہی تھی اسی کو اس پروردگار نے عروج وکمال کا زینہ بنادیا۔ حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں:

> عجائب کار وبار است کہ ایں ذم معنی مدح پیدا کرد وایں شرارت ونقصان محل خیر وکمال گشت۔ (مکتوب:۹)
>
> عجیب معاملہ ہے کہ اس ذم (برائی) نے مدح (تعریف) کے معنی پیدا کر لئے، اور یہ شرارت ونقصان خیر وکمال کا محل بن گیا۔

آپ مکتوب شریف کی اصل عبارت پڑھئے، اور ترجمہ پڑھئے، بامحاورہ وسلیس ہونے کے ساتھ کتنا واضح اور خوبصورت ہے، اور ساتھ ہی اصل مکتوب کی عبارت کے الفاظ کی تعداد کے قریب قریب مساوی ہے۔

مکتوبات خواجہ محمد معصوم صاحب قدس سرہٗ:

حضرت مولانا سیّد زوار حسین شاہ صاحب نے مجدد الف ثانی سیدنا امام ربانی کے فرزند وجانشین حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کے مکاتیب کا بتمام وکمال ترجمہ کیا ہے، ان مکاتیب قدسیہ کا تعارف حضرت مترجم نے جن الفاظ میں کرایا ہے، انھیں نقل کرتا ہوں:

> ''امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ السامی کے صاحبزادے اور جانشین عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ کے مکتوبات شریف بھی بزبان فارسی وعربی آپ کے والد بزرگوار کے مکتوبات شریفہ کی طرح بہت بلند درجہ رکھتے ہیں، اور شریعت وطریقت، حقیقت ومعرفت کے جامع اور ادب وانشاء کا اعلیٰ شاہکار ہیں، ان میں سالکان طریقت کو پیش آنے والے سوالات کے جوابات، خوابوں کی تعبیرات اور بہت سے فقہی مسائل کا حل ہے، نیز مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی قدس

سرہٗ کے بہت سے ادق مقامات کی تشریح پر مشتمل ہے، جو سالکان طریقت کے لئے ایک بے بہا ذخیرہ اور انمول خزانہ ہیں''۔(مقدمہ، دفتر اول،ص:۱۸)

مکتوبات امام ربانی کے ترجمے تو متعدد علماء نے کئے، لیکن مکتوبات معصومیہ کا اردو ترجمہ نہیں ہو سکا تھا، اس لئے اردو خواں طبقہ ان مکتوبات کے مطالعہ اور ان کے فیوض و برکات سے محروم تھا، حضرت شاہ صاحب نے ان کے ترجمے کا عزم کیا، اور بحمد اللہ حرفاً حرفاً پورا ترجمہ کر دیا۔ ایسا سلیس اور عام فہم کہ جس کو ذرا بھی مناسبت ہو وہ آسانی سے سمجھ جائے، جو مضامین ادق اور بلند ہیں، انھیں عام عقل و ذہن پر اتارنا تو ممکن نہیں، لیکن ترجمہ کی سلاست اور عمدگی نے انھیں اصحاب فن سلوک کے لئے سہل کر دیا ہے۔

ہم ان مکاتیب کے کچھ اقتباسات اور ان کے ترجمے نقل کرتے ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ ترجمہ جیسا جانکاہ اور نازک عمل کس درجہ عمدگی کے ساتھ ہوا ہے۔

عظمتِ مصطفیٰ ﷺ:

مکتوبات معصومیہ کھولئے اور دسواں مکتوب پڑھئے، کیا عشق و محبت ہے، کیا والہانہ انداز ہے، کیا فصاحت و بلاغت ہے، حضور سرور کائنات فداہ ابی و امی و روحی کی سرکار میں عقیدت و عظمت کا وہ جوش ہے کہ پڑھنے والے کا ایمان تازہ ہو جائے، اگر چہ فارسی ادب و انشا کا ذوق اب عنقاء ہے، مگر محبت و معرفت کی فراوانی اور حسن عبارت کی دلآویزی تقاضا کرتی ہے کہ پورا مکتوب نقل کیا جائے، پڑھئے اور بار بار پڑھئے، بغور پڑھئے، پھر قدم بقدم ترجمہ بھی ملاحظہ کیجئے:

''الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ،

نقد سعادت دارین وابستہ بمتابعت سید کونین ست، علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام، اگر نجات از نار ست، مربوط بمتابعت سید ابرار ست، اگر دخول بدار القرار ست، ہم منوط باتباع قدوۃ الاخیار ست، واگر رضائے پروردگار ست، نیز مشروط بہ پس رویِ سید مختار ست، توبۂ وزہد و توکل و تبتل بے تبعیت او نامقبول ست واذکار وافکار واشواق واذواق بے توسل وے غیر مامول۔

انبیاء بقدرے از سرچشمۂ آب حیات او سیراب و متمتع، واولیاء بجرعۂ از بے بحر

پایان او قانع ومتنفع! ملک طفیلیٔ اوست وفلک حویلیٔ او، رشتۂ وجود باو مسلوک ست وسلسلۂ ایجاد بوے مربوط، وظہور ربوبیت باو منوط، کائنات جملگی درقفائے ویند، ومکوّن کائنات طالب رضائے او! کماورد ''أنا أطلب رضاء ک یا محمد'' ؎

نماند بعصیاں کسے درگرو   کہ دارد چنیں سیدے پیش رو

فان رسول الله نور یستضاء به

مهند من سیوف الله مسلول

صلوات الله تعالیٰ وتسلیماته وتحیاته سبحانه علیه وعلیٰ آله وصحبه کلما ذکره الذاکرون وکلما غفل عن ذکره الغافلون صلوة تکون لک رضاء ولحقه اداء.

پس بر جوانانِ سعادت مند وطالبان ہوش مند لازم است کہ ظاہراً وباطناً در اتباع اوکوشند وہر چہ منافی ایں دولت بود، چشم سَر وسِر ازاں پوشند وبیقین یقین دانند کہ اگر شخصے ہزاراں ہزار فضائل وخوارق داشتہ باشد ودر متابعت مداہن بود، صحبت ومحبت او سم قاتل ست، وشخصے کہ ہیچ ازیں خوارق وفضائل ندارد ودر اتباع قدم راسخ دارد صحبت ومحبت او تریاق نافع!

بیت

محال ست سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پے مصطفیٰ

علیه وعلیٰ آله الصلوات والتسلیمات والبرکات العلی

اب اس مکتوب شریف کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

" الحمد لله وسلام علیٰ عباده الذین اصطفیٰ (سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہو) دونوں جہاں کی سعادت کی متاع سید کونین ﷺ کی پیروی پر موقوف ہے، اگر دوزخ سے نجات مقصود ہے، تو وہ بھی سید ابرار ﷺ کی متابعت سے وابستہ ہے، اور اگر دارالقرار یعنی جنت میں داخل ہونا ہے، تو وہ بھی پیشوائے صالحین کے اتباع پر منحصر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کا

حاصل ہونا ہے، تو وہ بھی رسول مختار کی پیروی کے ساتھ مشروط ہے، توبہ وزہد وتوکل اور دنیا سے قطع تعلق کرنا آپ کی متابعت کے بغیر مقبول نہیں، اور آپ کے توسل کے بغیر اذکار اوراشواق واذواق کی امید نہیں کی جاسکتی، انبیاء علیہم السلام آپ کے سرچشمۂ آب حیات کے ایک پیالہ سے سیراب ومستفید ہیں، اور اولیاء اللہ آپ کے بے پایاں سمندر کے ایک گھونٹ پر قانع ومنتفع ہیں، فرشتے ان کے طفیلی اور آسمان ان کی حویلی ہے، وجود کا رشتہ ان کے ساتھ منسلک اور ایجاد کا سلسلہ ان کے ساتھ مربوط اور ربوبیت کا ظہور ان کے ساتھ وابستہ ہے، جملہ کائنات ان کے ہی پیچھے ہے، اور کائنات کا بنانے والا (اللہ) تعالیٰ، ان کی رضا کا طالب ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے: ''**أنا أطلب رضاءک یا محمد**'' (اے محمد ﷺ) میں تیری رضا چاہتا ہوں۔

جس کا امام ایسا سردار ہو، وہ شخص گناہوں کے بدلے میں گروی نہ رہے گا۔
بلاشبہ رسول اللہ ﷺ ایسا نور ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اور آپ
اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے، میان سے نکلی ہوئی ایک (ہندی) عمدہ تلوار ہیں۔

صلوات اللہ تعالیٰ وتسلیماتہ وتحیاتہ سبحانہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ کلما ذکرہ الذاکرون وکلما غفل عن ذکرہ الغافلون صلوۃ تکون لک رضاء ولحقہ اداء، (اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور سلامتیاں اور نوازشات آپ پر اور آپ کی آل واصحاب پر ہوں، جب تک کہ ذکر کرنے والے اللہ کا ذکر کرتے رہیں، اور جب تک ذکر سے غافل لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہیں، ایسی رحمتیں جو اس کے لئے رضا کا باعث ہوں، اور اس کے حق کی ادائیگی کا ذریعہ ہوں)

پس سعادت مند جوانوں اور ہوش مند طالبو پر لازم ہے کہ ظاہر وباطن میں آنحضرت ﷺ کے اتباع کی کوشش کریں، اور جو چیز اس دولت (اتباع رسول) کے منافی ہے اس سے ظاہر وباطن کی آنکھ بند کرلیں، اور یقینی طور پر جان لیں کہ اگر کوئی شخص ہزار ہا فضائل وخوارق رکھتا ہو اور آنحضرت ﷺ کی متابعت میں سستی کرتا ہو، تو اس شخص کی صحبت ومحبت زہر قاتل ہے، اور جو شخص کہ ان فضائل وخوارق میں سے کچھ بھی نہ رکھتا

ہو، اور آنحضرت ﷺ کے اتباع میں ثابت قدم ہو، اس کی صحبت ومحبت نفع دینے والی تریاق ہے۔

(اے سعدی! حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیروی کے بغیر پرہیزگاری کے راستہ پر چلنا محال ہے)

علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات والبرکات العلی،

اصل مکتوب اور اس ترجمہ کو پڑھئے، اصل مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ کہیں کوئی ژولیدگی اور تعقید نہیں ہے، ورنہ ترجمہ میں تھوڑی سی بے احتیاطی سے تعقیدات پیدا ہو جاتی ہیں۔

صورت والفاظ معتبر نہیں حقیقت ومعنی معتبر ہیں:

حضرت خواجہ صاحب کے ایک مسترشد نے اپنے عریضہ میں اپنے عربی وفارسی اشعار لکھ کر حضرت کو ملاحظہ کے لئے بھیجے، حضرت نے ان کی دلجوئی کی اور ان کے فن کی داد دی، لیکن ساتھ ہی نصیحت کی کہ الفاظ وعبارت سے پہلے معانی پر توجہ کرنی چاہئے، وہ نہ ہو تو الفاظ وعبارت کی کاریگری مفید نہیں، فرماتے ہیں:

"لیکن پیش از تحقق معنی بصور وحروف در ماندن بطالت ست، از گفت وشنود کارے نمی کشاید، اقبال دائم بصفت ذل وعجز بجناب قدس درکارست ومراقبہ متواتر، بنعت فرورفتگی ونیستی کہ فی الحقیقت کمال بے نعتی ست وبے رسمی، مطلوب ست تا باشد کہ قطرۂ از چاشنی معنی درکام جان او بچکانند، واورا ازاں سیراب ابد سازند وایں کار اوست سبحانہ وتعالیٰ وموہبت صرفہ است، آنچہ بظاہر ایں وابستہ است دوام عبودیت وتفقد است وہموارہ متعطش وبے آرام بودن وجز از ویچ چیز مالوف ناشدن وبآتش شوق اوسوختن وہمہ وقت بایں تلواسہ ساختن وبدیں سوز گداختن ست، آیت کریمہ **وما خلقت الجن والانس إلا ليعبدون** شاہد ایں معنی است۔ (مکتوب دفتر اول، مکتوب: ۵۱)

ترجمہ: لیکن معنی کے متحقق ہونے سے پہلے صورتوں اور حروف میں رہ جانا بے کار بات ہے، صرف کہنے اور سننے سے کوئی کام نہیں چلتا، ذلت وعاجزی کی صفت کے ساتھ ہمیشہ بارگاہ قدس کی طرف متوجہ رہنا درکار ہے اور فنائیت اور نیستی کی

صفت کے ساتھ جو کہ حقیقت میں کمال بے وصفی اور بے رسمی ہے، متواتر مراقبہ مطلوب ہے، تا کہ ایسا ہو کہ معنی کی چاشنی کا ایک قطرہ اس کی جان کی حلق میں ٹپکائیں، اور اس سے اس کو ابدی سیرابی عطا کردیں، اور یہ اس (اللہ) سبحانہ وتعالیٰ کا کام ہے، اور محض عنایت وبخشش ہے، جو چیز کہ بظاہر اس کے ساتھ وابستہ ہے وہ ہمیشہ کی عبودیت (بندگی)اور تلاش ہے، اور ہمیشہ پیاسا اور بے آرام رہنا ہے، اور اس کے علاوہ کسی چیز سے محبت نہ کرنا، اور اس کے شوق کی آگ میں جلنا، اور ہر وقت اس کے ساتھ بے قرار رہنا اور اس سوز کے ساتھ پگھلنا ہے، آیت کریمہ وو ما خلقت الجن والانس إلا ليعبدون ،(اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) اس معنی کے لئے شاہد ہے۔

آخرت کی نجات شریعت حقہ پر موقوف ہے:

بعض اوقات سالک کو دوران سلوک کچھ ایسے احوال پیش آتے ہیں، جو بظاہر شریعت کے مطابق نہیں ہوتے، یہ چیز عموماً سالکین کے لئے ایک مشکل اور آزمائش کی چیز ہوتی ہے، مرشد کامل ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ کی توفیق ہوتی ہے، تو سالک اس آزمائش سے کامیاب گزر جاتا ہے، ورنہ بعض اوقات یہ چیزیں ہلاکت کا سبب بن جاتی ہیں، ایک سالک نے شریعت پر استقامت کا اپنے بارے میں ذکر کیا، تو اس کے جواب میں خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں، اصل مکتوب کا اقتباس اور اس کے ترجمہ کی خوبی ملاحظہ فرمائیے:

"آنچہ در مکتوب اخیر مندرج بود کہ باوجود مغلوبئ اذواق باطن، ظاہر ہمہ بر طبق شریعت غرا است، بل آنچہ در مرآت شرائع مواجید مشہود ست اوفر الاحتظاظ است الخ ذوق بر ذوق افزود، حق سبحانہ مدار نجات اخروی را مربوط بشریعت حقہ کہ بوحی قطعی ثابت شدہ است ساختہ، وقرب خود را منوط باتباع سنت سنیہ نمودہ است، آیت کریمہ قل إن كنتم تحبون اللہ الآیۃ مشعر بآنست"۔ (مکتوب: ۵۷) دفتر اول

ترجمہ: اور یہ جو دوسرے خط میں تحریر تھا کہ "باطنی اذواق سے مغلوب ہونے کے باوجود ظاہر پوری طرح شریعت غرا کے مطابق ہے، بلکہ شرائع کے آئینے میں

جو مواجید مشاہد ہوتے ہیں بہت زیادہ لذت دیتے ہیں الخ‘‘ اس نے ذوق پر ذوق بڑھایا، حق سبحانہ وتعالیٰ نے آخرت کی نجات کا مدار شریعت حقہ کے ساتھ، جو کہ وحی قطعی سے ثابت ہو چکی ہے، وابستہ کیا ہے، اور اپنے قرب کو سنت منورہ کے اتباع پر موقوف کیا ہے، آیت کریمہ **قل إن کنتم تحبون اللّٰہ** الخ اس بات کی خبر دیتی ہے۔

لفظ کے مطابق لفظ کا ترجمہ ہے، اسے آپ ترجمہ لفظی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن سلاست اور اردو کے اسلوب میں کہیں خلل واقع نہیں ہوا، یہ ترجمہ کا کمال ہے، آگے حضرت خواجہ صاحب معرفت کی مزید گہرائی میں اترتے ہیں:

’’ وآنچہ بعضے از سالکاں را در اثنائے راہ امورے کہ بظاہر خلاف طور نبوت است، روئے می دہد، اگر از مقبولانست ظاہر اورا باحکام شرعیہ متحلّی می دارند، واز ورطۂ مہالک محافظت می نمایند وخلاف وجدان او، از وبعمل می آرند جمعے را از یں شہود می برآرند وبحقیقت کار کہ اسلام حقیقی است ودراں موطن مطابقت کشوف است باعلوم شرعیہ مہتدی سازند، وجمعے دیگر را در ہمیں شہود تا آخر می دارند، لیکن مقبولاں را کلائت ولید می فرمایند۔

الحمد للہ از مطالعہ مراسلات لطیفہ حظے فرا گرفتہ، از اصالت نسبت است کہ نوشتہ اند کہ مہما امکن از دائرۂ احکام بیروں رفتن نمی گزارند ودر ہر حکمے ذوق خاص لطیفۂ دل را حاصل است ومواجید ہمہ برطبق سنت سنیہ۔

ترجمہ: اور یہ جو بعض سالکوں کو راہ سلوک طے کرنے کے دوران بعض امور جو بظاہر طریقہ نبوت کے خلاف ظاہر ہوتے ہیں، اگر وہ سالک مقبول بندوں میں سے ہے، تو اس کے ظاہر کو احکام شرعیہ کے ساتھ مزین رکھتے ہیں، اور ہلاکتوں کے گرداب سے اس کی حفاظت فرماتے ہیں، اور اس کے وجدان کے خلاف اس سے عمل کراتے ہیں، ایک جماعت کو اس شہود سے باہر نکال لیتے ہیں، اور کام کی حقیقت کی طرف، جو کہ حقیقی اسلام ہے، اور اس مقام میں کشوف کو علوم شرعیہ کے ساتھ مطابقت ہے، ہدایت دیتے ہیں، اور ایک دوسری جماعت کو اسی شہود میں آخر تک رکھتے ہیں، لیکن مقبول بندوں کی نومولود بچوں کی طرح حفاظت کرتے ہیں۔

الحمدللہ آپ کے پاکیزہ خطوط کے مطالعہ سے بہت حظ حاصل ہوا، اور یہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''حتی الامکان احکام (شرعیہ) کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتے اور ہر حکم میں لطیفۂ دل کو ایک خاص ذوق حاصل ہے، اور تمام مواجید (وجد و حال) روشن سنت کے مطابق ہیں''۔ یہ اصالت نسبت سے ہے۔

حجاب اکبر نفس ہے:

حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمہ ایک سالک کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ ابواب فیوض وترقیات را مفتوح دارد، بزرگترین حجاب میان طالب ومطلوب نفس طالب است، **دع نفسک وتعال انت الغمامة علیٰ شمسک فاعرف حقیقتک.**

رفتن نفس سالک از میان امریست ذوقی ووجدانی، بگفتن ونوشتن راست نمی آید وبخواندن ومطالعۂ کتب بحصول نمی پیوندد، سابقۂ عنایت وجذب الٰہی جل شانہ می باید ودر عالم اسباب صحبت کامل ومکمل بشرط فنا دروے۔ (دفتر دوم ص:۳۸)

اس اقتباس کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

'' اللہ تعالیٰ فیوض وبرکات کے دروازے کھلے رکھے، طالب ومطلوب کے درمیان سب سے بڑا حجاب طالب کا نفس ہے، دع نفسک الخ (تو اپنے نفس کو چھوڑ دے اور آجا، تو اپنے سورج پر خود ہی ابر ہے، پس تو اپنی حقیقت کو پہچان لے)

سالک کے نفس کا درمیان سے دور ہو جانا، ایک ذوقی اور وجدانی امر ہے، جو تقریر وتحریر میں نہیں آسکتا، اور پڑھنے اور مطالعہ کتب سے حاصل نہیں ہوتا، اور اللہ جل شانہ کی عنایت وجذب کی سبقت اور عالم اسباب میں کسی شیخ کامل ومکمل کی صحبت، اس (شیخ) میں فنا ہونے کی شرط کے ساتھ ہونی چاہئے۔

حضرات صوفیہ کا مرتبہ ومقام:

ایک سالک کے لئے چند دعائیں کرتے ہیں اور حضرات صوفیہ کرام کے مرتبہ ومقام

سے آگاہی بخشتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ بعافیت وجمعیت دارد وبرجادۂ شرع محمدی وسنت احمد علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام مستقیم ومستدیم گرداندواز تعلقات دنیا وگرفتاریٔ ماسوا محرر ساختہ در سرادقات معرفت وسراپردۂ قرب خویش والفت دہد۔

ایں معنی در عالم اسباب وابستہ بسلوک طریقۂ صوفیہ عالیہ است، ایں بزرگواراں درمحبت حق جل وعلا از خود وغیر خود گسستہ اند ودر عشق اواز آفاق گزشتہ، ماسوارا درراہ اودر باختہ باوساختہ اند، اگر حاصل دارند اورادارند واگر واصل اند باوواصل اند، باطن ایشاں را بنہجے انقطاع از مادون اوتعالیٰ روئے دادہ است کہ اگر سالہا یاد ماسوانمایند بیادشاں نیاید وازانانیت نفس بنوعے گزشتہ اند کہ عودکلمۂ انارابرخودشرک می دانند۔

(دفتر دوم مکتوب:۴۴)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ عافیت وجمعیت کے ساتھ رکھے اورشرع محمدی وسنت احمدی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے راستہ پر استقامت ودوام عطا فرمائے ، اور دنیا کے تعلقات اور ماسوا کی گرفتاری سے آزاد کر کے اپنی معرفت کے شامیانوں اورقرب کے سراپردوں میں انس والفت نصیب فرمائے۔

اور یہ حقیقت عالم اسباب میں صوفیائے کرام کے طریقے پر چلنے کے ساتھ وابستہ ہے، یہ اکابر حق جل وعلا کی محبت میں اپنے آپ سے بھی اوراپنے علاوہ دوسروں سے بھی قطع تعلق کر چکے ہیں، اوراس کے عشق کی وجہ سے آفاق وانفس سے گزر کراور ماسوی اللہ کواس کی راہ میں قربان کر کے اس کے ساتھ موافقت کر لی ہے، اگر حاصل رکھتے ہیں، تو اسی کو رکھتے ہیں، اوراگر واصل ہیں تو اسی کے ساتھ واصل ہیں، ان کے باطن کو ماسوی اللہ تعالیٰ سے اس حد تک انقطاع حاصل ہوگیا ہے کہ اگر وہ سالہا سال بھی ماسوا کو یاد کریں، تو وہ ان کو یاد نہ آئے ، اورنفس کی انانیت سے اس قدر آزاد ہو چکے ہیں کہ اپنے اوپر کلمۂ انا (میں) کے اطلاق کوشرک جانتے ہیں۔

حق تعالیٰ کی جانب سے فیض مسلسل ہے:

حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمہ کے برادرزادہ خواجہ عبدالاحد صاحب جواستعداد عالی

رکھتے تھے، ان کے نام ایک مکتوب گرامی میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے بخشش وفیضان مسلسل اور علیٰ وجہ الاتم ہے، بندوں کی استعداد کا نقص ہوتا ہے کہ اس سے کما حقہ فیضیاب نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں:

''از مبدأ فیض تعطیل نیست، ہموارہ در کار است، بحسب استعدادات وقابلیات! اگر قبض وتعطیل ست منشا آں قابل است نہ مفیض، چہرۂ معشوق در مرایائے متقابلۂ او باندازۂ صفاونورانیتِ آئینہ ہر وقت منعکس ونمایاں ست، آئینہ کہ زنگار دارد، پذیرائے صورت نیست، کمی ونقصان از جانب آئینہ ست نہ از جانب صورت۔ (دفتر سوم، مکتوب: ۱٦٨)

ترجمہ: مبدأ فیض کی طرف سے بیکاری نہیں ہے، وہ ہمیشہ برسر کار ہے، استعدادوں اور قابلیتوں کے مطابق! اگر قبض وبیکاری ہے، تو اس کا منبع خود فیض قبول کرنے والا ہے، نہ فیض دینے والا، معشوق کا چہرہ اپنے بالمقابل آئینوں میں، آئینہ کی صفائی اور نورانیت کے مطابق ہی ہر وقت منعکس اور نمایاں ہوتا ہے، جو آئینہ کہ زنگ آلود ہے وہ صورت کو قبول نہیں کرتا، کمی ونقص آئینہ کی جانب سے ہے، نہ کہ صورت کی جانب سے''۔

فنائیت کا دوام اور قصور اعمال کی دید:

ترجمہ کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے، حضرت خواجہ صاحب قدس سرہٗ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''نوشتہ بودند کہ وقت سلوک از قالب اثرے نمی بینم، چناں معلوم می شود کہ گویا ہیچ درمیان نیست، در حیرت می مانم کہ ایں چہ باشد؟

مخدوما! ہیچ جائے حیرت نیست کہ حالتے ست نیکو، سالکاں را دست می دہد، لیکن معتبر آنست کہ ایں حالت دوام پیدا کند ومراقبہ وغیر مراقبہ وسکوت وغیر سکوت در دید عدمیت ونیستی یکساں بود، وعدمیتِ ذاتیہ رُو دہد ووجود موہوم کہ منشاء انانیت امارہ است روبزوال آرد۔

وآنچہ نوشتہ اند کہ اگر طاعت وعبادت کردہ می شود ازاں استغفار کردہ نظر بر فضل وکرم اومی دارد، مطالعۂ آں محظوظ ساخت، ہر چند دید قصور در اعمال پیدا شود اعمال را قیمت افزاید وقابل قبول سازد، **اعمل و استغفر** از عمل باز نمانند استغفار ازاں نماید ونظر بر فضل صرف داشتہ باشد، راہِ بندگی این ست۔ (دفتر سوم، مکتوب: ۱۶۸)

ترجمہ: آپ نے لکھا تھا کہ میں سکوت (مراقبہ) کے وقت قالب سے کوئی اثر نہیں دیکھتا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ درمیان میں نہیں ہے، میں حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟

میرے مخدوم! حیرت کا کوئی مقام نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک عمدہ حالت ہے، جو سالکوں کو پیش آتی ہے، لیکن معتبر یہ ہے کہ یہ حالت دوام حاصل کرلے، مراقبہ وغیر مراقبہ اور سکوت وغیر سکوت، عدمیت ونیستی کے دیکھنے میں یکساں ہوں، اور عدمیت ذاتی رونما ہو جائے، اور وجود موہوم جو کہ نفس امارہ کی انانیت کا منبع ہے، زوال پذیر ہو جائے۔

اور یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ ''اگر طاعت وعبادت کی جاتی ہے، تو اس سے استغفار کر کے نظر اس کے فضل وکرم پر رکھتا ہوں'' اس کے مطالعہ نے مسرور کیا، جس قدر قصور کی دید، اعمال کے اندر پیدا ہوگی، اعمال کی قیمت کو اسی قدر بڑھائے گی، اور قابل قبول بنائے گی، بزرگوں نے کہا ہے، **اعمل و استغفر** (عمل کر اور استغفار کر) عمل سے رکے نہ رہیں، اور اس سے استغفار بھی کریں، اور نظر محض فضل پر رکھیں، بندگی کا طریقہ یہی ہے''۔

یہ چند نمونے ترجمے کے اس خاکسار نے کیف ما اتفق نقل کئے ہیں، تمام ترجموں کا انھیں سے اندازہ کر لیجئے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے یہ ترجمے، ترجمہ کے اصولی معیار پر پورے اترتے ہیں، کہیں کہیں فروگزاشت کا ہو جانا تو بشری فطرت ہے، کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ بہتر تعبیر لائی جائے، لیکن ایسے بلند معارف، ادق مضامین اور عمدہ تعبیرات واسالیب کا جو بہتر سے بہتر اور صحیح سے صحیح ترجمہ ہوسکتا ہے، اس کا نمونہ شاہ صاحب کے ترجمے ہیں، آپ اصل کو سامنے رکھ کر پڑھتے چلے جائیے۔ آپ کو ان شاء اللہ کہیں یہ نہیں محسوس ہوگا کہ مکتوب نگار کچھ کہہ

رہے ہوں اور ترجمہ نگار کچھ اور لکھ رہے ہوں، جو کچھ اصل مکتوب میں کہا گیا ہے، بعینہٖ وہی بات ترجمہ میں بھی ہے، اور الفاظ وعبارت میں بھی کسی اضافہ اور طوالت کو اختیار نہیں کیا گیا ہے، مزید یہ کہ سلاست اور وضوح بیان میں کچھ خلل نہیں ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضراتِ شیخین شریک نہ تھے؟

حضرات صحابہ کرام کی عزت وناموس کا تحفظ ابتداء تاریخ اسلام ہی سے علماء امت کے درمیان اہم اجماعی مسئلہ رہا ہے کیونکہ دورِ صحابہ ہی سے مختلف فرقوں کی پیداوار شروع ہوگئی تھی، ان میں سے بعض فرقے ایسے بھی تھے جن کی دراز دستیاں اسلام کے اس مقدس وپاکیزہ گروہ کے جیب وگریباں کا تماشا کرنا چاہتی تھیں، انھوں نے نے کھلے اور چھپے بہت کوشش کی کہ اس باعزت طبقہ کے بے داغ دامنوں کو داغدار بنادیں، لیکن ان کے مقابلے میں علماء اہل سنت نے ان بزرگوں کی عظمت وتقدیس کو دین وایمان کا ایک عظیم سرمایہ قرار دے کر ہر محاذ پر ان کا دفاع کیا، اور بحمد اللہ اس میں یہ حضرات سرخرو رہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خاص طور سے دو بزرگ ان ناروا حملوں کے زیادہ تر ہدف بنائے گئے اور یہ دونوں بزرگ وہ ہیں جو اہل سنت کے نزدیک فضل وکمال اور شرف وکرامت میں تمام امت سے بڑھ کر ہیں، یعنی حضراتِ شیخین سیدنا ابوبکر وسیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما، ایک جماعت جو قدیم ایرانی تہذیب کے زیر اثر کسی فضل وکمال اور حکومت وسلطنت کو نسلی اور خاندانی حدود سے باہر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اس کے خیال میں حق تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو جن کمالات وخصوصیات سے نوازا تھا، ضروری تھا کہ یہ خصوصیات آپ کی نسل عالی میں باقی وقائم رہتیں۔ چونکہ وفات کے وقت آپ ﷺ کے فرزندوں میں سے کوئی موجود نہ تھا اس لئے اس جماعت نے فرض کرلیا کہ یہ کمالات وامتیازات آپ ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد سیدنا حضرت

علی کرم اللہ وجہہ اوران کی اولاد...... جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسل سے ہیں...... میں منتقل ہونے چاہئیں ۔ چنانچہ اسی مزعومہ کی بنا پر اس جماعت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے خلافت بلافصل اور امامت...... جو اپنے آثار ونتائج کے اعتبار سے نبوّت کی ہم پایہ بلکہ اس سے بھی کچھ بلند تر ہے......کا منصب تجویز کیا، اور اسی گمان باطل کے نتیجے میں اس گروہ کو حضرات شیخین سے سخت عناد پیدا ہوگیا، ان کے خیال میں یہ دونوں حضرات نعوذ باللہ غاصب خلافت تھے، اہلسنت نے اس الزامِ باطل کی دھجیاں بکھیر دیں۔

زیرِنظر مضمون میں اسی موضوع سے متعلق ایک خاص جز ئیہ کی تحقیق مقصود ہے، بسا اوقات یہ سوال سننے میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اہل بیت نبوت پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس وقت اہل تعلق کے ہوش وحواس بجا نہ تھے لیکن دوسری طرف دیکھئے تو حضرت ابوبکر وعمر اور دوسرے بہت سے صحابہ حکومت وامارت کی فکر میں سرگرداں تھے، اور اسی مشغولیت میں پڑ کر آپ ﷺ کی تجہیز وتکفین تک میں شریک نہ ہوسکے۔ یہ سوال تو ایک ہے، مگر اس کے نتیجے میں کئی اعتراضات پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ ان حضرات کو حضور اقدس ﷺ کی وفات کا رنج نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ حضرات خلافت وامارت کے آرزومند تھے۔ تیسرے یہ کہ اس اندیشہ سے کہ کہیں خلافت دوسروں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے، ضروری ہنگامی تقاضوں کو نظر انداز کر کے خلافت طلبی میں منہمک ہوگئے ۔ چوتھے یہ کہ اسی انہماک کے باعث تجہیز وتکفین میں شریک نہ ہوئے۔ زیرِنظر مضمون میں ان اعتراضات کا تاریخ کی روشنی میں منصفانہ جائزہ لیا جائے گا۔

چار مراحل:

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دنیوی کے آخری اوقات چار مرحلوں میں منقسم ہیں ۔ پہلا مرحلہ مرض الوفات کا ۔ دوسرا مرحلہ حالت وصال کا۔ تیسرا مرحلہ وصال کے بعد تجہیز وتکفین تک کا۔ چوتھا مرحلہ تجہیز وتکفین اور تدفین کا۔

تاریخ وسیر کی کتابیں شاہد ہیں کہ حضرات شیخین ان چاروں مرحلوں میں نہ صرف یہ کہ موجود رہے ہیں، بلکہ ان کی شخصیت ہر مرحلہ میں شرعی وانتظامی حیثیت سے رہنما اور فیصلہ کن رہی ہے۔

مرض الوفات:

آخر کون نہیں جانتا کہ جب نبی اکرم ﷺ کو مرض کی شدت ہوئی، اور نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں آنے سے آپ ﷺ معذور ہو گئے، تو امامت کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوا، یہ انتخاب کرنے والا اور کوئی نہیں، خود بنفس نفیس سرورِ کائنات ﷺ تھے، امامت کے لئے یہ انتخاب تواتر اً ثابت ہے، اس میں تو کسی مخالف سے مخالف شخص کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ بعض حضرات نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جانب سے عذر خواہی بھی کی کہ وہ رقیق القلب ہیں، آپ کے مصلیٰ پر کھڑے ہو کر خود کو سنبھال نہ سکیں گے۔ اس لئے ان کے بجائے حضرت عمر کو متعین فرما دیا جائے تو آپ ﷺ نے سختی سے انکار فرما دیا۔

عن عائشةؓ قالت: لما مرض النبی ﷺ مرضه الذی مات فیه فحضرت الصلوٰة فأذن بلال فقال مروا أبابکر فلیصل بالناس فقیل له أن أبابکر رجل اسیف إذا قام مقامک لم یستطع أن یصلی بالناس فأعاد فأعادوا له فأعاد الثالثة فقال إنکم "صواحبات یوسف "مروا أبابکر فلیصل بالناس۔

(البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۳۲ بحوالہ بخاری شریف)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو مرض الموت لاحق ہوا، اور نماز کا وقت آ گیا تو بلالؓ نے اذان کہی، حضور ﷺ نے فرمایا ابو بکرؓ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں، آپ سے عرض کیا گیا کہ ابو بکرؓ رقیق القلب آدمی ہیں، آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو نماز پڑھانے پر قادر نہ ہو سکیں گے۔ آپ ﷺ نے دوبارہ وہی ارشاد فرمایا، لوگوں نے پھر وہی بات دہرائی، آپ ﷺ نے پھر مکرر ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ تم "صواحبات یوسف" ہو، ابو بکرؓ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

اور ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ ایک صاحب نے غلط فہمی سے حضرت عمرؓ کو آگے بڑھا دیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انکار فرما دیا۔

عن عبد الله بن زمعه قال: لما استعز برسول الله ﷺ و أنا عنده فی نفر من المسلمین دعا بلال للصلوٰة فقال؛ مروا من یصلی بالناس قال: فخرجت فإذا عمر فی الناس و کان ابوبکر غائباً فقلت قم یا عمر فصل بالناس قال: فقام

فلما کبّر عمر سمع رسول اللہ ﷺ و کان عمر رجلا مجهرا فقال رسول اللہ ﷺ فاین ابوبکر یابی اللہ ذٰلک والمسلمون،یابی اللہ ذٰلک والمسلمون .
(البدایہ والنہایہ،ج:۵،ص:۲۳۲ بحوالہ مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن زمعہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب مرض کی شدت ہوئی اور اس وقت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضور ﷺ ہی کے پاس تھا،تو بلالؓ نے نماز کے لئے پکارا،فرمایا کہ کسی کو حکم دو کہ نماز پڑھادے،فرماتے ہیں کہ میں باہر نکلا،حضرت عمرؓ موجود تھے اور اتفاق سے حضرت ابوبکر وہاں نہ تھے،میں نے کہا عمر! نماز پڑھایئے،وہ کھڑے ہوگئے،جب انھوں نے تکبیر کہی تو حضور ﷺ نے سن لیا،ان کی آواز بلند تھی،فرمایا ابوبکر کہاں ہیں؟ اللہ کو اور مسلمانوں کو یہ منظور نہیں،دوبار فرمایا۔

یہ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ مصلیٰ سے ہٹ آئے اور پھر اہتمام سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بلوایا گیا،وہ جب آئے تو انھوں نے نماز پڑھائی،اس طرح کی روایات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول خدا ﷺ کے نزدیک سیدنا صدیق اکبرؓ کی امامت ایک طے شدہ بات تھی،وہیں دو باتیں اور معلوم ہوئیں،ایک یہ کہ حضرات شیخین آپ ﷺ کے مرض الوفات میں مستقل حاضر باش تھے،اتفاق سے ایک وقت حضرت ابوبکر موجود نہ تھے تو انھیں بلوایا گیا،دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے درمیان ان دونوں بزرگوں کی عظمت وصلاحیت مسلم تھی،خیال تو کیجئے جب حضرت ابوبکرؓ موجود نہ تھے،تو صحابی کی نظر انتخاب حضرت عمرؓ پر پڑی اور اس مجمع میں کسی کو اعتراض نہ ہوا،حالانکہ اس وقت اہل بیت سیدنا علی وسیدنا عباس رضی اللہ عنہما بھی یقیناً موجود ہوں گے،مگر ان کے واسطے امامت کی پیشکش نہیں ہوئی اور نہ حضور ﷺ نے ان کا انتخاب فرمایا،نہ خود اہل بیت کو اس امامت پر کبھی اعتراض ہوا،اس سے ہر وہ شخص جو اپنے کاسۂ سر میں ذرا بھی عقلی صلاحیت رکھتا ہوگا سمجھ سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام کی نگاہ میں متفقہ طور امامت کے اہل یہی دونوں بزرگ تھے،چنانچہ مذکورہ بالا روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن زمعہ کو ٹوکا کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ یہ حضور کا حکم ہے،جو تم مجھ سے نقل کررہے ہو،اگر میرا یہ گمان نہ ہوتا تو میں ہرگز امامت کے

لئے آگے نہ بڑھتا۔ اس کا جو جواب حضرت عبد اللہ بن زمعہ نے دیا وہ سننے کے قابل ہے، فرمایا:

واللہ ماأمرنی رسول اللہ ﷺ ولٰکن حین لم أر أبابکر رأیتک أحق من حضر بالصلوٰۃ	واللہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا نہیں دیا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر موجود نہیں ہیں تو میں نے سمجھا کہ اس مجمع میں آپ سے زیادہ امامت کا حقدار کوئی نہیں۔

حضور ﷺ کا آخری دیدار:

پھر حضور ﷺ کی وفات تک حضرت ابوبکر ہی نمازیں پڑھاتے رہے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں آخری نماز جو حضرت ابوبکر کی امامت میں ادا کی گئی ہے وہ دوشنبہ کے روز فجر کی نماز ہے، اسی روز چاشت کے وقت آپ ﷺ کا وصال ہوا، علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں بخاری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ''حضور اکرم ﷺ کے خصوصی خادم اور صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مرض الوفات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کیا کرتے تھے، دوشنبہ کا دن تھا لوگ فجر کی نماز میں صف بستہ تھے، حضرت ابوبکر مصلیٰ پر تھے کہ یک بیک حجرہ مبارکہ کا پردہ اٹھا، اور رسول اللہ ﷺ سامنے کھڑے نظر آئے، آپ ہمیں دیکھ رہے تھے اور چہرۂ اقدس ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے قرآن کھلا ہوا ہو، آپ مسکرا رہے تھے، ہمیں حضور ﷺ کے روئے انور کے دیدار سے ایسی مسرت ہوئی کہ ہم بے خود ہوئے جارہے تھے، حضرت ابوبکر فوراً اُلٹے پاؤں کھسکے تاکہ صف میں شامل ہوجائیں، انھوں نے سمجھا کہ حضور بنفس نفیس خود تشریف لاکر نماز پڑھائیں گے، آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ نماز پوری کرلو اور پردہ گرالیا۔

وفات شریف:

یہ جمال جہاں آراء کی آخری تابانی تھی جو صحابہ کرام نے دیکھی، پھر اسی روز چاشت کے وقت حضور ﷺ کا وصال ہوگیا، دوشنبہ کے روز حضور اکرم ﷺ کی طبیعت ہشاش بشاش تھی، نماز سے فارغ ہوکر حضرت ابوبکر نے عرض کیا:

یا نبی اللہ انی اراک قد أصبحت بنعمة من اللہ وفضل کما تحب

والیوم یوم بنت خارجة افآتیها قال نعم ثم دخل رسول الله ﷺ وخرج ابوبکر الیٰ أهله بالسخ (السیرة النبویة لابن هشام، ج:۴،ص:۲۲۲)

اے اللہ کے نبی! آج اللہ کے فضل وکرم سے آپ کی طبیعت بہتر ہے اور آج بنت خارجہ کی باری ہے (حضرت ابوبکر کی اہلیہ) کیا میں ہو آؤں؟ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے، پھر حضور اندر تشریف لے گئے اور ابوبکرؓ اپنی اہلیہ کے پاس مقام سخ چلے گئے۔

یہ وقت ہم ایسا پاتے ہیں کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضور اکرم کے پاس موجود نہ تھے، لیکن یہ عدم موجودگی کسی طرح قابل مواخذہ نہیں ہے کیونکہ وہ جہاں گئے تھے حضور کی اجازت ورضامندی سے گئے تھے، دوسرے یہ کہ گو حضرت صدیقؓ موجود نہ تھے مگر ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت عائشہ تو موجود تھیں، بلکہ صحیح روایات اس پر متفق ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی آغوش ہی میں حضور اقدس ﷺ تھے کہ آپ کی روحِ مبارک رفیق اعلیٰ کے حضور حاضر ہوئی۔

قالت عائشة توفی رسول الله ﷺ بین سحری ونحری۔ (طبقات ابن سعد، ج:۲،ص:۲۶۲، البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۳۹ بحوالہ بخاری شریف)	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات میری گود میں ہوئی۔

البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ عین حالت وفات کے وقت حضرت عمرؓ مسجد میں موجود ہیں، چنانچہ حضرت عائشہ کی روایت یہی ہے کہ جونہی حضور ﷺ کی وفات ہوئی، اور میں نے چارپائی پر لٹایا اور آپ کو چادر اُڑھائی تھی کہ:

فجاء عمر والمغیرة بن شعبة فاستاذنا فاذنت لهما۔	حضرت عمر اور مغیرہ بن شعبہ آئے اور دونوں نے اندر آنے کی اجازت چاہی، میں نے اجازت دے دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت عمرؓ وہیں تھے، پھر آگے سنئے! کہنے والے کے منہ کو کون پکڑے، وہ تو کہہ دیتے ہیں کہ ان حضرات کو آپ کی وفات کا رنج نہ تھا، لیکن دل تھام کر سوچیں کہ جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی، تمام تر مال وجان جس ذات والا صفات پر قربان کردی

تھی ،انھیں اس کی جدائی پر کیا کچھ محسوس ہورہا ہوگا ،جگر پھٹ جاتا ،قلب کے ٹکڑے اڑ جاتے ، حواس بکھر جاتے ،مگر اسی ذات نے جس کی رِحلت کا آج غم مسلط ہے،اسی نے مصائب وآلام پر صبر وضبط اور رضا بالقضا کا سبق اتنی تکرار اور اتنی کثرت کے ساتھ پڑھا اور یاد کرار کھا تھا اور حق تعالیٰ کی ذات حی وقیوم کے ساتھ ایسا ربط وتعلق قائم کر دیا تھا کہ اس نے جزع وفزع ،نوحہ وشیون اور نالہ وفریاد کی تمام صدائیں بند کر دی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حزن:

تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کی صلابت وشجاعت اور مضبوطیٔ قلب ودماغ شہرۂ آفاق ہے، دیکھئے کہ اس جانگداز حادثہ سے کس درجہ متاثر ہیں،آج بھی جب حضرت عمرؓ کی عظمت اور بلندیٔ حوصلہ کا تصور آتا ہے اور اس کے ساتھ وفاتِ نبوی کے وقت ان کی کیفیتِ حزن وملال کا تذکرہ ہم پڑھتے ہیں تو دونوں حالتوں کی تطبیق میں عقل حیران ہو جاتی ہے۔صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی اور ابن سعد نے بھی یہ تذکرہ کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت عمر اور حضرت مغیرہ بن شعبہ حجرۂ اقدس میں داخل ہوئے تو جونہی روئے انور پر ان کی نگاہیں پڑیں بے ساختہ حضرت عمر گھبرا کر پکار اُٹھے:

واغشیاه ! ما أشد غشی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم	ہائے غشی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس شدت کی غشی طاری ہے۔

پھر یہ دونوں حضرات پلٹے ،تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے دروازہ کے قریب جاکر حضرت عمرؓ کو بتایا کہ حضور بے ہوش نہیں ہیں آپ کا وصال ہو گیا ہے،حضرت عمر کو فرطِ رنج سے یہ سننے کی تاب نہ تھی ،بگڑ کر بولے:مغیرہ تم عجیب فتنہ جو آدمی ہو،جھوٹ بولتے ہو،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال اس وقت تک نہ ہوگا ،جب تک منافقین کا خاتمہ نہ ہو جائے۔(البدایہ والنہایہ،ج:۵،ص:۲۳۲ بحوالہ مسند احمد)

یہ کہتے ہوئے وہ مسجد میں آ گئے ،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کی خبر مدینہ میں بجلی کی طرح کوند گئی ،مسجد تو پہلے سے بھری ہوئی تھی ،اب مزید اطراف وجوانب سے لوگ سوگوارانہ کھنچ کھنچ کر آنے لگے،آپ کے وصال کے متعلق ایک دوسرے کو ابھی بتا ہی رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کو جلال

آ گیا، انھوں نے پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ اگر کسی کی زبان پر حضور کے وصال کی بات آئی تو میں اس کی زبان کاٹ دوں گا، قتل کر ڈالوں گا، سب لوگوں پر ہیبت طاری ہوگئی، زبانیں خاموش ہوگئیں، لیکن جو واقعہ ہو چکا تھا اسے کون رد کر سکتا تھا، اب یہ مشکل آن پڑی کہ حضرت عمرؓ کو سمجھائے کون؟ حضرت عباسؓ تشریف لائے۔ وہ لوگوں سے دریافت کرتے رہے کہ کسی کو حضور کی وفات سے متعلق کوئی حدیث معلوم ہے؟ لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی، انھوں نے حضرت عمرؓ سے بھی دریافت کیا، ان کا جواب بھی نفی میں تھا۔ غالبًا انھوں نے سوچا ہوگا کہ اگر حضور ﷺ کے حوالہ سے کوئی بات مل جاتی تو اختلاف آسانی سے ختم ہو جاتا، لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اس باب میں لوگوں کو کوئی بات معلوم نہیں تو پھر انھوں نے از خود فرمایا کہ سب لوگوں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضور کا وصال ہو گیا ہے، (ﷺ) لیکن چونکہ یہ بات انھوں نے اپنے اجتہاد سے کہی تھی اس لئے حضرت عمرؓ کو غالبًا اطمینان نہیں ہوا، تاہم حضرت عباسؓ کی بزرگی اور حضور ﷺ سے قرابت مندی کی وجہ سے انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۴۳ بحوالہ بیہقی)

یہ اختلاف کیوں؟:

اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ عظیم و برگزیدہ شخصیات جن کا ربط حق تعالیٰ کے ساتھ بہت قوی ہوتا ہے، اور لوگوں کے قلوب ان کی وقعت و محبت سے لبریز ہوتے ہیں، ان کی وفات کا ان کی زندگی میں تصور تک نہیں آتا، پھر جب واقعہ ہو جاتا ہے تو اہل تعلق کو اس کا یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے، یہ تاریخ انسانی کا ایسا باب ہے کہ اَبطال و مشاہیر کی تاریخ سے جو بھی واقفیت رکھتا ہوگا، اس کے نزدیک یہ مسئلہ محتاج دلیل نہ ہوگا، خود قرآن میں اسی قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام عصا بدست کھڑے ہو کر مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرارہے تھے، اجنّہ اور شیاطین تعمیری منصوبہ کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے کہ خدا کا حکم آ پہونچا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام اسی حالت میں اعلیٰ علیین میں پہونچ گئے، لیکن جسد اقدس اسی طرح کھڑا رہا، اور ایک مدت تک کھڑا رہا، کسی کو خیال بھی نہ گذرا کہ آپ تشریف لے جا چکے ہیں، البتہ اس پر حیرت ضرور رہی ہوگی کہ عرصہ گذر گیا اور حضرت اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر رہے ہیں، پھر ایسا ہوا کہ ان کے عصاء مبارک میں دیمک لگ گئی اور آہستہ آہستہ دیمک نے اندر اندر پورے عصا کو

چاٹ ڈالا، پھراچانک ایک دن وہ ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بدن زمین پرآرہا۔ جب کہیں احساس ہوا کہ حضرت کی وفات ہوچکی ہے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَادَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖ إِلَّا دَابَّةُ الْاَرْضِ تَاكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَالَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (سورہ سبا:۱۴)

پھر جب ہم نے ان پر موت کا حکم جاری کر دیا تو کسی چیز نے ان کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا سو جب وہ گر پڑے تب جنات کو حقیقت معلوم ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے۔ (بیان القرآن)

پھر اگر اسی طرح کی بات حضور ﷺ کے سلسلے میں بھی پیش آئی تو تعجب کیا ہے؟ نزول وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ پر ایک خفیف سی غشی کا مشاہدہ ہوتا رہتا تھا، ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیال ہوا ہو کہ یہ غشی ذرا شدید قسم کی ہے، عجب نہیں حضور کی یہ غیبت درحقیقت حق تعالیٰ کے دربار میں آپ کی روح مبارک کا کوئی مخصوص عروج ہو، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کے لئے اپنی قوم سے جدا ہو کر کوہِ طور پر تشریف لے گئے تھے اور لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا انتقال ہو گیا، پھر وہ چالیس روز کے بعد تورات لے کر آئے، اسی طرح حضور ﷺ بھی واپس تشریف لائیں گے۔

لما توفي رسول الله ﷺ قام عمر بن الخطاب فقال : إن رسول الله ﷺ مامات ولكنه ذهب إلىٰ ربه كما ذهب موسىٰ بن عمران فقد غاب عن قومه أربعين ليلة ثم رجع إليهم بعد أن قيل قد مات ، والله ليرجعن رسول الله ﷺ كما رجع موسىٰ. (سیرۃ ابن ہشام، ج:۴، ص:۲۳۴)

جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی، تو حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے، کہا کہ حضور کی وفات نہیں ہوئی ہے، آپ ﷺ اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ بن عمران گئے تھے، وہ بھی تو اپنی قوم سے چالیس رات کے لئے غائب ہو گئے تھے، اور پھر لوٹے تھے، حالانکہ یہ

کہا جانے لگا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا، خدا کی قسم حضور اقدس ﷺ بھی لوٹیں گے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آمد:

ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسی طاقتور اور مستحکم شخصیت ہوتی جو سب کو مطمئن کر دیتی اور سب کا اعتماد حاصل ہوتا۔ حضرت عباسؓ نے لوگوں کو مطمئن کرنا چاہا مگر ان کی پیش نہ گئی، اس مجمع میں کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اس ہیجان میں **وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** کی تلاوت کر رہے تھے، (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۴۳) یعنی (محمد ایک رسول ہی تو ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں) مگر اس کی طرف کسی کو دھیان نہ ہوا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کمی اس وقت شدت سے محسوس کی جارہی تھی، لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے ہوئے ہیں؟ اس لئے ایک صاحب سالم بن عبید فوراً مقام سنح کی جانب دوڑے گئے (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۴۴) اور حضرت صدیق کو حادثۂ فاجعہ کی خبر سنائی، حضرت صدیق اکبر پر جو بیتنی تھی وہ بیت گئی، لیکن جب انھوں نے یہاں آکر نقشہ ملاحظہ فرمایا تو خود کو قابو میں رکھا، اس وقت یہ مناسب نہ تھا کہ مجمع عام میں صدمہ کا اظہار کیا جاتا بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ دلوں کی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھالا جاتا، انھوں نے مسجد میں لوگوں کو روتے بلکتے دیکھا، مدہوش ومتوالا پایا، بے خود ووارفتہ پایا، حضرت عمر کو تلوار لے کر دھمکاتے دیکھا، ان سب مناظر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے وہ سیدھے حجرۂ اطہر میں پہونچے، حضرت عائشہ صدیقہؓ وہاں موجود تھیں، اور دیگر امہات المومنین بھی حلقہ باندھے بیٹھی تھیں۔

امام بیہقی کے حوالے سے صاحب البدایہ والنہایہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آمد کی روایت تفصیل سے نقل کی ہے۔ ہم اس کا ترجمہ ذیل میں نقل کئے دیتے ہیں، اس سے حضرت صدیق اکبر کے مزاج ومذاق، اور دین اسلام میں ان کے رسوخ وپختگی، نیز ان کی توحید میں استقامت کا صحیح اندازہ ملتا ہے۔

’’حضرت صدیقؓ مسجد کے دروازے پر سواری سے اترے، وہ نہایت محزون ورنجیدہ تھے، حجرۂ اقدس کے دروازے پر کھڑے ہوکر اندر آنے کی اجازت چاہی، اجازت ملنے پر اندر تشریف لے

گئے ،حضورا کرم ﷺ کا جسد اطہر بستر پر تھا،امہات المومنین حلقہ باندھے بیٹھی تھیں۔آپ کی آمد پر سب نے پردہ کرلیا،حضرت عائشہ چونکہ بیٹی تھیں انھیں پردہ کرنے کی حاجت نہ تھی ،حضرت صدیق اکبر نے حضور اکرم ﷺ کے روئے انور سے چادر ہٹائی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پیشانی کو بوسہ دیا اور بے ساختہ رونے لگے، پھر فرمایا: وہ بات نہیں جو عمر کہہ رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، آپ پر اللہ کی رحمت ہو، یا رسول اللہ! آپ زندگی میں بھی پاکیزہ تر تھے،اور وفات کے بعد بھی پاکیزہ تر ہیں۔ پھر چادر اوڑھا دی،اور تیزی سے مسجد کی طرف پلٹے (ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے دوبار ارشاد فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، مگر وہ ایسے بے خود تھے کہ نہ بیٹھے، جب حضرت صدیقؓ نے یہ رنگ دیکھا تو سیدھے آگے بڑھے) اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے منبر کے پاس پہونچ گئے ،اب حضرت عمرؓ بھی بیٹھ گئے ،حضرت صدیق اکبرؓ نے منبر کے کنارے کھڑے ہو کر لوگوں کو آواز دی، سب لوگ خاموش ہو گئے اور سمٹ کر بیٹھ گئے ،حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ مسنونہ پڑھا،اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جب وہ حیات تھے جبھی موت کی اطلاع دے دی تھی ،اور تم لوگوں کو بھی مطلع کر دیا ہے،خدائے عز وجل کے علاوہ اور کوئی باقی رہنے والا نہیں ہے،ارشادِ ربّانی ہے: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (محمد ایک رسول ہی تو ہیں،ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں) حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا یہ آیت قرآن میں ہے؟ واللہ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آج سے پہلے یہ آیت اتری ہی نہ تھی (پھر فرمایا) اور سنو! حق تعالیٰ فرماتے ہیں: إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (بلا شبہ تم بھی مرنے والے ہو،اور یہ لوگ بھی مر جائیں گے)اور حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (ہر شی ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے،حکم تو اسی کا ہے اور اسی کی جانب تم واپس لے جائے جاؤ گے)اور سنو! كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (زمین پر جو بھی ہے فنا ہو جانے والا ہے،اور صرف تمہارے رب کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہے گی)اور ارشاد ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (ہر نفس موت کا مزا چکھنے والا ہے،اور تمہیں قیامت کے دن پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

پھر فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدﷺ کو ایک عمر بخشی اور آپ کو زندہ رکھا، انھوں نے اللہ کے دین کو قائم و مستحکم کیا، خدا کے امر کو ظاہر کیا، اللہ کا پیغام پہونچایا، اس کی راہ میں جہاد کیا، پھر اللہ نے انھیں وفات دے دی، وہ تمہیں راستہ پر لگا کر چلے گئے، اب جو ہلاک ہوگا دلیل واطمینان کے بعد ہلاک ہوگا، تو جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے جو اس کا پروردگار ہے، تو وہ خوب سمجھ لے کہ خدا زندہ ہے، اسے موت کبھی نہیں آئے گی، اور جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا اور انھیں کو معبود بنا رکھا تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا معبود انتقال کر گیا۔

اے لوگو! اللہ سے ڈرو، اپنے دین کو مضبوطی سے تھامو، اپنے رب پر بھروسہ کرو، اللہ کا دین قائم ہے، اللہ کی بات مکمل ہے، جو خدا کی مدد کرے اور اس کے دین کو عزت دے اللہ تعالیٰ اس کا حامی وناصر ہے، بلاشبہ اللہ کی کتاب ہمارے درمیان ہے، وہ نور ہے، وہی شفاء ہے، اسی سے اللہ نے حضرت محمد (ﷺ) کو ہدایت بخشی، اس میں حلال وحرام کی تفصیل ہے، واللہ ہم کو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ مخلوق کی جانب سے کیا حالات پیش آئیں۔ اللہ کی تلواریں بے نیام ہیں، ہم نے ابھی انھیں ہاتھ سے رکھا نہیں ہے، جو ہماری مخالفت کرے گا ہم اس سے اسی طرح جہاد کریں گے جیسے حضورﷺ کے ساتھ رہ کر کرتے تھے، اس لئے جو کوئی بغاوت کرے گا اپنے آپ سے بغاوت کرے گا۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۴۳)

اس تقریر کے بعد سکون ہوا۔

سقیفہ بنی ساعدہ:

جب اس بات کا فیصلہ ہوگیا، اور لوگ متفق ہو گئے کہ حضرت کی وفات واقعۃً ہوچکی ہے تو قدرۃً ذہنوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ امت کی شیرازہ بندی جو آپ نے فرمائی تھی، اور اسلامی ریاست جو آپ کے ہاتھوں نشو ونما پا رہی تھی اس کے تحفظ وبقاء کا کیا انتظام ہو؟ اس سلسلے میں حضراتِ شیخین کے خلاف غوغا مچایا جاتا ہے کہ انھیں خلافت کی طلب تھی، اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس پر قابض ہو جائیں، لیکن تاریخی روایات کی چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات اس وقت تک اپنی خلافت کے تصور سے خالی تھے، اس کے برخلاف اگر ہم اس کا کچھ خیال واہتمام دیکھتے ہیں تو یا تو حضرات انصار میں، یا حضراتِ اہل بیت کے یہاں۔ حالانکہ سیدنا ابوبکر صدیق

ﷺ کواس کا تصور ہوتا تو بجا تھا، کیونکہ وہ حضورﷺ کے نامزد کردہ امام تھے، حضور فرما چکے تھے کہ اللہ اور مومنین کوابوبکر کے علاوہ کسی کی امامت منظور نہیں ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۳۲ بحوالہ مسند احمد)

نیز تمام مسلمانوں کی نگاہیں بھی آپ ہی کی جانب ملتفت تھیں، اور پہلا معرکۃ الآراء مرحلہ یعنی وفات النبی کا قضیہ آپ ہی کے قول پر سرانجام ہوا تھا، پھر اگر وہ کچھ سوچتے اور دوسرے مسلمان تجویز کرتے کہ خلیفہ انھیں کو ہونا چاہئے تو عین فطری بات تھی، مگر جتنی معتبر تاریخی روایتیں ہیں وہ کسی گوشہ سے اس بات کا تاثر نہیں دیتیں کہ حضرت صدیق کو اپنی خلافت کا کوئی واہمہ تھا، ہاں حضرت عباسؓ کو حضورﷺ کی حیات ہی میں اس کا خیال تھا کہ خلافت کا مسئلہ حضور سے طے کرالینا چاہئے، چنانچہ وفات سے دو تین روز پہلے کا قصہ ہے کہ:

أن عباساً وعلياً لما خرجا من عند رسول الله ﷺ فقال رجل كيف أصبح رسول الله ﷺ فقال عليٌّ أصبح بحمد الله بارئاً فقال العباس إنك والله عبد العصا بعد ثلاث إني لأعرف في وجوه بني هاشم الموت وإني لارىٰ في وجه رسول الله ﷺ الموت فاذهب بنا اليه فنسأله فيمن هٰذا الامر فإن كان فينا عرفناه وإن كان في غيرها أمرناه فوصاه بنا فقال علي إني لا أسأله ذٰلك والله إن منعناه لا يعطينا ها الناس بعده ابداً ۔

ایک روز جب حضرت عباس اور حضرت علی حضور ﷺ کے پاس سے نکل کر باہر آرہے تھے، تو ایک شخص نے حضور کا حال دریافت کیا، حضرت علی نے فرمایا الحمد للہ اب تندرست ہیں، حضرت عباس نے فرمایا واللہ تم تین روز کے بعد ڈنڈے کے ماتحت ہوگے، میں بنی ہاشم کے رُخ پر موت کے آثار پہچانتا ہوں، اور میں رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر بھی موت کے آثار دیکھ رہا ہوں، چلو حضور کے پاس چل کر پوچھ لیں کہ یہ کام (خلافت) کن لوگوں کے سپرد ہوگا، اگر ہمارے سپرد ہوتا ہے تو ہمیں معلوم ہوجائے گا، اور اگر کسی دوسرے کو ملنے والا ہے تو ہم گذارش کریں گے کہ اس کو ہمارے حق میں کچھ وصیت کردیں، حضرت علی نے جواب دیا کہ میں تو ہرگز نہیں پوچھوں گا، واللہ اگر حضور نے ہم سے انکار کردیا تو لوگ پھر کبھی ہمیں یہ کام سپرد نہ کریں

گے۔(البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۵۱ بحوالہ بخاری شریف)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس کے دل میں اس کا اہتمام تھا، اور حضرت علی بھی اس کے تصور سے خالی نہ تھے اور جو گروہ حضراتِ شیخین پر معترض ہے، اس کی روایت کے مطابق تو حضرت علی ہمیشہ اپنے کو اس کا مستحق سمجھتے رہے، اور اس کے آرزومند رہے، اگر خلافت کا آرزومند ہونا ایسا ہی برا ہے تو حضرت علی کے پاس پہونچ کر یہ برائی بھلائی سے کیوں کر تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ نہج البلاغہ میں سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک خطبہ بنام شقشقیہ منقول ہے، وہ اسی شکایت سے لبریز ہے کہ میں خلافت کا حقدار تھا، لیکن فلاں نے اس پر قبضہ کرلیا، پھر اس نے فلاں کے حوالے کردیا، میں صبر کا تلخ گھونٹ پیتا رہا۔

أما واللہ لقد تقمصها فلان وإنه ليعلم أن محلي منها محل القطب من الرحیٰ ....فرأيت أن الصبر علیٰ هاتا أجحى وفصبرت وفي العين قذى وفي الحلق شجي أرىٰ تراثي نهباً۔(نہج البلاغہ، ج:۱،ص:۳۰)

خدا کی قسم خلعت خلافت کو فلاں نے پہن لیا، حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ خلافت کے مسئلے میں میرا مقام وہی ہے جو چکی میں اس کی کھونٹی کا ہوتا ہے، پھر میں دیکھا کہ صبر ہی مناسب ہے، اس لئے صبر کیا، حالانکہ یہ تنکا میری آنکھ میں کھٹکتا رہا اور یہ اُچھو حلق میں پھنسا رہا، میں دیکھ رہا تھا کہ میری میراث لوٹ کا مال بن گئی ہے۔

دور تک حکایت وشکایت سے لبریز تقریر پھیلتی چلی گئی ہے، اور اس طرح کے متعدد خطبے ہیں، جن سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت علیؓ کو اس پر بہت تاسف تھا کہ انھیں ابتداء میں خلافت سے کیوں محروم کردیا گیا۔(اہل سنت کے نزدیک حضرت علی اس آرزومندی اور حکایات وشکایات کی بے معنی کہانیوں سے بَری ہیں)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور خطبہ:

پھر اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مشہور خطبہ دیکھئے، جسے اکثر سیر کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، جو آپ نے اپنے زمانۂ خلافت کے آخری حج سے واپسی پر مدینہ طیبہ میں تمام مہاجرین وانصار کے مجمع عام میں دیا تھا، اور حکم دیا تھا کہ جو لوگ میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئے

ہوں وہ جہاں جائیں وہاں میرے اس خطبہ کو پہنچادیں۔اس خطبہ کا حضرت عمرؓ کو بڑا اہتمام تھا، یہ خطبہ آپ منیٰ میں دینا چاہتے تھے، جہاں تمام عالمِ اسلام کا مجمع اکٹھا تھا۔ وہیں کسی نے آپ کو یہ اطلاع دی تھی کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد میں فلاں شخص سے بیعت کرلوں گا۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے مشورہ دیا کہ یہاں ہر طرح کا مجمع ہے نہ جانے لوگ کیا سے کیا سمجھ جائیں ،اس لئے یہاں مناسب نہیں ہے، مدینہ واپس چلیں، وہاں اہل حل وعقد اور سمجھداروں کا اجتماع ہوگا، آپ کی ہر بات صحیح محل پر رکھی اور سمجھی جائے گی، چنانچہ واپسی پر آپ نے طویل خطبہ دیا، اس میں بہت سے اہم امور کو بیان کرتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا:

''مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک شخص نے کہا ہے کہ اگر عمرؓ مر گئے تو میں فلاں سے بیعت کرلوں گا، اس کو یہ بات دھوکے میں نہ ڈالے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت اچانک اور بے شان وگمان ہوگئی تھی، یہ صحیح ہے ایسا ہی ہوا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے تمام شرور وفتن سے حفاظت فرمائی، اور آج تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کی جانب سواریوں کو تھکا تھکا کر لایا جائے، جیسے کہ حضرت ابوبکرؓ تھے، بس جو کوئی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے بیعت کرے گا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔(البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۴۵ بحوالہ مسند احمد، سیرۃ ابن ہشام، ج:۴، ص:۲۲۶)

اس عبارت کے بین السطور میں غور کیجئے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات خلافت صدیقی سے خالی الذہن تھے، جو کچھ ہوا بس اچانک ہوا۔ پھر آگے حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا:

انـه كان من خبرنا حين توفى رسول الله ﷺ أن علياً والزبير ومن كان معهـمـا تـخـلـفـوا فـى بيت فاطمة بنت رسول الله ﷺ وتخلف عنها الانصار بأجمعها فى سقيفه بنى ساعده واجتمع المهاجرون إلىٰ ابى بكر۔

جب حضور ﷺ کا وصال ہوا تو علی اور زبیر اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے، حضرت فاطمہ کے گھر اکٹھا ہوئے، اور انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے، اور مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کے پاس مجتمع ہو گئے۔(البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۴۵ بحوالہ مسند احمد)

حضرت عمرؓ نے اس وقت یہ نہیں بتایا کہ مہاجرین کا یہ مجمع کہاں تھا لیکن قرائن سے پتہ

چلتا ہے کہ یہ لوگ کسی ایسی جگہ نہ تھے، جو کسی فرد یا قوم کے ساتھ مخصوص رہی ہو، بلکہ ان کا اجتماع حسب سابق مسجد ہی میں تھا، حضرت علیؓ تو اپنے گھر چلے گئے، حضراتِ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوئے، لیکن مہاجرین جہاں تھے وہیں رہے، یعنی مسجد نبوی میں، حجرۂ مطہرہ کے آس پاس۔ کیونکہ روایات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس لوگوں کی عمومی آمد ورفت تھی، اور ایسی جگہ جہاں عمومی آمد ورفت ہو، مسجد ہی ہوسکتی ہے، نیز کسی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ لوگوں کے درمیان حضرت صدیقؓ پہلا خطبہ دے کر (جس کا اوپر ذکر ہوا) کہیں گئے ہوں، پھر انصار کے بارے میں تو صراحۃً یہ وارد ہے کہ وہ مسئلۂ خلافت پر ہی غور کرنے کے لئے مجتمع تھے، لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر جو لوگ جمع تھے، اس کی تصریح روایت میں نہیں ہے کہ وہ کس مقصد سے جمع تھے، تاہم صورتحال کی نزاکت اور حضرت عمرؓ کا اندازِ گفتگو صاف بتا رہا ہے کہ مقصد وہاں بھی یہی تھا بلکہ اگر نہج البلاغہ میں ذکر کردہ وہ خطبہ جو حضرت علیؓ نے حضرت عباس اور حضرت ابوسفیان کی درخواست بیعت کے جواب میں دیا ہے، اسی وقت کا مان لیا جائے جبکہ یہ حضرات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر اکٹھا ہوئے تھے، تب تو اس اجتماع کا مقصد وضاحت کے ساتھ متعین ہوجائے گا۔ علامہ رضی نے ذکر کیا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عباسؓ اور حضرت ابوسفیانؓ نے حضرت علیؓ سے درخواست کی کہ ہم آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرلیں، اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا:

هٰذا ماء آجن يغص بها أكلها مجتنى الثمرة لغير وقت ايناعها كالزارع بغير أرضه فإن أقل يقولوا أحرص على الملك وإن أسكت يقولوا جزع من الموت هيهات بعد اللتيا واللتى والله لابن أبى طالب انس بالموت من الطفل ثدى أمه. (نهج البلاغة، ج: ۱، ص: ۴۰)

یہ ایک بدمزہ پانی ہے اور حلق میں پھنس جانے والا لقمہ ہے، (اس کا طالب) ناوقت پھل توڑنے والا ہے جیسے کوئی شخص دوسرے کی زمین میں کھیتی کرے، اگر میں کچھ کہوں تو لوگ کہیں گے کہ حکومت کی حرص میں پڑ گئے اور خاموش رہوں تو کہیں کہ موت سے گھبرا گئے، لیکن یہ

سب کچھ نہیں۔ واللہ ابن ابی طالب موت کے ساتھ ایسا مانوس ہے کہ بچہ اپنی ماں کے پستان کے ساتھ بھی ایسا مانوس نہ ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات سرورکائناتﷺ کے بعد حضرت علیؓ کو خلافت کی پیش کش ہوئی تھی لیکن انھوں نے اسے ٹال دیا۔

اب سنئے! جہاں مہاجرین جمع ہیں، وہاں کیا بات ہو رہی تھی، ابن اسحاق کی روایت کہ:

فأتىٰ اٰتٍ إلىٰ ابى بكر وعمر فقال إن هٰذاالحى من الانصار مع سعد بن عباده فى سقيفه بنى ساعدة قد انحازوا إليه فإن كان لكم بأمر الناس حاجة فادركوا قبل أن يتفاقم أمرهم ۔(سیرۃ ابن ہشام، ج:۴، ص:۲۲۵)

ایک آدمی حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا انصار کا قبیلہ سعد بن عبادہ کے پاس سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہے، آپ حضرات کو اگر عوام کا کچھ خیال ہو تو معاملہ خراب ہونے سے پہلے وہاں پہونچ جائیں۔

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ انصار کے پاس چلنا چاہئے ۔ چنانچہ دونوں حضرات انصار کی جانب چل پڑے۔ حضرت کے خطبہ اور ابن اسحاق کی روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مہاجرین کا مجمع مشورۂ خلافت کے لئے نہ تھا، ورنہ اس سادگی سے دونوں بزرگ انصار کے مجمع کی جانب نہ چل دیتے، بلکہ اپنے ساتھ مجمع لے جاتے یا پہلے مسجد میں موجود حضرات سے بیعت لے لیتے پھر وہاں جاتے، مگر ایسا کچھ نہ ہوا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شیخین کے ذہن میں ابھی امارت وخلافت کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہونچنے کے بعد صورتحال خدا نے ایسی پیدا کردی کہ اچانک حضرت ابوبکر کی بیعت کا انعقاد ہو گیا اور ایک بڑے فتنہ سے خدا نے بچالیا۔

حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا خطبہ مجمع عام میں ہوا تھا، اس میں مدینہ کے اندر موجود تمام مہاجرین وانصار شریک تھے، اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی تو صحابہ کرام بالخصوص حضرت علیؓ ضرور اس کا اظہار کرتے۔

حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کی بیعت:

جب سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت ہوچکی، تو چونکہ یہ بیعت عامہ نہ تھی، اس لئے یہ

حضرات پلٹ کر مسجد میں آئے اور مسجد میں بیعت عام شروع ہوئی، حضرت ابوبکر کو حضرت علی اور حضرت زبیر...... جو حضور کے پھوپھی زاد بھائی اور حضرت ابوبکر کے داماد تھے...... کا خیال تھا، چنانچہ اسی وقت وہ منبر پر چڑھے اور مجمع پر ایک نگاہ ڈالی تو حضرت علی اور زبیر کو نہ پایا، فوراً آدمی بھیج کر دونوں حضرات کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ اے علی! آپ حضور ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد ہیں، اور اے زبیر! آپ حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، کیا مسلمانوں میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں، دونوں بزرگوں کا جواب ایک تھا: لاتثریب یا خلیفة رسول الله ، اے خلیفۂ رسول آپ پر کچھ مواخذہ نہیں ہے، یہ کہہ کر حضرت علی وزبیر نے اسی وقت بیعت کر لی، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حافظ ابوعلی نیشاپوری نے بیان کیا کہ مشہور محدث ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس امام مسلم تشریف لائے اور اس حدیث کے متعلق مجھ سے دریافت کیا، میں نے یہ حدیث لکھ کر انھیں پڑھ کر سنادی، وہ بیحد خوش ہوئے۔(البدایہ والنہایہ، ج:۶،ص:۳۰۲)

حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد:

اس بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ دیا، بیعت کے بعد یہ پہلا خطبہ ہے، البتہ وفات نبوی کے بعد کا دوسرا خطبہ ہے، پہلا خطبہ سطورِ بالا میں گذر چکا ہے۔ اس میں فرمایا کہ:

و الله ما كنت حريصاً على الامارة يوماً ولا ليلةً ولا سألتها الله في سر وعلانية۔	خدا کی قسم میں امارت کا حریص کبھی نہیں رہا، نہ کسی دن اور نہ کسی رات، اور نہ کبھی کھلے اور چھپے (مخلوق تو درکنار) خدا سے اس کا سوال کیا۔

مشہور امام مغازی موسیٰ بن عقبہ نقل کرتے ہیں کہ:

فقبل المهاجرون مقالته۔

حضرات مہاجرین نے ان کی یہ بات تسلیم کی۔

ظاہر ہے کہ مہاجرین میں حضرت علی وزبیر بھی تھے، پھر بات اتنے میں ہی ختم نہیں ہوجاتی، آگے دیکھئے حضرت علی وزبیر فرماتے ہیں:

ماغضبنا إلا لأننا أخرنا عن المشورة وان نرىٰ أبابكر أحق الناس بها

وإنـه صاحب الغار وإنا لنعرف شرفه وخيره ولقد أمره رسول الله ﷺ بالصلوٰة بالناس وهو حي ۔(البدایہ اوالنہایہ، ج:۵،ص:۲۵)

ہمیں صرف اس کا رنج تھا کہ ہمیں مشورہ میں شریک نہیں کیا گیا، ورنہ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ خلافت کے حقدار سب سے بڑھ کر ابوبکر ہی ہیں، وہ رفیق غار ہیں، ان کی عظمت وشرافت ہم جانتے ہیں۔ حضور ﷺ نے انھیں اپنی حیات میں نمازوں کا امام بنایا تھا۔

حضرت علیؓ کے ارشادات:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہج البلاغہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھی چند کلمات ذکر کردیئے جائیں، یہ کتاب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات ورسائل اور مقالات وملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے مشہور شیعی عالم علامہ شریف رضی نے جمع کیا ہے، اور اہل تشیع کے نزدیک صحیح ترین کتاب ہے، اس میں ایک خطبہ میں سیدنا علیؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

لله بـلاء فـلان فـقد قوم الادد وداوى العبد وأقام السنة وخلف البدعة وذهـب نـقـي الثوب قليل العيب أصاب خيرها وسبق شرها أدى إلى الله طاعته وأتقاه بحقه.(نهج البلاغه ، ج: ۲،ص: ۲۲۲)

فلاں صاحب بھی خوب تھے، انھوں نے کجی کو درست کیا، بیماری کا مداوا کیا، سنت کو قائم کیا بدعت کو پیچھے چھوڑا، پاک دامن اور قلیل العیب گئے، خلافت کی خوبیاں حاصل کیں، اور خرابیوں سے دامن بچا کر آگے بڑھ گئے۔ اللہ کی طاعت کا حق ادا کیا اور پورے طور پر تقویٰ برتا۔

یہ الفاظ سیدنا ابوبکر صدیق کی شان میں ہیں گو کہ علامہ رضی نے اپنے مذہب کی پاسداری میں لفظ ابی بکر اُڑا کر لفظ فلاں رکھ دیا ہے، اور ایسا انھوں نے کئی جگہ کیا ہے، لیکن عبارت خود بولتی ہے کہ وہ کس کے حق میں ہے۔ سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس نے سنت کو اہتمام سے قائم کیا، بدعت کو پس پشت ڈال دیا، دنیا سے پاک دامن اور قلیل العیب گیا، جس نے خلافت کی بھلائیاں سمیٹیں اور شر وفساد سے محفوظ رہا، اس کے بارے میں کیا خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ خلافت وامارت کا حریص رہا ہوگا؟ یہ حرص تو سخت مذموم ہے، پھر وہ سنت کا قائم کرنے والا اور پاک دامن کیونکر ہوسکتا ہے؟۔

مدعی! لاکھ پہ بھاری گواہی تیری

اور سنئے !اسی نہج البلاغہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک خط بنامِ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے،اسے بھی ملاحظہ کرتے چلئے ،اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے خلافت کے انعقاد پرخلفاءِ ثلٰثہ کی خلافت سے استدلال کیا ہے۔

أما بعد ! فإن بيعتى لزمتك وأنت بالشام فإنه بايعنى القوم الذين بايعوا أبابكر وعمر وعثمان على مابايعوهم عليه فلم يكن للشاهد أن يختار ولا للغائب أن يردوا إنما الشورىٰ للمهاجرين والانصار فإن اجتمعوا علىٰ رجل وسموه إماماً كان لله رضى فإن خرج منهم خارج بطعن أو بدعة ردوه إلىٰ ماخرج منه فإن أبىٰ قاتلوه علىٰ إتباعه غير سبيل المومنين ولى الله ماتولىٰ۔

امابعد !بلاشبہ میری بیعت تمہیں لازم ہے گوکہ تم ملک شام میں ہو، کیونکہ مجھ سے وہ لوگ بیعت کر چکے ہیں جنھوں نے ابوبکر وعمر وعثمان سے بیعت کی تھی ،اوراسی بات پر بیعت کی ہے،جس پر ان سے بیعت کی تھی ،اب نہ موجود کے لئے گنجائش ہے کہ دوسرے کو چنے اور نہ غائب کوحق ہے کہ اسے رَد کرے،شوریٰ تو مہاجرین وانصار کی معتبر ہے،اگر وہ حضرات کسی شخص پر متفق ہوجائیں اوراسے امام متعین کردیں تو اسی میں اللہ کی رضا ہے، پھر اگر ان سے کوئی شرارت یا بدعت کی وجہ سے خروج کرے،تو اسے وہیں لوٹا دیں جہاں سے وہ نکلا ہے پس اگر نہ مانے تو اس سے لڑیں، کیونکہ اس نے مومنین کی راہ سے انحراف کیا ہے،اوراللہ اس کے سر وہی چیز ڈال دیں، جواس نے اپنے سر لی ہے۔(نہج البلاغہ،ج:۳،ص:۷)

اس مراسلہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے نہ صرف یہ کہ خلفاء ثلٰثہ کی خلافت کو برحق ثابت کیا ہے، بلکہ اپنی خلافت کے ثبوت کے لئے ان حضرات کے دستور کومعیار گردانا ہے،اور اس کے ساتھ ہی شوریٰ اور مشاورت کومہاجرین وانصار کے حلقہ میں مخصوص کردیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ مہاجرین وانصار اگر کسی شخص پر متفق ہوجائیں ،اوراس کو امام متعین کردیں تو اللہ کی رضا اسی میں ہے،اور جو شخص اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر ہو اس کولوٹانا ضروری ہے،اگر نہ مانے تو اس سے جنگ کرنی ناگزیر ہے۔اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کس قدر ثابت برحق اور طریقِ مستقیم پر قائم تھی ،اور حضرت علی نہ صرف یہ کہ اس سے خود راضی

تھے بلکہ اسی میں رضاءِ الٰہی کو مضمر سمجھتے تھے۔کتنے ستم ظریف ہیں وہ لوگ جو حضرت علی کے اس صاف ارشاد کے باوجود ان پر خلافت صدیقی کی مخالفت کا الزام تھوپتے ہیں، اور ان کی جانب شکوہ وشکایت اور جزع وفزع کا دفترِ لایعنی منسوب کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیعت:

یہاں ایک سوال ممکن ہے کہ ذہنوں میں کھٹکے، گو وہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہے مگر تکمیل گفتگو کے لئے اس کی وضاحت بھی مناسب ہے، سوال یہ ہے کہ حضرت علی اوّل روز ......اور بروایتے دوسرے روز......(البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۴۸) بیعت کر چکے تھے، تو پھر بخاری کی اس روایت کا کیا مطلب ہے، جس میں ذکر ہے کہ حضرت علی نے حضور ﷺ کے وصال کے چھ ماہ بعد جب حضرت فاطمہ کی وفات ہوگئی تھی، اس وقت بیعت کی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ بیعت ہونے کے باوجود کچھ خانگی حالات، کچھ وفاتِ نبوی پر رنج وملال اور کچھ حضرت فاطمہ کی علالت کی وجہ سے، اس وقت تک دربارِ خلافت سے ایسا ربط وتعلق قائم نہ کر سکے تھے، جیسا کہ ان جیسی صاحب حیثیت وعظمت شخصیت کے شایان شان تھا۔ اس لئے کچھ لوگوں کے دلوں میں شاید کھٹک تھی کہ یہ خلیفۂ رسول سے کچھ کٹے کٹے سے رہتے ہیں، حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد جب بکثرت لوگوں سے ملنا جلنا ہوا تو انھوں نے محسوس کیا کہ بعض لوگ انھیں دوسری نظر سے دیکھتے ہیں، اس غلط فہمی کے ازالے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجمع عام میں دوبارہ بیعت کی، چونکہ یہ بیعت خصوصی تھی، اس لئے فوراً مشہور ہوگئی اور لوگوں کے دلوں میں جو گرانی تھی وہ دور ہوگئی۔

تجہیز وتکفین اور تدفین:

سقیفہ بنی ساعدہ کا قصہ، پھر دوبارہ بیعت، مذکورہ بالا مرحلہ وفات ہی کے دن یا اس کے دوسرے دن مکمل ہو چکا تھا۔ اب مسلمان مطمئن تھے، شیرازہ بکھرنے سے بچ گیا تھا، خلافت کا انتخاب ہو چکا تھا، اب غسل اور تجہیز وتکفین کا مرحلہ درپیش تھا، اس میں پہلا سوال یہ تھا کہ غسل کون دے؟ انتخاب خلافت کے فوائد وثمرات اسی مرحلے سے ظاہر ہونے شروع ہوگئے۔ فطری بات ہے کہ اعزہ واقرباء غسل دینے کے زیادہ مستحق تھے، چنانچہ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت فضل

بن عباس، حضرت قثم بن عباس، حضرت اسامہ بن زید اور حضورﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت صالح رضی اللہ عنہ غسل کی تیاریاں کرنے لگے، باہر انصار ومہاجرین جمع تھے، ہر ایک کی خواہش تھی اور بجا تھی کہ اپنے محبوب نبی اور جان سے زیادہ عزیز پیغمبر کی آخری خدمت سے بہرہ اندوز اور سعادت مند ہوں، ایسے نازک وقت میں اہل محبت کا تعلق جیسا کچھ جوش جنون دکھائے عین فطرت ہے، لیکن ظاہر ہے کہ حجرۂ مبارکہ میں نہ اتنی جگہ تھی، اور نہ یہ کسی طرح مناسب تھا کہ غسل کے وقت بھیڑ کی بھیڑ جمع رہے، اِدھر جوشِ محبت کہہ رہا تھا کہ کسی طرح یہ سعادت حاصل کرلو، ادھر حجرہ کی تنگ دامانی اور جناب نبی اکرمﷺ کی عظمت پکار رہی تھی کہ حدِ ادب سے باہر نہ نکلو، پھر کیا ہوا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبانی سنئے! فرماتے ہیں کہ:

''جب ہم حضور اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین میں مصروف ہوئے تو ہم نے دروازہ بند کرلیا۔ باہر مجمع لگا ہوا تھا، انصار نے پکارا کہ ہم حضور ﷺ کے نانیہالی رشتہ دار ہیں اور ہمارا مقام دین اسلام میں جو کچھ ہے ظاہر ہے، قریش نے آواز دی کہ ہم حضور ﷺ کے دادھیالی قرابت دار ہیں۔''

ان درخواستوں اور تمناؤں سے ہوسکتا تھا کہ حضراتِ اہل بیت مغلوب ہوجاتے اور انھیں دروازہ کھولنا پڑتا، لیکن ہر موقع کی طرح یہاں بھی حضرت ابوبکر ہی کی انتظامی صلاحیت اور ان پر اعتماد کام آیا۔ چنانچہ حضرت علی فرماتے ہیں کہ:

''اتنے میں حضرت ابوبکر کی آواز سنائی دی جو پکار کر کہہ رہے تھے کہ ہر قوم اپنے جنازہ کی زیادہ حقدار ہے، میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تم ہرگز نہ جاؤ، اگر تم اندر پہونچ گئے تو خاص قرابت داروں کو پیچھے کردوگے، کوئی نہ جائے، ہاں جسے بلایا جائے وہ جاسکتا ہے''

(طبقات ابن سعد، ج:۲،ص:۲۷۸)

چنانچہ مسند احمد کے حوالے سے علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت علی نے انصار میں سے حضرت اوس بن خولی کو اندر بلالیا تھا۔ ملاحظہ فرمایا! غسل کے وقت نہ صرف حضرت ابوبکر موجود تھے بلکہ باہر رہ کر انتظامات میں مصروف تھے۔ وہ بروقت موجود نہ ہوتے تو شور وشغب اور انتشار کا امکان تھا۔

نمازِ جنازہ:

غسل اور تجہیز وتکفین سے فراغت کے بعد نمازِ جنازہ پڑھنے کا وقت آیا۔ بعض روایات

سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ آپ کی نمازِ جنازہ ہر ہر شخص علیحدہ پڑھے۔اس بنیاد پر سب سے پہلے انھیں حضرات نے نماز ادا کی جو غسل دے رہے تھے،ان کے فارغ ہونے کے بعد اوّلاً جو لوگ حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوئے وہ حضراتِ شیخین تھے۔

لما کفن رسول الله ﷺ ووضع علیٰ سریره دخل ابوبکر وعمر ومعهما نفر من المهاجرين والانصار بقدر مایسع البيت ...... ثم صفوا صفوفا لایؤمهم أحد۔(البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۶۵،طبقات ابن سعد، ج:۲،ص:۲۹۰)

جب رسول اللہ ﷺ کو کفن پہنایا گیا،اور آپ ﷺ چار پائی پر لٹادئے گئے،تو حضرت ابوبکر وعمر مہاجرین وانصار کی ایک مختصر سی جماعت......جس کی حجرہ اطہر میں گنجائش تھی...... کے ساتھ اندر داخل ہوئے،پھر بغیر امام کے صف بندی کی۔(آگے دعا وغیرہ کا تذکرہ ہے)

تدفین:

نمازِ جنازہ سے پہلے لوگوں نے رائے دی کہ مسجد میں آپ کی تدفین ہو،بعضوں نے کہا کہ جہاں آپ کے اصحاب مدفون ہیں،وہیں آپ بھی دفن کئے جائیں،اس اختلاف میں بھی جو شخصیت فیصل بنی وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی تھی،انھوں نے فرمایا:

إني سمعت رسول الله ﷺ يقول	میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے
ماقبض نبي إلا دفن حيث قبض	سنا ہے کہ نبی کی جہاں وفات ہوتی ہے
(سیرۃ ابن ہشام، ج:۴،ص:۲۳۰)	وہیں دفن کیا جائے۔

چنانچہ اسی فیصلہ پر عمل ہوا۔

ان تفصیلات پر نظر کرنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ حضراتِ شیخین بالخصوص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین میں شریک نہ تھے،شریک ہونا کیا معنی،آپ تو مرض الموت سے لے کر تدفین تک ہر ہر مرحلہ میں حضور ﷺ کے جانشین اور امت کے سچے رہنما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اور تمام صحابہ پر اپنی خصوصی رحمتیں نازل فرمائے۔آمین

☆☆☆☆☆☆

کتب شیعہ کی شہادت

کتابچہ مکمل کر کے خاکسار نے کاتب کے حوالے کر دیا تھا اور کتابت تقریباً مکمل ہوچکی کہ ایک رسالہ ''جنازۃ الرسول'' ملا، جو علامہ مولانا عبدالستار صاحب تونسوی صدر مناظر تنظیم اہل سنت پاکستان کا تالیف کردہ ہے، موصوف نے یہ رسالہ ہمارے ہی زیر بحث موضوع پر مرتب کیا ہے، اگر یہ رسالہ پہلے مل جاتا تو ہمیں محنت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، موضوعِ زیرنظر پر یہ بہت مکمل اور جامع ہے، ہمیں شیعہ کتب دستیاب نہ تھیں، اس لئے حوالہ میں ان سے استفادہ نہ کیا جاسکا۔ یہ رسالہ شیعہ کی کتب معتبرہ کے حوالجات سے بھرپور و مالا مال ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس رسالہ کے اقتباسات نقل کردئے جائیں۔ (اعجاز احمد اعظمی)

(۱) شیعہ حضرات کی معتبر کتاب ''حیات القلوب'' جلد دوم ص:۶۶۴ پر ہے:

شیخ طبری از حضرت امام محمد باقر روایت کردہ است کہ دَہ دَہ نفر داخل شدند وچنیں برآں حضرت نماز می کردند بے امامے، درروز دوشنبہ وشب سہ شنبہ تا صبح وروز سہ شنبہ تا شام تا آنکہ خورد و بزرگ مرد و زن از اہل مدینہ واہل اَطراف ہمہ برآں جناب چنیں نماز ادا کردند۔

شیخ طبری نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ دس دس آدمی حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوتے تھے اور اس طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کرتے رہے بغیر کسی امام کے، سوموار کے دن اور منگل کی رات صبح تک اور منگل کے دن شام تک، یہاں تک کہ سب چھوٹے بڑے مرد عورت اور اطراف مدینہ کے لوگوں نے اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کی۔

(۲) شیعہ حضرات کی معتبر کتاب ''حق الیقین'' فارسی جلد اوّل ص:۱۳۲ پر آنحضرت ﷺ کے جنازہ کے متعلق مرقوم ہے:

وایشاں صلوٰۃ فرستادند ومی رفتند تا آنکہ مہاجران وانصار داخل شدند وصلوات فرستادند

اور یہ لوگ درود وسلام پڑھتے اور حجرۂ مبارکہ سے نکلتے رہے حتیٰ کہ مہاجرین وانصار داخل ہوئے اور صلوٰۃ وسلام پڑھا۔

(۳) ''اصول کافی'' شیعہ حضرات کی معتبر ترین کتاب ہے، اس کے ص:۲۸۶ پر مرقوم ہے:

عن أبی جعفر علیه السلام قال لما قبض رسول الله ﷺ صلت علیه الملائکة والمهاجرون والانصار فوجاً فوجاً۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ پر ملائکہ، اور تمام مہاجرین وانصار نے گروہ در گروہ جنازہ پڑھا۔

(۴) شیعہ حضرات کی معتبر کتاب مرآۃ العقول، جلد اوّل ص:۳۷۱ پر مرقوم ہے کہ:

دس دس مہاجرین اور انصار آنحضرت ﷺ کا جنازہ (صلوٰۃ وسلام) پڑھتے تھے اور باہر آتے تھے۔

حتیٰ لم یبق أحد من المهاجرین والانصار إلا صلیٰ علیه۔

یہاں تک کہ مہاجرین وانصار میں سے کوئی ایک بھی نہ رہ گیا کہ جس نے آنحضرت ﷺ کا جنازہ نہ پڑھا ہو۔

ایسی واضح اور صریح روایت کے باوجود نہایت ہی حیرت کا مقام ہے کہ کس طرح صحابۂ کرام کی وفادار اور جاں نثار جماعت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرات آنحضرت ﷺ کے جنازے پر حاضر نہ تھے۔

(۵) شیعہ حضرات کی کتاب ''حیات القلوب'' جلد دوم ص:۶۶۴ پر ہے:

وکلینی بسند معتبر از امام محمد باقر روایت کردہ است کہ چوں حضرت رسالت رِحلت فرمود نماز کردند بر وجمیع ملائکہ ومہاجران وانصار فوج فوج۔

کلینی نے نہایت معتبر سند کے ساتھ امام محمد باقر سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت

رسالت نے رِحلت فرمائی تو آپ ﷺ کی نماز جنازہ سب فرشتوں اور مہاجروں اور انصار نے فوج فوج ہوکر پڑھی۔

(۶) ضمیمہ جات مقبول ترجمہ ص:۴۵۰ پر آنحضرت ﷺ کے جنازے کے متعلق لکھا ہے:

جناب سردارِ دو عالم ﷺ نے وفات پائی تو جوق در جوق مہاجرین وانصار اور ملائکہ نے آنحضرت ﷺ درود بھیجا۔

(۷) شیعہ کی معتبر تفسیر صافی کے ص:۲۶۲ پر امام محمد باقر کا فرمان مذکور ہے:

لما قبض رسول الله ﷺ صلت عليه الملائكة والمهاجرون والانصار فوجاً فوجاً۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ پر ملائکہ، اور تمام مہاجرین وانصار نے فوج فوج ہوکر جنازہ پڑھا۔

(۸) احتجاج طبرسی مطبوعہ نجف اشرف ص:۱۵۲ پر آنحضرت ﷺ کے جنازے میں انصار ومہاجرین کی شرکت کے متعلق مرقوم ہے:

ثم أدخل (عليٌّ) عشرة من المهاجرين وعشرة من الانصار فيصلون ويخرجون حتىٰ لم يبق أحد من المهاجرين والانصار إلا صلىٰ عليه۔

پھر حضرت علی دس دس مہاجرین اور انصار کو حجرۂ مبارکہ میں جنازہ کے لئے داخل کرتے رہے، پس وہ لوگ نمازِ جنازہ پڑھتے اور نکلتے رہے یہاں تک کہ مہاجرین وانصار میں سے کوئی ایک بھی نہ رہ گیا کہ جس نے آنحضرت ﷺ کا جنازہ نہ پڑھا ہو۔

(۹) شیعہ مجتہد علامہ باقر مجلسی نے بھی اپنی مشہور کتاب ''جلاء العیون'' کے ص:۳۶ پر آنحضرت ﷺ کے جنازہ میں تمام مہاجرین وانصار، مردوں عورتوں، چھوٹوں بڑوں، اہل مدینہ واطرافِ مدینہ کی شمولیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

تا آنکہ خورد و بزرگ مرد و زن از اہل مدینہ واہل اَطراف ہمہ برآں حضرت چنیں نماز ادا کردند وکلینی بسند معتبر از امام محمد باقر روایت کردہ است کہ چوں حضرت رسالت رِحلت فرمود نماز کردند بروجمیع ملائکہ ومہاجران وانصار فوج فوج۔

یہاں تک کہ سب چھوٹے بڑے مرد وعورت اور اطراف مدینہ کے لوگوں نے اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کی۔ کلینی نے نہایت معتبر سند کے ساتھ امام محمد باقر سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت رسالت نے رحلت فرمائی تو آپ ﷺ کی نماز جنازہ سب فرشتوں اورمہاجروں اورانصار نے فوج فوج ہوکر پڑھی۔

اہل سنت اور شیعہ حضرات کی اس قدر واضح اور معتبر روایات سے بخوبی ثابت ہے کہ مہاجرین اور انصار سارے کے سارے حتیٰ کہ ان کے بیوی بچے تک آنحضرت ﷺ کے جنازۂ مبارک میں شریک ہوئے ،کوئی غیر حاضر اور اس سعادت سے محروم نہ رہا۔ اب ایسی معتبر اور صحیح روایات کی موجودگی میں تربیت یافتگانِ درسِ نبوی ﷺ ونجومِ ہدایت ونمونۂ اخلاقِ نبوت ، شاگردانِ رسول، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق کیسے یہ فضول و بے حقیقت بات کہی اور سنی جاسکتی ہے، کہ جو حضرات مشکل سے مشکل اوقات میں آنحضرت ﷺ پر پَروانہ وار فدا اور قربان ہوتے رہے۔ العیاذ باللہ انھوں نے اخیر وقت میں اس محبوب ترین ہستی اپنے پیارے رسول ﷺ کا جنازہ تک نہیں پڑھا۔

سوال: اگر تمام مہاجرین وانصار آنحضرت ﷺ کے جنازے پر موجود تھے، تو پھر آپ کا جنازہ دو دن تک کیوں رکھا رہا؟

جواب: روایات اہل سنت وشیعہ میں واضح طور پر موجود ہے کہ چونکہ امام الانبیاء علیہ السلام کا جنازہ تھا، جس پر ہزاروں کی تعداد مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی بوجہ اپنے عشق ومحبت کے موجود تھی، اور آنحضرت ﷺ کا جنازہ حجرۂ مبارکہ سے باہر نکالنا مصلحت نہ سمجھی گئی۔ اس وجہ سے دس دس آدمی باری باری سے داخل حجرہ ہوتے رہے، جس کی وجہ سے دو دن تک تاخیر ہوئی، جیسا کہ شیعہ کی معتبر کتاب ''جلاء العیون'' ص: ۳۶، اور ''حیات القلوب'' جلد دوم، ص: ۶۶۴ پر لکھا ہے کہ:

از حضرت امام محمد باقر روایت کردہ است کہ دَہ دَہ نفر داخل شدند وچنیں برآں حضرت نماز می کردند بے امامے، درروز دوشنبہ وشب سہ شنبہ تا صبح وروز سہ شنبہ تا شام تا آنکہ خورد وبزرگ مرد وزن از اہل مدینہ واہل اَطراف ہمہ برآں حضرت چنیں نماز ادا کردند۔

حضرت امام محمد باقر سے روایت ہے کہ دس دس آدمی حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوتے تھے اوراس طرح آنحضرت ﷺ پرنماز جنازہ ادا کرتے رہے بغیر کسی امام کے، سوموار کے دن اور منگل کی رات صبح تک اور منگل کے دن شام تک ، یہاں تک کہ سب چھوٹے بڑے مرد عورت اور اطراف مدینہ کے لوگوں نے اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نماز جنازہ ادا کی۔

اہل سنت کی معتبر کتاب البدایہ والنہایہ جلد خامس ص: ٢٦٥ پر مرقوم ہے:

قـد قيـل إنهم صلوا عليه من بـعـد الزوال يوم الاثنين إلىٰ مثله من يوم الثلاثاء	تحقیق کہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی سوموار کے دن زوال کے بعد نمازِ جنازہ شروع کی اور منگل کے دن زوال کے بعد تک ادا کرتے رہے۔

یہ روایات واضح طور ثابت کرتی ہیں کہ صحابۂ کرام کے عشق ومحبت کی وجہ سے متواتر دو دن رات صبح وشام آنحضرت ﷺ کے جنازے پر مہاجرین وانصار مردوں عورتوں کا اِزدحام رہا۔ جس کی وجہ سے جنازہ دو دن تک بصد مشکل پورا ہوسکا۔ مخفی نہ رہے کہ اس دیر وتاخیر کے باعث عام اموات کی طرح آنحضرت ﷺ کے جسم اقدس واطہر میں کسی قسم کے تغیر کا اندیشہ نہ تھا، کیونکہ انبیاء **علیہم السلام** کے اجسامِ مبارکہ تو قبروں میں قیامت تک محفوظ ہیں۔ قرآن مجید میں موجود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کا وجود مسعود عبادت خانہ میں بہت دنوں تک رہا، مگر کسی قسم کا ذرا بھی تغیر نہ ہوا۔

(٢) حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شرکتِ جنازہ کی تصریح:

شیعہ حضرات کی معتبر روایات میں ثابت ہے کہ حضرت علیؓ ابھی تک جناب رسول اللہ ﷺ کو غسل دے رہے تھے کہ مہاجرین وانصار مسجد نبوی میں آ کر حضور ﷺ کے جنازہ اور دفن وغیرہ کے متعلق باہم مشورہ کر رہے تھے، جس کی اطلاع حضرت عباسؓ نے آ کر حضرت علی کو دی، چنانچہ حیات القلوب جلد دوم ص: ٦٦٤ پر حضرت امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ:

عباس بخدمت امیر المومنین آمد وگفت کہ مردم اتفاق کردہ اند کہ حضرت رسول را در بقیع دفن کنند وابوبکر پیش بایستد وبرآں حضرت نماز کند۔

حضرت عباس جناب امیر المومنین حضرت علی کی خدمت میں آئے اور کہا کہ لوگوں نے اتفاق کیا ہے کہ حضورﷺ کو جنت البقیع میں دفن کریں اور ابوبکر حضور کے جنازہ کا امام بنے۔

اور مرآۃ العقول جلد اوّل پر بھی اسی مضمون کی روایتیں موجود ہیں، نیز احتجاج طبرسی ص:۵۴ پر مرقوم ہے، حضرت سلمان کہتے ہیں کہ:

وقلت لعلی حین یغسل رسول الله ﷺ إن القوم فعلوا کذا وکذا وأن أبابکر الساعة لعلی منبر رسول الله ﷺ۔

میں نے حضرت علیؓ کو اس وقت کہا جب کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو وہ غسل دے رہے تھے کہ تحقیق لوگوں نے اس اس طرح کرلیا اور اب ابوبکر جناب رسول اللہ ﷺ کے منبر پر ہیں۔

تو شیعہ حضرات کی ان معتبر روایات سے ثابت ہوا کہ حضرت علی اب تک غسل رسول اللہ ﷺ سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ صحابۂ کرام مہاجرین وانصار اور ابوبکر صدیق جنازۂ رسول وکفن ودفن کا انتظام اور مشورہ کررہے تھے حتیٰ کہ بعض لوگ ابوبکر صدیق کو امام جنازہ بنانے کا باہم تذکرہ کررہے تھے، لیکن چودہ سو برس بعد آنے والے کس جرأت سے آنحضرت ﷺ کے جنازہ پر صدیق اکبر کی شمولیت کا انکار کرتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

☆☆☆☆☆☆

تصوف اور علمائے دیوبند

اللہ تعالی نے آسمان سے ایک امانت اتاری، یہ امانت خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کی گئی، یہ امانت دین اسلام ہے، یہ علم وعمل اور فکر واعتقاد کی ایک سیدھی راہ ہے، جسے دین سے، شریعت سے، صراط مستقیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی دین ہے، جسے اللہ تعالی نے اپنی آخری کتاب اور آخری کلام میں پسندیدگی کی سند دی ہے۔ ورضیت **لکم الاسلام دیناً**.

اسلام ایک مجموعۂ احکام وارشاد کا نام ہے، اس کے کچھ احکام انسان کے ظاہر پر نافذ ہوتے ہیں، اور کچھ احکام کا تعلق قلب و باطن سے ہوتا ہے، شریعت کے دائرے میں دونوں طرح کے احکام داخل ہیں، نماز کی ایک ظاہری شکل ہے جس کی تشکیل انسان کے بدن سے ہوتی ہے، اور ایک اس کی باطنی صورت ہے جس کا تعلق آدمی کے قلب سے ہے، یعنی خشوع وخضوع، یکسوئی اور دربار الٰہی میں حاضری کا دھیان وخیال۔

یہی حال دوسری عبادات کا بھی ہے، ہر ایک کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے، دونوں کا مجموعہ شریعت ہے، لیکن ان دونوں احکام کے الگ الگ نام بھی بطور شناخت کے استعمال کئے گئے ہیں۔ ظاہری احکام کے مجموعہ کو فقہ کہا گیا ہے اور باطنی احکام کا مجموعہ تصوف کہلایا۔

علم فقہ سے انسان کی ظاہری زندگی دین اسلام پر گامزن ہوتی ہے، اور تصوف سے انسان کا باطن خوبصورت ہوتا ہے، اور سنورتا ہے، ایک زمانہ میں بعض ستم ظریفوں نے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے کے بالمقابل تصور کیا تھا، یہ ایک بڑی گمراہی تھی،

شریعت کل کا مجموعہ ہے، اور تصوف اس کا ایک جز اور اسے خوبصورتی اور رونق بخشنے والا ایک ضروری حصہ ہے۔

ہر زمانے میں علماء محققین نے اور صوفیاء اہل حق نے اس غلط فہمی اور گمراہی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ہندوستان جن دنوں ایک نئے انقلاب سے دوچار ہو رہا تھا، یورپ سے ایک دین بیزار قوم ہندوستان سے تخت وتاج چھین کر ایک نیا نظام ودستور نافذ کر رہی تھی، اس وقت دین وملت کی حفاظت کے لئے اللہ نے کچھ ایسے حضرات کو کھڑا کیا جو ظاہر وباطن کے جامع تھے، اگر ایک طرف وہ قرآن وسنت کے اور فقہ وکلام کے ماہر تھے تو دوسری طرف قلب وباطن کے تاجدار تھے۔ یہ حضرات جیسے علوم ظاہری میں باکمال تھے اسی طرح علوم باطن میں بھی باکمال تھے، ان کے وجود سے شریعت کے دونوں پہلوؤں کا کمال ظاہر ہوا۔

یہ حضرات ہندوستان کے مشہور خاندان علم وفضل اور خانوادۂ تصوف وسلوک سیدنا حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے وابستہ تھے، اس خاندان میں جہاں علم وفضل اپنے عروج کمال پر تھا وہیں تصوف وسلوک کی بلندیاں بھی اسے حاصل تھیں، حدیث کا علم اگر شاہ صاحب مدینہ طیبہ سے لائے تھے تو تصوف وسلوک کا ذوق سرہند کے مرد درویش اور صاحب علم وفضل مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد علیہ الرحمہ کے گھرانے سے انہوں نے پایا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور ان کے رفیق خاص حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، دونوں نے علم ظاہر کا اکتساب شاہ ولی اللہ صاحب کے خانوادۂ علم وفضل سے کیا، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دونوں، استاذوں نے اسی خرمن علم سے خوشہ چینی کی تھی۔

پھر تصوف وسلوک کے لئے انہوں نے زانوئے ارادت تھانہ بھون کے مشہور بزرگ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے سامنے تہ کیا، حضرت حاجی صاحب ابتداء مولانا نصیر الدین صاحب سے بیعت ہوئے، جو خانوادۂ مجدد سرہندی کے گل سرسبد تھے، ان کی شہادت کے بعد آپ نے حضرت میاں جی نور محمد جھن جھانوی علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے جو بیک وقت حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید علیہما الرحمۃ کے فیض

یافتہ اور مجاز وخلیفہ تھے،اس طرح وہ سلسلۂ چشتیہ ونقشبندیہ مجددیہ کے مجمع البحرین تھے۔

اس وقت جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تھا،کوئی تصور نہ تھا کہ دارالعلوم سے وابستہ کوئی بھی فرد تصوف کا ذوق آشنا نہ ہو،مہتمم سے لے کر ایک آخری درجہ کی ملازمت رکھنے والا ہر ایک نام خدا کا لذت یاب تھا۔

حضرت نانوتوی کے رفقا میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت گنگوہی بھی،حضرت حاجی صاحب کے دامن گرفتہ،ان کے علاوہ حاجی عابد حسین صاحب،مولانا فضل الرحمان صاحب والد محترم حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب،اور مولانا ذوالفقار علی صاحب والد محترم حضرت شیخ الہند،حضرت حاجی صاحب کے دامن فیض سے وابستہ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اول حضرت شاہ رفیع الدین صاحب،خانقاہ مظہریہ کے گل سرسبد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی محدث،استاذ گرامی حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی کے خلیفہ تھے،اور بڑے صاحب نسبت اور پرتاثیر بزرگ تھے۔

دارالعلوم کا دور آغاز شریعت وطریقت کا ایک سدا بہار گلستاں تھا،دارالعلوم کے پہلے صدرالمدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی بھی حضرت حاجی امداداللہ صاحب کے فیض یافتہ اور خلیفہ تھے،یہ حضرات علم وفضل کے مقام بلند پر فائز تھے،حضرت گنگوہی تفقہ وحدیث کے امام تھے،ان کا فیضان درس وتدریس،فتوی نویسی اور تالیف وتصنیف ہر اعتبار سے رواں دواں تھا،اس کے ساتھ سلوک ومعرفت کی عظیم خانقاہ بھی آپ کے وجود کے ساتھ قائم تھی،بڑے بڑے علما اور خصوصی لوگ اس بحر معرفت سے فیض پاتے تھے،دارالعلوم دیوبند کے اس وقت اساتذہ وطلبہ اور اہل انتظام سب گنگوہ کے چشمۂ معرفت کے جرعہ نوش تھے،اس وقت تقریباً پورے ہندوستان میں علم ومعرفت کا نور خانقاہ گنگوہ سے پھیل کر اطراف واکناف کو روشن کر رہا تھا۔ایک طرف درس حدیث کا سلسلہ جاری تھا،دوسری طرف تصوف وسلوک کی تابانیاں قلوب کو جگمگا رہی تھیں۔اس چشمۂ فیض سے جو نفوس قدسیہ سیراب وسرشار ہوئے وہ بجائے خود ایک امت تھے،ان فضیلت وروحانیت سے ہندوستان میں بھی اور بیرون ہند بھی دین وملت کے بلند مینار تعمیر ہوئے۔

یہ وہ حضرات ہیں جو براہ راست دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے،ان کا ہر فرد بجائے خود ایک امت تھا،ایک ملت تھا،ان سے علم وحکمت کے ساتھ سلوک ومعرفت کے بحر ذخار جاری ہوئے،جن سے ایک دنیا کی دنیا سیراب ہوئی۔

حضرت گنگوہی کے متوسلین وخلفا میں دو نام اس قدر ممتاز ہیں اوران کا فیض اس درجہ عام ہوا کہ اس کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں،تاہم اجمال واختصار کے ساتھ ان کا قدرے تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اول شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی،دوسرے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری۔حضرت شیخ الہند براہ راست بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے شاگرد تھے،چنانچہ ان کے علوم اوران کی تصنیفات پر حضرت نانوتوی کا رنگ چھایا ہوا ہے،لیکن تصوف وسلوک کے لئے وہ اپنے خواجہ تاش حضرت گنگوہی کی خدمت میں لوگوں کو بھیج دیا کرتے تھے،اسی نسبت سے حضرت شیخ الہند نے حضرت گنگوہی کے دامن فیض سے تربیت پاکر طریقت وسلوک کا میدان طے کیا،خود حضرت شیخ الہند باوجود اعلیٰ نسبت کے حامل ہونے کے بیعت وارشاد کی ذمہ داریوں سے حتی الامکان بچتے تھے،مگر ان کے تلامذہ میں اتنے بڑے اصحاب نسبت اور بزرگ ہوئے ہیں کہ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ استاذ کا مرتبہ ومقام کیا ہوگا؟۔

حضرت تھانوی،علامہ انورشاہ کشمیری،مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند،شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی،حضرت سید اصغر حسین صاحب،حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی،حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔یہ وہ آفتاب وماہتاب ہیں،ان میں ہر فرد تنہا سارے عالم کو روشن کرنے کے لئے کافی ہے۔

پھر حضرت شیخ الہند نے حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں بھی خوب حصہ لیا،اور ایک عرصہ تک اس کی قیادت کرتے رہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب جامعہ مظاہر علوم سہارن پور کے صدر،شیخ الحدیث اور سرپرست رہے،انہوں نے طریقت ومعرفت کی بڑی عظیم الشان خدمت انجام دی،تفصیلات

دیکھنی ہوتو ''تذکرۃ الخلیل'' یا ''حیات خلیل'' پڑھئے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کے فیض تربیت سے جو باکمال اٹھے ان میں ایک نام حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کا ہے، یہ بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے، اور اللہ تعالی نے تجدد دین وملت کا اتنا بڑا کام لیا ہے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی، آج جو سارے جہاں میں تبلیغی جماعت کے وفود دین کے نام پر چلتے پھرتے ہیں، یہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب ہی کی برکت ہے۔

دور حاضر کے مشہور روحانی شیخ اور زبردست عالم ومحدث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نے انہیں کی خدمت میں تربیت پائی، آج دنیا کا ایک بڑا حصہ ان کے خلفا و متوسلین سے فیض پارہا ہے۔

حضرت شیخ کے خلفا کی ایک بڑی تعداد ہے، ان میں نامور ترین بزرگ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ تھے، ان کا فیض ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور یورپ وافریقہ میں عام ہے۔

حضرت گنگوہی کے دامن تربیت میں ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو بظاہر دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں نہیں ہیں، لیکن ان کے فیضان روحانی سے ایک دنیا متأثر ہوئی۔ لکھنو کے شیخ وارث حسن صاحب علیہ الرحمہ حضرت گنگوہی کے خلفا میں ہیں، ان سے جدید تعلیم یافتہ نئی نسل کی اصلاح بہت ہوئی۔

حضرت گنگوہی کے خلفا و متوسلین میں ایک عظیم الشان ہستی حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی ہے، یہ ابتداء ایک دوسرے بزرگ جو انہیں کے ہم نام تھے، یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارن پوری کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے، وہاں سے تکمیل واجازت کے بعد گنگوہ میں حاضر ہوئے، اور طریقت وسلوک کے اعلی مراتب پر فائز ہوئے۔ شاہ صاحب کا فیض مغربی یوپی اور پنجاب وہریانہ کے علاقوں میں بہت عام ہوا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے خلفا میں نامور ترین بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری تھے، ان کے ذریعے سے تصوف وسلوک کی عمومی اشاعت ہوئی، اور ایک دنیا

کی دنیا نام خدا کی حلاوت آشنا ہوئی۔ دور حاضر کے دو بڑے ممتاز اصحاب علم وقلم نے تزکیہ و باطن کا فیض انہیں بزرگ سے پایا، ایک حضرت مولانا منظور نعمانی جنہوں نے کبھی میدان مناظرہ میں قدم رکھا تو فرق باطلہ کے قدم اکھاڑ دیئے، پھر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو احسان وسلوک کے اعلی مرتبوں پر فائز ہوئے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کی خدمت میں رہ کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا، اور زندگی کے ہر دور میں اپنے مفید اور بافیض قلم سے دینی موضوعات پر امت کی خدمت کرتے رہے، ماہنامہ ''الفرقان'' کے ذریعے پوری زندگی امت کی رہنمائی کرتے رہے۔

دوسرے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، جن کی علمی ودینی اور دعوتی خدمات کا فیض عرب وعجم کو محیط ہے، اردو اور عربی میں اتنی مفید اور طاقت ور کتابیں تصنیف فرمائیں، دین اسلام اور تصوف وسلوک کا ایسا تعارف کرایا کہ بھٹکے ہوئے دماغوں نے راہ راست کا سراغ پایا۔

حضرت گنگوہی کے خلفا میں ایک عظیم الشان اور بابرکت نام شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی علیہ الرحمہ کا ہے، حضرت شیخ الاسلام جہاں بہت بڑے محدث، بہت بڑے عالم، بہت بڑے مجاہد تھے، وہیں بہت بڑے صاحب نسبت درویش تھے، دن کے مجاہد اور رات کے عبادت گزار، دن قومی وتعلیمی مجاہدوں میں گزرتا، اور راتیں عبادت وریاضت کے سوز و گداز سے معمور ہوتیں، ہزاروں افراد کی تربیت کرکے انہیں اللہ والا بنایا، دارالعلوم میں عرصۂ دراز تک شیخ الحدیث رہے، اور اللہ جانتا ہے کہ کتنے پاکیزہ نفوس نے ان کے قدموں کے نیچے رہ کر سلوک وطریقت کے مراتب طے کئے، ان کے خلفا کی بڑی تعداد ہوئی جن سے معرفت و حقیقت کا راستہ روشن ہوا۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے دو خلفا حضرت گنگوہی وحضرت نانوتوی کے بعد ان کے تیسرے عظیم الشان خلیفہ کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ یہ بزرگ ہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔

زباں پہ بارالہا یہ کس کا نام آیا　　کہ نطق نے مرے، بوسے مری زباں کے لئے

حضرت تھانوی کی ہمہ جہت دینی خدمات سے برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش کا کون صاحب علم ناواقف ہوگا، حضرت تھانوی تصوف وطریقت کے زبردست شہسوار تھے، اوران کے دامن تربیت میں رہ کراتنے عظیم اصحاب نسبت پیدا ہوئے جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

حضرت نے جہاں صوفیہ پاک نہاد کی ایک جماعت تیار کی جنہوں نے مسلمانوں میں ہرعنوان سے دین کی خدمت کی، عقائد کی درستگی، اعمال کی اصلاح، خیالات کی تربیت، معاشرہ کی رہنمائی، لوگوں کو اللہ کا مخلص بندہ بنایا، وہیں انہوں نے قلم کے ذریعے ہر موضوع کو اس طرح روشن کیا کہ کسی کو کوئی التباس نہ رہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے بعد حضرت تھانوی دین وملت کے زبردست مجدد تھے، ان کے خلفا ومتوسلین کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اب تک رواں دواں ہے۔

اللہ تعالی اسے باقی رکھے، اورامت کی آبیاری ہوتی رہے۔

☆☆☆☆☆☆

بہار کا ایک مرد عظیم ۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری
وفات کا ایک ایمان افروز اور دلآویز منظر

ساتویں صدی ہجری کا نصف آخر ہے، ۶۶۱ھ میں بہار کی سرزمین شرق سے، علم وفضل زہد وورع، تقوی وطہارت اور عبادت وریاضت کا ایک آفتاب تازہ طلوع ہو رہا ہے، اللہ تعالی نے اپنے آخری پیغمبر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کو خیر امت بنایا ہے، یہ امت اپنے افراد کی خوبی اور برگزیدگی کے لحاظ سے بڑی زرخیز امت ہے، اللہ نے اس امت کے دامن میں ایمان وعمل کے ایسے گراں بہا نمونے عطا فرمائے ہیں جن کے فضل وکمال کی برکتیں صدیوں اور قرنوں پر محیط ہیں، ایسے ہی فضل وکمال کا آفتاب عالمتاب بہار کے افق پر روشن ہو رہا ہے، یہ بزرگ ہیں مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ۔

ان بزرگ کی ولادت موجودہ بہار شریف کے مضافات میں قصبہ منیر میں شعبان ۶۶۱ھ کے آخری جمعہ کو ہوئی، یہ دور ہندوستان کے مشہور انصاف پرور اور عابد وزاہد بادشاہ سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت کا تھا، بادشاہ کی نیک نیتی اور عبادت وتقوی کا نور پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا، مخدوم الملک پایۂ سلطنت دہلی سے دور مشرق میں پیدا ہوئے، دہلی شہر اس وقت علم وفضل اور مشیخت وبزرگی کا مرکز تھا، چنانچہ مخدوم خود فرماتے ہیں:

''در دہلی از ہر چہ پرسی ہمہ بسیار، عابداں وزاہداں بسیار، بزرگان دین بسیار، صاحبان سجادہ وصاحبان کرامت بسیار''۔ (سیرۃ الشرف ۵۷)

دہلی میں جس چیز کو پوچھو سب کچھ بہت زیادہ ہے، عابد وزاہد بہت! بزرگان دین بہت! صاحب سجادہ بہت! اصحاب کرامت بہت!

شیخ دلی سے دور تھے،اور علم وفضل کا مرکز دہلی شہر تھا،حق تعالی کے غیبی انتظامات بھی عجیب ہوتے ہیں،شیخ کا ابتدائے عمر میں دہلی پہونچنا مشکل،اور وہاں پہونچے بغیر علم کی تکمیل دشوار!دہلی انقلاب سلطنت کی شکار ہوئی،غالباً غیاث الدین بلبن کا دور تھا،دہلی کے نامور اور قدیم شہرت یافتہ اساتذہ اور مدرسین میں ایک بلندرتبہ بلکہ شاید سب سے بلند مرتبہ استاذ شیخ شرف الدین ابوتوامہ اس انقلاب کی ہلچل سے متأثر ہوئے،ان سے دہلی چھڑائی گئی،شاید عتاب شاہی نے انہیں ملک کے آخری مشرقی سرحد پر جانے کا حکم صادر کیا،اس دور میں اسلامی سلطنت کی آخری سرحد پر ایک بڑا شہر سنارگاؤں تھا،جواب ڈھاکہ کے علاقے میں پنیام کے نام سے ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے،یہ شہر اس عہد میں مشرقی بنگال کا دارالحکومت تھا،حضرت شیخ شرف الدین ابوتوامہ کے بارے میں خود مخدوم الملک فرماتے ہیں:

''مولانا شرف الدین ابوتوامہ ایں چنیں دانشمندے بود کہ در تمامہ ہندوستان مشار الیہ بودند و ہیچ کس را در علم ایشاں شبیہ نہ بود''۔(خوان پر نعمت)

مولانا شرف الدین ابوتوامہ ایسے عالم تھے کہ تمام ہندوستان میں ان کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں،اور علم میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔(تاریخ دعوت وعزیمت ج۳ص۱۸۱)

مولانا دلی سے روانہ ہوئے،راستے میں جہاں مختلف جگہوں پر ان کا ٹھہرنا ہوا،وہیں چند دنوں کے لئے یہ بزرگ حضرت مخدوم کے وطن منیر میں بھی ٹھہرے،شیخ یحییٰ،مخدوم کے والد نے ان کی بڑی مدارات کی،حضرت مخدوم اس وقت نوعمر تھے،مولانا کی صحبت کی برکت یہ ہوئی کہ مخدوم الملک کے دل میں شوق علم موجزن ہوا،انہوں نے والدگرامی سے اجازت چاہی کہ مولانا کے ساتھ سنارگاؤں جاکر ان کی خدمت میں تحصیل علوم کریں،باپ نے بیٹے میں جو یہ شوق دیکھا تو فوراً منظور کرلیا،مولانا نے بھی ایک جوہر قابل پاکر ہاتھوں ہاتھ لیا،اور دامن تربیت میں رکھ کر سنارگاؤں لے گئے،وہ سنارگاؤں پہونچ کر تعلیم میں مشغول ہوگئے،مخدوم نے ایک زمانۂ دراز تک مولانا کی خدمت میں رہ کر تفسیر،حدیث،فقہ،اصول،کلام،منطق،فلسفہ،ریاضی اور تمام علوم متعارفہ کی تحصیل کی،اور اچھی طرح کی۔(سیرۃ الشرف ص۴۷،۴۸)

حق تعالی کی ایک بندۂ خاص پر یہ خصوصی عنایت ومہربانی تھی کہ دہلی کا علم وفضل خود اٹھ

کر طالب کے گھر آ گیا،اور اپنے فیوض وبرکات سے مالا مال کر گیا،ایک عرصہ کے بعد جب تحصیل علوم سے فراغت ہوئی تو گھر تشریف لائے ،والد محترم کا انتقال ہو گیا تھا،والدہ محترمہ کی قدم بوسی کی۔

کچھ دنوں گھر پر ماں کے دامن شفقت میں وقت گزرا مگر آتش عشق الٰہی جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی،اب شعلہ بن کر بھڑ کنے لگی تھی،والدہ مکرمہ سے اجازت لے کر مرکز اولیا ومشائخ حضرت دہلی کی طرف روانہ ہو گئے ،دہلی میں سلطان الاولیا محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین قدس سرہ کے رشد وہدایت کا آفتاب نیم روز ہر طرف تابانی پھیلا رہا تھا،حضرت مخدوم بھی حاضر خدمت ہوئے ،اس وقت خواجہ صاحب کی مجلس میں کچھ مذاکرہ علمی ہوا،حضرت نے اس نو وارد کا اعزاز واکرام کیا مگر فرمایا:

''سی مرغیست کہ نصیب دام ما نیست''۔ایک شاہین بلند پرواز ہے لیکن ہمارے جال کی قسمت کا نہیں۔یہ فرما کر ایک بیڑا پان دے کر رخصت کر دیا۔

بعد میں دہلی کے ایک دوسرے بڑے مگر گمنام شیخ ومرشد حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔

سلسلۂ فردوسیہ:

مشائخ طریقت کے چار سلسلے مشہور ہیں،ان میں ایک سلسلہ سہروردیہ ہے،جو شیخ الشیوخ سیدنا شہاب الدین عمر سہروردی ،صاحب عوارف المعارف کی جانب مشہور ہے،ان بزرگ کے خواجہ تاش ،مشہور بزرگ خواجہ نجم الدین کبری علیہ الرحمہ تھے،یہ دونوں بزرگ خواجہ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی علیہ الرحمہ متوفی ۵۶۳ ھ کے خلفا میں تھے،خواجہ نجم الدین کبری خوارزم کے رہنے والے تھے،تصوف وطریقت میں اس کا پایہ بہت بلند تھا۔

ان کے شیخ خواجہ ضیاء الدین ابوالنجیب قدس سرہ نے جب انہیں خلافت عطا فرمائی تو فرمایا:

''شما مشائخ فردوس ہستید''۔تم مشائخ فردوس ہو۔

خواجہ نجم الدین کبری کے ایک زبردست خلیفہ خواجہ سیف الدین باخرزی تھے،ان کے

خلیفہ خواجہ بدرالدین سمرقندی تھے، یہ بزرگ ہندوستان تشریف لائے، اور دہلی میں قیام فرمایا، خواجہ بدرالدین سمرقندی کے خلیفہ خاص خواجہ رکن الدین فردوسی تھے، انہیں کے عہد سے یہ سلسلہ فردوسیہ کے لقب سے معروف ہوا۔

خواجہ نجیب الدین فردوسی انہیں خواجہ رکن الدین فردوسی کے بھتیجے تھے، وہ چچا کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے، اور انہیں سے خلافت پائی، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ انہیں خواجہ نجیب الدین صاحب سے بیعت ہوئے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> ''(انہوں نے) سلسلہ فردوسیہ کی اشاعت واستحکام اور توحید وعشق الٰہی کی تبلیغ و اشاعتِ عام کے لئے ایک ایسے محقق، مجتہد الفن، امام اور بانی طریقہ کی تربیت کی جس نے نہ صرف پیران عظام کے نام کو زندہ اور تابندہ رکھا بلکہ نصف صدی سے زائد تک مشرقی ہندوستان کو اپنے روحانی فیض اور حرارتِ عشق سے گرم اور معمور رکھا، اور اپنی تحقیقات عالیہ ، مقامات علمیہ اور علوم نادرہ کی بنا پر عین القضاۃ ہمدانی، خواجہ فریدالدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی کی یاد تازہ کردی''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج۳ ص۱۹۴)

اجازت وخلافت:

حضرت مخدوم جب شیخ نجیب الدین کی خدمت میں پہونچے اور بیعت کی درخواست کی تو شیخ نے بیعت لی، اور ایک اجازت نامہ اسی وقت لاکر دیا، مخدوم نے عرض کیا کہ میں نے تو ابھی شیخ کی خدمت میں رہ کر کچھ سیکھا نہیں ہے؟ فرمایا کہ بارہ برس قبل میں نے حضور ختمی مآب ﷺ کے حکم سے یہ اجازت نامہ لکھ کر رکھ لیا تھا، تم کو کچھ اندیشہ نہیں کرنا چاہئے، نبوت تمہاری تعلیم کرے گی، اور پیروں کی ولایت حامی رہے گی، پھر طریقت کی روشن تعلیم فرمائی اور چند نصیحتیں لکھ کر مخدوم کو دیں، اور قدرے اپنے پاس رکھ کر رخصت فرمایا، اور یہ بھی فرمایا کہ اگر راہ میں تم کوئی خبر ملے تو نہ لوٹنا۔ مخدوم اپنے بھائی اور چند رفقا کے ساتھ دہلی سے سوئے وطن روانہ ہوئے، ابھی دو تین منزل گئے ہوں کہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے وصال کی خبر ملی، مخدوم نے حسب ہدایت سفر جاری رکھا، مگر دل کا جو حال ہوا اسے اللہ ہی جانتا ہے، البتہ اس کی طرف حضرت مخدوم کے ایک

ملفوظ سے اشارہ ملتا ہے، اورآگے کے حالات اس کے شاہد بین ہیں۔فرماتے ہیں:

''من چوں بخواجہ نجیب الدین فردوسی پیوستم حزنے دردل من نہادہ شد کہ ہر روز آں حزن زیادہ می شد''۔

میں جب خواجہ نجیب الدین فردوسی سے ملا تو ایک حزن اور درد میرے دل میں بیٹھ گیا، جو دن بدن بڑھتا ہی رہا۔(تاریخ دعوت وعزیمت ج۳ص۱۹۷)

پھراس کا کامل ظہور اس وقت ہوا جب حضرت مخدوم منزل بمنزل راستہ طے کرتے ہوئے وطن کے قریب ایک جگہ''بتھیا''پہونچے، وہاں ایک جنگل کے کنارے سے گزرہورہا تھا کہ ایک مور کے چنگھاڑنے کی آواز سنی، دل درد وحزن سے بھرا ہوا تو تھا ہی، اسے سن کر دل میں ہوک سی اٹھی، اورصبر وضبط کا یارا نہ رہا، گریبان چاک جنگل میں گھس گئے، اور اللہ جانے کہاں روپوش ہوگئے، بھائی نے اور رفقاء سفر نے بہت تلاش کیا مگر کچھ خبر نہ ملی، آخر اجازت نامہ اور خواجہ صاحب کے تبرکات لے کر گھر آگئے، اور یہ سب چیزیں والدہ صاحبہ کے حوالے کیں۔(مناقب الاصفیاء۳۳)

حضرت مخدوم اس جنگل میں بارہ برس تک اس طرح عزلت نشیں رہے کہ نہ کسی نے انہیں جانا اور نہ کسی سے ملاقات ہوئی، غیبی طریقہ پر سلوک وطریقت کی منزلیں طے ہوتی رہیں، بارہ برس کے بعد راجگیر کے جنگلوں میں وقت گزرا، یہاں کچھ کچھ خبر واثر کے نشانات ملتے ہیں، تیس سال صحرانشینی کے بعد حق تعالی کی حکمت ومصلحت نے انہیں آبادیوں کی جلوت میں پہونچایا، اوراذن اقامت دی، پھر بہار شریف میں آپ کی سکونت کا انتظام کیا گیا، تیس سال کے مجاہدات شاقہ کے بعد آپ تقریباً ساٹھ سال ہدایت وارشاد خلائق میں سرگرم رہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب لکھتے ہیں:

''کم سے کم ۷۲۴ھ سے لے کر ۷۸۲ھ تک، جس میں آپ کی وفات ہوئی ہے، نصف صدی سے زائد کا زمانہ خلق خدا کی ہدایت وارشاد اور طالبین کی تعلیم وتربیت میں گزرا، شیخ حسین معز بلخی کے بقول اس عرصے میں ایک لاکھ سے زائد انسان آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، جن میں بعض اقوال کے مطابق کم سے کم تین سو آدمی عارف کامل اور واصل بحق

ہوئے، متعدد ہندوفقیروں اور مرتاض جوگیوں کے قبول اسلام اور آپ کے ہاتھوں تکمیل وتحقیق تک پہونچنے کے واقعات بھی نقل کئے گئے ہیں''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج۳ص۲۰۲)

وفات:

تقریباً ساٹھ سال مخلوق خدا کی نفع رسانی اور ہدایت سامانی میں زندگی گزار کر ۱۲۱؍ سال کی عمر میں جس شان کے ساتھ اپنی روح وجان، جہان آفریں پروردگار کے سپرد کی ہے، وہ ان کی عظمت وبزرگی اور مذہب اسلام کی حقانیت کی ایک عظیم دلیل ہے، موت برحق مگر انسانی افتادومزاج اور لذت وخواہش کے برعکس ایک تلخ حقیقت ہے، یہ تلخ حقیقت جب اللہ کے مخلص بندوں تک پہونچتی ہے تو وہی تلخی جو عام انسانوں کے کام ودہن کو ہرنا گوار سے بڑھ کر ناگوار محسوس ہوتی ہے، اللہ والوں کے لئے ایک جام نوشیں ثابت ہوتی ہے، وہ بڑھ کر اس استقبال کرتے ہیں، اور اس کے آثار وعلائم کو محسوس کرکے مسرت وشادمانی سے مست وسرشار ہوجاتے ہیں۔

حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کی وفات کے حالات اس درجہ ایمان پرور، دل افروز اور نشاط انگیز ہے کہ انہیں پڑھنے سے ایمان میں تازگی، آخرت کی محبت اور اللہ کی رحمت کی امید کا ایک زندہ سماں بندھ جاتا ہے، یہ حالات ان کے خلیفہ خاص، ہمہ وقت کے حاضر باش حضرت زین بدرعربی نے ایک رسالہ میں لکھے ہیں، ہم انہیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے حوالے سے من وعن نقل کرتے ہیں، شیخ زین بدرعربی فرماتے ہیں:

''چہارشنبہ کا دن تھا اور ۵؍شوال ۷۸۲ھ کی تاریخ تھی، میں حاضر خدمت ہوا، نماز فجر کے بعد اس نئے حجرے میں جس کو ملک الشرق نظام الدین خواجہ ملک نے تعمیر کیا تھا، سجادہ پر تکیہ سے سہارا لگائے بیٹھے تھے، شیخ خلیل الدین حقیقی بھائی اور خادم خاص اور بعض دوسرے احباب اور خادم جو متواتر کئی راتوں سے آپ کی خدمت کے لئے جاگتے رہے تھے، جن میں قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین، (جو خواجہ مینا کے بھانجے تھے) مولانا ابراہیم، مولانا آموں قاضی، میاں ہلال وعقیق اور دوسرے عزیز حاضر تھے، آپ نے زبان مبارک سے فرمایا ''**لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم**'' پھر حاضرین کی طرف رخ کرکے فرمایا: سبحان اللہ، وہ ملعون اس وقت

بھی مسئلہ توحید میں لغزش دینا چاہتا ہے، خدا کا فضل وکرم ہے، اس کی طرف کیا توجہ ہوسکتی ہے، پھر آپ نے **لاحول ولاقوة الا بالله العظيم** پڑھنا شروع کیا، اور حاضرین سے فرمایا: تم بھی پڑھو، اس کے بعد آپ اپنے ادعیہ ووظائف میں مشغول ہوگئے، چاشت کے وقت ان سے فارغ ہوئے، کچھ دیر کے بعد اللہ تعالی کی حمد وثنا میں مشغول رہے، بآواز بلند **الحمد لله الحمد لله** کہنے لگے، فرماتے تھے: خدا نے کرم فرمایا **المنة لله المنة لله**، کئی بار دل کی خوشی اور اندرونی فرحت کے ساتھ اسی کو بار بار دہراتے رہے۔ **الحمد لله الحمدلله ،المنة لله المنة لله**

بعد ازاں آں مخدوم حجرہ سے صحن حجرہ میں تشریف لائے، اور تکیہ کا سہارا لیا، تھوڑی دیر کے بعد دست مبارک پھیلائے، جیسے مصافحہ فرمانا چاہتے ہوں، آپ نے قاضی شمس الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور دیر تک لئے رہے، پھر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا، خدام کو رخصت کرنے کا آغاز انہیں سے ہوا، پھر قاضی زاہد کا ہاتھ پکڑ کر سینہ مبارک پر رکھا اور فرمایا: ہم وہی ہیں ہم وہی ہیں۔ پھر فرمایا: ہم وہی دیوانے ہیں، ہم وہی دیوانے ہیں۔ پھر تواضع وخاکساری کی کیفیت طاری ہوئی، اور فرمایا: نہیں، بلکہ ہم ان دیوانوں کی جوتیوں کی خاک ہیں، پھر حاضرین میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ فرمایا اور ہر ایک کے ہاتھ، داڑھی کو بوسہ دیا، اور اللہ تعالی کی رحمت ومغفرت کے امیدوار رہنے کی تاکید فرمائی، اور بلند آواز سے پڑھا "**لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**"۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

خدایا رحمت دریائے عام است   از انجا قطرے بر ما تمام است

اس کے بعد حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا: کل تم سے سوال کریں گے تو کہنا "**لا تقنطوا من رحمةالله**" لائے ہیں، اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا، اس کے بعد کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا "**اشهد ان لا اله الاالله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله**"۔ یہ الفاظ بھی ادا کئے۔ **رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمدﷺ نبيا وبالقرآن اماما وبالكعبة قبلة وبالمومنين اخوانا وبالجنة ثوابا وبالنار عذابا.**

میں اللہ کو رب مانتا ہوں، اسلام کو دین، محمد ﷺ کو نبی، قرآن کو اپنا پیشوا، کعبہ کو قبلہ، اہل

ایمان کو اپنا بھائی، جنت کو اللہ کا انعام اور دوزخ کو اللہ کا عذاب تسلیم کرتا ہوں، اور اس عقیدے پر مطمئن ہوں۔

اس کے بعد آپ نے مولانا تقی الدین اودھی کی طرف متوجہ ہو کر اپنا ہاتھ پھیلایا اور فرمایا: عاقبت بخیر ہو، اور ان کے حال پر بڑی عنایت و مہربانی فرمائی، پھر زبان مبارک سے فرمایا، آموں! مولانا آموں حجرے کے اندر تھے، وہ سن کر لبیک کہتے ہوئے دوڑتے ہوئے آئے، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور چہرۂ مبارک پر ملنے لگے، فرمایا: تم نے بڑی خدمت کی، تمہیں نہیں چھوڑوں گا، خاطر جمع رکھو، ایک ہی جگہ رہیں گے، اگر قیامت کے دن پوچھیں گے کہ کیا لائے؟ تو کہنا" **لاتقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**"، اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا، دوستوں سے کہو خاطر جمع رکھیں، اگر میری آبرو رہے گی تو میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا، اس کے بعد ہلال اور عتیق کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم نے ہم کو بہت خوش رکھا، ہماری بڑی خدمت کی، جیسے ہم تم سے خوش رہیں گے، تم بھی خوش ہو گے اور ہمیشہ خوش رہو گے، تین مرتبہ اپنا ہاتھ میاں ہلال کی پیٹھ پر رکھا اور فرمایا: بامراد ہو گے، اس وقت آپ کے دونوں پاؤں میاں ہلال کی گود میں تھے، اور ان کے حال پر بڑی عنایت تھی۔

اس عرصہ میں مولانا شہاب الدین ناگوری آئے، آپ نے کئی بار ان کے سر، چہرہ، داڑھی اور دستار کو بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے تھے، اور الحمد للہ الحمد للہ کہتے جاتے تھے، آپ نے ہاتھ نیچے کر لیا، اور درود پڑھنے لگے، مولانا شہاب الدین کی بھی آپ کے چہرۂ مبارک پر نظر تھی، اور درود پڑھ رہے تھے، اس کے بعد آپ نے مولانا شہاب الدین خوہر زادہ خواجہ معین الدین کا نام لیا، اور فرمایا: میری بڑی خدمت کی، مجھ سے بہت اتحاد تھا، بڑی خوبی کے ساتھ میری صحبت اٹھائی، عاقبت بخیر ہو، اس وقت مولانا شہاب الدین نے مولانا مظفر بلخی اور مولانا نصیر الدین جونپوری کا نام لیا، اور فرمایا کہ ان دونوں کے باب میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ آپ نے بہت خوش ہو کر مسکراتے ہوئے اور اپنی تمام انگلیوں سے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا مظفر میری جان ہے، میرا محبوب ہے، مولانا نصیر الدین بھی اسی طرح ہیں، خلافت اور مقتدائی کے لئے جو شرائط واوصاف ضروری ہیں، وہ ان دونوں میں موجود ہیں۔

اس موقع پر مولانا شہاب الدین نے کچھ ہدیہ پیش کیا اور عرض کیا، مخدوم! اسے قبول فرمائیں، فرمایا میں نے قبول کیا، یہ کیا ہے میں نے تو سارا گھر قبول کیا، اس کے بعد ان کو کلاہ عطا ہوئی، انہوں تجدید بیعت کی درخواست کی، آپ نے قبول فرمایا، اس دوران قاضی مینا حاضر خدمت ہوئے، میاں ہلال نے تعارف کرایا، اور عرض کیا کہ یہ قاضی مینا ہیں، فرمایا: قاضی مینا! قاضی مینا! قاضی مینا نے کہا، حضرت حاضر ہوں، اور ہاتھ کو بوسہ دیا، آپ نے ان کا ہاتھ اپنے چہرہ وریشِ مبارک اور رخسار پھیرا، اور فرمایا: خدا کی تم پر رحمت ہو، باایمان رہو، اور باایمان دنیا سے جاؤ، ازراہ شفقت یہ بھی فرمایا: مینا ہمارے ہیں۔ اس دوران میں مولانا ابراہیم آئے، آپ نے اپنا دایاں ہاتھ ان کی داڑھی پر پھیرا، اور فرمایا: تم نے میری اچھی خدمت کی ہے، اور پورا ساتھ دیا، باآبرو ہوگے، مولانا ابراہیم نے عرض کیا: مخدم مجھ سے راضی ہیں؟ فرمایا ہم سب سے راضی ہیں، تمہیں بھی ہم سے راضی ہونا چاہئے، جو کچھ ہے میری طرف سے ہے، اس کے بعد قاضی شمس الدین کے بھا قاضی نورالدین حاضر ہوئے، آپ نے قاضی نورالدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور بڑی شفقت کے ساتھ ان کی داڑھی، چہرہ، رخسار اور ہاتھ کو کئی بار بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے، آپ نے ان سے فرمایا کہ تم ہماری صحبت میں بہت رہے ہو، اور ہماری بڑی خدمت کی ہے، ان شاء اللہ کل ایک ہی جگہ رہیں گے، اس کے بعد مولانا نظام الدین کو ہی حاضر ہوئے، فرمایا غریب اپنا وطن چھوڑ کر ہمارے جوار میں آ گیا تھا، یہ کہہ کر کلاہ مبارک اپنے سے سرا تار کر ان کو عطا فرمائی، اور حسن عاقبت کی دعا فرمائی، اور فرمایا حق تعالی مقصود تک پہونچائے، پھر سب حاضرین کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: دوستو! اپنے دین وایمان کا غم کھاؤ، اور اسی میں مشغول رہو۔

اس کے بعد کاتب سطور زین عربی نے دست مبارک کو بوسہ دیا، اپنی آنکھ، سر اور بدن پر پھیرا، ارشاد ہوا کون ہے؟ میں نے عرض کیا، گدائے آستانہ توجہ چاہتا ہے، اور عرض کرتا ہے کہ مجھے ازسرنو غلامی میں قبول فرمایا جائے، فرمایا جاؤ، تم کو بھی قبول کیا، تمہارے گھر اور اہل خاندان کو قبول کیا، خاطر جمع رکھو، اگر میری آبرو رہی تو کسی کو چھوڑنے والا نہیں ہوں، میں نے عرض کیا: مخدوم تو مخدوم ہیں، مخدوم کے غلاموں کی بھی آبرو ہے، فرمایا امیدیں تو بہت ہیں۔ قاضی شمس الدین آئے اور حضرت مخدوم کے پہلو میں بیٹھ گئے، مولانا شہاب الدین وہلال وعقیق نے عرض

کیا کہ مخدوم! قاضی شمس الدین کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ فرمایا قاضی شمس الدین کے بارے میں مَیں کیا کہوں؟ قاضی شمس الدین میرا فرزند ہے، کئی جگہ میں اس کو فرزند لکھ چکا ہوں، خط میں مَیں نے اس کو برادرم بھی لکھا ہے، ان کو علم درویشی کے اظہار کی اجازت ہوچکی ہے، انہیں کے خاطر اتنے کہنے اور لکھنے کی نوبت آئی، ورنہ کون لکھتا؟۔

اس کے بعد برادر اور خادم خاص شیخ خلیل الدین نے جو پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، آپ نے ان کی طرف رخ کیا، اور فرمایا: خلیل! خاطر جمع رکھو، تم کو علما و درویش چھوڑیں گے نہیں، ملک نظام الدین خواجہ ملک آئے گا، اس کو میرا اسلام ودعا پہونچانا، میری طرف سے بہت معذرت کرنا اور کہنا کہ میں تم سے راضی ہوں، اور راضی جارر ہا ہوں، تم بھی راضی رہنا، فرمایا کہ جب تک ملک نظام الدین ہے تم کو نہیں چھوڑے گا، شیخ خلیل الدین بہت متأثر تھے، آنکھوں میں آنسو تھے، حضرت مخدوم نے جب ان کی دل شکستگی دیکھی تو بڑی شفقت سے فرمایا: خاطر جمع رکھو، اور دل کو مضبوط رکھو، اس کے بعد فرمایا کون ہے؟ ہلال نے عرض کیا کہ ملا محمود صوفی ہیں، آپ نے بڑے گہرے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ بیچارہ غریب ہے، مجھے اس کی بڑی فکر ہے، بیچارے کا کوئی نہیں، اس کے بعد ان کے لئے حسن عاقبت کی دعا فرمائی، اس کے بعد قاضی خاں خلیل حاضر خدمت ہوئے، فرمایا: بیچارہ قاضی ہمارا پرانا دوست ہے، ہماری صحبت میں بہت رہا ہے، اللہ تعالی اس کو جزائے خیر دے، اور عاقبت بخیر کرے، اس کے فرزند بھی ہمارے دوست ہیں، سب کی عاقبت بخیر ہو، اور حق تعالی دوزخ سے رہائی دے۔

اس کے بعد خواجہ معز الدین مشرف بخدمت ہوئے، فرمایا عاقبت بخیر ہو، پھر مولانا فضل اللہ نے قدم بوسی کی، فرمایا بھلے بھلے، اللہ عاقبت بخیر کرے، فتوح باورچی روتا ہوا آیا، اور قدموں میں گر گیا، فرمایا: بیچارہ فتوحا، جیسا کچھ تھا میرا ہی تھا، اس کے حق میں بھی دعائے عاقبت فرمائی، اس کے بعد مولانا شہاب الدین صاحب نے شرف قدم بوسی حاصل کی، ہلال نے تعارف کرایا کہ مولانا شہاب الدین حاجی رکن الدین کے بھائی ہیں، فرمایا: انجام بخیر ہو، ایمان کا غم کھاؤ، اور رحمت حق کے امیدوار ہو کر پڑھو **لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً.**

کچھ دیر کے بعد نماز ظہر کے قریب سید ظہیر الدین اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے، آپ نے سید ظہیر الدین کو بغل میں لے لیا، اور بڑے لطف وشفقت کے ساتھ فرمایا: میں جو عاقبت عاقبت کہتا تھا، یہی عاقبت ہے، اس کے بعد تین مرتبہ ان کو بغل میں لیا اور آخری بار یہ آیت پڑھی، **لاتقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**، اور حاضرین کو رحمت ومغفرت خداوندی کا امیدوار بنایا، اس کے بعد وہاں سے اٹھے اور حجرے میں تشریف لے گئے، اور سید ظہیر الدین کے ساتھ کچھ دیر بیٹھے، اور ان سے کچھ دیر باتیں فرمائیں، اس کے بعد سلطان شاہ پرگنہ دار راجگیر اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر خدمت ہوا، ایک روغن کا سر ریاح پیش کیا، ارشاد ہوا کہ مولانا نظام الدین بھی لائے تھے، پھر شربت اور پان دے کر معذرت کی، اس کے بعد خلیل کے بھائی منور نے عرض کیا کہ توبہ وبیعت کرنا چاہتا ہوں، فرمایا آؤ، اس کی جانب ہاتھ بڑھا کر توبہ وبیعت سے مشرف فرمایا، پھر قینچی طلب کی، قینچی سے بال تراشے اور کلاہ پہنائی، اور فرمایا جاؤ دوگانہ ادا کرو اس طرح اس کے بیٹے نے بھی بیعت کی، اس کو بھی یہی حکم ہوا۔

اسی اثنا میں قاضی عالم احمد مفتی، مولانا نظام الدین مفتی کے بھائی جو مریدان خاص میں سے ہیں، آئے، اور ادب کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھ گئے، اسی درمیان ملک حسام الدین کے بھائی امیر شہاب الدین اپنے لڑکے کے ساتھ حاضر ہوئے اور آکر بیٹھ گئے، آپ کی نظر مبارک لڑکے پر پڑی، آپ نے فرمایا: پانچ آیتیں پڑھ سکتے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا، ابھی چھوٹا ہے، سید ظہیر الدین مفتی کا لڑکا بھی حاضر تھا، میاں ہلال نے جو دیکھا کہ آپ کو اس وقت کلام الٰہی سننے کا ذوق ہے، تو انہوں نے اس لڑکے کو بلایا اور پانچ آیت پڑھنے کی ہدایت کی، سید ظہیر الدین نے جب محسوس کیا کہ طبیعت مبارک پر قرآن مجید سننے کا تقاضا ہے تو اپنے لڑکے کو ارشاد کیا کہ قرآن مجید کی پانچ آیتیں پڑھو، لڑکا سامنے آیا اور مؤدب بیٹھ گیا، اس نے سورہ فتح کے آخری رکوع کی آیتیں **محمد رسول الله والذين معه** الخ پڑھنی شروع کی، حضرت مخدوم تکیہ کے سہارے آرام فرما رہے تھے، اٹھ بیٹھے، اور معمولِ قدیم کے مطابق باادب دوزانو بیٹھ گئے، اور بڑی توجہ سے قرآن سننے لگے، لڑکا "**ليغيظ بهم الكفار**" پر پہونچا تو مرعوب ہوگیا، اور اس سے پڑھا نہ جاسکا، آپ نے اس کو آگے کے لفظ کی تلقین فرمائی، جب لڑکے نے قرأت ختم کی

تو آپ نے فرمایا: اچھا پڑھتا ہے اور خوب ادا کرتا ہے، لیکن مرعوب ہوجاتا ہے، اس موقع پر آپ نے ایک مغربی درویش کا ذکر کیا کہ کبھی اس کی طبیعت حاضر ہوتی تھی اور قرآن مجید سننے کا ذوق ہوتا تھا، کبھی اس طبیعت حاضر نہیں ہوتی تھی اور قرآن مجید سننے کا ذوق نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد قاضی عالم کو شربت اور پان دینے کا ارشاد ہوا، اور معذرت فرمائی، آپ نے پیراہن جسم سے اتارنا چاہا اور وضو کے لئے پانی طلب فرمایا، اور آستین سمیٹی، مسواک طلب فرمائی، آواز سے بسم اللہ پڑھی، اور وضو شروع فرمایا، اور ہر موقع کی ادعیہ پڑھیں، کہنیوں تک دونوں ہاتھ دھوئے، منھ دھونا بھول گئے، شیخ فریدالدین نے یاددلایا کہ منھ دھونا رہ گیا، آپ نے ازسرنو وضو کرنا شروع کیا، اور بسم اللہ اور وضو کی دعائیں جس طرح آئی ہیں، بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھتے تھے، مفتی سید ظہیرالدین اور حاضری مجلس دیکھتے تھے، اور تعجب کرتے تھے، اور آپس میں کہتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ احتیاط! قاضی زاہد نے پاؤں دھونے میں مدد کرنا چاہی، حضرت مخدوم نے ان کو روک دیا، اور فرمایا، کھڑے رہو، اس کے بعد خود سے وضو پورا کیا، وضو مکمل کرنے کے بعد کنگھی طلب فرمائی، اور داڑھی میں کنگھی کی، اس کے بعد مصلیٰ طلب فرمایا، نماز شروع کی، اور دو رکعت پر سلام پھیرا، تکان ہوجانے کی وجہ سے کچھ دیر آرام فرمایا، شیخ خلیل الدین نے عرض کیا کہ حضرت سلامت حجرہ میں تشریف لے چلیں، ٹھنڈک کا وقت ہوگیا ہے، آپ کھڑے ہوئے، جوتیاں پہنیں اور حجرہ کی طرف چلے، آپ کا ایک ہاتھ مولانا زاہد کے کاندھوں پر تھا، دوسرا مولانا شہاب الدین کے کاندھوں پر، حجرہ میں آپ ایک شیر کی کھال پر لیٹ گئے، میاں منور نے بیعت وتوبہ کی درخواست کی، آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھادیا، اور ان کو توبہ وبیعت سے مشرف فرمایا، اور ان کے سر کے بال دونوں جانب سے تھوڑے تھوڑے تراشے، ان کو کلاہ پہنائی اور فرمایا جاؤ دوگانہ ادا کرو، یہ آخری بیعت وتوبہ تھی جو آپ نے کرائی، اس موقع پر ایک عورت اپنے دولڑکوں کو لے کر حاضر ہوئی، اور شرف قدم بوسی حاصل کیا، نماز عصر کے بعد مغرب کی نماز کے نزدیک خدام نے عرض کیا کہ حضرت چارپائی پر آرام فرمائیں، آپ چارپائی پر تشریف لے گئے اور آرام فرمایا۔

نماز مغرب کے بعد شیخ خلیل الدین، قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین، قاضی

نورالدین، ہلال وعقیق اور دوسرے احباب وخدام جو خدمت میں مصروف تھے، چارپائی کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے، حضرت مخدوم نے کچھ دیر کے بعد باآواز بلند بسم اللہ کہنی شروع کی، کئی بار بسم اللہ کہنے کے بعد زورزور سے پڑھا **لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین** ،اس کے بعد بار بار بلند آواز سے بسم اللہ الرحمان الرحیم پڑھا، پھر کلمہ شہادت **اشھد ان لاالہ الااللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ**،اس کے بعد فرمایا:**لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم** ،پھر کچھ دیر تک کلمہ شہادت زبان پر جاری رہا، پھر کئی بار **بسم اللہ الرحمان الرحیم،بسم اللہ الرحمان الرحیم،لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ،اس کے بعد بڑے اہتمام سے اور دل کی بڑی قوت اور بڑے ذوق وشوق سے **محمد،محمد،محمد اللھم صل علی محمد وعلیٰ آل محمد الخ** ،پھر یہ آیت پڑھی، **ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء الخ** پھر **رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد**ﷺ **نبیا** ،اس کے بعد تین مرتبہ کلمہ طیبہ کا ورد فرمایا، پھر آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ جیسے کوئی دعا اور مناجات کرتا ہے،فرمایا:**اللھم اصلح امۃ محمد اللھم ارحم امۃ محمد اللھم اغفر لامۃ محمداللھم تجاوز عن امۃ محمد اللھم اغث امۃ محمد اللھم انصر دین محمد اللھم فرج عن امۃ محمد فرجاً عاجلاً اللھم اخذل من خذل دین محمد ،برحمتک یا ارحم الراحمین**۔ ان الفاظ پر آواز بند ہوگئی،اس وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے،**لاخوف علیھم و لاھم یحزنون لاالہ الا اللہ**، اس کے بعد ایک بار بسم اللہ الرحمان الرحیم کہا اور جاں بحق تسلیم ہوئے، یہ واقعہ شب پنج شنبہ ۶ رشوال ۷۸۲ھ عشا کی نماز کے وقت کا ہے،اگلے روز پنج شنبہ کے دن نماز چاشت کے وقت تدفین عمل میں آئی۔

جنازہ وتدفین:

نماز جنازہ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی نے پڑھائی، جو انتقال کے بعد پہونچے تھے، لطائف اشرفی میں حضرت مخدوم صاحب کی خود وصیت اور پیش گوئی فرمانے، اور شیخ جہانگیر کے وہاں پہونچنے اور حسب وصیت نماز پرھانے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ مخدوم صاحب کی وصیت واطلاع کے مطابق جنازہ تیار کرکے راستہ پر رکھ دیا گیا تھا، اوران کا انتظار تھا، شیخ اشرف جہانگیر دہلی سے بنگالہ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ علاؤ الدین علاؤالحق لاہوری پنڈوی کی خدمت میں تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں بہار شریف عین اس وقت میں پہونچے جب حضرت کا جنازہ تیار کرکے راستہ پر رکھ دیا گیا تھا، اورامام کا انتظار تھا، آپ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبر میں اتارا، قبر کچی ہے اوراس پر کوئی گنبد نہیں ہے، سوریوں کے عہد سلطنت میں اس کے گرد وپیش مکانات، مسجد اور حوض وفوارہ بنا، لیکن بخیال اتباع شریعت جس کا حضرت مخدوم کو بڑااہتمام تھا قبر اپنی حالت پر چھوڑ دی گئی۔

☆☆☆☆☆☆

نصیحت نامہ پیرومرشد

حضرت شیخ نجیب الدین فردوسی علیہ الرحمہ نے بیعت واجازت کے بعد چند نصیحتیں لکھ کر حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری کو دی تھیں، ہم انھیں ''سیرۃ الشرف'' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ان سے حضرات مشائخ صوفیہ کے انداز تربیت کا پتہ چلتا ہے، اور یہی نصیحتیں ہیں جن کے بنائے ہوئے خطوط پر حضرت مخدوم زندگی بھر استقامت وپختگی کے ساتھ چلتے رہے۔

(۱) بعد از تامل وتفکر بسیار روشن شد کہ مشغول شدن، بہر چہ باشد گوخطاست، جز مشغول شدن بحق تعالیٰ کہ بہ ترک است از جملہ!

بہت غور وفکر کے بعد یہ بات روشن ہوئی ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ مشغولیت کے علاوہ کسی بھی چیز اور کام میں مشغول ہونا، خواہ وہ کوئی مشغولیت ہو، غلطی ہے، اور حق تعالیٰ کے ساتھ مشغولیت، ہر ماسوا کے ترک سے ہوتی ہے۔

(۲) واصلاً والبتہ چپ وراست نہ بیند وہوشیار باشد تا بہ غفلت چپ وراست نظر نہ کند۔

دائیں بائیں ہرگز نہ دیکھے، اور ہمیشہ ہوشیار اور باخبر رہے کہ غفلت کی وجہ سے دائیں بائیں نگاہ نہ پڑے۔

(۳) واصلاً والبتہ سخن کسے گوش نہ کند، البتہ قصد شنیدن آں نہ کند کہ چہ می گوید۔قصد دل بچیزے مشغول نہ کند، تا اگر سخن ضروری در گوش می افتد نا فتد وفہم نشود۔

اور ہرگز کسی کی بات پر کان نہ لگائے، اور اس کے سننے کا قصد نہ کرے کہ کیا کہتا ہے، دل کا قصد کسی چیز میں مشغول نہ کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی بات کان میں پڑ بھی جائے تو نہ پڑے اور نہ سمجھ

میں آئے۔

(۴) وجز نان خشک وآب کہ وقت ضرورت مقرر ومعہود کردہ است اصلاً والبتہ نخورد کہ آں محض اتباع ہویٰ است ومحض خودی است۔

اور سوائے سوکھی روٹی اور پانی کے، جو وقت ضرورت متعین ہو، ہرگز کچھ نہ کھائے کہ وہ محض نفس کی خواہش کی پیروی ہے اور محض خودی ہے۔

(۵) وہر روز یکبار میانہ روز متوضی رود، واگر بسبب قلت طعام ہر روز احتیاج نہ شود خود بہتر باشد، واما ازیں زیادہ نرود وقت بگرداند، اگرچہ تقاضا پیدا شود وضو مشوش باشد تا بدیں عادت شود۔

اور ہر روز ایک بار بیت الخلا جائے، اور اگر قلت طعام کی وجہ سے ہر روز ضرورت نہ پڑے تو یہ زیادہ بہتر ہے، مگر ایک مرتبہ سے زیادہ نہ جائے، اگر تقاضا پیدا ہو تو ٹال دے، خواہ وضو میں تشویش ہو، تا کہ اس کی عادت ہو جائے۔

(۶) وہمہ وقت جز یک خرقہ گلیم ہیچ نہ پوشد، مگر در سرما لبادۂ کہنہ بپوشد بالائے خرقہ..... بریں زیادہ نہ کند۔

اور ہمہ وقت بجز ایک کملی کے خرقہ کے اور کچھ نہ پہنے، ہاں جاڑے کے موسم میں ایک پرانا لبادہ خرقہ کے اوپر پہن لے، اس سے زیادہ نہ کرے۔

(۷) واصلاً والبتہ نہ در روز ونہ درشب از آمدن کسے وکار کسے ناخوش نشود واعتراض نہ کند ونہ گزارد کہ در ظاہر وباطن بر ہیچ کس ودر ہیچ چیز انکارے واعتراضے وچون وچرائے ولم وکیفے بگزرد، اگرچہ ہمہ آتش برسر بارد، تا مقام وحدت با کمال ذوق حاصل شود۔

اور کسی کے آنے اور کسی کے کام سے کبھی ناخوش نہ ہو، نہ دن میں، نہ رات میں، نہ کبھی اعتراض کرے، اور اپنے کو اس حال پر ہرگز نہ چھوڑے، کسی شخص پر اور کسی چیز پر ظاہر وباطن میں انکار واعتراض، چون وچرا اور لم وکیف (کیوں اور کیسے) کا گزر ہو، تا کہ کمال ذوق کے ساتھ مقام وحدت حاصل ہو۔

(۸) ودر وقت سماع تا آنگہ کہ تواند وممکن باشد اصلاً والبتہ نگزارد کہ آب از چشم یا حرکت در وجود آید، وبقدر المقدار دریں باب بکوشد، مگر آنگہ کہ مغلوب شود ونگاہ نتواند داشت نہ پرا چہ در ظاہر

شدن احوال آفات بسیار است وکتمان آن از حد مہمات ست ۔

اور بوقت سماع جہاں تک ممکن ہو اور طاقت واختیار ساتھ دے، ہرگز آنکھ سے آنسو بہنے نہ پائے یا بدن میں حرکت نہ ہونے پائے ، بقدر مقدور اس کا اہتمام ضروری ہے، البتہ اگر بالکل مغلوب ہوجائے اور طاقت واختیار باقی نہ رہے تو گنجائش ہے، احوال کے ظاہر ہونے میں آفات بہت ہیں، اور ان کا چھپانا کارِ اہم ہے۔

تشریح

(۱) مشغولیت بحق کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہو، اس کا ذکر ظاہر وباطن اور لسان وقلب سے ہو، اس کے خوف وہیبت کا دل پر تسلط ہو، اس کی خشیت سے گناہوں اور ممنوعات کا ترک ہو۔ اس کی قضا وتصرف پر دل وجان سے رضا وخوشی ہو، یا اس کے حکم کے تحت صبر وسکون ہو، غرض زندگی کا کوئی کام ہو، کوئی تصرف ہو، کوئی حرکت وسکون ہو، وہ سب اس خیال اور جذبہ کے ماتحت ہو کہ حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں، جب یہ جذبہ ہوگا تو ہر اس چیز سے اعراض ہوگا جو انسان کے دامن دل کو حق تعالیٰ سے غفلت کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہی ہو، یہ نصیحت تفسیر ہے اس آیتِ قرآنی کی: قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ. (سورۃ الانعام: ۱۶۳) تم کہہ دو کہ بلاشبہ میری نماز، میری قربانی وعبادت، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے، اللہ کے حکم کے ماتحت ہے، جو سارے جہاں کا پروردگار ہے، اس کے ساتھ کوئی بھی شرکت رکھنے والا نہیں ہے اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا ماننے والا ہوں

(۲) سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا مرکز نگاہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ اور رضائے الٰہی کو بنائے، اس کے دائیں بائیں بہت سی خواہشیں ہیں، بہت سے تقاضے ہیں، بہت سے بلانے والے، بہکانے والے، ترغیب دلانے والے، ڈرانے والے، اندیشوں میں مبتلا کرنے والے ہیں، شیطان ہے، لذت نفس ہے، نفسانی اور جذباتی تعلق کے مراکز ہیں، معاش اور روزی کے بہت سارے پھندے ہیں، مگر سالک ان سب سے صرفِ نظر کرکے اپنی نگاہ صرف سامنے خالق تعالیٰ وتقدس پر جمائے رکھے، اور اس سلسلے میں بہت ہوشیار رہے، ورنہ ذرا سی غفلت

،دائیں بائیں کی کھائیوں اورخندقوں میں گرا کر ہلاک کردے گی۔ إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفاً وَّمَاأَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورۃالانعام:۷۹)میں نے اپنارخ اسی ذات واحد کی طرف یکسوکرلیا ہے،جس نے آسمانوں کواورزمین کو پیدا کیا ہے،اور میں مشرکین میں نہیں ہوں۔ابراہیمں کی یہ صدائے ایمانی اورندائے وحدانی،اس کاعقیدہ وعمل اور نظریۂ وخیال ہونا چاہیئے،اگروہ دائیں بائیں متوجہ ہوگا توشرک میں پڑجانے کااندیشہ ہوگا۔

(۳) بجز ذکرالٰہی کے،بجز تلاوت کلام الٰہی کے،بجز اوامرونواہیٔ خداوندی کےکسی اور بات اورکسی کے کلام پر ہرگز کان نہ لگائے،اس کے علاوہ اوراس سےالگ جوکچھ ہےسب باطل ہے، ان باطل باتوں کو نہ سنے اور نہ سننے کا ارادہ کرے،اگرکسی مجبوری کےتحت کان میں یہ باتیں پڑجائیں توایساہوجیسا کہ نہ سنا،نہ سمجھا،کیونکہ حق کے بعدبجز گمراہی کےاورکچھ نہیں ہے،اورگمراہی ایسی چیزنہیں ہے کہ اس کے سننے کاارادہ کیاجائے، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (سورۃیونس:۳۲)پس حق کے ماسوا،گمراہی کےعلاوہ اورکیاہے؟پس تم کدھرمتوجہ کئے جارہے ہو؟

جدھربھی متوجہ کئے جاؤ گے،تمام گمرہی ہوگی۔

(۴) کھانا پینا جسم کی ایک ضرورت ہے،اورضرورت کی چیز استعمال میں لانی اتنی ہی رواہےجتنی سےضرورت پوری ہوجائے،پس کھاناپینا بھی اتناہی رواہےجس سےجسم کی اور زندگی کی ضرورت پوری ہوجائے،انسان اگراپنے کھانے اور پینے پرغورکرے،تواسے صاف محسوس ہوگا کہ زیادہ تراس کا کھاناپینا،اس کی ضرورت سے زائد،محض خواہش نفس،تحصیل لذت اورخودپسندی ہے،اپنی اپنی پسند کے پیچھے دوڑتے رہنا ہے،انسان کے لئے اتنا کھاناپینا کافی ہے ،جواس کی کمرسیدھی رکھ سکےاوراسے طاعت وعبادت الٰہی کی طاقت حاصل رہے۔

اورظاہر ہے کہ یہ ضرورت سوکھی روٹی اورتھوڑے سے پانی سے پوری ہوجاتی ہے،توسالک اپنے کواسی قدرکاپابند بنائے رکھے۔انسانوں کےتمام طبقات میں جس طبقے نے کھانے اور پینے کوسب سے کم استعمال کیاہے،وہ وہی طبقہ ہے جواللہ کےنزدیک سب سے برگزیدہ اورمعصوم طبقہ ہے،یعنی انبیاءکرام علیہم السلام،ان کے روزانہ کےکھانے پینے کواگرکوئی تلاش کرے،توچند

لقموں سے زیادہ نہ پائے گا، اور تلاش کرنے والوں کو یہ بھی ملے گا اور بہت ملے گا، کہ متعدد روز گزر جاتے اور ان کے شکم چند لقموں سے بھی آشنا نہ ہوتے تھے، ایسا نہ تھا کہ یہ لوگ غربت کی مجبوری میں تھے، انھوں نے منشاء الٰہی کو پایا اور اپنا یہ شعار اختیار کیا۔

کھاتے رہنا اور طرح طرح کی لذتوں میں ڈوبے رہنا کن کا حال ہے؟ اس کی خبر کتاب الٰہی دیتی ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاكُلُوْنَ كَمَا تَاكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (سورۃ محمد:) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہی لذتوں میں پڑے رہتے ہیں، اور اس طرح کھاتے پیتے ہیں جیسے چوپائے کھانے میں لگے رہتے ہیں، اور جہنم ہی ان کا ٹھکانا ہے۔

سالک کا حال وہ نہیں ہونا چاہئے جو کفار کا حال ہے۔

(۵) کھانے پینے کی مقدار بس اتنی ہی رکھے کہ دن میں صرف ایک بار قضائے حاجت کی ضرورت پڑے، اور اگر قلت طعام کی وجہ سے ایک دن سے زائد کا وقفہ ہو تو بہتر ہے، اور اگر بے وقت ضرورت پڑ جائے تو حتی الامکان اسے ٹالے، خواہ اس کی وجہ سے تشویش ہی کیوں نہ پیدا ہو، تاکہ ایک ہی وقت کا عادی ہو جائے۔ یہ بھی ایک ضرورت ہے، ضرورت کی حد سے اس کو بھی متجاوز نہ ہونا چاہئے۔

(۶) پوشاک میں بھی اس کا اہتمام رکھنا چاہئے، کہ بس موٹے جھوٹے کپڑے کے ایک جوڑے سے زیادہ نہ ہو، اتنا انسانی بدن کے لئے حاجت کے لحاظ سے بھی اور شرعی ضرورت کے لحاظ سے بھی کافی ہے، ہاں سردیوں میں ایک اور معمولی لبادہ بدن پر ڈال لے تو حرج نہیں، لباس میں بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت یہی ہے کہ بدن پر کم سے کم کپڑا استعمال کیا ہے، عام طور سے ایک لنگی اور ایک چادر کی خبر ملتی ہے، اور سر پر صافہ ہوتا تھا، اس سے زیادہ کو تعیش اور تنعم میں شمار کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا، تو انھیں نصیحت فرمائی تھی کہ:

إياک والتنعم فان عباد الله ليسوا بالمتنعمين (رواه احمد كذا فى المشكوٰة)

خبردار! تعیش اور تنعم سے بچو، اللہ کے نیک بندے ناز و نعم والے نہیں ہوتے۔

(۷) تمہارے پاس بہت سے لوگ دن میں بھی اور رات میں بھی آئیں گے، اور بہت سے الٹے سیدھے کام بھی ان سے صادر ہوں گے، ان کے آنے سے، اور ان کی حرکات سے دل تنگ نہ ہونا، نہ ان پر اعتراض کرنا، تمہارا حوصلہ بلند ہونا چاہئے، تمہارے اخلاق بہت وسیع ہونے چاہئیں۔ وہ سب لوگ اگر تمہارے سر پر آگ بھی برسائیں، تب بھی تمہارے دل کو جنبش نہ ہونی چاہئے، نہ تمہارے اخلاق میں فرق پڑنا چاہئے۔ مخلوق اور مخلوق کے تصرفات تمہاری نگاہ سے ساقط ہونے چاہئیں، تمہارے دل کا ربط اور تعلق محض حق تعالیٰ شانہ سے ہو، ہر تصرف کا منشا اور مصدر وہی ہیں، اللہ سے محبت و تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ہر تصرف اور ہر فیصلے میں تمہارا دل لذت یاب ہو اور راحت پائے، پس نہ مخلوق کچھ ہے اور اس کا عمل کچھ ہے، جو کچھ ہے اللہ کی جانب سے ہے، بس جو بھی حال ہو تمہارے دل کو ناگواری اور تغیر نہ ہونا چاہئے، تاکہ تمہیں مقام وحدت یعنی محض اور بلا شرکت غیرے اللہ کے تعلق کا ذوق حاصل ہو۔

واضح ہو کہ اس حال کی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تربیت کے فریضہ میں کوتاہی نہ ہوگی، کیونکہ اس کا بجالانا امر الٰہی کے ماتحت ہوگا، اس کے لئے ناگواری اور طبیعت کا تغیر ضروری نہیں ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تربیت میں اگر غصۂ نفس اور ناگواری طبع شامل ہے تو اس میں اخلاص کہاں رہا؟

(۸) سالک کے لئے سب سے بڑی مصیبت، جو اس کے لئے سخت مہلک ہوتی ہے، خود نمائی اور ریاکاری کا جذبہ ہوتا ہے، آدمی قصد کرتا ہے کہ اپنا اچھا عمل اور اچھا حال لوگوں کو دکھائے، تاکہ ان پر اچھا تاثر قائم ہو، وہ اس کے معتقد ہوں، اس کے اثر کے دباؤ میں رہیں، عبادت کا موضوع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کی غرض وغایت اللہ کو راضی کرنا ہے، اگر آدمی نے اپنے اچھے حال، اچھے عمل اور عبادت کو مخلوق پر اثر ڈالنے کے لئے استعمال کرے، تو یہ ایک طرح کا شرک ہوگا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّلَايُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ أَحَداً (سورۃ الکہف: ۱۱۰) جو کوئی اس کا یقین رکھتا ہے کہ اسے حق تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے، اسے چاہئے کہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

سالک کے احوال میں ایک بہترین حال اللہ تعالیٰ کی محبت کے غلبہ کا حال ہوتا ہے، دل پر جب اللہ تعالیٰ کی محبت غلبہ کرتی ہے تو بے تحاشا آنکھیں برسنے لگتی ہیں، بدن حرکت میں آجاتا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَا اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (سورۃ الانفال:) اہل ایمان کے سامنے جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے، تو ان کے دل خشیت سے ہل جاتے ہیں، اور ارشاد ہے: وَاِذَا سَمِعُوْا مَااُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰیٓ اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (سورۃ المائدۃ: ۸۳) جو کتاب رسول کے پاس اتاری گئی ہے، جب اسے وہ سنتے ہیں تو حق کی معرفت ومحبت میں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ پڑتی ہیں۔

سالک کا یہ حال بہت عمدہ ہے، مگر کم ظرف لوگ اسے دوسروں پر اثر ڈالنے کا ذریعہ بنالیتے ہیں، آدمی جب محبت الٰہی کے موضوع پر خوش آوازی کے ساتھ اشعار سنتا ہے تو دل بے اختیار ابلتا ہے، بالخصوص وہ لوگ جو اللہ کی محبت میں مرتے کھپتے ہیں، انھیں تو قابو نہیں رہتا، ان پر بے تکلف وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے ''وجد'' کہتے ہیں، مگر بے نصیب لوگ اس سے متاثر نہیں ہوتے تو تکلف کرتے ہیں اور محبت کی کیفیات سے اپنا لبریز ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

شیخ نے منع فرمایا کہ جب تک قابو چلے ہرگز آنکھ کے آنسو اور بدن کی حرکت ظاہر مت کرنا، یہ تمہارے لئے ایک فتنہ ہوگا، اخفائے حال کی کوشش بہت اہم ہے، ہاں بالکل مجبوری اور بے اختیاری ہو تو البتہ معذوری ہے۔

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کی پوری زندگی، جو کہ خاصی طویل ہے، ان کے ملفوظات وارشادات اور ان کے مکاتیب ومضامین، سب شاہد ہیں کہ انھوں نے پیر ومرشد کی ان نصیحتوں کو استقامت کے ساتھ اپنے عمل میں رکھا، اور اپنے مریدین ومتوسلین کو ان کا پابند بنائے رکھا۔

سالکین ان کا حرف حرف پڑھیں، راستہ آج بھی وہی ہے جو کل تھا۔

وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون

☆☆☆☆☆☆

قصۂ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام

معارف وحقائق

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک سفر کی سرگزشت ذکر کی ہے، اس سرگزشت کا آغاز حدیث میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے (پیغمبر تھے، پیغمبرانہ حقائق ومعارف کا ظہور ہو رہا ہے) کسی نے ان سے دریافت کیا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ فرمایا کہ میں، اس پر حق تعالیٰ نے مواخذہ فرمایا کہ اس کا علم اللہ کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ اللہ نے وحی بھیجی کہ میرا ایک بندہ مجمع البحرین کے پاس ہے، وہ تم سے بڑا عالم ہے، عرض کیا: میرے وہاں تک پہونچنے کی کیا صورت ہوگی؟ حکم ہوا کہ ایک مچھلی لے کر اسے ٹوکری میں رکھ لو، اور دیکھتے رہو، جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہیں وہ بندہ ملے گا، انھوں نے ایک مچھلی لے لی اور اسے تل کر ٹوکری میں رکھ لیا، انھوں نے اپنے ساتھ اپنے ایک شاگرد حضرت یوشع کو بھی لے لیا، اور فرمایا کہ مجمع البحرین تک چلنا ہے، خواہ کتنی ہی مدت لگے، یہ لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑے، یہاں تک کہ مجمع البحرین کے علاقے میں پہونچے، وہاں انھوں نے ایک چٹان کے پاس دم بھر قیام کیا، اور موسیٰ علیہ السلام سو گئے، حضرت یوشع بھی سوئے، مگر وہ پہلے اٹھ گئے، انھوں نے ایک حیرتناک منظر دیکھا کہ مچھلی زندہ ہوگئی، بعض روایات میں ہے کہ وہاں ایک چشمہ تھا، حضرت یوشع اس سے وضو کرنے لگے، پانی کا چھینٹا اڑ کر مچھلی پر پڑا اور وہ زندہ ہوگئی، اور زندہ ہوتے ہی تڑپ کر اچھلی تو پانی میں جا پہونچی، اور پانی میں جیسے ہی وہ گئی اس کے گھسنے کی جگہ

پانی منجمد ہوتا چلا گیااور سرنگ جیسا سوراخ بنتا گیا ، انھیں بڑی حیرت ہوئی ، سوچا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھیں گے تو ان سے ذکر کروں گا ،مگر جب بیدار ہوئے تو وہاں سے کوچ کرنے کے اہتمام میں انھیں مچھلی کا یہ عجیب حال یاد نہ رہا۔ پھر یہ دونوں حضرات دن بھر، رات بھر چلتے رہے، دوسرے دن صبح کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تو تھکان ہوگئی ، لاؤ کچھ کھاپی لیا جائے ، اب انھیں یاد آیا کہ مچھلی تو غائب ہے، کہنے لگے حضرت! دیکھئے اس جگہ جہاں ہم نے چٹان کے پاس قیام کیا تھا ، وہاں میں مچھلی کا تذکرہ بھول گیا،اور یہ شیطان کی حرکت تھی کہ مجھے بالکل بھلادیا، مچھلی تو ایک عجیب وغریب راستہ بنا کر پانی میں غائب ہوگئی تھی ۔فرمایا اوہو! اسی جگہ تو ہمیں پہونچنا تھا، اچھاواپس چلو، وہ دیکھتے بھالتے وہیں پہونچ گئے ، وہاں دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب چادر لپیٹے ہوئے موجود ہیں ،حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں سلام کیا، انھوں نے پوچھا اس جگہ سلام کرنے والا کون ہے؟ فرمایا کہ میں موسیٰ ہوں ، کیا بنی اسرائیل کے موسیٰ؟ فرمایا ہاں، ان صاحب کا تعارف حق تعالیٰ نے اس طرح کرایا ہے کہ وہ ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ہے، ہم نے اسے اپنے پاس سے خصوصی رحمت عطا فرمائی تھی،یعنی نبوت ، اور بہت سے لوگوں نے ولایت قرار دیا ہے، اور ہم نے اسے کچھ خاص قسم کا علم بھی عطا فرمایا تھا، حدیث میں اس خصوصی بندے کا نام خضر بتایا گیا ہے ، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشریف آوری کی وجہ پوچھی ، انھوں نے بتایا کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی صحبت میں رہ کر ان خصوصی علوم کو سیکھوں جو آپ کو حق تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئے ہیں ،حضرت خضر نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے جو علم مجھے عطا فرمایا ہے وہ آپ کے علوم سے علیٰحدہ ہے، آپ کا علم آپ کے منصب کے لحاظ سے ہے، اس لئے میں جب اپنے علم کے مطابق کچھ کروں گا تو آپ اسے برداشت نہ کرسکیں گے، اور یہ بات تو واقعی ہے کہ جس حقیقت کا علم اور اس کی اطلاع آپ کو نہ ہو، اسے کیونکر گوارا کرسکیں گے، اور آپ کے علم کی شان کچھ اور ہے، وہاں تک میری رسائی نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ، ان شاء اللہ میں برداشت کرلوں گا ، اور آپ کے کسی امر کی نافرمانی نہ کروں گا۔ ان شاء اللہ اس لئے کہا کہ عارفین کو اپنے اوپر ایک لمحے کے لئے اعتماد نہیں ہوتا، وہ خدا کی مشیت کے سامنے اپنے ارادہ واختیار کو فنا سمجھتے ہیں ،حضرت خضر نے فرمایا، اچھا

اگر ساتھ ہی رہنا ہے تو آپ مجھ سے کسی چیز کے بارے میں کچھ نہ پوچھئے گا، میں خود ہی بتادوں گا، اس شرط وقرار کے بعد دونوں دریا کے کنارے چل پڑے، ایک جگہ کشتی چل رہی تھی، یہ دونوں حضرات بھی اس پر سوار ہوگئے، کشتی والوں نے ان کی بزرگانہ شان کو محسوس کیا اور اپنی عزت وسعادت سمجھ کر بغیر کسی کرایہ کے بیٹھالیا، کشتی جب گہرائی میں پہونچی تو حضرت خضر نے تصرف کیا اور کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ کر اس میں دراڑ پیدا کردی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے دیکھ لیا، ان کو منصب نبوت کی وجہ سے جلال آیا، اور ٹوکا کہ کیا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ لوگ ڈوب جائیں، یہ تو بہت بری حرکت ہے، حضرت خضر نے جواب دیا کہ میں نے تو کہا ہی تھا کہ آپ برداشت نہ کرسکیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی، کہ مجھ سے بھول ہوگئی، اس پر مواخذہ نہ فرمایئے، اور سختی نہ کیجئے۔ روایت میں ہے کہ کشتی میں دراڑ تو ضرور پڑی مگر پانی اندر نہیں آیا۔

کشتی سے اتر کر دونوں بزرگ ایک طرف چلے، ایک جگہ چند بچے کھیل رہے تھے، ان میں ایک بچہ بڑا صاحب جمال تھا، حضرت خضر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس نے دم توڑ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پھر جلال آیا، فرمانے لگے، بلا وجہ ایک بے گناہ بچے کو مار ڈالا، کیا اس نے کسی کو قتل کیا تھا؟ یہ تو بہت ہی غلط کام آپ نے کیا۔ حضرت خضر نے مزید پختہ لہجے میں فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے پہلے ہی نہیں کہا کہ آپ کو میرے ساتھ صبر نہ ہوگا؟ موسیٰ علیہ السلام نے پھر معذرت کی، اچھا اب درگزر کیجئے، لیکن اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کچھ پوچھا تو میرا کوئی عذر نہ ہوگا، آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا۔

اس واقعہ کے بعد وہ لوگ ایک شہر میں پہونچے، انھوں نے شہر والوں سے کہا کہ ہم مہمان ہیں، ہمارے لئے کچھ انتظام کرو۔ اس شہر والوں نے ضیافت سے انکار کردیا، یہ وہاں سے نکل رہے تھے، تو ایک دیوار پر نظر پڑی جو ایک طرف جھک گئی تھی اور گرنا ہی چاہتی تھی، حضرت خضر نے اس پر ہاتھ لگایا تو سیدھی ہوگئی، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اتنا بڑا کام ہوگیا، اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔

حضرت خضر نے فرمایا، بس اب جدائی کا وقت آ گیا، اب میں وہ ساری باتیں بتائے

دیتا ہوں، جن پر آپ صبر نہیں کر سکے۔ سنئے! وہ کشتی جسے میں نے عیب دار بنایا، وہ کچھ غریب مزدوروں کی تھی، وہ اس سے دریا میں کچھ محنت مزدوری کر کے معاش حاصل کرتے تھے، ان کے پیچھے ایک ظالم بادشاہ ہے، وہ ہر اچھی کشتی کو زبردستی چھین لیتا ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ اس میں نمایاں عیب پیدا کر دوں، جس سے یہ اس کے دستبرد سے بچ جائے۔

اور ہاں لڑکے کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ماں باپ مومن ہیں، اور اس میں کفر وطغیان کا مادہ غالب ہے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بڑا ہو کر ماں باپ کو بہت پریشان کرے گا، ہم نے چاہا کہ حق تعالیٰ اس کے بدلے ایک نیک اور فرمانبردار ورحمدل اولاد عنایت فرمائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لڑکا تو مر گیا، اس کے بعد ان کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی، اس کا نکاح ایک نبی سے ہوا، اور اس کی اولاد بھی نبی ہوئی، اور بہت سے لوگوں کو ان سے ہدایت ملی۔

اور رہی دیوار! تو وہ شہر میں دو یتیم بچوں کی تھی، اور اس کے نیچے دونوں یتیم بچوں کا خزانہ تھا، اور ان کا باپ نیک صالح تھا، اس کی نیکی کی برکت تھی کہ رب تعالیٰ نے چاہا کہ یہ دونوں سمجھدار ہو کر اپنا خزانہ نکال لیں، اگر دیوار گر جاتی تو شہر کے لوگوں کی جیسی طبیعت ہے، سب لوٹ لیتے، یہ جو کچھ ہوا میرے اختیار وارادہ سے نہیں ہوا ہے، بلکہ حق تعالیٰ کے امر سے ہوا۔

☆☆☆☆☆

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی سرگزشت جو قرآن کریم میں ہے، اور جس کی قدرے تفصیل صحیح حدیث میں ہے آپ نے پڑھ لی، یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، اس کا جواب انھیں آیات میں ہمیں تلاش کرنا ہے، ممکن ہے ان سے کچھ ایسے حقائق سامنے آئیں، جن سے حضرات صوفیہ کے بعض مکاشفات ونظریات کی تائید ہو سکے۔

سوال یہ ہے کہ شریعت کے احکام ہر مکلّف پر لازم ہیں، پھر کسی بشر کے لئے خواہ وہ کسی بھی علم کا حامل ہو شریعت کی خلاف ورزی کب جائز ہے؟ کشتی دوسروں کی! لڑکا بے گناہ! پھر حضرت خضر کے لئے کیونکر جائز ہوا کہ حکم شریعت کے خلاف کشتی میں سوراخ کر دیں، یا بچے کو قتل کر دیں؟ کیا کسی آئندہ مصلحت کے لئے وقت سے پہلے کوئی ایسا کام کرنا جائز ہے جو غیر شرعی ہو؟ اور کیا کسی کو علم ہو جائے کہ فلاں آدمی آگے چل کر ڈاکو، باغی اور کافر ہو جائے گا تو اس کے لئے

درست ہے کہ موقع پاکر اسے قتل کردے؟ اگر ایسا جائز ہوتا،تو ہمارے پیغمبر علیہ السلام کو بعض لوگوں کے بارے میں متعین طریقے سے معلوم تھا کہ یہ کافر ہی مریں گے،اور وہ حربی بھی تھے،مگر انھیں نہ قتل کیا نہ کرایا،ہاں جنگ میں جب وہ برسر پیکار ہوئے تو مارے گئے۔پھر حضرت خضر علیہ السلام نے خواہ کچھ بھی حقیقت بیان کی ہو،کیا ظاہر شریعت کے خلاف کرنا،ان کے لئے جائز تھا؟

اس سوال کا اجمالی جواب یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے ان سارے تذکروں کو بطور مدح کے بغیر انکار کے ذکر کیا ہے،تو ضرور جائز ہیں۔جن کا فرمان جواز وعدم جواز کا معیار ہے،وہی اگر اس کی مدح کریں تو کون سی شریعت اسے ناجائز کہہ سکتی ہے،لیکن اس جواب پر ایک اور سوال پیدا ہوگا کہ یہ بات حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے،یا کسی اور کے حق میں بھی اس کی گنجائش نکل سکتی ہے؟۔

اس کے جواب کے لئے حضرت خضر کی شخصیت کو سمجھنا ہوگا۔اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بشر تھے،ایک ضعیف قول یہ ہے کہ وہ فرشتہ تھے،اور مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں اسی کو ترجیح دی ہے،لیکن اگر وہ فرشتہ ہوتے،تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی اعتراض وانکار کی گنجائش نہ ملتی،اس لئے صحیح یہی ہے کہ وہ بشر تھے،مگر انھیں جو رحمت خصوصی ملی تھی اور جو علم لدنی ملا تھا،جس کا قرآن میں مجمل ساذکر ہے،اور حدیث میں صراحت ہے: **یا موسیٰ انی علیٰ علم من علم الله علمنیه لاتعلمه أنت وأنت علیٰ علم من علم الله علمکه الله لا اعلمه** (بخاری شریف) اے موسیٰ! مجھے اللہ کے علوم میں سے ایک علم حاصل ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے،آپ اسے نہیں جانتے،اور آپ کو اللہ کے علوم میں سے ایک علم حاصل ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے،اسے میں نہیں جانتا۔

یہ خصوصی علم ورحمت کیا چیز ہے؟ حضرت موسیٰ صاحب شریعت تھے،انھیں اللہ کی پسند وناپسند اور احکام کا پورا علم تھا،یہ تو بالکل ظاہر ہے،حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر کو اس علم سے سرفراز نہیں فرمایا گیا تھا،لیکن حضرت خضر کو کون سا علم دیا گیا تھا،اس کی تفصیل قرآن وحدیث میں واضح طور پر نہیں بیان کی گئی ہے،ہاں مذکورہ تینوں واقعات کے ضمن میں اس کا سراغ ملتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ احوال ووقائع وجود میں آتے ہیں، ان میں ایک حصہ وہ ہے جو انسان کے دائرۂ اختیار وارادہ میں ہے، یہ بنی آدم کے اعمال اختیاریہ ہیں، خواہ ان کا تعلق انسانی ذہن ودماغ سے ہو یا اس کے اعضائے جسمانی سے ہو، انبیاء علیہم السلام کا موضوع انسان کے یہی اعمال اختیاریہ ہیں، حق تعالیٰ کے اوامر واحکام اور نواہی ومناہی کے مورد یہی ہیں۔ ان کے نتائج، ان کی تفصیلات کا علم، حق تعالیٰ کی خوشنودی وناراضگی کی معرفت، اللہ کی رحمت وغضب کا عرفان، اسماء الٰہیہ وصفات خداوندی سے بندوں کے ربط وتعلق کے حقائق، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی تفصیلات کا علم حضرات انبیاء کو دیا جاتا ہے، اور انسان جب تک دنیا میں بعقل وہوش وحواس موجود ہے، ان احکام کا مکلّف ہے۔ اوامر کی اطاعت، نواہی سے اجتناب، اس کی ذمہ داری ہے، انھیں اصطلاح میں ''علم شریعت'' یا ''تشریعیات'' کہا جاتا ہے۔ دنیا وآخرت کی فلاح کا مدار اسی پر ہے، حق تعالیٰ کے قرب ورضا کا حصول اسی پر موقوف ہے، کفر وشرک اور معصیت وبغاوت کا طوفان اسی کی خلاف ورزی سے اٹھتا ہے، جنت کا وعدہ اور جہنم کی وعید اسی علم شریعت سے وابستہ ہے۔

اور دنیا کے احوال ووقائع کا ایک اور بہت بڑا حصہ وہ ہے جو انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، مثلاً خود انسان کا پیدا ہونا، اس کا مرنا، بیمار ہونا، گورا ہونا، کالا ہونا، عقلمند ہونا، بیوقوف ہونا، اور انسان کے باہر، مثلاً بارش ہونا، طوفان آنا، موسم کا بدلتے رہنا، رات ودن کا یکے بعد دیگرے آنا، اور اسی قیاس پر دنیا کے بے شمار احوال ذہن میں حاضر کرلیجئے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے کرنے نہ کرنے اور جن کے وجود وعدم کا مخاطب انسان نہیں ہے، نہ ان امور پر حق تعالیٰ کے قرب ورضا کا مدار ہے، ایسا نہیں ہے کہ جو فلاں زمانے میں پیدا ہوگا، وہ قرب ورضا سے سرفراز ہوگا اور جو فلاں وقت میں وجود میں آئے گا وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔ حضرات انبیاء کو جو علم عطا کیا گیا ہے، یہ امور اس کے موضوع سے خارج ہیں، یہ انتظام عالم کی قبیل سے ہے، اس میں حق تعالیٰ کی مشیت کی کارفرمائی ہے، اس انتظام پر حق تعالیٰ نے ایک غیبی مخلوق فرشتوں کو مامور فرمایا ہے، ان امور سے حرمت وحلت کا کوئی تعلق نہیں، اس انتظام کو ''تکوین'' کہا جاتا ہے، اس انتظام کو عالم غیب سے کنٹرول کیا جاتا ہے، دیکھئے بارش کے لئے فرشتے مامور ہیں، ہواؤں پر

فرشتوں کو متعین کیا گیا ہے، جانداروں کی موت کے لئے فرشتوں کی جماعت کام کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ألا لـه الخلق و الامر**، اللہ ہی کے لئے خلق بھی ہے اور امر بھی ہے۔ خلق کا تعلق تکوین سے ہے اور امر کا تعلق تشریع سے ہے، نیکی و بدی اور ثواب وعقاب کا تعلق تشریع سے ہے، حیات وموت اور صحت ومرض کا تعلق تکوین سے ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے تینوں کاموں میں غور کیجئے، ان تینوں کا تعلق تکوین سے ہے تشریع سے ہوتا تو بجائے کشتی میں سوراخ کرنے کے وہ کشتی والوں کو منع کرتے کہ فلاں جگہ کشتی کو مت لے جانا، کہیں وہ ظالم بادشاہ چھین نہ لے، یا اس بادشاہ کو فہمائش کرتے کہ یہ غلط حرکت نہ کرو اس کے بجائے انھوں نے کشتی میں عیب پیدا کر دیا جو بظاہر تشریع کے اعتبار سے غلط ہے، مگر تکوین کے لحاظ سے عین مصلحت کے مطابق ہے۔

اسی طرح بچے کے قتل کا تعلق بھی تکوین سے تھا، اگر تشریع کے طور پر عمل کرنا ہوتا تو بچے کو نصیحت کرتے، اس کے والدین کو اس کے نیک بنانے کی تدبیریں بتاتے، اس کا قتل تشریع کی نظر میں غلط تھا، مگر تکوین میں یہ ناگزیر عمل تھا۔

یہی حال دیوار کا بھی تھا کہ وہ گرتی تو خزانہ کھل جاتا، تو بجائے اس کے کہ شہر والوں کو نیکی کی تلقین کرتے دیوار ہی سیدھی کردی، یہ سارے معاملات تکوین کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اوپر بتایا جا چکا ہے کہ امورِ تکوینیہ میں تصرف کرنا احکام شرع سے برکنار ہے، اس کا تعلق ثواب وعذاب اور خطا وصواب سے نہیں، وہ سب مصالح تکوین کے عین موافق ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیوں کیا؟ جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہ تشریع پر تھی، اور انھیں اس علم کا امام بنایا گیا تھا، وہ اس علم کے تقاضوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے، پس انھیں خلاف تشریع کاموں کو ایک بشر کے ارادہ وعمل سے دیکھ کر غیرت آئی۔ (مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ انھیں اور ان کے کاموں کو دیکھ رہے تھے، جو صاف صاف خلافِ شرع تھے، اس لئے ٹوکنا ان کا فرض تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ اور اس سے ملتا جلتا ہے، وہ یہ کہ ملک الموت ان کے پاس پیغام وصال لے کر بصورت بشر تشریف لائے تھے، انھوں نے اسی بشری صورت میں ان سے قبض روح کی اجازت مانگی، تو موسیٰ علیہ السلام نے انھیں تھپڑ رسید

کر دیا تھا، کیونکہ انھیں اس تکوینی حقیقت پر مطلع نہیں کیا گیا تھا) اور یہی وہ بات تھی جو حضرت خضر نے پہلے ہی بتا دی تھی۔

اخیر میں حضرت خضر علیہ السلام نے یہ جو فرمایا کہ **وما فعلته عن امری**، یہ سب میں نے اپنے امر سے نہیں کیا ہے، بلکہ یہ سب امر ربی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر تکوینیات پر مامور تھے، اور اس باب میں وہ فرشتوں کے مثل تھے، جیسے فرشتے پروردگار کے حکم سے کسی کو زندگی دیتے ہیں، کسی کو موت دیتے ہیں، وہ فرشتے ہی تھے جنھوں نے قوم لوط کی بستیاں الٹ دی تھیں، وہ فرشتے ہی تھے جنھوں نے قوم ثمود پر چنگھاڑ ماری تھی، وہ فرشتے ہی ہیں جو روزانہ بے شمار آدمیوں کی روح نکال کر مردہ بنا دیتے ہیں، وہ فرشتہ ہی تھا جس نے حضرت مریم عذرا کے گریبان میں پھونک ماری تھی، اور انھیں جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔

حق تعالیٰ نے بشر کی تخلیق مختلف استعدادوں پر کی ہے، بعض میں جسمانیت اور اس کے تقاضے غالب ہوتے ہیں اور ان کی روحانیت ضعیف اور کالعدم ہوتی ہے، ایسے لوگوں کو ملکوت سے اور عالم غیب سے کوئی مناسبت نہیں، کیونکہ جسم عناصر سے مرکب ہے، اور بعض میں روحانیت اور اس کے آثار وثمرات طاقتور اور غالب ہوتے ہیں، ان کا جسم بھی بحکم روح ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا جسم جسمانی تقاضوں سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا عام آدمی کا جسم متاثر ہوتا، انبیاء اور اولیاء وصالحین کے بے شمار احوال وواقعات اس پر شاہد ہیں، ان لوگوں کو ملکوت سے بہت مناسبت ہوتی ہے، حق تعالیٰ انھیں میں سے کچھ لوگوں کو منتخب کر کے تکوینیات پر مامور فرما دیتے ہیں، یہ چونکہ بشر ہوتے ہیں اور بشری ضروریات کو سمجھتے اور ان سے مناسبت رکھتے ہیں، اس لئے یہ غیبی طور پر انسانوں کے خوب کام آتے ہیں۔ حضرت خضر کا ذکر اور ان کے احوال واوصاف کا ذکر ایک نمونہ ہے، جس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ تکوینی مصلحتوں کے لئے انسانوں کو بھی عامل وکارندہ بناتے ہیں، لیکن اس قسم کے حضرات اپنے اوصاف وافعال کے ساتھ عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے جیسے فرشتے مخفی ہوتے ہیں، چونکہ یہ ان سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، اور انھیں کے مثل تکوینی امور پر مقرر ہوتے ہیں، اس لئے عام حالات میں ان کو اور ان کے کاموں کو

بھی پوشیدہ رکھا جاتا ہے ، ہاں جو لوگ اصحاب کشف ہوتے ہیں وہ کبھی کبھی باذن اللہ مطلع ہوجاتے ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر ہیں،ان سے زیادہ صاحب کشف کون ہوسکتا ہے،مگر وہ خضر کونہیں جانتے تھے،ان کی جگہ بتادی گئی، وہاں پہونچے اور گزر بھی گئے،مگرنہیں پا سکے، کیونکہ ابھی اذن الٰہی نہ تھا۔واپس لوٹ کے آئے تو دیکھا بھی اور ملے بھی!اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ جولوگ تکوینیات پر مامور ہوتے ہیں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں،حق تعالیٰ ہی کسی پر ظاہر فرمادیں تو وہ دیکھ سکتا ہے۔یہیں سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت خضر علیہ السلام سے جو تینوں کام صادر ہوئے تھے وہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مکشوف ہوئے تھے، باقی اورلوگوں پر نہ وہ منکشف تھے اور نہ ان کا کام تھا!عام لوگوں نے تو بس یہ دیکھا کہ کشتی میں سوراخ ہوگیا،اور بچہ زمین پر گرا اور اچانک مرگیا،دیوار جھکی تھی مگر خود بخود سیدھی ہوگئی،اللہ کے دکھانے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا،اور باقی لوگوں نےنہیں دیکھا،غالبًا یہی وجہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا ساتھ ملنے کے بعد ان کے شاگرد کا بھی ذکر کہیں نہیں ہوا، کیونکہ وہ حضرت خضر سے بیگانہ تھے،وہ انھیں یا ان کے کام کونہیں دیکھ رہے تھے۔

چنانچہ امام ابوحاتم رازی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابوالعالیہ اور حضرت شعیب بن حجاب کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: **کان الخضر عبداً لاتراہ الاعین إلامن اراداللہ أن یریہ ، فلم یرہ القوم إلا موسیٰ ولوراٰہ القوم لحالوا بینہ وبین خرق السفینۃ وبین قتل الغلام** (ج:٦،ص:١٥٨) حضرت خضر ایسے بندے تھے جنھیں عام نگاہیں نہیں دیکھ سکتی تھیں،ہاں کسی کو اللہ تعالیٰ ہی دکھانا چاہیں تو ہوسکتا ہے،اس لئے بجز حضرت موسیٰ کے انھیں کسی نے نہیں دیکھا،اگر لوگ دیکھ لیتے،تو نہ انھیں کشتی میں سوراخ کرنے دیتے،اور نہ لڑکے کو قتل کرنے دیتے۔

ہماری اس تشریح سے یہ بات بھی معلوم ہورہی ہے کہ ان کا نبی ہونا کچھ ضروری نہیں ہے،ممکن ہے کہ نبی نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء انھیں نبی نہیں قرار دیتے،اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اب تک حیات ہوں،کیونکہ زمرۂ ملکوت میں شامل ہیں۔ دیکھئے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک بڑی ملکوتی شان کے پیغمبر ہیں کہ وہ صرف ماں کی طرف سے انسانوں میں شامل ہیں تو وہ آج تک زندہ ہیں، اوراگر ان خضر کا جن کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی

انتقال ہو چکا ہو، تو یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے حضرات تکوین کے اس منصب پر فائز ہوں، اوراس منصب کی وجہ سے وہ بھی خضر کہلاتے ہوں۔ اس طرح کے لوگ اربابِ کشف کی اصطلاح میں صاحب خدمت کہلاتے ہیں، ان کے مختلف درجات ہوتے ہیں، اصحاب کشف نے ان درجات کے نام بھی بتائے ہیں۔

مشائخ صوفیہ جوارباب کشف ہیں، ان کے یہاں ''صاحب خدمت'' ایک بدیہی حقیقت ہے، لیکن چونکہ عام مشاہدہ سے اس کا تعلق نہیں، اور تشریعیات میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے نصوص شرعیہ ان کے تذکرے سے خاموش ہیں، بس ایک جگہ کچھ اشارۃً کچھ صراحۃً بتادیا گیا ہے، اس لئے یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہو، بس جتنا قرآن میں ذکر ہے اس پر ایمان لانا ضروری ہے، باقی اس کی جو توجیہات وتاویلات ذکر کی گئی ہیں، ان پر اعتقاد واجب نہیں ہے، اور نہ انکار سے کوئی کفر وفسق لازم آئے گا، پس اس کو اسی حد پر رکھنا چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆

امیر المومنین وسید المجاہدین حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا ارادۂ حج

امیر المومنین وسید المجاہدین حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے سفر حج کا تذکرہ عجیب و غریب روشن حالات سے معمور ہے، یہ تذکرہ ہم حضرت سید صاحب کے حالات و واقعات پر مشتمل کتاب ''وقائع سید احمد شہید'' سے اخذ کر کے مرتب کر رہے ہیں، یہ کتاب اسی جماعت کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ہے جس کو سید صاحب کے مسترشد خاص نواب وزیر الدولہ مرحوم (والی ریاست ٹونک) نے سید صاحب کی وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے لئے مقرر کیا تھا، اس میں سید صاحب کے بعض اعزہ آپ کے رفقاء سفر و جہاد اور آپ کے خدام تھے، ہر ایک اپنی معلومات اور چشم دید واقعات بیان کرتا اور کاتب اسے لکھ لیتا، یہ مجموعہ حضرت سید صاحب اور ان کی دعوت وتحریک سے متعلق مراجع میں سب سے وسیع ذخیرہ ہے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

ایک دن حضرت سید صاحب اپنے وطن تکیہ رائے بریلی کی مسجد کی چھت پر اکیلے بعد نماز اشراق تشریف فرما تھے، زینہ پر عبدالرحیم صاحب کاندھلہ والے تھے، آپ نے پکارا، یہاں کوئی ہے؟ عبدالرحیم صاحب حاضر خدمت ہوئے، فرمایا نیچے جو لوگ موجود ہوں انہیں بلا لاؤ، انہوں نے نیچے کی طرف دیکھا، حضرت کے خادم ' دین محمد' صاحب نظر آئے، ان سے کہا کہ حضرت بلا رہے ہیں، تم آؤ، اور جو لوگ وہاں ہوں انہیں بھی بلا لاؤ۔

دین محمد صاحب کہتے ہیں کہ میں پہلے حاضر ہوا، حضرت کو دیکھا کہ چھت کی منڈیر پر

ہاتھ ٹیکے ہوئے سئی ندی کی طرف دیکھ رہے ہیں، مجھے دیکھ کر فرمایا:

''دین محمد تمہارا خواب مبارک ہو''

میں نے عرض کیا، کون سا خواب؟ فرمایا جو بیت اللہ شریف جانے کا تم نے کئی ماہ پہلے دیکھا تھا[۱] مجھے جناب الٰہی سے الہام ہوا ہے کہ تم پہلے حج کرنے جاؤ، وہاں سے آ کر جہاد کرنا۔

اس وقت تک حضرت سید صاحب کے پاس متعدد اصحاب آ چکے تھے، حضرت نے سب سے کہا، اور اس وقت خوشی آپ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو رہی تھی، آپ نے فرمایا:

''بھائیو! اب اپنے اپنے سامان کی تیاری کرو''

حاجی عبدالرحیم صاحب نے عرض کیا کہ ''آپ تو سفر ہجرت و جہاد کی تیاری میں تھے؟ بیچ میں یہ معاملہ کیا آ گیا؟''

آپ نے فرمایا ''منظور الٰہی یوں ہی ہے، اس میں بڑی حکمت اور اسرار الٰہی کے معاملات ہیں، کسی وقت ہم آپ سے اسے بیان کریں گے''۔

اس گفتگو کے بعد آپ گھر تشریف لائے، اور رفقا و حاضرین حج کی بشارت سن کر بہت مسرور ہوئے، اور ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا، سب خوش ہو رہے تھے کہ بیت اللہ شریف کی حاضری اور حج و عمرہ کی سعادت حاصل ہونے والی ہے۔

خطوط:

چند روز کے بعد حضرت سید صاحب نے ارادہ کیا کہ دہلی، سہارن پور، پھلت، رام پور بانس بریلی وغیرہ کے اہل تعلق اور متوسلین کو اس ارادہ سے آگاہ کریں، اس وقت حضرت کے پاس آپ کی مرضی کے مطابق کوئی کاتب نہ تھا، آپ نے اپنے بھانجے سید احمد علی صاحب کے نوعمر فرزند سید زین العابدین سے فرمائش کی کہ ''تم خطوط لکھو'' انہوں نے معذرت کی کہ مجھے خوب لکھنا نہیں آتا، آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کی، اور دعا کی، اور ساتھ ہی بشارت بھی سنائی کہ دعا قبول ہو گئی ہے، تمہیں خوب لکھنا آ جائے گا۔ چنانچہ دو تین روز کی مشق میں انہوں نے لکھنے کی مہارت حاصل کر لی۔ حضرت نے جو خطوط لکھوائے تھے، ان کا مضمون یہ تھا:

''ہم واسطے ادائے حج بیت اللہ شریف جاتے ہیں، جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو ان کو

اپنے ہمراہ لائیے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے، نہ خزانہ، محض اللہ پر توکل کر کے جاتے ہیں، اور ہم کو اس ذات پاک سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے ہماری مراد پوری کرے گا، اور جہاں کہیں راستے میں حاجات ضروری کے لئے خرچ نہ ہوگا وہاں ٹھہر کر ہم لوگ محنت ومزدوری کریں گے، جب بخوبی خرچ جمع ہوجائے گا تب وہاں سے آگے روانہ ہوں گے، اور جو عورتیں اور مرد ضعیف مزدوری کے قابل نہ ہوں گے، وہ اپنے ڈیروں کی نگہبانی پر رہیں گے، اور خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں پر رہنے والے سب برابر کے شریک ہوں گے''۔

اس مضمون کے خطوط آپ نے قصبہ بڑھانہ میں مولانا عبدالحی صاحب کو، دہلی میں مولانا محمد اسماعیل صاحب کو، پھلت میں مولوی وحیدالدین صاحب اور ان کے بھائی حافظ قطب الدین صاحب اور ان کے والد حافظ معین الدین صاحب کو، اور ان کے علاوہ سہارن پور میں مولوی وجیہہ الدین صاحب، حافظ عبدالرب صاحب اور حکیم مغیث الدین صاحب اور ان کے بھانجے شہاب الدین وغیرہ کو لکھے۔

کچھ دنوں کے بعد ان مکاتیب کے جواب آنے لگے، سب کا مضمون ایک ہی طرح تھا کہ:

''آپ کا بشارت نامہ آیا، ان شاء اللہ عنقریب آپ کی خدمت سراپا برکت میں ہم لوگ حاضر ہوتے ہیں، اور جناب کے ارشاد کے مطابق جو لوگ بیت اللہ شریف کا عزم سفر رکھتے ہوں گے، ان کو اپنے ہمراہ لائیں گے''۔

سفر حج کی تیاریاں ہونے لگیں، اسی دوران کانپور اور اس کے اطراف کے لوگوں کی دعوت پر ایک تبلیغی اور اصلاحی دورہ فرمایا، وہاں سے واپسی پر مولانا عبدالحی صاحب اور ان کے قافلے سے راستے میں ملاقات ہوئی، وہ لوگ قصبہ پھلت، بڑھانہ اور اسی کے اطراف سے آئے

جس زمانے میں سید صاحب نے بیت اللہ شریف کا عزم سفر کیا تھا، حالات کے لحاظ سے یہ حیرت کا معاملہ تھا، سفر کی وہ سہولتیں جو آج میسر ہیں اس دور میں ان کا نام ونشان نہ تھا، پانی کا جہاز، انجن سے محروم، صرف بادبان کے سہارے چلتا، ہوا موافق ہوتی اور سمندر میں طغیانی نہ ہوتی تو خیر، ورنہ ہوا کی مخالفت کی تاب نہ لاکر جہاز مدتوں سمندر میں چکر کاٹتے رہتے، کبھی طغیانی

ہوتی تو غرق بھی ہوجاتے ، پھراس سفر میں وقت بھی بہت لگتا ، دشواریاں ، دقتیں ، کھانے پینے کے مسائل اور پھر مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ! ایک پاسپورٹ اور ویزا کا دردسر تو نہ تھا مگر پھر دردسر ہی دردسر تھا۔ انہیں دشواریوں کی وجہ سے سہولت پسندوں نے فتوی صادر فردیا تھا کہ ہندوستانیوں پر حج فرض نہیں ، کیوں کہ راستہ ہلاکت سے محفوظ ومامون نہیں ۔

ان حالات میں سید صاحب نے اکیلے نہیں ، جوساتھ جانا چاہے سب کوساتھ لے کر حج بیت اللہ کے لئے جانے کا اعلان کردیا۔قریبی لوگوں نے بھی اسے ایک مذاق سمجھا ، وہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ آج کسی جوش میں حج بیت اللہ کا ارادہ کرلیا ہےمگر کل جب حقائق کی سنگینیاں سدراہ نظر آئیں گی تو خود ہی ارادہ بدل جائے گا۔

مگر جب یہ دیکھا کہ مولانا عبدالحی صاحب جیسے بڑے عالم ربانی اس آواز پر لبیک کہہ کر پورے قافلہ کے ساتھ وارد ہوگئے تو وہی جوکل تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے تھے ، سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ سید صاحب جو کہتے ہیں کرگزریں گے۔

ایک روز حضرت نے مولانا سے دریافت کیا کہ ’’ آپ تو آگئے ، دوسرے لوگوں کے آنے کا بھی کچھ حال معلوم ہے؟‘‘ مولانا نے عرض کی کہ ’’ آنے والے تو بہت تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ آپ کے ساتھ ہم بھی چلیں گے ، میں نے دل میں سوچا کہ جب تک میں کوچ نہ کروں گا یہ لوگ تردد میں رہیں گے ، اور جلد نکل نہ پاویں گے ، اس لئے میں اتنے لوگوں کو لے کر چل پڑا یقین ہے کہ اب وہ لوگ بھی چلے ہوں گے ، یا اب چلیں گے ، مگر آئیں گے ضرور‘‘!

آپ نے فرمایا کہ مولانا! ’’ آپ خطوط لکھ کر جابجا اطلاع بھیج دیں کہ جن لوگوں کو ہمارے ساتھ چلنا منظور ہو وہ جلد آجاویں ، اگر دیر کریں گے تو ہمارا قافلہ یہاں سے کوچ کردے گا پھر راستے میں جہاں مل سکیں گے وہاں آنا ہوگا ، مگر شرطیں وہی ہیں جن کا ذکر پہلے خط میں ہوا ہے ، جن لوگوں کو یہ شرطیں منظور ہوں وہ ہزار بھی ہوں تو ہم انہیں اپنے ہمراہ لے چلیں گے ، اور جن کو ہماری یہ شرطیں منظور نہ ہوں وہ ہرگز نہ آئیں‘‘۔

مولانا نے حکم کی تعمیل میں متعدد خطوط لکھے اور انہیں اپنے وطن کے اطراف ونواح میں بھیجا۔ ادھر تو یہ ہوا ، دوسری طرف حضرت سید صاحب نے اپنے خاندان والوں کو ترغیب دینی

شروع کی کہ آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ حج کی تیاری شروع کردیں، ان کو تو ابتدا ہی سے حضرت سید صاحب کے ارادے پر اشکال تھا، وہ اسے ایک انہونی بات سمجھ رہے تھے، اب جب حضرت نے براہ راست ان کو دعوت دی تو دل کی بات زبانوں پر آنے لگی کہ ''جو لوگ ہندوستان میں مالدار اور صاحب مقدور ہیں، ان پر حج فرض ہو تو ہو، بعض علما نے ایسے مالداروں پر بھی حج کی فرضیت سے اختلاف کیا ہے، کیوں کہ حج کی فرضیت کے لئے جیسے زادوراحلہ کی قدرت شرط ہے اسی طرح امن راہ بھی شرط ہے، اور امن کا حال یہ ہے کہ بغیر جہاز کے وہاں جانا محال ہے، اور سمندر میں جان و مال دونوں کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، اس لئے اہل ہند پر حج کی ادائیگی فرض نہیں ہے اگر چہ کتنا ہی مالدار ہو، اور آپ کے پاس تو ایک روز کا بھی خرچ نہیں، اس بے سروسامانی کے باوجود آپ خطوط بھیج بھیج کر لوگوں کو سفر حج کی دعوت دے رہے ہیں، اور ہم سے بھی فرماتے ہیں، تو شاید اپنے ساتھ ان کو بھی حیران و پریشان کریں گے، ہم لوگ آپ کے ساتھ نہ جائیں گے، اگر آپ جاتے ہیں تو جائیں، مگر ہمارے بھائی بہنوں کو اپنے ساتھ لے جا کر تباہ نہ کریں''۔

حضرت سید صاحب ان سے فرماتے ہیں:

''ان شاء اللہ ہم اور تم ساتھ ہوں گے، راستے میں چل کر دیکھنا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنی قدرت اور عنایت سے کھانا پینا پہونچاتا ہے، اور اپنی طرح طرح کی نعمتوں سے پرورش کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے یہ یقین کامل ہے کہ ہم سب اپنے عاجز محتاج بندوں کو یہاں سے حرمین شریفین تک بآرام تمام پہونچادے گا اور پھر وہاں سے ساتھ خیر وعافیت کے یہاں لاوے گا''۔

اسی طرح آپ سمجھاتے رہے مگر وہ اپنے انکار واشکال پر جمے رہے، البتہ آپ کے قرابت داروں میں سے کچھ لوگ آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار تھے، اسی دوران مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید کا خط سید صاحب کے نام آیا، اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:

''یہاں ہمارے ہمراہ حکیم مغیث الدین صاحب، مولوی وجیہہ الدین صاحب وغیرہ سہارن پور کے اور مولوی وحیدالدین صاحب وغیرہ قصبہ پھلت کے اور ان میں اکثر صاحب مع اہل وعیال، عورت مرد ملاکر قریب ڈھائی سو آدمیوں کے ہیں، اور ہم سب گڈھ مکتیشر کے گھاٹ

سے کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہو چکے ہیں''۔

اس خط کے ملنے کے بعد اسی دن صبح کو حضرت سامان سفر ڈلمئو کو روانہ کرنے لگے، گویا تیاری مکمل ہو چکی تھی۔

خاندان والوں کو آخری تلقین:

جب روانگی کا قصد پختہ ہو گیا اور اسباب بھیجے جانے لگے تو ایک مرتبہ پھر آپ نے اہل خاندان کو جمع کیا اور ان سے ارشاد فرمایا:

''ہم تم سب صاحبوں کو اتنے روز سے سمجھا رہے ہے کہ ہمارے ساتھ اس سفر باظفر میں تم بھی شریک ہو، مگر کسی صاحب کے خیال شریف میں نہیں آیا، اور اب یہ اخیر سمجھانا ہے کہ تم سب محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر توکل و اعتماد کر کے اپنا اپنا اسباب سفر لاؤ کہ ڈلمئو بھیج دئے جائیں اور اس امر میں اپنی رائے ناقص کو دخل نہ دو اور ہمارے ساتھ ہو جاؤ''۔

انہوں نے جواب دیا کہ ''ہمارا اسباب تو نہیں آ سکتا اور نہ ہم آپ کے ساتھ جا سکتے، اور نہ آپ کو منع کر سکتے، خیر ہم نے آپ کو اللہ کے سپرد کیا، آپ تشریف لے جائیں''۔ حضرت نے اس جواب کے بعد ایک مبسوط تقریر فرمائی، وہ من وعن درج کی جاتی ہے۔

سید صاحب کی ایمان افروز تقریر:

''جب سے میں سفر دہلی سے آیا ہوں، کچھ کم ڈیڑھ برس کا عرصہ گزرا ہے، تب سے میں تم سب صاحبوں کی خیر خواہی دنیا و آخرت کی بوجھ کر اکثر اوقات بطور نصیحت کے کہتا رہا، اور تم صاحبوں کے خیال شریف میں نہ آیا، اور ان روزوں واسطے سفر حج کے طرح طرح سے سمجھا کر کہتا رہا، اور اس کو بھی تم نے افسانہ سمجھ کر باتوں میں اڑا دیا، اور انکار کیا، مجھ پر جو حق قرابت، برادری اور اسلام کا تھا وہ میں نے حتی الامکان ادا کیا، اور اسی طور پر تمہارے جو بھائی بریلی، جہان آباد، نصیر آباد اور جائس وغیرہ کے ہیں، بہ نسبت دور والوں کے ان کا حق مجھ پر زیادہ ہے، جہاں تک ہو سکا ان کو بھی میں نے وعظ و نصیحت سے سمجھایا، اس میں جنہوں نے مانا، مانا، اور نہ مانا، نہ مانا، مگر میں نے ان کا حق مجھ پر تھا، ادا کیا۔

اور سبب تم صاحبوں کے نہ ماننے کا سبب تمہاری ہی گفتگو سے دریافت ہوا کہ تمہارے

ذہنوں میں یہ ہے کہ یہ ایک مفلس بے سروسامان محتاج نان ہے، چند لوگ مفلس محتاج اپنے پاس جمع کرر کھے ہیں، ہم اس کے ہمراہ کیوں جاویں؟ اور مفت کا رنج اٹھاویں، سو بات حقیقت میں یوں ہے کہ جو لوگ غربا، ضعفا اور مسکین محتاج میرے ہمراہ ہیں، اور انہوں نے ساتھ اخلاص کے فی سبیل اللہ کمر ہمت کی میرے ہمراہ باندھی ہے، ان کے واسطے اس رزاق مطلق اور قادر برحق نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس سفر باظفر میں تیرے ہمراہ ایک سے ہزاروں تک جتنے ہوں گے، تجھ سے کچھ سروکار نہیں، وہ سب میرے مہمان ہیں، اور ان میں سے جن کی اسی سفر میں موت ہے وہ مریں گے، اور باقی سب کو بامراد ان کے گھر پہونچادوں گا۔

سو جب تک میں اس بریلی کے علاقے میں ہوں تب ہی تک ان سب پر تنگی وافلاس ہے، ان شاء اللہ جس وقت میں ان کو ساتھ لے کر اس علاقے سے باہر ہوا تب ان کا حال دیکھنے والے دیکھیں گے کہ پروردگار عالم بے سان وگمان اپنے بندوں کے ہاتھوں (روزی) کیوں کر پہونچاتا ہے، اور خدمت کراتا ہے۔

اور جو میں نے لوگوں کو خطوط میں لکھ لکھ کر بھیجا کہ ''ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے نہ خزانہ، صرف اللہ تعالی کی ذات پاک پر توکل واعتماد کر کے واسطے ادائے حج کے کمر باندھی ہے اور جہاں کہیں خرچ راہ ضروری نہ ہوگا، وہاں ٹھہر کر محنت ومزدوری کریں گے، پھر جب خرچ جمع ہوگا تب وہاں سے آگے چلیں گے''اس میں بڑی بڑی مصلحتیں ہیں، یہ خلاف، توکل کے نہیں ہے، اور یہ بھی اللہ کی طرف سے مجھے معلوم ہے، جب ہم لوگ یہاں سے بیت اللہ شریف کو جاویں گے، تب پیچھے سے مخالف لوگ موافق لوگوں کے رنجیدہ کرنے کی طرح طرح کی خبریں اڑادیں گے، کوئی کہے گا جہاز تباہ ہوگیا، اس میں ڈوب گئے، کوئی کہے گا، ہوائے مخالف خدا جانے ان کے جہاز کو کہاں لے گئی؟ کوئی کہے گا، ان کو فرنگی پکڑ لے گئے، کوئی کہے گا، عرب میں ترکوں نے مار ڈالا۔ سو ان باتوں پر تم یقین نہ کرنا، ان شاء اللہ یہ کچھ نہ ہوگا، جس طرح اللہ تعالی ہم لوگوں کو ساتھ خیر کے لے جاوے گا، اسی طرح بعافیت تمام پھیر لاوے گا، بلکہ اللہ تعالی ہمارے ان غریب لوگوں کو ایسا خوشحال صاحب مال کر کے لاوے گا کہ لوگ دیکھ تعجب کریں گے کہ یہ وہی محتاج لوگ ہیں؟ یا کوئی اور ہیں؟ اور از روئے حسرت کہیں گے کہ ہزار افسوس! کیا شامت دامن گیر تھی جو ہم

نہ گئے''۔

اس تمام گفتگو کے بعد سید صاحب نے انہیں سلام کیا اور وہاں سے چلے آئے۔

سید محمد جامع کی بیعت:

جس دن حضرت کو اپنے مستقر تکیہ رائے بریلی سے روانہ ہونا تھا، اس سے ایک روز پہلے عصر کی نماز کے بعد حضرت مسجد میں تشریف فرما تھے کہ خاندان کے ایک بزرگ سید محمد جامع صاحب نے ایک آدمی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ آپ ایک لحظہ کے لئے فرش مسجد کے شرقی شمالی گوشے پر تشریف لائیں، میں وہیں حاضر ہوتا ہوں، مجھے کچھ کہنا ہے۔ سید صاحب وہاں تشریف لے گئے، دوسری طرف سے سید محمد جامع بھی آ گئے، وہ بڑے جسیم قدآور اور فربہ بدن کے تھے، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مسجد کے چبوترے پر اپنے پاس بیٹھایا، اور پوچھا کیا ارشاد ہے؟۔

انہوں نے کہا، اس وقت اللہ تعالی کی مجھ پر عنایت ہوئی، میں آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے آیا ہوں، سچ بات تو یوں ہے کہ جب سے آپ دہلی سے تشریف لے آئے ہیں، آپ کی ذات برکات سے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو فضل الٰہی سے ہدایت اس ملک میں ہوئی، ہم اپنے نفس وشیطان کی شامت اور شرارت سے محروم اور بے نصیب رہے کہ آپ کے فیض سے بہرمند ہوتے، سو آگے جو قصور ہم سے ہوا، سو ہوا، اس سے ہماری توبہ ہے، اور اب ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، ہمارا کہا سنا آپ معاف کریں۔

یہ بات سن کر آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

> ''الحمدللہ کہ اللہ تعالی نے شیطان ملعون کو پشیمان کیا، اور آپ کو توفیق خیر عطا فرمائی''۔

اس وقت آپ کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا، اس بات سے خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، پھر آپ نے ان سے بیعت لی، اور ان کے لئے ایسی مؤثر دعا فرمائی کہ تمام مجمع کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، کم لوگ ہوں گے جو روئے نہ ہوں۔

پھر اسی روز سید محمد جامع کے منجھلے بھائی سید غلام جیلانی نے اپنا قصور معاف کرایا، اور حلقۂ ارشاد میں شامل ہوئے، اور ان کے لئے بھی دعا کی۔

گھر سے روانگی:

شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ تھی، کوچ کی تیاری مکمل ہوچکی ہے، حضرت سید صاحب دولت خانہ میں تشریف لے گئے، اندر والوں سے رخصت ہوکر آپ باہر تشریف لائے، یہاں لوگوں کا انبوہ گراں تھا، ساتھ چلنے والے بھی اور رخصت کرنے والی بھی، باہر نکلے تو اپنے دست مبارک سے مستحقین اور خدام کو حسب لیاقت رقوم تقسیم کئے، اس سے فارغ ہوکر لوگوں کو ساتھ لے کر سئی ندی کو پار کیا، اور وہیں کنارے آموں کا ایک باغ تھا، اس میں ٹھہرے، وہاں سید محمد جامع صاحب کے چھوٹے بھائی اور حضرت سید صاحب کے بہنوئی نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی، ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات بیعت سے مشرف ہوئے۔

کچھ دیر اس باغ میں ٹھہر کر آگے روانہ ہوئے، ایک میل کے فاصلے پر اور ایک باغ آموں کا تھا، وہاں جا کر آپ ذرا اطمینان سے ٹھہرے کہ بعد میں آنے والے بھی آجائیں، اس باغ میں بھی بہت سے افراد نے بیعت کی۔

توکل کی کیفیت:

حضرت سید صاحب کے مالیات کے منتظم قصبہ پھلت کے مولانا محمد یوسف صاحب جو خود ولی کامل تھے، گھر سے نکلتے وقت حضرت نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے؟ انہوں نے کچھ اوپر سو روپئے بتائے، آپ نے ان سے لے کر لوگوں میں تقسیم کر دیئے تھے (مخزن احمدی ص ۶۲) جب آپ اس دوسرے باغ میں پہونچے تو پھر ان سے پوچھا کہ کچھ خرچ آپ کے پاس ہے؟ انہوں عرض کی کہ سات روپئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ:

''اتنے روپیوں سے تو ایک دن کا بھی خرچ پورا نہ ہوگا، اللہ پر توکل کر کے یہ بھی سات روپئے محتاج لوگوں کے حوالے کر دیجئے، ہمارے لئے اللہ تعالی کا خزانہ معمور ہے، اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ آپ ہم عاجز محتاج بندوں کی پرورش کرے گا''۔

مولانا موصوف نے وہ ساتوں روپئے ایک شخص کے حوالے کر دیئے، اور فرمایا کہ انہیں بھنا کر تم سب آپس میں برابر تقسیم کرلو۔

اس کے بعد حضرت نے برہنہ ہوکر دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور کہا:

’’اے کریم کارساز! تو اپنی اتنی مخلوق اپنے اس ذلیل بندے کے سپرد کر رکھا ہے، آپ ہی چارہ سازی فرمایئے، اور بخیر وخوبی اپنی مہربانی سے اس پورے قافلے کو منزل مقصود پر پہونچایئے‘‘۔(مخزن احمدی ص ۶۲)

حضرت سید صاحب کے دعا کرنے کا یہ خاص انداز تھا، سر پر سے عمامہ اتار دیتے، اور انتہائی تذلل اور خشوع وخضوع کے ساتھ دربار الٰہی میں ہاتھ اٹھاتے، سید صاحب نہایت مستجاب الدعوات بزرگ تھے، اس سفرنامے میں قدم قدم پر آپ حضرت کی دعاؤں کا ظہور دیکھیں گے۔

رحمت الٰہی کا ظہور:

حضرت سید صاحب اس باغ میں تشریف فرما تھے، خلقت کا ایک ہجوم تھا، وہ بھی تھے جو قافلے میں شریک تھے، اسی باغ میں ان کو شمار کیا گیا، تو وہ چار سو پانچ یا سات تھے، ایک کثیر تعداد رخصت کرنے والوں اور اس مقدس اور نرالے قافلہ کو دیکھنے والوں کی تھی، کئی لوگ قصبہ ڈلمئو کے بھی آگئے تھے، کیوں کہ سید صاحب نے اس قافلہ کے لئے دریا کا سفر تجویز کیا تھا، ڈلمئو دریائے گنگا کے کنارے ہے، وہاں سے دریائی سفر کشتیوں سے شروع ہونے والا تھا، تو اس سفر میں پہلی منزل آپ کی یہی قصبہ ڈلمئو ہونے والا تھا، اس لئے وہاں کے متعدد لوگ اس ارادے سے یہاں آگئے تھے کہ حضرت کی روانگی ہو تو وہ آگے بڑھ کر قافلے کی مہمان نوازی اور دعوت کا انتظام کریں، انہوں نے حضرت کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ ہم نے اپنے یہاں کا قلعہ خالی کر رکھا ہے، اور پانی گھڑے اور فرش اور دوسرے ضرورت کے سامان اس میں جمع کر دیئے ہیں، آپ کے ہمراہ جو عورتیں ہوں گی وہ بھی وہیں اتریں، آپ نے فرمایا:

’’یہ کام تم نے خوب کیا، مگر کھانا ہم لوگوں کے واسطے تب پکانا کہ جب ہم یہاں سے چل کر وہاں داخل ہوں، اور تم کو اجازت دیں، اور جو اسباب ہم لوگوں کا یہاں سے جاوے اس کو حفاظت سے وہیں رکھو‘‘۔

یہ فرما کر انہیں رخصت کر دیا، اور باقی لوگوں کو بھی وہیں سے رخصت کرنے لگے، اور اپنے بھانجے سید عبدالرحمان صاحب اور اپنے خصوصی خادم اور حاضر باش میاں دین محمد کو تکیہ مکان پر بھیج دیا کہ وہاں کا انتظام مکمل کر کے حج میں جانے والی مستورات کو لے کر ڈلمئو پہونچیں، ان

لوگوں کوادھر بھیجا اور خود قافلہ لے کر ڈلمئو کی طرف روانہ ہوئے۔

شوق دعوت:

ڈلمئو سے چار میل پہلے آپ نے آموں کے ایک باغ میں تھوڑی دیر کے لئے پڑاؤ ڈالا وہیں ڈلمئو سے دو بھائی آپس میں کش مکش کرتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے، دونوں بھائی اپنے اپنے گھر دعوت کرنا چاہتے تھے، ہر ایک کی آرزو تھی کہ حضرت پہلے اس کی دعوت قبول فرمائیں، آپ نے دونوں کو سمجھا کر راضی کیا، اور چھوٹے بھائی سے کہا کہ یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں، ان کا حق تم پر ہے، جو یہ کہتے ہیں وہی سہی، پہلے یہ دعوت کریں، پھر دوسرے دن تم کرنا، خدا چاہے گا تو ہم دونوں کی ضیافت کھائیں گے۔

چنانچہ جب حضرت ڈلمئو پہونچے تو پہلے بڑے بھائی کے یہاں، پھر چھوٹے بھائی کے یہاں پورے قافلے کی ضیافت ہوئی، پھر تو دعوتوں کا سلسلہ چل پڑا۔

اسی اثنا میں حضرت کے گھر کی مستورات کا قافلہ بھی آ گیا، حضرت نے اپنے خادم میاں دین محمد صاحب سے دریافت کیا کہ وہاں سے فراغت کرآئے ہوں، انہوں نے عرض کیا، ہاں سب کچھ تو ہوگیا ہے مگر بار برداروں کے بائیس روپئے دینے ابھی باقی ہیں، فرمایا الحمدللہ وہ بھی دیدیئے جائیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرت نے انہیں پچیس روپئے عطا فرمائے، اور فرمایا کہ تین روپئے جوزائد ہیں، انہیں بھی بار برداروں کو بطور انعام کے عطا کردو، اب تو ہم بیت اللہ کو جاتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ لاوے گا تب آئیں گے، چنانچہ وہ سارا روپیہ انہیں بخش دیا گیا۔

مواعظ:

چار پانچ روز ڈلمئو میں قیام رہا، بیعت کرنے والوں کا سلسلہ رہا، لوگ اپنے گھروں میں حضرت کو لے جاتے اور گھر کے تمام افراد بیعت سے مشرف ہوتے، ان چار دنوں میں حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے مواعظ ہوتے رہے، جن میں وہ شرک وبدعت کی برائی، توحید وسنت کی خوبی اور حج وعمرہ کے فضائل بیان فرماتے۔

حضرت سید صاحب کا وعظ:

ایک روز حضرت سید صاحب نے فجر کی نماز کے بعد ایک مؤثر وعظ فرمایا، فرمایا کہ

''بھائیو! اگر تم سب اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر واسطے ادائے حج وعمرہ کے اس نیت سے جاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو، تو تم کو لازم ہے کہ آپس میں مل کر ایسا اتفاق اور خلق رکھو جیسے ایک ماں باپ کے نیک بخت بیٹے ہوتے ہیں، ہر ایک کی راحت کو اپنی سی راحت اور ہر کسی کے رنج کو اپنا سا رنج جانو، اور ایک دوسرے کے کاروبار میں بلا انکار حامی ومددگار رہو، اور ایک دوسرے کی خدمت کو ننگ وعار نہ جانو، بلکہ عزت وافتخار سمجھو، یہی کام اللہ کی رضا مندی کے ہیں، اور جب ایسے اخلاق تمہارے اندر ہوں گے تو اور غیر لوگوں کو شوق ہوگا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ان میں شریک ہونا چاہئے، اور اللہ پر کامل توکل کرو، کسی مخلوق سے کسی چیز کی آرزو ہرگز نہ رکھو، رزاق مطلق اور حاجت روائے برحق وہی پروردگار عالم ہے، وہی ماں کے شکم میں روزی پہونچاتا ہے، پھر وہی وہاں سے ساتھ آسانی کے باہر لاتا ہے، اور باہر لانے سے پہلے ماں کی پستان میں روزی تیار رکھتا ہے، پھر وہ لڑکا اسی کی تعلیم سے دودھ پیتا ہے، اور جتنا چاہتا ہے اتنا پی لیتا ہے، باقی مکھی، بال، گرد وغبار سے محفوظ تازہ بتازہ ماں کے پستان میں رہتا ہے، پھر وسرے وقت پیتا ہے، یہ اسی پروردگار کی روزی رسانی ہے، پھر چند مدت میں دودھ چھڑا کر اور غذا کھانے کی تعلیم فرماتا ہے، اسی طور سے پرورش کر کے جوان اور جوان سے بوڑھا کرتا ہے، اور جو کچھ اس نے جس کی تقدیر میں روزی لکھی ہے وہ بہرصورت اس کو بلا شک وشبہہ پہونچے گی، اور یہاں ایک ادنی آدمی جو ہم لوگوں کی دعوت کر جاتا ہے اور چاہے جھوٹ ہی کر جاوے، مگر ہم لوگ اس کے اعتماد پر اپنے گھر میں منع کر دیتے ہیں کہ ہمارے واسطے کھانا نہ پکانا، فلانے کے یہاں ہماری دعوت ہے، یا مثلاً غازی الدین حیدر والی لکھنؤ اس بات کا وعدہ کرے کہ میرے فلاں امیر کے ہمراہ کہ بیت اللہ شریف کو جاتا ہے، جو کوئی جاوے زاد وراحلہ اس کو میں دوں گی، تو ہزاروں آدمی خوشی باخوشی جانے پر مستعد ہو جائیں، کچھ بھی اس کی وعدہ خلافی کا شک وشبہہ اپنے دل میں نہ لاویں، اور مجھ سے اس شاہنشاہ عالم پناہ قادر برحق رزاق مطلق نے وعدہ کیا ہے کہ جو تیرے ساتھ لوگ اس سفر میں ہیں، ان کے کھانے، کپڑے کا کچھ اندیشہ نہ کرو، وہ سب میرے مہمان ہیں، اور وہ اپنے وعدے کا سچا ہے کہ جس میں کسی صورت وعدہ خلافی کا احتمال بھی نہیں ہے، پھر میں کیوں کر نہ سچ جانوں؟ اور کس بات کا اندیشہ کروں؟ وہ آپ ہم سب بھائیوں کی پرورش کرے گا۔

سو حاصل کلام یہ ہے کہ جن بھائیوں کو یہ سب باتیں منظور ہوں اور میرے کہنے کو سچ

مانتے ہوں وہ میرے ساتھ چلیں، میں ان کے رنج وراحت کا شریک ہوں، اور وہ میری یہی باتیں اپنی اپنی عورتوں کو سمجھا کر کہہ دیں ورنہ ابھی مکان نزدیک ہے، تکلیف سفر کی اٹھانے کی موقوف کریں، سفر میں ہرطرح کی تکلیف اور مصیبت ہوتی ہے، والا پھر کوئی بھائی گلہ شکوہ کسی بات کا زبان پر نہ لاویں، اور مجھ کو عنایت الٰہی سے امید قوی ہے کہ اس سفر باظفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا، اور ہزاروں لوگ کہ دریائے شرک وبدعت اور فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے اور شعار اسلام سے مطلق ناواقف ہیں، وہ پکے موحد اور متقی ہوں گے۔

اور جناب الٰہی میں مَیں نے بہت سی واسطے اہل ہند کے دعا کی کہ الٰہی! ہندوستان سے راہ تیرے کعبہ کی مسدود ہے، ہزاروں مالدار صاحب زکوٰۃ مر گئے اور بہکانے نفس وشیطان کے کہ رستہ امن کا نہیں ہے، حج سے محروم رہے، اور ہزاروں صاحب ثروت اب جیسے ہیں اسی وسوسہ سے نہیں جاتے، سو اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کر لے بے دغدغہ چلا جاوے، اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔

سو میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب کی اور ارشاد ہوا کہ تیرے حج سے آنے کے بعد یہ رستہ علی العموم ہم کھول دیں گے، سو ان شاء اللہ جو بھائی زندہ رہیں گے وہ یہ حال بچشم خود دیکھیں گے"۔

ڈلمئو سے کوچ:

ڈلمئو میں چار پانچ روز قیام رہا، اس اثنا میں حضرت کے گھر لوگ اور دوسرے رفقا اور مستورات ڈلمئو پہونچ گئے، ڈلمئو والوں نے ایسا انتظام واہتمام کر رکھا تھا کہ قافلہ والوں کو کسی وقت کھانا پکانے کی نوبت نہیں آئی، حق تعالیٰ کا وعدۂ مہمانی یہیں سے جلوہ گر ہونے لگا تھا، دعوتوں پر دعوتوں کا سلسلہ تھا، قیام کا انتظام بھی بہت عمدہ کر رکھا تھا، یہاں سے سفر دریائی راستے سے طے تھا، آپ نے ڈلمئو میں رہ کر پانچ کشتیاں کرائے پر لیں، جمعہ کی نماز ڈلمئو میں پڑھی۔

نصرت حق:

ادھر قافلہ کے کوچ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ادھر ڈھلئی اور دھمدہ کے لوگوں کو حضرت

کے عزم وارادہ کی اطلاع ہوئی تو وہاں سے کئی لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ بہت دور دور سے لوگ آ کر بستی میں جمع ہیں، وہ سب آپ سے بیعت ہونے کے لئے آئے ہوئے ہیں، آپ جب یہاں سے چلیں تو ہماری بستی کے کنارے پڑاؤ کریں، وہاں دعوت کا کافی انتظام ہم لوگوں نے کر رکھا ہے، آپ نے فرمایا: ہم ان شاء اللہ تمہاری بستی میں ضرور اتریں گے، مگر دعوت کی تکلیف ہمارے لئے نہ کرو، انہوں نے اصرار کیا کہ ہماری خوشی اور راحت اسی میں ہے، آپ نے فرمایا خیر تمہاری خوشی ہم کو منظور ہے۔

جمعہ کے بعد وہاں سے روانگی تھی، قافلہ بڑا تھا، کشتیوں میں سب کی گنجائش نہ تھی، حضرت نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کو جن کے ساتھ عورتیں نہیں ہیں، خشکی کے راستے سے لے چلیں، اور موضع دھلئی میں چل کر ٹھہریں، وہاں وعظ ونصیحت کریں، ہم بھی ان شاء اللہ وہیں آتے ہیں، چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کے ہمراہ براہ خشکی ادھر روانہ ہوئے۔

شان دل نوازی:

حضرت کے رفقا کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے، اسباب لادے جا رہے تھے، اسی دوران قصبہ ڈلمئو کے ایک شخص نے آ کر آپ کی خدمت میں عرض کی کہ چند لوگ بیعت کرنے کو میرے یہاں باقی رہ گئے ہیں، اگر آپ وہاں تک قدم رنجہ فرمائیں تو بہتر ہو، فرمایا، بہت خوب چلو، پھر آپ اس کے مکان پر گئے، اور ان لوگوں سے بیعت لی۔ حضرت سید صاحب کی یہ خاص ادا تھی کہ معمولی سے معمولی آدمی کی کمال درجہ دل نوازی فرماتے۔

برکت کے روپئے:

وہاں سے حضرت تشریف لائے تو آپ نے اپنے خزانچی مولانا یوسف صاحب کو سات روپئے دیئے اور فرمایا، ان کو کسی کپڑے میں باندھ کر بحفاظت تمام اپنے پاس رکھئے، یہ ہمارا راہ کا خرچ ہے، اور یہ برکت کے روپئے ہیں ان شاء اللہ ان میں بہت برکت ہوگی۔

کشتیاں ڈلمئو سے روانہ ہوئیں، مغرب کی نماز کشتیوں میں پڑھی گئی، نماز کے بعد آپ نے سورہ الحمد کا وعظ کہنا شروع کیا، آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھتا گیا، دریا میں طغیانی تھی، ملاحوں نے

خیال نہیں کیا، کشتیاں پانی کے بہاؤ میں ڈھلئی سے آگے نکل گئیں، وہاں گھاٹ پر لوگ انتظار کررہے تھے، انہیں جب اندازہ ہوا کہ کشتیاں گھاٹ سے آگے چلی گئی ہیں تو وہ پکارنے لگے کہ گھاٹ پیچھے رہ گیا، کشتیاں واپس لاؤ، موسم برسات کا تھا، دریائے گنگا چڑھا ہوا تھا، جب تک ملاح کشتیوں کو واپس لاتے پانی کے ریلے میں دور نکل گئیں، پھر رسوں سے باندھ کر بڑی دیر میں کنارے گھاٹ تک لا سکے۔

حضرت اور آپ رفقا اترے، عورتیں کشتیوں میں رہیں، حضرت کے لئے ایک ہنس کا انتظام ان لوگوں نے کررکھا تھا، حضرت اپنے رفقا کے ساتھ گاؤں میں تشریف لے گئے، مولانا عبدالحی صاحب کا قافلہ آچکا تھا، حضرت اور آپ کے قافلہ نے وہاں کھانا کھایا، عورتوں کے لئے کشتی پر کھانا بھیج دیا گیا۔

بہت سے لوگوں نے رات ہی میں آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی، پھر دوسرے دن دیر تک بیعت کا سلسلہ رہا، بیعت سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے سب لوگوں سے خطاب فرمایا کہ:

''بھائیو! حاصل بیعت کرنے کا یہ ہے کہ جوتم شرک وبدعت کرتے ہو، تعزیہ بناتے ہو، جھنڈے نشان کھڑے کرتے ہو، پیروں شہیدوں کی قبریں پوجتے ہو، ان کی نذرونیاز مانتے ہو، ان سب کاموں کو چھوڑ دو، اور سوائے خدا کے کسی کو اپنے نفع وضرر کا مالک نہ جانو، اور اپنا حاجت روانہ پہچانو، اور اگر یہ نہ کروگے تو فقط بیعت کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا''۔

آپ کے مختصر کلمات کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت لوگوں نے اپنے اپنے تعزیوں کے چوک کھول کر نکال دیئے، اور نشان اور پنجوں میں جو چاندی تھی اسے نکال کر حضرت کی خدمت میں پیش کردیا کہ اپنے صرف میں لائیں۔

موضع ڈگڈگی:

یہاں سے آپ رخصت ہوئے، جب کشتیاں موضع ڈگڈگی کے قریب پہونچی تو وہاں ایک صاحب شیخ محمد پناہ نامی انتظار میں کھڑے تھے، ان کی درخواست پر حضرت نے کشتیاں رکوائیں، انہوں نے سلام ومصافحہ کے بعد عرض کی کہ میں نے کئی روز سے آپ کی مہمانی کا سامان

تیار کر رکھا ہے، آپ کے آنے کی خبر سن کر سینکڑوں لوگ اس نواح کے بیعت کے واسطے میرے غریب خانے پر جمع ہیں، آپ وہاں تشریف لے چلیں، حضرت نے ان کی درخواست قبول فرمائی، کشتیاں وہیں کنارے باندھ دی گئیں، آپ اپنے رفقا سمیت اتر گئے، عورتیں کشتی پر رہیں، آپ ان کے گھر تشریف لے گئے، شام سے رات گئے تک بیعت کا سلسلہ رہا۔

وہاں بھی تعزیوں کے چوک بہت تھے، آپ نے تعزیہ داری کے بارے میں انہیں نصیحت کی، شرک و بدعت کی برائی بیان کی، چنانچہ اسی وقت چوک کھودوائے گئے، اور نشان اور جھنڈے توڑ دیئے گئے، لوگوں نے تمام برائیوں سے توبہ کی۔

انوکھی میزبانی:

رات کا قیام وہیں رہا، صبح وہاں سے کشتیاں روانہ ہوئیں، اور شام تک چلتی رہیں، شام کو ملاحوں نے کشتیاں ایسی جگہ لنگر کیں جہاں آس پاس آبادی کا کوئی نشان نہ تھا، آسمان پر غلیظ ابر چھایا ہوا تھا، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، آپ نے کھانا پکانے کا حکم دیا، لیکن دیکھا تو دریا کے کنارے بہت دور تک کیچڑ اور دلدل تھی، کھانے پکانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، سب کو یقین ہوا کہ آج فاقہ ہی کرنا ہوگا، اس وقت حال کچھ ایسا ہی تھا کہ فاقہ کر لینا آسان تھا مگر کھانا پکانا بہت دشوار تھا، بارش بھی ہو رہی تھی اور ہوا بھی تیز چل رہی تھی، کہیں سے دعوت کی بھی امید نہ تھی، قافلہ نے عشا کی نماز ادا کی۔

اتنے میں کوئی میل آدھ میل کے فاصلے پر کچھ روشنی دکھائی دی، غور سے دیکھا گیا تو کچھ لوگ ادھر ہی آتے ہوئے محسوس ہوئے، لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ اللہ جانے یہ کون لوگ ہیں؟ اتنے میں دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑا پر سوار کشتیوں کے قریب آیا، اس کے ساتھ کئی لوگ تھے، اس نے قریب آکے پوچھا کہ تمہارے پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت نے پکارا ہم یہاں ہیں، اس طرف آؤ، وہ گھوڑے سے اتر کر خدمت میں حاضر ہوا، ٹوپی اتار کر آداب بجالایا، کہنے لگا کہ کئی روز سے میں نے آدمی لگا رکھے ہیں کہ آپ آئیں تو مجھے خبر ملے، آج آپ کی خبر ملی تو آپ کے لئے کھانا پکوا کے لے آیا ہوں۔

حضرت نے حکم دیا کہ وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے لیں، اور باہم بانٹ کر کھالیں، وہ

کھانا کافی تھا،سب نے آسودہ ہوکر کھایا، پھر ملاحوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ انگریز نیل کا سوداگر تھا۔

اس رات کواللہ تعالی نے اس طرح اپنی قدرت کاملہ سے روزی پہونچائی،جس کا کوئی وہم وگمان بھی نہ تھا،رات کو وہیں قیام رہا،صبح کو کشتیاں روانہ ہوئیں،دن بھر کشتیاں چلتی رہیں، شام کوایک ایسی جگہ قافلہ پہونچا جہاں گنگا کی دھارائیں دو ہوگئیں، بڑا دھارا گڑھی مانک جارہا تھا اور چھوٹا دھارا گنتی کی جانب جارہا تھا،قافلہ کو گنتی کی طرف جانا تا تھا،مگر ادھر پانی کم تھا،رات میں ادھر کشتیوں کو لے جانا مشکل تھا،اس لئے وہیں کشتیاں باندھ دی گئیں،کل رات کا کھانا قدرے بچا ہوا تھا،اور اس کے ساتھ حضرت کے حکم سے کھچڑی پکا لی گئی،اور سب لوگ کھا کے فارغ ہوگئے،اسی دوران موضع گنتی سے کچھ لوگ آئے اور عرض کرنے لگے،حضرت! آپ نے یہاں پڑاوَ ڈال دیا ہے حالانکہ آپ کی دعوت کی تیاری ہمارے یہاں بڑے اہتمام سے ہورہی ہے،اب ہم لوگ کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ اس دھارے میں پانی کم ہے،اندھیری رات میں اس میں کشتیاں لے جانا مشکل ہے،ان شاءاللہ کل سویرے تمہارے یہاں آئیں گے۔

صبح سویرے وہاں سے کشتیاں چلیں،دن چڑھے قافلہ موضع گنتی ساحل دریا پہونچ گیا عورتیں کشتیوں پر رہیں مرد سب اتر کر حضرت کے ساتھ بستی میں آصف زماں خاں رسالدار کے گھر گئے،وہاں دعوت کا سامان تھا،وہاں تین روز قیام رہا،ان تین دنوں میں بہت سے مردوں اورعورتوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، برائیوں سے توبہ کی،ازسرنو زندگی کا عہد باندھا۔

الٰہ آباد میں قدرے قیام اوراس کے برکات:

الہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب مہاراجہ بنارس کے مختار عام تھے،اور حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کے نہایت مخلص ارادت مندوں میں تھے،اور ساتھ ہی ساتھ نہایت صاحب ثروت تھے،انہوں نے حضرت کے قافلے کے استقبال کی خاص تیاریاں کر رکھی تھیں،سید صاحب گنگا کے دوسرے کنارے الہ باد کے بالمقابل ساحل پر فروکش تھے، وہیں شیخ غلام علی صاحب کے فرستادہ اصحاب پہونچے،رات کا قیام اسی ساحل پر رہا، یہاں سے الہ باد خشکی کے راستے سے ڈیڑھ کوس اور دریا کے راستے ڈھائی کوس ہے،کشتیاں دریا کے راستہ سے روانہ ہوئیں،قافلے کے

بعض لوگ خشکی کے راستے سے چلے،سید صاحب کشتی پر تھے،شہرالہ باد میں شیخ غلام علی کی تجویز کے مطابق بلوہ گھاٹ پر کشتیاں رکیں،آپ کے استقبال کے لئے دریا کے کنارے شیخ غلام علی اور ان کے بیٹے، پوتے وغیرہ،مولوی کرامت علی،صدر امین،حافظ اکرام الدین دہلوی،شیخ محمد تقی قصاب ان کے بھائی شیخ عبداللہ اور وہاں کے نامور پیرزادے شاہ محمد اجمل کے بیٹے شاہ ابوالمعالی وغیرہ موجود تھے،ان کے علاوہ قلعہ الہ آباد کے داروغہ بسنتی میاں،رنجیت خان میواتی اور دوسرے بہت سے امراوغربا کھڑے تھے،کشتی کنارے لگی اور حضرت اترے تو سب نے مصافحہ ومعانقہ کیا

شیخ غلام علی صاحب:

شیخ غلام علی صاحب الہ آباد کے رئیس اعظم تھے،شاہانہ کارخانہ اورامیرانہ ٹھاٹ رکھتے تھے،سوتو فقط خدمت گار تھے جو اپنی نوکری پر حاضر ہوتے،وہ دونوں وقت شیخ صاحب کے دسترخوان پر کھانا بھی کھاتے،کئی طبیب ملازم تھے،اور الگ دواخانہ تھا اور یہ اذن عام تھا کہ غریب محتاج جس دوا کے لئے آئیں لے جائیں۔

شیخ صاحب موصوف کا تعلق حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ سے اس وقت ہوا جب سال ڈیڑھ سال پیشتر آپ پہلی مرتبہ الہ آباد تشریف لائے تھے،اس وقت شیخ غلام علی دوسرے حال میں تھے،عام امراورؤسا کی طرح شراب،تاڑی،حقہ،مدک اور چرس وغیرہ کے عادی تھے، ہرطرح کی شراب اوراس کے لئے طرح طرح کے ظروف اور پیالے صراحی وغیرہ ان کے یہاں موجود رہتے تھے،مختلف طرز کے سنہرے اور روپہلے حقے،بیش قیمت نیچے وغیرہ استعمال ہوتے تھے،حضرت جب پہلی مرتبہ الہ آباد میں تشریف لائے اور انہوں نے خدمت میں حاضری دی تو آپ کے دست حق پرست پر تمام منہیات شرعیہ سے تائب ہوئے،اور مخلص ارادت مندوں میں شامل ہوئے،مرید ہونے کے بعد شراب اور حقے کے ساز وسامان کو توڑ پھوڑ کر دریا میں ڈلوادیا، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ انہیں ضائع کرنے کے بجائے بیچ ڈالئے،فرمانے لگے:نعوذ باللہ میں براجان کر بیچ ڈالوں اور دوسرے لوگ اس بلا میں مبتلا ہوں،مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا،جو برتن چاندی کے تھے انہیں توڑ کر اپنے توشک خانے میں داخل کرلیا،باقی سب دریا میں پھنکوا دیا۔
وقائع احمدی میں ہے:

''حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے معتقد صادق اور مخلص بے ریا اور محبّ باوفا تھے کہ میں نے تو آج تک کسی کو نہیں دیکھا''۔(ص۶۳۳)

''مرید ہونے کے بعد انہوں نے ہمیشہ موٹا کپڑا استعمال کیا، بغیر بستر بچھائے کھلی چارپائی اور چھوٹی چارپائی پر کہ پیر نہ پھیلائے جاسکیں، سونے لگے''۔(کاروان ایمان و عزیمت ص۱۰۸)

شیخ کا بنگلہ دریائے جمنا کے ساحل پر تھا، اس بنگلہ سے ساٹھ ستر قدم کے فاصلے پر راجہ بنارس اودت نرائن کی دومنزلہ وسیع وعریض کوٹھی تھی، شیخ صاحب حضرت کو اپنے بنگلہ پر لے آئے، پھر کوٹھی دکھانے لے گئے، اسی کوٹھی میں حضرت کے قافلہ کے قیام کا انہوں نے انتظام کررکھا تھا، اس میں مردانہ مکانات الگ تھے، اور زنانہ مکانات علیحدہ تھے، یہ دومنزلہ کوٹھی تھی، حضرت نے نیچے اوپر سب ملاحظہ کیا، اور خوشی ظاہر فرمائی، شیخ صاحب نے ہر ایک کمرے اور مکان میں پلنگ اور فرش وغیرہ پہلے ہی بچھوادیئے تھے، اور ضروری اسباب رکھوادیئے تھے، کوٹھی کو دیکھ کر آپ بنگلہ پر آئے، کچھ دیر کے بعد قافلہ کی باقی ماندہ کشتیاں بھی ساحل پر بنگلہ کے نیچے آگئیں، وہ پورا قافلہ مردوعورت سمیت مذکورہ کوٹھی میں حضرت کی ہدایت وتقسیم کے مطابق فروکش ہوگیا، مردانہ حصہ کا ایک حصہ آپ کے تصرف میں رہا، شیخ صاحب نے پورے قافلہ کی ضیافت کی، کھانے میں پلاؤ اور بریانی تھی، حضرت کا قیام وہاں پندرہ روز سے زیادہ رہا، دن میں دوبار کھانا شیخ صاحب کی طرف سے آتا، دن میں پلاؤ کی دیگیں آتیں اور پورانی ہرروز شام کو خمیری روٹیاں، گوشت اور دہی وغیرہ مٹھائی بہت افراط سے ہوتی، اس وقت قافلہ میں سات سوافراد ہوچکے تھے، ان کے علاوہ شہر کے غربا بھی دسترخوان پر ہوتے، روزانہ ڈیڑھ دوہزار آدمیوں کا کھانا پکتا تھا۔

شیخ غلام علی سے الہ آباد کے بعض اصحاب ثروت نے عرض کیا کہ حضرت سید صاحب آپ کے یہاں اترے ہیں اور ہرروز آپ ہی طرف سے دعوت ہوتی ہے، ہم لوگوں کی بھی آرزو ہے کہ ہم بھی حضرت کو اپنے مکان پر لے جائیں، اور خدمت کریں، کھانا کھلائیں، شیخ نے ان سے بہت خوشامد کے ساتھ کہا کہ ''بھائیو! ضیافت کا احسان تو میرے ہی اوپر رہنے دو، تم کوئی تکلیف نہ کرو، اور جو تمہاری خوشی ہوتو کچی دعوت کرو۔ وہ یہ کہ اپنے گھر لے جاؤ، نذر پیش کرو،

پان کھلاؤ، عطر لگاؤ، گھر والوں کو بیعت کراؤ۔ شیخ صاحب کی بات سب نے قبول کی، پھر لوگ ایک ایک کر کے سید صاحب کو اپنے گھر لے جاتے، اپنے اہل وعیال کو مرید کراتے، کچھ نذرانہ پیش کرتے، نذرانہ کے علاوہ اگر کسی کو دعوت ہی کرنی منظور ہوتی تو دعوت کے لئے رقم پیش کرتے، کسی نے دوسو، کسی نے سو، کسی نے پچاس اور کسی نے پچیس روپے پیش کئے۔

کچی دعوت:

چنانچہ مولوی کرامت علی صدر امین، شیخ محمد تقی، بستی میاں اور نجیب خان نے دو دوسو روپے پیش کئے، کچھ لوگ وہاں جوتوں کے سوداگر تھے، جیسے حافظ نجابت علی، محمد حسین اور عبدالقادر وغیرہ انہوں نے آپس میں مل کر دوسو روپے حاضر کئے، قلعہ کے میگزین کے خلاصیوں نے دوسو روپے جمع کر کے پیش کئے، دعوت اور نذر کے یہ تمام روپے حضرت نے اپنے خزانچی مولانا یوسف صاحب کے پاس رکھوا دیئے۔

برکت کی انتہاء:

ایک روز مولانا یوسف صاحب نے حضرت سے کہا کہ میرے پاس روپیوں کی جو تھیلی ہے وہ بھر گئی ہے، باقی پیسے میں نے دوسروں کے پاس رکھ دیئے ہیں، اب اس کی کیا تدبیر کی جائے؟ آپ نے فرمایا سب روپے جمع کر کے ایک صندوق میں رکھ دیجئے اور وہ سات روپے جو آپ کے پاس کپڑے میں بندھے ہوئے ہیں، وہ بھی اسی میں رکھ دیں، اور کچھ رقم بقدر خرچ کرنے کے اپنے پاس رکھو، چنانچہ مولانا نے ایسا ہی کیا۔

حضرت کی دعا کی برکت:

الہ آباد میں رنجیت خاں میواتی حضرت کے بڑے معتقد تھے، اور بڑے سوداگر اور صاحب ثروت تھے، وہ بھی حضرت کی خدمت میں پیش پیش تھے، پہلے وہ بہت غریب اور مفلوک الحال تھے، حضرت سال ڈیڑھ سال پہلے جب الہ آباد تشریف لائے تھے، اس وقت وہ نہایت مفلس اور پریشان حال تھے، اور شیخ محمد تقی صاحب جو الہ آباد کے بڑے رؤوسا میں تھے، ان کے یہ دوست بھی تھے، اور ان کے یہاں ملازمت بھی کرتے تھے، شیخ محمد تقی کئی بار اس موقع پر حضرت سے درخواست کی کہ رنجیت خان کے لئے دعا فرما دیں، حضرت نے وعدہ فرمایا کہ ہم ان شاء اللہ

ضرور دعا کریں گے۔

اب سنئے کہ رنجیت خاں کے لئے دعا کیوں کر ہوئی؟ اور اس کی قبولیت کس شان سے ہوئی؟ واقعہ یہ ہوا کہ انہیں دنوں حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ ایک روز بستی میاں کے گھر تشریف لے گئے، شیخ محمد تقی بھی ہمراہ تھے، ایک شخص نے بستی میاں کو اطلاع دی کہ دھومن خان رافضی کئی ہتھیار بند لوگوں کے ساتھ سید صاحب کی واپسی کی راہ پر بیٹھا ہوا ہے کہ جب سید صاحب ادھر سے آئیں گے تو میں اپنے لوگوں سے تبرا کہلاؤں گا، بستی میاں کو غصہ آیا، انہوں نے اپنا آدمی بھیجنا چاہا کہ دھومن خاں سے کہہ دے کہ تم نے جو فساد کا ارادہ کیا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے، سید صاحب ہمارے پیر و مرشد ہیں، اور ہمارے مہمان ہیں، اگر فساد ہی کرنا منظور ہو تو جواب دو، پھر جو کچھ ہوگا ہم بھی دیکھ لیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ بے جا بات ہے، فساد کرنا کچھ ضرور تو نہیں، ہم وہ راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے سے چلے جائیں گے، انہوں نے عرض کی کہ حضرت سلامت! یہ بات ہرگز نہ ہوگی، ہم اسی راستے سے چلیں گے، اگر آج اس سے ہم دب جائیں گے تو ہمیشہ دبایا کرے گا، آپ کچھ دیر یہیں ٹھہریں، ہم خود ہی بندوبست کر لیتے ہیں۔ اب انہوں نے بجائے دھومن خان کے انگریز جنرل کے پاس آدمی بھیجے، اور ساری صورت حال اسے بتا دی اور کہا کہ اندیشۂ فساد ہے، آپ اس کا کچھ انتظام کریں، جنرل کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ دھومن خان پر بہت خفا ہوا، حالانکہ دھومن خان انگریزی حکومت میں بڑا معزز تھا، کیوں کہ یہ بستیوں کا اجارہ دار اور حاصل گزار تھا، جنرل نے بستی میاں کو پیغام کہلایا کہ آپ بےفکر رہیں، ہم انتظام کئے دیتے ہیں، پھر جنرل نے اپنا چپراسی کوتوال کے پاس بھیجا کہ رائے بریلی کے سید صاحب جو شاہ اجمل کے دائرے میں ٹھہرے ہیں، اور آج وہ بستی میاں کے گھر ہیں، دھومن خان اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ فلاں راستے پر فساد کی نیت سے بیٹھا ہوا ہے، تم اس کا انتظام کرو، اور شہر کے ہر تھانے کو ہدایت کر دو کہ سید صاحب جس وقت اور جہاں چاہیں، آتے جاتے رہیں، شہر میں کوئی مزاحمت نہ کرے۔ کوتوال کو جب یہ حکم ملا تو اس نے فوراً ایک جمعدار اور دس سپاہیوں کو دھومن خان کے پاس بھیجا کہ راستہ خالی کر کے وہ اپنے مکان پر چلا جائے، اس کے چلے جانے کے بعد پھر بستی میاں کو اس انتظام کی خبر کر دو، اور سید صاحب کو بتا دو کہ شہر میں وہ کہیں بھی بے تکلف آ جا سکتے ہیں،

کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

حضرت وہاں سے اٹھے،ساتھ یہ دسوں سپاہی مع جمعدار کے تھے،بستی میاں کے گھر سے ابھی نکلے ہی تھے کہ دیکھا کہ رنجیت خاں پندرہ بیس بندوقچیوں کے ساتھ آپ کی حفاظت کے ارادے سے آرہے ہیں،آپ نے ان سے فرمایا کہ گھر جاؤ،اور ہتھیار کھول دو،شام کو شیخ تقی کے مکان پر ہم سے ملنا۔

شام حضرت نے مغرب کی نماز چوک کی مسجد میں پڑھی،رنجیت خان اپنے لوگوں کے ساتھ وہاں حاضر تھے،نماز کے بعد آپ سب کو لے کر شیخ تقی کے مکان پر آئے،حضرت نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس وقت جب رنجیت خان اپنے لوگوں کے ساتھ ہماری حفاظت کے لئے آئے تھے،اور ہتھیار باندھے ہوئے تھے،تو ایک بلوے کی صورت ہوگئی تھی،یہ بات ہم کو پسند نہیں آئی،مگر ان کی ہوشیاری،دلیری اور خیر خواہی سے ہمیں بہت خوشی ہوئی،آپ شیخ بھائی ان کے لئے ہم سے کیا کہتے ہو؟انہوں نے عرض کی کہ یہ بھائی بھتیجے بھی حاضر ہیں،اور میں بھی امیدوار ہوں،آپ میرے لئے اور سب بھائیوں کے لئے دعا فرمادیں،اس مجلس میں شیخ تقی کے بھائی شیخ عبداللہ بھی آگئے،ایک لڑکا جوان کا بھتیجا یا بھانجا تھا،قادر بخش اسے بھی بلایا،اور عرض کیا یہ یتیم ہے،اس کے واسطے بھی دعا کریں،حضرت نے اسے اپنے پاس بٹھالیا،اس مجلس میں تیس چالیس آدمی تھے،آپ کا دعا میں ایک خاص انداز تھا،وہ یہ کہ سر سے صافہ اتار دیتے،اور ننگے سر نہایت الحاح وزاری کے ساتھ دعا فرماتے،چنانچہ اسی شان سے آپ نے دعا فرمائی اور سامعین نے آمین کہی۔

دعا سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے ایک دستار منگائی،اور رنجیت خان کے سر پر باندھ دی،اور خلافت نامہ لکھ کر دیا،اور روزی کی فراخی اور کشائش کے لئے برکت کے پانچ روپئے دیئے،ایک روپیہ ان کے بھائی کو دیا،اور دستار خلافت بھی دی،اور بھی متعدد لوگوں کو ایک ایک روپیہ دیا،اور قادر بخش کے واسطے فرمایا کہ ابھی تو یہ نابالغ لڑکا ہے،مگر جب بالغ ہوگا تب ان شاءاللہ اس کا حال دیکھنا کہ کیا خیر و برکت اس کے نصیب میں ہوتی ہے۔

حضرت کی اس دعا کے بعد رنجیت خان کا حال بدلا،اللہ نے دینداری کے ساتھ مال

ودولت سے خوب نوازا۔

الٰہ آباد اور اس کے اطراف ونواح کا انتظام:

موضع جھنی میں حضرت نے وعدہ کیا تھا کہ شیخ لعل محمد کو الٰہ آباد میں کچھ تعلیم کریں گے، کچھ تدبیر بتائیں گے، چنانچہ شیخ لعل محمد، شیخ محمد وزیر، ان کے چاروں بیٹے اور موضع چھری کے دونوں بھائی زمیندار خدمت میں حاضر ہوئے، اور ہر ایک کے ساتھ ان کی بستیوں کے کافی لوگ تھے، ان میں جن لوگوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی تھی، وہ بیعت ہوئے، حضرت نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ ان بھائیوں کو نماز روزہ، حج وزکوۃ وغیرہ کے ضروری مسائل تعلیم فرمائیں، پھر ہمارے پاس لایئے، جو کچھ ہم کو کہنا ہوگا ہم کہیں گے۔

مولانا نے سب کو اکٹھا کر کے مسائل سمجھائے، پھر حضرت کی خدمت میں لے گئے، آپ نے شیخ لعل محمد کو، شیخ محمد وزیر اور ان کے دونوں بیٹوں کو اور چھری کے دونوں بھائیوں کو خلافت نامہ دیا، اور اپنا خلیفہ بنایا، اور جو لوگ آنے والوں میں مناسب تھے انہیں بھی خلافت سے نوازا، کسی کو کرتا دیا، کسی کو عمامہ، کسی کو ٹوپی عطا فرمائی، اور سب کے لئے دعا کی، اور شیخ وزیر کو ایک روپیہ برکت کا دیا۔

پھر سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

''بھائیو! کچھ مدت للہ فی اللہ اپنے نواح اور اطراف کی بستیوں میں دورہ کرو، اور مسلمانوں کو توحید اور طریق اسلام سکھاؤ، اور شرک وبدعت سے بچاؤ، اللہ تعالیٰ تم کو اجر عظیم عطا کرے گا''۔

حضرت کا یہ کلام سن کر سب نے عرض کی کہ آپ کا فرمانا سچ ہے، مگر ہم کو عذر یہ ہے کہ ہم اقسام شرک وبدعت سے واقف نہیں کہ کن کاموں کو شرک کہتے ہیں؟ اور کن کو بدعت؟ دوسرے یہ کہ عموماً لوگ شعائر اسلام سے محض ناواقف ہیں، ان کو ہدایت کی باتیں سکھانا اور راہ راست پر لانا، ہم لوگوں کے لئے بہت دشوار ہے۔ آپ نے فرمایا:

''ان کی ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، نہ میرے اختیار میں ہے نہ تمہارے اختیار میں، جو تم اس امر میں للہ فی اللہ چند مدت کوشش کرو گے تو اس کا اجر عظیم خدا سے پاؤ گے، اور مفت

میں جنت کماؤ گے''۔

یہ بشارت سن کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آپ کا فرمان قبول ہے، پھر عصر کا وقت ہوگیا، نماز پڑھ کر آپ شیخ غلام علی صاحب کے بنگلے پر تشریف لے گئے، پیچھے سے وہ لوگ بھی حاضر خدمت ہوئے، شیخ صاحب نے پوچھا کہ آپ نے ان لوگوں رخصت کرنے کی کیا تدبیر کی ہے؟ آپ نے فرمایا، کچھ باتیں تعلیم کرنی ان کو باقی ہیں، وہ تعلیم کر کے ایک دو روز میں رخصت کر دیں گے، ان لوگوں نے عرض کی کہ لوگوں کو تعلیم وتلقین کرنے کو جو آپ نے فرمایا، اگر اس کے لئے شیخ صاحب کو بھی مقرر فرما دیں تو ان کی وجہ سے ہم لوگوں بڑی قوت حاصل ہوگی، اس لئے وہ یہاں کے نامی سردار ہیں، اور بڑے علاقہ دار اور صاحب اقتدار ہیں، آپ نے فرمایا کہ میرا بھی یہی ارداہ تھا، مگر تم نے اس وقت کہا تو خوب کہا، اور شیخ صاحب سے فرمایا کہ شیخ بھائی! تمہارے علاقے کی بستیوں میں جو مسلمان بستے ہیں ان کی تعلیم وتلقین کے لئے ہم نے تم کو مقرر کیا، شیخ صاحب نے کہا کہ آپ کا فرمانا بجا ہے مگر میں ابھی خود آپ کی تعلیم اور تلقین کا محتاج ہوں، اور مزید اس علاقے کے لوگ طریق اسلام سے محض نابلد ہیں، کوئی ان کو کیوں کر تعلیم کرے گا؟۔

حضرت نے فرمایا کہ شیخ بھائی! اک ذرا تم پس وپیش نہ کرو، ان کو ہدایت تو اللہ اپنے فضل وکرم سے کرے گا، تم جو چند روز ان کو دین اسلام سکھاؤ گے تو اجر عظیم پاؤ گے۔ اور اس کی تدبیر بہت آسان ہے، وہ یہ ہے کہ ان زمیندار لوگوں کا اکثر کاروبار سرکار و دربار سے تعلق رکھتا ہے، تم ان کے حامی ومددگار رہو، وہ تمہاری سرکار کے مال گزار ہیں، اس میں جس قدر تم سے ہوسکے حسب استطاعت روپے لینے میں تخفیف کرو، تمہارا یہ احسان جب ان پر ہوگا تو جو کچھ تم ان سے کہو گے، سب بغیر انکار کے مانیں گے۔

شیخ صاحب نے کہا ''اگر یہی بات ہے تو بہت آسان ہے، ان شاء اللہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔[۲]

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) میاں دین محمد نے حضرت سید صاحب سے اس وقت ایک خواب بیان کیا تھا جب حضرت مغربی یو پی کے دورے سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستے میں میاں دین محمد حضرت سے ملے تھے، وہ دہلی سے حضرت کی طلب پر آئے تھے، حضرت نے ان سے دہلی کی خیر وعافیت دریافت کی، انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہ الرحمہ کی خیریت اور اپنے احوال بیان کئے، حضرت نے مکرر فرمایا کہ ہم یہ نہیں پوچھتے، اس کے سوا اور جو تم پر گزرا ہو بیان کرو، تب ان کو ایک معاملہ یاد آیا، جسے انہیں کی زبان میں سنئے، کہتے ہیں:

''میں ایک روز دہلی میں مغرب کی نماز میں گیا، دو رکعت نماز ہو چکی تھی، میں تیسری رکعت میں شریک ہوا، اسی دوران میرے کان میں آواز آئی کہ تو حج کی تیاری کر اور جلد آ، میں سن کر متفکر سا ہوا کہ یہ کون کہتا ہے؟ پھر امام کے سلام پھیرنے کے بعد باقی نماز کے لئے اٹھا، تو پھر وہی آواز آئی کہ ہم تجھ سے کہتے ہیں کہ تو حج کو جا، پھر تیسری رکعت میں بھی آواز آئی کہ تو کس بات کی فکر کرتا ہے؟ اپنے حج کی تیاری کر اور جا۔

جب میں نماز پڑھ چکا تو میرے دل میں تشویش پیدا ہوئی کہ الٰہی یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے ان تینوں آوازوں کا مضمون خوب نہیں سمجھا، جو کچھ حال ہو مجھ کو آج خواب میں معلوم ہو جائے، پھر اسی رات کو مجھ سے کسی نے خواب میں کہا کہ تو حج کو جانے کی تیاری کر، پھر میں جگ گیا۔

اس کے بعد پھر ایک رات میں نے خواب میں آپ کو دیکھا کہ فرماتے ہیں، دین محمد! خاطر جمع رکھ، اللہ تعالی چاہے گا تو سب کام تیرا درست ہوگا، کسی بات کا اندیشہ نہ کر''۔

آپ نے فرمایا، میں اسی کو پوچھتا تھا، سو خوب کیا کہ تم ہمارے پاس چلے آئے۔

(۲) سید صاحب کا یہ سفر نامۂ حج مکمل نہیں ہے، والد صاحب کے مسودے میں ہم کو اتنا ہی ملا، سو ہم نے اسے نقل کر دیا کہ اتنے سے بھی سید صاحب کی عزیمت ورفعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ترجمہ مقدمہ ''الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن''

تعارف ''الیاقوت والمرجان فی لغات القرآن'':

رب یسر ولاتعسر وتمم بالخیر یافتاح بک نستعین

الحمدللہ الذی جعل القرآن العظیم سراجا وھاجا فانقشت ظلمات الکفر وھدی بہ الناس فدخلوا فی دین اللہ افواجا وبعث محمداً خاتم النبین نبیاھادیا ورسولا فانا ربہ سبلاً فجاجا صلی اللہ علیہ وبارک وسلم وعلیٰ الہ وصحبہ الذین تدفقت النھارجدودھم امواجا فامواجا. اما بعد!

کتاب اللہ کے معانی ومطالب کو سمجھنے کے لئے بنیادی چیز قرآن کریم کی زبان کو جاننا ہے، کتاب الٰہی کی تفسیر وتاویل کو جاننے اور سمجھنے کے لئے یہ پہلا مرحلہ ہے، اس کے بعد دوسرے مرحلے آتے ہیں، جیسے علم نحو، صرف اور علم بلاغت، علم ادب کی باریکیاں، لغت کے حقائق ودقائق وغیرہ، اس لئے علماء اسلام میں لغت عربی کے ائمہ نے، لغات قرآن کے حل کرنے، اس کے نادر الفاظ کی شرح کرنے، اور اس کے مشکلات کی تشریح وتوضیح کرنے کا ہر چیز سے پہلے اہتمام کیا ہے، چنانچہ حسب ذیل ائمہ لغت کی تالیفات معروف ہیں۔

(۱) امام ابوعبیدہ معمر بن مثنی بصری متوفی ۲۱۰ھ انہوں نے اس موضوع پر پہلے ایک مختصر سی، پھر ایک بڑی کتاب تصنیف کی، غالباً وہ ''مجاز القرآن'' نامی کتاب ہے اور وہ طبع ہو چکی ہے۔

(۲) ابوالحسن نضر بن شمیل مازنی متوفی ۲۰۴ھ۔

(۳) ابوسعید عبدالملک بن قریب اصمعی متوفی ۲۱۶ھ۔

(۴) محمد بن مستیز (قطرب) متوفی (۲۰۶)

(۵) امام ابوعبید قاسم بن سلام بغدادی متوفی ۲۲۴ھ

انہوں نے قرآن کے مشکل اور نادر الفاظ کے ساتھ حدیث کے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو۔ مقدمہ النہایہ لابن الاثیر وکشف الظنون)

(۶) امام ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ۔

امام سیوطی الاتقان کی چھتیسویں نوع معرفۃ غریب القرآن میں لکھتے ہیں:

غریب قرآن کے موضوع پر بکثرت علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً ابوعبیدہ، ابوعمر زاہد بین درید اوران میں مشہور تر عزیزی کی کتاب ہے جس کی ترتیب وتالیف میں وہ اوران کے استاد ابوبکر بن الانباری پندرہ سال تک مشغول رہے اوراس موضوع پر عمدہ ترین کتاب راغب اصفہانی کی المفردات ہے ابوحیان اندلسی نے بھی اس موضوع پر ایک مختصر سی کتاب دو جزء میں تالیف کی ہے۔

ابن صلاح فرماتے ہیں کہ تفسیر کی کتابوں میں جہاں کہیں یہ لکھا دیکھو کہ ''اہل معانی کا قول ہے'' تو اس سے مراد وہ اہل علم ہوتے ہیں جنہوں نے قرآن کے معانی پر کتابیں لکھی ہیں۔ جیسے زجاج، فراء، اخفش اور ابن الانباری۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ ائمہ لغت ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے غریب اور نادر کلمات کو حل کرنے کا اہتمام کیا، کیونکہ کتاب الٰہی کے سمجھنے کا یہی پہلا مرحلہ ہے اس اہتمام وکاوش سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالص اہل عرب جو اہل زبان ہیں وہ بھی قرآن کریم کے مشکل الفاظ اور نادر و کمیاب کلمات کے حل کرنے سے مستغنی نہیں۔ پھر سمجھا جاسکتا ہے کہ اہل عجم کو اس کی کس قدر ضرورت ہوگی۔

دورِ حاضر میں متعدد اہل علم حضرات نے قرآن کریم کے مفردات کو اردو زبان میں حل کرنے اور ان کی توضیح وتشریح کا اہتمام کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے بہت نفع پہونچایا، ان کی تصنیفات طبع ہوچکی ہیں اس دور اخیر میں جس بزرگ عالم نے لغات قرآن کے حل کرنے کے لئے خاص توجہ کی ہے اوران کی اچھی شرح کی ہے وہ دور حاضر کے زاہد، بلاد سندھ کے عارف باللہ اور فقیہ ومحدث حضرت شیخ مولانا حمّاد اللہ بن محمود بن حمّاد اللہ ہالیجوی سندھی رحمہ

اللہ ہیں، انہوں نے کتب لغت کی ترتیب کے مطابق لغات قرآنی کی تفہیم وتشریح کے لئے ایک بیش قیمت کتاب تالیف فرمائی ہے، انہوں نے اپنی اس کتاب میں صرف اس پر اکتفاءنہیں کیا ہے کہ امام راغب اصفہانی کی مفردات جیسی کتابوں سے حل وتشریح کے لئے عبارتیں نقل کردیتے۔ بلکہ انہوں نے کتب لغت کو بھی پیش نظر رکھا۔ جیسے قاموس صراح اور منتہی الادب اور لغت کی بعض جدید کتابیں، اسی طرح کتب تفسیر مثلاً زمخشری کی کشاف، امام رازی کی تفسیر کبیر، علامہ ابن کثیر کی تفسیر سے بھی استفادہ کیا ان کتابوں سے بلند مضامین، عمدہ کلام اور اہم وضروری تحقیقات نقل کی ہیں۔

پھر مزید یہ کہ اتنے ہی ماخذ پر بس نہیں کیا، نحو کی کتابوں سے بھی بحثیں اخذ کی، اور اہم مسائل کو ذکر کیا۔ چنانچہ الف لام کی بحث ''الا''۔ ہمزہ کے فتحہ اور لام تخفیف کے ساتھ۔ اور ''اِلَّا'' حرف استثناء کی بحث، حروف جارہ میں ''اِلیٰ'' کی بحث اور جو چیزیں اہمیت کی حامل ہیں، انہیں موقع موقع پر ذکر کیا ہے۔

ان تحقیقات اور بحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کو علم ادب میں خصوصی مہارت تھی اور مسائل وتحقیقات کے انتخاب میں ان کا ذوق کس قدر بلند تھا۔

پھر حضرت نے صرف حل لغات پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کریم کے اندر آئے ہوئے ہر کلمہ کی شرح کی ہے، خواہ وہ ماضی ہو، مضارع ہو، فاعل ہو، مفعول ہو، مثبت ہو، منفی ہو۔ پھر ان کے صرف ذکر پر قناعت نہیں کی بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ لفظ کس پارے اور کس رکوع میں آیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ اپنی اصلی صورت میں کیا معنی رکھتا ہے اس طرح یہ فقط قرآن کی کتاب لغت نہیں ہے بلکہ الفاظ قرآنی کی فہرست بھی ہے جو بتاتی ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہاں کہاں آیا ہے۔ پس یہ کتاب ان دونوں عظیم فائدوں کی جامع ہے۔

اس کتاب سے ناظرین بیک وقت یہ بھی معلوم کرسکیں گے کہ یہ کلمہ کہاں کہاں مذکور ہے اور اسی کے ساتھ اس کی شرح بھی معلوم ہوجائیگی اور جہاں جہاں یہ لفظ مذکور ہے اگر ان جگہوں میں معانی کے اندر کچھ فرق واختلاف ہے تو وہ بھی معلوم ہوجائیگا، پھر حضرت موصوف نے عموماً ثلاثی مجرد کے ابواب ذکر کرنے کا التزام فرمایا ہے۔ یہ ایک عظیم لغوی فائدہ پر مشتمل ہے، جس کی قدر وہی کرسکتا ہے جسے عربی زبان میں معانی کے فرق واختلاف جاننے کا اہتمام ہو، اور وہ جانتا ہو کہ

ابواب کے بدل جانے سے معانی میں کچھ تغیر آ جاتا ہے اسی طرح مصدر کے بدلنے سے بھی معنی بدلتا ہے۔ یہ ایک ادبی اور لغوی مرحلہ ہے۔

یہ اور اس طرح کے التزامات واختیارات بتاتے ہیں کہ عارف سندھی کا ادبی اور لغوی ذوق بہت بلند تھا جیسا کہ اہل زبان کا ذوق ہوتا ہے۔

حیرت انگیز معاملہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو عرب سے دور بلاد سندھ میں پیدا ہوتا ہے اور یہیں کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتا ہے، اور ایسے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے جنہیں ذوق ادب سے مس تک نہیں، اور نہ وہ زبان کے حقائق ودقائق کی کچھ خبر رکھتے پھر اس شخص کا ادبی کتابوں سے کچھ خاص اشتغال بھی نہیں، وہ اس درجہ اور خصوصیت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ کیسی منفرد اور کامل عبقری شخصیت ہے۔ **وذالک فضل الله یوتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم.**

خصوصیات کتاب:

اس کتاب کی چند خاص خصوصیات ملخصاً ہم ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قرآن کریم کے الفاظ کی لغوی مادہ مجردہ کے لحاظ سے حروف تہجی کی ترتیب سے معجم مفہرس ہے۔

(۲) بجائے سورتوں کی ترتیب کے کتب لغت میں رائج ترتیب کے مطابق قرآن عزیز کے الفاظ کی شرح ہے۔

(۳) قرآن کریم کے الفاظ کی شرح بیک وقت لغت کے اعتبار سے بھی اور تفسیر کی کتابوں سے بھی۔

(۴) صرف حل لغات پر اکتفاء نہیں کی ہے بلکہ بہت سے اہم نحوی اور لغوی فوائد بھی ضمناً درج کر دیئے ہیں۔

(۵) ثلاثی مجرد کے ابواب کو عموماً بالالتزام ذکر کیا ہے یہ اس کتاب کی خاص خصوصیت ہے

(۶) کسی لفظ کی شرح میں کئی اقوال ہیں تو ان سب کو ذکر کر کے معتبر اور قابل اعتماد تفسیری کتابوں سے ان میں سے کسی ایک کی ترجیح ذکر کی ہے۔ مثلاً ابن جریر طبری، ابن کثیر اور کشاف

زمخشری۔

(۷) صلہ کے اختلاف سے معانی میں جو تبدیلی آتی ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے چنانچہ استویٰ کی شرح دیکھئے۔

(۸) کسی نادر لفظ کی شرح میں اگر کسی اعتقادی پہلو کو اختیار کرنا ہوتا ہے، تو اس کی صراحت فرماتے ہیں وہ عقیدہ میں سلف صالحین کے تابع ہیں، متاخرین کی تاویلات کو اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ استویٰ کی مسئلہ میں اسکی تصریح کی ہے، نہ تکیف کو اختیار کیا نہ تشبہ کو، بلکہ تفویض کا راستہ اختیار کیا۔ جو ایک بے غبار راستہ ہے، لفظ کے ظاہر کو بھی نہیں اختیار کیا جیسا کہ بہت سے اہل ظاہر نے کیا ہے، بس وہ تشبہ میں یا اس کے قریب جا پڑے۔

یہ چند خصوصیات میں نے عاجلانہ اور طائرانہ نگاہ میں اخذ کئے ہیں ممکن ہے اور بھی خصائص ہوں جنہیں میں عجلت میں نہ پا سکا ہوں اور اگر اتنی ہی خصوصیات ہوں جب بھی فضل و امتیاز کے لئے بہت ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس تالیف کی قدر و قیمت سمجھنے کے لئے یہ خصوصیات کافی ہیں اور اتنے ہی سے اصحاب علم وفضل کی توجہ اس کی طرف ہو جائیگی اور انہیں اس سے استفادہ کی رغبت ہوگی۔ میں اس کتاب کا نام ''الیاقوت والمرجان فی شرح لغات القرآن'' رکھتا ہوں۔

امام مؤلف کے حالات:

وہ شیخ عارف زاہد محدث فقیہ حماد اللہ بن محمود بن حماد اللہ ہالیجوی ہیں، ہالیجوی ایک چھوٹے سے گاؤں ہالیجی کی طرف نسبت ہے جو صوبہ سندھ کے ضلع سکھر میں واقع ایک شہر پنوعاقل کے مضافات میں ہے، یہی گاؤں شیخ کی جائے اقامت اور آبائی وطن ہے، یہیں انہوں نے ایک مسجد اور خانقاہ بنائی۔

تعلیم وتدریس کے ابتدائی دور میں آپ کے عالمانہ مزاج وطبیعت کو صوفیاء کے اذواق ورجحانات سے مناسبت نہ تھی، پھر جاذبہ توفیق الٰہی نے وقت کے مشہور بزرگ ایک بڑے عارف باللہ حضرت مولانا تاج محمود امروٹی کی حدمت میں پہونچا دیا، صوبہ سندھ کے ضلع سکھر میں امروٹ ایک بستی ہے، امروٹی کی نسبت اسی گاؤں کی طرف ہے۔

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی علیہ الرحمہ اپنے دور میں سلسلہ قادریہ کے کامل ترین مشائخ میں سے تھے، حضرت مؤلف علیہ الرحمہ کو ان کی خدمت میں قرب وتوجہ کا بہت قوی رابطہ حاصل ہوا، اور ان کی نسبت کا عکس تمام وکمال حضرت مؤلف کے قلب وباطن میں اتر آیا، اس طرح وہ ان کے بہترین جانشین ہوئے، اور حضرت شیخ امروٹی نے انہیں بیعت وارشاد کی اجازتِ عامہ فرمائی، چنانچہ اپنے شیخ کی حیات میں ہی مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے، اور لوگ شیخ کے حکم سے ان کے ہاتھوں پر بیعت ہونے لگے۔

حضرت مولانا امروٹی فرماتے تھے کہ ''گھی تو سارا حماد اللہ لے گئے اور لوگوں کے لئے چھاچھ چھوڑ دیا''۔

حضرت موصوف چالیس سال تک اپنے گاؤں میں استقامت کے ساتھ بیٹھے اور مسلسل عبادت وریاضت، وعظ وارشاد، افتا اور لوگوں کی دینی وروحانی رہنمائی میں مشغول رہے، یہاں تک کہ ۱۳۸۱ھ میں جوار رحمت حق میں پہونچ گئے۔

شیخ کبھی اپنی کنیت ابوالسعاد لکھتے ہیں، کبھی اپنا نام محمد حماد تحریر فرماتے ہیں۔

تالیفات:

حضرت شیخ نے متعدد کتابوں پر حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں، چنانچہ علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف پر، مشہور مجموعۂ قصائد ''سبع معلقات'' پر آپ کے حواشی ہیں، نیز صحابی جلیل حضرت کعب بن زہیر کے مشہور قصیدہ ''بانت سعاد'' اور شیخ بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح فرمائی ہے۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی طرف اللہ کے اسماء حسنی بصورت نظم منسوب ہیں، حضرت نے اس کی بھی شرح لکھی ہے اور یہ ساری تحریریں عربی میں ہیں، لغات القرآن کی ایک شرح سورتوں کی ترتیب سے بھی عربی زبان میں تالیف فرمائی ہے اور سورتوں کی ہی ترتیب پر سندھی زبان میں ایک شرح تحریر فرمائی ہے اور ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں آٹھ مسائل کے متعلق لکھا ہے۔

(۱) علم غیب کے متعلق کہ وہ حضرت حق جل مجدہ کے ساتھ مختص ہے اور جو کوئی غیر اللہ کے لئے غیب کلی کا دعویٰ کرے وہ کفر کا مرتکب ہوا۔

(۲) جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ کے ماسوا، خواہ انبیاء ہو یا اولیا، نفع ونقصان کے مالک ہیں، وہ کافر ہے۔

(۳) غیر اللہ سے استعانت اس اعتقاد سے کہ وہ مدد کرنے میں مستقل اور خود قادر ہیں کفر و شرک ہے۔

(۴) رقص وتواحد جو بعض صوفیا کرتے ہیں، حرام ہے۔

(۵) غیر اللہ کے لئے نذر ماننا یا، اس کے تقریب کے لئے منت ماننا حرام ہے اور جس چیز پر یہ نذر مانی گئی ہے، اس کا کھانا حرام ہے، فقرا کے لئے بھی درست نہیں ہے۔

(٦) "**ما اهل به لغير الله**" کی تحقیق اور یہ کہ ہر وہ جانور جو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا گیا ہو حرام ہے، اس کا کھانا حرام ہے اگرچہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

ہاں اس جگہ ایک بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اکرام ضیف اور تقرب الی غیر اللہ میں فرق ہے، اکرام ضیف کے لئے جانور ذبح کرنا جائز ہے، وہ "**ما اهل به لغير الله**" میں داخل نہیں ہے، البتہ اگر تقرب وبندگی کی نیت ہو تو حرام ہے۔

(۷) یہ کہ گانے بجانے کے سب سامان حرام ہیں، سوائے دف کے، جو نکاح کے وقت اعلان کے لئے بجایا جائے یا جنگ کے لئے بجایا جائے۔

میں نے اس رسالہ کا نام "**الينابيع الصافيه فى حكم المسائل الثمانيه**" رکھا ہے۔

ان مسائل کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کا فقہی ذوق کس قدر صحیح اور بلند تھا، اور آپ کے صاف ستھرے، پاکیزہ ذہن میں جاہل صوفیہ کی کدورتوں کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

انہوں نے ان جاہل صوفیہ پر اور ان کی ان تحقیقات پر جو اس قسم کے مسائل میں بطور ادعا کے پیش کرتے ہیں، سب پر خط نسخ پھیر دیا ہے، وہ بلا شبہہ سنت کے سچے متبع تھے، اور ان کا فقہی ذوق بالکل درست اور بصیرت کا حامل تھا۔

آثار و باقیات:

حضرت شیخ ہالیجوی نے اپنے قریبی قصبہ پنو عاقل میں ایک دینی مدرسہ ۱۳۵۴ھ میں

قائم کیا،اس کا نام ''مدینۃ العلوم'' ہے، یہ ایک عمدہ اور قابل اعتماد مدرسہ ہے،اس کے نگران اور مدرس ہمارے دوست مولانا محمد امین اللہ بھاولپوری ہیں، وہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہیں،اللہ نے انہیں اخلاص کی دولت سے نوازا ہے خود حضرت شیخ بھی دوسرے مدرسین کے ساتھ تدریسی اور تعلیمی خدمت میں حسبۃً للہ بغیر کسی تنخواہ کے مشغول رہتے ہیں،ان کے اخراجات ان کی ذاتی کاشتکاری سے پورے ہوتے ہیں۔

مزید یہ کہ شیخ نے وصیت کی تھی ان کی وفات کے بعد ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس کے اخراجات ان کی کاشت کے حصے سے پورے کئے جائیں۔

چنانچہ ان کے صاحبزادے اور خلیفہ محمود اسعد (**بارک الله فی حیاته وجهوده**) نے پوری کی، اللہ تعالیٰ انہیں ہر خیر وسعادت کی توفیق عطا فرمائے۔(صاحبزادے محترم بھی جوار رحمت میں پہونچ چکے ہیں)

مزاج وشمائل:

حضرت مولانا شیخ حماد اللہ صاحب بڑے عالم وعابد،حلیم وزاہد اور باوقار بزرگ تھے، ریا اور دکھاوا سے بہت دور تھے، میں نے جن اہل صلاح وفلاح کو دیکھا ہے ان میں سب سے بڑھ کر زاہد تھے،اور اہل بیعت وارشاد میں مَیں نے ان سے زیادہ حلیم اور بردبار نہیں دیکھا۔

بڑے صاحب کشف تھے،آپ کا کشف نہایت صحیح اور صریح ہوتا مخلوق کی نفع رسانی کا بڑا جذبہ رکھتے تھے،علما ودرویشوں سے خاص محبت رکھتے تھے، مالداروں کا اثر ان کی مالداری کی وجہ سے یا اصحاب حکومت کا اثر ان کے عہدہ ومنصب کی وجہ سے ان کے قلب پر مطلق نہ ہوتا تھا۔

تکلیفوں اور ناگواریوں پر بہت صابر تھے،ان کی زندگی نہایت سادہ تھی،ان کے گذر بسر کا کوئی تعلق لذیذ اور پرتکلف کھانے پینے سے قطعاً نہ تھا۔

وہ روزانہ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد وہیں تشریف رکھتے،لوگ آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوتے،آپ انہیں بیعت کرتے،اذکار تلقین فرماتے،مسنون دعاؤں کی ہدایت فرماتے،اور لوگ دوسری حاجات کے لئے بھی آتے،اور آپ سب کی ضرورتوں کے پورا کرنے کا اہتمام فرماتے،لوگوں کو دعائیں تعلیم فرماتے اور دوائیں بھی بتاتے۔

آپ طبیب حاذق بھی تھے،آپ کی مجرب دوائیں ہوتیں،علاج کے مفید طریقے ہوتے تھے،آپ کے پاس دیہات کا ایک اکھڑ اور بے سلیقہ بدو آتا،وہ درخواست کرتا کہ میں بیمار ہوں میرے لئے دعا فرما دیجئے،آپ ہاتھ اٹھاتے اور دعا کرتے،اور دیر تک دعا کرتے،پھر وہ کہتا میرے لئے تعویذ لکھ دیجئے،آپ اسے لکھتے،پھر وہ کہتا میرے لئے دوا تجویز کر دیجئے،آپ اسے دوا بتاتے،اور دیر تک سمجھاتے کہ کیسے بنائے گا،اور کیسے استعمال کرے گا،پھر وہ کہتا میرے پاس پیسے نہیں ہیں کہ دوا خریدوں تو آپ اسے دواؤں کے بقدر رقم بھی دیتے اور اس سوال و جواب اور گفتگو میں خاصا وقت لگ جاتا لیکن ہم نے نہیں دیکھا کہ چہرے پر تکدر یا ملال کا کوئی اثر آتا ہو،یہ سب خوشی خوشی خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لیتے۔یہ میں نے خود دیکھا ہے،مجھے آپ کے اخلاق،قوت برداشت دیکھ کر حیرت ہوتی اور مزید حیرت اس وقت ہوتی جب اسی وقت میں فضل اور کرم کی بارش بھی ہونے لگتی۔دوپہر تک آپ اس مشغولیت میں مسلسل رہتے،پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے گھر میں تشریف لے جاتے،پھر ظہر کی نماز کے لئے آتے اور خود ہی امامت فرماتے،نماز ظہر کے بعد عصر تک قرآن کی تلاوت کے لئے یکسو ہو جاتے،عصر کے بعد خطوط ملاحظہ فرماتے اور ان کے جواب تحریر فرماتے۔

آپ مسائل اور فتاوی بھی صادر فرماتے،کبھی دوسرے حضرات افتا کے فتوؤں کو ملاحظہ فرماتے،ان پر تصدیقی دستخط فرماتے یا تصحیح کی ضرورت ہوتی تو وہ کرتے،یہ سلسلہ نماز مغرب تک چلتا،مغرب کی نماز کے بعد آپ مصلی پر قوم کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے،اور لوگ بھی حلقہ بنا لیتے،پھر سلسلہ قادریہ کے طریقے پر اجتماعی ذکر فرماتے،لوگ پوری توجہ اور استحضار کے ساتھ ذکر میں شریک ہوتے،آپ کی توجہ نہایت مؤثر تھی،پھر عشا کی نماز پڑھاتے اگر مہمان وغیرہ ہوتے تو ان کی خاطر داری کا اہتمام فرماتے،کھانے اور بستر کا انتظام کرواتے،پھر گھر میں تشریف لے جاتے۔یہ دستور آپ کے آخری دنوں تک رہا،آپ کی پوری زندگی عبادت،ارشاد،خدمت خلق سے عبارت تھی،اس سے نہ آپ کو اکتاہٹ ہوتی اور نہ چہرے پر کلال وملال کا کوئی اثر ہوتا۔

سبحان الله! ذالک فضل الله یوتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم.

ارشادت کے نمونے:

حق تعالی کا ارشاد ہے۔**فاولئک مع الذین انعم الله علیهم من النبیین**

والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئک رفيقاً.

اس آیت کے سلسلے میں حضرت نے ارشاد فرمایا:

''حضرات انبیاء وہ ہیں جن کے قلوب کو حق تعالی نے وحی الٰہی کا مورد اور محل بنایا ہے، ان حضرات پر اللہ تعالی وحی بھیجتے ہیں''۔

''صدیقین وہ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے وحی الٰہی کا مخزن اور برتن بنایا ہے، یہ حضرات وحی کی حفاظت کرتے ہیں''۔

''شہدا وہ ہیں جو وحی الٰہی کی حفاظت میں اپنی جان اور اپنا مال قربان کرتے ہیں''۔

''صالحین وہ ہیں جو وحی الٰہی کے احکام پر عمل کرتے ہیں''۔

پس چاروں میں بلند مرتبہ ان کا ہے جن کو اللہ نے اپنی وحی اور کلام کا مورد اور مرکز بنایا، یہی حضرات اس کے حقائق کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ انبیاء کرام ہیں۔ **عليهم الصلوٰة والسلام**

پھر وہ ہیں جن کے قلوب وحی الٰہی کی حفاظت کے لئے مخزن بنائے گئے، پس وحی کا کوئی حصہ فراموش یا ضائع نہیں ہوتا، یہ صدیقین ہیں، پھر شہدا کا رتبہ ہے، پھر صالحین کا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے:

''نبی بارگاہ الٰہی کے نور سے قوت علمیہ کی جہت سے اثر قبول کرتا ہے پس اس کے سامنے اشیا اور ان کے حقائق کما حقہ واضح ہو جاتے ہیں اس طرح کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا''۔

نیز وہ قوت عملیہ کی جہت سے بھی اثر قبول کرتا ہے، اس سے اس کی طبیعت اور مزاج کو وہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ اعمال صالحہ بغایت محبت اور رضا کے ساتھ بے تکلف صادر ہوتے ہیں، اور طبعی طور سے ناپسندیدہ اعمال سے انہیں تنفر ہو جاتا ہے، پھر جب ان کے جسمانی قویٰ درجۂ کمال کو پہونچ جاتے ہیں اور عقل تجربات سے گزر کر کامل اور پختہ ہو جاتی ہے تو انہیں مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث اور مامور کیا جاتا ہے، اور معجزات اور عقلی نشانیوں سے ان کی تائید کی جاتی ہے، ان عقلی نشانیوں کی وضاحت نبی کے اخلاق کریمہ، ان کے علام صادقہ، دلائل واضحہ ،

بیان واضح اور مخلوق کے اندران کے انوار صحبت کی تاثیر سے ہوتی ہے، یہ نشانیاں اہل فضل وکمال کے لئے مفید ومرشد بنتی ہیں۔اور دوسرے معجزات سے عام لوگ استدلال کرتے ہیں۔

صدیق وہ ہے جو اپنی قوت علمیہ میں تو نہیں لیکن قوت نظریہ میں نبی کے قریب تر ہوتا ہے،اور شہید وہ ہے جسے نبی کی لائی تعلیمات واحکام پر اس درجہ شرح صدر ہوتا ہے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے،ایسا شرح صدر کہ ان تعلیمات واحکام کے لئے اپنی جان اور اپنے مال کی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے، گویا وہ اپنی قوت عملیہ میں نبی کے قریب تر ہوتا ہے۔

اور صالحین وہ ہیں جو اپنی ان دونوں قوتوں یعنی قوت نظریہ اور قوت علمیہ میں نبی کے قریب تر تو نہیں ہوتے لیکن وہ اپنی زندگی میں نبی کا اتباع کرتے ہیں، گناہوں سے اجتناب میں بھی، صحیح عقائد کے ساتھ انصاف میں بھی اور دوسرے احوال زندگی میں بھی۔

عرف میں ولی کا اطلاق صالحین پر ہوتا ہے گوکہ یہ لفظ تینوں گروہوں کو عام اور ان چاروں ''انبیاء، صدیقین، شہدا، صالحین'' میں قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ تعالی ان سب سے محبت فرماتے ہیں اور زمین میں ان کی مقبولیت عام فرمادیتے ہیں اور عام لوگوں سے علیحدہ ان کی روزی اور ضروریات کا تکفل فرماتے ہیں، ان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے دنیاوی ساز وسامان سے انہیں تعلق نہیں ہوتا، ان کے قلوب روشن ہوتے ہیں، ان کے سامنے وہ حقائق روشن ہوتے ہیں جن تک عام عقلوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

فائدہ''حسنات الابرار سئیات المقربین''کی شرح:

حضرت شیخ ہالیجوی نے فرمایا:''ابرار وہ نیک لوگ ہیں جو جنت اور اس کی نعمتوں کی طلب میں اعمال صالحہ بجالاتے ہیں، ان کا مطمح نظر جنت کا وہ عیش وآرام ہے جو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ان کے لئے مہیا کر رکھا ہے، جو نعمتیں کہ دائمی ہیں اور جنت ابدی ہے۔

اور مقربین وہ ہیں جن کا مقصود صرف رضائے الٰہی ہے، وہ اللہ تعالی کی ذات پاک کو نگاہ میں رکھتے ہیں، حق تعالی کی ہستی کے سامنے ان کے ارادے اور ان کی خواہشیں فنا ہوتی ہیں، وہ ''محبت ذات'' کے درجے میں پہونچے ہوئے ہوتے ہیں۔اور ابرار صفات کی محبت میں ہوتے ہیں، اس سے آگے ان کا عروج نہیں ہوتا، بس وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ کی حمد کرتے ہیں تا کہ

انہیں وہ خداوندی نعمتیں حاصل ہوں۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی شخص کے دو بیٹے ہوں، ایک بیٹا باپ کی خدمت اوراس کے ساتھ حسن سلوک اور محبت اس لئے کرتا ہے کہ باپ نے اس سے وعدہ کرر کھا ہے کہ اس کی خدمت کے صلے میں وہ اسے فلاں فلاں انعام دے گا،بس اسے یقین ہے کہ اگر میں خدمت گزاری میں مستعد رہوں گا اور حسن سلوک کرتا رہوں گا تو وعدے کا استحقاق ہوگا،اور اگر نافرمانی کروں گا تو محرومی ہاتھ آئے گی تو ایسے شخص کی جب مراد پوری ہوجائے گی تو اس کی خدمت گزاری سست پڑ جائے گی، بلکہ ختم بھی ہوسکتی ہے، یا کسی وجہ سے اگر اسے مایوسی ہوجائے اوراپنی محرومی کا یقین ہوجائے جب بھی وہ خدمت سے ہاتھ اٹھالے گا۔

اورایک بیٹا وہ ہے جو باپ کی خدمت محض اس کی شخصیت اور ذات کی وجہ سے کرتا ہے اس کے دل میں وہ اغراض ومقاصد نہیں جو پہلے بیٹے کے سامنے تھے،اس کا حسن سلوک اوراس کی وفاداری کبھی ختم نہیں ہوگی،خواہ اسے کچھ نفع حاصل ہو یا نہ ہو۔ پہلا بیٹا ابرار کے درجے میں ہے،اور دوسرا مقربین کے درجے میں ہے۔

پس کوئی شبہہ نہیں کہ وہ نیک عمل جو ابرار مادی عوض کے غرض سے بجالاتے ہیں وہ ان مقربین کی نگاہ میں بڑا گناہ ہے جو صرف ذات الٰہی کی رضا کو غرض بناتے ہیں،ان کی محبت میں مادی اغراض کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مقربین کا تعلق بہت مضبوط اور قوی تعلق ہوتا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا،اورابرار کا تعلق کمزور ہوتا ہے، وہ حصول مقصود کے بعد ساقط ہوسکتا ہے۔

ان دونوں میں فرق عمل کا نہیں نیت کا ہے، یہ دونوں ظاہر عمل میں متفق ہیں لیکن نیت میں مختلف ہیں،اعمال کا مدار نیتوں پر ہی ہے،اورآدمی کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔

فائدہ ’’اللہ تعالٰی کی معرفت‘‘:

حضرات صوفیہ نے جو اللہ کی معرفت سے بہرور ہیں، ذکر کے چار طبقات بیان کئے ہیں۔(۱) ناسوت (۲) ملکوت (۳) جبروت (۴) لاہوت۔

ناسوت:

انسان کا اس دنیاوی زندگی میں وجود وظہور کا نام ہے، آدمی جب اس مرتبہ میں ہوتا ہے

تو وہ دو ساتھیوں کے ساتھ ہوتا ہے،نفس اور شیطان۔نیز وہ بہت سی حاجات میں گھرا ہوا ہوتا ہے، مثلاً نفقہ،رہائش وغیرہ تو نفس دنیا کی لذتوں اور شہوتوں پر فریفتہ ہوتا ہے،چنانچہ حق تعالی کا ارشاد فرماتے ہیں:

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة.

لوگوں کے لئے عورتوں اور بچوں،ڈھیروں سارے سونے اور چاندی کی خواہش مزین کر دی گئی ہے۔

اور شیطان نفس انسانی کے لئے ان لذائذ اور شہوات کو،فسق وفجور کے گندے اعمال کو مزین کرتا رہتا ہے،حق تعالی نے متعدد آیتوں میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے،فرماتے ہیں:**وزين لهم الشيطان.** شیطان نے ان کے لئے مزین کر دیا ہے۔اور فرماتے ہیں:**فزين لهم الشيطان.** شیطان نے ان کے لئے مزین کر دیا ہے۔اور حاجات بشریہ کا یہ حال ہے کہ آدمی خود اپنی طبیعت سے ان کی چاہت رکھتا ہے ان سب کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ محبوب وپسندیدہ ہوں،اور ان کی محبت دل کی گہرائیوں میں جمی ہوئی ہو،اور اس پر پورے طور سے مسلط ہو تو جب اللہ کے اسم ذات کو ذاکر اپنی زبان وقلب سے دہراتا ہے تو اس کا دھیان ہونا چاہئے کہ یہ سب محبتیں اس کے دل سے نکل جائیں اور صرف اللہ کی محبت دل کی گہرائیوں میں قائم ہو جائے تو جب وہ اللہ اللہ کہتا ہے تو گویا نفس وشیطان کو جواب دیتا ہے کہ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں،میں صرف اللہ سے محبت رکھتا ہوں،سوائے اللہ کے مجھے اور کسی سے محبت نہیں،بس اسی کو دہراتا رہتا ہے۔یہ ذکر مرتبہ ناسوت ہے۔

پھر سالک اس مرتبہ سے ملکوت کے مرتبہ میں عروج کرتا ہے(ملکوت مَلَک سے صیغہ مبالغہ ہے)اب فرشتوں کے یہاں نفس کی دخل اندازی نہیں ہے اور نہ شیطان کی،اور نہ طبیعت بشری اور حاجات بشریہ کی،اور فرشتوں کا مقصد محض رضائے الٰہی ہے،پس اس مرتبہ میں جو ذکر ہے وہ محض رضائے الٰہی کے لئے ہے،لہٰذا اللہ اللہ کا تکرار محض اللہ کو راضی کرنے کے لئے ہے۔

پھر اس مرتبہ سے آگے بڑھتا ہے اور جبروت کے مرتبہ پر پہونچتا ہے،جبروت کا مرتبہ

اللہ تعالی کے اسماء وصفات کا مرتبہ ہے،اس مقام میں ذکر کرتے ہوئے سالک حق تعالی کے صفات بلند وبرتر،جلال وکبریائی،عظمت واحسان،مہربانی،رحمت وغیرہ کا لحاظ رکھتا ہے،دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ تعالی کی صفات جلال وجمال کا مراقبہ کرتا ہے اور اسی میں غرق ہوکر اللہ اللہ کرتا ہے،کہ وہ اس جہت سے ذکر کا مستحق ہے۔پھر دومرتبہ اللہ تبارک وتعالی کی ذات عالی کے دھیان میں اللہ اللہ کہتا ہے،یہاں صرف ذات کی نیت رکھتا ہے،اس طرح اللہ کا نام وہ آٹھ مرتبہ لیتا ہے اور ہر مرتبہ میں علیحدہ نیت رکھتا ہے،گویا نیتوں کے بدل جانے سے ہر مرتبہ تاثیر بدلتی رہتی ہے۔

اور شریعت میں اس کی نظیریں ہیں کہ ایک شے میں متعدد نیتیں ہوسکتی ہیں،اور نیت کے بدلنے سے اس کے اثرات بدل جاتے ہیں۔اس طرح سو مرتبہ کہے،ہر مرتبہ آٹھ مرتبہ اسم ذات کو شامل ہوگا،گویا ایک تسبیح ذکر کرے گا تو آٹھ سو مرتبہ اسم ذات کا ذکر ہوگا،پس ذاکر کو ہر روز کم از کم ایک تسبیح اسی کیفیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہئے۔(حضرت عارف سندھی سے میں نے یہ استفادہ کیا ہے)

فائدہ''اہل معرفت کے طریقے پر ذکر کے متعلق افادہ'':

ذاکر کے لئے مناسب ہے کہ اسم ذات کا ذکر تین تصورات کے ساتھ کرے۔

اول یہ ہے کہ اس کا دھیان کرے کہ اللہ سبحانہ تعالی ہی محبوب حقیقی ہیں،کیوں کہ وہی خالق ورزاق ہیں اور وہی تمام نعمتیں بخشنے والے ہیں،انہیں کے دربار سے تمام الطاف واحسانات ہیں،پس یہ خیال رکھے کہ اس کا قلب اللہ تبارک وتعالی سے محبت کرتا ہے اور وہی محبوب حقیقی ہے، اس خیال اور مراقبہ کے ساتھ اسم ذات اللہ اللہ کا ذکر کرے۔

دوسرے یہ خیال رکھے کہ وہ اللہ سبحانہ تعالی سے مخاطب ہے،کیوں کہ ہر کمال وجمال کے منبع ومصدر وہی ہیں،اس لئے سارے کمالات انہیں کے لئے ہیں،اور اپنی ذات سے وہ ہر کمال اور ہر صفت کی نفی کرتا ہے،پس وہ اللہ کے کمال کا مراقبہ کرتا ہے،پھر اسے پکارتا ہے اور حرف ندا کے واسطے کے بغیر اسے ندا دیتا ہے۔یہ حرف ندا لفظ میں تو نہیں ہے مگر اس کے ذہن اور تصور میں ہے اور مسلسل پکارتا ہے۔اللہ اللہ اللہ اللہ

تیسرے یہ کہ اس بات کا دھیان رکھے کہ حقیقۃً موجود وہی ہے،اور اس کے ماسوا ہر چیز

گویا کہ وہ موجود نہیں ہے، کیوں کہ ہر ماسوی فانی، زائل ہے اور بقا سے محروم ہے، اس ذات عالی کے سوا ہر شے فانی اور ہالک ہے، پس اس تصور سے اللہ اللہ کرے۔

انہیں تینوں دھیان اور انہیں تینوں مراقبات کے ساتھ اسی ترتیب کے مطابق دیر دیر تک ذکر کرتا رہے، اور مناسب یہ ہے کہ کم از کم آٹھ ہزار مرتبہ دس تسبیح ذکر کرے اور کسی وجہ سے وقت میں گنجائش نہ ہو تو وسعت کے مطابق کرے اور کم از کم روزانہ سترہ مرتبہ تو کر ہی لیا کرے، اور ذکر خفی میں تلفظ جیسے چاہے کر سکتا ہے یا انشراح ہو تو جہر کے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔

یہ طریقہ مجھے عارف باللہ الشیخ مولانا حماد اللہ سندھی ہالیجوی نے بتایا ہے جو شیخ عارف حضرت مولانا تاج محمود امروٹی سندھی کے خلفا میں ہیں، جو سلاسل تصوف میں طریقہ قادریہ سے وابستہ ہیں، اور ذکر قلبی میں حضرات مشائخ نقشبندیہ کا طریقہ معروف ہے، وہ یہ کہ دھیان کرے کہ لطیفۂ قلب جو قلب کے ماتحت ہے، اس پر نور کے حرفوں سے اللہ لکھا ہوا ہے، اور یہ کہ وہ بڑی محبت کے ساتھ اللہ کا نام بغیر تلفظ کے لے رہا ہے، گویا وہ اللہ کی محبت میں والہ وشیدا ہو رہا ہے، اسی طرح ہزار ہا ہزار مرتبہ نام لیتا ہے۔

یہ وہ فوائد ہیں جنہیں میں نے آپ کی مجالس میں سنا ہے، ان کا خلاصہ میں نے ایک مدت کے بعد اپنی یادداشت میں لکھ لیا تھا، بعض باتیں اس وقت مجھے مستحضر نہیں ہیں، اس لئے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں لیکن دیکھئے کہ اس کلام میں کتنا زبردست علم پنہاں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معرفت الٰہی اور فضل وکمال کے کس مرتبہ پر آپ فائز تھے۔ **ذالک فضل الله توتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم**

حاصل یہ ہے کہ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ عارف وعالم تھے، عابد وزاہد تھے، اپنے علوم ومعارف میں محقق تھے، ذکر الٰہی کے خواص واسرار سے واقف تھے، بہت کم علما اور اولیاء اس باب میں آپ کے ہمسر ہوں گے۔

اسی کے ساتھ آپ طبیب حاذق بھی تھے، مرشد وہادی بھی تھے، سنت نبوی کے نہایت متبع بھی تھے، اتباع شریعت میں کمال استقامت رکھتے تھے، آپ کا مرتبہ تجلئ صفات سے آگے بڑھ کر تجلئ ذات کے مقام بلند پر اس درجہ راسخ تھا کہ آپ اس بات سے قطعی بے نیاز ہو گئے تھے

کہ آپ کو کوئی پہچانے یا آپ سے کسب فیض کرے۔ میں نے آپ کے خصائص میں کسی کو آپ کا مثل نہیں دیکھا۔

البتہ ہمارے شیخ عارف دیوبندی مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب نقشبندی رحمہ اللہ کا بھی یہی رنگ وحال تھا، حضرت عارف دیوبندی کا وصال ۱۳۴۷ھ میں ہوا تھا، ان کے انتقال کے بعد ہمارے استاذ امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا کہ:

''ہماری جماعت میں جو سب سے افضل عند اللہ تھے چل بسے''۔

میں کہتا ہوں کہ عارف سندھی کو ان کے معاصرین میں کم کسی نے پہچانا، اور جیسا کہ میرا خیال ہے کہ ان کے باطنی کمالات سے پورے طور پر کسی نے استفادہ نہیں کیا، اور نہ ان سے کسی نے کما حقہ مراتب سلوک طے کیا۔

پس اللہ ان پر اپنی رحمتیں نچھاور کریں، ان سے راضی ہوں، اور انہیں راضی کریں، اور جنت ان کا مستقر بنائیں۔

وصلى الله على سيد الاولين والآخرين وخاتم النبيين محمد وآله وصحبه ومن تبعهم الى يوم الدين.

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

محرم الحرام ۱۳۹۳ھ

☆☆☆☆☆☆

فقہی اختلافات رحمت ہیں

احکام اسلامی کی تعمیل کی جومختلف شکلیں رائج ہیں،ان سب کو چھوڑ کر امت کو کسی ایک شکل پر جمع کرنا ممکن نہیں، یہ جمع کرنا نہیں انتشار پیدا کرنا ہے،بعض لوگ علمائے امت کے ان فقہی اختلاف کو بہت بھیانک بنا کر پیش کرتے ہیں، اور دعوت دیتے ہیں کہ سب کو چھوڑ کر حدیث پرآجاؤ،ہم نے مفصل اس پر بحث کی ہے،اتفاق سے کاغذات کی الٹ پلٹ میں رابطۂ عالم اسلامی کے ماتحت **مجمع الفقهي الاسلامي** کےایک اجلاس میں طےشدہ ایک قرارداد اسی موضوع پر مل گئی ، مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ شائع کردیا جائے تا کہ بصیرت کاباعث ہو۔(اعجازاحمداعظمی)

الحمدلله وحده والصلوٰة والسلام علىٰ من لانبي بعده،سيدنا ونبينا محمد صلى الله عليه وعلىٰ آله وسلم ، أمابعد!

رابطۂ عالم اسلامی کی **مجمع الفقهي الاسلامي** کا دسواں اجلاس مکہ مکرمہ میں ۲۴ر صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۹۸۷ء بروز ہفتہ سے ۲۸ر صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۱ر اکتوبر ۱۹۸۷ء بروز چہارشنبہ تک منعقد ہوا۔اس اجلاس میں مشہور فقہی مذاہب (حنفیہ،شافعیہ،مالکیہ اور حنبلیہ) کے اختلافات زیر بحث آئے ، اور بعض لوگوں نے اپنے مسلک کے سلسلے میں جو شدید اور نا روا تعصب اختیار کررکھا ہے،جس کی بنیاد غلو،اور حد اعتدال سے خروج ہے ، اور اس کی وجہ سے دوسرے مذاہب کواور ان کے علماء کوطعن کا نشانہ بناتے ہیں،اجلاس نے اس کی وجہ سے پیدا شدہ ان مشکلات اور پیچیدگیوں کا بھی جائزہ لیا،جس میں نئی نسل (جوان فقہی اختلاف کی بنیادوں اور

ان حکمتوں سے واقف نہیں ہے) مبتلا ہورہی ہے، اور انھیں گمراہ کیا جارہا ہے کہ جب شریعت اسلامی ایک ہے، اس کے اصول، جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں، ایک ہیں تو پھر مذاہب فقہیہ کا یہ اختلاف کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ تمام اہل اسلام ایک مذہب اور ایک فہم واجتہاد کے پیرو ہو جاتے۔

اجلاس نے اس تعصب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ان دشواریوں پر بھی غور کیا، جس کا سبب آج کل کے بعض نومولود افکار ونظریات بن رہے ہیں، ان افکار ونظریات کے حاملین عام مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسی نئے مسلک کو اختیار کریں، اور وہ مذاہب اور طریقے جو صدیوں سے قائم اور رائج ہیں، جنھیں ابتداء ہی سے امت میں قبول عام حاصل ہے، ان پر اور ان کے ائمہ پر وہ طعنہ زنی کرتے ہیں، اور بعض تو انھیں گمراہ قرار دے کر لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرتے ہیں۔

اجلاس نے اس موضوع پر بسط وتفصیل سے تبادلۂ خیال کیا، اور اس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے واقعات وحوادث، عواقب ونتائج اور تضلیل وفتنہ اندازی کا تفصیلی جائزہ لیا، اور ان متعصب اور گمراہ کن فرقوں کے حق میں درج ذیل قرارداد منظور کی۔

(۱) اختلاف مذاہب

فکری ونظریاتی مذاہب کے اختلاف، جو ممالک اسلامیہ میں موجود ہیں، وہ دو قسم کے ہیں۔

(الف) اعتقادی مذاہب کا اختلاف۔(ب) فقہی مذاہب کا اختلاف۔

اعتقادی اختلافات درحقیقت مصیبت ہیں جو ممالک اسلامیہ میں ہولناک حوادث کے سبب بنے ہیں، ان سے مسلمانوں کی صف میں انتشار پیدا ہوا ہے، ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوا ہے یہ اختلاف افسوسناک ہے، اور نہیں ہونا چاہئے، اس باب میں ضروری ہے کہ امت اہل سنت والجماعت کی راہ پر قائم رہے، جو اس صاف ستھرے افکار ونظریات اسلامی کی نمائندہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اور حضرات خلفاء راشدین کے عہد میں تھے، خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا اعلان ہے کہ ان کی سنت، خود رسول اکرم ﷺ کی سنت میں داخل ہے،

فرمایا: **علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ** ، تم میری سنت کواور میرے بعد خلفاء راشدین کولازم سمجھو،اس پر مضبوطی سے جمے رہواور دانتوں سے پکڑلو۔

اور رہا دوسرا اختلاف یعنی مختلف فقہی مذاہب کا بعض مسائل میں اختلاف! تو اس کے کچھ علمی اسباب ہیں،جن کی وجہ سے یہ اختلاف ہوا ہے،اوراس میں حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہے، اس میں بندگان خدا پر رحمت کا سامان ہے،اورنصوص سے استنباط احکام کی توسیع ہے،علاوہ ازیں یہ ایک زبردست فقہی نعمت وثروت ہے، جس سے امت اسلامیہ کو دینی وشرعی امور میں بڑی وسعت اور گنجائش حاصل ہوتی ہے،اس اختلاف کی وجہ سے امت کو یہ آسانی ہے کہ سب کو کسی ایک مکتب فکر کا پابند ہونا ضروری نہیں ہے کہ اس سے ادھر ادھر ہٹنا قطعاً جائز نہ ہو، بلکہ یہ سہولت حاصل ہے کہ جب کسی وقت کسی خاص معاملہ میں کسی ایک طریقۂ فکر میں تنگی اور دشواری ہوتی ہے،تو دوسرے مذاہب فکر واجتہاد میں سہولت اور گنجائش دستیاب ہوجاتی ہے،خواہ عبادات میں ہو یا معاملات میں، عائلی مسائل ہوں، یا عدالتی اور جنایات کے معاملات! دلائل شرع کی روشنی میں سہولت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

اختلاف کی یہ دوسری قسم نہ کوئی عیب ہے،اور نہ ہمارے دین میں اس سے کوئی تناقض لازم آتا ہے،اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ اختلاف نہ ہوتا،کوئی بھی امت ہو جس میں شریعت کا کامل نظام ہواوراس میں فقہ واجتہاد کا دخل ہو،ممکن نہیں کہ اس میں اجتہادی اختلافات نہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان اجتہادی اختلافات کا نہ ہونا ممکن ہی نہیں ، کیونکہ قرآن وسنت کے بنیادی نصوص، بسا وقات ایک معنی سے زیادہ کا احتمال رکھتے ہیں،اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ نصوص،تمام محتمل وقائع کا احاطہ نہیں کرتے ، کیونکہ نصوص محدود ہیں اور وقائع غیر محدود ہیں...... چنانچہ علماء نے اس کی تصریح کی ہے......اس لئے ناگزیر ہے کہ قیاس سے کام لیا جائے،احکام کی علتوں پرغور کیا جائے،شارع کی غرض کوسمجھا جائے،شریعت کے مقاصد عامہ کا لحاظ کیا جائے،اور بدلتے ہوئے حالات اور نئے نئے واقعات میں ان کی طرف رجوع کیا جائے،اسی مقام پر علماء کی فہم میں اور متعدد احتمالات کے درمیان کسی ایک کو ترجیح دینے میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، پھر ایک ہی موضوع میں احکام مختلف ہوجاتے ہیں،جبکہ ہر ایک بجائے خود حق وصداقت کا ہی ارادہ

کرتا ہے، اور اسی کو تلاش کرتا ہے، تو جو شخص صحیح فیصلے پر پہونچا، اس کے لئے دو اجر ہیں، اور جو شخص چوک گیا، اس کے لئے ایک اجر ہے، اور اس بنیاد پر احکام میں گنجائش ملتی ہے، اور تنگی ختم ہوتی ہے، تو اس فقہی اختلاف میں عیب کیونکر ہے، جبکہ ہم نے اس کے اندر جو خیر ہے اسے واضح کر دیا ہے، اور واقعہ یہی ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے اہل ایمان پر ایک رحمت ہے اور اسی کے ساتھ ایک بڑا شرعی وفقہی سرمایہ ہے، جس پر امت اسلامیہ فخر کرے تو بجا ہے۔

لیکن وہ دشمنان دین (یہود ونصاریٰ) جو ملت اسلامیہ کو گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، جن کے پاس ہماری ملت کے نوجوان جدید تعلیم حاصل کرنے کیلئے پہونچتے ہیں، ان کا منصوبہ یہی ہے کہ ان نوجوانوں کا تعلق اسلامی تہذیب سے کمزور سے کمزور تر کر دیں، وہ مذاہب فقہیہ کے اختلاف کو اس طرح بیان کرتے ہین جیسے وہ اعتقادی اختلاف ہوں، اور غلط سلط نتائج کا استنباط کر کے احکام شرعیہ میں تناقض اور تضاد کو ظاہر کرتے ہیں، وہ اس نکتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تضاد نہیں تنوع ہے۔

رہی اس فرقہ کی بات جو تمام مذاہب فقہیہ کو ترک کر کے ایک نئے نقطۂ اجتہاد پر سب کو آنے کی دعوت دیتا ہے اور مشہور فقہی مسالک پر زبان طعن دراز کرتا ہے اور ان ائمہ کے بارے میں نامناسب باتیں کرتا ہے تو ہم نے ابھی مذاہب فقہیہ اور ان کے ائمہ کے امتیازات و خصوصیات میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس کی روشنی میں ضروری ہے کہ وہ اس برے لب ولہجہ سے باز آئے جس میں وہ مبتلا ہے اور جس سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرتا ہے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرتا ہے، جبکہ موجودہ دور میں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دشمنان اسلام کی طرف سے اسلامی احکام وتعلیمات پر جو مسلسل حملے ہو رہے ہیں ان کے مقابلے کے لئے زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا کیا جائے نہ کہ تفرق وانتشار کی یہ خطرناک دعوت دی جائے۔

ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (نائب صدر) عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (صدر مجلس) محمد بن جبیر ڈاکٹر بکر عبداللہ ابوزید۔ عبداللہ عبدالرحمٰن البسام۔ صالح بن فوزان بن عبداللہ الفوزان۔ محمد بن عبداللہ سبیل۔ مصطفیٰ احمد الزرقاء۔ محمد محمود الصواف۔ ابوالحسن علی الحسنی الندوی۔ محمد رشید راغب قبانی

☆☆☆☆☆☆

سبیل المومنین سے انحراف

دین اسلام ایک مکمل اور نا قابل ترمیم دین ہے، علم کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی، نہ اس کے علمی حصار میں کسی اجنبی نظریہ اور اجنبی علم کے گھسنے کی کوئی راہ ہے، اور نہ اس کے عملی احاطہ میں کوئی دوسرا عمل دراندازی کرسکتا ہے، یہاں ہر علم اور نظریہ واضح اور منقح ہے، نیز ہر عمل معلوم اور متعین ہے، علم اور اعتقاد کی راہ سے اگر کوئی چیز اس میں گھسنے کی کوشش کرتی ہے تو اس پر بدعت اور ضلالت کی مہر لگ جاتی ہے، اور اسے نکال باہر کیا جاتا، اور اگر عمل کی راہ سے کوئی اجنبی داخل ہوتا ہے تو وہ بدعت اور فسق قرار پاکر رد ہوجاتا ہے۔ حق تعالی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولی ونصله جهنم وساء ت مصیراً (سورہ نساء: آیت: ۱۱۵)

اور کوئی رسول کے خلاف چلے جب کہ اس کے سامنے سیدھی راہ کھل چکی، اور سب مسلمانوں کی راہ سے ہٹ کر چلے تو ہم اس کے حوالے وہی راہ کردیں گے جس پر وہ چلا ہے، اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول کے واسطے سے اللہ تعالی نے دین کی جو علمی اور عملی راہ متعین کردی ہے اور جس پر سب اہل ایمان چل رہے ہیں، اس سے انحراف کرنا خطرناک ہے، اگر کسی نے کہیں کہیں انحراف کیا، تھوڑی بہت کجی اختیار کی، وہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہے، قرآن وسنت اور جمہور امت سے ہلکا سا انحراف بھی آدمی کے لئے سخت اندیشے کا باعث ہے۔ گناہ کو گناہ سمجھتے ہوئے اگر اس میں کوئی ملوث ہوتا ہے تو وہ نہ گمراہ ہوتا ہے اور نہ دوسرے اس سے دھوکہ کھاتے ہیں، وہ بھی جانتا ہے اور لوگ بھی جانتے ہیں کہ وہ گناہ کررہا ہے، لیکن اگر کوئی شخص علم

وتحقیق کے نام پر صراط مستقیم سے انحراف کرتا ہے،اور اپنے زوردماغ سے اسے دین حق کی ترجمانی اوراس کی شرح قرار دینے کی سعی کرتا ہے تو وہ خود بھی گمراہی کا شکار ہوتا ہے اور دوسرے لوگ بھی دھوکہ کھاتے ہیں، کیوں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے یا کرر ہا ہے، اسے دین کی ترجمانی اوراس کی شرح قرار دے رہا ہے۔ گناہ سے نکلنا آسان ہے مگر اس ''جہل'' سے نکلنا مشکل ہے، اس لئے صاف ستھری راہ یہ ہے کہ جس راہ پر تمام امت چلی ہے، علما وصلحا چلے ہیں، فقہا ومحدثین چلے ہیں، جو راہ روشن اور نمایاں ہے، جس کا ایک ایک مرحلہ اور ایک ایک منزل متعین ہے، جسے سب پہچانتے ہیں، اس پر اپنے قلب اور قدم کو استوار رکھا جائے، ورنہ زندگی کا کارواں اور علم وعمل کا قافلہ کہاں جا پہونچے گا؟ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ انحراف خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، وہ انحراف ہے اور پرخطر ہے۔

ہم اپنے اس دور میں فتنوں کے تماشے دیکھ رہے ہیں، ایک ذہین اور صاحب دماغ آدمی اٹھتا ہے، اس کی طبیعت تقلید واتباع سے انکار کرتی ہے، اسے وہ اپنے رتبے سے کمتر سمجھتا ہے تو اپنی ایک نئی راہ نکالتا ہے، اور عام مسلمانوں کے طریقے سے قدرے ہٹ جاتا ہے، بعض اوقات وہ نئی راہ معصوم اور بے ضرر معلوم ہوتی ہے، دیدہ ورعلما بھی اسے نظر انداز کردیتے ہیں، لیکن وہ راہ جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے احساس ہوتا ہے کہ دین سے الگ راہ بنتی جارہی ہے، پھر اس پر ٹوکتے ہیں تو ایک فتنہ کی صورت برپا ہوتی ہے، اور اس فتنے کی نسبت اس شخص اور اس طبقہ کی طرف کردی جاتی ہے، جس نے انحراف کو انحراف کہا، کج روی کو کج روی بتایا، حالانکہ کجی دوسری طرف ہے، اور یہ دنیا کی پرانی ریت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک عرصہ کے جمے جمائے کفر وشرک پر قوم کو ٹوکا تو قوم نے آپ ﷺ کی دعوت کو فتنہ اور قطع رحمی سے تعبیر کیا، اور اس کے ماننے والوں کو'' فتنہ زدہ اور بے وقوف'' قرار دیا، لیکن اس سے قطع نظر جو صحیح راہ ہے اسے واضح کردینا ضروری ہے، ورنہ دین اور بدعت میں ایسا التباس ہوگا کہ کچھ امتیاز نہ ہوسکے گا کہ دین کیا ہے؟ اور بدعت کیا ہے؟۔

دین اسلام چونکہ آخری دین ہے، اس لئے اس کے اردگرد ایسے اصول وقواعد کا حصار ہے کہ ہر اجنبی علم وعمل کی حیثیت یہاں متعین ہوجاتی ہے، ورنہ دوسرے آسمانی مذاہب انہیں فکری وعملی بدعات اور گمراہیوں میں پھنس کر غلطیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئے ہیں، عام علمی اور عملی گمراہیوں

کوتو چھوڑ یئے ،شرک جیسی نا قابل معافی معصیت ان مذاہب کا بنیادی جز بن گئی ہیں۔

دین اسلام میں بھی یہ تماشے چلتے رہتے ہیں لیکن ہر زمانے میں علماء اہل حق گمراہی اور بدعت کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں،خواہ وہ معمولی حیثیت کی گمراہی ہو یا غیر معمولی!

ابھی کچھ دنوں پہلے ایک ذہین وذکی صاحب علم اور نامور اور غیر معمولی خطیب مولانا سید سلمان صاحب ندوی کی زبان سے اسی طرح کا علمی اور فکری انحراف سننے میں آیا، جوان کے زورزبان اور بظاہر علمی واستدلالی رنگ میں ہونے کی وجہ سے لوگوں کو بھلا معلوم ہوا،مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اب تک جس راہ پر چلتے آرہے ہیں،اس سے ہٹا ہوا راستہ انہوں نے دکھانے اور اس پر چلانے کی کوشش وسعی کی ہے،انہوں نے دعوی کیا کہ ''علم دین'' صرف وہی نہیں ہے جسے اب تک علما علم دین قرار دیتے چلے آرہے ہیں،یعنی قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ کا علم! بلکہ علم دین کا دائرہ بہت وسیع ہے،اس دائرے میں وہ علوم بھی آتے ہیں جنہیں لوگ غلط فہمی سے ''علم دنیا'' سمجھتے ہیں،انجینئری،ڈاکٹری،سائنس اور اس کے مختلف شعبے حتی کہ صنعتیں مثلاً بڑھئی گری، لوہاری،سناری،معماری،وغیرہ کی صنعتیں یہ سب علم دین کے زمرے میں آتی ہیں۔اس کی تائید میں انہوں نے قرآن کی آیتیں پیش کیں،لیکن ان آیتوں نے ان کے دعوی کی جب تصدیق نہیں کی تو تفسیر بالرائے کے ذریعے ان سے اپنے دعووں کی تصدیق حاصل کرنی چاہی،کہیں آیت کے ترجمہ میں طبع زاد اضافہ کردیا،بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ قرآن سے استدلال کررہے ہیں مگر فی الحقیقت ان کا استدلال ان کی اپنی رائے ہوا ہے۔

انہوں نے ہمارے مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور اعظم گڑھ کے سالانہ جلسے میں ایک مجمع کثیر میں ''گل افشانئ گفتار'' کا نمونہ دکھایا،انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز اس نکتہ سے کیا کہ یہ مدرسہ ''احیاء العلوم'' ہے،جس کا مطلب یہ ہے کہ اس مدرسہ کو ''العلوم'' کے احیاء کے لئے قائم کیا گیا ہے، ''العلوم'' سے مراد ہے دینی اور انبیائی علوم ،انہیں زندہ کرنا ہے، پھر انہوں نے بتایا کہ ''دین'' کی تشریح مشہور حدیث جبریل سے ہوتی ہے،حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے وصال سے کچھ پہلے اجنبی بن کر آپ کی مجلس میں آئے،اور پوچھا۔ ما الاسلام؟ اسلام کیا ہے؟ ما الایمان؟ ایمان کیا ہے؟ ما الاحسان؟ احسان کیا ہے؟ آپ نے تینوں سوالوں کے

جواب بہت وضاحت کے ساتھ دیئے، وہ چلے گئے تو آپ نے فرمایا کہ پوچھنے والے کو واپس بلاؤ، لوگوں نے تلاش کیا تو نہیں ملے، فرمایا وہ جبرئیل تھے، تم کو تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایمان اور احسان کے مجموعے کا نام ''الدین'' ہے، اس دین تک پہونچنے کا راستہ کیا ہے؟ اللہ تعالی نے اس کی راہنمائی ان آیات میں کی ہے جو بالکل آغاز نبوت میں نازل ہوئی تھیں۔ یعنی

اقرأ باسم ربک الذی خلق ،خلق الانسان من علق،اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم ،علم الانسان مالم یعلم.

پڑھو اپنے رب کے نام سے لگ لپٹ کر، جس نے پیدا کیا انسان کو جونک جیسے جمے ہوئے خون سے، پڑھ اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اور دوسری جگہ اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کے کارہائے نبوت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلو علیکم آیاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمة ویعلمکم ما لم تکونوا تعلمون.

جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہارے ہی درمیان سے بھیجا، وہ تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے، اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے، اور تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور وہ سب کچھ تم کو سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ جو کچھ انسان نہیں جانتا تھا، اللہ تعالی نے اسے وہ سب کچھ سکھا دیا ہے، اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ جو کچھ پڑھے اللہ کے نام سے لگ لپٹ کر پڑھے، جو کچھ بھی اس طرح پڑھا جائے گا وہ سب ''العلوم'' میں داخل ہوگا۔

دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبر ﷺ کا منصب جہاں یہ ہے کہ وہ ''تلاوت آیات'' کریں، ''تزکیہ نفوس'' کریں، کتاب وحکمت کی تعلیم دیں، اسی طرح ان کا منصب یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں وہ سب کچھ سکھائیں جو تم نہیں جانتے، یعنی دنیوی علوم وفنون، جن کا تعلق اسباب دنیا سے

ہے، جن کی ضرورت انسانی زندگی میں ہوتی ہے، آلاتِ جنگ وغیرہ بنانے کا علم، جن سے اقوام و ممالک کو فتح اور زیر کیا جائے وغیرہ۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ علوم دین صرف اتنے ہی میں منحصر نہیں ہیں جو ہمارے مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں، ہم نے ایک عرصہ کی غلامی کے نتیجے میں 'العلوم' کو تفسیر و حدیث اور فقہ میں محدود کر دیا ہے، ورنہ انبیائی علوم کا دائرہ بہت وسیع ہے، ہم نے اس وسیع دائرہ کے ایک بہت مختصر جز کو لے لیا اور باقی علوم کو اس دائرے سے خارج کر دیا ہے۔

موصوف نے مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کی ذات گرامی کو پیش کیا کہ انہیں اللہ تعالی نے کشتی بنانے کا حکم دیا، چنانچہ وہ ایک ماہر کاریگر تھے، وہ کشتی بنانے کا فن جانتے تھے، انہوں نے اللہ تعالی کی نگرانی میں ایک عظیم الشان کشتی بنائی، معلوم ہوا کہ یہ فن بھی انبیائی علوم کے دائرے میں آتا ہے، مگر ہم نے اسے بھی دوسروں کے حوالے کر رکھا ہے۔

پھر انہوں نے حضرت داوٗد علیہ السلام کا اسم گرامی پیش کیا، اللہ تعالی نے فرمایا۔ ''وَ اَلَنّا لہ الحدید'' ہم نے ان کے لئے لوہا نرم کر دیا۔ موصوف نے کہا کہ لوہے کو نرم کرنے کا مطلب شعبداتی ذہن اور کراماتی مزاج رکھنے والوں کے نزدیک یہ ہے لوہا ان کے ہاتھ میں آ کر موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا، اور وہ اسے جس طرح چاہتے تھے موڑ دیتے تھے۔ مگر یہ غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بڑی بڑی بھٹیاں لوہے کو تپانے اور گلانے کے لئے بنا رکھی تھیں، ان میں لوہا گلا کر زر ہیں بنائی جاتی تھیں، اور ہتھیار ڈھالے جاتے تھے، یہ فن حضرت داوٗد علیہ السلام پر اللہ تعالی نے نازل فرمایا تھا، پس یہ انبیائی علوم میں شامل ہے جس کا احیاء کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

پھر انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر چھیڑا کہ وہ جناتوں سے بڑی بڑی بلڈنگیں، مجسمے، کوہ پیکر دیگیں اور لگن بنوایا کرتے تھے، ان کے پاس ایک زبردست بحری بیڑہ تھا جس کی رفتار صبح و شام ایک ایک ماہ کی مسافت کے بقدر تھی۔ غدوها شهر ورواهها شهر

بلڈنگوں کی تعمیر، مجسموں کی صنعت، لگن اور دیگیں بنانے کا فن اور بحری بیڑے بنانے کی تکنیک یہ سب انبیائی علوم میں شامل ہیں، پھر آخر میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا کہ آپ کے پاس وہ سب ہتھیار تھے جو دوسروں کے پاس تھے، بلکہ وہ ہتھیار بھی تھے جو اوروں کے پاس نہ تھے

چنانچہ منجنیق اور دبابہ کو آپ نے غزوہ طائف میں استعمال کیا تھا، یہ ہتھیار عربوں کے پاس نہ تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلحہ سازی کا فن انبیائی علوم میں داخل ہے، ہم نے غلطی سے اپنا دائرہ محدود کر کے علوم دینیہ کو چند علوم میں منحصر کر دیا ہے، یہ بہت بڑی غلطی ہے، انہیں علوم کے فقدان نے ہم کو دنیا میں ذلیل اور شکست سے دوچار کر رکھا ہے، ہمارے علما نے غلطی سے علوم دینیہ کو صرف انہیں چیزوں میں محدود کر دیا ہے جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، حالانکہ وہ علوم بھی انبیائی علوم ہیں جنہیں ہم نے کالجوں، یونیورسٹیوں کے حوالے کر دیا ہے، اور جنہیں ہم دنیاوی علوم کہتے ہیں، ان سب کو ہمارے دائرۂ عمل میں آنا چاہئے، ہماری ذلت کا ایک بڑا سبب یہ علوم دین اور علوم دنیا کی تفریق ہے۔

یہ ہے ندوی صاحب کی تقریر کا حاصل جس کو انہوں نے تفصیل کے ساتھ خطیبانہ آہنگ میں بیان کیا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ ندوی صاحب کا دعویٰ بھی غلط ہے اور ان کا استدلال بھی غلط در غلط ہے، اختصار کے ساتھ قدرے تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) یہ دعوی کے انبیائی علوم اور دینی علوم کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں دنیاوی علوم وفنون بھی شامل ہیں، ایک ایسا دعوی ہے جو علمائے امت میں اب تک کسی نے نہیں کیا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ انبیاء علیہ السلام جو علوم اللہ کے پاس لائے ہیں اور جس کی انہوں نے دعوت دی ہے، وہ علوم ہیں جن سے بندوں کا ربط اللہ تعالی کے ساتھ درست اور استوار ہو، چنانچہ حدیث جبرئیل علیہ السلام میں رسول اللہ ﷺ نے تینوں سوالات کے جو جوابات دیئے ہیں جن کے مجموعے کو موصوف نے بھی ''الدین'' ہونے کا اعتراف کیا ہے، اس میں کہیں دنیاوی علوم کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ہے۔

اسلام کیا ہے؟ کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، اور زکوۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو، اور اگر استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو''۔
(الاسلام ان تشهد ان لااله الا الله وان محمداً رسول الله، وتقيم الصلوٰة، وتوتی الزکوٰة، وتصوم رمضان، وتحج البیت ان استطاع الیه سبیلاً)

اور ایمان کیا ہے؟ کے جواب میں آپ نے فرمایا: ''اللہ پر ایمان لاؤ، اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ، نیز تقدیر پر اس کے خیر وشر پر ایمان لاؤ''۔ (**ان تومن بالله وملئکته وکتبه ورسله واليوم الآخر وتومن بالقدر خيره وشره**)

اور احسان کیا ہے؟ کے جواب میں فرمایا: کہ ''اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ (**ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك**)

اس مجموعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین کا مقصد یہ ہے کہ بندوں کا اللہ سے ربط صحیح ہو، اس مقصد سے متعلق جو علوم ہوں گے وہی علوم دین ہوں گے، اس پر تمام امت کا اجماع ہے، اب تک امت میں کسی معتبر عالم نے ان علوم دنیا کو جنہیں موصوف نے علوم دین میں داخل کرنا چاہا ہے، اور جن کے اختیار نہ کرنے کو علما کی غلطی قرار دیا ہے، دینی علوم میں شامل نہیں کیا ہے، پس یہ بنیاد اور مقصد ہی سرے غلط ہے، بلکہ گمراہ کن ہے۔

رہی یہ بات کہ **علم الانسان مالم يعلم** (انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا) اور **یعلمکم مالم تکونوا تعلمون** (تم کو وہ سب کچھ سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے) تو یہ قرآن کے ترجمے میں اپنی رائے سے بغیر کسی دلیل کے ایک بے جا اضافہ ہے، ان دونوں آیتوں میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ ''سب کچھ'' کیا جائے، اسی ''سب کچھ'' سے موصوف نے استدلال کیا ہے کہ تمام علوم وفنون انبیائی علوم کے دائرے میں آتے ہیں، یہ ''سب کچھ'' قرآن میں نہیں ہے، کیوں کہ ''مــا'' اگر چہ عام ہے، مگر وہ اثبات میں استغراق کے لئے نہیں آتا، یعنی ''سب کچھ'' اس کے عموم میں شامل نہیں ہوتا، اور موصوف کے استدلال کی بنیاد یہی ''سب کچھ'' ہے، پس یہ استدلال قرآن سے نہیں، ان کی اپنی رائے سے ہے، مگر ان کے بیان سے ایسا تأثر ہوتا ہے جیسے وہ قرآن ہی سے استدلال کر رہے ہیں۔

علما جانتے ہیں استدلال کی یہ فنکاری کن لوگوں کا شیوہ ہے۔ **وان منهم لفريقا يلوون السنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتاب وماهو من الكتاب ويقولون هو**

من عندالله وماهو من عندالله ويقولون على الله الكذب وهم يعلمون. اوران میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کتاب کو پڑھنے میں زبان کو توڑتے مروڑتے ہیں، تاکہ تم یہ سمجھو کہ یہ بات بھی کتاب ہی کی ہے، حالانکہ کتاب سے اس کا تعلق نہیں ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے، اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وما اوتيتم من العلم الاقليلاً.** علم کا بہت تھوڑا حصہ تمہیں دیا گیا ہے، لیکن موصوف فرماتے ہیں کہ اللہ نے وہ سب کچھ سکھایا جو انسان نہیں جانتا تھا۔ کتنا فرق ہے کلام الٰہی میں اور دعویٰ انسانی میں؟!

حضرت نوح علیہ السلام نے بے شک کشتی بنائی تھی، اور اللہ کے حکم سے بنائی تھی، اس کے بنانے کی ضرورت تھی، عذاب الٰہی آنے والا تھا، اس سے حفاظت کے لئے بنائی تھی، لیکن کیا کسی اشارے سے بھی یہ بات ملتی ہے کہ کشتی بنانے کا فن کوئی دینی اور انبیائی علم ہے؟ کیا حضرت نوح علیہ السلام نے یا ان کے بعد کسی بھی نبی نے اپنی امت میں بطور علم دین کے اس کو رواج دیا؟ یا اس کی ترغیب دی؟ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال تک اپنی قوم کو دین کی دعوت دی تھی، کیا اس دعوت کا کوئی جزیہ بھی تھا کہ فن کشتی سازی سیکھو؟۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے اللہ نے لوہا نرم کر دیا تھا، یہ ان کا معجزہ تھا، شعبداتی اور کراماتی ذہن والوں سے نہیں، متعدد تابعین جن میں حضرت حسن بصری، قتادہ اور اعمش شامل ہیں، مروی ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں آکر نرم ہو جاتا تھا۔ (دیکھئے تفسیر ابن کثیر) اور اگر لوہا ان کے ہاتھ میں نرم ہونے سے یہی مراد ہے کہ وہ لوہے کو بھٹیوں میں پگھلاتے تھے، اس مقصد کے لئے انہوں نے بھٹیاں بنوا رکھی تھیں، تو یہ ان کی کون سی خاص بات ہے؟ جس کو اللہ تعالیٰ نے اتنے اہتمام سے بطور احسان کے بیان کیا ہے، اس طرح کی چھوٹی بڑی بھٹی تو ہر لوہار کے پاس ہوتی ہے۔ داؤد علیہ السلام کے زمانے سے پہلے بھی ہوا کرتی تھی، کیونکہ لوہے کے ہتھیاروں کا استعمال بہت پہلے سے عام ہے۔ قرآن کی شہادت ہے کہ داؤد علیہ السلام سے صدیوں پہلے یوسف علیہ السلام کے دور میں زنان مصر کے پاس چھریاں تھیں جن سے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، ظاہر ہے کہ بغیر ان بھٹیوں کے جن میں لوہا تپایا اور گلایا جائے، چھری بنانے کی کوئی اور صورت

نہیں ہے، یہ ساری افسانہ طرازی انہوں نے اسلحہ سازی کے فن کو دینی علوم میں شامل کرنے کی غرض سے کی ہے، مگر دونوں باتیں غلط ہیں، اس فن کو علوم دین میں شامل کرنا بھی، اور یہ افسانہ طرازی بھی!

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلاشبہ جنات سے کام لیا، ان سے بلڈنگیں تعمیر کرائیں مجسمے بنوائے، لگن اور دیگیں ڈھلوائیں، لیکن کیا اس سے اشارۃً بھی کوئی ثبوت ملتا ہے کہ یہ فن علوم دین میں شامل ہیں، اور اس کا براہ راست دین سے کوئی تعلق ہے؟ ہاں ان کے اس استدلالی منطق سے اگر کوئی چاہے تو یہ ثابت کرسکتا ہے کہ جنات کو مسخر کرنے اور ان کو اپنے کاموں میں استعمال کرنے کا فن البتہ دینی اور انبیائی علم ہے، کیوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات مسخر تھے، اور وہ ان سے کام لیا کرتے تھے، مگر وہ شاید اس کو پسند نہ کریں۔

اور تخت سلیمانی کے بارے میں مولانا موصوف نے مولانا مودودی صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تقلید میں ایک نیا انکشاف کیا ہے، جس کا شاید اب تک کسی کو علم نہ رہا ہو کہ وہ ایک زبردست بحری بیڑہ تھا جو سمندروں میں گشت کرتا پھرتا تھا۔ کاش اس کے لئے موصوف کوئی دلیل پیش کئے ہوتے!۔

رسول اللہ ﷺ نے یقیناً غزوۂ طائف میں منجنیق کا استعمال فرمایا تھا مگر ہمارے ناقص علم میں اب تک یہ بات نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اسلحہ سازی کو علم دین قرار دیا ہو، یا بطور علم دین کے اس کی ترغیب دی ہو، یا کم از کم اس کے لئے کوئی کارخانہ بنایا ہو، ضرورت کے بقدر ہتھیار مہیا کرنا، دشمنوں سے مقابلہ کی تیاری کرنا، اس کے ذرائع ووسائل فراہم کرنا لاریب کہ مطلوب ہے مگر اسلحہ سازی کو دینی علوم کی حیثیت دیدی جائے، اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

ضرورت کی چیزیں ضرورت کے لئے ہوتی ہیں، وہ مقاصد نہیں ہوتیں، کھانے پکانے کا فن، کپڑا سینے کا فن ایک انسانی ضرورت ہے، مگر ان فنون کو دینی علوم قرار دینا ستم ظریفی ہے!!

ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت سے بڑی مصیبت آئی جب سے علم کو تقسیم کردیا گیا، یہ ایک مجمل بات ہے، اللہ جانے اس کا مطلب کیا ہے؟ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ علم کی جتنی شاخیں ہیں، سب دین کے دائرے میں آتی ہیں، اور سب کو حاصل کرنے اور ان کے لئے جد جہد

کرنے کی فضیلت یکساں ہے۔اگر یہی مطلب ہے تو بالکل غلط ،قرآن وسنت کے خلاف اور اجماع امت سے بغاوت ہے،اور اگر اس کا کوئی اور مطلب ہے تو اسے واضح کرنا چاہئے ،مولانا کی تقریر دل پذیر سے وہی مطلب واضح ہوتا ہے جو ہم نے سمجھا ہے اور جسے اوپر لکھا ہے،لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر غلط بات ایک ہوش مند عالم کی زبان سے کیوں کر نکلی؟اسی لئے رہ رہ کر شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی اور مطلب تو نہیں ہے؟لیکن اگر کوئی اور مطلب ہے تو اس کے لئے جوانہوں نے تعبیر اختیار کی ہے،نہایت گمراہ کن ہے۔

اس مسئلہ پر میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے دو بزرگ علما کی تحریر سے استفادہ کروں گا،ایک بزرگ مشہور صاحب تصانیف محدث اور امام ابوعمر یوسف بن عبدالبر اندلسی متوفی ۴۶۳ھ ہیں،ان کی مشہور و معتبر تصنیف ''جامع بیان العلم وفضلہ'' ہے،اس میں انہوں نے علوم کی قسموں سے تفصیلی بحث کی ہے،ہم اس کی تلخیص اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں،اصحاب علم و تحقیق اصل کی طرف مراجعت کرلیں،فرماتے ہیں:

''تمام اصحاب دین کے نزدیک علوم کی تین قسمیں ہیں(۱)علم اعلی(۲)علم اوسط (۳)علم اسفل۔علم اعلی ان کے نزدیک دین کا علم ہے،جس میں اپنی مرضی اور اپنی رائے سے کسی کو کلام کرنا درست نہیں ہے،اس میں وہی کلام درست ہے جو وحی الٰہی سے استناد رکھتا ہو،خواہ وہ وحی الٰہی کتاب اللہ کی صورت میں ہو یا اسے انبیاء کی زبان پر ظاہر کیا گیا ہو۔علم اوسط دنیاوی علوم ہیں،جن کی معرفت ان کی نظیروں سے ہوتی ہے،اور جن پر نوع اور جنس وغیرہ سے استدلال کیا جاتا ہے،جیسے علم طب، ہندسہ، ریاضی وغیرہ۔علم اسفل صنعتوں کے علوم ہیں،جیسے حدادی، خیاطی وغیرہ،ان علوم کا تعلق زیادہ تر جسمانی اعمال سے ہے۔پھر انہوں نے علم اوسط تحت نجوم کو ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے فلک کی گردش،طلوع وغروب کے اوقات ، دن رات کے اوقات کی کمی وزیادتی کا پتہ چلتا ہے،نماز اور عبادات کے اوقات کا تعین ہوتا ہے، اس لحاظ سے ایک مفید اور دین کے لئے مددگار علم ہے،لیکن اس کا ایک پہلو اور ہے،اور وہ یہ کہ اس علم سے بعض لوگ غیب کی باتوں کے جاننے اور بتانے کا دعوی کرنے لگتے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے،غیب کا علم اللہ کے علاوہ کوئی نہیں رکھتا،علم نجوم کا یہ شعبہ حرام ونا جائز بلکہ شرک ہے،مصنف

نے اپنی سند سے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ "علم نجوم اتنا حاصل کرو جس سے صحرائی اور دریائی راستوں میں اندھیرے میں صحیح راہ پاسکو، اس سے آگے نہ بڑھو"۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ **من اقتبس علماً من النجوم اقتبس شعبةً من السحر زادمازاد.** جس نے علم نجوم کا کوئی حصہ حاصل کیا اس نے سحر کا ایک حصہ حاصل کیا، اور جو کچھ زیادہ حاصل کیا اس نے زیادہ سحر حاصل کیا۔

خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے نجومیوں کے بارے میں فرمایا ہے:
اولئک لا خلاق لهم. ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

حافظ ابن عبدالبر علیہ الرحمہ نے ابواسحاق الکوفی کا ایک قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: علوم تین ہیں، وہ علم جو دنیا کے لئے ہوں، وہ علم جو دنیا وآخرت دونوں کے لئے ہے، اور ایک وہ علم جو دین کے لئے ہے نہ دنیا کے لئے۔

وہ علم جو دنیا کے لئے ہے، وہ علم طب اور علم نجوم ہے، اور وہ علم جو دنیا وآخرت دونوں کے لئے ہے، وہ قرآن وسنت اور فقہ کا علم ہے، جو دنیا وآخرت دونوں جگہ کام دیتا ہے، اور وہ علم جو نہ دنیا کے لئے ہے نہ آخرت کے لئے، وہ علم شعر ہے، اس کی مشغولیت نہ دنیا کے لئے ہے نہ آخرت کے لئے۔

اسی بحث میں علامہ ابن عبدالبر نے مزید لکھا ہے کہ تمام اصحاب ادیان اس بات پر متفق ہیں کہ علم اعلی وہ علم دین ہی ہے، اور اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ دین کی معرفت تین قسموں پر ہے، یعنی علوم دین کی تین قسمیں ہیں، اول خاص ایمان واسلام کی معرفت، اس کا تعلق توحید و اخلاص کی معرفت سے ہے، یہ علم نبی ﷺ سے ہی حاصل ہوسکتا ہے، کیوں کہ وہی اللہ تعالی کی طرف سے اس علم کو پہونچانے والے ہیں، اور قرآن کی آیات میں غور وتدبر سے اس علم تک رسائی ہوسکتی ہے، چنانچہ حق تعالی نے اس کا حکم دیا ہے۔

دوسری قسم دین اور احکام شرع کی خبریں کن واسطوں سے ہم تک پہونچی ہیں، ان کی

معرفت،اس علم کا تعلق نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کی معرفت سے ہے،جن پر اللہ تعالی نے اپنا دین نازل فرمایا،اور پھران لوگوں کی معرفت سے جن کے واسطے سے ہم تک دین پہونچا ہے۔

تیسری قسم سنن وواجبات اور مستحبات وغیرہ احکام کا علم ہے، یہ علم فقہ ہے۔

علوم دین انہیں تینوں کے مجموعے کا نام ہے۔(ج۲ص ۳۷تا۴۰)

علامہ ابن عبدالبر علیہ الرحمہ کی اس گفتگو سے چند باتیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوئیں۔

(۱) اول یہ کہ تمام علوم یکساں نہیں ہیں، بلکہ بنیادی طور پران کی تین قسمیں ہیں،ایک وہ علم جو مرتبہ میں سب سے بلند ہے،اور وہ علم دین ہے۔دوسرے وہ جو بلند اور پست کے درمیان میں ہے،وہ دنیاوی علوم ہیں جن کا تعلق انسانی ذہانت وذکاوت اور تجربوں سے ہے، جیسے علم ریاضی، علم طب، علم ہندسہ اور علم نجوم کے زیادہ تر شعبے۔تیسرے وہ علم جو مرتبہ میں سب سے کمتر ہے، یہ وہ علوم ہیں جن کا تعلق صنعت وحرفت سے ہے، جس میں جسم انسانی کی محنت ومشقت صرف ہوتی ہے، یہ علوم بھی ذہانت وذکاوت سے بے نیاز نہیں ہیں، لیکن ان میں دخل زیادہ تر جسم انسانی کی کارفرمائی کا ہے۔

(۲) یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض علوم سرے سے درست ہی نہیں ہیں جیسے علم نجوم کا وہ شعبہ جس کا تعلق غیب کی خبریں بتانے سے ہے۔

(۳) یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کا انحصار تین علوم میں ہے۔اول توحید واخلاص اور عقائد کی معرفت، یہ علم صرف وحی الٰہی سے حاصل ہوتا ہے، خواہ قرآن سے ہو یا سنت سے۔دوسرے قرآن وسنت کو جن واسطوں سے ہم نے حاصل کیا ہے ان واسطوں کی معرفت، اس کے تحت اصولِ حدیث، علم اسماء الرجال وغیرہ آتے ہیں۔تیسرے احکامِ شرعیہ، فرائض وواجبات سنن و آداب کی معرفت، اس کا تعلق علم فقہ سے ہے۔

انہیں تین طرح کے علوم کو علم دین کہتے ہیں، اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے یہ کسی ایک عالم کی انفرادی رائے نہیں ہے بلکہ اس پر اجماع ہے، کیا اس کے بعد بھی کہا جاسکتا ہے کہ علم ایک اکائی ہے اور یہ کہ صنعت وحرفت وغیرہ بھی انبیائی علوم ہیں، خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ شکل اختیار کر گئے

ہوں۔

اب آیئے امام غزالی علیہ الرحمہ کی خدمت میں چلیں کہ وہ کیا فرماتے ہیں۔ان کا ارشاد ہے کہ علوم کی دو قسمیں ہیں۔علوم شرعیہ اور علوم غیر شرعیہ۔

علوم شرعیہ وہ ہیں جنہیں انبیاء کرام صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہ ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے، انہیں نہ علم حساب کی طرح محض عقل سے حاصل کیا جا سکتا ہے، نہ علم طب کی طرح تجربے سے، اور نہ علم لغت کی طرح محض سماع سے۔

پھر علوم غیر شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔محمود اور مذموم۔

محمود وہ علوم ہیں جن کا دنیا کی مصلحتوں سے تعلق ہوتا ہے، مثلاً علم طب، حساب اور اصول صناعات مثلاً کاشتکاری، کپڑوں کی بنائی وغیرہ۔

اور مذموم جیسے سحر، طلسمات اور شعبدوں کا علم۔

علوم شرعیہ سب محمود ہیں۔علوم شرعیہ کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) اصول: یہ چار ہیں۔کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اجماع امت، آثار صحابہ۔

(۲) فروع: یہ وہ علوم ہیں جو اصول سے مفہوم اور مستنبط ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق دنیا کے مصالح سے ہے، انہیں اصطلاح میں علم فقہ کہا جاتا ہے۔دوسرے وہ جن کا تعلق آخرت کے مصالح سے ہے، وہ احوال قلب، اخلاق محمودہ، اخلاق مذمومہ اور اللہ کی مرضی و نامرضی کا علم ہے۔

(۳) مقدمات: یہ وہ علوم ہیں جو بمنزلہ آلات و وسائل کے ہیں، جیسے علم نحو و صرف، علم لغت، یہ علوم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ تک رسائی کے لئے اسباب و وسائل ہیں، بذات خود علوم دین میں شامل نہیں ہیں لیکن انہیں بھی حاصل کرنا ضروری ہے کیوں کہ ہماری شریعت عربی میں نازل ہوئی ہے۔

(۴) متممات (تکمیلات): یہ وہ علوم ہیں جو قرآن وسنت کے علوم میں حسن اور کمال پیدا کرتے ہیں، چنانچہ علم قرآن میں الفاظ سے متعلق علم، علم قرأت وتجوید ہے، معنی سے متعلق علم تفسیر ہے، احکام سے متعلق ناسخ ومنسوخ، عام وخاص اور نص اور ظاہر کی معرفت ہے، جس کا بیان علم

اصول فقہ میں ہوتا ہے۔

اور علوم سنت کی تکمیلات اسماء الرجال کی معرفت ہے، یہ علوم شرعیہ ہیں۔(احیاء العلوم ۱/۱۶ ملخصاً) پوری تفصیل دیکھنی ہو تو امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم کی پہلی جلد میں ''**بیان العلم الذی ھو فرض کفایۃ**'' کا مطالعہ کریں۔

امام غزالی کے کلام سے بھی ظاہر ہے کہ علوم بنیادی طور پر دو ہیں، علوم شرعیہ وغیر شرعیہ۔ علم کی تقسیم ہر مسلمان کے لئے بدیہی ہے، جس کو ذرا بھی علم اور شعور ہے وہ خوب جانتا ہے کہ دنیا میں علم کے نام سے بے شمار چیزیں جو بکھری ہوئی ہیں، وہ کوئی بھی علم دین نہیں ہے، علم دین وہی ہے جس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، جس کے ادراک میں عقل انسانی ناکافی ہے، باقی دوسرے علوم اگر علم دین کے لئے معین ومددگار یا ضروری ہیں تو وہ علم دین سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کسی درجے میں علوم دین میں شمار ہو سکتے ہیں، اوران کے علاوہ کوئی بھی علم، علم دین نہیں ہے، اس بات کے لئے کسی دلیل اور حوالے کی ضرورت نہ تھی لیکن کیا کیجئے کہ یہ چھوٹی بات ایک بڑے منھ سے نکلی ہے، اس لئے اس تفصیل کی ضرورت پڑی۔

☆☆☆☆☆☆

تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کی شرعی حیثیت

سوال: موجودہ دور میں ایک تبلیغی تحریک ’’تبلیغی جماعت‘‘ کے نام سے تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک ہے، اس کے کثرت شیوع اور ہمہ گیری کے باعث جب مطلق تبلیغ کا نام بولا جاتا ہے تو اس کا اطلاق بے تکلف اسی تحریک پر ہوتا ہے، یہ تحریک چند اعمال واشغال سے مرکب ہے، جنہیں اس کی مجموعی حیثیت میں اجزا ولوازم کی حیثیت حاصل ہے، اور ان پر بے حد التزام و اصرار کیا جاتا ہے، نیز تمام مسلمانوں کو خواہ عالم ہوں یا جاہل، دیندار ہوں یا دین سے دور، سب کو اس میں شرکت اور ان اعمال واشغال پر کاربند ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، اور بشدت اصرار کیا جاتا ہے، اس دعوت واصرار کا اثر یہ ہے کہ عامۃ الناس جو اس میں شریک یا اس کے مؤید ہیں، اس کو اس درجہ ضروری دینی عمل سمجھنے لگے ہیں کہ جو اس میں شریک نہ ہو یا اس سے اختلاف رکھتا ہو وہ نہ صرف یہ ہے کہ مستحق ملامت ہے بلکہ گمراہ اور راہ سے بھٹکا ہوا ہے، حتی کہ جو عالم اپنے اور دینی مشاغل کے باعث اس میں شریک نہیں ہوتے وہ بھی اس حلقہ میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ بہت سے مدارس میں مدرسی کے لئے شرط ہے کہ وہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو، یہ ذہن صرف عوام ہی کا نہیں ہے خواص بھی اپنی تقریروں میں کہیں صراحۃً اور کہیں عالمانہ تعبیرات میں اشارۃً یہ کہتے ہیں کہ ہدایت کا راستہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے، جو کچھ اس کے علاوہ ہے خالی از خطر نہیں۔ یہ تبلیغی حضرات کے ذہن وفکر کا اجمالی خاکہ ہے، ذیل میں ان اعمال واشغال کو لکھا جاتا ہے جن سے اس کی مجموعی صورت مرتب ہوتی ہے۔

(ا) خروج:

یعنی اس تحریک میں شرکت کے لئے گھر چھوڑ کر ایک مدت متعینہ کے لئے باہر نکلنا، سفر

کے اخراجات خود نکلنے والے کے ذمے ہوتے ہیں، اس کو کبھی ہجرت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ ''تفریغِ وقت'' بھی یہی ہے۔

(۲) چلہ:

چالیس روز کے واسطے گھر چھوڑ کر نکلنا، لیکن یہ لفظ بطور عموم کے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں چالیس روز سے کم وبیش مقدار بھی شامل ہے، عامۃ الناس کو ابتداء سال کی دعوت دی جاتی ہے، اس کے بعد ایک چلہ کی، پھر دس دن کی، یہ نہ ہو تو تین روز کی، ورنہ چوبیس گھنٹہ کی، پھر جتنے وقت کے لئے چاہیں۔ اور علما سے ابتداء سات چلہ کا مطالبہ ہوتا ہے۔

(۳) جماعت:

چند افراد پر مشتمل ایک جماعت بنائی جاتی ہے، جس میں ایک امیر ہوتا ہے، باقی مامور، یہ جماعت مخصوص آداب واعمال کے ساتھ قریہ قریہ سفر کرتی رہتی ہے، اس کا قیام ہمیشہ مسجد میں ہوتا ہے۔

(۴) گشت:

یہ تین طرح کا ہوتا ہے۔ (۱) خصوصی (۲) عمومی (۳) تعلیمی

خصوصی کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کے دو یا تین افراد مل کر بااثر اور ذمہ دار قسم کے افراد سے ملاقات کرتے ہیں، اور انہیں تعاون اور شرکت کی دعوت دیتے ہیں، اس تعاون کو اپنی اصطلاح میں ''نصرت'' کہتے ہیں۔

عمومی کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ دن بھر ایک بار پوری جماعت مل کر بستی کے عام افراد سے ملاقات کر کے نماز کی اور اس کے بعد بیانِ تبلیغ میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے، اس گشت میں نکلتے وقت جماعت کے ایک فرد کو مسجد میں دعا کرنے کے لئے متعین کر دیا جاتا ہے، جماعت ہی کا ایک فرد گشت کا امیر اور ایک شخص متکلم مقرر ہو جاتا ہے، اور ایک رہبر بستی کا لے لیا جاتا ہے۔

اور تعلیمی یہ ہے کہ ایک مخصوص وقت میں کتب فضائل جنہیں تبلیغی نصاب کہتے ہیں، پڑھی جاتی ہیں، اس وقت ایک یا دو آدمی بستی کی گلیوں میں اور چوراہوں پر جاتے ہیں، اور جس آدمی کو فارغ دیکھتے ہیں اسے دعوت دے کر مسجد میں لاتے ہیں، تا کہ وہ اس میں شریک ہو۔

(۵)بیان:

عمومی گشت کے بعد جو عموماً کسی نماز سے پہلے ہوتا ہے،نماز سے فارغ ہوکر جماعت ہی کا کوئی فرد علی العموم امیر جماعت اپنی دعوت لوگوں کے سامنے رکھتا ہے،اور چھ باتوں پر تقریر کرتا ہے۔

(۶)تعلیم:

کتب فضائل کسی ایک وقت یا دو وقت پڑھی جاتی ہے،اسی کو تعلیم کہتے ہیں۔

(۷)مشورہ:

جماعت جب کسی آبادی میں پہونچتی ہے تو فوراً افراد جماعت بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں، جس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کھانے کے نظم پر کون کون ہوگا؟ اعلان کون کرے گا؟ بیان کس کا ہوگا؟ گشت خصوصی میں کون جائے گا؟ مشورہ کا بھی امیر متعین ہوتا ہے۔

(۸)تشکیل:

بیان کے خاتمے پر لوگوں کو چلہ میں نکلنے کی ترغیب دی جاتی ہے، بیان کرنے والے کے علاوہ خود جماعت کے تمام افراد بھی فرداً فرداً بات کرتے ہیں،اور انہیں اصرار سے چلہ میں نکلنے کی دعوت دیتے ہیں،ان کے اعذار وموانع کا حل پیش کیا جاتا ہے، یا رد کیا جاتا ہے۔

(۹)دعا:

ہر بیان کے بعد اجتماعاً اور جہراً طویل دعا ہوتی ہے،اس کے علاوہ بھی گشت شروع کرنے سے پہلے مسجد سے باہر نکل کر کسی بستی میں داخلہ سے پہلے،کھانے سے پہلے اور بعد،سونے پہلے اجتماعاً اور جہراً اور کبھی صرف جہراً دعا ہوتی ہے۔

(۱۰)تفقد:

جو لوگ چلہ میں نکلنے کے لئے نام لکھواتے ہیں انہیں دوبارہ اہتمام کے ساتھ اکٹھا کرنا ان کا حوصلہ بندھانا،ان کی دیکھ بھال کرنا ''تفقد'' کہلاتا ہے۔

(۱۱)اجتماع:

مختلف جماعتیں اور افراد ایک جگہ تاریخ مقررہ پر اکٹھا ہوتے ہیں، جماعت کے اکابر بھی تشریف لاتے ہیں،تقریریں ہوتی ہیں،اجتماع کے خاتمہ پر تشکیل کے بعد بہت لمبی دعا ہوتی

ہے۔ یہ اجتماعات دوطرح کے ہوتے ہیں، سہ روزہ۔ یہ بڑا اجتماع ہوتا ہے، کبھی اس کو عالمی اجتماع کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جبکہ غیر ملکی جماعتیں شریک ہوتی ہیں۔ دوسرے چوبیس گھنٹہ کا اجتماع، یہ بالعموم ہر ماہ کسی کسی جگہ ہوتا، اس کے علاوہ مقامی طور پر بھی ہفتہ وار اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔

(۱۲) شب گزاری:

مقامی احباب عموماً جمعہ کی شب کسی مسجد میں اکٹھے ہوکر وہیں آداب کے مطابق کھانا کھاتے اور رات گزارتے ہیں۔

(۱۳) چھ باتیں:

جماعت میں نکلنے کے بعد آدمی چھ باتوں کے دائروں میں منحصر ہوکر اپنے اوقات گزارتا ہے، انہیں چھ باتوں پر بیانات ہوتے ہیں، ان کے علاوہ کسی اور بات کی اجازت نہیں ہوتی، وہ چھ باتیں یہ ہیں۔ (۱) کلمہ طیبہ (۲) نماز (۳) علم وذکر (۴) اکرام مسلم (۵) اخلاص نیت (۶) تفریغِ وقت یعنی خروج۔ ان چھ کے علاوہ ایک اور چیز ہے جس کو پرہیز کا لقب دیتے ہیں، وہ ہے ''ترکِ لایعنی'' ان چھ باتوں کے علاوہ کسی اور میں مشغول نہ ہوں۔

(۱۴) اجتماعی تلاوت سورہ یٰسں:

یہ امر مرکز یعنی بستی نظام الدین میں بعد مغرب التزاماً رائج ہے۔

(۱۵) مصافحہ:

جماعتیں جب اجتماعات سے روانہ ہوتی ہیں یا مرکز سے کوچ کرتی ہیں تو وہاں موجود حضرت جی یا کسی بڑے سے مصافحہ کرتی ہیں، اس کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔

یہ ہیں اجزا اس تبلیغی جماعت کے، ان سب امور کو التزاماً پورا کیا جاتا ہے، ان میں سے اکثر کے مستقل فضائل بیان کئے جاتے ہیں، گشت سے پہلے تو بالالتزام ''فضائلِ گشت'' کے عنوان سے ایک مختصر بیان ہوتا ہے، ان امور کو دینی اور عباداتی حیثیت سے ضروری سمجھا جاتا ہے، ان میں سے کسی کی عدم بجا آوری کو اصول کے خلاف اور بے برکتی اور خرابی کا باعث خیال کرتے ہیں، وعیدیں سنائی جاتی ہیں۔ جہاد کے فضائل اس جماعت پر چسپاں کئے جاتے ہیں، اور ہر ہر فرد کے

لئے شمولیتِ جماعت کولازم قرار دیا جاتا ہے،عدمِ شمولیت پر بعض اوقات عذاب تک کی وعیدیں سنادیتے ہیں۔

ترتیب شمولیت کی علی الانفراد یہ بیان ہوتی ہے کہ عمر بھر میں بیک دفعہ تین چلہ،اور علما کے لئے سات چلہ، پھر سال بسال ایک ایک چلہ،مہینہ میں تین دن، ہفتہ میں دوگشت،ایک اپنے محلے میں اور ایک دوسرے محلے میں،روزانہ کی تعلیم ۔جواس طریقہ پر پوری طرح عامل ہے،وہ کامل ہے،ورنہ بقدر کمی اس میں کوتاہی۔تبلیغی حضرات اس تحریک سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتے، چنانچہ مدرسین اور طلبہ سے بھی جمعرات جمعہ اور رمضان کی تعطیلات میں چلہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

نتائج:

اس تحریک کے کچھ مفید اور کچھ مضر اثرات شاہد ہیں،اچھے تو یہ کہ ہر ہر جگہ دین کی بیداری پیدا ہوگئی،مسجدوں میں نمازی بڑھ گئے،بعض بعض علاقہ جو بالکل فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے تھے ان کی اصلاح ہوگئی،عام دینی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی، جہاں لوگ نماز روزے سے ناواقف تھے وہاں مسجدیں آباد ہوگئیں، بہت سے اہل بدعت کی اصلاح ہوگئی، یورپین مما لک میں اس تحریک کے ذریعے بکثرت مسلمان ہونے کی اطلاعات ہیں۔

نقصانات یہ ہیں کہ دینی اعمال واشغال کو مذکورہ چھ باتوں میں منحصر سمجھنے کا رجحان پیدا ہوگیا ہے،تبلیغ صرف اسی ایک طریقہ میں منحصر سمجھی جانے لگی دوسری دینی خدمات کے متعلق دینی خدمات نہ سمجھنے کے رجحانات پیدا ہوگئے ہیں،اس میں شرکت نہ کرنے مورد ملامت بن گئے،وہ علما جو اپنے مشاغل تدریس وتالیف،وعظ وتقریر،افتاء وارشاد میں مصرف ہونے کے باعث اس میں عملاً شریک نہیں ہوتے ان کی وقعت عامۃ الناس کے قلوب سے نکل گئی،ان پر کاہلی اور ناکارگی کے اتہامات عائد ہوتے ہیں،مدارس وخوانق کے متعلق بھی اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔

ان سب حالات کو دیکھ کر دریافت طلب یہ بات ہے کہ اس تحریک کا شرعی حکم کیا ہے؟ مفصل بیان کیا جائے۔

حامداً و مصلیاً

پہلے چند قواعد سمجھ لینے ضروری ہیں، ان کے ذہن نشیں ہونے کے بعد مسئلہ کا حکم دریافت کرنے میں سہولت ہوگی۔

(۱) امور شرع کے معتبر دلائل چار ہیں، قرآن، سنت رسول، اجماع، قیاس۔ کسی عمل کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ ان چاروں دلائل میں کسی ایک سے ثابت ہو، اور جو حکم ان سے ثابت نہ ہو، خواہ وہ کتنا ہی ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہو، جائز نہیں۔

(۲) احکام شرع دو طرح کے ہیں۔ بعض احکام ایسے ہیں جنہیں محض بجالانے کا امر ہے، شریعت نے ادائیگی کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے، انہیں ادا کرنے کے لئے کوئی بھی طریقہ جو شرعاً جائز ہو اختیار کیا جا سکتا ہے، اس سے وہ فرض ادا ہو جائے گا، مثلاً جہاد کہ اس کے لئے کوئی خاص ہیئت، فوج کی کوئی خاص ترتیب، کچھ مخصوص اسلحے متعین نہیں ہیں، جب جیسی ضرورت ہو ویسی ہیئت بنائی جا سکتی ہے، ہر زمانہ کے مطابق اسلحے اختیار کئے جا سکتے ہیں، کسی ایک محدود و مخصوص صورت میں جہاد منحصر نہیں ہے، ایسے احکام اصطلاحِ شرع میں 'مطلق' کہے جاتے ہیں۔

بعض احکام ایسے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے کوئی خاص شکل یا وقت وغیرہ متعین ہیں، مثلاً نماز کہ یہ عبادت رکوع، سجود، قیام وقعود اور قرأت وغیرہ پر مشتمل ہے، ایسے احکام 'مقید' کہلاتے ہیں، اور مقیدہ کو ان کی قیودات کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے ورنہ اس کا وجود ہی نہ ہوگا، فرض کرو کوئی نماز تو پورے طور پر ادا کرے مگر سجدہ نہ کرے تو اس کو نماز ہی نہ کہیں گے، سجدہ شرعاً مطلوب ہے، امور مقیدہ میں جتنی تقییدات ہیں سب مطلوبِ شرعی ہیں، اس کے خلاف امور مطلقہ کو کسی بھی ہیئت میں بشرطیکہ وہ ہیئت جائز ہو، ادا کرنا درست ہے۔

(۳) لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کسی امر مطلق کی بجا آوری ہوگی تو وہ کسی فرد کے ضمن میں ہوگی، اس کی کوئی خاص صورت و ہیئت ضرور بنے گی، تاہم یہ خیال رہے کہ اس کے اجزاء مطلق کے لئے قیود نہ ہوں گے کہ ان کے بغیر اس کی ادائیگی ہی نہ ہو سکے، بلکہ انہیں عوارض اور منضمات کہیں گے، مثلاً جہاد کے لئے کسی نے ایک لشکر ترتیب دیا، اس کے مختلف دستے متعین کئے، انہیں مختلف مقامات پر مامور کیا، سب کی خدمات بتائیں، ہتھیار دیئے، ان تمام امور سے جہاد کی ایک

ہیئت بنی، ان امور کو جہاد کی قید نہیں سمجھا جائے گا، اگر کوئی شخص اس طریقہ سے مختلف کوئی اور ڈھنگ اختیار کرے تو وہ بھی بے تکلف جہاد ہی ہوگا۔ غرض مطلق کی کوئی شکل اس طور پر متعین نہیں ہوگی کہ اس کے اجزا کو قیود کا درجہ دیا جائے، اگر کوئی شخص اپنی رائے سے مطلق میں کوئی قید لگا دے تو یہ امر نامشروع اور بدعت ہوگا، فقہا کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ:

المطلق یجری علی اطلاقه ۔مطلق اپنے اطلاق ہی پر رہے گا۔

علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

التقیید فی المطلقات التی لم یثبت بدلیل الشرع تقییدها رأی فی التشریع. (الاعتصام ج ۱ ص ۳۴۵)

مطلق کی ایسی تقیید جو دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو، شریعت میں رائے کی دخل اندازی ہے۔

مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ بحکم آیات واحادیث مجمع علیہ تمام امت کا ہے کہ کسی حد کو حدود شرعیہ میں سے تغیر نہیں کرنا چاہئے، اور کسی حکم کو تبدل، تبدل کمی زیادتی وغیرہ نہیں دینا چاہئے، مطلق کو مطلق، مقید کو مقید، ضروری کو ضروری، مباح کو مباح، اپنے مشروعہ پر رکھنا واجب ہے ورنہ تعدی حدود اللہ اور احداث وبدعت میں گرفتار ہو جاوے گا''۔ (براہین قاطعہ ص ۱۱۲)

(۴) امر مشروع میں کسی مباح یا مندوب کا انضمام اسی حد تک جائز ہے جب تک وہ اپنی حد پر رہے، اگر اسے لازم اور ضروری قرار دیا جائے یا اس پر ایسا دوام واستمرار ہو جائے کہ لوگوں میں لزوم کے اعتقاد کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو وہ امرِ منضم اپنی حدِ انضمام سے بڑھ کر قید بن جائے گا، اس لئے اس کا ترک لازم ہوگا، اسی کا نام اصطلاح فقہ میں ''التزام مالا یلزم'' ہے، یعنی جس امر کو شریعت نے عبادۃً یا عادۃً لازم اور ضروری نہ بنایا ہو، اس کو اپنی طرف سے لازم قرار دینا، یہ درست نہیں ہے، اس کو اگر دین یا ثواب کی چیز سمجھ کر لازم کیا گیا تو بدعت ہے، مثلاً نماز میں کسی خاص سورت کا پڑھنا متعین نہیں ہے، کوئی بھی سورت پڑھی جاسکتی ہے، اگر کوئی شخص کسی خاص

نماز میں کسی ایک ہی سورت کا ایسا التزام کرے جس سے اس کے لزوم کا ایہام ہو تو فقہا نے اسے ممنوع قرار دیا ہے، اسی بنا پر سورِ مستحبہ مثلاً جمعہ کے دن نماز فجر میں 'الم سجدہ' اور سورہ 'دہر' کا التزام مکروہ ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں:

''التزام مالا یلزم بدونِ اعتقادِ وجوب بھی ممنوع ہے، اگر باصرار ہو، اگر مندوب پر دوام ہو بلا اصرار، وہ جائز ہے، اور مستحب ہے، بشرطیکہ عوام کو ضرر نہ کرے، اور اگر عوام کے اعتقاد میں نقصان ڈالے تو وہ بھی مکروہ ہے، چنانچہ کتب فقہ میں سورِ مستحبہ کے التزام کو مکروہ لکھا ہے''۔ (تذکرۃ الرشید ج ا ص ۱۳۴)

مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی فرماتے ہیں:

قدتقرر فی مقره ان کل مباح ادی الی التزام غیر مشروع والی فساد عقائدالجهلة وجب ترکه علی الکملة ان لا یلتزموا لکونه مؤدیاً الی اعتقاد السنیة.(روع الاخوان عن محدثات آخر جمعة فی رمضان)

اپنی جگہ ثابت ہو چکا ہے جو مباح ضروری سمجھ لیا جائے اور اس سے عوام کا اعتقاد فاسد ہونے لگے تو اس کا ترک کرنا علما پر ضروری ہے، اور یہ کہ اس کا التزام نہ کریں، کیوں کہ لوگ اسے سنت سمجھنے لگیں گے۔

امام شاطبی اور وضاحت فرماتے ہیں:

کل ماواظب رسول اللهﷺمن النوافل فی الجماعات فهو سنة فالعمل بالنافلة اللتی لیست بسنة علی طریقة العمل بالسنة اخراج النافلة عن مکانها المخصوص بها شرعاً ثم یلزم من ذالک اعتقاد العوام فیها من لا علم عنده انها سنة وهذا فساد عظیم ،لان اعتقاد مالیس بسنةوالعمل علی حد العمل بالسنة نحو من تبدل الشریعة کما لو اعتقد فی الفرض انه لیس بفرض اوفیما لیس بفرض انه فرض ثم عمل وفق اعتقاده فانه فاسد فهو العمل فی الاصل صحیحاً فاخراجه عن بابه اعتقاداً وعملاً من باب افساد الاحکام

الشرعية ومن ھٰھنا ظهر عن السلف الصالح تركهم سنةً لئلا يعتقد الجاهل انها من الفرائض. (الاعتصام ص۳۴۶)

ہر وہ عبادت نافلہ جس پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبت فرمائی ہو، اور اس کو جماعتوں میں ظاہر فرمایا ہو، وہ سنت ہے، پس وہ نفلی عمل جو سنت نہ ہو، اس کو عمل بالسنۃ کے طریقے پر کرنا در حقیقت اس نفلی عمل کو اس کے مخصوص شرعی مرتبے سے خارج کرنا ہے، پھر اس سے لازم آتا ہے کہ عوام اور جہلا اس کو سنت اعتقاد کرنے لگیں، اور یہ فساد عظیم ہے۔ اس لئے کہ جو سنت نہ ہو اس کو سنت اعتقاد کرنا شریعت کو تبدیل کر دینا ہے، جیسا کہ فرض کو غیر فرض اور غیر فرض کو فرض اعتقاد کر لیا، پھر اپنے اعتقاد کے موافق عمل کر لیا تو یہ فاسد ہے، پس مانا کہ عمل فی نفسہ درست ہے لیکن اس کو اپنے باب سے اعتقاداً یا عملاً نکال دینا احکام شرعیہ کو فاسد کر دینے کے قبیل سے ہے، یہیں سے سلف صالحین کے قصداً سنتوں کے ترک کر دینے کا عذر ظاہر ہو گیا کہ جاہل یہ اعتقاد نہ کرنے لگیں کہ یہ عمل فرائض وواجبات میں سے ہے۔

(۵) مذکورہ بالا قاعدہ کی تتمیم کے لئے یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ فرض کیجئے کہ کسی امر مشروع میں کچھ چیزیں لازم کی گئیں، یا مستقل کوئی امر جدید ایجاد کیا گیا تو اس سلسلے میں اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ قرونِ مشہود لہا بالخیر یعنی دورِ نبوت، دورِ صحابہ، دورِ تابعین میں اس کا مقتضا اور موجب تھا یا نہیں؟ اگر اس کا مقتضا اس دور میں بھی موجود تھا مگر اسے اختیار نہیں کیا گیا تو اس صاف مطلب ہے کہ اس امر جدید کو بالقصد ترک کیا گیا ہے، مثلاً عید کی نماز کے لئے اجتماع مطلوب ہے، اور اجتماع کا تقاضہ ہے کہ اذان ہو، تاکہ وقت پر لوگ سہولت سے جمع ہو جائیں، لیکن اسے اختیار نہیں کیا گیا، اب اگر کوئی شخص اپنی رائے سے عیدین میں اذان کا اضافہ کر دے تو صریح بدعت ہے۔ اور اگر ان قیودات اور امر جدید کا مقتضا اس دور میں نہ تھا، اب پایا گیا تو یہ دیکھنا چاہئے کہ مامور بہ ان لوازم پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر انہیں پر موقوف ہے تو بدعت تو کیا ہوتیں وہ بھی مامور بہ ہوں گی، مثلاً تحصیل نسبت مع اللہ مامور بہ ہے، دور اول میں اس کا حصول فقط رسول اللہ ﷺ اور صحابہ وتابعین کی صحبت ہی سے ہو جایا کرتا تھا، اس لئے ریاضات ومجاہدات

اوراد واشغال کی ضرورت نہ تھی،لیکن زمانۂ نبوت سے بعد اور نفوس بہیمی کے غلبہ کی وجہ سے اب ضرورت ریاضات ومجاہدات کی پڑی کہ اس کے بغیر تحصیلِ نسبت عادۃً بہت مشکل ہے،اس لئے انہیں بدعت نہ کہا جائے گا۔

دوسری مثال۔علم دین کی تحصیل مامور بہ ہے،اس کا حصول عادۃً مدارس کے وجود پر موقوف ہے،اس لئے مدارس کا وجود بھی اس کے لوازم کے ساتھ ضروری ہے،اگر ان چیزوں میں کچھ شرعی خرابیاں پیدا ہوجائیں تو ان کی اصلاح کردی جائے گی ،انہیں ترک نہ کیا جائے گا۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

فامثلة(القید)الواجب منها من قبیل مالا یتم الواجب الابه فلا یشترط ان یکون معمولاً بـه فی السلف ولا ان یکون لـه اصل فی الشریعة علی الخصوص لانه من باب المصالح المرسلة لاالبدع. (الاعتصام ج۱ص۱۹۷)

قیود واجبہ میں سے وہ قیود بھی ہیں جو’’ مالایتم الواجب الا بہ‘‘ کے قبیل سے ہے،یعنی ایسی قید جس پر واجب کا حصول موقوف ہو،اس قید کا سلف میں مامور بہ ہونا شرط نہیں ہے،اور نہ یہ شرط ہے کہ خاص طور پر شریعت میں اس کی کوئی اصل ہو،اس لئے کہ یہ مصالح مرسلہ کی بات سے ہے، بدعت نہیں ہے۔

اور اگر مامور بہ کا حصول اس پر موقوف نہیں ہے،تو ان کا اختیار کرنا بس اسی حد تک درست ہے جب تک وہ اپنی حد پر رہے،اور اگر انہیں لازم سمجھ لیا جائے تو بدعت اور قابل ترک ہے جیسا کہ اس کی تفصیل قاعدہ نمبر چار میں گزری۔

(۶) کسی مرکب عمل کے اجزا اگر علیحدہ علیحدہ مباح،مستحب،یا مسنون ہوں تو یہی امر اس مجموعہ کے لئے جواز کی دلیل نہ بنے گا،نماز نفل امر مندوب،جماعت بھی مشروع،جماعت کے لئے تداعی واہتمام بھی مامور بہ لیکن ان سب کی الگ الگ مشروعیت کے باوصف ان کا مجموعہ [ا] ناجائز اور بدعت ہے۔

علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

فذالک ابتداع والدلیل علیه انه لم یات عن رسول اللهﷺولا عن

اصحابه ولا عن التابعين لهم باحسان فعل هذا المجموع هكذا مجموعاً وان اتى مطلقاً من غير تلك التقييدات فالتقييد فى المطلقات اللتى لم يثبت بدليل الشرع تقييدها رأى فى التشريع. (الاعتصام ۳۴۶)

پس یہ بدعت ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب اور تابعین سے یہ مجموعہ ثابت نہیں ہے، اگرچہ مطلقا بغیر قید کے ثابت ہو، پس مطلق میں ایسی قید لگانا جو شریعت سے ثابت نہ ہو، شریعت میں رائے کو دخل دینا ہے۔

(۷) جو امر بذریعۂ غیر مشروعہ حاصل ہو، وہ خود ناجائز ہے۔

''یہ امر یقینی ہے کہ جو امرِ خیر بذریعۂ غیر مشروع حاصل ہو، وہ امر خیر نہیں، اور جب قیود کا غیر مشروع ہونا ثابت ہوجائے تو اس کا ثمرہ کچھ بھی ہو، جائز الحصول نہ ہوگا''۔ (تذکرۃ الرشید ج ا ص ۱۳۰)

(۸) التزام مالا یلزم اور دوام عمل میں فرق ہے، التزام میں لزوم کا اعتقاد ہوتا ہے، یا عوام میں اعتقادِ لزوم کا ایہام ہوتا ہے، ہر صورت میں کراہت سے خالی نہیں، بخلاف اس کے مندوب پر دوام میں، نہ اس کے لزوم کا اعتقاد ہوتا ہے اور نہ عوام کو اس سے کوئی ضرر ہوتا، اور اگر ضرر ہونے لگے تو وہ بھی التزام میں داخل ہو کر ممنوع ومکروہ ہوگا۔

ان اصول وقواعد کو بغور ملاحظہ کیجئے، یہ تمام کلیات علمائے احناف کے درمیان مسلم ہیں تفصیل کے لئے ''براہین قاطعہ'' اور ''مکاتیب حضرت گنگوہی وحضرت تھانوی قدس سرہما، مندرجہ تذکرۃ الرشید'' کا مطالعہ کیجئے، اس کے بعد موجودہ تبلیغی تحریک پر غور کیجئے۔

اولاً اس پر غور کیجئے کہ تبلیغ احکامِ مطلقہ میں سے ہے یا مقیدہ میں سے؟ تو اس کے متعلق علامہ شاطبی کا قول نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

الامر بتبليغ الشريعة بدون الاختلاف فيه لقوله تعالى "يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك" وامته مثله، وفى الحديث "ليبلغ الشاهد منكم الغائب والتبليغ كمالا يتقيد بكيفية معلومة لانه من قبيل المعقول المعنى فيصح باى شئى من الحفظ والتلقين والكتابة وغيرها ذالك لا يتقيد حفظه

عن التحريف و الزيغ بكيفية دون اخرى. (الاعتصام ج اص ۱۸۷)

تبلیغ شریعت کا حکم بغیر کسی اختلاف کے ثابت ہے، اللہ تعالی کے ارشاد سے کہ: ''اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اس کی تبلیغ کیجئے''، اور آپ کی امت بھی آپ کے مثل مامور ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ءء چاہئے کہ تم میں سے جو حاضر ہیں وہ غائب کو تبلیغ کردیں''، اور تبلیغ جس طرح کیفیتِ متعینہ کے ساتھ مقید نہیں ہے، اس لئے کہ معقول المعنی کی قبیل سے ہے، لہٰذا حفظ، تلقین، تحریر جس صورت میں ممکن ہو، صحیح ہے، اسی طرح شریعت کی تحریف وزیغ وغیرہ سے حفاظت کے لئے بھی کوئی کیفیت اور صورت متعین نہیں۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تبلیغ امور مطلقہ میں سے ہے، اور قاعدہ نمبر تین سے معلوم ہوچکا ہے کہ مطلق کو اپنی رائے سے مقید کرنا درست نہیں ہے، اب قابل نظر یہ امر ہے کہ تبلیغِ موجودہ کے جو اعمال واشغال ہیں وہ قیود ہیں یا انضمامات؟ ظاہر ہے کہ اصلاً تو وہ امور منضمہ ہی ہیں، لیکن التزام واصرار کے باعث قیود بن گئے ہیں، کیوں کہ ان کے بغیر تبلیغ کا وجود ہی نہیں سمجھا جاتا، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ایک مطلق کی تقیید لازم آتی ہے۔

خود ان اجزا پر فرداً فرداً غور کیجئے تو فی نفسہ وہ سب جائز اور مشروع ہیں، لیکن التزام و اصرار کے باعث کوئی بھی اپنی حد پر نہیں رہ گیا، بلکہ انہیں واجب کا درجہ دیدیا گیا، اس سلسلے میں عامۃ الناس کا فسادِ عقیدہ بالکل ظاہر ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ترک پر ملامت کی جاتی ہے، اسی کا تو نام ''التزام مالایلزم'' ہے، جو باتفاقِ فقہا مکروہ وممنوع ہے۔

مجموعی حیثیت سے غور کیجئے! کیا اس مرکب شکل کے ساتھ جس کی طرف آج دعوتِ عام دی جارہی ہے، تبلیغ کا وجود قرون ثلاثہ میں تھا، ظاہر ہے کہ نہیں تھا، ہمارے اس زمانہ میں ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان ادوار میں اس کا داعی اور مقتضا موجود تھا یا نہیں؟ تبلیغ کا مقصد اشاعتِ دین ہے اور یہی مقتضا ہے مروجہ تبلیغ کا بھی، کون کہہ سکتا ہے کہ اشاعتِ دین کی ضرورت اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے بھی تھی اور یقیناً تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں فسق وفجور اور دین سے غفلت نہ تھی، لیکن دوسری اقوام میں شرک وکفر موجود تھا، قرون ثلاثہ کے بعد عملی واعتقادی گمراہیاں بھی بہت پھیلیں، تو مسلمانوں کو احکامِ اسلام سکھانے کی ضرورت بھی بکثرت پیش آئی، مگر اس کے لئے

خاص یہ شکل تو کیا کبھی کوئی متعین اور محدود صورت نہیں اختیار کی گئی، جہاں جیسا مصلحت کا تقاضا ہو، اطریقِ کار اختیار کیا گیا، کہیں مقامی طور پر علما ومشائخ نے تبلیغ وتلقین کا فرض انجام دیا، کہیں مشائخ نے اپنے خلفا اور علما نے اپنے تلامذہ کے وفود بھیجے، کہیں کوئی ایک شخص گیا، کوئی مسجد میں وعظ کہتا، کوئی عام مجامع میں تلقین کرتا، کوئی تصنیف وتحریر کے ذریعے تبلیغ کرتا، کہیں مناظرہ ومجادلہ کی نوبت آتی، کہیں حرب وضرب تک بھی معاملہ پہونچتا، اور یہ سب اسی ایک امر مطلق کی تعمیل تھی، کسی نے کوئی خاص طریقہ عمومی طور پر لازم نہیں کیا، اس کے برخلاف موجودہ تحریک میں دنیا کے ہر خطے اور ہر ماحول میں وہی ایک طریق متعین ہے، اور سب پر لازم ہے، ظاہر ہے کہ یہ بالکل نیا امر ہے، اس صورت حال پر غور کیجئے کہ مقتضا ابتدا ہی سے موجود مگر اس کا حدوث اب ہوا، اس لحاظ سے قواعد کی روشنی میں تو یہ امر صریح بدعت معلوم ہوتا ہے۔ فتأمل

اگر کوئی کہے کہ موجودہ شکل کا مقتضا ان ادوار میں نہ تھا، اس وقت حالات ایسے نہ تھے، بے دینی اتنی عام نہ تھی کہ اس اجتماعی شکل میں تبلیغ کی ضرورت ہوتی، اس کی ضرورت ہمارے اس دور میں ہوئی ہے، تو اول اسی میں کلام ہے، جیسا کہ اس کی طرف اشارہ سطور بالا میں گزر چکا ہے، لیکن چلئے فرض کیجئے کہ اس کا تقاضا اس وقت نہ تھا، آج ہی ہوا ہے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ تبلیغ وتعلیم کا حصول خاص اسی طریقہ پر موقوف ہے، اور عادۃً اس کے بغیر تبلیغ کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اب بھی تبلیغ کے مختلف شعبے ضعف کے ساتھ ساتھ سہی جاری ہیں، وعظ وتقریر، تصنیف وتالیف، مدارس وخوانق یہ تمام شعبے تو چل ہی رہے ہیں، پھر تبلیغ کو اسی طریقہ خاص میں منحصر کیسے کیا جاسکتا ہے؟۔

بہرکیف یہ بدیہی امر ہے کہ تبلیغ کا حصول اس پر موقوف نہیں ہے، لہٰذا اس مجموعہ کے التزام واصرار کے لئے مستقل دلیل کی ضرورت ہے جیسا کہ قاعدہ نمبر چھ سے معلوم ہو چکا ہے، اور وہ ہے نہیں۔ مزید اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت سے مفاسد اس میں شامل ہیں، التزام مالا یلزم تو ہر ہر جز میں ہے، مثال کے طور پر دعا بالجہر للاجتماع، بے شک مطلق دعا مامور بہ ہے، لیکن متعین مواضع پر التزاماً دعا جہراً واجتماعاً کرنا بلاشبہ ایک نئی بات ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے ہرگز ثابت نہیں، اسی طرح اس تحریک میں جہلا کو علما کے منصب پر فائز کرنے کا بالعموم رواج ہے، وعظ

اورخطاب عام کرنا.... کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ.... کہ علما کے لئے مخصوص ہے، کسی جاہل، ناواقف کو وعظ کہنے کا حق نہیں ہے، خطاب خاص کے ساتھ انفراداً کسی کو نصیحت کرنے کی اجازت تو ہے مگر محافل ومجامع میں نہ وعظ کہنا درست ہے نہ اس کا سننا، جب کہ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بالکل ناواقف شخص جو شریعت کے اصول وقواعد سے بالکل نابلد ہوتا ہے، اسے امیر بنادیا جاتا ہے، اور وہ بے ڈھڑک وعظ کہتا پھرتا ہے، اور اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جاہل وناواقف سے ہر وہ شخص مراد ہے جس نے علما کی صحبت میں رہ کر معتد بہ علم جس سے عرف میں عالم کہلاتا ہو، نہ حاصل کیا ہو، اور نہ اسے کسی معتمد عالم سے وعظ کہنے کی اجازت ہو۔

اسی طرح نہی عن المنکر جو شریعت کا ایک مستقل فریضہ ہے، وہ بھی جماعت میں التزاماً متروک ہے، بلکہ اس کے ترک کا حکم ہے، یہ بھی علما کی تصریحات کے مطابق نادرست ہے۔

علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

ان البدعة من حيث قيل فيها انها طريقة مخترعة الخ. يدخل في عموم لفظها البدعة التركية فقد يقع الابتداع بنفس الترک تحريماً للمتروک اوغير تحريم فان الفعل مثلاً قد يكون حلالا بالشرع فيحرمه الانسان على نفسه او يقصد تركه قصداً.

بدعت کے بارے میں جب کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ دین میں گھڑے ہوئے طریقہ کا نام ہے، الخ۔ تو اس کے عموم لفظ میں بدعت ترکیہ بھی داخل ہے، جیسا کہ بدعت غیر ترکیہ داخل ہے، پس بدعت صرف ترک کردینے کا نام ہے، خواہ متروک کو حرام سمجھ کر ترک کیا ہو، خواہ حرام نہ سمجھا ہو، اس لئے کہ مثلاً فعل کبھی شرعاً حلال ہوتا ہے، مگر انسان اس کو اپنے اوپر حرام کرلیتا ہے، یا قصداً اسے ترک کردیتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

وان كان الترک تديناً فهو الابتداع اذ قد فرضنا الفعل جائزاً شرعاً فصار الترک المقصود معارضة في شرع التحليل. (الاعتصام ج۱ص۴۲)

اور اگر ترک تدیناً ہے تو یہ ابتداع فی الدین ہے، اس لئے کہ فعل کو ہم نے جائز فرض کیا

ہے، لہٰذا بالقصد ترک کردینا شارع کا معارض ہوگا کہ یہ تحلیل شارع کے مقابلے میں تحریم ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی مفاسد ہیں جن کا ذکر سوال میں موجود ہے، اس لئے حسبِ قاعدۂ مذکورہ اس کا تدارک ضروری معلوم ہوتا ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ یہ اس تحریک سے دینی فوائد بہت ہیں، تو بلاشبہہ یہ صحیح ہے، اس کا انکار کون کرسکتا ہے؟ لیکن مخصوص فوائد کا ہونا کسی چیز کی صحت کی دلیل نہیں، فائدہ وہی معتبر ہے، جو بذریعۂ مشروع ہوا ہو، اگر موجودہ تبلیغ دلائل وقواعد کی رو سے درست ہوتب تو کلام کی گنجائش ہی نہیں، ورنہ ان منافع کا شرعاً کچھ وزن ہی نہیں ہے جنہیں حاصل کرنے کے لئے مکروہات و ممنوعات کا ارتکاب کیا گیا ہو۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی حیثیت فتوی کی نہیں ہے بلکہ سوال وجواب دونوں مل کر ایک استفتا ہے، جو حضرات اہم علم کی خدمت میں پیش ہے، اب تک اس حیثیت سے جماعت کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے، چونکہ اپنی جماعت کے اکابر نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے، اور اپنے ہی اکابر کی سرپرستی میں چل رہی ہے، اس لئے کبھی غور کی ضرورت ہی شاید محسوس نہ ہوئی، اگرچہ بعض اوقات ناخوشگواریاں پیش آتی ہیں، لیکن عوام کا غلو کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے، لیکن سوچنے کا ایک طرز یہ بھی ہے۔ حضرات اہل علم غور کریں، اور دیکھیں کہ اس میں کیا خامی ہے؟ اگر واقعۃً کوئی کمی اور کجی ہے تو اس کو ظاہر کریں ورنہ جو کچھ صحیح ہوا سے ظاہر کردیں۔

واللہ الموفق والمعین

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) یعنی اگر کوئی نفل نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرے اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دے، تو یہ ناجائز ہے۔

جماعت تبلیغ۔مشورے اور گزارشیں

یہ خاکسار راقم جماعت تبلیغ کے اندر کچھ ایسی چیزیں دیکھ رہا ہے جسے اکابر کے سامنے پیش کر دینا امانت و دیانت کا تقاضا سمجھتا ہے، اس دیکھنے والے کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے تاہم چونکہ ان تمام اکابر سے تعلق رکھتا ہے جو تبلیغی جماعت اور اس کے اجتماعات کی سرپرستی فرماتے ہیں، اور ان احباب سے محبت رکھتا ہے جو اس میں شرکت کو دین و ایمان سمجھتے ہیں، اور دین نام ہی خیر خواہی کا ہے، اس لئے کچھ باتیں ان کی خدمت میں پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہے، اگر مجھ سے غلطی ہو رہی ہے تو اصلاح کا امیدوار ہوں، اور اگر یہ گزارش کسی درجہ میں لائق اعتنا ہے تو حضرات اکابر توجہ فرمائیں۔

مفید تحریکات کا مزاج عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک فطری سادگی کے ساتھ چلتی ہیں، ان میں مقصدیت کا عنصر غالب ہوتا ہے، ذرائع و وسائل کو ان کے درجے پر ہی رکھا جاتا ہے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے اور اس تحریک کا پھیلاؤ بڑھتا ہے اس میں دوسرے عناصر بھی شامل ہوتے چلے جاتے ہیں، وسائل کبھی مقاصد کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، اور بعض اوقات تو تحریک کسی اور ہی رخ پر چل پڑتی ہے، ایسے وقت میں بہت چوکنا ہو کر ان فاضل عناصر کو دیکھتے رہنا بہت ضروری ہوتا ہے، جو تحریک کے لئے مضر یا اجنبی ہوں، اور ضرورت ہوتی ہے کہ وقتاً فوقتاً تطہیر کا عمل جاری رہے، ورنہ ابتدا کا رنگ انتہا میں باقی نہیں رہتا ہے، یہ مزاج تحریکات ہی تک محدود نہیں ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود دین اسلام میں نئی نئی چیزیں کرنے والے شامل کر دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ دین کی تطہیر و تجدید کے لئے مجددین کو مقرر فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ''**ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مأۃ سنۃ من یجددلھا**

دینھا". (ابوداؤدشریف۔کتاب الملاحم)ہرسوسال پراللہ تعالی اس امت کے واسطےایسےشخص کو کھڑاکرتے ہیں جودین کی تجدید کرےیعنی زائدآمیزشوں سےاسے پاک کرے۔

تبلیغی جماعت جواشاعتِ دین کی تحریک کےطور پرشروع ہوئی تھی،اوراب اس پر نصف صدی سےزیادہ عرصہ گزرچکاہے،اورماشاءاللہ اس کےاثرات وفوائدعالمی پیمانے پرظاہر ہوئے ہیں،اللہ تعالی نےاس سےبڑاکام لیالیکن جیسےاورتحریکات میں نامناسب عناصرکےداخل ہونےکاامکان ہوتاہے،اس تحریک کابھی اصولِ دین کی روشنی میں احتساب کرناچاہئے،اگرکوئی چیزنامناسب اس میں داخل ہوگئی ہوتواسے چھانٹ دیں،حضوراکرمﷺاورصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کےبعدہرشخص،ہرجماعت،ہرتحریک جودینی خدمت کرتی ہے،وہ مکلّف ہے کہ اپنے طریقۂ کارکوقرآن وسنت پرپیش کرے،حضرات صحابہ کےتعامل پرپیش کرے،معیاریہی ہے،تمام ائمہ کرام،مشائخ عظام نےیہی کوشش کی ہے کہ وہ رسول اللہﷺاورصحابہ کرام کےنقش قدم پررہیں،ہرایک نےبرملااعلان کیاہے کہ ان کاکوئی قول وعمل یاکشف والہام دلیل سے ثابت ہوجائےکہ خلافِ سنت رسول ہےتواسےبےتکلف ردکردیں۔

تبلیغی جماعت بھی اس اصول سےمستثنی نہیں ہے،تحزب وعصبیت سے برکنارہوکر یہ ضروردیکھناچاہئےکہ اس میں کوئی ایسی بات تونہیں آچلی ہے جسےنہیں ہوناچاہئے،تبلیغی جماعت کا مسئلہ اس حیثیت سےبہت اہم ہےاورنازک ہے(کہ اس میں جوبھی غلطی ہوگی)تووہ انفرادی نہ ہوگی،ایک بڑی اجتماعیت اس میں سرایت کرجائےگی،اوروہ دین کاتقدس بھی اختیارکرےگی، کیوں کہ ماشاءاللہ اس جماعت کاحلقہ دنیاکی تمام دینی جماعتوں سے بڑاہے،بلکہ یہ عالمی حلقہ ہے،اس لئےکوئی بھی صداجواس حلقہ میں ایک جگہ بلندہوتی ہےاس کی گونج سارے اسلامی جہاں میں سنائی دیتی ہے۔

(۱) بنگلہ دیش کےاجتماع میں شریک ہونےاوروہاں کےمقررین وواعظین کی تقریروں کو سننے کےبعدیہ احساس بہت ہواکہ ان میں غلوکاخاصادخل ہوچکاہے،اللہ تعالی نےقرآن پاک میں دین کےاندرغلوکرنےسےمنع فرمایاہے:"**قل یا اھل الکتاب لاتغلوا فی دینکم غیر الحق**" غلوکامطلب یہ ہے کہ کسی چیزیاحکم کاجودرجہ ہےاس سےاس کوبڑھادیاجائے،تبلیغی

جماعت اور اس کا موجودہ طریقۂ کار خود دین و مذہب نہیں ہے، بلکہ دین سے غافل اور ناآشنا لوگوں کو دین کی طرف متوجہ اور آشنا کرنے کا ایک ذریعہ اور طریقہ ہے، یہ طریقہ بذات خود مقصود نہیں ہے، حصول مقصود کا واسطہ ہے، یہ طریق بہیئتِ مجموعی منصوص نہیں ہے بلکہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نوراللہ مرقدہ نے اپنے الہام وتجربات کی روشنی میں اسے ترتیب دیا ہے، لیکن حضرات واعظین کی تقریروں سے بھی اور اس میں شریک ہونے والوں کے عمومی رجحان سے بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ بذات خود یہی طریقہ مقصود ہو گیا ہے، چنانچہ اجتماع کی تمام تقریروں میں عموماً یہی بات بتکرار کہی جاتی رہی کہ ''دعوت سے اونچا کوئی عمل نہیں، یہ پوری امت کی ذمہ داری ہے، اس کے واسطے ملکوں ملکوں پھرنا چاہئے''۔ بعض حضرات نے تو یہ تک فرمادیا کہ ''دعوت کا یہ عمل مثل کشتیٔ نوح کے ہے، نجات وہی پائے گا جو اس میں آجائے گا''۔ ان بزرگوں کی گفتگو میں جب دعوت کے عمل کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس سے یہی مخصوص طریقۂ کار مراد ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ باتیں غلو اور افراط پر مبنی ہیں، پھر ہر ایک کو اس میں شریک ہونے کی دعوت پوری قوت سے دی جاتی ہے۔

ان تقریروں سے عوام تو عوام ہیں خواص کا بھی یہی ذہن بنتا ہے کہ جو لوگ جماعت کے اس طریقہ کار میں شریک نہیں ہوتے، خواہ وہ دین کی خدمت کسی اور راہ سے کتنی ہی کرتے ہوں، وہ ایک بڑی ذمہ داری سے پہلو تہی کرتے ہیں، اور نجات سے گویا محروم رہتے ہیں، حالانکہ ایک طریقۂ دعوت وتبلیغ جو منصوص نہیں ہے یا کوئی اور طریقہ جو دینی خدمت کے لئے کسی تجربہ اور مصلحت کے تحت اختیار کیا جائے، اس میں شرکت نہ واجب ہے اور نہ اس میں شریک نہ ہونے سے کوئی فرد یا جماعت مستحقِ ملامت ہے، بلکہ اس میں شرکت کی شدومد سے دعوت دینا اور اصرار کرنا خود محلِ نظر ہے، جب ائمہ فقہ [۱] کو اپنے مسلک میں شمولیت کی دعوت عام دینے کا اختیار نہیں ہے، تو دوسروں کو یہ حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ لیکن تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار میں شرکت کی نہ صرف دعوت عام دی جاتی ہے بلکہ تشکیل کے نام پر اس پر ایسا اصرار ہوتا ہے کہ شرکت نہ کرنے والوں کے مجرم ہونے کا شبہہ ہونے لگتا ہے، گویا ان کی ذمہ داری ہے کہ اس میں ضرور شریک ہوں، حالانکہ علما کی یہ ہرگز ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ خاص اس طریقہ سے تبلیغ وتعلیم کا

فریضہ انجام دیں۔خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نوراللہ مرقدہ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو علما دینی خدمت کی مشغولیت رکھتے ہوں انہیں اس میں نکلنے کی دعوت نہ دی جائے ،بس ان سے دعا کرائی جائے۔

(۲) (دعوت وتبلیغ کے فضائل)بہت زیادہ اورنہایت شدومد سے بیان کئے جاتے ہیں،اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور سے قابل توجہ ہیں،اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں عوام نہیں ذمہ داروں کی طرف سے بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ فضائل کے سلسلے میں ہر قسم کی رطب ویابس روایات، بے سرو پا حکایات،اور خواب وخیال اور کشف وکرامات سے کام لیا جاتا ہے، بلکہ موضوع روایات کو بھی بے تکلف بیان کر دیا جاتا ہے،موضوع روایات کا امت میں رواج پانا خود ایک مصیبت ہے، پھر اس سے جو ذہن بنتا ہے وہ مزید مصیبت کا باعث بنتا ہے۔ایک صاحب کے سامنے گناہوں کی قباحت اوران پر اللہ تعالی کی ناراضگی کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ حدیثوں میں ایک ایک دعا پر بیس بیس لاکھ نیکیوں کا وعدہ ہے، اتنے گناہ تو ہم کرتے بھی نہیں، یہ ذہن جب بنتا ہے تو گناہ کا ڈر ختم ہوجاتا ہے کہ جماعت میں جائیں گے اور سب گناہ معاف ہوجائیں گے، یہ رجحان کتنا خطرناک ہے؟محتاجِ بیان نہیں!

دوسرے یہ کہ مقرر حضرات رسول اللہ ﷺ کے واقعات وحالات کو آج کی جدید تبلیغی اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں،اصطلاحات کی تبدیلی کی وجہ سے واقعہ کی صورت کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے،مثلاً حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جہاد کے لئے سفر ہوتے تھے،قدیم اصطلاح میں اسے ’غزوہ‘ یا ’سریہ‘ یا ’فی سبیل اللہ‘ کہا جاتا تھا، چنانچہ قرآن میں مصارف زکوۃ میں ’فی سبیل اللہ‘ کا جو ذکر آیا ہے فقہا نے اس کا مصداق غزوہ کے مسافر کو قرار دیا ہے، جو فوج سے پیچھے رہ گیا ہو،ان الفاظ سے واقعہ کی صحیح صورت ذہن میں آتی ہے،لیکن یہ حضرات اسے ’’جماعت‘‘ کے نکلنے سے تعبیر کرتے ہیں،اس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جیسے آج کل جماعتیں نکلتی ہیں،اسی طرح صحابہ کرام کی بھی جماعتیں نکلتی تھیں،حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے،کہاں حضرات صحابہ کا جہاد و قتال کے لئے اسلحہ بند ہوکر نکلنا؟ جہاں ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا،اور کہاں موجودہ جماعتوں کا

نکلتا؟ بنگلہ دیش کے اجتماع میں ایک صاحب نے تو اور کمال کر دیا، کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب حکم ملا کہ مصر میں فرعون کے (پاس جایئے اور ان دعوت دیجئے) تو اسے مقرر صاحب نے یوں تعبیر کیا کہ ''کوہِ طور سے جماعت چلی''۔

(یہ ایسی سنگین باتیں ہیں جن) پر حضرات اکابر کو بہت سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

(۳) جماعت میں جو امیر مقرر کئے جاتے ہیں ان کا مسئلہ بھی خاصا اہم ہے، جماعت کے امراء اکثر صاحب علم نہیں ہوتے، لیکن امارت کے منصب کی وجہ سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں، وہ بہت سی ناہموار باتیں عوام کے درمیان کر جاتے ہیں جس کی وجہ سے غلط علم عوام میں پھیلتا ہے، اس سلسلے میں عموماً یہ عذر بیان کیا جاتا ہے کہ کیا کریں صاحب علم امیر نہیں ملتے تو جو بھی مل جاتا ہے اسی کو امیر مقرر کر دیا جاتا ہے، لیکن یہ عذر قابل قبول نہیں ہے۔ اصول یہ ہونا چاہئے کہ جب لائق امیر ملے جبھی جماعت تشکیل دی جائے، اور اگر کسی ایسے شخص کو امیر بنانا ناگزیر ہو جس میں علمی لیاقت نہ ہو تو اسے پابند کر دیا جائے کہ وہ عوام کے درمیان خطاب عام نہ کرے، بلکہ صرف کتاب پڑھ دیا کرے، اور اس میں بطور تشریح کچھ بھی نہ کہے۔

(۴) جماعت اور اجتماعات دیکھنے اور ان میں شرکت کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیان وتقریر اور تشکیل ہی اصل مقصود ہے، تقریروں کی اتنی کثرت ہوتی ہے، اور اتنا طولانی بیان ہوتا ہے کہ آدمی اکتا جائے، اور جماعتیں جو مسجدوں میں قیام کرتی ہیں، وہ ہر نماز کے بعد بیان کو ضروری سمجھتی ہیں، اور تشکیل کا حاصل عنصر اصرار ہوتا ہے، یہ باتیں افراط پر مبنی معلوم ہوتی ہیں، بیان دن بھر میں صرف ایک ہونا چاہئے، باقی اوقات جماعت کے افراد باہم مذاکرہ کریں، تلاوت میں مشغول رہیں، دعائیں یاد کریں، مسائل سیکھنے کا اہتمام کریں، مقامی لوگوں کو بھی اس میں شریک ہونے کی دعوت دیں، دن بھر کی پانچ تقریریں سب پر بھاری پڑتی ہیں، لوگ تقریروں کا اعلان سنتے ہیں اور مسجد سے باہر نکلنے لگتے ہیں۔ تذکیر میں لوگوں کے مزاج کی رعایت تو خود رسول اللہ ﷺ نے کی ہے کہ لوگ اکتا نہ جائیں۔ لوگوں کے بھاگنے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ تقریر کرنے کے لئے ہر کس وناکس کھڑا ہو جاتا ہے، حالانکہ ہر شخص کو نہ تقریر کرنی جائز ہے اور نہ ہر شخص کی تقریر سنی درست ہے۔

تشکیل میں اصرار کا حاصل یہ ہے کہ خواہی نخواہی جماعت میں نکلو، حالانکہ تبلیغ کا جو طریقۂ کار منصوص نہیں ہے اس میں شرکت پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہے، ترغیب دینے کا مضائقہ نہیں ہے، بذات خود تبلیغ کی ہیئتِ موجودہ کو مقصود بنا لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک وسیلہ و ذریعہ کو اصل مقصد بنا لیا جائے، یہ بات شرعی اصول کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔

(۵) تبلیغ کے نام پر اتنے بڑے بڑے اجتماعات کا اہتمام بھی کھٹکتا ہے، ۱۳۹۰ھ میں دہلی مرکز میں مجھے دو ہفتہ رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت وہاں بڑے حضرات سے سنتا تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہ بڑے اجتماعات کی اجازت بہت مشکل سے دیتے تھے، وہ بڑے اجتماعات کو پسند نہیں کرتے تھے، پھر حضرت مولانا کے مکاتیب میں بھی یہ مضمون دیکھا کہ وہ ہفتہ واری اجتماع کو اہم قرار دیتے تھے، مگر اب بڑے اجتماعات کی بڑی کثرت ہوگئی ہے، اور انہیں عوام کی نظروں میں ایسا تقدس حاصل ہوتا جا رہا ہے جیسے آگے چل کر یہ حج کے اجتماع کے مشابہ قرار پا جائیں گے، چنانچہ زبانوں پر مجمع کی تعداد کے لحاظ سے سہی، حج کے اجتماع سے اس کا موازنہ آنے لگا ہے۔ کیا بعید ہے کہ کچھ دنوں کے بعد تقدس کے اعتبار بھی موازنہ ہونے لگے۔

پھر ایک ایک اجتماع میں کڑوڑوں روپئے صرف ہو جاتے ہیں، کشن گنج بہار میں ابھی ۲۸ رفروری کو اجتماع ہوا تھا، اس سے کچھ دنوں پہلے اس کے قریبی ضلع ارریہ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا، معلوم ہوا کہ ارریہ کوٹ کے ایک شخص نے اس کے ایک حصے کے شامیانے کے لئے چار لاکھ روپئے دیئے ہیں، صرف تین چار روز کے لئے اتنے پیسے صرف کر دیئے جاتے ہیں، ایک ظاہری شان وشوکت معلوم ہونے لگتی ہے، فخر سے لوگوں کی زبانوں پر یہ آنے لگتا ہے کہ اتنے اتنے لاکھ آدمی جمع ہوئے تھے، لیکن کیا اتنے صرفہ کے بقدر اس کے نتائج نکلتے ہیں؟ یہ بہت قابل توجہ ہے۔

ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں دینی مکاتب اور مدارس کی سخت ضرورت ہے لیکن گاؤں میں یہ مکاتب و مدارس نہیں چل پاتے، کیوں کہ عمارت نہیں ہے، اساتذہ کی معقول کفالت نہیں ہے، بچے دین سے جاہل رہتے ہیں، ان مدارس ومکاتب کے لئے پکارا جاتا ہے تو وہی لوگ غریب ہو جاتے ہیں، جو اجتماعات کے سلسلے میں خاصے دولت مند نظر آتے ہیں، انہیں اس ٹھوس

اور بنیادی خدمت دین کے لئے خرچ کی توفیق نہیں ہوتی، اور وقتی اجتماع کے لئے لاکھوں لاکھ روپئے مسلمانوں کی جیب سے بے تکلف نکل آتے ہیں، ان بڑے اجتماعات کے بجائے چھوٹے چھوٹے اجتماعوں کو کارآمد بنانے کی سعی کرنی چاہئے، تاکہ بے تحاشا اخراجات بھی نہ ہوں، اور دینداری لوگوں میں آہستہ آہستہ راسخ ہوتی رہے، اوراس کے ساتھ ہر جگہ مدارس ومکاتب کا نظم کیا جائے کہ بچے ابتدا ہی سے دین سیکھ جائیں۔

یہ چند باتیں جماعت اور اجتماعات کو دیکھنے کے بعد عموماً محسوس ہوتی ہیں، برائے اعتراض نہیں، ازراہ خیرخواہیٔ دین ومذہب بزرگان تبلیغ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں، اس پر توجہ فرمائیں، ورنہ یہ جماعت بھی مختلف فرقوں کی طرح ایک فرقہ بن کر رہ جائے گی، بلکہ اسی رخ پر چلنے لگی ہے، حضرات اکابر اگر توجہ دیں تو اس کا تدارک ہوسکتا ہے۔

ان ارید الا الاصلاح مااستطعت. وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کی فقہ کا لوگوں کو سرکاری طور پر پابند کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن امام مالک علیہ الرحمہ نے اس کو منع کر دیا تھا۔

تبلیغی جماعت اوراس کے اجتماعات

تحریکات کا مزاج عموماً یہ ہے کہ کوئی صاحبِ عزیمت شخص اسے برپا کرتا ہے، اوراس کے مقاصد متعین کرتا ہے، ابتدا میں وہ انہیں خطوط پر کام کرتی ہیں، اوراپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مناسب طریقے اختیار کرتی ہیں، اور ڈرتی بھی رہتی ہیں کہ اصحابِ نظر کہیں اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں، احتیاط کو بھی کام میں لاتی رہتی ہیں، لیکن جب یہ تحریکیں پھیل جاتی ہیں اور کسی درجہ میں مقبول اور مؤثر ہوجاتی ہیں تو ہر قسم کے رطب ویابس لوگ اس میں گھس آتے ہیں، اور جو آتا ہے اپنے نظریات وخواہشات سمیت آتا ہے، پھر یہ تحریکات احتیاط ترک کرکے بہت سے نامناسب امور میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ ذمہ داروں کی طرف سے ایسے عناصر سے اس کی تطہیر کا عمل ہوتا رہے تو ان کی افادیت کچھ عرصے تک برقرار رہتی ہے، لیکن اگر انہیں عناصر کا غلبہ ہوجائے اور اس کی تطہیر نہ ہوسکے تو نفع سے زیادہ نقصان ہونے لگتا ہے۔

ادھر پچھلی صدیوں میں ہندوستان میں بھی اور ہندوستان کے باہر بھی مختلف مقاصد کے لئے مختلف نام سے بہت سی تحریکیں اٹھیں، جنہوں نے کچھ مدت تک مناسب کام کئے، مگر بعد میں ''**واثمھما اکبر من نفعھما**'' کی مصداق بن کر رہ گئیں۔

پچھلی صدی میں دین کی خدمت، اس کی تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں کے درمیان دینی علم وعمل کی ترسیخ واستحکام کے لئے مشہور داعی بزرگ حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی نوراللہ مرقدہ نے ایک عظیم تحریک کی بنیاد ڈالی، یہ تحریک بہت مخلصانہ تھی، اس کے پیچھے زبردست اخلاص اور دینی جذبہ کام کررہا تھا، حضرت مولانا ہمہ اخلاص ہمہ سوز اور ہمہ عزیمت تھے، ان کے جوش اندروں نے تھوڑے عرصے میں دینی علم وعمل کا ایک ایسا صور پھونکا کہ مشرق سے مغرب تک

مسلمان چونک پڑے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ جو دین سے بے گانہ تھے، ایمان و اسلام کے داعی بن گئے، امیر المومنین حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کی اصلاحی وایمانی اور جہادی تحریک کے بعد اس کا قدرے پرتو حضرت مولانا الیاس صاحب کی تحریک میں نظر آیا، ابتدا میں یہ تحریک احتیاط سے چلی، حضرت مولانا علیہ الرحمہ علما کو متوجہ کرتے رہتے کہ اس کے طریق کار کو دیکھتے رہیں، کہیں کوئی غلطی تو دراندازنہیں ہورہی ہے؟ پھر یہ تحریک بڑھی اور پھیلی اور اس میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوگئے، چونکہ اس کا مزاج دعوت ہے اس لئے ہر ایک کو اس میں آنے کی دعوت دی گئی، دعوت ہی نہیں اس میں شامل ہونے پر غیر معمولی اصرار کیا گیا، پھر ظاہر ہے کہ ہر طرح کے عناصر داخل ہونے ناگزیر تھے، تحریک کی ہمہ گیری نے اور عوامی رویے کی سطحیت نے جہاں اس میں شرعاً نامناسب چیزیں داخل کردیں، وہیں اس کا مزاج بھی تبدیل ہوگیا، پہلے علما کا علم وتقوی معیار تھا کہ اس جماعت میں کوئی غلطی نہ آجائے، مزاج بدلا تو یہی تحریک حق بن گئی، صرف حق نہیں معیارِ حق بن گئی، اب اس تحریک میں شامل افراد کا عام خیال یہ ہے کہ جو عالم خواہ کتنا ہی صاحب علم ہو، اگر اس تحریک سے وابستہ ہے تو معتبر ہے، ورنہ خارج از اعتبار ہے، ایک چلتی ہوئی مثال بکثرت سننے میں آتی ہے کہ ''یہ تحریک سفینۂ نوح کے مثل ہے، جو اس میں آگیا وہی ہدایت پر ہے، نجات یافتہ ہے، ورنہ غرق طوفان ہے''!

یہ مثال اور بحالات موجودہ اس مثال کو اس تحریک پر منطبق کرنا غلو کا ایک نمونہ ہے، عوام الناس کا خیال کچھ اور رنگ پر آگیا ہے کہ یہ تحریک اور اس تحریک کا ہر طریق کار معصوم ہے، اس پر نہ ٹوکا جاسکتا اور نہ اس میں غلطی کا تصور کیا جاسکتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی عالم نے کسی بدعنوانی پر تنبیہ کی تو اس تحریک کے افراد اسے مخالفت قرار دے کر حیز اعتنا والتفات سے اسے خارج کردیتے ہیں، اس مزاج میں یہ جماعت اتنی پختہ ہوگئی ہے کہ اس کے اپنے افراد بھی اگر کسی بات پر نکیر کرتے ہیں تو وہ بات نہیں خود نکیر کرنے والا نظر سے گرجاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نوراللہ مرقدہ نے جن خطوط پر جماعت کی تحریک چلائی تھی اور ان کے جو خیالات تھے، ان سے اب یہ جماعت بہت ہٹ چکی ہے۔ حضرت مولانا کے ملفوظات کا مجموعہ مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے مرتب فرمایا، اور ان کی سوانح حیات نیز

ان کی اس تحریک کا تعارف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ نے تفصیل سے لکھا ہے، انہیں ملاحظہ فرمائیے، اور جس رخ پر جماعت چل رہی ہے دونوں کا موازنہ کیجئے تو بہت فرق ملے گا، غالباً اسی وجہ سے یہ دونوں کتابیں تبلیغی تحریک میں بار نہیں پاسکی ہیں۔

اس تبلیغی تحریک میں ایک بڑا اہم مقام ''اجتماعات'' کا ہے، اس تحریک میں چھوٹے بڑے اجتماعات کا ایک دستور سا ہوگیا ہے، ایک روز کے مختصر اجتماعات تو خیر کسی قدر مفید کہے جاسکتے ہیں، مگر بہت بڑے بڑے اجتماعات کی افادیت مشکوک ہے، بڑے اجتماعات کا اہتمام بہت ہوتا ہے، تین روز کے اجتماع کے لئے اللہ ہی جانتا ہے کتنا مال خرچ ہوتا ہے؟ اور اس مال کا حصول شرعی اعتبار سے قباحت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس تحریک سے وابستہ حضرات دینی مدارس کے چندوں کی بہت تحقیر کرتے ہیں، مدرسہ کی خدمت کو دینی خدمت ماننے سے ان کے دلوں میں گرانی ہوتی ہے، کیوں کہ یہ چندے کرتے ہیں، اور ان میں خدمت کرنے والے انہیں چندوں سے تنخواہ پاتے ہیں، لیکن جب ان اجتماعات پر خرچ ہونے والے سرمایے پر نظر ڈالی جاتی تو یہ چندہ نہیں ٹیکس معلوم ہوتا ہے، اجتماعات کے منتظمین مسلمانوں کی آبادیوں پر اخراج کی مدات تقسیم کردیتے، بانس بلی کی ذمہ داری، کھانے پینے کی ذمہ داری، پانی کی ذمہ داری، ٹینٹ کی ذمہ داری، قضائے حاجت کے مواقع کی ذمہ داری اور اللہ جانے کیا کیا ذمہ داریاں مختلف آبادیوں کے ذمے کردی جاتی ہیں، اب اسے خواہی نخواہی یہ کام کرنا ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ وہ لوگ دین سے گریز کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف طرح کی وعیدیں لوگوں نے گھڑ رکھی ہیں، جنہیں سنا سنا کر لوگوں کو ہلکان کیا جاتا ہے، پھر یہ بڑے اجتماعات عوام الناس کے لئے میلے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں، اور اس کام سے وابستہ لوگوں کے لئے فخر وریا اور شہرت ونمو کا ذریعہ بن جاتے ہیں، عرصہ تک یہ چرچا کیا جاتا ہے کہ اتنے اتنے لاکھ لوگ اجتماع میں آئے، اور اجتماع سے پہلے بھی خوب پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اتنے اتنے لاکھ افراد آئیں گے، یہ پروپیگنڈہ اتنے منظّم پیمانے پر ہوتا ہے کہ شبہہ ہونے لگتا ہے کہ یہ ریا ونمود ہی مقصود ہے، بلکہ اس کی ہر ہر چیز کی الگ الگ تشہیر کی جاتی ہے، مجمع کی زیادتی کی الگ، تشکیل کی الگ، اتنی اتنی جماعتیں بن کر نکلیں، اس کی الگ، خصوصاً دعاؤں کی بہت تشہیر

کی جاتی ہے، اجتماع کی کامیابی کے لئے دعا کی تشہیر، اس کے لئے اعتکاف کی تشہیر، اس کے لئے روزہ رکھنے کی تشہیر، پھر اجتماع کے خاتمے کے دعا کی تشہیر! اس کے علاوہ اجتماع میں اجتماعی نکاح کا اہتمام! خدا جانے اس کے کیا لوازمات والتزامات ہیں؟ پھر اس اجتماع کے سلسلے میں تقدس کا ایسا اعتقاد دیا جانے لگا ہے کہ نہ مدارس کی تعلیم، نہ خانقاہوں کے اشغال واوراد، نہ کسی اور دینی جماعت کی سرگرمی، کسی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی، بلکہ اب تو زبانوں پر حج کے اجتماع سے موازنہ بھی دبے دبے لہجے میں آنے لگا ہے، اندیشہ ہے کہ یہ لہجہ آئندہ بلند ہو جائے گا۔

اس تحریک اور اس کے اجتماعات کے یہ رویے، بہت زیادہ اندیشہ ناک ہیں کہ کہیں یہ تحریک جو دین کی خدمت کے لئے اٹھائی گئی تھی خود مستقل دین نہ بن جائے۔ عملاً رویہ کچھ ایسا ہی ہے کہ یہ خود ایک مستقل دین بن گئی ہے، ایسی صورت میں اصحاب علم کو مجبوراً کہنا پڑے گا کہ یہ تحریک اور یہ طریقۂ کار سنت سے دور جا پڑا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اب بجائے خادمیت کے اس میں مخدومیت کی شان آ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆

بے احتیاطیوں کا طوفان

دور حاضر میں گھٹیا صحافت بھی ایک فن ہے، اور اس کی فن کاری یہ ہے کہ بے بنیاد کوئی بات اڑادی جائے، اور اس طرح اڑادی جائے کہ وہی حق وصداقت کی سند بن جائے، کتنی ہی بے سند باتیں ہیں جو اس صحافت کے کرشمہ سے معیار صدق بن گئی ہیں، حالانکہ اگر واقعی انہیں تلاش کیا جائے تو ان کی حقیقت ایک افواہ سے زیادہ نہ ہوگی، بڑی بڑی شخصیتوں کو اس صحافت کی کرشمہ سازیوں نے معمولی درجہ کے انسان سے بھی گیا گزرا بنادیا ہے، اور بعض نامعقول اور ناہموار اشخاص کو ''ہیرو'' بنا کر پیش کردیا ہے۔

اس فن کا ایک نمونہ دیوبند سے شائع ہونے والے ایک نومولود رسالہ جس کو برائے نام نسبت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے ساتھ ہے، یعنی ''عزم حسین احمد''اس کے ٹائٹل کے آخری صفحے پر دیکھنے میں آیا، اس کے آخری صفحے کی فوٹو کاپی دیوبند ہی سے ایک بزرگ نے دفتر المآثر کو ارسال فرمائی، اس پر عنوان ہے''حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مشاہیر کی نظر میں''۔

اس عنوان کے تحت مشاہیر کے اقوال درج کئے گئے ہیں، ان میں نمایاں نام حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب، محدث کبیر مولانا حبیب الرحمان الاعظمی صاحب، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے ہیں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اقوال مرتب نے کہاں سے نقل کئے ہیں، کوئی حوالہ تو دیا نہیں کہ تحقیق کی جاسکتی، لیکن یہ اکابر ہمارے ہی دور کے ہیں، اور ہماری قریبی شخصیات ہیں، جن کے مزاج ومذاق سے واقفیت رکھنے والے بہت سے لوگ ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں بزرگوں کے ذوق و

مزاج کو اگر سامنے رکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض اسی گھٹیا صحافت کی چابکدستی ہے، جس کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے، مثلاً مولانا منت اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔

''عام انسانوں کے دماغ کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے، مگر مولانا مجاہدالاسلام کے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں''۔

اللہ جانے ایک کھڑکی اور ساری کھڑکیاں کھلی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ ایک بے معنی اور مہمل جملہ ہے، جس کا مطلب کوئی چاہے تو مدح کی صورت میں لے لے، اور اگر چاہے تو اسے مذمت اور تنقیص بنادے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب علیہ الرحمہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ:

''اگر کوئی شخص اپنے وقت کا امام اعظم ابوحنیفہ دیکھنا چاہتا ہے تو وہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی کو دیکھ لے''۔

مبالغہ خود مبالغہ کی حد سے تجاوز کئے ہوئے ہے، اللہ ہی بہتر ہے کہ یہ قول کس کا ہے؟ لیکن اس پر نام چسپاں مولانا علی میاں صاحب کا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم ہی کا اگر یہ قول ہے تو خود ان کی شخصیت مشکوک قرار پائے گی، اتنا بڑا صاحب نظر کیسی کم نظری کی بات کرتا ہے کہ اسے نہ امام ابوحنیفہ کے مقام کی خبر ہے اور نہ قاضی صاحب سے واقف ہے۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی قدس سرہ کی طرف جو قول منسوب ہے اسے بھی ملاحظہ فرمایئے:

''اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آتا تو قضا کے سب سے بڑے عہدے پر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی فائز ہوتے''۔

اس قول کو وضع کرنے والا گویا یہ سمجھتا ہے کہ جو چاہو لکھ کر جس کی طرف جی چاہے منسوب کردو، جھوٹ اور افترا کی صحافت میں کون ہے جو سچ کو کرید ے، اور اگر کوئی سچ کو کرید کر نکالے بھی تو جہاں جہاں جھوٹ پہونچ چکا ہے کیا ضروری ہے کہ وہاں وہاں سچ بھی پہونچ جائے، اور اگر پہونچ بھی گیا تو جھوٹ کے دھوئیں سے جن کے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں کیا وہ سچ

کوجھوٹ نہ سمجھ لیں گے؟ صحافت کی کرشمہ سازی سے جھوٹ چل گیا، سچ کہاں تک تعاقب کرے گا، اور کیا ضروری ہے کہ تعاقب میں کامیاب ہی ہوجائے، کہیں اسی پر جھوٹ اور غلط بیانی کا لیبل نہ لگ جائے۔

جولوگ حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ کی محتاط اور سنجیدہ طبیعت سے واقف ہیں اور جن کو پتہ ہے کہ حضرت کی تقریر وتحریر میں مبالغہ آرائی کی کہیں گنجائش نہیں ہوتی، بڑی بڑی شخصیتوں حتی کہ اپنے اساتذہ کے اظہارِ کمال میں بھی وہ مبالغہ سے کام نہیں لیتے، وہ اس قول پر دروغ کی نشانیاں صاف دیکھ رہے ہیں۔

قاضی صاحب شہرت کی بلندی پر فقہ اکیڈمی، فقہی سیمیناروں اور ملی کونسل کی تاسیس کے بعد نمایاں ہوئے ہیں، اس سے پہلے وہ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی علیہ الرحمہ کے تحت امارت شرعیہ میں کام کرتے تھے، اور بلاشبہہ امارت کے بڑے قاضی تھے، لیکن ان کی فقہی اور علمی تحریریں یا کمالات منظر عام پر نہیں آئے تھے، محدث کبیر جیسا محتاط عالم اتنی غیر محتاط اور مبالغہ آمیز بات کیسے کہہ سکتا ہے؟ ہاں اگر حضرت مولانا کی بات سنی ہو تو سننے والے آپ کو سنائیں گے کہ حضرت مولانا ہر نئی تحریک اور علم دین کے نام پر ہر نئی سرگرمی سے بہت چوکنا رہتے تھے، حضرت کی حیات میں چند ایک فقہی سیمینار ہوئے، حضرت نے اس کا رخ بھانپ لیا تھا، اس وقت فرمایا تھا کہ:

''اس قسم کے سیمینار فقہ حنفی کو مسخ کردیں گے''۔

بعد کے تجربات نے اس کو سچ ثابت کردیا۔ اس ارشاد کو سننے والے حضرت کے تلامذہ مدرسہ مرقاۃ العلوم میں موجود ہیں، ان سے اس کی تصدیق حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس سطور کا مقصد قاضی صاحب کی شخصیت پر حرف رکھنا نہیں ہے، ادارۂ المآثر کو تو ان سے مسلسل اختلاف رہا ہے، ان کی سیمیناری سرگرمیوں پر المآثر نے برابر ان کو ٹوکا ہے، مقصد یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی عظمت کے لئے ان وضعی اقوال سے ان محترم اور بزرگ ہستیوں کو داغدار نہ کریں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ رسالہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

قدس سرہ کے نام سے شرفِ انتساب رکھتا ہے، اور حضرت شیخ کے نامور صاحبزادگان جو بذات خود ملک وملت کی اہم اور گرانمایہ شخصیتیں ہیں، ان سے اس رسالہ کا دامن کسی نہ کسی عنوان سے وابستہ ہے، ان اہم اور مقدس انتسابات کی وجہ سے رسالہ کا بڑا وقار اور وزن خواص وعوام کے حلقے میں ہونا چاہئے، لیکن اس طرح کی بے سروپا باتیں اس وقار اور وزن کے منافی اور اسے مجروح کرنے والی ہیں۔

فدائے ملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی اس طرف توجہ فرمائیں تا کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ سے شرف نسبت رکھنے والا رسالہ بے احتیاطیوں کے طوفان کی زد میں نہ آئے۔

☆☆☆☆☆☆

صبر

عربی زبان میں صبر کے معنی روکنے کے ہیں،یعنی اپنی طبیعت کوگھبراہٹ اور بےقراری سے روکنا،اسے شریعت اورعقل کے تقاضوں پرعمل کرنے کے لئے آمادہ کرنا،زبان کوشکایت اور اظہارنا گواری سے روکنا،اور ہاتھوں کوگریبان پھاڑنے اور چہرہ نوچنے سے بچانا۔

صبر کی قسمیں:

صبر کی تین قسمیں ہیں۔(۱)اللہ کے احکام پر اپنے کو جمانا(۲)جن چیزوں سے اللہ نے منع کیا ہے ان سے اپنے آپ کوروکنا(۳)اللہ کی طرف سے جومصائب آئیں ان پرصبر کرنا۔

صبر کے متعلق اللہ کے ارشادات:

(۱) **واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ وانها لکبیرۃ الا علی الخاشعین** (سورہ بقرہ ۴۵)

اورصبر اورنماز کے واسطے سے مدد چاہو،اور بیشک نماز بھاری ہے مگر وہ لوگ جوخدا کے سامنے جھکنے والے ہیں۔(ان پر بھاری نہیں)

(۲) **یا ایها الذین آمنوااصبروا وصابروا ورابطوا وتقوا الله لعلکم تفلحون.** (سورہ آل عمران ۲۰۰)

اے ایمان والو!صبر کرواورایک دوسرے کے مقابلے میں جم کر رہواورمقابلہ کے لئے مستعدرہو،اوراللہ سے ڈروتا کہ تم کامیاب ہو۔

(۳) **ماعندکم ینفد وما عندالله باق ولنجزین الذین صبروا اجرهم باحسن ماکانوا یعملون.** (سورہ النحل:۹۶)

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس وہ ہمیشہ رہے گا، اور جن لوگوں نے صبر سے کام لیا ہم ضرور ان کے بہترین کاموں کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

(۴) **اولٰئک یجزون الغرفة بما صبروا ویلقون فیها تحیة وسلا ماً** (سورہ الفرقان:۷۵)

یہی لوگ ہیں کہ ان کے صبر سے کام لینے کی وجہ سے اونچے بالا خانے جزا میں ملیں گے، اور ان میں انہیں مبارکبادیاں اور سلامتی کی بشارتیں حاصل ہوں گی۔

(۵) **قل یٰعبادِ الذین آمنوا اتقوا ربکم للذین احسنوا فی هذة الدنیا حسنة وارض الله واسعة ،انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب.** (سورہ زمر:۱۰)

تم کہہ دو! اے میرے وہ بندو! جو ایمان لائے، اپنے رب سے ڈرو، جن لوگوں نے نیکی کا عمل کیا، ان کے لئے اس دنیا میں بھلائی ہے، اور اللہ کی زمین وسیع ہے، جو لوگ صبر کرنے والے ہیں ان کو ان کا اجر وثواب بے حساب عطا ہوگا۔

احادیثِ رسول:

(۱) حضرت ابوسعید خذری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چند انصاری حضرات نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا، آپ نے عطا فرمادیا، پھر انہوں نے مانگا، آپ نے پھر دیا، اس کے بعد وہ مال ختم ہو گیا، ختم ہونے کے بعد آپ نے فرمایا، میرے پاس جو بھی مال ہوگا میں اسے تم سے بچا اور چھپا کو رکھنے والا نہیں ہوں، اور جو کوئی اللہ تعالی سے پاکیزگی مانگتا ہے، اللہ اسے پاکیزگی عطا فرماتے ہیں، اور جو کوئی غنا مانگتا ہے اللہ تعالی اسے غنا عطا فرماتے ہیں اور سب بڑا عطیہ جو خدا کی طرف سے ملتا ہے، جس سے بڑا کوئی عطیہ نہیں وہ صبر ہے۔ (بخاری ومسلم)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے کہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ جب میں کسی بندہ کو اس کی آنکھوں کی آزمائش میں ڈالتا ہوں (یعنی بینائی ختم ہوجاتی ہے) اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو ان دونوں کے بدلے میں اسے جنت عطا کرتا ہوں۔ (بخاری)

(۳) حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گزر رہے تھے، ایک عورت ایک قبر کے

پاس بیٹھی رورہی تھی،آپ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور صبر کرو، بولی ہٹئے آپ! آپ کو میری مصیبت کا کیا پتہ؟ اس نے آپ کو پہچانا نہیں، بعد میں اسے بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ تھے، تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا، فرمایا صبر تو ابتداءِ صدمہ ہی کے وقت ہے۔ (بعد میں تو از خود صبر آ جاتا ہے) (بخاری ومسلم)

(۴) حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مومن کا معاملہ بھی کیسا عجیب ہے، اس کا سارا معاملہ اس کے لئے خیر ہے، یہ بات مومن کے علاوہ اور کسی کو میسر نہیں، اگر اسے خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو اس پر شکر ادا کرتا ہے، یہ اس کے حق میں خیر ہے، اور کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو صبر کرتا ہے، اور یہ اس کے حق میں خیر ہوتا ہے۔ (مسلم)

(۵) حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کسی مرد مومن کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے، خواہ درد ہو، مرض ہو، فکر اور غم ہو، اور کوئی زحمت ہو، یہاں تک کہ کوئی کانٹا چبھتا ہے تو اس سے اللہ تعالی اس کی خطاؤں کو مٹا دیتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

اقوالِ سلف:

(۱) امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمام کاموں میں صبر کا وہی درجہ ہے جو بدن میں سر کا درجہ ہے، جب جسم سے سر جدا ہو جاتا ہے تو جسم خراب ہو جاتا ہے، اسی طرح جب معاملات میں سے صبر ہٹ جاتا ہے تو سب معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایمان کے دو حصے ہیں، آدھا صبر ہے اور آدھا شکر ہے۔

(۳) ابوحاتم فرماتے ہیں کہ صبر تمام کاموں کا خلاصہ ہے، پختگی کا نظام ہے، عقل کا مدار ہے، بھلائی کا تخم ہے اور جس کے پاس کوئی تدبیر نہ ہو، صبر اس کی تدبیر ہے۔

(۴) ایک حکیم نے کہا کہ صبر کامیابی کی کنجی ہے، اور اللہ پر بھروسہ کرنا کامرانی کا قاصد ہے۔

(۵) بعض سلف نے فرمایا: اس ذات کے فیصلے پر صبر کرو، جس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں، اور

اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں۔

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صبر کی دو قسمیں ہیں، ایک ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرنا، دوسرے اپنی محبوب شے سے صبر کرنا، یعنی ناجائز چیزیں جو عموماً مرغوب نفس ہوتی ہیں، ان سے صبر کئے رہنا۔

(۷) نیز فرمایا: زمانے کے دو دن ہیں، ایک دن وہ جو تمہارے موافق ہے اور ایک دن وہ جو تمہارے مخالف ہے۔ جب موافق دن ہو تو اتراؤمت، اور جب مخالف دن ہو تو گھبراؤمت، صبر کرو۔

(۸) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے چار چیزوں میں بھلائی کو جمع پایا۔ (۱) نوافل کے ذریعے اللہ کی محبوبیت حاصل کرنا (۲) اللہ کے فیصلوں پر صبر کرنا (۳) اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا (۴) اللہ کی نظر سے حیا کرنا۔

صبر کا نمونہ:

حضرت سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عروہ زبردست تابعی وفقیہ ہیں، اور مومن صابر کے لئے جو اللہ تعالی کی تقدیر پر راضی رہنا چاہتا ہے، بہترین نمونہ ہیں، ان کے پاؤں میں کینسر جیسا مرض ہو گیا، اطبا نے تجویز کیا کہ ان کا پاؤں کاٹ دیا جائے، ورنہ پنڈلی اور ران تک پہونچ جائے گا، اور ہوسکتا ہے کہ پورے بدن میں سرایت کر جائے، آپ نے کاٹنے کی بخوشی اجازت دیدی، لوگوں نے ان کے سامنے کوئی نشیلی چیز پیش کی کہ اس کو پی لیجئے، اس سے عقل مستور ہو جائے گی، تکلیف کا احساس نہ ہوگا، اور آسانی سے کاٹا جا سکے گا، فرمایا کہ میرا خیال ایسا نہیں ہے جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہوگا وہ ایسی چیز نہیں پئے گا جس سے اس کی عقل غائب ہو جائے، اور وہ خدا کو بھی نہ پہچان سکے، مجھے ایسے ہی رہنے دو، میں دو رکعت نماز پڑھتا ہوں، نماز کے آخر میں پاؤں کاٹ دینا، لوگوں نے ایسا ہی کیا، حضرت عروہ ساکت وخاموش رہے، نہ انہیں احساس ہوا اور نہ تکلیف ہوئی نہ کچھ بولے۔

پھر اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ ان کی آزمائش ان کے ایمان کے بقدر ہو، جس دن ان کا پاؤں کاٹا گیا اسی دن ان کا ایک بیٹا جوان کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھا، چھت سے گر کر

مر گیا،لوگ تعزیت کے لئے ان کے پاس گئے ،انہوں فرمایا:اے اللہ! سب تعریف آپ کے لئے ہے،سات تھے،آپ نے ایک ہی کولیا،اور چھ کو باقی رکھا،اور میرے ہاتھ پاؤں چار تھے،آپ نے ایک ہی کولیا،اور تین کو باقی رکھا،اگر آپ نے لیا ہےتو بے شک دیا بھی ہے،اور اگر آپ نے مبتلائے آفات کیا تو اس سے بدرجہا زائد عافیت بھی بخشی۔

☆☆☆☆☆☆

اخلاص

اعوذ بالله من الشیطان الرجیم   بسم الله الرحمان الرحیم

ومـاامـروا الا لیعبـدوا اللـہ مخلصین له الدین حنفا ء یقیموا الصلوۃ ویوتوا الزکوٰۃ وذالک دین القیمۃ. (سورہ البینہ)

اوران کوحکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی، خالص کر کے اس کے واسطے بندگی، ابراہیم کی راہ پر، اورقائم رکھیں نماز، اوردیں زکوٰۃ، اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے ان بدنصیبوں کا ذکر کیا ہے جنہیں آسمانی کتاب سے نوازا گیا تھا، لیکن انہوں نے اس کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات کی پیروی کی، اور اس کے نتیجے میں ان کی الگ الگ پارٹیاں اور ٹکڑیاں بن گئیں، وہ لوگ بجائے خداپرستی کے خواہش کی پوجا کرنے میں لگ گئے، اور چونکہ ہر آدمی کی خواہش الگ ہوتی ہے، اس کا مفاد الگ ہوتا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ ان میں بہت سی ٹولیاں بن جاتیں، اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ان کو تو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ سب کی طرف سے یکسو ہوکر صرف اللہ کی بندگی کریں، اوراس بندگی میں کسی اورکو بالکل شریک نہ کریں، جیسا ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا، ان کی قوم ستاروں کو پوجتی تھی، چاند کو خدا سمجھتی تھی، سورج کو دیوتا بنائے ہوئے تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سب معبودوں کی نفی کر کے ارشادفرمایا: **یٰقـوم انـی بـرئ مـمـا تشرکون انی وجهت وجهی للذی فطر السموٰت والارض حنیفاوما انا من المشرکین.** (سورہ انعام ۷۸،۷۹)

اے میری قوم! جن چیزوں کوتم لوگ خدائی میں شریک کرتے ہو، میں ان سب سے الگ ہوں، میں نے اپنا قبلۂ توجہ سب سے یکسو ہوکر صرف اس ذات کو بنایا ہے جس نے آسمان وزمین کو پیدا

کیا،اور میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں۔

یہی راہ ابراہیم علیہ السلام کی ہے کہ جب اللہ کو اپنا خالق و مالک اور رب مان لیا اور بندگی کا سران کے سامنے جھکا لیا تو اب کوئی مخلوق خواہ کتنی ہی شان وشوکت رکھتی ہو،اور خواہ وہ کتنی ہی محبوب ہو حتی کہ اپنی خواہش اور دل کی چاہت ہی کیوں نہ ہو،اس کی بندگی اور غلامی ہرگز نہیں ہوگی،اور اگر اللہ کے ساتھ ساتھ بندگی کا تعلق کسی اور سے کسی درجہ میں جوڑ دیا تو یہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔

مصلح الامت حضرت اقدس مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی موجود تھے،حضرت نے ایک اور صاحب کے واسطے سے حضرت محدث جلیل سے دریافت کرایا کہ اخلاص کسے کہتے ہیں؟ ان صاحب نے جس وقت یہ بات پوچھی،حضرت محدث الہند لیٹے ہوئے تھے،اٹھ کر بیٹھ گئے،اور دیر تک سر جھکائے رہے اور پھر فرمایا کہ حضرت سے عرض کردیجئے کہ اخلاص یہ ہے آدمی جس کا ہو بس اسی کا ہو رہے، حضرت کے اس جملے سے اخلاص اور حنیف ہونے کی حقیقت کھل جاتی ہے،آدمی اللہ کا بندہ ہے تو بس اللہ ہی کا ہو رہے،کوئی اور دروازہ اس کا مرکزِ نگاہ نہ ہو۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا ایک دوہا مشہور ہے،اس میں بھی اسی اخلاص اور حنیف کی ترجمانی اور اس کے بہترین ثمرہ کا بیان ہے،سننے اور لوحِ دل میں نقش کر لینے کے لائق ہے۔

جہہ کتا دَر دَر پھرے   دَر دَر دُر دُر ہوئے
ایک دَر کو تھام لے   کہے نہ دُر دُر کوئے

آوارہ کتا ہر دروازہ پر جاتا ہے اور ہر جگہ سے دُر دُر ایا جاتا ہے،اور ایک مالک کے دروازے سے چمٹا ہوا کتا روزی پاتا رہتا ہے،اور کسی کی دُر دُراہٹ سننے کی نوبت نہیں آتی، اخلاص و بندگی کی یہی شان ہے کہ جب اللہ کو رب مان لیا،تو ہر طرف سے کٹ کر ساری نیاز و بندگی سب حاجت روائی،مشکل کشائی اس کے متعلق کردی۔ **ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا** (بے شک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے،پھر اسی پر جم گئے) **واذکر اسم**

ربک وتبتل الیہ تبتیلاً(سورہ مزمل)اور پڑھے جا نام اپنے رب کا،اور چھوٹ کر چلا آ،اس کی طرف سب سے الگ ہوکر۔ پھر ارشاد ہوا کہ''اورانہیں اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ نماز قائم رکھیں،اورزکوٰۃ ادا کرتے رہیں،یہی پختہ کارلوگ یعنی انبیاءوصالحین کا دین ہے''۔

اللہ کا یہ حکم جیسے پہلے لوگوں کو تھا آج بھی یہی حکم ہے،اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، زمانے کے حالات بدلتے رہیں مگراس حکم میں تبدیلی نہیں ہے،اللہ کے تمام بندوں سے اللہ کا یہی مطالبہ ہے،بندوں کی سرخروئی اسی میں ہے کہ حق تعالی کے اس پاک حکم کی تعمیل جان ودل سے اور ذوق وشوق سے کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆☆

اہل بیت کون ہیں؟

سوال: گزارش ہے کہ رسالہ فروری مارچ کا موصول ہوا، اپنی معلومات کے لئے عرض ہے کہ صفحہ ۵۹ پر تین بنات طاہرات کا آپ نے ذکر کیا ہے، حضرت ام کلثوم، حضرت رقیہ، حضرت زینب کا۔ بعدۂ اہل بیت کا تذکرہ ہے، کیا صرف حضرت فاطمہ ہی اہل بیت میں داخل ہیں، یہ چاروں بیٹیاں حضرت خدیجہ ہی کے بطن سے ہیں، یا میری معلومات میں کمی ہے، آخر سب کو اہل بیت میں شمار کیوں نہیں کیا گیا، میری معلومات کے مطابق رافضی ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں، صرف انھیں کو اہل بیت میں شمار کرتے ہیں جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، امید کہ تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں گے۔

(ضیاء الدین کانپور)

جواب:

میرے جس مضمون کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس میں خاکسار نے مقبرۂ مبارکہ جنت البقیع کے اندر چند اصحاب کرام کی قبروں کی نشان دہی کی ہے، اور اس کا ماخذ ایک عربی کتاب ہے، جس کا نام ''بقیع الغرقد'' ہے، اس میں جس طرح قبروں اور ان میں مدفون بزرگوں کا تذکرہ ہے، میں نے اسی طرح نقل کر دیا ہے، اس وقت میرے ذہن میں یہ نکتہ نہ تھا جو آپ نے تحریر فرمایا ہے، آپ کے سوال سے ذہن اس کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ تو واقعہ ہے کہ بعض چیزیں شیعوں کی سنیوں کے درمیان رائج ہیں، لیکن ہمارے علماء بالخصوص امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نور اللہ مرقدہٗ کی کوششوں سے اس غلطی کا بہت کچھ ازالہ ہو گیا ہے۔

اہل بیت کون ہیں؟ اس مسئلے میں شیعوں کی ایک منفرد رائے ہے، جو خلاف نقل بھی ہے اور خلاف عقل بھی، خلاف نقل اس لئے کہ قرآن پاک میں اھــل البیــت کالفظ امہات المومنین ازواج النبی ﷺ کے تذکرے کے سیاق میں آیا ہے، یہ لفظ سورۂ احزاب کے چوتھے رکوع میں آیا ہے، اس رکوع کی ابتداء يَـآاَيُّهَـا الـنَّـبِـيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ سے ہے، یعنی اے نبی! آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے، یہاں سے ازواج مطہرات کیلئے خصوصی ہدایات کا آغاز ہے، اسی رکوع میں آیت ذیل ہے:

وَقَـرْنَ فِـیْ بُیُـوْتِـكُـنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَأَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَآتِيْـنَ الـزَّكـوٰةَ وَأَطِعْـنَ اللهَ وَرَسُـــوْلَهُ إِنَّمَا يُـــرِيْدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْـلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (آیت: ۳۶)

اور اپنے گھروں میں جم کر رہو، اور اگلی جاہلیت کے طریقے پر اپنے آپ کو دکھلاتی نہ پھرو، اور نماز قائم رکھو، اور زکوٰۃ دیتی رہو، اور اللہ ورسول کی اطاعت کرتی رہو، اور اللہ یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو! کہ تم سے گندی باتیں دور کردے، اور تمہیں خوب پاک صاف کردے۔

اس آیت کریمہ کا خطاب ازواج مطہرات کو ہے، اسی خطاب کے ذیل میں حق تعالیٰ نے یہ بات بھی فرمائی ہے کہ اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ تم سے گندی باتیں دور رکھیں اور تمہیں خوب صاف ستھرا کردیں، ظاہر ہے کہ یہ خطاب ازواج مطہرات ہی کو ہے، اس لئے اہل بیت اصلاً وہی ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ...... جو شئون الٰہیہ کی زبردست معرفت رکھتے تھے...... نے جب دیکھا کہ اہل بیت کا خطاب ظاہر کے اعتبار سے عام ہے، اور ہر وہ شخص اس کے عموم میں داخل ہوسکتا ہے جو آپ کے گھر کا فرد کہا جاسکتا ہے، تو آپ نے چاہا کہ اس فضیلت خاص میں اپنی اولاد کو بھی شامل فرمالیں، تو آپ نے حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسنین ﷺ کو بلا کر ان کے حق میں بھی بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ یہ بھی میرے اہل بیت ہیں۔

''اس کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کریم اپنے کسی مقرب اور مصاحب سے یہ کہے کہ میرے پاس اپنے اہل خانہ اور گھر والوں کو حاضر کرو، میں انھیں خلعت خاص دینا چاہتا ہوں، اس مقرب اور مصاحب نے عالی ہمت بادشاہ کے لطف وکرم پر نظر کر کے اپنے اہل خانہ کے علاوہ کچھ

دوسرے قریبی اعزہ واقارب کو بھی بارگاہِ شاہی میں پیش کردیا، اور کہنے لگا کہ حضور یہ سب میرے اہل خانہ ہیں، جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ اعزہ واقارب بھی شاہی خلعت ونوازش سے بہرہ مند ہوں۔''(معارف القرآن ادریسی، ج:٦،ص:٢٦٧)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اوران کے شوہر واولاد کو کیوں اکٹھا کیا، آخران کے علاوہ بھی تو تین صاحبزادیاں تھیں، ان کا ذکر کیوں نہیں ہے؟۔

اس کا جواب حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی علیہ الرحمہ نے تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''حضرت خدیجہ کی چار صاحبزادیاں تھیں، رقیہ، ام کلثوم، زینب اور فاطمۃ الزہراء، اول الذکر تین صاحبزادیاں اس آیت کے نزول سے پہلے وفات پا چکی تھیں، صرف حضرت فاطمہ باقی تھیں، اس لئے فاطمہ کو اس دعا کے ساتھ مخصوص فرمایا''۔(دیکھو تفسیر ابن کثیر، ج:٣،ص: ٤٩٣ معارف القرآن ادریسی، ج:٦،ص:٢٦٧)

یہاں ایک سوال اور ذہن میں کھٹکتا ہے کہ لفظ اہل بیت کا اطلاق عموماً انھیں بزرگوں پر کیوں ہوتا ہے، جن کو بعد میں رسول اللہ ﷺ نے اہل بیت میں شامل فرمایا ہے، ازواج مطہرات پر عموماً اہل بیت کا لفظ نہیں بولا جاتا۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ازواج مطہرات کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور لقب سے اسی سورۂ احزاب میں نوازا ہے، وہ ہے ''امہات المومنین'' ۔فرمایا: وأزواجــه أمهــاتهم، اس لقب میں مزید ایک شرف کا بیان ہے، وہ یہ کہ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں ہونے کی وجہ سے تمام اہل ایمان کی مائیں ہیں، یہی لقب مذکورہ حضرات اہل بیت پر عمومی طور پر غالب آگیا ہے، اور وہ حضرات جن کو ایک چادر میں سمیٹ کر آپ نے خصوصی دعا فرمائی اور انھیں اہل بیت میں شامل فرمایا، ان پر ''اہل بیت'' کا لقب عموماً بولا گیا، اور یہ اب سے نہیں، اور کسی اور نے نہیں، خود رسول اکرم ﷺ نے ان حضرات پر بطور لقب کے اطلاق فرمایا ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا چھ ماہ تک یہ معمول رہا

کہ جب آپ فجر کی نماز کے لئے نکلتے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر گزرتے تو فرماتے: یااهل البیت! **إِنَّمَا يُرِيْدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيْراً**، یہ حدیث امام ترمذیؒ نے بھی روایت کی ہے۔

ظاہر ہے کہ چھ ماہ تک جب آپ کا روزانہ کا یہ معمول رہا ہے کہ حضرت فاطمہ اوران کے گھر والوں کو یـا اهـل البیـت کہہ کر پکارتے رہے تو یقیناً یہ لقب ان لوگوں کے لئے مستند اور معروف ہو جائے گا، اسی بنا پر جب مطلق اہل بیت بولا جاتا ہے تو یہی حضرات مراد ہوتے ہیں، اور اس میں کوئی رافضیت نہیں ہے۔

رہی رافضیوں کی ہرزہ سرائی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی اور کوئی صاحبزادی نہ تھی، تو کہنے والے کیلئے یہ بات انتہائی شرمناک ہے، اللہ بچائے۔

☆☆☆☆☆☆

قوم انصار کی حقیقت
اور
قطب، ابدال اور مجذوب کی شرعی حیثیت

حضرت اقدس مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی دامت برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دو تین سوال کرنے کی جرأت کررہا ہوں، امید ہے کہ ناگوار خاطر نہ ہوگا۔

(۱) مسلم انصاری، جولہا مومن یہ ایک فرقہ یا قوم کے نام ہیں، کیا ان کا تعلق حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ہے؟ کیا امام غزالی اسی قوم کے تھے؟۔

(۲) قطب، ابدال، مجذوب کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ کیا ان کا دنیاوی نظام میں کچھ دخل ہے؟۔

(۳) خاتمہ بالخیر اور جنت فردوس میں داخلہ کا یقین کس طرح ہوگا؟

ناچیز محمد شبیر حسن منظرؔ

نیالہیر یا سرائے دربھنگہ، بہار

☆☆☆☆☆

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہندوستان کے عرف میں وہ لوگ جو کپڑا بننے کا پیشہ کرتے ہیں، انھیں ''جولاہا'' کہا جاتا ہے، دستکاری کوئی بھی ہو بشرطیکہ جائز ہو، اس میں شرعاً اور عرفاً کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن اللہ

جانے، دستکاری کرنے والوں کے سروں پر ذلت وخواری کیونکر چسپاں ہوگئی ہے، ہندوستان جو مذہبی طور پر نسل وبرادری کی تفریقات میں ہمیشہ سے مبتلا رہا ہے، اور اس کو یہاں کے مذہبی رہنماؤں نے خدائی ہدایات کا رنگ دے دیا تھا۔ ذات پات کی اس تقسیم کی بنیاد کئی چیزوں پر تھی، ان میں نسل، علاقائیت، مذہبی تقدس اور پیشوں کا خاص لحاظ تھا، دستکاری کرنے والی اقوام خدام اور غلاموں کی فہرست میں تھیں، اسلام کا نور جب اس کفرستان میں چمکا، تو ہر طبقہ کے لوگ اسلام کی آغوش میں آئے، لیکن طبقہ واریت اور ذات پات کی جو پختہ بندشیں تھیں، ان سے یہ ملک آزاد نہ ہوسکا۔

پھر کپڑا بننے والی قوموں میں جو لوگ مسلمان ہیں، اور عموماً وہ مسلمان ہی ہیں، انھوں نے بعض عوامل وموثرات کے نتیجے میں اپنے لئے انصاری اور مومن کا لقب اختیار کیا، ان کے لئے جولاہا کا لفظ باعث ننگ وعار بن گیا تھا۔ اسلامی تاریخ میں ''انصاری'' ایک بڑے شرف والا لقب ہے، یہ ان حضرات کا لقب ہے جنھوں نے مدینہ طیبہ میں حضور اکرم ﷺ کو تشریف آوری کی دعوت دی تھی، اور ان کی دعوت بارگاہِ الٰہی میں منظور ہوئی، آپ کو ہجرت میں وہیں جانے کا حکم ہوا، اور جب آپ کے اصحاب ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے گئے، تو ان حضرات نے ایسی عدیم المثال خدمت آپ کی اور آپ کے اصحاب کی کہ رہتی دنیا تک نصرت اور وفاداری کی ایک دل آویز مثال قائم ہوگئی۔ یہ نسبت کپڑا بننے والی قوم نے اپنے لئے جو اختیار کی، تو میں عرصے تک خلجان میں مبتلا رہا کہ یہ نسبت کس مناسبت سے ہے، ظاہر ہے کہ یہ برادری مدینہ کے انصار سے کوئی نسلی تعلق نہیں رکھتی، ہندوستان کے یہ انصاری حضرات اپنا نسب نامہ چند پشتوں سے اوپر لے جانے سے عموماً قاصر ہیں، کیونکہ آج کے دور سے پہلے ناخواندگی کی شرح اس برادری میں بہت زیادہ تھی پھر کون اپنا نسب محفوظ رکھتا۔ پھر محدث الہند ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہٗ کی بعض کتابیں مطالعہ میں آئیں، تو معلوم ہوا کہ مدینہ کے انصار حضرات میں پارچہ بافی و دستکاری وغیرہ کا عمل رائج تھا، اور اس دستکاری کا رواج خاندانی اعتبار سے اور اوپر سے ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

عرب ممالک میں خصوصیت سے ملک یمن عرصۂ قدیم سے کپڑے کی بُنائی کا مرکز رہا

ہے، وہاں کے اکثر قبائل پارچہ بافی کی صنعت اختیار کئے ہوئے تھے، اور انصار مدینہ یمن ہی سے آ کر یثرب (مدینہ کا قدیم نام) میں آباد ہوئے تھے، اس لئے قدرۃً پارچہ بافی کی صنعت یہاں رائج ہوگئی تھی، غالباً اسی نسبت سے ہندوستان کے اہل حرفت نے اپنے لئے ''انصاری'' کا لقب اختیار کیا۔

محدث الہند ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمہ کی کتاب ''تذکرۃ النساجین'' کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، وہ یمن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کندہ اور اشعر دو یمنی خاندان اور قبیلے تھے، اور یمن میں عموماً بُنائی کا کام ہوتا تھا، اس میں اکثر قبائل کا پیشہ یہی تھا، اس کا سب سے بڑا ثبوت عربی لٹریچر ہے۔ (ص:۶)

اس کے بعد انھوں نے متعدد اشعار کی روشنی میں ثابت کیا کہ یمن میں پارچہ بافی کی صنعت کافی مشہور تھی، پھر تاریخ کی کتابوں کے متعدد حوالے انھوں نے دئے، تفصیل کے لئے اصل کتاب ملاحظہ ہو، پھر لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ میں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ مدینہ منورہ کے انصار بھی یمنی الاصل ہیں، ان کے اجداد یمن سے آ کر مدینہ میں آباد ہوئے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ انصاریوں کے متعدد گھرانوں میں بُنائی کا کام ہوتا تھا، جیسا کہ متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ (ص:۸)

مدینہ شریف میں جو لوگ بُنائی کا کام کرتے تھے، ان میں ایک روشن نام میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا ہے، حضرت محدث الہند لکھتے ہیں کہ:

''معارج النبوۃ میں ہے کہ آپ بھی حیا کت کیا کرتے تھے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ جب مدینہ پہونچے ہیں تو صرف یہ خیال کر کے میں غریب بننے والا ہوں، اپنے یہاں آپ کے ٹھہرنے کی کیا خواہش کروں، آپ نے حضور سے اپنے یہاں نزول اجلال فرمانے کی درخواست نہ کی، مگر مشیت ایزدی یہی تھی کہ یہ دولت لازوال ابوایوب ہی کے حصے میں آئے، حضرت ابوایوب کا مقولہ معارج النبوۃ میں یوں منقول ہے:

''من مرد ضعیف وفقیر بافندہ ام، ورسول از من عار دارد و در خانۂ من نزول نفرماید''

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد
ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

میں ایک کمزور وغریب بنکر آدمی ہوں، رسول اللہ ﷺ کو مجھ سے عار ہوگا، اس لئے میرے گھر میں نزول نہ فرمائیں گے۔ (ص:۴)

اس تفصیل سے انصاری کے لقب کا سراغ ملتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انصار مدینہ کے ساتھ انصار ہند کا کوئی نسلی تعلق نہیں ہے۔

امام غزالی علیہ الرحمہ کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے کہ ان کا تعلق کپڑا بننے والی قوم سے ہے۔

قطب:

قطب، ابدال اور مجذوب، یہ اصطلاحات ہیں، جو حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کے علوم میں استعمال کی جاتی ہیں، اس قسم کی اصطلاحات کی حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات عالم میں تمام تصرفات کے مالک تو اللہ تعالیٰ ہیں، وہ خواہ کلی تصرفات ہوں، یا ان کی جزئیات، سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت کے ماتحت ہیں، وہ جیسے چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں، لیکن حق تعالیٰ ان تصرفات کے لئے اپنی حکمت بالغہ کے تقاضے سے اپنے خاص خاص بندوں سے انتظام عالم کے بہت سے کام لیتے ہیں، مثلاً دلائل شرعیہ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ تکوینیات میں بھی اور تشریعیات میں بھی حق تعالیٰ فرشتوں سے کام لیتے ہیں، چنانچہ قرآن وحدیث سے صراحۃً ثابت ہے کہ دنیا ودین کے الگ الگ کاموں پر فرشتے مامور ہیں، کتب ہدایت کا نزول حضرت جبرئیل علیہ السلام سے متعلق رہا ہے، قرآن کریم کی شہادت ہے کہ فرشتوں کو جہاں بشارت کے ساتھ بھیجا گیا، وہیں وہ ایک قوم پر عذاب بھی لے کر آئے، پھر قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے علاوہ بعض خاص خاص انسانوں سے بھی انتظامِ عالم متعلق ہوتا ہے، چنانچہ تشریعیات میں ہدایت وارشاد کا کام انبیاء سے متعلق ہے، پھر ان کے نائبین سے اس خدمت کا تعلق ہوتا ہے، اسی طرح تکوینیات میں بھی ان سے کام لیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے، اس واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک صاحب تشریع پر مامور تھے، اور ایک صاحب تکوین پر متعین تھے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ان کے نائبین میں بعض حضرات ارشاد وہدایت کی

مرکزی شان رکھتے ہیں، ان کی برکت سے ہدایت کا خوب رواج ہوتا ہے، یہ لوگ قطب الارشاد کہلاتے ہیں، بعض کے سپرد کچھ تکوینی امور ہوتے ہیں، یہ لوگ باطنی طور پر حضرت خضر علیہ السلام کے نائب ہوتے ہیں، انھیں ''قطب التکوین'' کہا جاتا ہے۔

ابدال:

رسول اکرم ﷺ کی بعض احادیث میں ''اَبدال'' کا ذکر آیا ہے، مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالے سے ایک روایت منقول ہے، شریح بن عبید کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے عرض کیا گیا جب وہ عراق میں تھے، کہ اہل شام پر لعنت بھیجئے، فرمایا نہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ فرما رہے تھے کہ ابدال شام میں ہوں گے، وہ چالیس ہوں گے، ایک کا انتقال ہوگا، تو اس کی جگہ پر اللہ تعالیٰ دوسرے کو متعین فرما دیں گے، ان کی برکت سے بارش ہوگی، دشمنوں پر غلبہ ہوگا، اور اہل شام سے بلائیں ٹلیں گی۔ (ج:۱، ص:۱۱۲)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اس امت میں تیس ابدال ہوں گے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر قدم ہوں گے، جب کسی ایک کا انتقال ہوگا، تو اس کے بدلے میں دوسرا مقرر ہوگا۔ (مسند احمد، ج:۵، ص:۳۲۳)

ان دونوں روایتوں میں محدثین کے اصول وقواعد کے اعتبار سے قدرے ضعف ہے، اجمالاً سنن ابی داؤد میں بھی ابدال کا تذکرہ ہے (دیکھئے: کتاب المھدی) حضرات ابدال کا ذکر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں بھی ہے، جو مختلف الفاظ میں منقول ہے، اور امام سخاوی نے لکھا ہے کہ وہ سب روایتیں ضعیف ہیں، خلال نے کرامات الاولیاء، طبرانی نے المعجم الاوسط میں، ابن عدی نے الکامل میں یہ روایتیں قدرے الفاظ کے فرق سے نقل کی ہیں، طبرانی نے معجم کبیر میں بھی حدیث ذکر کی ہے۔

امام ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر دور میں میری امت میں پانچ سو بہترین لوگ ہوں گے، اور ابدال چالیس ہوں گے، نہ یہ پانچ سو سے کم ہوں گے اور نہ وہ چالیس سے کم ہوں گے، جب کسی کا

انتقال ہوگا،تو دوسرا آدمی اس کی جگہ آجائے گا،لوگوں نے عرض کیا،یارسول اللہ!ان کے اعمال کیا ہوں گے؟ فرمایا کہ جو کوئی ان پر ظلم کرے گا اسے معاف کردیں گے،جو ان کے ساتھ بُرا برتاؤ کرے،یہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے،اور جو کچھ اللہ نے انھیں دیا ہے،اس میں مسلسل بخشش کرتے رہیں گے۔

حلیۃ الاولیاء ہی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً منقول ہے کہ چالیس آدمی میری امت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کے مطابق رہا کریں گے،ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ اہل زمین سے بلائیں دفع فرمائیں گے،انھیں ابدال کہا جاتا ہے،انھوں نے یہ مرتبہ نماز،روزے اور صدقہ کی وجہ سے نہ پایا ہوگا،لوگوں نے سوال کیا،پھر کیونکر ملے گا؟ فرمایا سخاوت سے اور مسلمانوں کی قلبی خیر خواہی سے۔

اور بھی کئی ایک روایتیں ہیں جنھیں امام سخاوی نے **المقاصد الحسنۃ** میں نقل کیا ہے،اور ان سب پر ضعیف کا حکم لگایا ہے،ضعف کی شدت میں کمی بیشی ہے،ان سب میں بہتر امام سخاوی نے اس روایت کو قرار دیا ہے جس کو ہم نے ابتداء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

روایات کے اس مجموعے سے یہ بات بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ ابدال کا تصور بے بنیاد نہیں ہے،بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اس کی اصل موجود ہے،امام سخاوی فرماتے ہیں کہ:

> ''ان قرائن میں سے جن سے اس حدیث کی قوت ثابت ہوتی ہے،اور جن سے ائمہ کے درمیان اس حدیث کی شہرت معلوم ہوتی ہے،ایک قرینہ یہ ہے کہ ہمارے امام شافعی علیہ الرحمہ نے بعض حضرات کے بارے میں فرمایا کہ ہم انھیں ابدال میں شمار کرتے تھے،نیز امام بخاری بھی بعض اکابر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ لوگوں کو فلاں کے ابدال میں سے ہونے میں شک وشبہ نہیں ہے،ایسے ہی متعدد ائمہ،حفاظِ حدیث اور اصحابِ نقد ونظر نے متعدد لوگوں کے ابدال میں ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔(**المقاصد الحسنۃ**،ص:۲۲/۲۳)

یہ اللہ کے مخصوص بندے ہیں،جن کے ذریعے حق تعالیٰ زمین پر برکتیں نازل فرماتے

ہیں، ان کا قلب بہت صاف ستھرا ہوتا ہے، یہ ساری امت بلکہ ساری انسانیت کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ کثر اللہ أمثالھم

مجذوب کی حقیقت:

تیسرا لفظ آپ نے 'مجذوب' لکھا ہے، اس کے متعلق بقدر ضرورت تشریح کرتا ہوں۔

مجذوب کا لفظ جذب سے مشتق ہے، جذب کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ مجذوب حضرات صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے، جو لوگ حق تعالیٰ کے خاص بندے ہیں، وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض حضرات کا اپنی بارگاہ کے لئے اللہ تعالیٰ انتخاب فرماتے ہیں، ان کی خصوصی تربیت فرماتے ہیں، انھیں غلطیوں اور معصیتوں سے بچاتے ہیں، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام۔ یہ حضرات اپنی خلقت کے روز اول سے حق تعالیٰ کی نگاہ انتخاب میں ہوتے ہیں، بہت سے اولیاء اللہ کا بھی یہی حال ہوتا ہے، انھیں اللہ تعالیٰ اپنی عبادت وطاعت یا اپنی طرف مخلوق کو دعوت دینے کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حق تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لئے جدو جہد کرتے ہیں، ان کا قصد وارادہ بارگاہِ الٰہی تک پہونچنے کا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بارگاہ تک رسائی عطا فرماتے ہیں، حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دونوں طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ إِلَیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَیَھْدِیْ إِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ (سورۂ شوریٰ:۱۳) اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اور جو شخص رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی عطا فرماتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے مسائل السلوک میں لکھا ہے کہ:

> ''روح (المعانی) میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے جذب وسلوک کی طرف، وجہ یہ ہے کہ ''جبی'' کے معنی جذب کے ہیں، اور ہدایت کے معنی سالک کو اراءۃ طریق ہے۔''

لفظ یجتبی اور اس کا مصدر اجتباء، جبی سے بنا ہے، اس کے معنی وہی ہیں، جو جذب کے ہیں، اسی جذب سے مجذوب بنا ہے، حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کی اصطلاح میں مجذوب وہی ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ إِلَیْہِ مَنْ یَّشَاءُ کے پیرائے میں بیان کیا ہے، اور جن لوگوں کو وَیَھْدِیْ إِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ (اور کوئی رجوع کرے تو اس کو اپنے تک رسائی عطا فرماتے

ہیں) کے پیرائے میں ذکر کیا ہے، صوفیہ کی اصطلاح میں اس قسم کے لوگ سالک کہلاتے ہیں، صاحب روح المعانی مذکورہ بالا آیت کے تحت (ومما قاله أرباب الاشارات) میں لکھا ہے کہ:

''اس آیت میں مجذوب اور سالک کے مقامات کی جانب اشارہ ہے، مجذوب وہ خاص حضرات ہیں جن کو حق تعالیٰ سبحانہ نے ازل میں چن لیا ہے، اور ان لوگوں کے زمرے میں انھیں داخل کیا ہے، جن سے اللہ سبحانہ محبت فرماتے ہیں، اور جن کو خاص اپنے واسطے منتخب فرمایا ہے اور انھیں ہر دو عالم سے ہٹا کر اپنی جانب اس طور سے کھینچ لیا ہے کہ یہ ''جذب'' جن وانس کے تمام عمل کے ہم پایہ ہے، یہ لوگ صاحب اقتدار بادشاہ کے دربار میں ایک سچے مقام پر فائز ہیں۔

اور سالک وہ عام لوگ ہیں، جن کو حق تعالیٰ نے ان لوگوں کے زمرے میں رکھا ہے، جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں، انھیں ہدایت، جہد وانابت اور صراط مستقیم کی توفیق منجانب اللہ عطا ہوتی ہے۔'' (ص:۶۱، ج:۲۵)

اس تشریح کے لحاظ سے مجذوب وہ خاص حضرات ہیں، جن کا انتخاب حق تعالیٰ نے اپنی ذات، اپنی اطاعت اور اپنی مرضیات کے لئے کرلیا ہے، یہی لوگ ''مجذوب'' ہیں، انھیں ''مراد'' بھی کہا جاتا ہے۔

اور وہ لوگ جن پر یہ خاص نظر عنایت نہیں، مگر انھیں حق تعالیٰ کی جانب سے توفیق ہدایت ملتی ہے، یہ اللہ کی طرف اپنی رغبت سے چلتے ہیں، نفس وشیطان کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن ان کے ارادہ کے خلوص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انھیں اپنی راہ پر چلنے کی ہمت اور توفیق دیتے ہیں، یہ لوگ صوفیہ کی اصطلاح میں ''سالک'' اور ''مرید'' کہے جاتے ہیں۔

لیکن ''مجذوب'' عوام الناس کی بھی ایک اصطلاح ہے، اس اصطلاح میں مجذوب ان پاگلوں کو کہتے ہیں، جن کے بارے میں لوگوں کا کسی وجہ سے یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ شاید یہ اللہ والے بزرگ ہوں، یہ اصطلاح معتبر نہیں ہے، اور نہ شریعت میں اس کا کوئی وزن ہے۔

حسن خاتمہ کا یقین:

آپ کا تیسرا سوال یہ ہے کہ خاتمہ بالخیر اور جنت الفردوس میں داخلہ کا یقین کس طرح

ہوگا؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات نہایت رحیم وکریم ہے، ان کے رحم وکرم پر نگاہ جاتی ہے، اوراس پر کہ اس رحیم وکریم ذات نے محض اپنے فضل وکرم سے ایمان بخشا ہے، اوراس کے تقاضوں کے مطابق کچھ کچھ اعمال کی توفیق دی ہے، اس سے امید ہوتی ہے کہ آخری وقت میں بھی فضل فرمائیں گے، لیکن وہ پروردگار بے نیاز بھی ہیں، بندوں سے بھی، بندوں کی طاعات سے بھی، پھر کیا معلوم آخر میں کون سی شان جلوہ گر ہو، اس بے نیازی پر نظر جاتی ہے، تو دل پر ہیبت چھا جاتی ہے، مومن انھیں دونوں حالتوں کے درمیان رہتا ہے، اوران دونوں شانوں کا استحضار ہونا بھی اللہ کی عظیم رحمت ہے، **الایمان بین الخوف والرجاء**، ایمان خوف اورامید کے درمیان میں ہے۔ اس زندگی میں کامل اطمینان کا ہونا مناسب نہیں ہے۔

اطمینان تو اسی کو ہوگا، جس کا دل خوف اورامید دونوں حالتوں سے خالی ہو، اور ظاہر ہے کہ جس کا قلب ان دونوں حالتوں سے خالی ہوگا، وہ ایمان ہی سے خالی ہوگا، اس لئے اس فکر میں نہ پڑا جائے کہ خاتمہ بالخیر اور داخلۂ جنت کا یقین حاصل ہوجاء، دنیا میں امید وخوف کی حالت ہی بہتر ہے، اسی بنیاد پر طاعتوں کا شوق، گناہوں پر ندامت، حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وانابت کی توفیق ہوتی ہے، ہاں اتنا ہے کہ عام حالات میں خوف کا غلبہ ہو، اوردم واپسیں میں امید کا غلبہ ہو، تو بہتر ہے، امید کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن سے ہے، یہ حسن ظن بھی بڑی عبادت ہے، مرنے کے قریب اسی کا غلبہ ہونا چاہئے۔

امام نووی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ:

> ''جو شخص ایمان رکھتا ہے، اوراس نے خالص اللہ کی رضا کے لئے عمل کئے، تو اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا، سوء خاتمہ اس شخص کے حق میں ہے، جس نے خلاف شریعت برے اعمال کئے، یا عمل صالح میں ریا کاری اور جذبۂ شہرت طلبی کو شامل کرلیا۔'' (شرح اربعین)

ایمان کے ساتھ عمل میں خلوص ہو، یعنی جو عمل کرے، وہ محض اللہ کی رضا کے لئے کرے، اور ظاہر ہے کہ محض اللہ کی رضا کے لئے وہی عمل ہوگا، جو شریعت وسنت کے مطابق ہو، اگر شریعت کے مطابق نہ ہو، تو اس میں رضائے الٰہی کی نیت ہی باطل ہوگی، اوراگر شریعت کے

مطابق ہے، لیکن رضائے الٰہی کی نیت نہیں ہے تو دکھلاوا ہے، کسی کو خوش کرنا ہے، یا کسی اور کے دباؤ میں کرتا ہے، کسی آدمی کے ڈر سے کرتا ہے، تو وہ ہے تو شریعت کے مطابق، مگر اس میں نیت فاسد ہے، تو اس پر خاتمہ بالخیر کی امید کیونکر کی جائے۔

ایمان اور مخلصانہ عمل کے ساتھ کثرت سے دعا بھی کرنی چاہئے، حق تعالیٰ دعاؤں کی برکت سے بگڑے ہوئے کاموں کو بنا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ہم سب کو ایمان پر استقامت عطا فرمائیں، اعمال صالحہ اور ان میں اخلاص وللٰہیت کی توفیق بخشیں اور زندگی کی آخری ساعت میں کلمۂ ایمان نصیب فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆

اداریئے

(۱) رسالۃ الاوائل اور ناشر دیوبند

(۲) کتب خانہ محدث کبیر

(۳) محدث کبیر کی سوانح حیات کی ضرورت

(۴) دارالعلوم دیوبند کا نمائندہ اجلاس بسلسلۂ نصاب تعلیم

(۵) حکومت کی پالیسیاں اور مسلمانوں کے لائحہ عمل

(۶) سیمناروں کے سوال نامے؟

(۷) بیمہ اور فقہ اکیڈمی کا فیصلہ؟

(۸) تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

(۹) ایک مجلس کی تین طلاق اور غیر مقلدین کا رویہ

(۱۰) مملکت سعودیہ عربیہ میں غیر مقلدین کی بدعنوانیاں

(۱۱) منافق علیم اللسان

(۱۲) تحریف وتبدل کی ابتدا اور قرآن وحدیث کی وضاحت

رسالۃ الاوائل اور ناشر دیو بند

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی علیہ الرحمۃ کی حدیثی خدمات اور محدثانہ تحقیقات تمام اہل علم پر عیاں ہیں، بہت سی نادر ونایاب کتابوں کو ڈھونڈ نکالنا، پھر ان کی تصحیح وتحقیق کر کے شائع کرانا، حضرت کا ایک عظیم کارنامہ ہے، اس طرح کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں ہیں، جن کا تعارف سلسلہ وار آپ ''المآثر'' میں پڑھ رہے ہیں، اسی سلسلہ کا ایک مختصر سا رسالہ مشہور محدث وفقیہ شیخ محمد سعید بن سنبل مکی کا مرتب کیا ہوا ہے، اس کا نام ''رسالۃ الاوائل'' ہے، اس میں شیخ موصوف نے حدیث کے مشہور مجموعوں میں سے ۴۳ کتابوں کی پہلی اور چند ایک کی آخری حدیث صاحب کتاب تک اپنی سند سے نقل کی ہے۔ محدثین کا دستور ہے کہ کسی کتاب کی پہلی حدیث سن کر یا سنا کر پوری کتاب کی روایت کی اجازت طالب علم کو دے دیتے ہیں، اس مجموعہ کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم کسی محدث سے ان سب کتابوں کی اجازت حاصل کرنا چاہے تو سب کو جمع کرنے اور ان کی ورق گردانی کے مشکل عمل سے بچ جائے گا، اس رسالہ سے ہر کتاب کی ایک ایک حدیث پڑھ کر اسے سب کی اجازت حاصل ہوجائے گی، اجازت کا یہ طریقہ اساتذۂ حدیث کے درمیان معروف ہے۔

یہ رسالہ سب سے پہلے مولانا نور محمد صاحب نے ''اکلیل المطابع''.... جو ابتداء رسڑا ضلع بلیا میں تھا، اور بعد میں بہرائچ منتقل ہوگیا تھا.... سے شائع کیا تھا، اس کے بعد دوبارہ مصر سے شائع ہوا، پھر نایاب ہوگیا، ۱۳۸۲ھ میں محدث کبیر نے ''اکلیل المطابع'' والے نسخے کی تصحیح کر کے اور بعض جگہ مختصر حواشی تحریر فرما کر'' مکتبہ اعظمی مئو'' سے تیسرا ایڈیشن عمدگی کے ساتھ چھپوایا، اس نسخے میں شیخ الدلائل حضرت مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی مہاجر مکی کے قلم سے کچھ تعلیقات

تھیں، حضرت نے انہیں مولانا موصوف کے حوالہ سے حاشیہ میں درج کر دیا، اور اس پر ابتداء میں ایک مختصر سی تمہید بھی لکھی، جس میں مذکورہ بالا باتیں درج کیں۔

یہ تیسرا ایڈیشن نایاب نہیں ہے، حضرت محدث اعظمی کے گرامی قدر صاحبزادگان سے اب بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر دیوبند سے اسی نسخے کا فوٹو ایڈیشن اور اس پر ناشر کی تمہید دیکھ کر حیرت بھی ہوئی، اور حق امانت کا پاس ولحاظ نہ کرنے پر افسوس بھی ہوا، اس کے ناشر نے نادانستہ یا دانستہ کئی غلطیاں کیں، جن سے ناظرین دھوکہ میں پڑ سکتے ہیں، اس لئے اس کا مختصر سا احتساب ضروری ہوا۔

(۱) شروع میں ناشر نے ایک تمہید لکھی ہے، اس میں ذکر کیا ہے کہ اس رسالہ کے سابقہ ایڈیشن نایاب ہو چکے تھے، اس لئے اس کے ایک قدیم نسخے کو جو مجھے حاصل ہوا، بنیاد بنا کر یہ نیا ایڈیشن شائع کر رہا ہوں، لیکن نہ اس نے اس قدیم نسخے کا تعارف کرایا، اور نہ یہ بتایا کہ اس کو کس نے شائع کیا تھا، حالانکہ ایسا کرنا ضروری تھا، علاوہ ازیں جو کچھ ناشر نے لکھا ہے، وہ غلط بھی ہے، ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ ۱۳۸۲ھ میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا، اور اس کے نسخے اب تک موجود ہیں، اس لئے یہ نسخہ نہ تو نایاب ہے، اور نہ قدیم!

(۲) یہ جدید ایڈیشن ۱۴۰۷ھ میں شائع کیا گیا ہے، اس وقت حضرت محدث کبیر باحیات تھے، ان سے اس بارے میں کوئی استصواب نہیں کیا گیا۔

(۳) حضرت نے تیسرے ایڈیشن کے شروع میں جو مختصر تمہید تحریر کی تھی، ناشر نے اسے حذف کر دیا، اور اپنی تمہید میں اس کا کوئی ذکر بھی نہیں کیا، اور یہی بڑی غلطی کی ہے، اس تمہید میں حضرت نے صراحت فرمائی ہے کہ اس کتاب پر جگہ جگہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی مہاجر مکی شیخ الدلائل کے قلم سے تعلیقات ہیں، اس تمہید کے حذف ہونے سے یہ ضروری وضاحت بھی حذف ہوگئی، جو لوگ زیر نظر ایڈیشن پڑھیں گے، اور اس میں جابجا تعلیقات کے خاتمہ پر ''محمد عبدالحق عفی عنہ'' یا ''مولانا عبدالحق عم فیضہم'' یا ''الشیخ عبدالحق'' پڑھیں گے، یا ''الاعظمی'' لکھا ہوا دیکھیں گے، تو ان کا ذہن مذکور الصدر مولانا عبدالحق الہ آبادی یا حضرت محدث اعظمی کی جانب نہ جائے گا، بلکہ عجب نہیں کہ وہ اس سے حضرت مولانا عبدالحق صاحب الاعظمی

مدظلہ استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کو سمجھ لیں، کیونکہ ناشر نے مشیر کی حیثیت سے ان کا نام تمہید میں ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا موصوف ایک سال سے اس رسالہ کو پڑھا رہے ہیں، پھر اگر قارئین یہ خیال کریں کہ یہ حواشی مولانا موصوف ہی کے قلم سے ہیں، تو یقیناً اس اشتباہ کا اندیشہ ہے، اس لئے ناشر کا فرض تھا کہ جب وہ پورے نسخے کا... بلا اجازت ہی سہی... فوٹو لے کر اسے شائع کررہا ہے، تو حضرت کے تمہیدی کلمات بھی شائع کر دیتا، تاکہ علم کی امانت کا حق ادا ہو جاتا۔

(۴) مئو کے مطبوعہ نسخے میں طباعت کی کچھ غلطیاں تھیں، جن کی تصحیح آخر میں صحت نامہ لگا کر کی گئی ہے، دیوبند کے ناشر نے ان اغلاط کی تصحیح اصل کتاب میں کردی ہے، مگر ایک جگہ تساہل کے نتیجہ میں ایسی فاش غلطی ہوگئی ہے، جو اہل علم کی شان سے بہت بعید ہے۔

صحت نامہ میں دو تصحیحات اس طرح ہیں:

الصفحہ	السطر	الخطا	الصواب
۲	۷	ابی عیسیٰ بن سورۃ	ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ
//	//	وحدثناھناد	بن سورہ ح وحدثنا ھناد

یہ دوسری عبارت سطر ۱۱ کی ہے، مگر کمپوزنگ (حرف جوڑنے) کی غلطی سے اس پر بھی ایضاً کا نشان لگ گیا ہے، لیکن یہ غلطی کچھ ایسی اہم نہیں ہے، نیز اس میں پہلی سطر کی تصحیح کا ایک لفظ "بن سورہ" دوسری سطر میں آ گیا ہے، تصحیح کرنے والا ذرا غور سے کام لیتا تو بالکل واضح ہوجاتا کہ اس کا ربط سطر اول سے ہے، بعد والی سطر میں تصحیح صرف "ح وحدثنا" ہے مگر اس نے غفلت سے کام لیا، سطر ۷ میں صرف اتنی تصحیح کی، "ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ" حالانکہ اس کے بعد "بن سورہ" ضروری تھا، اور سطر ۱۱ میں "بن سورہ" کو ملا کر عبارت کو خبط کردیا، تصحیح شدہ عبارت ملاحظہ ہو:

"حدثنا قتیبہ بن سعید قال حدثنا ابوعوانہ عن سماک بن حرب وبن سورہ ح وحدثنا ھناد" اس میں "بن سورہ" بالکل بے تکی بات ہے، اگر ترمذی شریف کھول کر اس کی پہلی حدیث دیکھ لی گئی ہوتی، تو یہ غلطی نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ توفیق نیک عطا فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر (۱۹۹۲ء)

کتب خانہ محدث کبیر

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ نے اپنے بعد جہاں اپنی بیش قیمت تصنیفات وتالیفات کا وافر ذخیرہ چھوڑا ہے، وہیں ایک عظیم الشان علمی کتب خانہ بھی حضرت کی یادگار ہے، جاننے والوں کو معلوم ہے کہ حضرت والا بچپن ہی سے مخصوص علمی ذوق رکھتے تھے، حافظہ بھی اللہ تعالیٰ نے محدثین جیسا عطا فرمایا تھا، ذہانت وذکاوت بھی بھرپور تھی، حضرت اقدس نادرونایاب علمی کتابوں کی تلاش وجستجو میں لگے رہتے تھے، اس وقت جن کتابوں کے صرف نام ہی اہل علم نے سن رکھے تھے، محدث کبیر انہیں حاصل کرنے کیلئے بے تاب رہا کرتے تھے، یہ بے تابی انہیں باوجود غربت وافلاس اور استغناء وبے نیازی کے جگہ جگہ لئے پھرا کرتی تھی، کبھی حیدرآباد، کبھی رامپور، کبھی مچھلی شہر، کبھی دیوبند، کبھی لکھنؤ، کبھی مکہ مکرمہ، کبھی مدینہ منورہ، غرض جہاں کہیں نادر کتابوں کا پتہ ملتا، کوئی نہ کوئی جتن کرکے حضرت تشریف لے جاتے، اگر وہ حاصل ہوسکتیں انہیں حاصل کرتے، ان کی فوٹو کاپی مل سکتی تو وہ لیتے، ورنہ کم ازکم ان کا وہیں مطالعہ کرکے اپنے حافظہ میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت نے ۲۹/سال کی عمر میں رجال طحاوی پر ایک مفصل اور مکمل کتاب ''الحاوی'' کے نام سے تصنیف فرمائی، اور اس کا مسودہ اس وقت کے امام حدیث اپنے استاذ علامہ انور شاہ کشمیری کی خدمت میں بھیجا، کچھ دنوں کے بعد خود دیوبند ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب اس وقت علیل تھے، پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ عرض کیا اعظم گڈھ سے، فرمایا اعظم گڈھ میں مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی کون ہیں، جنہوں نے رجال طحاوی پر کتاب لکھی ہے، عرض کیا بندہ حاضر ہے، شاہ صاحب نے بہت اکرام فرمایا، اور پوچھتے رہے کہ فلاں فلاں کے حالات کہاں ملے، اور وہ کتابیں آپ کو کہاں سے ملیں، شاہ صاحب کا یہ ارشاد

دلیل ہے کہ حضرت اقدس نے کس قدر کدو کاوش سے کتابوں کی جستجو کی تھی۔

حضرت کی جوانی کے دور میں اسلامی ذخائر حیدرآباد سے اور مصر سے چھپ چھپ کر شائع ہورہے تھے، ان ذخائر کو حضرت مولانا قیمتاً حاصل کرتے، ان کا بغور مطالعہ کرتے، اس طرح ایک بیش قیمت کتب خانہ علمی کتابوں سے معمور ہوگیا، بعد میں حضرت کی شہرت جب عالم عرب میں ہوئی، تو مصنفین اور ناشرین اپنی کتابیں ہدیہ بھیجنے لگے، اس کے ساتھ کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، چنانچہ حضرت کی وفات سے پہلے موسم حج میں جب صاحبزادۂ گرامی مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ حج کے لئے تشریف لے گئے تو ان کے ہاتھوں کئی کتابیں منگوائیں۔

آج وہ ایک بھرپور کتب خانہ ہے، جس میں نادر ونایاب قلمی کتابیں بھی ہیں، پرانی مطبوعات بھی ہیں، تازہ اور جدید کتابیں بھی ہیں، حضرت نے اپنی حیات میں کتابوں کو ایک خاص ترتیب سے رکھا تھا، اور وہ صرف ان کے تصرف میں رہتی تھیں، ضعف وعلالت کے زمانہ میں جب کہ خود سے اٹھ کر وہ کتابیں نہیں نکال سکتے، اپنے خدام کو کتاب کی جگہ کا پورا پتہ بتا کر نکلواتے، پھر وہیں رکھوادیتے، حضرت کا حافظہ بے نظیر تھا، کتاب کی جگہ انہیں بخوبی یاد رہتی تھی، لیکن حضرت کے گزرنے کے بعد اس کتب خانہ سے استفادہ کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے کہ ان کتابوں کو جدید ترتیب کے مطابق از سر نو مرتب کیا جائے، ان کی مکمل فہرست بنائی جائے ان کے لئے مستقل کشادہ عمارت بنائی جائے، حضرت نے تو ایک مختصر سے کمرے میں تمام کتابیں رکھ چھوڑی تھیں، مگر ان کی حفاظت کے پیش نظر اور ان سے استفادے کی سہولت کے لئے ضروری ہے کہ کتب خانہ کی ایک وسیع عمارت تعمیر کی جائے، اور اس میں تمام کتابیں منتقل کردی جائیں، اہل علم حضرات حضرت کی وفات کے بعد ہی سے مشورہ دے رہے ہیں کہ حضرت کے نام پر ایک اکیڈمی قائم کرکے حضرت کی باقیات کی نشر واشاعت کا اہتمام کیا جائے، اور حضرت کے کتب خانہ کو از سر نو مرتب کیا جائے۔

چنانچہ حضرت کے صاحبزادگان اور اہل تعلق نے کتب خانہ کی عمارت کا منصوبہ بنالیا تھا اس کا نقشہ بھی انجینئر سے بنوالیا تھا، اس کے لئے سامان بھی ایک حد تک فراہم کرلئے تھے، اب

صرف اس کا انتظار رہ گیا تھا، کہ کسی بزرگ اور صاحب علم صاحب نسبت شخصیت سے اس کی پہلی اینٹ رکھوائی جائے، اس کے لئے سب کی نگاہ انتخاب عصر حاضر کے معروف صاحب علم، اور صاحب نسبت بزرگ اور شیخ حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ العالی پر پڑ رہی تھی، حضرت اقدس باندوی مدظلہ محدث کبیر سے بہت گہرا عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے، اور حضرت محدث کبیر بھی ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی نے ان سے تشریف آوری کی درخواست کی، جس کو انہوں نے از راہ کرم منظور فرمایا، اور ۲۴/ جمادی الاخری ۱۴۱۴ھ مطابق ۹/ دسمبر ۱۹۹۳ء بروز جمعرات تشریف لائے۔

حضرت باندوی مدظلہ دور حاضر میں اخلاص وللٰہیت اور مجاہدہ وجانفشانی کی ایک علامت ہیں، حق تعالیٰ نے انہیں ایسی محبوبیت ومقبولیت عطا فرمائی ہے، کہ فقر میں شاہی کا منظر نظر آتا ہے، بغیر کسی سابقہ اطلاع کے خلقت کا ایک انبوہ عظیم اکٹھا ہو گیا، ظہر کی نماز سے چند منٹ قبل اپنے دست مبارک سے کتب خانہ کی پہلی اینٹ رکھی، ان کے بعد اور بھی اکابر علماء کرام نے انٹیں رکھیں، پھر حضرت نے نہایت خشوع اور الحاح وزاری کے ساتھ جناب باری میں دعائیں فرمائیں حق تعالیٰ قبول فرمائے۔

بعد نماز ظہر حضرت محدث کبیر کے مدرسہ مرقاۃ العلوم کے درجۂ حفظ کے بچوں نے حضرت کے سامنے قرآن کریم کی آخری سورتیں پڑھ کر حفظ کی تکمیل کی، اس کے بعد حضرت کا نہایت مؤثر اور اصلاحی وعظ ہوا، یہ سلسلہ عصر کی نماز تک چلتا رہا، عصر کی اذان کے وقت حضرت نے وعظ ختم فرمایا، کافی لوگ جمع ہو گئے تھے، سارا مجمع ایمانی اور روحانی کیفیات سے سرشار تھا۔

الحمدللہ بنیاد رکھے جانے کے بعد سے مسلسل کام ہو رہا ہے، دیواریں مکمل ہو گئی ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ بقیہ کام بھی بسہولت اور بعجلت ہو جائے، تاکہ یہ کتب خانہ حضرات اہل علم کے لئے ایک مرکز تحقیق بن سکے۔

ماخذ: المآثر (جنوری، فروری، مارچ) ۱۹۹۴ء

☆☆☆☆☆☆

محدث کبیر کی سوانح حیات کی ضرورت

محدث کبیر حضرت مولانا اعظمی قدس سرہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ہی سے اہل علم کے حلقوں سے حضرت کے سوانح حیات کے جمع کئے جانے اورانہیں شائع کئے جانے کا تقاضا شروع ہوگیا تھا، اور یہ فطری بات ہے، حضرت کے علمی ودینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے، اور حضرت کی زندگی اتنی سبق آموز ہے کہ اس کی روشنی میں آنے والی نسلیں نہ صرف یہ کہ راہ عمل اور منزل کا پتہ ڈھونڈھ لیں گی، بلکہ انہیں جدوجہد کے لئے حوصلہ مندی اور آرزو وجستجو کا ایک نہ تھمنے والا جوش و ولولہ بھی ملے گا، استقامت وثبات قدمی کا سلیقہ حاصل ہوگا، لیلائے علم کی تلاش وجستجو میں کس طرح راتیں آنکھوں میں کاٹ لی جاتی ہیں، اورحوادث زمانہ سے بے نیاز کس طرح دن بسر کر لئے جاتے ہیں، اس کا شعور ملے گا، جولوگ حضرت سے واقف نہ تھے، انہیں تو ان کے احوال وسوانح جاننے کا شوق تھا ہی، جولوگ واقف ہیں وہ بھی بے تاب تھے، کیونکہ کسی عالم اور بزرگ کی زندگی کے تمام پہلو ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتے، سوانح مرتب کرنے والا زندگی کی تمام کیفیات وشئون کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے لئے وہ مختلف لوگوں کی معلومات سے مدد لیتا ہے، اورایک ایسا مرقع تیار کردیتا ہے، جس میں زندگی کے بیش تر پہلوؤں کا دل آویز جلوہ نظر آنے لگتا ہے، یہ تقاضا روز بروز بڑھتا رہا، انتظار ہوتا رہا، پھر مولانا اسیر ادروی نے اس تقاضے کو محسوس کرکے جتنی جلد ممکن ہوسکتا تھا، اورکم وقت میں جس قدر بہتر ہوسکتا تھا، حضرت کی علمی خدمات اورحضرت کی زندگی کا ایک خوبصورت مرقع ترجمان الاسلام کے ایک خاص نمبر کی صورت میں پیش کردیا، انہوں نے وقت کی بڑی ضرورت کو محسوس کیا، دلوں کے تقاضوں کو بھانپا، اہل علم سے رابطہ قائم کیا، ان سے فرمائش کرکے، تقاضے کرکے مضمون لکھوائے،

پھر ذوق سلیم کے ہاتھوں انہیں ترتیب دیا، اور ایک سجا سجایا گلدستہ پیش کر دیا۔

اس خاص نمبر نے حضرت کی حیات طیبہ کے سلسلہ میں معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ مہیا کر دیا، علم وفضل میں حضرت کے مقام بلند کو نمایاں کیا، اور جن چیزوں سے لوگ واقف نہ تھے، ان کے سلسلہ میں معلوماتی دستاویز پیش کی، یہ پہلی کوشش اس قدر برمحل اور کامیاب ہوئی کہ باوجود کاغذ اور طباعت کے معیاری نہ ہونے کے اس نے ارباب ذوق کی بارگاہ میں حسن قبول پایا، جیسے انہیں اس کا شدید انتظار رہا ہو، اور بلاشبہ انتظار تھا۔

اس کے بعد حضرت کے صاحبزادگان اور متعلقین ومنتسبین نے حضرت کی یادگار میں ''مجلّہ المآثر'' کا اجراء کیا، اس میں حضرت کی علمی تحقیقات کا تعارف حضرت کی نایاب تحریریں، قیمتی مقالات، اور حضرت کے بلند پایہ فتاویٰ کی اشاعت ہونے لگی، اس نے بھی ایک حد تک ضرورت کی تکمیل کی، اور جاننے والے بھی چونک چونک پڑے کہ حضرت کے مقام بلند سے اجمالاً تو واقفیت ضرور تھی، مگر اب جو تفصیلی معلومات حاصل ہو رہی ہے، تو ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے اس سے پہلے اس عظیم محدث ومحقق کو جانا ہی نہ تھا۔

تاہم یہ جو کچھ ہوا سہ ماہی مجلّات کے واسطے سے ہوا، جن میں متفرق معلومات، مختلف حضرات کے قلم سے شائع ہوئی ہے، ان سے چاہے جس قدر احوال وسوانح کا علم ہو، لیکن ایک مرتب ومفصل سوانح عمری کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے، جس میں پیدائش، بچپن، جوانی سے لے کر واقعۂ وصال تک ہر موضوع پر ممکن معلومات مہیا کر دی جائیں، پھر صاحب سوانح کا ذوق، ان کی خصوصیات، ان کے علمی وعملی کمالات، ان کے کارناموں اور ان کی کوششوں اور کاوشوں کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرا دیا جائے، اور جن گوشوں تک مجلّات کے مضمون نگاروں کا قلم نہیں پہونچ سکا ہے، انہیں بھی سامنے لایا جائے۔

اس ضرورت کا احساس بار بار ہوتا رہا، مگر کسی بلند وبالا شخصیت جس کے علم وفضل کا سکہ تقریباً تین چوتھائی صدی تک رواں رہا ہو، لیکن اس کے باوصف اس نے اپنے آپ کو کہیں نمایاں کرنا پسند نہ کیا ہو، اس کے عرصۂ حیات کے بہت سے گوشے مخفی ہو گئے ہوں، اور آج انہیں کوئی بتانے والا نہ ہو، ایسی شخصیت کے حالات لکھنے کے لئے جس قدر علم وتحقیق، کدوکاوش،

مبصرانہ صلاحیت ، اخذ وترک کی لیاقت کی ضرورت ہے، وہ بالکل ظاہر ہے، اور یہاں جس دیوانے کے نام یہ قرعۂ فال نکل رہا ہے، وہ ان سب چیزوں سے نہ صرف عاری ہے، بلکہ اس کی مخصوص مصروفیات کی وجہ سے آئندہ بھی اس میں اس طرح کی استعداد پیدا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، مگر بزرگوں کے حکم کی تعمیل بجائے خود سعادت ہے، اسی سعادت کے حصول کے پیش نظر اس نے ہمت کر لی ہے کہ جیسا کچھ بن پڑے گا، لکھ کر پیش کرنے کی سعی کرے گا۔ چنانچہ کسی قدر اس کا سلسلہ شروع کیا جا چکا ہے، قارئین سے درخواست ہے کہ اس کے اتمام کے لئے بارگاہ حق میں دعا کریں، اور جن حضرات کے پاس حضرت سے متعلق کچھ معلومات ہوں، حضرت کے علمی مکاتیب ہوں، یا انہوں نے حضرت کے ساتھ کہیں کا سفر کیا ہو، وہ اپنی معلومات قلم بند کر کے ''مجلّہ المآثر'' کے پتے پر ارسال کریں، استفادہ کے بعد بحفاظت انہیں واپس کر دیا جائے گا۔

ماخذ: المآثر۔ مارچ، اپریل، مئی (۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆☆☆

دارالعلوم دیوبند کا نمائندہ اجلاس بسلسلۂ نصاب تعلیم

محرم کے اوائل میں دارالعلوم دیوبند سے مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کو ایک دعوت نامہ موصول ہوا، اس میں اطلاع دی گئی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام ۲۱/۲۲ محرم ۱۴۱۵ھ مطابق یکم و ۲ر جولائی ۱۹۹۴ء کو ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے، جس میں نصاب تعلیم، طرز تعلیم و تدریس، طریقۂ تربیت اور مدارس عربیہ کے مشکلات پر غور کیا جائے گا، دعوت نامہ کچھ مبہم سا تھا، یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ نصاب تعلیم کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے گا، اس میں کوئی بڑی تبدیلی لانے کا ارادہ ہے؟ یا جزوی طور پر کچھ ترمیم کرنی منظور ہے؟ اور اس کے لئے ذہن سازی کرنی ہے، یا صرف لوگوں کی رائے معلوم کرنی ہے۔

نصاب تعلیم میں بالخصوص درس نظامی کے سلسلہ میں جب کسی حلقے سے ''غور وفکر'' کی آواز آتی ہے، تو خوامخواہ وہم ہوتا ہے کہ یہ غریب نسخ وترمیم کے لئے تختۂ مشق بنایا جائے گا، واقعہ یہ ہے کہ اصلاح نصاب کا یہ آوازہ بہت عرصہ سے رہ رہ کر گونجتا رہتا ہے، اور دارالعلوم اور اس کے ہم مشرب مدارس، تجویزوں، تقریروں، اور تحریر وانشاء کی چاند ماری کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، مگر یہ مدارس اتنے سخت جان واقع ہوئے ہیں کہ ان تمام یلغاروں کے باوجود اب تک اپنی قدیم بنیادوں پر کھڑے ہیں، جزوی ترمیم واصلاح تو بعض اوقات ہوتی رہی ہے، مگر نصاب کا مجموعی ڈھانچہ وہی ہے، جو ابتداء میں بنا دیا گیا تھا، مدعیان اصلاح کو ان جزوی اصلاحات سے تسکین نہیں ہے، اس لئے وہ بار بار ہانک لگاتے رہتے ہیں کہ نصاب تعلیم عقیم ہے، از کار رفتہ ہے، آثار قدیمہ میں داخل ہے وغیرہ۔

دعوت نامہ سے معلوم ہوا کہ ابھی تو نمائندہ اجتماع کیا جا رہا ہے، جو محدود پیمانہ پر ہے،

اس میں ملک کے صرف کلیدی مدارس شرکت کریں گے، اس کے بعد اکتوبر میں ایک بڑی کانفرنس اس موضوع پر ہوگی، خیال ہوا کہ شاید ارباب دارالعلوم بھی عرصہ سے اٹھنے والے شور وغوغا سے متأثر ہو گئے ہیں، اور اب وہ بھی اسی منزل کی طرف چلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، جدھر مدعیان اصلاح لے جانا چاہتے ہیں۔

دارالعلوم کا چراغ جن مقاصد کے لئے روشن کیا گیا تھا، اور پھر اس سے روشنی حاصل کر کے ملک کے طول وعرض میں مدارس ومکاتب کی جو بہت سی چھوٹی بڑی شمعیں جلی تھیں، اور اب تک ان کا سلسلہ قائم ہے، جن لوگوں کی نظر ان کے اساسی مقصد پر ہے، اور وہ زمانہ کے شور وغل کی حقیقت سے بھی واقف ہیں، اور تاریخی تجربات سے فائدہ اٹھانے کا ملکہ بھی رکھتے ہیں، ان کے سامنے دو اور دو چار کی طرح یہ بات یقینی ہے کہ جس دن دارالعلوم دیوبند کا مجموعی نصاب بدلا گیا، اسی دن وہ مقاصد فنا ہو جائیں گے، جن کو دارالعلوم دیوبند کی بنیادوں کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے، وہ موضوع جس پر ان مدارس عربیہ کا مدار ہے، اپنی موت آپ مر جائے گا، وہ دل، وہ دماغ، وہ شخصیتیں بدل جائیں گی، جن کی تربیت دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مسلک مدارس کی آغوش میں ہوا کرتی تھی، نصاب بدلا گیا تو گویا دارالعلوم کا خاتمہ ہوا، یقین تو نہ تھا کہ ایسا ہوگا، مگر احتمال اور اندیشہ تو تھا ہی!

حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی نے راقم الحروف اور مولانا عبدالرب اعظمی ناظم جامعہ عربیہ انوار العلوم جہانا گنج اعظم گڈھ کو حکم دیا کہ ان کی رفاقت میں دیوبند چلیں، دیوبند پہونچ کر بعض ذمہ داروں سے گفتگو کی گئی، تو بحمد للہ یہ اندیشہ غلط نکلا، نمائندہ اجتماع میں پچاس سے زائد مدارس کے نمائندے تشریف لائے، چار نشستیں ہوئیں، پہلی نشست میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے خطبۂ صدارت پڑھا، خطبۂ صدارت جامع اور متوازن تھا، اس سے وہ تمام اندیشے باطل ہو گئے، جو مبہم دعوت نامے سے پیدا ہوئے تھے، خطبۂ صدارت کے بعد حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور مولانا سعید احمد پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی تقریریں ہوئیں، مولانا پالنپوری نے اس اجتماع کی ضرورت اور اس کے پس منظر پر مفصل روشنی ڈالی، انہوں نے اپنی تقریر میں ان کانفرنسوں اور سیمیناروں کا

تذکرہ کیا، جومختلف حلقوں سے اصلاح نصاب کے سلسلہ میں ہوتے رہتے ہیں،مولانا پالن پوری خود براہ راست دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایسے اجتماعات میں شریک ہوتے رہتے ہیں،انہیں اصحاب فکر ونظر سے ملنے اورتبادلۂ خیال کرنے کے مواقع بھی ملتے رہتے ہیں،اور ماشاءاللہ بہت گہرائی اورتوازن کے ساتھ اشخاص وافراد اورنظریات کا جائزہ لیتے ہیں،اس لئے ان کی تقریر بہت بصیرت افروز ہوئی۔اصلاح نصاب کے متعلق مختلف امور کا تذکرہ کرتے ہوئے، مدارس عربیہ کے تعلیمی انحطاط کا بھی بہت عمدگی سے جائزہ لیا،جس سے شرکاء اجتماع بہت محظوظ ہوئے، وہ تقریر اس قابل ہے کہ اسے شائع کردیا جائے،ان شاءاللہ اہل مدارس کے لئے بھی اور مدعیان اصلاح کے لئے بھی رہنما ثابت ہوگی۔

دوسرے اجلاس میں نصاب تعلیم کے متعلق بحث ہوئی،تمام شرکاء اجلاس اس بات پر متفق تھے کہ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جائے گی،بعض جزوی اصلاحات کا ذکر آیا،جن کو اکتوبر میں ہونے والی کانفرنس پر موقوف رکھا گیا۔

تیسرے اجلاس میں طریقۂ تدریس اورطریقۂ تربیت پر شرکاء اجلاس نے اظہار خیال کیا،اس میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند اورمولانا عبدالحق اعظمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے خطاب کیا،مولانا مدنی نے مدارس پر مسلط ہونے والے بیرونی خطرات اور اسلام دشمن عناصر کی دسیسہ کاریوں کی نشاندہی کی۔

چوتھے اجلاس میں تجویزیں پڑھی گئیں،اورحضرت مفتی محمود حسن گنگوہی مدظلہ کی دعا پر اس اجتماع کا خاتمہ ہوا۔

ماخذ:الماثر۔اکتوبر،نومبر،دسمبر(۱۹۹۴ء)

☆☆☆☆☆☆

حکومت کی پالیسیاں اور مسلمانوں کا لائحہ عمل

دسہرہ کے موقع پر شہر مئو میں فساد پھوٹ پڑا، پھر کرفیو لگ گیا، لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ کرفیو بے ضرورت تھا، ظلماً پرامن شہریوں پر مسلط کیا گیا، پھر پولیس اور پی، اے، سی کو زیادتیاں کرنے کا موقع ملا، یہ بھی لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ حکومت کی پالیسی یہی ہے کہ لوگ مطمئن ہو کر زندگی بسر نہ کریں، ہر وقت ایک نہ ایک اضطراب کا شوشہ نکلتا رہے، اور عام لوگ اسی میں الجھے رہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اس وقت ہمارے صوبہ میں اور مرکز میں برسر اقتدار ہیں، ان کی نیتیں بخیر نہیں ہیں، یہ بات آج سے نہیں، حکمراں پارٹی کی بنیاد کے دن سے سب کو معلوم ہے، یہ تنگ نظر لوگوں کی ایک جماعت ہے، جو اپنے علاوہ کسی مذہب وملت کو اس ملک میں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے، جب سے یہ پارٹی حکمرانی کے محل میں داخل ہوئی ہے، اس کی بدنیتی کا اثر یہ ہے کہ اس وقت سے یہ ملک مسلسل زمینی اور آسمانی آفات ومصائب سے لگاتار دوچار ہوتا رہا ہے، کبھی زلزلہ، کبھی قحط سالی، کبھی تباہ کن سیلاب، اقتصادی کساد بازاری، کون سی بلا ایسی ہے، جو اس ملک پر اور ملک کے مختلف خطوں پر مسلط نہیں ہوئی ہے، قتل وخون، عصمت دری و آبروریزی، چوری ڈکیتی، اور خانہ جنگی کا تو کوئی شمار نہیں ہے، پورا ملک ایک غیر یقینی اور بے اطمینانی کی حالت میں مبتلاء ہے، اس حکومت میں سب سے زیادہ جو لوگ مصائب کا شکار ہیں، وہ مسلمان ہیں، اور لاریب کہ یہ پارٹی مسلمانوں کی دشمنی ہی کے بل بوتے پر پروان چڑھی ہے، یہ خم ٹھونک کر مسلمانوں کے مقابلہ میں کھڑی ہے، اس کا عزم یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں سے فنا کر دیا جائے، اس کا ہر منصوبہ مسلمانوں کے مفاد کو ضرب لگاتا ہے، اور اس کا ہر قدم مسلمانوں کی

خوش حالی کو روندتا ہے۔

یہ تو وہ صورت حال ہے، جو اس ملک کا ہر سمجھ رکھنے والا آدمی جانتا ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم! لیکن مسلمانوں کے لئے دیکھنے کی اتنی ہی بات نہیں ہے کہ فلاں پارٹی کی پالیسی ایسی ہے، حکمراں طبقہ بدنیت ہے، واقعہ یہ ہے کہ کفر نے، خواہ کوئی کفر ہو، اسلام کو برداشت نہیں کیا ہے، کفر اسلام کے ساتھ براہ راست ٹکراتا ہے، کسی بھی کافر حکمراں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اہل اسلام کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، ایک خواب پریشاں ہے۔

مسلمانوں کو جو کہ زمین کے صحیح طور پر وارث ہیں، جب ایسی صورت حال کا سامنا ہو، جیسی آج کل مسلط ہے، تو انہیں باہر سے زیادہ اپنے اندر غور کرنا چاہئے، باہر جو کچھ ہوتا ہے، وہ عموماً اندر کے احوال کا ظہور ہوتا ہے، ایک آدمی راہ چلتے ہوئے، کسی معمولی سی ٹکر سے بے تحاشا گر جاتا ہے، تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جسمانی اعتبار سے بہت کمزور ہوں، ورنہ اتنی معمولی ٹھوکر آدمی کو گرانے کے لئے کافی نہیں ہے۔

موجودہ صورت حال میں حکومت کو کوسنا، اس کے ظلم و ناانصافی کی فریاد کرنا، اس کے خلاف بولتے اور لکھتے رہنا، کافی نہیں، کافی تو کیا ہو، ایسا خیال میں آتا ہے کہ مضر ہے، کیونکہ ایسا کرکے مسلمان مطمئن ہو کر بیٹھ رہتا ہے کہ ہم نے حکومت کو برا بھلا کہہ کر دل کو ٹھنڈا کر لیا ہے، آگے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے اندرون کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے، اور پھر دل میں اتنا حوصلہ اور اتنی ہمت بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنے نفس پر دباؤ ڈال کر اپنی خواہشوں کو قربان کر کے، وہ کام اختیار کریں، جس کا حکم ہمارا مالک حقیقی دیتا ہے، اگر ہم نے اپنے نفس کا بگاڑ نہیں تلاش کیا، اور اس سے بے خبر رہے تو بھی ہلاکت ہے، اور اگر تلاش کرنے کے بعد اس کی اصلاح کی ہمت نہیں کی تو بھی بربادی ہے۔

اس جذبہ سے جب ہم خود کو کریدتے ہیں تو الامان والحفیظ! کیا عوام کیا خواص؟ ایک عجیب بدحالی دکھائی دیتی ہے، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جہاں خواہش نفس کی حکمرانی نہیں ہے، ہماری خواہشیں، ہمارے اغراض، ہمارا مفاد ہر جگہ آگے رہتا ہے، حکم شریعت پامال ہو جائے

ہم نے اسلام کا کلمہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عہد باندھا ہے، اور جب زندگی کے مسائل و معاملات میں قدم رکھتے ہیں، تو ہر ہر قدم پر یہ دعویٰ ٹوٹتا دکھائی دیتا ہے، پھر ظاہر ہے کہ عہد شکنی نہ اللہ کو پسند ہے، نہ بندوں کو! اگر اس کی سزا اسی دنیا میں ملے تو کیا عجب ہے، کفار کا معاملہ الگ ہے وہ تو ابتدا سے باغی ہیں، ان کی گرفت کے لئے آخرت متعین ہے، جہنم انہیں کے لئے بنائی گئی ہے مسلمانوں کے لئے جہنم نہیں ہے، اسی لئے انہیں تابڑ توڑ تازیانے یہیں لگتے ہیں، تاکہ آنکھیں کھلیں، اور صحیح راہ اختیار کریں۔

لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ حکومت کے مظالم کی شکایت بہت کرتے ہیں، لیکن ہم میں سے جب کسی کو ذرا بھی طاقت حاصل ہوتی ہے، تو ظلم کرنے میں ذرا بھی کسر نہیں چھوڑتا، ابھی پچھلے دنوں اعظم گڈھ کے ایک گاؤں میں ایک معمولی بات پر کچھ لوگوں نے ایسا بھیانک ظلم ڈھایا کہ سن کر روح ایمان کانپ کانپ جائے۔ جمعہ کا دن تھا، لوگ جمعہ پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے تھے، گاؤں کے کچھ افراد مسلح ہوکر دروازے پر کھڑے ہوگئے، اور چار آدمیوں کو رائفل کی گولیوں سے چھلنی کردیا، دو آدمی مسجد کے اندر گرے، اور دو آدمی مسجد کے باہر، مارنے والا بھی مسلمان، اور مرنے والے بھی کلمہ گو، بس ایک آن اور شان کا مسئلہ تھا، اور کچھ نہیں، ہمارا پورا ماحول اور پورا معاشرہ اس بات کی کھلی گواہی دیتا ہے کہ جس کو کچھ زور حاصل ہوا، وہ کمزوروں کو گرانے اور دبانے کی کوشش کرتا ہے، آج ہم اپنے معاملات کو شریعت کی روشنی میں دیکھتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ جاہلیت زندہ ہوکر اسلام کا گلا گھونٹ رہی ہے، شریعت کے احکام کو توڑ کر اللہ کو راضی کرنا ممکن نہیں، اور اللہ ناراض ہوں تو احوال کا درست ہونا خواب وخیال ہے۔

ہمارا دین اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس نعمت کی قدر دانی یہ ہے کہ اس پر کماحقہٗ عمل ہو دل میں اس کی محبت وعظمت ہو، نعمت اسلام کے آثار وثمرات ساری دنیا جانتی ہے کہ اس سے کتنے بہتر احوال پیدا ہوتے ہیں، یہ بہتر احوال ہم سے چھن گئے، کیوں چھن گئے؟ اس لئے کہ ہم نے اپنے آپ کو بدل لیا، دین اسلام کی روشن شاہراہ سے ہٹ کر جاہلیت اور معصیت کی ٹیڑھی ٹیڑھی راہوں پر بھٹکنے لگے، پھر اسلام کے آثار وثمرات ہم سے چھن گئے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ**، اللہ تعالیٰ کسی قوم کے اچھے حالات

کواس وقت تک نہیں بدلتے، جب تک وہ اپنے احوال واعمال کو نہیں بدل لیتے، ہم نے جب اپنی دینی حالت بدلی تو ہمارے دنیاوی حالات من جانب اللہ بدل دیئے گئے۔

پھر ایک مصیبت اور بھی ہے، وہ یہ کہ ہم میں بہتوں کو یہ احساس ہے کہ ہمارے اندر دین کے راستے سے انحراف ہے، لیکن یہ انحراف خود ہم کو اپنی ذات اور نجی زندگی کے اندر نظر نہیں آتا ہے، ہم اپنی ذات کے باہر دوسروں کی ذات میں ڈھونڈھتے ہیں، اپنے کو اصلاح سے بے نیاز سمجھ کر دوسروں کی اصلاح کی فکر کرتے ہیں، اور غالباً اپنی اصلاح کا حوصلہ نہیں ہوتا، دوسروں کو نصیحت کرنے والے اپنی رسوائی کا سامان لئے پھرتے ہیں۔

کاش ہم اپنے اندر اتنی ہمت اور اتنا حوصلہ پیدا کرتے کہ مفاد دنیوی اور اغراض نفسانی سے بے نیاز ہوکر اور خواہشات سے بلند ہوکر اپنے آپ کو شریعت کے حوالہ کر دیتے، شریعت جیسا تصرف ہم میں کرتی، اسے بخوشی ہم قبول کرتے، اور کاش ہم کو ایسے لوگ ملتے، جو قلوب کے طبیب اور نفوس کے معالج ہوتے، اور ہم اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیتے کہ وہ شریعت کی روشنی میں ہمارا علاج اور ہماری اصلاح کریں۔

ہماری خوشحالی کی یہی صورت متعین ہے، اس کے باہر ہم جو کچھ ڈھونڈھتے ہیں، وہ ایک چمکتی ہوئی ریت ہے، جس پر پانی ہونے کا دھوکہ ہورہا ہے، فسادیوں کو پکڑنے سے زیادہ ضروری اپنے دل کے فساد کو پکڑنے کا عمل ہے، اسے پکڑیں، اوردل سے نکال باہر کریں، اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔

ماخذ: المآثر۔نومبر، دسمبر، جنوری (۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆☆

سیمیناروں کے سوال نامے؟

کہا جاتا ہے کہ ہمارے دور میں سائنس کی ترقیات، کاروبار کے پھیلاؤ، صنعت کے عروج، اور ذرائع آمدورفت کی سہولیات نے بہت سے پیچیدہ اور سنگین مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جو علماء اسلام کے سامنے چیلنج بن کر ابھرے ہیں، اس لئے علماء امت کی ذمہ داری ہے کہ سر جوڑ کر اجتماعی طور پر ان مسائل کو حل کرنے کی فکر کریں، ورنہ ترقی کی اس تیز رفتار دوڑ میں مسلمان بہت پیچھے رہ جائیں گے، اور اسلام ایک ناکارہ اور از کار رفتہ مذہب بن کر رہ جائے گا۔

یہ آواز اتنے دنوں سے، اتنے حلقوں سے، اور اتنی شدت سے مسلسل آ رہی ہے کہ ساری کائنات اس کی گونج سے بھر گئی ہے، چنانچہ ان پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے تقریباً ان تمام ممالک میں جہاں مسلمان رہتے بستے ہیں، اجتماعی طور پر بیٹھنے اور غور وفکر اور بحث وفیصلہ کی کاوش ہو رہی ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ان جدید پیچیدہ مسائل کا نام لے کر فقہی سیمیناروں کا انعقاد ہو رہا ہے، اور مسائل کے تصفیہ کی کوشش ہو رہی ہے، طریقۂ کار یہ ہے کہ علماء کے پاس پہلے کسی خاص موضوع سے متعلق سوال نامے بھیجے جاتے ہیں، ان سے جواب حاصل کئے جاتے ہیں، پھر ان علماء کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے، کچھ بحث وتحقیق ہوتی ہے، کچھ مسائل کا فیصلہ وہیں کر دیا جاتا ہے، کچھ مسائل کے لئے کمیٹیاں بنادی جاتی ہیں، وہ غور وتعمق کے بعد ایک تجویز پیش کرتی ہیں، اور اسے فیصلہ کی شکل دیدی جاتی ہے۔

لیکن اب تک جتنے سیمینار ہو چکے ہیں، انہیں سامنے رکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ طریقۂ کار خود اسلام اور مسلمانوں کے لئے دور حاضر کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، ہوتا یہ ہے کہ دور

حاضر کے خدا بیزار، مذہب سے نفور، دولت دنیا کے حریص، اور خود غرضی اور بے حیائی سے معمور ذہنیت نے دنیاوی ترقی کی جو بے شمار راہیں کھولی ہیں، ان میں بہت سی راہیں کہیں براہ راست، اور کہیں بالواسطہ شریعت محمدیہ (جو سراسر آخرت کو مقصود بنانے پر مبنی ہے) سے ٹکراتی ہیں، تو ان سیمیناروں کو یہ ہمت تو ہوتی نہیں کہ ان باطل اور غلط طریقوں کو مٹانے کی جدوجہد کریں، اور انہیں اپنا موضوع بنائیں، یہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت، مجبوری، صنعتی ترقیات اور حاجات کی دہائی دے کر مسائل شرعیہ میں کتر بیونت کر دیں۔

خود تو بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

ان سیمیناروں کے لئے جو سوال نامے مرتب کئے جاتے ہیں، انہیں دیکھنے سے ایسا تأثر ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں اسلامی فقہ اور اسلامی تعلیمات نا قابل عمل ہیں، زمانہ کی ترقیات نے حالات ومعاملات میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، اور زندگی میں ایسی الجھنیں ڈال دی ہیں، کہ ان پیچیدگیوں کو دور کرنا اور ان الجھنوں کو سلجھانا، اس وقت تک ممکن ہی نہیں، جب تک اسلامی فقہ کے مسائل میں حالات حاضرہ کے مطابق ترمیم وتنسیخ نہ کر لی جائے، وہ تو اللہ بھلا کرے، پرانے طرز کے مدارس میں پڑھے ہوئے، پرانے خیال کے علماء کا، کہ وہ اس جذبہ اور اس تحریک پر ناتمام سی سہی، مگر روک لگانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اس جذبۂ ترمیم کو پوری طرح نمایاں ہونے کا موقع نہیں مل پاتا، ورنہ نوخیز علماء جو اپنے ناتمام مطالعہ کے نتیجہ میں اپنی ''ناقص رائے'' کے اظہار میں اچھی خاصی جرأت دکھا لیتے ہیں، وہ اب تک اپنی ''ناقص رائے'' کی بدولت مسائل شرعیہ کی تمام چولیں ڈھیلی کر چکے ہوتے، لیکن یہ روک کب تک؟ جب سیمینار کے یہ سوالات مسلسل ''راہ اجتہاد'' ہموار کرتے چلے جا رہے ہیں، تو کیا عجب پرانے خیال کے علماء یا تو خود کو اس سے الگ کر لیں، یا وہ بھی اسی رنگ میں رنگ جائیں، اس کے بعد احداث اور نوخیز علماء کے لئے ہر 'ناقص رائے' کو درجۂ کمال تک پہونچانے کا موقع آسانی ہاتھ آ جائے۔

اعظم گڈھ کے سیمینار میں اس کا ایک منظر دیکھنے میں آیا تھا، زکوٰۃ کے مصارف میں ''فی سبیل اللہ'' کا موضوع زیر بحث تھا، پرانے خیال کے علماء اسی رائے پر متفق تھے، جس کا فیصلہ فقہاءِ متقدمین نے کیا ہے، یعنی ''غازی فی سبیل اللہ'' لیکن ایک صاحب بغداد سے تشریف لائے

تھے،انہوں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک زبان کی پوری طاقت اس کولغواور مہمل قرار دینے میں صرف کر دی، غیر مقلدین اور جماعت اسلامی کے مولویوں کے چہروں پرخوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں، لیکن دوسرے علماء بڑی گرانی سے اس سمع خراشی کو برداشت کرر ہے تھے، اسی طرح ہر سیمینار میں ایک دوصاحب تشریف لاتے ہیں، اوراپنی آزادانہ رائے سے فقہ اسلامی کی پابندرایوں کو ڈھیلا کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

سیمینار کے سوال ناموں سے دوسرا تأثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذاہب فقہ میں حنفی مسلک ایک مشکل ترین فقہ ہے، جس کا نفاذ آج کے پیچیدہ دور کے بہت سے سنگین مسائل میں مشکل ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس کے بہت سے مسائل سے دستبردار ہوجایا جائے، اس عمل کے واسطے 'تلفیق' اور 'مذہب غیر' پر عمل کرنے کے مباحث اٹھائے گئے، اور راستہ ہموار کیا گیا کہ جو مسائل مشکل نظر آئیں، انہیں تلفیق کے ذریعہ یا مذہب غیر کے مطابق فتویٰ دے کر آسان کرلیا جائے۔

غالباً اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ سوال نامے اتنے جذباتی اور ڈراؤنے انداز میں مرتب کئے جاتے ہیں کہ ان کو پڑھتے ہی مفتی کی ذہنیت، فرار کے لئے اغلب یہ ہے کہ آمادہ ہوجاتی ہے، پھر وہ دلائل کی قوت اور ان کے ضعف سے قطع نظر سوال نامہ میں بیان کردہ مجبوری کا حوالہ دے کر فقہ حنفی سے گریز کی راہ سوچنے لگتا ہے، حالانکہ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اتنی مجبوری نہیں ہوتی، کہ اس کی وجہ سے فقہ حنفی کو چھوڑنے کی ضرورت پیش آجائے، ان سیمیناروں کی برکت سے اندیشہ ہے کہ مفتیان کرام کا ذہن خصوصیت سے فقہ حنفی کے خلاف نہ بنتا چلا جائے، اوراس کے نتیجے میں فقہاء متقدمین پر اعتماد کم ہوجائے۔ نہ غیر مقلدیت! بلکہ ایک طرح کی ذہنی اباحیت ہے، جو بالآخر شریعت ہی کو مشکوک بنا کرر کھ دے گی۔

اس سلسلہ میں بطور مثال کے حج سے متعلق بعض مسائل قابل توجہ ہیں، جو سیمینار کے سوال نامے میں شدومد کے ساتھ اٹھایا گیا ہے، اور مفتیان کرام نے بے تکلف فقہ حنفی سے فرار کا مشورہ دیا ہے، سوال نامہ میں کہا گیا ہے کہ:

''حج واحرام کے بعض مسائل ایسے ہیں، جن میں فقہ حنفی کے مطابق عمل کرنا موجودہ

زمانہ میں بعض اعذار اور ضرورتوں کی وجہ سے دشوار ہوگیا ہے، ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک میقات سے باہر رہنے والوں کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لئے حج یا عمرہ کا احرام باندھنا ضروری ہے، خواہ وہ کسی نیت سے داخل ہورہا ہو، آج کل اس مسئلہ پرعمل کرنا نہایت دشوار ہے، کیونکہ بکثرت تجارتی تعلقات، آمدورفت کی سہولیات کی وجہ سے بار بار مکہ مکرمہ میں باہر والوں کو بھی اور خود مکہ والوں کو بھی میقات کے اندر باہر آنا جانا پڑتا ہے، بالخصوص تجارتی سامان لے جانے والے ملازمین اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو اس صورت میں ہر مرتبہ میقات سے احرام باندھ کر آنا اور ارکان عمرہ کی ادائیگی بہت مشکل ہے، تو کیا ایسی صورت میں مسلک حنفی سے عدول کرکے مسلک شافعی پرعمل کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ یہ سوال کا خلاصہ ہے

اب ناظرین غور فرمائیں، ایسے مشکل مسئلہ کا جواب بجز اس کے اور کیا ذہن میں آسکتا ہے کہ جی ہاں حنفیہ کے ایسے سخت مسئلہ کو دور رکھئے، اور بجان ودل شافعیہ کے مسلک پرعمل کیجئے، اور ایسا فیصلہ صادر بھی فرمادیا گیا ہے، اور اسے عوام میں مشتہر کردیا گیا، اب فقہ حنفی کے بارے میں عوام وخواص کا ذہن یہی تو بنے گا کہ فقہ حنفی جب یہاں قابل عمل نہیں ہے تو اور بھی مسائل میں قابل عمل نہ ہوگا۔

اس میں نہ مفتی کو دلائل پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ فرصت ہے، اس کے لئے یہ آسان ہے کہ "**الدین یسر**" کہہ کر حنفیت کی جڑ کاٹ دے، حالانکہ غور کرنے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔

حرم محترم دنیا کی عام جگہوں کی طرح کوئی جگہ نہیں ہے، وہاں ایک خاص تقدس اور احترام ہے، وہاں شکار نہیں کرسکتے، خودرو پودوں اور گھاسوں کو نہیں کاٹ سکتے، اسی طرح اس کے تقدس اور احترام کا تقاضا ہے کہ جب کوئی شخص اس میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو ادب و احترام اور وہاں کے مقصد خاص کی رعایت کرکے داخل ہو، احادیث کی روشنی میں فقہ حنفی نے یہ بات واجب قرار دی ہے کہ جانے والا احرام باندھ کر جائے، اور وہاں کی اصل عبادت حج یا عمرہ کرکے پھر کسی اور کام میں لگے، وہ کوئی تجارت گاہ یا صنعت گاہ نہیں ہے، کہ آدمی جیسے چاہے چلا جائے۔

اب سنئے کہ سعودی حکومت حج کے لئے محیر العقول انتظامات کرتی ہے، اگر وہ چاہے تو احناف کے لئے نہایت آسانی سے حرم میں داخل ہونے کے اس پیچیدہ اور ہولناک عذر کو حل کرسکتی ہے، اور دوسرے لوگ بھی اس کار خیر سے مستفید ہوسکتے ہیں، آخر وہاں غیر مسلموں کے داخل ہونے پر پابندی ہے، تو ان کے لئے عجیب وغریب انتظامات کئے گئے ہیں، یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ حرم کی توسیع وتعمیر اور وہاں کے بڑے بڑے تعمیری وصنعتی منصوبوں کے چیف انجینئر بلکہ بہت سے ذیلی انجینئر غیر مسلم ہیں، انہیں حرم سے باہر رکھا جاتا ہے، اور جدید آلات کے ذریعہ جن کے بڑے بڑے مراکز نصب ہیں، ان سے مشورے اور رہنمائیاں حاصل کی جاتی ہیں، اسی طرح کیا یہ انتظام نہیں ہوسکتا کہ حدود حرم کے باہر ایسے تجارتی چک پوسٹ اور ناکے بنادیئے جائیں، جہاں وہ اہل تجارت ڈرائیور اور ملازمین وغیرہ جو احرام اور حج وعمرہ کی پابندی نہیں برداشت کرنا چاہتے، رک جایا کریں، اور حرم کے اندر رہنے والے ڈرائیور، ملازمین اور تجار یہاں سے اپنی ذمہ داری سنبھال لیں، حکومت کے لئے یہ انتظام کچھ مشکل نہیں، بجائے مسئلہ میں تبدیلی کرنے کے یہ صورت سعودی حکومت کے سامنے اجتماعی طور پر ان سیمیناروں کے فیصلہ کی صورت میں رکھیں، یہ حکومت تو مشوروں کی طالب رہتی ہیں۔

اسی طرح یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ مکی شخص حج کے مہینوں میں میقات سے باہر جائے، اور اس سال حج کا ارادہ رکھتا ہو، تو وہ کیا کرے؟ اگر میقات سے بلا احرام کے واپس چلا آتا ہے تو یہ جرم۔ عمرہ کا احرام باندھ کر آتا ہے تو یہ غلط، کیونکہ وہ حج کا ارادہ رکھتا ہے، اب عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کرے گا، پھر حج کا احرام باندھ کر حج کرے گا، تو تمتع لازم آئے گا، وہ مکی کے لئے جائز نہیں ہے، اور اگر صرف حج کا احرام باندھ کر آئے، تو حج کے وقت تک اسے احرام میں مقید رہنا پڑے گا، یہ بہت دشوار! اور اگر وہ یہ طے کرلے کہ حج کے مہینوں میں وہ میقات کے باہر نہ جائے گا تو اس کی تجارت کے لئے سخت نقصان دہ! اب وہ کرے تو کیا کرے؟ مفتیان کرام بتائیں کہ اگر فقہ حنفی میں اس کا حل نہیں ہے، تو مسلک شافعی پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی کہ بلا احرام میقات سے واپس آجائے، اور حج وعمرہ کا ارادہ نہ کرے۔

اب کون ایسا سر پھرا مفتی ہوگا، جو اتنی ہولناک مجبوریوں کے بعد بھی فقہ شافعی پر عمل کا

مشورہ نہ دے گا، اور فقہ حنفی کو کالائے بد بریش خاوند کا مقولہ نہ سنائے گا۔

حالانکہ مسئلہ کچھ مشکل نہیں ہے، اگر اس کا حج، حج فرض ہے، تو یہ زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے، اس سال میقات سے باہر نہ نکلے، تجارت کا قدرے نقصان برداشت کرلے، یا کسی اور آدمی سے کام کرالے، خود باہر نہ جائے، اور اگر حج نفل ہے، تو اس کے لئے زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے، عمرہ کا احرام باندھ کر آئے، اور عمرہ کرکے فارغ ہوجائے، حج نہ کرے بلکہ تجارت کرتا رہے، نفلی حج کے لئے حنفی مسلک کو چھوڑ دینے کی کیا ضرورت ہے، اور اگر اسے نفلی حج کا ایسا ہی شوق ہے، تو دنیا کی قربانی دینا اس کے لئے کیا مشکل ہے؟۔

ایک سوال اور ملاحظہ ہو، یہ سوال حج تمتع اور حج قران والوں کے لئے رمی، ذبح، اور حلق کے درمیان ترتیب کے وجوب سے متعلق ہے، سوال میں کہا گیا ہے کہ:

''احناف کے مفتیٰ بہ قول میں ترتیب کو واجب کہا گیا ہے، دور حاضر میں اس ترتیب کی رعایت میں دشواری یہ ہے کہ حجاج کے بے پناہ ازدحام، موسم کی شدت، قیام گاہ اور مذبح میں کافی دوری ہونے، اور سواری نہیں ملنے کی وجہ سے حجاج خصوصاً ضعیف ومعذور حجاج کے لئے خود مذبح جاکر قربانی کرنا، انتہائی مشکل ہوگیا ہے، اس لئے حجاج عام طور پر قربانی کی رقم ان اداروں کے حوالہ کرکے فارغ ہوجاتے ہیں جو حجاج کی طرف سے نیابۃً قربانی کا نظم کرتے ہیں، قربانی کا نظم کرنے والے ان اداروں کے ذمہ داروں کے مسلک میں ترتیب واجب نہیں ہے، اس لئے یہ لوگ بسا اوقات ترتیب کا خیال نہیں کرتے، ان حالات میں اگر رمی، ذبح، حلق کے درمیان ترتیب قائم نہ رہ سکے تو...... مذکورہ حالات کے پیش نظر کیا اس مسئلہ میں فقہ حنفی کے قولِ مرجوح اور دوسرے ائمہ کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے؟''۔

ظاہر ہے کہ اس انتہائی مشکل حال میں بھی کہا جائے گا، ہاں فقہ حنفی کے قول مرجوح کو اختیار کرلیا جائے، اور وہ کرلیا گیا، لیکن غور کرنے کا یہ پہلو چھوٹ گیا کہ:

(ا) ان غیر ذمہ دار اداروں کے علاوہ دوسرے ایسے ذمہ دار ادارے بھی ہیں، جن کے مسلک میں ترتیب واجب ہے، اور وہ ترتیب کی رعایت کرتے بھی ہیں، ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔

(۲) ذبح کے لئے ایک ہی دن نہیں ہے، اللہ نے خود آسانی پیدا فرمادی ہے کہ اس کے لئے تین دن متعین کردیئے ہیں، ۱۰؍ذی الحجہ کو ضرور ازدحام ہوتا ہے، تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ضعفاء ۱۰؍ کو رمی کرلیں، اور قربانی نہ کریں، وہ ۱۱؍ یا ۱۲؍ کو قربانی کرلیں، ان دنوں میں ازدحام نہیں ہوتا، اگر قربان گاہ دور ہے، تو عموماً حجاج تنہا نہیں ہوتے، کئی لوگ ساتھ ہوتے ہیں، اپنے ساتھی سے مدد لے لیں۔

البتہ اس صورت میں احرام نہیں اتر سکے گا، جب تک قربانی سے فارغ نہ ہوجائیں، اور یہی چیز لوگوں پر بھاری پڑتی ہے، وہ جلد سے جلد احرام سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، کیونکہ بہت سے لوگوں کو نعوذ باللہ داڑھی منڈانے کی جلدی رہتی ہے، حالانکہ ایک دو روز احرام کی پابندی کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس سہل صورت کے ہوتے ہوئے، مشکلات اور دشواریوں کی دہائی دے کر حنفی مسلک کو ترک کرنے یا قول مرجوح کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ وجیہ نہیں ہے۔

اسی طرح ایک سوال میں یہ بھی مسئلہ نازک بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ طواف زیارت جو حج کا ایک فریضہ ہے، جب اس کے کرنے کا وقت آیا تو عورت کو حیض آ گیا، اور پاک ہونے سے پہلے اس کی روانگی کی تاریخ آ گئی، اور وہ قلت نفقہ یا ویزا نہ بڑھ سکنے کی مجبوری، جہاز کی تاریخ میں عدم تبدیلی کے سبب مکہ مکرمہ میں نہیں ٹھہر سکتی، تو کیا کرے؟ پھر کچھ اور دشواریوں کو ذکر کرکے طواف زیارت کے لئے طہارت کے وجوب کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ کیا وہ ساقط ہوجائے گا؟ اور اگر اس وجوب کو نہ ساقط کیا گیا، تو واپسی کے بعد اپنے شوہر کے لئے کبھی حلال نہ ہوگی، جب تک دوبارہ وہ مکہ مکرمہ آ کر طواف زیارت نہ کرلے، مکہ واپس آنا دور دراز ملک سے انتہائی مشکل ہے، پھر مزید یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ مسئلہ آج کل حجاج کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کے بعد کثیر الوقوع ہے، اس لئے اس کا شرعی حل واضح کرنا ضروری ہے۔

ناظرین عالی مقام غور کریں کہ اس نازک اور دشوار ترین اور قانونی مجبوری کی فضا میں مفتی اس کے علاوہ اور کیا سوچے کہ لاؤ حالت حیض میں طواف کی اجازت دے دو، اس کے نتیجہ میں ایک بڑا دم دینا ہوگا، وہ آسان ہے۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک تو حالت حیض میں طواف کرنا خود حرام، دوسرے اس حالت میں مسجد میں داخل ہونا حرام،ان دو حراموں کی اجازت صرف اس بنا پر کہ قانونی مجبوری ہے، یا قلت نفقہ کی مجبوری ہے، جب کہ فی الحقیقت یہ مجبوریاں زیادہ تر فرضی ہیں، کیسے درست ہوسکتی ہے؟۔

اول تو اس سلسلہ میں حکومت کو متوجہ کرنا چاہئے، جو فریضۂ حج کے سلسلہ میں ہر سہولت دینے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتی ہے،حکومت کی اس خصوصی توجہ کے بعد کسی مجبوری کا نام لینا بے کار ہے۔

دوسری مجبوری جہاز کی تاریخ نہ بڑھ سکنے کی ہے،تو یہ بھی کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے،عملاً ایسا بہت ہوتا رہتا ہے کہ لوگ جہاز کی تاریخوں میں تبدیلی کرواتے رہتے ہیں، یہ حیض کی مجبوری کا مسئلہ سیکڑوں میں کسی ایک کو پیش آتا ہے،اس کا حل کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے،لیکن بات یہ ہے کہ لوگ کسی طرح کی مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، دنیاوی سامان کی خرید وفروخت ہوتو سب کچھ کر لیتے ہیں،اور دینی فرائض کے لئے سخت کاہل ہوجاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ کچھ کرنا نہ پڑے، بلکہ ناجائز ہی جائز ہوجائے۔[۱]

قلت نفقہ کی بات بھی فرضی ہے،آج کل حج کے قوانین کے رو سے آدمی کبھی قلت نفقہ کا شکار نہیں ہوسکتا، الّا یہ کہ کوئی آسمانی آفت آجائے، لیکن اول تو یہ صورت اقل قلیل ہے، دوسرے اس حالت میں مدد کرنے والے بہت اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر یہ مسئلہ باوجود حجاج کرام کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کے ایسا کثیر الوقوع نہیں ہے، کہ اس کے لئے اجتماعی طور سے ناجائز کو جائز کرنے کی ضرورت پیش آئے، ماشاء اللہ مکہ مکرمہ میں علماء کی کمی نہیں ہے، کسی کو ایسی ضرورت پیش آئے گی ،تو اس کے وقتی حالات وضروریات اور سہولیات ومشکلات کو سامنے رکھ کر حضرات علماء کرام حل کردیں گے، یہ اجتماعی فیصلۂ جواز شریعت ہی کو مشتبہ بنادے گا۔

یہ چند مسائل بطور نمونہ کے پیش کئے گئے ہیں، ایسے مسائل ہر سوال نامے میں بہتات کے ساتھ ہوتے ہیں، ان مسائل کا حل آسانی سے نکالا جاسکتا ہے،لیکن چونکہ ہم سے یہ نہیں

ہوسکتا، اس لئے لاؤ مسائل ہی کو حالات کے رنگ میں لے آؤ، یہ رجحان سیمیناروں کے، سامنے آرہا ہے، یہ اباحیت کا راستہ ہے، اس پر چل کر آدمی کہاں پہونچے گا؟ شریعت کا کیا حلیہ بنے گا؟ اور اسلاف پر اعتماد کا کیا حال ہوگا؟ آج کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

سوال نامہ مرتب کرنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ سوال نامہ مرتب کرتے وقت ادنیٰ ادنیٰ حاجات کو ضرورت ومجبوری کی ہولناک صورت نہ بنادیا کریں، ورنہ اسلام سے جہاد وغیرہ کے مسائل کو نکالنا پڑے گا، کیونکہ ان میں اور زیادہ مجبوریاں اور مشقتیں ہیں، اور نوادر کو عام مسائل کے درجہ میں نہ رکھیں، بلکہ نادر مسائل کو سیمینار کا موضوع بحث ہی نہ بنائیں، جس کسی کو اس طرح کے نادر مسائل اتفاقاً پیش آجائیں، مثلاً حالت حیض میں کسی مجبوری سے طواف زیارت کا مسئلہ وغیرہ تو وہ کسی متدین عالم سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرلے گا، عام ناجائز صورتوں کو کسی خاص مجبوری سے جائز قرار دے کر اسے عام نہ کریں، ورنہ خاص مجبوری تو پس پشت چلی جائے گی، اور ناجائز چیز جائز بن جائے گی، جیسا کہ بیمہ کی تحلیل کے مسئلہ میں بکثرت مشاہدہ ہوا ہے۔
وباللہ التوفیق

ماخذ: المآثر۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر (۱۹۹۷ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) دینی مسائل میں لاپرواہی اور کاہلی کا یہ عالم ہے کہ اس سال حج سے ایک روز پہلے منیٰ میں زبردست آگ لگی، جس میں بڑی افراتفری ہوئی، یہ خاکسار بھی وہاں حاضر تھا، منیٰ میں جس خیمہ میں ہمارے قافلہ کا قیام تھا، اس میں کچھ گجراتی نوجوان مرد وعورت بھی تھے، آخری دن مجھ سے ایک گجراتی نے پوچھا کہ کیا ہم اپنی عورتوں کی طرف سے نیابۃً رمی کرسکتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کیا یہ وہاں نہیں پہونچ سکتیں، اس نے کہا پہونچ سکتی ہیں، میں نے کہا انہیں اپنی کنکری خود مارنی ہوگی، وہ یہ سن کر خیمہ کے باہر عورتوں سمیت نکل گیا، وہاں کچھ اور لوگ اس قافلہ میں شامل ہوگئے، تو وہی شخص پکار کر کہہ رہا تھا کہ جمرات پر بہت بھیڑ ہوتی ہے، عورتوں کو ایک طرف ٹھہرادیں گے، اور ان کی طرف سے کنکری ماردیں گے، اس کو سن کر ایک دوسرا شخص اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے میرے پاس لایا، اور دوبارہ مسئلہ پوچھا، میں نے پھر وہی بتایا، جو بتاچکا تھا، تو پہلے شخص نے کہا کہ بہت مشکل ہے، دوسرے نے جواباً کہا کہ حج کرنا بھی تو بہت مشکل ہے، آخر کیوں عورتوں کو لائے ہو، ان کی طرف سے تم پورا حج کردیئے ہوتے، یہ ایک مثال نہیں ہے، اس طرح کے متعدد واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

بیمہ اور فقہ اکیڈمی کے فیصلہ؟

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں ۳/تا۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ کو ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کا پانچواں سیمنار منعقد ہوا، اوراس کے معاً بعد اخبارات میں ''انقلابی فیصلہ'' کے عنوان سے ممتاز سرخی کے ساتھ جان ومال کے بیمہ کے جواز کا قطعی فیصلہ شائع ہوا، بعد میں مجمع الفقہ الاسلامی کی طرف سے بھی کتابچہ وغیرہ کی صورت میں اس فیصلہ کی اشاعت کی گئی، اس فیصلہ کی اشاعت کے بعد جہاں بیمہ کمپنیوں کو اپنے کاروبار میں وسعت وہمہ گیری پیدا کرنے میں مدد ملی وہیں عام مسلمانوں بالخصوص دیندار طبقہ میں ایک بے چینی بھی پیدا ہوئی، اس فیصلہ سے پہلے عام طور سے مسلمانوں کا رجحان اس کے خلاف تھا، کیونکہ اس میں سود اور جوا دونوں موجود ہیں، جن سے مسلمانوں کو ایسی ہی گھن ہے، اور ہونی چاہئے، جیسی لحم خنزیر سے ہے، یا پاخانہ پیشاب سے، اس لئے بیمہ کمپنیاں اپنے کاروبار کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے درمیان کامیاب نہیں ہو پاتی تھیں عموماً بیمہ ایجنٹوں کے پاس بریلی علماء کے کچھ فتوے ہوا کرتے تھے، جن سے عموماً مسلمان متاثر نہیں ہوتے تھے، لیکن اس فیصلہ کی اشاعت سے بیمہ ایجنٹوں کو اپنے کاروبار کے فروغ کے لئے ایک مؤثر سبب ہاتھ آ گیا ہے، لیکن بہرحال اندازہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس سے مطمئن نہیں ہے، اس سلسلہ میں انفرادی طور پر مسلسل استفسارات ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس باب میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ اس فیصلہ کو چوتھے اور پانچویں دونوں فقہی سیمینار کے حوالہ سے شائع کیا گیا ہے، یہ خاکسار چوتھے سیمینار میں شریک نہ تھا، لیکن پانچویں سیمینار میں اول سے آخر تک شریک رہا، سیمینار کے جو جلسے دونوں وقت ہوتے رہے، ان میں یہ مسئلہ کسی وقت زیر بحث

نہیں آیا[۱] البتہ جب سیمینار کے تمام اجلاس ختم ہو گئے، اور صرف آخری اجلاس باقی رہ گیا تھا، اور اس وقت مختلف مسائل کے سلسلہ میں ذیلی کمیٹیاں اپنی تجاویز تیار کرنے میں مصروف تھیں، تا کہ انہیں آخری اجلاس میں سنا دیا جائے، اسی دوران ایک صاحب بیمہ کے جواز کی اس تجویز پر فرداً فرداً علماء کرام سے دستخط لے رہے تھے، بعض حضرات دستخط کر رہے تھے، بعض انکار کر رہے تھے، چنانچہ خاکسار نے بھی اس سے اختلاف کیا، اور دستخط کرنے سے معذرت کر دی، جو صاحب دستخط کرا رہے تھے، وہ بار بار لے کر آئے، اور بہت زور دیا کہ اس پر دستخط کر ہی دیجئے، مگر میں نے اور میرے کچھ رفقاء نے اس کی تائید سے انکار کر دیا، پھر جب آخری اجلاس ہوا، تو جہاں تک مجھے یاد ہے، اس میں پانچویں سیمینار کی تمام تجاویز تو پڑھ کر سنائی گئیں، اور بعض بعض پر بحثیں بھی ہوئیں، ترمیمیں بھی کی گئیں، مگر یہ تجویز اس میں بھی نہ آئی، گویا اس کا تعلق پانچویں فقہی سیمینار اور اس میں شریک ہونے والے تمام علماء سے نہیں ہے، لیکن جب اس کی اشاعت ہوئی تو اس سے ایسا محسوس ہوا کہ یہ مسئلہ چوتھے سیمینار میں زیر غور تھا، اور پانچویں سیمینار میں اس کا فیصلہ ہوا، گویا اس میں شریک ہونے والے تمام علماء کی رائیں اس سے متفق ہیں، لیکن یہ بات خلاف واقعہ ہے، کہ تمام شرکاء اس سے اتفاق رکھتے ہیں۔

(۲) مزید برآں یہ کہ چوتھے فقہی سیمینار میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے کسی قطعی فیصلہ تک پہونچنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی، اور اس کمیٹی کے ممبران کے اسماء گرامی شائع کئے گئے ہیں، اور یہ ذکر کیا گیا ہے کہ پانچویں فقہی سیمینار میں ''کمیٹی کے موجود ارکان اور مزید دیگر علماء پر مشتمل ایک کمیٹی نے صورت حال پر غور کیا'' اس میں ''موجود ارکان'' ایک مبہم لفظ ہے، جس سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ کمیٹی کے کون کون سے ارکان شریک تھے، اور کون نہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات کے ناموں کی اشاعت کی گئی ہے، وہ سب شریک رہے ہوں گے، لیکن ایسا نہیں ہے، ان میں کئی ایسے افراد شریک نہیں تھے، جن کا ہونا اس فیصلہ کے سلسلہ میں ضروری تھا، اور ان کی موجودگی اس میں بڑی حد تک مؤثر ہو سکتی تھی۔

ایک سنجیدہ مجلس علم و تحقیق، جس میں ملک کے مؤقر علماء شریک ہوتے ہوں، اس کی طرف سے ایسے اہم مسئلہ میں اس طرح کی مبہم تحریر اس کی ثقاہت و اعتماد کو مجروح کرتی ہے۔

(۳) حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جان ومال کا تحفظ بیمہ کے جواز پر موقوف نہیں، بیمہ جس کے عدم جواز کے معترف ذمہ داران فیصلہ بھی ہیں، کیا یہ بات وہ حضرات سوچ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے تحفظ کی اب کوئی شکل بجز بیمہ کے باقی نہیں رہ گئی ہے؟ اگر ایسی بات ہوتی تو اس کے جواز کی گنجائش نکل سکتی تھی، وہ بھی انفرادی اور شخصی طور پر نہ کہ اجتماعی اور علی الاطلاق طریقہ پر، لیکن یہاں تو اور بھی ذرائع اور اسباب ہیں، جن سے تحفظ کا کام لیا جاسکتا ہے، اس وقت سب کی تفصیل مقصود نہیں ہے، دو اہم باتوں کی جانب ہم حضرات علماء کرام کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں، (ا) اول یہ کہ حرص مال کی بہتات نے ہمارے دور میں حلال وحرام کی تمیز اٹھادی ہے، خالص حرام اموال جن کے حاصل کرنے کے لئے کسی کو کسی طرح کی مجبوری نہیں ہے، آدمی انہیں لے لینے اور کھا لینے میں کوئی خوف اور جھجھک نہیں محسوس کرتا، جو سرکاری ملازم ہیں، ان کے لئے رشوت مال غنیمت ہے، تجارت جیسا شریف پیشہ، کس قدر دغا وفریب پر مبنی ہو گیا ہے، اجیر اور مزدور اپنی ذمہ داری ادا کئے بغیر پوری اجرت کے لئے بے قرار رہتے ہیں، مرنے والے کا ترکہ جبراً غصب کرنے کا عام دستور ہے، چندلوگ کسی کاروبار میں شریک ہیں، تو عموماً دیکھا جاتا ہے، کہ اس کا کوئی ایک رکن اس میں خیانت اور بد دیانتی کا شکار ہوتا ہے، غرض ناجائز اور حرام اموال کی کھیپ کی کھیپ مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہوتی ہے، کافر کے گھر میں داخل ہوتو وہاں اوپر سے نیچے تک سب حرام ہی حرام ہے، عقائد، اعمال، دل، دماغ سب نجس ہیں، وہاں تو ایک ہی جواب ہے، **فحسبه جهنم** (اس کے لئے جہنم کافی ہے) لیکن مسلمانوں کے گھروں میں اس طرح سے حرام مال داخل ہوگا، تو ظاہر ہے کہ سب کو تہ وبالا کر کے رہے گا، ایک ناجائز چیز کو جائز قرار دینے کے بجائے مسلمانوں کو اہتمام کے ساتھ حلال خالص کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، حلال خالص مقدار میں خواہ زائد نہ ہو مگر اس میں برکت ہوتی ہے، اور اس کے بے جا ہلاک ہونے کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ صاحب حیثیت ہیں، وہ باقاعدہ طور پر زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے، یونہی جیسے تیسے کر کے کچھ مانگنے والوں اور کچھ مدرسہ کے محصلین کو زکوٰۃ ادا کردیتے ہیں، لیکن اپنی ملکیت کے تمام اموال کا حساب لگا کر سال بسال پوری پوری

زکوٰۃ ادا کرنے کا دستور کم ہے، اور یہ بات مسلم ومعروف ہے، اور حدیث سے ثابت ہے کہ جس مال میں زکوٰۃ کی رقم شامل رہ جائے، وہ ہلاکت کے نشانے پر ہے، زکوٰۃ کا نکال دینا مال کی طہارت ہے، باوجود فرض ہونے کے جب زکوٰۃ نہیں نکالی گئی تو سارا مال نجس ہوگیا، اب وہ جلا دینے کے ہی قابل رہتا ہے۔

میں یہ وعظ نہیں کہہ رہا ہوں جس اضطرار کی بنیاد پر فقہی قاعدہ کا سہارا لے کر ایک ناجائز معاملہ کو عموماً جائز قرار دے دیا گیا ہے، اور اس میں جان ومال کے تحفظ کی ضمانت سمجھی گئی ہے، عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ جان ومال کے تحفظ کا یہ کوئی یقینی سبب نہیں، ہاں اللہ کا جو فریضہ ہے، اس کے نافذ کرنے کا انفرادی اور اجتماعی طریقہ پر اہتمام کیا جائے تو تحفظ کو زیادہ یقینی کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے قابل عمل نہیں ہے، اس سے اجتناب کرنا ہی متعین ہے۔ **واللہ الموفق**

ماخذ: المآثر۔ جنوری، فروری، مارچ (۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

ہم نے مجلّہ المآثر کے صفحات پر انشورنس کے سلسلے میں مجمع الفقہ الاسلامی کے فیصلہ کا سنجیدہ احتساب کیا تھا، اور اس سلسلہ میں چند باتیں حرف آغاز کے تحت تحریر کی گئی تھیں، اس میں یہ بات بھی عرض کی گئی تھی، کہ انشورنس کے سلسلہ میں پانچویں فقہی سیمینار منعقدہ اعظم گڈھ کے جلسوں میں بحث نہیں ہوئی تھی، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، آخری اجلاس میں پانچویں سیمینار کی تمام تجویزیں پڑھ کر سنائی گئی تھیں، مگر انشورنس والی تجویز اس میں نہیں آئی۔

اس پر ہمارے ایک محترم دوست نے ہمیں ٹوکا ہے کہ یہ تجویز آخری اجلاس میں پڑھ کر سنائی

گئی تھی، بلکہ خود انہیں محترم نے سنائی تھی، بحث اس لئے نہیں ہوئی کہ زیادہ تر شرکاء گذشتہ سیمینار کے تھے، شرکاء کی ایک بڑی تعداد نے مشروط یا غیر مشروط دستخط کئے تھے۔

بلا شبہ انسان خطا وسہو کا پتلہ ہے، اس کا حافظہ عین ممکن ہے کہ دغا کر جائے، ہم نے اس تحریر کے لکھنے سے پہلے اپنے حافظہ کو ٹٹولا تھا، فقہ اکیڈمی کی طرف سے شائع شدہ کتابچہ پڑھا، کئی احباب کے سامنے جو سیمینار کے اجلاسوں میں شریک تھے، اس کا تذکرہ کیا، مگر کہیں سے اس خبر کا سراغ نہ لگا کہ یہ فیصلہ آخری اجلاس میں سنایا گیا تھا، لیکن ہمارے دوست نے لکھا ہے کہ انہیں بخوبی یاد ہے کہ یہ تجویز سنائی گئی تھی، اگرچہ اس کے بعد بھی یہ بات ہماری لوح حافظہ پر ابھر نہ سکی، تاہم یادداشت کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے، موصوف کی اس بات کو تسلیم کرلینا ہم انصاف ودیانت کا تقاضا سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کی اطلاع بخشی۔

لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسے اجلاس میں سنایا گیا یا نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ انشورنس کے جواز کا جو فیصلہ صادر کیا گیا ہے، دلائل واصول کی روشنی میں اس کا وزن کتنا ہے؟۔

☆☆☆☆☆☆

تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

حضرات قارئین کو یاد ہوگا کہ فقہ اکیڈمی دہلی کی طرف سے جب بیمہ کے جواز کا فتویٰ شائع ہوا، اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اسے شائع کرکے پورے ہندوستان میں تقسیم کیا گیا، اورلوگ بڑی تیزی سے ہلاکت کی اس دلدل میں گرنے لگے، تو سب سے پہلے ''المآثر'' نے اس کے خلاف آواز بلند کی، پھر مشہور صاحب نظر عالم ومفتی حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری، جو عرصۂ دراز سے جوار رسول میں اقامت کا شرف رکھتے ہیں، انہوں نے اس کی طرف توجہ فرمائی، اور اس مسئلہ پر مسلسل مضامین اور خطوط لکھے، جن میں سے زیادہ تر 'مجلّہ المآثر' میں چھپے، اور بعض خطوط ومضامین دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اس صدائے حق کو تاثیر بخشی اور جس تیزی سے انشورنس کا سیلاب چلا تھا، اس پر ایک مضبوط بند لگ گیا، یہ سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا، مولانا موصوف نے حق کا اظہار بلاخوف لومۃ لائم کردیا۔

اس سلسلہ کا ایک بڑا افسوس ناک پہلو یہ سامنے آیا کہ انشورنس کے جواز کے خلاف المآثر میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ اور دوسرے معتبر اور قابل احترام علماء کے مضامین شائع ہوتے رہے، حضرت مفتی صاحب نے فقہ اکیڈمی کے سربراہ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب مدظلہ کو براہ راست مخاطب کرکے انہیں خط بھی لکھا، مسئلہ اہم ہے، مسئلہ ایک ایسے معاملے کے جواز کا ہے، جس کے بنیادی ارکان میں سود اور قمار دونوں شامل ہیں، اور یہ دونوں قرآن کی نص قطعی سے حرام ہیں، جواز کا مطلب یہ ہے کہ عارضی طور پر سہی ان دونوں محرمات قطعیہ کو جواز کی مطلق سند دے دی گئی، حق یہ تھا کہ جب اس پر ٹوکا گیا، تو فقہ اکیڈمی کی طرف سے اس سلسلہ میں وضاحت کی جاتی، ٹوکنے والوں کو غلط فہمی ہوئی تھی، تو اسے دور کرنے کی کوشش کی جاتی، اگر

اپنی غلطی محسوس ہوتی تو اس کا اعتراف کر کے رجوع کیا جاتا، اور یہ سب بر ملا ہوتا، اور اسی پیمانے پر ہوتا، جس پیمانے پر اس کی حلت و جواز کا فتویٰ شائع کیا گیا، ورنہ کم از کم یہ ہوتا کہ جن بزرگ نے براہ راست قاضی صاحب کو خط لکھ کر اس کی طرف متوجہ کیا تھا، انہیں کو خط کے جواب میں کچھ تحریر کیا جاتا، مصلحت نہ تھی تو شائع نہ کرتے، مگر ایک شخص خط لکھتا ہے، اور وہ بھی ایسا شخص جو علم و تفقہ کے بلند مقام پر فائز ہے، تو کیا اس کا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ چند صفحات اس کے جواب میں لکھ کر مجلّہ میں نہ سہی، نجی طور پر انہیں بھیج دیا جائے۔

لیکن افسوس یہ سب کچھ نہیں ہوا، فقہ اکیڈمی اور اس کے ارکان نے اس سلسلہ میں بالکل خاموشی اختیار کی، ایک آدھ مضمون آیا بھی تو محض ضمناً اور گویا تجاہل کے انداز میں! یا انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم نے فیصلہ کر دیا ہے، کوئی کچھ کہتا رہے، اس سے متأثر ہونا ہی نہیں ہے، یہ ٹھیک وہی ندازہے جو جماعت اسلامی کے بانی علامہ مودودی نے علماء حق کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا، کہ ان بزرگوں کی طرف سے خواہ کوئی بھی بات آئے، سرے سے دھیان ہی نہیں دیتے تھے، بس اپنے خرام ناز میں محو رہتے تھے، ہاں اگر ان کی جماعت کے کچھ افراد اس کی طرف انہیں متوجہ کرتے، تو بے تحاشا کبر وغرور کی پھلجھڑیاں ان کے قلم سے چھوٹنے لگتی، پھر تجہیل و تحمیق کے تمام اوصاف والقاب سے علماء کو وہ نوازتے چلے جاتے، اس طرح کے نمونے دیکھنے ہوں تو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمۃ کی عربی تالیف ''الاستاذ المودودی'' کے ترجمہ کے مقدمہ میں ملاحظہ فرمائیں، جنہیں خاکسار نے بطور عبرت کے جمع کر دیا ہے، ان کی جماعت کے افراد نے متوجہ کیا، تب تو وہ کچھ بولے، ورنہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کہتے رہے، مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے رہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے ٹوکا، مفتی کفایت اللہ صاحب مفتیٔ اعظم ہند نے مواخذہ کیا، مگر ان کے کبر وغرور نے سرے سے التفات کرنے کی اجازت نہیں دی، بس کہا تو یہی کہا کہ ہمارے مخالفین ہم پر بہتان لگاتے ہیں، تہمت تراشی کرتے ہیں، خوف خدا سے دور ہیں، آخرت کی جواب دہی کا انہیں احساس نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ بات ! جی نہیں چاہتا کہ قاضی صاحب مدظلہ کے متعلق لکھی جائے، لیکن واقعہ یہی ہوا

کہ انہوں نے تمام ایرادات ومواخذات، تمام اشکالات ودلائل اور تمام خطوط ومضامین کو یکسر نظر انداز کردیا، جیسے انہیں کچھ خبر ہی نہیں۔

پھر اخیر میں ایک خط حضرت مفتی صاحب نے قاضی صاحب کے نام نہایت مفصل لکھا اور امید رکھی کہ اس کے جواب سے خواہ نجی طور پر ہو، یا مجلّہ میں ضرور نوازیں گے، مگر قاضی صاحب نے اسے بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا، تو حضرت مفتی صاحب نے انتظار کے بعد اسے بعض رسالوں میں اشاعت کے لئے دے دیا، چنانچہ وہ شائع ہوا، اس کے بعد بھی صدائے برنخواست!

جب بات حد سے آگے بڑھ گی، تو ہندوستان کے نامور صاحب افتاء، جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ صاحب فتاویٰ رحیمیہ نے قاضی صاحب سے اس کے جواب کا مطالبہ کیا، تب قاضی صاحب نے جواب کا ارادہ فرمایا، لیکن اب بھی انہوں نے مفتی عاشق الٰہی صاحب کو لائق خطاب نہیں سمجھا، یہ جواب انہوں نے حضرت لاجپوری کے نام لکھا، اور انہیں کے پاس بھیجا، اس کے بعد بحث ونظر میں شائع کیا، نیز ریاض الجنہ گورینی میں چھپا، اس طرز عمل کو کیا کہا جائے؟۔

تمہیں بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

یہ راقم الحروف سن وسال کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے، اور علم وتفقہ میں درجۂ صفر سے بھی گرا ہوا ہے، لیکن یہ وسوسہ دل میں آتا ہے کہ کہیں یہ وہی طرز عمل تو نہیں ہے، جو مودودی صاحب نے علماء حق کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔

بہر کیف! مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ نے قاضی صاحب کا خط اور اس کے ساتھ اپنا بھی ایک مکتوب مفتی عاشق الٰہی صاحب کے پاس ارسال فرمادیا، حضرت لاجپوری نے اپنے خط میں حضرت مفتی صاحب کے لب ولہجہ کی شکایت بھی کی ہے، حضرت مفتی صاحب نے ان کے خط کا جواب فوراً تحریر فرمایا، اور اس میں قاضی صاحب کے خط سے بھی تعرض فرمایا، حضرت مفتی صاحب نے حکمت وموعظۂ حسنہ اور مداہنت کا فرق واضح فرمایا ہے، نیز عوام الناس کی نفسیات اور ان کے لحاظ ورعایت سے گفتگو کرنے کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے، اور ایک بڑی بات اس خط میں حضرات ناظرین یہ دیکھیں گے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے سابقہ خط میں لکھا تھا

’’آپ نے تلفیق پر بھی بہت زور دے رکھا ہے، متقدمین میں سے جس کسی نے جواز تلفیق کے بارے میں جوکوئی بات کہہ دی، آپ کو وہی ملتی ہے، اور جن حضرات نے اس میں سختی کی ہے، ان کا قول لینا گوارہ کیوں نہیں؟ کیا اس میں یہ جذبہ مضمر نہیں ہے کہ پہلے سے جو بات طے کررکھی ہے، اسی کے دلائل پیش کرنے ہیں، آپ مجھے معاف کریں یا نہ کریں یہ اتباع ہویٰ ہے‘‘۔(ریاض الجنۃ بابت مئی ۱۹۹۷ء)

اس پر قاضی صاحب نے سخت مواخذہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

’’حضرت والا (حضرت لاجپوری) سے بڑھ کر اس کو کون سمجھ سکتا ہے کہ اتباع ہویٰ کا یہ فتویٰ جو مولانا نے صادر فرمایا ہے، وہ بدترین گالی سے بھی بڑھ کر ہے، اور پھر جس کی بنیاد بھی سو فیصد غلط ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے تلفیق کے موضوع پر میرے مقالہ کو پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی‘‘۔(حوالۂ سابق)

پھر انہوں نے بتایا کہ تلفیق کے موضوع پر انہوں نے تمام اقوال کو جمع کیا ہے، اب یہاں یہ الگ بات ہے کہ تلفیق کے موضوع پر تمام اقوال کو جمع کرنے کا حاصل کیا ہے، بجز اس کے کہ عوام اور دنیا داروں کے نفس کے لئے کام جوئیوں کا ایک حیلہ دستیاب ہوجائے، کہ چلو اگر بعض لوگ اسے منع کرتے ہیں تو بہت سے لوگوں کے نزدیک جائز بھی تو ہے، سہل انگار علماء بھی سہولت کے ان اقوال سے فائدہ اٹھاکر اباحیت کا دروازہ کھولنے میں تکلف نہیں کرتے، خیر یہ تو ایک الگ موضوع ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے اس مواخذہ سے کیا اثر قبول کیا، میں کوئی تبصرہ نہیں کرتا، آپ خود اندازہ کرلیں گے کہ جذبۂ حق آدمی کو کس بلندی پر پہونچا دیتا ہے؟ لکھتے ہیں کہ:

’’قاضی صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے تلفیق کے بارے میں مجوزین اور مانعین دونوں کے قول لکھے ہیں، اور عاشق نے میری طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ تمہیں صرف مجوزین ہی کے قول ملتے ہیں، واقعی یہ احقر کی غلطی ہے، میں قاضی صاحب سے معافی چاہتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ میں نے بحث ونظر کا وہ پرچہ نہ دیکھا ہو، جس میں تمام اقوال نقل کئے گئے ہیں، بہرحال غلطی غلطی ہی ہے‘‘۔

کاش قاضی صاحب بھی اسی طرح کا کوئی نمونہ پیش کئے ہوتے۔

ماخذ: (جون، جولائی، اگست) ۱۹۹۷ء ☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک مجلس کی تین طلاق اور غیر مقلدین کا رویہ

تقریباً تین ماہ کے عرصہ سے اخبارات ورسائل میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مسئلہ پر ایک ناگوار شور وغوغا برپا ہے، یہ مسئلہ ایک خالص علمی اور قانونی مسئلہ ہے، جو علمی حیثیت سے اہل علم کے حلقوں میں موضوع بحث کبھی کبھی بنتا رہا ہے، لیکن آج وہ عامیانہ اخبارات ورسائل کے صفحات پر آکر غیر سنجیدگی کا شکار اور افتراق وانتشار پھیلانے کے لئے تختۂ مشق بن گیا ہے۔

ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلہ میں اسلام کے مشہور ائمہ وفقہاء کے درمیان اختلاف کبھی نہیں پایا گیا، قرآن وسنت کی روشنی میں سب نے یہی سمجھا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں، تین ہی ہوتی ہیں، لیکن بعد کی صدیوں میں چند ایک علماء کی منفرد رائے سامنے آئی کہ ایک مجلس کی تین طلاق، تین نہیں ایک ہی تسلیم کی جائیں، جنہوں نے یہ رائے دی ان کے سامنے خواہ کوئی بنیاد رہی ہو، لیکن یہ ایک شاذ اور منفرد رائے تھی، گوانہوں نے بہت شدومد سے اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی مگر امت نے اسے قبول نہیں کیا، سعودیہ عربیہ کی ہیئت کبار علماء نے بھی ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہونے کا فیصلہ دیا ہے، چنانچہ وہاں یہی فیصلہ نافذ ہے۔

ہمارے ملک کی یہ بدنصیبی ہے کہ یہاں اس شاذ رائے پر اصرار کرنے والی ایک جماعت وجود میں آگئی، اس نے اس مسئلہ کے حق ہونے پر جارحانہ قسم کا اصرار شروع کر دیا، اور ائمہ وفقہاء کی فہم اور ان کے اجتہاد کو قطعی غلط کہنے کی جرأت کر بیٹھی، اور ایک نزاع کی فضا پیدا ہوگئی، مگر اختلاف ونزاع کا جو بھی دائرہ تھا وہ علمی حلقوں ہی میں تھا، دلائل دیئے جاتے، ان کے جوابات تحریر کئے جاتے، تاہم ان کا ان عوامی اخبارات اور ریڈیو وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

لیکن شاہ بانو کیس میں شکست کھا جانے کے بعد ملک کا وہ عنصر جو ہمیشہ مسلمانوں اور

اسلام کی دشمنی پر آمادہ رہتا ہے، اسے بے قراری تھی کہ اس کا بدلہ کسی عنوان سے چکایا جائے، نہ جانے اسے تین طلاق والا یہ مسئلہ کن ذرائع سے حاصل ہوگیا کہ اسے بنیاد بنا کر اس عنصر نے مسلمانوں میں افتراق وانتشار کی چنگاری پھیلانی شروع کردی۔

اس سلسلہ میں ذرائع ابلاغ، اخبارات اور ریڈیو وغیرہ کی ہرزہ سرائیوں پر سنجیدہ اور متوازن رائے رکھنے والے علماء بہت کچھ لکھ چکے ہیں، اور بہت کچھ اس کی تفصیل اخبارات میں بھی اور دینی وعلمی رسائل میں بھی آچکی ہے، اسے دہرانے کا اس وقت کوئی حاصل نہیں ہے۔

البتہ ہم ان حضرات سے ایک گزارش ضرور کرنا چاہتے ہیں، جو خود کو اہل حدیث کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت اس مسئلہ میں اور دوسرے فروعی اختلافی مسائل میں آپ کی ہمنوا نہیں ہے، یہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد، بہت بڑی تعداد امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ پر اعتماد کرتی ہے، اور اختلافی مسائل میں ان کی تقلید کرتی ہے، اور اس مسئلہ میں تو ائمہ اربعہ ایک زبان ہیں، آپ کے اس فتویٰ کو جب مسلم دشمن عناصر نے ایک انقلابی اجتہاد کی شکل میں اچھالنا شروع کیا، اور یہ غل مچایا کہ مفروضہ ستم رسیدہ مسلم خواتین کے درد کا یہ مداوا ہے، اس لئے تین طلاق کے اس مسئلہ میں جو ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے، ترمیم کرکے یہ نیا فتویٰ علی العموم نافذ کردینا چاہئے، اور پھر اس ایک مسئلہ کو نظیر بنا کر دوسرے مسائل پر بھی انقلابی اجتہاد کی قینچی چلانی چاہئے، جب یہ غوغا مچایا گیا تو فطرۃً مسلمانوں کے سواد اعظم کے ترجمان علماء نے اس کا نوٹس لیا، اور یہ حقیقت واضح کی کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے ایک ہونے کا مسئلہ ائمہ اربعہ کے یہاں سرے سے ہے ہی نہیں، اور اس کے برخلاف جن لوگوں کی رائے ہے، وہ ایک شاذ رائے ہے، یہ اس لئے ہوا تاکہ مسلم دشمنوں کی طرف سے اٹھایا گیا فتنہ فرو ہوجائے، ایسے وقت میں اہل حدیث کہلانے والے حضرات کا بھی فریضہ تھا کہ مسئلہ کی صحیح صورت حال واضح کردیتے، اور جرأت مندی اور حق پسندی کا ساتھ دیتے ہوئے، برملا یہ کہہ دیتے کہ یہ مسئلہ امت کے سواد اعظم کے نزدیک یوں ہے، اور ہمارے نزدیک یوں ہے، ایک کا مسئلہ دوسرے کے سر نہیں تھوپا جاسکتا، اختلافی مسائل میں ابتداء اسلام سے طریقۂ کار یہی رہا ہے کہ جس کو جس پر اعتماد ہوا اس پر اس نے عمل کیا، علمی طور پر دلائل کو پیش کرنے کی بات اور ہے،

لیکن کسی نے دوسرے کے سر اپنا اجتہاد تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔

مشہور عباسی خلیفہ منصور نے امام مالک علیہ الرحمۃ سے درخواست کی کہ آپ اجازت دیں تو میں آپ کی مرتب کی ہوئی کتاب مؤطا کو اسلامی حکومت کے تمام شہروں میں بھیج کر یہ حکم دے دوں کہ اب سب لوگ اسی کتاب پر اور اس کے فتووں پر عمل کریں، یعنی اسے سرکاری قانون کی حیثیت دے دی جائے، تو امام مالک نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، اس کتاب سے پہلے ہر طرف صحابہ کرام اور ان کے جلیل القدر تلامذہ پھیل چکے ہیں، اور لوگ ان سے سیکھ سیکھ کر دین پر عمل کر رہے ہیں، اب یہ کتاب بطور قانون کے پہونچے گی، تو جو باتیں ان کے علم اور عمل سے مختلف ہوں گی، ان کو لے کر انتشار پھیلے گا، چنانچہ منصور اپنے خیال سے باز رہا۔

امام مالک کا یہ فیصلہ نہایت حکیمانہ فیصلہ تھا، ورنہ ان کے لئے خوشی کی بات تھی، کہ ان کی کتاب قانونی دستاویز بن رہی ہے، مگر انہیں جو بصیرت حاصل تھی، اور اخلاص کی جس دولت سے وہ سرفراز تھے، اس نے ان کے سامنے صحیح راستہ کھول دیا۔

غرض ان حضرات کے کرنے کا کام یہ تھا، کہ اپنے اور دوسرے فقہی مکاتب فکر کی پوزیشن واضح کر دیتے، لیکن دیکھا یہ گیا کہ یہ لوگ اپنی شاذ رائے کے حق بجانب ہونے کی دلیلیں پیش کرنے لگ گئے، اور اس کا کل فائدہ انہیں مسلم دشمن طاقتوں کو پہونچا، جنہوں نے ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔

بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ اندرونی طور پر ان حضرات کو کچھ مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ شاید اس طرح ہمارا مسئلہ اور ہمارا مسلک عام ہو جائے گا، چنانچہ بعض مقامات پر وہ لوگ باقاعدہ تحریکی شکل میں اپنے مسلک کی تبلیغ واشاعت میں لگ گئے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں مزید انتشار بڑھ رہا ہے۔

کاش یہ حضرات امام مالک علیہ الرحمۃ کے نکتے کو سمجھ لیتے، اور اس کو اپنے لئے مشعل راہ بنا لیتے، تو کتنے فتنے اپنی موت مر جاتے! **الیس منکم رجل رشید**

ماخذ: المآثر۔ جولائی، اگست، ستمبر (۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆☆☆

مملکت سعودیہ عربیہ میں غیر مقلدین کی بدعنوانیاں

دنیا میں علم اور جہل کی کش مکش ہر دور میں رہی ہے، مختلف مفادات کے زیر اثر قوموں نے بھی اور افراد نے بھی علم کے ساتھ عداوت کی ہے، یہ عداوت کبھی جوش انتقام میں، کبھی غیض و غضب میں، کبھی کسی کی ضد اور عناد میں ظاہر ہوتی رہی ہے، اور اس کے ظہور کے پیرائے بھی الگ الگ ہوئے ہیں، علم کا دشمن کبھی علم صحیح کو چھپا کر اپنی عداوت ظاہر کرتا ہے، کبھی کتابوں کو جلا کر، کبھی علماء سے نفرت کر کے! غرض اس کے ظہور کے طریقے بھی متعدد رہے ہیں، دوسری قومیں اور ملتیں چاہے اسے اپنے لئے مایۂ ناز اور باعث افتخار قرار دیں، مگر اسلام نے علم کی اشاعت کی ترغیب دی ہے، اس سے عداوت کو کبھی پسند نہیں کیا ہے، بشرطیکہ وہ علم ایمان و اسلام کے مخالف نہ ہو، اور جو علم دین وایمان کا مخالف ہوگا، وہ علم نہیں ہے، جہل ہے، خواہ اس کے حق میں کتنے ہی دلائل مہیا کئے جائیں، ایسے علم نما جہل سے دشمنی رکھنا ہی علم دوستی ہے۔

لیکن افسوس ہمارے زمانہ میں کچھ لوگ دین وایمان اور علم وعقیدہ کا نام لے کر اس کے پردہ میں علم کی عداوت میں پیش پیش نظر آرہے ہیں، اور اسے شاید وہ اپنا قابل فخر کارنامہ سمجھتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیچھے پیٹ کی غرض پوشیدہ ہوتی ہے، بریلوی مسلک کے عالم ہر سال ۱۰ محرم کو تعزیہ داروں کی دعوت پر ان کے مجمع میں تقریر کیا کرتے تھے، شہداء کربلا کے فضائل ومناقب پر تفصیلی کلام کرتے، مگر یہ کبھی نہیں کہا کہ تعزیہ داری شرک ہے، حرام ہے، کسی نے ان سے دریافت کیا کہ تعزیہ داری کا کیا حکم ہے؟ تنہا تھے، مجمع نہیں تھا، فرمایا کہ حرام ہے، اعلیٰ حضرت کا فتویٰ یہی ہے، پوچھنے والے نے کہا کہ آپ ہر سال تعزیہ داروں کے مجمع میں تقریر کرتے ہیں، مگر اس کو کبھی نہیں بیان کرتے، کہا کہ اگر اسے بیان کردیں گے، تو پھر کون بلائے گا؟ نہ بلائیں،

صحیح مسئلہ کا اعلان تو ہو جائے گا، کہنے لگے کہ مسئلہ روزی کا ہے۔

ایک علم صحیح کو اس لئے چھپالیا کہ روزی کا مسئلہ اندیشناک ہو جائے گا، یہ ایک مثال ہے اس مفاد کی جس کی بنیاد پر علم سے عداوت اختیار کی جاتی ہے۔

اب تازہ واقعہ سنئے، مدینہ منورہ زاد ہا اللہ شرفاً وکرامۃً میں ایک نہایت عابد وزاہد، کریم الطبع مہمان نواز اور سخی بزرگ رہتے ہیں، حضرت مولانا عبداللہ صاحب مدظلہ [۱]، رہنے والے تو یہ ضلع بستی کے ہیں، لیکن اب مستقلاً جوار نبوی میں رہتے ہیں، مجلّہ المآثر کے بڑے قدرداں ہیں، اور حضرت محدث الاعظمی قدس سرہ سے والہانہ تعلق رکھنے والے ہیں، انہوں نے حکم دیا کہ اب تک المآثر کی جتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں، سب کو الگ مجلد کروا کے دو سیٹ ان کے پاس بھیج دیئے جائیں، دفتر المآثر نے اس حکم کی تعمیل کی، کئی شمارے ختم ہو چکے تھے، ان کی فوٹو کاپی تیار کرائی، اور سات سات جلدوں کے دو سیٹ تیار کرائے گئے، مدرسہ شیخ الاسلام کے ایک استاذ پانچ چھ حجاج کے قافلہ کے ساتھ حج کو جا رہے تھے، یہ جلدیں ان کے حوالہ کی گئیں، کہ وہ رفقاء میں تقسیم کر دیں، تاکہ سب کے سامانوں کے ساتھ یہ علمی تحفہ وہاں پہونچ جائے، ہم لوگ مطمئن تھے، کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب انہیں پا کر بہت خوش ہوں گے، دعاؤں سے نوازیں گے۔

مگر ہوا کیا؟ عبرت کی داستان ہے، عقیدہ کے دعویٰ فروشوں پر عقل وایمان کا ماتم ہے، حجاج کا قافلہ اپنے سامانوں کے ساتھ ان تحائف علمیہ کو بھی لے گیا، احتیاطی تدابیر کے طور پر جدہ ایرپورٹ میں حجاج کے ساتھ جانے والے سامانوں کی تفتیش ہوتی ہے، ان حجاج کا قافلہ اترا تو بدقسمتی سے تفتیش کرنے والی ٹیم میں ہندوستان اور پاکستان کے غیر مقلدین بھی تعینات تھے، عموماً دیکھا گیا ہے کہ تفتیش کرنے والے عرب ہوتے ہیں، تو دینی رسائل وکتابوں سے تعرض نہیں کرتے، تین سال قبل یہ خاکسار المآثر کی متعدد جلدیں لے کر گیا تھا، اور تفتیش کرنے والے نے انہیں ایک نظر دیکھا، اور پاس کر دیا، مگر اس جگہ اردو زبان والا غیر مقلد ہوتا ہے، تو وہ کسی طرح برداشت نہیں کرتا کہ کسی حنفی کی کوئی کتاب مملکت سعودیہ میں پہونچے، یا کوئی ایسی کتاب وہاں داخل ہو جس کا تعلق تصوف سے ہو، اس کا قدرے تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

ان غیر مقلدین نے دیکھا کہ ایک ایسا مجلّہ جو ہندوستان کے محدث کبیر کی طرف

منسوب ہے، وہ محدث کبیر جس کی جلالت قدر تمام علماءِ عرب وعجم کے نزدیک مسلم ہے، لیکن وہ غیر مقلدین کے فرقہ شاذہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم احناف کا پیشوا تھا ان غیر مقلدین کو کیوں کر گوارہ ہوتا کہ اس مجلّہ کی جلدیں مملکت سعودیہ میں داخل ہوں، انہوں نے ان تمام مجلّات کو ضبط کرلیا، ان سے ان حجاج نے دریافت بھی کیا، کہ آخر ان رسائل میں کیا قصور ہے؟ جس کی وجہ سے ان پر پابندی لگ رہی ہے، مگر ایک رٹ تھی کہ نہیں! کسی عرب تفتیش کرنے والے نے بھی پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ حق کے ان دعویداروں نے جنہیں جھوٹ کا ٹھیکیدار کہنا بجا ہے، کہہ دیا کہ ان میں ''عقائد مختلفہ'' ہیں، ایسی کتابوں کے بارے میں سعودی گورنمنٹ کا قانون ہے کہ انہیں روک کر ان کی رسید دیدی جاتی ہے، اور تفتیش کے بعد ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوتی تو انہیں اصل مالک کو واپس کر دیا جاتا ہے، یا رسید دکھا کر ان سے واپسی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے، ان ظالموں سے رسید مانگی گئی، تو انہوں نے رسید دینے سے بھی انکار کر دیا، مجبوراً یہ حضرات خالی ہاتھ وہاں سے آگے بڑھے، انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ وہ گروہ ہے جو اپنے کو حقانیت کا علمبردار قرار دیتا ہے، جو اپنے ٹولے کے علاوہ کسی فرد یا جماعت میں حقانیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، اس نے اہل عرب کو باور کرا رکھا ہے کہ عقائد صحیحہ اسی گروہ میں منحصر ہیں، بے جا ضد اور ہٹ دھرمی اس کا شعار ہے، ایسی جامد ذہنیت اس گروہ کی ہے کہ اسے ہر شخص اہل باطل ہی نظر آتا ہے، یہ گروہ نہیں چاہتا کہ اس کے علاوہ دوسرے اہل اسلام کی کتابیں وہاں پھیلیں، انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ان کا پول نہ کھل جائے، اور ان کی روزی کا مسئلہ نہیں، بلکہ ان کی تکمیل حرص وہوس کا مسئلہ کھٹائی میں نہ پڑ جائے، یہ جھوٹ بول کر، تعصب وتنگ نظری کا خول بنا کر عربوں کی دولت اینٹھتے رہتے ہیں، انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ دولت ان کے ہاتھ سے نکلنے نہ لگ جائے، اس کے لئے وہ عجب عجب کھیل کھیلتے ہیں۔

اس طرح یہ اپنے تعصب، ضد وعناد اور بے عنوانیوں کی بدولت مملکت سعودی کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، سعودی مملکت جہاں تمام دنیا سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، ان میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی سب ہوتے ہیں، بلکہ اہل سنت کے ساتھ شیعہ بھی ہوتے ہیں، ان سب کو سعودی مملکت میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی

ہے،لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے، باہر سے ایک فسادی ٹولہ وہاں پہونچ کر اپنی چاپلوسیوں اورتقیہ بازیوں کی بدولت حکومت کے اداروں میں کس قدر گھس جاتا ہے، اورعلم ونظر کے ان تمام دروازوں کی ناکہ بندی کرنے کی کوشش کرتا ہے،جن کا تعلق اس ٹولہ سے نہیں ہوتا ہے، یہ علم سے دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

غور کرنے کی بات ہے کہ معاملہ اتنے پر ہی بس نہیں ہوا، کہ مجلّہ المآثر کی جلدوں کو روک دیا گیا ہے، جہالت وعناد کے شرارے جب اڑتے ہیں تو علم وعقل کا تمام خرمن جل جاتا ہے،ان حجاج کے ساتھ نبی کریمﷺ سے منقول دعاؤں کا مجموعہ ’’الحزب الاعظم‘‘ بھی جاتا ہے، جسے مرتب کرنے والے مشہور عالم ،مشکوٰۃ شریف کے شارح حضرت ملاعلی قاری علیہ الرحمۃ المتوفی ۱۰۱۴ھ ہیں،اسے بھی ان ستم ظریفوں نے ضبط کرلیا، حالانکہ اس کتاب میں وہی دعائیں ہیں، جوقرآن کریم میں ذکر کی گئیں ہیں، یا جو رسول اللہﷺ کی زبان غیب ترجمان سے ادا ہوئی ہیں، یا حضرات صحابہ کرام وتابعین عظام سے منقول ہیں،اورسہولت کے لئے انہیں سات منزلوں پرتقسیم کردیا گیا ہے، کہ ہر روز ایک منزل کو پڑھ لیا جائے ، بھلا اس میں کیا قابل اعتراض بات تھی؟ مگر اسے بھی ظالموں نے روک دیا، حجاج کہتے ہی رہ گئے ، کہ ہم ان مسنون دعاؤں کو کیسے پڑھ سکیں گے،مگر:

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت   نہیں کام آتی دلیل اور حجت

ان اللہ کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ اس طرح دوسروں کی ملکیت کو بزور حکومت غصب کر لینا،صرف تمہارے اس مفروضہ کی بنیاد پر کہ اس میں اس راہ سے علم نہیں آیا ہے، جو راہ تم نے اپنے لئے متعین کررکھی ہے، تنگ نظری کی راہ،تعصب کی راہ، ایک جامد ذہنیت کی راہ، چونکہ اس راہ سے اس میں علم نہیں آیا ہے،اس لئے وہ غلط ہے،محض اس غلط مفروصہ کی بنیاد پر کسی مسلمان کا مال تمہارے لئے حلال ہوجاتا ہے، اس کی ملکیت پر دست اندازی کا تمہیں جواز مل جاتا ہے، کیا کوئی حدیث تمہیں اس کی سند دیتی ہے؟ اللہ سے ڈرو، یوم حساب دم بدم قریب آتا جارہا ہے، یہ سب غصب کی ہوئی ملکیتیں اس دن برآمد کرلی جائیں گی،اپنے کو اتنا معصوم اور پاک باز قرار نہ دو کہ دوسرے سب گنہ گار اور خطا کار نظر آئیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت　　　　　　دامن کوذرا دیکھ ذرا بندقبا دیکھ

کسی حکومت کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسے ایسے مخلص اور صحیح الفکر علماء میسر آ جائیں، جوحکومت کو مخلصانہ اور صحیح مشورہ دیں، اس سے مملکت روز بروز ترقی کی جانب قدم بڑھاتی چلی جاتی ہے، رعایا خوش حال اور مطمئن ہوتی ہے، باہر سے جانے والے زائرین اور سیاح بھی بے خوف ہوتے ہیں، اور مملکت کی ہر طرف نیک نامی ہوتی ہے، اچھے اچھے لوگ کھنچ کھنچ کر پہونچتے ہیں علم کی قدردانی ہوتی ہے تو علوم کے قافلے وہاں اترتے ہیں اور ملک میں علم کی بہار آ جاتی ہے۔

ٹھیک اسی کے مقابلہ میں کسی حکومت کی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کے گرد ’’علماء سوء‘‘ کا حصار قائم ہوجائے، جو اپنے علاوہ کسی کو حکومت کے پاس پھٹکنے نہ دیں، علم وکمال کے تمام راستوں کو مسدود کردیں، اور اپنی من مانی چیزوں کو حکومت پر مسلط کریں، جب یہ صورت حال ہوتی ہے تو ظلم عام ہوجاتا ہے، انصاف مٹتے مٹتے ختم ہوجاتا ہے، پھر یہی چیز حکومت کے زوال کا سبب بن جاتی ہے۔

ہر زمانے میں حکومتوں کو غلط کار مشیروں نے اور برے علماء نے بگاڑا ہے، بدقسمتی سے سعودی حکومت پر بھی علماء سوء کا تسلط ہوتا جاتا ہے، بذات خود مملکت کے حکمراں بالخصوص خادم الحرمین الشریفین ملک فہد حفظہ اللہ بہت نیک نیت ہیں، ان کے قانون میں ہر مسلک والوں کے لئے رواداری موجود ہے، وہ حق کو اپنی اجارہ داری نہیں سمجھتے، مگر ہندوپاک کے غیر مقلدین اور نجد کے بعض متشدد علماء نے حکومت کی غلط اور ڈراونی تصویر بنا رکھی ہے، جس سے دوسرے ملک و مشرب کے علماء خوفزدہ رہتے ہیں۔

ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ کی تائید و تصویب سے ملک فہد کے پریس سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کا ترجمۂ قرآن پاک اور مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ کے تفسیری فوائد کی اشاعت ہوئی تھی، اس ترجمہ و تفسیر کی صحت وجلالت قدر پر برصغیر ہندوپاک میں بغیر استثناء کے اتفاق تھا، غیر مقلدوں نے بھی کبھی اعتراض کا کوئی شوشہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن جونہی مدینہ منورہ کے شاہی پریس سے چھپ کر اس کی اشاعت ہوئی، تمام غیر مقلدین کے پیٹوں میں مروڑ ہونے لگی، وہی ترجمہ وتفسیر جس پر اب

تک کوئی اعتراض نہ تھا، اب اس میں انہیں گمراہی کے کیڑے نظر آنے لگے، پھر اتنا طوفان اٹھایا گیا کہ اس کی اشاعت بند کردی گئی، اوراس کے بجائے محمد جونا گڑھی کا ترجمہ اور صلاح الدین یوسف کے تفسیری حواشی شائع کئے گئے، جن کا علمی دنیا میں نہ کوئی وزن ہے، اور نہ معتبر علماء ان سے واقف تھے۔

ان شرانگیزوں کی وجہ سے مملکت کی بدنامی ہورہی ہے، لیکن جیفۂ دنیا کے کرگسوں کو اس سے کیا مطلب؟ انہیں تو اپنا پیٹ بھرنے سے مطلب ہے، کوئی بدنام ہو یا نیک نام! انہیں اگر خوف ہے تو بس اس کا کہ کوئی شخص ان کی اس لوٹ گھسوٹ میں حصہ دار نہ بن جائے، تو وہ مطمئن رہیں، علماء احناف بالخصوص علماء دیوبند کو ان کے مرغوبات سے دلچسپی نہیں ہے، لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ مملکت پر علم کے دروازوں کو کوئی بند نہ کرے۔

سعودی حکومت کو ایسے شرپسند افراد کا احتساب کرنا چاہئے، ورنہ یہ خود تو ڈوبے ہیں، حکومت کو بھی لے ڈوبیں گے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔مئی، جون، جولائی (۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) حضرت مولانا عبداللہ صاحب مہاجر مدنی (المتوفی ۳۰/رجب ۱۴۲۵ھ) کے بارے میں جاننے کے لئے دیکھیں ''کھوئے ہوؤں کی جستجو''، صفحہ ۵۴۲۔

فرق ضالہ اور علمائے حق

۲؍اور۳؍مئی کو ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی میں جمعیۃ العلما ہند کی طرف سے ''تحفظ سنت کانفرنس'' کا انعقاد ہوا۔ ہمارے ملک میں مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہے جو سنت اور حدیث کے اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا دعوی بڑی بلند آہنگی کے ساتھ کرتا ہے، اس نے توحید و سنت کا نعرہ اختیار کرر کھا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے دعوئ عمل بالحدیث کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ حنفیت پر چوٹ کی جائے، ائمہ کرام بالخصوص امام ابوحنیفہ کو برا بھلا کہا جائے، ہندوستانی مسلمانوں کے سواد اعظم احناف کو گمراہ، مشرک، خرافی اور ان کی نماز کو خلاف سنت ثابت کیا جائے اس فرقہ میں کیا عالم کہلانے والے کیا جاہل، کیا کتابیں اور کیا جرائد ومجلّات، سب کا ایک موضوع ہے کہ حنفیت کو خلاف سنت وشریعت ثابت کر کے اپنے ٹولے میں اصافہ کیا جائے، اس کے لئے یہ لوگ وہ تمام حربے اور وسائل اختیار کرتے ہیں جن کے زیر اثر آدمی حنفیت سے بدگمان ہو جائے اس مقصد کے لئے مال اور پروپیگنڈہ کے تمام ذرائع بے دریغ استعمال کئے جاتے ہیں۔ آج کی دنیا تو جھوٹی تشہیر اور پروپیگنڈے کو کمال اشاعت سمجھتی ہے، چنانچہ بہت سے لوگ ان کے پھندے میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اور جب سے سعودی اور خلیجی ممالک کی دولت کا رخ اس فرقہ کی طرف ہوا ہے، اس وقت سے اس کی جارحیت میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ حدیث پر عمل کرنا سر آنکھوں پر، سنت کی ترویج عین مقصد ہے، توحید کی دعوت اور شرک سے بیزاری دین و ایمان ہے، لیکن ان چیزوں کا نام لے کر مسلمانوں کے نہیں! بلکہ علماو فقہا، مشائخ وصوفیہ اور بزرگان دین کے سواد اعظم کو گمراہ اور بدعتی ومشرک قرار دینا یہ کس عمل بالحدیث کا کرشمہ ہے؟ ایک زمانہ میں خوارج نے قرآن کو فیصل ماننے کا نعرہ لگایا، اور صحابہ کی ایک بڑی تعداد کو کافر قرار دیا،

روافض نے محبت اہل بیت کا دعوی کیااور بیشتر صحابہ کو مرتد قرار دیا،معتزلہ نے توحید اور عدل کا آوازہ بلند کیااور فقہا ومحدثین کو گمراہ بنایا، ہمارے دور میں بریلیوں نے محبت رسول کا غل مچایا اور دین کے سچے خادموں کے بے دین ہونے کا فتوی شائع کیا،اور اب پانچوں سواروں میں یہ آخری ٹولہ اٹھا ہے اس نے حدیث پر عمل کرنے کا نام لے کر ہندوستان میں جب سے اسلام داخل ہوا، اس وقت سے لے کر اب تک کے تمام مسلمانوں اور تمام دین کے خادموں پر بیک جنبشِ قلم گمراہ اور خلاف سنت ہونے فتوی صادر فرمادیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ نہ یہ توحید کی دعوت ہے اور نہ حدیث وسنت پر عمل ہے، یہ ایک فتنہ ہے جو مسلسل مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالے ہوئے ہے، کسی بھی آبادی میں، کسی بھی ملک میں مسلمان اپنا دین اور اپنی نماز سنبھالے ہوئے سکون کی فضا میں مسجدیں آباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اچانک کوئی غیر مقلد اپنے کو اہل حدیث کہتا ہوا وہاں پہونچ جاتا ہے،اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کے تیور بدل جاتے ہیں،لڑائی جھگڑے کی بنیاد پڑ جاتی ہے،نمازیں علیحدہ ہونے لگتی ہیں، گمراہی کے فتوے لگتے ہیں،اکابر واسلاف جن کی عظمت کے سامنے ہمیشہ جبینِ عقیدت جھکی رہتی ہے،ان کو گالیاں دی جانے لگتی ہے۔اس ٹولے نے سنت کا نام لیا مگر اس کو مسخ کر دیا، بدشکل بنادیا،سنت میں احترام تھا،اتحاد تھا،خیر و برکت تھی، لیکن سنت کے ان متوالوں نے احترام والوں کو بے احترام کیا،اتحاد میں رخنہ ڈال کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کیا،خیر اٹھ گیا، برکت جاتی رہی،سنت اور حدیث کو بگاڑنے والی اور اس کو بے محل استعمال کرنے والی اس قوم کی دست اندازیاں بلکہ چیرہ دستیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ جب تحفظ سنت کے نام پر ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے اصحاب علم اور ارباب فتوی کو دعوت دی گئی تو ہر طرف سے لوگ بے اختیار اُمڈ پڑے،معلوم ہوا کہ ہر چہار جانب اس جارحیت پسند جماعت کا تشدد پھیلا ہوا ہے، ہر طرف لوگ زخموں سے کراہ رہے ہیں، پریشان ہیں،سب نے فریاد کی کہ اچھی خاصی پرسکون فضا میں ایک غیر مقلد کودتا ہے اور تمام سکون کو تہ وبالا کر کے رکھ دیتا ہے۔

اس فرقہ کا بنیادی مقصد کوئی مثبت مقصد نہیں ہے،نفی اور انکار پر اس فرقہ کی اساس ہے اور ہر گمراہ فرقہ کا خاصہ یہی ہے کہ اس کی بنیاد نفی اور انکار پر ہوتی ہے، اگر اس کا انکار ختم ہو جائے تو اس کا وجود ہی فنا ہو جائے۔ بریلویت کی اساس علماءِ دیوبند کا انکار ہے،صحیح عقائد اور صحیح اعمال کا

انکار ہے، اگر کوئی بریلوی علماءِ دیوبند کو کافر نہ کہے تو بریلی نہیں رہے گا، اگر اجتماعی طور سے ان کے علما، اہل حق کو کافر کہنا ترک کر دیں تو بریلویت فنا ہو جائے گی، اسی طرح غیر مقلدوں کی اساس انکار حنفیت پر ہے، اسی کے ضمن میں شافعیت، مالکیت اور حنبلیت کا انکار بھی ہے، مگر وہ محض ضمناً ہے، اصل مخاصمت احناف سے ہے، اگر احناف کی مخاصمت یہ چھوڑ دیں تو غیر مقلدیت بنام اہل حدیثیت فنا ہو جائے گی، اس لئے ہمیشہ ان کی طرف سے رد حنفیت کا کام جاری رہتا ہے۔ ابتدا سے جب سے اس فرقہ کا وجود ہوا ہے، یہی وطیرہ قائم ہے۔ حدیث وسنت کے نام پر ان کے پاس گنتی کے چند مسائل ہیں، جن میں یہ غوغا مچاتے ہیں، البتہ جارحیت کا انداز گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اب سے پچاس سال پہلے ان کی جارحیت میں بہت شدت آ گئی تھی، مسجدوں میں لڑائی، بازاروں میں بحث ومجادلہ، اشتہار اور پمفلٹ میں زوردار دعوے اور چیلنج کی وہ بہتات ہوگئی تھی کہ الامان والحفیظ! علمائے اہل حق بنام علمائے دیوبند کو عام طور سے ان چیلنجوں کے جواب دینے کی فرصت نہ ہوتی تھی، ان حضرات کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہی کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت جا چکی ہے، مسلمانوں کا شیرازہ بکھر رہا ہے، اس شیرازہ کو سمیٹا جائے، کس طرح دین سے دور ہوتے ہوئے معاشرہ کو دین سے قریب کیا جائے؟ ان کے بکھرے ہوئے اتحاد کو کس طرح بچایا جائے؟ دشمنان اسلام کی طاقتیں اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں، ان کا دفاع کس طور پر کیا جائے؟ کسی طرف سے عیسائیوں کا حملہ ہے، کسی محاذ پر آریہ سماجیوں کی جنگ تھی، کہیں قادیانی نقب لگا رہے تھے، ہر محاذ پر علمائے حق ڈٹے ہوئے مقابلہ کر رہے تھے، اب اگر ان داخلی فتنوں کی طرف توجہ کی جائے تو دوسرے محاذ کمزور پڑ جائیں، اس لئے یہ حضرات طرح دے جاتے، غیر مقلدین اور دوسرے مسلمان فرقوں کے فتنوں سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرتے، مگر یہ سور ما للکارتے ہی رہتے، اور اس سے آگے بڑھ کر اسلاف وائمہ حتی کہ صحابہ کرام کے مقدس دامنوں پر دست درازی کرنے لگتے تو ان کی غیرت کو جوش آتا، اور کوئی صاحب ضرورت کے بقدر ان کے فتنے کی سرکوبی کر کے پھر اپنے تعمیری اور مثبت کاموں میں مشغول ہو جاتے، شیعیت کے مقابلے میں اللہ تعالی نے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نوراللہ مرقدہ اور ان کے خاندان ذی شان کو توفیق بخشی، انہوں نے نہایت اعتدال اور توازن کے ساتھ شیعیت کا فتنہ کچلا، بریلویوں کے

مقابلے میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہاں پوری اور حضرت مولانا نور محمد صاحب ٹانڈوی علیہم الرحمہ کو سعادت بخشی گئی، ان حضرات نے بریلویت کا سارا طلسم کھول کر رکھ دیا، اور امت اس فتنے سے خبر دار ہوئی۔ غیر مقلدیت کے فتنے کی حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ سے لے کر آج تک حسب ضرورت متعدد علماء کبار نے خبر لی، مگر عموماً کسی نے اس کو اپنا موضوع نہیں بنایا، جب جیسی ضرورت پڑی علما نے اس کا تعاقب کیا، اور بعض خوش نصیب علما ایسے بھی تھے جو ہر محاذ پر نظر آتے ہیں، نیز وہ اپنے مثبت اور تعمیری کام میں بھی اسی انہاک سے لگے ہوئے ہیں، مدرسوں میں قرآن وحدیث کی اعلیٰ تعلیم بھی دے رہے ہیں، عام مسلمانوں کی دینی زندگی میں راہنمائی بھی کر رہے ہیں، تصنیف وتالیف میں بھی لگے ہوئے ہیں، شیعوں کے مقابلے میں ضرورت پڑتی ہے تو وہاں بھی اپنی وسعت معلومات کا لوہا منوا رہے ہیں، بریلویت بھی ان سے گھبراتی ہے، غیر مقلدیت بھی ان سے خائف ہے، ایسے بزرگوں میں نمایاں تر نام اس شخصیت کا ہے جس کی یادگار میں یہ مجلّہ (المآثر) شائع کیا جاتا ہے، یعنی محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نور اللہ مرقدہ، اللہ تعالیٰ نے ان سے ہر محاذ پر کام لیا، بالخصوص غیر مقلدیت تو ان سے اتنی خائف رہی کہ ان کے نام سے اس کی روح کانپتی تھی، حالانکہ انہوں نے اس کام کو اپنی زندگی کا موضوع نہیں بنایا تھا، ان کی زندگی کا موضوع تو خدمت حدیث تھا، اور اس کے روشن نمونے آج بھی دنیا کے سامنے جگمگا رہے ہیں، تاہم جب ضرورت ہوئی ہے، غیر مقلدیت کا جائزہ نہایت تحقیقی اور علمی انداز میں لیا ہے۔ ''رکعات تراویح'' ''اعلام مرفوعہ'' ''تحقیق اہل حدیث'' اور ''ازہار مربوعہ'' وغیرہ میں علم کا ایک دریا امڈ رہا ہے۔

حضرت مولانا کی خدمت کا اعتراف اقبال سہیلؔ نے بڑے بلیغ انداز میں کیا ہے، سدھاری اعظم گڑھ کے جلسے کے لئے انہوں نے فارسی قصیدہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ اور دوسرے بزرگ علما کی شان میں تصنیف کیا تھا، اس کا ایک شعر ہے:

ازاں پس آں حبیب ما ادیب ما م خطیب ما — کہ ذاتش درمئو احناف را حصن حصین آمد

اس کے بعد ہمارے وہ حبیب، ہمارے وہ ادیب، ہمارے وہ خطیب ہیں، جن کی

ذات گرامی مئو کے اندر احناف کے لئے ایک مضبوط قلعہ ہے۔

حضرت کے گزر جانے کے بعد غیر مقلدوں نے بہت زور دکھایا، تو اللہ تعالی نے نئی نسل میں مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری مدظلہ کو اس فتنہ کی سرکوبی کی توفیق بخشی، وہ اس سلسلے میں بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن یہ فتنہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔

حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی دامت برکاتہم صدر جمعیۃ علمائے ہند کو اس فتنہ کی ہمہ گیری اور پھیلاؤ نے بے چین کیا تو ضرورت محسوس کی کہ ملک کے تمام حساس اور ذمہ دار علما کو اکٹھا کر کے اجتماعی طور پر اس فتنے کو کچلنے کی تدبیر کی جائے، اور مسلمانوں کو اس سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ ۲،۳ رمئی کو تحفظِ سنت کے عنوان سے یہ اجلاس کیا گیا، جس میں ملک کے تمام علاقوں کی نمائندگی بہت اچھی رہی، ملک بھر کے ستائے ہوئے علما وفضلا اس میں شریک ہوئے، اجلاس ماشاءاللہ بہت کامیاب ہوا، امید ہے کہ اس اثرات اچھے مرتب ہوں گے۔

ماخذ: المآثر (مئی، جون، جولائی) ۲۰۰۱

☆☆☆☆☆☆

منافق علیم اللسان

امیر المومنین سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن أخوف ماأخاف علىٰ كل منافق عليم اللسان (مسند احمد)

مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ جس سے خوف ہے، وہ ہر وہ منافق ہے جو زبان کا ماہر ہو۔

یعنی وہ شخص ہو جو زبان کا تو ماہر ہو، لیکن دل و دماغ اور عمل کے لحاظ سے جاہل ہو، علم دین کو حصول معاش کے ذریعے کے طور پر استعمال کرتا ہو، زبان و بیان کی مہارت کی وجہ سے لوگوں میں اپنا وزن بنا رکھا ہو، بظاہر لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہو، لیکن خود خدا کی راہ سے بھاگتا ہو، دوسروں کے عیب کو تو برا سمجھتا ہو اور خود اس سے زیادہ برائیوں میں مبتلا ہوتا ہو۔ لوگوں کے سامنے تو تقویٰ وطہارت اور عبادت وخلوص کا اظہار کرتا ہو، مگر خدا کے حضور بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو، ایسا شخص تنہائی میں بھیڑیا ہوتا ہے، لیکن لوگوں کے سامنے انسانی لباس میں ہوتا ہے، اس سے اس حدیث میں ڈرنے اور بچنے کی تاکید کی گئی ہے، کہ کہیں وہ اپنی زبان کی حلاوت سے تمہیں زہر نہ دے دے، اور اس کے گناہوں کی آگ تمہیں جلا نہ دے۔

اس حدیث کی شرح مشہور تابعی حضرت احنف بن قیس علیہ الرحمہ کے ایک واقعے سے بخوبی ہوتی ہے، اس کو علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیا ہے، ان کا تعارف کراتے ہوئے علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے:

الامير الكبير، العالم النبيل ،أحد من يضرب بحلمه وسودده المثل ،

كان سيد تميم اسلم فى حياة النبى ﷺ ووفد على عمر۔

امیر کبیر، صاحب عقل وفہم عالم، ان کی عقل وحلم اور سیادت وقیادت ضرب المثل ہے، قبیلہ تمیم کے سردار تھے، نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مدینہ شریف میں ان کی حاضری ہوئی تھی۔

حضرت احنف جب مدینہ شریف حاضر ہوئے تو کسی موقع پر انھوں نے خطبہ دیا۔ یہ بڑے فصیح وبلیغ اور بہترین خطیب تھے، حضرت عمر نے ان کا خطبہ سنا تو بہت پسند کیا۔ ان کی عام گفتگو بھی بڑی دلآویز ہوتی تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ امیر المومنین نے مجھے حکم دیا کہ میں سال بھر مدینہ شریف میں ان کی خدمت میں حاضر رہوں، روزانہ میری حاضری ان کی خدمت میں لازم تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے میرے اندر کوئی ناپسندیدہ بات نہیں دیکھی۔ ایک سال کے بعد انھوں نے ایک بار مجھے طلب کیا، اور فرمایا: احنف! تمہیں کچھ پتہ ہے کہ میں نے تمہیں کیوں اپنے پاس روک رکھا ہے؟ میں نے عرض کیا، حضرت! مجھے معلوم نہیں، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو صاحب علم منافق سے ڈرایا تھا، تمہارا خطبہ اور تمہاری گفتگو سن کر مجھے اندیشہ ہوا تھا کہ شاید تم اس کے مصداق ہو، لیکن احنف! الحمد اللہ! مجھے اطمینان ہے، میں نے تمہارا امتحان کرلیا ہے، تمہارا ظاہر تو اچھا ہے ہی، مجھے امید ہے کہ تمہارا باطن بھی تمہارے ظاہر ہی کی طرح بہتر ہے۔ ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ اس امت کی بربادی صاحب علم منافق سے ہوگی۔ (سیر اعلام النبلاء ج۵، ص۳۹)

یہ اس وقت کی بات ہے، جبکہ زمانۂ نبوت ابھی دور نہیں ہوا تھا، اللہ کے رسول نے جن تین دوروں کے خیر ہونے کی گواہی دی تھی ان میں دوسرے دور کا آغاز تھا۔ پہلا دور تو خود حضور اکرم ﷺ کا دور تھا، اس میں عرش اعظم سے براہ راست ربط قائم تھا، اللہ کی مرضیات کی اطلاع یقینی طور پر ہوا کرتی تھی، وہ دور گزر چکا تھا۔ دوسرا دور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور تھا، نبوت کی تمام برکتیں عروج پر تھیں، فتوحات اسلامی کا سلسلہ چل رہا تھا، اسی دور میں ایک ایسے بزرگ جو خود زمانۂ نبوت میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، مگر آپ کی خدمت میں کسی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مدینہ حاضر ہوتے ہیں، اور یہاں کسی موقع پر ایک خطبہ دیتے ہیں، بہت فصیح وبلیغ اور بہت پُر زور اور بلند آہنگ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اہل

زبان تھے، زبردست عالم تھے، ان کے دل کو یہ خطبہ بہت بھایا، وہ ان سے واقف نہ تھے، وہ چونکے، انھیں رسول اللہ ﷺ کا فرمان یاد آیا کہ اس امت پر سب سے زیادہ اندیشہ ایسے صاحب زبان سے ہے، جو دل کا منافق ہو، انھیں خطرہ ہوا کہ یہ عظیم ادیب وخطیب کہیں منافق علیم اللسان نہ ہو، اس کو دیکھنے کے لئے اور اس کا امتحان لینے اور اطمینان کرنے کے لئے حضرت احنف کو اپنے پاس ایک سال کے لئے روک لیا۔ اس پوری مدت میں ان کا جائزہ لیتے رہے، سال بھر کے بعد اطمینان ہوا اور انھیں وطن واپس ہونے کی اجازت دی۔

خیر القرون میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس خطرے سے چونک رہے تھے، صدیاں گزر جانے کے بعد اس خطرے کا صرف امکان نہیں بلکہ اس کا بکثرت وقوع کیا اہل اسلام کو چونکانے کے لئے کافی نہیں؟ ہمارے دور میں تو علیم اللسان افراد کی بہتات ہے جو زبان وقلم کی فصاحت وبلاغت اور تحریر وخطابت کے امتیازات میں مشہور ومعروف ہیں، کیا ان کے بارے میں اگر کوئی چونکتا ہے اور دین وشریعت کی میزان پر انھیں تولتا ہے تو کیا یہ ایک ضروری عمل نہیں ہے۔

ہم تو اپنے دور میں بکثرت دیکھتے ہیں کہ ایک ذہین وذکی آدمی اٹھتا ہے، اس کا ذہن زرخیز ہوتا ہے، زبان وبیان کا ماہر ہوتا ہے، لوگوں پر چھا جانے کا ذوق ہوتا ہے، اپنے گرد وپیش اپنے نام لیواؤں کا ہجوم دیکھنا چاہتا ہے، مال حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے، لوگوں کے رنگ ڈھنگ دیکھتا ہے، کس چیز سے لوگ متاثر ہوں گے؟ اس پر غور کرتا ہے، پھر اپنے ذہن ودماغ اور زبان وقلم کو اس طرح کام میں لاتا ہے کہ لوگ ابتداءً متحیر ہو جائیں، پھر اس پر فریفتہ ہو جائیں، وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کو اللہ سے، رسول سے، قرآن سے، حدیث سے محبت ہے، تو وہ انھیں چیزوں کو نئے انداز سے پیش کرتا ہے، تاکہ لوگ اس کے آس پاس بھیڑ لگائیں، اور وہ ان سے اپنا مقصد حاصل کرلے۔

کم از کم ہندوستان کی حد تک ماضی قریب میں غلام احمد قادیانی سے لے کر ڈاکٹر ذاکر نائیک تک ذہین وذکی افراد کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، جنھوں نے جمہور امت کا راستہ چھوڑ کر حدیث کی زبان میں ''سواد اعظم'' کی راہ ترک کرکے، اتباع کو اپنے لئے باعث عار خیال کیا، اور

ابتداع کی نئی نئی راہیں نکالیں، اور دونوں ہاتھوں سے دنیا خوب کمائی، امت کے سادہ لوح اور ناواقف افراد کومعروف راستوں سے ہٹایا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شذ فی النار۔ (رواه ابن ماجه من حديث انسؓ)**

سواد اعظم کی پیروی کرو، جوکوئی اس سے انحراف کر کے الگ ہوا، وہ جہنم میں جا پڑا۔

سواد اعظم کا مصداق جمہور علمائے اسلام ہیں، ہر دور میں خود پسند ذہین وذکی افراد نے جمہور اہل اسلام کی راہ سے الگ اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے، انھیں محسوس ہوا ہے کہ عام لوگوں کے ساتھ چلنے میں ان کی انفرادیت باقی نہ رہے گی، اور ایسے لوگوں کو اپنی انفرادی شان بنانے کا خاص ذوق ہوتا ہے، بعض افراد کا یہ ذوق انفرادیت انھیں اتنی دور لے جاتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ بزرگوں کی راہ سے کٹ جاتے ہیں، بلکہ وہ اپنی تیزیٔ طبع کی وجہ سے اسلام کی راہ کو ہی خیر باد کہہ دیتے ہیں، اس کی مثال میں قادیانی فرقہ اور منکرین حدیث کا فرقہ پیش کیا جاسکتا ہے، بعض وہ ہوتے ہیں کہ حلقۂ اسلام سے تو خارج نہیں ہوتے ہیں، مگر اہل سنت کے زمرے سے باہر آجاتے ہیں، ان میں بھی تیزیٔ طبع کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، مختلف فرقے، بریلوی، غیر مقلدین، جماعت اسلامی، جماعت المسلمین، مختلف افراد مثلاً وحید الدین خاں، ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر ذاکر نائیک وغیرہ اس کے مصداق ہیں۔

یہ نام میں نے بطور مثال کے لکھے، اس فہرست میں اور بھی افراد ہیں، سب میں انفرادیت کا ذوق کام کرتا ہے۔ آج کل ٹی۔ وی چینل دیکھنے والے مسلمانوں کی طرف سے بکثرت سوال کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کی حیثیت کیا ہے؟ بعض ان کے غالی معتقد ہیں، ایک بڑی تعداد ان کے پروپیگنڈے سے بہت متاثر ہے۔ ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ یہ صاحب سواد اعظم سے ہٹے ہوئے ہیں۔

أللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه

☆☆☆☆☆☆

تحریف وتبدل کی ابتداء
اورقرآن وحدیث کی وضاحت

قرآن پاک میں سورۂ مریم میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے تذکروں کے بعد حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ **فخلف من بعد هم خلف أضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا**(۵۹:) پھران کے بعد ایسے ناخلف افراد آئے جنھوں نے نماز ضائع کی اور اپنی چاہتوں کے پیچھے چلے، تو یہ عنقریب خرابی وبربادی میں پڑیں گے۔ سورہ اعراف میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فخلف من بعد هم خلف ورثوا الكتاب ياخذون عرض هذا الادنىٰ ويقولون سيغفرلنا وإن ياتهم عرض مثله ياخذوه ألم يوخذ عليهم ميثاق الكتاب أن لايقولوا على الله إلا الحق ودرسوا مافيه والدرار الآخرة خير للذين يتقون أفلاتعقلون** (۱۶۹:) پھران کے بعد جانشین ایسے نالائق لوگ ہوئے، جنھوں نے وراثت میں کتاب کوتو پایا لیکن وہ اس سے دنیا کا مال حاصل کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری مغفرت ہو ہی جائے گی، اور اگر ویسا ہی مال پھر مل جائے تو اسے بھی لے لیتے، کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ پر کوئی بات نہ گڑھیں، بجز حق بات کے اور کچھ نہ کہیں، حالانکہ جو کچھ اس میں ہے اسے انھوں نے پڑھا ہے، اور دار آخرت ہی ان کے لئے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، تو کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

یہ دونوں آیتیں انبیاء کی اور ان کے بعد آنے والی امتوں کی تاریخ کا آئینہ پیش کرتی ہیں، نبی کے واسطے سے ہدایت کی صاف ستھری راہ کھلتی ہے، عقائد وافکار کی صحت کی ضمانت ہوتی ہے، عمل وکردار کا رخ متعین ہوتا ہے، پھر انبیاء کے دنیا سے چلے جانے کے بعد جو ان کے صحیح

جانشین ہوتے ہیں وہ دین کی تعلیمات کو باقی رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، اور ہدایت کا راستہ اپنی اصل شکل میں محفوظ رہتا ہے، مگر جوں جوں وقت گزرتا ہے، انبیاء کے وارثین دنیا سے اٹھتے جاتے ہیں، ان کے چلے جانے سے علم کا نور مضمحل ہوتا رہتا ہے، پھر ان کے جانشینوں کو علم وعمل کا وہ مقام نہیں حاصل ہوتا جس سے وہ ہدایت کی راہ کو باقی رکھ سکیں، وہ عمل میں بھی کمزور ہوتے ہیں اور علم میں بھی درماندہ ہوتے ہیں، نمازیں ضائع کرتے ہیں، ہدایت کی راہ چھوڑ کر خواہشات اور اپنے ذاتی نظریات وجذبات کے پیچھے چل پڑتے ہیں، اور اس طرح ہدایت کا راستہ گم ہو کر رہ جاتا ہے، پھر اصل تعلیمات کی جگہ تحریفات کی بھرمار ہو جاتی ہے، دینی اعمال میں سستی پیدا ہو جاتی ہے، نبی کے طور طریقے کی جگہ نئے نئے رسوم ایجاد ہو جاتے ہیں، پھر آخری حد یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں کے پاس کتاب الٰہی کا علم ہوتا ہے، جو اسے پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں وہ دنیوی مال ومتاع، عارضی چمک دمک اور دنیوی معیار زندگی کی ترقی ونمائش پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کا ذریعہ اسی کتاب الٰہی اور علوم آسمانی کو بنا لیتے ہیں، جہاں سے مال ملتا انھیں نظر آتا ہے، کتاب اللہ کے فتووں کے رخ کو توڑ مروڑ کر کے ادھر ہی کر دیتے ہیں اور جھوٹی تسلی سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرتے ہیں کہ ہماری بخشش تو ہو ہی جائے گی۔

اس طرح ہادیان راہ شریعت کے بعد آہستہ آہستہ گمراہی عام ہوتی چلی جاتی ہے، یہ گمراہی کفر وشرک اور گناہ وبدعملی کی راہ سے تو آتی ہی ہے، اس کے علاوہ خود دین ومذہب کا لبادہ اوڑھ کر، شریعت الٰہی کے رنگ میں رنگین ہو کر بھی بکثرت آتی ہے، ناواقف آدمی اسے حکم الٰہی سمجھ کر مانتا اور بجالاتا ہے، مگر حقیقت میں اسے دین الٰہی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، وہ سراسر گمراہی ہوتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے امتیں جب اس طرح کے احوال سے دوچار ہوتی تھیں، تو حق تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے تازہ نبی بھیج دیتے تھے، جو حق کے روئے زیبا سے باطل کے گرد وغبار کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیتے تھے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیاء کرام کا سلسلہ لگاتار قائم رہا، آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر جب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا، اور آپ کی نبوت قیامت تک کے لئے استوار اور محکم ہو گئی، ایسی استوار اور ایسی

محکم کہ اب کسی نبی کی بعثت کی حاجت باقی نہ رہی، آپ کی رسالت عام بھی ہے اور اتنی مضبوط اور پختہ بھی ہے کہ اس میں دراندازی کرنے والوں کوتحریف وترمیم کرنے کے امکانات کم سے کم ہیں، آپ کے اوپر اللہ نے جو آخری کتاب نازل فرمائی اس کی حفاظت کا ایسا انتظام بھی فرمایا کہ اس میں تحریف کی کوئی گنجائش نہ رہی، نہ صرف وہ کتاب الٰہی بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے ہر علم وفن کو اس قدر مستحکم کر دیا گیا کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، گویا دین کی حفاظت کا انتظام مکمل کر دیا گیا۔ نبی آخر الزماں کی نبوت خود اس درجہ مستحکم ہے کہ اس میں کسی کے لئے دخل اندازی کا امکان کم سے کم ہے، تاہم طبائع انسانی کا جو قدیم انداز ازل سے ہے وہ اب بھی ہے، انسانی ذہن ودماغ، خواہشات وشہوات کے جال میں جیسے پہلے گرفتار رہا ہے اب بھی رہتا ہے، اس لئے ہر مضبوطی اور پختگی کے باوجود انسانی ذہانت اغواء شیطانی سے متاثر ہوکر تحریف وتبدیل اور ترمیم واضافے کے چور دروازے تلاش کر ہی لیتی ہے، شیطان گمراہیوں کو مزین کرتا ہے، طبیعت لذتوں کی جانب ٹوٹ کر آگے بڑھتی ہے، نفس امارہ مختلف حیلوں بہانوں سے ان لذتوں میں آدمی کو مبتلا کرتا ہے اس طرح وہ دین حق سے منحرف ہوکر گمراہی کے گڈھوں میں جا گرتا ہے۔

نبی سے بڑھ کر طبیعتوں کا دانائے راز کون ہوسکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے شیطان کی تمام گمراہیوں اور نفس امارہ کی تمام رخنہ اندازیوں کی نشاندہی فرمادی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح ودرستگی کا مکمل انتظام بھی فرمادیا ہے۔

چنانچہ صاحب مشکوٰۃ شریف نے کتاب العلم میں حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن عذری کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے: **یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین**، یعنی اس علم کو یعنی کتاب وسنت کے علم کو ہر پچھلے طبقے میں سے نیک سیرت، معتبر اور معتمد افراد حاصل کریں گے، وہ اس علم سے غلو کرنے والوں کی دست درازیوں اور تحریفات کو، باطل مدعیوں کے غلط انتسابات کو، نیز جاہلوں کی ناروا تاویلات کو محو کرتے رہیں گے، اور اس کی اصل صورت میں پیش کریں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امت میں تین طرح کے افراد سے دین میں تحریف

وتبدیل کے چور دروازے کھلیں گے۔

(۱) غلو کرنے والوں کی تحریف۔(۲) باطل مدعیوں کے غلط انتسابات۔(۳) جاہلوں کی ناروا تاویل۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے تمام احکام واعمال اورعقائد ونظریات کی حدیں متعین کررکھی ہیں، اعمال کے بھی حدود ہیں اورعقائد کے بھی، جب تک وہ حدیں قائم رہتی ہیں دین وشریعت کا اعتدال وتوازن برقرار رہتا ہے، اور جب وہ حدیں توڑ دی جاتی ہیں تو دینی تعلیمات میں تحریف کا دروازہ کھل جاتا ہے،اسی لئے ان حدوں کی پاسداری ضروری ہے، بدعت کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے، کہ اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے آدمی آگے بڑھنے لگتا ہے،تو بظاہر وہ اچھا کام کرتا ہے مگر وہ غلط ہوتا ہے،مثلاً عقائد میں ملاحظہ ہو کہ نبی کا مرتبہ عام انسانوں سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، وہ معصوم ہوتے ہیں،علم وعمل کے معیار ہوتے ہیں،اس لحاظ سے ان کی عظمت وجلالت کا اعتقاد فرض ہے،مگر جب اس عظمت کو اس کی حد سے آگے بڑھاتے ہیں تو نبی کو خدا کے درجے میں پہونچا دیتے ہیں، بظاہر ایسا وہ عظمت ومحبت سے تقاضے سے کرتے ہیں مگر درحقیقت اس طرح وہ شرک کے قریب جا پڑتے ہیں۔

اس طرح مشہور حدیث میں ہے کہ تین حضرات ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے، اورانھوں نے رسول اللہ ﷺ کی عبادت کی کیفیت دریافت کی، جب انھیں صورت حال بتائی گئی تو انھوں نے خیال کیا کہ یہ تو کم ہے، پھر کہنے لگے کہ کہاں ہم اور کہاں نبی ﷺ، آپ تو بخشے بخشائے ہیں،ایک صاحب نے کہا میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے صاحب بولے میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے صاحب نے کہا میں عورتوں سے کامل اجتناب کروں گا، نکاح سرے سے نہ کروں گا۔رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ نے دریافت کیا، کیا تم نے ایسا ایسا کہا ہے،سنو! مجھے اللہ کی خشیت اورتقویٰ سب سے زیادہ ہے، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اورعورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو کوئی میرے طریقے سے انحراف کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔(بخاری ومسلم)

حدود سے تجاوز کرنے کا نام غلو ہے،غلو کرنے والا دین میں،علم میں تحریف کا مرتکب ہوتا

ہے۔

دوسری چیز غلط مدعیوں کے غلط انتسابات ہیں۔انتحال کا مطلب یہ ہے کہ بات ہو کسی کی اور منسوب کسی کی طرف کردی جائے ، چنانچہ مدعیان باطل بات تو اپنی جانب سے کرتے ہیں مگر اسے مضبوط بنانے اور رواج دینے کے لئے اللہ ورسول یا کسی بڑے بزرگ عالم کی جانب اس کی نسبت کر دیتے ہیں، نہ جانے کتنی حدیثیں وضع کی گئیں ،اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئیں ،نظریہ بذات خود ایجاد کیا گیا مگر اس کی سند اللہ ورسول کے ساتھ جوڑ دی گئی ،اس طرح بہت سی بے بنیاد باتیں اللہ ورسول کی طرف منسوب کر کے انھیں دین کا رنگ دیدیا گیا، حالانکہ ان سے دین کا تعلق کچھ بھی نہیں۔

تیسری چیز جاہلوں کی تاویل باطل ہے، جاہل کا مطلب بے پڑھا لکھا نہیں ہے بلکہ ایسا شخص جس کی طبیعت میں کجی ہے، وہ اپنی طبیعت کی کجی کی وجہ سے آیات واحادیث کا صحیح مطلب نہیں اخذ کرتا بلکہ اپنے غلط نظریات پر کھینچ تان کر انھیں منطبق کرتا ہے،صاف ستھرا مطلب چھوڑ کر ایچ پیچ کی راہ نکالتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں وہ ہیں جن سے دینی تعلیمات اور دینی اعمال میں تحریف وترمیم راہ پاتی ہے، اللہ کا انتظام ہے کہ اس کی تدبیر نے ہر زمانے میں ایسے مخلص اور علم میں رسوخ رکھنے والے علماء پیدا فرمائے ہیں جو صحیح علم اور سچے دین کے اوپر غلو،تحریف ،غلط انتسابات اور بے جا تاویلات کے پڑے ہوئے غبار کو ہٹا کر اسے صاف ستھرا واضح کر دیتے ہیں، اللہ کی حکمت نے ہر زمانے میں ایسے اصحاب علم حضرات کو برپا کیا ہے جو دین کو اس کی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اسی کا ثمرہ ہے کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی دین اسلام اپنے اصل رنگ وروغن کے ساتھ واضح اور نمایاں ہے، جس طرح آنکھ میں اگر ایک تنکا پڑ جائے تو آنکھ بلکہ پورے جسم کو احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی اجنبی چیز آنکھ میں آ گئی ہے، اسی طرح کوئی خوشنما سے خوشنما اور ہلکے سے ہلکا نظریہ بھی دین کا لبادہ پہن کر چاہے جتنے خفیہ راستے سے مذہب میں داخل ہو، اسلام کا اجتماعی معاشرہ اسے محسوس کر لیتا ہے، اور آنکھ کے تنکے کی طرح اسے نکال پھینکتا ہے۔ یہ برکت ہوتی ہے ان اصحاب علم وفضل کی جن سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت لیتے ہیں، ایسے

حضرات کی تعداد کم وبیش ہوتی ہے، پہلے بہت ہوتے تھے، اب کم ہوتے ہیں، لیکن اسلام پر ایسا دور کبھی نہیں آیا کہ ایسے علماء ناپید ہو گئے ہوں۔

ایک حدیث میں ہے: **لایزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لایضرهم من خالفهم حتیٰ یاتیهم أمر الله وهم ظاهرون** (بخاری ومسلم) میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم اور نمایاں رہے گی، کوئی بھی ان کی مخالفت کر کے انھیں ضرر نہیں پہونچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ کا امر آ جائے، اور وہ اس طرح اس پر قائم ہوں گے۔

یہ امت قیامت تک کیلئے زندۂ جاوید ہے، اس لئے ایسے علماء وصلحاء کا وجود بغیر کسی انقطاع کے مسلسل قائم رہا ہے اور قائم رہے گا۔ ان حضرات کے درجات اللہ کے نزدیک بہت بلند ہیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے: **من جاءه الموت وهو یطلب العلم لیحیی به الاسلام فبینه وبین النبیین درجة واحدة فی الجنة** (رواہ الدارمی) جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم کی طلب میں لگا ہو، تا کہ اس کے ذریعے اسلام کا احیاء کرے، اس کے اور انبیاء کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فاصلہ ہوگا۔

ایسے علماء ومشائخ کا وجود امت کی خوش نصیبی کی علامت ہے۔ **کثر الله امثالهم**

☆☆☆☆☆☆

سفرنامے

(۱) سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ

(۲) تحفۂ مدینہ

(۳) تحفۂ بہار

(۴) سفر بنگلہ دیش

(۵) سفر بنگلہ دیش

سفر کاندھلہ اور ایک شاہکار علمی تحفہ

۱۵؍ربیع الآخر ۱۴۲۲ھ مطابق ۶؍جولائی ۲۰۰۱ء ہفتہ کا دن تھا، یہ خاکسار راقم الحروف اپنے چند رفقا کے ساتھ تھانہ بھون میں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ حاضر ہوا، ناظم خانقاہ حضرت مولانا نجم الحسن صاحب تھانوی مدظلہ سے گفتگو ہو رہی تھی، میں نے ان سے عرض کیا کہ کاندھلہ جانے کا ارادہ ہے، کیا مولانا نورالحسن راشد صاحب سے ملاقات ہو سکے گی؟ انہوں نے ازراہ عنایت فوراً کاندھلہ فون کیا، معلوم ہوا کہ مولانا موصوف کیرانہ گئے ہوئے ہیں، مولانا نجم الحسن صاحب نے فون پر ہی انہیں تلاش کرنے کی مہم چھیڑ دی، تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوا کہ مولانا موصوف سے بات ہو رہی ہے، یہاں سے مولانا کہہ رہے تھے کہ آپ فوراً کاندھلہ پہونچئے، فلاں صاحب ابھی کچھ دیر کے بعد ایک مختصر سے قافلہ کے ساتھ کاندھلہ پہونچ رہے ہیں۔ ہم لوگ بارہ بجے کے قریب کاندھلہ پہونچے، مولانا نورالحسن راشد انتظار میں تھے، ان سے ملاقات ہوئی، بہت سادہ مزاج، بہت بے تکلف، اپنی تحقیقات وتحریرات میں جس مقام ومرتبہ کے عالم اور محقق نظر آتے ہیں، ملاقات میں اس بلندی کا شائبہ بھی نہیں جھلکا، اس طرح ملے جیسے ان کا کوئی بڑا انہیں اپنی آمد سے نواز رہا ہو۔ میں عرصہ سے ان کی تحریرات ومقالات پڑھتا ہوں، ان کا ظہور ابتدا ہی سے محققین کی صفِ اول میں ہوا ہے، بلکہ ان میں بھی ممتاز اور نمایاں! ان کی ہر تحریر سند ہوتی ہے، وہ کئی سال سے ''احوال وآثار'' کے نام ایک سہ ماہی مجلّہ نکالتے ہیں، جس میں خصوصیت سے اکابر دیوبند کے بارے میں نادر اور نایاب چیزیں نہایت تحقیق سے پیش کرتے ہیں، ان کا ہر مضمون معلومات میں خوشگوار اضافے کا ضامن ہوتا ہے، بہت دنوں سے ملاقات کی آرزو تھی، مگر اپنے کوتاہ قد اور ان کے بلند قامت کو دیکھتا تھا تو ہمت نہیں ہوتی تھی، وہ ایک بلند پایہ محقق اور میں

نرا واعظ! وہ ایک غیر معمولی مؤرخ اور میں ایک معمولی مدرس! وہ یکسوئی وخلوت کی دولت سے مالا مال اور میں منتشر اور پراگندہ جلوتوں میں گم! میں سوچتا تھا کہ ان سامنے پڑ کر اپنی نارسائی علم کا احساس اور بڑھ جائے گا، مگر ملاقات ہوئی تو سب خیال باطل ہو گئے، علم وتحقیق کی بلندی کے باوجود اتنے تواضع اور انکسار سے ملے کہ اندیشہ ہوا کہ مجھے دھوکہ نہ ہو جائے، خدانخواستہ فریب نفس میں نہ مبتلا ہو جاؤں۔

یہ گھر اکابر بزرگوں کا امین رہا ہے، مشہور متبع سنت اور متقی بزرگ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب محدث، حضرت مولانا الیاس صاحب، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہم اللہ، سب کا اسی گھر سے تعلق تھا، یہ گھر اور گھرانہ بچپن سے دل کا مرکز عقیدت تھا، حاضری کی سعادت اب مولانا راشد صاحب کے طفیل ملی، مولانا تو آداب ضیافت میں سرگرم تھے، وہ اس طرح دوڑ دوڑ کر مہمان نوازی میں منہمک تھے جیسے انہیں کوئی بڑی دولت ہاتھ آ گئی ہو، اور میں حیرت میں انہیں دیکھ رہا تھا، ان کا قیمتی کتب خانہ دیکھ رہا تھا اور وہاں کا سکون اور وہاں کی یکسوئی دیکھ رہا تھا، جس سے میں مدتوں سے محروم ہوں۔

ابھی حال میں مولانا نے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے سلسلے میں ایک ضخیم دستاویزی کتاب ۷۷۵ صفحے پر مشتمل بڑی عرق ریزی سے مرتب کی ہے، اس کا قدرے تعارف مولانا عبدالعلی صاحب کاکوری نے اپنے رسالہ ''البدر'' میں تحریر کیا تھا، اس کتاب کی تقریبِ اجرا کے جلسے میں وہ شریک ہوئے تھے، اسی وقت سے میں اس کتاب کو دیکھنا چاہتا تھا، اتفاق سے جلد ہی ادھر کا سفر ہوا تو ع: تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے۔ کا ایک بہانہ نکل آیا۔ اس کتاب کا نام ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، احوال و آثار و باقیات ومتعلقات'' ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ مصنف سے براہ راست یہ کتاب حاصل کروں، مگر میں اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ مولانا نے فون پر ہی مولانا نجم الحسن صاحب کو اطلاع دیدی تھی کہ انہوں نے ایک کتاب میرے نام مختص کر رکھی ہے، ڈاک سے بھیجنا چاہ رہے تھے کہ میں حاضر ہو گیا، یہ ضخیم کتاب اور اس کے ساتھ اور بھی دو چار کتابیں عنایت فرمائیں، مولانا کا کتب خانہ نہایت بیش

قیمت ہے،اس کا تعارف حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے الفاظ میں پڑھئے،وہ لکھتے ہیں:

''کاندھلہ ضلع مظفر نگر یوپی کے ان قصبات میں سے ایک ہے جنہوں نے پچھلی دو صدیوں میں علم وفضل اور ورع وتقوی کے آفتاب وماہتاب پیدا کئے،خاتم المثوی حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس سرہ کے نام پر یہاں ''حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی'' کے نام جو علمی ادارہ قائم ہے،وہ اس لحاظ سے برصغیر پاک وہند کے علمی وتحقیقی اداروں میں ایک منفرد امتیاز کا حامل ہے کہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کے سلسلے کے جبالِ علم وعمل کے مآثر اوران کے بارے میں معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہے کہ شاید پورے برصغیر (بلکہ شاید پوری دنیا) میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو،اس ذخیرے میں خاندانِ ولی اللہی،اکابر دیوبند وسہارن پور،حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اوران کے معاصرین وخلفا کے قلمی اورنادرونایاب نسخے،ان حضرات کے مکاتیب اور دوسری مطبوعہ اورغیر مطبوعہ تحریریں اس اہتمام سے جمع کی گئی ہیں کہ دوسری جگہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے''۔(ماخوذ از مقدمہ)

یہ ذخیرہ مولانا راشد صاحب کو اپنے بلند پایہ آباء واجداد سے وراثۃً ملا ہے،مولانا اس سے مسلسل استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں،اور جب موقع مل جاتا ہے اس میں اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں،اسلاف کے علمی ورثہ کا ایسا قدردان اہل علم کے گھرانوں میں بہت کم ملے گا۔مولانا ان نادرونایاب تحریروں کو ایک ترتیب کے ساتھ سجا سنوار کر اہل علم کے ہاتھوں میں پیش کرتے ہیں،احوال وآثار میں افادات کا سلسلہ جاری ہے،اوراب انہوں نے یہ ضخیم اوربیش قیمت کتاب پیش کی ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے حالات پر یہ کتاب سیرت وسوانح کے انداز پر کوئی مسلسل تحریر نہیں،یہ فرض تو مشہور صاحب قلم،مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے صاحب نظر عالم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نوراللہ مرقدہ''سوانح قاسمی''کے نام سے ادا کرچکے ہیں،لیکن حیاتِ قاسم کے بہت سے گوشے ابھی مخفی تھے،کئی تحریریں ابھی غیر مطبوعہ تھیں،غیر مطبوعہ مکاتیب کا بھی خاصا ذخیرہ ہے،جو بجائے خود علم وحکمت کے شاہکار ہیں،زیر نظر کتاب میں وہ مخفی گوشے نمایاں کئے گئے ہیں،اور غیر مطبوعہ مضامین ومکاتیب کی تحقیق کی گئی ہے،اس طرح یہ

کتاب حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے علمی وتصنیفی کارناموں کے متعلق متعدد رسائل کا مجموعہ ہے، ان رسائل کے عنوانات ملاحظہ ہو۔

(۱) آئینۂ کمالات (۲) مرقوماتِ قاسمی (۳) متاعِ دلفروز (۴) افاداتِ قاسمی (۵) مآثرِ قاسمی (۶) رہنمائے راہ۔

مولانا نورالحسن راشد نے ''احوال وآثار'' کے علاوہ ایک اور مجلّہ کی بنیاد ڈالی ہے، جس کے صرف خاص نمبر شائع ہوا کریں گے، اس کا نام ''صحیفۂ نور'' رکھا ہے، یہ اس کا پہلا خاص نمبر ہے، اس کا آغاز ''سخن مدیر'' کے عنوان سے ہوا ہے۔

آئینہ کمالات:

(۱) اس عنوان کے تحت حضرت حکیم الامت تھانوی کی مثنوی زیروبم کے کچھ اشعار نقل کئے گئے ہیں، جو حضرت نانوتوی کی شان میں کہے گئے ہیں۔

(۲) پھر اس کا ذکر ہے کہ حضرت نانوتوی کے دینی مزاج، ان کے زہدوتقوی نیز اتباع سنت کے جذبہ کی تربیت میں کاندھلہ کے مشہور بزرگ حضرت مولانا مظفرحسین صاحب کاندھلوی کی صحبت بابرکت کا دخل ہے، حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کیا تھے؟ اس مضمون میں تعارف کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی جو دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس اور نہایت وسیع العلم بزرگ تھے، ان کی لکھی ہوئی چند سطریں ملاحظہ فرمالیں، لکھتے ہیں:

> ''مولوی مظفرحسین صاحب کاندھلوی اس آخری زمانہ میں قدما کے نمونہ تھے، تقوی اللہ اکبر! ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ مشتبہ چیز اگر معدہ میں پہونچ گئی تو اسی وقت قے ہوجاتی تھی، اور اتباع سنت نہ ایسا دیکھا نہ سنا، سبحان اللہ! بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اول ان سے ہوئی''۔ (ص۵۶)

مرحوم سرسید نے مولانا قاسم صاحب کی وفات پر جو تعزیت مضمون اپنے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا اس کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو:

> ''ان کو جناب مولانا مظفرحسین کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت راغب کردیا تھا''۔ (ص۵۷)

حضرت نانوتوی نے پہلا وعظ حضرت مولانا مظفرحسین صاحب کے حکم پر کاندھلہ کی خاندانی روایت کے مطابق ان کے مکان پر کیا تھا، وہی مکان جس میں مولانا راشد صاحب ہم لوگوں کی ضیافت کررہے تھے، اس مضمون میں حضرت مولانا کاندھلوی کا بقدرضرورت اختصار کے ساتھ تذکرہ ہے، کتاب کا یہ حصہ بڑا روح پروراور ایمان افروز ہے۔

(۳) حضرت نانوتوی قدس سرہ نے ایک عرصہ تک مکتبہ مجتبائی میرٹھ میں قرآن شریف اور علمی کتابوں کی کتابت وطباعت کے سلسلے میں تصحیح کی خدمت انجام دی ہے، حضرت کی تصحیح سے مطبع مجتبائی نے قرآن کریم کی بہت عمدہ طباعت کی تھی، اس کا مفصل تعارف ہے۔

(۴) ہندوستان میں حدیث کی کتابوں کی بڑے پیمانے پر طباعت اور ان پر حواشی لکھنے کا آغاز مشہور محدث حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری علیہ الرحمہ نے کیا، وہ حضرت نانوتوی کے استاذ ہیں، انہوں نے بڑے اہتمام سے بخاری شریف کی حاشیہ نگاری اور اعلی طباعت شروع کی، اس عظیم کام میں انہوں نے حضرت نانوتوی کو باوجودان کی نوعمری کے شریک کیا، اخیر کے اجزاء پر حضرت نانوتوی کے لکھے ہوئے حواشی ہیں۔

(۵) اس کے مرتب ومحقق نے حیات قاسمی کا اور ہماری دینی وملی تاریخ کا ایک اہم گم شدہ ورق کھولا ہے، ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں روس نے مسلمانوں کی مرکزی حکومت، خلافت اسلامیہ ترکی پر ہلہ بول دیا۔ عیسائی حکومتیں اور روس کی حکومت ہمہ وقت ترکی کو نگلنے کی فکر میں رہا کرتی تھیں، متعدد بار انہوں نے ترکی پر حملے کئے، اب کی بار زبردست حملے ہوا اور اندیشہ تھا کہ حکومت ترکی کو یہ طاقتیں شکست وریخت کردیں گی۔ عام طور سے یہ لڑائی ''جنگ بلقان'' کے نام سے معروف ہے، اس جنگ میں ہندوستانی علما بالخصوص علماء دیوبند نے حضرت نانوتوی کی سربراہی میں ترکوں کی امداد واعانت بڑے پیمانے پر کی تھی، اس کے سلسلے میں حضرت نانوتوی نے ایک مفصل روداد شائع کی تھی۔ مولانا راشد صاحب نے وہ پوری روداد جزء کتاب بنادی ہے، اس سے حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی دینی حمیت وغیرت اور جوش اسلامی کی ایک تابناک صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔

(۶) حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین حضرت مولانا

یعقوب صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ نے حضرت کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کئے تھے،مولانا گیلانی نے اسے الہامی قرار دیا ہے اور ۲۶ صفحے کے اس رسالہ کو پھیلایا ہے تو تقریباً تیرہ سو صفحات کی کتاب بن گئی ہے۔

اس مختصر رسالے کے کئی ایڈیشن نکلے،محقق موصوف نے ہر ایڈیشن کو پڑھا،ایک دوسرے کا مقابلہ کیا،اور پہلی طباعت کو بنیاد بنا کر متن کو مرتب کیا،حتی الامکان تصحیح کا اہتمام کیا، عنوانات کا اضافہ کیا،بکثرت حواشی لکھے،یہ حاشیے بہت معلومات افزا اور محققانہ ہیں،جن شخصیتوں کے نام کتاب میں آئے ہیں،سب کا تعارف کرایا،مجمل اشارات کی تفصیل کی،اس طرح اس رسالہ کو ایک مکمل صورت میں کتاب کا جز بنا دیا ہے۔

مرقوماتِ قاسمی:

(۱) اس عنوان کے تحت مرتب موصوف نے حضرت نانوتوی کے گیارہ مکاتیب درج کئے ہیں، جو اب تک غیر مطبوعہ تھے، یہ سارے خطوط فارسی زبان میں ہیں،اور سب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کے نام ہیں۔مولانا راشد صاحب نے اصل خطوط بھی درج کتاب کئے،ان کا ترجمہ کیا،اور بیش قیمت حواشی لکھے۔

(۲) حضرت نانوتوی کی حیاتِ طیبہ کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپ نے غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی حقانیت کو اس طرح مدلل کیا کہ کسی کو مجالِ انکار نہیں ہوسکتی، ہندوؤں میں پنڈت دیانند سرسوتی بڑے مرتبے کے شخص ہیں،انہوں نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی،ان پنڈت جی نے حضرت نانوتوی کی شدید علالت کے دوران یہ سمجھ کر کہ مولانا تشریف لانے سے معذور ہیں، رڑکی ضلع سہارن پور میں بیٹھ کر لاف گزاف شروع کیا،بار بار مسلمانوں کو مناظرہ کا چیلنج دیتے اور یہ بھی کہتے ''میں کسی اور سے نہیں،مولبی کاسم سے مناظرہ کروں گا'' حضرت کے پاس رڑکی سے پے در پے دعوتیں آنے لگیں،حضرت نے باوجود ضعف وعلالت کے رڑکی جانا منظور فرمایا،تا کہ حق واضح ہوجائے،اور باطل کو منہ زوری کا موقع نہ رہے۔مولانا اپنے مخصوص تلامذہ کے ساتھ وہاں پہونچ گئے، پنڈت جی نے خلافِ توقع یہ صورت حال دیکھی تو کسی طرح دوبدو مناظرہ کے لئے تیار نہیں ہوئے،اس دوران پنڈت جی سے مسلسل خط وکتابت ہوتی رہی،مگر کسی طرح آمنے

سامنے گفتگو لئے آمادہ نہیں ہوئے، حضرت مولانا سترہ دن رڑکی میں مقیم رہے، حضرت مولانا اور پنڈت جی کے درمیان جو مراسلت ہوئی، حضرت کے سوانح نگاروں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔

یہ مکاتیب پنڈت جی کی سوانح عمری ''جیون چرتر مہارشی دیانند'' میں مصنف نے درج کئے ہیں، مرتب موصوف نے انہیں بغور پڑھا، اور انہیں بھی اور پنڈت جی کے خطوط کو بھی کتاب کے اندر شامل کیا، ان میں جو فروگزاشتیں ہوئیں ہیں ان کی اصلاح کی، یہ پوری داستان اس مراسلت کے ساتھ پہلی مرتبہ سامنے آئی ہے۔

(۳) سوامی جی کے فرار پر اس دور کی ایک بڑی صاحب علم شخصیت، حضرت شیخ الہند کے والد گرامی مولانا ذوالفقار علی صاحب نے ایک نظم عربی میں لکھی ہے، مرتب نے اس نظم کو بھی داخل کتاب کر دیا ہے۔

(۴) محقق مرتب نے حضرت نانوتوی کے مکاتیب کا ایک اور غیر مطبوعہ مجموعہ، حضرت کے ایک تلمیذ رشید مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودوی کے کتب خانہ سے حاصل کر کے اصل نسخے کا فوٹو شائع کیا ہے، بقول مرتب یہ کل تین مکاتیب اور ایک افادہ کا مجموعہ ہے جو اسرار و حکم کے خزینے ہیں۔ پہلے خط میں مطلق لفظ کو مقید کرنے کی کیا صورتیں ہیں؟ اس پر مختصراً بحث ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے ''وانا اول المومنین'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے مومن ہیں، حالانکہ ان سے پہلے بھی اہل ایمان بکثرت گزر چکے ہیں۔ اس سوال کا جواب حضرت نے اختصار کے ساتھ دیا ہے، مگر بہت حکیمانہ اور اصولی جواب ہے۔

اس کے بعد ایک افادہ ہے، درحقیقت یہ بھی مکتوب ہے، کاتب نے مکتوبِ دیگر کے عنوان سے اسے شروع کیا ہے، لیکن چونکہ بظاہر کسی سے خطاب نہیں معلوم ہوتا، اس لئے مرتب و محقق نے اسے ''افادہ'' کا عنوان دیا ہے۔ کسی پادری نے طہارت کے سلسلے میں چار اعتراض کئے، حضرت نانوتوی نے ان چاروں اعتراضوں کے نہایت مفصل جواب دیئے، یہ جواب علم و حکمت سے لبریز ہیں۔

یہاں مرتب موصوف سے سہو ہوا ہے، انہوں نے تین ہی سوال کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ

چار سوال تھے۔

(۱) خروجِ ریاح ناقضِ وضو کیوں ہے؟ حالانکہ بظاہر ریاح نجاست نہیں ہے۔

(۲) خروجِ منی ناقضِ طہارت اور موجبِ غسل کیوں ہے؟ حالانکہ منی انسان جیسی اشرف المخلوقات اور اس میں بھی انبیاء کرام علیہم السلام جیسے برگزیدہ طبقہ کا مادۂ خلقت ہے، پاک مخلوق کا مادۂ خلقت بھی پاک ہونا چاہئے۔

(۳) قہقہہ ناقضِ وضو کیوں ہے؟ حالانکہ اس کا نجاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

(۴) نیند ناقضِ وضو کیوں ہے؟ جب کہ اس کا بھی نجاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

حضرت نانوتوی نے اپنے خاص حکیمانہ انداز میں ان چاروں اعتراضوں کے مفصل اور تسلی بخش جواب دیئے۔ ان چار سوالوں کے ساتھ ایک پانچواں سوال بھی تھا، وہ یہ کہ ''خروجِ نجاست ناقض وضو کیوں ہے''؟ حالانکہ بظاہر نجاست کا بدن سے جدا ہو جانا باعثِ طہارت ہونا چاہئے، نہ کہ باعثِ نجاست؟۔

اس سوال کا جواب اس مکتوب میں نہیں ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ نے اس کا جواب حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے ایک شاگرد حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب محدث امروہوی علیہ الرحمہ کی زبان مبارک سے اجمالاً سنا، پھر اس کی تفصیل اپنے الفاظ میں کر کے اسے مرتب کیا، اور اس جواب کو اور باقی چاروں مذکورہ بالا سوالوں کے جواب کو ''اسرار الطہارۃ'' نامی رسالہ میں شائع کیا، محقق موصوف نے پانچویں سوال کے جواب کو اسرار الطہارۃ سے نقل کیا ہے، حضرت قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> ''ان پنجگانہ سوالات کا جواب دیتے ہوئے حضرت نے اسلامی وضو وغسل کی حقیقت اور نجاست وطہارت کی حقیقی ماہیت پر بحث فرمائی ہے، جس سے اسلام کا بابِ طہارت ایک نہایت ہی روشن طریقے پر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور اس کے ذیل میں کتنے ہی اور حقائق ومعارف بھی کھل جاتے ہیں''۔ (زیرنظر کتاب۔ ص۵۰۴)

متاعِ دلفروز:

(الف) اس عنوان کے تحت مرتب نے حضرت کی چند تحریریں جو خود حضرت کے قلم سے لکھی

ہوئی ہیں، ان کا فوٹو لے کر شامل کتاب کیا ہے، یہ چار تحریریں ہیں۔

(۱) مباحثۂ شاہ جہاں پور (۲) تنویر النبر اس علی من انکر تحذیر الناس (۳) قصیدہ در مدح خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی (۴) مکتوب (غالباً) بنام مولانا سید احمد حسن امروہوی۔

مباحثۂ شاہ جہاں پور کے متعلق مشہور یہ ہے کہ اسے حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید مولانا فخر الحسن صاحب نے مرتب کیا ہے، لیکن محقق کو اس کا جو قلمی نسخہ ملا ہے، وہ خود حضرت نانوتوی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس رسالہ کا فوٹو کتاب میں شامل ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ نے ایک صاحب علم کے ایک سوال کے جواب میں تحذیر الناس تحریر فرمائی تھی، اس پر مخالفین نے اعتراضات کئے، ان اعتراضات پر مشتمل ایک رسالہ ''قول فصیح'' میرٹھ کے ایک صاحب کے نام سے شائع ہوا تھا، حضرت کو وہ رسالہ لوگوں نے دکھایا تو حضرت نے اس کے حاشیہ پر ان اعتراضوں کے جواب لکھے۔ حاشیہ کی یہ تحریر بعینہ فوٹو لے کر کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔

جنگ بلقان کے موقع پر حضرت نانوتوی نے خلیفہ ترکی عبد الحمید خاں کی شان میں عربی میں ایک قصیدہ کہا تھا، قصیدہ مطبوعہ ہے، مرتب موصوف نے حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا قصیدہ فوٹو لے کر شائع کیا ہے۔

اس کے بعد ایک مکتوب گرامی کا فوٹو ہے، جو غالباً مولانا سید احمد حسن صاحب کے نام لکھا گیا ہے۔

(ب) حضرت نانوتوی قدس سرہ کے علوم بہت غامض اور ادق ہیں، اسی لحاظ سے ان کی عبارتوں کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، سب سے مشکل مضمون ''آب حیات'' کا ہے، مشہور ہے کہ اس میں سے چند اوراق حضرت نانوتوی نے تحریر کے بعد نکال دیئے تھے کہ انہیں سمجھنا بغایت دشوار ہے، لیکن مرتب مدظلہ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اوراق حضرت کی ایک اور تالیف ''قبلہ نما'' کے ہیں۔ یہ اوراق حضرت کے شاگرد رشید مولانا عبد الغنی صاحب پھلاودی علیہ الرحمہ کے کتب خانہ میں تھے، اور اب وہ مرتب موصوف کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہو گئے ہیں، تھوڑا سا ان کا فوٹو بھی شامل کتاب ہے۔

افاداتِ قاسمی:

اس بحث کے بعد افادات قاسمی کے عنوان سے کتب حدیث کے مراتب وطبقات اور تنقید حدیث کے اصول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کے افادات کی روشنی میں ذکر کئے گئے ہیں، یہ اصول حضرت نے اپنی کتاب ''ہدیۃ الشیعہ''میں تحریر کئے ہیں۔ہدیۃ الشیعہ کے ان صفحات کا فوٹو شامل کتاب ہے جن میں یہ بحث ہے۔

اس کے ساتھ ہی دینی تعلیم پر اجرت اور دینی مدارس کی تعلیم کے متعلقات پر حضرت کی ایک اہم تحریر بلکہ فتوی شامل کیا گیا ہے، چند اور افادات بھی ہیں۔

مآثر قاسمی:

اس عنوان کے تحت حضرت مولانا کے مکتوبات، تالیفات، افادات ،مکتوبات کے مضامین اور حضرات مکتوب الیہم کی مفصل فہرست اور اشاریہ ہے۔

رہنمائے راہ:

آخر میں رہنمائے راہ کے عنوان سے حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ اور ان کے علوم و معارف پر کام کرنے کا طریقہ کیا ہو؟ اسے محقق موصوف نے تفصیل سے لکھا ہے، اوراس کے لئے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا محمد میاں منصور غازی انصاری (نواسئہ حضرت نانوتوی) اور مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی کے کچھ ہدایات بھی نقل کئے ہیں۔

یہ کتاب کیا ہے؟ معلومات کا ایک گراں قدر خزانہ ہے، جس میں ۷۰ سے زیادہ اشخاص وافراد کا اجمالی یا تفصیلی تذکرہ ہے، بعض نزاعی یا مشتبہ امور کا محاکمہ اور فیصلہ ہے، کتاب ہر طرح لائق مطالعہ ہے۔

البتہ مرتب موصوف کی خدمت میں ایک مشورہ ہے۔وہ یہ کہ انہوں نے حضرت نانوتوی کی تحریر کا عکس پورے پورے رسالہ یا مکتوب کا دیدیا ہے۔حضرت مولانا کے مضامین تو یونہی ادق ہوتے ہیں، جو عام قاری کی دسترس سے باہر ہیں، پھر اس پر مسودہ کی تحریر جو عموماً بہت صاف اور واضح نہیں ہوتی، اور اس پر قدامت کا اثر پڑ جاتا ہے تب تو اس کا پڑھنا اور مشکل ہوجاتا ہے، مزید یہ کہ جس دور کی وہ تحریریں ہیں، کتابت کا انداز اب اس سے خاصا تبدیل ہوگیا،

سو سال پہلے کی تحریر خواہ کتنی ہی صاف ہو، آج کے اردو خواں کے لئے بہت مشکل ہے، اس دور میں ''ے'' اور ''ی'' میں کوئی امتیاز نہ تھا، ایک کو دوسرے کی جگہ بے تکلف لکھتے تھے، موجودہ دور میں دونوں میں بڑا فرق ہے، آج کا املا ''سمجھا'' ہے، پہلے اس کو ''سمجہا'' لکھتے تھے، اور بھی جہاں جہاں ہائے ہوز اور ہائے دوچشمی آتی ہے، ایک کو دوسرے کی جگہ لکھتے چلے جاتے تھے، اب یہ طریقۂ املا متروک ہو چکا ہے، پھر مستزاد یہ کہ کاغذ کی کہنگی کی وجہ سے فوٹو ناصاف ہو جاتا ہے اور کچھ پریس کی مشین روشنائی کو اڑا دیتی ہے، ایسی عبارتوں سے استفادہ نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

ان مجموعی مشکلات کی وجہ سے عکسِ تحریر سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ مرتب موصوف ماشاء اللہ دیدہ ور ہیں، قلمی تحریرات پڑھنے کے مشاق ہیں، پرانے اور نئے طرز املا سے واقف ہیں، وہ ناظرین کی خاطر تکلیف اٹھاتے اور حضرت کی تحریرات کی کتابت یا کمپوزنگ کرا کے بطرز موجودہ شائع کرتے اور نمونے کے لئے دو تین صفحات کا عکس کتاب میں شامل کر دیتے تو زیادہ مناسب ہوتا، کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی، اعتماد بھی برقرار رہتا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ مآثر ونوادر قاسمی کی گمشدگی اور نایابی کا احساس مرتب مدظلہ کو بہت شدت کے ساتھ ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا زور وشور سے ماتم کیا ہے کہ یہ ماتمی تحریریں کہیں کہیں جارحانہ ہوگئی ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کے ذہن میں یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ ہمارے وہ اکابر جو براہ راست حضرت نانوتوی کے وارث تھے، انہوں نے علوم قاسمی کی ناقدری کی، لاپرواہی برتی، بلکہ بعض ضروری اور بنیادی چیزیں جان بوجھ کر انہوں نے ضائع کر دیں، گم شدہ اوراق کی تلاش بہت عمدہ چیز ہے، لیکن اگلوں کی ناقدری کی شکایت ذرا کھٹکتی ہے، حالانکہ ان حضرات کی تلاش وجستجو کا ایک نمونہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کے قلم سے اسی کتاب میں موجود ہے۔

اس مسئلے میں اس ناچیز کا خیال یہ ہے کہ حفاظت واضاعت کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے، جن چیزوں کی حفاظت منظور ہوتی ہے اس کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں، اور جن چیزوں کی اضاعت منظور ہوتی ہے اس کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا تفصیلاً وعدہ کیا ہے، اسی کے ذیل میں احادیث نبویہ کی حفاظت ہوگئی ہے، اس کے علاوہ

کسی کے علوم ومعارف کی حفاظت کا وعدہ نہیں ہے، جو کچھ محفوظ رہ گیا اللہ کا احسان ہے، اور جو ختم ہو گیا تو دستور یہی ہے کہ علما کے اٹھ جانے سے علم اٹھ جاتا ہے، جتنا کچھ سفینہ یعنی کاغذ میں آجاتا ہے وہ اس سے بہت کم ہوتا ہے جو سینے میں رہتا ہے، اس لئے گم شدہ دولت پر افسوس اور ماتم نہ کرکے موجودہ دولت ہی کو قابل استفادہ بنانا چاہئے، اس کا منصوبہ بنانا چاہئے کہ حضرت نانوتوی کے علوم سے استفادہ کیوں کر عام ہوسکتا ہے؟ حضرت کی کتابوں کا حال یہ ہے کہ اچھے خاصے اذکیاء بھی چند ورق پڑھنے کے بعد تھک جاتے ہیں، ان کو صحیح طور پر سمجھنا اور انہیں سہل انداز میں پیش کرنا ایک کام ہے، پرانے کئی علما کے بارے میں سنا ہے کہ حضرت نانوتوی کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھتے تھے، اب بھی ذہین وذکی اساتذہ جو حضرت کی کتابیں سمجھ سکتے ہیں، ذی استعداد طلبہ کو پڑھائیں تو فائدہ عام ہو، علم وہ نہیں جو کتاب میں ہے بلکہ علم وہ ہے جو دماغ میں ہے، ہم نے دماغوں میں اسے اتارا نہیں، دلوں کو اس سے مناسبت نہیں ہوئی، تو کاغذ کے سفینوں میں اس کی حفاظت کیا کرسکیں گے؟۔

پھر یہ بھی ہے کہ مضامین ومکاتیب اور تصنیف وتالیف پر مصنف کے مزاج کا اثر سایہ فگن رہتا ہے، حضرت نانوتوی کا مزاج فنا وخمول کا تھا، وہ کہیں بھی نمایاں نہیں ہونا چاہتے تھے، کیا عجب اس رنگ طبیعت کا پرتو خود حضرت کے مقالات ومضامین پر بھی پڑ گیا ہو کہ عربی اور انگریزی ترجمہ تو الگ رہا، خود اصل تصنیف کی زبان میں بھی مشہور نہ ہوسکے۔

....

آج کل ہر چیز میں آسانی ڈھونڈھ لی جاتی ہے، کتابت کے لئے کمپیوٹر کی ایجاد نے کاتب کے نازنخروں کی مصیبت سے بڑی حد تک نجات دلا دی ہے، مگر ایک دوسرا دردسر پیدا ہو گیا ہے، وہ یہ کہ باوجود کوشش کے کتابت کی اتنی غلطیاں رہ جاتی ہیں کہ ان کی تلافی مشکل نظر آتی ہے، زیر نظر کتاب تو بہت ضخیم ہے، ضخامت کے لحاظ سے کتابت کی غلطیاں کم ہیں، پھر بھی بہت ہیں، تصحیح پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محنت بہت ہوئی ہے، مگر کمپیوٹر تو کمپیوٹر ہے، وہ بناتے بناتے بھی کلمات وحروف کو بگاڑ دیتا ہے۔

صفحہ ۴۹ پر غلطی سے حضرت شاہ یعقوب دہلوی کو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کا بڑا

بھائی لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ چھوٹے بھائی تھے۔

کتابت کی غلطیوں کی نشان دہی کتاب ہی کے صفحات پر کردی ہے، ارادہ ہے کہ زیر تعارف نسخہ حضرت محقق موصوف کی خدمت میں نذر کروں اور اس کے عوض دوسرا نسخہ حاصل کروں۔[ا]

ماخذ: المآثر۔نومبر، دسمبر، جنوری (۲۰۰۱۔۲۰۰۲)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(ا) زیر نظر نسخہ کی تصحیح کتابت مکمل کر کے اسے مرتب موصوف کے پاس بھیج دیا، انہوں نے بہت شکرگزاری کے ساتھ دوسرا نسخہ ارسال فرمادیا۔ جزاک اللہ خیرا الجزاء

تحفۂ مدینہ طیبہ

۱۴۳۱ھ کے رمضان شریف شروع ہونے سے ایک روز قبل حق تعالیٰ کی توفیق سے قسمت نے یاوری کی، بلدۂ مکرمہ، مرکز ایمان ومحبت، قیامگاہ نبوت اور دیار ہجرت ورسالت مدینہ منورہ زادہا اللہ عزاًوکرامۃً میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، ایک امتی کے لئے اس سے بڑھ کر شرف اور خوش بختی کیا ہوگی کہ اسے دنیا کے سب سے بڑھ کر شفقت ورحمت والے آقا، رحمۃ للعالمین ﷺ کے قرب میں کچھ ٹھہرنے اور رہنے کا نصیبہ حاصل ہوجائے، حاضری کے ان ایام کو حاصل زندگی کہئے تو بجا ہے۔

یہاں میرے بہت قریبی دوست شیخوپور کے رہنے والے افتخار احمد اعظمی انتظار واستقبال میں پہلے سے موجود تھے، ان کے واسطے سے ان کے رشتے کے ایک بھانجے محمد اسعد عرف چنّو سے ملاقات ہوئی، یہ بلریا گنج کے رہنے والے ہیں، ایک عرصہ سے مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں، اس سے پہلے بھی ایک حاضریٔ طیبہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، ان کی زبان سے بار بار ایک شخصیت کا تذکرہ پہلے بھی سنا تھا اور اس حاضری میں بھی سن رہا تھا۔

بلریا گنج کے ایک غیر مسلم گھرانے کے ایک ہونہار بچے پر اللہ کا فضل خاص ہوا، وہ اسلام کی نعمت عظمیٰ سے نوازا گیا، صاحبزادے ''بانکے لال'' سے ضیاء الرحمٰن ہوئے، بلریا گنج کے مشہور ومعزز معالج جناب حکیم محمد ایوب صاحب علیہ الرحمہ نے سرپرستی فرمائی۔ جنوبی ہند کے مشہور دینی ادارہ جامعہ دارالسلام عمرآباد سے تعلیم کی تکمیل کی، پھر مزید علمی فیوض وبرکات جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ اور جامع ازہر مصر سے حاصل کرتے رہے، تعلیم کے مرحلوں سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الحدیث میں استاذ مقرر ہوئے اور

اس کے منصب صدارت پر فائز ہونے کے بعد جامعات کے دستور کے مطابق سبکدوش ہوئے۔

اب مدینہ منورہ کے گہوارۂ سکون ویکسوئی میں ہمہ تن خدمت حدیث شریف میں منہمک ہیں، کیا خدمت کررہے ہیں؟ محمد اسعد صاحب یہ تو نہیں بتا پارہے ہیں، لیکن کہہ رہے ہیں کہ بہت طویل المیعاد کام ہے، دس سال سے لگے ہوئے ہیں، پانچ سال اور لگیں گے، انھیں فرصت نہیں رہتی شب وروز کا زیادہ حصہ اسی شغل میں بسر ہوتا ہے، پچھلی حاضری میں ان کی مشغولیت کی کثرت کی وجہ سے، اور اس لئے بھی کہ میں بہت معمولی اور چھوٹا ہوں، بڑے علماء سے ملنے کی ہمت نہیں کرپاتا کیونکہ جو خود بونا ہو کسی طویل القامت کے پاس کھڑا ہو تو اسے بونا ہونے کا احساس بڑھ جاتا ہے، یہی حال میرا ہے، بہت چھوٹا ہوں، بڑے لوگوں کی خدمت میں حاضری ہوتی ہے تو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس **المضاعف** ہو جاتا ہے۔

لیکن اب کی بار ایک نئی بات یہ ہوئی کہ محمد اسعد صاحب نے ان کے سامنے میرے ایک مضمون کا تذکرہ کیا، جو میں نے حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم کی وفات پر لکھا تھا، انھیں حکیم صاحب سے قلبی تعلق ہے، انھوں نے اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میری کتاب ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں وہ مضمون شامل ہے، وہ کتاب میرے خاص کرم فرما اور محسن مولانا حافظ محمد مسعود صاحب مدظلہ.....جو عرصۂ دراز سے مدینہ شریف میں مقیم ہیں.....کے پاس ہے، ان سے حاصل کرکے وہ کتاب ان کے پاس بھجوادی، مضمون پڑھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور ملاقات کے لئے ۸؍رمضان المبارک بعد نماز ظہر کا وقت متعین فرمایا، حضرت حافظ صاحب اپنی گاڑی سے محمد اسعد صاحب کی رہنمائی میں ہمارے قافلہ کو مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب کے دولت کدے پر جو حقیقت میں ''علم کدہ'' ہے، لے گئے، اس قافلہ میں ان دونوں حضرات کے علاوہ خاکسار اور اس کے بیٹے مولانا حافظ محمد راشد سلّمہٗ اور میرے دوست افتخار احمد اعظمی صاحب تھے۔

مولانا نہایت اخلاق اور تواضع سے ملے، سفید ریش بزرگانہ صورت اور بزرگانہ ادائیں، مل کر بہت اُنس محسوس ہوا، بے تکلف سادہ، گفتگو بہت نرم اور شیریں، لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ، ملنے سے خوشی کا اظہار، اور میرے مضمون اور اُسلوبِ نگارش کی تحسین کرتے رہے، کتاب خاصی پڑھ لی تھی۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کی خدمت حدیث کا تذکرہ بار ہا سنا، مگر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کی خدمت کس نوعیت کی ہے؟ اس پر مولانا نے تفصیل سے اپنی خدمت کا تذکرہ فرمایا:

ہر مسلمان جانتا ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات واحکام کی اَساس بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں، اول قرآن، دوسرے سنت، انھیں دونوں چیزوں کے مجموعے کا نام دین ہے، قرآن تو اللہ کا کلام ہے، اس کے لفظ لفظ اور اس کی ایک ایک طرزِ ادا کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، چنانچہ اس کے جمع وتدوین کا کام حق تعالیٰ نے خلافت راشدہ کے عہد میں مکمل کردیا۔ ابتداءً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا کامل نسخہ تیار کرایا، لیکن اس ایک نسخہ کے علاوہ دوسرے حضرات صحابہ کے نسخے کلمات وحروف اور حرکات وسکون اور طرز ادا کے جزوی اختلاف کے ساتھ پڑھے جاتے تھے، اور اپنے تلامذہ ومتعلقین کو اسی طریقہ پر تعلیم دیتے تھے، اس کی بنیاد پر اندیشہ تھا کہ امت میں اختلاف بلکہ شقاق وخلاف کا دروازہ کھل جائے گا، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس مجموعے کی جو حضرت خلیفہ اول نے تیار کرایا تھا سرکاری طور پر نقلیں تیار کرائیں اور تمام اسلامی عملداری میں انھیں بھجوایا اور حکم نافذ کیا کہ صرف یہی نسخہ پڑھا اور پڑھایا جائے، اس کے علاوہ اور سارے نسخوں کو اکٹھا کرکے نذر آتش کردیا، اس طرح امت ایک بڑے فتنہ سے بچ گئی۔

دین کی دوسری بنیاد سنت ہے، جس کا منبع ومرجع احادیث واقوال وافعال رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، ان کے تحفظ وبقا کا تکوینی نظام دوسرے طریقے پر ظہور میں آیا، ہم دیکھتے ہیں کہ امت کی بہترین صلاحیتیں، بہترین دماغ، اعلیٰ درجے کے حافظے، صاحب ورع اور متقی شخصیتیں اللہ ورسول کی محبت میں ڈوب کر، دنیا وجہان کے تمام علوم وافکار سے منہ موڑ کر تین صدیوں تک اس مہم پر کمربستہ رہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ کے احوال وسوانح اور آپ کے متعلق ایک ایک معاملہ کو محفوظ ومدوّن کرلیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مختلف تبلیغی وتعلیمی اور جہادی مہمات میں آپ کے صحابہ چونکہ مختلف بلاد وامصار میں پھیل گئے تھے، اس لئے وہ لوگ جنھوں نے آپ کی صحبت نہیں پائی مگر آپ کی محبت میں غرق تھے، ان کی تسکین کا سامان یہ تھا کہ وہ

حضرات صحابہ کی خدمت میں پہونچیں اوران سے نبی ﷺ کے ارشادات واحوال معلوم کریں، پھر تو پورا عالم اسلام حرکت میں آ گیا، لوگوں نے سواریوں کے رخ ہر اس طرف پھیرے جہاں جہاں انھیں رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کی خوشبو محسوس ہوئی، اس وقت کو اگر آپ تصور کی نگاہوں میں لائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہزاروں ہزار افراد مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں سرگرم سفر ہیں، اور جہاں انھیں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی حدیث مل سکتی ہے وہاں ٹھہر جاتے ہیں، خدمت میں پڑ جاتے ہیں، حدیث یاد کرتے ہیں، انھیں لکھتے ہیں، پھر خود بھی مرکز علم بن جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ نے تلاش حدیث کے لئے اتنے سفر کئے کہ اگر وہ سیدھے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے تو تین چکر پورے ہو جاتے۔

پھر ان حضرات نے یہ التزام کیا کہ جن واسطوں سے یہ حدیثیں انھیں حاصل ہوئی تھیں ایک ایک کا نام یاد رکھا اور ہر واسطے کو بالالتزام بیان کیا، اس کا نام سند رکھا، اس طرح اسناد کا ایک عظیم الشان ذخیرہ تیار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ سند میں آئے ہوئے یہ واسطے باستثنائے صحابہ کرام سب ایک درجے کے نہ تھے، کسی کا حافظہ قوی تھا ہے، کسی کا کمزور ہے، کوئی محتاط ہے، کوئی غیر محتاط، کوئی متقی و پرہیز گار ہے اور کوئی غیر معتبر ہے، ان واسطوں کے اعتبار سے حدیثوں کے درجات اور ان کے معتبر ہونے میں فرق ہوا، ان سب کو لکھ کر مرتب کیا گیا، اس طرح احادیث کا ایک عظیم الشان ذخیرہ سینوں سے منتقل ہو کر سفینوں میں محفوظ ہو گیا۔

یہ دینی علم کی دوسری بنیاد ہے، محدثین نے بڑی محنت اور کاوش سے چوتھی صدی تک تمام حدیثوں کو ان کی سند کے ساتھ مدوّن ومرتب کر دیا، اب ہر اس مسئلے کیلئے جس کا تعلق دین سے ہے اس کی دلیل یا تو قرآن میں ہے یا ان حدیثوں میں ہے، یا پھر ان کی بنیاد اجماع یا اجتہاد و استنباط میں ہے۔

اگر کسی مسئلے کی دلیل حدیث میں ہے، تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ یہ حدیث کس درجے کی ہے؟ یہ ایک دقت طلب اور مشکل کام ہے، لیکن اس مشکل کام سے محدثین عہدہ برآ ہو چکے ہیں، اور ہر ہر حدیث پر وہ واضح حکم لگا چکے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، یا ضعیف وموضوع ہے،

اب انھیں تلاش کرنے کی محنت ہے، اور اس عظیم الشان ذخیرے میں صحیح اور حسن حدیثوں کو تلاش کرنا بھی آسان نہ تھا۔

احادیث کے ذخائر میں چھ کتابوں کو قبول عام حاصل ہوا، لیکن صحیح حدیثیں انھیں چھ کتابوں میں منحصر نہیں، ان کتابوں میں صحیح احادیث کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہے، لیکن ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی بڑا عظیم ذخیرہ ہے۔

مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا، اور اس میں یکسوئی کے ساتھ منہمک ہو گئے، وہ منصوبہ یہ ہے کہ جہاں جہاں جس جس کتاب میں صحیح اور حسن مرفوع حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں سب کو یکجا کر دیا جائے، یہ کام بہت ہمت طلب اور پُر مشقت ہے، اس کے لئے تمام ذخائر حدیث کا مطالعہ کرنا، ان میں سے صحیح یا حسن مرفوع روایتوں کو تلاش کرنا، پھر ان کی صحت کے متعلق دلائل مہیا کرنا، انھیں مرتب کرنا، ایک طویل اور مسلسل جہد و مشقت کا عمل ہے، ایک عرصہ ہوا کہ مولانا اسی محنت و کاوش میں لگے ہوئے ہیں، وہ فرما رہے تھے کہ میری نیت ہے کہ سب صحیح حدیثیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے اور وہ صحت کے ساتھ ثابت ہیں، اور جو دین کی بنیاد ہیں، میں یکجا کر کے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دوں، اس کے واسطے سے حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں میری حاضری ہو جائے اور اللہ کی رضا حاصل ہو جائے۔

مولانا نے اپنے اس عظیم منصوبہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

قسم اول: ایمان، علم، عبادات

قسم ثانی: معاملات واحکام

قسم ثالث: تفسیر، سیرۃ، مغازی، مناقب، ادعیہ، گزشتہ انبیاء واقوام وملل کے واقعات

اس منصوبہ کے دو حصے بفضل اللہ وعونہ پورے ہو چکے ہیں، جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہیں، ان کے مجموعی صفحات ۷۲۰۰ ہیں، اور ان میں حدیثوں کی تعداد ۶۸۰۰ ہے۔

اب مولانا تیسری قسم مرتب کر رہے ہیں، فرما رہے تھے کہ سیرت نبوی پر کام چل رہا ہے، غزوۂ احد تک پہونچا ہوں۔

یہ منصوبہ مولانا نے ۱۴۲۲ھ میں شروع کیا تھا، اور امید ہے کہ ۱۴۳۵ھ میں تکمیل کو ان شاءاللہ پہونچے گا۔

مولانا فرما رہے تھے کہ صحاح ستہ میں کل صحیح حدیثیں بغیر تکرار کے سات ہزار سے کچھ زائد ہیں، اور اتنی ہی ان کے علاوہ میں بھی ہیں، اس طرح تقریباً پندرہ ہزار متونِ حدیث جمع ہوجائیں گی، ان شاءاللہ، اس مجموعہ کا نام مولانا نے "**الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل**" رکھا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ میری تلاش وجستجو کے مطابق حدیث کے تمام ذخائر میں ساٹھ سے ستر ہزار کے درمیان حدیثیں ہیں جو تقریباً تین لاکھ سندوں سے مروی ہیں، لیکن یہ حدیثیں بکثرت سندوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مکرر سہ کرر ہیں، تکرار سے خالی کر کے جب حدیث صحیح کے متون کو منتخب کیا جائے گا تو ۱۲ سے ۱۵ ہزار کے درمیان ہوں گے۔

یہ منصوبہ جب مکمل ہوگا.....اور خدا کرے مولانا کی عمر، صحت اور جدوجہد میں برکت ہو کہ یہ عظیم الشان کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے.....تو امت کے ہاتھوں میں صحیح احادیث کا ذخیرہ یکجائی طور پر موجود ہوگا، پھر اس کی تحقیق وتنقیح کی دردسری نہ ہوگی کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا صحیح ہے۔

مولانا کو اور ان کی محنت اور جذبۂ اخلاص وعمل کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد: **مثل امتی کمثل المطر لایدری اولها خیر أم آخرها** یاد آتا ہے، یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے کہ نہ معلوم اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے یا اس کا آخری حصہ۔

ابتدائی صدیوں میں حضرات محدثین نے شہر شہر قریہ قریہ چل کر لمبے لمبے سفر کر کے اپنے آپ کو مشکلات میں ڈال کر صبر واستقامت کے عدیم النظیر کارناموں کے ساتھ احادیث کے ذخیرے ان کی سندوں کے ساتھ مہیا کر دیئے، ہر حدیث پر جرح وتعدیل کے قوانین کے مطابق احکام لگائے، تا کہ حدیث گھڑنے والے کی دسیسہ کاریوں سے امت محفوظ رہے، اس سلسلہ میں اتنی محنت وکاوش ہوئی، اور ہر زمانہ میں علماء نے اس کا اتنا اہتمام کیا کہ فن حدیث کا ایک بڑا کتب خانہ تیار ہوگیا، اس عظیم کتب خانے کے اوراق وصفحات سے صحیح حدیثوں کو منتخب کرنا اور ان کے صحیح

ہونے کے دلائل مہیا کرنا طول طویل اسفار کے مرتبے میں، حق تعالیٰ کی توفیق سے مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب اعظمی ۱۴۲۲ھ سے مسلسل یہ سفر کررہے ہیں، وہ اپنے موضوع میں اس درجہ منہمک ہیں کہ انھیں دیکھ کر متقدمین یاد آتے ہیں۔

احادیث کا عظیم الشان کتب خانہ ان کے پاس ہے، اور وہ شب وروز اس میں سرگرم عمل رہتے ہیں، میں ان کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنی قیمتی مصروفیات کے ان لمحوں میں ایک معمولی بہت معمولی آدمی کو حاضری کا موقع دیا۔

فجزاه الله خير الجزاء وبارک فی علمه وعمله وعمره ودنياه وآخرته.

☆☆☆☆☆☆

تحفۂ بہار

۱۴۰۴ھ میں میرے قلم سے مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کی سوانح حیات بنام ''حیات مصلح الامت'' شائع ہوئی، گو کہ فی نفسہ کتاب میں کوئی خاص حسن و جمال نہ تھا، مگر صاحب سوانح کی شخصیت ایسی پر کشش اور باکمال تھی کہ اس نے خود تحریر سوانح کے اندر جاذبیت پیدا کر دی۔ بزرگوں نے، ادیبوں نے اور دوستوں نے اسے بہت پسند کیا، اس کتاب نے بہت سے اللہ والوں کی نگاہ کرم میری طرف مبذول کرا دی، جن بزرگوں کی خصوصی نگاہِ کرم ادھر متوجہ ہوئی، ان میں بہار کے رہنے والے میرے نہایت محترم بزرگ الحاج ماسٹر قاسم صاحب مدظلہ بھی ہیں، حضرت موصوف کی نوازشیں اور مہربانیاں مجھے اس وقت سے حاصل ہیں، جب میں الہ آباد میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا، اس وقت چند بزرگوں کے ہمراہ حضرت ماسٹر صاحب الہ آباد تشریف لائے۔ یہ حضرات امروہہ سے واپس ہو رہے تھے، معلوم ہوا کہ ان حضرات کے شیخ و مرشد حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہوی کا وصال ہو گیا ہے، اسی سلسلہ میں ان بزرگوں کا سفر ہوا تھا، واپسی میں الہ آباد بھی آئے تھے، فطری طور پر رنج و حزن کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں تھے، بس صرف تعارف کی حد تک ملاقات ہوئی، لیکن دل نے گواہی دی کہ یہ لوگ خاصانِ خدا میں سے ہیں، چہروں پر سرورِ عشق آنکھوں میں یقین کا نور صاف جھلک رہا تھا، زبانوں پر خاموشی کا پہرہ تھا، مگر انداز بتا رہا تھا کہ دل میں ایمان کے جذبات موجزن ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد میری واپسی غازی پور کو ہو گئی، جہاں سے میں الہ آباد گیا تھا، وہاں حضرت ماسٹر قاسم صاحب کی عنایات کا ظہور ہوا۔ ابتداء حضرت موصوف نے اپنے دو فرزندوں مولوی محمد عاصم و مولوی محمد ہاشم سلمہما کو بغرض تعلیم میرے پاس بھیجا، پھر خود بھی کئی مرتبہ تشریف لائے، ہر

بارطبیعت ان سے مزید متاثر ہوتی رہی، جب حیات مصلح الامت چھپ کر شائع ہوئی تو تحریر فرمایا کہ''آپ کے قلم سے اگر ہمارے شیخ حضرت مولانا سراج احمد صاحب کی سوانح بھی آجاتی تو بہت اچھا ہوتا''۔ میں نے اس حکم کو اپنے لئے غنیمت سمجھا، ایک تو اللہ والے کی سیرت، دوسرے ایک بزرگ کے حکم کی تعمیل۔ نورعلی نور کا مصداق!

دل میں ٹھان تو لیا کہ یہ کام ضرور انجام دینا ہے، مگر تدریسی مشغولیات میں اس کی گنجائش کہاں؟ کہ معلومات فراہم کیجئے، انہیں ترتیب دیجئے، اس کا موقع سال میں ہونے والی دو تین تعطیلوں میں مل سکتا تھا، مگر ان تعطیلوں کا حال یہ ہے کہ وہ پہلے ہی سے اسفار کے لئے متعین ہوتی ہیں، مواعظ کے پراگرام اور جابجا دوروں کے ہنگاموں میں قرطاس وقلم کی تنہائیاں کہا نصیب؟ اسی میں بات ٹلتی رہی، دل میں یہ خیال ہوا کہ ایک سفر کر کے ماسٹر صاحب موصوف کی خدمت میں حاضری دی جائے اور وہیں سکون اور یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر یہ کام انجام دے لیا جائے۔ اپنے اس خیال کا اظہار حضرت موصوف سے بھی کر دیا، ماسٹر صاحب بہت مسرور ہوئے، شعبان ۱۴۱۰ھ کی تعطیل اس کام کے لئے متعین کر لی، مگر اس وقت دوسرے اسفار اور اچانک ناگفتنی ایسے واقعات پیش آتے چلے گئے کہ رمضان قریب آ گیا، اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ کی کوئی تاریخ تھی کہ میرے عزیز دوست حافظ آفتاب عالم صاحب سلمہ مدرسہ شیخ الاسلام تشریف لائے، انہوں نے سابقہ وعدہ کی یاددہانی کرائی۔ میں نے ارادہ کیا کہ بقرعید کی تعطیل میں وہاں کا سفر کرلوں، مگر پھر یہ بات ذہن میں آئی کہ بقرعید کے تین دنوں میں گھر رہنا ضروری ہے، اور ان تین دنوں کو نکال دوں تو کام کے دن بہت کم بچیں گے، دوسرے یہ ایام شدتِ باراں کے ہوں گے، بالخصوص جس علاقے میں جانا ہے وہ سیلاب کی کثرت کے لئے معروف ہے، پھر بات اس پر ٹھہری کہ ربیع الاول میں ششماہی امتحانات ہوتے ہیں، امتحان کے بعد ایک ہفتہ کی تعطیل ہوگی، یہ وقت سفر کے لئے مناسب ہوگا۔ چنانچہ حافظ صاحب سلمہ سے اس کا وعدہ کرلیا، انہوں نے واپس جا کر ماسٹر صاحب کو اس وعدہ کی اطلاع کر دی۔

درمیان میں موانع کی صورتیں پیش آتی رہیں، مگر اب کی عزم کیا گیا تھا، حق تعالیٰ نے

اس کے سامنے ان رکاوٹوں کو ٹکنے نہ دیا، رکاوٹیں آتی رہیں، اور خش وخاشاک کی طرح بہتی رہیں، بہر حال حق تعالیٰ نے مقدر فرما دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔

روز شب کا قافلہ اپنی رفتار سے چلتا رہا، یہاں تک کہ ۷؍ربیع الاول کو امتحانات ختم ہو گئے، بہار جانے والا قافلہ بھی زاد وراحلہ کے ساتھ تیار ہو گیا، اس قافلہ میں ہمارے مدرسہ سے مولوی مہتاب عالم صاحب مدرس شعبہ عربی، عزیزم مولوی ہاشم سلمہ استاذ درجہ فارسی اور مدرسہ دینیہ غازی پور سے عزیزم مولوی ابوالخیر کلکتوی مدرس شعبہ عربی اور ان کے علاوہ حافظ آفتاب عالم صاحب سلمہ اور عزیزی مولوی حافظ عبدالجبار مظفر پوری شریک ہیں۔ یہ سب لوگ بھی شیخو پور میں مجتمع ہو گئے تھے، عصر کی نماز مدرسے میں پڑھ کر یہ قافلہ عازم سفر ہوا، مغرب کی نماز کے بعد اعظم گڑھ جامع مسجد میں ہم لوگ پہونچے، نماز سے فارغ ہو کر رفقا نے کھانا کھایا، عشا کی نماز کے بعد اعظم کڑھ ریلوے اسٹیشن کے لئے روانگی ہوئی، ٹرین کا وقت بارہ بجے کے بعد تھا، لیکن ہندوستان میں کوئی ٹرین وقت کی پابند نہیں، دو بجے کے قریب ٹرین آئی، اس سے چھپرا تک پھر چھپرا سے دوسری ٹرین پر سوار ہو کر مظفر پور پہونچے، مظفر پور میں مغرب کی نماز ادا کی، پھر بس سے دربھنگہ ساڑھے آٹھ بجے پہونچے، توقع یہ تھی حضرت ماسٹر صاحب نے کسی کو بس اسٹیشن بھیجا ہوگا، نیز میں نے اپنے عزیز دوست مولوی حبیب اللہ سلمہ کو مدھوبنی اطلاع کر دی تھی، یقین تھا کہ وہ بھی آئے ہوں گے، لیکن جب ہم لوگ بس سے اترے تو ایک ہو کا عالم تھا، کوئی بھی نہ تھا۔ خیال ہوا کہ دیر ہوئی ہے شاید آنے والے مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہوں۔ سوال تھا کہ اب کہاں جایا جائے؟ آج ہندوؤں کا تہوار ہے، دسہرہ کی دھوم دھام ہے، بس اسٹیشن ہر طرح کی سواریوں سے خالی ہے، نہ کوئی رکشہ نہ کوئی ٹمپو، نہ کوئی جیپ اور بس اسٹیشن شہر سے اتنی دور کہ سامانوں سے لدے پھندے پیدل جانا بھی ممکن نہیں، یا اللہ اب کیا ہو؟ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، سواریاں تلاش کر رہے ہیں، مگر معلوم ہوا کہ سب سواریاں اور سب سواریوں کے ڈرائیور دسہرہ کے میلہ میں مگن ہیں، اور ہم چند لوگ حیران پریشان سڑک پر ایک ایک کا منہ دیکھ رہے ہیں، اتنے میں حافظ آفتاب سلمہ کے ایک شناسا جوان کے نانیہالی گاؤں کے تھے، مل گئے، انہوں نے دعوت دی کہ رات میرے مکان پر چل گزار لیجئے، یہ موقع غنیمت معلوم ہوا، مگر جائیں کیسے؟ سامان لے سڑک

پر ڈال ہم لوگ کھڑے ہوگئے، وہ بیچارے سائیکل پر سوار گشت لگاتے رہے کہ کوئی سواری ملے تو لے آئیں، بڑی مشکلوں اور بڑی دیر کے بعد ایک ٹمپو کو لے کر آنے میں کامیاب ہوگئے، اس نے جوں توں کر کے ان کے مکان تک پہونچایا، مکان خالی تھا، ان کے بچے گاؤں گئے ہوئے تھے، وہاں آرام ملا، عشا کی نماز پڑھی اور سو گئے، صبح بذریعہ بس روانگی ہوئی، یہ بس سپول جانے والی تھی اس سے ہم لوگ آشاپور تک گئے، آشاپور سے حافظ آفتاب عالم نے ایک جیپ ریزرو کی، اور اس سے ہم لوگ ساڑھے نو بجے پوہدی بیلا پہونچے، جو ہماری منزل تھی، ابھی گاؤں سے دور ہی تھے کہ حضرت ماسٹر صاحب دو آدمیوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے، گاڑی روک کر ان سے مصافحہ ومعانقہ کیا، پھر وہ بھی گاڑی پر بیٹھ گئے، اور بعافیت ہم لوگ مدرسہ اشرفیہ پوہدی بیلا میں داخل ہوئے۔

ماسٹر صاحب کے چہرے پر کچھ استعجاب کے اثرات تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ کل انہوں نے مدرسہ کے ایک استاذ کو دربھنگہ ہم لوگوں کے استقبال کے لئے بھیجا تھا، ماسٹر صاحب کو معلوم تھا کہ ہم لوگ رات میں کسی طرح پوہدی بیلا نہیں پہونچ سکتے، اس لئے انہوں نے دربھنگہ شہر میں قیام کا بندوبست معقول کرادیا تھا، ماسٹر صاحب کو اس پر تعجب تھا کہ وہ مولوی صاحب کہاں چلے گئے؟۔

یہ علاقہ جہاں کا ہم نے سفر اختیار کیا تھا، اس کا قدرے تعارف کرادینا ضروری ہے، یہ خطہ دربھنگہ شہر کے پورب تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، یہاں سے ہمالیہ پہاڑ کچھ دور نہیں ہے، آج دنیا مادی اعتبار سے جس تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب دوڑ رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، شہروں اور مرکزی علاقوں میں چلے جایئے، تو دولت امنڈی پڑ رہی ہے، ہر روز زمین کا سینہ شق کر کے اونچی اونچی وسیع وعریض بلڈنگیں سر اٹھا رہی ہیں، سڑکیں صاف وشفاف ایک سے بڑھ کر ایک، اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سواریاں، موٹریں، بسیں، کاریں اور موٹر سائیکلیں کارخانوں سے نہیں، انہیں سڑکوں کے بطن سے پیدا ہو کر دوڑنے لگ جا رہی ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک ڈھلی ڈھلائی سواریاں، بجلی کی رو ایسی دوڑا دی گئی ہے جیسے اب اندھیرے کی دنیا میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، ہر طرف روشنی کی فراوانی، لیکن آپ اس علاقہ میں چلے جایئے جہاں کی

بات میں کرر ہا ہوں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عروج وترقی کی دوڑ یہاں آتے آتے بالکل مدھم پڑ گئی ہے، نہ اونچی اونچی عمارتیں نظر آتی ہیں، نہ جال کی طرح پھیلی ہوئی بہتریں سڑکیں، نہ رنگ برنگ سواریوں کی بہتات، نہ بجلی کے قمقمے جورات کو دن بنائے رہتے ہیں، آشاپور سے جب ہم لوگ پوہدی کی طرف چلے ہیں تو جس زمین پر ہماری جیپ اچھل کود کرر ہی تھی، نام تو اس کا سڑک ہی لیا جاتا ہے، مگر سڑک کی تعریف اس پر ہر قدم پر ٹوٹتی نظر آرہی تھی، کنکر ضرور بچھے تھے، ان کنکروں پر ڈامر کے نشانات بھی تھے، مگر ایسے ہی کہ کہیں ڈامر بہت زور دکھایا تو چند سنگریزوں پر غالب آ گیا، ورنہ عام طور پر سنگریزوں کی بغاوتِ عام نے ڈامر کو شکست فاش ہی دے رکھی ہے، ہماری جیپ اسی طرح اچھل رہی تھی جیسے اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر بیل گاڑی اچھلتی ہے، ہماری ہڈیوں کا ڈھانچہ زیروزبر ہوکر رہ گیا، آٹھ دس کلومیٹر کی مسافت غالباً گھنٹہ بھر سے زائد میں پوری ہوئی، راستے میں عمارتوں کا جو منظر سامنے آیا، اس نے تو ہمارے لئے دور قدیم کی یاد تازہ کردی، پکی اور اونچی عمارت گاہے ماہے کہیں کہیں اس طرح نظر آتی تھیں جسے کسی نے صحرا میں کوئی پختہ عمارت تعمیر کر لی ہو، ورنہ زیادہ تر پھوس کے مکانات نظر آئے، جو کھپریل کی ستر پوشی سے بھی بے نیاز تھے، بجلی کے تار اور کھمبے بھی ضرور دکھائی دیئے، مگر جسد بے روح اور لاشئہ بے جان، شاید مہینوں کے بعد ان میں زندگی کی رو دوڑتی ہو، ہم تو ہفتہ بھر اس علاقہ میں رہے ایک منٹ کے لئے بھی کہیں بجلی کی جھلک نہیں دکھائی دی، ان پھوس کے مکانات میں ٹمٹماتے دیئے، اور بھکبھکاتی لالٹینیں کتنی روشنی پھیلاتیں؟ بجلی کے قمقموں کی عادی آنکھیں انہیں اندھیرا ہی سمجھتیں۔ یہ علاقہ مکمل سیلاب کی زد میں رہتا ہے، ایک تو ندی نالہ بہت ہیں، دوسرے ہمالیہ کی بلندی یہاں سے قریب ہے، بارش اور ندیوں کا پانی تو کم تباہی مچاتا ہے، مگر جب سیلاب کی رو ہمالیہ پہاڑ سے اترتی ہے تو پورا علاقہ تہہ و بالا ہوجاتا ہے، سال کے چھ مہینے سیلاب کی نذر ہوجاتے ہیں، پھر ترقیاتی اسکیمیں آئیں تو کہاں سے آئیں؟۔

ہمارا قیام پوہدی بیلا میں تھا، یہ ایک بہت بڑی آبادی ہے، جہاں ضروریات کی تقریباً سبھی چیزیں ملتی ہیں، اس کے پاس ڈیڑھ دوکلومیٹر سے لے کر دس پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر چھوٹی بڑی بہت سی دیہی آبادیاں ہیں، جن میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد بستی ہے، آگے چند

گاؤں کا تذکرہ آئے گا،ان ساری آبادیوں میں پوہدی بیلا کومسلمانوں کے حق میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے، کیوں کہ یہاں عربی کا ایک مدرسہ ہے، یہ مدرسہ اشرفیہ عربیہ کے نام سے موسوم ہے،اس کی بنیاد ۱۳۵۴ھ میں اسی علاقے کے مشہور بزرگ حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب ہرسنگھ پوری نے رکھی ہے۔ ہرسنگھ پور اس اس دیار کا مشہور گاؤں ہے،اس گاؤں کو حضرت مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوری کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے،حضرت مولانا محمد عارف صاحب حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کے مرید اور حضرت شاہ محمد علی صاحب مونگیری کے خلیفہ، بہت بافیض اور بابرکت عالم تھے،نہایت سادہ مزاج، بے تکلف اور قوی النسبت لوگوں میں تھے،انہوں اس علاقہ میں بہت کام کیا، مدرسہ رحمانیہ انہیں کا قائم کردہ ہے، جو عرصہ تک علما و اکابر کا مرجع رہا،اوراب بھی ماشاءاللہ اس کا فیض جاری ہے،موجودہ امیر شریعت بہار حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے انہیں مولانا عارف صاحب سے تربیت اور اجازت پائی ہے۔

حضرت مولانا محمد عارف صاحب کے چار صاحبزادے ہوئے،جن میں اس وقت ایک صاحب زندہ ہیں۔ بڑے حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب،ان کے بعد مولانا لطف الرحمان صاحب،اوران کے بعد مولانا حکیم عبدالمنان صاحب، یہ تینوں بزرگ اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں،ان تینوں بزرگوں نے اس علاقے میں بہت کام کیا،اوراپنے نامور والدمحترم کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔

مولانا حکیم عبدالمنان صاحب پوہدی میں سرکاری اسکول کے استاذ تھے،مولانا کے دل میں دین کی سچی تڑپ اور مسلمانوں کی بہی خواہی کی پرجوش لگن تھی، وہ دن رات ایک کرکے مسلمان عوام میں دینی بیداری کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے،مگرانہیں محسوس ہوا کہ ان بڈھے طوطوں کو پڑھانا بڑا مشکل ہے،توان کے نورِفراست نے یہ راستہ دکھایا کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے ایسا ادارہ قائم کرنا چاہئے جو سرکاری مداخلت سے پاک ہو، چنانچہ انہوں نے مدرسہ عربیہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی،اور خاموشی کے ساتھ کام شروع کردیا،اللہ تعالی نے انہیں چند مخلص اور باہمت رفقا بھی عطا فرمائے،جن کی کوشش سے یہ مدرسہ خدمت کے میدان

میں آگے بڑھتا رہا، حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب اور حاجی محمد حسین صاحب ان کے مخلص لوگوں میں تھے، جن کی کوششوں اور کاوشوں نے مدرسہ کو پروان چڑھایا، اس مدرسہ میں اللہ تعالی نے بہت برکت عطا فرمائی، یہاں کے متعدد طلبہ اچھے عالم وفاضل بن کر دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اس پورے علاقے میں حضرت مولانا محمد عارف صاحب اوران کے صاحبزادگان نیز مولانا سراج احمد صاحب امروہوی کی مساعی جمیلہ کے آثار وثمرات نمایاں ہیں، کم پڑھے لکھے لوگ ہیں، کم مالدار ہیں، مگر دینی جذبہ، تواضع اور اکابر کے احترام سے ان کے قلوب معمور ہیں۔

جس وقت ہم لوگ مدرسہ میں داخل ہوئے تو طلبہ واساتذہ تو خیر ملاقات اور مصافحہ کے لئے دوڑے ہی، ایک اور عجیب بات مشاہد میں آئی، جس کا تجربہ یوپی اور بہار کے مدرسوں میں کم از کم مجھے تو کبھی نہیں ہوا، کہ ان طلبہ واساتذہ کے ساتھ مدرسہ کے دونوں باورچی ہاتھ دھوکر مصافحہ کے لئے لپکے چلے آرہے ہیں، اسی طرح راج مستری اوران کے ساتھ کام کرنے والے مزدور جو کہ سب مسلمان تھے، اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر ملاقات کے لئے دوڑے ہوئے آئے، یہ تجربہ میرے لئے بالکل نیا تھا، اور پھر نماز کے اوقات میں یہ لوگ نماز میں بھی حاضر تھے، یہ ماحول انہیں بزرگوں کی برکت کا اثر ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد مولانا فیاض صاحب صدر المدرسین، دربھنگہ سے تشریف لائے، انہوں نے بتایا کہ میں بھی اور مولانا حبیب اللہ صاحب بھی بس اسٹیشن پر مغرب کے پہلے سے موجود تھے، جب ساڑھے سات بجے تک آپ لوگ نہیں آئے تو خیال ہوا کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے، اب بس کا وقت بھی نکل چکا ہے، مولوی حبیب اللہ صاحب کو مدھوبنی جانے والی آخری بس ملی، وہ مدھوبنی چلے گئے، اور میں مدرسہ امدادیہ چلا گیا کہ حالات ایسے ہورہے تھے کہ بعد میں سواری ملنا مشکل ہوجاتا جیسا کم ہم لوگوں کے ساتھ بعد میں پیش آیا۔

چونکہ آج ہی سفر کرکے دھکہ کھاتے ہوئے آئے تھے اس لئے آج کا پورا دن ملاقاتوں میں اور تکان مٹانے میں صرف ہوگیا، ویسے مجھ پر تکان کا کوئی خاص اثر نہ تھا مگر حضرت ماسٹر صاحب نے غالبًا اسی خیال سے کوئی پروگرام نہ بنایا نہ بتایا، ہاں شام کو میں نے ماسٹر صاحب سے

درخواست کی کہ وہ معلومات جوانہوں نے حضرت مولانا سراج احمد صاحب علیہ الرحمہ کی سوانح حیات سے متعلق تحریری طور پر جمع کررکھے ہیں، مجھے دے دیں، تاکہ ان کا مطالعہ کر کے سوانح کا ایک خاکہ ذہن میں مرتب کرلوں، ماسٹر صاحب نے چند کاغذات اور ایک سفر نامہ اور ملفوظات کا مسودہ عنایت فرمایا، یہ معلومات مجھے اتنے کم محسوس ہوئے کہ ان کے بنیاد پر پوری کتاب کا خاکہ بنتا محسوس نہیں ہوا، میں نے عرض کیا کہ ان معلومات سے چند صفحے کا مضمون شائع کردیا جائے، ماسٹر صاحب نے اس کو پسند فرمایا، رات سے لے کر صبح تک میں اپنے ذہن میں ترتیب سوانح کا نقشہ بناتا رہا اور بگاڑتا رہا، اب کچھ کچھ صاف خطوط ذہن پر نمایاں ہونے لگے تھے۔

۱۰/ربیع الاول ۱۴۱۱ھ:

آج فجر کی نماز کے بعد وعظ ہوا، وعظ کی بنیاد اس مشہور حدیثی دعا پر رکھی گئی جو حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ کو تلقین فرمائی تھی کہ:

عن معاذ بن جبل ان رسول الله ﷺ اخد بیده یوماً ثم قال: یا معاذ! والله انی لاحبک فقال له معاذ بابی انت وامی انا والله احبک قال اوصیک یا معاذ! لا تدعن فی دبر کل صلوة ان تقول اللهم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک. (رواہ ابوداؤد ونسائی والترغیب والترہیب ج۲ص۴۵۴)

اے معاذ! مجھے تم سے محبت ہے، لہٰذا تم نماز کے بعد یہ کبھی نہ ترک کرنا "اَللّٰھُم اَعِنِّی عَلٰی ذِکرِکَ وشُکرِکَ وحُسنِ عِبَادَتِک". اے اللہ! آپ اپنی یاد پر، اپنے شکر پر اور حسن عبادت پر میری مدد فرمایئے۔ اس وعظ میں حدیث کے جز یعنی **یامعاذ! انی احبک** کی مفصل تشریح کی گئی، اور قدرے ذکر پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

وعظ سے فارغ ہو کر سوانح کے لئے فراہم شدہ معلومات کا از سر نو جائزہ لیا، گہری نظر سے ان کا مطالعہ کیا، پھر اس کی بسم اللہ کردی۔

حضرت ماسٹر صاحب نے ایسا نظم کر دیا تھا کہ میرا وقت صبح سے ظہر کے وقت تک بالکل فارغ رہے، اس وقت نہ ملاقاتیوں کا ہجوم ہوتا نہ کوئی اور کام ہوتا، بس صبح قرطاس وقلم کی محفل ترتیب دیتا اور بارہ بجے تک ناشتہ کا تھوڑا سا وقفہ مستثنی کر کے مسلسل اسی محفل میں جما رہتا، بارہ

بجے یہ محفل برخاست کردیتا۔آج ابتداء کردی ،لیکن خدشہ یہ تھا کہ میرا اندازتحریر نہ جانے ماسٹر صاحب کو پسند آئے یانہ آئے؟۔

اسی لئے دوتین صفحے جو آج لکھے گئے ،وہ ماسٹر صاحب کو سنا دیئے گئے،انہوں نے میرے انداز وقیاس سے زیادہ پسندفرمایا،اورتحسین کی ،پھرتو طبیعت کھل گئی،ظہر کی نماز کے بعد کھانے کا اورقدرے قیلولہ کا معمول قرار پایا،عصر کےقبل سوانح کے سلسلے میں مزید غور فکر کرتا رہتا، کوئی اور عارضی کام پیش آجا تا تو اس کی انجام دہی میں مشغول ہوجاتا۔

بعدنمازعصر حضرت ماسٹر صاحب نے بتایا کہ یہاں سے قریب ایک جگہ برہم پورہ ہے، آج مغرب کی نماز کے بعد وہاں پروگرام ہے،اس لئے مغرب کی نماز وہیں چل کر پڑھی جائے، تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر یہ گاؤں ہے،پوہدی سے ہم لوگ اس انداز سے چلے کہ مغرب کے پہلے وہاں پہونچ جائیں۔

یہ راستہ کھیتوں کے درمیان مینڈھوں پر تھا،نیچی اونچی مینڈھوں پر چڑھتے اترتے ٹھیک اذانِ مغرب کے وقت وہاں پہونچے،میرا خیال تھا کہ نماز کے بعد مسجد میں مصلیوں کے سامنے کچھ بیان کرنا ہوگا،مگر وہاں تو لوگوں نے اچھا خاصا جلسہ منعقد کررکھا تھا،تھوڑی دیر مولوی ابوالخیر سلمہ نے گفتگو کی،اس کے بعد میں نے وعظ سننے کےفوائداوراہمیت، نیز شادی بیاہ کی تباہ کن رسوم اوراللہ اوررسول کی اطاعت پر مفصل کلام کیا۔تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وعظ ہوا،اس گاؤں میں طبیعت بہت لگی،اچھے لوگ معلوم ہوئے،وعظ کے بعد عشا پڑھی گئی،اور کھانا کھا کر وہاں سے واپسی ہوئی۔

۱۱/ربیع الاول:

آج بھی بعدنماز فجر وعظ ہوا،آج ذکر کے موضوع پر قدرے تفصیل سے کلام کیا گیا۔ سوانح کی تسوید کا کام آج زیادہ ہوا،اندازہ ہوا کہ معلومات کاغذ پر کم محسوس ہورہے ہیں،مگر حضرت ماسٹر صاحب جو حضرت امروہوی کے معتمد خاص ہیں،ان سے بہت کچھ معلومات فراہم ہوجائیں گے۔بارہ بجے تک یہ مشغولیت رہی۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ موضع سسونی جو پوہدی سے کہنے کوتو ملا ہوا ہے مگر میری قیام

گاہ سے کم ازکم ڈیڑھ کیلومیٹر ضرور ہے، وہاں کھانا کھانا ہے، اور اس سے لگی ہوئی بستی سبھو لی میں وعظ کہنا ہے۔ میرے عزیز دوست مولوی عبدالشکور سلمہ جو مدرسہ قاسم العلوم زمانیہ غازی پور میں استاذ شعبہ عربی ہیں، مجھ سے الہ آباد میں پھر غازی پور میں پڑھا ہے، اچھی صلاحیت کے عالم ہیں، سسونی کے رہنے والے ہیں، بہت عرصہ سے ان کا بھی اصرار تھا کہ ایک بار ادھر کا سفر ضرور ہو، اب جب میرا پروگرام بنا تو اتفاق سے وہ کلکتہ گئے ہوئے تھے، کلکتہ ہی میں انہیں میرے پروگرام کی اطلاع ملی، تو از راہ سعادت مندی مدرسہ نہ جا کر گھر چلے آئے، اور برابر میرے ساتھ رہے۔ آج انہوں نے اپنے گھر ہمارے پورے قافلے کی دعوت کر رکھی ہے، ان کا گاؤں چونکہ بہت چھوٹا ہے، اور سبھو لی اس کے مقابلہ میں بڑا گاؤں ہے، اس لئے وعظ کا پروگرام سبھو لی میں رکھا ہے کہ سسونی کے لوگ بھی وہاں جا کر شریک ہو جائیں گے۔ پوہدی سے نماز مغرب پڑھ کر چلے تھوڑی دیر سسونی میں رکے، وہاں چائے پی، پھر رفقا سبھو لی چلے گئے، وہاں مولوی مہتاب عالم صاحب نے تقریر کی، اسی روز میرے ایک عزیز دوست مولوی مجاہد حسین سلمہ سیتا مڑھی سے آ گئے تھے، انہوں نے تقریر شروع کی تھی کہ میں پہونچ گیا، وقت کے زیادہ ہو جانے کے خیال سے انہوں تقریر موقوف کر دی، پھر میں نے آخرت کی اہمیت اور **الدنیا مزرع الآخرۃ** کے تصور کی شرح کرتے ہوئے دنیا کی حیثیت کیا ہے؟ اس پر مفصل کلام کیا، مجمع خاصا تھا مگر ذرا بے ترتیب۔

نماز عشا وہیں ادا کی، پھر کھانا مولوی عبدالشکور صاحب کے یہاں آ کر کھایا، رات مدرسہ میں گذاری۔

۱۲؍ربیع الاول:

آج صبح سو کر اٹھا تو سر میں تکلیف محسوس ہوئی جو تھوڑی دیر میں شدت اختیار کر گئی، سوچا کہ آج صبح کا وعظ موقوف کر دوں مگر اس سے لوگوں کو تشویش ہوتی، اس لئے معمول کے مطابق وعظ ہوا، آج بھی حدیث مذکور کے پہلے جز یعنی ذکر کی ایک دوسرے عنوان سے تفصیل کی گئی۔

سوانح کی ترتیب کا کام ایک حد تک ہو چکا ہے، حضرت امروہوی کے طریقۂ اصلاح و تربیت پر لکھنا تھا، میں نے جناب ماسٹر صاحب سے عرض کیا کہ آپ کی حضرت سے کافی مراسلت

ہوئی ہوگی، اگر وہ محفوظ ہوں تو مجھے عنایت فرمادیں، انہوں نے از راہ عنایت ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۹ء تک کے تمام خطوط میرے حوالے کردیئے، سر میں شدید درد کے باوجود میں نے پورے ذخیرے کا مطالعہ کرڈالا، اور جو چیزیں سوانح میں لانے کے مناسب تھیں، انہیں منتخب کرلیا، آج تحریری کام بالکل نہ ہوا، درد کی شدت میں حرکت مشکل تھی، مگر بحمد للہ مطالعہ جاری رہا۔

رات کا پروگرام آج پوہدی مدرسہ کے اندر ہی تھا، مغرب کی نماز کے بعد آس پاس کی آبادیوں سے بھی لوگ آگئے، آج چونکہ بارہ ربیع الاول ہے، فطری طور پر ذہن سیرت نبوی ﷺ کے بیان کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ سیرت پر بیان ہوا۔

۱۳؍ربیع الاول:

آج رات میں حافظ آفتاب عالم سلمہ کے خسر کے والد کا انتقال ہوگیا، اچھے آدمی تھے، نماز کا بہت اہتمام رکھتے تھے، عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، کوئی بات نہ تھی، رات میں اچانک کوئی تکلیف ہوئی، اور نہایت سہولت سے کلمہ پڑھتے ہوئے جان دیدی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں۔ چونکہ فجر میں ان کے انتقال کی اطلاع ملی، اس لئے آج کے وعظ میں شکر کے متعلق بیان تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ صبر کی توضیح وتشریح بھی اس میں شامل کردی، تاکہ اہل بیت کے سامنے تسلی کا مضمون آجائے، نماز جنازہ بعد نماز ظہر ادا کی گئی۔ سوانح کی ترتیب کا کام آج نسبتاً کم ہوا، کیوں کہ آج کچھ محترم ومعزز حضرات بغرض ملاقات تشریف لائے تھے، جامعہ رحمانیہ سپول کے صدر مدرس حضرت مولانا ہارون رشید صاحب اور ایک دوسرے بزرگ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے کرم فرمایا، کچھ دیر ان بزرگوں سے گفتگو رہی، بہت اچھے اور متواضع لوگ تھے۔ مسودہ کا کچھ حصہ میں نے سنایا، مولانا ہارون رشید صاحب جو خود بھی تالیفی وتصنیفی ذوق اچھا رکھتے ہیں، انہوں نے بہت تحسین کی۔

بعد نماز ظہر دو بزرگوں سے ملاقات ہوئی، مولانا سعد اللہ صاحب یہ حضرت مولانا محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ کے پوتے اور حضرت مولانا عبد الرحمان صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ جامعہ رحمانیہ سپول میں عربی کے استاذ ہیں، ذی استعداد عالم ہیں، لیکن بہت منکسر ومتواضع اور خاشع وخاضع ہیں۔ دوسرے مولانا صفی الرحمان صاحب عرف ممتاز بابو، یہ بھی حضرت مولانا

محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ کے پوتے ہیں،مولانا حکیم عبدالمنان صاحب کے فرزند ہیں،ان حضرات سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔میری خواہش تھی کہ اس سفر میں ہرسنگھ پور جوان حضرات کا گاؤں ہے،دیکھ لیتا،اور حضرت مولانا محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے نامور صاحبزادگان کی مزارات پر فاتحہ پڑھ لیتا،ممتاز بابو نے بھی پروگرام بنا رکھا تھا،مگر اب مجبوری ظاہر کررہے تھے کہ گاؤں کے کنارے جوندی ہے،اس میں پانی زیادہ آ گیا ہے،اب جانا ممکن نہیں رہا،افسوس کر کے رہ گیا کہ اب کیا صورت ہوسکتی ہے؟۔

آج شام کا پروگرام مرزا پور کا ہے،یہ گاؤں پوہدی سے ۵،۶ کلومیٹر دور ہے،حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب کا وطن ثانی ہے،ماسٹر صاحب کا آبائی وطن پوہدی کے پورب پندرہ سولہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں کھور مدن پور نامی ہے،وہاں سیلاب کی طغیانی ہر سال گھروں کو اجاڑ دیا کرتی تھی،اس کے سبب ماسٹر صاحب نے مرزا پور میں مکان بنالیا تھا،مگر بعد میں ایک باندھ کے ذریعہ کھور کا علاقہ کسی قدر محفوظ کردیا گیا تو ماسٹر صاحب مرزا پور سے کھور منتقل ہوگئے (اب بھی وہاں ان کی زمین وجائداد نیز مکان ہے،مگر اس میں اس وقت ان کی منجھلی لڑکی قیام پذیر ہے،جس کی شادی وہیں ہوئی ہے) طے یہ کیا گیا کہ عصر سے پہلے بیل گاڑی سے جس میں ٹائر کے پہیئے لگائے جاتے ہیں (جسے وہاں کی زبان میں ٹائر گاڑی کہتے ہیں) روانگی ہو،عصر کی نماز راستے میں ایک جگہ بگھیلا نامی ہے،وہاں مدرسہ میں پڑھی جائے،اور مغرب کی نماز مرزا پور میں ادا کی جائے،مگر ٹائر گاڑی کے آنے میں دیر ہوئی،اس لئے قدرے تاخیر سے روانگی ہوئی،ٹائر گاڑی میں مَیں ،ماسٹر صاحب،مولانا سعد اللہ صاحب،مولوی عبدالشکور صاحب،مولوی ابوالخیر صاحب اور مولوی ہاشم سلمہ سوار ہوئے،مولوی مہتاب عالم کو سائیکل دیدی گئی کہ وہ ٹائر گاڑی سے وحشت زدہ تھے،پوہدی سے باہر نکل کر ایک بڑے تالاب کے کنارے گاڑی روک کر عصر کی نماز ادا کی گئی،نماز کے بعد پھر گاڑی روانہ ہوئی،راستہ کیا تھا نشیب وفراز کا مجموعہ تھا،ہر قدم پر گاڑی نیچے اوپر ہوتی تھی،بعض جگہ چھوٹی موٹی نہریں بھی پار کرنی پڑیں،بیل عرصہ کے بعد گاڑی میں جوتے گئے اور کچھ بیمار بھی تھے،بار بار پتلا پاخانہ کررہے تھے،اور گاڑی بان کو اس کی کچھ زیادہ فکر نہ تھی،گاڑی کے کھنچنے میں جو دقت تھی وہ تھی ہی،بیلوں کے مسلسل پاخانوں نے اور پیچیدگی پیدا

کردی، گاڑی بان سے احتیاط کی تاکید برابر کی جاتی رہی، مگر ہوا یہ کہ ایک مرتبہ ایک بیل نے پاخانہ کرتے ہوئے جودم ہلائی ہے تو میں، ماسٹر صاحب اور مولانا سعد اللہ صاحب ٹھیک اس کی زد میں آ گئے ۔ چنانچہ ہم تینوں کے کپڑے خراب ہو گئے، مولانا سعد اللہ صاحب نے فرمایا کہ فقہا نے جو تسہیلات کتابوں میں لکھی ہیں ان کی قدر ایسے ہی مقامات میں ہوتی ہے، خیر صاحب گرتے پڑتے بکھیلا مدرسے پر ایسے وقت پہونچے جب کہ مغرب کی اذان ہو رہی تھی، میرے کپڑے زیادہ خراب ہو گئے تھے، اس لئے مجھے کپڑے تبدیل کرنے کی ضرورت تھی، اور کپڑے ساتھ لئے نہیں گئے تھے، مدرسہ کے استاذ جناب مولانا اسلام الدین صاحب نے اپنے کپڑے عنایت فرمائے، انہیں پہن کر مغرب ادا کی، اور دوسرے صاحبان نے اپنے اپنے کپڑے دھو لئے ۔ یہاں ہم لوگوں کے آمد کی اطلاع پہلے سے تھی، اس لئے یہ حضرات چائے وغیرہ تیار کر کے انتظار ہی میں تھے ۔ اس جگہ کا پانی زمین سے بہت گرم نکلتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آگ پر گرم کیا گیا ہو، پوہدی میں بھی پانی گرم ہوتا ہے مگر یہاں اس سے کہیں زائد ہے، معلوم ہوا کہ پانی میں گندھک کے اثرات زیادہ ہیں، اور غالباً یہ بات صحیح ہے، میں جب پوہدی آیا تھا تو بدن پر خارش کا خاصا اثر تھا مگر دو ہی روز میں سارا جسم صاف ہو گیا ۔ نماز مغرب پڑھ کر مولوی ہاشم سلمہ سائکل لے کر پوہدی چلے گئے، تاکہ میرے لئے اور ماسٹر صاحب کے لئے کپڑے لائیں، اور ہم کچھ دور پیدل چلے، ایک چھوٹی سی ندی پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا (یہ جگہ بکھیلا گھاٹ کے نام سے موسوم ہے) اسے پار کر کے ایک رکشہ منتظر تھا، ماسٹر صاحب نے مجھ کو اور مولانا سعد اللہ صاحب کو رکشہ پر بٹھا دیا اور خود پیدل چلے، ندی سے گاؤں کا فاصلہ ڈیڑھ دو کلومیٹر تھا، راستہ تو ویسا ہی تھا جیسا اس علاقے میں عام طور پر پایا جاتا ہے، مگر رکشہ والا ہوشیار تھا، اس نے بخیریت گاؤں تک پہونچا دیا، وہاں توبہ واستغفار اور رحمت خداوندی کے موضوع پر وعظ ہوا، سود خوری کی مذمت بھی بیان کی گئی، رات وہیں گزاری گئی ۔

۱۳ / ربیع الاول:

بعد نماز فجر پھر وعظ ہوا، اس میں صحبتِ نیک کی ترغیب دی گئی، صبح حضرت ماسٹر صاحب کے گرد پانی اور تیل لے کر لوگوں نے ہجوم کیا کہ وہ دم کریں، ماسٹر صاحب انہیں سہولت

کے ساتھ نمٹاتے رہے، ریلا میری طرف بھی بڑھتا تھا مگر حضرت ماسٹر صاحب عنایت وکرم سے نہایت لطف کے ساتھ روک دیتے تھے، حضرت موصوف نے میری راحت کا جس قدر اہتمام کیا ہے وہ میری حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ وہاں سے روانگی سے پہلے ایک کھپریل مکان میں جو بمنزلہ بیٹھک کے تھا، بیٹھے لوگوں نے بتایا کہ ۱۹۸۸ء میں جو عظیم زلزلہ آیا تھا اس میں آس پاس کے تمام مکانات منہدم ہوگئے تھے، کوئی مکان نہ بچا تھا، مگر یہ کھپریل کا کچا مکان جوں کا توں کھڑا رہا، صاحبِ مکان کہہ رہے تھے کہ اس جگہ جتنے علما اور بزرگان دین آئے ہیں سب کا قیام اسی مکان میں رہا ہے، مجھے یقین تھا کہ ان بزرگوں کی برکت سے یہ مکان جوں کا توں قائم رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہاں سے ماسٹر صاحب بذریعہ سائیکل اپنے اسکول کے لئے جو علی نگر میں ہے اور پوہدی کے قریب ہے، اور کئی روز کی تعطیل کے بعد کھلا تھا، روانہ ہوئے، اور مجھے اور مولانا سعد اللہ صاحب کو رکشہ پر بٹھا دیا، دھمسائن جو مرزا پور سے قریب ہے، وہاں مولانا سعد اللہ صاحب کو اپنے ایک عزیز کی عیادت کرنی تھی، ہم لوگ پہونچے تو ماسٹر صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے، مولانا کے عزیز نہایت شریف آدمی تھے، ان سے ملاقات کر کے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وعافیت بخشے۔ وہاں سے رخصت ہوکر ساڑھے گیارہ بجے قیام گاہ پر پہونچے۔

آج جمعرات ہے، سنیچر کو مدرسہ کھلنے والا ہے، پروگرام کچھ ایسا ہے کہ میرا سنیچر تک پہونچنا نظر بظاہر مشکل ہے، اس لئے خیال ہوا کہ مولوی مہتاب اور مولوی ابوالخیر کو روانہ کردوں کہ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے وقت پر مدرسہ پہونچ جائیں، مولوی مجاہد حسین کا ارادہ ہوا کہ ان دونوں حضرات کو اپنے یہاں لے جائیں، اس بنیاد پہ یہ تینوں ہم لوگوں سے پہلے پوہدی سائیکل سے آگئے تھے، جب ہم لوگ پہونچے تو یہ حضرات کھانا کھا رہے تھے، کھانا کھا کر یہ لوگ فوراً روانہ ہوگئے، سیتا مڑھی سے دوسرے دن یہ لوگ غازی پور کے لئے روانہ ہوجائیں گے، اور مولوی مہتاب عالم سنیچر کو مدرسہ پہونچ جائیں گے۔

آج تحریر کا کوئی کام نہ ہوسکا، ساڑھے گیارہ بجے قیام گاہ پر پہونچا، رات کی بیداری اور دن کے سفر نے بدن کو تھکا ڈالا تھا، آتے ہی سوگیا، ظہر کے وقت آنکھ کھلی، نماز ظہر کے بعد دیکھتا

ہوں کہ میرے عزیز دوست مولانا حبیب اللہ صاحب مدھوبنی سے آئے ہوئے ہیں، ان سے مل کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔

شہر سے متصل ایک جگہ بھوارہ نامی ہے، یہاں مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہیں، اور سب بنکر ہیں، میری مدرسی کی ابتدا بنارس جامعہ اسلامیہ سے ہوئی، وہاں بھوارا کا ایک کمسن سیدھا سادا خاموش اور بظاہر احوال نہایت غریب طالب علم قدوری کی جماعت میں پڑھتا تھا، اس کی خاموشی کی وجہ سے اس کی طرف خصوصی التفات نہ تھا، ایک دن اس نے سبق میں قدوری کی عبارت پڑھی، نہایت صاف اور شستہ اور صحیح! اب اس طالب علم کی طرف پہلی بار توجہ ہوئی، احوال دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ یہ بچہ یتیم ہے، ماں موجود ہے دو بھائی اس سے چھوٹے اور ہیں، اس کے خالو اس غریب خاندان کی کفالت کرتے ہیں، اور ماں اپنی قوتِ بازو سے کام لے کر خرچ کے انتظام میں حصے لیتی ہے، یہ معلوم کر کے طبیعت پر بہت اثر ہوا، میں نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا، پھر دوسرے سال میں غازی پور آ گیا، تو یہ طالب علم بھی آ گیا، اور یہاں سے دو سال پڑھ کر دیوبند چلا گیا، اس سے تعلق برابر قائم رہا، دیوبند سے فراغت کے بعد بھوارہ میں مدرسہ فلاح المسلمین میں تقرر کی بات ہوئی، میں نے غازی پور میں ضرورت کا ذکر کیا تو اس باوفا اور حوصلہ مند مولوی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا کہ مدرسہ فلاح المسلمین میں زیادہ تنخواہ کم از کم غازی پور کی دوگنی پر تقرر ہو رہا ہے، خاموشی سے مدرسہ دینیہ غازی پور میں قلیل تنخواہ پر کام شروع کر دیا، غالباً تین سال تک وہاں رہا، پھر مجھ سے گھر کے کچھ حالات بتائے، جس سے اندازہ ہوا کہ اب اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا ضروری ہے، نیز اب تک اپنا گھر نہ ہونے کی وجہ سے نکاح بھی نہیں کیا تھا، اب ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے، ضرورت ہے کہ گھر کی آبادی کا بھی سامان کیا جائے، چنانچہ میری اجازت کے بعد یہ گھر چلا گیا، نکاح کے معاملات میں برابر مشورہ لیتا رہا، ایک جگہ محلّہ میں ہی نکاح کی بات پختہ ہوگئی، اور نکاح کی تاریخ میری فرصت کی رعایت سے مدرسہ دینیہ کے امتحان ششماہی کے قریب متعین کی گئی، امتحان کے موقع پر ایک ہفتہ پہلے سے تیاری کے لئے اسباق بند ہوگئے، میں نکاح کی تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے بھوارہ پہونچ گیا، بہار میں شادیاں کیا ہوتی ہیں؟ خرافات کی طغیانی امنڈ پڑتی ہے، اس عزیز نے سب لوگوں سے صاف صاف کہہ دیا

کہ اس نکاح کے ذمہ دار مولانا ہیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوگا، میں نے ایک ہفتہ پہلے پہونچ کر مسلسل وعظ کا سلسلہ شروع کر دیا، جس کا اثر وہاں بہت اچھا پڑا، اور سادگی کے ساتھ نکاح کی تقریب انجام پا گئی۔ اس کے بعد پھر بار بار بھوارہ جانا ہوا، یہ اس جگہ کا پہلا طالب علم تھا، جو عالم بن کر آیا تھا، پھر تو اس نے طلبہ کا سلسلہ قائم کر دیا، اب اس جگہ بیسوں عالم تیار ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کی تعلیم میں بڑی برکت رکھی، یہ شخص اب بھی مجھ سے بالکل ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا پہلے تھا، جیسی ایک بیٹا اپنے باپ سے محبت رکھتا ہے۔ اس سابق طالب علم اور موجودہ عالم کو آپ نے پہچانا؟ یہی مولانا حبیب اللہ سلمہ ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم کے سائے میں رکھے، اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق بخشے۔

میرا ارادہ پہلے سے تھا کہ ایک روز کے لئے بھوارہ جاؤں گا، اسی غرض سے میں نے انہیں اطلاع کر دی تھی، وہ دربھنگہ بس اسٹیشن پر آئے تھے، مگر ہمارا قافلہ کافی دیر میں پہونچا اس لئے وہ واپس چلے گئے تھے، میں نے دربھنگہ میں صبح اسی روز ایک شخص کے ہاتھ ایک رقعہ بھیج دیا تھا مگر جن کے ہاتھ رقعہ بھیجا تھا انہوں نے باوجود پختہ وعدہ کے غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا، اور رقعہ نہیں پہونچایا، مولانا حبیب اللہ صاحب یونہی معلوم کرنے آ گئے تھے کہ میں پہونچا یا نہیں۔ اب میں بہت کشش وپنج میں پڑ گیا کہ وقت تو ختم ہو گیا، پوہدی ہی میں وقت زائد لگ چکا ہے، سنیچر کو یہاں سے روانگی ہوگی، اگر سنیچر کو بھوارہ پہونچا تو اتوار کو روانہ ہو بھی جاؤں تو مدرسہ دوشنبہ کو ہی پہونچ سکتا ہوں، مجھے دونوں کی خاطر عزیز تھی، یعنی حضرت ماسٹر صاحب کے بنائے ہوئے پروگرام کو بھی رد نہیں کر سکتا تھا، اور بھوارہ جانا بھی منسوخ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد پھر وہی رہی کہ سنیچر کو بھوارہ پہونچا جائے اور وہاں سے جتنی جلد ممکن ہو، مدرسہ کے لئے روانگی ہو جائے۔

آج رات کا پروگرام پوہدی سے تقریباً چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر لیل پور نامی بستی میں ہے، اس گاؤں میں حضرت ماسٹر صاحب تقریباً پچیس سال اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے ہیں، اس لحاظ سے اس گاؤں کو خصوصیت حاصل ہے، عصر کی نماز پڑھ کر ٹائر گاڑی سے جو لیل پور سے آئی تھی، بلکہ دو گاڑیاں آئی تھیں، قدرے تاخیر سے لیل پور کے لئے روانگی ہوئی، ایک گاڑی پر

حضرت ماسٹر صاحب اور مولانا سعداللہ صاحب اور یہ ناکارہ تین نفر بیٹھے، اور دوسری گاڑی پر مولانا حبیب اللہ، مولوی عبدالشکور، مولوی ہاشم سوار ہوئے۔ پوہدی سے نکلتے نکلتے سورج غروب ہوگیا، جہاں کل عصر کی نماز ادا کی تھی آج وہاں مغرب کی نماز ادا کی گئی، آج کی گاڑیاں اچھی تھیں، بہت آرام سے لیل پور پہونچ گئے، آج طبیعت پر کسی قدر گرانی تھی، میری خواہش پر مولانا حبیب اللہ صاحب کا وعظ ہوا، اور بہت اچھا ہوا، پھر مولانا سعداللہ صاحب نے وعظ فرمایا، بالکل سیدھے سادے انداز میں، پرانے بزرگوں کے طرز پر، معاشرہ میں پھیلی ہوئی خرابیوں پر خوب انگلی رکھی، مجھے ان کا وعظ بہت پسند آیا، ان کے بعد میں نے تھوڑی دیر گفتگو کی، جس میں نیک صحبت کے فوائد اور اس کے ضمن میں بزرگوں کے احوال وواقعات بکثرت بیان کئے، آج کا پروگرام قدرے دیر تک چلا، بعد نماز عشا کھانا کھا کر چلنے کی تیاری ہوئی تو کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ رات یہیں گزار لی جائے، مگر ماسٹر صاحب نے میرے وقت اور راحت کی رعایت میں اسے منظور نہیں کیا، ان لوگوں نے ازراہِ محبت یہ تدبیر کی کہ اس وقت کوئی گاڑی واپس لے جانے کے لئے تیار نہیں ہے، ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ پاؤں میں بحمد اللہ جان ہے، یہ کہہ کر پیدل چل دیئے، ہم لوگ بھی ساتھ ہولئے، گاؤں سے نکلتے نکلتے بیل گاڑی آ گئی، اجالی رات تھی، چاند اپنے شباب پر تھا، چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی، موسم نہایت خوشگوار اور سہانا تھا، ہرے ہرے دھان کے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر گاڑی چل رہی تھی، اور ہچکولے کھا رہی تھی، تو عجیب لطف آ رہا تھا، کئی کلومیٹر کا راستہ باتوں باتوں میں کٹ گیا، بارہ بجے کے بعد مدرسہ میں پہونچے، تو دیکھا کہ ہمارے پرانے شناسا بزرگ حاجی محمد حسین صاحب اور ان کے عالم وفاضل بھتیجے مولانا نصیرالدین صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، ملاقات ہوتے ہی میں نے شکایت کی کہ اب جب واپسی کا وقت آ لگا ہے تو آپ تشریف لائے ہیں؟ کہنے لگے کہ مجھے کچھ معلوم ہی نہ تھا، کل رات میں معلوم ہوا تو آج بھاگا ہوا آیا ہوں، حالانکہ ان کا گاؤں بہت دور نہیں ہے، لیکن سیلابی ندیوں نے راستہ منقطع کر رکھا ہے، دس گھنٹے میں یہاں پہونچے تھے، ان حاجی صاحب سے زمانۂ قیام الہ آباد سے تعلق ہے، ان کے بھیجے ہوئے بہت سے طلبہ الہ آباد میں پڑھتے تھے، اس وقت یہ پوہدی بیلا کے مدرسہ میں مدرس تھے، ان کی کوششوں اور کاوشوں سے بہت سے علماء دین اور حفاظ

کرام تیار ہوئے ،اب یہ اپنے گاؤں دلدل میں رہتے ہیں،حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت ہیں،نہایت ذاکر وشاغل اور اوقات کے پابند خلیق اور ملنسار شخصیت ہیں، ان چچا بھتیجے سے مل کر طبیعت بہت مسرور ہوئی۔

۱۴/ربیع الاول:

آج صبح کی نماز کے بعد حدیث مذکورہ کے آخری جز ’حسن عبادت‘ پر مفصل کلام کیا،اور اسی پر حدیث کی تشریح کا سلسلہ ختم ہوا۔نماز کے بعد وعظ کے دوران ایک نوجوان پر نظر پڑی، جو نہایت صالح اور سراپا ذوق وشوق بنے ہوئے سن رہے تھے،وعظ کے بعد انہوں نے ملاقات کی اور بتایا کہ میں پٹنہ کا رہنے والا ہوں،حضرت ماسٹر صاحب کے خط سے اطلاع ہوئی کہ آپ تشریف لائے ہیں،تو میں فوراً آیا، یہ نوجوان حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی سے اصلاحی تعلق رکھتے ہیں، نام ان کا اطہر حسین ہے،دوسرے وقت انہوں نے بتایا کہ میں سوچ رہا تھا کہ حضرات صحابہ کے نماز کی کیا کیفیت ہوتی رہی ہوگی؟ اتفاق سے اس روز صحابہ کی نماز کی کیفیت کا تفصیلی بیان ہوا، وہ نوجوان بہت خوش ہوئے تھے کہ جو سوال ان کے ذہن میں تھا اس کا مفصل جواب مل گیا۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ جمعہ کی نماز سے پہلے وعظ ہوگا ، پھر اس کے بعد کوئی پروگرام نہیں ہے،سوانح میں جس قدر کام باقی رہ گیا ہے حتی الامکان اسے مکمل کیا جائے،صبح بھوارہ کے لئے روانگی ہوگی ، میں اسی خیال سے لکھنے میں منہمک ہوگیا، دس بجے کے قریب ماسٹر صاحب نے آکر بتایا کہ ممتاز بابو نے کہلایا ہے کہ ندی کا پانی اتر گیا ہے،اب ہرسنگھ پور آنا ممکن ہے،اس لئے سابق پروگرام میں تبدیلی کردی گئی ہے کہ عصر کے پہلے یہاں سے روانگی ہو،علی نگر میں عصر کی نماز پڑھ کر ہرسنگھ پور میں مغرب کی نماز پڑھی جائے ،اور وہاں وعظ ہو، فجر کی نماز کے بعد بزرگوں کی مزارات پر حاضری دی جائے ،اور پھر علی نگر آکر بس سے دربھنگہ اور وہاں سے بھوارہ روانگی ہو، مولوی حبیب اللہ صبح ہی بھوارہ روانہ ہوگئے۔

جمعہ کی نماز سے پہلے اختتامی وعظ ہوا،اور جمعہ کی نماز کے بعد کھانے سے فارغ ہوکر پھر میں لکھنے مشغول ہوگیا،اور اس میں اتنا انہماک ہوا کہ مجھے وقت کا خیال ہی نہ رہا،اور ماسٹر

صاحب نے بھی کچھ نہ کہا،عصر کا وقت ہوا تو سب سامان سمیٹا جانے لگا،اب عصر کے بعد روانگی ہوگی،مولوی عبدالشکور سلمہ نے سفر میں ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا، میں نے انہیں ہرسنگھ پور جانے سے روک دیا کہ کل وہ علی نگر بس سے آجائیں اور ہم لوگ پکڑی نامی جگہ سے سوار ہوں گے، چنانچہ وہ رک گئے۔

حاجی محمد حسین صاحب اور دوسرے صاحبان پہلے ہی ہرسنگھ پور کے لئے روانہ ہوگئے، میں اور مولانا سعداللہ صاحب رکشہ سے روانہ ہوئے، اور ماسٹر صاحب سائیکل سے ابھی گاؤں ہی کا راستہ طے کرر ہے تھے کہ دو موٹر سائیکلیں آئیں، جنہیں ممتاز بابو نے بھیجا تھا، میں نے مولانا سعداللہ صاحب کو ایک موٹر سائیکل پر اور مولوی ہاشم کو دوسری پر بٹھا دیا، اور رکشہ پر ماسٹر صاحب اور میں دونوں بیٹھے، میرا مقصد یہ تھا کہ راستہ لمبا ہے، ماسٹر صاحب سے اطمینان سے کچھ باتیں کرنے کا موقع ملے گا، نیز آج جو کچھ لکھا ہے اسے سنا بھی دوں گا۔

ہمارا رکشہ پکڑی کے قریب پہونچا تھا کہ دونوں موٹر سائیکل والے دوبارہ ہم لوگوں کو لینے کے لئے آگئے، چنانچہ بقیہ راستہ موٹر سائیکل سے طے ہوا، ہرسنگھ پور گاؤں سے متصل ایک چھوٹی سی ندی ہے، جس میں اس وقت گھٹنے تک پانی تھا، اسے عبور کر کے گاؤں میں پہونچے، مغرب کی نماز ہوچکی تھی، دو تین آدمی اور بچھڑے تھے، سب نے مل کر جماعت کی، پھر حضرت مولانا عارف صاحب قدس سرہ کے درِ دولت پر حاضری دی، تھوڑی دیر کے بعد جلسہ شروع ہوا، جلسہ گاؤں کے مکتب میں ہور ہا تھا، میں حضرت مولانا کے دراقدس پر لیٹا کارروائی سن رہا تھا، مولانا سعداللہ صاحب تعارفی کلمات ارشاد فرمار ہے تھے، ان کے کلمات کو میں یہاں تحریر کروں کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا، مگر ان کا میرے دل پر اتنا اثر ہوا کہ بے اختیار آنکھیں بہہ پڑی تھیں، اور بڑی مشکل سے میں نے گریہ کو ضبط کیا، اس وقت کئی لوگ میرے پاس موجود تھے، اس تأثر کا تقاضہ ہے کہ اسے نقل کردوں خواہ اس سے اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی پھبتی ہی سننی پڑے، لیکن محض اس ڈر سے اتنی قیمتی بات کو میں کھونا نہیں چاہتا، اور میری نیت اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ کسی صاحب دل کے منہ سے اگر آمین ادا ہوجائے گی تو میری نجات کا ذریعہ میسر آجائے گا، اور یہ بھی بتاتا چلوں کہ میرے بعض دوستوں نے اسٹیج پر میری تعریف کے پل باندھ

دیئے تھے مگر مجھے اس سے کچھ دلچسپی نہیں ہوئی، میں سوچتا رہا کہ یہ تیر ہوا میں چلائے جارہے ہیں، ان کا نشانہ کوئی نہیں، مگر جو کچھ میرے بزرگ حضرت مولانا سعداللہ صاحب نے فرمایا وہ ٹھیک دل میں ترازو ہوگیا، اوراب بھی جب سوچتا ہوں تو تڑپ جاتا ہوں، انہوں نے فرمایا کہ:

میں ....کی تعریف نہیں کروں گا، کیوں کہ حکم یہ ہے کہ اگر تعریف کرنی ہوتو منہ پر نہ کرو، بلکہ پیٹھ پیچھے کرو، اوراگر کوئی برائی ہوتو پیٹھ پیچھے نہ کرو بلکہ سامنے کرو، اوراس غرض سے کرو کہ اس کی اصلاح ہوجائے، لیکن اتنا کہوں گا کہ میں تین روز سے ....کے ساتھ ہوں، قرآن میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ " **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**"یعنی اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں، اورحدیث میں آیا ہے کہ" **العلماء ورثۃ الانبیاء**" علما انبیاء کے وارث ہوتے ہیں، اورانبیاء کی وراثت مال نہیں ہے، وہ علم ہے، میں تین دن سے ....کے ساتھ ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ .....قرآن کی اس آیت اور حدیث کے اس ارشاد کے مصداق ہیں، ان میں وہ باتیں موجود ہیں، جن کا قرآن کی آیت اور حضور کے ارشاد میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ مولانا نے فرمایا ہے ان کا حسن ظن ہے، ورنہ میرا اس آیت اوراس حدیث کا مصداق نہ ہونا بالکل واضح ہے، لیکن مجھے اس کی حرص ضرور ہے کہ یہ صفات کسی طرح اس بے مایہ کو حاصل ہوجائیں، گو کہ یہ تمنا تمنائے خام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، کیوں کہ جب اپنی کاہلی سستی اور پست ہمتی اورتن آسانی پر نگاہ پڑتی ہے تو محال معلوم ہوتا ہے کہ ان صفات سے کبھی کسی وقت بھی متصف ہوسکوں گا۔ لیکن

با کریماں کارہا دشوار نیست

اسی دوران گاؤں کے ایک بزرگ کا خط آیا، نہایت خوشخط اور پاکیزہ! اول وہلہ میں یہ سمجھا کہ کسی قدیم بزرگ کی یادگار ہے، نیچے دستخط صاف پڑھا نہیں جارہا تھا، "حسین" سمجھ میں آرہا تھا، میں نے خیال کیا کہ بزرگوں کا خاندان ہے، ممکن ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہ کی کوئی یادگار تحریر ہو، جسے بغرض زیارت مجھے ممتاز بابو دے رہے ہوں، ابتدائی سطریں پڑھ کر بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس خط کا مخاطب میں ہی ہوں، پورا خط پڑھ گیا تب میں چونکا کہ میرے نام خط ہے، ممتاز بابو نے بتایا کہ ایک معمر بزرگ جو اس وقت تقریباً

معذور ہیں، انہوں نے آپ کے نام لکھا ہے، خط کے انداز اور طرز تخاطب سے بہت متأثر ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا کہ دیکھ تیری خوش نصیبی ہے کہ تجھے بزرگ حضرات کس کس طرح یاد کررہے ہیں، اگر اب بھی اپنی سرکشی وغفلت، بے ہودگی اور لغویات سے نہ باز آیا تو تف ہے تجھ پر، پھر حق تعالی سے مناجات کی کہ پروردگار! تجھ سے بہتر کون میری حقیقت جان سکتا ہے، تو میرے ناگفتہ بہ احوال کو بھی جانتا ہے، اوران بزرگوں کے حسن ظن سے بھی واقف ہے، اور تو اس پر قادر ہے کہ اس گندے اور لاغی انسان کو واقعی انسان اور حقیقی مسلمان بنادے، تو علیم وخبیر ہے۔

یظن الناس بی خیراً وانی لشر الناس ان لم تعف عنی

اس خط کو میں نے حفاظت سے رکھ لیا، ناظرین اسے ملاحظہ فرمالیں، اور اس سیاہ کار کے حق میں دعا فرمائیں۔

محترم ومکرم بندہ! السلام علیکم

ہم ناکاروں کو بڑی مسرت ہے کہ آپ تبلیغ دین کے عزم سے ہم نااہلوں کی بستی میں قدم رنجہ فرمارہے ہیں، اس ضعیف وناتواں کی جانب سے التماس ہے کہ وعظ ونصائح میں قرآن پاک کی تلاوت کی کمی پر اور ناتوجہی پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالیں گے، میرے خیال ناقص میں قرآن پاک سے ناتوجہی ٹیپ رکارڈنگ اور ٹی وی اور ریڈیو جیسے باجے کی ایجاد اور مسلمانوں کو اس سے دلچسپی کے باعث ہے۔ دوسری التجا یہ ہے کہ تِلک کی بھیانک رسم ورواج پر بھی شرع کی روشنی میں ارشاد ونصیحت فرمائیں گے۔ والسلام

ملتمس احقر امداد حسین عفی عنہ

چنانچہ ہرسنگھ پور کے وعظ میں اس حکم کی تعمیل کی گئی، اوران بزرگ کی خواہش اور حکم کی برکت اور یہاں کے بزرگوں کے روحانی اثرات تھے کہ بقول بعض بزرگوں کے یہاں کا وعظ ہر جگہ سے مؤثر اور عمدہ رہا، اس گاؤں کی فضا پر اور لوگوں پر بزرگوں کے آثار وبرکات کا بہت احساس ہوا، اکثر لوگوں پر دین داری کا نور نظر آیا، ملنے اور بات کرنے میں تواضع اور انکساری کا غلبہ۔ طبیعت بہت متأثر ہوئی۔

وعظ کے بعد عشا کی نماز ہوئی، پھر کھانا کھا کر تھوڑی کے دیر کے بعد سو گئے، چونکہ رفقا

میں اکثر لوگ ذاکر وشاغل تھے اس لئے دو بجے رات ہی سے خانقاہ کا سماں بندھ گیا،تہجد ذکر اور گریہ وزاری کا ماحول پیدا ہوگیا۔

۱۵/ربیع الاول:

صبح کی نماز پڑھ کر حضرت ماسٹر قاسم صاحب مدظلہ کی رہبری میں حضرات اکابر کی مزارات کی زیارت کے لئے چلے،قبرستان آبادی سے قدرے فاصلے پر ہے،عید گاہ کے دروازے کے قریب رات کی رانی کا شاداب اور پھیلا ہوا درخت ہے،اسی کے سائے میں چار بزرگ آرام فرما ہیں،حضرت مولانا محمد عارف صاحب علیہ الرحمہ والد محترم ہیں،اور حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب ،حضرت مولانا لطف الرحمان صاحب اور حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب علیہم الرحمۃ صاحبزادگان آس پاس ہیں،قبریں بالکل خام اور سنت کے مطابق ہیں،ہری ہری گھاسوں نے چاروں قبروں کو ڈھک دیا،لوگ کہہ رہے تھے کہ جب اس درخت پر پھول آتے ہیں تو سفید پھولوں کی چادر بچھ جاتی ہے،اس جگہ اس درجہ سکون وطمانینت محسوس ہوئی کہ دل گلاب کی طرح کھل اٹھا،بے حد انس محسوس ہوا،اور بالکل سنت کے مطابق قبریں دیکھ کر طبیعت کھل گئی،نہ اونچی پختہ قبریں،نہ قبروں کے سرہانے خوشنما کتبے،نہ کوئی چراغ اور اگربتی۔ بس ایک سادگی سی سادگی،اور اس پر برستی ہوئی لطف وکرم اور طمانینت وسکون کی بارش! کافی دیر تک وہاں کھڑے رہنے کی سعادت نصیب ہوئی،اور جب چلے تو بزرگوں کی محبت اور شریعت کی عظمت سے دل معمور تھا،اب ناشتہ کرکے واپسی کی تیاری ہے،سفر کی ایک قسط ختم ہورہی ہے، لیکن ٹھہریئے،ان بزرگ سے ملاقات کرنی ہے جن کا رقعہ رات ملا تھا،میں نے ممتاز بابو سے کہا کہ اس وقت چلیں اور صاحب رقعہ سے ملاقات کرلیں،اس پر وہ انہیں اس کی اطلاع دینے چلے گئے،اورتھوڑی دیر کے بعد آئے کے امداد حسین صاحب خود تشریف لارہے ہیں،میں گھبرا گیا کہ ضعیف العمر اور معذور بزرگ کو آپ نے کیوں تکلیف دی؟ کہنے لگے کہ انہوں نے اصرار کیا ہے کہ مولانا سے ملنے مجھے جانا چاہئے،انہیں تکلیف نہیں دوں گا،ابھی ہم یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے تشریف لائے،میں لپک کر آگے بڑھا کہ ان سے ملاقات بھی کروں اور انہیں سنبھالوں بھی،ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ بینائی اتنی کمزور ہوگئی ہے

کہ آدمی کا وجود تو دیکھ لیتے ہیں مگر خدوخال نہیں دیکھ پاتے، مجھے حیرت ہوئی کہ بایں ضعیف العمری بلکہ نابینائی، رقعہ کیوں کر لکھ لیا؟ وہ بھی لالٹین کی روشنی میں۔ پوچھنے پر بتایا کہ اندازے سے لکھ لیتا ہوں، مگر پڑھ نہیں پاتا ہوں، تھوڑی دیر بیٹھے، پھر تشریف لے گئے، ناشتہ ہوا، اور میرے لئے رکشہ آ گیا، مجھے لوگوں نے زبردستی رکشہ پر بیٹھا دیا، ندی تک میں تنہا بیٹھ کر گیا، ندی میں بھی رکشہ سے اترنے نہیں دیا، لوگوں نے پیچھے سے سہارا دے کر رکشہ کو پار کر دیا، دوسری طرف جا کر حضرت ماسٹر صاحب بھی رکشہ پر بیٹھے۔ پکڑی پہونچنے کے بعد تھوڑی دیر میں لدی پھندی بس علی نگر سے آئی، مولوی عبدالشکور اس پر تھے، جگہ پہلے سے لی ہوئی تھی، آرام سے بیٹھ گئے، سب لوگوں سے آخری مصافحہ کیا اور دل میں محبت وانس کی سوغات لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا، ساتھ میں مولوی عبدالشکور صاحب، حاجی حسین صاحب، مولوی ہاشم اور پٹنہ والے اطہر حسین صاحب تھے۔

میں اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس پاک پروردگار نے اپنے صالح بندوں کی خدمت میں مجھے پہونچایا، اور ایک ہفتہ وہاں ان کی صحبت میں وقت بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اس دیار میں چند خاص باتیں مجھے محسوس ہوئیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ وہاں کے تمام مسلمانوں میں سادگی اور تواضع بہت ہے، جو لوگ بڑی حیثیت کے ہیں ان میں بھی ترفع اور پندار کا اثر نہیں ہے، ملاقاتوں سے مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ ان میں کوئی مالدار بھی ہوگا، نہ گفتگو میں کوئی مال کا فخر نہ طرز وانداز میں مالداری کا نشہ، اس لئے میں یہ اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ مالی اعتبار سے کسی کی حیثیت بلند ہے، کئی علما سے ملنے کا اتفاق ہوا، جو علم ومرتبہ اور عمر میں مجھ سے کہیں فائق ہیں، مگر مجال کیا کہ کسی طرح اندازہ ہو جائے کہ وہ اپنے سے کسی چھوٹے یا کم از کم برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں، ایسی تواضع اور ایسی کسر نفسی کہ مجھے شبہہ ہونے لگتا کہ یہ مجھی سے مل رہے ہیں یا کسی زبردست عالم اور بزرگ سے، اس کا میری طبیعت پر خاص اثر ہوا۔

حضرت ماسٹر صاحب گو اصطلاحی طور پر عالم نہیں ہیں لیکن عرصہ دراز تک بزرگوں کی صحبت میں رہے ہیں، حضرت مولانا سراج احمد صاحب کے تو خیر مرید وخلیفہ ہی ہیں، مصلح الامت

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کی صحبت میں بھی کافی وقت گزارا ہے، پھر مولانا عبدالرحمان ،مولانا لطف الرحمان صاحب کی خدمت اور صحبت کا بہت موقع ملا،اور حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب سے تو ایسا تعلق رہا ہے کہ ایک کا تصور دوسرے کے تصور کے بغیر مشکل ہے، پھر صاحبِ نسبت ہیں،ادھر کا پورا علاقہ ان کے فیض سے سرشاراوران کا نہایت درجہ معتقد ہے،مگر بے نفسی کا یہ عالم ہے کہ کبھی اپنے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ عام آدمی سے زیادہ ان کی حیثیت ہے۔ایک مرتبہ تو حد کردی،اور میں شرم سے پانی پانی ہوگیا،جب ہم پوہدی سے ہرسنگھ پور جارہے تھے تو ایک ہی رکشہ پر ہم دونوں بیٹھے تھے،سڑک کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں،راستہ میں ایک ندی آئی،اس پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا،پل کی چڑھائی سڑک سے نہایت بے اعتدالی کے ساتھ اونچی تھی، میں نے رکشہ والے سے کہا کہ رکشہ سے میں اتر جاؤں، ابھی وہ روکنے کی تیاری کررہا تھا کہ ماسٹر صاحب اتر گئے،اور مجھے اترنے نہیں دیا،اب رکشہ والا کھینچ رہا ہے اور میں کاہل آرام سے بیٹھا ہوں، مجھے محسوس ہوا کے رکشہ والے پر زیادہ زور نہیں پڑرہا ہے،تو میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو وہ کچھ دیکھا جس کا مجھے تصور نہیں تھا،یعنی میری نظریں دیکھ رہی ہیں کہ حضرت ماسٹر صاحب بنفس نفیس دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر چڑھا رہے ہیں، میں عرقِ ندامت میں ڈوب گیا مگر کیا کرسکتا تھا، چلتے ہوئے رکشہ سے کودنے کی مشق نہیں، بے حیا بن کر بیٹھا رہا،اور اپنی کاہلی کوستا رہا،اور ایسے مواقع نہ جانے کتنے آئے کہ مجھ جیسا مہمل آدمی مخدوم نظر آیا،اور وہ اپنے معتقدین ومتوسلین کے جھرمٹ میں خادم نظر آئے۔

یہی حال مولانا سعداللہ صاحب کا بھی دیکھا،ان لوگوں سے مل کر تواضع کے انداز کا سبق ملا،تواضع تو ہم جیسے لوگ بھی کرتے ہیں مگر اپنی بڑائی اورانانیت کا تحفظ کرکے،اور تواضع ان لوگوں نے بھی کیا مگر بے ساختہ! جیسے یہ لوگ اپنے کوایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے ان میں نہ کوئی خوبی ہے اور نہ کوئی کمال۔

میں نے وعظ میں ان دونوں بزرگوں کو دیکھا کہ بالکل میری کرسی کے پاس بیٹھ کر اس انہماک اور غور سنتے جیسے اس وعظ کی سب سے زیادہ ضرورت انہیں کو ہے۔

(۲) اس علاقہ کے عام مسلمانوں میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ان کے دلوں میں علما کا

احترام واقعی بہت زیادہ ہے، ہم لوگوں کے علاقے میں بعض ناگفتنی وجوہ سے علما کا احترام کیا معنی ان سے ایک طرح کا استغنا ہو گیا ہے، لیکن یہاں اس استغنا کا کوئی اثر نہیں دیکھا، جب کسی راستہ سے گزرنا ہوا تو ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مسلمان بغیر سلام کئے ہوئے گزر گیا ہو، کوشش تو یہ کرتے دیکھا کہ مصافحہ کی سعادت بھی حاصل کریں، آپ پڑھ آئے ہیں کہ مدرسہ کے باورچی راج مستریوں نے بھی لپک کر ملاقات کی تھی، ایسا بھی ہوا کہ ہم لوگ کسی راستہ سے گزر رہے ہیں، اور دور کھیت میں کوئی مسلمان ہل جوت رہا ہے، اس نے ہل روک دیا اور ہاتھ سے مٹی جھاڑ کر سلام کے بعد مصافحہ کیا، یہ برکات ہیں ان بزرگوں کے۔ اسی علاقہ میں سابق امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب کی تربیت ہوئی، ان کے دورے بھی ہوتے رہتے ہیں، مجموعی طور پر ان اکابر کے برکات مشاہدے میں آئے۔

میں ایسا کچھ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس علاقہ میں نہ آیا ہوتا تو بڑی کمی رہ جاتی، حق تعالی کا شکر ہے کہ اس نے یہاں پہونچا دیا۔

(۳) مدرسہ اشرفیہ کے طلبہ واساتذہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، مدرسہ گو چھوٹا ہے، طلبہ کم ہیں، اور زیادہ تر چھوٹی عمر کے طلبہ ہیں، بیرونی طلبہ درجہ پرائمری اور حفظ سے لے کر عربی دوم تک ہیں، اساتذہ بچوں پر بہت شفیق ومہربان نظر آئے، چھوٹے بچے عموماً شور وغل زیادہ کرتے ہیں، ان کے کسی کام میں ترتیب اور باقاعدگی نہیں ہوتی، لیکن اس مدرسہ میں اس کے برعکس دیکھا، بچے سنجیدہ اور مہذب ہیں، میں ایک ہفتہ مسلسل ان بچوں کے کمروں کے درمیان رہا، مگر کبھی نازیبا حرکات اور شور وغل کی کوفت نہیں اٹھانی پڑی، نماز کے اوقات میں بغیر کسی تنبیہ وتادیب کے مسجد حاضر ہو جاتے، اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ اساتذہ ان بچوں پر کوئی سختی یا درشت تادیبی کاروائی کرتے ہوں، ہمہ وقت ایک سکون کی کیفیت چھائی رہتی، مدرسہ کے صدر مدرس مولانا فیاض احمد صاحب ایک لائق اور فاضل نوجوان ہیں، میرے پروگرام میں ہر جگہ ساتھ رہے، اور ناؤنسری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ درجہ عربی کے ایک استاذ مولوی زبیر احمد صاحب میرے دوستوں میں سے ہیں، انہوں نے بہت خدمت کی، ان سے چونکہ قدیم بے تکلفی ہے اس لئے میری ہر فرمائش کے مورد یہی بنتے رہے اور نہایت خوشی کے ساتھ تعمیل کرتے تھے، ایک دوسرے استاذ مولانا نور محمد

صاحب میرے دورِ تعلیم کے ہم عصروں میں سے ہیں، لیکن اس طرح پیش آتے رہے کہ جیسے میں ان کا کوئی بزرگ ہوں، نو بجے دن میں چائے پلانے کا اہتمام بنفس نفیس کرتے تھے۔

ان حضرات میں خصوصیت کے ساتھ ہر خدمت میں پیش پیش ماسٹر سید امین اللہ کوثر صاحب تھے، یہ اپنی وجاہت کے اعتبار سے نہایت بزرگ صورت ہیں، لیکن جذبۂ خدمت کے لحاظ سے اپنے کو ہر چھوٹے سے چھوٹا رکھنے میں لطف محسوس کرتے ہیں، حضرت ماسٹر صاحب مدظلہ سے بیعت ہیں، اور بہت خوب شخص ہیں۔ غرض یہ مدرسہ اور اس مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، اور کیوں نہ ہو؟ یہ پود لگائی ہوئی ہے حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صاحب علیہ الرحمہ کی، اس کی آبیاری ونگہداشت میں حضرت ماسٹر صاحب اور حاجی حسین صاحب کا حصہ ہے، اور اس کو خصوصی توجہات مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اور سراج الامت حضرت مولانا سراج احمد صاحب علیہما الرحمہ کی حاصل ہے، حضرت مولانا امروہوی بیسیوں بار یہاں تشریف لائے ہیں، اور اسے نوازا ہے، حضرت ماسٹر صاحب کے خطوط میں بار بار اس مدرسہ کے لئے دعاؤں کی درخواست اور حضرت کی دعاؤں کا تذکرہ ملتا ہے، ایسے مدرسے اس زمانہ میں کمیاب ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو ترقی بخشے۔

اب اس سفر کی دوسری قسط شروع ہورہی ہے، ہم لوگ ذرا تاخیر سے دربھنگہ بس اسٹیشن پہونچے، دربھنگہ پہونچ کر معلوم ہوا کہ پٹنہ کے لئے بسیں بند ہیں، ہندوستان کے موجودہ وزیر اعظم وی پی سنگھ نے چھوٹی ذات والوں کے لئے حکومت کے ہر شعبہ میں ریزرویشن کا قانون پاس کردیا ہے، بڑی ذات کے ہندوؤں کو اس پر بہت غصہ ہے، وہ پورے ملک میں اس کے خلاف بغاوت اور اودھم مچائے ہوئے ہیں، ۸/ اکتوبر کو پٹنہ میں وزیر اعظم کی ریلی تھی، اونچی ذات کے ہندوؤں نے اس ریلی کو ناکام بنانے کے لئے پٹنہ کے راستوں پر بسوں کا چکہ جام کردیا تھا، ہم لوگ بخیر وعافیت بھوارہ پہونچ گئے، وہاں کوتوالی کے پاس میرے عزیز دوست مولوی صفی اللہ اور مولوی نور اللہ کھڑے تھے، بس سے اتر کر سیدھے مدرسہ فلاح المسلمین پہونچے، ظہر کا وقت قریب تھا قدرے آرام کرکے ظہر کی نماز پڑھی پھر مدرسہ ہی میں کھانا آگیا، وہیں کھا پی کر سوگئے۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ زیر تعمیر مسجد میں وعظ ہوگا۔ میں بعد نماز عصر مولوی نور اللہ کے

گھر بیٹھا ہوا تھا، ساتھ میں مولوی عبدالشکور، حاجی محمد حسین صاحب اور مولوی محمد ہاشم اور مقامی متعدد علما تھے، اتنے میں ایک مولوی صاحب لنگی پہنے ہوئے ڈھیلا ڈھالا کرتا زیب تن کئے ہوئے رنگ سانولا، داڑھی پر بڑھاپے کی دھوپ چمک رہی تھی، سلام کرتے ہوئے بے تکلفی سے داخل ہوئے، مقامی علما احتراماً کھڑے ہونے لگے، میں غور سے دیکھنے لگا کہ کون صاحب ہیں؟ اچانک مولوی عطاء اللہ نے یہ سمجھ کر کہ میں نے پہچانا نہیں بول پڑے کہ یہ مولانا دبیر عالم صاحب ہیں، میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا، اور نہایت گرم جوشی سے مصافحہ اور معانقہ ہوا۔

میں جب دارالعلوم ۱۹۶۸ میں نیا نیا پہونچا تھا، کچھ تو نئی جگہ ہونے کا اثر اور اس سے کہیں زیادہ دارالعلوم کا صد سالہ تقدس و وقار اور اس کی عظمت و ہیبت دل پر بیٹھی ہوئی، ہر چیز عجیب اور پاکیزہ بلکہ مسحور کن دکھائی دیتی تھی، ایک دن گیٹ پر اعلان آویزاں دیکھا کہ دارالحدیث فوقانی میں کوئی جلسہ منعقد ہو رہا ہے، دارالعلوم دیوبند میں یہ پہلا جلسہ دیکھنے کو مل رہا تھا، پرشوق اور بیتاب دل کے ساتھ دارالحدیث میں پہونچا تو جلسے کی کاروائی شروع ہو چکی تھی، اناؤنسر اعلان کررہا تھا کہ آپ کے سامنے مولوی دبیر عالم دربھنگوی تقریر کریں گے، اس پر ایک نوعمر لڑکا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں، نہایت بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اسٹیج پر آیا، ایک ہاتھ میں کاغذات کا مختصر سا پلندہ تھا، جس بے خوفی اور بے تکلفی کے ساتھ وہ آیا تھا اسی بے تکلفی سے تقریر شروع کردی، برجستہ اور شستہ الفاظ کا دروبست اور اندازِ تکلم ایسا کہ فصاحت و بلاغت منہ چوم رہی تھیں، برمحل اشعار اس طرح درمیان درمیان میں پڑھتا چلا جاتا کہ جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑتا چلا جائے، تقریر میں شاعری کررہا تھا یا یوں کہئے کہ شاعری کو تقریر کے پیکر میں ڈھال رہا تھا، میں مبہوت و متحیر سنتا رہا، دل میں سوچتا رہا کہ ایسی برجستگی اور تقریر کی عمدگی مجھے بھی حاصل ہو سکتی ہے؟ وہ تقریر کرکے گیا تو سامعین کے دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ بیٹھا گیا۔ پرانے طلبہ تو خیر واقف تھے، میں نیا طالب علم تھا، اس لئے قدرتی طور پر میرے اوپر زیادہ اثر ہوا۔ یہی اس وقت کے مولوی دبیر عالم تھے، وہ دورۂ حدیث سے فارغ ہو چکے تھے، اب فنون پڑھ رہے تھے، اس وقت دورۂ معقولات کو فنون کہتے تھے، اب بائیس سال کے بعد ملاقات ہوئی تو وہ لڑکا جوانی کی سرحدوں کو پار کر کے بڑھاپے کی حدوں کو چھو رہا تھا، داڑھی اور سر کے بالوں نے تو مکمل بڑھاپے کا اعلان کر رکھا تھا، دیر

تک باتیں ہوتی رہیں، پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔مولانا دبیر صاحب دیوبند سے اٹھے تو علی گڑھ پہونچے، طبیہ کالج میں داخلہ لیا، کبھی کبھی معلوم ہوتا رہا کہ وہ علم دین سے بغاوت کررہے ہیں، مولویوں کو آج کل کے فیشن کے مطابق بہت گراہوا اور آؤٹ آف ڈیٹ سمجھتے ہیں، پھر وہ یونانی حکیم ہوکر سرکاری ملازمت میں آگئے، اور معلوم نہیں پھر کیا انقلاب آیا کہ وہ علم دین کی عظمت کی طرف پلٹے، عرصہ سے بھوارہ میں مقیم ہیں، اب سے تین چار سال پہلے میں بھوارہ گیا تھا تو اس وقت بھی معلوم ہوا تھا کہ یہیں ہیں، لیکن غالبًا کسی چھٹی میں گھر گئے ہوئے تھے، اس لئے ملاقات نہیں ہوسکی تھی، بارہا افسوس کررہے تھے کہ میں نے اپنا راستہ ترک کرکے اس راہ کو غلط اختیار کیا، اس لائن میں پیسے تو بہت ہیں مگر پیسہ تو مقصودِ زندگی نہیں ہے، بار بار مجھ سے کہتے رہے کہ جب آپ کو دیکھتا ہوں تو خوشی بھی ہوتی ہے، رشک بھی آتا ہے، آپ پڑھنے پڑھانے میں لگے رہے، آپ کے کیسے کیسے شاگرد تیار ہوگئے، آپ کا فیض مجھے بھی پہونچتا ہے کہ آپ کے شاگرد صرف اس نسبت سے کہ دیوبند میں آپ کا ہم عصر رہ چکا ہوں، میرا ادب واحترام بھی استاذ ہی کی طرح کرتے ہیں، پھر نہایت عجز وانکسار کے ساتھ کہنے لگے کہ میرے لئے مغفرت کی دعا کیجئے۔

پھر باصرار پوچھا کہ کریں گے نا؟ بار بار پوچھتے رہے، میں کیا کرتا ان کی تسلی کے لئے کہہ دیتا کہ ہاں ضرور۔ ورنہ مجھ کو اپنی حقیقت معلوم ہے کہ مجھ سے کہیں اچھا ان کا قلبی حال ہے، میں کس کھیت کی مولی ہوں کہ میری دعائیں ان کے لئے کارگر ہوں، وہ خود نہایت عمدہ اور نفیس آدمی ہیں، ان کے جذبات وخیالات اور ان کے دینی رجحان سے مجھے بہت نصیحت حاصل ہوئی، کہ ایک شخص بالکل غیر دینی ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس قدر پختہ دین دار ہے، اور میرے تو لیل ونہار دینداروں کے درمیان بسر ہوتے ہیں لیکن مجھے ایسا جذبہ حاصل نہیں ہے۔

گوکہ مولانا دبیر عالم صاحب کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ چھوٹ گیا ہے، مگر دماغ بہت حاضر ہے، علم پر دسترس اب بھی باقی ہے، مثنوی مولانا روم کا خوب مطالعہ کئے ہوئے ہیں، اب بھی اس کے بہت سے اشعار نوکِ زبان ہیں، وعظ وتقریر کا سلسلہ بھی قائم ہے، مواعظ میں مثنوی سے بہت کام لیتے ہیں، ماشاءاللہ صاحبِ اولاد ہی نہیں کثیر الاولاد ہیں، مجھ سے اس بارے میں سوال کرنے لگے، الحمد للہ ادھر بھی کچھ یہی رنگ ہے۔ میں نے کہا کہ عشق ومحبت انسان کی

سرشت میں داخل ہے،اور غالباً تمام جذبات میں یہی جذبہ سب سے قوی ہے،اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو بڑا تباہ کن ہے،اور اگر اسے شریعت کی قید میں پابند کر کے اس سے کام لیا جائے تو نہایت بیش قیمت اور عمدہ نتائج نکلتے ہیں،ہم لوگوں کا عشق چونکہ قید شریعت میں ہے اس لئے کثرت اولاد کا تماشہ دیکھتے جایئے۔اکبر مرحوم نے فرمایا ہے۔

عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

اس پر ہنسے اور داد دی۔عشا کی نماز زیر تعمیر مسجد میں پڑھی گئی،پہلے یہ مسجد چھوٹی تھی، ۱۹۸۸ء کے زلزلے میں یہ مسجد بھی متأثر ہوئی،مولانا حبیب اللہ صاحب نے اسے شہید کر کے دوبارہ توسیع وتعمیر کا منصوبہ بنایا،چنانچہ اس میں کافی وسعت پیدا کردی گئی،دیواریں چھت تک آگئی ہیں،چھت ڈھالنی باقی ہے،اسی کے انتظامات ہورہے ہیں،عشا کی نماز کے بعد مسجد میں ہی پروگرام ہے،میں نے اپنے وعظ میں اس طرف توجہ دلائی کہ ماضی قریب میں صوبہ بہار دو ہولناک تباہیوں میں ڈوب کر ابھرا ہے،ایک تو ۱۹۸۸ء کے زلزلے میں شمالی بہار کا پورا خطہ زیر و زبر ہوکر رہ گیا،دوسرے ۱۹۸۹ء میں بھاگل پور کا خونیں فساد،ان دو تباہیوں کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی،ایسے موقع پر اہل اسلام کو خلوص دل سے خدا کی جانب رجوع کرنا چاہئے،اس سلسلے میں مبسوط بیان ہوا۔وعظ کے بعد کھانا کھا کر مدرسہ میں آرام کیا۔

۱۷ربیع الاول اتوار:

آج صبح کی نماز کھنڈ کی مسجد میں پڑھی،نماز کے بعد چونکہ کسی قسم کے پروگرام کا اعلان نہ تھا اس لئے میں مصلیٰ پر بیٹھا رہا،لیکن دیکھا کہ تمام مصلی جوں کی توں اپنی جگہوں پر خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں،کوئی جا نہیں رہا ہے،تو میں نے لوگوں کا عندیہ دریافت کیا،مولوی عطاءاللہ نے بتایا کہ یہ لوگ منتظر ہیں کہ آپ کچھ بیان کریں گے،میں نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر سورہ مائدہ کے آخری رکوع سے پہلے والے رکوع کی تلاوت کی،یعنی **"یوم یجمع اللہ الرسل"** اور اس کا ترجمہ اور تفسیر بیان کی،اس رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصی تذکرہ ہے،اور یہ کہ یہود علما آپ کے دشمن ہوگئے تھے،اسی ذیل میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ

والسلام کے علماءِ سو کا تذکرہ آ گیا ہے، اور قدرے تفصیل سے ان کی علامات اور احوال پر گفتگو کی، چونکہ لاؤڈ اسپیکر لگا دیا گیا تھا اس لئے دوسری مسجدوں بھی سے مصلی آ گئے تھے، اس بیان کا اثر وہاں کے علما پر زیادہ ہوا۔ مولانا حبیب اللہ صاحب نے کہا کہ یہاں کہ نوجوان علما و مدرسین کے سامنے ایک مجلس میں کچھ کہہ دیجئے، چونکہ بھوارہ کے علما براہ راست یا بالواسطہ مجھ سے پڑھے ہوئے ہیں، اس لئے میں نے اسے منظور کرلیا، لیکن یہ تاکید کردی کہ جو حضرات مجھ سے تلمذ کا تعلق نہیں رکھتے اس کی اطلاع انہیں نہ کرنا، کیوں کہ ایسے لوگوں کے سامنے کچھ کہنے کا مجھے حوصلہ نہیں ہے، تلامذہ کی بات اور ہوتی ہے، ان کو چونکہ ابتدا سے کہنے سننے کی بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے اب بھی کچھ حجاب اور تکلف نہ ہوگا، لیکن مدرسہ کے ایک استاذ مولانا مطیع الرحمان صاحب جو ذی استعداد اور سلیم الطبع عالم ہیں ان کا اصرار تھا کہ وہ بھی اس مجلس میں شرکت کریں، اور وہ خود کو اس طرح پیش بھی کرتے ہیں جیسے میرے احباب، گو تکلف تو ہوا مگر ان کی خاطر شکنی کا یارا نہ تھا، اس لئے وہ تشریف لائے۔

گیارہ بجے دن میں عزیزم مولوی نوراللہ سلمہ کے مکان پر یہ مجلس منعقد ہوئی، گھنٹہ بھر ان سے گفتگو ہوتی رہی، ان لوگوں پر اچھا اثر پڑا۔

چونکہ میرے پاس وقت کم ہے، کل ہی روانگی کا ارادہ ہے، اس لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ پروگرام مرتب کرلو، جہاں جہاں بیان کی ضرورت ہو، آج ہی وقت مقرر کرلو، چنانچہ آج دو جگہ پروگرام ہے، ایک پروگرام کسی محلّہ کی مسجد میں ہے، اس کا نظم کرنے والے مولوی سمیع اللہ اور مولوی ابوذر تھے، مغرب کے بعد اولاً مولوی دبیر عالم صاحب نے کچھ دیر تقریر فرمائی، پھر میں بیٹھا اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے کہ وہاں کیا بیان ہوا۔

عشاء کی نماز وہاں پڑھ کر مولوی حبیب اللہ کے گھر کے آنگن میں جو خاصا وسیع ہے، یہ جلسہ منعقد ہوا، اور اس میں خاص طور سے فرمائش کی گئی کہ مستورات کے متعلق خصوصیت کے ساتھ وعظ و پند ہونا چاہئے، شروع میں مولانا ہارون رشید صاحب مدظلہ صدر المدرسین مدرسہ فلاح المسلمین نے تھوڑی دیر کچھ بیان فرمایا، اس کے بعد متعلقہ موضوع پر میں نے تقریباً سوا گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کی، بعد میں معلوم ہوا کہ عورتوں نے بہت پسند کیا، اور یہ تو میں نے بھی محسوس کیا

کہ بالکل خلاف عادت عورتیں نہایت صبر وسکون کے ساتھ تقریر سنتی رہیں، ورنہ عموماً تجربہ یہ ہے کہ جہاں چار عورتیں جمع ہوئی، انہیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں ایسا انہماک ہوتا ہے کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ سننے آئیں ہیں یا سنانے ؟!

آج دن بھر کی چار تقریروں نے تھکا ڈالا، آدھی رات کے قریب بستر پر جانے کا موقع ملا۔

۱۸؍ربیع الاول۔ دوشنبہ:

آج صبح نیند کا بہت زیادہ اثر تھا، آج ہی بعد نماز فجر واپسی کا ارادہ ہے، اس لئے نماز کے بعد وعظ نہیں ہوا، ایک عزیز کو بس اسٹیشن اور ریلوے اسٹیشن بھیجا کہ معلوم کرے کہ بسیں یا ریلیں بخیریت چل رہی ہیں یا نہیں؟ اطلاع ملی کہ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ اتنا ہے کہ پٹنہ کی لائن پر نہ کوئی بس جارہی ہے نہ کوئی ٹرین، مجبوراً ارادہ فسخ کرنا پڑا، لیکن دماغ اتنا بوجھل تھا اور طبیعت اتنی مضمحل تھی کہ آج کسی پروگرام کا حوصلہ نہیں ہوسکا۔

عصر کی نماز کے بعد مولانا دبیر عالم صاحب کے گھر پر حاضری دی، اور وہاں چائے پی، مغرب کی نماز کے بعد عزیزم مولوی سہیل سلمہ کے گھر گئے، اور وہاں دیر تک مجلس رہی، آج کی رات بہت آرام سے گزری۔

۱۹؍ربیع الاول۔ سہ شنبہ:

آج روانگی کا پروگرام ہے، فجر کی نماز کے بعد آج سورہ مائدہ کے آخری رکوع کی تفسیر بیان کی گئی۔ ناشتہ سے فارغ ہوکر بس اسٹیشن پہونچے، دربھنگہ کی بس تیار تھی، احباب سے رخصت ہوکر بس پر بیٹھے، ایک گھنٹہ میں دربھنگہ پہونچے، وہاں دوسری بس سے مظفر پور اسٹیشن پر پہونچے، تو بڑی بھیڑ دیکھی، تین دن کے بعد آج گاڑیاں چلی تھیں، ویشالی ایکسپریس آنے ہی والی تھی، اللہ کے فضل سے باوجود ازدحام کے جگہ اچھی مل گئی، تقریباً چار بجے دیوریا پہونچے، وہاں سے مئو جانے کے لئے فی الحال کوئی سواری نہ تھی، سوچا گیا کہ اب کہاں جایا جائے؟ خیال ہوا کہ کسی مسجد میں چل کر عصر کی نماز پڑھی جائے، پھر آگے کا پروگرام بنایا جائے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قریب ہی مسجد ہے، وہاں پہونچے تو وہ جامع مسجد تھی، نماز پڑھ کر ایک وجیہ وشکیل شخص کو دیکھا کہ وہ مسجد میں

گھڑی ٹھیک کرا رہے ہیں، ان سے ملاقات کے لئے آگے بڑھا تو وہ خود لپکے، ملاقات کے بعد تعارف ہو، یہ مولانا اشفاق احمد صاحب ہیں، مشہور واعظ مولانا جمال الدین چترویدی کے داماد، انہوں نے بتایا کہ وہ اس مسجد کے امام ہیں، اور مسجد کے ملحقہ مدرسہ کے صدر مدرس۔ کہنے لگے کہ ہم آپ کو یہاں جلسہ میں دعوت دینے والے تھے، مگر آپ کا پتہ معلوم نہ تھا۔ مغرب اور عشا کی نماز وہاں پڑھ کر اسٹیشن آ گئے، کچھ دیر کے بعد چوری چورا ایکسپریس آئی، اس سے تقریباً بارہ بجے مئو پہونچے، مئو سے اعظم گڑھ جانے والی گاڑی کھڑی تھی، اس پر جا سوار ہوئے، اور تقریباً ڈیڑھ بجے رات میں اعظم گڑھ آ گئے، باقی رات جامع مسجد میں گزار کر صبح مدرسہ پہونچ گئے، ساتھ میں مولوی عبدالشکور صاحب سلمہ اور مولوی ہاشم سلمہ ہیں، یہ سفر بہت خوشگوار اور بابرکت رہا، اگر میری تقریروں اور دینی کاموں پر دینی کام کا اطلاق درست ہو تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس سفر میں حق تعالیٰ نے اپنے دین کی خدمت کی جتنی توفیق بخشی کم سفروں میں اس کا اتفاق ہوا، ایک تو مسلسل بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت نصیب رہی، دوسرے ایک تالیفی کام ہو گیا، تیسرے اتنے سے سفر میں ۱۹ وعظ ہوئے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے قبول فرمائیں۔

ناظرین سے دعائے خیر کی التجا ہے کہ پاس میں کوئی پونجی نہیں سوائے رحمت خداوندی اور دوستوں کی محبت کے، اور بحمد للہ یہ کچھ کم نہیں ہے، مگر اپنا ظرف جب بالکل خالی نظر آتا ہے تو جس طرح ایک غریب آدمی جو دونوں وقت روٹی تو کھالیتا ہے مگر پاس میں کوئی نقدی نہیں رکھتا، وہ اپنی غربت پر نظر کرتا ہے تو ایک ہوک سی اٹھتی ہے، یہی حال بعینہ میرا بھی ہے کہ رحمت خداوندی اور دوستوں کی محبت کے سہارے جی تو رہا ہوں مگر جب دل کی جھولی خالی دیکھتا ہوں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

اس سفرنامہ کا مقصود تعلّی اور اظہار خودی نہیں ہے، چونکہ اس سفر سے طبیعت میں انشراح بہت ہوا، اس لئے مناسب سمجھا کہ اسے قلم بند کردوں، پڑھنے والوں کو معلوم نہیں کوئی فائدہ پہونچے یا نہیں؟ میرا اپنا فائدہ ہے، اس لئے یہ کوئی بیکار عمل نہیں معلوم ہوا، اس میں اگر خود پسندی، ادعاء اور تعلّی محسوس ہو تو ناظرین اسے میرا عیبِ نفس سمجھ کر اللہ کے حضور میرے لئے استغفار کردیں۔

سفر بنگلہ دیش

١٦/تا ١٨/شوال ١٤١٨ھ بروز ہفتہ تا دوشنبہ بنگلہ دیش کے مرکزی شہر ڈھاکہ سے چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر بمقام ٹنگی ایک بڑا تبلیغی اجتماع ہوا، یہ اجتماع ہر سال ہوتا ہے اور کافی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے، وہاں کے لوگوں کے پرانے تجربے کے بنا پر اس کا ہر انتظام، حسن انتظام کا آئینہ دار ہوتا ہے، بالخصوص دوسرے ممالک کے شرکا اور جماعتوں کے لئے تو وہ نظم ہوتا ہے کہ باید وشاید! ان کی رہائش، ان کے خورد ونوش، ان کی بشری ضروریات اور ان کی راحت وآرام کا جو انتظام واہتمام بنگلہ دیش کے اس عظیم اجتماع میں دیکھا ان کی نظیر ذرا مشکل سے ملے گی، پھر انتظام جن لوگوں سے متعلق تھا، ان کی محبت، ان کی خاکساری، ان کے بچھے جانے کا دلآویز انداز بلکہ ان کی ہر ہر ادا دیدنی تھی، تین دن کا اجتماع تھا مگر شرکاءِ اجتماع کی آمد کئی روز پہلے سے ہورہی تھی، اور اجتماع کے ختم ہونے کے کئی دن بعد تک بہت سے لوگ وہاں رہے، اس پوری مدت میں ٹنگی کا یہ وسیع وعریض میدان انسانوں، دیندار انسانوں کا ایک بڑا شہر بن گیا تھا، بڑے سکون کے ساتھ اجتماع کے پروگرام چلتے رہے، اصل تقریریں اردو میں ہوتیں، اسٹیج سے ان کا بنگلہ زبان میں ترجمہ نشر ہوتا، اور اسٹیج کے نیچے مختلف زبانوں کے ترجمان اپنے اپنے حلقوں میں ترجمے کرتے رہتے، اجتماع کی ایک مفصل اور دلچسپ روداد ہے خاکسار نے اپنے روزنامچے میں اسے قدرے تفصیل سے لکھ لیا ہے، فرصت ملی تو مکمل سفر نامہ کتابی شکل میں ترتیب دینے کا ارادہ ہے۔[١]

راقم الحروف کا مشغلہ درس وتدریس ہے، اس میں جب موقع مل جاتا ہے تو عوام کے درمیان بھی حاضری کی توفیق مل جاتی ہے، تبلیغی جماعت اور تبلیغی احباب سے بھی رابطہ رہتا ہے، بڑے جلسوں اور بڑے اجتماعات سے مناسبت نہیں ہے، اس لئے ان میں شرکت کا اتفاق کم بلکہ

بالکل نہیں ہوتا۔ بنگلہ دیش جانے کا ارادہ عرصہ سے تھا اور مقصد یہ تھا کہ وہاں کے مدرسوں کو دیکھا جائے اور وہاں کے علما سے ملاقاتیں کی جائے، بنگلہ دیش سے محبت وتعلق کی دو خاص وجہیں اور بھی اس سفر کی محرک بنتی رہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہی علاقہ ہمارے جونپور کے مشہور بزرگ اور صاحبِ ارشاد وہدایت شیخ، حضرت مولانا کرامت علی صاحب جون پوری نوراللہ مرقدہ کی تبلیغی و عرفانی کوششوں کا مرکز ومحور رہا ہے، بنگلہ دیش ہی کے مشہور شہر رنگ پور میں ان کی قبر مبارک بھی ہے۔ دوسرے ہمارے مرکز عقیدت ومحبت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ نے بھی عرصہ دراز تک سلہٹ کو نوازا ہے، ان حضرات اکابر سے جو تعلق ہے اس کی بھی کشش بنگلہ دیش کی طرف کھینچ رہی تھی، لیکن ایک دوسرا ملک بن جانے کی وجہ سے سفر میں جو قانونی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں ان کی وجہ سے جب چاہیں سفر کرلیں، ایسا ممکن نہیں ہے، یہ اجتماع عالمی اجتماع ہوتا ہے، اس کی وجہ سے ویزا ملنے میں سہولت ہوتی ہے، اور بہت سے احباب کی رفاقت بھی بہم ہوجاتی ہے، پھر اتفاق سے یہ وقت بھی ایسا تھا کہ ہمارے عربی مدارس میں ابھی داخلے ہوتے رہتے ہیں، درس وتدریس کا کچھ زیادہ حرج بھی نہ ہوتا، ان مصالح کے پیش نظر اس وقت سفر اختیار کیا گیا۔

بہر حال اجتماع میں شرکت رہی، چار دن اور پانچ راتیں اجتماع گاہ میں گزریں، اجتماع کے ہر پروگرام کو غور سے دیکھا، ماشاءاللہ بنگلہ دیش میں تو اجتماع ہی تھا، لوگ پروانوں کی طرح امنڈ کر آرہے تھے، دوسرے تقریباً بیس ممالک کے دیندار حضرات دین اور اشاعتِ دین کے جذبہ سے سرشار ایک میدان میں جمع ہوگئے تھے، دین میں اللہ نے کتنی کشش رکھی ہے اور دلوں میں اس کا کتنا احترام وتقدس ہے، اس کا اندازہ ایسے اجتماعات سے خوب ہوتا ہے، لاکھوں کا مجمع تھا مگر کہیں شور وغل نہ نزاع وتکرار، نہ ہٹو بچو، نہ پولیس کی ضرورت، نہ کوئی بدامنی، بس یہ دین کا احترام، اللہ کی محبت اور ایمانی اخوت تھی کہ سب ایک تسبیح کے دانے نظر آرہے تھے۔ بڑی خوبیاں تھیں اس مجمع میں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو دین وایمان کی محبت سے سرشار کرے۔

تین دن اجتماع کی ہماہمی میں گزرے، اب پروگرام یہ تھا کہ یہاں کے دینی عربی مدارس میں حاضری دی جائے، علما وطلبہ سے ملاقاتیں کی جائیں، بنگلہ دیش ہمارے لئے ایک

اجنبی ملک ٹھہرا، نہ یہاں کے مدارس سے واقفیت اور نہ یہاں کے علما سے روابط، کہاں سے ابتدا کی جائے؟ مدارس کہاں کہاں ہیں؟ کچھ خبر نہیں، بنگلہ دیش میں جس زبان کی حکمرانی ہے اس سے ہم لوگ بالکل نابلد اور اردو یہاں بالکل ناپید۔ زبان کے مسئلے میں عجب رجحان یہاں دیکھا کہ بنگلہ زبان کے علاوہ یہ حضرات کسی اور زبان کے لکھنے اور بولنے کے روادار نہیں ہیں، ہم لوگ ششں وپنج میں تھے کہ ایک صاحب ملے، وہ بہت صاف اردو بول رہے تھے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے معہد ملت مالیگاؤں میں اپنی پوری تعلیمی زندگی گزاری ہے، ان سے مل کر بہت انس معلوم ہوا، یہ مولانا عبدالرحیم صاحب تھے، وہ ٹنگی کے قریب ہی ایک مدرسہ کے نائب مہتمم ہیں، معلوم ہوا کہ مہتمم صاحب بھی تشریف فرما ہیں، یہ مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند ہیں، تھوڑی دیر میں وہ بھی تشریف لائے، مفتی صاحب موصوف عرصہ تک بمبئی میں رہ چکے ہیں، اردو اور بنگلہ کے عمدہ خطیب ہیں، بہت دیندار اور باحوصلہ ہیں، انہوں نے چند برس پہلے جامعہ عثمانیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا ہے، ان سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، وہ اپنے مدرسے میں لے گئے، دیر تک بنگلہ دیش کے دینی اور تعلیمی احوال پر گفتگو ہوتی رہی، بنگلہ دیش میں کچھ لوگوں کی طرف سے تحریک چل رہی ہے، اور موجودہ حکومت اس کی مدد کر رہی ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم اور ملازمت کے نام پر پردہ سے باہر نکالا جائے، اس کے لئے شہر شہر اور قریہ قریہ میں مختلف انداز سے کوششیں ہو رہی ہیں، مال ودولت اور دوسرے ترغیبات سے کام لیا جا رہا ہے، اس کے نتیجے میں مسلمان عورتوں کی بڑی تعداد گھروں سے باہر آ گئی ہیں، علما اس کے تدارک اور علاج کی فکر میں ہیں، مگر اس منہ زور سیلاب پر بندھ باندھنا بڑا مشکل نظر آ رہا ہے، مفتی عبدالقیوم صاحب نے اسی مجبوری سے لڑکیوں کا بھی دینی اقامتی مدرسہ کھولا ہے اور پردہ کے اہتمام کے ساتھ چلا رہے ہیں کہ تعلیم کے نام پر جہاں بے تحاشا سرکاری اسکولوں اور بددینی کے مراکز کی طرف لڑکیاں بھاگ رہی ہیں، وہیں کچھ بچیاں ان مدارس دینیہ میں بھی تعلیم حاصل کر لیں گی، اللہ تعالیٰ خیر فرمائیں۔

ہمارے ہندوستان کے مدارس کی طرح بنگلہ دیش میں بھی دینی مدارس دو طرح کے ہیں بعض مدارس کا تعلق گونمنٹ سے ہے، انہیں حکومت سے امداد ملتی ہے، ان مدرسوں کو وہاں کی

اصطلاح میں ’’سرکاری مدارس‘‘ کہا جاتا ہے، ان کی تعداد بہت ہے، مگر سب بے روح، بے جان کوئی رونق نہیں، دینی چہل پہل نہیں۔ دوسرے وہ مدارس ہیں جو حکومت کے تعاون سے آزاد ہیں، انہیں وہاں ’’قومی مدارس‘‘ کہا جاتا ہے، دین اور دینی تعلیم کی آبرو انہیں مدارس سے ہے۔ ماشاءاللہ قومی مدارس بھی ملک میں بہت ہیں، اور بڑے بڑے ہیں، اکثر مدارس میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، جامعہ عثمانیہ تو ابھی چند برسوں سے قائم ہے، وہاں ابتدائی درجات کی تعلیم ہے لیکن قدیم مدارس میں دورۂ حدیث تک نظم ہے، مفتی عبدالقیوم صاحب نے میزبانی کا حق ادا کردیا جامعہ عثمانیہ جس جگہ ہے اس کا نام ’’ستائیس‘‘ ہے، اور ضلع غازی پور ہے۔

مفتی عبدالقیوم صاحب کی رہنمائی میں ہم لوگ ڈھاکہ شہر کے ایک مدرسہ ’’مرکز الفکر الاسلامی‘‘ میں پہونچے، یہ ادارہ شہر کے باہر ایک مقام پر واقع ہے، اس کے بانی اور روح رواں مولانا مفتی عبدالرحمان صاحب مدظلہ ہیں، یہ ایک معروف مدبر صاحب نسبت اور باا ثر عالم اور فقیہ ہیں، حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی علیہ الرحمہ کے مرید اور خلیفہ ہیں۔

یہ ادارہ دوسرے مدارس کے برعکس اوپر کے درجہ سے شروع کیا گیا ہے، یعنی پہلے افتا کا درجہ قائم کیا گیا، پھر تخصص فی الحدیث کا، اس کے بعد دورۂ حدیث کا، اور اب مشکوۃ شریف کا بھی درجہ کھول دیا گیا، یہاں محنتی اور ذی استعداد اساتذہ کا اچھا اجتماع ہے۔ ڈھاکہ کے اور مدارس میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ طلبہ ماشاءاللہ کثیر تعداد میں نظر آئے، چندروز ڈھاکہ میں رہ کر بنگلہ دیش کے دوسرے مشہور شہر جو علم وفضل کے اعتبار سے بہت پہلے سے معروف ہے، چاٹگام جانا ہوا، اس کو آج کل ’’چیٹا گانگ‘‘ کہتے ہیں، چاٹگام کے حلقے میں بہت بڑے بڑے مدارس ہیں، تین مدرسے بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

ایک دارلعلوم معین الاسلام ہاٹ ہزاری، یہ بنگلہ دیش کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، اور پرانا بھی ہے، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا ضمیر الدین صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے رفقا کا قائم کیا ہوا ہے، اس مدرسہ میں طلبہ کی تعداد چار ہزار ہے، دورۂ حدیث میں آٹھ سو طلبہ ہیں۔

دوسرا مدرسہ، مدرسہ ضمیر یہ قاسم العلوم پٹیہ ہے، چاٹگام سے ۲۰/۲۲ کلومیٹر کے فاصلے پر

پیٹہ ایک قصبہ ہے، وہیں یہ عالیشان مدرسہ ہے، عمارت کی وسعت اور خوبصورتی کے لحاظ سے یہ بنگلہ دیش کا ممتاز مدرسہ ہے، اس کے مہتمم مولانا ہارون صاحب مدظلہ بہت فعال اور زیرک عالم ہیں، اس مدرسہ کے بانی حضرت مولانا مفتی عزیزالحق صاحب نوراللہ مرقدہ ہیں، جو حضرت مولانا ضمیرالدین صاحب چاٹگامی علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے، اس مدرسہ میں تقریباً ساڑھے تین ہزار طلبہ زیرتعلیم ہیں، اس مدرسہ کے تعلقات عرب ممالک سے بہت مستحکم معلوم ہوتے ہیں، اس کی متعدد شاخیں ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی کام کرتی ہیں، اب اس مدرسہ کا نام جامعہ اسلامیہ ہے۔

تیسرا مدرسہ، مدرسہ اسلامیہ خبیری ہے، یہ بنگلہ دیش کا قدیم ترین مدرسہ ہے، مولانا مفتی عزیزالحق صاحب نے یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔

ان مدارس میں ماشاءاللہ دینداری کے نمایاں اثرات محسوس ہوئے، طلبہ کی وضع قطع شرعی نظر آئی، اساتذہ میں بھی تدین کا رنگ غالب تھا۔

بنگلہ دیش میں طلبہ کی مہمان نوازی کا بھی خاصا ذوق دکھائی دیا، ہاٹ ہزاری کے مہتمم صاحب نے بتایا کہ چار ہزار طلبہ میں ۲۱۰۰ ؍طلبہ مختلف آبادیوں میں بطور مہمان رہتے ہیں۔

البتہ ایک چیز بہت شدت سے محسوس ہوئی، وہ یہ کہ بنگلہ دیش سے اردو زبان کا تقریباً خاتمہ کردیا گیا ہے، صرف دینی مدارس کے اوپر کے درجات میں بنگالی زبان بنام اردو بولی جاتی ہے، یعنی زبان تو اردو ہوتی ہے مگر لب ولہجہ ایسا بنگالی ہوتا ہے کہ ہم یوپی والے اس کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، اردو کی کتابیں بہت کمیاب بلکہ ناپید ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کو اپنے حفظ وامان میں رکھے، اور دین اسلام اور دینداری کو فروغ بخشے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) متذکرہ بالاتحریر مجلّہ المآثر شوال تا ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ مطابق فروری تا اپریل ۱۹۹۸ء میں بطور اداریہ شائع ہوئی تھی، یہ حضرت مولانا کے سفر بنگلہ دیش سے متعلق مختصر تأثرات ہیں جو اس میں نقل ہوئے، مستقل سفرنامے کا ارادہ تھا مگر اس کو ترتیب نہیں دے سکے، ہاں ذاتی روزنامچے میں تاریخ وار تفصیل سے لکھا ہے، آئندہ سطور میں سفر بنگلہ دیش ہی کے عنوان سے روزنامچے کی ترتیب پر مفصل سفر نامہ ملاحظہ فرمائیں۔

سفر بنگلہ دیش

۱۳؍شوال ۱۴۱۸ھ:

آج نارکل ڈانگہ کلکتہ سے بنگلہ کے لئے روانگی ہے، ہم لوگوں کو آٹھ بجے کی لوکل ٹرین سے ہندوستان کے سرحدی شہر بن گاؤں جانا ہے، مگر بعض رفقا کے تاخیر سے آنے کی وجہ سے وقت پر سیالدہ اسٹیشن پر نہ پہونچ سکے۔

ہم لوگ اسٹیشن پہونچے تو آٹھ بجے والی لوکل جا چکی تھی، اب نو بجے ٹرین تھی، اس سے روانہ ہوئے اور سوا گیارہ بجے بن گاؤں اسٹیشن پر اترے، وہاں سے آٹو رکشہ کے ذریعے سرحد تک گئے، جس کا فاصلہ بن گاؤں سے پندرہ بیس کلومیٹر ہوگا، ہندوستان میں اس کا نام ہری داس پور ہے، اور بنگلہ دیش کی سرحد کا نام بنیا پول ہے۔

اس سفر میں ہمارا قافلہ پندرہ آدمیوں پر مشتمل ہے، امیر قافلہ حافظ محمد ابراہیم صاحب ہیں، قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔ حاجی انور حسین صاحب، مولوی محمد شفیع صاحب، شاہجہاں بھائی، مولوی منظور الحق سلمہ، صغیر احمد، حافظ غلام حیدر سلمہ، فضل اللہ وغیرہ۔

ہم لوگوں کا پروگرام یہ بنا ہے کہ سرحد سے براہ راست ڈھاکہ نہ جایا جائے، بلکہ اس سے بہت پہلے شہر جیسور میں حافظ محمد ابراہیم صاحب کے پھوپھی زاد بھائی جناب شرف الدین صاحب رہتے ہیں، رات میں وہاں قیام کیا جائے، حافظ صاحب نے کلکتہ سے جیسور فون کر دیا تھا، چنانچہ وہاں سے ان کے ایک رشتہ دار شہادت حسین صاحب ایک گاڑی لے کر آ گئے تھے، جس میں آسانی سے دس آدمیوں کی گنجائش ہے۔

سرحد پار کرنے کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے، انسانی حد بندیوں نے زمین کے مختصر فاصلے

کو اتنا دور دراز کر دیا ہے کہ اتنی مسافت طے کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں، تبلیغی اجتماع کی وجہ سے مسافروں کا ہجوم بہت تھا، اور سرحد کا عملہ سست رو بھی تھا، پاسپورٹ اور ویزا کی قانونی جانچ اور اندراج میں گھنٹوں لگ گئے، خدا خدا کر کے اس مرحلہ سے نجات ملی، اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے بنگلہ دیش کے اندر پہونچے، تو وہاں بھی وہی سخت مرحلہ درپیش تھا، یہاں شہادت حسین صاحب کی وجہ سے آسانی ہوئی، ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی، وہیں ایک مسجد میں نماز پڑھی، اسلامی ملک ہونے کا یہ فائدہ فوراً نظر آیا کہ وہیں ایک نہیں کئی مسجدیں نظر آئیں، یہاں پر تبلیغی اجتماع کے کارکن موجود تھے، جو اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے بسوں کی سہولت کا انتظام کئے ہوئے تھے، نماز کے بعد طویل انتظار کے بعد پاسپورٹ کی انکوائری مکمل ہوئی، چار بجے کے بعد ہم لوگ جیسور کے لئے روانہ ہوئے، ایک گاڑی اور کرایہ پر لی گئی، ہم لوگوں کو بھوک خوب لگی ہوئی تھی، جیسور سے پہلے ایک بڑا بازار پڑا، وہاں عصر کی نماز پڑھی گئی، نماز کے بعد وہیں ایک ہوٹل میں کھانا کھایا گیا، مغرب کی نماز کے وقت جیسور پہونچے، شرف الدین صاحب کے مکان کے قریب ایک مسجد میں اپنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، نماز کے بعد شرف الدین صاحب کے بڑے بیٹے سے ملاقات ہوئی، انہوں نے خوب خاطر مدارات کی، والد ابھی دوکان پر تھے، وہ عشا کے بعد آئے، انہوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، بہت اہتمام کے ساتھ کھانا کھلایا، رات کو انہیں کے گھر قیام رہا، رات بعافیت گزری، شرف الدین صاحب نے راحت کا پورا اہتمام کیا۔

۱۴، ۱۵، ۱۶؍شوال:

ہمارے قافلہ کے پانچ ساتھی علی الصباح ایک بس سے اجتماع گاہ کے لئے روانہ ہو گئے ہم لوگوں کا پروگرام سواری کی دقت کی وجہ سے یہ ہوا کہ جس گاڑی سے کل آئے تھے (جسے یہاں میکرو کہا جاتا ہے) وہی گاڑی ریزرو کر لی جائے اور اس سے اجتماع گاہ جایا جائے، اجتماع گاہ ڈھاکہ کے قریب ایک مقام پر ہے جس کا نام ٹنگی ہے، میکرو ۳۱۰۰ میں طے ہوئی، اس پر ہم دس آدمی اور ایک شرف الدین صاحب سوار ہوئے، دقت تو ہوئی مگر چونکہ سب اپنے ہی رفقا تھے اس لئے ذہنی اعتبار سے انس رہا، وحشت نہیں ہوئی۔

فجر کی نماز سوا چھ بجے ہوئی، نماز کے بعد مسجد میں مختصر سا وعظ ہوا، ناشتہ کے بعد قافلہ سفر

کے لئے تیار ہوا، دس بجے دن میں ہماری گاڑی چلی، کافی دور تک سڑک معمولی تھی مگر جب ڈھاکہ کی شاہراہ شروع ہوئی تو وہ مسلسل اچھی ملتی چلی گئی، جیسور سے ڈھاکہ کا فاصلہ تقریباً تین سو کلومیٹر ہے۔اس سفر میں ایک نیا تجربہ ہوا، ڈھاکہ سے سوکلومیٹر قبل ایک دریا ملا، جس کا نام ''بدّا'' ہے، سڑک یہیں ختم ہوجاتی ہے، اس دریا پر پل نہیں ہے، بنگلہ دیش تو دریاؤں اور ندیوں کا ملک ہے، ہر تھوڑی تھوڑی دیر اور فاصلے کے بعد کوئی نہ کوئی ندی آہی جاتی ہے، حکومت نے سب پر پل بنوا رکھے ہیں، مگر بدا کا عرض اتنا زیادہ ہے کہ اس پر ابھی تک پل نہیں بن سکا ہے، معلوم ہوا کہ کہیں اس پر پل بن رہا ہے، مگر ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے، وہ تیار ہوگا تو شاید پندرہ بیس کلومیٹر کا ہوگا۔

بدا کو جہاز سے پار کرنا تھا، یہ جہاز پھیری کہلاتے ہیں، یہ اسی مقصد کے لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان پر بسیں اور ٹرک نیز دوسری گاڑیاں سوار کردی جائیں، اور وہ جہاز انہیں دوسری طرف اتار دیتے ہیں، پانی زیادہ ہوتا ہے تو جہاز کا یہ سفر قدرے مختصر ہوتا ہے، کیوں کہ جہاز سیدھا دوسرے کنارے پہونچ جاتا ہے، لیکن جب پانی کم ہوتا ہے تو اس کا سفر طویل ہوجاہے، اور بہت دیر میں دوسرے کنارے پہونچتا ہے، اس جہاز تک گاڑیوں کا پہونچنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے، بڑا شدید ہجوم ہوتا ہے، گھنٹوں گاڑیوں کو لائن میں کھڑے رہنا پڑتا ہے، جہاز دوسری جانب سے گاڑیوں کو لے کر آتا ہے، گاڑیاں یکے بعد دیگرے اترتی ہیں، اور آگے پیچھے چلتی رہتی ہیں، اگر کوئی ڈرائیور ذرا بدعنوانی کر دیتا ہے (اور بدعنوانی یہاں عام ہے) تو پیچھے تمام گاڑیاں رک جاتی ہیں، ہم لوگوں کی گاڑی بھی اسی بندعنوانی کا شکار ہوئی، اور گھنٹوں پھنسی رہی، بڑی مشکلوں سے گاڑی دریا تک پہونچی، تھوڑی دیر میں جہاز گاڑیوں سے بھر گیا، ۱۸ر بڑی گاڑی بسیں اور ٹرک تھے، اور تین چھوٹی گاڑیاں تھی، ان گاڑیوں کے مسافر تھے، اور ان کے سامان تھے، ہم لوگ دو بجے جہاز میں سوار ہوئے، اور اسی پر ظہر کی نماز پڑھی، جہاز پر وضو اور استنجا کا انتظام ہے، ڈھائی بجے کے بعد جہاز کا لنگر اٹھا، اور دو گھنٹے تک مسلسل چلتا رہا، اور ساڑھے چار بجے کے بعد دوسرے کنارے پر پہونچا، خوش قسمتی سے ہماری گاڑی آگے ہی تھی، اس لئے ہم لوگ جلدی اتر گئے، اور بعجلت ڈھاکہ کی شاہراہ پر پہونچ گئے۔ڈھاکہ یہاں سے اسی پچاسی کلومیٹر ہے، سات بجے کے

قریب اجتماع گاہ میں پہونچے، یہاں باہر آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے والے لوگ موجود ہیں، انہوں نے ہم لوگوں کو ایک اچھے خیمے میں پہونچا دیا جو ہندوستان اور پاکستان کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔

یہ اجتماع گاہ ایک بہت بڑا میدان ہے، اسی میدان میں خیموں کا ایک شہر آباد ہے، بنگلہ دیش کا یہ اجتماع ایک مدت سے ہوتا آرہا ہے، اس لئے یہاں کے لوگوں کو اس کا بڑا تجربہ ہو گیا ہے، وہ سارا انتظام نہایت سلیقے سے کرتے ہیں۔

یہ لوگ خیموں کو بڑے منصوبہ بند طریقے سے لگاتے ہیں، چونکہ بہت سے ملکوں کی جماعتیں آتی ہیں، اس لئے ہر ملک کے لئے الگ الگ خیمے لگائے جاتے ہیں، اور ہر دو خیمہ کے درمیان ایک کشادہ راستہ رکھا جاتا ہے جس میں گاڑیاں بسہولت دونوں طرف آجا سکیں، بنگلہ دیش کے علاوہ دوسرے ملکوں کی جماعتوں کے لئے شیڈ کے خیمے بنائے گئے ہیں، اور شیڈ ہی سے چاروں طرف سے انہیں گھیرا گیا ہے، دھوپ کی گرمی اور رات کی سردی سے بچاؤ کے لئے ان شیڈوں کے نیچے ٹاٹ کے پردے لگا دیئے گئے ہیں، خیمے نہایت آرام دہ ہیں، زمین پر چٹائیوں کا فرش بچھایا گیا ہے، انہوں چٹائیوں پر لوگ اپنے اپنے بستر لگاتے ہیں۔ ہم لوگ جس خیمے میں پہونچائے گئے، وہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لئے مختص ہیں، عربوں کے لئے الگ خیمے ہیں، اسی طرح الگ ملکوں کے لئے علیحدہ خیمے، اکثر خیموں میں کئی کئی ملکوں کے لوگوں کو جمع کیا گیا ہے۔ سعودی عرب، ملک شام، نائیجیریا، افغانستان، پاکستان، برما، ہندوستان اور انڈونیشیا کی جماعتیں نمایاں ہیں، اور خیموں پر اہل انتظام کی نگرانی بہت چوکس ہے، اس حلقے میں بنگلہ دیشی عوام کو آنے کی مطلق اجازت نہیں ہے۔ ہر راستے پر مستعد کارکن جماعت کی شکل میں میں کھڑے رہتے ہیں، جو باہر سے آنے والوں کا استقبال کرتے ہیں ان کی رہنمائی کرتے ہیں، ان کو خیموں میں پہونچاتے ہیں، کوئی اور شخص داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے روکتے ہیں، اس سلسلے میں ان رضا کاروں کی کارکردگی بہت عمدہ ہے۔ اس پورے علاقہ میں جگہ جگہ عارضی بیت الخلا اور غسل خانے بکثرت اور نہایت عمدہ قسم کے بنائے گئے ہیں، اور ہر وقت ان کی صفائی ستھرائی کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور وضو خانے بھی نہایت وافر مقدار میں ہیں۔ غرض سہولت کا بہت اچھا نظم ہے، وضو

خانوں میں تازہ بلکہ گرم پانی کا انتظام کیا گیا ہے،خیموں کے اسی حلقے میں مہمانوں کے کھانے کے لئے ایک بہت وسیع پنڈال بنایا گیا ہے، پورا پنڈال چٹائیوں کے فرش سے ڈھکا ہوا ہے، ہر ملک کی غذا اور مزاج کی رعایت کرتے ہوئے الگ الگ حلقے بنائے گئے ہیں،اہل عرب کا حلقہ الگ ہے، ہندوستان و پاکستان کا حلقہ الگ ہے، ہندوستان میں بھی اہل بنگال وآسام کا حلقہ جدا ہے۔انتظام اس طرح ہے کہ چار چار آدمیوں کا گروپ ایک دسترخوان پر بٹھایا جاتا ہے،ایک بڑی سینی میں روٹیاں،ایک بڑے پیالے میں سالن،ایک چھوٹی پلیٹ میں سلاد،ایک پیالی میں اچار اور اسی سینی میں چاول دے دیا جاتا ہے، یہ سارا سامان اسی سینی میں ہوتا ہے، وہ چاروں افراد مشترکہ طور پر کھاتے ہیں۔

دو دو رضا کار پنڈال کے ہر دروازے پر کھڑے رہتے ہیں، وہ جانے والوں کو محبت سے سلام کرتے ہیں،انہیں بیٹھنے کی جگہ بتاتے ہیں، پھر دوسرے رضا کار کھانا لاتے ہیں، کچھ اور رضا کار ہر وقت روٹیاں، سالن، چاول اور پانی لئے پھرتے ہیں، جس کو جو ضرورت ہوتی ہے فوراً حاضر کرتے ہیں،اور بڑی محبت سے پیش کرتے ہیں، بڑی خوش اسلوبی سے تمام مہمانوں کو کھانا کھلا کر بآسانی فارغ کر دیتے ہیں،اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے، پنڈال کے باہر ہاتھ دھونے کے لئے ٹونٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں،اور رضا کار بھی مستعد رہتے ہیں،صابون کا انتظام بھی ہے،سالن بکری اور گائے کے گوشت کا ہوتا ہے،جس میں آلو،لوکی، پپیتہ اور گاجر مل کر کے پکایا جاتا ہے،اس مجموعہ کا شوربہ بڑا لذیذ اور ہاضم ہوتا ہے،تلی ہوئی مچھلیاں بھی رہتی ہیں،کبھی کبھی عمدہ قسم کی بریانی بھی دی گئی۔پنڈال کے باہر ایک طرف بڑی بڑی کیتلیوں میں چائے لئے چند افراد بیٹھے رہتے ہیں،جن لوگوں کی خواہش ہوتی ہے انہیں خندہ پیشانی سے چائے پلاتے ہیں،اس سے آگے بڑھئے تو کھانا پکانے کا وسیع وعریض حلقہ ہے،جس میں بے شمار چولہے بنے ہوئے ہیں، اور بہت سے تندور گڑے ہوئے ہیں،ان میں گیس سے آگ جلتی ہے،اسی حلقے میں ایک احاطہ میں بہت سی بکریاں، بھیڑیں،اور گائے بیل بندھے ہوئے ہیں،جنہیں دونوں وقت ذبح کیا جاتا ہے،اسی حلقے میں ناریل کے پھل جن میں صرف پانی ہوتا ہے جنہیں بنگال میں ’’ڈابھ‘‘ کہا جاتا ہے، بافراط رکھے ہوتے ہیں،جس مہمان کو خواہش ہو بے تکلف لے سکتا ہے، یہ سارا انتظام مفت

ہے اور غیر ملکی مہمانوں کے لئے ہے، اس میں ملکی حضرات کا حصہ نہیں ہے۔

بنگلہ دیشی عوام کے لئے ایک بہت وسیع وعریض پنڈال کپڑوں کے خیموں کا تا حد نظر بنایا گیا ہے، جس کو حلقہ وار تقسیم کر دیا گیا ہے، یہ حضرات اپنے گھروں سے کھانے پکانے کا انتظام لے کر آتے ہیں، حتی کہ اپنے ساتھ لکڑیاں بھی لاتے ہیں، یہ لوگ پنڈال کے باہر میدان میں روکھا پھیکا پکا کر کھا لیتے ہیں۔ یہی پنڈال جلسہ گاہ بھی ہے، اسی میں اسٹیج بنا ہوا ہے، اسی پنڈال میں پانچوں وقت نماز ہوتی ہے، نماز کا انتظام یہاں اس طرح کیا گیا ہے کہ اذان سے پہلے نماز کے وقت کا اعلان کر دیا جاتا ہے، یہ اعلان لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا ہے، لیکن اذان بغیر لاؤڈ اسپیکر کے ہوتی ہے، اذان کے بعد مسلسل اعلان ہوتا رہتا ہے، لوگوں کو بلایا جاتا ہے، ہر ہر خیمے میں رضا کار پھرتے رہتے ہیں، اور پنڈال میں جانے کی تاکید کرتے رہتے ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ خیموں میں جماعت نہ ہو، انتظام کی سہولت کے لئے غیر ملکی مہمانوں کے لئے نماز کا الگ حلقہ بنا دیا گیا ہے، اس حلقہ میں جانے کا ایک خاص راستہ بنایا گیا ہے، اس حلقے میں اور اس راستے پر رضا کار دو رویہ کھڑے رہتے ہیں جو مہمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں، اور بنگلہ دیشی عوام کو ادھر آنے سے روکتے ہیں، یہ طریقہ اگر چہ مستحسن نہیں معلوم ہوتا مگر انتظام اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے، البتہ غیر ملکی حضرات پر پابندی نہیں ہے کہ وہ اس حلقے میں ضرور جائیں، وہ دوسرے مقامات پر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اذان، اقامت اور نماز سب بغیر لاؤڈ اسپیکر کے ہوتی ہے، اس لئے نماز ہونے تک ہر پل لاؤڈ اسپیکر میں اعلان ہوتا رہتا ہے کہ اب اتنا وقت باقی رہ گیا ہے، اب اذان ہونے والی ہے، اب اقامت ہوگی، مکبرین کا انتظام بہت زبردست کیا گیا ہے، اسٹیج پر میرا اندازہ ہے کہ پندرہ بیس مکبر ہوں گے، یہ امام کی تکبیر کو ایک ساتھ بہت قوت کے ساتھ بلند آواز سے دوسروں تک پہونچاتے ہیں، پھر سارا میدان مکبرین کی آواز سے گونجنے لگتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کی سہولت کے اس دور میں یہ انتظام کچھ عجیب سا لگا، علما عام طور سے نماز واذان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز قرار دیتے ہیں، ابھی ڈھاکہ شہر میں تو جانا نہیں ہوا لیکن اجتماع گاہ کی قریبی آبادیوں سے اذان کی آوازیں بکثرت آتی رہتی ہیں، پھر معلوم نہیں اس عظیم اجتماع میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال

ممنوع کیوں ہے؟ البتہ اذان سے پہلے اور اذان کے بعد، اس کے ہونے کی اطلاع اسی سے دی جاتی ہے۔ اب علما اسے سمجھیں کہ یہ طریقۂ تثویب ممنوع میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر اذان و اقامت اور نماز لاؤڈ اسپیکر سے ہوتی تو بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے، جمعہ کی دونوں اذان اور خطبہ البتہ لاؤڈ اسپیکر سے ہوا مگر نماز جمعہ میں لاؤڈ اسپیکر ممنوع رہا۔

تبلیغی اجتماعات میں تقریریں بہت ہوتی ہیں، اور بہت لمبی ہوتی ہیں، جمعہ کے روز تعلیم کے نام پر خیمے میں تقریر شروع ہوئی تو بہت دراز ہوئی، جمعہ کی نماز کے بعد ایک صاحب کی تقریر اسٹیج پر عربی زبان میں ہوئی، اس کا بنگلہ میں ترجمہ ہوا، یہ ترجمہ تو اسٹیج سے نشر ہو رہا تھا، اسٹیج کے نیچے غیر ملکیوں کے حلقوں میں کئی زبانوں کے لوگ اپنی اپنی زبان میں ترجمہ کرتے رہتے ہیں، عصر کی نماز کے بعد مغرب تک بنگلہ میں تقریر ہوئی، مغرب کی نماز کے بعد مولانا احمد لاٹ صاحب کی تقریر اردو میں ہوئی، اور ساتھ ہی ساتھ اسٹیج ہی سے بنگلہ زبان میں ترجمہ بھی نشر ہوتا رہا۔ ساڑھے چھ بجے تقریر شروع ہوئی اور ان سطور کے تحریر کے وقت جب کہ سوا نو بج چکے ہیں، تقریر کا سلسلہ جاری ہے، تھوڑی دیر کے بعد تشکیل شروع ہوئی، پونے دس بجے تشکیل بند ہوئی، اس وقت اعلان ہوا کہ اب اذان ہوگی، ہم لوگوں نے خیمے میں پہلے ہی عشا کی نماز پڑھ لی۔

آج فجر کی نماز کے بعد ایک صاحب کا وعظ ہوا، شروع میں انہوں نے متعدد آیات اور احادیث نہایت صحت کے ساتھ پڑھیں، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عالم ہیں، لیکن جب تقریر شروع ہوئی تو محسوس ہوا کہ عالم نہیں ہیں، کیوں کہ پھر اخیر تک انہوں نے کسی آیت اور کسی حدیث پر کلام نہیں کیا، ان کی طویل تقریر کا مضمون صرف یہ تھا کہ ''ساری دنیا کی ہدایت کی فکر کرنا پوری امت کی ذمہ داری ہے''۔ اسی بات کو وہ بتکرار بیان کرتے رہے اور تقریر لمبی ہوتی رہی، طول ممل کی کامیاب مثال! (یہ بھائی عبدالوہاب صاحب، امیر جماعت پاکستان تھے)

ہم لوگ جلسہ گاہ کے اس حصے میں بیٹھے تھے جو عربوں کے لئے مختص تھا، ایک صاحب تقریر کا عربی ترجمہ کر رہے تھے، وہ آج کل کے عربوں جیسی عربی بول رہے تھے، تقریر کا سلسلہ آٹھ بجے کے قریب تک چلتا رہا، اس کے بعد ناشتہ کی فرصت دی گئی، دس بجے الگ الگ خیموں میں تعلیم کے نام سے تقریروں کا سلسلہ پھر چلا، ہمارے خیمے میں ایک صاحب تقریر کر رہے تھے،

ان کی آواز جادو جگا رہی تھی، انداز بیان بہت دلچسپ تھا، الفاظ وعبارت کی بندش خاصی دلکش تھی، مگر پوری تقریر خودساختہ احادیث وواقعات سے بھری ہوئی تھی، تقریر کیا تھی؟ عجائب وغرائب کی گلزار تھی، کوئی روایت اول سے آخر تک صحیح نہیں بیان کی، اس تقریر سے بہت وحشت ہوئی، ان تقریروں سے عوام کا جو ذہن بنے گا وہ کچھ بھی ہو دینی ذہن نہ بنے گا، یہ شخص موضوع روایات کا امام معلوم ہوتا ہے، میں نے ان موضوع روایات کا ایک نوٹ تیار کیا ہے جس پر مستقبل میں مضمون لکھنے کا ارادہ ہے[۱] سوا بارہ بجے اس تقریر سے نجات ملی، ظہر کی نماز ہم لوگوں نے خیمہ میں اپنی جماعت سے ڈیڑھ بجے کے پہلے پڑھ لی، پھر اعلان ہوا کہ ڈیڑھ بجے اذان ہوگی، اور دو بجے جماعت ہوگی۔ یہاں سب نظم وضبط قابل تعریف ہے مگر نماز کا جو نظم کیا گیا ہے وہ سمجھ سے باہر ہے۔

پونے پانچ بجے عصر کی نماز بڑی جماعت کے ساتھ ادا کی، عصر کی نماز کے بعد ایک صاحب، سابق حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب علیہ الرحمہ کے طرز وانداز میں بولتے رہے، معلوم ہوا کہ ان کے صاحبزادے مولانا زبیر الحسن صاحب ہیں، یہ تقریر مختصر تھی، مغرب کی اذان ۵۵-۵ پر ہوئی، نماز کے بعد کوئی صاحب تقریر کر رہے ہیں، اس وقت ۳۷-۶ ہوئے ہے ہیں، دس منٹ قبل تقریر شروع ہوئی ہے۔

۱۷/شوال:

آج اجتماع میں آدمیوں کا ہجوم بہت آیا، دوسرے ملکوں کے لوگ بھی بکثرت آئے، کالے گورے ہر طرح کے آنے والے ہیں، فجر کے بعد جن صاحب کی تقریر ہوئی ان گلا نہایت پھنسا ہوا تھا، اس لئے کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم لوگ تھوڑی دیر مجمع میں بیٹھ کر چلے آئے، دن کے معمولات حسب معمول چلتے رہے، عصر کی نماز کے بعد مجلس نکاح منعقد ہوئی، مولانا زبیر صاحب نے خطبۂ نکاح پڑھا، اور بہت سے نکاح ہوئے، مغرب کی اذان تک ایجاب وقبول کا سلسلہ چلتا رہا۔ مغرب کی نماز کے بعد پاکستان کے مفتی زین العابدین صاحب کی تقریر ہوئی، یہ تقریر عام تبلیغی تقریروں کے برخلاف عالمانہ ہوئی، انہوں نے مردم سازی کی اہمیت پر زور دیا۔ یہ تقریر جلد ہی ختم ہوگئی، سوا آٹھ بجے تشکیل شروع ہوئی۔

۱۸؍شوال:

آج دعا ہوگی، معلوم ہوا کہ اسٹیج تبدیل کردیا گیا ہے، آج مجمع بہت ہوگا، ہر روز اعلان ہوتا تھا کہ تمام لوگ میدان میں نماز پڑھیں، لیکن آج اعلان ہوا کہ خیمے ہی میں نماز ہوگی، میدان میں نماز ۵۰-۵ پر ہوئی، اور اعلان ہوا تھا کہ خیمے میں نماز چھ بجے ہوگی، چنانچہ میدان کی نماز کے پورا ہونے کے بعد یہاں نماز شروع ہوئی، مگر مصیبت یہ ہوئی کہ ایک صاحب نے مسلسل تقریر شروع کردی، طاقتور لاؤڈ اسپیکر ہونے کی وجہ سے مسلسل خیمے میں آواز آتی رہی، اس سے پوری نماز متاثر رہی۔ کاش اتنی دیر تک اسٹیج پر خاموشی رہتی، جب کہ وہیں سے چھ بجے نماز کا حکم ہوا تھا، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغی اجتماع کا حاصل صرف تقریر اور تشکیل ہے، بولنا اور مسلسل بولتے رہنا۔ الفاظ کی بہتات مگر معانی نہایت قلیل! ساری تقریروں کا حاصل یہ ہے کہ ’’دعوت سب سے بڑا کام ہے، یہ پوری امت کی ذمہ داری ہے‘‘۔ قرآن وحدیث میں خواہ کسی عمل کی فضیلت بیان کی گئی ہو، سب کو دعوت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔

فجر کی نماز کے بعد ایک صاحب کی تقریر ہوئی، غالبًا یہ پاسکتانی تبلیغی جماعت کے امیر بھائی عبدالوہاب ہیں، انہوں نے ایک حدیث کا مضمون ذکر کیا، جس میں اللہ تعالی نے فرشتوں کو دنیا کی سب سے طاقت ور مخلوق کی خبر دی ہے، فرشتوں نے پہاڑوں کو سمجھا تھا، اللہ نے بتایا کہ لوہا اس سے زیادہ طاقت ور ہے، پھر بتایا کہ آگ اس سے زیادہ قوی ہے، پھر فرمایا کہ پانی میں اس سے زیادہ طاقت ہے، پھر ارشاد ہوا کہ ہوا اس سے زیادہ زور آور ہے، پھر اخیر میں بتایا کہ مومن کے دائیں ہاتھ کا ایسا صدقہ جس کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو، اس سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کو مقرر صاحب نے بجائے صدقہ کہنے کے اس طرح تعبیر کیا کہ ’’مومن کے دائیں ہاتھ سے نکلنے والا عمل جس کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو، اور اسے دعوت قرار دیا‘‘۔ یہی انداز تبلیغی تقریروں کا ہوتا ہے کہ مضمون کوئی ہو اسے دعوت بنا دیا جائے۔

اعلان ہوا کہ ساڑھے آٹھ بجے دعا کی مجلس ہوگی، ساڑھے آٹھ بج گئے تو یکے بعد دیگرے لوگ آنے لگے کہ پنڈال میں جلد چلو، تھوڑا سا بیان ہوگا پھر دعا ہوجائے گی، امیر صاحب نے کہا کہ دس بجے چلا جائے گا، لیکن اتنے لوگ ہانکنے کے لئے آنے لگے کہ ہم لوگ ساڑھے نو

سے پہلے پنڈال میں پہونچ گئے، آج بہت ہجوم تھا، بڑی مشکل سے تھوڑی سی جگہ بیٹھنے کی ملی، مولانا سعد بن مولانا محمد ہارون بن مولانا محمد یوسف صاحب سابق رئیس التبلیغ کی تقریر ہورہی تھی جگہ جگہ اس کے ترجمے ہورہے تھے، تقریر بہت طویل ہوگئی، اس کا بنگلہ ترجمہ اس سے بھی طویل تھا، تقریر تھی کہ ٹھہرنے کا نام نہ لیتی تھی، دھوپ کی گرمی پریشان کررہی تھی، سب بدحواس تھے، مگر تقریر جاری تھی، اور اس میں بجز تکرار کے کوئی خاص مضمون بھی نہ تھا، اسی دوران بنگلہ دیش کا صدر جمہوریہ بھی آ گیا، ایک خاص جگہ اسٹیج کے پہلو میں بنائی گئی تھی، اسی میں وہ بیٹھا، سوا بارہ بجے غالبًا کسی کے کہنے سے تقریر کا سلسلہ رکا، اس کے بعد مولانا زبیر الحسن صاحب بن مولانا انعام الحسن صاحب علیہ الرحمہ نے دعا شروع کی، خیر انہوں نے مہربانی کرکے بیس منٹ پر دعا ختم کردی، دعا میں ناقابل بیان ہجوم تھا۔ اللہ تعالی کرم فرماویں۔

مجمع دعا کے بعد آہستہ آہستہ چھٹنے لگا، ہجوم کی وجہ سے اس کے چھٹنے کی رفتار بہت سست تھی، عصر کی نماز کے بعد مولانا محمد ابراہیم صاحب خادم خاص حضرت مفتی محمود الحسن صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا محمد فاروق صاحب صاحب خلیفہ حضرت مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔

بعد نماز مغرب ایک صاحب ملے، انہوں نے بتایا کہ وہ معہد ملت مالیگاؤں کے تعلیم یافتہ ہیں، مولانا محمد حنیف صاحب ملی کے شاگرد، نام ان کا مولانا عبدالرحیم صاحب ہے۔ ان سے باتیں کرکے طبیعت کو بہت خوشی ہوئی، وہ یہیں ٹنگی سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ''ستائیس'' کے ایک مدرسہ جامعہ عثمانیہ دارالعلوم کے نائب مہتمم اور مدرس ہیں، انہوں نے بتایا کہ مدرسہ کے مہتمم مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب بھی تشریف فرما ہیں، وہ بہت عرصہ تک ممبئی میں رہ چکے ہیں، یہاں کے بہت اچھے خطیب ومقرر ہیں، پھر وہ جاکر انہیں بلا لائے، ان سے جو گفتگو شروع ہوئی تو دل کی کلی کھلتی چلی گئی۔ بنگلہ دیش آنے کے میرے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ یہاں کے مدارس میں حاضری دوں، اور یہاں کے علما سے ملاقات کروں، یہ دونوں ایسے مخلص اور محبوب ملے کہ انہیں ہم لوگوں نے غیبی امداد سمجھا، میں نے ان کے سامنے اپنا پروگرام رکھا، انہوں نے بڑی محبت سے کہا کہ اس کی ابتدا ہمارے مدرسے سے ہو، انہوں نے وعدہ کیا کہ میں کل آٹھ، نو بجے آکر اپنے ساتھ آپ حضرات کو لے جاؤں گا۔

۱۹؍شوال:

نو بجے مفتی عبدالقیوم صاحب گاڑی لے کر آئے، ہم چھ آدمی، حافظ محمد ابراہیم صاحب حاجی انور صاحب، مولوی محمد شفیع صاحب، عبداللطیف صاحب، عزیز غلام حیدر سلمہ اور میں، ان کے ساتھ ان کے مدرسہ پر گئے، یہ ضلع غازیپور ہے، یہاں کبھی ایک راجہ تھا، جس کے مختلف مقامات پر ستائیس کچہریاں تھیں، اس جگہ ترتیب کے لحاظ ستائیسویں کچہری تھی، اسی بنا پر اس مقام کا نام ستائیس ہے، بنگلہ دیش میں اس کا تلفظ ''ستیش'' ہے۔ مفتی عبدالقیوم صاحب یہاں دس بارہ سال سے مدرسہ چلا رہے ہیں، ایک مدرسہ لڑکیوں کا ہے، اور ایک لڑکوں کا۔ لڑکیوں کے مدارس یہاں کی ایک مجبوری ہے جسے دوسری جگہ ان شاء اللہ ذکر کروں گا۔ (اس مجبوری کا ذکر سفر بنگلہ دیش کے پہلے حصے میں ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں) استانیوں اور لڑکیوں کو مفتی صاحب نے پس پردہ بیٹھا دیا، اور مدرسہ کے اساتذہ اور ہمارے رفقا سامنے بیٹھے، مفتی صاحب کی فرمائش پر کچھ دیر میں نے گفتگو کی، مفتی صاحب نے بنگلہ میں اس ترجمہ کیا، پھر وہاں سے اٹھ کر اصل مدرسہ میں آئے، وہاں طلبہ اور اساتذہ انتظار میں بیٹھے تھے، تھوڑی دیر مولوی محمد شفیع صاحب کا بیان ہوا، پھر مختصر سی گفتگو میں نے کی، وہیں کھانا کھایا، ظہر کی نماز پڑھی، اور پھر بشوندھرا حضرت مولانا مفتی عبدالرحمان صاحب مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ایک ادارہ چلا رہے ہیں، جس کا نام ''مرکز الفکر الاسلامی'' ہے، اس میں تخصص فی الفقہ اور تخصص فی الحدیث کے درجات ہیں، اور ان کے علاوہ دورۂ حدیث شریف، مشکوٰۃ شریف اور حفظ کے درجات ہیں، مولانا بڑے فعال اور صائب الفکر شخصیت اور ذہن کے مالک ہیں، دیر تک علمی اور دینی باتیں کرتے رہے، جن سے ان کے وسیع علم، اصابت فکر، اعتماد علی اللہ اور ایمانی قوت کا اندازہ ہوتا رہا۔ مفتی صاحب موصوف حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب نوراللہ مرقدہ کے خلیفہ ہیں، وہاں کے دوسرے اساتذہ سے بھی ملاقاتیں رہیں، طبیعت کو بہت انس محسوس ہوا۔

مفتی صاحب کے یہاں سے اٹھ کر ہم لوگ حاجی جمیل الدین صاحب کلکتہ والے کے بڑے بھائی حاجی بشیر الدین صاحب کے گھر آئے، مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب نے اپنی گاڑی سے پہونچایا۔ رات یہاں گزاری، حاجی صاحب بہت خلیق اور مہربان آدمی ہیں، اللہ تعالی انہیں

عافیت دارین سے نوازے۔

۲۰؍شوال:

کل کی بھاگ دوڑ میں تکان بہت ہوگئی تھی، نہائے دھوئے بھی کئی دن ہوگئے تھے، آج ذرا فراغت ملی تو سب ساتھیوں نے اطمینان سے نہایا اور تکان مٹائی۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ مدنی نگر جا کر حضرت مولانا ادریس صاحب خلیفہ حضرت مدنی قدس سرہ سے ملاقات کی جائے، حاجی بشیر صاحب نے باوجودیکہ آج ان کی تین گاڑیاں مولانا ابراہیم صاحب خادم خاص حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی قدس سرہ کے قافلہ میں چل رہی تھیں، ہم لوگوں کے لئے اپنی خاص گاڑی عنایت فرمادی، اور ایک امیر مولوی امداد الحق صاحب کو ہمارے ساتھ لگا دیا، ان کے ساتھ تقریباً بارہ بجے ہم لوگ مدنی نگر کے لئے روانہ ہوئے، اندازہ نہ تھا کہ یہ جگہ کتنی دور ہے، ایک تو ڈھاکہ شہر بہت بڑا، ہجومِ مراکب کی وجہ سے جگہ جگہ گاڑی کو دیر تک رکنا پڑا، پھر شہر سے باہر نکلے تو کم از کم پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر یہ جگہ ملی، ہم لوگ پونے دو بجے دارالعلوم مدنی نگر پہونچے، یہ مدرسہ مولانا محمد ادریس صاحب کا قائم کیا ہوا ہے، اس کی عمر آٹھ دس سال سے زیادہ نہیں ہے، مگر ماشاء اللہ عمارت کے لحاظ سے بہت وسیع وعریض ہے، طلبہ کی تعداد بھی بہت ہے، مگر افسوس یہ ہوا کہ مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی، وہ اپنے وطن سندیپ گئے ہوئے ہیں، اور ۲۸؍شوال کو واپس تشریف لائیں گے۔ سندیپ چاٹگام کے قریب ایک جزیرہ ہے، آج ہمیں چاٹگام جانا ہے، دل میں قصد ہوا کہ چاٹگام پہونچ کر ان سے ملاقات کا شرف حاصل کریں گے، ان کے بڑے صاحبزادے مولانا فیض اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی، یہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں، ۱۹۹۳ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی ہے، خانوادۂ مدنی کے اثرات سے منور ہیں، عجلت میں بہت عمدہ ضیافت کی، طبیعت خوش ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ مولانا بہت حوصلہ مند طبیعت کے مالک ہیں، وہ جگہ جگہ مدارس قائم کرتے ہیں، اب تک ۸۸؍ مدارس قائم کر چکے ہیں، ماشاء اللہ بنگلہ دیش کے علما میں دینی تعلیم کا خاصا جوش ہے، اور ایسا ہونا اس ملک کے لئے بہت ضروری ہے، یہاں کے عام باشندوں کو دیکھئے تو ہندو اور مسلمان کا امتیاز نہیں محسوس ہوتا، حکومت کی رو بھی اسلام کے بالکل خلاف ہے، اگر یہ علما سر اور دھڑ کی بازی نہ لگا دیں تو یہ ملک

ہندوؤ اور انگریزوں کے شکنجے میں پھنس کر رہ جائے گا۔

تین بجے وہاں سے واپسی ہوئی، اور چار بجے کے بعد قیام گاہ پر پہونچے۔

آج رات میں چاٹگام روانہ ہونا تھا، شاہجہاں بھائی نے سات ٹکٹ انٹرسٹی ٹرین سے ریزرو کرالئے ہیں، ۱۱ر بجے شب میں ٹرین ہے، اسٹیشن پہونچے تو ٹرین کھڑی تھی، یہ اسٹیشن بھی عجیب ہے، عمارت بالکل سادہ ہے مگر بہت خوبصورت ہے، پلیٹ فارم بہت وسیع ہیں، باہر سے عمارت دیکھئے تو بالکل کمل کا پھول معلوم ہوتی ہے، ایسا ریلوے اسٹیشن ابھی تک نظر سے نہیں گزرا تھا، چھوٹی لائن کی ٹرین انٹرسٹی بھی بہت خوبصورت ٹرین ہے، بیٹھنے کے لئے بسوں کی طرح دونوں طرف دو دو آدمیوں کی نشست گاہیں ہیں، بیچ میں اچھی خاصی جگہ ہے۔ اس ٹرین میں نماز پڑھنے کے لئے مخصوص جگہ ہے، ہرے رنگ کی یہ ٹرین بہت اچھی رفتار سے چلتی ہے، لیکن چھوٹی لائن کی اور لمبی ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ہلتی ہے، ٹکٹ صرف بیٹھنے کا تھا، لیٹنا ممکن نہ تھا، اس لئے بیٹھے بیٹھے اونگھنے سے بہت زحمت ہوئی، رات بھر ٹرین چلتی رہے۔

۲۱ر شوال:

صبح چھ بجے ٹرین چاٹگام پہونچی، وہاں حاجی بشیر الدین صاحب کا آدمی موجود تھا، ان کی کار پر اور ایک آٹو رکشہ پر جسے یہاں ٹیکسی کہتے ہیں، لد کر ہم لوگ حاجی صاحب کے مکان پر پہونچے، یہاں قدرے آرام کیا اور ناشتہ کر کے دار العلوم معین الاسلام ہاٹ ہزاری جانے کا پروگرام بنا۔ ہاٹ ہزاری کا یہ مدرسہ بہت قدیم اور بڑا ہے، حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے خلیفہ حضرت مولانا ضمیر الدین صاحب چاٹگامی اور مولانا حبیب اللہ صاحب اس کے بانی تھے، یہ مدرسہ طلبہ کی تعداد کے اعتبار سے بہت بڑا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے کہا کہ دار العلوم دیوبند سے بھی یہ بڑا مدرسہ ہے، ہاٹ ہزاری قریب آیا تو نگاہوں کو تلاش ہوئی کہ مدرسے کے آثار نظر آئیں، مگر کم نظر آئے، مدرسے میں حاضری ہوئی، یہ مدرسہ بہت گنجان عمارتوں پر مشتمل ہے، اندر پہونچے تو عجیب طرح کی بو کا احساس ہوا، جس سے سانس گھٹنے لگی، پانی تالاب، ناریل کے درختوں سے بھرا ہوا یہ مدرسہ عجیب بند بند سا لگتا ہے، طلبہ کی تعداد واقعی بہت ہے، سات آٹھ سو طلبہ تو صرف دورۂ حدیث میں ہیں، معلوم ہوا کہ کل چار ہزار طلبہ ہیں، صفائی کی طرف زیادہ توجہ

نہیں ہے، مہتمم صاحب مولانا احمد شفیع صاحب کے بارے معلوم ہوا کہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے خلیفہ ہیں۔جی چاہا کہ کتب خانہ کی زیارت کریں مگر وہ بند تھا،اور مہتمم صاحب نے اس کے کھلوانے کی طرف توجہ نہیں دی،مہتمم صاحب نے بتایا کہ ۲۱؍سو طلبہ کی جاگیر[۲] اطراف کی آبادیوں میں ہے،اور باقی کو مطبخ سے کھانا دیا جاتا ہے، جاگیر والے طلبہ عصر کی نماز کے بعد اپنی اپنی جاگیروں پر چلے جاتے ہیں، رات کو وہیں رہتے ہیں، صبح کھانا کھا کر مدرسہ میں آتے ہیں، ساڑھے دس بجے سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، درمیان میں ظہر کی نماز کا وقفہ ہوتا ہے، عصر کی نماز کے وقت چھٹی ہوتی ہے۔

ظہر کی نماز مدرسہ کی مسجد میں ادا کی،نماز کے بعد ایک استاذ مولانا محمد ہارون صاحب ملے،ظہر کے پہلے وہ ترمذی شریف کا درس دے رہے تھے،اس میں تھوڑی دیر کے لئے ہم لوگ بیٹھے تھے،اردو میں پڑھا رہے تھے مگر بنگالی لہجہ ہونے کی وجہ سے ہم پوری بات نہیں سمجھ پا رہے تھے،اب وہ ملے اور بہت اخلاق سے ملے، پھر ایک دوسرے استاذ مولانا ارمان صاحب کے پاس لے گئے، یہ معمر آدمی ہیں، شاعری کا ذوق رکھتے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں، یہاں دیر تک بیٹھنا ہوا، انہوں نے چائے پلائی۔آج دن بھر بارش ہوتی رہی، ہم لوگ ایک کرایہ کی گاڑی سے آئے تھے، رہبر ہمارے ایک صاحب خالد نامی تھے، جو حاجی بشیرالدین صاحب کے یہاں ملازمت کرتے ہیں، وہی ہم لوگوں کے رہبر متعین کئے گئے تھے، کرایہ والی گاڑی واپس ہوگئی تھی، وہاں ایک بڑا آٹو رکشہ منگوایا گیا، اور اس سے اسی دیار کے مفتی اعظم حضرت مولانا فیض اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے مدرسہ روانہ ہوئے۔اس مدرسہ میں تعلیم شرح وقایہ تک ہے، مگر طلبہ کی تعداد دو ہزار ہے، یہاں تھوڑی دیر ٹھہرے، ایک صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل ملے، بہت لطف ومحبت کے ساتھ پیش آئے، یہاں طلبہ سے بھی قدرے گفتگو ہوئی، اچھے بچے محسوس ہوئے۔

مفتی فیض اللہ صاحب بعض مسائل میں متفرد بلکہ متشدد تھے، انہوں نے بہت سے رسائل لکھے ہیں، جن میں ان کے تفردات موجود ہیں، جی چاہا کہ یہ رسائل حاصل کر لئے جائیں، مگر وہاں اتفاق سے کوئی رسالہ نہ مل سکا، ایک صاحب نے بتایا کہ ہاٹ ہزاری بازار میں ملیں گے یہ جگہ ہاٹ ہزاری سے نو دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، ہمیں لوٹ کر ہاٹ ہزاری جانے کا موقع نہ

تھا،انہیں فاضل دیوبند سے گزارش کی کہ آپ وہ رسائل لے کر چاٹگام شہرتشریف لائیں،شہر میں ان کے بچے وغیرہ رہتے ہیں،ہم وہاں قیمت ادا کر کے لے لیں گے،انہوں وعدہ بھی کیا مگر معلوم نہیں کیا عذر مانع ہوا کہ وہ تشریف نہیں لائے؟۔

مدرسہ فیضیہ سے نکل کر کچھ فاصلے پر ایک اور مدرسہ تجوید القرآن فیضیہ میں حاضری ہوئی،اس میں چند منٹ رہے،نائب مہتمم صاحب ملے،وہ بہت خلوص کے ساتھ رکنے کے لئے اصرار کر رہے تھے،مگر موقع نہ تھا،کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا،رفقا بھوکے تھے،اس لئے عجلت تھی، واپس لوٹ کر چاٹگام میں عصر کی نماز ادا کی اور کھانا کھایا۔

۲۲رشوال:

آج جمعہ کا دن ہے قصد یہ ہوا کہ قصبہ پٹیہ میں ایک بڑا مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم ہے، جس کا نام اب اہل عرب کے ذوق کی رعایت کرتے ہوئے الجامعۃ الاسلامیہ کر دیا گیا ہے،آج اس کی زیارت کی جائے،کل چند مدرسوں میں جا کر جو تجربہ ہوا تھا اس کی روشنی میں یہ خیال ہوا تھا کہ جائیں گے،ایک نظر دیکھیں گے،کسی سے ملاقات ہوئی تو ہوئی نہ ہوئی تو نہ ہوئی،بس جلد ہی لوٹ آئیں گے،ہمارے رہبر محمد خالد صاحب بتا رہے تھے کہ وہاں سے واپسی میں خبیری مدرسہ میں چلیں،ان کا گھر وہاں سے قریب ہے،اور جمعہ کی نماز بھی وہیں پڑھی جائے،گیارہ بجے ہم لوگ چاٹگام سے نکلے،تقریباً بارہ بجے مدرسہ میں پہونچے،اس مدرسہ کی عمارت سلیقے کی اور کشادہ نظر آئی،گھٹن نہیں محسوس ہوئی، یہاں کے مہتمم صاحب سے ڈھاکہ میں ملاقات ہو چکی تھی،ایک دو صاحب سے ملاقات ہوئی مگر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی،مہتمم صاحب کو معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ وہ موجود ہیں،خوشی ہوئی،ہمارے رہبر نے ان کی آفس میں بیٹھا دیا،اور خود ان کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے،جو آفس کے اندر ہی تھا،مگر ادھر سے کوئی آواز نہیں آئی،اتنے میں ایک صاحب اندر تشریف لائے مگر اس طرح جیسے انہوں ہم چار پانچ آدمیوں کے وجود کو دیکھا ہی نہیں،میں آخری سرے پر بیٹھا تھا،جب وہ میرے قریب آئے تو سلام کر کے میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا،اس کے بعد وہ چونک چونک کر سب سے مصافحہ کرنے لگے،ایسا محسوس ہوا جیسے اب انہوں نے دیکھا ہو،ہم نے مہتمم صاحب تک اپنی آمد کی اطلاع پہونچانے کو ان سے کہا،وہ چلے گئے اور

تھوڑی دیر کے بعد آ کر حکم سنایا کہ مہمان خانہ میں تشریف لے چلیں، ہم لوگ مہمان خانے میں آ گئے، یہاں انہوں نے چائے پلائی، اور پھر مدرسہ کی تفصیلات اور اس کے کارنامے بیان کرنے لگے، اتنے میں جمعہ کی اذان ہوگئی، میں وضو سے فارغ ہوکر مسجد کی طرف چلا تو انہوں نے فرمایا کہ جمعہ سے قبل پندرہ منٹ تقریر کردیں، میں نے حکم کی تعمیل کردی، مہتمم صاحب مولانا محمد ہارون صاحب نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد مہتمم صاحب سے ملاقات ہوئی، یہ بہت فعال اور حوصلہ مند بزرگ ہیں، دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر انہیں مولوی صاحب کے ساتھ مدرسہ کو دیکھنے کے لئے بھیج دیا، مدرسہ کی عمارتیں بہت عمدہ ہیں اور اکثر چار منزلہ ہیں، اس کے چار پانچ احاطے ہیں، کتب خانہ بھی دیکھا خاصا نظر آیا۔

واپس آ کر کھانا کھایا، یہاں کا عجیب دستور ہے، کھانے پر میزبان شریک نہیں ہوتا، مہتمم صاحب تو سرے غائب تھے، مولوی صاحب جو ہمارے ساتھ پھر رہے تھے، وہ بھی دسترخوان پر بٹھا کر چلے گئے، کھانے کے بعد مہتمم صاحب تشریف لائے، انہوں نے مدرسہ کی عمارتوں کا البم اور کلینڈر دیا، اس مدرسہ کے بانی ایک بزرگ عالم حضرت مفتی عزیز الحق صاحب علیہ الرحمہ ہیں، ان کی سوانح حیات ''تذکرۂ عزیز'' بھی عنایت کی، غلام حیدر سلمہ نے ایک کتاب قیمۃً خریدی، اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے گاڑی پر آئے، اور چاٹگام کی طرف واپس ہوئے، کچھ دور چل کر محمد خالد صاحب نے گاڑی کو ایک ضمنی راستہ پر موڑ دیا، تین چار کلومیٹر چلنے کے بعد ھٹہزاری کے مدرسے میں پہونچے، یہ مدرسہ اس علاقہ کا سب سے قدیم مدرسہ ہے، حضرت مفتی عزیز الحق صاحب نے یہیں مکمل تعلیم حاصل کی تھی، فراغت کے بعد دیوبند اور سہارنپور تشریف لے گئے، پھر بارہ تیرہ سال تک یہیں پڑھایا، اس کے بعد پٹیہ والا مدرسہ قائم کیا، اس لحاظ سے ھٹہزاری کا یہ مدرسہ اس علاقے کے لئے ام المدارس ہے۔

وقت کم تھا، تھوڑی دیر وہاں ٹھہرے، یہ بھی خوب کشادہ جگہ میں سلیقہ کی عمارتوں پر مشتمل ہے۔ عصر کی نماز چاٹگام کی شاہی مسجد میں ادا کی، یہ بہت بڑی اور زمین سے کافی اونچائی پر ہے، جماعت ہوچکی تھی، ہم لوگوں نے اپنی جماعت خارجِ مسجد اس کے احاطہ میں کرلی۔

رات کو ایک صاحب ہرداس پور ضلع مئو کے رہنے والے ملے، وہ اب یہاں کے شہری

ہیں، صاحب حیثیت معلوم ہوئے، محمد رضوان نام ہے، ان سے مل کر طبیعت کو بہت انس ہوا، انہوں نے صبح ناشتہ کی دعوت دی، ہم لوگوں کو سات بیس کی انٹرسٹی سے واپس جانا ہے، انہوں نے کہا کہ ان شاء اللہ گاڑی پر بروقت پہونچا دوں گا۔

۲۳؍شوال:

آج ناشتہ محمد رضوان صاحب کے یہاں ہوا، سب کچھ تیار کر رکھا تھا، اپنی گاڑی پر لے گئے، ناشتہ سے فارغ کر کے انہوں نے اپنی گاڑی سے اسٹیشن پہونچا دیا، ہم لوگ آرام سے سوار ہو گئے۔

آج یہاں شہید دیوس منایا جا رہا ہے، پاکستان کے زمانے میں سرکاری زبان اردو تھی، بنگالیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، حکومت نے گولی چلوا دی، جس میں کئی آدمی مر گئے، یہی مسئلہ بنگلہ دیش بننے کا پیش خیمہ بنا، ان مرنے والوں کی جگہ جگہ یادگاریں بنا دی گئی ہیں، اور لوگ ان پر پھول چڑھاتے ہیں، پھول چڑھانے والے مرد بھی اور عورتیں بھی جھنڈ کی جھنڈ ننگے پاؤں سڑک پر نظر آرہے تھے، بالکل ہندوانہ رسم! اور اس میں زیادہ تر ہندو ہی تھے بھی، مسلمان کم۔ ایک مسلمان ملک میں یہ کافرانہ رسم دیکھ کر بہت وحشت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ معاف کریں۔

۲۰۔۱۱؍ پر ٹرین چلی اور ڈیڑھ بجے ڈھاکہ اسٹیشن پر پہونچی، وہاں سے ہم لوگ حاجی بشیر الدین صاحب کے یہاں آئے، حاجی صاحب کراچی جا چکے تھے، ظہر کی نماز پڑھی، کھانا کھایا حضرت مفتی عبد الرحمان صاحب کو ٹیلیفون کیا، انہوں نے حکم دیا کہ رات کا کھانا یہیں کھائیے، چنانچہ انہوں نے عشا کے پہلے گاڑی بھیج دی، اور ہم لوگ ان کے مدرسہ پر حاضر ہو گئے، ان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی، اس لئے ہم لوگوں کی ان سے ملاقات نہ ہو سکی، معلوم ہوا کہ وہ سو گئے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہاں کے ایک مدرس مفتی انعام الحق صاحب نے ایک صاحب کا تعارف کرایا کہ بہت مجاہد ہیں، بابری مسجد جب شہید ہوئی تھی تو انہوں نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ لانگ مارچ کیا تھا، بارڈر تک گئے تھے، اس وقت بنگلہ دیش میں ان کی ایک اچھی سیاسی حیثیت ہے، اس کے ساتھ ساتھ الجامعۃ العربیۃ القرآنیۃ لال باغ ڈھاکہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث

بھی ہیں، ابھی یہ تعارف چل ہی رہا تھا کہ ایک صاحب بہت مستعد، چاک وچوبند آتے ہوئے نظر آئے، بہت خوش مزاج، عمر پچاس کے لگ بھگ، معلوم ہوا کہ یہی صاحب ہیں جن کا تعارف ہو رہا تھا، ان سے مل کر طبیعت کو بڑا انس معلوم ہوا، یہ ہیں مولانا فضل الحق امینی، انہوں نے دعوت دی کہ کل لال باغ تشریف لائیں، ظہر کی نماز میں وہاں جانا طے ہوا۔

۲۴؍شوال:

آج مفتی عبدالرحمان صاحب کے ادارہ میں سب طلبہ واساتذہ روزے سے ہیں، چھ روز شوال کے روزے یہ لوگ رکھیں گے۔

ہم لوگ بشوندھرا سے بذریعہ آٹو رکشہ مالی باغ کے مدرسہ میں آئے، جہاں مفتی شفیق الاسلام صاحب سے ملنا تھا، مگر معلوم ہوا کہ اب وہ مدرسہ میں نہیں ہیں، وہاں سے نکلے تو آٹو رکشہ ہی سے لال باغ کے مدرسہ میں آئے، یہ پرانا ڈھاکہ ہے، ظہر کی نماز ہو چکی تھی، اپنی جماعت کی، نماز کے بعد کھانا کھایا، اس کے بعد مولانا امینی کے حکم سے طلبہ واساتذہ کے مجمع میں آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ خطاب کیا، وہاں سے فارغ ہو کر ڈھاکہ کی مشہور مسجد بیت المکرّم میں آئے، یہ مسجد باہر سے خانہ کعبہ کے مثل دکھائی دیتی ہے، بہت بڑی مسجد ہے، اسی میں عصر پڑھی، مغرب پڑھی، عشا پڑھی، بنگلہ دیش میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ مسلسل تین نمازیں جماعت سے مسجد میں ادا کی گئیں، ورنہ اب تک قیام گاہ ہی میں جماعت ہوتی رہی ہے، عشا کے بعد شاہجہاں صاحب کے بہنوئی علاؤالدین صاحب کے یہاں دعوت تھی، وہاں آکر کھانا کھایا، پھر حاجی بشیرالدین صاحب کے یہاں آکر سو گئے۔

۲۵؍شوال:

آج ڈھاکہ سے روانگی ہے، بس کے آٹھ ٹکٹ خریدے گئے، وقت ساڑھے دس بجے شب کا ہے، اس سے بَدّ اندی تک جائیں گے، ندی کو لانچ سے عبور کریں گے، اس پار دوسری بس ملے گی، اس سے جیسور تک جائیں گے، جیسور کچھ دیر ٹھہرنا ہے، ڈھاکہ سے جیسور کا کرایہ سو روپیہ ہے، یہ عام بس ہے، اے سی ہوتا تو ۱۸۰؍روپئے کرایہ ہوتا۔

رات کا کھانا حاجی بشیرالدین صاحب کے یہاں کھایا، کھانے کے بعد ان کے یہاں

کے منتظم علاؤالدین نے گاڑی سے ہم لوگوں کب تلی بس اڈہ پر پہونچایا، آدمی زیادہ تھے اور گاڑی میں گنجائش کم تھی، اس لئے ایک آٹو رکشہ بھی کیا گیا، بس میں سوار ہو گئے، وہ پونے گیارہ بجے کھلی، آرام دہ بس نہ تھی، راستہ بھی بن رہا تھا اس لئے بہت خراب تھا پون بجے دریا کے کنارے پہونچے سامان اتار کر لانچ میں سوار ہوئے، وہ تھوڑے سے وقفہ کے بعد آدھ پون گھنٹہ میں دوسری طرف اتار دی، وہاں سے پھر اسی کمپنی کی دوسری بس پر ہم لوگ سوار کر دیئے گئے، دو بجے کے بعد بس چلی اور ساڑھے پانچ بجے جیسور کی جامع مسجد کے پاس اتار دیا

۲۶ رشوال:

فجر کی نماز جیسور کی جامع مسجد میں پڑھی، یہ مسجد خاصی وسیع اور سہ منزلہ ہے، لیکن صفائی کا اہتمام نہیں ہے، مچھر اتنے کہ اب تک کسی جگہ اتنے مچھر سے سابقہ نہیں پڑا تھا، نماز پڑھ کر شرف الدین صاحب کے مکان پر آئے، وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، آج یہیں قیام ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد وہاں ایک مدرسہ، مدرسہ قاسمیہ میں اساتذہ کے درمیان قدرے گفتگو ہوئی، یہ مدرسہ درجہ حفظ اور ہدایۃ النحو کی جماعتوں پر مشتمل ہے، عشا کی نماز کے بعد وہیں مسجد میں وعظ ہوا، زبان کی اجنبیت عجیب چیز ہے، اس سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔

۲۷ رشوال:

آج بنگلہ دیش سے واپسی ہے، میکرو سے جیسور سے بنیا پول آئے، وہاں قانونی مراحل کی تکمیل سے فرصت ہوئی اور لوکل سے سیالدہ واپس آئے، ساڑھے چھ بجے شام کو نارکل ڈانگہ کلکتہ مسجد پہونچے۔

۲۹ رشوال:

آج جمعہ کی نماز سے پہلے آدھ گھنٹہ وعظ ہوا۔ ''**واعتصموا بحبل الله جميعاً**'' موضوع تھا، کل الیکشن ہونے والا ہے، میں نے تلقین کی کہ ووٹ دینے کے سلسلے میں اپنی رائے پر قائم رہیں لیکن لڑائی جھگڑے سے احتراز کریں۔

جمعہ بعد سے شکم میں تکلیف شروع ہوئی، جو بڑھتے بڑھتے عشاء کے وقت غیر معمولی ہوگئی، عشا کی نماز جماعت سے نہیں پڑھی، آج ہی ساڑھے گیارہ بجے روانگی ہے، سوا دس بجے

ڈاکٹر آیا، انجکشن لگایا، قدرے راحت ہوئی تو عشا کی نماز پڑھی، اور پونے گیارہ بجے ہوڑہ کے لئے نکل پڑا، ٹرین وقت پر تھی۔

ٹرین کو صبح ساڑھے نو بجے مغل سرائے پہونچ جانا چاہئے تھا، مگر وہ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ پہونچی، ٹھیک گیارہ بجے پلیٹ فارم پر لگی، منشی جی اور محمد عارف سلمہ گاڑی لے کر پہونچے تھے، مولانا غلام رسول صاحب کو اطلاع کی تھی مگر نہ آسکے، بنارس میں تھوڑی دیر حاجی منظور صاحب کے یہاں ٹھہرے، معلوم ہوا کہ مفتی ابوالقاسم صاحب آج حج کے لئے جارہے ہیں، وقت نہ تھا کہ ان سے ملاقات کرتا، ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔

ظہر کی نماز دیوگاؤں میں پڑھی، حاجی کبیر صاحب (برادر نسبتی مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ) سے ملاقات ہوئی، بہت اچھی طرح ملے، رانی کی سرائے میں مولوی محمد شفیع صاحب اتر گئے، عصر کی نماز کے وقت مدرسہ پہونچے، معلوم ہوا کہ بھیرہ حاجی محمد صدیق صاحب کے والد مظفر حسین کا انتقال ہوگیا، کئی اساتذہ وہیں ہیں، اور مبارک پور میں قاضی اطہر صاحب علیہ الرحمہ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا ہے، مولوی حکیم الدین صاحب وہاں گئے ہیں۔

آج بھائی محمد بلال کے فرزند مولوی عبدالقدوس سلمہ کا ولیمہ ہے، مغل سرائے میں ارادہ کیا تھا کہ سیدھا بھیرہ چلا جاؤں مگر طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ہمت نہ پڑی۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مضمون لکھنے کا ارادہ تو شاید شرمندۂ عمل نہ ہوسکا مگر ہاں حضرت والد صاحب کے روزنامچہ میں ''موضوعات یونسی'' کے عنوان سے ہم کو ایک صفحہ ملا ہے جو بنگلہ دیش کے اجتماع ہی سے متعلق ہے، ہم ذیل میں کچھ موضوع روایات بطور عبرت ونصیحت کے درج کرتے ہیں۔

[۱] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'ھنیئا لک یاعمر!' عمر! تمہیں خوش خبری ہو کہ میری امت کے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے، حضرت عمر نے عرض کیا کہ یہ تو بہت کم ہیں، تب فرمایا کہ ان ستر ہزار میں سے ہر ایک ستر ہزار کو جنت میں لے جائے گا، حضرت عمر نے اسے بھی کم محسوس کیا، تو حضور نے اتنا ہی اور بڑھایا۔

[۲] حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتقال کے وقت چوراسی ہزار کے مقروض تھے، حضرت ابن عمر نے

لوگوں سے کہا کہ میرے باپ کا قرضہ معاف کردو، اور اسے مجھ سے وصول کرلو، لوگوں نے کہا کہ جب ہم نے عمر کو معاف کیا تو عمر کے بیٹے کو بھی معاف کردیا۔

[۳] حضورﷺ نے فرمایا کہ اے حمزہ! اگر صفیہ کا خوف نہ ہوتا تو تجھے دفن نہ کرتا، اور ایسے میدان میں چھوڑتا کہ درندے جانور تمہاری بوٹیاں نوچتے، پھرتم میدان قیامت میں مختلف جگہوں سے اکٹھا ہوکر آتے۔

[۴] حضورﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آخر زمانے میں ایک آدمی کی محنت سے پچاس آدمیوں کا نتیجہ نکالیں گے۔

[۵] حضرت عبداللہ بن مبارک کی دوکان پر یہود ونصاری کا ہجوم کرنا اور مہینوں انتظار کرنا اور یہ کہنا کہ ہم کپڑا اسی دوکان سے خریدیں گے، کیوں کہ ان کی دوکان کے کپڑوں کے پہننے سے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ دعوت کے کام کی برکت تھی۔

[۶] کچھ لوگوں سے فرشتے کہیں گے کہ جنت میں چلو، وہ انکار کردیں گے، فرشتے پوچھیں گے کہ پھر کہاں جاؤ گے؟ وہ کہیں گے ''جہنم میں'' اور پھر جہنم میں جا کر بہت سے لوگوں کو جہنم سے نکالیں گے۔

اس سے عمومی اور خصوصی گشت ثابت کیا۔ قرآن میں ہے "**ما لهٰذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق**'' اس سے عمومی گشت نکلتا ہے۔ بازار میں گشت کریں گے، تاکہ مسجد کو بھریں، پھر یہی لوگ جہنم میں گشت کریں گے، تاکہ جنت کو بھریں۔

[۷] حضرت عبداللہ بن مسعود کی ٹانگوں کا وزن احد پہاڑ کے برابر ہے۔ صہیب رومی حوض کوثر پر حضور کے ہاتھوں سب سے پہلے پانی پئیں گے۔ ابودرداء سے فرشتے سب سے پہلے مصافحہ کریں گے۔ جنت سلمان وعمار کی مشتاق ہے۔ معاویہ بن معاویہ کا انتقال ہوا تو اس روز سورج میں روشنی ہر روز سے بہت زیادہ تھی، آپ نے بتایا کہ ستر ہزار فرشتے سورج کے ساتھ آئے تھے۔ انتقال مدینہ میں ہوا، حضور اس روز تبوک میں تھے، جنازہ تبوک میں لایا گیا، بقیع میں دفن کئے گئے۔ ''ان سب کے پیچھے ایک محنت تھی''۔

[۸] دعوت کے کام پر سو سو نسلوں تک اللہ رعایت کرے گا۔ (حضرت جی)

[۹] دین اور دین کی محنت اسے ملے گی جسے اللہ پسند کرے گا۔

(۲) جاگیر پہلے عام طور سے مدارس کے نظام کا ایک حصہ ہوا کرتی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ مدرسہ کے اطراف اور محلّہ کے لوگ اپنی حیثیت کے اعتبار سے طلبہ کو اپنے یہاں بطور مہمان کھلانے کی ذمہ داری لے لیتے تھے، جو طلبہ جس گھر میں متعین ہوتا وہ گھر مدارس کے اصطلاح میں اس طلبہ کی جاگیر کہی جاتی تھی۔

تبصرے

(۱) وقفۃ مع اللامذہبیۃ
(۲) مسائل غیر مقلدین
(۳) فیضان محبت
(۴) تقریر دلپذیر
(۵) الفوز الکبیر
(۶) صدیق اکبر۔ایک انسان کامل
(۷) مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں
(۸) افادات صدیق
(۹) حیات ابوالمآثر
(۱۰) مقالات ابوالمآثر
(۱۱) نصرۃ الحدیث (عربی)
(۱۲) تعدیل رجال بخاری
(۱۳) دارالاسلام اور دارالحرب
(۱۴) بیمہ اور اس کا شرعی حکم
(۱۵) عظمت صحابہ
(۱۶) ابطال عزاداری
(۱۷) رحمۃ اللہ الواسعۃ (تین تبصرے)
(۱۸) اللؤلؤ والمرجان فی لطائف القرآن
(۱۹) مسئلہ امام مہدی
(۲۰) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں
(۲۱) زندگی سے لطف اٹھایئے

نام کتاب	:	وقفة مع اللامذهبیه فی شبه القارة الهندیه
مؤلف	:	مولانا ابوبکر غازی پوری
صفحات	:	۳۸۹
قیمت	:	درج نہیں
ناشر	:	المکتبۃ الاثریہ قاسمی منزل سیدواڑہ غازی پور

مثل مشہور ہے کہ چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں اور گیڈر کی شامت آتی ہے تو شہر کی جانب بھاگتا ہے۔ ہمارے ملک میں، ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے والوں کا ایک ٹولہ ہے جو اپنے عمل اور سیرت واخلاق کے لحاظ سے حدیث اور سنت کی تعلیمات کے ٹھیک برعکس ہے، لیکن اپنا بورڈ ''اہل حدیث'' کے عنوان سے سجائے ہوئے ہے، اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے، بس یہی ڈیڑھ سو سال کے لگ بھگ سے اس کا وجود ہے، میاں نذیر حسین صاحب بہاری ثم دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء) اس کے بانی اول ہیں، پھر اس کے بطن سے رفتہ رفتہ متعدد مسائل پیدا ہوئے، رفع یدین، آمین بالجہر، قرأۃ خلف الامام، آٹھ رکعت تراویح، ایک مجلس کی تین طلاق تین نہیں ایک ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل پر چیلنج بازیاں ہوئیں، اس وقت سے اب تک ان مسائل پر اتنا شور وغوغا مچایا گیا جیسے مقلدین بالخصوص احناف ان مسائل میں یکسر خلافِ سنت عمل کرتے چلے آرہے ہوں، اور اس پر مزید یہ کہ تقلید کی وجہ سے ہر مقلد شرک کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ علماءِ احناف نے ان سب مسائل میں اپنا موقف واضح اور قوی دلائل سے ثابت کیا، مگر وہاں ایک انکار کا انکار رہا، اب تک اس حلقہ سے (حلقۂ غیر مقلدین سے) اسی طرح کے مسائل پر تحریری وتقریری پٹاخے پھوڑے جاتے رہے، لیکن انہیں محسوس ہوا کہ اب ان پٹاخوں میں دم نہیں، صرف آواز ہو کر رہ جاتی ہے، نہ کسی کا چہرہ جھلستا ہے، نہ کسی کے آنکھ سے پانی

آ تا، اور نہ کوئی اس پر چونکتا۔ اس ٹولے کا وجود چونکہ منفی بنیادوں پر ہے، اس کی زندگی صرف اس پر ہے کہ کسی کی نفی کرتا رہے، اسی لئے سال بسال یہ منفی اشتہارات سے اپنی زندگی بڑھاتا رہتا تھا، مگر اب پرانے منفی مسائل کی جب جان نکل گئی تو اسے نئے میدان کی تلاش ہوئی، اب وہ وقت آیا کہ گیڈر کی شامت آئے، اب تک ان مسائل علمیہ پر زور آزمائی تھی، جو دور صحابہ سے مختلف فیہ چلے آرہے تھے، اور یہ سب مسائل بجز معدودے چند، وہ تھے جو ائمہ اربعہ میں کسی نہ کسی کے یہاں معمول بہا تھے، اس لئے اس کی آبرو ان بزرگوں کے دامن میں کسی حد تک محفوظ رہ جاتی تھی، مگر اب جو شامت آئی تو ان مسائل کو چھوڑ کر غیر مقلدیت کا گیڈر علماءِ اہل حق، جن کے ذریعہ ہندوستان کے اندر دین اور علم دین کی آبرو اللہ تعالی نے باقی رکھی ہے، جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اللہ کے دین کی حفاظت کی ہے، یعنی علماء دیوبند۔ غیر مقلدیت کا گیڈر ان کی آبادی کی طرف دوڑنے لگا۔ کسی صاحب نے عربی میں ایک کتاب تیار کی، اور اس میں قدم بقدم مشہور بریلوی مقرر ارشد القادری کی بدنام زمانہ کتاب ''زلزلہ'' کی پیروی کی، نام اس کا اس کے دوہرے مصنف نے ''**الدیوبندیة تعریفها وعقائدها**'' رکھا۔ جس طرح زلزلہ میں ارشد القادری نے اپنے مسلک کی روایتی فنکارانہ خیانت سے کام لے کر علما دیوبند کے سر بے بنیاد اتہام والزام لگائے ہیں، اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کا انہیں کبھی تصور بھی نہیں آیا، اور جس طرح اس نے جزئی واقعات کی رائی کو اصول وکلیات کا پہاڑ بنادیا ہے، اور جس طرح اس نے اپنے مزعومات وخیالات کو علمائے دیوبند کے سر پر چپکا کر انہیں داغدار بنانے کی کوشش کی ہے، ٹھیک اسی طرح الدیوبندیۃ کے مصنف نے خیانت، الزام تراشی کی بنیادوں پر دجل وفریب کی عمارت کھڑی کی ہے، غیر مقلد مصنف نے بریلویت کی تقلید کی۔ بس فرق یہ رہا کہ بریلوی نے اردو میں کتاب لکھی، اور غیر مقلد نے عربی میں کتاب لکھی، کیوں کہ اسے اہل عرب کو فریب دینا تھا۔

یہ ایک نازک سوال ہے کہ ہندوستان یا پاکستان میں بیٹھ کر یہاں کا مصنف دیوبندیت کی تردید عربی میں کیوں تحریر کرتا ہے، کیا ہندو پاک کی عوام کو وہ مزعومہ دیوبندیت کے مشرکانہ عقائد واعمال پر متنبہ کر چکا ہے کہ اب اس سے آگے بڑھ کر وہ اہل عرب کے سامنے اس کی گمراہی

پیش کرتا ہے؟ اگر یہ کام واقعی خلوص سے، اللہ تعالی کو راضی کرنے کے لئے اور مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لئے کیا گیا ہے تو ضرورت تھی کہ اسے اردو میں لکھا جاتا، تاکہ ہندوستان و پاکستان کی عوام اس سے باخبر ہو جاتی۔ جہاں دیوبندیت کا اصل فروغ وشیوع ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ عرب کی سرزمین سونا اگل رہی ہے، سیال سونا، جو وہاں سے بہہ بہہ کر دوسروں ملکوں میں بھی جارہا ہے، ہندوستان و پاکستان سے غیر مقلدین کا یہ ٹولہ کثیر تعداد میں سیال سونے کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پہونچ گیا، اور وہاں اس نے جاکر یہ ظاہر کیا کہ ہندوستان ایک کفر زدہ ملک ہے، جہاں مسلمان کہلانے والے بھی مشرک ہیں، سنت کے بجائے بدعت ان کا شعار ہے، ان کے درمیان ہم صرف ہم (یعنی غیر مقلدین) توحید خالص کے علم بردار ہیں، سنت کے داعی اور بدعت سے برسر پیکار ہیں، اور اے اہل نجد! اے آل سعود! اے آل الشیخ محمد بن عبدالوہاب! ہم ہیں ٹھیک ٹھیک آپ کے نقش قدم پر! عقائد میں بھی! اعمال میں بھی! آپ حضرات نے جو فرمادیا، جو لکھ دیا، ہم ہیں اس پر بے سوچے سمجھے لبیک کہنے والے، ہم اپنا دین و ایمان، عقیدہ ونظریہ سب کچھ آپ کے قبضہ واختیار میں سونپتے ہیں، جو چاہے آپ تصرف کریں۔ بس اس کی قیمت یہ ہے کہ اپنی بے تحاشہ دولت کی زکوۃ ہمیں دیتے رہئے۔ یہ سودا وہاں بخوشی منظور ہوا، ہندوستان و پاکستان میں غیر مقلدین کے حلقے میں زکوۃ وصدقات کی نہریں جاری ہوگئیں، خستہ حال مسجدیں، لق ودق عمارت میں تبدیل ہوگئیں۔ مدارس کے جھونپڑے محلوں میں بدل گئے۔ جگہ جگہ بڑے اسپتال کھل گئے، لڑکیوں کے کالج وجود میں آگئے، غرض دولت کے رنگا رنگ مظاہر ہونے لگے۔

لیکن ملک عرب صرف غیر مقلدین کی میراث تو نہیں ہے، قلیل تعداد میں سہی فاضلین دیوبند بھی وہاں پہونچنے لگے، ان کی تعداد ہندوستان میں غیر مقلدین سے بدرجہا زائد ہے، لیکن ان حضرات نے مجموعی اعتبار سے تحصیل دولت کو کبھی اپنا نصب العین نہیں بنایا، انہوں نے دین کی خدمت کو ہی اپنا شعار بنا رکھا ہے، اس لئے ان حضرات کو حصول دولت کے لئے وہاں جانے کا خیال نہیں آیا، ہاں تحصیل علم کے لئے تھوڑے سے افراد پہونچ گئے۔ یہ حضرات محنت وکاوش، تقوی وتدین، اور امانت ودیانت میں خاصے ممتاز ہوتے تھے، غیر مقلدین کو اندیشہ ہوا کہ کہیں

ان کی عظمت اہل عرب کے قلوب پر نقش نہ ہو جائے، بس ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ فاضلین دیوبند پہنچنے نہ پائیں۔اس فرقہ کا تو مشن ہی منفی ہے، خوب مخالفت کی، اور اس میں خاصے کامیاب بھی رہے، لیکن ان کی کوششوں کے باوجود علماء دیوبند کا اثر ونفوذ پھیلتا ہی رہا، اور ادھر پانچ چھ برس کے عرصہ میں ایک عجیب گل یہ کھلا کہ شاہ فہد کا عظیم الشان پریس جو مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیر چھاپ کر دنیا کے گوشے گوشے میں بھیج رہا ہے، اس نے اردو زبان میں اشاعت کے لئے جس ترجمہ وتفسیر کا انتخاب کیا وہ کسی غیر مقلد کا ترجمہ نہیں۔ کیوں کہ ان کا دامن تو اس سے خالی ہے، وہاں صرف منفی لٹریچر کی بہتات ہے۔ایک حنفی عالم کا ترجمہ اور حنفی عالم ہی کی تفسیر کا انتخاب کیا۔اور یہ دونوں بزرگ علمائے دیوبند کے پیشوا ومقتدا ہیں۔ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا، اور تفسیر ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی کی۔بس غیر مقلدیت میں کھلبلی مچ گئی، بہت غل مچایا کہ اس تفسیر پر پابندی لگاؤ، اس میں شرک کی تعلیم ہے، سلف کے عقیدے سے ہٹی ہوئی ہے، کئی مرتبہ سننے میں آیا کہ اب اس کی اشاعت بند ہوگئی، مگر پھر دیکھا تو اس کی تقسیم واشاعت اسی شان کے ساتھ جاری ہے۔

اسی طرح بنگلہ زبان میں جس ترجمہ وتفسیر کا انتخاب ہوا وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن کی تلخیص ہے، جو ان کے ایک شاگرد نے کی ہے۔خادم الحرمین الشریفین ملک فہد کے پریس سے علمائے دیوبند کے ترجمہ وتفسیر کی اشاعت ہو، غیر مقلدیت کا حسد اسے کیوں گوارا کرتا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہر وہ حربہ اختیار کیا جانا ضروری ہوگیا جس سے دیوبندیت کی ساکھ اہل عرب کے نزدیک مجروح ہو، تاکہ جو مال انہیں وہاں سے حاصل ہو رہا ہے اس میں تقسیم کا خدشہ باقی نہ رہے۔

شاید یہی خدشہ تھا جس نے الدیوبندیہ نامی کتاب عربی میں لکھوائی، اور اس میں جی بھر کر اہل عرب کو علمائے دیوبند سے بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔اہل عرب عقیدۂ توحید کے باب میں بہت حساس ہیں، اور اس میں ایک حد تک ان کو غلو ہے، ان کے نظریۂ توحید کی روشنی میں قرون سابقہ کے بھی بہت سے علما ومشائخ بھی موحد باقی نہیں رہتے۔الدیوبندیہ کے مصنف نے علمائے دیوبند کی طرف وہ باتیں خوب چپکا کر منسوب کیں، جن سے علمائے نجد وحجاز کی حساسیت متأثر

ہوتی۔موجودہ علماءنجد وحجاز کوتصوف سے بہت بعد ہے،اور علمائے دیوبند کا امتیازی وصف تصوف واحسان ہے،اسے اس کتاب کے مصنف نے اکابر دیوبند کا جرم عظیم بنا کر پیش کیا ہے۔

لیکن یہ گیڈر کی شامت ہی تھی کہ اس نے شہر کا رخ کیا،علمائے دیوبند کو اختلافی مسائل سے زیادہ دلچسپی نہیں،ان کے سامنے دینی وتعلیمی مثبت امور اتنے زیادہ ہیں کہ انہیں کو پورے طور پر انجام دینا مشکل ہورہا ہے،لڑائی جھگڑے کے لئے کہاں سے وقت نکالیں،لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سب لوگ کان میں تیل ڈالے پڑے رہیں،لگانے والے الزام لگاتے رہیں،باندھنے والے بے بنیاد بہتان باندھتے رہیں،اور یہ بے حس وحرکت پڑے رہیں۔

آخر غیرت حق کو جلال آگیا،فاضل گرامی مولانا ابوبکر غازی پوری نے اس چیلنج کو قبول کیا،اورانہوں نے علمائے دیوبند کی طرف سے صفائی نہیں پیش کی،ان کا دفاع نہیں کیا،کیوں کہ جھوٹ کا کوئی علاج نہیں،دجل وفریب کا کوئی جواب نہیں،اوراس ٹولہ کے حق میں ڈیڑھ سوسال سے یہی تجربہ ہورہا ہے کہ اس کو جتنا حقیقت حال سے باخبر کیا جاتا ہے،اتنے ہی زور سے یہ مزید شور مچاتا ہے۔انہوں نے علمائے دیوبند پر لگائے گئے الزامات کے جواب دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی،کیوں کہ چاند پر تھوکنے سے چاند پر کوئی اثر نہیں پڑتا،خود تھوکنے والے کا منہ آلودہ ہوتا ہے،البتہ انہوں نے اہل عرب کے سامنے غیر مقلدوں کی اصل حقیقت کھول کر رکھ دی۔مولانا موصوف عربی زبان پر اہل زبان کی طرح قدرت رکھتے ہیں،انہوں نے عربی میں ہی زیرنظر کتاب لکھی،اوراہل عرب کے سامنے ایک قد آدم آئینہ رکھ دیا کہ اس میں وہ غیر مقلدین جوان کی بغل میں گھسے ہوئے ہیں،کے خدوخال خوب واضح طور پر دیکھ لیں۔

مولانا موصوف نے بڑی کدوکاوش سے اکابر غیر مقلدین کی کتابیں حاصل کیں،انہیں تدقیق وتحقیق سے پڑھا،اوران کی روشنی میں غیر مقلدیت کا اصل حلیہ پیش کیا۔ان کی کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ رافضیوں کے بعد اپنے عقائد ونظریات کو چھپانے میں کوئی فرقہ کامیاب ہوا ہے تو وہ یہی فرقۂ غیر مقلدین ہے،اورتقیہ کا استعمال شیعوں کے بعد اسی ٹولے نے کیا ہے۔ مولانا نے نام رکھنے سے لےکراب تک کے انجام تک ہر ہر مسئلہ پر گفتگو کی ہے،اور بتایا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متبعین اوران کے عقائد وافکار سے،غیر مقلدین کو کوئی مناسبت نہیں ہے،

بلکہ ان کے اکابر نے دولت سیال نکلنے سے پہلے پہلے ہمیشہ وہابیوں کی مخالفت ہی کی ہے، خاکسار کو اعتراف ہے کہ، اور میری طرح بہت سے لوگ اعتراف کریں گے کہ ہم لوگ غیر مقلدوں کی اصل حقیقت سے کم واقف تھے، اس کتاب نے جس طرح ان کو روشنی میں لا کھڑا کیا ہے، اس سے پہلے ان کے خدوخال اتنے نمایاں نہیں ہوئے تھے۔

نام رکھنے میں اضطراب:

مولانا نے سب سے پہلا دلچسپ انکشاف اس فرقہ کے نام رکھنے کے سلسلے میں کیا ہے انہوں نے بتایا کہ اس فرقہ نے اپنا نام ابتداء موحدین رکھا، ایک مدت تک یہ نام رہا، پھر نہ جانے کیوں اسے ترک کردیا، اب انہوں نے اپنا نام محمدی رکھا۔ چنانچہ اس فرقہ کی کتابیں مثلاً ''مذہب محمدی''، ''تعلیم محمدی''، ''عقیدۂ محمدیہ'' وغیرہ ہیں، پھر اس خوف سے کہ یہ نسبت کہیں محمد بن عبدالوہاب کی طرف نہ سمجھ لی جائے، اسے بدل کر غیر مقلد رکھ لیا، انہیں اس پر فخر تھا کہ وہ کسی امام کی تقلید نہیں کرتے، پھر اسے بھی ترک کردیا۔ بعض علما نے کوشش کی اور باقاعدہ سرکار انگریزی سے ''اہل حدیث'' کے نام سے منظوری لی، یہی لقب ان میں جاری رہا۔ ادھر کچھ عرصہ سے جب عرب میں دولت امنڈنے لگی، اور ان کی نگاہِ حرص وہاں پڑنے لگی، تو اب انہیں اہل عرب سے چپکنا تھا، انہوں نے دیکھا کہ اہل عرب زیادہ تر علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیرو ہیں، اور خود سلف کی طرف منسوب کر کے ''سلفی'' کہتے ہیں، انہوں نے بھی اپنے کو بدل کر سلفی اور اثری کہنا شروع کردیا، یہاں تک کہ اپنے مدارس ومراکز تک کے نام بدل ڈالے، لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا ہے کہ ان کے اغراض کے لئے لفظ سلفی مفید تر ہے یا اثری؟۔ (وقفة مع اللا مذہبیہ ۲۸)

ماضی وحال کے غیر مقلدین میں فرق:

پھر مولانا نے تفصیل سے بتایا کہ آج کل جو لوگ غیر مقلد کہلاتے ہیں ان میں اور ان کے گزشتہ اکابر میں نظریات واعتقادات کا کتنا فرق ہے؟ خدا جانے یہ فرق حقیقۃً ہے یا فرقۂ حاضرہ کا یہ نفاق ہے؟ کہ اس کا عقیدہ کچھ ہے اور ظاہر کچھ کرتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند باتیں آپ بھی سن لیں۔

(۱) ان کے اکابر تصوف کے قائل اور اس پر عامل تھے، اور آج کے غیر مقلدین اسے شرک وبدعت سے کم ماننے کے لئے تیار نہیں۔

(۲) ان کے اکابر شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے سخت خلاف تھے، اور ان کی طرف منسوب ہونے کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے، جب کہ فرقۂ حاضرہ اس نسبت کو اپنے لئے باعث صد نازش وافتخار سمجھتا ہے۔

(۳) اکابر غیر مقلدین، شیخ محی الدین بن عربی کو ولایت کے اعلی مقام پر سمجھتے بلکہ انہیں خاتم الولایت المحمدیہ قرار دیتے تھے، اور آج کل کے غیر مقلدین علامہ ابن تیمیہ کی تقلید میں انہیں بدترین کافر قرار دیتے ہیں۔

(۴) اس فرقہ کے اکابر نظریۂ وحدۃ الوجود کو دین وشریعت کی اصل اور اساس قرار دیتے تھے اور آج کا گروہ بظاہر اس کا شدید مخالف وناقد ہے۔

(۵) آج کل کے غیر مقلدین بظاہر غیر اللہ کے وسیلے کے مخالف ہیں، اور غیر اللہ سے استمداد واستعانت کو حرام وناجائز کہتے ہیں حالانکہ یہ باتیں ان کے اکابر کے نزدیک جائز تھیں۔

(۶) فرقۂ حاضرہ کو قبور اور اہل قبور سے سخت بیزاری ہے، جب کہ ان کے اکابر قبروں سے برکت حاصل کرنے اور ان کی تعظیم کرنے کے قائل تھے۔

(۷) یہ لوگ تین مسجدوں کے علاوہ اور کہیں کے سفرِ عبادت کو حرام سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے بہت سے اکابر اسے جائز سمجھتے تھے۔

(۸) موجودہ غیر مقلدین کو تعویذ وعملیات سے سخت بیزاری ہے، اور ان کے اکابر وسلف کے یہاں تعویذات کا معمول رہا ہے، وہ اس موضوع پر کتابیں لکھتے بھی تھے، اور بیچتے بھی تھے۔

(۹) آج کل کے غیر مقلدین شیعوں سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ ان کے اکابر شیعوں جیسے عقیدے رکھتے تھے۔ (وقفۃ مع اللامذہبیہ ۳۱، ۳۲)

مولانا نے ان سب عنوانات پر کتاب میں تفصیل کے ساتھ غیر مقلدوں کے اکابر کی کتابوں کے حوالوں سے قوی دلائل پیش کئے ہیں۔ ہر ہر عنوان قابل ملاحظہ اور باعث عبرت ہے کہ آدمی جب خوف خدا سے دور ہوتا ہے تو کس ضلال بعید میں جا پڑتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ موجودہ غیر مقلدین اپنے ان اکابر کی مدح وثنا کرتے تھکتے نہیں، یہی اکابران کے لئے مایۂ فخر وناز ہیں، لیکن کیا بات ہے کہ جو باتیں ان کے نزدیک جائز مسلم تھیں، عین دین وایمان تھیں، وہی باتیں ان اصاغر کے نزدیک ناجائز وحرام اور شرک و بدعت بن گئیں؟ اگر وہ ان کے نزدیک واقعۃً شرک وبدعت ہیں تو اپنے ان اکابر سے برأت کیوں نہیں ظاہر کرتے؟ انہیں مشرک اور بدعتی کیوں نہیں قرار دیتے؟ اور اگر یہ لوگ ان کے عقائد ونظریات درست سمجھتے ہیں اور دل سے یہ لوگ بھی وہی اعتقاد رکھتے ہیں تو اہل عرب اور اہل نجد کے ساتھ کیوں چپکے ہوئے ہیں؟ جب کہ معلوم ہے کہ وہ اس کے سخت مخالف ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ شیعوں کے تقیہ ہی کا ایک شعبہ معلوم ہوتا ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب:

یہاں ہم چند نمونے ان کے عقائد وخیالات کے پیش کرتے ہیں۔ دیدۂ عبرت درکار ہے۔

آج کل کے غیر مقلدین شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تعریف کرنے سے نہیں تھکتے، لیکن ان کے اکابران کو کس نظر تحقیر سے دیکھتے تھے، ملاحظہ ہو۔ غیر مقلدوں کے امام نواب سید صدیق حسن بھوپالی ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ’’محمد بن عبدالوہاب (نہ شیخ نہ علامہ نہ شیخ الاسلام) فلاں امریکی کرنل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس صدی کے آغاز میں فرقۂ وہابیہ نے زور پکڑا، یہ فرقہ تمیم کے ایک فرد محمد بن عبدالوہاب کی طرف منسوب ہے، جو درعیہ کا باشندہ تھا‘‘۔ (۴۶، بحوالہ التاج المکلل)

ترجمان الوہابیہ ص ۳۱ میں نواب صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ’نجدی مذکور ہندوستان کبھی نہیں آیا، اور نہ اہل ہند سے اس کا کوئی تعلق ہے، نہ وہ اس کے شاگرد ہیں، اور نہ انہوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی ہے..... اس نجدی کی مذہبی دعوت حجاز اور نجد سے آگے نہیں بڑھی، وہابیوں کا مسلمان کے ساتھ جہاد صرف نجد وحجاز میں تھا‘۔ (ص ۴۷)

مشہور غیر مقلد عالم حافظ عبداللہ غازی پوری ’’ابراء اہل حدیث واہل القرآن‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا نام جو وہابی رکھ دیا گیا ہے، یہ بالکل غلط ہے، اہل حدیث صرف کتاب وسنت کا اتباع کرتے ہیں، اور اپنے لئے اہل حدیث اور اہل سنت کا نفیس لقب اختیار کرتے ہیں''۔ ص ۴۹

اس عبارت کا بین السطور پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے متبعین کا عمل کتاب وسنت پر نہیں ہے، اور وہ نہ اہل حدیث ہیں، اور نہ اہل سنت ہیں۔

آگے لکھتے ہیں کہ:

''اہل حدیث اسی وجہ سے سابق ائمہ کی جانب بھی اپنے آپ کو منسوب نہیں کرتے، انہیں تو حنفی، شافعی، مالکی، یا حنبلی ہونا گوارا نہیں، پھر وہ محمد بن عبدالوہاب کی طرف نسبت کو کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں؟....... پھر یہ عبدالوہاب نجدی، جو وہابیوں کا پیشوا ہے، خود حنبلی تھا، اور اہل حدیث مقلدین کے کسی مسلک کی تقلید نہیں کرتے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ابن عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہو جائیں؟ اہل حدیث اور وہابیوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے''۔ (ص ۵۰)

اللہ اکبر...... وہابی کا لقب اہل حدیث کے اصولوں سے میل نہیں کھاتا، وہ اس لقب پر کبھی راضی نہیں ہیں، بلکہ اسے وہ گالی سے بدتر شمار کرتے ہیں''۔ (۵۱)

نواب سید صدیق صاحب ''ترجمان الوہابیہ'' میں لکھتے ہیں:

''جو شخص ہمیں وہابی کہتا ہے وہ ہمیں گالی دیتا ہے...... وہ شخص جو نجد میں پیدا ہوا، اور اس کے ماننے والوں نے مسلمانوں سے جنگ چھیڑی، وہ مقلد حنبلی تھا''۔ (ص ۵۲)

غیر مقلدوں کے یہاں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جو قدر و قیمت ہے وہ ان عبارتوں سے واضح ہے، اور بقول مولانا عبداللہ کے عبدالوہاب کے پیرووں اور غیر مقلدوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے، مگر اب شاید مسلک بدل گیا ہے یا غیر مقلدوں نے حصول زر کے لئے تقیہ کی چادر اوڑھ لی ہے۔

مشہور غیر مقلد عالم و پیشوا مولانا ثناء اللہ امرتسری اپنی کتاب ''مذہب اہل حدیث'' کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

''اس جیسے اعتقادات واقوال...... یعنی وہ اعتقادات واقوال جو شیخ محمد بن عبدالوہاب انبیاء واولیا کے حق میں رکھتے ہیں، ہم اہل حدیثوں کے نزدیک کفر ہے، ہمارے اعتقادات ایسے نہیں ہیں''۔ (ص ۵۶)

غور کیجئے، پہلے جو اعتقادات غیر مقلدوں کے نزدیک کفر تھے، اب وہ عین ایمان بن چکے ہیں۔

شیخ محی الدین بن عربی کا مرتبہ ومقام غیر مقلدین کی نظر میں:

غیر مقلدین کے امام اول، شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین دہلوی کا قول ان کے سوانح نگار نے ''حیات بعد الممات'' میں نقل کیا ہے کہ ''محی الدین بن عربی خاتم الولایۃ المحمدیہ ہیں''۔(ص ۱۷)

نواب صدیق حسن صاحب نے ''التاج المکلل'' میں شیخ محی الدین بن عربی کا طویل تذکرہ لکھا ہے، ان پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دیا ہے، اور آخر میں دعا کی ہے:

فجزاه الله عنا وعن سائر المسلمين وافاض علينا من انواره وكسانا من حلل اسراره وسقانا من حميا شرابه وحشرنا فى زمرة احبابه بجاه سيد اصفياءه وخاتم انبياءه صلى الله عليه وسلم وشرفه وكرمه وعلمه. (ص ۸۷)

اللہ تعالیٰ انہیں ہماری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، اور ہم پر ان کے انوار کا فیضان جاری کرے، اور ہم کو ان کے اسرار کی خلعت پہنائے، اور ہم ان کی شراب تند پلائے، اور ہمارا ان کے احباب کے زمرہ میں حشر فرمائے، سید اصفیاء خاتم انبیاء ﷺ کے مرتبے کے واسطے سے۔

نواب صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''حاصل یہ کہ ان کے مقامات وکرامات بے شمار ہیں، جنہیں کئی جلدوں میں بھی نہیں پورا کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ کی حجت ظاہرہ اور آیت باہرہ تھے''۔(ص ۸۰)

یہ وہی شیخ محی الدین بن عربی ہیں، جن کو علامہ ابن تیمیہ اور ان کے ماننے والے ''**اكفر من اليهود والنصارى**'' کہہ کر بھی تسکین نہیں پاتے، لیکن آج کے غیر مقلدین میاں نذیر حسین اور نواب صدیق حسن کو بھی اپنا پیشوا مانتے ہیں، اور علامہ ابن تیمیہ کو بھی اپنا مقتدا قرار دیتے ہیں، بڑے اطمینان سے دو ناؤ پر پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔

یار ما یک دارد و آں نیز ہم ؎

اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہے۔

تصوف اور غیر مقلدین:

غیر مقلدوں نے اس دور میں تصوف اور صوفیہ کی مخالفت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے، اور یہ محض عرب کے وہابیوں کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے، ورنہ ان کے اکابر بالخصوص شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین صاحب اور نواب والا جاہ سید صدیق حسن صاحب دونوں صوفیہ طریق پر بیعت تھے، میاں نذیر صاحب مریدوں کو بیعت بھی کرتے تھے۔ (ص ۱۰۵)

چنانچہ اس کی تفصیل میاں صاحب کی مستند سوانح ''حیات بعد الممات'' میں دیکھی جاسکتی ہے، اور نواب صاحب اور ان کے فرزند نور الحسن صاحب دونوں حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مرادابادی کے ہاتھوں پر بیعت تھے، اور ان کے والد مولانا اولاد حسن صاحب حضرت سید احمد شہید کے ہاتھوں پر بیعت تھے۔ نواب صاحب نے ذکر کیا ہے کہ ان کے ہاتھوں پر تقریباً دس ہزار آدمی بیعت تھے۔ (ص ۱۰۷)

لطف یہ کہ یہ تینوں غیر مقلد تھے، نواب صاحب تو غیر مقلدیت کے پیشوا ہی ہیں۔ اب اس تضاد یا نفاق کو آج کے مجتہدین حل کریں۔

تعویذات اور غیر مقلدین:

علامہ ابن تیمیہ اور ان کے پیرووں کے نزدیک تعویذ گنڈے کو گلے میں باندھنا مشرکانہ اعمال شمار کیا جاتا ہے، آج کل فرقۂ غیر مقلدین بھی اپنی عادت کے مطابق انہیں کی راگ میں لے ملا رہا ہے، لیکن ان کے اکابر کا حال اور خیال یہ نہیں تھا۔ نواب والا جاہ سید صدیق حسن صاحب نے تو تعویذات کی ایک مستقل کتاب ہی لکھی ہے، اس کا نام ''کتاب التعاویذ'' ہے، نواب صاحب اس کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس رسالہ میں ہم وہ ماثور دعائیں اور صحیح اعمال تحریر کریں گے جن کا تعلق ان عوارض و آفات سے ہے جو انسان کو زندگی میں اور مرنے کے بعد پیش آتے ہیں، یہ سب دعائیں اور اعمال ہم کو ہمارے مشائخ [سے] پہونچے ہیں، اور ہمیں ان کی طرف سے ان سب کی اجازت ہے''۔ (ص ۱۶۶)

اور فرماتے ہیں کہ:

''انہیں مشائخ اور اہل علم نے اس طرح کی جھاڑ پھونک کا ذکر کیا ہے، مخلوق میں اس کا نفع مشاہد ہے، میں بھی ان چیزوں کو گھر کے چھوٹے بچوں کے لئے استعمال کرتا ہوں، جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ،، القول الجمیل'' میں ذکر کیا ہے''۔(ص ۱۶۷)

اس کے بعد مولانا ابوبکر صاحب نے اس میں درج بہت سی ادعیہ ماثورہ اور اعمال صحیحہ کے نمونے پیش کئے ہیں۔اب خدا جانے کیا صحیح ہے؟ تعویذات صحیح ہیں؟ یا ان کا انکار صحیح ہے؟ اقرار کریں تو اہل عرب خفا ہوتے ہیں، انکار کریں تو غیر مقلدیت ہاتھ سے جاتی ہے۔

کتاب کے آخر میں نواب صاحب نے باقاعدہ ان تمام اعمال، تعویذات اور دعاؤں کی اجازت اپنی اولاد واحفاد کو دی ہے، اور بڑی شدت اور تاکید کے ساتھ وصیت فرمائی ہے کہ ان کو اپنی اولاد کے لئے اور دوسرے حاجت مند مسلمانوں کے لئے استعمال میں لائیں، کیوں کہ اچھا آدمی وہی ہے جو لوگوں کو نفع پہونچائے''۔(ص ۱۸۴)

غیر مقلدین اور قبروں کی خدمت گزاری:

غیر مقلدین شور مچاتے ہیں کہ قبروں کی مجاورت اور ان سے برکت حاصل کرنا ممنوع اور حرام ہے، حالانکہ ان کے مشہور اور بڑے عالم نواب وحید الزماں صاحب حیدرآبادی اپنی کتاب ''نزل الابرار من فقہ النبی المختار'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اولیاء اللہ کی قبروں کی خدمت گزاری اور مجاورت، حصول برکت کے لئے اس میں کچھ حرج نہیں، یہ عمل امت کے بہت سے صلحا وفضلا سے منقول ہے''۔(ص ۲۰۴)

اور اپنی کتاب ''ہدایۃ المھدی'' میں لکھتے ہیں:

''اور رہی مجاورت اور خدمت گزاری تو کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ نبی یا ولی کی قبر کی مجاورت شرک ہے''۔(ص ۲۰۴)

سبحان اللہ! ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا:

علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک علاوہ تین مسجدوں کے اور کسی مقام کے لئے بہ نیت عبادت

سفر کرنا حرام ہے، اسی لئے وہ نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ آج کل غیر مقلدین بھی انہیں کی لے میں لے ملا رہے ہیں، حالانکہ ان کا مسلک یہ نہیں ہے۔ ان کا مسلک وہی ہے جو ان کے بڑے عالم نواب وحید الزماں صاحب حیدر آبادی نے لکھا ہے، فرماتے ہیں:

''بہت سے علماء سلف وخلف نے انبیاء وصالحین کی قبروں کی زیارت کے لئے سفر کو جائز قرار دیا ہے، تو کیا یہ لوگ کافر ومشرک تھے.....؟''۔ (ص ۲۲۷)

ہمارے اصحاب میں شیخین (علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم) نے ان فیوض وبرکات اور لذائذ قلبیہ کا انکار کیا ہے، جو انبیاء وصالحین کی قبروں کی زیارت سے حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارے بہت سے اصحاب مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے نامور صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے خلیفہ حضرت سید احمد شہید نے اس کا اثبات کیا ہے، اور متقدمین میں سے امام شافعی اور علامہ ابن حجر مکی بھی اس کے قائل ہیں، اور حضرات صوفیہ تو سبھی اس پر متفق ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ مشاہد اور مجرب ہے، اور اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے''۔ (ہدایۃ المہدی۔ ص ۲۲۷)

کچھ ٹھکانا ہے ان تضادات کا، یہ سب اس حرص وہوس کا نتیجہ ہے جو اس فرقہ کے قلب میں اجتماعی طور سے جاگزیں ہے، اس کا اشارہ جدھر ہوتا ادھر لڑھک جاتے ہیں۔

قبروں کا طواف:

کسی بھی قبر کا طواف اور اس کے سامنے تعظیمی افعال کا بجالانا، علامہ ابن تیمیہ اور ان کے پیرووں کے نزدیک صرف گناہ نہیں بلکہ شرک ہے، مگر غیر مقلدین کے گلے میں یہاں بھی ہڈی پھنسی ہوئی ہے، نواب وحید الزاں صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اگر کوئی تعظیمی افعال بجالایا جائے، مثلاً قبر کا طواف کیا، یا اسے بوسہ دیا، یا وہاں مؤدب کھڑا ہوا، یا رکوع کیا، یا سجدہ کیا، خواہ وہ کسی نبی کی قبر ہو یا ولی کی، اور اس کی نیت صاحب قبر کی تعظیم اور اسے سلام کرنا ہو، نہ کہ قبر کی عبادت، تو ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، تاہم مشرک نہ ہوگا''۔ (ہدایۃ المہدی۔ ص ۱۵)

انبیاء واولیا سے استغاثہ:

کسی مصیبت میں غیر اللہ کو پکارنا، ان سے فریاد کرنا، ظاہر ہے کہ کھلا ہوا شرک ہے، آج کل کے غیر مقلدین اس سلسلے میں بڑی سختی برتتے ہیں، لیکن اپنا اصل مسلک اسی شدت سے چھپاتے ہیں۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ مصائب ومشکلات میں انبیاء واولیا اور صالحین سے فریاد کی جاسکتی اور انہیں پکارا جاسکتا ہے۔

چنانچہ نواب وحیدالزماں صاحب نے اپنی کتاب ''ہدیۃ المہدی'' میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے، اور آخر میں لکھتے ہیں:

''اس بحث سے بداہۃً یہ بات معلوم ہوگئی کہ غیر اللہ کو پکارنا یا اس کی طرف متوجہ ہونا، یا ان سے مدد چاہنا، ایسے امور میں جن پر مخلوق کو قدرت ہوتی ہے، یا غیر اللہ کے بارے میں نفع وضرر کا اعتقاد رکھنا، ایسے امور میں جن پر مخلوق قادر ہوتی ہے، یا غیر اللہ کے بارے میں نفع وضرر کا اعتقاد رکھنا کہ اللہ کے ارادے اور اذن سے ایسا کر سکتے ہیں، یہ شرک اکبر نہیں ہے''۔ ص ۲۴۷

پھر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ شرک کیوں کر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے ''**وماهم بضارين به من احد الا باذن الله**''. اور یہ جادوگر کسی کو نقصان نہیں پہونچا سکتے مگر اللہ کے اذن سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ساحر اللہ کے اذن سے ضرر پہونچا سکتا ہے۔ صاحب جامع البیان نے اپنی تفسیر کے آغاز میں نبی ﷺ سے استغاثہ کیا ہے، اگر غیر اللہ سے مطلق استغاثہ شرک ہوتا تو لازم آئے گا کہ صاحب جامع البیان مشرک ہوں، اگر ایسا ہے تو ان کی تفسیر پر کیوں کر اعتماد ہوسکتا ہے، حالانکہ تمام اہل حدیث نے ان کی تفسیر کو قبول کیا ہے''۔ (ص ۲۴۸)

اور فرماتے ہیں کہ:

''اگر کسی نے غلبۂ محبت اور استغراق میں غائب کو حاضر فرض کر کے پکارا، مثلاً 'یا رسول اللہ' کہا یا 'یا علی' کہا یا 'یا حیدر' کہا یا 'یا مدار' کہا یا 'یا سالار' کہا یا 'یا محبوب' کہا یا 'یا غوث' کہا...... یا ایسے امور میں استغاثہ کیا یا استعانت چاہی جس پر اللہ کے نیک بندے انبیاء واولیا قادر ہیں تو اس سے آدمی اسلام سے خارج نہیں ہوتا''۔ (ہدیۃ المہدی۔ ص ۱۶)

نواب وحیدالزماں صاحب مزید لکھتے ہیں:

''سید علامہ نواب صدیق حسن خان نے ایک طول قصیدہ میں لکھا ہے:

یاسیدی،یا عروتی ووسیلتی　　یا عدتی فی شدۃ ورخاء

قد جئتک بابک ضارعاً متضرعا　　متأوّھا بنفسی الصعداء

مالی وراک مستغاث فارحمنی　　یا رحمۃ للعالمین بکائی

(ص۲۴۹)

اے میرے سردار، اے سہارا اور وسیلہ، اے بدحالی وخوشحالی میں میرے مددگار، میں آپ کے دروازے پر گریہ وزاری کرتا اور آہ وبکا کرتا ہوا آیا ہوں، آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جس سے میں مدد چاہوں، تو اے رحمۃ للعالمین میرے رونے پر رحم فرمایئے۔

پھر لکھتے ہیں کہ:

''یہ سوال مردہ سے نہیں ہے، بلکہ صلحا کی ارواح سے ہے، اور روحیں مردہ نہیں ہوتیں، نہ فنا ہوتیں، بلکہ وہ حساس اور باخبر رہتی ہیں، بالخصوص انبیاء وشہدا کی روحیں، کہ وہ بحکم خدا زندہ ہیں..... ہاں یہ ضروری ہے کہ استعانت واستغاثہ ان کی قبروں کے پاس ہو، کیونکہ جب وہ زندہ تھے تو دور سے نہیں سنتے تھے تو مرنے کے بعد دور سے کیسے سنیں گے''۔(ص۲۴۹ ہدیۃ المہدی۔ص۲۰)

اور لکھتے ہیں:

''اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ عوام جو یا رسول اللہ اور یا علی یا غوث وغیرہ کہتے ہیں تو صرف اس طرح پکارنے سے ان کے شرک کا حکم ہم نہیں کریں گے''۔(ہدیۃ المہدی ص۲۴ص۲۴۹)

مزید ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں کہ:

سید (یعنی نواب صدیق حسن خان) نے اپنی تالیف میں لکھا ہے

قبلۂ دیں مددے　　کعبۂ ایماں مددے

ابن قیم مددے　　قاضی شوکاں مددے

ص۔۲۵۰

ان اقتباسات کو پڑھئے اور بتایئے کہ بریلویوں اور غیر مقلدین میں کیا فرق ہے؟ یہ

باتیں ان کا معمولی فرد نہیں لکھ رہا ہے۔نواب صدیق حسن خاں ہوں یا نواب وحید الزماں، یہ ان کی مایۂ ناز شخصیتیں ہیں۔

غیر مقلدوں کی ستم ظریفیاں:

غیر مقلدیت بے لگام شاخوں اور کانٹوں کا جنگل ہے، جتنی ڈفلی اتنا راگ، کوئی کچھ کہہ رہا ہے، اور کوئی کچھ۔ کچھ ٹھکانا نہیں کب کون کیا کہنے لگے؟ ایک صاحب ہیں، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، جن کے بارے میں ''جہود مخلصہ'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

''شیخ عبداللہ روپڑی متوفی ۱۳۸۷ھ اپنے زمانہ میں حدیث کے علماء کبار میں تھے، مولانا وزیرآبادی اور امام عبدالجبار غزنوی سے تعلیم حاصل کر کے فراغت پائی، کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتے تھے، اور دوسرے علوم وفنون پر بھی بہت وسیع نگاہ تھی، پوری زندگی درس وافادہ، تصنیف وتالیف میں اور سنت وسلفیت کے نشر واشاعت میں بسر کی''۔(ص۲۷۲)

بیوی کی خوشامد:

اب سنئے، یہ صاحب جو کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتے تھے، فرماتے ہیں:

''شریعت نے ازدواجی زندگی کی خوشگواری اور میاں بیوی کے درمیان الفت ومحبت کا بہت اہتمام کیا ہے، یہاں تک کہ اس کے لئے خدا کے اوپر بھی جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے''۔(فتاوی اہل حدیث۔ص۳۷۰۔ص۲۷۲)

بیوی کو کبیدگی وناگوارخاطری سے بچانے کے لئے قدرے جھوٹ بول دینے کی اجازت تو ضرور ہے، مگر اللہ پر جھوٹ بولنا پناہ بخدا! یہ تو کھلا ہوا ظلم ہے۔اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں''**فمن اظلم ممن کذب علی الله**''. اس سے بڑا ظالم کون ہے؟ جو خدا پر جھوٹ بولتا ہے۔اس ظلم عظیم کے باوجود یہ شخص محض اس لئے کہ غیر مقلد ہے، اور ائمہ کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے۔کبار علماء الحدیث میں ہے، کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتا ہے، سنت وسلفیت کی نشر واشاعت کرتا ہے۔استغفر اللہ

عیسیٰ علیہ السلام پر افتراء:

ایک اور غیر مقلد صاحب ہیں، شیخ عنایت اللہ وزیرآبادی، وہ خود اپنے بارے میں لکھتے

ہیں، میرا مذہب پہلے دن سے اہل حدیث کا مذہب ہے۔حافظ عبداللہ غازی پوری سے پورا استفادہ کیا ہے،مولانا عبدالستار کلانوری اور مولانا عبدالجبار کھندیلوی اور مولانا عبدالوہاب ملتانی کے شاگرد ہیں۔(العطر البلیغ)

ان شیخ عنایت اللہ وزیرآبادی کی ایک کتاب ''عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ بن مریم'' ہے،اس میں انہوں نے اپنی دانست میں دلائل کا زور لگا دیا ہے کہ حضرت مریم منکوحہ تھیں،اور عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے نہیں بلکہ باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ عقیدہ خالص کفر ہے جو ایک غیر مقلد نے ظاہر کیا ہے،اور صرف ظاہر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی ہے۔مولانا ابوبکر صاحب نے عیون زمزم کے متعلقہ صفحات کے فوٹو بھی شامل کتاب کر دیئے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ:

> ''ہم کو نہیں معلوم کہ ہندو پاک کے کسی غیر مقلد عالم نے اس گندی کتاب کا رد لکھا ہو، جب کہ یہ لوگ تقلید اور مقلدین کا رد لکھنے میں بہت تیزی دکھاتے ہیں،شاید عنایت اللہ اثری کا گناہ صرف اس لئے معاف کر دیا گیا ہو کہ وہ غیر مقلد تھا،اور ائمہ مجتہدین پر زبان طعن دراز کئے رہتا تھا''۔(ص ۲۷۵)

رافضیوں سے مناسبت:

غیر مقلدوں کے قابل فخر ائمہ میں سے نواب وحیدالزماں صاحب حیدرآبادی ہیں،ان کی کتاب ہدیۃ المہدی کے حوالے گزر چکے ہیں۔ان کی ایک تحریر پڑھئے،اور غور کیجئے کہ شیعوں میں اور ان میں کچھ حد فاصل باقی رہی یا نہیں؟ لکھتے ہیں:

> ''اگر ہمارے دور میں سیدنا علی اور معاویہ کے درمیان جنگ ہوئی ہوتی تو ہم علی کے ساتھ ہوتے ، پھر اس کے بعد امام حسن بن علی کے ساتھ ہوتے ، پھر ان کے بعد امام حسین بن علی کے ساتھ ، پھر ان کے بعد علی بن حسین کے ساتھ ، پھر ان کے بعد امام باقر کے ساتھ ، پھر ان کے بعد امام جعفر بن محمد صادق کے ساتھ ، پھر ان کے بعد امام موسی بن جعفر کے ساتھ ، پھر ان کے بعد امام علی بن موسی الرضا کے ساتھ ، پھر ان کے بعد امام محمد بن علی الجواد کے ساتھ ، پھر ان کے بعد امام علی بن محمد ہادی تقی کے ساتھ ، پھر ان کے بعد امام حسن بن علی عسکری کے

ساتھ، پھر اگر ہم باقی رہے تو ان شاء اللہ امام محمد بن عبداللہ المہدی الفاطمی المنتظر کے ساتھ ہوں گے''۔(ص ۲۹۷)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ بارہ ائمہ حقیقت میں یہی وہ امرا ہیں جن پر سید المرسلین ﷺ کی خلافت منتہی ہوتی ہے، اور یہی حضرات آسمان ایمان ویقین کے آفتاب ہیں......اور رہے بنی امیہ اور بنی عباس تو یہ ائمہ دین نہ تھے، بلکہ ان میں سے اکثر چور ڈاکو تھے، مسلمانوں کا خون بہاتے تھے، اور ان لوگوں نے زمین کو ظلم وجور سے بھر دیا تھا''۔(ص ۲۹۸)

اور اخیر میں دعا کرتے ہیں:

''اے اللہ! ہمارا حشر انہیں بارہ ائمہ کے ساتھ فرما، اور ہم کو ان کی محبت پر تا قیامت قائم رکھ''۔(ہدیۃ المہدی۔ص ۱۰۳۔ص ۲۹۸)

اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ کسی غیر مقلد عالم کی عبارت ہے تو ہر شخص بے ساختہ یہی سمجھے گا کہ کسی شیعہ کی کتاب کا اقتباس ہے۔کیا حضرات اہل حدیث نے یہ عبارت نہیں دیکھی ہے، یا یہ کہ فی الحقیقت ان کا عقیدہ یہی ہے؟''۔

دعویٰ امامت:

غیر مقلدین نے تقلید سے تو آزادی حاصل کر لی، مگر پھر ایسا منہ کے بل گرے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، اس حلقہ سے اتنی بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں ہیں کہ غیر مقلدیت کو سمجھنا چیستاں سے کم نہیں ہے۔قادیان کی جھوٹی نبوت کا سرا بھی غیر مقلدیت سے ملتا ہے، قادیانی کا خلیفۂ اول نورالدین پہلے غیر مقلد تھا، انکار حدیث کا فتنہ ایک غیر مقلد کے گھر سے اٹھا۔ابھی آپ نے دیکھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدائش کا فتنہ انگیز نظریہ غیر مقلد کے آستانہ سے نکلا۔حضرت میاں نذیر حسین صاحب شیخ الکل فی الکل کے ایک مشہور شاگرد، غیر مقلدوں کے بڑے عالم مولانا عبدالوہاب ملتانی دہلوی ہیں، ان کا دعوی تھا کہ میں امام وقت ہوں، وہ فرماتے ہیں: جس شخص نے امام وقت کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، اور مرگیا، وہ جاہلیت کی موت مرا، اور جس نے امام کے حکم کے بغیر زکوۃ ادا کی، اس کی زکوۃ نہیں ادا ہوئی، اسی طرح امام کی اجازت کے

بغیر نہ نکاح صحیح، نہ طلاق، اور اس زمانہ میں جو کوئی اور امامت کا دعوی کرے اس کو قتل کرنا واجب ہے''۔(۳۰۰،۳۰۱)

جنون! واللہ جنونِ فاحش! یہ غیر مقلدیت کے کارنامے ہیں۔

خلفائے راشدین میں افضل کون ہے؟:

مولانا وحیدالزماں صاحب حیدرآبادی کی کتاب ''ہدیۃ المہدی'' عجائبات کی زعفران زار کھیتی ہے، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کے بعد امام برحق ابوبکر ہیں، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی، پھر حسن بن علی۔ ہم نہیں جانتے کہ ان پانچوں میں کون افضل ہے؟ اور اللہ کے نزدیک کن کا مرتبہ اونچا ہے؟ البتہ ہر ایک کے فضائل ومناقب بہت ہیں، اور فضائل کی کثرت تو سیدنا علی اور امام حسن بن علی کے لئے ہے، اس لئے کہ یہ صحابی ہونے اور اہل بیت ہونے دونوں فضیلتوں کے جامع ہیں، یہی محققین کا قول ہے''۔(ص۳۰۴)

اہل سنت تو اس بات کے قائل ہیں اور اس پر اجماع ہے کہ خلفائے راشدین کی افضلیت خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے، لیکن نواب صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ:

''اکثر اہل سنت والجماعت کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد سب سے افضل ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی ہیں، لیکن اس پر شارع کی طرف سے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، اور نہ اس پر قطعی اجماع ہے، اور اگر اجماع ہے تو ظنی اجماع ہے''۔(ص۳۰۴)

اس کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ غیر مقلدیت، اہل سنت سے خارج ایک فرقہ ہے۔

صحابہ کے بارے میں غیر مقلدوں کا عقیدہ:

اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ پوری امت محمدیہ میں صحابہ سب سے افضل ہیں، ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی غیر صحابی سے فضیلت میں بڑھا ہوا ہے، لیکن نواب وحیدالزماں کی عبارت ملاحظہ ہو، وہ خیر القرون قرنی کے سلسلہ میں ہدیۃ المہدی میں لکھتے ہیں:

''اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعد کے زمانے میں کوئی ایسا شخص نہ ہو جو اگلے زمانے

والوں سے افضل ہو، اس لئے کہ امت کے بہت سے بعد کے علماعوام صحابہ سے علم ومعرفت اور اشاعت سنت میں افضل تھے، اوراس کا کوئی عاقل انکار نہیں کرسکتا''۔(ص۳۰۷)

صحابہ کی مخالفت تو غیر مقلدین کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، شاید ان کو ہوس ہو کہ غیر مقلدین صحابہ سے بڑھ جائیں، یہی مولانا وحیدالزماں صاحب اپنی ایک اور اہم کتاب ''نزل الابرار'' ج۳۔ص۹۴ میں لکھتے ہیں کہ:

''اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ میں بعض لوگ فاسق تھے، جیسے ولید، اوراسی طرح کی بات معاویہ، عمرو، مغیرہ اور سمرہ کے باب میں کہی جائے گی''۔(ص۳۳۱)

استغفر الله، معاذالله حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بطور خاص لکھتے ہیں کہ:

''معاویہ کو ان نفوس قدسیہ پر قیاس کرنا کیوں کر جائز ہوگا؟ جب کہ معاویہ نہ مہاجرین میں ہیں، نہ انصار میں، اور نہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں رہے، وہ تو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ سے لڑتے رہے، اور اسلام لائے تو فتح مکہ کے دن ڈر کے مارے ایمان لائے، پھر یہی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عثمان کو مشورہ دیا تھا کہ علی اور زبیر اور طلحہ کو قتل کرڈالیں''۔(لغات الحدیث، مادہ عشم۔ص۳۳۱)

پھراس سے بڑھ کر لکھتے ہیں کہ:

''مومن صادق جس کے دل میں ذرہ کے برابر بھی نبی ﷺ کی محبت ہوگی، وہ کبھی اس کو جائز نہیں قرار دے گا کہ معاویہ کی مدح کی جائے، اوران کی تعریف کی جائے''۔

ہم اہل سنت والجماعت کا طریقہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے بارے میں سکوت اختیار کرتے ہیں، یہی اسلم واحوط راستہ ہے، لیکن یہ انتہائی جرأت کی بات ہے کہ معاویہ کے حق میں تعظیم کے کلمات بولے جائیں، مثلاً ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جائے، اللہ تعالی اس سے ہماری حفاظت فرمائے''۔

مزید ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''وہ ان بادشاہوں میں سے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا ہے، یہ چور اور زبردستی کے حاکم تھے''۔(ص۳۳۲)

یہ ہے سلفیت، یہ ہے اثریت، یہ ہے اہل حدیثیت، کوئی بتائے کہ اس میں اور رافضیت

میں کیا فرق ہے؟ یہاں تک کہ ہم نے کتاب کے چند مباحث کی تلخیص کر دی، اسی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ غیر مقلدیت کس قسم کا فتنہ ہے؟ کتاب میں اور بھی بہت سے دلچسپ مباحث ہیں، جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، وہ اس سے بہت کم ہے، جو ہم نے ذکر نہیں کیا، عربی داں حضرات اصل کتاب سے استفادہ کریں۔

کتاب میں طباعت کی غلطیاں ہیں، لیکن اتنی ضخیم کتاب میں اتنی غلطیوں کا رہ جانا قابل مواخذہ نہیں ہے، البتہ کہیں کہیں آیت نقل کرنے میں غلطی ہوگئی ہے، آیات کے سلسلے میں زیادہ احتیاط سے پروف دیکھنا چاہئے۔صفحہ ۳۲۸ پر "**المنافقون والمنافقات بعضهم اولياء بعض**" چھپ گیا۔ یہ "**بعضهم من بعض**" ہے۔

اسی طرح صفحہ ۳۲۹ میں "**ومن يشاق الرسول ممن بعد ما تبين**" ہوگیا، صحیح "**من يشاقق الرسول من بعد ما تبين**" ہے۔صفحہ ۳۷۳ کے بعد ترتیب گڑبڑ ہوگئی ہے، ۳۷۳ کے بعد کی عبارت ۳۷۵ پر آگئی ہے، اس کے بعد ۳۷۴ پر، پھر اس کے بعد ۳۷۶ پر، اس سے قاری کو الجھن ہوتی ہے۔

ایک بہت دلچسپ بحث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی سے متعلق ہے، غیر مقلدین ان دونوں بزرگوں کو اپنا امام وپیشوا مانتے ہیں، اگر چہ یہ بالکل غلط اور تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے، لیکن مولانا ابوبکر صاحب نے اسے علی سبیل الفرض تسلیم کر کے غیر مقلدیت کے خلاف زبردست حجت قائم کی ہے۔ ہم ان شاء اللہ اگلے شمارے میں اس کا اسلوب تبدیل کر کے قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔

ماخذ: المآثر۔اپریل، مئی، جون (۱۹۹۶)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : مسائل غیر مقلدین۔کتاب وسنت اور مذہب جمہور کے آئینے میں
مصنف : مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری
صفحات : ۴۰۴
ناشر : المکتبۃ الاثریہ قاسمی منزل سیدواڑہ روڈ غازی پور
قیمت : ۱۲۵/۰۰ روپئے

چند ماہ پیشتر مولانا ابوبکر غازی پوری کی ایک عربی تصنیف ’’وقفۃ مع اللا مذہبیۃ‘‘ کا تعارف ان سطور میں تحریر کیا گیا تھا، اب انہوں نے فرقہ اہل حدیث ہی کے سلسلے میں یہ دوسری کتاب اردو میں مرتب کی ہے۔فرقہ اہل حدیث ایک غیر معتدل اور نا آشنائے انصاف فرقہ ہے، اس نے اسلام کو اپنے مختصر سے ٹولے میں محدود کردینا چاہا، یہ لوگ اپنے کو متبع سنت اور پیروِقرآن قرار دیتے ہیں، یہاں تک تو کوئی حرج نہیں، مگر ستم یہ کرتے ہیں کہ دوسرے تمام مسلمانوں کو اتباع قرآن وسنت سے منحرف گردانتے ہیں، بلکہ شاید کافر ومشرک سمجھتے ہیں۔ان کے حلقے سے ایک کتاب ’’الدیوبندیہ‘‘ شائع ہوئی، جو رازداری کے ساتھ عرب ممالک میں تقسیم ہورہی ہے، ہندوستان میں تلاش کیجئے تو مشکل سے ملے گی، اس کتاب نے علماء دیوبند پر ظلم وجور کے تیر بے محابا چلائے ہیں، اور یہ عدوان وطغیان کی تمام حدوں کو پھلانگ گئی ہے۔مذکورہ کتاب نے مولانا ابوبکر صاحب کی توجہ نام نہاد اہل حدیثوں کی بنیادی کتابوں کی طرف منعطف کرائی، جو ان کے ائمہ متقدمین نے تصنیف کی ہیں۔یہ کتابیں عام طور سے دستیاب نہیں ہیں۔بڑی کوشش اور محنت سے مولانا نے انہیں حاصل کیا، ان کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ کتاب وسنت کی جس پیروی اور اتباع کا یہ فرقہ مدعی ہے، اس کی اسے ہوا بھی نہیں لگی ہے۔اس فرقہ کے علما وعوام کے حالات تو بغیر کسی کتاب کی مدد کے ہی برملا اعلان کرتے ہیں کہ اتباع کتاب وسنت کا صرف نعرہ ہی نعرہ

ہے۔ کیوں کہ جماعتیں اپنے علوم وافکار اور عقائد ونظریات ہی کے زیر اثر تشکیل پاتی ہیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس جماعت کا ماحول ومعاشرہ قرآن وسنت سے منحرف ہے پھر ہم کیسے یقین کرلیں کہ ان کے مسائل وفتاوی قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے؟ مولانا محمد ابوبکر صاحب ان کے گھر میں گھسے تب تفصیلاً معلوم ہوا کہ باہر بورڈ کیا لگا ہوا ہے، اور اندر کھیل کیا ہو رہا ہے؟ ان کے محراب ومنبر کا جلوہ کچھ ہے، لیکن چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔ مولانا نے اسی "کار دیگر" کو اکٹھا کیا ہے۔ چند نمونے آپ بھی دیکھ لیں۔

(۱) فرقہ اہل حدیث کے نزدیک بیک وقت چار عورتوں سے زائد کو نکاح میں رکھنا جائز ہے۔

(۲) فرقہ اہل حدیث کا مسلک یہ ہے اگر کسی کا گھر مسجد سے دور ہو تو اس پر جمعہ کی نماز واجب نہیں، اگرچہ وہ اذان سنتا ہو۔

(۳) اس کے نزدیک مال تجارت میں زکوۃ نہیں ہے۔

(۴) شیعوں نے جواذان میں "**حی علی الصلوۃ**" کی جگہ "**حی علی خیر العمل**" کو اپنا شعار بنالیا ہے، فرقہ اہل حدیث کے نزدیک اس پر انکار نہیں کرنا چاہئے، اور چونکہ یہ کلمہ بھی مرفوع اور صحیح حدیث سے ثابت ہے، اس لئے واجب القبول ہے۔ (اس فرقہ کو شیعوں سے بڑی مناسبت ہے)

(۵) اس فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی حاجی وقوف عرفہ سے پہلے اپنی بیوی سے ہم بستر ہو جائے تو اس کا حج فاسد نہ ہوگا۔

(۶) اس فرقہ کے نزدیک ایک بکری کی قربانی بہت سے لوگوں کی طرف سے کافی ہے۔

(۷) اس فرقہ کا مذہب یہ کہ وضو میں پاؤں دھونے کے بجائے اس پر مسح کرلینا کافی ہے۔

(۸) اس فرقہ کے نزدیک دو وقت کی نماز کسی بھی دنیاوی ضرورت سے ایک وقت میں پڑھی جاسکتی ہے۔

(۹) اس فرقہ کے یہاں قرآن کریم بلا وضو اور بلا غسل چھونا جائز ہے۔

(۱۰) عورت مرد کی امامت کرسکتی۔

(۱۱) سجدہ تلاوت بغیر وضو کے بھی درست ہے۔
(۱۲) ایک میل کے سفر سے آدمی مسافر ہو جاتا ہے، وہ نماز میں قصر کرے۔
(۱۳) ماں باپ اور اولاد کو زکوۃ دینی جائز ہے۔
(۱۴) جس کو بھوک اور پیاس کا تقاضا سخت ہوتا ہو، اس پر روزہ رکھنا فرض نہیں ہے۔
(۱۵) فرقہ اہل حدیث کے نزدیک جو شخص روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو اس کو روزہ کا فدیہ دینا واجب نہیں ہے۔
(۱۶) کافر کے پیچھے کسی نے نماز پڑھی، بعد میں اس نے اپنا کافر ہونا بتایا تو نماز ہو گئی، دہرانا واجب نہیں ہے۔
(۱۷) غیر مقلدوں کا مذہب ہے کہ جب نماز بلا عذر شرعی چھوڑ دی گئی ہو تو اس کی قضا نہیں ہے۔
(۱۸) جوتے پہن کر نماز پڑھنا مسنون ہے۔
(۱۹) جن دواؤں یا جس خوشبو میں شراب ملی ہو، ان کا استعمال جائز ہے۔
(۲۰) ایک مد (تقریباً ۱۸ ؍ لیٹر) شراب کا شوربا پاک ہے۔
(۲۱) شراب سے گوندھا ہوا آٹا اور اس سے پکی ہوئی روٹی ہو تو اس کا کھانا جائز ہے۔
(۲۲) مشت زنی (ہاتھ سے منی نکالنا) جائز ہے، بلکہ بعض اوقات واجب ہے۔
(۲۳) منی، خون، شرمگاہ کی رطوبت، شراب سب پاک ہے، اور سور کے علاوہ تمام حیوانات کا پیشاب پاک ہے۔
(۲۴) حضرت ابوسفیان، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہنا نہیں چاہئے۔

فرقہ اہل حدیث کے سینکڑوں جدید اور تازہ مسائل میں سے یہ چند ایک بطور نمونے کے ذکر کئے گئے ہیں۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

کتاب کا لب ولہجہ سخت ہے، مگر یہ اس تعدی اور ظلم کا جواب ہے جو غیر مقلدین کی

طرف سے احناف پر مسلسل ہوتا رہتا ہے، لیکن حنفی عالم خواہ کتنا ہی سخت لب ولہجہ اختیار کرنا چاہے، غیر مقلدوں کے عشر عشیر کو نہیں پہونچ سکتا۔ مولانا نے ان کے سخت الفاظ اور دشنام طرازیوں کے نمونے بھی کتاب میں پیش کئے ہیں۔ کتاب میں مسائل کی فہرست نہیں ہے، اس کے بغیر کتاب میں بڑی کمی محسوس ہوتی ہے، غیر مقلدوں کے ہذیانات سے واقفیت کے لئے کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ماخذ: انوار العلوم۔ ستمبر (۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : فیضان محبت
مرتب : حضرت مولانا قمرالزماں صاحب
صفحات : ۲۱۶
ناشر : مکتبہ دارالمعارف ۴۲۶۶؍۷۰۴بخشی بازارالہ باد
قیمت : درج نہیں

امام معرفت ومحبت حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی قدس سرہ اس دور اخیر میں جب کہ قلوب واذہان پر مادیت ودنیا پرستی کے غلبہ نے ایسا تسلط کیا ہے کہ معرفت و روحانیت کی تمام راہیں تقریباً مسدود ہوگئی ہیں، اس دورظلمت میں حضرت اقدس کا وجوداللہ تعالی کی برہان اور محبت وروحانیت کا اعلیٰ نشان تھا، جن لوگوں نے حضرت کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے، انہیں اس گزارش کی صداقت میں ذرا بھی تأمل نہیں ہوگا، لیکن جنہوں نے آپ کی زیارت نہیں کی ہے وہ بھی آپ کے جلووں کی جھلکیاں ''فیضان محبت'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت اقدس محبت وعرفان کے بحرمواج تھے، جب یہ سمندرلہراتا تھا تو کبھی کبھی منظوم کلام اوراشعار کے آبدار موتی ساحل پر بکھر جاتے تھے، انہیں آبدار موتیوں کو پرویا گیا تو اس نے عرفان محبت کا نام پایا، یہ نام اتنا برمحل اور اتنا بامعنی ہے کہ اس کی داد نہیں دی جاسکتی، جگرمرحوم نے مستی کے عالم میں ایک شعر کہا تھا، شعر کیا ہے، اظہار حقیقت کا نقش دوام ہے۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انساں کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام تو ہے عرفان محبت عام نہیں

یعنی محبت کا فیض تو سارے عالم کو حاصل ہے، ہر ایک میں اس کی استعداد وصلاحیت

موجود ہے،مگر محبت کی شناخت ومعرفت جس سے اس کے تقاضوں کی تکمیل ہو سکے،خاص خاص لوگوں کو ہوتی ہے۔

حضرت اقدس انہیں خواص بلکہ اخص الخواص میں سے تھے،جن پر عرفان محبت کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔حضرت نے اس عرفان کو اشعار میں سمویا،مگر عرفان محبت، پھر عرفان محبت ہے۔اس کا عام قلوب واذہان تک پہونچنا آسان نہ تھا،حالانکہ حضرت کے اشعار اعلیٰ شعریت کے حامل ہونے کے باوجود نہایت سادہ اور سہل ہیں،اور شاید ان کی سادگی ہی ان کے عمیق ودقیق معانی کی تہوں میں پہونچنے سے مانع بن گئی ہے۔شمس الرحمان فاروقی نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ ’’حضرت احمد پرتاب گڑھی کے کلام کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ زبان نہایت سادہ اور بظاہر کسی دقت سے خالی لکھتے تھے،ان کے شعر میں سلاست اور صفائی حد اعجاز تک پہونچی ہوئی تھی،لہٰذا ان کے کلام میں سلوک وعرفان کے باریک نکتے اس طرح پنہاں ہو کر آتے تھے جس طرح بقول غالبؔ

نبض خس میں شعلۂ پنہاں ہوتا ہے

یعنی جب خس کو حرارت پہونچے تو وہ روشن ہو ورنہ وہ محض ایک پرکاہ ہے،اسی طرح حضرت پرتاب گڑھی کا کلام عام لوگ پڑھیں یا سنیں تو اکثر لاعلمی یا توجہ کی کمی یا درجۂ فہم کی پستی کے باعث سرسری گزر جائیں،بقول میرؔ:

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

اور یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا کا ہر شعر اپنے اندر شریعت وطریقت اور حقیقت و معرفت کا ایک جہانِ معنی رکھتا ہے،لیکن اس جہانِ معنی تک رسائی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ مولانا قمر الزماں صاحب مدظلہ ایک صاحب نظر عالم اور صاحب دردو محبت اہل دل ہیں،جنہوں نے ابتداء مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کے خوان کرم سے استفادہ کیا،پھر حضرت پرتاب گڑھی علیہ الرحمہ کی خدمت میں طویل مدت گزاری،وہ علم و معرفت اور شریعت وطریقت دونوں کے جامع ہونے کے ساتھ نہایت صاحب ذوق بھی ہیں،

انہوں نے حضرت کی حیات میں عرفان محبت کے فیضان کو عام کرنے کا ارادہ کیا۔انہوں نے حضرت کے اشعار کی تشریحات اس طرح لکھیں کہ ان میں شریعت وطریقت اورمعرفت ومحبت کے جس قدر رموز واشارات تھے،سب کھل کر نمایاں ہوگئے،اور پھر مزید یہ کہ انہیں قرآن و حدیث اور علماومشائخ کے اقوال سے اس طرح مدلل کیا کہ کسی کومجالِ تردد باقی نہ رہے۔اس طرح حضرت کے علوم ومعارف عام بھی ہوئے اور مدلل بھی۔

اس خاکسار نے فیضان محبت کو پڑھ کرحضرت کی خدمت میں ایک مرتبہ عرض کیا تھا کہ حضرت!عرفانِ محبت تو عام نہ تھا،مگر مولانا قمرالزماں صاحب مدظلہ نے فیضانِ محبت لکھ کر اسے بھی عام کردیا۔حضرت یہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔

یہ کتاب اہل شریعت کے لئے اور اہل طریقت کے لئے بھی اور عام اردوخواں حضرات کے لئے بھی ایک راہنما اور دلیل ہے۔ہر ایک اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔یہ کتاب شریعت وطریقت کی جامع بھی ہے اور حضرت اقدس کے احوالِ باطنی کونمایا بھی کرتی ہے،اس سے مردہ دلوں کوزندگی اور زندہ دلوں کوتازگی ملتی ہے۔

بات تو ذرا طویل ہوجائے گی،مگر تشریحات کا ایک نمونہ پیش کئے بغیر دل اور قلم راضی نہیں ہورہے۔حضرت کا ایک شعر ہے۔

کہنے کی نہیں بات یہ، کہتا ہوں مگر خیر
پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم

''محالات کا عالم'' آپ نے کچھ سمجھا؟اب اس کی تشریح سنئے،کس قدر برمحل اور معرفت افزا ہے۔پہلے مصرعہ کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرات اہل اللہ اگر اپنا کوئی حال بہ مصلحت یا بضرورت ظاہر فرماتے ہیں تو ایسا عنوان اختیار فرماتے ہیں جس سے کسی قسم کی انانیت اور خودی کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ ہر ہر حرف سے تواضع ومسکنت،خوف وخشیت کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے،چنانچہ حضرت والا کے مندرجہ بالاشعر کے پہلے مصرع کوملاحظہ فرمائیں کہ کس قدر احتیاط کے ساتھ فرمارہیں۔

کہنے کی نہیں بات یہ، کہتا ہوں مگر خیر

پھر دوسرے مصرع۔

پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم

کی شرح فرماتے ہیں کہ:

''جو چیزیں اس عالم دنیا میں محالات میں سے ہیں، مثلاً رویت جنت ودوزخ اور اسی طرح دیدار الٰہی وغیرہ، تو جب طالب صادق ریاضت ومجاہدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے نسبت و تعلق قوی کر لیتا ہے، اور اللہ جل شانہ کی عبادت ''ان تعبد الله كانك تراه'' کے حال سے ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے حجابات مرتفع فرما دیتے ہیں، اور ایسے حال حضور سے نوازتے ہیں جس سے مغیبات کا گویا انہیں مشاہدہ ہونے لگتا ہے''۔

کس قدر عمدہ شرح ہے، واقعی توفیق خداوندی کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، اور حضرت اقدس کی روح مبارک کو خوش رکھے۔ زیر نظر نسخہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے نفع کو عام فرمئیں۔

ماخذ: المآثر۔ جون، جولائی، اگست (۱۹۹۷ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	تقریر دلپذیر
مصنف	:	حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی متوفی ۱۲۹۷
تحقیق	:	مولانا عبدالرشید بستوی
صفحات	:	۴۰۵
ناشر	:	شیخ الہند اکیڈمی۔ دارالعلوم دیوبند
قیمت	:	۱۲۰/۰۰ روپئے

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں دین اسلام کے لئے اللہ تعالی کی ایک واضح برہان تھے، ان کا عظیم کارنامہ دارالعلوم آج بھی زندہ و تابندہ ہے، اس کے علاوہ حضرت نے مختلف موضوعات پر متعدد تصنیفات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ تصنیفات کیا ہیں؟ علم وتحقیق کے شہ پارے ہیں، کسی مسئلہ پر دلائل پیش کرنے پر آتے ہیں تو عقلیں حیران ہو جاتی ہیں کہ یہ غامض اور عمیق علوم کہاں سے آرہے ہیں؟ جن باتوں کی طرف عموماً علما کے اذہان نہیں پہونچتے، وہاں سے وہ دلائل وشواہد کے موتی چنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحریر کر دینے کے بعد بھی مشکل ہی سے ان کا ادراک ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں اچھوتے مضامین، گہرے اور مضبوط دلائل اور بلند معانی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کا سمجھنا عالم کی ذہانت وذکاوت کا امتحان ہے، ان میں علوم ومعارف کا بیش بہا خزانہ ہے، لیکن غالباً ان کے دشوار ہونے کی وجہ سے کماحقہ ان کی طرف توجہ نہیں دی جاسکی، کتابیں حضرت کی چھپتی رہتی ہیں، مگر ایسی کہ ان سے استفادہ دشوار ہوتا ہے، کتابت کی اغلاط، طباعت کی خرابی اور کاغذ کی فرسودگی کی وجہ سے کوئی پڑھنے کی ہمت بھی کرے تو دو ایک صفحہ پڑھ کر ہمت ہار جائے۔ البتہ بعض کتابوں کی عمدہ کتابت و طباعت بلکہ تسہیل کا بھی اہتمام ہوا، مگر وہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

اب پھر ارباب دارالعلوم دیوبند کو اس کی طرف توجہ ہوئی، ایسا لگتا ہے کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی تصنیفات پر جدید طرز تحقیق کے مطابق کام ہوگا۔ چنانچہ اس کی پہلی کڑی زیر تبصرہ کتاب ''تقریر دلپذیر'' خوبصورت طباعت اور عمدہ کاغذ کے ساتھ اہل علم کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم کی طرف سے اس کتاب کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس کتاب میں حضرت نانوتوی نے اسلام کے بنیادی عقائد توحید و رسالت وغیرہ کا اثبات اور ان کے ذیل میں بہت سے مسائل کی توضیح وتشریح نہایت محکم اور معقول انداز میں کی ہے۔

کتاب کی تحقیق مولانا عبدالرشید صاحب بستوی نے کی ہے، تحقیق کا کام خاصا دشوار ہے، مولانا نے اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔

تقریر دلپذیر کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، پہلا ایڈیشن مطبع صدیقی بریلی سے حضرت کی حیات میں شائع ہوا تھا، اس وقت کتاب کے ۷۰ اصفحات تھے، کتاب نا تمام تھی، پھر تقاضے ہوئے کہ اسے مکمل کر دیا جائے، حضرت نے قلم اٹھایا، مگر اب بھی نا تمام رہ گئی، دوسرا ایڈیشن اضافہ شدہ مطبع بحرالعلوم لکھنو سے ۲۸۰ صفحات پر شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ کے زیر نگرانی مطبع قاسمی دیوبند سے شائع ہوا۔

مولانا بستوی نے زیر نظر نسخہ دوسرے اور تیسرے ایڈیشن کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا ہے، متن کی بنیاد مطبع بحرالعلوم والے نسخے کو قرار دیا ہے، اس کی اہمیت کیا ہے؟ مولانا بستوی اس کا تعارف کراتے ہیں:

> ''اس نسخے میں اہمیت اس بنا پر ہے کہ یہ حضرت نانوتوی کے نسخۂ دستخطی کی بعینہ نقل ہے۔ نیز شروع میں فہرست مضامین شامل کی گئی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ کتاب ہذا کی حضرت نانوتوی کی طرف سے تکمیل کے بعد غالباً یہ پہلا ایڈیشن ہے جس میں حضرت کی عبارت میں کسی قسم کی تبدیلی یا حذف واضافہ نہیں کیا گیا ہے، حتی کہ الفاظ کے املا میں بھی کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے''۔ (ص ۱۷)

دوسرا نسخہ جو مولانا میاں صاحب نے شائع کیا، اس کی اہمیت کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں بعض عنوانات کا اضافہ ہوا ہے، پیراگراف قائم کئے گئے ہیں، اور بعد کے تمام ایڈیشن اسی کی

نقل ہیں‘‘۔(ص ۱۸)

پھر فاضل محقق نے بتایا کہ ان خوبیوں کے باوجود دونوں نسخوں میں کچھ خامیاں تھیں۔ بحرالعلوم کا ایڈیشن عنوانات، پیراگراف، صحیح اردو املا اور رسم الخط کے اصول کی رعایت سے یکسر عاری مسلسل مضمون کے مانند پھیلتا چلا گیا ہے، اور کتاب کے خاتمے پر ہی یہ سلسلہ رکا ہے، دوسرے نسخے میں ان خامیوں کی کچھ اصلاح تو کر دی گئی ہے مگر بعض ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جن سے کتاب کی استنادی حیثیت یقیناً مجروح ہوتی ہے، مثلاً اصل کتاب میں موجود تابع اضافات اور فارسی تراکیب کو بدل کر اردو کے قالب میں ڈھال دیا گیا، یا سہولت کی خاطر بعض الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے‘‘۔(ص ۱۸)

(۱) فاضل مرتب نے بحرالعلوم والے نسخے کو بنیاد بنایا ہے، اور جہاں جہاں مطبع قاسمی والے نسخے میں اس سے کچھ اختلاف ہے اسے حاشیہ میں لکھ دیا ہے۔

(۲) انہوں نے زیرنظر ایڈیشن میں اس بات کا خصوصیت سے اہتمام کیا ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت اور آپ کے الفاظ میں ہرگز کسی قسم کی تبدیلی نہ آنے پائے۔

(۳) اور کوشش یہ کی ہے کہ کومے، فل اسٹاپ، سوالیہ نشان، ڈیش، سیمی کولن اور قوس کی علامتوں کے ذریعہ کتاب کے مضمون ومفہوم کو سہل اور واضح کر دیں۔

(۴) نیز یہ کہ جو الفاظ مشکل اور پیچیدہ تھے ان کے مرادی مفہوم فرہنگ آصفیہ اور آصف اللغات جیسے معتبر ومستند اردو لغات کی مدد سے حاشیے پر لکھ دیئے ہیں۔

(۵) اگر کہیں کوئی لفظ مفید معنی بڑھایا گیا ہے تو اسے قوسین میں کر کے نمایاں کر دیا ہے۔

(۶) البتہ بعض الفاظ کے املا کو ضرور درست کیا ہے، مثلاً ’’اوس‘‘ کہ جگہ ’’اس۔‘‘ ’’پھونچا‘‘ کی جگہ ’’پہنچا‘‘۔ ’’تسپر‘‘ کی جگہ ’’پھر‘‘ وغیرہ۔

(۷) نئے عنوانات کے لئے زیادہ تر مطبع بحرالعلوم کے نسخے سے مدد لی گئی ہے، اور نئے پیراگراف لگانے کے سلسلے میں مطبع قاسمی کے نسخے کو پیش نظر رکھا گیا ہے، مؤخر الذکر نسخے میں کہیں کہیں مفید حواشی بھی تھے، انہیں بھی ذکر کر دیا گیا ہے‘‘۔(ص ۱۹)

یہ اس ایڈیشن کی خصوصیات ہیں، ماشاء اللہ فاضل محقق نے خوب محنت کی ہے، اللہ تعالی

انہیں جزائے خیر دے، لیکن کتاب کے مطالعہ کے بعد فاضل محقق اور سربراہ شیخ الہند اکیڈمی سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) میرے سامنے بحر العلوم والا نسخہ نہیں ہے، مگر کتاب چونکہ اسی کی نقل ہے، اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں، اور بعض بڑی فاش غلطیاں ہیں، یہ گو کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے دستخطی نسخہ کی بعینہ نقل ہے، جس میں حضرت کی عبارت میں کسی قسم کی تبدیلی یا حذف واضافہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ غلطیاں حضرت نانوتوی ہی کی ہوں گی، کاتب کی کارفرمائیاں کون نہیں جانتا؟ مطبع قاسمی والے نسخے میں ان غلطیوں کی تصحیح ہے، مگر دو ایک جگہوں کو چھوڑ کر یہ ساری غلطیاں زیر نظر ایڈیشن کے متن میں شامل کردی گئیں ہیں، اور حاشیے میں اس کو بھی ذکر کردیا ہے۔ صحیح طریقۂ عمل یہی تھا کہ اغلاط کی اصلاح کرکے متن مرتب کیا جاتا اور حاشیہ میں وضاحت کردی جاتی، جیسا کہ دو ایک جگہ کیا گیا ہے، متن میں کتابت کی غلطی کو برقرار رکھنا اور حاشیہ میں اس کی تصحیح کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

ص۱۵۱ متن انہوں نے صحیح نبیوں نے

ص۱۶۸ 〃 قیمہ کے برابر صحیح قیمت کے برابر

ص۲۲۷ 〃 کمی زیادتی، طاقت کی کمی زیادتی پر صحیح کمی زیادتی طاقت کی، لطافت کی کمی زیادتی

متن موقوف ہے صحیح پر موقوف ہے

اس طرح کی اور بھی متعدد مثالیں نظر سے گزریں۔

(۲) املا کے جدید طریقے جو آج کل بعض لوگ رائج کرنا چاہتے ہیں وہ اس لائق نہیں ہیں کہ آنکھ بند کرکے انہیں تسلیم کرلیا جائے، بالخصوص پرانے علما کی تحریرات کو جدید طرز املا پر ڈھالنے کی کوشش سے بعض اوقات الجھنیں پیش آسکتی ہیں۔

مثلاً حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی عبارت میں متعدد بار ''سو، چونکہ'' کے لفظ آئے ہیں، ان کی کتابت جدید طرز کے مطابق ''سوچوں کہ'' ہوئی ہے، اور کمپیوٹر نے 'سوچوں' کو ایک ساتھ

کر دیا اور 'کہ' کو الگ کر دیا، اس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لفظ سوچنے سے مشتق تو نہیں ہے؟۔

'اوس' اور 'پھونچا' کا املا غلط تو نہیں ہے کہ اس کو درست کیا جائے، ہاں یہ کہنا چاہئے کہ بدل دیا گیا ہے، لیکن 'تسپر' کو بدل کر 'پھر' کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر کے لفظ سے 'تسپر' کا مفہوم ادا نہیں ہوتا، 'تسپر' کے معنی عموماً 'باوجودیکہ' ہیں۔

(۳) کتاب میں کتابت کی غلطیوں کی بھر مار ہے، ایک تو حضرت نانوتوی کی تحریریں یوں ہی عام فہم نہیں ہوتیں، اس پر کتابت کی غلطیوں نے اور مشکل پیدا کر دی ہے، ایک دو مثالیں اس کی بھی ملاحظہ ہوں۔

(الف) ص۸۰ پر ایک عنوان ہے ''استدلال کا مدار بلاغت پر''۔ اس میں بلاغت کے لفظ نے بڑی الجھن پیدا کی، غور کیا تو ''ملازمت'' کا لفظ ہونا چاہئے۔

(ب) ص۸۹ پر ہے ''اور اعتدال فراخ جاتا رہا''۔ یہاں فراخ کا لفظ کسی طرح حل نہیں ہوتا تھا، ایک دوسرے نسخے میں اسے تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ ''اعتدال کا مزاج'' ہے۔

(ج) ص۹۰ پر ہے ''پھر سارے اعضاء کو سر سے پا تک ایک شئی سی بنایا ہے''۔ اس 'شئی سی' نے بہت خلجان پیدا کیا، بہت غور کرنے کے بعد اور دوسرے نسخے کو دیکھنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ ''ایک سی شئی'' ہے۔ دوسرے نسخے میں ''ایک ایسی شئی'' ہے، اس میں 'ایسی' کا لفظ بے محل ہے، وہ بھی سہو کتابت ہے۔

(د) ص۱۰۸ پر ہے ''اگر روح ہوائی کوئی اور چیز ہے''۔ اس عبارت میں ''روح غیر ہوائی'' ہونا چاہئے۔ کاتب نے اس کا عکس کر دیا ہے۔

(ہ) ص۱۴۳ پر ہے ''وہ اس کی دعوت (رغبت) طبع ہوتی ہے''۔ اللہ جانے قوسین کے لفظ 'رغبت' سے دعوت کا معنی بتانا مقصود ہے یا اس کی تصحیح منظور ہے؟ یہاں لفظ ''مرغوب طبع'' ہے۔

غرض کتابت کی غلطیاں بے شمار ہیں، تبصرہ نگار نے اس کی فہرست مرتب کر کے مولانا بستوی کے پاس بھیج دی ہے، دو سو سے زائد کتابت کی غلطیاں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کتابت کے بعد تصحیح کا اہتمام نہیں ہوا ہے۔ کمپیوٹر سے کتابت ایک بہت نازک عمل ہے، اس کی تصحیح مشین کے پاس بیٹھ کر کرانی چاہئے، ورنہ آسمان کو آسان اور زمین کو مشین بنتے دیر نہیں لگے گی۔ ص۲۴۸

پر ڈیڑھ دوسطر عبارت مکمل چھوٹ گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایڈیشن اغلاط کتابت میں پچھلے ایڈیشنوں سے بہت بڑھ گیا ہے، بہت اہتمام سے دوبارہ تصحیح کرانے کی ضرورت ہے، ورنہ اس نسخے کو پڑھ کر وہ لوگ بھی جو کچھ سمجھ سکتے ہیں، چکرا جائیں گے،نفی اور اثبات کا عکس تو متعدد جگہوں پر ہے۔

ایک دلچسپ غلطی کتاب کے محقق سے ایک لفظ کے معنی بتانے میں ہوئی ہے۔مولانا کی عبارت ہے:

''جیسے روڑکی کے گودام میں کسی نے دیکھا ہو کہ ایک کل سے دوسری کل چلتی ہے''۔

اس میں ''روڑکی'' کا معنی بتانے کی محقق نے کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''روڑکی''، پتھر توڑ کر روڑے اور کنکر بنانے والی مشین''۔(ص ۱۳۷)

حالانکہ بات یہ ہے کہ روڑکی سے روڑکی شہر مراد ہے، وہاں ابتداء انگریزوں نے ایک کارخانہ قائم کیا تھا،اس کی مشینوں کی طرف اشارہ ہے۔اس اطراف میں غالبًا وہ پہلا کارخانہ تھا، اس لئے اس کی خاص شہرت اور اہمیت تھی، ہمارے بزرگوں کی تحریرات اور ملفوظات میں متعدد جگہوں پر اس کا ذکر آیا ہے۔

شیخ الہند اکیڈمی نے یہ کام تو بہت اچھا شروع کیا ہے کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی کتابوں کو جدید طرز پر خوبصورت انداز میں شائع کرے،مگر اس کے لئے جتن اور محنت کی ضرورت ہے،اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

ماخذ: المآثر۔ستمبر،اکتوبر،نومبر (۱۹۹۷)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : الفوز الکبیر فی اصول التفسیر
عربی ترجمہ : مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
طباعت اور کاغذ : اعلیٰ
ناشر : مکتبہ حجاز دیوبند

حق تعالی کا ارشاد ہے: **وربک یخلق مایشاء ویختار**. تمہارا رب جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور انتخاب فرماتا ہے۔ اس اصول خداوندی کے تحت زمان ومکان، افراد واشخاص اور دستور وقانون ہر ایک میں خلق وانتخاب کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، اللہ کی مشیت جس زمانہ میں جس کام کے لئے جس کو چاہتی ہے، چن لیتی ہے، اور پھر اسے اس کام کا مرکز بنا کر اس کا فیضان عام کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں حق تعالی کی حکمت بالغہ نے علم اور دین کے فیضان وبقا کے لئے عین اس وقت جب کہ مسلمانوں کی حکومت زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی، ایک عبقری شخصیت، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا انتخاب فرمایا، اور ان کو علم وہدایت کا ایسا مرکز بنایا کہ آج علم کی جو بھی بہار دکھائی دے رہی ہے، اس کا فیضان اسی مرکزی شخصیت سے وابستہ ہے۔ ہندوستان میں علم حدیث کی عام اشاعت انہیں کے مدرسۂ فیض کی برکت ہے، قرآن کریم کا فارسی ترجمہ انہیں نے کیا، اور پھر ان کے اخلاف واحفاد نے اردو میں ترجمے کئے۔

قرآن فہمی کا دروازہ بھی ان کے لئے حق تعالی کی طرف سے کھولا گیا، یوں تو قرآن کریم کی تفسیریں چھوٹی بڑی بہت سی لکھی گئیں، اس سلسلے میں اصول وقواعد بھی مرتب ومنضبط کئے گئے، علماء اسلام نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ **شکر الله مساعیهم وتقبل منهم**
لیکن حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو قرآن فہمی اور اسرار دین کے سمجھنے کی جو خاص

استعداد اللہ کی جانب سے ودیعت کی گئی تھی، اس کی بنیاد پر تفسیر کے سمجھنے میں اور سمجھانے کی ایک قریب الفہم اور مختصر راہ کھلی، جو بہت واضح بھی ہے کہ اس کے سمجھنے میں دشواری بھی نہ ہو، اور بہت مختصر بھی، کہ آدمی کم سے کم وقت میں قرآن کریم کے مضامین ومطالب کا ادراک کرلے۔ شاہ صاحب نے تفسیر کے اصول وقواعد کو ایک مختصر سے رسالہ میں قلم بند فرمایا۔

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی علیہ الرحمہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہ کی خدمت میں رہ کر جب تفسیروں کا مطالعہ کرنا چاہا، اور تفسیر اور اصول تفسیر کی مفصل کتابیں دیکھ ڈالیں، مگر تفصیلات سے فہم کی الجھنیں کچھ بڑھ ہی گئیں تو انہوں نے حضرت شیخ کی خدمت میں اپنی مشکل رکھی، شیخ نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب محدث دہلوی کا ایک مختصر سا رسالہ ''الفوز الکبیر'' ہے، اسے پڑھ لو۔ مولانا سندھی نے بیان کیا کہ اس کے پڑھنے سے مشکلات کی تمام گرہیں کھل گئیں، اور قرآن فہمی کی راہ ہموار ہوئی۔

یہ رسالہ حضرت شاہ صاحب نے فارسی زبان میں تالیف فرمایا ہے، دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں اس کا عربی ترجمہ شامل کیا گیا، اس ترجمہ پر مترجم کی حیثیت سے علامہ محمد منیر الدمشقی کا نام چھپا ہوا ہے، لیکن ان کی شخصیت معلوم نہیں ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے حوالے سے اس کے دوسرے مترجم مولانا سلمان ندوی صاحب نے بتایا کہ یہ کسی ہندوستانی ہی عالم کا کیا ہوا ترجمہ ہے، لیکن مطبع منیر یہ دمشق سے شائع ہوا ہے، مترجم نے اپنے نام کا اخفا کیا اور صاحب مطبع کے نام سے یہ رسالہ شائع ہوا۔

لیکن اس ترجمہ میں کچھ تسامحات تھے، بعض جگہ مطلب کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، تصحیح کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں بھی بہت ہوگئی تھیں، ضرورت تھی کہ ترجمہ کا مقابلہ اصل سے کیا جاتا، غلطیوں کی تصحیح کی جاتی، اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند نے پیش رفت کی، انہوں نے الفوز الکبیر کی عمدہ شرح ''العون الکبیر'' کے نام سے عربی میں لکھی، اس میں ان جگہوں کی نشان دہی کی، اور اسے حل کیا، اس شرح میں انہوں نے اصل ترجمہ کو متن بنایا تھا، اور شرح میں اس کی تصحیح کی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ درس کے وقت میں طالب علم کے پاس وہی پرانا ترجمہ ہوتا ہے، اور

الجھنیں پیش آتی رہتی ہیں، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ از سرنو اس کا عربی ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔ یہ خدمت ندوۃ العلما لکھنو سے مولانا سلمان حسنی ندوی صاحب نے اب سے کچھ مدت پہلے انجام دی تھی، انہوں نے نئے اسلوب میں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا، تاہم درس کے حلقوں میں پرانا ہی ترجمہ جاری رہا، اور ناشرین اسے ہی چھاپتے رہے۔

اب حضرت مفتی صاحب نے ان دونوں ترجموں کو سامنے رکھ کر تیسرا ترجمہ کیا، جو ماشاءاللہ ہر لحاظ سے عمدہ اور مکمل ہے، ترجمہ کی زبان فصیح اور سلیس ہے، اسلوب دلنشیں ہے، ذیلی عنوانات کا اہتمام کیا ہے، ہر پیراگراف نئی سطر سے شروع کیا ہے، اس طرح اس کو پڑھنا اور اس سے استفادہ کرنا نہایت آسان ہو گیا ہے۔

اور بڑا کام یہ کیا ہے کہ مختصر حواشی اور تعلیقات سے اس کی ہلکی پھلکی گویا شرح کردی ہے، مشکل الفاظ کے معانی تحریر کئے ہیں، ضرورت محسوس ہوئی ہے تو عربی الفاظ کے ترجمے اردو میں بھی کر دیئے ہیں۔

شاہ صاحب نے کتاب میں جن آیات کو بطور اشارہ کے اختصار کی غرض سے لکھا ہے، ان کے حوالے سورہ اور آیت نمبر کے ساتھ درج کر دیئے ہیں، حدیثوں کے حوالے ذکر کئے ہیں، جن اصول وقواعد کی شاہ صاحب نے اختصار کے خیال سے مثالیں نہیں پیش فرمائیں کہ قرآن سے مناسبت رکھنے والا خود سمجھ لے گا، ان کی مثالیں مختصر الفاظ میں تحریر کردی ہے، اسی طرح کتاب میں جن علما اور مفسرین کے نام آئے ہیں، ان کا مختصر لفظوں میں تعارف کرا دیا ہے۔

غرض یہ ترجمہ اصل میں متن ہی ہے، لیکن اس کے مفید حواشی نے اسے گویا حل کر دیا ہے، اس طرح اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے بغایت مفید ہو گئی ہے۔

یہ کتاب اس لائق ہے کہ پرانے ترجمہ کے بجائے اسے نصاب میں رکھا جائے، مفتی صاحب کی یہ کوشش مشکور ہے، اور موصوف تمام اہل درس کے شکریے کے مستحق ہیں۔

ماخذ: المآثر۔فروری، مارچ، اپریل (۱۹۹۹ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	صدیق اکبر۔ایک انسان کامل
ترجمہ وتلخیص	:	پروفیسر مولانا بدرالدین الحافظ سابق صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی
ناشر	:	مکتبہ وحیدیہ ۵۳۷ ذاکرنگر اوکھلا، نئ دہلی ۲۵
کتابت وطباعت	:	عمدہ
قیمت	:	ندارد

یہ کتاب مشہور مصری ادیب عباس محمود العقاد کی کتاب ''عبقریۃ الصدیق'' کا ترجمہ اور اس کی تلخیص ہے۔عباس محمود نے عبقریۃ کے عنوان سے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ہمارے فاضل مترجم کوان عبقریات سے خاص دلچسپی اور مصنف کے ساتھ خاصا حسن ظن ہے،اسی دلچسپی اور حسن ظن کا نتیجہ ہے کہ موصوف نے''عبقریۃ الصدیق'' کوترجمہ وتلخیص کے لئے منتخب کیا،لیکن جن وجوہ سے انہوں نے دلچسپی اور حسن ظن کا اظہار کیا ہے،افسوس ہے کہ تبصرہ نگار کوان سے اتفاق نہیں ہے۔کتاب کی اور مصنف کی جو خوبیاں فاضل مترجم نے اپنے مقدمہ میں ذکر کی ہیں،ان میں واقعیت کم ہی نظر آتی ہے۔عباس محمود عقاد نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عبقریت کو بیان کرنے کے لئے جو طرز تعبیر اختیار کی ہے، وہ عجیب نامانوس سی ہے،اس پر اسلامی علامت کم، اور استشراق کا اثر زیادہ ہے،اس سے صدیق اکبر کی شخصیت بجائے نمایاں ہونے کے کچھ دبی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے،اس وقت ہمارا موضوع عقاد کی کتاب پر تبصرہ نہیں ہے،ورنہ اس کی تفصیل قدرے عرض کی جاتی، یہاں مقصد کتاب کے ترجمہ وتلخیص پر تبصرہ کرنا ہے۔

کتاب جب ہاتھ میں آئی تو اس حسن ظن کے ساتھ مطالعہ شروع کیا کہ فاضل مترجم عربی ادب پر اچھی دسترس رکھتے ہیں،شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی کے صدر گرامی قدر رہے

ہیں، اردو کا بھی نکھرا ہوا ذوق رکھتے ہیں، لیکن جب مطالعہ شروع کیا تو ایسی عبارتیں نظر سے گزرنے لگیں جو پیچیدگی، اغلاق اور تعقید معنوی سے لبریز تھیں، قلم کی ہکلاہٹ دیکھ کر حیرت ہونے لگی کہ عربی اور اردو کا ادیب ایسی ناقابل فہم عبارت لکھتا ہے، بعض جگہ ایسا محسوس ہوا کہ ترجمہ ہی غلط ہوگیا ہے، لیکن اصل کتاب سامنے نہ تھی، اس لئے فیصلہ کرنا دشوار تھا، خیال ہوتا تھا کہ شاید عقاد صاحب اسم بامسمی ہوں کہ وہ خود بعض دوسرے مصری ادیبوں کی طرح دشوار اور پیچیدہ عبارت لکھتے ہوں۔ پھر ایک جگہ سے اصل کتاب ''عبقریۃ الصدیق'' منگوائی، اور ترجمہ کا اصل سے مقابلہ کیا تو اندازہ ہوا کہ:

غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

عقاد صاحب اتنے پیچیدہ نویس نہیں ہیں، جتنی پیچیدگی مترجم صاحب نے پیدا کردی ہے، یہ پیچیدگی زیادہ تر اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ مترجم نے اصل عبارت کے مفہوم کو کماحقہ سمجھا نہیں۔

مثال کے لئے عقاد کے مقدمہ کی ایک عبارت ملاحظہ فرمایئے۔ عقاد نے لکھا ہے کہ مصر کے مشہور ادیب استاذ احمد امین نے ہیکل پاشا کی کتاب ''الصدیق'' اور عقاد کی ''عبقریہ عمر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"بقيت مسئلة هامة! كثيرا ما اختلفت وجهة نظر الكتاب فيها وهي ان العظيم مهما عظم له خطآت والا ماكان انسانا والعصمة لله وحده، فهل واجب المترجم له ان يعرض لكل ذالک فی تفصيل فيذكر كل ماله ويشيد بذكره ويذكر خطآته وينقدها...... اوواجبه فقط تجليلة نواحی العظمة والتاويل والدفاع الدائم عن نواحی الخطا؟.

انا الى الراى الاول اوجب متاسيا بابی بكر وعمر نفسيهما والمؤلفان الفاضلان الى الراى الثانی اميل.

والواقع اننا الى الراى الثانی اميل كما قال زميلنا الاستاذ ولكنه الميل الذی نحده بما قدمناه من حدود نحتج له بما بيناه من اسباب". (ص۱۲)

مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک اہم مسئلہ اور ہے، اور اس میں مصنفین کے نظریے مختلف ہیں، وہ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی بڑا آدمی خواہ کتنا ہی بڑا ہو، اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی ہوتی ہیں، ورنہ وہ انسان ہی نہ ہوگا۔ تو کیا سوانح نگار کی ذمہ داری یہ ہے کہ عیب و ہنر سب کو تفصیل سے بیان کرے، خوبیوں کو سراہے، اور خامیوں پر نقد کرے؟ یا یہ کہ صرف اس کی عظمتوں کو بیان کرے اور خطاؤں کی تاویل کرے اور ان کا دفاع کرے؟۔

احمد امین کہتے ہیں کہ میں پہلی رائے کی طرف رجحان رکھتا ہوں، اور میرا یہ رجحان خود ابوبکر اور عمر کی سیرت اور ان کے طریقۂ کار کی پیروی اور اقتداء کے اثر سے ہے، ہیکل پاشا اور عقاد کا رجحان دوسری رائے کی جانب ہے۔

عقاد اس پر لکھتے ہیں کہ واقعہ یہی ہے کہ ہمارا رجحان دوسری ہی رائے کی جانب ہے، جیسا کہ استاذ احمد امین نے فرمایا، لیکن اس رجحان کے کچھ حدود و آداب ہیں جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور کچھ اسباب ہیں جن سے ہم اس رائے کے حق میں استدلال کرتے ہیں۔

یہ اس عبارت کا صاف ستھرا اور واضح مفہوم ہے، لیکن فاضل مترجم نے اس کو کیا سمجھا اور اس کو کس طرح پیش کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں میرے فاضل محقق دوست احمد امین نے میری کتاب 'عبقریہ عمر' اور ہیکل پاشا کی کتاب 'الصدیق' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک مسئلہ تمام مصنفین کے لئے نہایت اہم ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان ہو، <u>وہ جتنا بھی عظیم تر ہوتا جائے گا، اس کے ساتھ غلطیاں اور خطائیں بھی ہوں گی</u>، ورنہ وہ انسان ہی نہیں ہوسکتا، عصمت تو صرف اللہ کے لئے ہے[۱] تو کیا ہر سوانح نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان باتوں کو تفصیل سے بیان کرے، اس میں تعریفی پہلو بھی آئیں، اور خطاؤں پر بھی تنقید ہو؟....... یا ایک سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ عظمت کے تمام گوشوں کو اجاگر کرے اور خطاؤں کا مکمل دفاع کرے''؟۔

یہاں تک ترجمہ غنیمت ہے، صرف خط کشیدہ جملہ محاورہ اور فصاحت سے گرا ہوا ہے، اور ترجمہ کے لحاظ سے بھی ناقص ہے، لیکن اس کے بعد کا ترجمہ بالکل ہی ناقابل فہم ہے، اگلی عبارت بھی احمد امین ہی کی ہے، مگر فاضل مترجم نے اسے عقاد کی عبارت سمجھ لیا ہے، فرماتے ہیں:

''میری رائے میں فاضل استاذ کی پہلی رائے درست ہے، خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کے حق میں، اور دوسری رائے کے حق میں ہمارا میلان تو ہے مگر کچھ حدود کے ساتھ''۔ (ص۱۳،۱۴)

احمد امین نے سوانح نگاری کے سلسلے میں دو نظریات ذکر کئے ہیں، ایک یہ ہے کہ صاحب سوانح کے تمام معائب ومحاسن کو تفصیل سے ذکر کیا جائے، دوسرے یہ کہ محاسن کو بیان کیا جائے اور معائب کی تاویل کی جائے اور ان کا دفاع کیا جائے۔ اور بتایا کہ خود ان کا رجحان پہلی رائے کی جانب ہے، کیوں کہ ان کے خیال میں یہی طریقۂ کار حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی سیرت سے اخذ ہوتا ہے۔ احمد امین اپنے اس مزعومہ طریقہ کے اختیار کرنے میں صدیق وعمر کی پیروی سمجھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہیکل پاشا اور عقاد دوسری رائے کے حق میں رجحان رکھتے ہیں۔ لیکن مترجم نے اس کا نقشہ ہی الٹ دیا، وہ سمجھے کہ عقاد کے خیال میں احمد امین کی بیان کردہ پہلی رائے درست ہے، یعنی معائب ومحاسن دونوں کا بیان کرنا سوانح نگار کی ذمہ داری ہے، بالخصوص حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے حق میں تو یہی رائے متعین ہے کہ ان کے حالات کو لکھنے والا ان کے عیب وہنر کو منظر عام پر لائے۔ (استغفر اللہ)

یہ غلط در غلط بات ہے جس سے عقاد کا دامن پاک ہے انہوں نے عقاد کے ذمہ لگادی۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

فہم اور ترجمہ کی غلطیوں کے حیرت ناک نمونے اس کتاب میں بکثرت ہیں، بلکہ تقریباً ہر صفحے پر ہیں۔ ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو، عقاد کی عبارت ہے:

''عاش ابوقحافه حتى رأى ابنه خليفة يرفع صوته على اناس لم يكن فى مكة ارفع منهم صوتاً واعظم خطراً''. (ص۱۵)

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کے والد گرامی حضرت ابوقحافہ نے طویل عمر پائی، انہوں نے وہ وقت بھی دیکھا کہ ان کے فرزند وقت کے خلیفہ ہیں، اور ان کی آواز ایسے لوگوں پر بھی بلند ہو رہی ہے، جن سے زیادہ بلند آواز والا اور جن سے زیادہ عزت وعظمت کا مالک مکہ میں کوئی اور نہ تھا۔

یہ صاحب جن کے اوپر حضرت ابوبکر کی آواز کے بلند ہونے کا تذکرہ عقاد نے کیا ہے، اپنے وقت کے سردار مکہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہیں۔ چنانچہ چند سطروں کے بعد ان کے واقعہ کو عقاد نے لکھا ہے۔

اس تفصیل کے پس منظر میں فاضل مترجم کا ترجمہ ملاحظہ ہو، بات کتنی بدل گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''صدیق اکبر کے والد بزرگوار ابوقحافہ آپ کی خلافت تک بقید حیات رہے، اور مکہ معظّمہ میں ان سے زیادہ بلند آواز اور خطرناک صورت کا کوئی آدمی نہ تھا''۔

خط کشیدہ فقرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "**لم یکن فی مکة ارفع منهم صوتا واعظم خطراً**" کا [ترجمہ] کیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ **منهم** ضمیر کا مرجع ابوقحافہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ نیز اس ترجمہ کی صورت میں اس جملہ کا تعلق **علی الناس** سے کیا ہوگا؟ اور **اعظم خطراً** کا ترجمہ ''خطرناک صورت'' کیوں کر ہوگا؟۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے جس واقعے کی طرف اوپر عقاد نے اشارہ کیا ہے، اسے چند سطروں کے بعد ذکر کیا ہے۔ عبارت یہ ہے:

"**دعا الخليفة بابی سفيان لامر انكره،فاخذته الحدة التی كانت تراجعه فی بعض ثورات نفسه**". (ص۱۶)

خلیفہ نے حضرت ابوسفیان کو ان کے کسی معاملہ میں طلب فرمایا، جو انہیں پسند نہ تھا، اس سے ان کے کلام میں قدرے تیزی آ گئی، جو بعض اوقات ہیجان طبع کے وقت ان پر طاری ہو جایا کرتی تھی۔

اس مضمون کو مترجم نے یوں ادا کیا ہے:

''ایک دن صدیق اکبر نے حضرت ابوسفیان کو بلایا، انہوں نے تعمیل حکم میں کچھ تأمل کیا۔ (غالباً یہ **لامر انكره** کا ترجمہ ہے) اس پر صدیق اکبر ناراض ہو گئے، کلام میں ترشی آ گئی، حالانکہ وہ ذرا سا احساس ہونے پر ندامت کی طرف جھک جاتے تھے۔ (یہ غالباً **كانت تراجعه** کا ترجمہ ہے) اور نفس سے محاسبہ کرتے تھے۔ (یہ مفہوم **فی ثورات نفسه** سے شاید

اخذ کیا ہو)**انالله وانا اليه راجعون**

اسی واقعہ میں فاضل مترجم نے ایک جملہ "**لقد عدوت طورك**"کا ترجمہ کیا ہے "تونے اپنے طریقۂ کار سے دشمنی کی"۔حالانکہ **عدوت** کے معنی تجاوز کرنے کے ہیں،مترجم نے اسے عداوت سے ماخوذ سمجھا،لیکن اس کے لئے **عادیت** کالفظ آتا ہے۔

یہ کتاب اغلاط کا عجائب خانہ ہے،کوئی صفحہ ترجمہ کی غلطی سے شاید ہی خالی ہو،اور غلطیاں بھی ایسی کہ نا قابل توجیہہ!بعض ابواب تو اول سے آخر تک اغلاط کا مجموعہ ہیں۔

عقاد نے ایک عنوان قائم کیا ہے۔"**مفتاح شخصيته**"اس عنوان کے تحت عقاد نے دور کی کوڑی اٹھانے کی کوشش کی ہے،جوخود محل نظر ہے،اس پر ترجمہ کی غلطیوں نے مزید سیاہی پھیر دی ہے،ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:

"**كان ابوبكر كما رأينا عصبى المزاج ،دقيق البنية خفيف اللحم صغير التركيب،تكوين يغلب على اصحابه احد امرين ان كانوا من كرام النحيزة فهم مطبوعون على الاعجاب بالبطولة والايمان بالابطال.وان كانوا من لئام النحيزة فهم مطبوعون على الحسد والكبر وهما ضرب من الاعجاب المعكوس يودى اليه انعكاس الطبعية**"۔

عقاد کے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں حمیت تھی، دبلے بدن اور کم گوشت والے تھے،جسمانی لحاظ سے مختصر تھے،مزاج اور جسم کی یہ وہ بناوٹ ہے کہ اس طرح کے لوگ اگر طبعاً شریف ہوں تو کمالات سے متأثر ہونا اور صاحب کمال پر دل سے ایمان رکھنا ان کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے،اور اگر یہ لوگ رذیل اور پست ہوں تو ان کی سرشت میں حسد اور مکر وفریب راسخ ہوتا ہے،حسد اور مکر وفریب درحقیقت ایک "تأثر معکوس" ہے،جو ان کی الٹی طبیعت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔

اب عقاد کے اس بات کی ترجمانی مترجم کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے،اور اسے عقاد کی عبارت میں تلاش کیجئے۔لکھتے ہیں:

"صدیق اکبر کے مزاج میں خاندانی اور وراثتی استقلال تھا،وہ جسمانی لحاظ سے کم

گوشت والے ایک معمولی بدن کے انسان تھے، تو ناقدین کے ذہن میں اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس معمولی جسم میں وہ حیرت انگیز حد تک بہادر کیسے تھے؟ کیا قوی الجسم اور بہادر اسی شکل کے ہوتے ہیں؟۔

اس سلسلے میں یہاں دو قسم کے مفکرین سامنے آتے ہیں، اگر وہ شریف الطبع ہیں، تو آپ شخصیت سے بہر حال متأثر ہوں گے، اور ان کی شجاعت ان کی نگاہ میں اعلیٰ مقام حاصل کرے گی، اور اگر یہ دنی اور نچلی طبیعت کے لوگ ہیں تو ان میں حسد و مکر پیدا ہوگا، اور اس کے نتیجے میں وہ طبعی الجھن اور فکر مندی کے شکار رہیں گے''۔ (ص ۴۳)

اللہ جانے یہاں دو قسم کے مفکرین کہاں سے آ گئے؟۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

ایک لطیفہ اور ملاحظہ ہو، عقاد نے غیر معمولی اصحاب کمال یعنی عبقری افراد کی کچھ علامات ایک اطالوی مفکر کے حوالے سے نقل کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

''فیکون العبقری طویلا بائن الطول او قصیرا بین القصر ویعمل بیده الیسریٰ او یعمل بکلتا الیدین ویلفت النظر بغزارة شعره اوبنزارة الشعر علی غیر المعهود فی سائر الناس''. (ص ٦٦)

مطلب یہ ہے کہ عبقری کبھی غیر معمولی لمبے قد کا ہوتا ہے، اور کبھی بہت پستہ قد ہوتا ہے، وہ اپنے بائیں ہاتھ یا دونوں ہاتھ سے کام کرتا ہے، اس کے بال عام لوگوں کے برخلاف کبھی غیر معمولی طور پر اتنے زیادہ یا کبھی اتنے کم ہوتے ہیں کہ نگاہیں ان پر بے ساختہ اٹھتی ہیں۔

اب ملاحظہ ہو، فاضل مترجم نے اسے کیا بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مثلاً ایک عبقری واضح طور پر طویل القامت ہوگا، یا واضح طور پر پستہ قد ہوگا، بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہوگا یا دونوں ہاتھ سے''۔

یہاں تک تو ترجمہ صحیح ہے، لیکن **''یلفت بغزارة شعره او بنزارة الشعر علی غیر المعهود فی سائر الناس''** کے ترجمہ میں عجب گل کھلایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اور کسی سمت دیکھنے میں اپنے بالوں کی کثرت سے بھی کام لے گا، اور بلا لحاظ سب

لوگوں پرنظر ڈالے گا''۔(ص ٦٠)

خدا جانے اس چیستاں کا کیا مطلب ہے؟۔

مولانا بدرالدین الحافظ ہمارے کرم فرما ہیں، انہیں ہمارے تبصرے سے تکلیف تو ضرور ہوگی، تاہم ان سے گزارش ہے کہ ترجمانی اور تلخیص کے لئے مزید غور وفکر اور محنت سے کام لیں۔ ہاں یہ بھی عرض ہے کہ عقاد جیسے مشکوک ادیبوں کی تحریروں کا اگر ترجمہ نہ ہو تو امت کے حق میں یہی بہتر ہے۔

ماخذ: الماٰثر۔اگست، ستمبر، اکتوبر (۱۹۹۹ء)

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

یہ تعبیر غلط ہے۔عصمت اللہ کی صفت نہیں ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی صفت ہے۔اور یہ بھی غلط ہے کہ عصمت ہوگی تو انسان، انسان نہ رہے گا۔انبیاء کرام معصوم ہونے کے ساتھ انسان ہی ہیں۔

نام کتاب : مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں
مؤلف : مفتی محمد ڈینڈ رولوی
ناشر : دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی شمالی گجرات
کتابت وطباعت اور کاغذ: اعلی درجہ کا معیاری
قیمت : ندارد

ہندوستان کے ظلمت کدہ میں اسلام کی روشنی کس طرح پہونچی، اور کن کن مرحلوں سے گزری، کہاں کہاں چمکی، اور کب کب بجھی؟ اور بجھنے کے بعد کس کس طرح دوبارہ چمکی، کن کن بزرگوں سے اللہ تعالی نے دین کی خدمت لی، ان کے اثرات ماضی میں کیا تھے، اور اب تک کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں؟ یہ ایک طویل اور دلچسپ داستان ہے، جو تابناک بھی ہے اور عبرت خیز بھی! اس میں درس استقامت بھی ہے اور جوش وولولہ بھی! تاریخ کے صفحات نے اس دلچسپ داستان کے بہت سے ٹکڑوں کو محفوظ رکھا ہے، اور بہت سے ٹکڑے فراموش بھی کر دیئے ہیں۔ بہت سے اصحاب حوصلہ ماضی کے تہ بہ تہ ملبوں کو کرید کران بزرگوں کے کارناموں کو حال کی روشنی میں لانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کا حوصلہ قابل داد ہے اور لائق احترام۔

صوبہ گجرات سمندر کے ساحل پر آباد ہے، یہاں اسلام کی روشنی اسلام کے ابتدائی ادوار میں ہی چمکی تھی، اور اس کے بہت سے علاقے نور اسلام سے خوب منور ہوئے، بڑے بڑے علما ومحدثین اور مشائخ وصوفیا کے انفاس قدسیہ سے یہ صوبہ معطر ہوا، غیر مسلم قومیں بکثرت مسلمان ہوئیں۔

انہیں نومسلموں میں ایک قوم وہ ہے جس کے اسلام لانے اور عہد بعہد ان کی ہدایت و ضلالت کی داستان کا یہ کتاب مرقع ہے۔ اس قوم کا نام مصنف کتاب نے 'مومن قوم' بتایا ہے،

بمبئی وغیرہ میں اس قوم کے افراد بکثرت ہیں، جن کا نمایاں امتیاز دین داری اور دیانت داری ہے۔ بمبئی میں عام زبان میں اسے ''چلیا'' کہا جاتا ہے، اس قوم کا تعلق جماعت تبلیغ سے بہت گہرا ہے، مشہور مبلغ حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری علیہ الرحمہ جن کے خطابت سے بے شمار لوگ دین کی راہ پر لگے، اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ یہ قوم کس بزرگ کے ہاتھ مسلمان ہوئی؟ پھر کیوں کر جہالت کے دریا میں ڈوبی؟ پھر کس بزرگ کے طاقتور ہاتھوں اور زبردست روحانیت سے متأثر ہوکر جہالت وضلالت کے دریا سے ابھری؟ اور پھر کن لوگوں نے ضلالت کے طوفانوں سے بچا بچا کر اسے راہ مستقیم پر برقرار رکھا؟ اور دین داری میں پختہ کرتے رہے، ان کی مفصل داستان مصنف نے نہایت تحقیق کے ساتھ بیان کی ہے۔

اس کتاب میں ان بزرگوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے بزرگ جنھوں نے اس قوم کو اسلام کی روشنی بخشی، وہ سید کبیر الدین حسن علیہ الرحمہ ہیں، جن کے متعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ:

> ''ان سے بکثرت کرامات اور خرق عادت کا ظہور ہوتا تھا، اور ان کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ ان کے ہاتھ پر بکثرت کفار مسلمان ہوئے، ممکن نہ تھا کہ کسی کو وہ اسلام کی دعوت دیں اور وہ مسلمان نہ ہو، جماعت کی جماعت ہندوؤں کی آتی تھی اور مشرف بہ اسلام ہوکر لوٹتی تھی''۔

مومن قوم بھی اسی طرح مسلمان ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان پر ان صوفیاء ومشائخ کا بڑا احسان ہے، جن کی روحانیت کے آفتاب سے کفر وشرک کی ظلمت شب اچانک کافور ہوجایا کرتی تھی، مومن قوم کے مسلمان ہونے کی داستان تو تبصرہ ہی میں سن لیجئے، باقی مفصل داستان اصل کتاب میں پڑھئے، لکھتے ہیں:

> ''اس کا واقعہ مومن قوم میں بطریقۂ تواتر مشہور ہے کہ ہندوؤں کا ایک قافلہ کاشی کی تیرتھ گاہ کی جاترا کے لئے جارہا تھا، ان قافلہ والوں سے سید کبیر الدین نے فرمایا کہ اس قدر دور جانے کی ضرورت کیا ہے؟ میں تمہیں تمہارے کاشی کی تیرتھ گاہ کی زیارت یہیں سے کرادوں، بشرطیکہ تم اسلام مذہب قبول کرلو، جاتریوں نے منظور کیا، آپ نے فرمایا کہ تیرتھ گاہ کی نشانیاں

اور علامتیں نامزد کرلو،اس کے بعد آپ نے اپنی کرامت سے جاتریوں کو تیرتھ گاہ کی زیارت کراوادی۔چنانچہ تمام جاتریوں نے مذہب اسلام قبول کیا اور مومن سے موسوم اور مومنہ سے مشہور ہوئے''۔(ص۵۹)

اسلام لانے کے بعد عرصہ تک یہ قوم گمراہی کے دلدل میں پھنسی رہی،اس دلدل سے انہیں بزرگ کی اولاد میں ایک روحانی شخصیت سید پیر مشائخ علیہ الرحمہ نے نکالا،انہوں نے دیوان مشائخ کے نام سے ایک بہت مفصل کتاب منظوم مرتب کی ،جس میں اسلام کی تمام تعلیمات کا تفصیلی بیان ہے، یہ کتاب گجری زبان میں ہے، جو اردو سے بہت قریب ہے۔مصنف نے اس کے اقتباس بکثرت نقل کئے ہیں، یہ اشعار بہت مؤثر اور دردوسوز سے لبریز ہیں،اس کتاب نے مومن قوم میں ایک خوشگوار انقلاب برپا کیا۔یہ بزرگ اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کے ہیں۔صرف ۴۲رسال کی مختصر عمر میں انہوں نے مومن قوم کو دین کی سچی راہ پر لا کھڑا کیا۔

ان کے بعد ماضی کی تہیں جس قدر کم ہوتی گئیں،حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے آتے گئے۔آخر میں مصلح قوم حضرت مولانا نذیر احمد صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری کا مفصل تذکرہ ہے۔

یہ کتاب تاریخ اقوام میں ایک قابل قدر اضافہ ہے،اور لائق مطالعہ!اس سے قوموں کی نفسیات،ان میں کام کرنے کا طریقہ،مخالفین کی ریشہ دوانیاں،نصرت حق اور اہل حق کے غلبہ کا ایک دلآویز مرقع سامنے آتا ہے۔اللہ تعالی اس خدمت کو قبول فرمائے،اور تمام مسلمانوں کے لئے عموماً اور قوم مومن کے لئے خصوصاً مفید بنائے۔

ماخذ:المآثر۔نومبر،دسمبر،جنوری(۱۹۹۹۔۲۰۰۰)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	افادات صدیق۔ملفوظات حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد
مرتب	:	مولانا مفتی محمد زید صاحب
ناشر	:	ادارہ افادات اشرفیہ ہتورا باندہ
صفحات	:	۴۲۴
طباعت	:	عمدہ
قیمت	:	۱۰۰ روپئے

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی علیہ الرحمہ اس دور اخیر میں علم وفضل، تقوی وطہارت، سخت کوشی ومجاہدہ، فنائیت وتواضع اور خلوص وللّٰہیت کے وہ پیکر جمیل تھے جس کا اعتراف سب نے کیا ہے، ان صفات حمیدہ کا اثر یہ تھا کہ وہ محبوب القلوب بن گئے تھے۔ وہ ظاہراً ایک فقیر بے نوا تھے، لیکن جس طرف نکل جاتے نگاہیں فرش راہ ہوتیں اور انسانوں کا جم غفیر ان کے جلو میں ہوتا، اور وہ ان سب کے درمیان اس طرح رہتے جیسے یہ سارا ہجوم یہ ساری خلقت ان کے لئے نہیں کسی اور کے لئے اکٹھا ہوئی ہیں، وہ اس دور میں اسلام کی حقانیت کے نشان اور دین کی ابدیت کی برہان تھے، وہ ظاہر وباطن ہر اعتبار سے صدیق تھے، سچائی، خلوص اور تواضع و بے نفسی ان کی خاص پہچان تھی، وہ جو کچھ بولتے تھے وہی کرتے تھے، اور جو کچھ کرتے تھے وہی بولتے تھے، ان کا ظاہر وباطن بالکل یکساں تھا، وہ اللہ کے مخلص بندے تھے، اور اخلاص کی زبان سے بولتے تھے۔

یہ کتاب ان کے ان ملفوظات وارشادات کا مجموعہ ہے، جن کا تعلق طلبہ وعلما اور مدارس و مکاتب سے ہے، ان کے تلمیذ خاص مولانا مفتی محمد زید صاحب جو ہر وقت مدرسہ میں ان کے ساتھ حاضر باش رہا کرتے تھے، وہ ان ملفوظات کو قلم بند کرتے رہتے تھے، اور پھر موقع بموقع

انہیں دکھالیا کرتے تھے،انہوں نے ملفوظات کے ایک بڑے ذخیرہ سے منتخب کرکے یہ کتاب تیار کی ہے،اس کتاب کو پڑھ کرحضرت مولانا کی یادتازہ ہوجاتی ہے۔

علما وطلبہ اور مدارس کے ذمہ داروں کے لئے یہ کتاب ایک بیش بہا نعمت ہے،اور''از دل خیزد بردل ریزد'' کی بہترین مصداق ہے۔کتاب کا ہر ہر لفظ سوز دل میں ڈوبا ہوا ہے۔بڑی سعادت کی بات ہوگی کہ یہ کتاب ہر طالب علم،ہر عالم اور ہر مدرس کے ہاتھ میں ہو،اوراس کا مسلسل مطالعہ کرتے رہیں،تاکہ آنکھوں کی راہ سے دل میں اس کے مخلصانہ مضامین اترتے رہیں۔

مولانا محمد زید صاحب شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ مفید کتاب مرتب کی اور اسے شائع کیا۔

ماخذ:المآثر۔نومبر،دسمبر،جنوری(۱۹۹۹۔۲۰۰۰)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : حیات ابوالمآثر
مرتب : ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی
ناشر : المجمع العلمی، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مئو
صفحات : ۷۳۲
قیمت : درج نہیں

۱۰رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کی شام کو جب آفتاب غروب ہو رہا تھا، ٹھیک اسی وقت آسمان علم وفضل کا بھی ایک آفتاب تاباں غروب ہو رہا تھا، ایک مسافر جو زندگی بھر علم وتحقیق کی راہوں پر چلتا رہا، ان راہوں پر بھی جن پر قافلے مسلسل گزر رہے ہیں، جو جانی پہچانی راہیں ہیں، اوران راہوں پر بھی جن کے آثار ونشان مٹ چکے ہیں، جن پر کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی شاید ہی گزرا ہو، اس مسافر نے ان ناپید راہوں کو تلاش کیا، ان کے آثار ومعالم کو نمایاں کیا، چلنے والوں کے لئے انہیں ہموار کیا، ان پیچیدہ راستوں کو تلاش کرتا کرتا یہ مسافر بوڑھا ہو گیا، تھک گیا، عمر کی ترانوے منزلیں طے کرکے اب کمر کھولنے کی تیاری کر رہا تھا اور بالآخر علم وتحقیق اور فضل وکمال کی دنیا کو جگمگا کر روپوش ہو گیا۔

جب یہ مسافر زندگی کی منزلیں طے کرتا رہا لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، جب اس نے کمر کھول دی دی تو اس کے نقوش پا کی تلاش ہوئی، قدردانوں نے مطالبہ کیا کہ ترانوے منزلوں پر پھیلے ہوئے اس سفر کی داستان کاغذ کے صفحات میں سمیٹ دی جائے، تاکہ دیکھنے والے بیک نگاہ اسے دیکھ سکیں۔ اس طویل سفر کے نقوش وآثار کو تلاش کرنا ایک مشکل کام تھا، مگر اللہ تعالی جس کے لئے آسان فرمادیں اور واقعی اللہ نے آسان فرمادیا۔

اس مسافر علم وتحقیق یعنی محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا علامہ حبیب الرحمان

الاعظمی نوراللہ مرقدہ کے نواسے جناب مولانا ڈاکٹر مسعو احمد الاعظمی کے لئے اللہ نے یہ کوہ کنی آسان فرمادی، مولوی مسعود احمد سلمہ اس راہ میں نو وارد ہیں، اور اپنے علمی سفر کا آغاز کر رہے ہیں، وہ اپنے نانا جان کے نقوش پا کی تلاش میں نکلے، قدرت نے یاوری کی، غیب سے ان کے لئے انتظام ہوئے، اورانہوں نے ایک مکمل جامع اور نہایت محققانہ تذکرہ ''حیات ابوالمآثر'' کے نام سے مرتب کر کے چاہنے والوں کے ہاتھوں میں دیدیا، مرتب نے سچ لکھا ہے کہ:

'یہ جو کچھ آپ کے سامنے ہے وہ 'رحمان' کا کرم اور اس 'حبیب' کی کرامت ہے'۔(ص۲۶)

اللہ کا کرم جب اہل اللہ کی کرامت کی صورت اختیار کرتا ہے تو ایسے ہی کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا اعظمی علیہ الرحمہ نے اپنی حیات میں فرمایا تھا کہ ''میری سوانح عمری میرے خطوط سے لکھی جاسکتی ہے'' (ص۲۷)۔ یہ بات مولانا مسعود احمد صاحب سلمہ کے دل میں بیٹھ گئی، اللہ تعالی نے انہیں ایسا موقع عطا فرمایا اور ایسی فرصت بخش دی کہ حضرت کے لکھے ہوئے خطوط اور چھوٹی بڑی پرچیاں جن پر حضرت نے مختصر اشارات اور اجمالی چیزیں لکھ رکھی تھیں، ان میں بیشتر تحریر ان کی نگاہ کے سامنے سے گزر گئیں۔ ہوا یہ کہ حضرت کے وصال کے بعد ''مکتبہ مولانا حبیب الرحمان الاعظمی'' کے نام سے ایک وسیع کتب خانہ تعمیر کیا گیا، تعمیر مکمل ہوگئی تو حضرت کا سرمایۂ علمی جو بلند پایہ علمی وتحقیقی کتابوں، خود حضرت کی تصانیف، مسودات اور خطوط پر مشتمل تھا، اسے سلیقہ سے اس مکتبہ میں منتقل کرنے کا مرحلہ سامنے آیا، اس مرحلہ میں مولانا مسعود احمد صاحب علی گڑھ میں اپنی تعلیم کی تکمیل کر کے گھر آ چکے تھے، اور ابھی کوئی علمی مشغلہ شروع نہیں کیا تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ نے اپنے صاحبزادگان مولانا ازہر رشید اور مولانا انور رشید کے ساتھ اس کام پر اپنے بھانجے کو بھی مامور کیا۔ تینوں حضرات نے بہت شوق وذوق سے کتابوں کی منتقلی کا مرحلہ انجام کو پہونچایا۔ اس دوران مولانا مسعود احمد صاحب کے سامنے وہ تمام تحریریں آ گئیں جن کی ضرورت سوانح حیات لکھنے کے لئے پڑسکتی تھی، انہوں نے بغور ان کا مطالعہ کیا، اور انہیں کی روشنی میں سوانح کی ترتیب کا کام شروع کر دیا، مواد سارا موجود تھا، انہیں تصنیف کے پیکر میں ڈھالنا تھا، طبیعت باذوق تھی، ترتیب کا سلیقہ قدرت کا عطیہ ہے، ذہانت و ذکاوت موروثی ہے، مرتب ہو کر جو کتاب سامنے آئی تو ہر اعتبار سے معیاری تھی، ترتیب بھی، معلومات بھی، اسلوب نگارش بھی۔ نہ بہت مختصر، نہ اتنی مفصل کہ دیکھنے والا گھبرا کر رکھ دے۔

یہ تذکرہ نہایت مستند اور بہت باوثوق ذرائع سے مرتب کیا گیا ہے، کیوں کہ اس میں بنیادی معلومات زیادہ تر حضرت ہی کی تحریروں سے حاصل کی گئی ہیں۔

سب سے زیادہ اندیشہ اس بات کا تھا کہ آپ کی طالب علمی پر تقریباً چوتھائی صدی کا عرصہ بیت گیا ہے، اس وقت کے حالات تفصیلی طور پر شاید نہ ملیں، لیکن اللہ کی مہربانی ہے کہ اس دور کے بیشتر حالات مفصل طور پر منتشر اوراق وخطوط میں جابجا ملتے گئے، اور لائق مصنف نے جب انہیں ترتیب دیا تو دور تعلم کا بہترین مرقع تیار ہوگیا۔ کہاں کہاں پڑھا؟ کن کن اساتذہ سے پڑھا؟ کون کون سی کتابیں پڑھیں؟ ڈھونڈھنے والے کو سب کچھ اس میں مل جائے گا۔

ایک باب میں حضرت کے اساتذہ کا مفصل تذکرہ ہے، جن حضرات کے سامنے حضرت نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، وہ خود علم وفضل کے اساطین تھے، ان سے حضرت اقدس نے خوب اکتساب فیض کیا، اور مجموعۂ کمالات بن کر روشن ہوئے۔

ایک باب میں آپ کی تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں کا مفصل ذکر ہے، آپ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور روشن دور یہی ہے۔ دارالعلوم مئو، مظہرالعلوم بنارس میں تدریس کا مختصر سا وقت گزرا، اس کے بعد آپ نے مفتاح العلوم مئو کو جو پہلے ایک معمولی مدرسہ تھا، اپنی علمی وتدریسی خدمات سے اتنا بلند کیا کہ سارے ہندوستان میں اس کا شہرہ ہوگیا، تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ چلتا رہا، اور ایک سے ایک بیش قیمت علمی وتحقیقی تحفے آپ کی بارگاہ قلم سے امت کو ملتے رہے۔

پھر آپ کے بلند پایہ تلامذہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئوی، حضرت مولانا منظور نعمانی، حضرت مولانا حسین صاحب بہاری، حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب بحری آبادی رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ دوسرے اساطین علم کا نام ہے۔

ایک مستقل باب میں حضرت اقدس کے اخلاق وعادات اور اوصاف وکمالات اور ذوق وکیفیات کو بیان کیا گیا ہے، حضرت جہاں ایک بلند پایہ محدث وفقیہ تھے، وہیں ایک صاحب دل سالک راہ طریقت بھی تھے، اللہ کے ذکر کی حلاوت سے آشنا، سالکین کے مربی، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے دست اقدس پر بیعت تھے، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔

حضرت نے ابتداءِ عمر میں جب کہ طالب علم تھے ،شاعری بھی کی ہے،اچھی غزلیں کہتے تھے،امیر مینائی مرحوم کے شاگرد وسیم خیرآبادی سے اصلاح لیتے تھے، یہ مشغلہ صرف تین چار سال رہا پھر اسے ترک کردیا،شاعری کے نمونے بھی کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

حضرت کی شان اور علوئے مرتبت کا آپ کے بلند پایہ معاصر علما نے بلکہ آپ کے اکابر نے بھی اعتراف کیا ،علمائے عرب نے بھی اور علمائے عجم نے بھی ،مصنف سلمہ نے ان اعترافات کواس سلیقہ سے اکٹھا کردیا ہے کہ حضرت کی رفعت وعظمت نمایاں ہوجاتی ہے۔

حضرت نے 'وفیات الاعیان' کے نام سے اپنے دور میں وفات پانے والے علما اور مشائخ کی تاریخ وفات ضبط کی ہے،اور مختصر لفظوں میں ان بزرگوں کے احوال اور اپنا ان کے ساتھ تعلق بیان کیا ہے۔ یہ بیان کہیں عربی میں ہے، کہیں فارسی میں، کہیں اردو میں، جو بھی زبان لکھی ہے،نہایت فصیح وبلیغ زبان لکھی ہے۔مشہور محدث حافظ ابن حجر کی طرح آپ بھی فطری ادیب تھے،ادب کی شان ہر جگہ نمایاں رہتی ہے،اس سے جہاں ان بزرگوں کی سنین وفات معلوم ہوتے ہیں، وہیں حضرت کی نگاہ میں جوان کا مرتبہ تھا اور حضرت سے جو ان کا تعلق تھا وہ بھی معلوم ہوتا ہے۔مرتب نے بڑے حسن ذوق سے اس کا انتخاب کیا ہے۔

آخر میں آپ کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین ومقالات اور تصانیف کی فہرست بھی شامل کتاب کردی ہے۔اس طرح یہ تذکرہ حضرت محدث اعظمی کی حیات طیبہ کا ایسا آئینہ ہے جس میں حضرت کی زندگی کا ہر گوشہ اجمالاً ہی سہی دیکھا جاسکتا ہے۔مصنف سلمہ بہت ہی لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے سوانحی ادب میں ایک بہت ہی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔اللہ تعالی ان سے مزید خدمت لے۔

کتاب کی طباعت اور کاغذ کا معیار حضرت مولانا رشید احمد اعظمی کے حسن ذوق کا آئینہ دار ہے۔۳۲۷ صفحات کی یہ کتاب علم واداب اور تاریخ کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے،اللہ تعالی اس کی خوشبو اور اس کے حسن کو عام فرمائیں۔

ماخذ: المآثر۔اگست،ستمبر،اکتوبر (۲۰۰۰)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	مقالات ابوالمآثر (جلد اول)
مرتب	:	مولانا مسعود احمد الاعظمی
صفحات	:	۴۰۶
قیمت	:	۱۴۰/۰۰ روپئے
ملنے کا پتہ	:	مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس (۱) مئو ۲۷۵۱۰۱ یوپی

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نور اللہ مرقدہ علم وتحقیق کی دنیا میں رسوخ فی العلم، اصابت رائے اور تنقید صحیح کی ایک روشن علامت تھے، ایک تو خداداد صلاحیت علم اور سلامتی فکر بے مثل تھی، پھر ایسے اساتذہ کی صحبت نصیب ہوئی جو اپنے دور کے جید، ثقہ اور معتبر علما تھے، اس لئے حضرت محدث جلیل نے کبھی کوئی ایسا نظریہ قبول نہیں کیا جو منہج صحیح اور مسلک اہل سنت سے ذرا بھی منحرف ہو، اور نہ ایسے کسی نظریے سے دھوکہ کھایا، اور دینی غیرت و صلابت اس درجہ حضرت اقدس کو حاصل تھی کہ اگر فرد یا کسی جماعت نے مذہب حق سے ذرا بھی انحراف کی راہ نکالی اور اندیشہ ہوا کہ عام مسلمان اس سے مبتلائے وسوسہ ہو جائیں گے، یا اس منحرف راہ کو اختیار کر لیں گے، یا دین وشریعت کے دامن پر کچھ دھبہ آ جائے گا، تو حضرت اقدس تحفظ دین وشریعت کے جذبے سے اس کا تعاقب فرماتے، زبان سے بھی اور قلم سے بھی۔

جس دور میں حضرت محدث جلیل نے اصطلاحی طالب علمی کا دور پورا کیا اور خدمت علم ودین کے لئے تدریسی اور تصنیفی میدان میں اترے تو گمراہ فرقوں اور منحرف افراد کے ساتھ بطور خاص دو ٹولیوں سے آپ کا سابقہ پڑا۔ ایک ٹولی اپنے کو اہل حدیث کہتی ہے، اور دوسری ٹولی اہل قرآن کے نام سے خود کو موسوم کرتی ہے۔ اہل قرآن کا مطلب یہ ہے کہ اسے حدیث کے حجت و برہان ہونے سے انکار ہے۔ اہل حدیث فرقہ خود آپ کے مئو میں ایک نئی طاقت بن کر ابھر رہا تھا

اورمختلف طریقوں سے عوام الناس کو اپنے دائرے میں لانے کی کوشش کررہا تھا،اس زمانہ میں اس فرقہ کو خاص کمک پنجاب سے مل رہی تھی،مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم اس تحریک میں نمایاں کردارادا کررہے تھے،ان کے علاوہ دوسرے پنجابی علما بھی ہاتھ پاؤں ماررہے تھے۔

محدث جلیل علیہ الرحمہ نے اس فرقہ کا تعاقب کیا،اوراس کے استدلال واجتہاد کے تمام تاروپود بکھیر کررکھ دیئے،اس موضوع پر حضرت نے طالب علمی کے دور سے ہی مضامین و مقالات لکھنے شروع کردیئے تھے،جوملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے،حضرت کی وفات کے بعد ادارہ المآثر کو مسلسل اس کا خیال رہا کہ حضرت کے علمی جواہر پارے جوقدیم رسائل کی پھٹی پرانی گڈڑیوں میں مستور ہیں،انہیں ازسرنو مرتب کرکے علم کے قدردانوں کے ہاتھوں میں پیش کیا جائے۔

اللہ کو جب کوئی کام منظور ہوتا ہے تو اس کے اسباب مہیا فرمادیتے ہیں۔حضرت مولانا کے جواہر پاروں کے جمع وترتیب کی توفیق حضرت ہی کے اہل میں سے آپ کے نبیرۂ سعید مولانا مسعوداحمدالاعظمی سلمہ کوملی،انہوں نے اپنے خال محترم حضرت مولانا رشیداحمدالاعظمی مدظلہ کے حکم سے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو پرانے بوسیدہ اوراق سے نکال نکال کرمرتب کیا۔اہل حدیثیت (غیرمقلدیت) کی تردیداوران کے تعاقب میں آغاز کارمیں حضرت نے جومقالات لکھے تھے، جتنے مل سکے،انہوں نے سلیقے سے مرتب کیا،اورشروع میں ایک مفیداور پرمغز پیش لفظ لکھا(جس میں تمام مقالات کا اجمالی تعارف بھی شامل ہے)اب چارسوصفحات کا یہ مجموعہ حضرت مولانا کے علم وفضل،مطالعہ وتحقیق،نقدونظراورنقل ودرایت کا چمن زار ہے جو اہل علم کو دعوت دید ومطالعہ دے رہا ہے۔اس مجموعہ میں ۱۹ مقالات شامل ہیں،تبصرہ وتعارف کی ان مختصر سطروں میں سب کا تعارف اجمالا بھی نہیں کرایا جاسکتا،اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مقالات اس صاحب علم کے قلم سے صادرہوئے ہیں،جس کا نام دراست وتحقیق کے لئے عالی مرتبہ سند ہے۔

ماخذ:ضیاءالاسلام۔جولائی(۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	نصرۃ الحدیث (عربی)
مصنف	:	محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب الاعظمی
مترجم	:	مولانا مسعود احمد الاعظمی
صفحات	:	۲۰۵
قیمت	:	درج نہیں
ناشر	:	دار رحاب طیبہ مدینہ منورہ
ملنے کا پتہ	:	مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس (۱) مئو ۲۷۵۱۰۱

اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا ہے کہ مولانا کو جہاں اس فرقہ سے مقابلہ کرنا پڑا جو حدیث کی علم برداری کا مدعی بن کر فقہ کا انکار کرتا ہے، وہیں ان لوگوں کا بھی تعاقب کرنا پڑا جو صرف قرآن کریم کو حجت و برہان مانتے ہیں، اور حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ یہ فتنہ زور وشور کے ساتھ پنجاب سے اٹھا، کوئی صاحب عبداللہ چکڑالوی تھے، انہوں نے اس فتنے کو آگے بڑھایا، اس فتنہ میں ذاتی طور پر کوئی دم خم نہ تھا، کیوں کہ انکار حدیث کا نظریہ نہ عقل کے نزدیک قابل قبول ہے، اور نہ نقل ودرایت کے لحاظ سے قابل اعتنا ہے، مگر خواہ کتنی ہی بے عقلی کی بات ہو، ہر آواز کے پیچھے چلنے والوں کی ایک ٹولی جمع ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ اس غلط نظریہ نے بھی کچھ شور کرنے والوں کو پالیا، نیاز فتح پوری، حافظ اسلم جیراج پوری، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ انہیں بے جا شور کرنے والوں میں ہیں۔ ایک اور صاحب تھے، نام ان کا غالباً مقبول حسین تھا، وہ بھی اس جرگہ میں شامل تھے، انہوں نے حق گو کے لقب کی نقاب چہرہ پر لگائی، اور ایک کتاب لکھی ''میں منکر حدیث کیوں ہوا؟'' اور اس میں حدیث اور مشائخ حدیث کے خلاف خوب زہر افشانی کی، اہل حدیث کہلانے والوں کی ہمت تو پڑی نہیں کہ حدیث کے خلاف ہفوات وخرافات بکنے والوں کے منہ میں لگام دیتے، بلکہ ان کے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے ذاتی پریس سے اس غلیظ

کتاب کی طباعت ہوئی۔

حضرت محدث جلیل کے مطالعہ سے جب یہ کتاب گزری تو غیرت حق کو جلال آیا، اور ایک نہایت بیش قیمت علمی وتحقیقی کتاب ''نصرۃ الحدیث'' کے نام سے وجود میں آئی، اس کا مقدمہ حضرت نے اتنا نفیس، محققانہ اور دل نشیں لکھا ہے کہ اب کوئی بھی ایسا شخص جس کے سر میں ذرا بھی مغز ہوگا، انکار حدیث کی طرف رخ نہیں کرے گا۔

یہ کتاب حضرت نے اردو زبان میں لکھی تھی، عرصہ سے تقاضا تھا کہ اسے عربی زبان میں منتقل کیا جائے تا کہ وہ علماء عرب جو حضرت مولانا کے تلامذہ میں یا حضرت کے قائل ومعترف اور عقیدت مند ہیں، وہ بھی اس بیش قیمت کتاب سے مستفید ہوسکیں۔ جب حضرت کی کتابوں اور ان کے مضامین ومقالات کے جمع وترتیب کا بیڑا حضرت کے خلف الرشید مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ نے اٹھایا، تو یہ دیرینہ تقاضا بھی سامنے آیا، حضرت کے علوم کی خدمت کی تو نبیرہ سعید مولانا مسعود احمد الاعظمی کو میسر آئی، تو یہ سعادت بھی ان کے لئے آسان ہوگئی، انہوں نے محنت وہمت سے کام لے کر کتاب کا معیاری عربی ترجمہ مکمل کیا، حضرت اقدس کے شاگرد رشید شیخ محمد عوامہ نے اس پر مقدمہ لکھا، اور اپنے انتظام میں دائرہ رحاب طیبہ مدینہ منورہ سے بہت عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا۔

ماشاءاللہ! اصل کتاب کا تو کہنا ہی کیا، ہندوستان کے تمام علمی حلقوں میں نہ صرف اس کی پذیرائی ہوئی تھی بلکہ ہر طبقہ علم نے اس قلمی جہاد پر سرور انبساط محسوس کیا، اور اسے اس موضوع پر حرف آخر قرار دیا، اور یہ بالکل سچ ہے کہ اس کتاب نے منکرین حدیث کی کمر توڑ دی، اور وہ سرنگوں ہوکر رہ گئے۔ پھر اس کا ترجمہ جو مولانا مسعود احمد کے قلم سے ہوا تو اس کے بارے میں میرا احساس یہ ہے کہ اگر حضرت اقدس حیات ہوتے تو بے حد مسرور ہوتے، اور بہت دعائیں دیتے، اور کیا عجب کہ عالم برزخ میں ان کی روح خوش ہو رہی ہو۔

اللہ تعالی عزیز مترجم کو جزائے خیر دے، اور ان کی علمی وقلمی صلاحیتوں کو بیش از بیش خدمت دین کی توفیق ارزانی فرمائے اور حضرت اقدس کے علوم وتحقیقات سے وابستہ رکھے، انہوں نے اہل عرب کے لئے بھی حضرت کی تحقیقات سے استفادہ آسان فرمادیا۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ جولائی (۲۰۰۲ء) ☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	تعدیل رجال بخاری
تصنیف لطیف	:	محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نوراللہ مرقدہ
صفحات	:	۲۳۷
ناشر	:	المجمع العلمی مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو
قیمت	:	تجویز نہیں
ملنے کا پتہ	:	مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس (۱) مئو ۲۷۵۱۰۱

ایک بزرگ عالم کا قول ہے کہ عالم انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان یہودیت سے پہونچا ہے، اور عالم اسلام کو سب سے زیادہ نقصان رافضیت سے پہونچا، اس فرقہ نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کا حلیہ بگاڑنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، اس فرقہ نے اسلام پر چوطرفہ حملہ کیا ہے، لیکن علماء اسلام نے ہر محاذ پر انہیں ناکام بنایا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مدار قرآن وسنت پر ہے، اور سنت وحدیث کا صحیح ترین مجموعہ صحیح بخاری شریف ہے، اور سب جانتے ہیں کہ احادیث کی صحت کا مدار راویوں کے معتبر ہونے پر ہے، ایک رافضی عالم اٹھا، اور اس نے صحیح بخاری کے معتبر اور محکم راویوں پر سخت حملے کئے، انہیں مجروح اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی مذموم کوشش کی ہے اور رافضیوں کی عادت کے مطابق خوب تبرا بازی کی اور قلب وزبان کی نجاست کو کاغذ کے صفحات پر پھیلایا۔ اور اسے ''رجال بخاری'' کے نام سے شائع کیا۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمہ کی غیرت اسلامی اور حمیت دینی نے اس کتاب کا تعاقب کیا، مولانا نے علم وتحقیق کی گہرائی میں اتر کر اتنا موثر اور حقیقت افروز جواب تحریر فرمایا کہ ایک طرف اگر اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے، نور بصیرت عام ہوتا ہے، ذہانت اور نکتہ رسی کی دنیا روشن ہوتی ہے تو دوسری طرف شیعوں کی خیانت، ان کی دروغ بافیاں

اوران کی مضحکہ خیز قلابازیاں سامنے آتی ہیں۔امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی علیہ الرحمہ نے اس کتاب کی تقریظ میں لکھا ہے کہ:

''جواب بحمداللہ شافی وکافی ہے اورحق یہ ہے کہ اہل سنت کے ذمے ایک قرض تھا،جس کوممدوح نے ادا کیا۔مولف رجال بخاری کی خیانت اور جہالت کی کارروائیاں جوگرفت کی ہیں وہ ہر شخص نہیں کرسکتا تھا''۔

حضرت سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے تجویز فرمایا کہ:

جواب بے حد متین،سنجیدہ،مدلل اورفن وتحقیق کے اعتبار سے کافی وشافی ہے۔

علماء وطلبہ ٔحدیث کیلئے نہایت بیش قیمت علمی تحفہ ہے،کاغذ اور کتابت وطباعت معیاری ہے۔

ماخذ:ضیاءالاسلام۔فروری(۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : دارالاسلام اوردارالحرب
تصنیف : محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہٗ
صفحات : ۱۱۷
ناشر : مذکورسابقاً
قیمت : تحریرنہیں
ملنے کا پتہ : اوپرمذکورہوا

ایک زمانہ تھا کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کوعروج بخشا تھا۔اہل اسلام جس طرف نکل گئے ،ان کی دھاک بیٹھ گئی ،حکومتیں تبدیل ہوگئیں ،کفر کی سلطنتیں بکھریں ،اسلام کی حکمرانی قائم ہوئی ،دارالحرب تبدیل ہوہوکر دارالاسلام بن گئے ۔پھرکچھ صدیوں کے بعد حالات بدلنے لگے ۔اہل اسلام کی وابستگی تعلیمات اسلام کے ساتھ کمزور پڑنے لگی ،اوراسی کے ساتھ مسلمانوں کی ہوااکھڑنے لگی ،ان کی حکومتیں ٹوٹنے لگیں ۔اسلام کواسلام کے ماننے والوں کومٹایا تو نہ جاسکا مگران کی سیاسی قوت وشوکت ،ضعف واضمحلال کا شکار ہوتی چلی گئی ۔اسلام چونکہ ایک مکمل نظام حیات ہے ۔یہ انسانی زندگی کے ہرحال اور ہرکیفیت سےتعرض کرتا ہے،اس لئے اس نئی صورت حال سے بھی تعرض کرنا ضروری ہ ، جہاں پہلے اسلامی حکومتیں تھیں ،اب ان کی جگہ کفار ومشرکین کی بالادستی قائم ہوگئی ۔اس ملک اورجگہ کی اب شرعی حیثیت کیا ہے؟ وہاں کیلئے اسلامی احکام کیا ہیں؟ علماءاسلام نے اس مسئلہ کا حل پیش کیا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے مکمل سقوط کے بعد مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی ، اور انگریزوں کا اقتدار مسلط ہوگیا ۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ملک کے دو حصے ہوگئے ،ایک حصہ پراہل اسلام کا اقتدار قائم ہوا، دوسرا حصہ جمہوریت کے نام سے کفروشرک کی گود میں باقی رہا۔مسلمانوں کی سلطنت کے ختم

ہونے کے بعد یہ سوال بار بار اٹھا کہ ہندوستان اب دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ متعدد علماء کی طرف سے اس باب میں مختلف رائیں سامنے آئیں، کسی نے اسے دارالحرب بتایا، اور کسی نے دارالاسلام قرار دیا، اور اس اختلاف کی بنیاد پر ان احکام شرع کے بیان میں بھی اختلاف ہوا، جس کا تعلق کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے سے ہے۔

بڑی ضرورت تھی کہ ان دونوں رایوں کے درمیان محاکمہ کیا جائے، اور افراط وتفریط سے بچ کر متعدل راہ متعین کی جائے، محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمہ اللہ جن کی فقہی بصیرت بھی مسلم ہے، انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور نہایت مدلل اور مکمل محاکمہ فرمایا، اور حق کو اس طرح واضح کر دیا کہ اب کسی قیل وقال کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کتاب پہلے قسط وار مضامین کی شکل میں ۱۹۶۷ء میں ماہنامہ البلاغ بمبئی میں چھپی تھی۔ پھر مجلّہ المآثر میں اسے شائع کیا، اب صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے اہتمام سے کتابی شکل میں بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ کتاب کیا ہے؟ فقہی حکمت وبصیرت کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے، اس کا ہر صفحہ علم وآگہی کا خزینہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی افادیت کو عام فرمائیں۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔فروری (۲۰۰۳) ا

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	بیمہ اوراس کا شرعی حکم
اثر خامہ	:	محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی وشیخ عبداللہ ناصح علوان
ترتیب وترجمہ	:	مولانا مسعود احمد الاعظمی
صفحات	:	۸۰
قیمت	:	درج نہیں
ناشر وملنے کا پتہ	:	اوپر مذکور ہوا

انسان جب آخرت سے غافل ہوا اور دنیا اور دنیاوی زندگی کو اس نے معبود ومقصود قرار دیا تو انسانی زندگی نت نئے مسائل کا شکار ہوئی۔ اس دنیا میں حیات جاوید اس کا مقدر تو نہ بن سکی، مگر انسان نے ہر ممکن کوشش کی کہ اپنے کو موت سے اور اس کے خطرات سے بچا لیجئے۔ یہ کوشش مختلف عنوانوں سے انسانی زندگی میں داخل ہوئیں، انہیں عنوانوں میں ایک عنوان انشورنس اور بیمہ بھی ہے۔ جب اس کا رواج شروع ہوا تو اسلامی احکام میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ ایک سوال ابھرا، اور جب کہ انسانی عادت ہے کہ جب کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو زاویۂ نظر کے اختلاف سے اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، یہاں بھی جواز وعدم جواز کی راہیں مختلف ہوئیں، اس سلسلے میں محدث جلیل حضرت مولانا اعظمی کی ایک مختصر تحریر نہایت منصفانہ اور مدلل دستیاب ہوئی تھی، جسے مجلّہ المآثر شمارہ (۲) جلد (۳) میں شائع کیا گیا تھا، مولانا مسعود احمد صاحب نبیرۂ حضرت محدث کبیر کو حضرت کے کتب خانے میں ''**حکم الاسلام فی التامین**'' کے نام سے اس موضوع پر شیخ عبداللہ ناصح علوان کا ایک مختصر رسالہ ملا۔ جس میں انھوں نے اختصار سے دونوں فریق کے درمیان محاکمہ کیا ہے، مولانا مسعود احمد صاحب نے اس رسالہ کا ترجمہ کیا اور حضرت

محدث کبیر کی تحریر کو ابتداء میں شامل کر کے بیمہ کے موضوع پر ایک مکمل رسالہ کر دیا، اس رسالہ سے بیمہ کی شرعی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس کے عدم جواز پر اطمینان ہو جاتا ہے، مزید یہ کہ نئے نئے مسائل پر غور کرتے وقت ایک عالم دین کا زاویہ نظر کیا ہونا چاہئے، اس رسالہ سے اس کی بھی رہنمائی ہوتی ہے، بہت غور وتدبر سے مطالعہ کرنے کی چیز ہے۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔فروری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : عظمت صحابہ
مؤلف : محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ
صفحات : ۹۰
طباعت وکتابت : عمدہ
قیمت : درج نہیں
ناشر: المجمع العلمی ،مرکزتحقیقات وخدمات علمیہ، مدرسہ مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس نمبر ا،مئو، یو پی

ہمارا دین، دین اسلام ایک امانت ہے، جسے حق تعالیٰ کی جناب سے برگزیدہ فرشتے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام لائے ،اوررسول امین ﷺ کے سینہ مبارک کے حوالے کیا،رسول امین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ امانت اپنے اصحاب وتلامذہ کے سپرد کی ،اوران کی امانت ودیانت پر کامل اعتماد کیا،اوراس لئے اعتماد کیا کہ حق تعالیٰ نے،خالق علیم وخبیر نے ان کے قلوب کوتقوی کے لئے پرکھ کران سے دائمی رضامندی کا اعلان کردیا ہے،صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کی یہ امانت جیسی انھیں ملی تھی بعینہٖ اپنے بعدوالوں تک پہونچادی۔صدیاں گزرگئیں،اوروہ دین جسے حضرات صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کرکے دنیا میں پھیلایا تھا آج بھی تروتازہ حالت میں موجود ہے، رسول اکرم ﷺ کے بعد اس جہاں پرسب سے بڑا احسان انھیں حضرات کا ہے۔اگرکوئی شخص صحابہ کی خردہ گیری یا عیب چینی کرتا ہے،تو وہ درپردہ دین کی بنیاد ڈھارہا ہے،اس لئے جس کسی نے بھی صحابہ کی شان میں نازیبا بات کہی علماءراسخین کوجلال آیا ہے،غیرت دین نے ایسے لوگوں کو للکارا ہے۔ بنارس کا کوئی بابا خلیل داس تھا،اس کی عاقبت رُسوا ہوئی کہ اس نے ایک کتاب ’’اصحاب رسول اللہ اور معاویہ کی صحابیت‘‘ کے نام سے لکھ کرصحابہ کرام کے ناموس پرعموماً اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت پرخصوصاً اپنے رافضیانہ ذہن کی غلاظت اچھالی۔

حضرت محدث کبیرؒ کی غیرت دینی کو جلال آیا، آپ نے اس فتنہ کا تعاقب کیا، تمہید کی عبارت اس جلال کی ترجمان ہے۔فرماتے ہیں:

''آج کل بنارس میں ایک شخص مسمیٰ خلیل داس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعن طعن کے جواز کا فتویٰ دے کر ایک نیا فتنہ برپا کر رکھا ہے، اس باب میں شخص مذکور کی اب تک کئی تحریریں شائع ہو چکی ہیں اور ہر چند کہ یہ تحریر کسی مستند عالم یا محقق کی نہیں ہیں، اور اس لحاظ سے وہ بالکل ناقابل التفات ہیں اور ہر سنجیدہ واقف کار ایسے نابلد کو منہ لگانے میں عار محسوس کرتا ہے تاہم چونکہ ان تحریروں سے ناواقف عوام غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اس لئے میں بغرض اظہار و تائیدِ حق اور بقصدِ ہدایت خلق و رفع غلط فہمی عوام اپنے کو اس شخص کے مقابل پیش کرنے کی ذلت گوارا کرتا ہوں، اور حق تعالیٰ کی توفیق سے حضرت معاویہ کے باب میں جو بات حق اور اہل سنت والجماعت کا اجماعی مسلک ہے، اس کو مدلل اور واضح طور پر لکھتا ہوں''۔واللّٰہ حسبی ونعم الوکیل

پھر واقعی مولانا نے جو کچھ لکھا، تحقیق کا حق ادا کر دیا، مقام صحابیت کو ایسا روشن کر دیا، اور اس سلسلے میں اعتراضات واشکالات کا ایسا اطمینان بخش جواب دیا اور خصوصاً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایسا دفاع کیا کہ انصاف پسند دل مطمئن اور ہر صاف دماغ شخص علم وتحقیق سے مالا مال ہو جائے۔ بہت نفیس اور محققانہ مباحث نہایت سہل اور بلیغ عبارات میں بیان کر دئے گئے، جن سے اہل علم کے علم میں اضافہ ہو، اور عوام الناس بھی مسئلے کو خوب سمجھ جائیں، اور ایمان میں تازگی پیدا ہو۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	ابطال عزاداری
مؤلف	:	محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
صفحات	:	۹۴
طباعت و کتابت	:	عمدہ
قیمت	:	درج نہیں

کسی کتاب یا مضمون کے مستند ہونے کے لئے محدث کبیر علیہ الرحمہ کا نام کافی ہے۔

یہ وہ شخصیت ہے، جس نے علم تحقیق کے میدان میں اور غیرت دینی وعلمی کے باب میں ایک امتیازی شناخت حاصل کر لی ہے۔ محدث کبیر کی تحریر خواہ مختصر ہو، خواہ مفصل سند ہوتی ہے، تعزیہ سازی اور عزاداری، جو شیعوں کا دین و مذہب ہے، اور اہل سنت کے نزدیک شرک و بدعت ہے، اس میں بہت سے سنی بھی مبتلا ہیں، اور ایک رافضی نے تو دیدہ دلیری کی حد کر دی، اس نے ثابت کرنا چاہا کہ عزاداری مذہب اہل سنت میں بھی ایک اہم فریضہ ہے۔

حضرت مصنفؒ نے اس خیال اور اس نظریہ کا ابطال نہایت عمدگی اور تحقیق سے کیا ہے، یہ ہے تو ایک مختصر سا رسالہ مگر علم وتحقیق کا گنجینہ اور ذہانت وذکاوت نیز قوت استدلال اور اثبات حق کا صاف شفاف آئینہ ہے، یہ رسالہ آج سے ۶۵؍سال قبل لکھا گیا تھا، جو دار المبلغین لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''الداعی'' میں ۱۳۶۱ھ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ بقول ناشر:

''تعزیہ داری اور دیگر مراسم عزاداری کے حرام و بدعت ہونے پر اتنی جامع اور مفصل ومدلل تحریر مشکل ہی سے ملے گی، اس اعتبار سے اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد اور اہم رسالہ ہے''۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔فروری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغہ
شارح	:	حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
صفحات	:	جلد اول ۸۲۱۔ جلد دوم ۷۴۴
طباعت	:	نہایت عمدہ اور معیاری
قیمت	:	درج نہیں
ناشر	:	مکتبہ حجاز دیوبند یوپی

ارواح ثلٰثہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہ کی روایت سے بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ حضرت نانوتوی فرماتے تھے کہ:

''مشاہیر امت میں تین قسم کے افراد گزرے ہیں۔

(۱) بعض ایسے ہیں کہ حقائق شرعیہ میں ان کا ذہن طول وعرض میں چلتا ہے، جیسے امام رازی کہ ہر مسئلے میں پھیلتے زیادہ ہیں، اور ترتیب وتفصیل وتہذیب مواد میں زیادہ مستعد ہیں۔

(۲) بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن علو کی طرف زیادہ چلتا ہے، جیسے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ حقائق میں اس قدر بلند پرواز ہیں کہ اصحاب ذوق کو بھی ان کے مدارک تک پہونچنا مشکل ہوجاتا ہے۔

(۳) اور بعض ایسے ہیں جن کا ذہن عمق کی طرف زیادہ دوڑتا ہے، جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلہ کی تہ اور اصلیت کا سراغ لگالیتے ہیں، اور ایسی اصل قائم فرمادیتے ہیں کہ سیکڑوں تفریعات اس سے ممکن ہوجاتی ہیں۔ (ارواح ثلٰثہ۔ ص ۲۸۵)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا جو تعارف حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ نے

کرایا ہے اس کا اندازہ شاہ صاحب کی تصانیف کے مطالعہ ہوتا ہے، واقعی اس قدر بلند پروازی ہے کہ ان کے قریب تو کیا ان کی گردتک پہونچنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عبقریت اوران کی عظمت شان کے تعارف میں تو بہت لکھا گیا ہے، ان کے تلامذہ اوران کے خلفا کا تعارف بھی خوب ہوا، ان کے فیض علمی کا سلسلہ جو ہندوستان میں جاری ہوا اور اخیر میں دارالعلوم دیوبندان کے فیضان علم وحکمت کا مرکز بنا، اس کے اثرات کی تفصیلات خوب لکھی گئی گئیں، لیکن اس علوئے ذہن اور حقائق میں بلند پروازی کی وجہ سے انہوں نے خود جو کچھ لکھا ہے ان کی تشریح کم کی گئی، بلکہ علما کا اشتغال بھی ان کے ساتھ کم ہی رہا۔

حق تو یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند اوراس کے زیر اثر مدارس میں حضرت شاہ صاحب کی کتابیں بطور تخصیص کے سہی داخل درس ہوتیں، ذہین طلبہ کی ایک معتد بہ جماعت ان سے استفادہ کرتی، مگر ایک رسالہ الفوز الکبیر کو چھوڑ کر ان کی کوئی کتاب باقاعدہ داخل درس نہیں ہوئی، اوراس بھی حال یہ ہے کہ الفوز الکبیر کی اصل زبان فارسی ہے، اس کا عربی میں ترجمہ کسی دمشقی عالم نے کیا ہے، وہی ترجمہ درس میں داخل ہے، اس میں ترجمہ کے متعدد اغلاط ہیں، پھر مزید کرم اس پر یہ ہے کہ پوری کتاب درس میں نہیں داخل ہے، اس کا صرف ایک جز ہے، اور جتنا حصہ ہے وہ بھی جلالین شریف کے ضمن میں بھاگتے دوڑتے گزار دیا جاتا ہے، طلبہ کو اس کی خبر نہیں ہوتی کہ یہ کن بلند حقائق کا مخزن ہے؟۔

دوسری کتاب جس کے بہت تھوڑے سے اجزا متفرقاً پڑھائے جاتے ہیں، وہ حجۃ اللہ البالغہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ اپنے مسلسل اسفار اور مصروفیات کے درمیان کبھی کبھی کچھ موقع نکال کر حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے تھے، ان کا ذہن ودماغ بڑا حکیمانہ تھا، وہ معارف ولی اللہی کو بہت خوب سمجھتے تھے، اوران کی تفصیل وتشریح کی بے مثال قدرت رکھتے تھے۔ یہاں میں حضرت مولانا سالم صاحب مدظلہ کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں، جس سے یہ پتہ چلے گا کہ دارالعلوم دیوبند میں حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس کیسے شروع ہوئی؟ اوراس سلسلہ میں حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کا کیا مقام تھا؟ حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’(مولانا عبیداللہ صاحب) سندھی جب جلا وطنی ختم کر کے وطن واپس آئے اور پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، تو بعد مغرب حضرت مہتمم صاحب کے پاس گھر پر تشریف لائے، طلبہ کافی تعداد میں ساتھ آ گئے، جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا، مولانا سندھی رحمہ اللہ نے حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ سے پہلا سوال یہ کیا کہ ’’کیا حجۃ اللہ البالغہ دارالعلوم میں پڑھائی جاتی ہے؟‘‘ حضرت مہتمم صاحب نے نفی میں جواب دیا، اس پر موصوف نے ناگواری کے ساتھ فرمایا کہ اسی پر تو ہمارے فکر کی بنیاد ہے، اس کا پڑھانا بے حد ضروری ہے، اور ابھی اس کی پڑھائی شروع کی جائے، کتاب منگائیے۔

حضرت مہتمم صاحب نے اپنے کتب خانے سے کتاب لانے کا (حکم) احقر کو فرمایا، کتاب آئی تو خیال تھا کہ خود مولانا سندھی کچھ پڑھائیں گے، لیکن انہوں نے کتاب حضرت مہتمم صاحب کو دے کر فرمایا کہ عبارت پڑھئے، حضرت نے عبارت پڑھی، اور منتظر رہے کہ حضرت مولانا سندھی اب کچھ فرمائیں گے، مگر انہوں نے حضرت مہتمم صاحب سے فرمایا کہ جو عبارت آپ نے پڑھی ہے اس کا ترجمہ کیجئے، انہوں نے ترجمہ کیا، پھر فرمایا کہ اب اس کا مطلب بیان کیجئے، حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ مطلب آپ بیان فرمائیں تو فرمایا نہیں، آپ ہی بیان فرمادیں۔ اس پر حضرت مہتمم صاحب نے فکر ولی اللہی کی اصولی حیثیت کو موضوع بنا کر تقریر فرمائی، اس عرصہ میں طلبہ کا بڑا مجمع وہاں جمع ہو گیا، تقریر قریباً نصف گھنٹہ ہوئی، جسے مولانا نے بڑے انہماک سے سنا، ختم تقریر پر نہایت پر جوش انداز میں فرمایا کہ الحمدللہ علوم ولی اللہی جماعت میں ابھی زندہ ہے، اور تاکید فرمائی کہ اس کا درس آپ مسلسل دیں۔ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ نے اس کے بعد بہ تسلسل حجۃ اللہ البالغہ کا درس کافی عرصہ تک دیا‘‘۔

اس درس میں شرکت کی سعادت اس خاکسار تبصرہ نگار کو ۱۳۸۹ھ میں ہوئی، حضرت مہتمم صاحب کی مصروفیت اور مسلسل اسفار کے باعث درس بہت تھوڑا سا ہو سکا تھا۔

عرض کرنے کی غرض یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف اتنے بلند ہیں کہ ان تک رسائی نہایت مشکل ہے، ان کے سمجھنے کے لئے اسی طرح کی ذہنی بلندی کی ضرورت ہے، جو حضرت شاہ صاحب کو حاصل تھی، پھر ایک خاص طرح کا ذوق و وجدان بھی شرط ہے، جس کے

باعث ان علوم سے مناسبت پیدا ہو، ہمارے مدارس میں جو کتابیں زیر درس ہیں، تراجم، حواشی اور شروح کے میدان میں ان کی اتنی خدمت ہوئی ہے کہ ان کی مدد سے اساتذہ بے تکلف درسی کتابیں پڑھا لیتے ہیں، اس کے برخلاف شاہ صاحب کی کتابوں کے ترجمے تو بے شک ہوئے ہیں، مگر شرح پر کسی نے ہاتھ نہیں لگایا اور ان ترجموں کا جو حال ہے، ان پر ایک مترجم کا تبصرے یہ ہے کہ:

''اس کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) کے اردو تراجم پہلے بھی ہو چکے ہیں، لیکن وہ ترجمے کیا ہیں؟ ایک چیستاں ہیں، جس میں مغلق مقامات کو اور بھی مغلق کر دیا گیا ہے، اکثر الفاظ مفردہ کا ترجمہ الفاظ مفردہ سے کیا گیا ہے، جس سے مطلب کی وضاحت تو در کنار الجھاؤ بڑھ گیا ہے''۔ (برہان الٰہی از مولانا محمد اسماعیل گجراتی)

لیکن خود اس ترجمہ ''برہان الٰہی'' پر حضرت مفتی سعید احمد صاحب کا تبصرہ یہ ہے کہ:

''مگر یہ آخری ترجمہ بھی سابقہ تراجم سے بہتر نہیں ہے، مترجم نے بے شک جگہ جگہ شاہ صاحب کے مختصر الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کیا ہے، مگر ''من چہ سرایم وطنبورۂ من چہ سراید'' کا مصداق ہے''۔ (ج۱ص۳۰)

غرض نہ ٹھکانے کا ترجمہ نہ شرح، پھر شاہ صاحب کی بلند پایہ کتابوں کو پڑھانے کے لئے ہاتھ لگائے تو کون لگائے، دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اس کتاب سے بڑی مناسبت تھی، اور وہ اسے خوب پڑھاتے بھی تھے، مگر حضرت کا قیام مدرسے میں کم ہوتا اور جتنا ہوتا، اس میں مشغولیات پیچھا نہ چھوڑتی تھیں، نتیجہ یہ ہوتا کہ کتاب کا درس بہت کم ہو پاتا۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت مہتمم صاحب کے وصال کے کئی برسوں بعد حجۃ اللہ البالغہ کا درس ۱۴۰۸ھ میں حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ سے متعلق ہوا، مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''میں نے یہ کتاب حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب قاسمی قدس سرہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے پڑھی، حضرت کو شاہ صاحب کے علوم پر کمال قدرت حاصل تھی، مگر افسوس کہ درس میں چند ہی ابواب شامل تھے، کاش حضرت سے پوری کتاب، یا

کتاب کا معتد بہ حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی''۔ (ج۱ص۳۱)

مفتی صاحب موصوف بے شرح اور بے حاشیہ کی کتاب مسلسل ۱۲/۱۳ سال سے پڑھا رہے ہیں، اس کے لئے ان کو کتنی جانکاہی کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کو اس کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کا اتفاق ہوا ہو، پڑھانے کا مسئلہ لکھنے سے مشکل ہے، پڑھانے میں تو ہر لفظ اور ہر جملہ کا حل کرنا ضروری ہے، ورنہ طالب علم آگے چلنے نہیں دے گا، اور لکھنے کا مسئلہ تو یہ ہے کہ بقول ایک بزرگ عالم کے کہ'' لکھنا کیا مشکل ہے، جو نہیں آئے گا اسے چھوڑ دیں گے''۔

مفتی صاحب پڑھاتے ہیں اور دیوبند کے منتخب طلبہ کو پڑھاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی تیاری کرنی پڑتی ہوگی، ایک عرصہ تک پڑھا لینے کے بعد ظاہر ہے کہ اس کے مشکلات پر عبور حاصل ہوجانا یقینی ہے۔ اب مولانا کو یہ خیال آیا کہ اس کی شرح لکھنی ضروری ہے، یہ بڑی دشوا گزار راہ تھی، اس راہ کی دشواری کو ایک اور صاحب نظر عالم حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ حدیث وتفسیر ندوۃ العلما لکھنو کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں، وہ مفتی صاحب مدظلہ کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

> '' آپ نے اس راہ کی جن مشکلات کا ذکر کیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہی بلکہ اسی جیسی کچھ اور دشواریوں کی وجہ سے راقم نے سوچ سوچ کر بلکہ کر کے ہمت ہار دی...... راقم بھی عرصہ سے حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس کا مکلّف بنا ہوا ہے، اس لئے مبتلیٰ بہ کی رائے زیادہ باوزن ہونی چاہئے''۔ (ج۲ص۲۶)

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح لکھنے کا حوصلہ ایک عرصہ کی تدریس کے بعد کرلیا، اللہ نے ان کو علوم ولی اللہی سے مناسبت عطا فرمائی، یہ ان کا پہلا کارنامہ نہیں ہے، اس سے پہلے انہوں نے شاہ صاحب کے رسالہ الفوز الکبیر کی عربی زبان میں شرح لکھی ہے جو بہت معتبر اور باوقار ہے، اس کے بعد انہوں نے الفوز الکبیر کے رائج ترجمے کے نقص کو محسوس کر کے اس کا مستقل عربی ترجمہ کیا جو صحت وامانت کی ضمانت ہے۔ اب حضرت مفتی صاحب کا اس باب میں تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ اور اس کی سہل اور جامع شرح لکھی، اور حضرت شاہ صاحب غامض اور بلند پایہ معارف کو علما کے لئے

سہل فرمادیا۔

شاہ صاحب کی یہ کتاب احکام شریعت کے اسرار و رموز اور ان کی حکمتوں کے بیان میں ہے، یہ ایک مشکل اور غامض فن ہے، اس کے ساتھ ہی نہایت نازک، شریعت کی روح کو پہچاننا، اس کے مطابق حکمتوں کو اخذ کرنا، اس کی عقلی مصلحتوں کی تفصیل کرنا فی نفسہ بھی ایک مشکل کام ہے، اور پھر جب یہ بھی پیش نظر رہے کہ عموماً اس فن کو موضوع بنا کر متقدمین نے اس سے تعرض نہیں کیا ہے، کہیں کہیں بعض احکام کے ضمن میں ان کی مصلحتیں بیان کی گئی ہیں، مگر مستقلاً اسے موضوع بنا کر شریعت کے تمام مسائل کے معارف وحقائق بیان کرنے کا التزام نہیں کیا گیا ہے، تو اس کی دشواریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ شاہ صاحب مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، انہوں نے اپنی خداداد ذکاوت وبصیرت سے جو کچھ لکھا وہ علوم اسلامیہ کا عظیم سرمایہ ہے، لیکن ایک تو فن اچھوتا، دوسرے مصنف انتہائی ذہین وذکی اور نہایت بلند پایہ صاحب ذوق، ایسا شخص جب کلام کرتا ہے تو اپنے مرتبہ ومقام سے کلام کرتا ہے، اور اس کا سمجھنا متوسط ذہن والوں کو تو کیا اعلیٰ ذہن والوں کو مشکل ہوتا ہے، پھر نیا فن ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اصطلاحیں اور علامتیں وضع کرنی پڑتی ہیں، ان اصطلاحوں اور علامتوں کے مفہوم کو سمجھنا بہت دشوار ہوتا ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ مصنف نے خود اس کی واضح تفصیل وتشریح نہ کی ہو۔

مفتی صاحب موصوف نے شرح کی تمہید میں بہت سچی بات لکھی ہے کہ:

> ''شاہ صاحب قدس سرہ عرش پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، شرح میں ان مضامین کو جب تک فرش پر نہ لایا جائے بات نہیں بن سکتی، شاہ صاحب کی ہر بات انوکھی ہوتی ہے، ہر مصنف کی باتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مراجع ومصادر مل جاتے ہیں، مگر شاہ صاحب کی کوئی بات کسی کتاب میں نہیں ملتی''۔ (ج ا ص ۳۰، ۳۱)

بہر حال کام تو مشکل تھا، مگر حق تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب مدظلہ کو جن صلاحیتوں اور کمالات سے نوازا ہے، ان سے کام لے کر بفضلہ تعالیٰ انہوں اس مشکل کو سر کرلیا، عرش کے مضامین کو فرش پر لاکر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے، لیکن جو مضمون بلند اور مشکل ہے وہ تو بلند اور مشکل ہی ہوگا، خواہ اسے کتنا ہی آسان کیا جائے، اور نیچے اتارا جائے۔ یہ کتاب درحقیقت ان

علما کے لئے ہے، جو شاہ صاحب کے علوئے خیال اور بلندیٔ علم کی وجہ سے ان کی عظمت پر ایمان بالغیب سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرتے تھے، اس شرح نے ان علوم و معارف کو قریب تر کر دیا ہے اور شاہ صاحب کی عظمت کو غیب سے شہود بنا دیا ہے۔

شاہ صاحب کی یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے والے حصے میں وہ اصولی قواعد بیان کئے گئے ہیں جن سے احکام شرعیہ کی حکمتیں اور مصلحتیں مستنبط ہوتی ہیں، تمہیدی مضامین کے ساتھ مطبوعہ حجۃ اللہ البالغہ کے ص ۱۶۱ صفحات پر یہ حصہ پھیلا ہوا ہے، یہ حصہ مشکل اور غامض مضامین پر مشتمل ہے، کتاب کا دوسرا حصہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات عالیہ کے تفصیلی اسرار وحکم کی وضاحت وشرح میں ہے، یہ حصہ گویا کہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی ایک موضوع کے اعتبار سے شرح ہے، یہ حصہ ۲۴۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، حضرت مفتی صاحب نے پہلے حصے کی شرح دو جلدوں میں مکمل کی ہے۔ جلد اول ۸۲۱ صفحات پر مشتمل ہے، اور جلد دوم ۷۴۴ پر، اس ۱۶۱ صفحات کی شرح مجموعی اعتبار سے کم بیش ساڑھے پندرہ سو صفحات پر محیط ہے۔

اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے ایک بڑا کام لیا ہے، انہوں نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کو پڑھایا، اس کے بعد معانی ومطالب کو اپنے اندر جذب کیا، پھر طالب علموں کو اس سے سیراب کیا، کچھ طالب علموں نے مفتی صاحب کی درسی تقریروں کو ٹیپ ریکارڈ میں ضبط کیا، پھر اسے صفحات کاغذ پر منتقل کر کے حضرت مفتی صاحب کی نظر اصلاح کے لئے پیش کیا، مفتی صاحب نے ان کی تہذیب وترتیب کی، مگر چونکہ پوری کتاب داخل درس نہیں ہے، اس لئے وہ حصہ جو درس میں شامل نہیں ہے، اس کی علیحدہ شرح لکھنی پڑی۔

شرح کا انداز حضرت مفتی صاحب نے یہ اختیار کیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی مسلسل عبارتوں کو مختلف پیراگرافوں میں تقسیم کر کے ہر پیراگراف کا ایک مستقل عنوان قائم کیا، جس سے اجمالی طور پر اس پیراگراف کا مضمون ذہن میں آجاتا ہے، پھر جو کچھ حضرت شاہ صاحب نے اس پیراگراف میں تحریر فرمایا ہے، مصنف نے اس کی مفصل تقریر وتشریح اپنے لفظوں میں فرمائی، اس تشریح میں حضرت شاہ صاحب کی ہر بات ممکنہ سہل انداز میں ادا کر دی ہے، تشریح کی ضرورت ہوئی تو تشریح کر دی، موقع کی مناسبت سے اگر ترتیب میں کچھ تبدیلی پیدا کرنے کی

ضرورت محسوس ہوئی تو اسے کر دیا۔غرض جو کچھ حضرت شاہ صاحب کہنا چاہتے ہیں اسے آسان اسلوب میں لکھ دیا ہے، اس طرح کہ نہ حضرت شاہ صاحب کی کوئی بات چھٹی اور نہ اس کے مفہوم میں کوئی تغیر ہوا۔

اس کے بعد شاہ صاحب کی متعلقہ عبارت ضروری اعراب کے ساتھ لکیروں کے چوکھٹے میں نقل کی گئی ہے، اس کے بعد عبارت کا نہ آزادانہ، نہ تحت اللفظ بلکہ درسی انداز کا ترجمہ کر دیا ہے، تا کے علما وطلبہ جس عبارت کا ترجمہ دیکھنا چاہیں، انہیں بے تکلف وہ ترجمہ مل جائے اور عبارت اس کی مدد سے حل ہو جائے۔

اس کے بعد جس بات یا جس جملہ کی تشریح مزید کی ضرورت ہوئی، اسے تشریح کے عنوان سے تحریر فرما دیا ہے، اس کے ضروری لغات یا ترکیب وغیرہ کی تشریح کر دی ہے، اس طرح یہ کتاب اہل علم کے ہر طبقہ کے لئے مفید ومعاون بن گئی ہے۔

اگر کوئی صاحب کسی وجہ سے صرف حجۃ اللہ کے مضامین ومعارف پر عبور حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لئے ابتدائی تقریر کافی ہے، حجۃ اللہ البالغہ کے تمام مضامین تسہیل وتشریح کے ساتھ اس میں آ گئے ہیں، کوئی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کو لفظاً لفظاً حل کرنا چاہیں تو یا ابتدائی تقریر کو حجۃ اللہ پر منطبق کرنا چاہیں تو ان کے لئے عبارت اور اس کا ترجمہ موجود ہے، اور ساتھ ساتھ لفظوں کم مختصر تشریح وتحقیق بھی۔کسی صاحب کو یہ کتاب پڑھانی ہے تو ان کے لئے یہ شرح ایک مکمل استاذ کا کام دے گی، اس سے نہ صرف عبارت حل ہوگی بلکہ کس انداز سے اسے پڑھایا جائے، کس طرح اس کے مضامین طلبہ کے ذہن میں اتارے جائیں؟ اس کی بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوگی۔

شاہ صاحب کی کتابوں کے شارح کے سامنے ایک دشواری اور آتی ہے، وہ یہ کہ شاہ صاحب عملاً تو حنفی ہیں، مگر علم حدیث میں شاگرد ایک بہت بڑے شافعی عالم کے ہیں، جن کی خدمت میں وہ عرصہ تک رہیں، اس طرح ان کے نظریات پر فقہ شافعی کی گہری چھاپ ہے، پھر یہ کہ وہ ایک مجتہدانہ دماغ رکھتے ہیں، ایسا صاحب نظر عالم جب تدریس وتصنیف کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو قدم قدم پر اس کی انفرادیت نمایاں ہوتی رہتی ہے، انہیں اثرات کے ماتحت وہ

کہیں کہیں حنفی ہونے کے باوجود احناف سے الگ راہ اختیار کرتے ہیں، کسی کسی مسئلہ میں ان کی رائے منفرد ہوتی ہے، کہیں وہ نظریاتی اعتبار سے شوافع کے ہم قدم نظر آتے ہیں، اور ان کے مجتہدانہ دماغ اور بصیرت کا اثر یہ ہے کہ برخود غلط مجتہدین یعنی غیر مقلدین انہیں اپنے مسلک غیر مقلدیت میں گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ ان کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

یہاں شارح کو دشواری پیش آتی ہے کہ شاہ صاحب تو بعض مسائل میں حنفیت سے نظری طور پر جدا راہ اختیار کرتے ہیں، انہیں ان مسائل یا ان کے اصول میں ضعف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ نہ ان مسائل میں غلطی ہے اور نہ ان کے اصول میں ضعف ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک صاحب نظر جس پہلو سے اس مسئلہ کو دیکھ رہا ہے وہ پہلو نگاہوں پر چھا گیا ہے، اور دوسرا پہلو خفیف سا ہوکر رہ گیا ہے، اس کی وجہ سے اسے ضعف محسوس ہوتا ہے، اس کی تفصیل طویل ہے، اس کے بیان کا یہ محل نہیں ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کی شرح میں ایسے بھی مرحلے آئے ہیں، مگر مفتی صاحب کی بصیرت کا کمال ہے کہ انہوں نے ان مباحث کو بڑی خوبی کے ساتھ حل کیا ہے، حنفیت کے جن اصولوں کو شاہ صاحب نے کمزور قرار دیا ہے، حضرت مفتی صاحب نے سنجیدہ اور علمی وقار کے ساتھ ان کا دفاع کیا ہے، اور حضرت شاہ صاحب کے ادب واحترام میں بھی کسی طرح کی کمی نہیں ہونے دی ہے، اور ان مباحث میں الجھ کر غیر مقلدوں نے حضرت شاہ صاحب کو اپنے مسلک میں گھسیٹنے کی جو ناروا کوشش کی ہے، حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھی قلع قمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو، رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم ص۳۲۷ سے آخر کتاب ۴۴۷ تک۔

اسی طرح کہیں کہیں شاہ صاحب کے ظاہر کلام سے کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے یا ہوسکتی ہے، اس غلط فہمی کو بھی حضرت مفتی صاحب نے شرح میں دور کرنے کا اہتمام کیا ہے، مثلاً اسباب تحریف میں حضرت شاہ صاحب نے استحسان کو بھی ذکر کیا ہے، اس بحث میں انہوں نے استحسان کی تعریف کی ہے، اور اس کے ذیل میں یہودیوں کے ایک استحسان کی مثال پیش کی ہے، پھر اس کی مذمت علما کے کلام سے بیان کی ہے، یہ سارا کلام بہت عمدہ اور صحیح ہے، لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا قوی امکان ہے، وہ یہ کہ فقہائے احناف کے یہاں استحسان کی اصطلاح بکثرت رائج

ہے،اور فقہ کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیاس کے مقابلہ میں استحسان کے اندر قوت زیادہ ہوتی ہے، یہاں سوچنے والا سوچ سکتا ہے کہ شاہ صاحب استحسان کو اسباب تحریف میں قرار دے رہے ہیں،اوراحناف کے یہاں اس کا درجہ قیاس ظاہر سے بڑھا ہوا ہے،تو یقیناً شاہ صاحب فقہ حنفی اور اصول احناف کے مخالف ہیں،اور یہ فقہائے احناف دین میں تحریف کے مرتکب ہیں،شاہ صاحب کا کلام قدرے مجمل ہے،حالانکہ شاہ صاحب نے اس بحث کے آخری فقرہ سے غلط فہمی کا یہ دروازہ بند کردیا ہے،مگر وہ اتنا مجمل ہے کہ جب تک اس کی تفصیل مستحضر نہ ہو، کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے اس اجمال کی تفصیل کر کے غلط فہمی کے ہر دروازے کو بند کردیا ہے۔

جزاه الله خير الجزاء وبارک في علمه ومعرفته

مفتی صاحب کا یہ کارنامہ واقعی قابل مبارک باد ہے، وہ سب اہل علم کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک بڑے قرض سے علما دیوبند کو سبک دوش کردیا ہے۔ کتاب کی کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد سب ماشاء اللہ بہت معیاری اور دیدہ زیب ہیں،اتنی بڑی کتاب میں ترجمے اور کتابت کی معمولی فروگزاشت کا ہونا محل تعجب ہے اور نہ باعث مواخذہ! بعض جگہ تعبیرات ترمیم کے لائق ہیں،مگر جن خوبیوں کی یہ کتاب حامل ہے ان کے مقابلے میں یہ کوتاہیاں قابل گرفت نہیں۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔مئی (۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ جلد سوم
شارح	:	مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہ
صفحات	:	٦٩٦
قیمت	:	درج نہیں
ناشر	:	مکتبہ حجاز دیوبند (سہارن پور)

دار العلوم دیوبند کے مشہور ومقبول استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی نہایت نافع اور شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح لکھنے اور شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے، اس کی ابتدائی دو ضخیم جلدوں کا مفصل تعارف ماہنامہ ضیاء الاسلام بابت ماہ صفر ۱۴۲۳ھ میں خاکسار کے قلم سے آچکا ہے، اس میں اصل کتاب اور اس کی شرح کی خصوصیات پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاچکی ہے۔

اللہ تعالی کی خاص مدد ہے، اور مولانا موصوف کے خلوص اور ان کی دھن اور لگن کی یہ برکت ہے کہ بغیر کسی معتد بہ وقفہ کے شرح کی تیسری جلد بھی شائع ہوکر علما وطلبہ کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔

اس جلد سے کتاب کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں حضرت شاہ صاحب نے اسلامی احکام وتعلیمات کے اسرار وحکم کو احادیث کی روشنی میں تفصیلاً بیان کیا ہے، جن کے علم سے احکام الہی کی گہرائیوں میں اترا جاسکتا ہے، اور جن کے پڑھنے سے ایک سلیم الطبع شخص کو اسلام کے دین حق ہونے پر مکمل شرح صدر ہوجاتا ہے۔

اس جلد کا آغاز ایمان وعقائد کی تفصیلی حکمتوں کے بیان سے ہوا ہے، اور اس سلسلے کی

حدیثوں کی شرح اس میں لکھی گئی ہیں، ایمان، کفر، تصدیق، سکینت قلبی، نفاق اور اخلاص کی علامتیں، گناہوں کی تفصیل، کبائر وصغائر کا بیان، شیطان کی وسوسہ اندازیاں، فرشتوں کی جانب سے الہام، مجازات اور تقدیر کے مسائل، نیز کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے کے سلسلے میں اصولی باتیں، غرض ایمان وعقائد کے متعلق نہایت عمدہ اور ضروری مباحث کی تفصیل اس جلد کے آغاز میں بیان کی گئی ہے۔

ایمان وعقائد کی تفصیلی گفتگو کے بعد حضرت شاہ صاحب نے طہارت، وضو، غسل، تیمّم، پانی وغیرہ کے مباحث پران کے اسرار وحکم پر کلام فرمایا، پھر نماز کے ابواب واحکام کی حکمتوں کو تحریر فرمایا۔ شاہ صاحب کا کلام تو شاہ صاحب ہی کا ہے، اس کی خصوصیات وامتیازات پر پہلے گفتگو کی جا چکی ہے، پھر مولانا نے اس غوامض کی تہوں میں اتر کر اس کو واضح کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔

شرح کے ضمن میں مولانا نے بہت سے نفیس مباحث تحریر فرمائے ہیں، اور اصل کتاب کی فہرست کے ساتھ سہولت استفادہ کے لئے ان نفیس فوائد کی فہرست بھی مرتب کر دی ہے۔ اہل علم حضرات کے لئے یہ کتاب ایک بیش قیمت تحفہ ہے، اللہ تعالی اصل کتاب کی طرح اس شرح کو بھی حسن قبول سے نوازیں۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ جنوری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ (مکمل پانچ جلدوں میں)
مؤلف	:	حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
صفحات	:	۳۶۰۸
طباعت وکتابت	:	عمدہ
قیمت	:	درج نہیں ہے
ناشر	:	مکتبہ حجاز دیوبند، یوپی

امت محمدیہ (**علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام**) کے خصوصی امتیازات میں ایک اہم امتیاز اس کے علمی کمالات ہیں، رسول اکرم ﷺ امی تھے، اور امیوں میں بھیجے گئے تھے، مگر اللہ نے آپ کو وہ علم عطا کیا تھا، جس کی وجہ سے آپ سراپا علم وحکمت بن گئے۔ پھر آپ نے اپنی امت میں علم وحکمت کے ذوق کی وہ روح پھونکی، کہ ایک دنیا کی دنیا علم کے نور سے جگمگا اُٹھی۔ آپ پر پہلی وحی جو آئی، اس کی ایک آیت ''**علم بالقلم**'' کے کلمات پر مشتمل ہے۔ اس آیت کی روشنی میں امت نے قلم کو ہاتھ میں لیا، تو علوم کے دفتر نہیں، بلکہ عظیم الشان کتب خانے تیار ہوتے چلے گئے۔ قرونِ اولیٰ سے اب تک تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے، اور ہر زمانے میں ایسی بیش قیمت کتابیں طلبائے علوم کے ہاتھوں میں آجاتی ہیں جن سے علم کی زندگی اور تابندگی اور اس کی رونق بڑھ جاتی ہے۔

یہ کتابیں روشنی کے مینار ہیں، فضا میں جب کبھی جہل کی ظلمت بڑھ جاتی ہے، تو کوئی صاحب استعداد عالم انھیں کتابوں سے روشنی حاصل کر کے جہل کی تیرگی کو چھانٹ دیتا ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر کتاب ایک رُتبے کی نہیں ہوتی، جہاں بعض کتابیں بہت بلند، بہت روشن اور بہت نافع ہوتی ہیں وہیں بہت سی تحریریں بالکل بے معنی، ہذیان اور بے تکی ہوتی ہیں، پھر ان

دونوں مرتبوں کے درمیان بے شمار درجات اور مراتب ہیں، پڑھنے کے لئے وہی کتابیں منتخب کرنی چاہئیں، جوعلم وحکمت کی صحیح ترجمانی کرنے والی ہوں۔

علم وحکمت کی اَساس، اللہ کا کلام ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں، جنھیں حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن وحدیث کی خدمت کے بہت سے شعبے ہیں، اور ہر شعبے میں امت نے خدمات کے بے شمار نقوش ثبت کئے ہیں۔ دنیا اور امت کو جب جیسی خدمت کی ضرورت پیش آئی ہے اللہ نے مردانِ کار کو پیدا فرمایا ہے، اور انھوں نے وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے، اس داستان کی تفصیل بہت طولانی ہے، جی تو چاہتا ہے کہ اس تفصیل کی جانب ہلکے ہلکے اشارے کردئے جائیں، مگر جب ان اشاروں کو ترتیب دینا چاہا، تو وہی طول طویل دفتر کی شکل اختیار کرنے لگے، اس لئے ان اشاروں سے صرف نظر کرکے جو بات اس وقت عرض کرنی ہے، اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تفسیر وحدیث کے ذیلی علوم میں ہر ہر عنوان پر بہت کچھ خدمتیں ہوئی ہیں، ان موضوعات پر تصنیف وتالیف کے ذخیرے کے ذخیرے موجود ہیں۔ مگر ایک موضوع ایسا بھی ہے، جس کو موضوع اور مقصود بنا کر متقدمین ومتاخرین میں سے غالباً کسی نے ہاتھ نہیں لگایا، یا اگر کسی نے کچھ لکھا، تو وہ آج دستیاب نہیں ہے۔ حالانکہ وہ موضوع بڑا اہم ہے، اور ایسا ہے بھی نہیں ہے کہ کسی نے اس پر غور وفکر نہ کیا ہو، یا اس سے سرے سے بحث ہی نہ کی ہو، متفرق اور منتشر طور سے اس موضوع کے اشارات اور تصریحات کتابوں میں ملتے ہیں۔ مگر مرتب اور مدون کرنے کی طرف کسی نے التفات نہیں کیا۔

وہ موضوع ہے ''علم اسرارالدین'' یعنی دینی علوم واعمال کی عقلی توجیہات اور ان کی علتوں اور حکمتوں کا تفصیلی بیان۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ احکام شرع حکمتوں اور مصلحتوں سے بے نیاز ہیں، اعمال اور ان کی جزائیں جو اللہ تعالیٰ نے متعین کی ہیں، ان میں کوئی مناسبت ملحوظ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے، **فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ** صاحب حکمت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، پھر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون حکیم ہوگا۔ قرآن پاک میں حکمت کا اتنے

عنوانوں سے تذکرہ ہوا ہے کہ یہ سوچا بھی نہیں جانا چاہئے کہ، اللہ تعالیٰ کے احکام کسی حکمت اور مصلحت پر مبنی نہ ہوں گے۔

علماء نے جستہ جستہ مختلف مقامات پر احکام کی حکمتوں اور علتوں پر بحث کی ہے، مگر اس حیثیت سے یہ موضوع اچھوتا رہا ہے کہ اس کی جانب مستقلاً اعتناء نہیں ہوا۔ امام غزالی نے، علامہ عزالدین عبدالسلام نے اور دوسرے محقق علماء نے اپنی تصنیفات میں متفرق طور سے اس موضوع پر بہت کچھ کلام کیا ہے، مگر اسے موضوع نہیں بنایا۔

اسلامی تاریخ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ غالبًا پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس موضوع پر پوری توجہ فرمائی، اور ''**حجة الله البالغة**'' کے نام سے ایک زبردست کارنامہ انجام دیا۔

یہاں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے الفاظ نقل کرتا ہوں، جن سے ''**حجة الله البالغة**'' کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''شاہ صاحب کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب اور علمی کارنامہ ''**حجة الله البالغة**'' ہے، جس میں دین ونظام شریعت کا ایک ایسا مربوط، جامع اور مدلل نقشہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاق، علم الاجتماع وتمدن، سیاست واحسان کو ایک ایسے ربط وتعلق اور صحیح تناسب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہار کے موتی اور زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں، اور ان میں اصول وفروع، مقاصد ووسائل اور دائمی وموقت کا فرق نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو پاتا............ اسلام کی یہ مربوط وجامع ترجمانی، جو ''**حجة الله**'' کے صفحات میں دیکھنے میں آتی ہے، بہت کم دینی تصنیفات میں نظر آئے گی، اس طرح ''**حجة الله**'' اس دورِ عقلیت کے لئے ایک نیا علم کلام بن گیا ہے،............ ہمارے علم میں کسی مذہب کی تائید، اور اس کی حکیمانہ توجیہ وتشریح میں (ان زبانوں میں جن سے ہم واقف ہیں) اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی، اور اگر لکھی گئی تو اس وقت علمی دنیا کے سامنے نہیں ہے۔
>
> (تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۵، ص:۲۱۵، ۲۱۶)

حضرت شاہ صاحب نے جس اچھوتے موضوع کی ترتیب وتدوین کی ہے، دینی علوم میں اس کا مقام کتنا بلند ہے، اس کو خود شاہ صاحب ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں کہ:

''علوم حدیث میں میرے نزدیک سب سے باریک، دقیق وعمیق، رفیع وبدیع، اسرار دین کا وہ علم ہے، جس میں احکام کی حکمتیں، اوران کے لمیات اورخواص اعمال کے اسرار ونکات بیان کئے جائیں، جن کے ذریعے انسان شریعت کی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں صاحب بصیرت بن جاتا اورخلط وخبط سے محفوظ رہتا ہے،(مقدمہ **حجة الله البالغة** ص ۳)

یہ علم اور موضوع ہے تو اس درجہ اور مرتبہ کا! مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ شاہ صاحب ہی نے اس کی ترتیب وتدوین کا آغاز کیا ہے، اوراب تک وہی اس کی انتہا ہیں۔

یہ کتاب حضرت شاہ صاحب نے عربی زبان میں لکھی ہے، شاہ صاحب بہت بلند پرواز اصحاب علم اوراصحاب دل حضرات میں ہیں، ان کی علمی وذہنی بلند پروازی کی وجہ سے ان کے علوم ومدرکات تک پہونچنا آسان نہیں ہوتا، جن حضرات نے حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس سے بخوبی واقف ہیں، پھر یہ ایک اچھوتا اور دقیق موضوع ہے، اس کی گہرائیوں تک عقل وفہم کی رسائی یوں بھی مشکل ہے پھر جب حضرت شاہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں ایجاز واختصار کوملحوظ رکھتے ہوئے اس کے حقائق کوکھولتے ہیں تو ان کے آسان کرنے کے باوجود غموض وامعان کی تہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ بلکہ بعض جگہ ان کی بلندیٔ ادراک کی وجہ سے کچھ تہیں اور بڑھ جاتی ہیں، اس صورتِ حال میں اس کتاب کوسمجھنے کا حوصلہ وہی علماء کرسکتے تھے، جن کوعلمی رسوخ حاصل ہو، حضرت شاہ صاحب کے علوم سے مناسبت ہو، ان کی اصطلاحات سے فی الجملہ واقف ہوں، پھراسرار وحکم کے سمجھنے کا ذوق بھی ہو۔ ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کو حضرت شاہ صاحب کے علوم ومعارف سے خاص مناسبت تھی، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی علیہ الرحمہ نے تو حضرت شاہ صاحب کے علوم ومعارف کواپنا موضوع زندگی بنایا تھا، مولانا سندھی **حجة الله البالغة** کا درس دیا کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں بھی اس کے درس کا سلسلہ تھا، حضرت قاری محمد طیب صاحب کے درس میں یہ خاکسار شریک رہا ہے، طالب علمی سے رسمی فراغت کے بعد ایک بارمحنت کرکے پوری کتاب کا بالاستیعاب اور بغور مطالعہ کیا، اورایک بارنہیں

متعدد بار کیا، ہر ہر سطر پڑھی، اکثر جگہیں تو حل ہوگئیں، مگر بعض مقامات پر تردد باقی رہا، بعض جگہیں سمجھ میں نہیں آئیں، اس وقت شدت سے احساس ہوا کہ کوئی صاحب نظر عالم اس کی مکمل شرح کر دیتا، تو اس کے بلند مضامین کچھ تو دسترس میں آجاتے، لیکن تلاش وتحقیق کے بعد بھی کسی شرح کا سراغ نہ ملا۔ نہ عربی میں نہ اردو میں، ترجمے تو دستیاب تھے، مگر ترجموں سے کچھ بات بنتی نظر نہیں آئی، پھر خود ہی محنت کرتا، جو مضامین سمجھ میں نہیں آتے تھے، انھیں بار بار پڑھتا رہا۔

اِدھر پچھلے دنوں یہ خوشخبری ملی کہ دارالعلوم دیو بند کے استاذ حدیث، صاحب نظر عالم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہٗ اس کی مکمل شرح تصنیف فرمارہے ہیں، اس خبر سے بہت خوشی ہوئی، پھر جلد ہی اس شرح کی پہلی جلد ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' کے نام سے نہایت خوبصورت چھپی ہوئی مل گئی۔ بہت دنوں سے دل میں پڑی ہوئی مراد برآئی۔ اور خوشی دوبالا ہوئی۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام میں اس پر تبصرہ بھی لکھا، یہ کام بہت بڑا تھا۔ دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے ہاتھوں اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچادیں، معلوم ہوتا رہا کہ حضرت موصوف پوری مستعدی کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، پھر ماشاء اللہ جلدوں پر جلدیں آنے لگیں، یہاں تک کہ اس سال یعنی ۱۴۲۵ھ کے اوائل میں آخری جلد بھی منظر عام پر آگئی۔ اللہ کے فضل سے یہ عظیم الشان منصوبہ پورا ہوگیا، اور اس صدی میں اب تک آئی ہوئی دینی وعلمی کتابوں میں ایک بہت ہی کامیاب اور امتیازی کتاب کا اضافہ ہوا۔

یہ کتاب عام شروحات کے طرز پر محض ایک شرح نہیں ہے، بلکہ ایک درسگاہ ہے، جس میں ایک متبحر استاذ اپنے طالب علموں کو علمی اسرار ونکات کو تفصیل کے ساتھ آسان تر بنا کر سمجھا رہا ہے، اور نہ صرف کتاب کو بلکہ فن کے مسائل کو نہایت تسلی بخش طور پر سمجھا رہا ہے۔

شرح کا انداز یہ ہے کہ پہلے شاہ صاحب کے مضامین عالیہ کو مفتی صاحب اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہیں، اور اس طرح ادا کرتے ہیں کہ کہیں اغلاق اور اشکال باقی نہیں رہتا، اور مسئلہ خوب روشن ہوجاتا ہے، پھر شاہ صاحب کی عبارت نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اس کا ترجمہ اس انداز سے کرتے ہیں، جیسے درس میں ہونا چاہئے، تاکہ ہر عبارت اور لفظ کا ترجمہ ہوجائے، اور کہیں کوئی تشنگی باقی نہ رہے، اس کے مشکل الفاظ کی شرح، ضمائر کے مراجع کی تعیین وغیرہ پر اختصار

سے بحث کرتے ہیں۔

اس طرح یہ شرح ،ایک باکمال استاذ کا درس ہے،جس سے ہر استعداد کے طلبہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں،مولانا کو مشکل مسائل کی تسہیل کا فن خوب آتا ہے،اورانھوں نے بڑی خوبصورتی سے اس فن کو اس کتاب میں برتا ہے، جو مضامین خود مشکل ہیں،انھیں کوئی کتنا ہی آسان کرے گا کچھ نہ کچھ دشواری تو رہے گی لیکن مولانا نے اس دشواری کو جس حد تک آسان کر دیا ہے، وہ ان کی مہارت تدریس وتفہیم کی روشن دلیل ہے۔

حجة الله البالغة اپنے فن کی یکتا کتاب ہے،اوراس کی یہ شرح بھی یگانۂ روزگار ہے۔

مولانا خبر دیتے ہیں کہ ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ سے شرح کی تصنیف کا آغاز ہوا،اور۱۹رذی الحجہ۱۴۲۴ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، درس وتدریس اور وہ بھی دارالعلوم دیوبند میں تدریس حدیث کے مشاغل کے ساتھ اتنا اہم علمی کارنامہ جو بڑی تقطیع کے ساڑھے تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے،صرف پانچ سال میں مکمل ہو جانا،خاص تائید الٰہی اورنصرتِ غیبی کا مظہر ہے،حضرت مفتی صاحب پوری امت مسلمہ کی طرف سے عموماً،اور علمی حلقوں کی طرف سے خصوصاً شکریے کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں، اور مفتی صاحب کو بایں فیوض وبرکات تادیر سلامت باکرامت رکھیں۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔نومبر،دسمبر (۲۰۰۴)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب : اللؤلؤ والمرجان فی لطائف القرآن (یعنی قرآن کے تعبیری جواہر پارے)
مؤلف : مولانا رضوان الدین صاحب معروفی
(شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا)
صفحات : ۵۱۳
قیمت : درج نہیں
ناشر : مکتبہ الہدایہ ،محلّہ بانسہ پوسٹ کرتھی جعفر پور ضلع مئو یوپی ،پن کوڈ ۲۷۵۳۰۵۔ دیوبند، دلی اور مئو کے کتب خانوں پر دستیاب ہے۔

قرآن کریم علوم معانی کا ایک اتھاہ سمندر ہے،اس سمندر کی گہرائیوں میں ارباب ذوق اوراصحاب علم اترتے ہیں،اوراپنی اپنی استعداد کے بقدرعلوم سے دامن بھرکر نکلتے ہیں،لیکن آج تک کوئی یہ نہ سکا کہ یہ سمندر کھنگالا جاچکا،اس کے سب موتی چن لئے گئے ہیں،چننے والوں نے بہت کچھ چنا،لیکن اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنارہ گیا؟ ہرایک نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے علوم حاصل کئے،فقہا نے قانون کی باریکیاں دریافت کیں،متکلمین نے عقائد کی تہوں کوکھولا، مؤرخین نے تاریخ کی سچائیاں پائیں،اہل تقوی کے سامنے دیانت اورتقوی کی راہیں کھلیں،اہل بلاغت نے فصاحت وبلاغت کے نئے اورتازہ نکتے نکالے،اور ہرایک یہی کہتا رہا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ابھی کتنے اورحقائق ومعانی دریافت ہوں گے۔

کئی سال پہلے ہمارے عزیزم مولانا رضوان الدین صاحب معروفی سلمہ اللہ نے قرآن کریم کے کلمات وعبارات ،ان کی تقدیم وتاخیر،ان کے حذف وذکر، ان کے تنوع و ترادف،ان میں اختلاف اعراب،تبدیلیٔ اسلوب وبیان،ربط آیات وغیرہ کوموضوع بنا کرغور کرنا شروع کیا،ان کی حکمتوں کی تلاش میں ایک تازہ علمی سفرشروع کیا،اوراس کا تذکرہ اپنے

حسن ظن سے اس خاکسار سے بھی کیا، مجھے ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ حیرت یہ ہوئی کہ ایک دقیق علمی مبحث، اس کی تہوں میں اترنا، اس کے حقائق کو تلاش کرنا، اور پھر انہیں بیان کرنا، بڑی جاں کاہی اور گہرے مطالعہ کو چاہتا ہے۔ سہولت پسندی کے اس دور میں ایک نوجوان عالم وفاضل آسان راہوں سے ہٹ کر ایک مشکل راہ کے سفر پر نکل رہا ہے۔ اور خوشی اس پر کہ یہ نوجوان میرا بہت ہی خاص عزیز ہے، اس کے ذریعہ سے علم کی نئی گرہیں کھل رہی ہیں۔ قرآن کریم کے معانی وبلاغت کا ایک جلوہ زار سامنے آرہا ہے، جو علوم قرآن کے طالبین کے لئے اردو زبان میں نئے انداز کا ایک تحفہ ہے، بہت آسان اور بہت ایمان افروز!

ان حقائق ومعانی کی تلاش میں انہیں بکثرت کتب تفسیر وبلاغت کا مطالعہ کرنا پڑا ہے، اس کے ساتھ ذوق صحیح کی ضرورت ہر قدم پر رہی ہے۔ بحمد للہ! انہوں نے اس مہم کو سر کرنے کی پوری محنت کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی محنت وکاوش کو قبول فرمائے اور دنیا وآخرت میں اسے نافع بنائے۔

ماخذ: ضیاءالاسلام۔ جنوری (۲۰۰۳)

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	مسئلہ امام مہدی آخر الزماں
تالیف	:	مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب فیضی
صفحات	:	۱۲۸
طباعت وکتابت اور جلد	:	عمدہ روشن
قیمت	:	۵۰
ناشر	:	مکتبۃ الفہیم ریحان مارکیٹ، صدر چوک مئوناتھ بھنجن، یوپی

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد کے زمانوں کے بہت سے احوال کبھی صراحۃً کبھی اشارۃً بکثرت بیان فرمائے ہیں، تاکہ آپ کی امت ان احوال وواقعات کے سلسلے میں بصیرت پر رہے، پھر آپ نے ان مواقع پر امت کے لئے کیا لائحۂ عمل ہوگا؟ اسے بھی ارشاد فرمادیا ہے، تاکہ کسی کو حیرانی اور سرگشتگی نہ ہو، بالخصوص قربِ قیامت کے احوال تو اتنی تفصیل اور کثرت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، جیسے آپ ہر ایک کا تفصیلی مشاہدہ فرمارہے ہوں، اور وقت جوں جوں آگے بڑھتا جارہا ہے، رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشن گوئیاں ہو بہو سامنے آتی جارہی ہیں، بہت کچھ ظہور میں آچکی ہیں، اور بہت سے امور کا انتظار ہے، قربِ قیامت کی نشانیوں میں حضرت مہدی کا ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، دجالِ اکبر کا خروج، یاجوج ماجوج کا فساد، وغیرہ وہ امور ہیں، جنھیں خاصی تفصیل کے ساتھ آپ نے بیان فرمایا ہے۔

انسانی ذہن شکی ہے، اس کے سامنے جب تک کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آجاتا، تذبذب میں مبتلا رہتا ہے، حالانکہ ایمان نام ہے یقین کا، اللہ کے رسول ﷺ نے جیسا فرمادیا، اس پر یقین کرنا ہی ایمان ہے، لیکن شکی لوگ یقین سے دامن بچانے کے لئے بہت سی دور از کار تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔

بکثرت احادیث کے قدر مشترک سے حضرت مہدی کا ظہور یقینی امر ہے، لیکن شکیوں کو تسلی نہیں ہوئی، مختلف انداز سے اس پیشین گوئی کو کمزور کرنا چاہتے ہیں، کچھ لوگ اس سلسلے کی احادیث کو ضعیف کہہ کہہ کر اس کی نفی کرنے کے درپے ہیں، کچھ لوگوں نے دیکھا کہ شیعوں کے یہاں امام مہدی کا مسئلہ بڑا بنیادی اور مرکزی ہے، اس سے انھیں شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ مسئلہ شیعوں کے گھر سے اہل سنت میں در آیا ہو۔

پھر اس پیشن گوئی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کتنے برخود غلط افراد نے اپنے کو مہدئ موعود بنا کر پیش کیا، مگر بحمد اللہ امت کا مجموعی مزاج ہدایت کی شاہراہ سے منحرف نہیں ہے، اس لئے کوئی مدعی کامیاب نہ ہوسکا، مہدی کی جگہ خالی ہے، وہ اسی مہدی سے پر ہوگی جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اس مسئلہ پر موافق ومخالف بحثوں کا سلسلہ عرصۂ دراز سے چل رہا ہے، اور جوں جوں قیامت قریب آرہی ہے، یہ بحث شدت پکڑ رہی ہے، یہ دور، عہد نبوی سے دور ہے، اس لئے اس میں ظلمتیں زیادہ ہیں، اور جس قدر ظلمت بڑھتی ہے، شکوک وشبہات بڑھتے ہیں، طبیعتوں میں بے اطمینانی بڑھتی ہے۔

مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب فیضیؔ نے بروقت اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور بہت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مسئلہ کو منقح کر دیا ہے، اس سلسلہ کی روایتوں کو خوب جمع کر دیا ہے، اور ان کی اسنادی حیثیت بھی واضح کر دی ہے، اس موضوع پر یہ کتاب بہت جامع اور مدلل ہے۔ موضوع کے عنوانات سے اس کی افادیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

مقدمہ — عقیدۂ مہدی پر مستقل تصانیف
فصل اول — تذکرۂ امام مہدی اور مختصر حالات
فصل دوم — احادیث مہدی
فصل سوم — احادیث مہدی مشہور ومتواتر ہیں
فصل چہارم — جمہور علماء امت کا اجماع
فصل پنجم — شکوک وشبہات اور ان کے جوابات

فصل ششم مدعیان مہدیت

کتاب کے ناشر ماشاء اللہ بہت خوش ذوق ہیں،کاغذاور کتابت وطباعت بہت معیاری ہے۔قابل مطالعہ کتاب ہے۔

کتاب میں مرکزی اور ذیلی عنوانات بکثرت ہیں ،مگر ناشر نے ترتیب فہرست پر دھیان نہیں دیا،یہ کمی ہے،آئندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کر دیں۔

عرضِ ناشرمحتاجِ اصلاح ہے،کسی سے اصلاح کرالینی چاہئے تھی۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں
مرتب	:	مولانا محمد عمران خاں ندویؒ
ترتیب جدید وحواشی	:	مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
صفحات	:	۴۲۸
طباعت وکتابت	:	عمدہ
قیمت	:	۱۴۰
ناشر		احیاءعلم ودعوت، رفعت منزل 485/185 لکڑمنڈی، ڈالی گنج لکھنؤ

ساٹھ سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا ہوگا، مصر کے مشہور رسالہ ''الہلال'' میں ایک سلسلۂ مضامین ''الکتب التی أفادتنی '' (کتابیں جن سے میں نے استفادہ کیا) کے نام سے شائع ہوا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کو خیال ہوا کہ اس موضوع پر ہندوستان کے نامور اور جید علماء سے بھی مضامین حاصل کرنے چاہئیں، انھوں نے ہندوستان کی ممتاز ونامور شخصیتوں کے نام خطوط لکھے کہ وہ ان کتابوں کا ذکر کریں، جن کا ان کی سیرت کی تعمیر اوران کے فکروخیال کی تشکیل، اوران کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں انقلاب انگیز اور بنیادی حصہ ہے۔

موضوع ہمارے ملک کی حد تک اچھوتا تھا۔ بہت سے اہل علم نے مضامین لکھ کر بھیجے، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان ''الندوہ'' میں شائع ہوئے، ان مضامین کا مجموعہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مضمون کے اضافے کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں اس وقت کے مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد عمران خاں ندوی نے مکتبہ دارالعلوم کی طرف سے اپنے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ پچاس سال سے زائد عرصہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے ملک میں نہیں شائع ہوا۔ حالانکہ یہ کتاب اہل علم کے لئے اس درجہ مفید ہے کہ ہر طالب علم بلکہ ہر صاحب علم کی

نگاہ میں رہنی چاہئے ، مجھے ایک مرتبہ اس کی تلاش ہوئی ،تو بڑی مشکل سے دستیاب ہوسکی۔ البتہ ایک ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں کراچی، پاکستان سے شائع ہوا تھا۔

مولوی فیصل احمد بھٹکلی ندوی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انھوں نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے لئے بڑی محنت کی ۔موصوف نے اصل'' الندوہ'' اور ہندوستانی و پاکستانی دونوں ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر صحیح ترین متن مرتب کیا۔مضامین نگار حضرات کا مختصر اور جامع تذکرہ ہر مضمون کے شروع میں تحریر کیا، کتاب میں آئے ہوئے اعلام واشخاص کا حواشی میں مختصر اور جامع تعارف لکھا، اور ساتھ ہی ساتھ ان مآخذ ومراجع کا بھی ذکر کیا، جہاں ان کا تفصیلی تذکرہ مل سکتا، ان مضامین میں جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا مختصر اور کہیں کہیں قدرے تفصیل سے تعارف کرادیا ہے، قرآن کریم کی آیتوں کا تعین، سورہ اور نمبر آیات کے ساتھ، احادیث نبویہ کی تخریج، اور اشعار کی تخریج وتحقیق وغیرہ کی ہے۔

اس طرح یہ کتاب جو بجائے خود نہایت دلچسپ اور مفید تھی، مرتب موصوف کے حواشی وتحقیق نے اس میں گویا چار چاند لگادئے ، کتابوں اور اشخاص کے باب میں یہ ایک مختصر سا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے ۔کتابت وطباعت اور کاغذ کی عمدگی مزید برآں ! مرتب موصوف نے بہت صحیح لکھا ہے:

''اس کتاب سے جہاں ماضی قریب کے برصغیر کے مشاہیر علم وادب کی محسن کتابوں کا علم ہوتا ہے، جنھوں نے ان کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے افکار وخیالات کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، وہیں ان کی زندگی کے بعض مخفی گوشے بھی سامنے آتے ہیں، جن سے ان کے سوانح نگار کام لے سکتے ہیں''۔

مرتب موصوف شائقین علم وادب کی جانب سے شکرئے اور دعائے خیر کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک بہت اہم علمی، تربیتی اور معلوماتی دستاویز تیار کردی ہے۔ ہر وہ شخص جس کو علمی ذوق ہو، اس کتاب کو بار بار پڑھے، اور فائدہ اُٹھائے۔ مدارسِ دینیہ کے طلبہ واساتذہ خاص طور سے اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں رکھیں۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب	:	زندگی سے لطف اٹھائیے (اسوۂ حسنہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کے سنہرے اصول)
مصنف	:	دکتور محمد بن عبدالرحمٰن العریفی
مترجم	:	حافظ قمر حسن
ناشر	:	مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی (یہ کتاب مکتبہ ضیاء الکتب سے بھی طلب کی جاسکتی ہے)
صفحات	:	۵۷۰
قیمت	:	۲۵۰روپئے
کتابت وطباعت	:	عمدہ

یہ کتاب ایک عرب عالم جناب ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن العریفی کی عربی تصنیف **استمتع بحیاتک** کا خوبصورت ترجمہ ہے، یہ کتاب کیا ہے؟ زندگی کو خوشگوار اور سہل بنانے کے اسلامی وشرعی طریقوں کا دلآویز مجموعہ ہے، آدمی اپنی زندگی میں، زندگی کے معاملات میں، زندگی کی مشکلات میں، کون سے راستے اختیار کرے؟ کیا طرز عمل اپنائے؟ اپنے قلب ودماغ کی سوچ اور فکر کا مرکز کسے بنائے؟ کہ زندگی آسان بھی ہو، خوشگوار بھی ہو، اور اسے اتباع سنت کی دولت گرانمایہ بھی حاصل ہو، لوگ بھی اس سے خوش ہوں اور اللہ بھی راضی ہو، مصنف نے بڑے عمدہ اُسلوب میں ان موضوعات کو اس کتاب میں پیش کیا ہے، بلکہ ایک ہمدرد اور شفیق استاذ کی طرح اپنے پڑھنے والوں کو سمجھایا ہے، دلچسپ واقعات اوراور دلنشیں مثالوں کے واسطے سے زندگی کے مسائل اور اس کی الجھنوں کے حل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور ہر ایک مسئلے میں رسول اکرم ﷺ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ارشادات وواقعات کو ذکر کرکے ایمان وعمل کی ایک دنیا

سجادی ہے۔

آج کی زندگی باوجود مادّی وسائل کی ارزانی اوراسباب راحت کی فراوانی کے ہر شخص کے لئے ایک سنگین مسئلہ بنی ہوئی ہے، بے اطمینانی اور پریشانی میں ہر فرد ہچکولے کھارہا ہے، سامان بہت ہیں مگر کون ہے جو کمی کا شاکی نہیں ہے، آج کی زبان میں ہمارا یہ دور ''ٹینشن'' کا دور ہے، اس صورت حال سے سب بے زار ہیں، مگر گھوم پھر کے سب اسی میں رہ جاتے ہیں۔

مصنف نے رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں اس بے اطمینانی اور پریشانی کا حل تلاش کیا ہے، اور ماشاء اللہ وہ اس تلاش میں کامیاب ہیں، انھوں نے بڑی دلسوزی سے اور بڑے خوبصورت پیرائے میں حیات نبوی کے نمونوں کو درج کیا ہے، کہ پڑھنے والا پڑھتا جائے اوراس کی دلچسپی بڑھتی جائے، اگر پڑھنے والا حوصلے سے کام لے، تو اس کی زندگی ایک خوشگوار فضا میں پہونچ جائے! اور ایمان میں بھی تازگی آجائے۔ بیان کا انداز بہت خوبصورت اور دلآویز ہے۔

مترجم نے ترجمہ بھی بہت خوبصورت کیا ہے، ترجمہ ایک مشکل عمل ہے، میرے سامنے اصل کتاب نہیں ہے، لیکن کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم اس مشکل وادی سے بحسن و خوبی گزرے ہیں، اتنی ضخیم کتاب کے ترجمے میں تبصرہ نگار کو اگر کہیں جھول محسوس ہو، تو ہوسکتا ہے، لیکن مجموعی اعتبار سے ترجمہ بہت اچھا اور کامیاب ہے، اور کتاب کے موضوع کے لحاظ سے بہت مناسب ہے۔ البتہ کتاب کے نام کے ترجمے میں خوش مذاقی کی کمی محسوس ہوتی ہے، یہ **استمتع بحیاتک** ٹھیٹ لفظی ترجمہ ہے، اس کے بجائے ''زندگی کو خوشگوار بنایئے'' یا ''خوشگوار زندگی کا راز اسوۂ حسنہ کی روشنی میں'' ہوتا، تو بہتر تھا۔

کتاب وطباعت، کاغذ اور جلد سب عمدہ ہے، مکتبہ الفہیم کو مبارک باد ہے کہ ایسی خوبصورت، مفید اور روح پرور کتاب شائع کی!

ماخذ: ضیاء الاسلام۔ اپریل (۲۰۱۰)

☆☆☆☆☆☆

مقدمات وتقریظات

(۱) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ بحیثیت فقیہ ومجدد
(۲) غیر مقلدیت ۔ جماعت یا فرقہ؟
(۳) تأثر بر ''حیات ابوالمآثر''
(۴) جہاد اور شہادت
(۵) سیرت نبوی کی جامعیت کا ایک درخشاں پہلو
(۶) مقدمہ ''اخلاق نبوی غزوات کے آئینے میں''
(۷) تقریظ بر ''مسجد نبوی میں تراویح عہد بعہد''
(۸) اندلس اور ہندوستان
(۹) مقدمہ ''قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے''
(۱۰) تقریب بر ''تذکرہ مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری''
(۱۱) علماء ومشائخ کے تذکرے کا دینی پہلو
(۱۲) تأثر بر ''اپنی باتیں'' (آپ بیتی مولانا زین العابدین معروفی صاحب نور اللہ مرقدہ)
(۱۳) فیضانِ حکیم الامت
(۱۴) مقدمہ ''تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت''

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ
بحیثیت فقیہ ومجدد

الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا أن ھدانا اللہ ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ من أرسلہ بالحق والھدایۃ وعلیٰ آلہ وأصحابہ وأتباعہ الذین لانقاذ الخلائق عن الضلالۃ والغوایۃ رحمھم اللہ وأکرمھم بالدرجات العلیٰ من الجنان.

نبی آخرالزماں سیّدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت جیسے خیرالامم اورآخرالامم ہے ویسے ہی یہ بہت زرخیز امت ہے، انسانیت کا جو بہتر سے بہتر نمونہ ہوسکتا ہے محبت الٰہی کے اعتبار سے، عبادت خداوندی کے لحاظ سے، اخلاق فاضلہ کے مقامات بلند کے اعتبار سے، ایثارومروت کی حیثیت سے، غرض آدمیت کی ہرخوبی اور ہرکمال کے لحاظ سے، جو بلند سے بلندتر نمونہ ہوسکتا ہے، وہ امت میں بافراط پایا جاتا ہے، ابتدائی دور میں بہت کثرت سے، بعد کے زمانوں میں مقدارتو گھٹی ہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ امت ان نمونوں سے خالی ہوگئی ہو، پوری امت کا خالی ہونا کیا معنی؟ ایسا بھی نہیں ہوا ہے کہ کوئی خاص وقت اور کوئی خاص جگہ ان دلآویزنمونوں سے خالی ہوئی ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادگرامی ہے، راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

مثل أمتی مثل المطر لایدری اولہ خیر أم آخرہ (رواہ الترمذی فی ابواب الامثال) میری امت کی مثال بارش کے مانند ہے، نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اول بہتر

ہے یا آخر!

یہ زبانِ نبوت سے امت کی زرخیزی کا بیان ہے، ہر دور میں امت کا دامن مثالی انسانوں کے روشن نمونوں سے لبریز رہا ہے، ہاں بیش وکم کا فرق ہوا ہے، اور ظاہر ہے کہ زمانۂ نبوت سے جس قدر بُعد ہوگا، زمانہ کی برکت اور انسانوں کی دینی استعداد میں فرق آتا جائے گا، چنانچہ اس کی خبر خود حضور سرور کائنات ﷺ نے دی ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے، راوی اس کے بھی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

لایاتی علیکم زمان إلا والذی بعده أشر منه حتیٰ تلقوا ربکم ۔

تم پر جو بھی وقت آئے گا، اس کے بعد والا اس سے برا ہوگا، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو۔ (کتاب الفتن، حدیث:۷۰۶۸)

مجموعی اعتبار سے زمانۂ نبوت سے بُعد کا یہی قدرتی اثر ہے، مگر اس امت کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ بعض اتنی طاقتور شخصیتوں کو پیدا کرتے ہیں کہ ان کی قوت استعداد بُعد زمانی اور بُعد مکانی کے فاصلوں کو سمیٹ کر فیضان نبوت کو اس طرح جذب کرتی ہے کہ زمانے کا زمانہ ان سے متاثر ہوتا ہے، اور عہد نبوت کی برکتیں ان کے وجود سے پھیل جاتی ہیں، ہر دور اور ہر ملک میں حق تعالیٰ اس طرح کی بابرکت ہستیاں پیدا کرتے ہیں، تاکہ بُعد زمانہ کی وجہ سے اسلامی تعلیمات اور دینی عقائد واعمال پر بدعت وجہالت کے جو خس وخاشاک چھا جاتے ہیں، ان کا صفایا ہو جائے اور دین کے علم وعمل کا آفتاب از سر نو اپنی چمک دمک کے ساتھ روشن ہو جائے

ترجمان غیب ﷺ نے اپنی تعلیمات میں اس کی بھی نشاندہی فرمادی ہے، فرمایا:

إن اللہ یبعث لهذه الامة علیٰ راس کل مأئة سنة من یجدد لها دینها ۔

اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر ایک ایسے شخص کو اٹھائیں گے جو امت کے لئے اس کی دین کی تجدید کرے گا۔ (ابوداؤد شریف، کتاب الملاحم)

سو سال کی مدت میں چار نسلوں کا وجود ہو جاتا ہے۔ اس مدت میں دین کی تعلیمات پر، دینی عقائد واعمال پر نئی نئی بے سروپا باتوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے، چونکہ حق تعالیٰ کو اس دین کی بقا

قیامت تک منظور ہے،اسی لئے اس امت کی بنیادی کتاب قرآن مجید کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری خود خدانے لے رکھی ہے، پس ہر صدی میں ایسی بزرگ ہستی کا وجود امت کی پوری تاریخ میں ملتا ہے، جوان بے سروپا نئی نئی باتوں کے ڈھیر کو صاف کر کے علیٰحدہ کر دیتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے ملک ہندوستان اسلام کے زیر سایہ آیا، یہاں بھی ہر دور میں ایسی طاقتور ہستیاں یکے بعد دیگرے اور کبھی کبھی ایک ہی وقت میں متعدد شخصیتیں رہی ہیں، جنھوں نے دین کے متعدد شعبوں میں تجدیدی کارنامہ انجام دیا۔

مغلیہ حکومت کے عہد زوال میں جہاں مسلمانوں کی حکومت پر گردش آئی، وہیں دینی اعتبار سے عام مسلمانوں پر بھی بڑا زوال آیا۔ بدعات، رسوم ورواج اور جہل وضلالت کا وہ پھیلاؤ اورعروج ہوا کہ دین اسلام کی اصلی شکل وصورت ایک دبیز گہن میں آ گئی، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام کے نام پر اتنی نئی نئی باتیں پھیلیں کہ دین کا حلیہ ہی مسخ ہونے کا ندیشہ ہو گیا تھا۔

اس وقت حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے دہلی میں متعدد بزرگوں کو کھڑا کیا، جن کو حق تعالیٰ نے اسلام کی تجدید کے لئے ذریعہ بنایا، دسویں صدی ہجری کے عظیم مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے خانوادۂ تجدید کی مختلف شاخیں دہلی میں ان نازک حالات میں سرگرم عمل ہوئیں۔ حضرت خواجہ محمد زبیر المتوفی ۱۱۵۹ھ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ حضرت مرزا مظہر جان جاناں المتوفی ۱۱۹۳ھ، یہ وہ حضرات ہیں جن کے انفاس قدسیہ سے دین اسلام کی علمی اور عملی اعتبار سے تجدید ہوتی رہی، ان حضرات کے کارِ تجدید کی تکمیل کرنے والی شخصیتیں، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ، حضرت شاہ غلام علی المتوفی ۱۲۴۰ھ، اور حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۰ھ، سرگرم کار رہے، پھر تیرہویں صدی ہجری میں اسی خانوادے سے تربیت پا کر امیر المومنین حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہ اوران کے خلفاء حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید، حضرت مولانا عبدالحی صاحب، حضرت مولانا شاہ ولایت علی عظیم آبادی المتوفی ۱۲۶۹ھ، اور حضرت مولانا کرامت علی جون پوری المتوفی ۱۲۹۰ھ، کا آوازۂ تجدید بلند ہوا، اور اس تجدید کا دائرہ پورے ملک کو محیط ہوا، صوبہ سرحد سے بنگال کے آخری

کناروں تک اور ہمالیہ کی پہاڑیوں سے مدراس کی جنوبی وادیوں تک اس تجدید کا آوازہ گونجا۔

حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہٗ کی شہادت کے کچھ عرصہ بعد (حضرت سیّد صاحب کی شہادت ۶؍مئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی تھی) ہندوستان میں برطانیہ کا مکمل تسلط ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہندوستان میں ایک عام بغاوت پھیلی، لیکن اس میں اہل ہند کو ناکامی ہوئی، وہ زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بڑا قیامت خیز تھا، علماء ومشائخ کی اتنی بڑی تعداد کو انگریزوں نے جام شہادت پلایا کہ پورا ملک علماء سے خالی ہوگیا، حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہٗ کی تحریک وتجدید سے مسلمانوں میں جو اصلاحات ہوئی تھیں اس قیامت صغریٰ کے بعد جو لوگ ان اصلاحات کو سنبھالنے اور بقا کا اہتمام کرنے والے تھے، ان کی بڑی تعداد دنیا سے رخصت ہوگئی، اور عامۃ المسلمین پر دین کے علم وعمل کے اعتبار سے پھر مردنی چھانے لگی، اِدکا دُکا علماء مختلف علاقوں میں موجود تھے اور احیاء دین کے لئے کوشاں بھی تھے، مگر یہ کاوشیں محدود تھیں، ان کے ذریعے سے اصلاحات کا پیمانہ بھی مختصر تھا، علماء کے اٹھ جانے کی وجہ سے علم بھی ناپید ہونے لگا تھا، اور کسی مذہب کا علم اٹھ جاتا ہے تو اس مذہب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

حق تعالیٰ کا احسان ہے اور بزرگوں کی دعاؤں کی برکت ہے کہ حکمت الٰہی نے ہندوستان کے اس تیرہ وتار دور میں اسلام اور اسلامی عقائد واعمال کے باقی رکھنے کا فیصلہ کیا، وہ لوگ جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد وقتال کا نعرہ بلند کیا تھا، اور ہتھیار لے کر ان کے خلاف صف آراء ہوئے تھے، ان کی بڑی تعداد موت کی نیند سلادی گئی، مگر ان میں سے چند اہم.....بہت ہی اہم.....لوگوں کی قدرت الٰہی نے حفاظت کی۔ سیّدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (رحمہم اللہ ورضی عنہم) اس جہاد کے بڑے داعیوں میں تھے، یہ حضرات جہاد وقتال کی قیادت کررہے تھے، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب علیہ الرحمہ کی شہادت کے بعد جب انگریزوں کا غلبہ ہر طرف چھانے لگا، تو یہ تینوں بزرگ بھی دارو گیر کی زد میں آئے، مگر اللہ نے غیب سے حفاظت فرمائی، حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمہ نے تو ہجرت کرکے مرکز اسلام مکہ معظّمہ زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً میں اقامت اختیار کرلی، ان کے ساتھ ان کے دونوں بزرگ

خلفاء بھی ہجرت کرنا چاہتے تھے، مگر حکمت خداوندی کا جلوہ غالباً حضرت حاجی صاحب پر منکشف ہو چکا تھا، انھوں نے ان دونوں حضرات کو یہیں ہندوستان میں رہنے کی تلقین کی، وہ شاید دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی مسلمان علم کی کمی کی وجہ سے گمرہی کے دلدل میں پھنس جائیں گے، اس سے بچانے کے لئے طاقتور، صاحب علم اور صاحب نسبت شخصیات کی ضرورت ہے، وہ محسوس کررہے تھے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ دونوں ہمدم ورفیق بہت موزوں ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں بزرگ یعنی مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ یہیں رہ پڑے، انگریزوں کی طرف سے دونوں کی تلاش جاری رہی، حضرت گنگوہی گرفتار کر لئے گئے، چھ ماہ جیل میں وقت بسر کیا، حضرت نانوتوی ان کے ہاتھ نہ آسکے، پھر انتقام کی آگ سرد پڑی تو دونوں بزرگوں نے الگ الگ محاذ سنبھالا اور ایک محاذ پر دونوں رفیق وہمدم ودمساز رہے۔

حضرت نانوتوی نے خارجی محاذ سنبھالا، یعنی اسلام کے خلاف باہر سے طوفان کا جو ریلا حملہ آور ہوا، حضرت نانوتوی اس کے مقابلے میں ناقابل تسخیر آہنی دیوار بن گئے، مسلمانوں کی حکومت کا آخری چراغ گل ہونا تھا کہ گمراہوں اور گمراہ کنندوں کی ٹولیاں حشرات الارض کی طرح پھیلنے لگیں، عیسائی پادریوں کا ریلا یورپ سے چلا، آریہ سماجی یہیں کی زمین سے ابلے، پھر اہل اسلام ہی کے درمیان سے متعدد فرقے ابھارے گئے۔ حضرت نانوتوی نے باہر کے ان حملوں کا کامیاب مقابلہ کیا، لیکن مولانا نے محسوس کیا کہ ان گمراہیوں اور جہالتوں کا سدباب علم دین کی روشنی سے ہوسکتا ہے، چنانچہ حضرت نانوتوی نے اس ہنگامۂ داروگیر کے نودس سال بعد علوم اسلامی کا ناقابل تسخیر قلعہ دیوبند میں تعمیر کرنا شروع کیا، اس محاذ پر دونوں بزرگوار ساتھ رہے۔ دارالعلوم دیوبند کی شکل میں نور کا جو عظیم الشان مینار دیوبند میں تعمیر ہوا، آج ڈیڑھ صدی ہونے کو آئی، اب اس کا کارنامہ محتاجِ تعارف نہیں، تمام اسلامی دنیا اس سے اخذِ نور کررہی ہے۔

حضرت گنگوہی نے داخلی محاذ کو اپنا میدان عمل بنایا، داخلی محاذ کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام کی صحیح خطوط پر تربیت، عقائد کی تصحیح، اعمال کی درستگی، قلوب کی سلامتی اور روحانیت کی پرورش! دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ حدیث جبرئیل میں جن باتوں کی یکجائی تعلیم دی گئی ہے، ان میں سے ہر ایک کو مسلمانوں میں زندہ کرنا، یہ تھا حضرت گنگوہی کا مشن! حضرت نانوتوی تو

اپنے محاذ پر کامیابی حاصل کر کے اور اس محاذ پر کام کرنے کے لئے ایک پختہ کار جماعت تیار کر کے تیرہویں صدی ہجری کے خاتمہ سے چند سال پہلے ہی حضورِ حق میں بلا لئے گئے، حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ چودھویں صدی کے تقریباً چوتھائی حصہ میں سرگرم عمل رہے۔

حضرت گنگوہی کے کارناموں کی قدرے تفصیل سے پہلے میں حدیث جبرئیل کو تحریر کر دینا چاہتا ہوں، جس کا ذکر حضرت گنگوہی کے میدانِ عمل کے سرنامے کے طور پر کیا گیا ہے۔

یہ مسلم شریف کی پہلی حدیث ہے، راوی اس کے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما ہیں، روایت کا حاصل یہ ہے کہ:

''ایک روز ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، اسی دوران ایک صاحب مجلس مبارک میں آئے، کپڑے ان کے بہت صاف شفاف اور بال نہایت سیاہ تھے، ان کے اوپر سفر کا کوئی اثر نہ تھا، لیکن ہم میں سے کوئی انھیں پہچانتا نہ تھا، وہ نبی ﷺ کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے، اور اپنے ہاتھ اپنے زانو پر رکھ لئے، اور عرض کیا:

اے محمد! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے کہ وہ کیا ہے؟

فرمایا: اسلام یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت کی، اور محمد کے رسول ہونے کی شہادت دو، اور نماز کا اہتمام کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو، اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا!

ہمیں حیرت ہوئی کہ یہ صاحب پوچھ بھی رہے ہیں اور تصدیق بھی کر رہے ہیں۔

پھر عرض کیا: ایمان کے بارے میں بتائیے کہ وہ کیا ہے؟

فرمایا: ایمان یہ ہے کہ اللہ پر یقین کرو، اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخر پر، اور تقدیر پر وہ خیر ہو یا شر، یقین کرو۔

عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا، اچھا احسان کے متعلق بتائیے کہ وہ کیا ہے؟

فرمایا: اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

عرض کیا: قیامت کے متعلق خبر دیجئے، کہ وہ کب آئے گی؟

فرمایا: جس سے یہ بات پوچھی جارہی ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔
عرض کیا: اچھا اس کی کچھ علامتیں ہی بتادیجئے!
فرمایا: (۱) جب باندی اپنی مالکہ کو جنے۔ (۲) اور جب دیکھو کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن مفلس اور بکریوں کے چرواہے لمبی لمبی عمارتیں بنانے لگیں۔
پھر وہ صاحب چلے گئے، پھر عرصے کے بعد حضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عمر! تمہیں کچھ پتہ ہے کہ یہ پوچھنے والے کون صاحب تھے؟۔
میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔
فرمایا: وہ جبرئیل تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مومن کے لئے دین اسلام کی تکمیل کا انحصار تین باتوں پر ہے، ان تینوں کے رسوخ اور پختگی سے آدمی کا دین کامل ہوتا ہے۔
(۱) اسلام: یعنی توحید ورسالت کا اقرار اور اس کی شہادت، اور چاروں فرائض کا اہتمام، یہ پانچوں چیزیں اسلام کی بنیاد ہیں۔ دین کا ظہور آدمی پر انھیں پانچ باتوں سے ہوتا ہے۔
(۲) ایمان: یعنی باتوں کی تصدیق اور دل سے ان کا یقین! اللہ کی ذات کا، فرشتوں کا، کتب الٰہیہ کا، اللہ کے رسولوں کا، روزِ قیامت اور تقدیر کا یقین اور ان کی تصدیق۔
(۳) احسان: یعنی عبادت اور بندگی کی یہ کیفیت کہ خود کو ہمہ وقت حق تعالیٰ کے حضور میں محسوس کرے
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ نے دین کے ان تینوں شعبوں کی خدمت کے لئے خود کو وقف کیا، اور زندگی کی آخری سانس تک اسی نہج پر مسلمانوں کی تربیت کا بڑے وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر اہتمام کرتے رہے۔
اس فریضے کی ادائیگی کے لئے ظاہر ہے کہ علم میں رسوخ، عمل میں پختگی، نسبت مع اللہ یعنی کیفیت احسانی میں استقامت، اور ان سب کے ساتھ عقل ورائے کی اصابت اور کامل درجے کی ہمت وشجاعت کا جامع ہونا شرط ہے۔
توفیق خداوندی سے جو ان سب باتوں کا جامع ہوگا، اس سے تجدید دین کا کام خوب ہوگا۔ ہم جب مولانا کے حالاتِ زندگی دیکھتے ہیں، تو ان میں یہ سب اوصاف بدرجۂ کمال نظر

آتے ہیں۔

علم میں رسوخ کا مدار تین چیزوں پر ہے،قرآن کریم کی صحیح سمجھ،سنت کا وسیع اور پختہ علم اورقرآن وسنت سے استنباط واستخراج کا ملکہ،یعنی علم فقہ میں مہارت۔ان تینوں باتوں کو اگر ہم مختصراور بلیغ تعبیر میں ادا کرنا چاہیں تو حدیث کی زبان میں اسے تفقہ فی الدین کہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: **من یرد اللہ بہ خیراً یفقهه فی الدین۔**

اللہ تعالیٰ کو جس شخص کے ساتھ خیر منظور ہوتا ہے اسے دین کے اندر فہم عطا فرماتے ہیں

دین کی یہ سمجھ، دین کے تمام اموراوراحکام کو عام ہے،خواہ وہ عقائد ہوں،اعمال ظاہرہ ہوں یا اعمال باطنہ ہوں۔اعمال ظاہرہ کے متعلق احکام وقوانین کی تعبیر اصطلاح میں ''علم فقہ'' سے کی جاتی ہے،اوراعمال باطنہ کی درستگی اوران کے اصلاح کے طریقوں کو ''تصوف وسلوک'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ علم کے ان تینوں شعبوں کے امام تھے،دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ انھیں کمال درجہ ''تفقہ فی الدین'' حاصل تھا۔حضرت کا یہ ''تفقہ فی الدین'' ہندوستان کی امت مسلمہ کے لئے حق تعالیٰ کا خصوصی عطیہ تھا۔جہالت اور بدعت کی گھنیری تاریکی میں حضرت نے اسی کی مدد سے قرآن وسنت کی وہ شمع روشن کی،جس کا نور آپ کے فتاویٰ، تصنیفات،تلامذہ وخلفاءاوردارالعلوم دیوبند کے واسطے سے پورے ملک میں پھیلا۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کی شکست کے بعد ۶/۵ رسال تک ہنگامۂ داروگیر چلتا رہا، اس کے بعد جب حکومت برطانیہ کا قدم مضبوطی سے یہاں جم گیا،اور ہندوستان میں بچے کھچے علماء ومشائخ نے محسوس کیا کہ اب حرب وضرب کے بجائے اہل اسلام کواوران کے دین کواور تعلیمات دین کو بچانا ضروری ہے،تو ہمارے حضرات نے میدانِ عمل بدل دیا۔۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیوبند کا قیام ہوا،اس وقت سے حضرت گنگوہیؒ کی وفات ۱۹۰۵ء تک ایک خاصا عرصہ میسر آیا،جس میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے اپنے رفقاءاورخلفاءوتلامذہ کی رفاقت میں دین کے عملی وعلمی اورروحانی میدان میں تجدیدی کارنامے انجام دیئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ تو زمانۂ طالب علمی سے رفیق تھے،

یہ دونوں بزرگ ایک جان دو قالب تھے، دونوں نے ایک ہی بزرگ حضرت مولانا مملوک العلی علیہ الرحمہ کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی، پھر ایک ہی استاذ و شیخ حضرت شاہ عبد الغنی مجددی المتوفی ۱۲۹۶ھ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، پھر دونوں ایک ہی بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ المتوفی ۱۳۱۷ھ سے بیعت ہوئے، اور انھیں سے خلافت پائی، دونوں ۱۸۵۷ء کے جہاد، شاملی میں دوش بدوش رہے، دار العلوم دیوبند کے قیام میں دونوں ہمدم و رفیق رہے۔ تیرہ چودہ سال حضرت نانوتویؒ کی سرپرستی ونگرانی میں مدرسہ رہا، اور پشت پناہی و رفاقت حضرت گنگوہی کی رہی۔ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں حضرت نانوتویؒ کا وصال ہو گیا، تو اب یہ پورا بوجھ حضرت گنگوہی پر آ گیا۔ ۲۵/۲۶ سال تک حضرت گنگوہیؒ دار العلوم دیوبند کے سرپرست رہے، اسی کے ساتھ علوم دینیہ کے دوسرے مرکز جامعہ مظاہر علوم سہارن پور کے بھی سرپرست رہے، خود گنگوہ میں درس وتدریس کی بساط بچھائے رکھی، باصلاحیت افراد واشخاص کی روحانی تربیت فرماتے رہے، اس عرصے میں انھوں نے علم وعمل اور روحانیت کے وہ بلند مینار اور نمونے قائم کر دئے کہ دین ودیانت کی تازہ لہریں پورے ملک میں چلنے لگیں۔

کسی نے کہا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

سر سے قدم تک جہاں بھی نظر پڑتی ہے، ہر جلوہ دامن دل کو کھینچتا ہے، کہ جگہ تو یہ ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے فتاویٰ کا ایک حصہ بہت پہلے شائع ہوا تھا، لیکن چونکہ حضرت گنگوہیؒ اپنے دور میں فتاویٰ کے لئے پورے ملک کے مرجع اور مرکز تھے، اس لئے فتاویٰ کی ایک بڑی تعداد غیر مطبوعہ رہ گئی، اللہ نے اپنے ایک باتوفیق بندے کو توفیق مزید بخشی کہ ان باقی غیر مطبوعہ فتاویٰ کو بھی تلاش کر کے اکٹھا کرے، یہ ایک مشکل کام تھا، بہت محنت اور بہت دیدہ ریزی چاہتا ہے، مگر جس کے لئے وہ قادر مطلق آسان کر دیں۔

اللہ کا ایک اور بندہ جو عاجز وقاصر ہے، بڑی دیر سے سوچ رہا ہے، کہ ان فتاویٰ کی روشنی میں حضرت گنگوہی کے تفقہ فی الدین کو جانے پہچانے اور دوسرے کو پہچنوانے کی کوشش کرے، مگر جب ان کی شخصیت پر نگاہ پڑتی ہے تو جمال وکمال کے اتنے مظاہر نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں

کہ کرشمہ دامن دل می کشد کی جا اینجاست

کئی صفحات آپ پڑھ چکے ہیں، مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں لکھ سکا ہوں، حضرت گنگوہیؒ کے تفقہ فی الدین کا تعارف مجھ جیسے قلیل البضاعت کی دسترس سے باہر ہے، اس کمال کے تعارف کے لئے ایک نابغۂ روزگار محدث وفقیہ اور عبقری شخصیت حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری کا ارشاد نقل کرتا ہوں۔

مشہور مصری عالم علامہ سید رشید رضا علیہ الرحمہ ۱۳۳۰ھ میں دار العلوم دیوبند تشریف لائے، ان کی آمد کی تقریب سے دار العلوم میں ایک علمی جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ میں حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ نے دار العلوم کے درس حدیث کی خصوصیات، فقہ الحدیث کے اہتمام کا تعارف بہت عمدہ پیرائے میں کرایا تھا، اس ضمن میں سلسلۂ حدیث کے اکابر اساتذہ کا تذکرہ بھی فرمایا۔ فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ عبد الغنی مجددی علیہ الرحمہ سے، شمس الاسلام والمسلمین، عارف باللہ، حافظ محقق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیٔ دار العلوم دیوبند، اور فقیہ، حافظ، مجتہد، ولی کامل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت نانوتوی نے معارف وحقائق میں نیز مادہ پرستوں اور دہریوں کے خلاف محققانہ کتابیں تحریر فرمائیں، جن سے حق تعالیٰ نے بہت نفع پہونچایا۔

اور حضرت گنگوہی کی خدمت میں بکثرت استفتاء اور سوالات آتے رہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ حق وباطل میں بہت التباس واشتباہ ہوگیا تھا، حضرت نے ان مسائل کے صحیح جواب دئے، وہ فقیہ تھے، مجتہد تھے، پس اصول میں ہم نے حضرت نانوتوی کو اپنا امام اور پیشوا مانا، اور فروع میں حضرت گنگوہیؒ کو اپنا امام ومقتدا قرار دیا، اور ان دونوں بزرگوں سے نہایت صاف ستھرا علم ہمیں نصیب ہوا۔ (نفحة العنبر، ص:۱۷)

حضرت شاہ صاحب نے حضرت گنگوہی کی شان میں بزبان عربی ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فقیہ حافظ علم شهیر   کصبح مستنیر هدی سار

الیه المنتهی حفظاً وفقهاً   واضحی فی الروایة کالمدار

ففی التحدیث رحلة کل راوٍ وفی الاخبار عمدة کل قاری
فقیه النفس مجتهد مطاع وکوثر علمه بالخیر جاری
واحییٰ سنة کانت أمیتت وإذ وضح النهار فلاتمار
(نفحة العنبر ،ص:۱۷۳)

وہ فقیہ ہیں، حافظ ہیں، مشہورنشان ہیں جیسے روشن صبح، جومسافروں کے حق میں رہنما ہے۔حفظ (حدیث) میں اور فقہ میں وہ انتہائی مقام پر ہیں، اور روایت میں وہ مثل مدار کے ہیں۔علم حدیث میں وہ ہرراوی کی منزل ہیں،اوراخبار وآثار میں ہرقاری کا مدارانھیں پر ہے۔وہ فقیہ النفس ہیں، مجتہد ہیں، مقتدا ہیں، ان کے علم کا حوض کوثر خیر کے ساتھ جاری ہے۔انھوں نے مردہ سنت کوزندہ کیاجب دن واضح ہوجائے ،توجھگڑا نہ کرو۔

یہ بات وہ کہہ رہا ہے جواپنے دور کا مسلم محدث کبیر ہے،جس کا حافظہ متقدمین علماء حدیث کے حافظے کی یادتازہ کررہا تھا،اورجس کی ذکاوت وذہانت کااعتراف اکابرواصاغرسب نے کیا۔

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے بارے میں اور باتوں کے ساتھ دوباتیں حضرت شاہ صاحب نے خاص طور پر جو بیان فرمائی ہیں،وہ یہ کہ ’’فقیہ النفس‘‘ تھے،اور یہ کہ وہ ’’مجتہد‘‘ تھے۔

فقیہ النفس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی توفیق سے ان کی علمی وعقلی صلاحیت واستعداد تفقہ فی الدین کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی،قرآن سنت پر ان کی نظر کی وسعت اور ادراک کی گیرائی کی وجہ سے انھیں دینی علوم میں وہ ملکہ اور رسوخ حاصل ہوگیا تھا کہ کسی بھی واقعہ اورکسی بھی مسئلہ میں ابتداء ہی سے ان کی نظرصحیح فیصلہ پر پہونچتی تھی، بعد میں تحقیق کرنے والے جتنی بھی تحقیق کریں، کتابوں کی مراجعت کریں،صحت وصواب کا مرکز وہی رائے ہوتی ہےجس کی طرف اول مرتبہ میں حضرت کی نگاہ پہونچی ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ کسی مسئلے میں علماء کی رائیں اورتحقیقات مختلف ہوتیں،اورکوئی کسی کی رائے پر متفق نہ ہوتا، پھراس کا فیصلہ حضرت کی خدمت میں لایا جاتا، پھرآپ مسئلہ کی حقیقت تک پہونچ کراس کواس طرح واضح فرماتے کہ سب مطمئن ہوجاتے،آپ کا ذہن ثاقب مسئلہ کی تہ میں

پہونچتا، بڑے بڑے علماء اپنے اشکالات پیس کرتے اور اس کا مکمل حل انھیں مل جاتا۔ تذکرۃ الرشید میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب علیہ الرحمہ کے متعدد دقیق سوالات نقل کئے گئے ہیں، ان کے جوابات کے پڑھنے سے اندزہ ہوتا ہے کہ حضرت واقعی مجتہدانہ دل ودماغ رکھتے تھے۔

مجھے یہاں مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ حضرت کے فتاویٰ قارئین کے سامنے ہیں، ہر فتویٰ حضرت اقدس کے فقیہ النفس اور مجتہد ہونے کی شہادت ہے۔

جس دور میں حضرت کے درس وتدریس اور افتاء وتفقہ کا آغاز ہوا، پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ وہ دور ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ہے، اس دور میں علم کا چراغ ٹمٹمارہا تھا۔ دور دور تک علماء کا نام ونشان نہ تھا، سنت کی جگہ بدعت کا غلغلہ تھا۔ مغلیہ حکومت کے زوال میں رافضیوں کا اچھا خاسا دخل تھا، چنانچہ شیعیت کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، پنجاب سے بنگال تک ہر طرف شیعوں کا عمل دخل تھا، بالخصوص نوابانِ اودھ کی وجہ سے پورا اتر پردیش رافضیت کی زد میں تھا۔ جہالت اور رافضیت کی ملی بھگت نے اہل سنت والجماعت میں بھی طرح طرح کی بدعات اور رسوم کو پیدا کررکھا تھا، اس وقت کی بہت سی بدعات وخرافات کو آج لوگ جانتے بھی نہیں، لیکن اس دور میں وہ سب ایمان واسلام کے اجزاء ہی نہیں، مدار کار انھیں پر تھا۔

ماہ محرم کی بدعات شیعوں کے یہاں سے متعدی ہوکر سنیوں میں بھی اس طرح پیوست ہوگئی تھیں کہ اس ماہ میں پورا مسلم معاشرہ وقف تعزیہ وماتم ہوجاتا تھا، قلوب واذہان میں ان خرافات کا ایسا رسوخ تھا کہ ان کے خلاف زبان کھولنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ شادی غمی کے مواقع پر بدعات ورسوم کا وہ لامتناہی سلسلہ ہوتا، کہ دین اسلام کا نقشہ ہی بدل جاتا، نمازیں نہ ہوں، مسجدیں ویران ہوں، روزہ کی کوئی پوچھ نہ ہو، کچھ حرج نہیں، لیکن تیجہ، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی، نیاز فاتحہ گیارہویں، ماہ رجب کے کونڈے، شب برأت کے حلوے پٹاخے، عرس، قوالی، مولود، قیام وغیرہ جن کا قرآن وحدیث میں، فقہ کی کتابوں میں، قرون اولیٰ کے اسلامی معاشرہ میں کہیں پتہ نہیں، وہ سب جزو ایمان اور مدار حقانیت بنے ہوئے تھے، ان کے خلاف آواز اٹھانا، اپنے آپ کو مصائب اور تہمتوں کا نشانہ بنانا تھا۔

اور عقائد کے بگاڑ کا یہ حال تھا کہ ہر پختہ قبر میں دفن ہونے والا....خواہ کوئی بھی ہو....

بندگی اور غلامی سے بلند ہو کر خدائی اختیارات کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہما الرحمہ کے اختیارات وتصرفات تو ان کے خالق و مالک سے بھی آگے بڑھادئے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات وصفات میں اتنا غلو کیا گیا تھا جس کا کنارہ ملنا مشکل تھا۔ ایسے وقت میں دین اسلام کی اصل تعلیمات کو ان کی اصل شکل میں لانا، بدعات کے خلاف آواز اٹھانا، سنتوں کو زندہ کرنا جہاں بہت شجاعت وہمت کو چاہتا ہے، وہیں تفقہ فی الدین بدرجۂ اتم کا متقاضی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے قلب مبارک میں حق تعالیٰ نے احیاء سنت اور قطع بدعت کا وہ جذبۂ وجوش بھر دیا تھا، اور اس کی ایسی شناخت عطا فرمائی تھی کہ کوئی بدعت اپنا روپ بدل کر سنت یا مستحب کے رنگ میں نہیں آسکتی تھی، لوگ مختلف انداز سے، مختلف اطراف سے، مختلف لوگوں کے فتاویٰ اور تحریرات کی روشنی میں سوالات کرتے تھے، مگر حضرت کی نگاہِ عالمانہ اور فراستِ مومنانہ ہر ایک عقیدہ وعمل کی وہ حیثیت متعین کر دیتی تھی جو قرآن وسنت کی روشنی میں واقعی ہوتی تھی، اور اس میں کسی مداہنت کا گزر نہ تھا۔ چاہے جتنی مخالفت ہو، خواہ کوئی تہمت لگے، مگر جو حق تھا، جو صداقت تھی، اس سے کبھی سر مو نہیں ہٹے۔

اس دور کا جہاد یہ تھا کہ دین اسلام اور سنت رسول اللہ ﷺ کے صاف ستھرے اور روشن چہرے پر بدعتوں اور جہالتوں کے جو گرد وغبار چھا گئے تھے، انھیں صاف کیا جائے، بعض بدعتوں بلکہ اکثر بدعتوں نے ایسے تقدس کا رنگ اختیار کر لیا تھا کہ شاید کسی کو وہم بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ بھی کچھ غیر شرعی چیزیں ہیں، جیسے مولود خوانی جس میں نبی کریم ﷺ کی ولادت کا ذکر نثر ونظم میں کیا جاتا تھا، اور اس کے لئے بڑے اہتمام سے مجلس سجائی جاتی تھی، روشنی کا اور خوشبو کا التزام واہتمام ہوتا، اہل مجلس کو شیرینی تقسیم کی جاتی۔ اس مجلس کے تقدس کا ایسا عقیدہ دلوں میں جما دیا گیا تھا کہ بہ نفس نفیس حضرت رسالت مآب ﷺ اس میں تشریف لاتے ہیں، اسی لئے اس میں کھڑا ہونا اور بہت ادب واحترام سے ایک مخصوص سلام پڑھنا ضروری تھا۔ پھر یہ نہیں کہ اس کا رواج صرف ہندوستان میں رہا ہو، مرکز اسلام سرزمین عرب اور خلافت اسلامیہ ترکی وقسطنطنیہ میں بھی اس کا برملا رواج تھا۔ خاص خاص علماء اپنی خصوصی مجالس اور خصوصی تحریروں میں اس کے بدعت ہونے

کا اعتراف کرتے تھے، مگر کھلے طور پر عوام میں اس کی نکیر کرنے اور دلوں میں جمی ہوئی عقیدت کو نکالنے کا حوصلہ حضرت گنگوہی ہی کو ہوا۔ ان کے فتاوے جب اس موضوع پر آنے لگے تو عوام میں غل مچ گیا، لیکن حضرت کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ ان کے فتویٰ کو کوئی ہلکا سمجھتا، بہر حال بدعت کے ماحول میں ایک زلزلہ سا آ گیا، خود وہ لوگ جو حضرت کے قریبی، بلکہ حضرت کے پیر بھائی تھے، انھوں نے مخالفت پر کمر کسی، گنگوہ کی قریبی آبادی رام پور، جو چند پشت پہلے حضرت کے آباء واجداد کا وطن تھا، وہاں کے ایک صاحب علم مولوی عبد السمیع صاحب جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی علیہ الرحمہ سے بیعت تھے، وہ ان بدعات کی حمایت میں کمر باندھ کر کھڑے ہوئے، اور ''انوار ساطعہ'' کے نام سے بدعات کی اتنی زبردست وکالت کی، کہ اس وقت کی رائج الوقت ہر بدعت سکہ بند کارِ ثواب بن گئی۔ حضرت گنگوہیؒ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ سے اپنی نگرانی میں اور اپنی منشا کے مطابق اس کا جوابِ قاطع ''براہین قاطعہ'' کے نام سے لکھوایا، اور کتاب چھپی تو صرف جواب نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ انوار ساطعہ کو بھی اس میں شامل رکھا، تا کہ اصل بات اور اس کا جواب دونوں بیک وقت سامنے آ جائے۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو ایوانِ بدعت میں بھونچال آ گیا۔ مخالفت، بدزبانی، تہمت طرازی سے بات آگے کفر سازی تک بڑھ گئی، مگر وہ ایک کوہِ استقلال تھا، عزم وشجاعت کا پہاڑ تھا، تفقہ فی الدین کا سرمایہ دار تھا، مخالفت کے طوفان آتے تھے، مگر علم اور عزیمت کی اس چٹان سے ٹکرا کر واپس چلے جاتے تھے۔

تاریخ علمائے حق کے عینی شاہد اور معتبر راوی حضرت امیر شاہ خاں فرماتے ہیں کہ:

''مولانا گنگوہی کی طبیعت علیل تھی، میں آپ کے پاس اکیلا تھا اور پاؤں دبا رہا تھا، یہ زمانہ وہ تھا، جس میں براہین قاطعہ شائع ہوئی تھی، اور اس پر لوگوں کی شورش ہو رہی تھی، حضرت نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ تخت پر جلوہ افروز ہیں، اور مجھے سامنے کھڑا کیا ہے، اور مجھ سے امتحاناً سو مسئلے دریافت کئے، اور سو کے سو کا میں نے جواب دیدیا ہے، اور آپ نے سب کی تصویب فرمائی، اور نہایت مسرور ہوئے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس روز سے میں نہایت خوش ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ اگر سارے عالم میرے خلاف ہوں گے تو بھی

ان شاءاللہ حق میری جانب ہوگا‘‘۔(امیر الروایات)

یہ خواب مبشرات میں سے ہے،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کوتفقہ فی الدین کا کیا مقام حاصل تھا۔حضرت کے فتاوے اورتحریرات بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئے ، ان امور کا بدعت ہونا ایسا واضح ہوا،اورسنت وشریعت کا جلوہ اتنا بے غبار ہوا کہ آج ان دونوں میں فرق و امتیاز کرنا ذرا بھی مشکل نہیں۔

عقائدحقہ اوراعمال مسنونہ کے مقابلے میں جتنے عقائد باطلہ اوراعمال بدعیہ کا رواج ہوا تھا،حضرت گنگوہیؒ کے تفقہ اورعزیمت وشجاعت کی بدولت سب علیٰحدہ علیٰحدہ ہوگئے،اور **جاء الحق وزهق الباطل** کاوعدہ پورا ہوا۔

حضرت نے اس کتاب میں بدعت کے تمام اصول واضح کردئے ہیں،آج بھی اگر کوئی اسے بغور پڑھے تو تمام رائج الوقت اعمال وتحریکات میں بدعت وسنت کا بخوبی ادراک کرسکتا ہے۔

بدعت وسنت کی توضیح وتنقیح میں حضرت کی تحریرات متعدد ہیں،براہین قاطعہ میں تو سب کا تفصیلی بیان ہے،اس کے علاوہ فتاویٰ کی شکل میں آپ خود اسی مجموعۂ فتاویٰ میں ملاحظہ کریں گے، نیز اس موضوع پر بہت بیش قیمت اور پُر مغز وہ مکاتیب ہیں جو حضرت اقدس حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے سوالات کے جواب میں لکھے گئے ہیں، ابتداء میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ مجالس مولود کے بارے میں نرم رائے رکھتے تھے،اوران میں شریک ہوتے تھے،حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے اس پرنکیر فرمائی،تو اس موضوع پر بہت علمی مراسلت دونوں بزرگوں کے درمیان ہوئی ،حضرت تھانوی کے عالمانہ اشکالات اور دقیق سوالات کے حضرت گنگوہیؒ نے جوبصیرت افروز جوابات تحریرفرمائے ،وہ ان کے فقیہ النفس اور مجتہد ہونے کی روشن دلیل ہے۔

یہ مکاتبت’’تذکرۃ الرشید‘‘میں من وعن محفوظ کردی گئی ہے، واقعہ یہ ہے، کہ اگراس دور میں سنت وبدعت کے مسئلہ کی حضرت گنگوہی نے اس درجہ توضیح وتنقیح نہ کردی ہوتی ،تو آج دونوں کے درمیان خط فاصل کھینچنا مشکل ہوتا۔حضرت گنگوہی کے انتقال کوسوسال سے زیادہ

عرصہ گزر گیا ہے، اب پھر شریعت وسنت پر بدعات کی یلغار ہو چلی ہے، لیکن آج بھی اگر کوئی اس مسئلے کو وضاحت اور تنقیح وتحقیق کے ساتھ سمجھنا اور بدعت کو سنت سے الگ کرنا چاہے تو حضرت کے مضامین ومقالات میں مکمل رہنمائی موجود ہے، بشرطیکہ دیانت داری کے ساتھ ان اصول وقواعد کی روشنی میں رائج الوقت رسوم اور طریقوں کا جائزہ کماحقہ لیا جائے۔

تفقہ فی الدین کے ساتھ حضرت مولانا گنگوہی نے اپنے حلقۂ بیعت ودرس میں ایسے علماء اور مشائخ کی تربیت فرمائی، جو حضرت کے بعد دین اسلام اور سنت وشریعت کے محافظ ثابت ہوئے، ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے بڑے بڑے علماء دین، جو علمی تبحر اور جودت عقل وذہن کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے، وہ حضرت گنگوہی کی تربیت میں اپنے اوصاف وخصائص کو دین کی حفاظت، اس کی ترویج واشاعت اور اللہ ورسول کی محبت میں فنا کرنے کا ہنر سیکھ رہے تھے، اس وقت تعلیم دین کے دو مراکز دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور، حضرت کے ساختہ پرداختہ حضرات کے مرکز تھے، پھر وہاں سے سارے ہندوستان میں علم وعمل کی روشنی پھیل رہی تھی، اور آج بھی جہاں حق وصداقت اور سنت وشریعت کا جلوہ ہے، وہ انھیں دونوں اداروں کا فیض ہے، اور یہ دونوں ادارے پورے طور پر حضرت گنگوہی کے زیر اثر رہے ہیں۔

میں ان بزرگوں کے تذکروں کی تفصیل میں نہیں جاتا، جو حضرت گنگوہیؒ کے دائرۂ تربیت میں آفتاب وماہتاب بنے ہیں، یہ بہت طویل الذیل موضوع ہے، جس کا یہ مختصر سا مضمون متحمل نہیں ہے، میں نے صرف اشارے کر دئے ہیں، تفصیلات سے اہل علم ونظر واقف ہیں۔

آخر میں اس مضمون کا خاتمہ میں حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے ان جامع، بلیغ اور مبنی برحقیقت کلمات پر کرتا ہوں، جو انھوں نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا سیّد عبدالحی صاحب علیہ الرحمہ کی تصنیف نزھة الخواطر کی کے تکملہ میں تحریر فرمائے ہیں، خیال رہے کہ مولانا سیّد عبدالحی صاحب ۱۳۱۲ھ میں حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور بغایت متاثر ہوئے تھے، حضرت مولانا علی میاں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے والد کی لفظ بلفظ ترجمانی ہے۔

’’وکان آیة باھرة ونعمة ظاھرة فی التقویٰ واتباع السنة النبویة

والعمل بالعزيمة والاستقامة على الشريعة ورفض البدع ومحدثات الامور ومحاربتها بكل طريق والحرص علىٰ نشر السنة وإعلاء شعائر الاسلام والصدع بالحق وبيان الحكم الشرعي.

ثم لايبالي بما يتقاول فيه الناس ولا يقبل تحريفاً ولايتحمل منكراً ولايعرف المحاباة والمداهنة في الدين مع ماطبعه من التواضع والرفق واللين دائراً مع الحق حيث ما دار ويرجع عن قوله إذا تبين له الصواب ،

انتهت إليه الامامة في العلم والعمل ورئاسة تربية المريدين وتزكية النفوس والدعاء إلى الله واحياء السنة إماتة البدع ''(الاعلام بمن في تاريخ الهند من الاعلام ،المعروف به نزهة الخواطر ،ج:۸،ص:)

وہ ورع وتقویٰ میں ،اتباع سنت میں ،عزیمت پرعمل کرنے میں ،شریعت پر استقامت میں ، بدعات وخرافات کے ردوانکاراوران کے خلاف کھلی جنگ میں ،سنت کی نشر وترویج میں ، اسلامی شعائر کے اعلاء واظہار میں ،حق وصداقت کے برملا اعلان میں اور حکم شرعی کے واضح بیان کے اہتمام میں ایک روشن نشان اور حق تعالیٰ کے عظیم احسان تھے۔

وہ حق وصداقت کے اظہار کے بعد لوگوں کے کچھ کہنے سننے کی کچھ پروانہ کرتے تھے ،ان کے یہاں نہ کسی تحریف کا گزر تھا ، نہ انھیں کوئی منکر گوارا تھا ، وہ دین کے باب میں جانبداری اور مداہنت جانتے ہی نہ تھے ،اوراس کے ساتھ ساتھ وہ طبعاً نہایت متواضع ،خوش مزاج اورنرم دل تھے حق کے ساتھ رہتے ، جدھر بھی وہ ہوتا ، اگر ان کی رائے کے خلاف درستگی ظاہر ہوتی ،تو فوراً رجوع کر لیتے ۔

علم وعمل میں ،مریدین کی تربیت اورنفوس کے تزکیہ ،دعوت الی اللہ ،احیاء سنت اور قطع بدعت میں امامت کا درجہ.....ان کے زمانے میں.....انھیں پرختم تھا ''

اعجاز احمد اعظمی

۲۲ رمحرم الحرام ۱۴۳۱ھ/ ۹ رجنوری ۲۰۱۰ء شنبہ

☆☆☆☆☆☆

غیر مقلد۔ جماعت یا فرقہ؟

(مقدمہ ''احسن التنقیح'')

انسانی دنیا میں اختلافات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی، اگر کوئی مؤرخ انسانی اختلافات کی جستجو میں نکلے تو یہ تلاش اسے انسان کے بالکل ابتدائی عہد تک پہونچا کر چھوڑے گی، اختلاف کی کہانی اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک خانہ میں ہم انسان کے ان فطری اور طبعی اختلافات کی لمبی فہرست دیکھتے ہیں، جو قدرت کی جانب سے بنی نوع انسان کے مابین رکھے گئے ہیں، اس کی مثالیں عمروں کے تفاوت، امارت وغربت کے مظاہر، رنگ وروغن کے تنوع، ملکی وزمینی فرق، قبائل وعشائر کے امتیاز میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انہیں آپ اختلاف کا نام دے لیجئے، تنوع کہئے، گونا گونی سے تعبیر کیجئے، لیکن ہے بہرحال اختلاف کی صورت، اور بلاشبہ یہ اختلاف اسی وقت سے ہے جب سے انسان کا خمیر گوندھا گیا، کون نہیں جانتا کہ چند متخالف ومتحارب عناصر کو آمیز کر کے انسان کا پتلا تیار کیا گیا تھا، اور پھر اسی اختلافی صورت حال کے تحت انسانی طبائع میں بھی اختلاف وانفراد کے جذبہ نے پرورش پائی، خواہشات ومیلانات میں تصادم ہوا، عزائم اور ارادوں میں ٹکراؤ ہوا، پھر انسان نے فطری اختلافات کی روزنوں سے چھلانگ لگا کر آپس میں ارادی اور اختیاری کش مکش شروع کر دی، یہیں سے اختلافات کی داستان دوسرے اسٹیج میں داخل ہوجاتی ہے، پھر اس تصادم وٹکراؤ کے نتیجے میں انسانیت مختلف فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوجاتی ہے اور بٹتی جاتی ہے۔ انسانی اختلاف کی ان دولہروں میں پہلی لہر تو بالکل فطری اور اضطراری ہے، اور ہر جگہ موجود ومشاہد ہے، انسان کا یہ اختلاف بذات خود اس کے حق میں مضر نہیں، ان اختلافات کے باوجود بنی آدم اتحاد کی کسی نہ کسی مضبوط رسی میں بندھے رہتے ہیں، خود بھی زندہ رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی زندگی

فراہم کرتے ہیں۔ایک گھر کے چندافراد باوجودیکہ قدوقامت،رنگ وروغن،شکل وصورت کے لحاظ سے باہم متفاوت ہوتے ہیں لیکن ''ہم خاندانی'' کی رسی میں جکڑے رہتے ہیں،کبھی انہیں وطن کا رشتہ ایک لڑی میں پروئے رکھتا ہے،کبھی اتحادِ مقصد کی زنجیر انہیں باہم پیوست کئے رہتی ہے،کبھی وحدتِ دین انہیں مربوط رکھتی ہے۔یہ تنوعات اگر اپنی حد پر رہیں تو صحیفۂ فطرت نہ صرف یہ کہ رنگ رنگ کے گل بوٹوں سے مزین رہے گا بلکہ انسانیت اپنی گونا گوں اور بوقلمونی رنگینیوں کی وجہ سے ایک ایسی جاذبِ نظر فضا پیدا کرے گی کہ:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن قیامت تو اس وقت ٹوٹتی ہے جب کوئی کم ظرف انسانی طبیعت ان اختلافات کو پھلانگ کر فتنہ وفساد کے شعلوں کو ہوا دینے لگ جاتی ہے،پھر یکا یک انسانوں کا ایک طبقہ اس آگ میں جل اٹھتا ہے،انسانی فتنوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے،ہر ایک کے پیچھے کوئی بندۂ نفس بیٹھا اپنی ہوا وہوس کی بھٹی انہیں قدرتی اختلافات کے ایندھن سے روشن کر کے اس کا دھواں دنیا میں پھیلا رہا ہوگا۔اللہ نے صحیفۂ حق وصداقت میں انسانوں کو متنبہ کیا ہے کہ ''**کان الناس امة واحدة فاختلفوا**'' . انسان درحقیقت ایک جماعت کا نام ہے مگر کچھ لوگوں نے اختلاف کی بنا ڈالی،دین ایک ہی ہے مگر **ان الذین فرقوا دینهم و کانوا شیعاً**۔کچھ لوگوں نے اپنا راستہ الگ بنایا اور فرقہ کی صورت میں علیحدہ ہو گئے،انسان کا وہ پہلا اختلاف اس کے حق میں تنوع ورنگا رنگی۔اور یہ دوسرا اختلاف عذاب وبے لطفی!

بنی اسرائیل کے پاس علم وہدایت کی دولت آئی،مگر انہوں نے اپنی خواہشات کے نشے میں جماعت کی تکا بوٹی کر ڈالی اور بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے،اور یہ سب علم کے بعد ہوا۔''**فما اختلفوا حتی جاء هم العلم**''.**وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ماجاتهم البینة**''۔اہل کتاب تفریق وانتشار کے شکار جہالت کی راہ سے نہیں ہوئے بلکہ یہ سب کچھ علم اور بینہ آ جانے کے بعد ہوا۔

ملتِ واحدہ کے بعد ظہورِ بینہ کے بعد حصولِ علم کے بعد۔آپ نے غور کیا،کس چیز نے انسانیت کو پارہ پارہ کیا؟ تاریخ چھان ڈالئے،ہر جگہ آپ کو یہی ملے گا کہ انسانی طبیعت کی کسی

کمزوری نے کسی ایک اختلافی چیز کو ہوا دینی شروع کی، ابتدا میں وہ ایک بے ضرر سا اختلاف تھا، خواہش نفس کی سوزش نے اسے چنگاری میں تبدیل کیا، اور دو چار افراد مل گئے، بالآخر آگ کا الاؤ تیار ہو گیا، پھر انسانی گردنیں پکڑ پکڑ کر اس میں جھونکی جانے لگیں، پھر تفرق وانتشار اور مجادلہ و محاربہ کا وہ ہولناک منظر نگاہیں دیکھتی ہیں کہ ظلم وطغیان کے ماتھے پر پسینہ آجاتا ہے۔

تاریخ کا یہ عمل اس امت میں بھی در آیا، جسے ''خیر امت'' کا لقب عطا کیا گیا تھا، تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، تاہم اتنا سمجھتے چلئے کہ تاریخ کے صفحات جہاں جہاں بھی انتشار و افتراق کی داستان سناتے ہیں وہاں کچھ اسی قسم کی صورت حال سامنے آتی ہے کہ ایک شخص کسی ایک اختلافی مسئلہ کو اپنی بحث وتحقیق نہیں زندگی کا مقصد بنالیتا ہے، اور فرقہ کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ہماری مراد فرقوں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ما انا علیہ و اصحابی کی شاہراہ چھوڑ کر اپنی الگ ڈگر بنالی، ورنہ اس شاہراہ کے اندر رہتے ہوئے عبادات ومعاملات کی عملی تشکیلات میں جن حضرات نے کے درمیان تفقہ واجتہاد یا مختلف اخبار آحاد کی بنیاد پر اختلاف کی صورت نظر آتی ہے وہ بالکل فطری اور قدرتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسائل ومعاملات میں بہت سے مواقع پر ائمہ اربعہ کے فتاوے الگ الگ ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے کیسی سچی بات کہی ہے:

> ''پھر کیا حدیث کی بنیاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کسی چیز کے حلال ہونے کا فتوی دیا ہے اور حنفی مذہب میں بجائے حلت کے اس چیز کے حرمت کے پہلو کو ترجیح دی گئی ہو؟ کیا حلت وحرمت کے یہ اختلافات جو خبر آحاد کی حدیثوں پر مبنی ہیں، محض ان کی بنیاد پر مجال ہے کسی حنفی کی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس کا اندیشہ بھی کر سکتا ہے کہ اس فتوی کی وجہ سے فضل وقرب کے مدارج ومراتب میں ان کے کسی قسم کی کوئی کمی ہو گئی ہو گی؟ یقیناً نہ کوئی حنفی یہ تصور کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے۔ اسی طرح میں نہیں جانتا کہ باوجود ان تمام اختلافات کے حضرت امام ابوحنیفہ کے لئے رحمۃ اللہ علیہ یا دعائے خیر کرنے سے کسی شافعی کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہو؟''۔ (تدوین حدیث ص ۳۲۵)

یہی وجہ ہے کہ مختلف ائمہ کے ماننے والوں میں وہ خلیج کبھی حائل نہیں ہوئی، بالخصوص ان کے مابین اختلافی مسائل کی بنیاد پر، جس کا مشاہدہ صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے فرقوں میں ہم

کرتے ہیں۔ یہاں تو یہ صورت حال ہے کہ احناف کا بہترین اعتماد شوافع کے ائمہ حدیث وفقہ کو حاصل ہے،اور شوافع وموالک ائمہ احناف کی ثنا خوانی میں رطب اللسان ہیں،ائمہ کو تو چھوڑئے ان پر تو پوری امت کا اتفاق واعتماد ہے،بعد کے علما میں کون نہیں جانتا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی، امام ذہبی،علامہ ابن الہمام، جمال الدین زیلعی ،امام نووی،علامہ زرقانی،علامہ سیوطی نیز ائمہ حدیث امام بخاری، مسلم اور دوسرے جلیل القدر محدثین مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بلا لحاظ مسلک ومشرب ان کی تصانیف اور علم پر سب لوگ اعتماد کرتے ہیں،اور جن لوگوں نے کبھی آویزش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے،تاریخ شاہد ہے کہ خود انہی کے جماعت نے ان کا چھتاڑ کر دیا ہے،علامہ خطیب بغدادی کا لہجہ ایک جگہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے متعلق تیز ہوگیا ہے تو خود شوافع کے اعتماد سے ان کو محروم ہونا پڑا۔اس قسم کی مثالیں ڈھونڈھنے والوں کو بکثرت تاریخ کے ذخیرہ میں مل جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ائمہ فقہ کے یہ تنوعات بنیادی عقائد میں نہ تھے، بلکہ اخبار آحاد اور تفقہ واجتہاد کی بنیاد پر فروعی مسائل میں تھے، یہ اختلافات ضروری تھے،اس سے امت کو ''الدین یســــر'' کا صحیح مفہوم سمجھنا میسر ہوا، یہ اختلاف درحقیقت ائمہ میں نہیں بلکہ عہد صحابہ ہی میں موجود تھا۔مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

''حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے اپنی مفصل سند کے ساتھ رجاء بن جمیل کے حوالہ سے یہ قضیہ نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا جارہا تھا کہ قاسم جس حدیث کا تذکرہ کرتے عمر بن عبدالعزیز اس کے مقابلہ میں ایسی روایت پیش کر دیتے جس کا مفہوم قاسم کی پیش کردہ روایت کے مخالف ہوتا۔آخر دیر تک جب گفتگو اسی رنگ میں ہوتی رہی تو عمر بن عبدالعزیز نے محسوس کیا کہ قاسم بن محمد ان کے طریقۂ کار سے کچھ گرانی محسوس کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز نے قاسم سے کہنا شروع کیا کہ آپ اس کی گرانی کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ آخر میں عمر بن عبدالعزیز کا اس باب میں جو خیال تھا اس کو ان الفاظ میں ظاہر فرمانے لگے:

''صحابہ کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، میں سچ کہتا ہوں کہ ان اختلافات کے معاوضہ میں سرخ اونٹوں سے اتنا خوش نہیں ہوسکتا تھا جتنا کہ اس کی اختلافی روایات سے خوش ہوں''۔

سرخ اونٹ ایک عربی محاورہ ہے، انمول جس کی قیمت کا مقابلہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکے، اسے عرب سرخ اونٹ کہتے تھے، کیوں کہ سرخ اونٹ سے زیادہ قیمتی کوئی چیز عربوں کی نگاہ میں نہ تھی۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عمر بن عبدالعزیز کی اسی گفتگو کا شاید اثر تھا کہ بعد کو قاسم بن محمد مختلف جلسوں میں فرمایا کرتے تھے کہ عمر بن عبدالعزیز کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں روایات کا اختلاف اگر نہ ہوتا تو میرے نزدیک یہ کوئی خوشگوار بات نہ ہوتی۔ آج یہ انہی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ لوگ اس کی تنگی میں نہیں ہیں جو ایک ہی قول یا روایت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی، اب تو آزادی ہے ان بزرگوں کے مختلف اقوال میں سے جس قول پر بھی عمل میسر آجائے وہ کامیاب ہے'۔ (جامع بیان العلم ج ۸۔ص ۲۔بحوالہ تدوین حدیث ص ۳۲۲)

انہی فقیہ مدینہ حضرت قاسم بن محمد بن سیدنا ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک قول علامہ ابن عبدالبر کے حوالہ سے مولانا گیلانی نے نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ:

سألت القاسم بن محمد عن القرأة خلف الامام فيما لم تجهر فيه فقال ان قرأت فلك في رجال من اصحاب رسول الله ﷺ اسوة واذا لم تقرأ فلك في رجال من اصحاب رسول الله ﷺ اسوة. (جامع بیان العلم ج ۲۔ص ۸۰)

میں نے قاسم محمد سے پوچھا کہ جن فرض نمازوں میں زور سے قرأت نہیں کی جاتی ان میں امام کے پیچھے پڑھنے (یعنی سورہ فاتحہ) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر قاسم محمد نے فرمایا کہ اگر تم پڑھو تو رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں تمہارے لئے نمونہ ہے، اور نہ پڑھو تو رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں ہی میں اس کا بھی نمونہ تمہارے لئے موجود ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر محض اپنی رائے سے حدیث کے وسیع وعریض ذخیرے میں جس کو جو حدیث مل جائے، تمام اصول وضوابط کو طاق پر رکھ کر اسی کو اپنے عمل کی بنیاد بنالے، اس طرز عمل سے تحیر وانتشار تو پیدا ہوگا ہی، دین ایک مذاق بن کر رہ جائے گا۔

یہاں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے یہ اختلافات کبھی تکفیر وتذلیل اور

تفسیق وتجہیل کے دروازوں تک نہیں پہونچے، اور نہ ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کو بددین اور گمراہ کہہ کر جہنم کی طرف ڈھکیلنے کی کوشش کرتا، اختلاف اور پھر اعتماد واحترام کی ایسی روشن فضا کم ازکم اختلافات کی دنیا میں بہت کم دیکھنے کو ملے گی، پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ ان جماعتوں کی بنیاد کسی اختلافی مسائل پر نہیں ہے، بلکہ تفقہ واجتہاد کا خلوص ان میں شامل ہے، ہر ایک نے رضا جوئی حق کو پیش نظر رکھا ہے، پھر ظاہر ہے کہ تفرق وانتشار کی وہ ہولنا کیاں کس طرح نمودار ہو سکتی ہیں؟ جو محض خواہش نفس، ضد اور شیطانی اثرات کا کرشمہ ہوتی ہیں۔

آپ ایک نظر تاریخ کے ان اوراق پر بھی ڈال لیجئے، جہاں ائمہ متبوعین کسی ایک خاص موضوع سخن کو اپنے فرقوں کی بنیاد بنائے ہوئے ہیں، ان کی جماعت کا دارومدار چند اختلافی مسائل ہیں، وقتاً فوقتاً انہیں کا جھنڈا الہراتا رہتا ہے۔شیعوں کی بنیاد 'مسئلہ امامت'، خوارج کی بنیاد 'مسئلہ تحکیم'، نواصب کی بنیاد 'بغض اہل بیت'، معتزلہ کی بنیاد 'مسئلہ صفات، خلق قرآن' وغیرہ، ان فرقوں میں دم خم اس وقت باقی رہا جب تک ان کے مسائل کو ہوا ملتی رہی، یا حکومت کا سہارا انہیں حاصل رہا۔آج بجز کتب خانوں کی الماریوں کے کہاں ان کا وجود ہے، لیکن سچ پوچھئے تو امت اختلاف کی آگ میں اس طور پر جھلسی اور جلی ہے کہ غیر تو غیر ہیں، بہت سے اپنوں کے سامنے بھی اس کا پیکرِ جمال مخفی رہ گیا ہے۔

ہندوستان میں بھی اس قسم کے اختلافات انسانی کمزوری کے منبع سے پھوٹتے اور بہتے رہے، لیکن جب تک حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی یہ لاوے ابلتے اور ٹھنڈے ہوتے رہے، لیکن جب سے انگریزوں نے یہاں قدم جمایا، انہوں نے اپنے خاص مقاصد کے تحت ان شعلوں کو ہوا دیتے رہنا ضروری خیال کیا، چنانچہ اسلامی ہندوستان کی پوری تاریخ میں مسلمان اتنے فرقوں میں نہ تقسیم ہوئے ہوں گے جتنے سودوسوسال کے اس عرصے میں بٹ گئے ہیں، کبھی ظلی وبروزی نبوت کا ڈھونگ رچا گیا، کہیں سنت کے نام پر بدعت کا جھنڈا الہرایا گیا، کبھی قرآن کی آڑ لے کر حدیثوں سے انکار واعراض کی راہ ہموار کی گئی، کہیں عقل وفلسفہ کی بنیاد پر عقائد کی تیشہ زنی کی گئی۔غرض ایک ایسا طوفان برپا کر دیا گیا کہ اس کشمکش نے ملت اسلامیہ کے جسد واحد کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔

انہیں فتنوں کی جلو میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چند بھولے بھالے لوگ ایک خاص فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں، اور حدیث وسنت کی آڑ لے کر تفقہ واجتہاد اور ائمہ مجتہدین سے برگشتہ کرنے میں لگ جاتے ہیں، یہاں بھی صورت حال وہی ہے کہ امت کے سواد اعظم سے ایک ٹکڑی یہ کہہ کر علیحدہ ہوگئی کہ فلاں فلاں مسئلہ میں جو دور صحابہ سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں مسلمانوں کا عمل صحیح نہیں ہے، اتنے ہی پر بس نہیں، ایسے مسائل میں بھی انکار وتغلیط کا دروازہ کھولا گیا جن پر ائمہ اربعہ کا اتفاق چلا آرہا ہے، اس دردناک تاریخ کو میرے بجائے آپ مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے ذرا مفصل سنئے:

''ابھی کچھ دنوں پہلے اسی سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت کا اقتدار جس وقت ختم ہوا، خواہ بجائے خود اسلام اور اسلامی قوانین سے اس حکومت کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو، لیکن اتنا بہرحال ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ کسی نئی بات کو چھیڑ کر مسلمانوں میں اختلاف وافتراق کی آگ بھڑکانا آسان نہیں ہے، لیکن حکومت کے اس دباؤ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی جائز وناجائز مزاحمتوں کا اندیشہ دلوں سے نکل گیا، اور خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے، طرح طرح کے مشورے مسلمانوں کو ملنے لگے، اس سلسلے میں جو کچھ ہوا یا ہورہا ہے، یہاں سب سے مجھے بحث نہیں ہے، بلکہ ان احباب سے معافی چاہتے ہوئے جن کے دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگاتے ہوئے مجھے خود بھی تکلیف محسوس ہورہی ہے، مگر کیا کروں؟ واقعہ کے اظہار کے بغیر شاید صحیح طور پر میں اس چیز کو سمجھانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، جس کے سمجھانے کے لئے اس تازہ تاریخی مثال کا میں نے انتخاب کیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس تاریخی مثال کے جو اعاظم رجال واکابرو ابطال تھے اب وہ بے چارے دنیا میں موجود نہیں ہیں، پھر بھی بچے کھچے ان کے نام لیواؤں کا خیال آہی جاتا ہے جو اپنے گزرے ہوئے انہیں بزرگوں کے نشان سرمزار کی حیثیت سے اس طویل وعریض ملک کے بعض گوشوں میں زندگی کے دن پورے کررہے ہیں، اب کچھ بھی ہو کہنا چاہتا ہوں کہ احیاء سنت وقمع بدعت اور خدا جانے کن کن الفاظ کن کن ارادوں کن کن نیتوں کے ساتھ کچھ دن پہلے اسی ملک ہندوستان میں اٹھنے والے یہ کہتے ہوئے اٹھے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کی دینی زندگی جس کے صدیوں سے وہ پابند چلے آرہے ہیں، غیر مسنون زندگی ہے۔ پھر اسی غیر مسنون زندگی کو مسنون بنانے اسی ''خبر الخاصہ'' یا ''خبر الواحد

بعد الواحد' والی حدیثوں کے ذخیروں سے ان بزرگوں نے چن چن کر ان ہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو ابتداء اسلام سے ہی ناگزیر قدرتی اختلافات کے رنگ سے رنگین تھیں، وہ خود بھی جانتے تھے یا انہیں جاننا چاہئے تھا کہ اختلاف کی یہ صورت نئی بات نہیں ہے، نیز آگاہ کرنے والے ہر زمانہ میں جیسے مسلمانوں کو آگاہ کرتے چلے آئے تھے، ہندوستانی مسلمانوں پر بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں ان کو چونکانے والے یہ کہہ کہہ کر نہ چونکاتے رہے ہوں کہ ان اختلافات کی حیثیت وہ نہیں ہے جو کفر واسلام بلکہ طاعت وعصیان کے اختلافات کی حیثیت ہوتی ہے۔خود حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ ضریحہ، جن کی طرف منسوب کرنے والے چاہتے ہیں کہ اس غلط تحریک کی سیادت اور اولیت کو منسوب کردیں، وہی ایک جگہ نہیں بلکہ اپنی مختلف کتابوں میں صاف صاف یہ اعلان کر چکے تھے کہ ان اختلافات کی ہر صورت اور ہر شکل صحیح اور درست ہے، صرف ان ہی مسائل اور نتائج کی حد تک شاہ صاحب کا یہ فیصلہ محدود نہ تھا، جن کا تعلق تفقہ واجتہاد سے تھا، بلکہ خبر آحاد والی حدیثوں کی بنیاد پر جو اختلاف پیدا ہوگئے تھے، ان کے متعلق بھی شاہ ولی اللہ اس قسم کی عبارتیں چھوڑ کر دنیا سے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ روانہ ہوئے تھے، مجھے خیال آتا ہے کہ اسی کتاب میں کسی موقع پر شاہ صاحب کے اس قول کو ان کی کتاب ''الاصناف'' سے نقل کر چکا ہوں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ''ایسے اختلافی مسائل جن میں صحابہ کے اقوال ہر پہلو کی تائید میں ملتے ہیں مثلاً عیدین اور تشریق کی تکبیریں، محرم کے بحالتِ احرام حج نکاح کرنے کا حکم، یا تشہد کے کلمات جو ابن مسعود اور ابن عباس کی طرف منسوب ہیں، یا آمین یا بسم اللہ کو آہستہ یا زور سے پکارنا یا نماز کی اقامت میں بجائے دو دفعہ کے ایک ایک دفعہ اقامت کے کلمات ادا کرنا، یہ اور اس قسم کی ساری باتوں میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں کوئی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ شریعت کے مطابق اور اس کی مخالف شکل غیر شرعی شکل ہے، بلکہ سلف کا اگر اختلاف تھا بھی تو اس میں تھا کہ ان دو مختلف صورتوں میں اولیٰ اور بہتر شکل کیا ہے؟ ورنہ دونوں شکلوں کو شرعی شکل قرار دینے پر سب ہی متفق ہیں''۔(انصاف ص۸۹)

اسی موقع پر شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلک کے فقیہوں کے فتووں اور ہر مسلک کے قاضیوں کے فیصلوں کی سب ہی تصحیح کرتے ہیں، بہ ضرورت ایک امام

کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک کو اختیار کرنے کی مسلمانوں کو جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ فقہ کے سارے اختلافی مسائل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت کے دائرہ سے کوئی باہر نہیں ہے''۔(تدوین حدیث ص ۳۱۹)

میں ذکر مسلمانان ہند کی تاریخ کے اسی حادثہ کا کر رہا تھا جس میں زوال حکومت کے بعد اچانک اس ملک کے مسلمان مبتلا ہو گئے، وہی حادثہ جس میں دیکھا گیا کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں نے رزم گاہوں کا قالب اختیار کر لیا، نماز کی صفیں، نماز کی صفیں نہیں بلکہ باضابطہ جنگ کی صفیں بن گئیں، جو نماز نہیں پڑھتے تھے ان کو نہیں بلکہ نماز پڑھنے والوں کو نمازوں ہی کے پڑھنے والے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخ رہے تھے، آپس میں لاٹھیاں اور جوتے صرف اس لئے چل رہے تھے کہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی تم نے کیوں نہیں اٹھایا؟ یا امام'' ولا الضالین'' پر جب پہونچا تو اس پر نہیں کہ تم نے آمین کیوں نہیں کہی؟ کیوں کہ آمین تو سب ہی کہتے ہیں، جھگڑا اس پر تھا کہ صرف خدا ہی کو تم نے آمین کا یہ لفظ کیوں سنایا؟ خدا کے بندے جو تمہارے دائیں بائیں کھڑے تھے ان کو بھی اس لفظ کے سننے کا موقع کیوں نہیں دیا؟ مسلمانوں ہی کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو مسلمانوں کی مسجدوں سے نکال رہا تھا، اس لئے نکال رہا تھا کہ امام قرآن کے جس حصہ کو نماز میں پڑھتا ہے تم نے اسے سنا کیوں؟ بجائے سننے کے تم بھی اسی کو دہرانے میں مشغول کیوں نہ ہو گئے؟ جسے امام اپنی طرف سے اور تمہاری طرف سے پڑھ رہا تھا، اور بات اسی حد تک ختم ہو جاتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ خیر ایک حد پر پہونچ کر ختم ہو گئی، لیکن قصہ تو یہاں تک دراز ہوا کہ مسلمانوں کی دنیا جن لوگوں نے جبراً ان سے چھینی تھی ان ہی کے سامنے بخوشی ورضا اپنے دین کو بھی لے کر پہونچے، جن کی عدالتوں میں پیٹ کے جھگڑوں کے لئے جاتے تو سمجھا جا سکتا تھا کہ مسلمان مجبور ہیں، ان ہی عدالتوں کے حکام کے پاس وہ اللہ کی کتاب اور جن میں اس کے رسول کی حدیثیں تھیں، ان سب کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم دو فریقوں میں ان کتابوں کی رو سے واقعی مسلمان کون ہے؟ اور مسلمانوں کی مسجدوں کے استعمال کا قانونی حق کسے حاصل ہے؟ طیش کی آگ اور غصے کے شعلوں میں ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کا سارا سرمایہ جل کر بھسم ہو چکا تھا ان فیصلوں پر خوشی کی شادیانے بجائے جاتے تھے، جو اللہ اور رسول کے جھٹلانے والوں کی

طرف سے کوئی فریق حاصل کرتا تھا،اور ان ہی فیصلوں کی آڑ میں محمد رسول اللہ ﷺ کو رسول ماننے والی امت کی ایک جماعت عبادت گاہوں سے ڈھکیلی جارہی تھی، جو نہ عیسائیوں کے گرجے تھےاور نے یہودیوں کے سنی گاگ، بلکہ یہ کیسا دلخراش منظر تھا کہ مسلمانوں کی مسجدوں سے مسلمانوں ہی کو نکالا جارہا تھا، کہ جو مسلمان نہیں تھےان ہی حکام سے ان کے نکالنے کا فیصلہ خود مسلمانوں نے مسلمانوں کے لئے حاصل کیا''۔(تدوین حدیث ۳۲۶)

لیکن پوری صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا،اب وہ کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے جو آمین زور سے نہیں کہتا، یا رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھاتا،حقیقت ان پر واضح ہوچکی ہے،بطور نام نہاد کے اپنے مسلک کو ایک خاص نام سے موسوم کرکے جی رہے ہیں،شاید یہ نام بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے''۔[۱]

حاشیہ میں مولانا گیلانی مرحوم نے ایک مشہور غیر مقلد عالم کا ایک لطیفہ بھی نقل کیا ہے، جس سے اس مسلک کی حقیقی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔تحریر فرماتے ہیں:

''اس موقع پر ایک لطیفہ کا بار بار خیال آرہا ہے، میں نے براہ راست بانی ندوۃ العلما حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت کے پیرومرشد مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی تغمدہ اللہ بغفرانہ کی خدمت میں فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز ونمایاں عالم وہیں حاضر ہوئے،مولانا ابراہیم صاحب سے جب ملاقات ہوئی تو حضرت گنج مرادآبادی نے پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ عامل بالحدیث ہیں؟ بولے جی ہاں الحمد للہ، مولانا نے پوچھا کہ آں حضرت ﷺ سوتے وقت کون سی دعا پڑھتے تھے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ اس وقت یاد نہیں ہے، پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت کیا پڑھتے تھے؟ بولے وہ بھی یاد نہیں،الغرض یونہی آں حضرت مختلف اوقات ومقامات پر جو دعائیں پڑھا کرتے تھے، جیسے اکثر مولویوں کو یاد نہیں ہوتیں،مولوی صاحب بے چارے کو بھی یاد نہ تھیں،تب مولانا نے ان ہی اہل حدیث مولوی صاحب کو خطاب کرکے کہنا شروع کیا، کیوں مولانا آپ نے رسول اللہ ﷺ کی صرف اختلافی حدیثوں کو یاد کیا ہے،لیکن جن حدیثوں کے متعلق کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے،ان کے یاد کرنے کی ضرورت کو عمل بالحدیث کے لئے ضروری خیال نہ کیا،

کیا اسی کا نام عمل بالحدیث ہے؟ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب جھینپ سے گئے۔مولانا محمد علی مرحوم یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے زمانے میں مولوی ابراہیم صاحب نے ایک خواب دیکھا اور اسی خواب کی بنا پر حنفی مسلک پر واپس ہو گئے تھے۔شاید اس مضمون کا ایک مکتوب بھی مولوی ابراہیم کا لکھا ہوا ہے حضرت مولانا محمد علی کے پاس تھا‘‘۔(تدوین حدیث)

یہ صرف ایک لطیفہ نہیں ہے بلکہ بقلم خود اہل حدیث حضرات کی سچی تصویر اوران کی واقعی تاریخ ہے،اسی کو میں نے عرض کیا تھا کہ جو فرقے حقیقۃً فرقے ہیں اور جنہوں نے اتحاد اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اختلاف وانتشار کی قینچی تیار کی ہے،ان کی بنیاد عموماً کسی اختلافی مسئلہ پر بے جا اصرار وتشدد ہے،غیر مقلدیت کا فتنہ پہلے کے مقابلہ میں اب بہت کچھ ٹھنڈا پڑ چکا ہے،لوگ حقائق سے واقف ہو چکے ہیں،لیکن ظاہر ہے کہ جن کا پورا سرمایہ اور تمام تر پونجی چند مختلف فیہ مسائل سے زیادہ کچھ نہ ہو،انہیں یہ کب گوارا ہوسکتا ہے کہ یہ شعلہ ٹھنڈا پڑ جائے، اس میں انہیں اپنی اجتماعی موت نظر آتی ہے،اس لئے مولانا گیلانی کے الفاظ میں کچھ’’نشان سرمزار‘‘قسم کے افراد ہر تھوڑی تھوڑی مدت میں اپنی زندگی کا ثبوت دینے کی غرض سے اختلاف کی کوئی لے چھیڑ دیتے ہیں،اوراس طرح تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کے اجتماعی معاشرہ میں ہلچل سی مچ جاتی ہے،اوراب تو سچ پوچھئے تو ہوس زر کی دوڑ میں بازی لگانے کی وجہ سے وہ لوگ بھی بہت کچھ فراموش کر چکے ہیں،تاہم جیسے سوتا ہوا آدمی کبھی کبھی نیند میں بڑبڑانے لگتا ہے،یونہی ان کے بعض حلقوں سے بعض خاص مواقع پر بے وقت کی راگنی الاپی جانے لگتی ہے۔

آمین بالجہر،رفع یدین،قرأت خلف الامام وغیرہ کے اختلافات تو اب بہت حد تک دم توڑ چکے ہیں،کبھی کبھی طلاق ثلثہ کے مسئلہ پر کوئی شخص صدائے بے ہنگام لگا جاتا ہے،البتہ گرمیٔ محفل باقی رکھنے کے لئے اب بھی اکثر وبیشتر آٹھ رکعت تراویح کے مسئلہ کو اٹھا کر بغلیں بجائی جاتی ہیں،رمضان قریب آتے ہی بڑے بڑے پوسٹر اور کتابچے نمودار ہونے لگتے ہیں،احناف کو چیلنج کیا جاتا ہے،تھوڑی دیر کے لئے پرسکون ماحول میں تموج کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں[۲]پھر ’’میں خاموش تو خاموش‘‘ دولت کے خزائن پر ان کی نگاہیں گڑی رہتی ہیں۔

ہمارے علما جنہیں خلافیات کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں، چونکہ مسلمانوں کے انتشار کو بالخصوص فی زمانناً بہت ناپسند کرتے ہیں، اس لئے ان تماشوں پر عموماً خاموش رہتے ہیں، کہ ان کے پاس ان چند مسائل کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر پروگرام تو ہے نہیں، کہاں تک ان کے تعاقب میں وقت ضائع کیا جائے، لیکن تشویش کی لہر کبھی کبھی تیز ہوجاتی ہے تو عوام کا مطالبہ ہونے لگتا ہے کہ ادھر سے بھی کچھ جوابی کاروائی کی جائے۔[۳]

کچھ اسی قسم کا مرحلہ ہمارے دوست فاضل گرامی قدر جناب مولانا سید طاہر حسین گیاوی کے سامنے بھی آیا، اور موصوف قلم اٹھانے پر مجبور ہوئے، کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، لہجہ قدرے تند وتیز ہے، لیکن اس پر معذرت کی ضرورت نہیں ہے، اس کا الزام مولانا پر نہیں ہے، ان لوگوں پر ہے جو اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو کسی نرمی اور کسی عزت واحترام کا مستحق نہیں سمجھتے۔

مولانا موصوف نے اس کتاب میں متعلقہ مباحث پر اب تک کے تقریباً تمام مواد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، اور ان پر مزید تحقیقات کا بہترین اضافہ بھی کیا ہے، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتاب اس موضوع پر حرف آخر ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ اگر تحقیق وانصاف کو بالائے طاق نہ رکھ دیا گیا تو ذہن ودماغ کی سیرابی کا اس میں سامان موجود ہے، بعض جزئی مبحث میں ممکن ہے کوئی صاحب مین میخ نکالیں لیکن اس سے اصل مبحث پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

میرا خیال ہے کہ جس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے لے کر اب تک غیر مقلدوں کی تحقیق پر کسی امام کا عمل نہ ہوا، اس میں ان حضرات نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر شدید غلطی کی ہے، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ سارے اکابر کیوں کر غلط مسئلہ پر تیرہ سو سال تک متفق رہے؟ کیا یہ سارے حضرات ناواقف تھے؟ پھر اگر معاملہ وہاں تک رہتا جہاں تک ائمہ اربعہ کے اختلاف کی حدیں رہتی ہیں تو بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن یہاں تو بیک جنبش قلم وہ سب غلط، خلاف سنت جن پر آج تک ائمہ کا عمل ہے! اور ان کی تحقیق سو فی صد درست! اگر بات صرف دلائل کی بنیاد پر ترجیح کی حد تک ہوتی تو اس کتاب کی تصنیف کی چنداں ضرورت نہ تھی، اور اگر ہوتی بھی تو لب ولہجہ یہ نہ ہوتا، لیکن جو لوگ دوسروں کو گمراہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہوں ان

کے لئے یہی لہجہ مناسب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس شرذمۂ قلیلہ کو پایۂ اعتبار سے ساقط کرنے کے لئے طلقات ثلٰثہ اور تراویح کا مسئلہ بہت کافی ہے۔

مقدمہ نگار نے ناظرین کا بہت وقت لیا،اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، انصاف وتحقیق کی نظر سے پڑھئے اور ضد کو ایک طرف رکھ کر حق وراستی کے لئے سینہ میں وسعت پیدا کیجئے۔اللہ توفیق دے۔

و آخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

اعجاز احمد اعظمی

مدرسہ دینیہ شوکت منزل میاں پورہ غازی پور

۲۲/جمادی الاخری ۱۴۰۳

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) تدوین حدیث ص ۳۳۰۔حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ پچھلے دنوں سے دیکھا جارہا ہے کہ نام پر بھی اتفاق ان میں باقی نہیں رہا،بعض اپنے آپ کو بجائے اہل حدیث یا محمدی وغیرہ الفاظ کے کبھی شافعی کبھی حنبلی وغیرہ بھی کہنے لگے ہیں۔

(۲) یہ بھی مسلمانوں کی بدنصیبی کا ایک حصہ ہے کہ رمضان المبارک جو خالص عبادت ورضا جوئی الٰہی کا مہینہ ہے،اس کے برکات کو بھی ایک جماعت آتش اختلاف میں جلانے کے لئے تیار رہتی ہے، اور اختلاف بھی کیسا؟ ائمہ اربعہ میں کوئی بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ نہیں ہے۔اناللہ وانا الیہ راجعون

(۳) عجیب بات ہے کہ اس فرقہ نے خالص علمی اور اصطلاحی چیزیں جو محض علما کے سمجھنے کی تھیں، اور عوام کو ان سے نہ صرف یہ کہ نفع کچھ نہیں ہے، بلکہ الٹا نقصان ہے،عوام کے بازار میں لے آئے،تا کہ عوام بغیر سمجھے انتشار وافتراق میں مبتلا ہو، بھلا جو لوگ ابتدائی علوم سے واقف نہ ہوں، وہ حدیث وفقہ کی اصطلاحات پر کیا قابو پاسکتے ہیں؟ لیکن اس جماعت کا اسی میں فائدہ ہے کہ مسلمانوں کو الجھا دیا جائے۔ کس قدر ظلم ہے؟ نہ جانے اس طرز عمل کو حدیث اور سنت سے کیا تعلق ہے؟۔

تأثر بر ''حیات ابوالمآثر''

ایک ایسی شخصیت جس کا علم گہرا تھا اور وسیع بھی! ایک ایسا عالم جس کی نگاہ ثاقب تھی اور ہمہ گیر بھی! ایک ایسا شب زندہ دار جس میں محدثین کی سی جانکاہی تھی اور صوفیا کا سا سوز بھی! وہ علم کا طالب تھا اور علما کا استاذ بھی! اس کو دیکھ کر علماء حدیث کے حیرت انگیز حافظوں کی تصدیق ہوتی تھی، اور ائمہ اجتہاد کی ذہانتوں کا یقین آتا تھا، اس کی ژرف نگاہی کے سامنے عقلیں ششدر رہ جاتی تھیں، اور اس کے ورع وتقوی کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا، وہ غیرت وحیا کا پتلا تھا، وہ دینی صلابت میں بے نظیر تھا، وہ صحت علم اور حسن عمل کا جامع تھا، اس کی ہیبت اور اس کے وقار کے سامنے بڑے بڑے اساطین علم کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، وہ عرصۂ دراز تک ایک سفالہ پوش تنگ و تاریک حجرے میں رہا کیا، مگر اس کے علم کا نور چہار دانگ عالم کو روشن کرتا رہا۔

۱۴۱۲ء میں روشنیٔ علم کا یہ پیکر اپنے خالق ومالک کے حضور پہونچ گیا، اس کے خاکی بدن نے مٹی کی چادر اوڑھ لی اور اس کی نورانی روح مرکز نور میں روپوش ہوگئی، ہمارے درمیان سے اس کا وجود ناسوتی اٹھ گیا، لیکن اس کا علم؟ سب کہاں؟ کچھ تلامذہ کے سینوں میں، کچھ کاغذ کے سفینوں میں محفوظ ہے، جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی، اور ہاں اس کے احوال وسوانح کی یاد دلوں میں؟ وہ بھی سب کہاں؟ قدرے قلیل باقی رہ گئی، اس کے بھی محو ہوجانے کا اندیشہ لگا رہا۔

علم کے ہر حلقے سے تجویزیں آئیں کہ احوال وسوانح کا جو کچھ حصہ لوگوں کی یادداشت میں اور مختلف اوراق میں محفوظ اور بکھرا ہوا ہے، اسے جمع کر کے مرتب کردیا جائے تاکہ اس عظیم شخصیت کا مجموعی خاکہ نگاہوں میں آجائے۔

یہ تجویز واجب التعمیل تھی، اس کے لئے قرعۂ فال اسی دیوانہ کے نام نکالا گیا، جو یہ سطریں اس وقت لکھ رہا ہے، اے کاش کہ اس قاصر القلم سے یہ کام بن پڑتا، لیکن قرعۂ فال جس دیوانے کے نام نکلا تھا جب وہ لکھنے کا ارادہ کرتا تو اس کا قلم تھرا جاتا، موضوع کی اہمیت اور خود اس کی بے لیاقتی دامن گیر ہوتی، اسی کش مکس میں دن گزرتے گئے، اچانک معلوم ہوا کہ حضرت اقدس کے اہل بیت ہی میں سے ایک ذہین وفطین صاحب علم وقلم جو حضرت ہی کے شاگرد ہیں، چپکے چپکے حضرت کی سوانح عربی میں مرتب کر چکے ہیں، ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی، حیرت اس پر کہ کتنی خاموشی سے کام شروع کیا اور پایۂ تکمیل کو پہونچ بھی گیا، اور خوشی اس پر کہ حضرت کی اولاد ہی نے یہ فریضہ انجام دیا، یہ ہیں حضرت کے نواسے، مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے بھانجے اور حاجی سعید احمد صاحب (کشمیر ٹیکسٹائلس) کے فرزند گرامی مولانا مسعود احمد صاحب! جو المآثر کے صفحات میں ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کے عنوان سے جلوہ گر رہتے ہیں۔

دل میں خیال آیا کہ ماشاء اللہ نوجوانی ہی میں قلم پختہ ہے، انہیں کے قلم سے اردو میں بھی سوانح آجاتی تو ''حق بحقدار رسید'' کا مصداق ہوتا، کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اردو سوانح کا سفر تقریباً آدھا طے ہو چکا ہے، پھر جو ان کا کام دیکھا تو تلاش وجستجو، تحقیق وتفتیش، اقتباس و ترتیب اور نادر معلومات کا ایک مرقع نظر آیا، یہ خاموش کاوش بہت قابل قدر ہے، اللہ تعالی اسے قبول فرمائے، کتاب کی تعریف وتوصیف پر کچھ نہیں عرض کرنا ہے۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے'' پڑھئے اور خود فیصلہ کیجئے، حضرت اقدس کی برکت سے ان کے حالات کا مرقع کتنا دل آویز ہے۔

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد مسلسل حضرت کے علوم اور ان کے تذکرے کی خدمت ہو رہی ہے، ترجمان الاسلام بنارس نے محدث اعظمی نمبر شائع کیا، مدرسہ مرقات العلوم مئو سے المآثر کا اجراعمل میں آیا، جو بحمد للہ اب تک اس خدمت میں سرگرم ہے، حضرت کے نام پر عظیم الشان مکتبہ تعمیر ہوا، جس میں حضرت کا سارا علمی سرمایہ محفوظ کر دیا گیا ہے، یہ سب کچھ اس ایک شخص کی خاموش کاوش اور لگن اور اس کے حسن نیت کا ثمرہ ہے جسے حضرت اقدس کے ساتھ فرزندی کا شرف حاصل ہے، اور تلمذ کا بھی۔ یہ ہیں حضرت اقدس کے خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتہم۔

مولانا موصوف حضرت کے سفر وحضر کے رفیق اور کاتب رہے ہیں، اور حضرت کے علمی کارناموں میں شریک رہے ہیں، چونکہ مولانا کا خط پاکیزہ ہے اور طبیعت میں احتیاط بہت زیادہ ہے، اس لئے مسودہ تیار کرنا، اس کو آخری شکل دینا، عموماً مولانا رشید احمد صاحب کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی، اس باب میں حضرت اقدس کو ان پر بڑا اعتماد تھا، انتظامی سلیقہ کی بنا پر حضرت نے انہیں کو مدرسہ مرقاۃ العلوم کا ناظم بھی منتخب فرمایا تھا جو بفضل خدا اب تک انہیں کی نظامت میں سرگرم عمل ہے۔

غیرت وخودداری اور خاموش کارگزاری میں مولانا موصوف ٹھیک اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر ہیں، ان کی نگرانی اور اہتمام میں کتنے اہم کام انجام پا گئے، لیکن نہ کوئی اعلان نہ اشتہار!

مولانا موصوف جامعہ مفتاح العلوم مئو کے فارغ التحصیل ہیں، اجازت حدیث انہیں اپنے والد محترم رحمہ اللہ کے علاوہ عالم اسلام کے مشہور بزرگ محدث حضرت علامہ زاہد الکوثری نور اللہ مرقدہ سے بھی حاصل ہے۔

یہ حقیر وخاکسار رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد مسلسل تدریس کی خدمت میں لگا ہوا ہے، باقاعدہ مضامین لکھنے کا اتفاق کم ہوا تھا، اکادکا کتابیں اس کے قلم سے نکلی تھیں، لیکن تحریر و قلم سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی، اصل ذوق تدریس ہی کا تھا، اور اب بھی ہے، تدریس کے ساتھ تحریر وقلم کے میدان میں کھینچ لانا یہ مولانا موصوف ہی کے حکم اور محبت کا نتیجہ ہے، المآثر کا اجرا طے ہوا تو اس کوتاہ قلم کو اس کا مدیر مقرر فرمایا، جس کے نتیجے میں مسلسل مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور علمی حلقوں میں ایک نئے اہل قلم کا تعارف ہوا۔

غرض مولانا کی لگن یہ ہے کہ حضرت کے علمی وتحقیقی کاموں کو زندہ رکھا جائے، اس پر اضمحلال طاری نہ ہونے پائے، اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے کہ حضرت کا مفصل تذکرہ لکھوانے کا شدید داعیہ ان کے قلب میں پیدا ہوا، ان کا فیصلہ یہ تھا کہ اسی قاصر القلم سے لکھوائیں، میرے قصور ہمت کے باوجود ان کے اس جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی، تو اللہ تعالیٰ نے گھر ہی کہ ایک باصلاحیت عالم کو اس کام کے لئے مستعد فرمادیا، جنہوں نے دوسری مشغولیوں

کے ساتھ بہت کم مدت میں ایک مستند، معیاری اور محققانہ تذکرہ مرتب فرمادیا۔

حضرت کی ان علمی یادگاروں کی بقاوتحفظ میں مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادگان بالخصوص مولانا ازہر رشید صاحب اور مولانا انور رشید صاحب بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں، بحمدللہ حضرت اقدس کی نسل اور خاندان میں دین اور علم کا ذوق زندہ ہے، حضرت کے پوتوں اور نواسوں میں بہت کثرت سے اصحاب علم ہیں۔

حضرت کے دوسرے صاحبزادے حاجی سعید احمد صاحب اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے تحصیل علم کی تکمیل تو نہیں کر سکے تاہم ان کے صاحبزادگان میں اصحاب فراغت موجود ہیں، حضرت کی علمی یادگاروں کے سلسلے میں بڑے بھائی کی معیت میں انہیں بھی بہت دلچسپی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو علم وفضل سے اور دین وتقویٰ سے ہمیشہ آباد وشاداب رکھے۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی

۵؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

☆☆☆☆☆☆

جہاد اور شہادت

(مقدمہ ''عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور شہدائے اسلام'')

اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی کوشش وکاوش میں اپنی جان کو قربان کر دینے کا نام 'شہادت' ہے۔ شہادت اسلام کی، اللہ ورسول کی وفاداری کا ایک بلند مرتبہ ہے، موت آتی ہے تو عام آدمی مر جاتا ہے، شہید بھی مرتا ہے، مگر اللہ کا حکم ہے کہ اسے مردہ نہ کہو اور نہ مردہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہے، اور زندگی کے فوائد سے سرفراز ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں اپنے برگزیدہ اور مقرب بندوں کا ترتیب وار تذکرہ کیا ہے، وہاں شہید کو تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔ پہلا درجہ تو انبیاء کا ہے، اور اس میں کیا شبہ ہے کہ انبیاء کرام تو انبیاء کرام ہیں، خاص اللہ کے منتخب کردہ اور تربیت دادہ! ان کے بعد ''صدیقین'' ہیں، یہ صدق وصفا کے پیکر، قلب وذہن اور علم وعمل کے اعتبار سے انبیاء کے مثنیٰ ہوتے ہیں، ان کے بعد ''شہداء'' ہیں، جو قوت عملیہ کے پیکر ہوتے ہیں، اور یہ قوت بالآخر اللہ کے حضور میں جان کا نذرانہ پیش کر کے دم لیتی ہے۔

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر　　　عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

آخر میں صالحین کا تذکرہ ہے، جو ہیں تو اوصافِ صالحہ اور خصائل حمیدہ کے جامع، مگر کمالات میں گروہِ صدیقین وشہداء کے ہم پایہ نہیں ہوتے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُوْلٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُوْلٰئِکَ رَفِيْقاً (سورہ نساء:۶۹)

جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کرتے ہیں، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ کا خصوصی انعام ہوا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ، اور یہ لوگ بہترین رفیق ہیں۔

ان چاروں طبقات میں انبیاء تو تمام کمالاتِ انسانیہ کے جامع ہیں، صدیقین میں قوت علمیہ کا غلبہ ہے، اور شہداء میں کمالاتِ عملیہ کا رنگ چھایا ہوا ہے، اور یہ وفاداری کا آخری مقام ہے کہ انسان اپنے سب سے قیمتی سرمایہ یعنی زندگی کو محبوب کے قدموں پر نثار کردے، پس جان چلی گئی مگر وہ مردہ نہیں ہے، زندوں سے بڑھ کر زندہ ہے۔

شہادت کے تصور کے ساتھ ذہن ودماغ میں جہاد کا تصور ابھرتا ہے، کیونکہ شہادت کی بنیاد جہاد ہی ہے، جہاد کیا ہے؟ کیا یہ فساد ہے؟ یا کوئی تعمیری اقدام ہے جس میں انسان کی اور انسانیت کی فلاح ہے؟ فسادیوں نے غل مچا رکھا ہے کہ جہاد، فساد کا دوسرا نام ہے، قتل وخونریزی کا بڑھاوا ہے، چوروں نے اپنے بچاؤ کے لئے شور مچا رکھا ہے کہ مجاہدین چور ہیں، حالانکہ اگر کوئی فسادی ہے تو یہی غل مچانے والے ہیں، اگر کوئی چور ہے تو یہی شور کرنے والے ہیں۔

دنیا میں کون سی قوم ہے؟ جو دوسروں سے نہیں لڑی ہے، جاہل اور نادان قوم نہیں، علم و دانائی رکھنے والوں کی قوم بھی لڑی ہے اور زمین کو خون سے لالہ زار بنایا ہے، کیا آپ ایسی کوئی تہذیب جانتے ہیں جسے مخالفتوں کے ٹکراؤ میں گرفتار ہونا نہیں پڑا ہے، پھر ٹکرانے کے بعد اپنے دشمنوں کا اس نے صفایا نہیں کیا ہے، تو جن لوگوں کے ہاتھ ہزاروں لاکھوں کے خون سے آلودہ ہیں، وہ مجاہدین کے خونِ شہادت کو دیکھ کر کیوں تھراتے اور تلملاتے ہیں؟۔

بات یہ ہے کہ دشمن ہر ایک کے ہوتے ہیں، لڑتے سب ہیں، یہ انسانوں کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، جس سے کسی کو مفر نہیں ہے، دنیا میں کسی تہذیب کو اور کسی تمدن کو آپ نہ دیکھیں گے کہ وہ لڑائی سے دامن بچا کر اپنے وجود کو برقرار رکھ سکا ہو، اصل دیکھنے کی چیز یا اعتراض وتحسین کی بات یہ ہے کہ یہ لڑائی کس مجبوری سے لڑی جارہی ہے، اور کس مقصد کے لئے اسے چھیڑا گیا ہے؟ مقصد کی بلندی، عمل کو بلندی بخشتی ہے، اور مقصد کی پستی عمل کو پست کردیتی ہے، دنیا کے لوگ اپنی ذاتی برتری، ملک کی ہوس، دولت کے جنون، عورت کے عشق میں لڑتے ہیں، اور یہ سب پست مقاصد ہیں، اس لئے یہ لڑائیاں محض فساد ہیں، اور مجاہد صرف اللہ کے لئے، اللہ کے حکم سے لڑتا ہے کہ دنیا میں اللہ کا کلمہ اونچا رہے، اسے نہ اپنی ذاتی برتری سے کوئی غرض ہے، نہ خاندانی حمیت سے کوئی واسطہ ہے، نہ ملک گیری کی ہوس ہے، تو یہ مقصد بہت اونچا ہے، اس ارادے اور

نیت کی وجہ سے اس کا یہ عمل خاک کی پستی سے اٹھ کر اوجِ ثریا پر پہونچ جاتا ہے، یہ عمل فساد نہیں جہاد ہے، اس سے انسانیت کی تخریب نہیں ہوتی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ نہ ہوتو آدمی، آدمی سے بے وجہ ٹکرائے گا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر جائے گا: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۵۱) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتے تو زمین برباد ہوکر رہ جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر فضل فرماتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے جہاد کے بارے میں دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ اول یہ کہ اگر جہاد نہ ہو، اور اس کے ذریعے سے ایک دوسرے کی شوکت وقوت نہ ٹوٹے، تو زمین میں بربادی پھیل جائے، کوئی آدمی چین سے نہ رہے گا، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ انسانیت پر کرب وحزن کا غلبہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ دنیا والوں پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ انھیں جہاد کی اجازت ملی ہوئی ہے۔

ان دونوں باتوں پر غور کرنے کے لئے آدمی کو اپنی فطرت اور خلقی نہاد پر غور کرنا ہوگا، اس سے خوب اندازہ ہوگا کہ جہاد کی اجازت میں زمین کی اصلاح وخوبی کیونکر ہے، اور کس طرح اور کتنا بڑا یہ اللہ کا فضل ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ انسان مختلف جذبات وملکات کا مجموعہ ہے، یہ جذبات اور ملکات بعض بعض کے موافق اور معاون ہیں، اور بعض بعض کے مخالف اور متضاد بھی ہیں، اس مجموعۂ اضداد کو باقی رکھنا، اس کو سنبھالے رہنا، اور اس سے مفید کام لینا ایک بڑا نازک عمل ہے، اور یہ عمل وہی کرسکتا ہے جو انسان کے مختلف جذبات وملکات سے پوری طرح واقف بھی ہو، اور اسے ان میں توازن واعتدال پیدا کرنے کی پوری قدرت بھی حاصل ہو، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بجز خالق انسان کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے، أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (سورہ ملک:) کیا جس نے پیدا کیا ہے وہی نہ جانے گا؟ جبکہ وہ بہت باریک بیں اور خبر رکھنے والا ہے۔

پس انسانی فطرت کے استعمال میں جب بھی کسی ماسوی اللہ نے دخل اندازی کی ہے،

اس نے یا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے یا قدرت نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ انسانیت کو پریشانی میں مبتلا کیا ہے، دیکھ لیجئے دنیا کے تمام ریفارمر، فلسفی اور مصلح ناکام رہے، جن کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل نہیں رہی۔ کوئی فلسفی اور ریفارمر ایسا نہ ملے گا جس نے اپنی ناکامی ونامرادی کا اعتراف نہ کیا ہو، بات اتنی سی ہے کہ اسے نہ تو انسان کی تمام مخفی صلاحیتوں سے واقفیت ہے، نہ ان پر قدرت ہے، یہ کام صرف خالق تبارک وتعالیٰ کا ہے، چنانچہ انھوں نے انسان پر احکام جاری کئے، تو توازن واعتدال اور امن واطمینان کا ایک بہترین نمونہ سامنے آیا۔

اللہ کے احکام کی حکمتیں اور باریکیاں تو انھیں کو معلوم ہیں، لیکن انھیں کی رہنمائی میں جب ہم غور کرتے ہیں تو حکمتوں کا ایک پورا گلستاں لہلہاتا اور کھلا ہوا نظر آتا ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو احکام عنایت فرمائے ہیں، ان پر غور کیجئے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ہر جذبہ اور ہر ملکہ کے لئے اس کے مناسب احکام صادر فرمائے ہیں، کہ آدمی ان احکام پر عمل کرلے، تو وہ جذبہ تسکین کا سامان پالے گا، اور پھر اسے کوئی اور طلب باقی نہیں رہے گی، اس طرح دو متضاد جذبے اپنا اپنا محل استعمال پا کر مطمئن ہو جائیں گے، اور کسی کا کسی سے تصادم نہ ہوگا، اور انسانیت خوشحال ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بعض طاقتور جذبات ودیعت فرمائے ہیں، یہ طاقتور جذبات فطرتِ انسانی میں چھپے نہیں رہ سکتے، ان کا نمود وظہور بہر حال ہونا ناگزیر ہے۔

مثلاً محبت وعداوت کا جذبہ! مثلاً شہوت وعفت کا جذبہ! شہوت کا جذبہ انسان میں بہت طاقتور ہے، اسی پر نسل انسانی کی بقاء وتسلسل کا انحصار ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن جن راستوں سے اس جذبہ کی تسکین ہوسکتی ہے، آدمی ان راستوں پر دوڑتا رہے، لیکن اگر اس نے ایسا کیا تو عفت وپاکدامنی کا جذبہ، جو انسان کو انسانیت پر باقی رکھتا ہے، ٹوٹ پھوٹ کر کے بکھر جائے گا، فطرتِ انسان جیسے شہوت کے ہاتھوں مجبور ہے، ایسے ہی عفت وپاکدامنی کا جذبہ بھی اسے ہر قدم پر روکتا ٹوکتا ہے، اس روک ٹوک کے نتیجے میں باہم تصادم ہوتا ہے، اس سے انسانیت برباد ہوتی ہے، اور معاشرہ کی اجتماعی انسانیت جب برباد ہوگی، تو پوری آبادی بربادی کی آگ میں جھلس جائے گی، اللہ تعالیٰ نے جب انسانیت کی فلاح کے احکام اتارے، تو ہر ایک

جذبے کا محل استعمال متعین فرمادیا، اور اس کو اتنا عموم بخشا اور اس وسعت وعموم میں ایسی قیدیں لگائیں کہ جذبۂ شہوت بھی تسکین پائے اور عفت کے نازک حدود بھی برقرار رہیں، اور نسل انسانی کے بقاء وتسلسل کا عمل بھی جاری رہے۔

شہوت کے تقاضا کو پورا کرنے کیلئے مردوں اور عورتوں کو باہم نکاح کی اجازت دی، نکاح کے نتیجے میں دونوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان میں عورتوں کی ذمہ داری ذرا نازک اور پیچیدہ ہے، لیکن ان کی فطرت کے عین مطابق ہوتی ہے، اس لئے بیک وقت انھیں ایک ہی مرد سے نکاح کی اجازت ہے، ورنہ ایسی کش مکش بلکہ کشاکش میں پڑ جائیں گی کہ انھیں اس کا تحمل نہ ہو سکے گا۔

اور مردوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور عورتوں کی ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے ان کے لئے مزید وسعت درکار ہوتی ہے، تو ان کو بیک وقت چار نکاح کی اجازت ہے، چار نکاحوں کی ضرورت تو کسی کسی کو ہوتی ہے، ورنہ ایک ہی نکاح شہوت کے تقاضوں کی تسکین کے لئے کافی ہوتا ہے، اس طرح انسان کو اس کے شہوانی وفطری جذبہ کو بھی تسکین ہوجاتی ہے، اور عفت وعصمت کا فریضہ بھی دونوں فریق سے بحسن وخوبی ادا ہوجاتا ہے، اور نسل انسانی آگے کو قدم بڑھاتی رہتی ہے اور معاشرہ پُر امن وپُرسکون ہوتا ہے۔

یہی حال محبت وعداوت کا بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے ان دونوں طاقتور جذبات کے استعمال کے الگ الگ محل متعین کردئے ہیں، اگر ان کا استعمال ان کے محل پر ہوتا رہے تو دنیا امن وآشتی کا گہوارہ بنی رہے گی، محبت کا محل اللہ ہے اور اللہ والے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (سورۃ البقرۃ:) يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (سورہ مائدہ:) يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (سورۃ البقرۃ:) جولوگ ایمان والے ہیں، وہ اللہ سے بہت راسخ محبت رکھتے ہیں۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ اللہ ان سے محبت رکھتا ہے، اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ تیسری آیت میں فرمایا کہ کفار اپنے بتوں سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسے اللہ سے محبت ہوا کرتی ہے۔

یہ محبت کا محل ہے، اللہ تعالیٰ، اللہ والے، اور وہ جن سے اللہ تعالیٰ محبت رکھنے کا حکم دیں اور عداوت کا محل دشمن خدا، شیطان ہے، فرمایا: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ

عَــــدُوّاً (سورۃ الفاطر:٦) شیطان تمہارا دشمن ہے، تو تم اسے دشمن بنالو۔ اب محبت ودوستی اور عداوت ودشمنی کا محل متعین ہوگیا، اب کہیں تصادم نہ ہوگا، اور ماحول میں فساد پیدا نہ ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح فطرتِ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے غضب کا مادہ بھی رکھا ہے اور حلم ورحمت کا مادہ بھی، اور یہ دونوں متضاد ہیں۔ حق تعالیٰ نے دونوں کیلئے الگ الگ محل عمل متعین کئے ہیں، محل رحمت وہ لوگ ہیں صاحب ایمان ہیں، اور محل غضب وانتقام وہ ہیں جو کفر وشرک میں ملوث ہیں، اور زمین میں فساد مچانے کے درپے ہیں، صحابہ کرام علیہم الرحمۃ والرضوان کے اوصافِ عالیہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: أَشِـدَّاءُ عَـلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْـنَهُـمْ (سورۃ الفتح:۲۹) کفار پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ خود حضور اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ: يَاأَيُّهَا النَّبِيّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (سورۃ التحریم:۹) اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ اور فرمایا گیا: وَاخْـفِـضْ جَـنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَـعَكَ مِـنَ الْـمُـؤْمِنِيْنَ (سورۃ الشعراء:۲۱۵) اور جن مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے، ان کیلئے اپنے بازو جھکادو۔

تو رحمت کا محل الگ ہے، اور غضب کا محل الگ ہے، غضب اور انتقام کی تشکیل جہاد و قتال کی صورت میں کی گئی ہے، کافر اللہ کا باغی ہے، دعوتِ حق کا دشمن ہے، جنت سے دور اور جہنم سے قریب ہے، ایک صاحب ایمان جس کی ہستی کے اجزائے ترکیبی میں غیظ وغضب کا عنصر بھی شامل ہے، اور وہ اپنے اظہار ونمود کے لئے بے قرار ہے، اس کیلئے اس سے بہتر محل کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ کے دشمن پر اظہارِ غضب کرے اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹادینے کی سعی وکوشش کرے۔

جب غیظ وغضب اپنے محل پر پہونچ گیا، اور طبیعت انسانی نے اس مسئلے میں قرار پالیا، تو محبت ورحمت کا عنصر اپنے محل پر بآسانی پہونچ جائے گا، یعنی اللہ کے ماننے والوں، اس کے دوستوں کی طرف لپکے گا، ایک طرف دشمن مٹے گا، دبے گا، کمزور ہوگا تو دوسری طرف دوستوں کی تعداد بڑھے گی، محبت واُنس میں استحکام ہوگا، دنیا راحت پائے گی۔

کیونکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ انسان کے جذبات وملکات کو ظہور وبروز کی صحیح راہ مل جائے اور ہر جذبہ اپنے صحیح محل اور مقام پر پہونچ جائے، تو جذبات کی کشاکش سے نجات مل

جاتی ہے، آدمی مطمئن ہوجاتا ہے، اور اس کے اطمینان کی وجہ سے دنیا میں اطمینان کی چادر تن جاتی ہے۔

اور اگر انسانی جذبات کے خروج وظہور کا صحیح راستہ نہ بنایا جائے، اور درست راستے سے اسے نکلنے کی اجازت نہ دی جائے، تو جذبات کا منہ زور طوفان اٹھے گا ضرور! مگر صحیح راستہ نہ پائے گا تو غلط رُخ اختیار کرلے گا، اور دنیا میں فساد برپا ہوگا۔

پانی کا سیل رواں چلے، اور اسے گزرنے کی صحیح راہ مل جائے، تو وہ بغیر کسی خرابی کے نکلتا چلا جائے گا، اور اگر اسے صحیح راستہ نہ ملا، تو ادھر ادھر پھیل کر کارآمد زمینوں کو غرقاب کردے گا، اور زرخیز زمینوں کو بنجر بنا کر رکھ دے گا۔

آدمی کو نکاح کی اجازت نہ ہو، یا نکاح نہ کرتا ہو، تو شہوت کا طوفان رک تو سکتا نہیں، اس میں ہلچل مچے گی، پھر نگاہ بھی فاسد، کان بھی بدبخت، خیال بھی آوارہ ہوکر رہ جائے گا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کئی عفتیں چکنا چور اور عصمتیں لٹ کر رہ جائیں گی، پھر خاندان کے خاندان پر تباہی کے بادل منڈلانے لگیں گے۔

نکاح کی قید میں عورت اور مرد کو ڈال کر تقاضائے شہوت پورا کرنے کی آزادی عطا کردی گئی، تو یہ دونوں بطور خود مطمئن تو ہوئے ہی، تمام انسانیت کو اندیشہ ہائے گوناگوں سے نجات مل گئی، پھر عزت وآبرو کے ساتھ نسل انسانی کے باقی رہنے کا انتظام بھی ہوگیا۔

خدا کی نازل کردہ شریعت کی یہ خوبی ہے کہ انسان کے تمام جذبات وملکات کا صحیح مصرف نہایت اعتدال اور توازن کے ساتھ متعین کردیا گیا ہے، ہر ایک جذبہ اپنے اپنے محل پر پہونچ کر پُرسکون اور مطمئن ہے، اسے کسی اور طرف تاکنے جھانکنے کی ضرورت ہی نہیں، نہ کوئی ہیجان نہ بےاعتدالی! خود بھی خرخشے سے خالی اور دنیا بھی ہر اندیشہ سے پاک!

جہاد بھی شریعت کے اسی نظامِ فطرت کا مظہر اتم ہے، اللہ نے انسان میں جب رحمت و محبت کا جذبہ رکھا ہے، اسی کے ساتھ شدت وغضب کا مادہ بھی ودیعت فرمایا ہے، اگر ان دونوں متضاد جذبوں کو ان کی اپنی اپنی راہ پر نہ ڈالا گیا، تو کش مکش ہوگی اور دونوں غلط جگہوں پر ظہور کریں گے، اور دنیا آماجگاہِ فساد بن جائے گی۔

ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ دنیا سے خیر وشر کی کش مکش مٹادی جائے، اس دنیا میں یہ کش مکش دائمی ہے، دونوں کا علیحدہ علیحدہ وجود تو قیامت کے بعد ہوگا کہ خیر تمام تر جنت میں اور شر تمام تر جہنم میں۔ دنیا میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں، پس ضروری ہے کہ محبت ورحمت کے جذبے کو خیر کی طرف متوجہ کر دیا جائے، اور شدت وغضب کے رُجحان کو شر سے ٹکرا دیا جائے، اس صورت میں آدمی بھی مطمئن ہوگا، اور عالم انسانیت بھی پُرسکون رہے گا۔

اور اگر ایسا نہ ہو تو غصہ وانتقام کی آگ کبھی خیر پر بھڑکے گی، کیونکہ اسے شر نہیں ملا، اور محبت ورحمت کی پھوار شر پر برسے گی، کیونکہ اسے خیر نہیں ملا، اور ان دونوں سے دنیائے انسانیت آفت میں مبتلا ہوگی۔

اس فطری انتظام کا اشارہ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ میں ملتا ہے، صحابۂ کرام جو اس فطری نظام کے اولین اور بنیادی نمونہ ہیں، ان میں رحمت وغضب کی راہیں الگ الگ نمایاں ہیں۔ رحمت کا ظہور اپنی جگہ پر اور غضب کا ورود اپنی جگہ پر، اسی لئے ان حضرات میں بے نظیر خلوص اور اتحاد تھا۔

اگر جہاد کا یہ فطری نظام نہ ہوتا، تو باہم تصادم اور ٹکراؤ ہوتا، اور جہاں امن واطمینان ہونا چاہئے وہاں فساد وطغیان برپا ہوتا، چنانچہ تجربہ ہے کہ جہاں جہاں بھی جہاد کا نظام قائم ہوا باہمی محبت واخوت کا دور دورہ رہا ہے، جب کسی دشمن نے مسلمانوں کے معاشرہ پر حملہ کیا اور مسلمان جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، تو آپس کی کدورتیں، عداوتیں فنا ہوگئیں، اور ان سب کا رُخ غیروں کی طرف پھر گیا۔ اس لئے کسی مسلم معاشرہ کی بقاء واصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ ''نظامِ جہاد'' ہے، جہاد ہمارے لئے کوئی باعث ننگ وعار چیز نہیں ہے، بلکہ ایک فطری نظام ہے، جس کے فوائد دنیا میں بھی بہت ہیں اور آخرت میں بھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی گذر چکا ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۵۱) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتے تو زمین برباد ہوکر رہ جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر فضل فرماتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا (سورۃ الحج:۴۰) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو ڈھادئے جاتے تکیے، اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بہت کیا جاتا ہے۔

یعنی اگر کسی وقت اور کسی حالت میں ایک جماعت کو دوسری سے لڑنے بھڑنے کی اجازت نہ ہوتو یہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کی سخت خلاف ورزی ہوتی، اس نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ ہر چیز یا ہر شخص یا ہر جماعت، دوسری چیز یا شخص یا جماعت کے مقابلے میں اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لئے جنگ کرتی رہے، اگر ایسا نہ ہوتا اور نیکی کو اللہ تعالیٰ اپنی حمایت میں لے کر بدی کے مقابلے میں کھڑا نہ کرتا تو نیکی کا نشان زمین پر باقی نہ رہتا، بددین اور شریر لوگ جن کی ہر زمانہ میں کثرت رہی ہے، تمام مقدس مقامات اور یادگاریں ہمیشہ کیلئے صفحۂ ہستی سے مٹادیتے۔ کوئی عبادت گاہ، تکیہ، خانقاہ، مدرسہ محفوظ نہ رہ سکتا۔ بناءً علیہ ضروری ہوا کہ بدی کی طاقتیں خواہ کتنی ہی مجتمع ہوجائیں، قدرت کی طرف سے ایک وقت آئے جب نیکی کے مقدس ہاتھوں سے بدی کے حملوں کی مدافعت کرائی جائے۔ مسلمانوں کو کافروں کے مقابلے میں جہاد وقتال کی اجازت دینا اسی قانونِ قدرت کے ماتحت تھا، اور یہ وہ عام قانون ہے جس کا انکار کوئی عقل مند نہیں کرسکتا۔

اگر مدافعت وحفاظت کا یہ قانون نہ ہوتا تو اپنے اپنے زمانے میں نہ عیسائی راہبوں کے صومعے (کوٹھرے) قائم رہتے، نہ نصاریٰ کے گرجے، نہ یہود کے عبادت خانے، نہ مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بڑی کثرت سے ہوتا ہے، یہ سب عبادت گاہیں ڈھا کر اور گرا کر برابر کردی جاتیں، پس اس عام قانون کے تحت کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک وقت مناسب پر اپنے دشمنوں سے لڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔ (فوائد عثمانی)

نظامِ جہاد کا دنیا میں عظیم ترین فائدہ یہ ہے کہ خود اہل ایمان میں باہم للہ فی اللہ محبت قائم اور تعلقات اُستوار رہتے ہیں، اور سب سے پاکیزہ معاشرہ وہی ہوتا ہے جس میں باہم بے غرض محبت والفت قائم ہو، اس پاکیزہ معاشرہ جہاں اور بہت کچھ فوائد ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ

حاصل ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو جب اس معاشرے کے مطالعہ اور مشاہدہ کا موقع ملتا ہے، تو بہت جلد ان کے قلوب میں ایمان داخل ہوتا ہے، جہاد کے تحت جو لوگ گرفتار ہو کر آتے ہیں، اور وہ اس پاکیزہ معاشرہ میں غلام بنا کر تقسیم کردئے جاتے ہیں، تو دیر نہیں گذرتی کہ وہ حلقۂ اسلام میں خلوص و دیانت کے ساتھ داخل ہو جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی آزادی کی بہت سی سبیلیں بنا رکھی ہیں، ان سے فائدہ اٹھا کر بکثرت آزادانہ زندگی گزارتے ہیں، اور علم وعبادت کے نمونے بن جاتے ہیں، جب جہاد کا نظام موجود تھا تو غلاموں کی ایک فوج تاریخ کے صفحات میں ملتی ہے، جس نے علم و دین میں امامت وقیادت کا منصب بلند حاصل کیا۔

جہاد کے واسطے سے دنیا کی یہ برکت بجائے خود بے شمار برکات وفوائد پر مشتمل ہے، اس مختصر تحریر میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں، تاہم پانے والے ان اشارات کی روشنی میں بہت کچھ پاسکتے ہیں۔

اخروی فائدہ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جہاد میں اللہ کے لئے جان دینے والا اللہ کے نزدیک وہ اعزاز پاتا ہے کہ حق تعالیٰ اسے مردہ کہنے کو منع فرماتے ہیں، وہ زندہ ہے، اور شہید ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے دربار سے اسے خاص عزت وتکریم، رزقِ کریم، اور جنت کے سائے میں پرواز اور عرشِ الٰہی کے نیچے قیام کی اجازت مل جاتی ہے۔

شہادت وہ اعزاز ہے، جس سے بلند تر صرف منصب نبوت اور مرتبۂ صدیقیت ہے، شہادت اللہ کے لئے، رسول کے لئے، اسلام کیلئے وفاداری کی ایک بلند اور محکم ترین دلیل ہے، قرآن پاک میں احادیث رسول میں مرتبۂ شہادت کے سلسلے میں بڑے بلند کلمات ہیں۔

اس لئے جہاد اور اس کے نتیجے میں شہادت یا فتح مندی، یہ سب انسانیت کی وہ بلندیاں ہیں جن تک رسائی ہو جانا دنیا و آخرت کی عین خوش بختی اور سعادت مندی ہے۔

مولانا انوار احمد صاحب لائق صد مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اسلام کے شہداء سابقین پر اتنی مفصل اور جامع کتاب تیار کردی ہے، حق تعالیٰ انھیں شہداء کے طفیل میں کتاب کو بھی اور صاحب کتاب کو بھی قبول فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆

سیرت نبوی کی جامعیت کا ایک درخشاں باب
(مقدمہ ''امہات المومنین'')

فاضل گرامی مولانا انوار احمد صاحب خیرآبادی نے سیرت نبوی کا ایک پہلو منتخب کیا ''عہد نبوی کے غزوات و سرایا اور شہدائے اسلام'' انہوں نے بہت تحقیق و کاوش کے ساتھ اس موضوع پر دو ضخیم جلدیں تیار کر دیں، اور اہل علم اور اہل ذوق حضرات سے خراج تحسین حاصل کیا، سیرت نبوی کے اس پہلو پر جب لکھ کر وہ فارغ ہوئے، تو ان کے اشہب قلم نے سیرت ہی کا ایک اور میدان تلاش کیا، ان کے دل و دماغ نے مطالعہ کی وادیاں طے کیں اور رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی زندگی کا تفصیل سے جائزہ لیا، اور ''امہات المومنین'' کے نام سے ایک ضخیم جلد مرتب کر دی، پہلے موضوع پر اس حقیر کو مقدمہ لکھنے کی اور لکھ کر سیرت نگاری کے ایک گوشہ میں شامل ہونے کی سعادت ان کے واسطے سے ملی تھی، اب زیر نظر کتاب میں بھی مجھے شامل کرنے کا ارادہ انہوں نے کیا کہ یہ خاکسار پھر سیرت نگاروں کی گردِ رہِ کارواں بن سکے، میری سعادت ہے کہ چند سطریں میں سرکار دو عالم فداہ روحی وابی وامی ﷺ کی خدمت اقدس میں نذر کروں۔

اس جگہ ابتداء میں سیرت نبوی کی جامعیت کے بیان کے لئے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کی البیلی کتاب ''النبی الخاتم'' کا ایک صفحہ مستعار لیتا ہوں، مجھے یہ پوری کتاب بہت پسند اور محبوب ہے، اور یہ خاص صفحہ تو بڑا وجد آفریں ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے قارئین بھی اس وجد میں شریک ہو جائیں، فرماتے ہیں:

> ''پھر کیا مدینہ میں جو پایۂ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے، وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چمڑے کا اکہرا گدا ہے، نہ حاجب ہے، نہ دربان ہے، امیر بھی آتے ہیں، غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے، عجیب دربار ہے!

سلاطین کہتے ہیں شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں، مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتاء تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔

صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تحنث (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، فاقہ تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی ہیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے، بچوں کے سر ہاتھ پھیرا جاتا ہے، جس کو جو کہہ دیا جاتا ہے، پورا ہو جاتا ہے۔

مگر سچ یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لئے کہ وہ سب کے لئے تھا، آئندہ بھی جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔ (ص۱۵۳)

آپ معلم تھے، ہادی تھے، آپ کی تعلیم عام تھی، آپ کی ہدایت سب کے لئے تھی، آپ ساری انسانیت کے لئے معیار اور نمونہ تھے اسی لئے آپ کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے کا انتظام کیا گیا، آپ کی حیات طیبہ کے ہر گوشے کو اجاگر کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

اللہ نے انسان کی زندگی کو روز وشب کے دو بڑے شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے، پھر ان دونوں کے ذیلی اور ضمنی شعبے بہت سے ہیں تاہم بنیادی طور پر یہی دو شعبے ہیں، دن کی جلوتیں، اور رات کی خلوتیں! عام انسانوں کا حال تو یہ ہے کہ دن کی روشنی میں ان کی جلوتیں نمایاں ہوتی ہیں، نگاہیں ان پر پڑیں یا نہ پڑیں، ان کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو، لیکن رات کی تاریکی میں ان کی خلوتیں بہر حال مستور و مخفی رہتی ہیں، اور انہیں نمایاں کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

لیکن رسول کا معاملہ عام انسانوں جیسا نہیں ہے، کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، کسی کی نگاہ پڑے یا نہ پڑے، نہیں! رسول کی زندگی ہر امتی کی نگاہ میں رہنی چاہئے، وہ اسے تلاش کرے، جلوتیں بھی دیکھے، خلوتوں کو بھی جانے، تاکہ ہر مرحلۂ حیات میں آپ کے عمل کو اسوہ اور نمونہ بنائے، دن کی جلوتوں اور جلوتوں کے احوال واعمال کو دیکھنا نیز آپ کے فرمودات واقوال کو سننا تو فطرۃً آسان کر دیا گیا ہے، ماننے والوں کا جھرمٹ ساتھ ہے، نہ ماننے والے بھی پرکھ رہے ہیں، ماننے والے سنتے ہیں اور تعمیل ارشاد کرتے ہیں، نہ ماننے والے بھی سنتے ہیں، دل سے متأثر

ہوتے ہیں، گوزبان سے انکار کرتے ہیں،تو جلوت کے کام اور جلوت کی باتیں سب دیکھ رہے ہیں، سب سن رہے ہیں، موافق بھی، مخالف بھی، دوست بھی، دشمن بھی، اور دونوں اپنے اپنے انداز میں یادرکھتے ہیں، دوسروں تک پہونچاتے ہیں، دوسروں کو سناتے ہیں، ان دونوں راہوں سے رسول کی جلوتیں ان کی زندگی میں بھی عام ہوئی ہیں، اوران کے بعد بھی ان کی بقاء وحفاظت کا ایسا حیرت ناک اور عظیم الشان انتظام ہوا کہ کوئی ایسا عمل جو رسول سے صادر ہوا ہو اور کوئی ایسا کلام جو رسول کی زبان سے نکلا ہو، ایسا نہیں ہوا کہ ان کاموں اوران باتوں میں سے کوئی چیز گم ہوگئی ہو، حافظوں نے انہیں کھودیا ہو، اور تلاش کرنے والوں نے انہیں نہ پایا ہو، کس کس جتن سے آپ کے تلامذہ (حضرات صحابہ کرام) نے انہیں یادرکھا، بعد والوں کو بتایا، زبان سے بھی بتایا، عمل کرکے بھی دکھایا، اور پھر وہ سب چیزیں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہیں، اور تواتر کے ساتھ بعد والوں میں پھیلتی رہیں۔

جلوتوں کا یہ انتظام تو مسلسل رہا، از اول تا آخر رہا، مکہ میں بھی رہا، مدینہ میں بھی رہا، حضر میں بھی رہا، اور سفر میں بھی رہا، فداکاروں کا مجمع ہمہ وقت پروانوں کی طرح اس شمع ہدایت پر نثار ہوتا رہا، جنگ میں بھی، صلح میں بھی۔

ضروری تھا کہ آپ کی خلوتوں کے اظہار واعلام کا بھی انتظام کیا جائے، مکہ کی پوری زندگی آزمائشوں اور انکار وتمرد کے مظالم کی بھٹیوں میں تپتی رہی، وحی ونبوت کی تیرہ سال کی مکی زندگی مسلسل جانکاہیوں، مشقتوں، ایذاؤں اور کفر وانکار کی تلخیوں میں گھری رہی، مدنی زندگی کا بھی ابتدائی دور، مخالفت کی ہواؤں اور آندھیوں میں الجھارہا، جن کے بگولے مکہ اور اطراف مکہ سے اٹھتے رہے، اور مدینہ کو جھلسانے کی کوشش کرتے رہے، پھر اخیر کے چند برسوں میں قدرے مہلت ملی، اگرچہ خرخشے اب بھی سکون کو درہم برہم کررہے تھے، تاہم بقیہ چند سالوں میں ضروری تھا کہ دین کی تعلیم کی تکمیل کردی جائے، تربیت نفوس کا کام پورا کردیا جائے، اور موجودہ امت کو اس لائق بنادیا جائے کہ بعد کی امت جو بہت کثیر تعداد میں، مختلف طبقوں سے، مختلف ملکوں سے، مختلف رنگ ونسل سے حلقۂ اسلام میں آئے گی، ان کی تعلیم وتربیت کا فریضہ ٹھیک نمونہ کامل اور اسوۂ حسنہ کے طرز وانداز پر یہ حضرات ادا کرسکیں۔

پس زندگی کے انہیں آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں اور پاکبازوں کی ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی ہے جن کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی جلوتوں کو محفوظ کردیا گیا ہے، اورانہیں کے ذریعے یہ باتیں رہتی دنیا تک منتقل ہوتی رہیں گی۔

ارادہ کیا گیا کہ رسول کی خلوتیں، خلوت کی باتیں، خلوت کی راتیں، خلوت کی عبادتیں بھی روشنی میں آجائیں، تاکہ سیرت کا یہ شعبہ مخفی نہ رہ جائے، ہر آدمی کے لئے خلوت ناگزیر ہے، کیا مرد اور کیا عورت! تو کیا اس کے لئے رسول کی زندگی کا نمونہ درکار نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے، پھر اگر اس کا انتظام نہ ہو، تو نمونہ ادھورا رہ جائے گا، تلاش کرنے والا دن کو، اور دن کے اعمال کو تو روشن پائے گا لیکن رات کے حصے میں جو زندگی کا نصف حصہ ہے اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔

پھر یہ بھی ہے کہ انسانیت کا نصف یا نصف سے زائد حصہ صنف نازک (عورتوں) پر مشتمل ہے، ان کے لئے متعدد معاملات میں اسوہ اور نمونہ عورتوں ہی کی زندگی میں مل سکتا ہے، عورتوں کے کچھ خصوصی معاملات ہیں، جن کو سمجھانے، بتانے کے لئے عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ سارے جہاں کی عورتوں کے لئے، قیامت تک نسل انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں، ان سب کے لئے، ان کی تعلیم وتربیت کے لئے، ان کے نمونہ کے لئے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کی مشیت نے مردوں میں ایک سے بہتر ایک آپ کی صحبت و رفاقت کے لئے انتخاب فرمائے اور ہر مذہب وملت سے منتخب فرمائے، بت پرستوں میں سے، یہودیوں میں سے، عیسائیوں میں سے، تاکہ آپ کی تعلیمات ہر طبقے اور ہر مذہب میں عام ہوں اسی طرح مشیت حق کا تقاضا ہوا کہ ان مختلف مذاہب وطبقات میں سے بہتر سے بہتر عورتوں کا انتخاب ہوتا کہ ان کے ذریعے سے انسانیت کے اس نصف حصے میں بھی اسوۂ حسنہ کا پھیلاؤ ہو سکے

عورت مرد کی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے، جس طرح عورت کے لئے مرد ایک بنیادی لازمہ ہے، بقائے نسل انسانی کا دارومدار دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ احتیاج اور ضرورت پر ہے، لیکن اس ضرورت کے علاوہ اور بھی زندگی کی کتنی ضرورتیں اس احتیاج سے وابستہ ہیں، اور اس طرح باہم وابستہ اور پیوستہ ہیں کہ انہیں جدا کرنا تو کیا ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ دیکھنا اور

ان کا جائزہ لینا بھی مشکل ہے،لیکن ان ضرورتوں میں نمایاں اور غالب ضرورت وہی سمجھی جاتی ہے جس کا تعلق آدمی کی نوجوانی سے ہے،جس کے نتیجے میں نسل انسانی کا تحفظ ہوتا ہے، پھراس کے متعدد لوازم انسان کی طبیعت کے تقاضے سے ابھرتے ہیں،حسن و جمال،عنفوان شباب، ہم سنی یا کمسنی وغیرہ ان لوازم کے ساتھ مردوں اور عورتوں میں موافقت ہوتی ہے، پھر جوانی کے جذبات بے قابو ہوں تو انسانیت تباہی کے دہانے پر پہونچ کر رہتی ہے،اوراس کو قابو میں رکھنے کے لئے دنیا کے تمام شرائع وقوانین میں نکاح کا دستور ہے۔

بیمار ذہنیتوں اور مریض دماغوں نے شور مچایا کہ پیغمبر اسلام نے ایک نہیں متعدد نکاح کئے گویا یہ بھی کوئی جرم ہے جسے وہ پیغمبر اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کا مرتبہ گھٹانا چاہتے ہیں

جرم یہ ہے کہ آدمی بغیر کسی شرعی قاعدہ وقانون کے عورتوں کو اپنی خدمت میں رکھ لے، یا بغیر اذن الٰہی کے عورتوں سے شہوت کا تعلق رکھے،جیسا کہ پرانی تاریخوں میں بادشاہوں، امراء اور رؤسا کے احوال میں بکثرت ملتا ہے، یا مصنوعی مذہبی گھروندوں سے اللہ جانے کتنی کنواری لڑکیاں وابستہ ہوتی ہیں اور وہاں کے پجاریوں، پروہتوں اور پادریوں کی ہوسنا کیوں کا شکار بنتی ہیں، جرم اگر ہے تو یہ ہے! لیکن مجرموں نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے بے قصوروں کے سر جرم کی تہمت لگائی۔

کاش آنکھ والے دیکھیں اور دماغ والے سوچیں کہ مکہ کا وہ نوجوان جو ساری انسانیت کے لئے نمونہ بننے والا تھا،جس کا بچپن ہی نہیں اس کی جوانی بھی معصوم ہے،اوراس کو جاننے والا ہر فرد،اس کا گھر،اس کا خاندان،اس کا شہر سب اس کی معصومیت کا گواہ ہے،اس کی جوانی کو جب عورت کی ضرورت تھی، تب ایک ایسی جگہ سے نکاح کا پیغام آیا، جہاں اس عمر کے نوجوانوں کے تمام شرائط ولوازم ناپید تھے،مگر اس نوجوان نے اس پیغام کو قبول کیا،پچیس سال کی عمر کے نوجوان نے چالیس سال کی بیوہ کو اپنے حلقۂ نکاح میں لیا،اوراس خاتون کے ساتھ جوانی کے بہترین ایام پچاس برس کی عمر تک گزار دیئے، یہ خود اس بات کی شہادت ہے کہ طبیعت کا یہ فطری جذبہ کس قدر پاکیزہ اور قابو میں تھا۔

اس پہلے نکاح کے لئے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتخاب درحقیقت خدا

کی جانب سے تھا، یہ نکاح کتنا بابرکت ثابت ہوا، اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں، جنہیں سیرت نبوی سے واقفیت ہے، آپ کی تمام اولادیں حضرت ابراہیم کے علاوہ انہیں کے بطن سے ہوئیں، پھر رسول اکرم ﷺ کی رفاقت کا حق ہر مشکل وقت میں ادا کیا، بالخصوص آغاز نبوت میں ان کی زبان مبارک سے تائید اور تسلی کے جو کلمات صادر ہوئے وہ بالکل الہامی کلمات تھے، اسی لئے ان کی وفات سے جو صدمہ حضور کو ہوا، اسے تا زندگی آپ نے یاد رکھا، ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ کا نکاح دوسری سن رسیدہ خاتون حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے ہوا ان کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے نکاح میں آئیں، لیکن ان کی رخصتی کئی سال کے بعد مدینہ طیبہ میں ہوئی، ان چند برسوں میں حضرت سودہ تنہا آپ کے ساتھ رہیں، ہجرت کے سات آٹھ ماہ کے بعد ان کے ساتھ حضرت عائشہ بھی شریک ہوئیں، اس وقت آپ کی عمر شریف ۵۴ سال کے قریب تھی، باقی سب نکاح آپ کے ۵۵ سال کی عمر سے ۵۹ سال کی عمر تک میں ہوئے ہیں، اور یہ سب نکاح بجز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سب سن رسیدہ بیوہ خواتین سے ہوئے ہیں۔

ناظرین اس تفصیل سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کے یہ سب نکاح بشری حاجت کی مجبوری سے ہوئے ہیں؟ یا اس سے بہت ارفع واعلیٰ خاص مقاصد کے تحت ہوئے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ آپ صرف ایک بشر نہ تھے، جو حاجات وضروریات کی بندشوں میں گرفتار ہوتا ہے اور اسی کے تابع ہو کر اپنی زندگی کے نقشے میں رنگ بھرتا ہے، آپ کی بشریت صرف مجبوریوں اور ضرورتوں کے حصار میں محصور نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ آپ اللہ کے رسول بھی تھے، اور یہی حیثیت آپ کی غالب تھی، اور بشریت اس کے سامنے مغلوب تھی، اسی لئے بشریت کی کمزوریاں تو آپ پر کیا اثر انداز ہوتیں، بشریت کے لوازم وآثار سے بھی آپ مغلوب ومتاثر نہ ہوتے تھے، کھانے پینے سے وہ بے نیازی کہ پیٹ پر دو دو پتھر بھی بندھ جائیں تو کمزوری نہ ہوتی، نیند سے اتنا استغنا کہ راتیں جاگ جاگ کر گزار دیتے، اور نیند کی مجبوری سے کبھی سوتے ہوئے آپ کو نہیں پایا گیا اور نیند بھی ایسی کہ آنکھ سو رہی ہے، مگر دل جاگ رہا ہے، جنگوں میں سارا لشکر تھک کر چور ہو جاتا اور آپ پورے نشاط سے نماز میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، اور رات رات بھر

کھڑے ہیں،غزوہ خندق کی سنگین راتوں میں دیکھنے والے آپ کو دیکھتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کواللہ کا حکم ہو چکا تھا کہ: **قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین ، لا شریک له و بذلک امرت و انا اول المسلمین** (سورہ الاعراف) تم کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا، اور میں پہلا فرمانبردار ہوں۔

آپ کی بشریت اس حکم الٰہی میں فنا ہو چکی تھی ، پس آپ کا کھانا پینا، سونا جاگنا، نکاح کرنا کوئی بھی بشری تقاضے سے نہ تھا، حکم الٰہی کے ماتحت دین وشریعت کے بلند مقاصد حاصل کرنے کے لئے تھا۔

آپ نے اخیر زندگی کی قلیل مدت میں یعنی صرف چار سال کی مدت میں، جب کہ اسلام کی روشنی میں پورا عرب چمکنے کے قریب ہو رہا تھا اور عرب کے باہر بھی اس کی روشنی پھیلنے والی تھی، اسلام کا کام بہت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، اب ضرورت تھی کہ جہاں مردوں کی تربیت ہو رہی تھی عورتوں کا ایک گروہ بھی نمونہ کا گروہ تیار کر دیا جائے ، اسی بلند دینی مقصد کے تحت ایسا ہوا کہ آپ نے خام فہم اور ناتجربہ کار عوتوں کا انتخاب نہیں کیا، کیوں کہ انہیں دوسروں کے لئے نمونہ بنانا تھا، وقت بھی کم تھا، فرصت تنگ ہو رہی تھی ، شاید یہی وجہ ہے کہ چن چن کر مختلف طبائع اور مزاج ، مختلف مذاہب اور دیانات کی سن رسیدہ فہمیدہ وسنجیدہ، بیوہ عورتیں جو زندگی کے سرد وگرم کا تجربہ کر چکی تھیں، ان کی ایک برگزیدہ ، پاک اور منتخب جماعت کو مختلف اسباب و وجوہ کے پردے میں، قدرت نے آپ کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا، جب آپ کا اپنے فرض سے سبکدوشی کا وقت آخر ہو رہا تھا، یہ بات کھل چکی تھی کہ اب مکہ فتح ہوگا، خدا کی زمین جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوگی ، جس کے بعد آپ کا کام پورا ہو چکے گا، پس اس کام کو کامل طور پر پورا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مردوں کے ساتھ چند عورتوں کی تعلیم وتربیت کا کام اپنی آخری زندگی میں اسی حیثیت سے انجام دیتے ، جس حیثیت سے مردوں کی منتخب اور چیدہ جماعت کی تربیت آپ نے فرمائی تھی، لیکن فراست نبوی کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ آپ نے

مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور نام نہاد روحانی پیشواؤں کی مجرمانہ پیش دستیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کر کے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

پچھلے دنوں بیت المقدس کی خدمت کے لئے ایک بزرگ ہستی حضرت عمران کی بیوی نے صرف ایک لڑکی (مریم) کو پیش کیا تھا، پھر دیکھئے اس ایک کنواری کی آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر، پادریوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں، خدانخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی کی وہ حیثیت دے دی جاتی، جو باہر مردوں کو حاصل تھی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد کو آدم کے لبادہ میں کتنے ابلیسوں کے لئے قرب و نزدیکی کا یہ حیلہ کن کن شرارتوں اور خباثتوں کی بنیاد بن جائے گا۔

الغرض ان عورتوں کو ''بیوی'' کا مقام عطا کیا، اور جس کو انسان سوچ نہیں سکتا، اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ آپ نے پیش کیا، اس وقت جب کہ آپ کا دماغ عالمگیر سیاست، عالمگیر حکومت، ہمہ گیر تعلیم و تربیت کی الجھی ہوئی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھا، عین اس وقت عائلی اور خانگی زندگی کی ژولیدگیوں کو بھی نہایت خندہ پیشانی سے حل کر رہا تھا۔(النبی الخاتم)

لوگوں نے آپ کے حرم میں بہت سی خواتین کو تو دیکھا، لیکن یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ان نکاحوں میں انسانی طبیعت کے تقاضے کتنا دخل رکھتے ہیں؟ اور شریعت و حکمت کی کتنی مصلحتیں کارفرما ہیں؟

آپ کتاب میں ازواج مطہرات امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے تذکرے تفصیل سے پڑھیں گے وہاں ان نکاحوں کی مصلحتیں اور حکمتیں واضح طور پر آپ پڑھیں گے، میں تو اشارات سے بھی کام لوں تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا لیکن چند ایک اشارے اگر ذکر کر دوں تو مضائقہ نہیں۔

ام المومنین حضرت صفیہ خاتون ایک یہودی عالم کی صاحبزادی تھیں، ان سے نکاح کے پہلے جتنی جنگیں کفار نے اہل اسلام کے ساتھ کی تھیں، ان سب میں یہود کا ہاتھ تھا، مگر حضرت صفیہ سے نکاح کے بعد یہود، مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے۔

سردار کفار ابوجہل کے قتل کے بعد مسلمانوں کے خلاف جنگ کی کمان ابوسفیان نے سنبھالی، لیکن حضرت ﷺ کا نکاح جب ابوسفیان کی صاحبزادی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے ہوا، اس کے بعد باپ نے مسلمانوں کے خلاف کوئی جنگ نہیں کی، بلکہ تھوڑے عرصے کے بعد وہ خود دائرہ اسلام میں آ گئے۔

ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا باپ مشہور رہزن تھا، اور مسلمانوں سے دلی عداوت رکھتا تھا، بنومصطلق کا مشہور طاقتور اور جنگ جو قبیلہ اس کے اشارے پر کام کرتا تھا، اس نکاح سے پہلے مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں اس قبیلہ کی شرکت ضرور پائی جاتی تھی، لیکن اس نکاح کے بعد یہ دشمنیاں یکسر معدوم ہوگئیں، پھر یہ قبیلہ مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہیں ہوا۔

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح پر غور کیجئے، ان کی ایک بہن سردار نجد کے نکاح میں تھی، اس نکاح نے ملک نجد میں صلح اور امن اور اسلام کے پھیلانے میں بہترین نتائج پیدا کئے۔

ام المومنین زینب بنت جحش، عائشہ صدیقہ، حفصہ اور ام سلمہ کے نکاح خالص اسلامی اغراض اور مصالح دینی پر مبنی تھے، حضرت زینب بنت جحش کے نکاح نے منہ بولے بیٹے کے بت کو توڑا، جب کہ زمانہ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کی بیوی نے سگے بیٹے کی بیوی کا درجہ حاصل کر رکھا تھا۔

حضرت عائشہ وحفصہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن کے نکاح نے قرآن کریم کی حفاظت اور احادیث رسول کی نشر واشاعت اور عورتوں کی تعلیم وتربیت میں غیر معمولی فوائد پہونچائے۔
(رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوری ملخصاً)

یہ مختصر مختصر سے نمونے ہم نے ذکر کئے، پورا علم تو اللہ ہی کو ہے، ہم کیا اور ہماری بساط علم کیا؟ اصل کتاب پڑھئے اور دل ودماغ کو روشن اور علم وایمان کو تازہ کرتے جائیے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف مدظلہ کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین۔

☆☆☆☆☆☆

مقدمہ ''اخلاق نبوی غزوات کے آئینے میں''

رسول اللہ ﷺ کا سب سے روشن اور واضح سرنامہ وحی ونبوت کے بعد ''حسن اخلاق'' ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح آپ کی وحی ورسالت کی گواہی قرآن کریم میں دی ہے، اسی طرح آپ کے حسن اخلاق کی گواہی بھی دی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: **وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ** (سورۃ القلم: ۴) بلاشبہ آپ بلندترین اخلاق کے مالک ہیں، اور ارشاد فرماتے ہیں: **فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ** (سورۃ النساء: ۱۵۹) یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ آپ ان کے لئے نرم دل ہیں، اگر آپ بدخو اور سنگدل ہوتے، تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہوجاتے۔ نیز ارشاد ہے: **لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ** (سورۃ التوبہ: ۱۲۸) تمہارے پاس تم ہی لوگوں کی جنس (یعنی بشر) سے ایک رسول آیا، اس کے اوپر ہر وہ چیز گراں ہے جس میں تمہارا ضرر ہو، تمہارے اوپر خیر کے لئے بہت حریص ہے، بالخصوص مومنین کے حق میں بہت مہربان اور رحم وکرم والا ہے۔

حق تعالیٰ سے بڑھ کر بندوں کا حال کون جان سکتا ہے، انھیں نے سب کو پیدا کیا ہے، **أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ** (سورۃ الملک: ۱۴) کیا وہی نہیں جانے گا؟ جس نے پیدا کیا ہے، جبکہ وہ لطیف (باریک بیں) بھی ہے، اور خبیر (ظاہر وباطن کی پوری خبر رکھنے والا بھی) ہے۔ تو جب خالق عز وجل نے خود اپنے رسول کے خلق عظیم کی گواہی دی ہے، تو اب کس شہادت کی ضرورت رہ جاتی ہے، آخر انھیں نے پیدا کیا، انھیں نے حسن استعداد ودیعت فرمایا، انھیں نے خاص طور پر تعلیم دی، اور خصوصی تربیت فرمائی، اور پھر ہمہ وقت نگرانی رکھی، پھر جب

وہی ارشادفرمائیں کہ آپ عظیم ترین اخلاق سے مالا مال ہیں،تو کسے شک کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

پھر پرکھنے والوں نے پرکھا، دیکھنے والوں نے دیکھا، برتنے والوں نے برتا، خلوت میں، جلوت میں، دوستوں میں، دشمنوں میں، خوشی میں، ناخوشی میں، دولت میں، تنگدستی میں، مسجد میں، بازار میں، گھر کی تنہائیوں میں، باہر کے مجمعوں میں، صلح میں، جنگ میں، حضر میں سفر میں، جوانی میں، کہولت میں، بڑھاپے میں، صحت میں، مرض میں، عبادات میں، معاملات میں، اولاد میں، ازواج میں، غرض زندگی کے احوال کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا گیا، ہر جگہ ایک خاص بات جس میں کبھی فرق نہیں پڑا، وہ آپ کے اخلاق حسنہ اور خصائل حمیدہ کی جلوہ گری ہے کہ ہمیشہ آفتاب کی طرح چمکتی رہی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ جب دس سال کے تھے، ہجرت مدینہ کے موقع پر ان کی ماں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ کہہ کر سپرد کیا تھا کہ پیش کرنے والے آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کررہے ہیں، میرے پاس کچھ نہیں۔ یہ ایک بیٹا ہے، جو سمجھ دار ہے، میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں کہ آپ کی خدمت کرے گا۔آپ ﷺ نے بچے کو قبول فرمایا، انھوں نے وقت اخیر تک یعنی دس سال تک آپ کی خدمت کی، بچپن کی عمر، غفلت کا زمانہ، اللہ ہی جانتا ہے کہ کہاں کہاں رسول اللہ ﷺ کے مزاج لطیف کے خلاف کیا کیا ہوا ہوگا، لیکن خود حضرت انسؓ گواہی دیتے ہیں۔فرماتے ہیں:

> میں نے اللہ کے رسول ﷺ کی دس برس خدمت کی ہے، آپ نے کبھی مجھ کو اُف بھی نہ کہی، اور نہ کبھی فرمایا کہ فلاں کام کیوں کیا، اور فلاں کام کیوں نہیں کیا۔(بخاری ومسلم)

یہ ہمہ وقت کے حاضر باش خادم کی گواہی ہے، کیا دس سال کی مدت میں اور وہ بھی اس عمر میں جبکہ کھیل کود کے شوق کا غلبہ ہوتا ہے، ان سے کبھی کوئی خلاف مزاج کام نہ ہوا ہوگا۔خلاف مزاج بھی ایک واقعہ انھیں حضرت انسؓ کی زبانی سن لیجئے، اور رسول اللہ ﷺ کے حسن اخلاق کا جلوہ دیکھئے، فرماتے ہیں:

> رسول اللہ ﷺ سب سے بڑھ کر خوش خلق تھے، آپ نے مجھ کو ایک دن کسی کام کے لئے بھیجا، میں نے کہا کہ میں تو نہیں جاتا اور دل میں تھا کہ جہاں کا حکم دیا ہے وہاں جاؤں گا (یہ

بچپن کا اثر تھا) میں وہاں سے چلا تو بازار میں چند کھیلنے والے لڑکوں پر گزرا، اچانک رسول اللہ ﷺ نے پیچھے سے میری گردن پکڑ لی، میں نے آپ کو دیکھا تو ہنس رہے تھے، فرمایا، جہاں میں نے کہا تھا تم گئے؟ میں عرض کیا جی ہاں! یا رسول اللہ میں جا رہا ہوں۔ (مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ان دونوں روایتوں سے اجمالاً رسول اللہ ﷺ کے مزاج وطبیعت کے جمال وکمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ تفصیلات دیکھنی ہوتو سیرت کی کتابوں اوراحادیث کے ذخائر پر نظر ڈالئے، حسن اخلاق کے جلوے ہر جگہ جگمگاتے دکھائی دیں گے جن سے قلب وروح کو ایمان کی روشنی اور حسن خلق کی پاکیزگی حاصل ہوگی۔

حسن اخلاق کا ملکہ جب طبیعت میں راسخ ہوتا ہے، تو زندگی کے ہر میدان میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور اگر اس ملکہ میں کچھ کمی ہوتی ہے، تو بعض حالات میں اخلاق عالیہ کا ظہور ہوتا ہے اور بعض نازک مواقع پر اس کا پتہ نہیں چلتا، خوشی کے حال میں اخلاق کا برت لینا مشکل نہیں ہے لیکن رنج وغم کی حالت میں اکثر اس کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، مزاج وطبیعت کے موافق کام ہو، تو حسن خلق کا معاملہ آسان ہے، مگر خلاف مزاج اور خلاف طبیعت مواقع پر اس کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

عام حالات میں جبکہ اپنے دوستوں، ہوا خواہوں کے درمیان آدمی ہوتا ہے، کھانے پینے کی فراوانی ہوتی ہے، مشکل حالات کا سامنا نہیں ہوتا، معمول کے مطابق زندگی کے لیل ونہار بسر ہو رہے ہوتے ہیں، اس وقت انسان حسن اخلاق کا مظاہرہ کر لے تو کچھ دشوار نہیں، لیکن اسی آدمی کو دیکھئے کہ مخالف حالات میں گھرا ہوا ہے، دشمنوں سے جنگ و پیکار کا ماحول ہے، ہر طرف اندیشوں اور خطرات کی یلغار ہے۔ کب حالات بے قابو ہو جائیں، کب لڑائی ہو جائے، کب دشمن چڑھ جائے، کہاں کیا خطرہ پیش آ جائے۔ اس بے اطمینانی اور خوف وہراس کے ماحول میں بھی انسان کے عقل وہوش بجا رہیں، اس کا دل مضبوط، اس کی زبان قابو میں رہے، حسن اخلاق کے راستے سے اس کا قدم نہ ڈگمگائے، تو یہ انسانیت کی معراج اور طبیعت کا کمال ہے۔ اس کسوٹی پر آپ دنیا کے نامور اشخاص کو پرکھئے، اور دیکھئے کہ ایسے نازک مواقع پر ان کی طبیعت اور مزاج کا کیا رنگ رہا ہے۔ اکثر کو آپ پائیں گے کہ ان کے قدم پھسل گئے ہیں، اخلاق کا دامن ہاتھ سے

چھوٹ چھوٹ گیا ہے سوائے ان کے جو رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر ٹھیک ٹھیک چلے ہیں، جنھوں نے اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کو اس سانچے میں ڈھال لیا ہے، جو سانچہ نبی کریم ﷺ اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے تیار فرمایا تھا۔ اس نازک مرحلے میں رسول اللہ ﷺ کو ڈھونڈیئے کہ خطرات جنگ کے ماحول میں آپ ﷺ کے اخلاق فاضلہ کا ظہور کس کس طرح ہوا ہے؟۔

معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ترسٹھ سالہ زندگی کا وہ دور جس میں نزول قرآن کا سلسلہ چل رہا تھا، جو ۲۳ر سال کے لمبے عرصے پر محیط ہے، جس میں آپ لوگوں کی کمر پکڑ پکڑ کر جہنم سے کھینچ رہے تھے، اور جنت کے راستے پر لا رہے تھے، اور لوگ پوری قوت سے آپ کی مخالفت کر رہے تھے، یہ پورا دور خطرات اور اندیشوں بلکہ مصائب وآلام سے گھرا ہوا تھا۔ مکہ میں تیرہ سال کا عرصہ تو اس طرح گزرا کہ صرف مظلومیت کے مصائب سہتے رہے، آپ بھی اور آپ کے جاں نثار صحابہ بھی، پھر مدینہ آئے، اور ایک خود مختارانہ زندگی کا انتظام ہوا تو مخالفین نے جنگ کا عفریت مسلط کر دیا۔ مظلوموں کو بھی جہاد کی اجازت ہوئی، مدینہ کی دس سالہ زندگی کا کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ آپ اور آپ کے اصحاب فراغت سے زندگی کے روز مرہ کاموں میں مشغول ہوتے۔ خطرات کی آندھیاں چلتی رہیں، کبھی بہ نفس نفیس رسول اللہ ﷺ کفار ومخالفین کے مقابلہ کے لئے نکلتے، کبھی اپنے جاں نثاروں کو بھیجتے، پھر ان کی واپسی تک ان کی طرف دل وجان سے متوجہ رہتے، ان اندیشہ ناک احوال میں آپ کا سابقہ جہاں اپنے رفقاء اور جاں نثاروں کے ساتھ ہوتا وہیں کچھ کھلے کچھ چھپے دشمنوں سے بھی ہوتا، خوش حالی تو کم ہی ہوتی، زیادہ تر تنگدستی اور بدحالی سے سابقہ رہتا، ایک طرف منافقین اور دوسری طرف یہود اپنی سازش میں مصروف رہتے، کبھی کبھی اپنے رفقاء کی طرف سے بھی خلافِ مصلحت کوئی کام ہو جاتا۔ ان سب احوال میں آپ کے اخلاق عالیہ کا معیار مسلسل برقرار رہا، آج تک کسی مخالف سے مخالف کو یہ جرأت نہیں کہ آپ پر بد اخلاقی کی کوئی حرف گیری کرتا۔

عرصہ سے خیال تھا کہ جنگوں اور غزوات میں آپ کے بلند ترین اخلاق کا مطالعہ امت کے حق میں مفید ہوگا، سیرت نبوی کا یہ باب اگرچہ کتابوں میں پھیلا ہوا ہے، لیکن اگر اسے اسی

عنوان سے اکٹھا کر دیا جائے، تو امت کے دلوں میں نبی اکرم ﷺ کی محبت میں بھی اضافہ ہوگا، جو کہ عین ایمان ہے، اور ہوسکتا ہے کہ اتباع کی بھی توفیق اللہ کی طرف سے کسی صاحب ایمان کو حاصل ہو جائے۔

اسی جذبے سے کسی وقت میں نے اپنے عزیز مولانا انتخاب عالم قاسمی سلّمہٗ ناظم مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے اس پر محنت کرنے کے لئے کمر ہمت کس لی، اگر چہ نظامت کی مصروفیتوں کے ساتھ مطالعہ وتحریر کا وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے، پھر یہ کہ عزیز موصوف میدان تحریر کے نو وارد ہیں، لیکن انھوں نے محنت کی اور سیرت وحدیث کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اور موضوع سے متعلق مضامین اکٹھے کرتے گئے اور انھیں ترتیب دیتے گئے۔ یہ مضامین میری نگاہ سے گزرتے رہے، میں ان پر مشورے اور اصلاح کا عمل کرتا رہا، پھر قسط وار انھیں ''ماہنامہ ضیاء الاسلام'' میں شائع کیا گیا۔ پڑھنے والوں نے پسند کیا، اور تقاضا ہوا کہ اسے علیٰحدہ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے، اسی تقریب سے یہ چند سطریں لکھی جا رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرتب سلّمہٗ کی اس کوشش اور کاوش کو قبولیت سے نوازیں، اور لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو رسول اللہ ﷺ کے مزاج وطبیعت کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی
۱۸؍ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

☆☆☆☆☆☆

اندلس اور ہندوستان

(مقدمہ ''اندلس میں اسلام'')

اندلس اسلامی عظمت کا گہوارہ! تہذیبی وتمدنی جلووں کا نظر فروز نظارہ! علم وحکمت کا زرخیز چمن زار! علما وحکما کا بہترین مطلع انوار! اسلامی عدالت وصداقت کا عظیم شاہکار! یورپ کی تاریک فضاؤں میں روشنی کا ایک بلند مینار! لیکن آہ کہ عبرتوں اور المناکیوں کی پردرد داستان بھی! مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا دلدوز نوحہ وماتم بھی! لکھئے تو قلم کا جگر شق ہو! پڑھئے تو دل بیٹھے! بولئے تو درد کا طوفان اٹھے! سنئے تو آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب جائیں! اسلامی اندلس کی تباہی کے پانچ سو برس کے بعد کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو نگاہوں پر اشکوں کا پردہ پڑا جا رہا ہے، جب یہ پردہ ہٹتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اندلس کی نہیں اپنے ملک ہندوستان کی داستان لکھ رہا ہوں، ایک داستان گزر چکی ہے، اور ایک داستان تیار ہو رہی ہے، جس کا میں خود ایک فرد ہوں، پانچ سو برس میں حالات بدلے ہیں، اس لئے داستان کی ظاہری ہیئت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، ورنہ داستان کا بنیادی کردار اور بنیادی نظریہ ایک ہی ہے، اندلس کے حالات سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو سبق لینا چاہئے، اور یہاں کی حکومت کو بھی اس سے سبق لینا چاہئے۔ یہی جذبہ تھا جس کے تحت رسالہ ضیاء الاسلام میں اندلس کے متعلق مضامین کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے، خدا کرے کسی کے دل میں اثر ہو جائے۔

اندلس کی اسلامی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مضمون کے چند جملے مستعار لے رہا ہوں، پاکستان کے معیاری مجلّہ سہ ماہی ''فکر ونظر'' نے اندلس کی اسلامی میراث پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے، اس میں کوئی ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں:

''اسلامی اندلس جو آج ہسپانیہ ہے، تاریخ اسلام کا ایک ایسا ڈرامائی باب ہے جو بیک

وقت شاندار بھی ہے اور المناک بھی! یہ باب ڈرامائی اس لئے ہے کہ جس طرح طریف بن مجالد، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اسلام کی شمشیر خارا شگاف لئے سمندر عبور کرتے اور پھر شہر اور قلعے فتح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح ابوعبداللہ جیسے نالائق حکمراں اپنی کند تلوار کو عیسائی فاتحین کے سپرد کر کے جبل طارق کے دامن سے اپنے شکست خوردہ خانوادے اور ساتھیوں کے ہمراہ سمندر عبور کر کے افریقہ کی طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں''۔(ص۳۸۱)

پہلی صدی ہجری کے آخر میں طارق بن زیاد نے اندلس کے ساحل پر اپنی کشتیوں اور جہازوں کو جلایا تھا کہ اب غازی بن کر یا شہید ہو کر یہیں رہنا ہے، اللہ نے اس کے عزم وحوصلہ کی آبرو رکھی، آٹھ صدیوں تک یورپ کے بحر ظلمات میں اسلام کا آفتاب جگمگاتا اور نور پھیلاتا رہا، پھر دنیا نے دیکھا کہ یہ آفتاب غروب ہو رہا ہے، اور جو لوگ اس کے نور سے روشن تھے انہیں تاریکیوں میں ڈھکیلا جا رہا ہے، یا روشنی والے ملکوں کی جانب ہنکایا جا رہا ہے اور جو یہ بھی نہ ہوا تو انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہندوستان میں بھی پہلی صدی کے اواخر میں محمد بن قاسم نے اپنا لشکر اتارا، اسلام کی تعلیمات اور اس کے عادلانہ نظام سے یہاں کے ہندؤوں کو آشنا کیا، اس کے بعد سے اسلامی فوجوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہا، پھر شہاب الدین غوری کے ہاتھوں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد پڑی، اس کے بعد حکومت کے خانوادے بدلتے رہے مگر وہ رہی مسلمانوں کے ہی ہاتھوں میں۔ سلطان اورنگ زیب کے وصال کے بعد حکومت میں بکھراؤ شروع ہوا، اور وہی زوال اندلس جیسے حالات پیدا ہونے لگے، طوائف الملوکی کی آندھی چلنے لگی، اور بالآخر یورپ ہی کی ایک قوم نے اسلام کو سلطنت سے بے دخل کر دیا۔ انگریز اپنے پیش رووں کی تقلید میں یہاں بھی وہی حالات پیدا کرنے لگے کہ مسلمانوں کا خیمہ اکھڑ جائے، سیاسی قوت ختم ہونے کے بعد مذہب کا تحفظ ایک مشکل کام ہے، اللہ کی مشیت تھی کہ مسلمان اس ملک میں باقی رہا، اور اسلام زندہ رہا۔ پھر جب انگریزوں نے ۱۹۴۷ء میں یہاں سے رخت سفر باندھا تو اپنی روانگی کے وقت اس نے وہ زہر پھیلا کہ مذہب کے نام پر ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، ایک حصہ مسلمانوں کا اور دوسرا حصہ؟ پہلے حصے کے لئے مسلمانوں کی تعیین نے خود بخود یہ نتیجہ پیدا کیا کہ دوسرا حصہ غیر مسلموں کا

ہے، پاکستان جتنا سمیٹ سکتا تھا مسلمانوں کو سمیٹ کر الگ ہوگیا، لیکن ظاہر ہے کہ وہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو نہیں لے جاسکتا تھا، پھر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس حصے میں رہ گئی، جس کو یہاں کا ہندو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کا حصہ ہے، اور لطف یہ ہے کہ پاکستان کا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ صرف ہندوؤں کا ہے، یہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد رہ گئی، جو پاکستان کی پوری آبادی کے قریب قریب برابر تھی، ہندوستان کی تقسیم ایسا عمل تھا جس کا ردّعمل فطری طور پر یہی ہوا کہ یہاں مسلمان اجنبی سا ہوگیا، اور ایک عرصہ تک اس پر بے بسی اور افسردگی چھائی رہی۔

اندلس پر جب عیسائی غالب آرہے تھے اور اس کو مسلمان حکمراں سے خالی کرا رہے تھے تو انھوں نے مسلمانوں سے بہت سے معاہدے کئے تھے، ان میں اس بات پختہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے مذہب، ان کے مذہبی شعائر سے، ان کی زبان سے، ان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، اگر کوئی مسلمان اندلس چھوڑ کر کسی اسلامی ملک میں جانا چاہے گا تو حکومت اس کی مدد کرے گی، مگر جونہی انہیں اقتدار حاصل ہوا، انہیں اپنا کوئی وعدہ یاد نہیں رہا، مسلمانوں کو جبراً حکم دیا گیا کہ عیسائی بن جاؤ، اسلام کو اسلامی معاشرت کو چھوڑو، اس حکم کی تعمیل کے لئے سازشوں اور وحشیانہ مظالم کا ایسا بھیانک دور شروع ہوا کہ جنگل کے درندے بھی شرما جائیں، مسلمان سب کچھ قبول کرسکتا ہے مگر اسلام سے دستبردار ہوجائے یہ بہت مشکل ہے، انہوں نے اسلامی ملکوں کا رخ کیا مگر عیسائیوں کے ہولناک مظالم کی وجہ سے ان میں زیادہ تر راستہ ہی میں ہلاک ہوگئے، ایک بڑی تعداد کو حکومت نے مزدور بنا کر پہاڑی اور جنگلی مقامات اور ملکوں میں بھیج دیا، اور انہیں پتھر کاٹنے اور جنگل صاف کرنے کی مشقت میں لگادیا کہ وہ اور ان کی نسل آہستہ آہستہ اسلام کو بھول جائے، اس طرح اندلس سے اسلام کا خاتمہ کردیا گیا، لیکن اس عمل میں انہیں بہت جلد کامیابی نہیں ملی، تقریباً دوسو سال کی مدت میں وہ اپنے منصوبہ کو تکمیل تک پہونچا سکے۔

ان دوسو برسوں میں مسلمانوں پر کیا بیتی، بڑی دلدوز داستان ہے، لرزہ خیز اور عبرتناک! یہ مستقل ایک مطالعہ کا موضوع ہے، شاید عزیزم مولوی ضیاء الحق سلمہ اس پر قلم اٹھائیں،

لیکن مسلمان ایک سخت جان قوم ہے،صدیوں انہیں اندلس میں مردہ رکھا گیا،مگر بین الاقوامی حالات کے دباؤں میں جونہی وہاں آزادئ فکرونظر کا موقع ملا،صدیوں کی ظلم ستم کی راکھ میں دبی ہوئی ایمانی چنگاری لودینے لگی۔

ہندوستان میں بھی جب انگریزوں نے مسلمانوں کوحکومت سے بے دخل کیا تو ان کے عزائم وہی تھے جواندلس کے عیسائی حکمرانوں کے تھے،مگراس وقت حالات وہ نہ تھے کہ زبردستی عیسائی بنایا جاتا،انہوں نے ایک منظّم سازش کے تحت عیسائی پادریوں کی کھیپ یورپ سے لانی شروع کی،اور چونکہ سیاسی غلبہ انہیں حاصل ہو چکا تھا،اس لئے یہ پادری بے محابا اسلام کو اور مسلمانوں کوچیلنج کرتے اور مناظرہ کی دعوت دیتے،اور یہاں کی عوام کوعیسائی بنانے کا ہرممکن طریقہ عمل میں لاتے،لیکن ان کا یہ عمل ناکام رہا،کیوں کہ یہاں علماءاسلام نے اس کا سخت مقابلہ کیا اور ہرجگہ انہیں فرار ہونے پر مجبور کردیا،برسوں مناظروں کا ہنگامہ گرم رہا،مگر عیسائیوں کو کامیابی نہ ملی۔

اسی دوران ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے مظالم سے تنگ آکر ملک گیر پیمانے پر بغاوت کا ہنگامہ شروع کیا،یہ ایک غیر منظّم تحریک تھی،جس میں غیرتربیت یافتہ افراد نے بہت بدنظمی پھیلائی،ابتداء انگریزوں کا بہت نقصان ہوا،مگر بغاوت ناکام ہوگئی،انگریز کامیاب ہوگئے،یہ قوم جب غالب آتی ہےتو انتقام میں اتنا آگے بڑھ جاتی ہے کہ اسے عدل وانصاف بلکہ عقل وشعور کی کوئی حد یادنہیں رہتی،یورپین قوم کی یہ قدیم تاریخ ہے،یہ قوم فاتح ہوتی ہےتو مفتوح قوم کے ساتھ اتنی سنگدلی کا مظاہرہ کرتی ہے کہ روح کانپ اٹھے۔

۱۸۵۷ء میں کامیابی کے بعد انگریزوں نے پورے ملک کو پھانسی گھر بنادیا،ہر بڑی شاہراہ پر پھانسی کے تختے لٹک رہے تھے،اور ہر تختے پر ہمہ وقت تازہ لاش جھولتی رہتی تھی،مسلمان نام کوئی شے ملی اوراسے بے دریغ پھانسی پر چڑھادیا،توپوں کے مونہوں میں باندھ کر اڑایا گیا، گولیوں کی بوچھار سے چھلنی کیا گیا،تہیہ کرلیا گیا کہ تھا کہ علماء اسلام کواس ملک سے نیست ونابود کردیا جائے کہ اسلام کی اور مسلمانوں کی زندگی ان ہی کے دم سے ہے،علماختم ہوں گےتو علم کا خاتمہ ہوجائے گا،اورعلم گیا تو دین گیا۔

مگر بے خدا انسان کو دھیان نہیں رہتا کہ ان کی تدبیروں سے بالاتر ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کے قبضے میں ساری کائنات ہے، وہ جسے باقی رکھنا چاہے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا، اس ہنگامۂ دار و گیر کے شر سے ''دارالعلوم'' جیسا خیر عظیم وجود میں آیا، اس وقت کے بچے کھچے علما نے اپنے کو سیاست کے میدان سے ہٹا کر تعلیم و تربیت کے قلعے میں محصور کرلیا، اور پھر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ مسلمان ایک نئی طاقت بن کر ابھرنے لگا، انگریزوں نے دیکھا کہ وہ حرب و ضرب اور قتل وخون کے میدان میں ناکام ہو گئے ہیں تو انھوں نے زیر زمین جال بچھانا شروع کیا اور وہی تدبیر اختیار کی جس کو علماء اسلام نے اسلام کے بقا کے لئے اختیار کیا تھا، یعنی تعلیم و تربیت کی جانب رخ کیا، لیکن یہ تعلیم اور تربیت وہ تھی جس سے مسلمان کا نام تو نہ بدلے مگر اس کے اندر جو کچھ ہے سب بدل دے، نام اسلام کا رہے مگر روح غیر مسلم کی ہو جائے، انھوں نے انگریزی کالجوں اور اسکولوں کا جال بچھایا، جس میں مادی منافع کے بے شمار سبز باغ دکھائے، ان اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم و تربیت کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ بہت سے مسلمان، مسلمانوں جیسا نام رکھتے ہوئے، اسلام سے منحرف ہونے لگے، یہ کالج اور یہ اسکول درحقیقت انگریزوں کے شکارگاہ تھے، جن میں مسلمان بچوں کا شکار کیا جاتا تھا، اسی کو دیکھ کر اکبرالہ بادی مرحوم مغفور نے کہا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

دارالعلوم دیوبند نے جس تعلیم اور جس تربیت کا نظام قائم کیا تھا اس کا پھیلاؤ بڑھتا گیا معاشرہ پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، پس جہاں کہیں انگریزوں کے تربیت یافتہ افراد تھے وہیں ان کے دوش بدوش عربی تعلیم یافتہ حضرات بھی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم یافتہ پورے انگریز نہ بن سکے، انگریزی تہذیب میں ملوث ہو کر وہ بھی بالآخر پلٹ آتے تھے۔

پھر علما کی فکرمندی کی وجہ سے دم بہ دم اصلاحی تحریکیں بھی اٹھتی رہتی تھیں، اور از سر نو اسلام کی روح معاشرہ میں پھونکتی رہتی تھیں، انگریز اس محاذ پر بھی ناکام ہوا، اس کے بعد ایسا ہوا کہ انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے سارا ہندوستان ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں اسے یہاں سے اپنی بساط لپیٹنی پڑی، اور یہی موقع تھا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہوئے، آزاد ہونے

کے بعد ہندوستان میں حکمرانی اسی پارٹی کو حاصل ہوئی جس نے ملک کی آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا، چونکہ اس پارٹی میں شامل ہوکر مسلمانوں نے بھی بڑا کام کیا تھا، اس لئے حکمران طبقہ کو ہمت نہ تھی کہ مسلمانوں کے خلاف کھل کر اقدام کرتے ،مگر پاکستان بن جانے کی وجہ سے ان کے دلوں میں چور موجود تھا، خفیہ تدبیریں مسلمانوں کے خلاف ضرور رہیں، گو زبان سے ملک کے جمہوری دستور کی گردان جاری رہی، اب یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ حکمراں جماعت نے ہندوؤں کی ان تنظیموں کی در پردہ پرورش کی جو مسلمانوں سے براہ راست ٹکراتی تھیں، جن کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے مذہبی شعائر کو چھوڑ کر ہندو بن جائیں، یا ہندوستان چھوڑ دیں۔ یہ آواز پہلے دھیمی تھی پھر بلند ہوتی گئی، حکمراں پارٹی اپنے خفیہ عمل کے نتیجے میں میدان سے ہٹتی گئی، اور جارحیت پسند تنظیمیں ابھر کر ان کی جگہ لینے لگیں، یہاں تک کہ آج مرکز اور بہت سے صوبوں میں انہیں پارٹیوں کی حکومت ہے، ان جارحانہ تنظیموں نے ہر وہ طریقۂ عمل اختیار کر رکھا ہے جس سے مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا ہو، اور وہ اس ملک میں اچھوت بن کر رہ جائیں، ان کا دین مذہب اور ان کی معیشت تباہ ہوکر رہ جائے، اس کے لئے یہ تنظیمیں اپنے نمائندوں کو اندلس (اسپین) بھیجتی رہتی ہیں تا کہ وہ طریقہ معلوم کریں جس کی بنیاد پر وہ اندلس کو مسلمانوں سے خالی کرا سکے تھے، ان نمائندوں کی کچھ رپوٹیں شائع ہوجاتی ہیں اور کچھ صیغۂ راز میں رہ جاتی ہیں۔

جمہوریت کے اس دور میں حالات وہ نہیں رہے کہ جبری طور مذہب تبدیل کرایا جائے اور بین الاقوامی قوانین اور ضابطوں کی وجہ سے یہ بھی آسان نہیں رہا کہ آبادی کو دوسرے ملکوں میں منتقل کر دیا جائے، اس لئے اندلس والا طریقۂ عمل بعینہ اختیار نہیں کیا جاسکتا ،لیکن مختلف مرحلوں میں تقسیم کرکے بروئے کار لایا جاسکتا ہے، اور یہاں یہی ہورہا ہے، اجودھیا میں مسجد گرانی تھی تو اسے کئی مرحلوں بانٹ کر۱۹۹۲ء میں شہید کیا گیا، اس کی ابتدا۱۹۴۹ء میں اس وقت ہوئی جب اس میں چوری سے بت رکھے گئے، اور انہیں نکالا نہیں گیا، مختلف شعلہ بار مقررین اور لیڈروں کی خدمات حاصل کر کے ہندوؤں کو متحد کیا گیا، پھر کیا کیا ہوا؟ قارئین کے حافظہ میں موجود ہوگا، کبھی مسجدوں پر نظر ہے، کبھی شہروں کے وہ نام جو مسلمانوں کے دور سے معروف ہیں، انہیں بدلا جارہا ہے، کبھی مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کا شگوفہ چھوڑا جاتا ہے، اور حد یہ ہے کہ

ہندوستان کے جمہوری دستور میں تبدیلی لانے کا منصوبہ بنتا ہے، ان امور کے خلاف مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی جانب سے چیخ وپکار مچتی ہے تو تھوڑی دیر سکوت ہوجاتا ہے، پھر عوام کو کسی دوسرے حساس مسئلہ میں الجھا کر از سرنو کام کی نیو ڈالی جاتی ہے، غرض مرحلہ بہ مرحلہ مسلمانوں کے صفائے کا انتظام ہورہا ہے۔

یہ سب کچھ ہورہا ہے، مگر جولوگ سازش میں مصروف ہیں انہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ سب تدبیروں کے اوپر اللہ کی طاقت موجود ہے، خدائی طاقت کا نمونہ دیکھنا ہوتو یہ لوگ اپنی آنکھیں کھولیں کہ جب سے ان فرقہ پرست اور ظلم پرور تنظیموں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے، ملک گیر پیمانے پر آفتوں اور بلاؤں کی یورش ہورہی ہے، کہیں زلزلہ ہے، کہیں طوفان ہے، کبھی سیلاب ہے، کبھی خوفناک وبا ہے، اور نہ جانے کیا کیا ہے؟ اور کاروبار و معاش کی تو وہ بربادی ہے کہ خود ہندو بھی چلا اٹھا ہے کہ یہ اسی حکومت کی نحوست ہے۔

یہ بات بہت کھری اور سچی ہے کہ محض کفر وشرک کے ساتھ تو حکومت چل سکتی ہے مگر ظلم وستم کے ساتھ نہیں چل سکتی، قدرت کے اس قانون میں کوئی استثنا نہیں ہے، جہاں بھی جو حکومت تباہ وتاراج ہوئی ہے، اس کے اسباب پر غور کیجئے تو اصل بنیاد تباہی کی ظلم کا رواج ہی ہوگا۔ مسلمان بھی ظلم کرے گا تو اس سے حکومت چھین لی جائے گی، کافر بھی ظلم کرے گا اسے گرادیا جائے گا۔

البتہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کو اتنی بات یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی قوم خواہ کتنی ہی سازش کرے، وہ مسلمانوں کو مٹانے کا خواہ کوئی بھی منصوبہ بنائے، لیکن سازش کی کامیابی کا انحصار اللہ کی مشیت پر ہے، اس کی مشیت کے بغیر ہر سازش ناکام ہے، اللہ تعالی کا وعدہ ہے کہ "**وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً ان اللہ بما یعملون محیط**". (سورہ آل عمران) یہ خطاب خاص مسلمانوں سے ہے، اس میں دو شرطیں حق تعالی نے مقرر فرمائی ہیں، کہ اگر انہیں مسلمان پورا کردیں تو مخالفین کی ہر سازش ناکام کردی جائے گی۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تم میں صبر ہو، یعنی ثابت قدمی، ہراساں نہ ہونا، مخالفتوں سے گھبرانہ جانا۔ اور دوسری شرط ہے 'تقوی' یعنی اللہ تعالی کے احکام کو بجالانا، اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہنا، ظاہر وباطن میں اللہ تعالی کی اطاعت کرنا، اگر یہ دونوں خوبیاں اجتماعی طور سے مسلمانوں میں ہوں، اجتماعی اس لئے

کہا کہ انفرادی طور سے کسی کسی کے اندران خوبیوں کا ہونا، اجتماعی نصرت کو حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، عام معاشرہ میں، اس کی اکثریت میں یہ دونوں اوصاف موجود ہوں تو دشمنوں کی سازش ذرا بھی نقصان کا باعث نہیں ہوگی، پھر فرماتے ہیں کہ دشمن جو کچھ کرتا ہے سب اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

پہلے جملے میں مذکور دونوں شرطوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا وعدۂ نصرت ہے، جو حتمی ہے اور اخیر کے جملے میں صراحۃً کہا گیا ہے کہ یہ سازش اللہ کے دائرۂ قدرت میں ہے، لیکن اس سے اشارۃً یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کا فضل شامل حال ہو جائے تو دونوں شرطیں پورے طور نہ ہوں تب بھی نصرتِ الٰہی آسکتی ہے، اگر غور کیا جائے تو موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ اسی فضل الٰہی کی کارفرمائی ہے، ورنہ ہمارے معاشرے میں عمومی طور پر نہ صبر ہے اور نہ تقوی! پھر بھی اللہ تعالیٰ دشمنوں کی اکثر سازشوں کو مات دیئے جارہے ہیں، یہ کھلا ہوا فضل ہے، اور اس فضل کا ظہور بار بار ہوا ہے، اور ہوتا رہتا ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب بھی ظلم کی چکی میں مسلمان پسا ہے، تو کچھ عرصہ کے بعد فضل الٰہی کا ظہور ہوا ہے، اندلس میں صدیوں ظلم ہوا، تو اب اسی ظلم کی تہ سے اسلام کے نام لیوا ابھرا ابھر کر آرہے ہیں (ابھی پچھلے ماہ پانچ سو سال کے بعد وہاں مسجد بنانے کی اجازت ملی ہے۔ ضیاء الحق) تقریباً پون صدی تک روس میں مسلمان مجبور و مقہور رہے، پھر فضلِ خداوندی ہوا تو مسلمانوں کی تقریباً ایک درجن ریاستیں نکل پڑیں، ہندوستان میں ہزاروں فسادات ہوئے، بے شمار جانیں مسلمانوں کی گئیں، جائداد اور ملکیتیں تباہ ہوئیں، مگر گن لیجئے، دیکھ لیجئے، پہلے کے مقابلے میں مسلمان دوگنا ہیں، اور ہر اعتبار سے خوشحال ہیں، ظلم کرنے والے پچھلی تاریخ سے سبق لیں، اور اپنے ظلم سے باز آئیں، اور کاش ظلم سہنے والے اللہ کی عائد کردہ شرطوں پر پورے اترتے تو ظالموں کا چشم زدن میں صفایا ہو جاتا۔

اندلس کی سرگزشت داستان سرائی کے لئے نہیں لکھی گئی ہے، سبق آموزی کے لئے لکھی گئی ہے۔ **فھل من مدکر**

☆☆☆☆☆☆

مقدمہ ''قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے''

میرے عزیز جناب مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے ابوالمعالی حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ کے سفرناموں کو جو ماہنامہ ''البلاغ''، بمبئی کے مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے تھے، مرتب کرکے علمی ودینی اسفار کا ایک خوبصورت مرقع تیار کیا ہے، اس مرقع کو دیکھ کر قاضی صاحب کا ایک جملہ ذہن ودماغ میں جگمگانے لگا، اس جملہ نے اس وقت بھی مجھ کو بہت متاثر کیا تھا، جب میں نے ان کی زبان سے سنا تھا، اور آج جب یہ تحریر لکھ رہا ہوں، تو بھی طبیعت بے تاب ہے کہ اسے یہاں صفحۂ قرطاس کی نذر کروں۔

قاضی صاحب کے دورِ اخیر کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کے وقت قاضی صاحب ایک لمبے سفر سے تشریف لائے۔ چہرے پر تکان کے آثار صاف نمایاں تھے، کپڑے بھی متغیر ہو رہے تھے، ان کے ایک بے تکلف دوست اور ساتھی نے خیریت دریافت کی، تو فرمانے لگے کہ آج کل سفر بہت دشوار ہو گیا ہے، ٹرینوں میں اتنی بھیڑ بھاڑ اور مسافروں میں اتنی بے قاعدگی ہوتی ہے کہ ریزرویشن ہوتے ہوئے بھی دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ جسم اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ طبیعت پریشان ہو گئی۔ دیر تک سفر کی مشکلات کا تذکرہ کرتے رہے۔ اس پر ان کے بے تکلف دوست نے از راہِ بے تکلفی فرمایا کہ ''اسی لئے تو کہتا ہوں کہ آپ سفر نہ کریں، آپ سفر بھی کئے جاتے ہیں، اور اس سے پریشان بھی ہوئے جاتے ہیں''، قاضی صاحب نے فوراً فرمایا اور اپنی علاقائی زبان اور لہجے میں فرمایا کہ ''چپ رہو جی! تمہاری طرح ہم لوگ 'گھر گھُسنے' تھوڑا ہی ہیں''۔ سفر کرنے سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس آخری جملے کی معنویت سے دل پھڑک گیا۔ اس پر جتنا غور کیجئے معنویت کی تہیں کھلتی جائیں گی۔

سفر کرنے والے بہت ہیں، اور ہر ایک سفر کسی نہ کسی عنوان سے مسافر کے دامن شخصیت میں تکمیلی تحفے ڈالتا جاتا ہے، لیکن ہر سفر کے احوال وکوائف میں دوسروں کو شریک نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہر سفر کا سفرنامہ لکھا جاسکتا ہے۔

ہاں سفر ایسا ہو کہ اس کے ساتھ علمی اور دینی مقاصد وابستہ ہوں، مسافر نے اسی نقطۂ نظر سے سفر کے مرحلوں کو دیکھا ہو مقامات سفر کا اسی اعتبار سے مطالعہ کیا ہو، ایسے اسفار بیشک اس کے مستحق ہیں کہ ان کے سفرنامے لکھے جائیں، اور دوسروں کو سفر کے واردات میں شریک کیا جائے۔

سفر ایک درسگاہِ عبرت وموعظت ہے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، **أفلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلھم** (سورہ محمد:۱۰) کیا ان لوگوں نے سفر نہیں کیا، کہ یہ پچھلے لوگوں کے انجام کا مشاہدہ کرتے۔

سفر عقل وفہم کے دروازوں کی کلید ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أفلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوبٌ یعقلون بھا أو آذان یسمعون بھا (سورۃ الحج:۴۶) کیا انھوں نے زمین کا سفر کیا، کہ انھیں عقل حاصل ہوتی جس سے سمجھتے یا کان نصیب ہوتے جن سے یہ سنتے۔

سفر کا یہ وہ نقطۂ نظر ہے جس سے شخصیت کی تکمیل بدرجۂ کمال ہوتی ہے۔ قاضی صاحب ایک محقق عالم اور صاحب بصیرت مورخ تھے، اس کے ساتھ دینی حمیت وغیرت اور ایمانی وروحانی جذبات سے سرشار تھے، جہاں وہ تاریخ کے صفحات الٹتے پلٹتے اور ان کے مٹے مٹے نقوش کو ابھارتے اور صاف کرتے ہیں وہیں ایمانی عبرتیں، دینی حمیتیں اور روحانی حلاوتیں ساتھ ساتھ جلوہ نما ہوتی رہتی ہیں، ان کی مجلسی گفتگوؤں میں بھی یہ رنگ رچا بسا رہتا تھا، جہاں وہ علمی وتاریخی حقائق کے گوہر لٹاتے ہوتے، وہیں ان کی گفتگو سے اسلامی حمیت وغیرت کا درس بھی ملتا رہتا۔

قاضی صاحب نے جن اسفار کی داستان سنائی ہے، ان میں علم وتاریخ اور تہذیبی وتمدنی معلومات کے پہلو بہ پہلو عبرت وموعظت اور اسلامی حمیت وصلابت کے جلوے بھی ملتے ہیں۔

قاضی صاحب نے بہت سے سفر کئے ہیں، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی، اور ہر سفر سے علمی وتاریخی سوغاتیں اور عبرتوں ونصیحتوں کے خزانے ساتھ لائے ہیں۔ پھر ان میں

قارئین کوشریک کیا ہے ۔ان سوغاتوں اورخزانوں کوعزیز مرتب سلّمہٗ نے اکٹھا کرکے تاریخی حقائق ،تہذیبی وتمدنی معلومات اورعلمی ودینی تعلیمات کاایک خوبصورت گلدستہ تیارکردیاہے یایہ کہئے کہ بہترین الوان نعمت کا دسترخوان بچھادیاہے،ہم کوامید ہے کہ اس دسترخوان سے استفادہ کرنے والا،ان تمام فوائد سے متمتع اورآسودہ ہوگا،جن فوائد کے لئے سفرکی مشقت برداشت کی جاتی ہے،سفرناموں کے ادب میں یہ ایک قابل قدراضافہ ہے۔اورقاضی صاحب کے باقیات صالحات اورحسنات کی ایک بہترین یادگار!

اعجازاحمداعظمی

۱۵؍صفر ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۶؍مارچ ۲۰۰۵ء شنبہ

☆☆☆☆☆☆

تقریب
بر
''تذکرہ حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری''

الحمد الله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آله وصحبه اجمعین. اما بعد

یہ چند سطریں ایک گمنام لیکن باکمال مرد درویش، ایک مستور لیکن صاحب نسبت مرد حق کی یاد میں لکھی جارہی ہیں، کمال کے لئے شہرت لازم نہیں ہے، جیسے شہرت کے لئے کمال ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس دنیا میں کتنی باکمال ہستیاں گزری ہیں جنہیں نہ ان کے زمانے میں پہچانا گیا، نہ بعد میں ان کی شہرت ہوئی، اور کتنے ہی بے کمال اور بے ہنر افراد آسمان شہرت وناموری پر جگمگا رہے ہیں، شہرت نہ دلیلِ اخلاص ہے اور نہ ثمرۂ قبول حق! بلکہ بسا اوقات ناموری سامان فتنہ بن جاتی ہے، دنیا میں لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں اور آخرت میں آدمی مواخذہ میں گرفتار ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

یحسب امرئ من الشر ان یشار الیه بالاصابع فی دین اودنیا الا من عصمه الله. (رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوۃ شریف باب الریا والسمعۃ)

آدمی کے مبتلائے شر ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کی طرف دین یا دنیا کے سلسلے میں انگلیوں سے اشارہ کیا جائے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی حفاظت فرمائیں (تو اور بات ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کی خاص حفاظت نہ ہو تو مشہور آدمی مبتلائے فتنہ ہوکر رہتا ہے، اسی لئے گمنامی اور خمول وخفا ایک امر محمود ہے، جو آدمی گمنام رہا اس نے بہت سی آفات سے

نجات پالی۔لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی باکمال نے شہرت نہیں پائی،بعدوالوں میں اس چرچا نہیں ہوا،تاریخ کے اوراق میں اس ذکر نہیں آیا،اس کے آگے پیچھے آدمیوں کا ہجوم نہیں ہوا،تو زمانے نے اس کی ناقدری کی یااس کے کمال میں کوئی خاص نقص تھا،یااس کے اخلاص میں کمی تھی،لیکن یہ خیال عموماً صحیح نہیں ہے،اگر کوئی اللہ کا نیک اور مخلص بندہ ہے،صاحب علم وصاحب کمال ہے،اللہ کی نسبت کا حامل ہے،اس کی زندگی سنت وشریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے،اس کے فیض سے متعدد لوگ فیصیاب بھی ہوئے ہیں،لیکن اس کے باوجوداس کا تعارف نہیں ہوا،ایک مخصوص اور مختصر حلقے کے باہراس کا نام نہیں لیا گیا،پھر جوں جوں ماضی کے پردے دبیز ہوتے گئے،اس کا مختصر سا تعارف بھی مٹتا گیا،تو کیا ہم اسے ناکام کہیں گے؟اس کے بارے میں بے کمال ہونے کا وسوسہ دل میں لائیں گے؟اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہےتو اس نے قرآن نہیں پڑھا،حدیث نہیں سمجھی،شریعت کی روح کونہیں پہچانا،اللہ تعالی کے معاملات سے باخبر نہیں ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان الـله يحب الابرار الاتقياء الاخفياء الذين اذا غابوا لم يتفقدوا وان حـضـروا لم يدعوا ولم يقربوا ،قلوبهم مصابيح الهدى يخرجون من كل غبراء مظلمة. (رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان۔مشکوۃ شریف باب الریا والسمعۃ)

اللہ تعالی نیک مستور الحال لوگوں سے محبت رکھتے ہیں،جن کا حال یہ ہے کہ اگر وہ غائب ہوں تو انہیں کوئی نہ ڈھونڈھے،اوراگر موجود ہوں تو نہ انہیں بلایا جائے نہ قریب کیا جائے،ان کے قلوب ہدایت کے چراغ ہیں،غبارآلود اور تاریک جگہوں سے وہ نکلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی رہائش گاہیں عالیشان ،نمایاں اور ممتاز نہیں ہوتیں،کچے اور اندھیرے گھر ان کے مسکن ہوتے ہیں،لیکن صرف ان کے گھر ہی اندھیرے ہوتے ہیں،ان کے دل ہدایت کے روشن چراغ ہوتے ہیں،جن سے لوگ راہ حق کا پتہ پاتے ہیں،ایسے گمنام لوگ اللہ کے خصوصی محبوب ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہرت یافتہ حضرات خدا کے محبوب نہیں ہو سکتے،اللہ تعالی جب کسی شخص سے دین کا اہم اور عام کام لینا چاہتے ہیں تو اسے مشہور کر دیتے ہیں،ایسے لوگوں کی

حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے،شہرت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں بنتی مخلوق خدا ان سے فائدہ اٹھاتی ہے، یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو خود گمنامی کو پسند کرتے اور شہرت سے نفور رہتے ہیں، مگر اللہ تعالی اپنی حکمت بالغہ سے انہیں ان کے ارادہ کے بغیر ناموری عطا فرماتے ہیں، مشاہیر کی بزرگی اوران کا تقوی وتدین لوگوں کے درمیان معروف ہوتا ہے، اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے کہ بزرگ صاحب نسبت اور باکمال وہی ہے جسے شہرت کی سند مل گئی، اور جو ایسا نہیں ہوا لوگ اس کو نگاہ سے گرا دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث اس طرز عمل کی کھلی تغلیط ہے، بلکہ ان گمنام اور مستور حضرات کو رسول اللہ ﷺ نے ہدایت کا چراغ قرار دیا ہے تو انہیں تلاش کرنا چاہئے، اور ان کی روشنی میں راہ ہدایت طے کرنے کو سعادت سمجھنا چاہئے، مگر لوگ عموماً ایسے بزرگوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، مؤرخ کی آنکھ بھی اس سے نگاہ پھیر لیتی ہے، تاریخ کی زبان ان کے حق میں گنگ ہو جاتی ہے، اور یہ تاریخ تو عجیب شے ہے، بقول ایک دیندار، صاحب دل اور صاحب درد اردو کے شاعر و ادیب ڈاکٹر کلیم عاجز کے کہ:

> ''تاریخ تو امیر زادی ہے بادشاہ زادی ہے، یہ تو شاہراہوں پر اٹھلاتی پھرتی ہے، برق رفتار گھوڑے پر اڑی پھرتی ہے، اڑن کھٹولوں پر، پرواز کرتی ہے، یہ میناروں کو دیکھتی پھرتی ہے، قبوں اور کلسوں کی زیارت کرتی پھرتی ہے، لال قلعہ، تاج محل، قطب مینار، اشوک کی لاٹ، اجمیری گیٹ، کشمیری گیٹ کی بات کرتی ہے، یہ کونوں میں نہیں جھانکتی، گوشوں پر نگاہ نہیں ڈالتی، یہ تنگ گلیوں اور تاریک کوچوں میں جانے سے ڈرتی ہے، یہ محلوں کے پھاٹکوں پر کارڈ بھیج کر استقبال کراتی ہے، یہ ٹوٹے پھوٹے دروازوں پر اور بے کواڑ ڈیوڑھیوں پر دستک نہیں دیتی''۔ (جہاں جہاں خوشبو ہی خشبو تھی ص ۶۳)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہیں تنگ گلیوں، تاریک کوچوں اور بے کواڑ کی ڈیوڑھیوں سے لعل شب تاب نکلتے ہیں، اکثر غریب اور بے نام لوگ اس طرح ملتے ہیں جیسے نالی کی کیچڑ میں چمکتا ہوا ہیرا، گرد وغبار ہی میں حسن کا چمکتا دمکتا مکھڑا بار بار نظر آیا ہے، جنہیں حقیر سمجھا گیا ان میں بہت توقیر والے ملے، پستیوں میں بہت بلندیاں دکھائی دیں، یہ پیمانہ ہی غلط ہے کہ مؤرخ اور سیرت نگار کے قلم سے جو رہ گیا وہ ہنر اور کمال سے بھی خالی تھا، جس کی نگاہ اسلام کی تعلیمات پر ہوگی وہ تو کبھی

اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ صاحب کمال وہی ہے جسے نام آوری ملی، اور جو بے نام رہا اور گمنام رہا وہ بے کمال بھی تھا۔

انہیں گمنام بزرگوں میں ہمارے محسن بزرگ مولانا قاری ولی اللہ صاحب فتح پوری مدظلہ کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب علیہ الرحمہ بھی تھے، جن کو اللہ تعالی نے شہرت کی حشر سامانیوں سے محفوظ رکھا، کمال ظاہری ومحاسن باطنی سے لبریز ہوتے ہوئے گمنام ومستور رہے، ان کی زندگی میں لوگوں نے انہیں دیکھا ان کی باتیں سنیں، ان کی مہمان نوازیوں سے مستفید ہوئے، انہیں تلاوت کرتے دیکھا، ان کی استقامت کو دیکھا، لیکن سادگی وبے رنگی کی گدڑی میں جو لعل چھپا ہوا تھا اس پر کس کی نگاہ گئی؟۔

حق تو یہ ہے کہ جس نے زندگی بھر اپنے کو مخفی رکھا جس کو شہرت وناموری کی کوئی لپک نہ تھی، جو اپنے کمال علمی وعملی کے باوجود گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹا رہا، اسے اور اس کے حالات کو اللہ تعالی کے علم وہنر کے حوالے ہی رکھا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حروف ونقوش کی آڑھی ترچھی لکیریں اس کے واقعی اوصاف ومحامد کے حق میں راہ انصاف سے دور جا پڑیں۔

تاہم بعد والوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ اگلوں کے محاسن اعمال، مکارم اخلاق اور معالی احوال کو یاد رکھیں، ان کا مذاکرہ کریں، انھیں بعد والی نسل تک منتقل کریں، تاکہ بعد والوں کو یاد رہے کہ ان کے اسلاف کیسے تھے؟ ان میں اتباع سنت کی کیا شان تھی؟ ان کے احوالِ باطنی کیا کیا تھے؟ پھر ان کے دل میں حوصلہ اور ولولہ جاگے کہ ہمارے بزرگ بھی خاک کے پُتلے ہی تھے، گوشت وپوست کے ڈھانچے ہی تھے، انھیں امراض وعوارض میں وہ بھی گھرے رہتے تھے جن میں آج کا انسان مبتلا ہے، مگر اس کے باوجود وہ بندگی کا حق کس طرح ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اللہ کو راضی کرنے کے کیا کیا جتن کئے، انھوں نے دنیوی مال ودولت کو کس طرح اپنی ٹھوکر میں رکھا۔ کیا یہ سب کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص تھا، ان کے بعد جو خاک کے پُتلے تیار ہوئے، اور ہڈیوں کے جوڑ ھانچے گوشت وپوست کا لباس پہن کر وجود میں آئے، کیا وہ اس صلاحیت سے محروم ہیں؟ جب انھیں یہ خیال آئے گا تو ان کے اندر کی سوئی ہوئی عبدیت جاگے گی، چھپا ہوا جذبۂ کمال ابھرے گا، خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ سکتا ہے، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جل

سکتا ہے ، ایک طوطی کی آواز سن کر دوسرا طوطی ترنم ریز ہوسکتا ہے ۔ تو کیا معنیٰ کہ ایک انسان ، دوسرے انسان کو دیکھ کر اسی راہ پر نہ چل پڑے ۔

سیرت نویسی اور سوانح نگاری کی اصل منشاء یہی ہونی چاہئے ، اور پڑھنے والوں کو بھی اسی نظر سے پڑھنا چاہئے ، واقعات وحکایات کا بیان ، شہور وسنین کا اہتمام ، تاریخ ویوم کی تقدیم و تاخیر پر گہری نظر ، مؤرخ کا فریضہ ہوتو ہو ، سوانح نگار کو اس کا مکلّف نہیں بنایا جاسکتا ، اس سلسلے میں اس کے تسامحات قابل عفو ہیں ۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے ، اسے مؤرخ کی نگاہ سے مت پڑھئے ، بلکہ تذکیر واعتبار کی نگاہ سے پڑھئے ۔ ان شاء اللہ آپ فائدے میں رہیں گے ۔ ویسے لکھنے والے کو اپنے قلم کی کوتاہی ، علم کے قصور ، نگاہ کی درماندگی اور فکر کی نارسائی کا صرف اعتراف ہی نہیں ، اچھی طرح احساس بھی ہے ، اور اس کا یہی احساس اس کے لئے وجہ نجات ہے ، اور اسی سے امیدواری توفیق ہے ، اپنے بزرگوں سے دعاؤں کا ملتجی اور عام ناظرین سے حسن مطالعہ کا آرزومند ہوں ۔

اس مختصر رسالہ کا ماخذ محترم بزرگ حضرت مولانا قمرالزماں صاحب زید مجدہم اور حضرت حافظ محمد زکریا صاحب فتح پوری مدظلہ کی مختصر تحریریں ہیں ، جنہیں ان حضرات نے مرتب کیا تھا ، اور وہ غیر مطبوعہ ہیں ، اس کے علاوہ کچھ معلومات حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ اور ان کے برادر بزرگ حافظ عبدالمنان صاحب سے حاصل ہوئیں ، باتیں سب انہیں حضرات کی ہیں الفاظ میں نے تحریر کئے ہیں ۔

اعجاز احمد اعظمی

۱۳/رجب ۱۴۱۶ھ

☆☆☆☆☆☆

تقریظ بر ''مسجد نبوی میں تراویح عہد بعہد''

شیخ محمد سالم عطیہ علیہ الرحمہ مدینہ منورہ زادہ اللہ شرفاً کے رہنے والے ایک صاحب نظر اور معتبر عالم ہیں، عدالت عالیہ کے قاضی ہیں، مسجد نبوی شریف میں مدرس تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وعقل کا بڑا جامع توازن بخشا تھا، انھوں نے تراویح کے مسئلہ پر ایک نئے انداز سے قلم اٹھایا، پچھلی صدی میں پیدا ہونے والے ایک نئے فرقہ نے کچھ مسائل فقہیہ میں اپنی ایک شناخت ...شاہراہ امت سے ہٹ کر... بنائی، ان شناختی مسائل میں رکعات تراویح کی تعداد کا بھی مسئلہ ہے۔

قرون اولیٰ سے اب تک تمام ائمہ اور تمام امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ رمضان المبارک کی مبارک راتوں میں بعد نماز عشاء تراویح کی نماز بیس رکعات ہے، مگر اس ٹولہ نے اصرار کیا کہ تراویح صرف آٹھ رکعات ہے۔ علماء نے اس موضوع پر دلائل کی روشنی میں تفصیلی بحث کی، اور قلب وذہن میں ذرا بھی سلامتی ہو تو بحث اطمینان بخش ہے، مگر جن کی آنکھوں نے سورج کو چمکتا دیکھ کر انکار کی ٹھان لی ہو، انھیں کون دکھا سکتا ہے۔ تاہم امت کی سچی خیر خواہی رکھنے والے مایوسی کا دامن جھٹکتے رہے، اور نئے نئے انداز سے سمجھاتے رہے:

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

شیخ عطیہ نے مسجد نبوی میں تراویح کے عمل کو بنیاد بنایا، کیوں کہ یہی مسجد ابتداء سے احکام وشرائع اسلامی کی بنیاد رہی ہے، پہلی مرتبہ تراویح کی نماز یہیں قائم ہوئی، حضور ﷺ کی سنتوں کا آغاز یہیں سے ہوا، یہیں سے مشہور فرمان **علیکم بسنتی و سنة خلفاء الراشدین المهديين** (تم کو میری سنت اور اصحاب ہدایت خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے) جاری ہوا،

شیخ موصوف نے عہد نبوت سے دور حاضر تک مسجد نبوی کی تراویح اور اس کی جماعت کا جائزہ لیا۔

انہوں نے دیکھا کہ اس چودہ سوسالہ تاریخی تسلسل میں کبھی تراویح کی جماعت آٹھ رکعات نہیں ہوئی ہے، ہمیشہ بیس رکعات پڑھی گئی ہیں، انہوں نے نہایت دیانت داری اور امانت داری کے ساتھ ان تاریخی معلومات کو مرتب کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

مصنف نے تاریخی تسلسل کے بیان کے بعد مشہور فقہی مذاہب: حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی تحقیقات ونظریات بھی ذکر کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد چاروں ائمہ کے نزدیک تراویح بیس رکعات ہی سنت ہے، آٹھ رکعات کسی کے نزدیک سنت نہیں ہے، البتہ حنفیہ کے بیان کا مدار انہوں نے صاحب فتح القدیر علامہ ابن الھمام کے ایک قول پر رکھا ہے صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے، **و ظاھر بکلام المشائخ ان السنة عشرون رکعة و مقتضی الدلیل ما قلنا** مشائخ کے قول کا ظاہر یہ ہے کہ تراویح بیس رکعات ہے، لیکن دلیل کا تقاضا وہ ہے جو ہم نے کہا۔

اسی کو حنفیہ کا مذہب قرار دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، احناف کے نزدیک بھی پوری بیس رکعات سنت ہے، جو مصنف نے حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے، وہ علامہ ابن الہمامؒ کا رجحان ہے حنفیہ کا مذہب نہیں۔[۱]

مصنف نے کتاب میں وتر کا مسئلہ چھیڑا ہے موجودہ دور میں جو ائمہ مسجد نبوی میں تراویح پڑھاتے ہیں وہ وتر کی نماز تو تین رکعت پڑھتے ہیں، مگر دو سلام سے، پہلے دو رکعت پھر ایک رکعت پڑھتے ہیں، اور دعائے قنوت تیسری رکعت میں رکوع کے بعد جہراً پڑھتے ہیں، حنفیہ کے نزدیک وتر کی نماز تین رکعات ایک سلام سے ہے جیسے مغرب، اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے ہے اور سراً ہے، اس صورت حال کی وجہ سے احناف سعودی امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کے بعد جماعت سے الگ انفراداً وتر پڑھتے ہیں یا اپنی علاحدہ جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس طرح ایک تشتت اور انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، مصنف کو یہ صورت پسند نہیں ہے، انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ حنفی حضرات وتر میں الگ نہ ہوا کریں، بلکہ امام کے ساتھ وتر میں شریک ہو جائیں انہوں نے لکھا ہے کہ صاحب فتح القدیر علیٰ شرح الہدایہ نے ابوبکر رازی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

''اگر کوئی حنفی غیر حنفی کے پیچھے وتر پڑھے اور امام نے دوسری رکعت پر سلام پھیر دیا تو اس حنفی مقتدی کو دو امور کا اختیار رہے۔

(۱) وہ سلام نہ پھیرے اور امام کے ساتھ تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو جائے کیونکہ محل اجتہاد ہونے کی وجہ سے امام کے سلام پھیرنے سے اس کی نماز ختم نہ ہوگی۔

(۲) دو رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد اپنے امام سے الگ ہو کر نماز پوری کرے''۔

بہر کیف اگر ان صورتوں پر عمل ہو تو اختلاف ختم ہو سکتا ہے، اور ہر ایک اپنے مسلک پر باقی رہے گا، کاتب حروف کے خیال میں دوسری صورت میں بھی انتشار کی ایک صورت رہ جائے گی، احناف کے لئے مناسب ہے کہ پہلی صورت کو عمل میں لائیں، مسئلہ مجتہد فیہ ہے قطعی نہیں ہے اور تفرق وانتشار سے بچنا مطلوب ہے، نماز کے بعض اور اجتہادی مسائل میں باوجود اختلاف مسلک کے ائمہ کی اقتداء بغیر کسی تنگی کے کی جاتی ہے، مثلاً جس وقت ائمہ حرم عصر کی نماز پڑھاتے ہیں، احناف کے نزدیک ابھی ظہر کا وقت ہوتا ہے، مگر تمام احناف ان کی اقتداء میں اسی وقت عصر کی نماز ادا کرتے ہیں، اسی طرح وتر کے مسئلہ میں بھی اگر مندرجہ بالا صورت اختیار کی جائے تو نامناسب نہ ہوگا، گوکہ جمہور احناف نے امام ابوبکر رازی کے اس قول کو قبول نہیں کیا ہے، ان کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر امام وتر کی دو رکعت پر سلام پھیرتا ہے، تو اس کی اقتداء جائز نہیں، لیکن مسئلہ اجتہادی ہے، اگر تفرق وانتشار سے بچنے کے لئے ابوبکر رازی کے قول پر عمل کیا جائے تو گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

رہا رکوع کے بعد قنوت کا مسئلہ تو حنفی مقتدی کے لیے اس میں امام کی اقتدا بے تکلف جائز ہے، یہ بندہ صاحب افتاء نہیں ہے، حضرات علماء غور کر لیں۔

یہ کتاب ۱۳۹۰ھ میں لکھی گئی ہے، مگر آج بھی تر و تازہ ہے، فاضل عزیز مولانا محمد عارف صاحب مبارک پوری نے اس کو اردو لباس پہنایا، یہ ترجمہ قسط وار ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہوا تھا، اب انہوں اسے کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

۷ر ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

حاشیہ

(ا) تفصیل اس کی یہ ہے کہ صاحب فتح القدیر نے مصنف ابن ابی شیبہ، طبرانی اور بیہقی سے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ " انہ ﷺ کا ن یصلی فی رمضا ن عشرین رکعۃ سوی الوتر رسول اللہ ﷺ". رمضان شریف میں بیس رکعات علاوہ وتر کے پڑھتے تھے، پھر اس روایت کو انھوں نے ضعیف قرار دیا، اور فرمایا کہ اس کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کی وہ صحیح روایت ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، پھر مؤطا امام مالک کی روایت بیان کی ہے کہ "کا ن النا س یقومون فی زمن عمر بن خطاب بثلث وعشرین رکعۃ". حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ ۲۳ رکعات پڑھتے تھے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ " وجمع بینھما با نہ وقع اولا ثم استقر الامر علیٰ العشرین فانہ المتوا رث فتحصل من ھٰذا کلہ ان قیام رمضا ن سنۃ احدی عشرۃ رکعۃ با لوتر فی جما عۃ فعلہ ﷺ ثم تر کہ لعذر .... پھر لکھتے ہیں: انما استفدنا انہ کا ن یوا ظب علیٰ ما وقع منہ و ھو ما ذکرنا فتکون العشرون مستحباً و ذٰلک المقدا ر منھا ھو السنۃ". ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ پہلے تراویح آٹھ رکعات پڑھی، پھر بیس رکعات پر اتفاق ہو گیا، یہی متوارث ہے، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ رمضان کا قیام مع الوتر گیارہ رکعات سنت ہے، رسول اللہ ﷺ کی تراویح با جماعت ثابت ہے، بعد میں آپ نے اسے عذر کی وجہ سے ترک کر دیا تھا، اس گیارہ رکعت پر آپ ﷺ نے مواظبت کی، لہٰذا بیس رکعات مستحب ہے اس میں سے اتنی مقدار آٹھ رکعات مسنون ہے، اس بحث کے بعد علامہ ابن ہمامؒ نے و مقتضی 'الدلیل ما قلنا لکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صاحب فتح القدیر کا یہ رجحان ہے، مذہب احناف نہیں ہے۔ و اللہ اعلم۔

چراغ سے چراغ جلا

چراغ سے چراغ جلتا ہے، بات سے بات نکلتی ہے، چودھویں صدی ہجری کے نصف اول میں مغربی یوپی کے ایک مردم خیز قصبہ تھانہ بھون میں ایک چراغ روشن ہوا تھا، یہ چراغ کا ہے کوتھا ایک آفتاب تھا، جس کی روشنی سے گمراہیوں کی شب تاریک کی سیاہیاں چھٹتی اور ظلمتیں گھٹتی رہیں۔ اس آفتاب کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں، ایک طویل عرصہ تک تھانہ بھون کا یہ مرد حقانی علم وعمل کا مرکز رہا، حق تعالیٰ نے اپنے خاص بندے کا فیض عام کیا، تھانہ بھون کا یہ عالم ربانی جو حکیم الامت کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے، علم وعمل، اخلاص وروحانیت، تعلیم وافادہ، تربیت وارشاد اور اخلاق وانسانیت ہر اعتبار سے ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا۔ اس ایک چراغ سے سینکڑوں انجمنیں وجود میں آئیں، درس وافادہ کی، تربیت وسلوک کی، اخلاص وللٰہیت کی، تصنیف وتالیف کی، مواعظ وارشاد کی، اور سب سے بڑھ کر نسبت مع اللہ اور سچی روحانیت کی!

جب تک علم وہدایت کا یہ آفتاب اپنے وجود مسعود کے ساتھ عالم شہادت میں جلوہ گر رہا، یہ ساری انجمنیں اور یہ تمام محفلیں اس سے کسب نور کرتی رہیں اور فیضیاب ہوتی رہیں، لیکن جب قانون الٰہی کے مطابق یہ سورج روپوش ہوا، تو اتنے چراغ روشن ہو چکے تھے کہ ہدایت وارشاد کی وہ بزم جو آراستہ ہوئی تھی، اس کی آب وتاب باقی رہی، اس حکیم امت کی درسگاہِ تربیت میں علم وعمل اور سلوک وروحانیت کے جو آبدار موتی فضل وکمال سے آراستہ ہوئے تھے، انھوں نے ہر طرف روشنی کے حلقے قائم کئے اور کام آگے چلتا رہا، اگلوں سے پچھلے علم حاصل کرتے رہے، اور ہدایت وارشاد کا ماحول بنارہا۔

حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ امت محمد یہ علیٰ

صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشن اور تابناک جماعت میں علم واعتبار سے ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہوئے ہیں کہ ان کا قلم مسلسل ہدایت کے موتی تو بکھیرتا ہی رہا، اس کے ساتھ ساتھ ان کی زبان حق ترجمان سے سے جو کلمات ہدایت صادر ہوتے، انھیں بھی لکھنے کا بڑا اہتمام رہا، اس دور میں الفاظ وکلمات کو محفوظ کرنے کے جدید آلات ابھی وجود میں نہ آئے تھے، اس وقت حق تعالیٰ کا خصوصی کرم یہ تھا کہ انھیں ایسے رجال کار بخشے گئے جو حضرت حکیم الامت کے اقوال وارشادات اور مواعظ وحکم کو قید تحریر میں لانے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے، انھوں نے لفظ لفظ لکھا بھی! اور لکھ کر حضرت کی نگاہ اصلاح کے سامنے پیش بھی کیا، اور حضرت کے وقت اور عمل کی برکت بھی وہ تھی کہ سب کو ملاحظہ فرمایا اور اس کے استناد کی حیثیت پختہ کردی!

اس طریقۂ کار سے حضرت حکیم الامت کے مواعظ وملفوظات کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہوگیا، حضرت اقدس ایک زبردست عالم وفقیہ ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے خطیب وواعظ بھی تھے، حضرت کے خطبات ومواعظ ہزاروں ہوئے ہیں، بہت طویل بھی اور قدرے مختصر بھی! آج ان کی تعداد بجز علام الغیوب کے کون جان سکتا ہے، لیکن جو مواعظ قلمبند کئے گئے اور ان کی اشاعت ہوئی، ان کی تعداد بھی ساڑھے تین سو سے زائد ہے۔ ملت اسلامیہ کی وسیع وعریض تاریخ میں یہ ایک ممتاز اور مثالی کارنامہ ہے کہ شخص واحد کے اتنے مواعظ جو کئی کئی گھنٹوں پر محیط ہوتے تھے مرتب اور مدوّن کئے گئے، پاکستان کے ایک ادارہ ''ادارہ تالیفات اشرفیہ'' ملتان نے ۳۱؍جلدوں میں ۳۳۵ مواعظ کا مجموعہ ''خطبات حکیم الامت'' کے نام سے شائع کیا ہے، اس کا نقش ثانی بمبئی سے حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ نے بھی شائع کیا ہے۔

یہ تو وہ مواعظ وخطبات ہیں جنھیں حضرت حکیم الامت نے عمومی مجامع میں مسلسل بیان فرمائے ہیں۔ ان مواعظ کے علاوہ ان کے ان ملفوظات وارشادات کا بھی بڑا ذخیرہ ہے جو حضرت کی مجلسوں، خصوصی گفتگوؤں اور سفر وحضر کے مختلف مواقع پر صادر ہوئے ہیں، یہ روزمرہ کی عام گفتگوؤں کے مجموعے ہیں، جنھیں اہل ذوق اور اہم علم حضرات نے آپ سے سن کر قلمبند کئے، اور انھیں بھی حضرت کے ملاحظے سے گزارا۔ ان مجموعوں کی تعداد بھی ۷۰؍سے زائد ہے، (ان تمام ملفوظات کا مجموعہ بھی مذکورہ پاکستانی ادارے نے ۳۰؍جلدوں میں ''ملفوظات حکیم الامت'' کے

نام سے شائع کیا ہے،[جواَب دیوبند سے بھی شائع ہوگیا ہے]) جن میں بعض تو مختصر ہیں لیکن بعض بہت مفصل کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں، ان ملفوظات کے تعارف کیلئے ''فہرست تالیفات حکیم الامت'' مرتبہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی علیہ الرحمہ کا قتباس نقل کرتا ہوں ، لکھتے ہیں کہ:

''حق تعالیٰ نے آپ کے قلب وزبان کوایسی توفیق عطافرمائی تھی کہ کوئی لحظہ اور کوئی لمحہ یادالٰہی سے خالی نہ جاتا تھا،سوتے جاگتے ،اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اپنے معبود برحق کے ذکر میں رطب اللسان رہتے تھے، یا انبیاء کرام واولیاء عظام کے تذکرے یا عاشقان ذوی الاحترام کی حکایات وروایات یا دین برحق مذہب اسلام کے احکام ومسائل بیان فرماتے رہتے تھے۔

حضرت والا کا ہر لفظ صبغة الله میں رنگا ہوا، ہر کلمہ شراب عشق حقیقی میں ڈوبا ہوا، ہر فقرہ حقائق ومعانی کے عطر سے معطر اور ہر جملہ ہدایت وارشاد سے مملو ہوتا تھا،جس سے حضرت والا کا مذاق ومسلک ،طرز تعلیم وتربیت بھی معلوم ہوتا تھا، اصلاح اخلاق ، اصلاح نفس اور نکات تصوف کے مختلف علمی وعملی، عقلی ونقلی معلومات وتجربات کے بیش بہا خزائن بھی حاصل ہوتے تھے۔

اہل علم حضرات نے نفع عام کی غرض سے اپنے سنے ہوئے ملفوظات مختلف زبانوں میں قلمبند فرمائے ہیں۔(فہرست تالیفات حکیم الامت،ص:۳۰۰)

یہ ملفوظات زیادہ تر حضرت کی حیات مبارکہ میں ہی چھپ کر شائع ہوگئے تھے، آپ کے وصال کے بعد بھی مختلف اداروں اور مطابع کی طرف سے چھپتے رہے اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہے، اسی کے ساتھ بعض لائق وفائق حوصلہ مند وعقیدت مند علماء نے ان مواعظ و ملفوظات کی راہ سے دین متین کی خدمت کے اور بھی مفید طریقے اختیار کئے ، اس طرح ان مواعظ وارشادات کی افادیت کا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔

چنانچہ کچھ دنوں پہلے مولانا مفتی محمد زید صاحب تلمیذ خاص حضرت مولانا سید قاری صدیق احمد باندوی علیہ الرحمہ (استاذ دا رالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے مختلف دینی اور علمی موضوعات کوان مواعظ وملفوظات سے منتخب کر کے یکجا کیا ، اور انھیں الگ الگ کتابی شکل میں شائع کیا، اس سے حضرت کے علوم ومعارف سے استفادہ سہل تر ہوگیا۔

اب ہمارے عزیز مولانا محمد سمیع الدین قاسمی سلّمہٗ نے کمر ہمت باندھی، اور خدمت کی ایک نئی مگر تحقیقی راہ اختیار کی جو خاصی دقت طلب اور مشکل ہے، وہ یہ کہ حضرت اقدس تھانوی علیہ الرحمہ چونکہ ایک بلند پایہ عالم، محدث، مفسر، فقیہ اور متکلم تھے، اس لئے ان کی عام گفتگو میں بکثرت قرآن وحدیث کے حوالے آتے ہیں، تفسیری بیانات ہوتے ہیں، فقہی اصول ومسائل ہوتے ہیں، علم کلام کی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں، تصوف وسلوک کے اسرار ونکات ہوتے ہیں، نیز فارسی کے اشعار موقع ومحل سے بکثرت ارشاد ہوتے رہتے ہیں۔ گفتگو کی روانی میں کتابوں اور مصادر ومراجع کے بیان کا اہتمام نہیں ہوتا۔ مولانا محمد سمیع الدین نے دراست وتحقیق کے لئے یہ راہ اختیار کی، کہ ہر حدیث، ہر فقہی اصول ومسئلہ اور دوسری علمی چیزوں کو ان کے مصادر ومراجع سے تحقیق کی، ہر ایک کا مستند حوالہ تحریر کیا، ہمارے اس دور میں اردو ہی کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے، تو فارسی کو کون پوچھے، موصوف نے محنت کرکے فارسی اشعار کا ترجمہ کردیا ہے۔

اس خدمت کے لئے انھوں نے حضرت کے اخیر زندگی کے ملفوظات ''الافاضات الیومیہ''.....جو کہ سب سے ضخیم ترین مجموعہ ہے....کا انتخاب کیا، اور سالہا سال کی محنت شاقہ اور ریاضت مستمرہ کے بعد ان ملفوظات کو از سر نو مرتب کیا، مضامین کی تفصیلی فہرست مرتب کی، اشاریہ تیار کیا، اب اس ضخیم دفتر سے استفادہ بہت سہل ہوگیا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان علماء کو حضرت تھانوی کے علوم وکمالات سے مناسبت ہورہی ہے، یہ ایک امید افزا مستقبل کی جانب اشارہ ہے۔

مولانا محمد سمیع الدین قاسمی سلّمہٗ کی اس خدمت کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی، اور ملت اسلامیہ کے نوجوان علماء پر اعتماد بڑھ گیا، حق تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ وہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مردان کار پیدا فرماتے ہیں، خداوند تعالیٰ انھیں مزید توفیق سے نوازیں، اور ان کی کاوشوں سے امت کو فیضیاب فرمائیں۔

ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد

اعجاز احمد اعظمی

۱۰؍ربیع الاوّل ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۵؍فروری ۲۰۱۱ء دوشنبہ

تقریب بر ''چن بسیشور''

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ أمابعد!

۱۹۷۲ء کا غالبًا اگست کا مہینہ تھا، میں صوبہ کرناٹک کے شہر میسور میں مسجد خا کی شاہ میں امام وخطیب کی حیثیت سے مقیم تھا۔ مسجد کے قریب ہی ٹاؤن ہال کی عمارت تھی، ایک دن ایک اشتہار نظر سے گزرا کہ ٹاؤن ہال کے وسیع ہال میں ''دیندار انجمن'' کا اجتماع ہونے والا ہے، یہ نام میرے لئے اجنبی اور نیا تھا۔ دیندار کے عنوان سے مجھے کشش ہوئی، تاریخ موعود پر میں بھی شریک اجتماع ہوا، دیکھا تو صورت ووضع اور شکل وشباہت کے اعتبار سے خاصے دیندار لوگوں کا اجتماع ہے، بڑی بڑی داڑھیاں، سروں پر پگڑیاں، لمبے لمبے کرتے، لیکن ٹخنوں سے نیچے پاجامے! بس یہ ایک چیز کھٹک رہی تھی، مگر جب اجتماع کی کارروائی شروع ہوئی اور تقریروں کا آغاز ہوا تو بالکل ناقابل فہم! دل ودماغ میں اترنے کے بجائے سروں کے اوپر سے گزرتی چلی جارہی تھیں، اسٹیج پر لگے ہوئے بینر کو دیکھ کر پہلے ہی ایک وحشت محسوس ہوئی تھی، جس پر ''چن بسیشور'' لکھا ہوا تھا۔ تقریروں نے یہ وحشت اور بڑھادی، میں سوچ رہا تھا کہ مسلمانوں کی شکل میں یہ ہندو ہیں؟ پھر ''صدیق'' بھی اور ''دیندار'' بھی، لیکن اس کے ساتھ ''چن بسیشور'' عجب معمہ معلوم ہورہا تھا، ان کی بے معنی اور دوراز فہم تقریروں کے سننے کے بعد اندازہ ہوا کہ قادیان کی جھوٹی نبوت سے متاثر ہوکر ان صاحب کو بھی جن کا نام صدیق لیا جارہا ہے اور دیندار کے لقب سے انھیں یاد کیا جارہا ہے، نبوت کا شوق چرّایا ہے، اور ''چن بسیشور'' کا ہندوانہ لبادہ اوڑھ کر یہ صاحب مسلمانوں میں بھی اور ہندووں میں بھی کوئی نیا فتنہ جگانا چاہتے ہیں، اتنی بات اجمالی طور پر سمجھ میں آجانے کے بعد میں وہاں سے چلا آیا، اور پھر کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

تاہم جب تک وہاں رہنا ہوا، جنوبی ہند میں مہدوی فرقہ اور ''چن بسیشور'' کے فرقہ کا

ذکر سنتا رہا۔ وہاں سے جب اپنے علاقہ شمالی ہندوستان میں آ گیا تو ان فرقوں کی یاد تو باقی رہی مگر نہ ان کے افراد سے کوئی سابقہ پڑا اور نہ ان کے لٹریچر کی کوئی بازگشت سنائی دی، لیکن ذہن میں یہ بات ہمیشہ جمی رہی کہ ختم نبوت کے بعد دجالوں اور کذابوں کی فہرست میں ایک مختصر اور محدود سہی! ناکام ونامراد سہی! ایک نام یہ ''چمن بسیشور'' اور اس کا فرقہ ''دیندار'' کے نام پر بد دین بھی ہے۔

بہت عرصہ کے بعد پھر جنوب میں حیدرآباد آمد ورفت شروع ہوئی، تو اس مانوس فرقہ کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ حیدرآباد کے نامور اور غیور عالم دین حضرت مولانا مفتی عبدالقوی صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی، اور تعارف ہوا۔ یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی اور حضور خاتم النبین ﷺ کی امت کی زرخیزی پر یقین واذعان میں مزید اضافہ ہوا، کہ ختم نبوت کے مضبوط حصار پر جو بری نظریں لگ رہی ہیں، اور وہ وقتاً فوقتاً اس آہنی قلعہ میں شگاف ڈالنے کی سعی نامحمود میں مصروف رہتی ہیں، امت کے علماء جو صحیح معنوں میں وراثت نبوت کا حصہ پائے ہوئے ہیں۔ وہ ان چوروں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، اور جو فتنہ جہاں سے بھی لپکتا دکھائی دیتا ہے وہیں اسے دبانے اور بجھانے کے لئے سربکف موجود ہوتے ہیں۔

مولانا مفتی عبدالقوی صاحب مدظلہ نے کچھ عرصہ پہلے ''مہدوی فرقہ'' کا کامیاب تعاقب کیا تھا، اب ان کی توجہ ''چمن بسیشور'' کے ناقابل فہم فرقہ اور اس کے ہفواتی وخرافاتی لٹریچر کی طرف ہوئی، یہ فرقہ اپنے پر پُرزے قائم رکھنے اور بڑھاتے رہنے کی کوشش جنوبی ہند میں کر رہا ہے۔ مولانا نے ان کے ہذیانی لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس لٹریچر میں ہے، وہ ہذیان اور ذہن ودماغ کے بے معنی طغیان کے علاوہ کچھ نہیں ہے، لیکن حسب مقولہ لکل ناعق لاحق ، ہر شور وغوغا مچانے والے پیچھے کچھ لوگ لگ ہی جایا کرتے ہیں۔ اس لٹریچر پر بھی اعتقاد رکھنے والوں کا ایک گروہ غوغا مچانے پر لگ گیا ہے، اس لٹریچر کا پڑھنا ایک صحیح دماغ والے کے لئے شدید مجاہدہ اور سخت آزمائش ہے، مگر مولانا کا صبر قابل داد بھی ہے اور قابل دید بھی کہ انھوں نے ان کے مشکل الحصول لٹریچر کو حاصل بھی کیا اور اسے بغور پڑھا بھی، اور پھر اسے نہایت سلیقے سے مرتب کر کے اس فرقہ اور اس بانیٔ فرقہ کی اصل تصویر امت کے سامنے رکھ دی۔

حق تعالیٰ اس مجاہدہ، اس صبر واستقامت، احقاق حق اور ابطال باطل کو بہ طفیل حضرت خاتم المرسلین ﷺ قبول فرمائیں اور امت کو ہر فتنہ سے محفوظ رکھیں۔

علماء ومشائخ کے تذکرہ کا دینی پہلو

(تقریب بر''علماءِاعظم گڑھ'')

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين. اما بعد

اللہ کے برگزیدے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالی سے چند دعائیں کی تھیں، وہ دعائیں اللہ رب العزت نے پسند فرمائیں اور انہیں اپنے آخری صحیفۂ ہدایت میں نقل فرمایا، ان دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے: **واجعل لی لسان صدق فی الآخرین** (سورہ شعراء:۸۴) اے میرے رب! میرے بعد والوں میں میرا سچا تذکرہ قائم اور جاری رکھئے۔ پھر اللہ تعالی نے یہ دعا قبول فرمائی، چنانچہ قبولیت کا بھی تذکرہ قرآن کریم میں ہے، حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حضرت اسحاق اور پوتے حضرت یعقوب علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: **ووهبنا لهم من رحمتنا وجعلنا لهم لسان صدق عليا.** (سورہ مریم:۱۵۰) اور ہم نے ان سب کو اپنی رحمت عطا کی اور ہم نے ان سب کا نام نیک اور بلند کیا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: **وتركنا عليه فی الآخرين ،سلام على ابراهيم، كذالك نجزی المحسنين،انه من عبادنا المومنين.** (سورہ الصافات:۱۰۹تا۱۱۱) ہم نے ان کے متعلق پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ ابراہیم پر سلامتی ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اور اس کی پسندیدگی ومقبولیت، پھر اس کا آخری صحیفۂ ربانی میں نزول، اور پھر قیامت تک اس کی لگاتار تلاوت، اس بات کی دلیل ہے کہ کسی صاحب ایمان کے ذکر خیر کا بعد والوں میں باقی رہنا، اللہ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کی دعا اللہ کے صالح ترین بندے نے کی ہے، پھر بعد میں آنے والوں کی یہ سعادت ہے کہ ان کے حق میں

دعا قبول ہوئی اور انہیں اگلے نیک اور برگزیدہ بندوں کے ذکر خیر کی توفیق ملی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں جو بکثرت انبیاء علیہم السلام ہوئے، ان سب کا ذکر خیر بعد والوں میں جاری ہوا، اور ان سب کے ساتھ ''علیہ السلام'' کا لاحقہ ضروری ہوا، ذکر خیر کے دستور کی بنیاد خود اللہ تعالی نے ڈالی، چنانچہ ہر کتاب آسمانی میں حق تعالی نے اپنے صالح بندوں کا تذکرہ اہتمام سے کیا ہے، بالخصوص سب کتب سماویہ کی جامع کتاب قرآن کریم میں تو ان صالحین کے تذکرے اتنی کثرت اور تکرار سے ہوئے ہیں کہ منکرین کو یہ وسوسہ ہونے لگا کہ یہ شاید ''اساطیر الاولین'' کا (نعوذ باللہ) مجموعہ ہے، حالانکہ وہ تو کتاب ہدایت ہے جس میں ان لوگوں کا راستہ واضح کیا گیا ہے، جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہدایت کی راہ بتانے کا سب سے آسان ذریعہ یہی ہے کہ جو لوگ اس راہ پر چلے ہیں ان کا اور ان کے طریقۂ عمل کا تعارف کرا دیا جائے، اسی لئے قرآن کریم میں صالحین کا تذکرہ بکثرت کیا گیا ہے۔

صالحین کے تذکرہ حسن اور لسان صدق کی جو بنیاد حق تعالی نے رکھی، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے علما نے اس بنیاد پر تذکروں اور سوانح عمریوں کی بڑی عمارتیں کھڑی کر دی ہیں، اس طرح ان کے ذکر خیر کا غیر منقطع اور استعداد محکم سلسلہ قائم ہو گیا۔

ان بزرگوں کا تذکرہ جہاں بجائے خود ایک بڑی نعمت وسعادت ہے وہیں امت کی ایک اہم بنیادی ضرورت بھی ہے، حق تعالی نے اپنی آخری کتاب اور اس کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے دین اسلام کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، اس وعدے کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ اس کتاب اور اس کی شرح وتفسیر اور تشکیل وتکمیل کے جتنے عناصر واسباب ہیں ان سب کی حفاظت کی جائے، تا کہ قرآن بھی محفوظ رہے اور اس کے لانے والے پیغمبر کے حالات، ان کے ارشادات و فرمودات بھی محفوظ رہیں، اور ان کے اخلاق وسیرت کے جلوے بھی روشن اور واضح رہیں، اور یہ کہ ان میں کسی طرح کے تغیر وتبدل کو راہ نہ ملے، اس کے لئے اللہ تعالی ایسے مردان کار تیار کئے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کا لفظ لفظ یاد رکھا اور اسے دوسروں تک پہونچایا، انہوں نے آپ کی سیرت کو اپنے اندر جذب کیا اور بعد والوں کے لئے نمونہ بنے، پھر انہیں رجال کار نے عصراً بعد عصرٍ دین کو اس کی اصل حالت میں تازہ بتازہ باقی رکھنے کا اہتمام کیا۔

یہ حضرات پچھلی نسلوں میں دین کے منتقل کرنے کے واسطہ بنے، تو ضروری ہوا کہ ان

کی زندگیاں بھی محو وتغیر سے محفوظ رہیں، پس اس امت میں ایک مستقل فن ''علم الرجال'' کا وجود میں آیا اور لاکھوں انسانوں کی زندگیاں محفوظ ہوگئیں اوران کا ذکر خیر پچھلوں میں مسلسل باقی رہا۔

امت کے ہر طبقہ نے اپنے پیش رو علما وصلحا کو ضبط کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اس کے لئے مختلف عنوان اختیار کئے ہیں، محدثین نے احادیث رسول کے راویوں کے حالات جمع کئے، تحقیق وتنقید کرکے ان کے مراتب ومدارج کا انضباط کیا، ان کے سنین ولادت ووفات کی تحقیق کی، ان کے حفظ واتقان، ان کی وسعت نظر اور دقت فکر کو بیان کیا، فقہا نے اپنے اساتذہ اور اساطین مذہب کے حالات مرتب کئے، ان کے درجات کا تعین کیا اور ان کی ذہانت وذکاوت کے واقعات تحریر کئے۔

علما کی ایک جماعت نے حضرات صحابہ کو موضوع بنا کر ان کے احوال وسوانح مرتب کئے، بعض علما نے ائمہ کبار کے حالات مدون کئے، بہتیرے علما نے خلفا وملوک کی داستان لکھی، بعض نے مختلف مذاہب ومسالک کے علما کا عنوان قائم کرکے کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ اور طبقات حنابلہ کے نام سے علما کا تعارف کرایا، بعض اہل تحقیق نے وفیات کو موضوع بنا کر علما کی بڑی تعداد کی زندگیا محفوظ کیں، کسی نے انساب کو عنوان بنا کر داد تحقیق دی، موضوعات کی یہ ایک لمبی فہرست ہے جن کے تحت ہزار ہا ہزار بزرگانِ پیشیں کا ذکر خیر ہے۔

علما کی ایک جماعت نے مختلف دیار وامصار کے اہل علم واصحاب فضل کو موضوع بنا کر ان کے حالات کی تحقیق کی، مثلاً علامہ خطیب بعدادی المتوفی ۴۶۳ھ نے ۱۴/جلدوں میں تاریخ بغداد لکھی، پھر دوسرے عالم علامہ شمس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے ۸/جلدوں میں اس کا ذیل لکھا[۱] علامہ ابن عساکر المتوفی ۵۷۱ھ نے ۸/جلدوں میں تاریخ دمشق لکھی، اس کے علاوہ علما نے تاریخ مکہ، تاریخ مدینہ، تاریخ اصفہان وغیرہ مختلف ناموں سے ان مقامات کے علما کا تذکرہ کیا، علامہ سیوطی نے تاریخ قاہرہ لکھی۔

تذکرہ، سوانح، تراجم اور اسماء الرجال کا یہ عظیم الشان کتب خانہ زیادہ تر بلکہ ایک عرصہ تک تمام تر عربی زبان میں رہا، جو قرآن وحدیث کی زبان ہے، عربی کے بعد فارسی زبان دین کی دولت سے مالا مال ہوئی، پھر جب ہندوستان میں اردو زبان کا وجود ہوا اور علمی دنیا میں اس کی نشو

نما ہوئی، اور علما نے اس پر توجہ دی، تو علوم دینیہ کا بیشتر سرمایہ اردو زبان میں آیا، ان علوم کی فہرست میں جنہوں نے اردو زبان میں نمایاں مقام حاصل کیا، تذکرہ وسوانح کا علم بھی ہے، اس فن میں اصحاب علم نے خوب خوب داد تحقیق دی ہے، نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ پر ایک کتب خانہ کا کتب خانہ تیار کر دیا، آپ کے علاوہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے، صحابہ اور تابعین کے، محدثین و ائمہ کے، فقہا وعلما واسلاف کے ذکر خیر کی سنت وسعادت کا سلسلہ جاری کیا اور اب تک وہ سلسلہ قائم ہے۔

اردو زبان میں بھی اہل تحقیق نے مختلف عنوانوں سے اسلاف کے تذکرے لکھے ہیں، طبقات کے لحاظ سے بھی، مختلف مکاتبِ فکر کے لحاظ سے بھی، مقامات اور جگہوں کے لحاظ سے بھی ولادت ووفات کے اعتبار سے بھی علما نے ان بزرگوں کے احوال جمع کئے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک زریں کڑی ہمارے مخدوم فاضل گرامی مولانا حبیب الرحمان قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی مرتب کردہ کتاب ''تذکرہ علماء اعظم گڑھ'' ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا، جس میں مولانا موصوف نے بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ نہایت جانفشانی، تلاش وجستجو سے اعظم گڑھ کے تقریباً دوسو علما کے حالات لکھے تھے۔ اس وقت سے اب تک کے وقفہ میں اور بھی بہت سے علما دنیا کا سفر پورا کرکے منزل آخرت میں کمر کھول چکے ہیں، مولانا نے اس اڈیشن میں مزید محنت کرکے تقریباً پچاس علما کے حالات کا اضافہ کیا۔

لیکن جغرافیائی اعتبار سے ضلع اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء میں دو ٹکڑوں میں منقسم ہوکر چھوٹا ہوگیا، بڑے بڑے بہت سے علما ضلع مئو کے حصہ میں آگئے، اور تذکرے کا دامن علماءِ اعظم گڈھ تک ہی محدود ہے اس لئے انہیں دوسری کتاب یا دوسرے مؤرخ کے لئے چھوڑنا پڑا۔

بہرحال یہ ایک مستند علمی دستاویز ہے جو اپنے نقش اول پر کیفیت اور کمیت ہر اعتبار سے فائق ہے۔ بزرگوں کا تذکرہ باعث سعادت ہے اور دعاء ابراہیمی کی قبولیت کا پیکر جمیل! اللہ تعالی اس تذکرۂ حسن اور ذکر خیر کو قبول فرمائے اور نافع بنائے۔ آمین

حاشیہ

(۱) تاریخ بغداد کا ذیل حافظ ابوعبداللہ محمد بن سعید الدبیثی المتوفی ۶۳۷ھ نے لکھا تھا، علامہ ذہبی نے اس کا اختصار کیا۔ وہی اختصار تاریخ بغداد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

تأثر

بر

''اپنی باتیں''۔آپ بیتی مولانا ین العابدین معروفی صاحب

استاذ محترم مولانا زین العابدین الاعظمی المعروفی علیہ الرحمۃ اپنے تقوی و دیانت، اپنی عفت ونزاہت، اپنی استعداد وذکاوت، اپنی محنت وریاضت، اپنے خلوص وللّٰہیت، اپنی جانکاہی و جفاکوشی، اپنی شفقت ومحبت، اپنی تعلیم وتربیت، اپنی کردارسازی ومردم گری، اپنی پاک باطنی وبے نفسی، اپنے علم وفن کے رسوخ وپختگی اور اپنے اخلاق وعمل کی بلندی و پاکیزگی کے لحاظ سے ہمارے اس دور میں سلف صالحین کے نمونہ اور اللہ کی نشانیوں میں ایک روشن نشانی تھے، تمام زندگی جس سادگی اور بے نفسی میں گزاری، تعلیم وتربیت کے روزمرہ معمولات میں جس بے تکلفی سے لگے رہے، اور اپنے کو کھپائے رہے، دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کس بلند معیار ومرتبہ کے مردکامل ہیں اور تواضع وانکساری کی سادہ چادر میں لپٹا ہوا کتنا عظیم گوہر گرانمایہ ہے، لیکن حق تعالی کو منظور تھا کہ گدڑی میں جو لعل چھپا ہوا ہے، اس کی ایک جھلک نگاہوں کے سامنے آجائے، تاکہ چلنے والوں کے لئے راستہ ہموار رہے، اور اندھیریوں میں ایک تیز شمع کی روشنی دور تک اجالا کرتی رہے۔

زندگی کے اخیر دنوں کی تابناکی دیکھنے والوں نے خوب دیکھی، قریب والوں نے بھی اور دور والوں نے بھی، اس کی کچھ جھلکیاں اس خاکسار نے اپنے دو مضمونوں میں دکھائی ہیں، شاید ناظرین کی نگاہ سے گزری ہوں گی یا گزریں گی، یہ تو آخری لمحات کے ایمان افروز حالات ہیں۔

لیکن زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا ؟ کس حال میں ہوا؟ کن کن منزلوں سے زندگی گزری ؟ کس کس نشیب وفراز میں حالات نے ہچکولے کھائے ؟ روزی کی تقسیم کس کس سرزمین سے وابستہ رہی؟ نشو ونماوتربیت کن کن بزرگوں کے سایہ رحمت کے ماتحت ہوتی رہی؟ افادہ و استفادہ کا سفر کن کن مرحلوں سے ہوتا ہوا تکمیل کو پہونچا؟۔

عمر عزیز کی طویل مدت کا یہ سفر، اس سفر کی منزلیں، بہت سے لوگوں، عزیزوں، قرابت مندوں، شاگردوں، اور مریدوں کے نگاہ سے گزرتی رہتی ہیں، مگر جیسے ہی یہ سفر اپنی آخری منزل پر پہونچ کر کمر کھولتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نگاہوں سے سارے مراحل اوجھل ہوگئے، جنھوں نے قریب سے دیکھا ہے، وہ صدمہ کی ایک کیفیت میں خودفراموشی کی دنیا میں کھو جاتے ہیں، جنھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے، ان کی زبان گنگ ہوجاتی ہے، جب زبان ہی گنگ ہوگئی تو قلم کا کیا یارا ہے کہ وہ اظہار کرے۔

پھر اللہ کو منظور ہوتا ہے کہ زندگی کے نافع اجزا اور مفید حصے لوگوں کے ذہن ودماغ میں محفوظ رہیں، تو حق تعالی کی تدبیر اس کا انتظام کرتی ہے، حضرت مولانا کی زندگی کے بقاء کا حسن انتظام اللہ کی طرف سے یہ ہوا کہ مولانا کے رنگ طبیعت کے خلاف، مولانا کے افتادمزاج سے الگ، خود انھیں کے قلم سے حالات وسوانح کی تحریر کا سلسلہ شروع کرایا گیا، مولانا کا رنگ طبیعت یہ تھا کہ وہ اپنے احوال وکوائف کا عموماً اظہار نہیں کرتے تھے، ان کا مزاج پوشیدگی اور کتمان حالات کا تھا، اس مزاج اور اس رنگ کے ساتھ یہ تصور کہ وہ اپنے حالات اپنے قلم سے لکھیں گے، ایک بعید تصور تھا، مگر اللہ کے فیصلے نے مولانا سے یہ انہونا کام نہ جانے کب شروع کرادیا تھا، پھر جب مولانا بستر مرض پر آئے، اور دنیا سے رخصت ہونے کے آثار سامنے آنے لگے، اور ساتھ ہی ساتھ ایمان ویقین کی روشنی تیز سے تیز تر ہونے لگی، نصائح اور وصایا کا سلسلہ شروع ہوا، تو خود آپ کو بھی اور آپ کے صاحبزادوں کو بھی ناتمام لکھی ہوئی آپ بیتی یاد آنے لگی، مولانا نے وعدہ کیا کہ مہلت ملی تو اسے اپنی حد تک تکمیل کو پہونچاؤں گا، اور امید ظاہر کی کہ مہلت ملے گی، چنانچہ زندگی کے وقفے میں حق تعالی نے مہلت عطا فرمائی، کچھ بطور خود اور کچھ صاحبزادۂ محترم مولانا عبد الباسط صاحب سے بطور املا کے لکھوائی، اس کا نام خود مولانا نے ''اپنی باتیں'' رکھا۔

زندگی کے آغاز سے اس کے اختتام کے قریب تک یہ ایک مکمل، جامع لیکن مختصر آپ بیتی ہے، صاحب زندگی، اپنی زندگی سے جیسا واقف ہوتا ہے، دوسرا کیوں کر ہوسکتا ہے؟ پھر وہ صاحب زندگی اگر راست باز، دیانت دار، قوی الحفظ، فہیم وزیرک اور خداترس و بےنفس ہو، تو اس کا لفظ لفظ معیار حق وصداقت بن جاتا ہے، پڑھنے والوں کے لئے دیانت وامانت کی راہ روشن کرتا ہے۔

مولانا کے انتقال کے بعد مولانا پر جو مضامین ان کے تلامذہ ومحبین لکھیں گے، وہ تو لکھیں گے ہی، اس کے ساتھ صاحبزادۂ محترم مولانا عبدالباسط صاحب نے اہتمام کیا کہ سچائی کی یہ دستاویز، اور روشنی کی یہ شمع دلآویز ڈھونڈھنے والوں، محبت کرنے والوں اور صدمہ وغم میں ڈوبنے والوں کے ہاتھوں میں آجائے، تاکہ ان سچے حالات کی روشنی میں محبت کی لو تیز اور غم کا زخم مندمل ہو۔

اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں، پڑھنے والوں کے لئے رہنما بنائیں، غمزدہ وارثین واہل محبت کے لئے سرمایہ تسکین بنائیں، اور مولانا کی روح کو اعلیٰ علیین میں فرحت وشادمانی سے نوازیں۔ آمین

تلمیذہ الاصغر
اعجاز احمد اعظمی
۱۶؍رجب ۱۴۳۴ھ

☆☆☆☆☆☆

فیضانِ حکیم الامت

تھانہ بھون کے درویش عالم، صاحب نسبت بزرگ، سنت وشریعت کے بے مثال داعی وسالک، طریقت وحقیقت کے ماہر شناور حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی شخصیت ایک آفتاب جہاں تاب تھی، جن کے فیوض برکات سے ایک عالم کا عالم مستفیض ہوا، آپ کی حیات طیبہ میں آپ کا فیض تو رواں دواں تھا ہی، علم کا نور، عمل کی پاکیزگی، نسبت باطنی کے برکات، شریعت وطریقت کا عموم وشیوع، اصلاح باطن اور پختگی عقائد کے برکات کا ظہور تو تھا ہی، آپ کے دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی، جس کو اب ستر سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، آپ کے فیوض و برکات کا بحر بیکراں اب بھی دنیائے اسلام کو فیضیاب کر رہا ہے۔ **ذالک فضل الله یو تیه من یشاء وهو العزیز الحکیم۔**

آپ کے قلم سے صدہا دینی کتابیں، ضخیم بھی اور مختصر بھی نکلیں، جو افادیت اور نافعیت میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، ان کی اشاعت کا سلسلہ اب بھی قائم بلکہ روز افزوں ہے، ان سے امت فائدہ اٹھا رہی ہے، اس کے ساتھ ارشاد وتربیت کے ذریعہ سے مشائخ اور بزرگان دین کی اتنی بڑی جماعت تیار کر دی تھی کہ ان کے فیض نسبت سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش جگمگا گیا، آج ان کے براہ راست خلفاء میں سے کوئی بھی حیات سے نہیں ہے، لیکن ان کے سلسلہ کے ہزار ہا بزرگان طریقت موجود ہیں جن سے نسبت وشریعت اور راہ طریقت کے فوائد عام ہو رہے ہیں۔

آپ کی بابرکت زندگی میں فیوض و برکات کا ایک بڑا دروازہ آپ کے مواعظ و خطبات کا تھا، ہندوستان کا وہ کون سا گوشہ اور کون سا خطہ ایسا ہوگا، جہاں حضرت کے قدم نہ گئے

ہوں اور وہاں آپ کے مواعظ نہ ہوئے ہوں، چھوٹا مجمع ہو یا بڑا مجمع، دینی واصلاحی موضوعات پر آپ کے بے شمار خطبات سے امت حاضرہ نے خوب نفع اٹھایا ہے،آپ کے مواعظ گویا ہوتے تھے علوم دینیہ کے دائرۃ المعارف ہوتے،شریعت کی حکمتیں اور نکات،طریقت کے مسائل و معارف،زندگی کے مشکلات کا حل،انسانی تشنگی کی سیرابی کا سامان،قلبی الجھنوں کی تسکین وتشفی، ذکر الٰہی اور تعلق مع اللہ کی موثر دعوت،تصوف وسلوک کی رہنمائی،غرض ہر دینی واخروی بلکہ دنیوی ضروریات وحاجات کے بیان پر مشتمل یہ خطبات ومواعظ ہوتے تھے،ان مواعظ میں دل کی چھپی ہوئی بیماریوں کا علاج ہوتا تھا،غلط عقائد ونظریات کی اصلاح ہوتی تھی،مختلف شکوک وشبہات اور وساوس کا ازالہ ہوتا تھا،مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پھیلی ہوئی برائیوں،کمزوریوں اور بے راہ رویوں کی نشان دہی اور ان سے بچنے اور نجات پانے کی رہنمائی ہوتی تھی،ان مواعظ میں اللہ نے ایسی تاثیر رکھی تھی کہ ایک ایک مجلس وعظ سے کتنی زندگیاں دنیا سے اپنا رخ بدل کر دین کے رنگ میں ڈھل جاتی تھیں،اللہ ہی جانتا ہے کہ حضرت کے مواعظ کا فیضان کہاں کہاں اور کس کس شکل میں پہونچا ہے۔

جو ان مواعظ میں حاضر ہوتے تھے وہ تو مستفیض ہوئے،حق تعالی نے ان مواعظ کے بقاء کا بھی ایسا حیرت انگیز انتظام کیا،جس کی نظیر امت میں کم ملتی ہے،حضرت کے پورے پورے وعظ،مجلس وعظ میں قلم بند کئے گئے،پھر ان پر حضرت نے نظر ثانی فرمائی اور بیشتر حضرت کی حیات ہی میں شائع ہوئے،ان مواعظ کا فیض بحمد للہ اب تک جاری ہے،پہلے حضرت کی زبان مبارک سے لوگ سن کر،حضرت کی مجلس میں حاضر ہوکر مستفید ہوتے تھے،اب ان مواعظ کو کتابی شکل میں پڑھ کر مستفید ہوتے ہیں،آپ کی نسبت باطنی،اور شریعت وطریقت کا نور اور اس کی تاثیر اب بھی باقی ہے۔

پھر اللہ نے اپنے خاص خاص بندوں کو توفیق دی کہ انھوں نے اس بحر بیکراں سے فیض واثر کی چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نہریں تیار کیں،تا کہ کم فرصت والے،کم استعداد والے،زیادہ محنت نہ کر سکنے والے بھی ان سے اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق فائدہ حاصل کریں،اور یہ کام حضرت حکیم الامت کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا،اس طرح حضرت کا افادہ

عام سے عام تر ہوتا رہا۔

میرے دوست مولانا قاری عبدالستار صاحب فتح پوری ایک ذی استعداد، باصلاحیت، صالحیت کے پیکر، سراپا حرکت وعمل عالم دین ہیں، دینی خدمات کا خاص ذوق رکھتے ہیں، ایک صاحب ذوق شاعر بھی ہیں، لیکن ان کی شاعری حمد ونعت کے نورانی دائرہ میں رہتی ہے، اس سے آگے شاعری کی ان وادیوں میں قدم نہیں رکھتے جن کے بارے میں قرآن نے **فی کل واد یھیمون** سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ قاری عبدالستار صاحب اس سے مبرا ہیں۔

وہ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے، پھر جیسا کہ راہ صداقت کے ہر مسافر کی قسمت ہے کہ اللہ کی طرف سے کچھ آزمائش کے مرحلے آتے ہیں، جس کے ہجوم میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ہر طرف سے تنگ ہو رہی ہے، ایسی تنگ ہو رہی کہ آدمی گھبرا اٹھتا ہے، اور بے ساختہ دل سے صدا نکلتی ہے، **متی نصر الله**؟ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ ایسا مرحلہ قاری صاحب کی خدمات کے سفر میں بھی پیش آیا، میں نے انھیں مشورہ دیا کہ تنہائی اور سکوت کے ان ایام میں حکیم الامت حضرت تھانوی کے مواعظ کا مطالعہ کیجئے، ان کے مطالعہ سے اللہ کی محبت دل میں جاگے گی، قلب کو قوت حاصل ہوگی، ایمانی اطمینان میں اضافہ ہوگا، راہ عمل ہموار ہوگی، علوم ومعارف کی ایک پر کیف دنیا نگاہوں میں آئے گی، قاری صاحب نے اپنی سعادت مندی سے اس مشورہ کو قبول کیا، اور حضرت تھانوی کے مواعظ کا مجموعہ جو ''التبلیغ'' نام سے کئی جلدوں میں شائع ہوا تھا اس کا مطالعہ شروع کیا، اور جن آثار ونتائج کا میں مواعظ کے مطالعہ سے امیدوار تھا، وہ آثار بہت قوت سے ظاہر ہونے شروع ہوئے، اور اس پر ایک مزید اضافہ انھوں نے یہ کیا کہ ان مواعظ سے مختلف علوم ومعارف، نصائح وحکم، اور سبق آموز واقعات کے اقتباسات جمع کرنے کی مہم چھیڑ دی، ایک حد تک اس کام کو آگے بڑھانے کے بعد مجھے اطلاع دی، مجھے بہت خوشی ہوئی، یہ کام میں چاہتا تھا کہ خود کروں، یا اپنے لوگوں میں سے کسی صاحب ذوق سے کراؤں، قاری عبدالستار صاحب نے جب کام شروع کر دیا تو میری دلی مراد بر آنے کا سامان ہوا، میں نے کام کا نمونہ منگوایا، دیکھا تو مزید خوشی ہوئی، انھوں نے ڈوب کر مواعظ کا مطالعہ کیا اور بہت خوبصورت موتی نکالے، اور انھیں

سلیقے سے سجایا، یہ بڑی محنت، بڑے ذوق، بڑی جانکاہی اور تسلسل کا عمل تھا، قاری صاحب جن خدمات میں مشغول تھے ان میں مشغول رہتے ہوئے اس مسلسل اور جانکاہ عمل کا انھیں موقع نہ ملتا، مگر:

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

کبھی شر کے بطن سے خیر کا ظہور ہوتا ہے، حالات نے انھیں پریشان کیا، مجبور کیا، لیکن آدمی کے لئے میدان عمل تنگ نہیں ہے، انھیں ایک اور میدان مل گیا، اور انھوں نے خوب سے خوب تر محنت کی، اور محنت کا نتیجہ ایک ایسی دینی وعرفانی خدمت کی شکل میں آیا کہ اس کی افادیت دور تک اور دیر تک رہے گی۔ ان شاء اللہ

قاری صاحب کا عزم ہے کہ تلخیص واقتباس کا یہ سلسلہ حضرت تھانوی کے تمام مواعظ تک پھیلائیں، اس طرح تمام مواعظ کا بنظر غائر مطالعہ بھی ہو جائے گا، اور ان کی افادیت ایک نئی شکل میں جلوہ گر بھی ہوگی، ان مواعظ کی روحانی، علمی وعرفانی تاثیر سے پہلے تو پڑھنے والا متأثر ہوتا ہے، پھر دوسروں کو وہ اس تاثیر میں شریک کر لیتا ہے، اور **الدال علی الخیر کفاعلہ** کے مصداق حق تعالی کے یہاں امید ہے کہ یہ خدمت مقبول ہوگی۔

اللہ تعالی حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے فیوض و برکات سے پوری امت کو بہرہ ور فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۳۰ رجب ۱۴۳۴ھ

☆☆☆☆☆☆

تقریظ
بر
''عمدۃ الاقاویل فی تحقیق الاباطیل''

الحمد الله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین. اما بعد

دین اسلام کا آغاز اوراس کا ظہورعربی زبان میں ہوا،قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا،اور ایسے اسلوب میں اور ایسی معنویت اور داخلی اور خارجی کمالات کے ساتھ نازل ہوا، نیز فصاحت وبلاغت کا وہ بلند مقام اسے حاصل ہوا کہ دنیا آج تک انگشت بدنداں اور سر بگریباں ہے،اور کیوں نہ ہو؟ اللہ کا کلام ہے،اللہ کی صفت ہےتو جس طرح اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے ایسے ہی اس کا کلام بھی یکتا اور بےنظیر ہے۔

اسلامی علوم ومعارف کا تمام تر ذخیرہ عربی زبان میں ہے،فرامین وارشادات رسول عربی زبان میں ہے،آثار صحابہ وتابعین عربی زبان میں ہے،تفسیری کنوز وذخائرعربی زبان میں ہیں،حدیث رسول کے متعلقہ تمام علوم فنون عربی زبان میں ہیں،علوم فقہ کے تمام شعبےعربی زبان میں ہیں،عربی زبان اسلام کی بنیادی زبان ہے،اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام کے علوم وفنون کا تمام تر ذخیرہ عربی زبان میں ہو۔

پھر جوں جوں اسلام کا حلقہ وسیع ہوتا گیا دوسری زبانیں بھی اسلامی سرمایہ سے مالا مال ہوتی رہیں، بالخصوص فارسی زبان میں اس کا بڑا سرمایہ منتقل ہوا،مگر اردو زبان کی خوش بختی دیکھئے کہ اس کا وجود بہت بعد میں ہوا،ابھی چند ہی صدیاں گزری ہیں کہ یہ زبان عہد طفولیت سے نکل کر نشو

نما پاتے ہوئے عہد شباب تک پہونچی ہے،مگر دیکھا جائے تو عربی زبان کے بعد اسلامی علوم و معارف کی سب سے زیادہ سرمایہ داریہی اردو زبان معلوم ہوتی ہے، ہرعلم وفن کا ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے،تفسیر قرآن سے متعلق،احادیث رسول سے متعلق،فقہ اسلامی سے متعلق،جو دین کے بنیادی علوم ہیں،اردو زبان میں ہر ایک کا معتد بہ ذخیرہ جگمگا رہا ہے،کسی کا بہت زیادہ کسی کا کسی کا قدرے کم۔

تفسیر قرآن پر نظر کیجئے تو حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی تفسیر''موضح القرآن'' سے شروع ہوکر موجودہ دور کے متعدد علماومشائخ کی تفسیری کاوشوں،بالخصوص حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا ادریس کاندھلوی کی''معارف القرآن''اور مولانا عاشق الٰہی بلندشہری کی تفسیر''انوارالبیان'' تک ایک زبردست تفسیری سرمایہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، لیکن بعض تفسیری نکات ودقائق جن کا تعلق زبان وبیان کی گہرائیوں سے ہے،حضرات علما نے انہیں عربی زبان کے سفینوں میں ہی باقی رکھا،اردو ایک اجنبی زبان ہے،ان نکات ودقائق کو اس زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کیوں کہ اس کے مخاطب علما ہیں اور وہ عربی میں دسترس رکھتے ہیں۔

اسی طرح حدیث سے متعلق بہت سے فنون اردو میں آچکے ہیں،مگر کچھ فنی چیزیں جن کا تعلق خاص اہل علم سے ہے،انہیں بھی عموماً اردو زبان میں منتقل نہیں کیا گیا،مثلاً اسماء رجال کا وسیع وعریض علم،عربی زبان کی ابھی تک امانت ہے،احادیث رسول کے بحر ناپیدا کنار میں ایک بڑا علم احادیث کی مختلف حیثیات کی معرفت ہے،جب کسی حدیث کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں یہی بات راسخ ہوتی ہے کہ وہ ارشاد رسول ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ کتنی ہی باتیں لوگوں کی زبانوں پر، کتابوں کے دفاتر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوکر چل پڑی ہیں،حالانکہ تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ ارشاد رسول نہیں ہے،ایسی باتوں کا جاننا اہل علم کے لئے بالخصوص،عام اہل اسلام کے لئے بالعموم ضروری ہے، کیوں کہ جو بات رسول اللہ ﷺ نے نہ فرمائی ہو اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا سخت گناہ کبیرہ ہے،آپ ﷺ کا ہر فرمان دین ہے،اور جو کچھ آپ نے نہیں فرمایا اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا گویا دین میں اضافہ کرنا ہے،اور یہ درحقیقت افترا علی اللہ و

علی الرسول ہے۔اردو زبان میں اس کی طرف پیش رفت کم ہوئی ہے، کیوں کہ اہل علم عربی زبان میں مہارت کی وجہ سے اصل بنیادی مراجع سے اس کو دریافت کر سکتے ہیں، لیکن اب جب کہ حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ اردو میں آچکا ہے، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اردو خواں طبقہ کو بھی اس کی واقفیت بہم پہونچائی جائے، تاکہ تمام اہل اسلام ایک بڑی غلطی سے محفوظ رہ سکیں۔

مولانا رضوان الدین معروفی سلمہ اللہ تعالی شیخ الحدیث جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا کو تفسیر وحدیث کے ان خاص موضوعات کی طرف پیش رفت کی خصوصی توفیق اللہ کی جانب سے مرحمت ہوئی، انہوں نے تفسیری نکات ومعارف اوراس کے حقائق ودقائق جن سے اردو زبان کا دامن خالی تھا، بڑی خوبصورتی کے ساتھ اور عالم فہم انداز میں ''اللؤ لؤ والمرجان فی لطائف القرآن'' نامی کتاب میں اردو زبان میں انہیں تحریر فرمایا ہے، ایسے ایسے علوم ومعارف جن سے علم ومعرفت کی دنیا روشن ہوتی ہے، دل شاد ہوتا ہے، آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

اس خدمت کے بعد احادیث رسول کے اس خاص عنوان کی طرف متوجہ ہوئے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا، اور انہوں نے ان احادیث کی تحقیق کا بیڑا اٹھایا جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوکر رائج ہوگئی ہیں، حالانکہ وہ کلام نبوت نہیں ہیں، انہوں نے اپنی اس تحقیق کے آغاز میں ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ لکھا ہے جو بہت ہی معلومات افزا ہے، اس میں انہوں نے حفاظتِ حدیث پر مفصل گفتگو کی ہے، پھر حدیثیں گھڑنے کے آغاز، اس کے اسباب ومحرکات پر تفصیلی کلام کیا ہے، پھر موضوع حدیثوں کی شناخت اوران کی علامات پر بڑی جامع بحث کی ہے، اردو زبان میں اس موضوع پر اتنا مفصل اور جامع مقالہ شاید کہیں موجود ہو۔

اس مفصل مقدمہ کے بعد ایک سو سے زائد ایسی روایتوں کی تحقیق کی ہے جو حدیثوں کے نام سے رائج ہیں مگر وہ حقیقت میں حدیث رسول ﷺ نہیں ہیں، ہر ایک کی مکمل تحقیق کی ہے، اگلے پچھلے علما ومحدثین اور نقاد واہل تحقیق کے حوالے سے کلام کو مدلل کیا ہے۔

یہ ایک بڑی محققانہ علمی ودینی خدمت ہے، مولانا موصوف قابل مبارک باد ہیں، اور حق تعالی کا ان پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے حدیث پاک کی تدریس کے ساتھ اس اہم موضوع کو تحقیق وتنقید کا ہدف بنایا، اور ماشاء اللہ ان سے یہ عظیم اور مفید خدمت کمال حسن وخوبی کے ساتھ

لی گئی، اور کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب دانستہ یا نادانستہ ایسی باتیں منسوب کی ہیں، جن سے آپ بری ہیں، تو حق تعالی نے ایسے لوگوں کو کھڑا کر دیا اور انہیں توفیق دی کہ اس غلط نسبت کی غلطی ظاہر کر کے آپ کی برأت کو واضح کریں۔

خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ایک زندیق کو قتل کے لئے لایا گیا، وہ کہنے لگا تم مجھے تو قتل کردو گے لیکن ان ایک ہزار حدیثوں کا کیا کروگے جو میں نے وضع کر کے امت میں رائج کردی ہیں، ہارون رشید نے جواب دیا، اے دشمن خدا! تو ابواسحاق فرازی اور عبداللہ بن مبارک سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے؟ جو انہیں تحقیق کی چھلنی میں چھان کر ایک ایک حرف الگ کردیں گے

غلط روایات کی غلطی واضح کردینا ایک بڑی علمی و دینی خدمت ہے، جس کی توفیق اللہ تعالی نے مولانا رضوان الدین صاحب سلمہ کو عطا فرمائی۔

اللہ تعالی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور انہیں علم و عمل اور روحانیت کے بلند درجات پر فائز کریں، اور امت کو ان کی خدمات سے بیش از بیش فائدہ پہونچائیں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆

مقدمہ ’’تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت‘‘

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اندر انگریزوں کے خلاف ایک زبردست بغاوت ہوئی، لیکن وہ ناکام ہوئی، مغل حکومت کا چراغ جو ایک عرصہ سے جھلملا رہا تھا اس بغاوت کی آندھی میں بجھ گیا، اب پورے ملک میں انگریزوں کی جو مذہباً عیسائی تھے، حکومت قائم ہوگئی، اس حکومت نے بغاوت کا انتقام اس طرح لیا کہ ایک زبردست مہم کے تحت ذرا ذرا سے فرد جرم کے باعث پورے ملک میں پھانسیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا، درۂ خیبر سے لے کر مشرقی بنگال تک کا ہر درخت پھانسی کا تختہ بنا ہوا تھا، چونکہ اس بغاوت میں علما بطور خاص شریک تھے، اس لئے نشانہ پر سب سے زیادہ یہی آئے، خبر دینے والوں نے خبر دی کہ پچاس ہزار سے زیادہ علما تختۂ دار پر کھینچے گئے۔ سوچئے! جس ملک سے پچاس ہزار علما ناپید کر دیئے جائیں وہاں علم کیا باقی رہ سکتا ہے؟ اور جب علم ہی نہیں تو وہ دین بھی ناپید ہو جائے گا جس کا مدار علم پر ہوگا۔

چنانچہ اس وقت یہی ہوا کہ علما ختم ہوئے، علم دین نابود ہوا، دین میں اضمحلال پیدا ہوا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی علیہ الرحمہ کی ایک بات نقل کی ہے جس سے اس وقت کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا میرٹھی ’’تذکرۃ الخلیل‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’ایک مرتبہ بندہ حاضر تھا، آپ (شیخ الہند) نے سر اٹھایا اور فرمایا مولوی عاشق الٰہی! ایک بات کہوں، ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ ہندوستان میں علم کی اتنی کمی تھی کہ دور کیوں جاؤ؟ خود ہمارے اضلاع (سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ وغیرہ) میں جنازہ کی نماز پڑھانے والا مشکل سے ملتا تھا‘‘۔ (ص ۱۸۱)

یہ حال اس ملک کا ہوگیا تھا، جہاں کبھی ہر طرف علم کی بہاریں خیمہ زن تھیں، اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اللہ تعالی نے اہل دل کے دلوں میں ایک بات ڈالی، وہ یہ کہ دینی تعلیم گاہوں کا ایک نیا نظام شروع کیا جائے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند سے اس کا آغاز ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے دس بیس سال میں مدارس کا جال بچھتا چلا گیا، اور علم کی بہاریں پھر واپس ہونے لگیں، لیکن اس کے باوجود ایک ہمہ گیر تحریک کی ضرورت تھی جو علاوہ خواص کے عوام کے درمیان مؤثر کام کرے، علما کے مواعظ کا سلسلہ جاری تھا، کچھ انجمنوں کے ذریعے کام کر رہے تھے، بہر حال بیشتر علما اپنی اپنی جگہ فکر مند تھے کہ دین کی اشاعت کس طرح ہمہ گیر پیمانے پر عام ہو، مشائخِ طریقت تزکیۂ نفوس کا فریضہ انجام دے رہے، بعض حضرات مستقلاً خانقاہ میں قیام رکھتے، بعض بزرگان دین دورے کرتے، عوام کے درمیان جاتے، اور ان سب طریقوں کے اثرات آہستہ آہستہ مسلمانوں کے عمومی معاشرہ پر پڑ رہے تھے، اسی تجرباتی دور میں مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ایک صاحب عزیمت اور صاحب نسبت گھرانے کے فرد تھے، ابتداء حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی صحبت میں رہے، پھر باضابطہ تربیت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی، جب ان کا قیام بستی نظام الدین بنگلہ والی مسجد میں اپنے والد مولانا محمد اسماعیل صاحب اور اپنے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب کی جگہ پر ہوا، اور میوات کی طرف سے آنے والے بدوؤں اور دیہاتیوں سے سابقہ پڑا، نیز ان کی جہالت اور بے دینی کے مناظر دیکھے تو مولانا کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی، اور مدتوں کے ریاض اور دعاؤں کے بعد ایک خاص طریقے سے ان میں کام کرنے کا تجربہ ہوا، اس کے فوائد ظاہر ہوئے، پھر انہوں نے اس طریقے کو عام کرنا چاہا، کیوں کہ تجربے سے اس کے منافع ظاہر ہو چکے تھے، انہوں نے علما کو بھی دعوت دی کہ اس طریقۂ خاص کو دیکھیں، اگر مفید محسوس ہوتو اسے اختیار کریں، کچھ مضرتیں ہوتو اسے ظاہر کریں۔ یہ بات ان کے مطبوعہ ملفوظات کے پڑھنے سے بالکل عیاں ہیں، انہیں جہاں یہ تڑپ تھی کہ اس طریقۂ خاص کو لوگ اپنا کر اشاعت دین کا کام عام کریں، وہیں یہ بھی اندیشہ رہا کرتا تھا کہ کہیں یہ طریقہ منہاجِ سنت اور اصولِ شریعت سے منحرف نہ ہو جائے، اسی لئے وہ بار بار علما کو اس کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔

مولانا کے نزدیک عوام میں دین کو عام کرنے کا یہ ایک مفید طریقہ تھا، چاہتے تھے کہ یہ

طریقہ صحیح منہاج پر کام کرتا رہے، بانی کے اخلاص، ان کی علمی گرفت اور تحریک کے آغاز ہونے کی وجہ سے یہ طریقہ ایک طریقۂ کار ہی رہا، اس میں مقصدیت کی شان نہیں داخل ہوئی تھی، غلوا بھی نہیں پیدا ہوا تھا، لوگ اسے تبلیغ واشاعت کا ایک طریقہ ہی سمجھتے تھے، بذات خود یہی دین نہیں بنا تھا، لیکن یہ کام بڑھتا اور پھیلتا گیا، خواص سے نکل کر عوام میں داخل ہوا، اور عوام ہی اس میں نمایاں مقام حاصل کرنے لگے، بانی کا انتقال ہوگیا، اس پر سے علمی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس میں اصرار داخل ہوا، ہر شخص پر اصرار کہ اس کام کو ضرور ہی اختیار کرے، اس اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام کا یہی طریقہ، اب طریقۂ کار نہیں رہا بلکہ مقاصد دین میں داخل ہوکر عبادت مقصودہ بن گیا، اس کے بعد یہ بات آہستہ آہستہ عموم پکڑتی چلی گئی کہ جو خاص اس طریقۂ مروج میں شامل نہیں ہوتا وہ مورد اعتراض بننے لگا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ تو علما کو دعوت دیتے تھے کہ اس طریقۂ خاص کو دیکھیں، اور شریعت سے کہیں انحراف نظر آئے تو مطلع کریں، اصلاح کریں، اور اب اصرار کی وجہ سے اور عبادت مقصودہ بن جانے وجہ سے صورت حال پلٹ گئی ہے۔ اب علما کو اسی پیمانے پر ناپا جانا لگا، اگر کوئی عالم دعوت وتبلیغ کے اس طریقۂ خاص میں شامل ہے تب تو مقبول ہے، ورنہ نامقبول! پہلے علما کی نظر اور ان کا علم معیار تھا، جس پر اس طریقۂ خاص کو پرکھا جاتا تھا، اب یہی طریقۂ خاص معیار بن گیا ہے، اور علما کو اس کسوٹی پر پرکھا جانے لگا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کام بذات خود دین مقصود اور ضروری ہے۔

اسی اصرار اور عبادت مقصودہ بن جانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس طریقۂ خاص میں شمول کی دعوت کو عام کر دیا گیا، خواہ عالم ہو یا عامی ہو، شیخ طریقت ہو یا صاحب ارادت ہر ایک کو دعوت دی گئی کہ اس ''رسم خاص'' کو اختیار کرے، اور یہ دعوت اتنی عام ہوگئی گویا یہی اسلام کی دعوت بن گئی، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ کسی بھی غیر مقصود طریقۂ کار کی عام دعوت دینا صحیح نہیں ہوتا، یہ حق صرف نبی کو ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس طریقۂ کار میں شامل ہونے کی دعوت دے، جو اللہ کی طرف سے وہ لایا ہے، باقی انبیاء کے علاوہ کسی نے اللہ ورسول کے حکم کی تعمیل کی غرض سے اگر کوئی خاص طریقہ ایجاد کیا ہے تو اسے حق نہیں ہے کہ سب کو اس میں شمول کی دعوت دے، اور اس کا پابند بنائے۔

غیر نبی کے ایجاد کردہ کسی طریقے کو خواہ وہ تجربہ سے کتنا ہی مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہو، مقصود بنا دینا اس کی طرف دعوت دینا، اس پر اصرار کرنا، اس میں شامل نہ ہونے والوں پر اعتراض کرنا 'من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو رد' (جس نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز جاری کر کے شامل کردی جو اس میں شامل نہیں ہے، وہ رد ہے) کے مصداق ہے۔

اس کام کا جس قدر پھیلاؤ ہوتا گیا ہر مزاج و مذاق کے لوگ اس میں شامل ہوتے گئے، اور ایسے لوگ اس میں مقتدائیت کے منصب پر قابض ہوتے گئے جنہیں دین کا ضروری علم بھی نہ تھا، اسی کے بقدر اس کا ہر جز اپنی حد سے تجاوز کرتا گیا، وسائل مقاصد بن گئے، غلو بڑھتا گیا، غیر ضروری امور ضروری بنتے گئے، التزام مالا یلزم کی بھیڑ لگ گئی۔ خاص اس تبلیغی طریقۂ کار کا شاید کوئی ایسا جز ہو جو اعتدال پر رہ گیا ہو، اس بے اعتدالی اور غلو کی وجہ سے علما کو فکر ہوئی، گو عام مسلمانوں میں اس خاص طریقہ کا اتنا غلبہ اور اس کا اتنا رعب و دبدبہ ہے کہ اب اس کی خرابیوں پر متنبہ کرنا مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی دشمنی مول لینا ہے، لیکن حق کو کہنا ضروری ہے اور اس میں جتنا باطل آمیز ہوگیا ہے اس کو الگ کرنا واجب ہے، اس لئے کچھ لوگ دبی زبان سے، کچھ لوگ کھلم کھلا ان خرابیوں کا اظہار کرنے لگے ہیں، گو کہ دنیاوی لحاظ سے ان کا یہ اظہار و بیان ان پر خاصا گراں پڑ رہا ہے، تاہم شریعت کا تحفظ ضروری ہے۔

ان علماء راسخین میں جو اس طریقۂ خاص کے غلو اور حد اعتدال سے خارج ہونے پر متنبہ ہوئے اور چونکے، ایک ہمارے بزرگ عالم جنہیں علم شریعت میں گہرا رسوخ حاصل ہے، حضرت مولانا محمد فاروق صاحب مدظلہ [۱] ہیں، جو موضع اتراؤں ضلع الہ باد کے رہنے والے ہیں، اور عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے معتمد خاص ہیں، ان سے اس مسئلہ میں استفتا کیا گیا، انہوں نے بے خوف لومۃ لائم مسئلہ کی اصل صورت حال واضح کردی، البتہ زبان اور انداز بحث خالص علمی اختیار کیا تا کہ علما اسے بغور پڑھیں اور سمجھیں، اور ناسمجھ لوگ اسے فتنہ کا دروازہ نہ بنالیں، یہ رسالہ ایک مرتبہ چھپ چکا ہے، وہ اڈیشن ختم ہوگیا ہے، پھر لوگوں میں اس طلب بڑھ رہی ہے، دوبارہ اسے شائع کیا جارہا ہے۔ خدا کرے تحفظ شریعت کے لئے یہ مفید ثابت ہو اور خواص کو براہ راست اور عوام کو بواسطۂ اہل علم نفع پہونچائے۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) مولانا محمد فاروق صاحب نے ۱۳۶۵ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم کی تکمیل کی، ابتدائی اور متوسطات تک کی تعلیم الہ آباد میں حاصل کی تھی۔ حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے خاص معتقد تھے، طالب علمی کے زمانے میں تھانہ بھون حضرتؒ کی خدمت میں حاضری بھی دی تھی، فراغت کے بعد حضرت تھانویؒ کے خلیفہ اول حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کا دامن تھاما، پھر ان کے وصال کے بعد کسی شیخِ کامل کی تلاش ہوئی تو طلب وجستجو نے مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں فتح پور پہونچایا، یہاں اپنی سلامتی طبع، اعتقادِ کامل اور رزانتِ عقل کی وجہ سے بہت جلد حضرت کی خدمت میں رُسوخ حاصل کرلیا، حضرت کو ان پر بہت اعتماد ہوگیا تھا۔ اہم امور میں حضرت ان سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ وہ حضرت کے مزاج شناس تھے، حضرت کی منشا پہچان کر اس کے مطابق کام کرتے تھے۔

تبلیغی جماعت کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں انھوں نے مفصل گفتگو کی، اور جو کچھ ان کی نگاہ میں حق تھا۔ اسے واضح کردیا۔ گو کہ اس کے باعث وہ بہت سے عوام وخواص کا نشانۂ ملامت بنے، مگر کوئی اندیشہ وہ خاطر میں نہ لائے، افسوس کہ علماء نے ان کے اس فتویٰ پر اثباتاً یا نفیاً کوئی توجہ نہ دی، اگر ان کی گفتگو حق ہے، تو اسے قبول کرنا چاہئے، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہے، تو اسے واضح کرنا چاہئے۔ مولانا محمد فاروق صاحب بہت وسیع القلب انسان تھے، اگر دلائل سے ان کی غلطی واضح کی جاتی تو اسے وہ بے تکلف قبول کرلیتے۔ بلکہ وہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے، بات کی پچ جانتے ہی نہ تھے، ان کا فتویٰ آج بھی اہل علم کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ (کھوئے ہووں کی جستجو ص ۴۵۰)

مولانا فاروق صاحب نے تبلیغی جماعت سے متعلق ایک مفصل کتاب ''الکلام البلیغ فی احکام التبلیغ'' بھی لکھی ہے، جس میں موجودہ تبلیغی جماعت کے طریقہ کار کا اصول شرع کی روشنی میں محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہت ہی زیادہ بصیرت افروز اور علما کے لئے خاصے کی چیز ہے، جس نقطہ نظر سے مولانا نے اس کتاب میں بحث کی ہے اس نظر سے ابھی تک کسی بھی صاحب علم نے تبلیغی جماعت کو نہیں دیکھا، یہ کتاب خاص علما کے لئے ہے۔

مولانا فاروق صاحب کا انتقال ۱۴؍صفر ۱۴۲۱ھ میں ہوا ہے۔



علوم و نکات

(مجموعہ مضامین)

جلد دوم



مؤلف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

(م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

ترتیب

محمد عرفات اعظمی

مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)